

حکماء و علماء عربیہ

اُردو

وہ عظیم الشان اور علمی کتاب جس میں شیعہ مذہب کی ابتداء ان کے بے شمار فرقہ شیعوں کے اسلاف و علماء اور ان کی کتابیں و احادیث اور ان کے راویوں کے حالات۔ ان کے طریقے جن سے وہ سادہ لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف لاتے ہیں۔ الوہیت، نبوت، معاد اور امامت کے بارے میں ان کے عقائد ان کے پوشیدہ فقہی مسائل، صحابہ کرامؓ، ازواج مطہرات اور اہل بیت کے متعلق ان کے عقائد و اقوال۔ ان کے اوہام و تعصبات اور نفقات کی تفصیل۔ غرض اس کتاب میں اس موضوع کے تمام مباحث جمع کر دیئے گئے ہیں۔

تصنیف: حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

ترجمہ اردو: مولانا خلیل الرحمن نعمانی (مظاہری)

دارالاشاعت

اردو بازار کراچی۔ فون ۳۶۳۱۸۹۱

تحفہ انشاء عشریہ اردو

وہ عظیم الشان کتاب جس میں شیعہ مذہب کی ابتداء، ان کے بے شمار فرقے شیعوں کے اسلاف علماء اور ان کی کتابیں و احادیث اور ان کے راویوں کے حالات۔ ان کے مکرو فریب کے طریقے جن سے وہ سادہ لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف لاتے ہیں۔ الوہیت، نبوت، معاد اور امامت کے بارے میں ان کے عقائد ان کے پوشیدہ فقہی مسائل، صحابہ کرامؓ و ازواج مطہرات اور اہل بیت کے متعلق ان کے عقائد و اقوال۔ ان کے جھوٹ، مکائد و مطاعن، ان کے اوہام و تعصبات اور مطہرات کی تفصیل۔ غرض اس کتاب میں اس موضوع کے تمام مباحث جمع کر دیے گئے ہیں۔

تصنیف: حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی
ترجمہ اردو: مولانا خلیل الرحمن نعمانی (مظاہری)

ناشر

دارالاشاعت

مقابل مولوی مسافر خانہ۔ کراچی۔

اُردو ترجمہ کے جملہ حقوق طباعت و اشاعت محفوظ

اشاعت اول

باہتمام ضیاء اشرف عثمانی
ناشر دارالاشاعت کراچی
طباعت پریس کراچی

ملنے کے پتے

دارالاشاعت، مقابل مولوی سافر خانہ اردو بازار کراچی
ادارۃ المعارف ڈاک خانہ دارالعلوم کراچی
مکتبہ دارالعلوم ڈاک خانہ دارالعلوم کراچی
ادارۃ اسلامیات، ۱۹، انارکلی، لاہور
بیت القرآن اردو بازار کراچی

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مختصر حالات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ آمین

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت اور دفاع کا کام ہمیشہ اپنے منسوس بندوں اور علماء کرام و اولیاء عظام سے ہی لیا ہے۔ جس زمانہ میں بھی کسی فتنے نے سر اٹھایا، تو یہی جانباز اور سر فروش بندے سر سے کفن باندھ کر اس فتنے کے مقابلے کے لئے میدان میں آئے اور ہر قسم کی قربانیاں پیش کر کے اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا اور اسلام کے پرچم کو سر بلند رکھا۔ فتنہ اعتراضی ہو یا فتنہ رافضی، فتنہ خارجیت ہو یا فتنہ بدعت۔ ان سب کے مقابلے پر ہمیشہ یہی بندگانِ خدا ہمت سامنے آئے اور اپنا اپنا کام کر گئے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ہندوستان بھی ہمیشہ طرح طرح کے فتنوں کی آماجگاہ بنے رہے ہیں۔ منلیہ دور میں اگر اکبر بادشاہ کے دین الہی کا فتنہ اٹھتا ہے تو اس کی سرکوبی کے لئے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ میدان میں آ جاتے ہیں اور اس فتنہ کو یز دین سے اٹھا کر ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتے ہیں۔

اور جب رافضی و بدعت سر اٹھاتے ہیں تو اس کے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے لائق فرزند اور صحیح جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو پیدا فرمادیتا ہے اور ان سے اپنے دین کی حفاظت کا کام لیتا ہے۔ جو دین میں طرح طرح کی آمیزشوں اور آلائشوں کو اپنی تحریر و تقریر سے پاک و صاف کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہندو پاکتان کا ہر مسلمان حضرت شاولی اللہ اور ان کے خاندان کا مہونِ منت ہے کیونکہ آج دین کی جو کچھ صحیح شکل و صورت نظر آتی ہے وہ اسی خاندان کی اسلامی خدمات کی بدولت ہے۔

جنہوں نے یہاں تمام علوم اسلامی اور خصوصاً تفسیر و حدیث اور فقہ اسلامی کی ایسی شاندار اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں جو رہتی دنیا تک انشاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے مشکل راہ اور ان کے لئے ہمیشہ کے لئے ایک مدد و تارہ ثابت ہوں گی۔

ان کے خاندان کے لئے فی الحقیقت یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است ایں خانہ تمام آفتاب است

ایسے ہی بورنیشن اور خدامت علماء میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سر فہرست ہیں۔ اس کے لئے فرقہ ہے کہ موقع کی مناسبت سے بیان ان کے کچھ حالات زندگی اور کارناموں کا ذکر کیا جائے۔

لیکن انہوں نے ایسے عظیم المرتبت ولی کامل اور یگانہ دوزگار مفسر، محدث اور فقیہ اور جامع کمالات شخصیت کے حالات زندگی کیجی ٹی طور پر بہت کم ملتے ہیں۔ کافی تلاش و جستجو سے ہمیں ان کے جو حالات میسر آ سکے وہ ہم بیان مختصر درج کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے حالات سے پہلے کچھ ان کے زمانہ اور عہد کا حال معلوم کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے جن حالات اور جس زمانہ میں آنکھ کھولی وہ زمانہ انتہائی سخت فتنہ کا زمانہ تھا۔ جس میں اظہار حق سخت دشوار تھا اس لئے شاہ صاحب ترویج دین کا کام نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ کرتے تھے اور فتنہ انگیز عنوانات سے پرہیز کرتے تھے اور وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب کا جن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا وہ دین سے بالکل نا آشنا تھے ایسے لوگوں کو راہ پر لگانا سخت دشوار تھا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے اپنی کمال حکمت و دانائی سے ان کو

راہ پر لگایا اس زمانہ میں روافض کا غلبہ اور نجف علی ناں کا تسلط تھا جس نے حضرت شاہ ولی اللہ کے پیچھے اترائے تھے۔ تاکہ کچھ لکھ نہ سکیں۔ اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کو شہید کرا دیا تھا۔

اور روافض نے خود شاہ عبدالعزیز کو دوسرے تہذیب زدہ کر دیا تھا۔ دوسرے مصنوعی صوفیوں کا غلبہ تھا جن کا اثر بادشاہ شاہزادوں اور شاہزادیوں پر تھا۔ ایسا سخت زمانہ تھا جس میں حضرت شاہ صاحب کو اپنا کام انجام دینا تھا۔ جس میں وہ اپنی فہم فراست اور حکمت و دانائی سے بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

شاہ صاحب کی پیدائش نام و نسب اور جلیلیہ آپ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ آپ دہلی میں ۱۰۵۰ رمضان المبارک ۱۱۰۵ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۷۹۳ء کو یوسف پور میں پیدا ہوئے والد ماجد نے ان کا نام عبدالعزیز رکھا اور آپ کا تاجی نام غلام حلیم رکھا اور آپ نے ہی نام مخلصاً تحفہ اشاعرہ پر اپنا تقریر فرمایا ہے۔ آپ کا نسب چونتیسویں پشت میں حضرت فاروق اعظمؓ عمر بن الخطابؓ سے جاملتا ہے۔ آپ نے تمام علوم ظاہری و باطنی اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ سے حاصل کئے۔ اور بعض کتب کی سند شاہ صاحب کے بعض تلامذہ سے بھی حاصل کی۔ آپ اپنے والد ماجد ہی سے بیعت ہوئے۔ اور پھر فرقہ خلافت پہنا۔ جس وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ برس تھی تو حضرت شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے جانشین ہوئے۔ آپ دراز قد، گندم رنگ، لاغر جسم اور آنکھیں بڑی بڑی رکھتے تھے۔ چہرے پر خوبصورت گول داڑھی تھی۔ آپ کی زینہ اولاد کوئی نہ تھی البتہ تین صاحبزادیاں تھیں۔

آپ کے چند محاسن و کمالات آپ کی ذات ایسی جامع کالات اور مجموعہ صفات تھی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آپ نرم طبیعت خوش اخلاق اور حجاج میں نہایت خوش طبع تھی ہر چیز میں نہایت سحر مذاق رکھتے تھے۔ صاحب علم و علم، زہد و دراع و تقویٰ اور صاحب کشف و کرامات تھے۔ تمام علوم متداولہ اور فنون عقلیہ و نقلیہ میں عبور و دستگاہ رکھتے تھے حافظہ ایسا قوی کہ صحاح ستہ از بر تھیں۔ تعبیر خواب میں خصوصی مہر اور دماغ ایسے کہ عوام و خواص، علماء و فقہاء، افسر سلاطین و امرا سب ہی آپ کی مدح و تحسین میں رطب اللسان تھے۔ صاحب دلیل و برہان تھے اور موافق مخالف شیعہ و سنی سب آپ کے معتقد تھے۔

آپ نے ساری عمر درس و تدریس افتاء و عظمت و نصائح میں ہی بسر فرمائی۔ اور خصوصاً علم حدیث کا فیض ہندوستان میں عام کیا۔ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچا ہے۔ دو دوسرے لوگ آپ کی خدمت میں آتے اور علم کی پیاس بجھاتے اور سند کی تکمیل حاصل کرتے اور اپنی اس نسبت تلمذی کو باعث صد فخر جانتے۔ آپ مرجع علماء و مشائخ اور قطب ارشاد تھے۔

آپ کی معلومات بے حد وسیع تھیں جو صرف اسلامی علوم و فنون تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے متعلقہ علوم ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ زبان، لغت، انشاء و شاعری، موسیقی، خوش خطی، تعبیر خواب، تیر اندازی، گھڑ سواری اور پرکاری غرض کوئی علم و فن ایسا نہ تھا جس میں آپ کو کامل دستگاہ نہ ہو۔

آپ خود فرماتے ہیں کہ جو علوم میں نے مطالعہ کئے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ انہیں سے نصف کے قریب تو وہ علوم ہیں جو امت مسلمہ کی تخلیق ہیں اور باقی نصف دوسری امتوں کے ہیں اور تو اور آپ کو فن موسیقی کے علمی پہلوؤں سے پوری واقفیت تھی اور مختلف راگوں کو پوری طرح پہچانتے تھے۔ اس زمانہ کی شعر و شاعری اور ادبی معاملات میں بھی آپ کی رائے ایک حجت اور سند سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ جب شاہ نصیر دہلوی (جو مشہور شاعر ذوق کے استاد ہیں) نے ذوق کی غزل درست کرنے سے انکار کر دیا تو ذوق دہلی کے

سب اساتذہ کو چھوڑ کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جب آپ نے غزل کے متعلق اس کی تسلی کردی تو ذوق نے کسی اور سے اصلاح لئے بغیر بے دھڑک اس غزل کو مشاعرہ میں پڑھا۔

اور ذوق کا تعلق جب شاہ نصیر سے ختم ہو گیا تو وہ اکثر شاہ صاحب کے وعظ میں مشرک ہونے لگا۔ کسی دوست نے پوچھا کہ تم یہاں کیوں آتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ شاہ صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اس لئے میں ان کے بیان و گفتگو سناتا ہوں اور اردو زبان کے عاویز اور روزمرہ ماد کرتا ہوں۔ دراصل شاہ عبدالعزیز چھٹن میں اپنے والد محترم کے حکم کے بموجب خواجہ میر درد کی خدمت میں اردو زبان سیکھنے جایا کرتے تھے۔ اور خواجہ میر درد اردو زبان کے مجدد و مجتہد ہیں۔

الغرض کہاں تک آپ کے کمالات گنوائے جائیں اس کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے۔ صاحب تذکرہ ملائے ہند لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب۔ بالجلد دسے جامع علوم بلکہ آیتہ از آیات الہی بود۔

اور علامہ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے فرمایا ہے۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وریلا حضرت شاہ صاحب کی وفات آپ کی وفات اسی سال کی عمر میں ۲۳۹ شوال ۱۲۳۹ھ مطابق ۵ جون ۱۸۲۴ء کو صبح کے وقت ہوئی۔ اور کہتے ہیں کہ نماز جنازہ میں ہجوم کا یہ عالم تھا کہ آپ کی نماز جنازہ پچیس مرتبہ پڑھی گئی۔ اور وہلی میں اپنے والد ماجد کے قریب آپ مدفون ہوئے۔

مشہور نسل شاعر محکم مومن خاں مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دیئے ہوئے نام مومن خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ تاریخ وفات بھی تھی۔

دست بے داد اہل سے بے سرو پا ہو گئے
نقد و دین۔ فضیل و ہنر۔ لطیف و کرم۔ علم و عمل (۱۲۳۹ھ)

حضرت شاہ صاحب کے چند تلامذہ آپ کے شاگردوں کی تعداد تو بے شمار ہے ہم یہاں چند نام درج کرتے ہیں شاہ رفیع الدین محدث دہلوی۔ شاہ محمد اسماعیل محدث دہلوی۔ مفتی صدر الدین دہلوی۔ شاہ غلام علی صاحب۔ مولانا عفو اللہ صاحب۔ مولانا عبدالحی صاحب۔ مولانا میر محبوب علی صاحب۔ مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مولانا سید احمد بریلوی۔

آپ کی تصانیف آپ کا زیادہ تر وقت درس و تدریس اور خدمت فرائض میں گزرا۔ اس لئے تصانیف کے لئے زیادہ وقت دل نہ سکا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی جو تصانیف ہیں وہ سب نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں۔ جن سے آپ کی جلالت شان اور علو مرتبہ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں

تفسیر عزیزی ہے جو اپنے طرز کی منفرد تفسیر ہے۔ مجاز نافہ اصول حدیث میں بے مثل کتاب ہے۔ بستان الحمد شین جو محدثین کے حالات میں نہایت عمدہ اور جامع کتاب ہے ستر الشہادتین ہے۔ آپ کا مجموعہ فتاویٰ ہے جو ہر قسم کے مسائل پر مشتمل ہے ان کے علاوہ اور بھی چند رسائل آپ کے تصانیف ہیں۔ لیکن آپ کی سب سے زیادہ مشہور اور عظیم المرتبہ کتاب تحفہ اثنا عشریہ ہے ہم یہاں اس اہم کتاب کا تعارف قدرے تفصیل سے کرنا چاہتے ہیں۔

ملہ رود کوثر محمود الم آب حیات

ملہ شاہ عبدالغنی مولانا مملوک الاعلیٰ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کا سلسلہ اسناد انہی کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔

تحفہ اشاعہ شریعہ فارسی

جیسا کہ ہم شروع صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ شاہ صاحب کا زمانہ بڑے فتنوں کا زمانہ تھا۔ اور شاہ صاحب ہر معاملہ میں بڑے حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن دین حق اور کلمہ حق کے معاملہ میں آپ جبری بھی ایسے تھے کہ خالص انگریزوں کے تسلط کے زمانہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا تھا۔ اور معاملہ فہم ایسے تھے کہ جب انگریزوں نے دہلی کا لُج قائم کیا تو مسلمان اس میں تعلیم حاصل کرنے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن آپ نے ہی سب سے پہلے مسلمانوں کو اس کا لُج میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی اور پھر اسی دہلی کا لُج سے ایسے ایسے لیکچررز و دروڑ گار علماء و فضلا پیدا ہوئے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

آپ کی اسی حق گوئی و بے باکی نے انتہائی نامساعد اور کٹھن حالات میں آپ سے تحفہ اشاعہ شریعہ جیسی عظیم المرتبت کتاب تصنیف کرائی۔ جو بلاشبہ ایک بہت بڑا علمی کارنامہ تو تھا ہی۔ لیکن نجف خاں جیسے جابر و ظالم کے زمانہ اقتدار میں اس کتاب کی تصنیف و اشاعت کوئی دل لگی یا آسان کام نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت اور ہمت مردانہ کام تھا۔ حضرت شاہ صاحب تحفہ کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ہمارے زمانہ میں اور ہمارے شہروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ کوئی گھر ایسا نہ ہو گا جس میں ایک دو آدمی اس مذہب کے قائل اور شیعہ خیالات سے متاثر نہ ہوں۔

چنانچہ اسی فتنہ کی سرکوبی کے لئے یہ کتاب تالیف کی گئی۔ اصل کتاب فارسی زبان میں تصنیف کی جو بڑے سائبر کے تقریباً پانچ سو صفحات پر محیط ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۸۵ھ میں مطبع مشرق ہندوستان سے شائع ہوئی۔ اور پھر نو کشتور پریس وغیرہ مطابع میں بھی چھپتی رہی ہے۔

تحفہ اشاعہ شریعہ فی الحقیقت ایک مہم آفرین کتاب ہے۔ جس کی تالیف میں شاہ صاحب نے بے حد محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے۔ قوت بیان اور ندرت کلام اور ایجاد و اختصار کے ساتھ مطالب و معانی اور بے شمار ناقابل تردید دلائل ایسے دل نشین اور متین انداز میں تحریر کئے گئے ہیں کہ اس سے قبل ایسی جامع و مانع کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں شیعہ سنی مسائل و مباحث کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ جس کے بعد اس موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور بحث و مناظرہ میں اکثر علماء اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیونکہ شیعہ سنی معاملات کے تمام مباحث

اس کتاب میں نہایت جامعیت

کے ساتھ آگئے ہیں۔ کہ اگر تحفہ کو ان مسائل کی انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو وہ بالکل درست ہو گا۔

تحفہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ روایات اور بیان کے انتخاب میں اصول حق کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اور شیعہ مذہب و خیالات کے بیان میں صرف مستند و معتبر شیعہ کتب پر انحصار کیا گیا ہے۔ اور تواریخ و تفسیر و حدیث میں سے صرف انہی چیزوں کو چنا ہے جن پر شیعہ سنی دونوں متفق ہیں اور طرز بیان بھی نہایت متین اور مہذبانہ ہے۔

لے شاید انہی حالات کی وجہ سے شاہ صاحب نے کتاب پر اپنا فارغی نام غلام تعلیم تحریر فرمایا ہے۔ لے نواب آرکائٹ نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کر کر عرب میں بھیجا تھا۔

بھی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں شیعہ مذہب کا جو فروغ شروع ہوا تھا اس کو روکنے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کے شکوک و شبہات دور کر کے راہِ راست پر لانے میں تحفہ اثنا عشریہ نے زبردست کارنامہ انجام دیا۔

اس کتاب کی تصنیف و اشاعت نے شیعہ مقلدوں میں ایک پھل پیدا کر دی اور پوری جماعتِ شیعہ کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کا جواب کھو کر اس کتاب کے اثرات کو روکا اور ذائل کیا جائے۔ لہذا اس میں بہتوں نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور ہندوستان و ایران کے بہت سے شیعوں نے اس کے جواب لکھے۔

کھنڈو کے شیعہ علماء میں سب سے ممتاز نام کووی و دلار علی مجتہد اول کا ہے جنہوں نے اس کی تردید میں چھ کتابیں اور رسالے لکھے۔ ان کے علاوہ بعض شیعوں نے تو اپنی پوری عمر ہی اس کے جواب لکھنے میں صرف کر دی۔ لیکن یہ سب جواب بلاشبہ جواب و ہرزہ گوئی اور دور اثر کار باتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ پوری جماعتِ شیعہ کی جہدِ بیخ کے بعد بھی آج تک اس کتاب کا جواب نہ ہو سکا۔

اس کتاب کے جواب کے سلسلے میں ایک دلچسپ فقہ کتاب ارماع ثلاثہ (جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف ہے) میں بروایت کتاب امیر الروایات درج ہوا ہے۔ وہ یہ ہے۔

خان صاحب نے فرمایا کہ جب شاہ صاحب کا تحفہ کھنڈو پہنچا تو کھنڈو کے جواب نے جو اس وقت برسرِ حکومت تھا تمام مجتہدینِ شیعہ سے درخواست کی کہ اس کا جواب لکھا جائے۔ چنانچہ مجتہدین میں سے دلار علی خان نے جواب لکھنے کا بیڑہ اٹھایا۔ لیکن تحفہ کی زبان چونکہ بے نظیر تھی۔ اس لئے مرزا قتیل سے درخواست کی گئی کہ مضامینِ توقبلہ و کعبہ کھیں اور آپ اپنی عبارت میں اس کو ادا کر دیں تاکہ مضامین کا جواب مضامین سے اور عبارت کا جواب عبارت سے ہو جائے۔ لیکن مرزا قتیل نے یہ کہہ کر عذر کر دیا کہ میں شاہ صاحب جیسی عمدہ عبارت لکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ چنانچہ قبیلہ و کعبہ نے خود ہی جواب لکھا تو اس جواب کو جواب صاحب نے مرزا قتیل کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ بتلائیے کیسا جواب ہے؟ مرزا قتیل نے دیکھ کر کہا کہ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں؟ جواب صاحب نے کہا فرمائیے۔ مرزا قتیل نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ قبیلہ و کعبہ کو تو اپنی کتاب کا نام بھی رکھنا نہ آیا۔ شاہ صاحب تو تحفہ پیش کر رہے ہیں اور قبیلہ و کعبہ تحفہ کا جواب بتوار سے دیتے ہیں۔ (قبیلہ و کعبہ نے اپنی کتاب کا نام ذوالفقار رکھا تھا) اس کے بعد قبیلہ و کعبہ نے فرمایا کہ اچھا عبارت کی نسبت فرمائیے۔ قتیل نے کہا کہ حضور کہاں چائیں کا جولاہا اور کہاں دلی کی بیڑھیوں کا بیٹھنے والا مشہور۔ قتیل نے یہ اس لئے کہا کہ قبیلہ و کعبہ جاملش کے رہنے والے تھے جہاں کے جولاہے مشہور ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ اس کتاب کا نام تحفہ اثنا عشریہ اس مناسبت سے رکھا ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے اختتام پر یہ کتاب جلوہ گر ہو رہی ہے۔ اور دیباچہ کے آخر میں فرماتے ہیں کہ اس کتاب کو بارہ اماموں کی تعداد کے مطابق بارہ ابواب پر مرتب کیا گیا ہے۔

لے نقل از ارماع ثلاثہ حکایت ۲۷ بروایت امیر شاہ خان صاحب۔ لے ناظرین سے درخواست ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے قبل اس کا دیباچہ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

تحفہ اثنا عشریہ کا اردو ایڈیشن

یہ عظیم الشان اصل کتاب تو فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اردو خوانوں کے لئے اردو ایڈیشن کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے متعدد اردو ترجمے شائع ہوئے۔ غالباً پہلا اردو ترجمہ تو ہدیہ مجید یہ ہے جو مولانا عبدالمجید خان پٹلی بھیتی نے آج سے تقریباً نوے سال قبل کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ مولانا سعد حسن خان ٹونگی نے بھی کیا تھا جو شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن آج سے نوے سال قبل کی اردو زبان اور محاورے اب بالکل نامافوس ہو چکے ہیں۔ اور اس زمانہ کے لوگ ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ دوسرے یہ ترجمے عرصہ سے کیا بے نایاب ہیں۔

اس لئے ایک ایسے جدید اردو ترجمہ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ جو سادہ اور آسان زبان میں ہوتا کہ ہمارے زمانہ کے عام لوگ بھی اس عظیم المرتبہ کتاب سے پورا پورا فائدہ حاصل کر سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ احقر کے قدیم کرم فرما مولانا غلیل الرحمن نعمانی مظاہری نے احقر کی درخواست پر تحفہ اثنا عشریہ فارسی کا نہایت سلیس اور شگفتہ اردو زبان میں مکمل اردو ترجمہ فرما دیا ہے۔ جو احقر پر اور مسلمانوں پر ان کا ایک احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر آخرت میں عطا فرمائے۔

اور خدا کا بے حد شکر ہے کہ اب یہ نفیس تحفہ کتابت، لطافت، کاغذ اور جلد بندی کے اعلیٰ معیار کے ساتھ دارالاشاعت کراچی سے شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف ملام کو اس کے مترجم کو اور اس کے ناشرین اور وہ سب لوگ جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں حصہ لیا ہے ان سب کو اپنے حبیب پاک کے صدقہ میں زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب عطا فرمائے۔ اور اس کو ہمارے لئے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین۔

فقط ننگ اسلاف

جمعہ ۱۶ اشوال ۱۴۱۲ھ
مطابق ۶ اگست ۱۹۹۲ء

احقر محمد رضی عثمانی مدیر دارالاشاعت

فہرست مضامین تحفہ اثنا عشریہ اردو

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۲	۱۵۔ فرقہ غزالیہ: (ان کا عقیدہ ہے کہ جبریل نے غلطی سے وحی حضور کو پہنچائی)	۲۸	حضرت شاہ عبد العزیز کے مختصر سوانح
۴۳	۱۶۔ فرقہ ذبائیہ: (جو حضرت علیؑ کو الہ مانتا ہے)	۲۹	فہرست مضامین
"	۱۷۔ فرقہ ذمیرہ: (یہ حضرت علیؑ کی الوہیت کا قائل ہے۔)	۲۱	دیباچہ مصنف
"	۱۸۔ فرقہ اثنینہ: (یہ آنحضرتؐ اور حضرت علیؑ دونوں کو خدا مانتا ہے۔)	۲۲	باب۔ شیعہ مذہب کی ابتداء اور ان کا فرقوں میں بٹنا
"	۱۹۔ فرقہ خمیہ: (جو پانچوں کو خدا مانتا ہے)	۴۰	غالی شیعوں کے چوبیس فرقوں کی تفصیل
"	۲۰۔ فرقہ نصیریہ: (ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ میں خدا حلول کر گیا ہے۔)	"	۱۔ فرقہ سبائیہ: (عبد اللہ بن سبا کے پیروکار)
"	۲۱۔ فرقہ اسماعیلیہ: (یہ بھی حضرت علیؑ میں خدا کے حلول کے قائل ہیں۔)	"	۲۔ فرقہ مفضلینہ: (مفضل صیرفی کے ساتھی)
"	۲۲۔ فرقہ غلبانیہ: (یہ بھی حضرت علیؑ کی الوہیت کا قائل ہے۔)	۴۱	۳۔ فرقہ سیرغیہ: (سیرغ کے ہم عقیدہ لوگ)
"	۲۳۔ فرقہ زرامیہ: (یہ تارک فرائض اور حرام کو حلال بتاتے ہیں۔)	"	۴۔ فرقہ بیزغیہ: (بیزغ بن یونس کا گروہ)
"	۲۴۔ فرقہ متغیرہ: (یہ حضرت حسینؑ کے بعد متغیر کو خدا مانتے ہیں۔)	"	۵۔ فرقہ کاملیہ: (کامل کے ساتھی)
۴۴	فرقہ کیسانہ اور اس کے چھ فرقوں کی تفصیل	"	۶۔ فرقہ مغیریہ: (مغیرہ بن سعید علی کی ٹولی)
"	فرقہ زیدیہ کے نو فرقوں کے حالات	"	۷۔ فرقہ جناحیہ: (یہ لوگ تنازع ارجح کے قائل ہیں)
۴۵	فرقہ امامیوں کے اثنالیس فرقوں کے حالات	"	۸۔ فرقہ بیانیہ: (بیان بن سمان ہندی کا گروہ)
۴۶	جس میں اسماعیلی فرقے بھی شامل ہیں۔	۴۲	۹۔ فرقہ منصورہ: (ابو منصور علی کا گروہ)
۵۲	(پہلا فائدہ) شیعہ علمین کے حالات	"	۱۰۔ فرقہ غلامیہ: (جس کو زبیر بھی کہتے ہیں)
۵۵	(دوسرا فائدہ) شیعوں کی ریاست و حکومت کیلئے کوششیں	"	۱۱۔ فرقہ انویہ: (یہ حضرت علیؑ کو آنحضرتؐ کی نبوت میں شریک مانتا ہے۔)
		"	۱۲۔ فرقہ تقوینیہ: (ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے دنیا کے امور حضور کو تفویض کر دیئے)
		"	۱۳۔ فرقہ خطابیہ: (ابو الخطاب محمد بن ربیع کا گروہ)
		"	۱۴۔ فرقہ معمریہ: (معمر کا گروہ جو امام جعفرؑ کی امامت کے قائل ہیں۔)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۸	دھوکہ دینا اہل سنت خود کو شارع جانتے ہیں	۹۰	{ تفسیر فائدہ) اپنے مذہب کی طرف ترغیب دلانے کے طریقے
۸۹	{ دھوکہ دینا مذہب اشاعہ شری حق اور اہل سنت بالکل پر ہیں۔	۹۱	دعوت مذہب کے اسباب
۹۱	{ دھوکہ دینا علماء شیعہ اپنی کتابوں میں ناحق اہل سنت پر عیب لگاتے ہیں	۹۲	عبد اللہ ابن سبا یہودی کی فقہ انجیزی
۹۰	{ دھوکہ دینا ۱۳ خلفائے ثلاثہ نے قرآن میں تحریف کر دی ہے۔	۹۰	باب ۱: شیعوں کا مکرو فریب سے اپنے مذہب میں لانے کے مختلف طریقے
۹۰	{ دھوکہ دینا ۱۴ عوام کو فریب دینے کے لئے حب علیؑ کی جھوٹی حدیثیں لاتے ہیں۔	۹۰	{ (پہلی فصل) دھوکہ دینے کے قواعد کلیہ دعوت کے سات مرتبے
۹۲	{ دھوکہ دینا ۱۵ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ خلیفہ مقرر کئے۔	۹۲	{ (دوسری فصل) روانفس کے دھوکوں کی تفصیلی جزئیات
۹۳	{ دھوکہ دینا ۱۶ تفسیر کی آڑ میں جھوٹی حدیث وضع کرتے ہیں۔	۹۳	{ دھوکہ دینا اہل سنت خدا کو تارک الواجب مانتے ہیں۔
۹۴	{ دھوکہ دینا ۱۷ اہل سنت سے صحابہ کی مذمت میں جھوٹی حدیثیں وضع کرتے ہیں۔	۹۴	{ دھوکہ دینا ۱۸ اہل سنت خدا سے برائی کا صدور مانتے ہیں۔
۹۵	{ دھوکہ دینا ۱۹ اپنے مذہب کے مطابق مرفوع احادیث وضع کرتے ہیں۔	۹۵	{ دھوکہ دینا ۱۹ اہل سنت اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم منسوب کرتے ہیں۔
۹۶	{ دھوکہ دینا ۲۰ سنی رجال کے ہم نام راویوں سے اہل سنت کو دھوکہ دیتے ہیں۔	۹۶	{ دھوکہ دینا ۲۰ اہل سنت کا عصمت انبیاء کی نسبت غلط عقیدہ ہے۔
۹۷	{ دھوکہ دینا ۲۱ قرآن کی من مانی تفسیر کرتے ہیں	۹۷	{ دھوکہ دینا ۲۱ اہل سنت انبیاء سے سہو مانتے ہیں۔
۹۸	{ دھوکہ دینا ۲۲ اہل سنت کے بطلان میں خود کتاب لکھ کر سنی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔	۹۸	{ دھوکہ دینا ۲۲ اہل سنت پیغمبروں سے کلمہ کفر جائز مانتے ہیں۔
۹۹	{ دھوکہ دینا ۲۳ اہل سنت کے بطلان میں نادر کتب کا فرضی حوالہ دیتے ہیں۔	۹۹	{ دھوکہ دینا ۲۳ اپنے چچ کے علاوہ تمام صحابہ اہل بیت سے بغض رکھتے تھے
۱۰۰	{ دھوکہ دینا ۲۴ اپنے بعض علماء کو دھوکہ دینے کے لئے متعصب سنی کہتے ہیں۔	۱۰۰	{ دھوکہ دینا ۲۴ اہل سنت قرآن کی مخالفت کرتے ہیں۔
۱۰۱	{ دھوکہ دینا ۲۵ اہل سنت اہل بیت کے دشمن ہیں۔	۱۰۱	{ دھوکہ دینا ۲۵ اہل سنت حدیث کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔
۱۰۲	{ دھوکہ دینا ۲۶ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فاطمہؓ کا گھر جلا دیا۔	۱۰۲	{ دھوکہ دینا ۲۶ مخالفت کرتے ہیں۔

دھوکہ ۲۶ شیعہ چونکہ اہل بیت کے تابع ہیں اس لئے وہ حق پر ہیں۔

دھوکہ ۲۷ ایک جیسی لڑکی نے علماء سنی کو عاجز کر دیا۔

دھوکہ ۲۸ شیعہ کوئی کتاب لکھ کر کسی عورت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

دھوکہ ۲۹ کہ فلاں شخص نے دونوں مذاہب میں سے شیعہ کو قبول کر لیا۔

دھوکہ ۳۰ شیعہ لوگ سنی یا شافعی بن کر کتاب لکھتے ہیں۔

دھوکہ ۳۱ بعض شیعہ سنیوں کے نام سے کتاب لکھ کر دھوکہ دیتے ہیں۔

دھوکہ ۳۲ بعض شیعہوں نے اہل سنت کی تقابیر میں تحریف کر دی ہے۔

دھوکہ ۳۳ نقل روایت میں خیانت کرتے ہیں

دھوکہ ۳۴ خلفائے اربعہ کی اس طرح مدح لکھتے ہیں جو خلفائے ثلاثہ کی شان میں قدرج ثابت ہو۔

دھوکہ ۳۵ اہل سنت کے ڈر سے اپنی بعض کتب کو منسوخ کر دیا ہے۔

دھوکہ ۳۶ بعض شیعہ شکر کہہ کر بتاتے ہیں کہ یہ سنبلوں کے ہیں۔

دھوکہ ۳۷ شیعہ اپنے کلام کو کامنوں کے کلام سے ملا کر دھوکہ دیتے ہیں۔

دھوکہ ۳۸ فضائل علیؑ میں جھوٹی حدیث وضع کی ہے۔

دھوکہ ۳۹ یہ ہے کہ متفق علیہ کو لیں مختلف فیہ کو ترک کر دیں۔

دھوکہ ۴۰ شیعہوں کو اپنی نہایت کا یقین ہے اس لئے وہ جنتی ہیں۔

دھوکہ ۴۱ اہل سنت غیر معصوم کی پیروی کرتے ہیں۔

دھوکہ ۴۲ شیعہوں کا الزام کہ صحابہ نے قرآن میں تحریف کی ہے۔

دھوکہ ۴۳ یہ کہ پیغمبر شعیان علیؑ میں شامل ہونے کی دعا کرتے تھے۔

دھوکہ ۴۴ حضرت علیؑ کو تمام انبیاء پر فضیلت دیتے ہیں۔

دھوکہ ۴۵ خلفاء راشدین دوازہ مطہرات پر شتم افضل عبادت ہے۔

دھوکہ ۴۶ رسول اللہؐ پر وحی آئی کہ دعا کریں کہ ہم آپؐ کو حب علیؑ عطا کریں

دھوکہ ۴۷ بعض شیعہ سنی بن کر دھوکا دیتے رہے۔

دھوکہ ۴۸ بہت سے مشائخ اہلسنت شیعہ ہو گئے تھے۔

دھوکہ ۴۹ کہ آنحضرتؐ نے کسی بزرگ شاعر کی خواب میں تعریف کی

دھوکہ ۵۰ بعض شیعہ سنی بن کر اپنی جھوٹی احادیث گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔

دھوکہ ۵۱ شیعہ سنی مؤرخ بن کر اپنی کتابوں میں جھوٹی روایات داخل کرتے ہیں۔

دھوکہ ۵۲ شیعہ مؤرخین اہل سنت کی تاریخ میں اپنی روایات شامل کرتے ہیں

دھوکہ ۵۳ شیعہ مؤرخین صحابہ کی ذرمت بلا سند لکھتے ہیں۔

دھوکہ ۵۴ بعض شیعہ اپنی کتب کلامیہ میں اہل سنت کی حدیث سے حجت قائم کرتے ہیں۔

۹۸

۹۹

۱۰۰

۱۰۱

۱۰۲

۱۰۲

۱۰۳

۱۰۴

۱۰۴

۱۰۵

۱۰۶

۱۱۰

۱۱۱

۱۱۲

۱۱۲

۱۱۳

۱۱۵

۱۱۶

۱۱۶

۱۱۶

۱۱۶

۱۱۸

۱۱۸

۱۱۸

۱۱۹

۱۱۹

۱۱۹

۱۱۹

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۴	دھوکہ دہا ۶۶ قیامت کا ہول شیعوں کے علاوہ سب کو ہوگا۔	۱۳۷	دھوکہ دہا ۵۵ اپنا من گھڑت مضمون حضرت علیؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔
۱۳۶	دھوکہ دہا ۶۷ اہل سنت پر الزام کہ تمام سنیوں کے دل میں بغض ملی ہے۔	"	دھوکہ دہا ۵۶ اپنی کتاب کو ائمہ طاہرین سے منسوب کر دیتے ہیں۔
"	دھوکہ دہا ۶۸ قیامت میں سنیوں کے تمام اعمال گرد ہو جائیں گے۔	۱۳۸	دھوکہ دہا ۵۷ کہ حضرت علیؑ و دعائیں خلفائہ ثلاثہ پر لعن کرتے تھے۔
۱۳۸	دھوکہ دہا ۶۹ اہل سنت کی صحاح میں ہے کہ حضورؐ کو نماز میں سہو ہوا ہے۔	"	دھوکہ دہا ۵۸ فضائل علیؑ کے اشعار یہودی یا نصرانی سے منسوب کر دیتے ہیں۔
"	دھوکہ دہا ۷۰ اہل سنت کی حدیث کہ لیلۃ القدر میں حضورؐ کی صبح کی نماز قضا ہوئی۔	۱۳۹	دھوکہ دہا ۵۹ فضائل اہلبیت علیؑ کے متعلق ایک حدیث کی غلط نسبت
۱۳۹	دھوکہ دہا ۷۱ اہل سنت خارجیوں سے حدیث لیتے ہیں۔	۱۳۰	دھوکہ دہا ۶۰ شیعیان علیؑ سے قیامت میں حساب نہ ہوگا
۱۴۰	دھوکہ دہا ۷۲ اہل سنت شیطان کی طرح خاک کی ٹیکہ پر سجدہ نہیں کرتے۔	"	دھوکہ دہا ۶۱ شیعیان علیؑ پر قیامت میں انبیاء بھی رشک کریں گے۔
۱۴۲	دھوکہ دہا ۷۳ شیعوں سے مباہلہ کرنے والے ہلاک ہو گئے۔	۱۳۱	دھوکہ دہا ۶۲ انبیاء کرام شیعوں علیؑ ہونے کی آرزو کرتے رہے۔
"	دھوکہ دہا ۷۴ شیعوں کو آتشیں درزخ کچھ نہ کہے گی۔	"	دھوکہ دہا ۶۳ جبرائیلؑ پر حضرت علیؑ کا احسان و انعام
۱۴۳	دھوکہ دہا ۷۵ شیعہ خود کتاب لکھ کر کسی امام کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔	۱۳۲	دھوکہ دہا ۶۴ حضرت علیؑ نے ملائکہ کو تسبیح و مناجات کی تعلیم دی۔
۱۴۴	دھوکہ دہا ۷۶ مہاجرین اولین میں اہل رافضی شیعہ تھے۔	"	دھوکہ دہا ۶۵ حضرت علیؑ نہ ہوتے تو انبیاء اور فرشتے بھی نہ ہوتے۔
"	دھوکہ دہا ۷۷ تاریخ طبری کے خلاصہ میں شیعوں نے اپنی روایات ملا دیں۔	"	دھوکہ دہا ۶۶ مذاب و ثواب کے فرشتے حضرت علیؑ کے تابع ہیں۔
"	دھوکہ دہا ۷۸ بعض ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن سے دھوکہ ہو کہ یہ اہل سنت کی ہیں	۱۳۴	دھوکہ دہا ۶۷ اہل سنت پر ایک حدیث کے سلسلہ میں الزام
"	دھوکہ دہا ۷۹ سنیوں نے بعض ائمہ پر الزام کا ارادہ کیا	"	دھوکہ دہا ۶۸ کہ اہل سنت مومن کی طرح منافق سے بھی حدیث لیتے ہیں۔

۱۸۷	دھوکہ دہا ۹۷ اہل سنت کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ سے تین جھوٹ ثابت ہیں۔	۱۴۷	دھوکہ دہا ۸۲ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی خلافت میں شک تھا۔
۱۸۸	دھوکہ دہا ۹۹ اہل سنت کی روایت سے حضرت عمرؓ کی انبیاء پر فضیلت ثابت ہوئی۔	۱۴۸	دھوکہ دہا ۸۳ حضرت علیؓ کے فضائل ہی ایسے تھے کہ لوگ اُن کی الوہیت کے قائل ہوئے۔
۱۹۱	دھوکہ دہا ۱۰۰ سنیوں کی روایت سے بلالؓ کی آنحضرتؐ پر فضیلت۔	۱۵۱	دھوکہ دہا ۸۴ سنی ائمہ اور بزرگوار تو مذہب اختیار کرتے ہیں اہل بیت کا نہیں۔
۱۹۳	دھوکہ دہا ۱۰۱ سنیوں کی روایت سے حضرت عمرؓ کی فضیلت آنحضرتؐ پر	۱۵۲	دھوکہ دہا ۸۵ اہل سنت کی کتب سے طعن صحابہ کی ناکام کوشش۔
۱۹۴	دھوکہ دہا ۱۰۲ اہل سنت کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔	۱۵۳	دھوکہ دہا ۸۶ اپنی جعلی روایتوں سے انبیاء پر حضرت علیؓ کی فضیلت ثابت کرتے ہیں۔
۱۹۵	دھوکہ دہا ۱۰۳ اہل سنت کے نزدیک کھال پر نماز درست ہے۔	۱۵۴	دھوکہ دہا ۸۷ شریعتیں چھ ہوئیں اور ہر نبی کے بارہ دسی ہوئے۔
۱۹۶	دھوکہ دہا ۱۰۴ اہل سنت شطرنج کو جائز کہتے ہیں۔	۱۵۵	دھوکہ دہا ۸۸ اہل سنت خدا کو دیکھنے کے قائل ہیں۔
۱۹۷	دھوکہ دہا ۱۰۵ اہل سنت کے نزدیک گانا بجانا جائز ہے۔	۱۵۶	دھوکہ دہا ۸۹ عذاب قبر صرف سنیوں کو ہوگا۔
۱۹۸	دھوکہ دہا ۱۰۶ اکثر شیعہ ائمہ کے پاس جاتے تاکہ ان سے روایتیں لی جائیں۔	۱۵۷	دھوکہ دہا ۹۰ سنی اہل بیت کے دشمنوں کو دوست رکھتے ہیں۔
۱۹۹	دھوکہ دہا ۱۰۷ سب سے بڑا ان کا دھوکہ تفتیہ ہے۔	۱۵۸	دھوکہ دہا ۹۱ اہل سنت امامت کے سلسلہ میں بزدلی کو ترجیح دیتے ہیں۔
۱۹۹	باب ۳: شیعوں کے اسلاف کے حالات	۱۵۹	دھوکہ دہا ۹۲ اہل سنت خدا کو محراب جسم و مجبور مانتے ہیں۔
۲۰۰	طبقہ ۱ وہ لوگ جو عبد اللہ بن سبا کے ساتھی ہیں۔	۱۶۰	دھوکہ دہا ۹۳ اہل سنت خدا کو محراب جسم و مجبور مانتے ہیں۔
"	طبقہ ۲ حضرت علیؓ کے وہ ساتھی جو بظاہر غلط مگر منافق تھے۔	۱۶۱	دھوکہ دہا ۹۴ اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نبی کے گھر گڑیاں کھیلتی تھیں۔
۲۰۶	طبقہ ۳ جنہوں نے حضرت حسنؓ سے بیعت کر کے بعد میں غداری کی	۱۶۲	دھوکہ دہا ۹۵ اہل سنت کی روایت ہے کہ حضورؐ نے عائشہؓ کو تماشا دکھایا۔
۲۰۸	طبقہ ۴ وہ لوگ جنہوں نے حضرت حسینؓ کو کوفہ بلا کر اُن کو غدادی۔	۱۶۳	دھوکہ دہا ۹۶ سنیوں کی روایت کہ حضرت موسیٰؑ نے عزرائیل کو عقہ پڑھا۔
"	طبقہ ۵ وہ گروہ جس نے امام زین العابدینؑ سے انحراف کر کے مختار کو نبی مانا۔	۱۶۴	دھوکہ دہا ۹۷ رسول اللہؐ کو اپنی نبوت میں شک تھا۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۰	ہمیشگی میں تنہائی کے مخالف ہے۔ ۱۔	۲۰۸	{ طبقہ ملا جنہوں نے حضرت زید کو ناہیوں کے قبضہ میں چھوڑ دیا۔
۲۶۱	{ عقیدہ ۵۵ اللہ تعالیٰ زندگی اور علم اور صفات کے ساتھ زندہ ہے شیعہ اس کے مخالف ہیں۔	۲۰۹	{ طبقہ ۲۰۸ کی شاگردی کے مدعی ہیں جبکہ ائمہ ان کو کافر کہتے ہیں۔
"	{ عقیدہ ۵۶ اللہ تعالیٰ قدیم ہے مگر شیعہ اس کے بھی مخالف ہیں۔	۲۱۲	{ شیعہ علماء اور ان کی کتابیں۔
۲۶۲	{ عقیدہ ۵۷ اسماعیلی اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار کے مخالف ہیں۔	۲۲۸	{ (فائدہ) اشاعہ شریعہ کی چار کتب جن کو وہ اصح المکتب کہتے ہیں۔
"	{ عقیدہ ۵۸ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے لیکن امامیہ اس کے مخالف ہیں۔	۲۳۰	باب ۵: شیعوں کے اقسام حدیث اور اسناد
"	{ عقیدہ ۵۹ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اس کی پیدائش سے پہلے جانتا ہے شیعہ اس کے مخالف ہیں۔	۲۴۰	شیعوں کے مجہول راوی۔
۲۶۳	{ عقیدہ ۶۰ موجودہ اصلی قرآن کو شیعہ اصلی نہیں مانتے۔	۲۴۸	تمتہ باب۔ شیعوں کے بقیہ دلائل۔
"	{ عقیدہ ۶۱ اسماعیلی اللہ تعالیٰ کے ارادہ قدیم کے مخالف ہیں۔	۲۴۹	مذہب شیعہ میں خبر موافق ناقابل اعتبار ہے۔
۲۶۸	{ عقیدہ ۶۲ اللہ تعالیٰ جسم اور طول عرض سے ماوراء ہے شیعہ اس کے مخالف ہیں۔	۲۵۰	اجماع شیعہ کا حال۔
۲۶۹	{ عقیدہ ۶۳ اللہ تعالیٰ لامرکان ہے شیعہ اس کے مخالف ہیں۔	۲۵۱	عقل شیعہ مذہب میں حجت نہیں۔
۲۸۳	{ عقیدہ ۶۴ شیعہ غلام اللہ تعالیٰ کے حلول و مراتب کے قائل ہیں۔	"	فائدہ جلیلہ۔ عقلی دلائل و براہین (دوسرا اہم فائدہ) قرآن پاک اور اہل بیت سے شیعوں کی مخالفت۔
۲۸۵	{ عقیدہ ۶۵ اللہ امرض سے متصف نہیں شیعہ اس کے خلاف ہیں۔	۲۵۶	{ وہ معائب جو شیعہ اہل بیت پر لگاتے ہیں۔
"	{ عقیدہ ۶۶ اللہ کی ذات کسی چیز میں چھپ نہیں سکتی۔ شیعہ اس کے خلاف ہیں۔	۲۵۹	{ ذیلی فائدہ۔ وہ روایات جو شیعہ ائمہ سے لائے اور امام زادوں نے ان کی تکذیب کی۔
۲۸۶	{ عقیدہ ۶۷ اللہ تعالیٰ کے لئے بدار کی نسبت جائز نہیں۔ شیعہ اس کے خلاف ہیں۔	۲۶۵	
		۲۶۹	باب ۵: مسائل الہیات
		۲۶۹	عقیدہ ۷۱ معرفت الہی میں شیعہ سنی اختلاف۔
		۲۷۰	{ عقیدہ ۷۲ اسماعیلیہ فرقہ اس کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے۔
		"	{ عقیدہ ۷۳ شیعوں کے مختلف فرقے اللہ کی وحدانیت کے خلاف ہیں۔
		"	{ عقیدہ ۷۴ شیعوں کے بعض فرقے اللہ تعالیٰ کی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲۲	{ عقیدہ ۹ بعض شیعہ یہ کہتے ہیں علی بن ابی طالب خاتم النبیین ہیں۔	۲۹۲	{ عقیدہ ۱۵۔ اللہ تعالیٰ کسی کے کفر پر راضی نہیں۔ لیکن شیعہ مخالف ہیں۔
۳۳۶	{ عقیدہ ۱۰ اللہ کو پوشیدہ طور پر خاتم النبیین بتاتے ہیں	۲۹۷	{ عقیدہ ۱۶ اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں لیکن شیعہ اس کے خلاف ہیں۔
۳۳۸	{ عقیدہ ۱۱ معراج کے متعلق عقائد	"	{ عقیدہ ۲۰ اللہ تعالیٰ ضرور شرک خالق ہے شیعہ اس کے خلاف ہیں۔
۳۴۰	{ عقیدہ ۱۲ نص قرآنی و حدیث کے ظاہر و غیر ظاہر پر محمول ہونا۔	۳۰۸	{ عقیدہ ۲۱ بندہ کو خدا سے مکانی یا جسمانی قرب ممکن نہیں۔ شیعہ مخالف ہیں۔
۳۴۱	{ عقیدہ ۱۳ حضرت علیؑ پر درجی آتی تھی	"	{ عقیدہ ۲۲ مومنین کو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا حاصل ہوگا۔ شیعہ اس کے مخالف ہیں۔
"	{ عقیدہ ۱۴ پیغمبر کے بعد شرعی احکام امام موقوف کر سکتا ہے۔		
۳۴۲	{ عقیدہ ۱۵ حکم شرعی کو امام منسوخ یا تبدیل کر سکتا ہے۔		
۳۴۳	باب: امامت کا بیان	۳۱۰	{ عقیدہ ۱۶ پیغمبروں کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔
۳۴۳	{ مسئلہ ۱ در اختلافی مسائل	۳۱۲	{ عقیدہ ۱۷ ائمہ تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔
۳۵۲	{ مسئلہ ۲ امام کا ظاہر ہونا شرط ہے لیکن شیعہ انکاری ہیں۔	۳۲۳	{ عقیدہ ۱۸ انبیاء گناہ سے معصوم ہیں۔ شیعہ اس کے خلاف ہیں۔
۳۵۳	{ مسئلہ ۳ امام کا معصوم ہونا ضروری نہیں لیکن شیعہ ضروری سمجھتے ہیں۔	۳۲۵	{ عقیدہ ۱۹ اللہ تعالیٰ دروغ و بہتان سے پاک ہے لیکن شیعہ اس کے خلاف ہیں۔
۳۵۶	{ مسئلہ ۴ یہ ضروری نہیں کہ تقریباً امام پر اللہ کا حکم صریح آئے لیکن شیعہ ضروری کہتے ہیں	"	{ عقیدہ ۲۰ انبیاء کے لئے نبوت پہلے یا بعد واجبات ایمان کا علم ضروری نہیں ہے
۳۵۷	{ مسئلہ ۵ امام کے لئے ضروری نہیں کہ اپنے ساتھیوں سے افضل ہو۔ لیکن شیعہ منکر ہیں۔	۳۲۷	{ عقیدہ ۲۱ پیغمبروں سے ایسے گناہوں کا صدور ہوتا ہے جن کا انجام ہلاکت ہے۔
"	{ مسئلہ ۶ امام بلا فضل صدیق اکبرؑ نہیں شیعہ حضرت علیؑ کو کہتے ہیں۔	۳۲۹	{ عقیدہ ۲۲ حضرت آدمؑ آئمہ سے بغض رکھتے تھے۔
۳۹۳	{ بحث امامت بلا فضل کے سلسلے میں انکے دلائل کی اقسام	۳۳۳	{ عقیدہ ۲۳ بعض انبیاء نے رسالت قبول کرنے سے عذر کیا ہے۔
۳۹۵	{ امامت بلا فضل کے سلسلے میں قرآن سے ان کے دلائل کاراستہ لالات		

امامت بلا فصل کے سلسلہ میں اہل امامیت

۴۱۸

حدیث ۱۸ غدیر خم ہے جس کا بڑا چرچا ہے۔

حدیث ۱۹ جس کا مفہوم یہ ہے تم میرے لئے ایسے ہر جیسے ہارون کے لئے موسیٰ

حدیث ۲۰ اِنَّمَا عَلَيَّ الدِّينُ وَآلِئَا مِنْ بَعْدِي

حدیث ۲۱ حضرت انس بن مالک کی حدیث ہے جو حدیث طبر کے نام سے مشہور ہے

حدیث ۲۲ حضرت بابر کے نام سے امام مدینہ العلم علی بابہا

حدیث ۲۳ من اراد ان ينظر الى آدم في مله اذ

حدیث ۲۴ عن ناصب مدینا اخلا فتم مہر کاخ

حدیث ۲۵ انا وصی نوراً بین یدین اللہ

حدیث ۲۶ لا تعین الراية غدا - رجلاً حیداً رسولاً

حدیث ۲۷ ارحم اللہ مدینا اللہم ادر الحق معہ حیث دار

حدیث ۲۸ انک تقابل علی تادیل القرآن

حدیث ۲۹ الی تارک فیکم الثقلین

امامت بلا فصل کے متعلق شیعوں کے چھ عقلی دلائل

۴۲۵

پہلی دلیل - امام کے لئے معصوم ہونا ضروری

اور واجب ہے۔

دوسری دلیل - امام وہ ہے جس نے کبھی کفر نہ کیا ہو۔

تیسری دلیل - امام کی امامت نفس سے ثابت ہو۔

چوتھی دلیل - حضرت علیؑ ہمیشہ خلفائے ثلاثہ کے شاکی رہے۔

پانچویں دلیل - حضرت علیؑ نے دعویٰ امامت کے ساتھ معجزات بھی دکھائے۔

چھٹی دلیل - حضرت علیؑ کے متعلق

کسی نے موجب لعن

روایت نہیں کی ہے۔

امامت کی بحث کا خاتمہ

باب ۸: متعلق آخرت (امور معاویہ میں کتا
و عمرت سے شیعہ مخالفت

۴۶۵

عقیدہ ۱ اکثر شیعہ فرتے اس کے نائل

ہیں کہ ہم کینے معاویہ نہیں اور

ارواح کا ٹھکانا بھی مرنے والا ہے۔

عقیدہ ۲ شیعہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ پر

حشر و نشر عقلاً واجب ہے۔

عقیدہ ۳ شیعوں کے اکثر فرتے عذاب

قبر کے منکر ہیں۔

عقیدہ ۴ قیامت کے دن سوال جواب

سزا و جزا کے بھی منکر ہیں۔

عقیدہ ۵ شیعوں کے اکثر فرتے تاریخ کے قائل ہیں۔

عقیدہ ۶ شیعوں کے قیامت سے پہلے ائمہ کے

دنیا میں بولنے کے قائل ہیں۔

عقیدہ ۷ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ آخرت میں

ان کو عذاب نہ ہو گا۔ چاہے گناہ

کبیرہ ہی کیوں نہ کیا ہو۔

باب ۹: احکام فقہیہ: جن میں شیعوں
نے ثقلین سے اختلاف کیا ہے

۴۹۲

صحابہ کی تکفیر کرنا۔

حضرت عمرؓ پر لعنت کو ذکر پر فضیلت دینا۔

نماز پنجگانہ کے بعد کبار صحابہ پر

لعنت کو واجب قرار دینا۔

عید غدیر جو ۱۸ رذی الحجہ کو مناتے ہیں۔

ایک اور نئی عید یعنی قائل عمرؓ کی عید

جو ۹ ربیع الاول کو مناتے ہیں۔

موسیوں کی عید نوروز کی تعظیم کرنا

۴۲۵

۴۲۶

۴۲۸

۴۲۹

۴۳۰

۴۳۱

۴۳۲

۴۳۳

۴۳۴

۴۳۵

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	باب : خلفاء ثلاثہ و کبار صحابہ پر مطاعن اور ان کے جواب	۴۹۴	ظالم بادشاہوں کے لئے سجدہ کو جائز قرار دینا۔
		"	(۱) نبس پانی کو پاک قرار دیتے ہیں۔
		۴۹۵	(۲) شراب کو پاک قرار دینا۔
۵۱۶	حضرت ابو بکر صدیقؓ پر مطاعن مع جواب	"	(۳) مذی کو شیعہ پاک کہتے ہیں۔
"	اعتراف صدیق اکبر ممبر پر تھے تو حسینؓ	"	(۴) شیعہ کہتے ہیں کہ مذی نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا
"	نے کہا ہمارے نانا کے ممبر سے اتر جاؤ۔	"	(۵) یہودی کو بھی پاک کہتے ہیں اور
۵۱۷	اعتراف ۱۲ حضرت خالد نے بجا قتل کیا تو	۴۹۶	اس سے وضو بھی نہیں ٹوٹتا۔
"	حضرت صدیق نے قصاص لیا۔	"	(۶) پاک ناپاکی وضو غسل و تیمم میں ان کا اختلاف
۵۲۰	اعتراف ۱۳ حضرت صدیق نے لشکر اسامہ	۴۹۷	غزاکے مسائل میں شیعوں کا اختلاف
"	میں تاخیر کی۔	۴۹۹	میت پر زور و ماتم کرنے کا جائز کہتے ہیں۔
۵۲۲	اعتراف ۱۴ آنحضرتؐ نے ابو بکرؓ کو کبھی دینی	۵۰۰	مسائل روزہ و اعتکاف ۔
"	معاملات سپرد نہیں کئے۔	"	زکوٰۃ کے مسائل میں اختلاف
۵۲۶	اعتراف ۱۵ ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ	۵۰۱	مسائل حج میں شیعوں کا اختلاف
"	کو خلیفہ بنایا	۵۰۲	مسائل جہاد میں اختلاف
"	اعتراف ۱۶ ابو بکرؓ پر ابو العاصؓ و	"	مسائل نکاح میں اختلاف
"	اسامہؓ کو امیر بنایا۔	۵۰۳	مسائل عبادت اور ذہن میں اختلاف
۵۲۷	اعتراف ۱۷ ابو بکرؓ نے آنحضرتؐ کی مخالفت	"	مسائل قرض و غصب و امانت و عیالت کا اختلاف
"	کرتے ہوئے عمرؓ کو خلیفہ بنایا	۵۰۴	اجارہ، ہبہ، صدقہ اور وقف کے مسائل
۵۲۸	اعتراف ۱۸ ابو بکرؓ کا قول ہے کہ میرے	"	میں اختلاف
"	پچھے ایک شیطان لگا ہوا ہے	۵۰۵	مسائل نکاح میں اختلاف
۵۳۱	اعتراف ۱۹ ابو بکرؓ کی بیعت بغیر غور و فکر	"	مسائل متعہ، متعہ کو جائز کہتے ہیں۔
"	اچانک ہوئی۔	۵۰۶	مسائل رضاع و طلاق میں اختلاف۔
۵۳۲	اعتراف ۲۰ ابو بکرؓ نے کہا کہ علیؓ کے ہوتے	۵۱۰	مسائل عتاق و ظہار و لعان میں اختلاف۔
"	میں بہتر نہیں۔	۵۱۱	ایمان و نذور کے مسائل میں اختلاف۔
۵۳۳	اعتراف ۲۱ ابو بکرؓ کو اپنا پیغامبر بنا کر	۵۱۲	مسائل قعدا و عوی و شہادت میں اختلاف۔
"	پھر آنحضرتؐ نے منہ کر دیا۔	۵۱۳	مسائل صید و ذبائح و طعام میں اختلاف۔
۵۳۷	اعتراف ۲۲ ابو بکرؓ نے حضرت فاطمہؓ کو	۵۱۴	فرائض و وصایا۔
"	درہ نہیں دیا۔	۵۱۵	حدود۔ رجم وغیرہ مسائل میں اختلاف

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۴۳	(مطالعہ عثمانؓ) مع جواب	۵۴۴	اعترافِ عثمانؓ ابو بکرؓ نے آنحضرتؐ کی وصیت کے باوجود حضرت فاطمہؑ کو ترک دینے سے منع کر دیا۔
۵۴۸	اعترافِ عثمانؓ مروان کے باپ کو آنحضرتؐ نے مدینہ سے نکال دیا تھا لیکن عثمانؓ نے واپس بلا لیا۔	۵۵۰	اعترافِ عثمانؓ ابو بکرؓ کو شرعی مسائل کا بھی علم نہ تھا
۵۴۹	اعترافِ عثمانؓ نے اپنے اقربا کو بہت مال سے نوازا۔	۵۵۲	(مطالعہ عمرؓ) مع جواب
۴۰۵	اعترافِ عثمانؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کو معزول کیا۔	۵۵۲	اعترافِ واقعہ درقلاس والا طعن مع جوابات
۴۰۷	(قائدِ جلیلہ) مطالعہ عثمانؓ اکثر اصول شیعہ کے بھی خلاف ہیں۔	۵۶۸	اعترافِ عثمانؓ نے حضرت فاطمہؑ کا مکان جلا دیا اور ایسی ضرب لگائی جس سے آپؑ کا حمل ضائع ہو گیا
۴۰۹	اعترافِ عثمانؓ نے عبداللہ ابن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کا وظیفہ جو مقرر تھا وہ بند کر دیا۔	۵۷۰	اعترافِ عثمانؓ نے آنحضرتؐ کے وصال کا انکار کیا
۴۱۹	اعترافِ عثمانؓ نے عبداللہ بن عمرؓ سے قصاص نہ لیا۔	۵۷۱	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ شرعی مسائل سے ناواقف تھے
۴۲۳	اعترافِ عثمانؓ نے منیٰ میں قصر نہیں کیا بلکہ چار رکعت پڑھیں۔	۵۷۵	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ نے سو کوڑوں کی جگہ سو شاخہ لکڑی مارنے کا حکم دیا
۴۲۴	اعترافِ عثمانؓ نے بقیع کو جو مدینہ کی چراگاہ تھی قرق کیا۔	۵۷۷	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ نے چار گواہوں کے باوجود مغیرہ بن شعبہؓ پر حد زنا کو ترک کر دیا۔
"	اعترافِ عثمانؓ نے اپنے دوستوں کو جاگیریں دیں۔	۵۷۸	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ کو ہر کے مسئلے میں ایک عورت نے قائل کر دیا۔
۴۲۵	اعترافِ عثمانؓ نے قتل پر تمام صحابہؓ خوش تھے۔	۵۸۱	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ نے خمس میں سے اہلبیت کو حصہ نہ دیا۔
		۵۸۲	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ نے بہت سی نئی نئی باتیں پیدا کیں۔
		۵۸۵	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ نے دادا کی میراث میں ایک سو فیصد نافذ کئے۔
		۵۸۶	اعترافِ عثمانؓ عمرؓ نے عورتوں سے متہ کی ممانعت کی۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	سے کسی قریشی جوان کا شکار کروں گی (عام صحابہ کرامؓ پر اعتراض) مع جواب		مطالعہ عن عائشہ صدیقہؓ
۶۴۲	اعتراض ۱۷ صحابہؓ نے دو مرتبہ گناہ کبیرہ کیا	۶۳۰	اعتراض ۱۷ عائشہؓ اللہ کے حکم کے خلاف دینہ سے مکہ و بصرہ گئیں۔
۶۴۳	اعتراض ۱۸ صحابہؓ نے خطبہ میں آنحضرتؐ کو تنہا چھوڑ گئے۔	۶۳۲	اعتراض ۱۸ عائشہؓ نے خونِ عثمانؓ کے قصاص کے لئے سفر کیا۔
"	اعتراض ۱۹ اہل سنت کی صحاح میں یہ روایت سے سیحانہ بحال بت امتی فیتوخذہم ذات الشمال نا قول اصحابی۔	۶۳۳	اعتراض ۱۹ عائشہؓ نے آنحضرتؐ معلم کی مخالفت کی۔
۶۴۷	اعتراض ۲۰ آنحضرتؐ نے جب قرطاس طلب کیا تو حیلے حوالے کئے۔	۶۳۴	اعتراض ۲۰ عائشہؓ کے لشکر کرنے بصرہ کے بیت المال کو لوٹ لیا۔
۶۴۸	اعتراض ۲۱ صحابہؓ آنحضرتؐ کے حکم کی تعمیل سے جی چراتے تھے۔	۶۳۵	اعتراض ۲۱ عائشہؓ نے آنحضرتؐ کا راز افشا کیا۔
۶۵۰	اعتراض ۲۲ میں تمہاری کمر کپڑا کر آگ سے کھینچتا ہوں اور تم گرتے ہی پلے جاتے ہو۔	۶۳۸	اعتراض ۲۲ عائشہؓ کا قول ہے کہ میں نے حضرت غدیرؓ سے غیرت کھائی۔
۶۵۰	اعتراض ۲۳ آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جب تم پر روم و فارس کے خزانے کھل جائیں گے تو حدودِ حرم کر لگے۔	۶۳۸	اعتراض ۲۳ عائشہؓ کا قول ہے کہ میں نے علیؓ سے لڑائی کی کہ ارزو کرتی ہوں کہ میں بھولی بھری ہوتی۔
۶۵۱	اعتراض ۲۴ صحابہؓ آنحضرتؐ کے ارشاد کے برخلاف علیؓ اور غازیؓ کا ایذا پر متفق ہو گئے تھے۔	۶۳۸	اعتراض ۲۴ عائشہؓ نے پیغمبر کے حجرہ میں اپنے والد اور ان کے دوست عمروؓ کو وہاں دفن کرایا۔
۶۵۹	اعتراض ۲۵ رسول اللہؐ نے فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی جب تک میری امت اگلی اُمّتوں کی باتیں اختیار نہ کر لے۔	۶۴۰	اعتراض ۲۵ آنحضرتؐ نے حجرہ عائشہؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ فتنہ وہاں ہے۔
۶۶۰	اعتراض ۲۶ آنحضرتؐ نے عائشہؓ سے فرمایا کہ تیری قوم کا ڈر نہ ہوتا تو کعبہ کو بناد ابراہیمی پر بناتا۔	۱۳۱	اعتراض ۲۶ عائشہؓ نے اپنی پالی سوئی ایک لڑکی کا شکار کر کے کہا کہ اس

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۱۴	ہفتہ ۱۱ موجودہ قرآن کو تحریف شدہ کہنا	۷۱۱	باب خصوصیات مذہب شیعہ
۷۱۵	ہفتہ ۱۲ واسطۃ الارض سے حضرت علیؑ مراد ہیں	۷۱۱	فصل ۱ شیعوں کے پچیس قسم کے ادیان
۷۱۵	ہفتہ ۱۳ عورتوں کی شرکاء ہوں کو حلال سمجھنا	۷۱۲	فصل ۲ شیعوں کے پچیس تعصبات کی تفصیل
۷۱۵	ہفتہ ۱۴ عورتوں سے منع کرنا بہترین عبادت ہے	۷۱۳	فصل ۳ شیعوں کے تینیس ہفتوات کا ذکر
۷۱۶	(خاتمہ باب خلاصہ حساب)	۷۱۴	ہفتہ ۱۵ تلبیہ کی حقیقت
۷۱۶	کے سلسلہ میں وہ بارہ آیات قرآنی جن سے مذہب اہل سنت کی حقانیت ثابت ہے۔	۷۱۵	فائدہ عظمیٰ
۷۱۶	باب ۱۲ - تولا اور تبرا (محبت و عداوت)	۷۱۵	ہفتہ ۱۶ شیخین منافق تھے
۷۱۶	مقدمہ ۱۱ اخیاعت و عداوت میں فرق	۷۱۶	ہفتہ ۱۷ شیخین اصحاب عقبہ میں سے تھے
۷۱۶	مقدمہ ۱۲ محبت و عداوت کبھی جمع بھی ہو سکتے ہیں	۷۱۶	ہفتہ ۱۸ امام کا وجود محض لطف ہے
۷۱۶	مقدمہ ۱۳ عداوت مومنین ایمان میں خلل انداز نہیں	۷۱۶	ہفتہ ۱۹ حضرت علیؑ نہیں فدائی اوصاف تھے
۷۱۶	مقدمہ ۱۴ دینی عداوت کفر ہے اسلئے ہر کافر دشمن ہے	۷۱۶	ہفتہ ۲۰ اللہ نے تمام رسولوں کو حضرت علیؑ کی ولایت کے لئے بھیجا تھا
۷۱۶	مقدمہ ۱۵ مومن و کافر کے ساتھ محبت و عداوت کے مختلف دہے	۷۱۶	ہفتہ ۲۱ قرآن مجید کی تحریف کرتے ہیں
۷۱۶	مقدمہ ۱۶ فریقین اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام و ازواج مطہرات سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جو کفر کا باعث ہو۔	۷۱۶	ہفتہ ۲۲ روز جزا کے حاکم و مالک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت علیؑ ہوں گے
۷۱۶	مقدمہ ۱۷ ایماندار اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو اس پر لعن جائز نہیں	۷۱۶	ہفتہ ۲۳ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؑ کے قتل کی تدبیر کی
۷۱۶	مقدمہ ۱۸ بزرگوں میں اختلاف کوئی عیب نہیں ہے	۷۱۶	ہفتہ ۲۴ لعنت ملامت کرنے کو کو کر اللہ سے افضل کہتے ہیں
۷۱۶	مقدمہ ۱۹ اکثر امور عجیبہ کے باعث طے شدہ اصولوں سے غفلت طاری ہو جاتی ہے	۷۱۶	ہفتہ ۲۵ اللہ تعالیٰ کا کرنا کاتبین کو حکم
۷۱۶	مقدمہ ۲۰ اگر خاص فضیلت نہ ہو تو فضیلت عام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔	۷۱۶	ہفتہ ۲۶ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر مسرت تھے
۷۱۶	مصنف کا حرف آخر	۷۱۶	ہفتہ ۲۷ حضرت عمرؓ خطاب کے صلی لہ کے نہ تھے
	فہرست ختم شد	۷۱۶	ہفتہ ۲۸ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو ہر سال پھانسی دی جاتی ہے
		۷۱۶	ہفتہ ۲۹ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا تعلق ہے
		۷۱۶	ہفتہ ۳۰ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بغض
		۷۱۶	ہفتہ ۳۱ زمین کا چھتہ معصوم کے بدن سے چھوئے وہ کعبہ سے بہتر ہے۔
		۷۱۶	ہفتہ ۳۲ حقیقی صاحب امر ہمدی منظور ہیں
		۷۱۶	ہفتہ ۳۳ خاص وقت کے علاوہ جہاد کو غلط سمجھنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَبِیَاحِیَہِ مُصَنَّف

از حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى خصوصاً على سيد الومى صاحب قاب
قوسين او اذنى بدم الدجاشمس الضعفى نور المهدى محمد بن المجتبى وعلى اله واصحابه
ذوى الدرجات العلىٰ

حافظ غلام عظیم حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا تاریخی نام، بن شیخ قطب الدین احمد (المقلب بشاہ ولی اللہ) بن شیخ ابوالغنی
دشاہ عبدالرحیمؒ دہلوی، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی مغفرت فرمائے اور صالح و نیک بندوں میں ان کا حشر فرمائے۔ فرماتے
ہیں کہ :-

یہ ایک کتاب ہے جو شیعوں کے حالات کی پوری وضاحت کرتی اور یہ بتاتی ہے کہ ان کے اصول کیا ہیں۔ ان
کے مذہب کی بنیاد کیا ہے؟ اور دوسروں کو اپنے مذہب کی دعوت دینے کا طریقہ کیا ہے! ان کے اسلاف کون تھے! ان
کی روایتوں اور احادیث کے راوی کون اور کس حیثیت کے لوگ تھے!

ان باتوں کے علاوہ اس کتاب میں ان کے ان عقائد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو وہ الوہیت، نبوت، امامت،
اور معاد کے متعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ان مسائل کو فقہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ جن کی اصل ملت حنفیہ سے معنی اور پوشیدہ ہے
اسی کے ساتھ وہ اقوال و افعال بھی زیر بحث لائے گئے ہیں جو یہ حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) از وارج مطہراتؒ اور
اہل بیت نبوی رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں کہتے ہیں۔

میں نے اس کتاب کا نام تحفہ اثنا عشریہ اس مناسبت سے رکھا ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے اختتام پر یہ کتاب منظر
وجود پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔

ان گذشتہ صدیوں میں شیعہ حضرات بالخصوص فرقہ امامیہ اثنا عشریہ، اہل سنت کے مقابلہ میں گفتگو اور مناظرہ بازی کے
دوران جو باتیں کہتے رہے ہیں مع اسباب و علل ان کا بیشتر حصہ اس کتاب میں درج کر دیا گیا ہے اور جو حصہ نظر انداز کر
دیا گیا ہے اس کا اندازہ درج شدہ حصہ سے واضح ہو جائے گا۔

اس کتاب کو نصیحة المؤمنین و فضیحة الشیاطین کا لقب دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تالیف کی غرض اور ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ جس دور سے ہم گذر رہے اور جس زمانہ میں
ہم زندگی گزار رہے ہیں اس میں اثنا عشریہ کا غلبہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ مشکل کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں کوئی
نہ کوئی یہ مذہب اختیار نہ کر چکا ہو۔ یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ لیکن ان میں سے اکثریت چونکہ اپنے علم تاریخ اور مسائل
مذہب سے کوری ہے۔ اور اپنے اسلاف اور بزرگوں کے حالات سے یکسر بے خبر اور غافل ہے۔ اس لئے جب اہلسنت
کی مجلسوں میں گفتگو کی نوبت آتی ہے تو وہ بے ربط و بے محل اور لایعنی ہوتی ہے۔

ان حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کتاب کو مرتب کیا گیا، تاکہ مناظرہ اور مذاکرہ کے وقت یہ لوگ ہادۂ انصاف سے نہ ہٹ جائیں اور بے علمی کے سبب اپنے ہی اصولوں سے انحراف نہ کرنے لگیں، اور امور واقعی و حقیقی میں شک و تردد کو جوگ نہ دیں۔

اس کتاب میں اس امر کی پابندی کی گئی ہے کہ شیعہ مذہب یا ان کے اصول اور ان الزامات کے بیان و حوالہ کے وقت جو ان سے منسوب کیے جائیں ان کی معتبر کتب کے حوالہ کے سوا کسی اور کتاب سے حوالے نہ دیے جائیں اور قرین انصاف یہی ہے کہ شیعہ حضرات کی طرف سے اہل سنت و اہل علم پر جو الزامات عائد کیے جائیں وہ بھی اہل سنت کی روایات کے مطابق ہوں ورنہ انصاف نہیں ہو سکے گا اور فریقین میں سے ہر ایک باہم تعصب و عناد سے ایک دوسرے کو مستہم کر دے گا۔ اور باہم بھروسہ و اعتماد کی صورت پیدا نہ ہوگی۔

اس کتاب میں جو تاریخی واقعات یا گذشتہ قصص و حکایات بیان کی گئی ہیں وہ بھی صرف وہی ہیں جن پر ہر دو فریق متفق ہیں۔ اور تفسیر قرآن مجید اگرچہ ہر دو فریق کی تقریباً یکساں ہیں تاہم حوالے صرف شیعہ تفسیر ہی سے دیے گئے ہیں تاکہ کسی کو اتہام لگانے کا گمان نہ ہو۔ و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

اس کتاب کے ناظرین اور سامعین سے التماس ہے کہ وہ مطالعہ کے وقت درج ذیل چند امور کو ملحوظ خاطر رکھیں۔
اول :- اہل بیت عظام، یا اصحاب و ازواج مطہرات خیر الانام، کی شان میں جو کچھ طعن و تشنیع یا انبیاء و ملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نقائص سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز اس کتاب میں صراحتاً یا ضمناً درج ہوئی ہو اس سے مصنف کو بری الذمہ سمجھیں، کیونکہ وہ ہزار، لاکھ بار ایسے نازیبا و ناشائستہ الفاظ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے! اور ایسی بے ادبی اور ہرزہ سرائی سے ہزار بار اپنی ہیزاری کا اظہار کرتا ہے لیکن چونکہ سابقہ ایسے فرقہ سے ہے کہ یہ باتیں اس کے اصول مذہب میں شامل ہیں اس لئے نقل کفر کفر نباشد کے مصداق، انہیں کی کہی ہوئی باتیں مجبوراً نقل کی گئی ہیں۔

دوم :- جہاں کہیں کلام کو مطلق چھوڑ کر، مذہب شیعہ کا بیان شروع کر دیا ہے یا جہاں اہلسنت کے مذاق کے مطابق کلام کو مقید لاکر ان کی پیروی کہے تو ایسے موقعوں پر یہ خیال نہ کیا جائے کہ کلام مطلق ہمارے مذہب پر مبنی ہے۔ حاشا وکلا۔

سوم :- ہماری یہ کتاب اسی شخص کے لئے مفید ہو سکتی ہے جو اہل سنت و اہل علم اور شیعہ مذہب ہر دو کے اصولی و فروعی احکامات پر پوری پوری مہارت و دسترس رکھتا ہو اور جو ایک مذہب کو بانٹتا ہو اور دوسرے کی داعی سی شدہ رکھتا ہو وہ اس کتاب سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

ہاں جو شخص مذہب شیعہ پر تو عبور رکھتا ہو مگر مذہب اہل سنت سے چنداں واقف نہ ہو اس کے لئے بھی یہ کتاب نافع اور مفید ثابت ہوگی، البتہ جو شخص مذہب شیعہ سے تو لحاظ، واقف نہ ہو اور مذہب اہل سنت پر عبور رکھتا ہو تو اسے بھی چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب میں گفتگو اور کلام کی بنیاد شیعہ اصول اور روایات پر رکھی گئی ہے۔
چہارم :- اس کتاب میں شیعوں کی معتبر کتابوں سے جتنے حوالے بھی دیئے گئے ہیں ان میں افتراء، کذب اور بہتان کا شائبہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ سارے کے سارے حوالے شیعہ مذہب کی معتبر اور مشہور کتابوں کے ہیں۔ شک و شبہ

میں پڑ کر نادانی کے ارتکاب کے بجائے ہمارے حوالہ کا ان کی اصل کتابوں سے موازنہ کر لے۔ اور اس بات کا خوف نہ کرے کہ نقل و حوالہ کی صحت اگر ثابت ہو گئی تو اسے اس کی پیروی لازمی ہوگی۔

پہنچم :- اپنے دل میں کسی تاویل کے احتمال کو جگہ نہ دے اور یہ نہ سوچے کہ گویہ سب کچھ شیعوں کی معتبر کتابوں میں ہے لیکن ممکن ہے ان کی کوئی ایسی تاویل کی جاسکتی ہو جس تک ہمارے ذہن کی رسائی نہ ہو پائی ہو۔ کیونکہ منافقہ کے وقت ایسی خیال آرائی اور گونگو کی کیفیت مابری اور بیچارگی کی علامت ہے اور جہالت و نادانی پر دال ہے اور مزید گفتگو سے نااہلی کی شہادت!

اس کتاب کو ”بارہ اماموں“ کی تعداد کے مطابق بارہ بابوں پر مرتب کیا گیا ہے۔
پہلا باب :- اس بیان پر مشتمل ہے کہ شیعہ مذہب کس طرح وجود میں آیا۔ اور کب اور کس طرح مختلف فرقوں میں بٹا۔
دوسرا باب :- شیعوں کے مختلف فرقوں، دھوکے بازی اور قریب کاری کے بیان میں کہ وہ دوسروں کو کس طرح قریب دیتے اور گمراہ کرتے ہیں۔

تیسرا باب :- شیعوں کے اسلاف علماء اور کتابوں کے بیان میں۔
چوتھا باب :- ان کے اخبار و روایات اور راویوں کے ذکر میں۔
پانچواں باب :- اہلیات میں۔

چھٹا باب :- انبیاء کرام علیہم السلام کے بیان میں۔
ساتواں باب :- امامت کے بیان میں۔
آٹھواں باب :- معاد کے بیان میں۔
نواں باب :- مسائل فقہیہ کے بیان میں۔

دسواں باب :- اس طعن و تشنیع کے بیان میں جو شیعہ، خلفاء راشدینؓ، ام المؤمنینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی شان میں کرتے ہیں۔

گیارہواں باب :- مذہب شیعہ کے خواص کے ذکر میں۔ اور یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اول شیعہ ادہام میں؛ فصل دوم، شیعوں کے تعصبات اور فصل سوم، شیعوں کی بے اصل و بے بنیاد باتیں۔
بارہواں باب :- قولاً و دعوتاً اور تبراک کے بیان میں۔ یہ باب دس مقدمات پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ عز و شانہ وجل سلطانہ کے فضل سے امید ہے کہ وہ ان بزرگوں کی ذوات عالیہ کی برکت سے اس رسالہ کو قبولیت سے سرفراز فرمائے گا۔
واللہ الہادی الی سبیل الرشاد والمہم ملحق والسداد۔

باب: شیعہ مذہب کی ابتدا = اور ان کا فرقوں میں بٹنا

واضح ہے کہ شیعہ مذہب ابتدائے وجود ہی سے رنگ برنگ شکلوں اور طرح طرح کے بھیسوں میں رونما ہوتا رہا ہے اور اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ شیعہ مذہب روحانی مذہب نہیں بلکہ ایک سیاسی مذہب ہے تو اس بوتلمرونی اور طرح طرح کے مہر و پ کا جواز سمجھ میں آ جاتا ہے۔

غرض یہ ہر وقت انوکھے رنگ اور نئے طرز سے دنیا کے سامنے آتا رہا۔ تا آنکہ عراق و خلاسان میں صفوی سلاطین نے اس مذہب کے اصول و قواعد کو ضبط میں لانے کی صورت نکالی اور اس کے تحفظ و ترویج میں اپنے شاہی اثرات استعمال کیے۔ اور علماء و قوت نے بہت جدوجہد کے ساتھ اس کے اصول و فروع کی کاٹ چھانٹ کر کے ایک صورت دی۔ اور اس کو کتابوں میں مدون کیا۔ تب کہیں جا کر اس کی رنگارنگی اور تغیر و تبدل بند ہوا۔ اور ایک حالت پر قرار نصیب ہوا۔ مگر چونکہ تغیر و تبدل اس مذہب کی خصوصیت بن چکا ہے۔ اس لئے بانیان مذہب شیعہ وقت و زمانہ کے مطابق اپنا خاص مذہب تراشتے رہے۔ اور کسی ایک خاص طریقہ پر قرار نہیں لیا بھی وجہ ہے کہ اس مذہب کے اصول و ارکان میں بڑا اختلاف و اختلاف پیدا ہو۔

بخلاف دوسرے مذاہب کے کہ گودہ فروع میں ایک دوسرے سے مختلف رہے مگر انہوں نے اصول کبھی نہ بدلے اور ارکان مذہب میں تبدیلی کو کبھی روا نہ رکھا۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے دور میں یہود و نصاریٰ، مجوس و مشرکین کے دیار و امصار اللہ تعالیٰ کی عنایت سے صحابہ کرام و تابعین نظام رضی اللہ عنہم کے ہاتھ پر فتح ہوئے اور کفار کو قتل و قید اور ذلت و ادبار سے سابقہ پیش آیا۔ غلامی کی ذلت برداشت کرنی پڑی اور جزیہ ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ تو اس حالت سے نکلنے کے لیے اول دو خلفائے کرامؓ کے زمانہ میں انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ میدان حرب و ضرب گرم کئے۔ مگر چونکہ نصرت الہی اسلام کی پشت پناہ تھی اس لئے بجز ذلت و خواری کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تو انہوں نے کھلے کفر کو منافقت کا ملہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور خلیفہ سوم رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان میں سے بہت سے لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے، اور در پردہ نور اسلام کو بچھانے اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد اور بغض و عناد کو ہوا دینے کی تدبیروں میں لگ گئے، ناگاہ جب تقدیر الہی سے دور خلافت ختم ہونے لگا تو مصریوں کی ایک جماعت نے خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور ان کی اطاعت سے منکر ہو گئے۔ بغاوت کی آگ بھڑکانے میں یہ گروہ سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ اس گروہ کے دیگر افراد جو اطراف و اکناف خصوصاً کوفہ اور نواحی عراق میں پھیلے ہوئے تھے موقع غنیمت جان کر مدینہ میں سمٹ آئے اور وہ سارے فتنہ انگیز بر و گرام جو سالوں سے ترتیب دیے جا رہے تھے اور جن کو دبدبہ اسلام کے سبب زبان پر لانے کی جرأت نہ کر پا رہے تھے۔ علی الاعلان ان پر عمل شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور خاتم الخلافہ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی خلافت قائم ہوئی۔ تو منافقوں کے اس گروہ نے اپنے آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلص مجبین کے رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنے آپ کو شیعیان علیؓ کہنے لگے۔ وہ اس

انقلاب پر بے مدخوش تھے! اب انہوں نے اپنے لئے حالات سازگار دیکھ کر اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔

اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ بن سبا یعنی، صنعتی تھا جو اصلاً یہودی تھا! جو یہودی ہونے کے زمانہ میں اسلام و مسلمانوں کا کھلا دشمن تھا۔ دھوکے اور فریب کاری کا ماہر، حرب و ضرب کی چالوں سے خوب واقف، فتنہ انگیزی میں یکتا، سیاسی چالوں سے آشنا، اس نے جب دیکھا کہ جو شورش خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت برپا ہو گئی تھی۔ اب ماند پڑتی جا رہی ہے اور جو فتنہ ان لوگوں نے کھڑا کر دیا تھا وہ اپنی موت آپ مرتا جا رہا ہے اور مسلمانوں میں انفرق و انتشار کا جو منصوبہ ان کے پیش نظر تھا وہ ناکام ہوا چاہتا ہے۔ تو یہودی سیاست کو بروئے کار لا کر اس نے طریقہ واردات بدل دیا۔ اور اجتماعی ہنگامہ آرائی سے ہٹ کر افراد پر توجہ دینی شروع کی۔ اور ہر فتنہ پرداز کو نئے طریق سے فریب دینا شروع کیا اور ہر ایک کی استعداد کے مطابق اس کے دل میں گمراہی کی کاشت کرنے لگا۔

سب سے پہلے خاندان نبوی کے ساتھ خلوص و محبت کا حربہ اختیار کیا اور لوگوں کو اہل بیت کی محبت پر مضبوط و پختہ رہنے کی تلقین کرنے لگا۔ خلیفہ برحق کی جانبداری، دوسروں کے مقابلہ میں ان کو ترجیح، اور ان کے مخالفین کی باتوں پر کان نہ دھرنے کی پالیسی اختیار کرنے کو کہنے لگا، اور یہ باتیں ایسی تھیں کہ ہر خاص و عام کا مطمح نظر تھیں، اور کہیں سے بھی ان کی مخالفت متوقع نہیں تھی۔ اس لئے ان کی کافی پذیرائی ہوئی، اور لوگوں میں اس کا اعتماد بہت بڑھا۔ اور اس کو مسلمانوں کا غیر خواہ سمجھا جانے لگا۔ اس کے بعد اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے افضل ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے اقرب انسان ہیں۔ کیونکہ آپ رسول اللہ کے وصی، بھائی اور داماد ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق قرآن مجید میں جو آیات فضائل ہیں یا احادیث مروی ہیں وہ سب اور اسی کے ساتھ اپنی طرف سے احادیث گھڑ گھڑ کر لوگوں میں پھیلانی شروع کیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے شاگرد اور ماننے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر ایمان لے آئے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات جڑ پکڑ گئی کہ تو اپنے بہت ہی خاص لوگوں اور اپنے بھائیوں کو نہایت رازداری کے ساتھ بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیغمبر علیہ السلام کے وصی تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے الفاظ میں ان کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تھا اور یہ کہ آپ کی خلافت قرآن مجید کی اس آیت اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ سے ظاہر ہوتی ہے۔

لیکن صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے مکر سے اور اقتدار کی خاطر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وصیت کو ضائع کر دیا اور خدا و رسول کی اطاعت نہیں کی۔ اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے حق کو تلف کر دیا۔ دنیا کے لالچ میں آکر دین بھی چھوڑ بیٹھے۔ اور باغ و فساد کے سلسلہ میں سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا اور خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے مابین شکر ربی ہو گئی۔ جو صلح و صفائی کے بعد ختم بھی ہو گئی تھی۔ اپنے قول کے ثبوت میں سند و دلیل کے طور پر بیان کیا۔ اور ان حواریوں کو یہ راز چھپانے کی از حد تاکید کی۔ اور یہ کہا، کہ اگر لوگوں سے اس مسئلہ پر تہاری بحث ہو جائے تو بطور حوالہ میرا نام ہرگز نہ لینا۔ بلکہ مجھ سے نفرت و بیزاری ظاہر کرنا۔ کیونکہ میں نام و نمود اور شہرت کا خواہاں نہیں۔ نہ جاہ و مرتبہ کی خواہش رکھتا ہوں۔ اس نصیحت سے میرا مقصد صرف ایک حق بات کہنا اور ایک واقعہ کو ظاہر کر دینا،۔ اس کی اس وسوسہ اندازی کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود جناب علی کریم اللہ و جہہ کی فوج میں ان باتوں کا تذکرہ اور خلع و

پر طعن و دشنام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مناظرہ باؤی اور جھگڑوں کا آغاز ہو گیا۔ حتیٰ کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے برسر منبر خطبوں میں اس جماعت سے اپنی نفرت و بیزاری کا اظہار فرمایا۔ بعض سرگرم لوگوں کو دھمکایا اور شرعی سزا کا خوف دلایا۔ ابن سبائے دیکھا کہ تیر نشانہ پر بیٹھا اور شہد کی انگلی کام کر گئی۔ اور مسلمانوں کے عقیدہ میں نقشہ و فساد کا بیج باراؤ ہو گیا۔ مناظرہ بازی میں ایک دوسرے کی عزت و آبرو کا کوئی پاس نہیں رہا۔ تو اگلے قدم کے طور پر اپنے مخصوص ترین شاگردوں کی ایک اور جماعت منتخب کی اور راز داری کا مکتب لینے کے بعد، پہلے بھید سے بھی زیادہ بار یکب اور نازک، راز، کائنات کی کشف کیا۔ کہ جناب علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) سے چند ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جو انسانی طاقت سے بالاتر ہیں۔ مثلاً کرامتیں۔ ذاتوں کا بدل دینا۔ غیب کی خبریں سنانا۔ مَرُودوں کو زندہ کر دینا۔ اللہ کی ذات اور دنیا کے حقائق بیان کرنا۔ بار یکب اور گہری جانچ۔ حاسر جوابی۔ الفاظ و عبارت میں فصاحت و بلاغت۔ زہد و پرہیز گاری۔ بلند و برجہ بہادری اور وہ قوت و طاقت کہ دنیا والوں نے نہ دیکھی نہ سنی۔

تم جانتے ہو یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہے؟ اور اس کا راز کیا ہے؟ سب نے عاجزی کا اظہار کر کے کہا نہیں (استاد) ہم نہیں جانتے آپ فرمائیے۔ جب ان کے جذبہ شوق کو خوب بھڑکا چکا تو رازوں کو چھپانے کی تاکید مزید کر کے کہنے لگا کہ یہ سب کچھ خواص اور ہیبت ہیں، جو لباس بشریت میں جلوہ گر ہیں۔ غیر فانی لباس فنا میں خود کو نمودار کر رہے ہیں۔ فاعلموا ان علیا هو الاله دلا الہ الا هو یعنی جان لو کہ علی ہی معبود ہیں ان کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور اپنے قول کی شہادت و تائید میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے وہ کلمات پیش کئے جو بحالت وجد و کیفیت جو کبھی اولیاء اللہ پر غالب طاری ہو جاتی ہے۔ آپ کے منہ سے نکلے تھے۔ مثلاً انا حی الاموت میں زندہ ہوں نہیں مروں گا۔ انا بعث من فی القبور قبروں سے مَرُودوں کو میں اٹھاؤں گا۔ انا مقیم القیامۃ میں ہی قیامت برپا کروں گا۔

چنانچہ ہونٹوں نکلی کو ٹھٹھوں چڑھی، کے مصداق یہ نازیبا کلام بھی راز نہ رہا۔ اور لوگوں میں پھیلتا چلا گیا اور جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے سمع مبارک تک بھی پہنچا۔ آپ نے استاد شاگرد سب کو پکڑا۔ اور فرمایا تم نے ان خرافات سے توجہ نہ کی تو سب کو آگ میں جلا کر مار ڈالو گا۔ چنانچہ سب نے توجہ نہ کی۔ اس کے بعد ابن سبا کو ملائین میں جلا وطن کر دیا گیا۔ مگر وہ وہاں بھی اپنی حرکتوں اور غلط و گمراہ عقائد کی تعلیم و اشاعت سے باز نہیں آیا۔ اپنے خاص گروگوں کو آذربائیجان اور عراق کے علاقہ میں پھیلا دیا۔ اور ادھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ شام کی مہم اور کار خلافت کے سبب اتنے مصروف و مشغول رہے کہ ابن سبا اور اس کے چیلوں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ یہاں تک کہ اس ملعون کے پھیلائے ہوئے غلط عقائد نے لوگوں کے دلوں میں جڑ پکڑ لی، اور وہ خوب مشہور ہوئے۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فوجی اس دوسرے کو قبول کرنے اور نہ کرنے کی بناء پر چار فرقوں میں بٹ گئے۔

(۱) پہلا فرقہ ان غلصین اور جاں نثار ساتھیوں کا ہے جو اہل سنت و الجماعت کے مقتدا و پیشوا ہیں یہ حضرات اصحاب کبار، ازدواج مطہرات کی حق شناسی اور ظاہر و باطن کی پاسداری نیز جنگ و بدل کے باوجود سینہ کو بے کینہ اور پاک صاف رکھنے میں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے قدم بقدم رہے۔ ان کو ہی شیعیان اولیٰ، اور شیعیان غلصین کہتے

ہیں اور مصداق آیت کریمہ اِنَّ جَبَّارِیْنَ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ (البقرہ میرے خاص بندوں پر تیرا غلبہ نہ ہو سکے گا) یہ حضرت ہر جثیت سے اس دھوکہ باز شیطان کے شر سے محفوظ و مامون رہے۔ اور ان کے دامن پر اس شیطان کے گندے ہاتھ کا کوئی دھبہ نہ لگ سکا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خود اپنے خطبوں میں ان لوگوں کی مدح فرمائی اور ان کے رویہ کو سراہا۔ (۲) دوسرا فرقہ تفذیل شیعوں کا تھا۔ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام صحابہؓ سے افضل کہتے تھے، ایہ ابن سبا کے ادنیٰ شاگردوں میں سے تھے کہ انہوں نے اس دوسرے کے ایک مختصر سے حقے کو تسلیم کیا۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بھی ڈانٹا ڈپٹا، اور فرمایا کہ اگر کسی کے بارے میں، میں نے یہ سنا کہ وہ مجھے جناب شیعین رضی اللہ عنہما پر نفیست دیتا ہے تو میں اُسے افتراء کی شرعی مدد اسی کوڑے ماروں گا۔ (۳) تیسرا فرقہ تہرانی شیعوں کا تھا ان کو شیعہ سنیہ بھی کہتے ہیں، یہ لوگ عقیدہ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) کو ظالم، غاصب، بلکہ کافرو منافق مانتے اور کہتے تھے۔ گویا یہ اس شیطان مجسم کے درمیانی درجہ کے شاگرد تھے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تنازعہ ان لوگوں کے مذہب کے لئے مؤید اور ان کے خیال کے لئے محرک بن گیا۔ اور چونکہ ان جھگڑوں کی بنا غلیفہ سوم رضی اللہ عنہ کی شہادت تھی۔ اس لئے لامحالہ ان لوگوں نے ان کی شان میں بھی زبان طعن دراز کی، اور جب کہ غلیفہ سوم کی خلافت کی بنا شیعین رضی اللہ عنہما کی خلاف ورزی اور حضرت بلال بن رباحؓ اس کے سخیال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بحیثیت ثالث بانی مبنی تھے اس لئے ان بد بختوں کے تیر طاقت کا یہ حضرات بھی نشانہ بنے۔ اور غلصین کے ذریعہ جب بھی اس دشنام و تبری کی اطلاع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سماع مبارک تک پہنچی۔ آپ خطبہ عام کے وقت ان لوگوں کو بُرا بھلا کہتے اور ان لوگوں سے اپنی کھلی بیزاری کا اظہار فرماتے۔

(۴) چوتھا فرقہ غالی شیعوں کا تھا۔ اور یہ ابن سبا کے خاص الخاص شاگردوں اور راز دار دوستوں کا گروہ تھا۔ اور یہی گروہ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا قائل تھا۔

پھر جب غلصین نے سختی کے ساتھ ان پر سخت الزامات مائد کئے اور کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں تو الوہیت کے آثار کے خلاف بشریت کے تقاضے موجود ہیں تو بعض لوگوں نے صریح الوہیت کے عقیدہ کو ترک کر دیا مگر یہ پھر بھی کہتے رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جسم فانی میں روح الہی حلول و تسلط کئے ہوئے ہے۔

اور جس طرح قرآنی آیت وَفَقَحْنَا فِیْہِ مِنْ شَرِّ دُجَآءَ (کہ ہم نے ان میں اپنی رُح پھونکی) سے دھوکہ کھا کر نساہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے مذہب کی صحت ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض کلمات کی لچر اور دراز کار تاویلات سے اپنے لچر و بیہودہ عقیدہ کی صحت کی کوشش کرتے رہے۔

تو یہ ہے شیعہ مذہب کے وجود میں آنے کی حقیقت اور اصل بنیاد، اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل اہل تشیع کے بنیادی طور پر تین فرقے بیک وقت وجود میں آئے اور ان تینوں کا موجد اور بانی یہی بد باطن، نفاق پیشہ یہودی تھا۔ جسے دنیا عبد اللہ بن سبا کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ یہ ہر شخص کو اسی کے مذاق و صلاحیت کے مطابق اپنے جال میں پھانست اور سبز باغ دکھا کر اپنے قابو میں رکھتا تھا۔

غالی فرقہ کی کھی اور تہرانی فرقہ کی کثرت کی وجہ | فرقہ دارانہ تفریق و اختلاف کے بعد ایسے امور بکثرت رونما ہوئے

جو تباری عقیدہ کے لئے ہمیں ثابت ہوئے۔ مثلاً:-

اول اتفائاً اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ و حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم سے جنگ جمل چھڑ گئی اور یہ چونکہ سب خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے قریبی متعلقین تھے اور خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قصاص کے دعویدار! اس لئے لامحالہ تباری فرقہ کے لوگوں کے درمیان دونوں خلفاء کی طرف سے بغض و عناد نے جگہ بنائی۔ اور ان کے نزدیک شیعیت مرتضیٰ گویا صرف اسی بغض کا نام قرار پایا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے وہ اقوال جو شیخین رضی اللہ عنہما کی مدح و تعریف میں صادر ہوئے تھے اور وہ دھمکیاں اور سختیاں جو آنجناب ان بدزبان لوگوں کے خلاف عمل میں لاتے تھے۔ ان میں کو تعاضات مصلحت اور اصول و دلداری و ظاہر واری پر محمول کرتے، جو اکثر دنیا طلب سردار برتا کرتے ہیں۔

خلیفہ اول کے ساتھ برائیوں کا بغض و عناد ہی خلیفہ دوم کے ساتھ بغض کا سبب بنا اس لئے کہ خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کی خلافت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی خلافت کے تابع تھی اور ہر دو اصحاب کا رویہ اور طریقہ زندگی ایک تھا۔ یہاں تک کہ گویا ہر دو حضرات نے سیرت اور طریقہ زندگی میں ایک دوسرے کی اتباع و اقتداء کو لازمی جان رکھا تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی حیثیت زید و شیر کی سی تھی۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو فدک سے باز رکھنے نیز دیگر تنازعات میں آپ خلیفہ اول کے ہم خیال اور شریک کار تھے۔

یہ واقعات و اسباب تباریوں کے ذہن و خیال پر اس بری طرح حاوی ہوئے کہ وہ تعلقات و نسبت خاص جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تھی مثلاً داماد ہونا۔ رشتہ دار ہونا دین و خلافت کے اہم معاملات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے طلب رائے اور شریک مشورہ بنانا، ان سب کو تقیہ پر اور جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی کھردری اور بیچارگی پر محمول کرتے رہے۔

اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ اکثر برگزیدہ انصار و مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی طعن کا نشانہ بنایا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی طرح ان خلفاء رسول کی بھی اتباع کرتے، ان کی مدد اور پشت پناہی کرتے ان کے احکامات کی بجا آوری کو اپنے اوپر لازم اور فرض گردانتے تھے۔

دوم یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد جناب حسین رضی اللہ عنہما اور آپ کی اولاد مثلاً زید شہید رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ یا دیگر سادات حسینیہ ہمیشہ شام کے مروانی نواصب (نارنجیوں) اور عراق کے عباسی نواصب کے ساتھ برسرِ نزاع اور برسرِ پیکار رہے اور باہم کینہ پروردی فروغ پاتی رہی۔ اس لئے ادھر تو بعض نواصب گمراہی کے انتہائی درجے تک پہنچ کر دسیاہی کی زندگی گذارتے اور حضرات مذکورہ کی شان گرامی میں بڑی بے ادبی کا مظاہرہ کرتے۔ شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو نیکی سے یاد کرتے۔ بلکہ مروانیوں نے تو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف داری میں شرارت و گمراہی کا اندازہ اختیار کر رکھا تھا۔ تو دوسری طرف تباری فرقہ بھی ان نواصب کے مقابلہ میں ”بغض معاویہ“ کے مظاہرہ میں پیچھے نہ رہا اور مسلمانوں کے اسلاف ہر سہ خلفاء رضی اللہ عنہم کے متعلق ہرزہ سرائی و طیرہ بنا لیا۔

چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی طرف سے جی بھر کے داد بے حیائی دی۔

سوم یہ کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام آئمہ اطہار رحمۃ اللہ علیہم ان بد بخت خارجیوں کی ظاہری

شرارت، بد ذاتی اور خجاست و بد طبیعت کے پیش نظر لگا ہے گا ہے کچھ کلمات لعن آمیز عام اوصاف کی آڑ میں ارشاد فرماتے رہے۔ مثلاً نواصب کا ظلم و غضب، اہل بیت کے ساتھ تعصب و بغض، سنت رسول کو بدل ڈالنا، بدعات، اختراع کرنا اور خلاف شرع احکام گھڑ لینا وغیرہ

گو جناب مرتضیٰ اور ائمہ کا رئے سخن نواصب کی طرف تھا، مگر حقیقت شناس حضرات سمجھتے تھے کہ بد خیال اور جلد باز گزردہ نے ان کلمات کو صحابہ کرام اور ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں استعمال کیا کیونکہ وہ اپنے لغو عقیدہ کی بناء پر ان ہی حضرات کو ان کلمات کا محل سمجھتے تھے۔ جب ان لوگوں سے کہا گیا کہ اگر جناب مرتضیٰ اور ائمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کا رئے سخن ان ہندگ اسلاف کی طرف تھا تو ان حضرات نے ان کے نام کیوں نہ لئے، تو اس کا ان کے پاس ایک ہی گھڑا گھڑا یا جواب ہوتا تھا کہ مصلحت و وقت اور تقیہ اس کا سبب تھا۔

زمانہ امیر کے تبرائی ایک سوچی سمجھی اسکیم کی وجہ سے جانتے بوجھتے صحابہ کرام ازواج مطہرات اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم پر لعن طعن کرتے تھے۔ تو بعد میں آنے والوں کے لئے ان کا یہ طرز عمل نص صریح بن گیا۔ اور اب لعن طعن شیعہ سیاست کی بجائے مذہب ہو گیا۔

حاصل کلام یہ کہ ان اور ان جیسے اسباب کی وجہ سے تبرائی فرقہ دوسرے تمام فرقوں سے قوت اور تعداد میں بڑھ گیا۔ کیونکہ پے پے ایسے واقعات رونما ہوتے چلے گئے جو ان کے عقیدہ کے مدد ثابت ہوئے۔

تبرائیوں کے مقابلہ میں غالی فرقہ کا حال روز بروز پتلا، قوت کم اور ذلت وادبار فزوں تر ہوتا رہا۔ اور یہ حال ہو گیا کہ عقیدہ کے کھلے بطلان اور ان وحشت انگیز کلمات کی کھلی برائی کے سبب ان کی بکواس پر اب کوئی کان دھڑ کو بھو اتیار نہ تھا۔

اور اگر کوئی بطور فیشن "یہ عقیدہ اپنا بھی لیتا تو کبھی اپنی ہی قتل کی رہنمائی یا کتبہ برادری کے افراد کی نصیحت جلد اس عقیدہ سے ہٹا دیتی۔

اب رہے تسنیل، تودہ لآ فی العیر ولا فی المنہیر۔ کی تصویر بن کر رہ گئے تھے، کہ نرادرہ کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ تبرائی ان کو نہ منہ لگاتے نہ اپنے میں شامل کرتے، اور کہتے کہ یہ اہل بیت کی جنت کا حق ادا نہیں کرتے جو تبرائیوں کے عقیدہ کے مطابق بعض صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کو گالی بک کر اور لعن طعن کر کے ادا ہوتا ہے۔ دوسرے طرف خلعین ان کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے رے کے خلاف چلتا دیکھ کر اور آپ کی دھکیوں کا مورد بن کر حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ہنوز تبرائی ان اہل سنت اور خارجیوں میں فرق و تمیز نہیں کرتے۔ حالانکہ اہل سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلعین خاص ہیں خاندان نبوت پر دل و جان سے خدا ہیں۔ شام و عراق اور مغرب کے ناصبوں سے نہ صرف علمی اور زبانی لڑائی لڑنے میں مشغول ہیں، بلکہ تلواروں کی لڑائی میں بھی در بدر ہو چکے ہیں۔

اور احکام شریعت کی مدد اور مردانی بدعات کا قلع قمع بھی کر چکے ہیں۔ نواصب کو نہایت بد زبان سمجھتے ہیں۔ اور تعجب بالائے تعجب اس بات پر ہے کہ تبرائیوں کے علماء جو اپنے متعلق یہ غلط فہمی رکھتے ہیں کہ وہ اسلاف کے اخبار اور اہل علم کے اقوال سے باخبر ہیں وہ بھی نواصب کا لفظ شیعیان اولیٰ پر بولتے ہیں۔

کسی دانانے کیا خوب کہا ہے، کہ

”ہر بیماری کی ایک دوا ہے جس سے وہ باقی رہتی ہے۔ مگر حالت کہ وہ اپنے معالج کو عاجز کرتی ہے۔“
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شیعہ لغت میں نواصب کا لفظ ہر اس شخص کے لئے ہے جو ان کے عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو۔ اس اصول کی بنا پر غالی شیعہ، تبرائی شیعہ کو اور تبرائی، تفضیلی شیعہ کو اور تفضیلی شیعیان اولیٰ (مخلصین) کو نواصب جانتے اور گردانتے ہیں۔

ان شیعیان اولیٰ کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے کہ شیعوں کے تمام گمراہ فرقوں اور خارجیوں دونوں کی لعنت و ملامت کا نشانہ بنے اور سب کے سامنے مخالفت اختیار کی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وراثت میں مسکنت اور عزت غلطی ان ہی کے نصیب میں آئی۔ اور جنگ بادل اور مجاہدات شامہ کے لئے ان کے صمیم وارث بھی قرار پائے۔ درحقیقت یہ حدیث ان ہی کے حال پر ٹھیک منطبق ہوئی اور ان کے انجام کا پتہ دیتی ہے۔

إِنَّ الْمَدِينَةَ بَدَاءٌ عَزِيزِيًّا وَمَسِيحُوْدٌ خَيْرِيًّا فَطُوبَىٰ لِلْعَصَاةِ وَالْمُحْدَثِ

انشاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں آگے چل کر یہ بات کھلے گی کہ شیعیان اولیٰ میں مہاجرین و انصار کی اس جماعت کا شمار ہے جن میں سے اکثر سعادت مآب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ہمہ کارانی میں باغیوں، اور قرآن میں تاویل کرنے والوں کے مقابلہ میں جنگ لڑ چکے تھے! ایسے ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی وفات میں منکرین قرآن سے لڑائیوں میں شریک رہے تھے۔ اور ان میں سے بعض ایسے تھے جو انتہائی پرہیزگاری اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے اور اہل کلمہ اور اہل قبلہ کے قتل سے گریز کرتے ہوئے چند مذر پیش کر کے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے اور جن کے سب مذر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قبول فرمائے تھے اور باوجود اس گوشہ نشینی کے انہوں نے اپنے کے منافع و فضاہل کو پھیلانے اور اپنے کی محبت پر لوگوں کو ابھارنے اور اپنے کی عزت و تعظیم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عمل سے اس آیت کی ترجمانی فرمائی :-

لَيْسَ عَلَى الْمُتَحْسِنِينَ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يُجِدُونَ مَا يُفْعَلُونَ حَرْجٌ إِذَا انْصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ۔

مآ علی المتحسنین من سبیلہ (ترجمہ) ”نہیں ہے ان متحسینوں، مؤمنینوں اور ان لوگوں پر جو خرچ کے لئے کوئی مال

نہیں رکھتے کوئی حرج، جب کہ وہ اللہ و رسول کے غیر خواہ ہوں اور نیکوں پر کوئی الزام نہیں۔“

اور آگے چل کر قارئین کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ بیعت رضوان کے حاضرین میں سے تقریباً آٹھ سو حضرات نے جنگ

صفین میں وادجاں شاری دی اور تین سو نے جام شہادت نوش کیا، ان کے علاوہ دوسرے صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم نے جو خدمات دین و خلافت کی انجام دیں نہ کسی زبان کو اس کے بیان کا یا رہے نہ کسی قلم کو یہ تاب کہ ان کو قلم کر سکے۔

لیکن چونکہ در خلافت ختم ہو چکا تھا اور خاتم الخلفاء حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا جام حیات لبریز ہو چکا تھا

اس لئے دنیاوی طور پر یہ قربانیاں بار آور نہ ہو سکیں بجز اس کے کہ وہ حضرات ثواب آخرت اور جنت میں درجات بلند

کے حقدار ٹھہریں جو مسجد دو بھلائیوں کے ایک بھلائی ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں شیعیت کے جنم لینے اور چار فرقوں میں بٹ جانے کے بعد

شیعی مذہب میں اور بھی نئی نئی باتیں رونما ہوتی رہیں اس تغیر و تبدل اور فرقہ بازی کا راز یہ ہے کہ ہر انقلابی مؤرخ،

اس مذہب نے نیا چرلا بدلا۔ اور نئے روپ اور نئے مذہب کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا اور اس قسم کے اکثر انقلابات ائمہ کرام کی شہادت کے موقع پر رونما ہوتے رہے۔

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو: جب عراق کے بدعتوں نے یزید کی سیاست میں آکر بدعت زیادہ کے بعد گاہے اور کسانے پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تو کیسان نامی نے جو سبط اکبر حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے متبعین میں سے تھا اور آنجناب کی وفات کے بعد آپ کے بھائی محمد بن علی رحمہ اللہ علیہ کی جو محمد بن الحنفیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ محبت اٹھا چکا تھا۔ بلکہ ان سے عجیب عجیب علوم کا استفادہ بھی کر چکا تھا۔ امام شہید رضی اللہ عنہ کے انتقام کا مدعی بن کر اٹھا۔ اور لوگوں کو بھی اس مہم میں شرکت کے لئے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ حضرت شیعان اولیٰ میں سے مثلاً سیمان بن مرد عوامی اور رفاعہ وغیرہ اور کچھ لوگ تیرائی شیعوں میں سے اس کے ساتھ ہو گئے۔ اور ایک جتھہ بنا کر ابن زیاد اور اس کے ماموں الجھڑے، مگر نتیجہ کشت خون کا ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس ناکامی کے بعد تیرائی فرقہ کے ایک شخص منار ثقفی کو اپنا لیڈر اور سردار بنایا۔ منار حکومت و سیاست، فن جنگ و جدال اور حرب و قتال میں ماہر تھا۔ اور سیاست زمانہ پر گہری نظر رکھتا اور مکرو فریب میں ابن سبا ہی کی طرح دسترس رکھتا تھا۔ منار کی سرداری کے ساتھ ساتھ ابراہیم بن مالک اشتر کو امیر الامراء مقرر کیا۔

ابن زیاد کے ساتھ منار کے کئی معرکے ہوئے، اور بالآخر ابن زیاد منار کے ہاتھوں مارا گیا۔ منار نے اس کے بعد کیسان کا مذہب قبول کر لیا۔ کیسان ابتداء میں حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کی امامت کا قائل نہیں تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد، براہ راست جناب محمد بن الحنفیہ امامت کے مستحق اور حقدار تھے۔ اس کے نزدیک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ تو اہلیت امامت اس وجہ سے کھو چکے تھے کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام سے صلح کر لی تھی اور امام حسین رضی اللہ عنہ نے چونکہ بڑے بھائی کی متابعت کی تھی گو بادلِ خواستہ تھی اس لئے وہ بھی اس کے عقیدہ کے معیار پر پورے نہیں تھے اور وہ بھی اہلیت امامت سے محروم ہو گئے تھے۔ لہذا مجبور ہو کر محمد بن علی رضی اللہ عنہما کو ہی اس نے سرمرقنوی کا خازن اور لواء امامت کا حامل قرار دے لیا تھا۔ اور ان کے متعلق بیان کرتا تھا کہ ان کو جناب امیر نے ورثت میں کرامتیں اور عجیب و غریب علوم ملے ہیں۔

منار زمانہ سازی اور حالات کے مطابق اپنے آپ کو بدل کر فائدہ اٹھانے کا فن خوب جانتا تھا اور ادا فی حکومت و اقتدار کی چاٹ لگ گئی تھی۔ اس لئے بادلِ خواستہ کو ذکے عوام کو رام کرنے کے لئے کیسان کے عقیدہ کے خلاف حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کی امامت کا انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ کو ذکے عوام ان ہر دو حضرات کے انتہائی مطیع و فرمانبردار تھے۔ لہذا اس نے اب یہ کہنا شروع کر دیا کہ امام شہید رضی اللہ عنہ کے بعد حق امامت محمد بن علیؑ کی طرف منتقل ہوا ہے۔ اور ذاصب (خارجیوں) سے لڑنے اور امام شہیدؑ کا بدلہ لینے کے لئے ہمیں انہیں نے مامور کیا ہے۔

اور اس سلسلہ میں جناب محمد بن علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جھوٹے اور جعلی مہر شدہ فراہم تیار کر کے لوگوں کو دکھانے لگا۔ اور کیسان کی اپنے ساتھ موافقت بطور شہادت پیش کرنے لگا۔ چنانچہ یہ جعل سازی اور پال بازی کامیاب رہی اور بہت سے لوگوں کو اپنے دامِ ترویج میں پھنسا لیا۔ اور عراق کے شہروں دیار بکر، اہواز اور آذر بائیجان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ تا آنکہ حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بھائی

اور امام شہید رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ کیونکہ جناب سکینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ مختار کی بد اطواریاں دیکھ کر اس پر فوج کشی کی۔ اور اسے واصل جہنم کر کے خلق خدا کو اس کے جوہر تشدد سے رہائی دلائی۔

مختار نے اپنے ماننے والوں کے لئے مختاریہ کا لقب دیا تھا۔ جب کہ وہ پہلے کیسانیہ کہلاتے تھے۔ جب مختار کی برائیاں، بد عقیدگیاں اور ظلم و ستم زبان زد خلق ہوئیں اور ہر طرف سے لعنت پھیلنے لگی تو اس کے ماننے والوں نے مختاریہ کا لقب ترک کر کے سابقہ کیسانیہ ہی اختیار کر لیا۔

مختار دینی معاملات میں مدد و جبر بد عقیدہ تھا۔ آخر میں تو اس نے نبوت کا دعویٰ ہی کر دیا تھا اور کہتا تھا کہ جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور امراء، صوبہ داروں اور لشکریوں کی خبریں مجھے بتا جاتے ہیں۔

اُدھر جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں مختار کے گندے اور یہودہ عقائد و بد اطواریوں پر لعنت بھیجتے تھے اور اس کے کڑو توں سے اظہارِ بیزاری فرماتے تھے۔

مختار ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے رسم ماتم عاشورہ اور نوحہ گری کی بنیاد ڈالی، اور وہ یہ سیاست گری اور سارا کھیل اس لئے کھیلتا تھا تاکہ اہل کوفہ کو بھڑکا کر اہل شام کے ساتھ جدال و قتال پر کھڑا کرے اور اس کی آڑ میں زمامِ سلطنت و اقتدار پر اپنا قبضہ مضبوط رکھے۔ اس کو امام حسین رضی اللہ عنہ سے کیا واسطہ تھا وہ تو خود پیغمبر بن بیٹھا تھا اور اس کے پیرو علی الاعلان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر سب و شتم کرتے تھے۔

جب جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی تو کیسانیہ انتخابِ امام میں باہم مختلف ہو گئے۔ کہ اب امامت کس کی طرف منتقل ہوئی۔ ابو کریب جو اس فرقہ کے سرداروں میں سے تھا یہ کہنے لگا کہ محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ خاتم الائمہ ہیں۔ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ دشمنوں کے خوف سے دلپوش ہو گئے کچھ عرصہ بعد ظہور فرمائیں گے۔ اور مطلب اس سے یہ تھا کہ لوگ کسی دوسرے کے پیرو اور گردیدہ نہ ہو جائیں، بدستور سابق میرے ہی مطیع و فرمانبردار بنے رہیں۔

اس کے برخلاف ایک دوسرے سردار اسحاق نامی نے اس در سائل کے ذریعہ حضرت ابو ہاشم بن محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اپنا رشتہ جوڑا اور کہنے لگا کہ اب وہ امام ہیں اور انہوں نے مجھے نائب و نمائندہ مقرر کیا ہے۔ ابو ہاشم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اسحاق فرقہ ان کی اولاد میں امامت منتقل ہونے کا تامل ہوا۔

ادھر ابنِ حرب جو اسحاق فرقہ کا سردار تھا خود امامت کا دعویٰ کرتے لگا۔ ایک اور جماعت جو عبد اللہ بن جعفر کے چیلے چانٹوں پر مشتمل اور پہلے اسحاقیہ میں شامل تھی حضرت ابو ہاشم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد عبد اللہ بن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر کی امامت کی قائل ہو گئی اور کوفہ کے شیعوں کی بڑی اکثریت ان کے تابع ہو گئی۔

کیسانیہ ہی کی ایک جماعت نے یہ کہا کہ حضرت ابو ہاشم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امامت اولاد ابوطالب سے منتقل ہو کر اولاد عباس رضی اللہ عنہ کو ملی۔ چنانچہ انہوں نے علی بن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو امام مانا اور ان کے بعد ان کی اولاد میں امامت کا سلسلہ چلایا تا آنکہ منصور و والفق عباسی کا زمانہ آیا تو یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔

اس سلسلہ میں عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو اپنے خیال میں امامت کا درجہ دیتے تھے اور ان کی امامت کا ڈھنڈا پیٹتے پھرتے تھے وہ خود اس دعوے سے پورے طور پر بیزاری کا اظہار فرماتے اور اپنے آپ کو اس کھڑاک

سے بے تعلق ظاہر کرتے۔ اور یہ بے حیا لوگ، ان کے انکار اور ہزاری اور کنارہ کشی کو ان کے تقیہ اور دشمنوں کے خوف پر محمول کرتے، کیونکہ ہنوز مدینہ منورہ پر مردانیوں کا قبضہ و تسلط تھا۔

شیعہ مذہب میں تقیہ نے دراصل اسی زمانہ سے جڑ اور شہرت پکڑ لی!

اس زمانہ میں مذہب تشیع صرف دو فرقوں - کیسانہ اور مختاریہ میں بٹا ہوا تھا اور کوفہ کے شیعہ اسی مذہب کے پیرو تھے۔ غالی شیعہ اور تفصیل فرقے بہت کم اور ذلیل و حقیر ہو کر رہ گئے تھے۔ البتہ کیسانہ فرقہ میں زبردست چھوٹ تھی اور وہ خود کئی فرقوں پر تقسیم ہو چکا تھا۔

شیعہ مذہب میں تیسرا انقلاب یہ ہوا کہ جب حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اس عالم غالی سے دار بعاد کو سدھارے، تو زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے جو زید شہید کے لقب سے مشہور ہیں۔ ہشام بن عبد الملک بن مردان علیہ وقت پر چڑھائی کر دی۔ جب آپ کوفہ و عراق کے گرد و نواح میں پہنچے تو شیعہ مخلصین کی ایک جماعت آپ کے ساتھ ہو گئی۔ اس لئے کہ مردان کی اولاد، اپنے ماطوں کے ظلم و ستم کے سبب اور ان کو اس سے روکنے میں ناکام رہنے کے باعث ریاست کی ظاہری قابلیت اور دبہ سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ حضرت زید شہید کے اپنے ساتھیوں، مخلص شیعوں کے علاوہ تیس ہزار کی ایک جماعت۔ تبرائی شیعوں کی بھی شامل ہو گئی جس کی اکثریت کیسانیوں اور مختاریوں پر مشتمل تھی۔ یہ پورا لشکر یوسف بن عمر ثقفی سے قتال کرنے کے لئے روانہ ہوا جو اس وقت ہشام کی طرف سے امیر العزائم تھے۔

جب حضرت زید شہید رحمہ اللہ علیہ نے تبراہیوں کا سب و شتم اور تبری سنا تو بار بار ان کو ڈانٹا، دھمکایا، اور ان لوگوں کے سرداروں کو پابند کیا کہ وہ اپنے ماتحتوں کو اس لائق نفرت فعل سے باز رکھیں۔ جب بات زبانی کلامی مدد و اول سب و شتم سے آگے بڑھ کر تلوار اور بھالے تک پہنچی۔ اور مہمان اہل بیت شیعوں کی عملی آزمائش کی گھڑی آ پہنچی تو سامے کے سارے تبراہی، آپ کی رفاقت سے منہ موڑ کر اور آپ کو دشمنوں کے حوالے کر کے گھروں میں جا گھسے۔ اور مذریہ گھڑا کہ ہکو صحابہ پر تبرا بازی سے کیوں روکا۔ گویا تاریخ نے اپنے آپ کو بھر دہرایا اور کوفہ کے شتی لوگوں نے جناب امام حسین رضی اللہ عنہ سے غداری کا جو سلوک کیا تھا وہی سلوک ان کیسانیوں اور مختاریوں نے جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ سے کیا۔ نتیجتاً جناب زید شہید ہو گئے، آپ کی شہادت کے بعد مذہب شیعہ میں ایک عجیب انقلاب آیا کہ وہ جماعت جو جناب زید شہید رحمہ اللہ علیہ کے ساتھ رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا لقب شیعہ مخلص رکھا۔ وہ اس کے قائل تھے۔ کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت زید شہید ہی امام برحق تھے۔ اور شہادت جو ان کے باپ دادا کی میراث تھی۔ ان کو نصیب ہوئی۔ راہ خدا میں اپنی جان پر کھیل گئے اور یہی امام کے شایان شان ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرے اور تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہو، کسی انسان کی رفاقت اور مفارقت کی اس کو پرواہ نہ ہو۔

اور ان لوگوں کو جو جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کو میدان جنگ میں چھوڑ کر اپنے گھروں کو بھاگ گئے تھے۔ روافض کا لقب دیا۔ بلکہ خود جناب زید رحمۃ اللہ علیہ نے ان جھوٹے، بیونا اور غداروں کے حق میں فرمایا، رافضونا فہم الرافض یعنی انہوں نے ہم کو چھوڑا تو وہ رافض ہوئے۔

پھر جب حضرت زیدؑ کے یہ ساتھی اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو ان کے سامنے اپنے لئے امام منتخب کرنے کا سوال آیا۔ اس جماعت نے اپنے لئے امامیہ لقب چنا۔ ان میں سے کچھ جناب حسن ثقیلی بن حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہم

کی امامت کے قائل ہوئے۔ جب کہ اکثریت نے امام محمد باقر رحمہ اللہ علیہ کو اپنا امام تسلیم کیا۔ جو اس وقت اہل بیت میں سب سے افضل، عالم اور سب سے زیادہ پرمہیز گار اور عبارت گذار تھے۔ اور ان لوگوں نے کیسا تیر اور مختاریہ فرقوں کو اپنے مذہب کی دعوت دینا شروع کی۔ اس مذہب کے داعی جو اس گروہ کے سردار تھے یہ لوگ تھے۔ ہشام بن الحکم حول۔ ہشام بن سالم جو الیقینی۔ شیطان الطاق شیشی اور زرارہ بن امین کوئی۔

امام باقر رحمہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اس گروہ میں پھر اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ وہ زندہ ہیں مرے نہیں۔ اور ایک جماعت ان کی موت کی قائل ہوئی اور آپ کے صاحبزادے حضرت زکریا رحمہ اللہ علیہ کو اپنا امام مانا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ وہ زندہ ہیں مریں گے نہیں۔

کچھ لوگوں نے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کو امام مانا۔ یہ گروہ تعداد میں بڑھ گیا کیونکہ بہت سے لوگ ان کے پیچھے ہو گئے۔ انہوں نے امامیہ کا لقب اپنے لئے مخصوص قرار دے لیا۔ اور حضرت زید شہید رحمہ اللہ علیہ کو امام ماننے والوں کو زیدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

پھر امامیہ فرقہ میں سرداروں کی بھرمار کے سبب مذہبی نزاع رونما ہوا۔ ہر رئیس اور سردار نے اپنی خواہش کے مطابق نیا مذہب تراشا اور اپنا گروہ علیحدہ بنایا، اس لئے لامحالہ سرداروں کے ناموں پر ہشامیہ۔ سالمیہ۔ شیطانیہ۔ ہشامیہ اور زرارہ فرقے ان میں پیدا ہوئے۔

شیعوں کی مذہبی تاریخ میں یہ چوتھا بڑا اور ہولناک انقلاب تھا جو حضرت جعفر صادق کی وفات پر رونما ہوا۔ کچھ نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ جناب صادقؑ زندہ ہیں، غائب ہو گئے ہیں، پھر ظاہر ہوں گے۔ ایک فرقہ آپ کی موت کا قائل ہوا۔ اور اس نے آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے جناب کاظم موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ علیہ کی امامت کو تسلیم کیا۔ ایک دوسرے گروہ نے جناب اسماعیل بن جعفر رحمہ اللہ علیہ کو امام ٹھہرایا۔

پھر ان اسمعیلیوں میں بھی تفرقہ پڑا۔ بعضوں نے کہا کہ اسمعیلؑ آخری امام ہیں ان کے بعد کوئی امام نہیں اور ان کے متعلق صحیح لاجموت کا عقیدہ قائم کر لیا۔ اور بعض دوسرے ان کی موت اور ان کے بیٹے محمد بن اسماعیل رحمہ اللہ علیہ کی امامت کے قائل ہوئے۔

پھر ان میں بھی پھوٹ پڑ گئی، اس سبب سے کہ جناب اسماعیل بن جعفر رحمہ اللہ علیہ کی حیات میں وفات پا گئے اور اپنے پیچھے اپنا بیٹا محمدؑ چھوڑا۔ وہ اپنے دادا کے ہمراہ بغداد گئے وہیں وفات پا کر مقابر قریش میں مدفون ہوئے۔ ان کا ایک غلام مبارک نامی تھا۔ جو خوش فہمی، نقش و نگار سازی اور دستکاری میں یکتاے روزگار تھا۔ عبداللہ بن میمون اقداح ہوازی اس غلام سے آکر ملا۔ اور حضرت جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد اس سے کہا کہ میں تیرے آقا و مولیٰ حضرت محمدؑ کے شیعوں میں سے ہوں، غلام کے ساتھ کچھ عرصہ اٹھنے بیٹھنے اور بے تکلف ہونے کے بعد تنہائی میں اس سے کہا کہ مجھے تیرے آقا سے بعض ایسے اسرار اور بھیہد ملے ہیں کہ ان کی میرے سوا کسی کو انہوں نے جو ابھی نہیں کئے دی۔ پس مقطعات قرآنی کے متعلق فلسفیانہ انداز کی باتیں بتانی شروع کیں کچھ شعبہ سے سمجھ اور طلسمات بھی مبارک کو دکھائے اور سکھائے۔ اس کے متعلق محمد بن زکریا رازی نے کتاب الحمار بنی میں کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ عبداللہ بن میمون اقداح محمد، بدعقیدہ، زندیق اور دین اسلام کا پکا دشمن تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اسلام میں فتنہ و فساد برپا کرے

لیکن کوئی مناسب موقعہ نہیں ملتا تھا۔ اب مبارک کی دوستی میں اس کو اپنی ناپاک خواہش برلاسے کا موقعہ میسر آ گیا تھا۔ خلاصہ کلام یہ کہ کچھ عرصہ کے پارانہ کے بعد دونوں میں باہم کچھ عہد و پیمان ہوئے اور دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مبارک تو کوفہ چلا گیا اور وہاں اسماعیلی مذہب کا داعی بنکر اس کی دعوت دینے لگا اور اپنے فرقہ کا نام مبارکیہ اور قرطبیہ رکھا کیونکہ مبارک اس کا نام اور قرطیہ لقب تھا۔ ادھر عبداللہ بن میمون کو ہستان عراق پہنچا اور کومستانیوں کو طلسمات و نیمبر نہات کے زور پر اپنے جال میں پھانسا، وہ اپنے ہر قبیح کو ان الفاظ میں نصیحت کرتا اَسْتَوْذِعُكَ وَنَحْيَا لَكَ دَمْدَمٌ حَبْلَكَ (اپنے سونے، اپنے سفر اور اپنے مذہب کو چھپا)، اس نے اپنے گروہ کو میمونہ کا لقب دیا۔

جب کومستانیوں کی طرف سے اس کو پورا پورا اطمینان ہو گیا، اور اپنا بازو قوی بنا لیا تو خلف نامی ایک شخص کو اپنا نائب بنایا اور دعوت مذہب کی ہدایت کر کے اسکو خراسان، قم اور کاشان کی طرف روانہ کیا اور خود بعبرہ کا رخ کیا۔ اور وہاں کے لوگوں کو گمراہ کرنے اور بہکانے میں مشغول ہو گیا۔

خلف پہلے طبرستان گیا، اور وہاں کے شیعوں کو مذہب میمونہ کی دعوت دینے لگا۔ وہ کہتا تھا کہ اہل بیت کا مذہب یہی ہے اور اَھْلُ الْبَيْتِ اَدْوٰی بِنَا فِیْہِ (صاحب خانہ ہی گھر کی چیزوں کو اچھی طرح جانتا ہے)، اور مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے اپنے الگ مذہب گھڑ لئے ہیں اسی وجہ سے وہ مصائب اور نکالیف کا شکار ہوئے اور لڑاؤ و طیبات سے تہی دست!

وہاں سے اس نے نیشاپور کا رخ کیا۔ اور وہاں کے شیعوں کو بھی اسی آفت میں ڈالا۔ اور خود نیشاپور کے کسی گاؤں میں اقامت پذیر ہو گیا۔ اہل سنت کو جب اسکی فتنہ پھیلنے لگا تو وہ اس کے پیچھے پڑ گئے اور وہ جھپک جھپک گیا۔ وہاں سے رے پہنچا اور وہاں بھی یہی فتنہ انگیزی شروع کر دی۔ غرض جب تک زندہ رہا۔ یہی کرتا رہا۔ جب مر گیا تو اس کے بیٹے احمد نے باپ کی جگہ لے لی۔ اور غیاث نامی ایک شخص کو اپنا نائب بنا کر عراق میں بسیجا۔ غیاث ادیب، شاعر، مکار اور فلاح آدمی تھا۔

فرقہ باطنیہ کا بانی صابی اور اول معنف یہی ہے۔ "مذہب باطنیہ کے اصول کے بیان میں" نامی کتاب اسی نے لکھی ہے۔ جسے دہلندیر اشعار اور امثال عرب سے مزین کیا۔ اور اپنی دلیل میں آیات و احادیث کے بہت حوالے دیتا ہے۔ وضو، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر احکامات کو باطنی فرقہ کے مطابق بیان کر کے ثبوت میں لغت کے حوالے پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان سب امور سے شارع (علیہ السلام) کی یہی مراد ہے، عام لوگوں نے ان کے جو معانی و مطالب سمجھے ہیں سراسر غلط ہیں۔

غیاث کے مذہبی باطنی فرقہ نے بڑا زور پکڑا۔ اور عوام کو یہ نیا اور آسان طریقہ جس میں بے باکی اور پوری پوری آزادی ملتی تھی، بہت مرغوب اور دلچسپ معلوم ہوا، یہی وجہ تھی کہ ہزاروں جاہل اور فاسق و فاجر اس کی اطاعت کے جال میں پھنس گئے۔ اور دور و دراز کے شہروں سے سمت سمت کر اس کی طرف آنے لگے۔ یہ واقعہ سنہ ۳۸۷ھ کا ہے، جس کی طرف حدیث صحیح کے الفاظ ظہور الایات بعد الماتین، میں صاف اشارہ ملتا ہے کہ "دوسری صدی کے بعد نشانہوں کا ظہور ہو گا" اسوقت شیعہ مذہب کو یا کفر و فلسفہ کا سجون مرکب بن گیا تھا۔ جس کی مثال بول و براز اور خون جیص کے ملنے کی سی تھی۔

غیاث جب گمراہی کے بام عروج پر تھا اور اس کا دوبارہ گمراہی، اور اس کی جادوگری کے ڈکے بچ رہے تھے اسے خبر ملی، کہ اہل سنت کے رؤساء و سربراہ تیرے مار ڈالنے کی فکر میں ہیں جان پیاری ہے تو بھاگ جا۔ وہ یہ جھٹکا کہ خبر سنتے ہی بدحواسی کے عالم میں بھاگ اٹھا اور مرو شاہ جہان میں جا چھپا۔ اور ایک مدت تک خاموشی اور گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ لیکن اس خاموشی میں بھی وہ اپنے مشن سے غافل نہیں ہوا جو بھی اسے ملتا بہکانے سے باز نہ آتا ایک عرصہ کے بعد پھر سے جا پہنچا، مگر پھر خطرے کی جھنک پا کر دوبارہ بھاگ نکلا مگر راستہ ہی میں تھا کہ پیک اہل نے رشتہ حیات منقطع کر دیا۔

عبداللہ بن میمون کو اس کی موت کا بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ آخر وہ اسی صدمہ میں مر گیا۔ اور بصرہ میں دفن ہوا۔ اس نے اپنے لڑکے احمد کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا جو فتنہ کی آگ بھڑکانے میں باپ سے بھی دو قدم آگے تھا۔ اور شرارت گمراہی میں باپ سے کسی طرح بھی کمتر نہ تھا۔

پہلے تو وہ بصرہ سے شام گیا مگر وہاں مروانیوں کے اخلاف اور ان کے تعصب کی وجہ سے اس کی دال نہیں گئی۔ اس کے بعد وہ مغرب گیا اور وہاں ایک جماعت کو بہکانے میں کامیاب رہا پھر شام ہوتا ہوا بصرہ آیا۔ جہاں اہل نے اسے بھی باپ کے پاس پہنچا دیا۔

اس کا جانشین اس کا بیٹا محمد ہوا۔ وہ پہلے مغرب گیا جہاں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور بڑی عزت و قدر اور بڑا مرتبہ نصیب ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے یہ دعویٰ کر دیا کہ مہدی موعود میں ہی ہوں۔ اس دعویٰ پر فریب کا بھی بہت لوگ شکار ہوئے، غرض یہ بڑا فریقہ اور دوسرے مغربی شہروں پر چھا گیا۔ اپنے ماننے والوں کو اس نے مہدیہ کا لقب دیا۔ ایک مدت کے بعد مہدیہ میں بھی اندرونی اختلاف و افتراق پیدا ہو گیا اور یہ فرقہ بھی دو فرقوں میں بٹ گیا۔ اور اس کا سبب یہ ہوا کہ مستنصر جو محمد مہدی مذکور کی اولاد میں سے تھا۔ اور مصر و دیار مغرب کا بادشاہ تھا اس نے پہلے تو اپنے بعد اپنے بھائی نزار کی امامت کا حکم دیا۔ مگر پھر اپنے بیٹے مستعلیٰ کی امامت کا بھی دو سرا حکم جاری کر دیا۔ لہذا ایک جماعت نے تو پہلے حکم کی تعمیل میں نزار کو امام مانا۔ اور حکم ثانی کو لغو قرار دیا کیونکہ حکم اول نفاذ پا چکا تھا۔ اور ایک دوسری جماعت نے حکم ثانی کو حکم اول کا ناسخ قرار دے کر مستعلیٰ کو امام برحق تسلیم کیا۔

پھر ۲۵۵ھ میں اسمعیلیہ فرقہ میں سے ایک شخص محمد بن علی برقی نامی اہواز میں امامت کے دعویٰ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور خود کو علویہ کی طرف منسوب کیا۔ اگرچہ یہ خود علوی نہ تھا مگر اس کی ماں سے کسی علوی نے نکاح کر لیا تھا۔ اور اس نے اس علوی کے گھریں پرورش پائی تھی اس لئے اس نے علوی کی طرف اپنی نسبت ظاہر کی۔ اور خوزستان بصرہ و اہواز پر اپنا اقتدار جالیا، اور بڑی غفلت کو گمراہ کر ڈالا۔ اس نے اپنے فرقہ کو برقیہ کا لقب دیا۔ معتقد عباسی خلیفہ نے اس کی سرکوبی کو کوشش کر بھیجا جس نے اسے شکست دے کر بھاگ دیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر اس نے شورش کی اور پھر شکست پائی مار دھاڑ کی یہ آنکھ میوئی پندرہ برس جاری رہی بالآخر ۲۶۲ھ میں ایک بہت بڑی فوج اس کی سرکوبی کو بھیجی گئی، باوجودیکہ اس کے ہمراہیوں نے جان کی بازی لگادی مگر شکست سے نہ بچ سکے ہر قید ہو کر بغداد گیا اور معتقد نے اسے سولی چڑھا دیا۔

۲۶۸ھ میں اسمعیلیہ فرقہ میں حکم بن ہشام نامی ایک اور شخص پیدا ہوا۔ اس نے اپنا لقب مقتع رکھا۔ یہ ایک فلسفی

اور سائنسدان شخص تھا۔ ہر صنعت میں ماہر و خصوصاً فنِ بلاغت علمِ شعبہ بازی، جید گری، فلسفہ، سحر اور پیر نیجات۔ میں بہت دیر سے رکھتا تھا، علومِ فلسفہ سے خوب واقف تھا۔ اور عجیب و غریب باتیں اس سے سرزد ہوتی تھیں، اس نے شہرِ سنس میں ایک کنواں بنایا تھا۔ مغرب کے وقت اس کنویں سے ایک چاند نکلتا تھا جس کی روشنی سے پانچ فرسنگ تک کا علاقہ روشن رہتا تھا، رات بھر یہ چاند روشن رہتا تھا اور طلوعِ فجر سے پہلے غائب ہو جاتا تھا۔ مقنع چار خداؤں میں سے اپنے آپ کو چوتھا خدا کہتا تھا۔ شیعہ اس کی باتوں کی تصدیق کرتے جاتے اور اس طرح اس کی جہیت میں اضافہ ہوتا رہتا۔ یہ تعداد اتنی بڑھی کہ سلاطین، ماوراء النہد اس سے عاجز آ گئے، بالآخر غلیظہ بغداد امرائے خراسان اور ملک ماوراء النہر نے اس کی سرکوبی کو اپنے اپنے بھاری لشکر بھیجے۔ اس نے بھی امکان بھر جم کر ان کا مقابلہ کیا۔ آخر جب ہر طرف شکست ہی شکست دکھائی دینے لگی تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مضبوط قلعہ میں جو ایسے ہی کسی خطرہ کے پیشِ نظر پہاڑ کی چوٹی پر بنایا تھا۔ پناہ گزین ہو گیا۔ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر کے اس کی رسد بند کر دی۔ جب اسے موت سامنے نظر آنے لگی تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آگ کا بہت بڑا لاؤ روشن کرو۔

پھر ان سب کو ذرا آمیز شراب پلا کر ختم کر دیا ان کی لاشوں کو آگ میں جلا کر ان کی راکھ ہوا میں اڑادی۔ سب کے بعد خود ایک ایسے ٹھکے میں بیٹھ گیا جس میں تیزابِ فاروق بھرا ہوا تھا، اس تیزاب کی یہ خاصیت تھی کہ اس میں جو کچھ بھی ڈالا جائے پانی ہو کر رہ جاتے۔ چنانچہ وہ بھی پانی بن کر ختم ہو گیا۔ محاصرین کو اندر کا کچھ پتہ نہ تھا وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ اندر موجود ہے۔ اسی قلعہ کے کسی گوشہ میں ایک نوجوان عورت کسی مرض کے سبب بیہوش پڑی تھی۔ جب اُسے ہمیش آیا تو اس نے آگ کے لادو وغیرہ کے مناظر دیکھے۔ مگر وہ گوشہ سے نہیں نکلی اور جب سب کچھ ختم ہو گیا تو باہر نکل کر محاصرین کو بتایا کہ قلعہ خالی ہے

میرے سوا کوئی نہیں۔ یہ سب کچھ فوجی برجن اور فضیلوں پر چڑھ کر قلعہ کے اندر آئے۔ قلعہ کے دروازے کھولے اور فوج اندر گھس آئی۔ خوب دیکھ بھال کی گئی، وہاں انسانی جسم کا نشان تک ان کو نہ ملا۔ آخر اس عورت نے جو کچھ دیکھا تھا ان کو بتایا تب پتہ چلا کہ وہ مرتے مرتے بھی اپنے پس ماندگان کے گمراہ ہونے کے لئے کیا چال بازی کر گیا۔ چنانچہ جب ان ساتھیوں کو جڑی پہلی شکست کے بعد ہی منتشر ہو کر ادھر ادھر دیہات وغیرہ میں چھپ گئے تھے یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے اس واقعہ کو اس کے معبود ہونے کی سچی اور پکی دلیل سمجھ کر خوشی کا اظہار کیا کہ بے شک وہ خدا تھا جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمان پر چلا گیا۔ اور اُسے کاش کہ ہم بھی اسی کے ساتھ چلے جاتے اور اس ترقی سے فائز المرام ہوتے۔

معتقد عباسی کے عہد میں اسی سبیل فرقہ سے ایک شخص ابو سعید بن الحسن بن بہرام جنابی پیدا ہوا۔ ابتداً بحرین میں ظاہر ہوا پھر رفتہ رفتہ ہجر، لما اور قطیف اور تمام بحرین کے شہروں پر قابو پا گیا۔ لوگوں کو باطنی مذہب کی تعلیم دیتا تھا۔ اپنے متبعین کو جنابہ کا لقب دیا۔ ان کا اصول زندگی سکھوں کے اصول سے ملتا جلتا تھا۔ ان کا پیشہ اور زلیعہ معاش دیہاتوں میں لوٹ مار اور مویشی چرانہ قافلوں پر ٹلکے مارنا اور مسلمانوں کو قتل کرنا تھا۔ بالآخر اسی کے ایک خدمتگار نے حام میں اس کو مار ڈالا۔ یہ واقعہ سننے میں پیش آیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا طاہر پاپ کا قائم مقام ہوا۔ اور کافی زور پکڑ گیا۔ سنہ ۱۰۱۷ء میں حامیوں کو پہلے پہل اسی نے لوٹا۔ مذہبِ باطنی کو رائج کیا۔ جب غفاد اور ملک کی مدافعت کو کشش سے اس کی شرکت اور وہد بہ کا زور ٹوٹا تو ایک دوسرا شخص ہمدان نامی قرامطہ میں سے نکلا، اور محمد بن سبیل مذکورہ بالا

کی امامت کی طرف لوگوں کو دعوت دینے لگا۔ اور کہنے لگا کہ وہ نہ مرے ہیں نہ مریں گے، بلکہ وہ زندہ ہیں اور مہدی موعود وہی ہیں۔ وہ ظاہر ہوں گے اور دنیا کو بدل انصاف سے بھر دیں گے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو قرامطہ کا لقب دیا اور یہ لقب ان پر ایسا غالب ہوا کہ پھر کوئی مبارکیہ کو قرامطہ نہیں کہتا تھا بلکہ صرف اس کے متبعین ہی اس لقب سے پکارے جاتے تھے۔ ورنہ حقیقتاً تو یہ ہے کہ یہ لقب تمام مبارکیہ کا ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ اپنے موقع پر بیان کیا جائے گا۔

سند ان کے بعد ایک شخص ابن ابی السمرطیؒ کھڑا ہوا، یہ حمدان کا مخالف تھا۔ اور کہتا تھا کہ اسلمیل کے بعد امامت ان کے بھائی محمد کو ملی پھر ان کے بھائی مزی کاظم رحمہ اللہ علیہ کو ان کے بھائی عبداللہ الطی بن حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ اور ان کے بعد ان کے بھائی اسحاق بن جعفر امام ہیں۔

وہ محمد بن اسماعیل کی امامت کا معبر نہیں تھا البتہ ان کی حیات اور پھر ظاہر ہونے کو نہیں مانتا تھا اس نے اپنے گروہ کا نام شیطیہ رکھا۔ پس یحییٰ بن خلیفہ، برقیہ، متغیہ، جنابیر اور قمریہ سب کی سب باطنی فرقہ کی شاخیں ہیں۔ اصول و مفاد میں سب کے سب متفق ہیں۔ البتہ بعض فرقہ میں باہم مختلف ہیں، باطنی فرقہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ احکام کے باطن پر عمل کرنا فرض ہے ظاہر پر نہیں۔ اسی لئے ان کو باطنیہ کہا جاتا ہے۔ البتہ ان میں سے متغیہ فرقہ کا اختلاف بنیادی ہے۔ اس لئے کہ وہ متغیہ کی اہمیت کے قائل ہو گئے تھے۔

ابلی تاریخ لکھتے ہیں کہ برقی، متغی اور قمری باہم خفیہ مراسلاتی روابط رکھتے ہیں اور سب کے سب اعتراض و مقام میں متفق تھے کیونکہ ان کا واحد مقصد جس رنگ اور جس طریقہ سے بھی ممکن ہو مسلمانوں کو قتل کرنا، ان کے مذہب کو درہم برہم اور اہل اسلام کی بیخ کنی اور لوگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا تھا۔ ان میں اقتراح ابوزری ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے باطنی مذہب ایجاد کیا اور برقی وہ پہلا آدمی ہے جس نے تقیہ ترک کر کے علی الاعلان اور براہ راست مذہب کا اظہار کیا۔ اس کے بعد اس کے بعد متغی، اور جنابی پھر زاریہ میں سے حسن اور اس کی اولاد اور مہدیہ کہ جس کے آغاز کا حال پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ سب اگرچہ اصل عقیدہ کے لحاظ سے اسماعیلی تھے، لیکن جب مصر اور شریعت کی دلائل ان کے ہنرمندی کی آئی تو لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر ظاہری احکام شریعت کی پابندی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ یہ خود بھی ظاہری احکام شریعت کے نفاذ پر بہت زور دینے لگے مگر تنہائی میں اپنے خاص لوگوں میں باطنی مذہب کی تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔

مذکورہ بالا تقبیلات سے فہیم و سیدہ لوگ درج ذیل نتائج تک ضرور سامان حاصل کر سکتے ہیں۔

اول۔ شیعہ مذہب کے وجود میں آنے کا باعث وہ نفاق یا دغی تھی۔ جو اس کے موجد مسلمانوں کے بارے میں رکھتے تھے، جیسے عبداللہ بن سبا اور اس کے بھائی، کہ وہ یہودیت کے سبب مسلمانوں سے زخم اٹھا کر اور ذلیل و خوار ہو کر، اپنے دلوں میں غار رکھتے تھے۔

دوسرے۔ حکومت و اقتدار کا لالچ۔ جو واقعہ غار و کیسان سے ظاہر ہے۔

تیسرے۔ امام زادہ حضرت زید فہید رحمہ اللہ علیہ کے ساتھ مخالفت، جو شاہین اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے ظاہر ہوئی۔ چوتھے۔ کفر الٰہی سے لگاؤ اور تکالیف شریعت سے گریز، جس خیال میں کہ عبداللہ بن میمون اقرار کرتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ شیعہ مذہب کے اصولی صرف پانچ ہیں، کیونکہ ابتدائی فرقے بھی پانچ تھے، یعنی شیعہ اولیٰ، خلاۃ، کیسانیہ، زیدیہ اور امامیہ شیعیان اولیٰ کے دو فرقے شمار ہوتے ہیں۔ پہلا فرقہ ان اہل سنت و اجماعت مخلصین کا

ہے جن میں مہاجرین و انصار صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم شامل ہیں، جو ہمیشہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے رفیق اور ان کی خلافت کے مددگار رہے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ برحق ہیں اور ان کی اطاعت سب مسلمانوں پر فرض ہے اور یہ کہ وہ اپنے زمانہ کے موجودین میں سب سے افضل ہیں جس نے ان کی خلافت کی مخالفت کی اور ان کو لائق خلافت نہ سمجھا وہ باغی و گمراہ اور خطا کار ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ و علم و نہیر رضی اللہ عنہم کو ان کی خلافت کے بارے میں کوئی نزاع نہ تھا بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے تعاص یعنی میں جلالت اداس میں تاخیر کرنے یا نہ کرنے میں اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف بھی دور ہمنے والا اور باہم صلح و صفائی ہوا ہی چاہتی تھی کہ عبداللہ بن سبا اور اس جیسے لوگوں نے طرفین کے سرداروں کے مشورہ اور مرضی کے بغیر لڑائی چھیڑ دی، اور پھر جو کچھ نہ ہوا تھا ہوا۔

غرض تمام بزرگوں نے خصوصیت کے ساتھ خلافت کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لیاقت و قابلیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ ان کو اہل عصر میں بہترین جانتے اور مانتے تھے ان کے حماس اور غریبوں کے نہ صرف معترف تھے بلکہ علی الاعلان ان کو بیان بھی کرتے تھے۔

اور اس فرقہ کا یہ بھی مذہب تھا کہ جس طرح کلام اللہ اور کلام رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر پر محمول کیا جاتا ہے اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال اور کلام کو ظاہر پر محمول کرنا چاہیئے نہ کہ تفسیر اور ظاہر داری پر۔ کیونکہ خلیفہ برحق پیغمبر کا نائب ہوتا ہے تو پیغمبر کے اقوال جس طرح ظاہر پر محمول ہوتے ہیں ایسے ہی خلیفہ کے کلمات کا بھی معاملہ ہے۔

پس حضرت علی رضی اللہ عنہ بعض صحابہ کو خود پر فضیلت دینے کے بارے میں فرماتے یا ان اصحاب کے حماس و خوبیاں بیان فرماتے ہیں جو آپ سے برسرِ بیکار تھے۔ ان سب پر بلا شک و شبہ یقین کرنا اور ان کو ماننا چاہیئے کہ وہ حول اعتقاد یا عمل سنت مصطفویٰ علی صاحبہا الف الف تحنیتہ جو صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے اس کو غائب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے درست اور ٹھیک فرمایا ہے۔ اور تمام صحابہ کی درجہ بدرجہ مدح و توصیف فرمائی ہے، جسکی تفصیلات انشاء اللہ اس کتاب میں آگے آئے گی۔ اس فرقہ کے ان ہی خیالات و عقائد کی بنا پر ان کو اہل سنت والجماعت کا لقب دیا گیا، کیونکہ یہ لوگ ان تمام اقوال و کلمات کو جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صحابہ کے حق میں فرمائے ظاہر پر محمول کیا اور سب صحابہ رضوان اللہ علیہم کے درجہ بدرجہ معتقد ہوئے۔ دوسرا فرقہ تفصیلیہ ہے، جو اگرچہ شیعانِ اولیٰ میں تو داخل نہیں ہے لیکن ایک مسئلہ تفصیل کو چھوڑ کر باقی تمام مسائل

و معاملات میں اہل سنت کے ساتھ متفق اور ان کا اعتقاد و عمل بھی صحابہ کرام سے مروی ہے اس لئے اختلاف و انتشار کو پیشینہ اور بات کو مختصر کرنے کے محاورے و اصول کے مطابق ان کو بھی شیعانِ اولیٰ میں شامل کئے لیتے ہیں، ان کا مذہب یہ ہے کہ صرف حضرت علی اور ان کی اولاد (رضی اللہ عنہم) ہی خلافت کی حقدار ہے تا وقتیکہ وہ خود اپنی مرضی سے اپنا یہ حق دوسروں کو منتقل نہ کر دیں اسی بنا پر چونکہ جناب خفین رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر سب کا اتفاق ہو چکا تھا ان کی خلافت کو حق جانتے اور درست تسلیم کرتے ہیں، اور یہ حقداران جب خود دعویدار ہوں تو پھر کسی دوسرے کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل الناس مانتے ہیں۔ اور صحابہ کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔ اور ظلم و غضب اور گمراہی کی نسبت ان کی طرف ہرگز نہیں کرتے۔ گویا یہ لوگ سوائے مسئلہ تفصیل کے کسی بھی مسئلہ میں شیعانِ اولیٰ سے مخالفت نہیں رکھتے۔

اور فرقہ اسمعیلیہ کا مذہب اگرچہ (امامیہ سے) بالکل جدا ہے۔ انتشار کو کم کرنے کی غرض سے ان کو امامیہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ شیعانِ ادنیٰ جس میں اہل سنت اور اہل تفسیل دونوں شامل ہیں، پہلے شیعہ ہی کہے جاتے تھے مگر جب سے خلاۃ (عالی) و واقف (زیدیوں) اور اسمعیلیوں نے اپنے لئے شیعہ لقب اختیار کیا اور ان کے اعمال و عقائد کی تباہی اور مضر ظاہر ہونے لگے تو حق و باطل کے مل جانے کے خطرہ کے پیش نظر فرقہ سنیہ و تفسیلیہ نے اس لقب کو اپنے لئے ناپسند کر کے ترک کر دیا اور اس کی بجائے اہل سنت والجماعت کا لقب اختیار کیا۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ تاریخ کی قدیم کتابوں میں اساطین اہل سنت کے لئے جمیع الفاظ (فلاں من الشیعۃ و من شیعۃ) مذکور ہیں۔ قویہ الفاظ اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ پہلے ایسے حضرات شیعانِ ادنیٰ کا یہ لقب تھا۔ واقفی کی تاریخ اور استیعاب میں اس قسم کے الفاظ بہت آتے ہیں لہذا اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ یہ حضرات مذکورین سرگز ایسے شیعہ نہ تھے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور مددگاری کے سبب شیعانِ علی (علی کے ساتھی) کہلاتے تھے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے بھی معلوم ہوا خلاۃ کیسا نبیہ اور اسمعیلیہ فرقے ایسے ہیں کہ جن کو بلا اختلاف کا فرمایا جاسکتا ہے یا سرحد ٹھیرایا جاسکتا ہے۔ باقی رہے زیدیہ و واقف جو خود کو امامیہ کہتے ہیں ان کی تکفیر میں اختلاف ہے اس میں حق بات یہ ہے کہ ان کو باہم ایک دوسرے پر نفیلت ہے۔ اس کا بیان بھی انشاء اللہ آگے آئے گا۔

اور خلاۃ، کیسا نبیہ، زیدیہ اور واقف (امامیہ) بہت سے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں جن کے ناموں اور مذہبوں کی تعداد کتاب مل و نخل اور دوسری بڑی کتابوں میں ملتی ہے اس کا تذکرہ یہاں بے فائدہ ہے اس لئے کہ اصل کی پہچان کے بعد تابع کی پہچان خود بخود ہو جاتی ہے اور اصل کے فساد سے تابع کا ناسخ و خود ہی عیان ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم ناظرین کتاب کی دلچسپی اور تفریح طبع کے طور پر، اس تفصیل کا مختصر جمال بیان کرتے ہیں۔

عالی شیعوں کے چوبیس فرقے

خلاۃ (عالی فرقہ) کے چوبیس فرقے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) فرقہ سبائیہ۔ یہ پہلے فرقہ مہدائ بن سبا کے شاگردوں، ساتھیوں اور ہم عقیدہ لوگوں کا ہے۔ یہ کہتے تھے کہ حضرت علی مجبور حقیقی ہیں وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ ابنِ آدم نے ایک شیطان کو مارا ہے جو آپ کی شکل اختیار کر گیا تھا (نور ہالند) بھلا شیطان لعین آپ کی پاک شکل میں کیسے منتقل ہو سکتا تھا۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ابرہ میں پوٹھیرہ ہیں، اور یہ بجلی کا کرکٹ کا آپ کی آواز ہے اور بجلی آپ کا گڑا ہے۔ اسی لئے جب یہ لوگ ہاول کی گرج سٹنٹے میں تو کہتے ہیں الصلوٰۃ والسلام علیک یا امیر المؤمنین ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ ایک مدت کے بعد مدول فرمائیں گے اور اپنے دشمنوں کو زبردست ہر کر ڈالیں گے۔ ان لوگوں کے کلمات باہم ایک دوسرے کا رد کرتے ہیں اور لا یعین ہی اس لئے کہ ابرہ کی سمت کھڑک اور بجلی گرا کر جب ایک عالم کو مار سکتے ہیں تو اپنے دشمنوں کے بارے میں یہ ڈھیل کیوں اور یہ انتظار کس کا؟

(۲) فرقہ مفسیلیہ۔ یہ فرقہ مفسیل میری نامی ایک شخص کے ساتھیوں کا ہے جب سبائی مذہب برائیوں کا نشانہ اور لعنت و طعوت

کا بدت بنا قرآن لوگوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اور یوں کہنے لگے کہ جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ سے وہی نسبت ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے تھی۔ بقول نصاریٰ کہ لا ہوت ونا سوت دونوں ہام مل کر ایک چیز ہو گئے ہیں۔

اس فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور جس بھی کسی کا اتحاد ذات لاہوت سے ہوا وہ نبی ہے اور جس نے رہنمائی عالم اور گمراہوں کی ہدایت کو اپنا پیشہ بنا دیا وہی رسول ہے۔ اس لئے اس فرقہ میں نبوت و رسالت کے دواوہ بہت گز رہے ہیں۔

(۳) فرقہ میسرغیہ۔ یہ فرقہ میسرغ کے ساقیوں کا ہے۔ ان کا بھی وہی مذہب ہے جو مغنلیہ کا ہے فرقہ صرف اتنا ہے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق لاہوت کا حلول صرف پانچ ہستیوں میں ہوا ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہم۔

(۴) فرقہ بیزغیہ۔ یہ گروہ بیزغ بن یونس کے ساقیوں کا۔ یہ فرقہ حضرت جعفر کے اللہ ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اپنی اصلی صورت میں نظر نہیں آتے تھے۔ بظاہر جس ہستی کو لوگ جعفر کہتے تھے۔ وہ ان کی اصل شکل و صورت نہ تھی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ان کے ملاوہ کوئی اور اہام الارہیت نہیں رکھتا۔ البتہ وحی کا نزول، معراج کا حصول اور عالم ملکوت کی سیر یہ باتیں تمام انہ کو حاصل ہوتی ہیں۔

(۵) فرقہ کاملیہ۔ یہ کامل کے ساقیوں کی جماعت ہے۔ یہ لوگ دو حوں کے تنازع کے قائل ہیں، یعنی کہ روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہے، یہ کہتے ہیں کہ روح الہی پہلے آدم علیہ السلام کے بدن میں آئی۔ پھر شیث علیہ السلام کے پھر اسی طرح سلسلہ مسلسلہ تمام انبیاء علیہم السلام و انہ کے ابدان میں منتقل ہوتی رہی اسی طرح بنی آدم کی ارواح ایک دوسرے کے ابدان میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

یہ لوگ صحابہ کو کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی اور شامیہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی کافر کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنا جائز حق کیوں چھوڑا۔ اسی سے یہ بات معلوم ہوتی کہ ان کے نزدیک انتقال و حلول روح الہی کے لئے ایمان بھی شرط نہیں در نہ حضرت علیؓ کی تکفیر ممکن نہیں تھی۔

(۶) فرقہ مغیریہ۔ یہ مغیرہ بن سعید عجل کی ٹوٹی ہے، یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک نورانی شخص کی صورت میں ہے جس کے سر پہ تاج ہے اور اس کا دل حکمتوں کا سرچشمہ ہے۔

(۷) فرقہ جناحیہ۔ یہ لوگ بھی تنازع ارواح کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ روح الہی حضرت آدم و شیث علیہما السلام اور تمام انبیاء کے ابدان سے منتقل ہوتی ہوئی پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک آئی، اور پھر جناب علی رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہما اور محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ میں اور ان کے بعد عبد اللہ بن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر میں منتقل ہوئی یہ بات بھی اسی ترتیب سے مانتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک بدن انسانی میں روح الہی کے حلول ہی کا نام نبوت یا امامت ہے۔ یہ قیامت کے منکر ہیں اور حرام اشیاء کو حلال کہتے ہیں۔

(۸) فرقہ بیانہ۔ یہ بیان بن سحان نہدی کا گروہ ہے خدا تعالیٰ کو اسی شکل و صورت کے ساتھ جانتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن میں حلول کیا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بدن میں پھر محمد بن الحنفیہ کے بدن میں پھر ابو ہاشم ابن محمد بن الحنفیہ کے بدن میں۔ اس کے بعد بیان بن سحان

کے بدن میں۔ اور کہتے ہیں کہ لاہوت، ناسوت کے ساتھ مل کر میان کے رتبہ پہ میں ایسا سرایت کر گیا ہے جیسے کوئلے میں آگ اور مٹی میں گلاب۔

(۹) فرقہ مشنودریہ۔ یہ ابو منصور علی کے ساتھیوں کا گروہ ہے۔ یہ اس بات کے قائل ہیں کہ رسالت ختم نہیں ہوئی۔ عالم قدیم ہے احکام شریعت ملاؤں کی گھڑت ہے۔ جنت و دوزخ خیالی ہیں ان کوئی حقیقت نہیں۔ امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کے بعد ابو منصور کو امام مانتے ہیں۔

(۱۰) فرقہ عثمانیہ۔ اس فرقہ کو زہر بھی کہتے ہیں۔ یہ اس بات کے معتقد ہیں کہ پروردگار عالم موسم بہار میں ابر کی شکل میں زمین پر نازل فرماتا ہے اور دنیا میں پھر لگا کر پھر آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ اور یہ سب پھول پھولاری میوہ و غلہ اور باغ و بہار اسی کا اثر ہے۔

(۱۱) فرقہ اموویہ۔ یہ فرقہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نبوت در رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک و سہم مانتا ہے۔

(۱۲) فرقہ تفویضیہ۔ اس فرقہ کے لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے امور دنیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سپرد کی اور چار رج میں دے دیئے تھے۔ اور جو کچھ دنیا میں ان کے لئے حلال کر دیا تھا۔

اس فرقہ کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ چار رج حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ کیے گئے تھے۔ اور بعض دوسرے اس کے قائل ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کے سپرد کیا تھا۔

(۱۳) فرقہ خطابیہ۔ یہ فرقہ ابو الخطاب محمد بن ربیع الاخذع الاسدی کے ساتھیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ تمام ائمہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اور حضرت علی اور جعفر دونوں کو امام مانتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بڑا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو چھوٹا۔

اور ابو الخطاب کو پیغمبر ماننے کے بعد ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ گذشتہ تمام انبیاء کرام علیہ السلام نے نبوت ابو الخطاب کے حوالہ کر دی ہے۔ اور سب لوگوں پر اس کی اطاعت فرض کر دی ہے۔

ابو الخطاب اپنے ماننے والوں کو یہ نصیحت کرتا تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے بوقت ضرورت جھوٹی قسم کھا لینا۔ اس لئے فقہ کی کتابوں میں یہ طعن ہے کہ خطابیہ کی گواہی غیر معتبر اور ناجائز ہے۔

(۱۴) فرقہ معمریہ۔ یہ فرقہ معمر کی طرف منسوب ہے۔ یہ امام جعفر کی امامت کے قائل ہیں اور ان کے بعد ابو الخطاب کو نبی جانتے ہیں اور اس کے بعد معمر کو۔ ان کا عقیدہ ہے کہ احکام شرع معمر کو سپرد ہو گئے تھے اور وہ جو کچھ آخرا انبیاء تھے اس لئے اس نے تمام احکام ساقط کر دیئے اور تکلیفات شرع کو ختم کر دیا۔ یہ فرقہ خطابیہ ہی کی ایک شاخ ہے۔

(۱۵) فرقہ طرابلسیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تھا مگر انہوں نے پہچان میں غلطی کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دی اور ایسا اس وجہ سے ہوا کہ یہ دونوں حضرات شکل و شبہت میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے تھے۔ ان دونوں کی شبہت اس سے بھی زیادہ تھی جتنی ایک کوئے کو دوسرے کوئے سے ہوتی ہے۔ لہذا حضرت جبرائیل کے لئے ان میں باہم تمیز ممکن نہ رہی۔ حضرت جبرائیل کی اسی غلطی میں واقعی کیشک ہو سکتا ہے کہ نو دس سالہ نو عمر لڑکے اور چالیس سالہ بزرگ میں بھی تمیز نہ

کہ سیکے کہ بچے کے لئے دی گئی دجی ادھبڑ عمر بزرگ کو پہنچا دی اور پھر ۲۳ سال مسلسل اس بھول کا شکار رہے (مترجم)۔
اس فرقہ کے ایک شاعر نے اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ خَلَقَ الْاَیْمٰنُ فَاَوْفَا حَاقِنَ حَیْدَیَ یعنی جبریلؑ نے غلطی کی کہ حضرت علیؑ کو چھوڑ کر دجی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دی۔
ایک دوسرا فارسی گو شاعر کہتا ہے۔

جبریل کہ آمد ز بر خالق بے چوں در پیش محمد شد و مقصود علی بود

اور یہ باتیں قرآن کے پڑھے لکھے لوگوں کی ہیں، جاہل تو لعنة اللہ علی صاحب الریش کے صریح الفاظ کے ساتھ حضرت جبریل علیہ السلام پر لعنت بھیجتے ہیں۔

(۱۶) فرقہ ذباہیم۔ یہ فرقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آلہ مانتا ہے۔ یہ کہتے ہیں ان حضرات کی صورتوں میں اس سے زائد مشابہت تھی جتنی ایک لکھی کو دوسری لکھی سے ہوتی ہے۔ یہ فرقہ غزالیہ کا وہ فرقہ ہے جس نے اپنے عقیدہ کو چھوڑ کر دوسرا عقیدہ اختیار کر لیا ہے۔

(۱۷) فرقہ ذمیمہ۔ اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آلہ ہیں۔ انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی طرف اس لئے بھیجا تھا کہ وہ انہیں علی کی طرف دعوت دیں لیکن اس کے برخلاف وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینے لگے ماسی لئے یہ فرقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برائی کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اسی سبب سے اس کا نام ذمیمہ ہو گیا۔

(۱۸) فرقہ اثنیہ۔ یہ فرقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کو خدا مانتا ہے اس فرقہ میں پھر دگر وہ ہونے ایک صورت کی خدائی کو ترجیح دیتا اور غالب و قوی بتاتا ہے۔ جبکہ دوسرا حضرت علیؑ کو۔

(۱۹) فرقہ حمسیہ۔ یہ وہ فرقہ ہے جو پانچوں کو خدا مانتا ہے۔ یہ لفظ فاطمہؑ میں تاثیر کی تا نہیں لگاتے۔ اور کہتے کہ پانچوں در حقیقت شخص واحد ہیں۔ کہ ایک ہی روح سب میں حلول کئے ہوئے ہے ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ (پانچوں سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔

(۲۰) فرقہ نصیریہ۔ یہ فرقہ حضرت علی اور آپ کی اولاد میں سے جن کو وہ امام مانتے ہیں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ان میں خدا حلول کر گیا ہے اور کبھی یہ حجاز اسم اللہ حضرت علیؑ کے لئے بولتے ہیں گویا سال کا اطلاق عمل پر کرتے ہیں۔

(۲۱) فرقہ اسماعیلیہ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زمین کبھی بھی پیغمبر سے خالی نہیں رہتی۔ یہ بھی حضرت علیؑ اور انہیں خدا کے حلول کے قائل ہیں البتہ اس امر میں باہم اختلاف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد پہلے کس میں حلول ہوا۔

(۲۲) فرقہ غلبانیہ۔ یہ غلبانہ ادویہ اسدی با اوسی کے ساتھیوں کا فرقہ ہے، یہ بھی حضرت علیؑ کی الوہیت کے قائل ہیں اور آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل مانتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں حضور نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کر کے انکی متابعت خود پر لازم کر لی تھی۔

(۲۳) فرقہ ندرامیہ۔ ان کے نزدیک سلسلہ امامت یوں ہے، حضرت علی، بعدہ محمد بن الحنفیہ پھر ان کے بیٹے ابو ہاشم پھر ان کی وصیت کے مطابق علی بن عبد اللہ بن عباس ان کے بعد محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس، اسی طرح سلسلہ جاری رکھتے ہوئے منصور و درانی تک پہنچاتے ہیں۔ اور ابو مسلم مروزی میں جو صاحب دعوت عباسی تھا، اللہ تعالیٰ کا حلول مانتے ہیں اسی وجہ سے ان کا شمار بھی غالیوں میں ہوا، یہ لوگ تارک فرائض ہیں اور حرام چیزوں کو حلال بتاتے ہیں۔

(۶۴) فرقہ مقنعین۔ یہ گروہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد مقنع کو الہ مانتے ہے اور کہتا ہے کہ خدا چار ہیں۔ مقنع کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یہ دراصل اسماعیلی تھا، جب الہیت کا دعو بدار ہوا تو غالبوں میں اس کا بھی شمار ہوا۔

اس ساری تفصیل سے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ مذہب خلاۃ کا دار و مدار بنی امام کو الہ یا اس میں الہ کے حلول کو مانتے پر ہے۔ لیکن تین میں امام کے بارے میں خود ہی تین مذہب کیسا نیہ۔ دیدیہ، امامیہ۔ پیش نظر ہیں۔ ان خلاۃ میں بعض کیسا نیہ ہیں اور بعض امامیہ، البتہ زیدیہ میں سے اب تک کسی کو خلاۃ نہیں سنا گیا کہ وہ حضرت زید و ولید علیہ میں سے یا ان کی اولاد میں سے کسی کو الہ مانتے یا ان میں الہ کے حلول کے قائل ہوں۔ اس لئے ان چوبیس فرقوں میں ان کا نام نہیں آیا۔

کیسان۔ اور اس کے فرقے | فرقہ کیسا نیہ کے متعلق یہ واضح رہے کہ کیسان کے متعلق تحقیق میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے جو مری صاحب سماح اللہ تعالیٰ عنہ کی تحقیق ہے کہ مختار کا نام ہی کیسان ہے اور صاحب قاضی اور اکثر اہل لفت بھی اس کی تائید کرتے ہیں لیکن ثقہ اور معتدل تاریخ کے نزدیک وہ ایک الگ شخصیت ہے جو حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا پیر و اور جناب محمد بن الحنفیہ کا شاگرد تھا۔ آپ سے اس نے اکتساب فیض کیا اور بہت سے عجیب و غریب علوم حاصل کئے۔ اسی کیسان کے متعلق اور پیر و کا رد کو کیسا نیہ کہتے ہیں۔

کیسان کے پیروؤں کے چہرہ گردہ اور فرقے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

(۱) فرقہ کریمیہ۔ یہ البرکرب مزید کے ساتھیوں کا فرقہ ہے یہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد جناب ابوالقاسم محمد بن الحنفیہ کی امامت کے قائل ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعمرہ میں نشان لکھ کر ان ہی کے سپرد کیا تھا گویا ان کے نزدیک یہ امامت پر دلیل قطعی ہے۔ یہ لوگ ان ہی محمد بن الحنفیہ کے متعلق جی لا یؤت زندہ ہیں مری کے نہیں) کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ صاحب الزمان ہیں، کوہ و مری کے دلوں میں قدرت الہی سے ان کے لئے وہیں دو چٹے شہد اور دو دھکے جاری ہیں۔

ایک شاعر کثیر غزہ نامی بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتا تھا، اس کے یہ اشعار اس عقیدہ کا ثبوت دیتے ہیں وہ کہتا ہے۔

وَسَبَّطُ لَا يَذُوقُ الْمَوْتَ حَتَّى
يَقُودُ الْخَيْلَ يَعْقِدُ مَهَا الْوَأْدَ
يَعْتَبُ فَلَا يَرْتَعِلُ فِيهِمْ نَمَانًا
بِرَّ مَتَوَعَّى عِندَ كَأَسَلٍ وَمَاءَ

ترجمہ۔ یہ وہ بیٹا ہے جو اس وقت تک موت سے ہلکا نہیں ہو گا جب تک آگے اڑتے ہوئے جھنڈے والے لشکر کی قیادت نہ کرے۔ اس وقت تک وہ غائب رہے گا اور لوگ اپنے میں ان کو نہ دیکھیں گے کوہ و مری میں اس کے پاس پانی اور شہد موجود ہے۔

شیعروں میں البرکرب وہ پہلا شخص ہے جو امام صاحب الزمان کے غائب ہو جانے کا قائل ہوا اور امام کا دشمنوں کے شکنجے سے چھینا اور کھرمہ ظاہر ہونے کے عقیدہ کا بھی یہی موجب ہے۔ شیعروں کے تمام فرقوں نے امام مفقود کے بارے میں دل کی تسلی کے لئے یہ سبق اسی البرکرب سے سیکھا ہے۔

(۲) فرقہ اسحاقیہ۔ یہ فرقہ اسحاق بن عمر کے ساتھیوں پر مشتمل ہے یہ لوگ جناب محمد بن الحنفیہ کی موت کے قائل ہیں اور

کہتے ہیں ان کی وفات کے بعد امامت ان کے بیٹے ابو ہاشم کو منتقل ہو گئی۔ جو ان کی اولاد اور اولاد منتقل ہوئی۔ کیونکہ ہر امام اپنے بیٹے کے لئے وصیت کر جاتا تھا۔

(۴) فرقہ حرمیہ۔ یہ فرقہ کندی بھی کہلاتا ہے۔ یہ لوگ عبداللہ بن حرب کندی کے پیرو ہیں۔ یہ جناب ابو ہاشم رحمہ کے بعد عبداللہ بن حرب کو امام مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابو ہاشم رحمہ نے اس کے حق میں وصیت فرمادی تھی۔

(۵) فرقہ حماسیہ۔ اس فرقہ کے لوگ علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو جناب ابو ہاشم کی وصیت کی بنا پر امام مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے منتقل ہوئی ہوئی منصور عباسی تک پہنچی ہے۔

(۶) فرقہ طیارہ یہ۔ ان کا کہنا ہے کہ بمطابق وصیت جناب ابو ہاشم رحمہ جناب عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب امام ہوئے۔

(۷) فرقہ مختارہ یہ۔ اس گروہ کے لوگ حضرات حسین رضی اللہ عنہما کی امامت کے بارے میں کیسانہ سے اختلاف رائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرات حسین رضی اللہ عنہما نے امامت پائی اور ان کے بعد حضرت محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ نے۔ اس اختلاف کا سبب پہلے بیان ہو چکا ہے۔

زید یہ اور اس کے فرقتے | اس فرقہ کے اصحاب اپنے آپ کو جناب زید بن علی بن الحسین بن علی رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مگر اختلاف سے یہ بھی محفوظ نہیں رہے۔ اور فرقوں میں بٹ گئے، جن کا بیان یوں ہے۔

(۱) خالص زیدیہ۔ یہ حضرت زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب ہیں جنہوں نے اولاد عبدالملک بن مروان پر لشکر کشی کرتے وقت آپ سے بیعت کی، یہ اصول مذہب اور کچھ فروعات کی روایت جناب زید سے کرتے ہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر تبری نہیں کرتے۔ بلکہ سب کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں اور اسی تبرائے کرنے پر مصدقہ روایات حضرت زید سے نقل کرتے ہیں۔

یہ کہتے ہیں کہ گواہ امامت کا حق حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو پہنچا تھا مگر آپ نے جناب شیخین و ذی النورین رضی اللہ عنہم کے بارے میں خود اپنے حق سے دست برداری فرمائی تھی۔

یہ اس کے بھی قائل ہیں کہ خلعانے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت درست تھی کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے راضی تھے اور معصوم کبھی غلط اور باطل پر راضی نہیں ہوتا۔ غرض تمام ساسلی امامت پر ان کا مذہب اہل سنت کے مذہب سے ملتا جلتا ہے۔ اختلاف صرف اتنا ہے کہ یہ امام کے لئے فاطمی ہونے کو شرط قرار دیتے ہیں اور اس کے سپرد کرنے سے کسی دوسرے کو امام مانتے ہیں۔ گویا شیعیان اولیٰ کا فرقہ ثانیہ اس فرقہ کی اصل ہے لیکن ان کے پچھلے لوگوں نے معتزلہ اور دوسرے شیعول کے میل جول اور اثر میں آکر اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اور اصل مذہب سے بہت دور جا پڑے؛ کہا جاتا ہے کہ جناب امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید کی امامت سے متفق تھے۔ ان کے خروج کو درست جانتے تھے اور لوگوں کو ان کی رفاقت کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ اسی لئے زید سے فروع میں مذہب حنفیہ سے متفق ہیں مگر اصول میں معتزلہ کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲) فرقہ جہارودیہ۔ یہ گروہ ابوالجبار ودنیادین ابی زیاد کے دوستوں کا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بدلیل وصف، بدلیل تعین نام حضرت علی رضی اللہ عنہ امام تھے۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے چونکہ ان کی اقتداء

نہیں کی اس لئے ان کو کافر قرار دیتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد بالترتیب حضرات حسین رضی اللہ عنہما کو امام مانتے ہیں۔ اور ان کی امامت کے بعد انکی اولاد میں امامت شریعی کے معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان میں جو تنوار تمام کراٹھ کھڑا ہو اور وہ عالم دشمنان بھی ہو وہی امام وقت ہے۔ چنانچہ زید بن علی اور یحییٰ بن زید کو بھی امام مانتے ہیں۔ البتہ امام منتظر کے بارے میں ان میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں وہ محمد بن عبد اللہ بن حسن بن حسن ہیں جو عہد منصور میں مدعی امامت ہوئے۔ اور مقتول ہوئے ان کے اقتقاد میں یہ اب بھی زندہ ہیں مقتول نہیں ہوئے۔

بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ وہ محمد بن حسن طالقانی ہیں جو منعم کے عہد میں اس کے قاتل کیا اور قید آئے اور حالت اسیری میں ہی وفات پائی۔ مگر یہ ان کی وفات کے منکر ہیں۔

ان کی ایک اور جماعت یہ کہتی ہے کہ وہ یحییٰ بن عمر ہیں جو جناب زید بن علی بن حسین کے پوتوں میں سے ہیں جن کو صاحب الکوفہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مستقبین کے عہد میں ہوئے اقبال کیا اور پھر مقتول ہوئے۔ مگر یہ جماعت ان کے قتل کی بھی منکر ہے۔

(۳) فرقہ جریر یہ۔ اس فرقہ کو سلیمانہ بھی کہتے ہیں، یہ سلیمان بن جریر کے پیروکاروں کی جماعت ہے یہ بھی امامت شریعی کے معتقد ہیں اور کہتے ہیں کہ دونیک بخت مسلمانوں کی رخصانہ مذی سے بھی امامت درست تسلیم کر لی جاتی ہے حضرت ابوبکر و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی امامت کو تو مانتے ہیں مگر ان سے بیعت کرنے والوں کو خطا کا کہتے ہیں اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ان حضرات کی بیعت کیوں کی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کو کافر بتاتے ہیں۔

(۴) فرقہ تبریہ۔ اس کا لقب تو تبریہ بھی مشہور ہے۔ یہ مغیرہ بن سعد جس کا لقب تبرہ تھا کے ساتھیوں کا گروہ ہے یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی امامت خطا پر مبنی نہیں تھی کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر سکوت فرمایا تھا اور جس بات پر معصوم سکوت کرے حق ہوتا ہے، البتہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی امامت تسلیم کرنے میں ان کو تامل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رخصانہ مذی و سکوت اس معاملہ میں حب و طوائف ثابت نہیں۔ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیعت کے وقت سے امام مانتے ہیں۔

(۵) فرقہ نجیبیہ۔ یہ نعیم بن الیمان کے دوستوں کا گروہ ہے، ان کا اور تبریہ کا مذہبی مسلک ایک ہے۔ فرقہ صرف یہ ہے کہ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں اور ان پر تبریہ بھی کرتے ہیں۔ باقی صحابہ کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

(۶) فرقہ دکنیہ۔ جو فضل بن دکن کی طرف منسوب ہے ان کا مذہب جباردہ سے ملتا ہے فرقہ یہ ہے کہ یہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر اور ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہم کو کافر کہتے ہیں اور باقی اصحاب رسول کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

(۷) فرقہ خشبیہ۔ یہ خلف بن عبد الصمد کے ساتھیوں کا گروہ ہے۔ یہ اولاد فاطمہ میں امامت شریعی کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کوئی غیر مستحق جامہ امامت زیب بر کرے تو اس کی مخالفت واجب ہے ان کو خشبیہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اپنے وقت کے بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو تیر و تنوار سے مسلح ہونے کے بجائے لالچی اور ڈنڈے ان کا ہتھیار تھے اور لنت عرب میں خشب لکڑی کو کہتے ہیں۔

(۸) فرقہ یعیقوبیہ - یہ یعقوب کے ساتھیوں کی ٹولی ہے۔ یہ رجعت کے قائل ہیں، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی امامت کو نہیں مانتے بلکہ ہر دو حضرات گرامی پر قبر بڑی بازی کرتے ہیں۔

(۹) فرقہ صالحیہ - جو حسین بن صالح کی طرف منسوب ہے۔ یہ بھی اولاد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں امامت شوری کے قائل ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ فاطمیں میں سے جو بھی صفات علم شجاعت اور سخاوت سے متصف ہو کر ابھرے وہ امام ہے ان کے اور زیدیوں کے نزدیک ایک زمانہ میں ایک ملک میں ایک وقت کئی اماموں کا ہونا ممکن ہے۔

امامیہ - اور اس کے فرقے | اب رہا فرقہ امامیہ قرآن کے مذہب کا دار و مدار اور ان کے تمام فرقوں کا مشترکہ عقیدہ یہ ہے کہ دامن تکلیف شرعاً ائمہ فاطمیہ سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ اس ایک فرقہ سے ان تالیس فرقوں نے جنم لیا۔ جن کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

(۱) فرقہ حسینیہ - اس فرقہ کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو امام مانتے ہیں ان کے بعد ان کے بیٹے حسن مثنیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو جن کو فاضل آل محمد بھی کہتے ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے صاحبزادے جناب عبداللہ کو امام تسلیم کرتے ہیں اور وہ تنازع اور مدد کد جہان کے اور جناب جعفر صادق کے درمیان ہوا اور جس کا حوالہ کتب اثنا عشریہ میں موجود مذکور ہے اور اس کو ملا عمر رفیع واعظ نے ابواب الجنان میں کلینی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

ان عبداللہ کے بعد ان کے بیٹے محمد نفس زکیہ کو، پھر ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کو امام مانتے ہیں۔ یہ دونوں بھائی منصور و داغی کے زمانہ میں نکلے، لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی لوگوں کی کافی جمعیت نے ساتھ دیا بالاخر جنگ و جدل اور میدان کارزار گرم ہوا مگر امرائے منصور کے ہاتھوں دونوں بھائی قتل ہو گئے۔

(۲) فرقہ نقشبندیہ - یہ بھی حسینیہ ہی کا ایک فرقہ ہے جو کہتا ہے کہ نفس زکیہ قتل نہیں ہوئے بلکہ غائب اور چھپے ہوئے ہیں چند روز بعد پھر ظہور فرمائیں گے۔

(۳) فرقہ حکمیہ - اس کا نام ہشامیہ بھی ہے۔ کیونکہ یہ اصحاب ہشام بن حکم پر مشتمل ہے ان کا کہنا ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے بعد امامت حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد میں آئی۔ اور اس سلسلہ امامت کو بالترتیب حضرت جعفر تک چلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ ہم صریح رکھنے کے قائل ہیں گویا وہ اپنے معبود کو مجسم شکل میں مانتے ہیں جو طول و عرض و عمق ہر سہ اطراف تو برابر رکھتا ہے۔ مگر ان ظاہری اجسام میں سے کسی صورت سے شاہد نہیں۔

(۴) فرقہ سالمیہ - اس فرقہ کا نام جوالیقیہ بھی ہے۔ کیونکہ یہ ہشام بن سالم جوالیقی کے ساتھیوں پر مشتمل ہے امامت اور اللہ تعالیٰ کی جمیعت کے بارے میں ان کے عقائد بھی فرقہ حکمیہ سے ملتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو بصورت انسانی مانتے ہیں۔

(۵) فرقہ شیطانیہ - اس فرقہ کا ایک نام نغانیہ بھی ہے کیونکہ یہ محمد بن نغان حیرنی جو کہ شیطان الطاق کے لقب سے مشہور ہے مانتے والوں کا گردہ ہے۔ یہ امامت کا سلسلہ جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ تک چلاتے ہیں، اور خدا تعالیٰ کو مجسم مان کر اس کے اعضاء و جوارح ثابت کرتے ہیں۔

(۶) فرقہ زہراریہ - یہ فرقہ زہرہ بن ابیہ کوئی کے اصحاب پر مشتمل ہے۔ ان کے نزدیک امامت کا سلسلہ حضرت جعفر تک آتا ہے یہ صفات الہی کو حادث مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نہ حیات رکھتا تھا نہ علم نہ قدرت نہ

صح و لبیر۔

(۷) فرقہ یونسیہ - یہ یونس بن عبد الرحمن قنی کا گروہ ہے، یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔

(۸) فرقہ بدامیہ - یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بعض باتوں کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے ارادہ پر نادم ہوتا ہے کہ ایسا ارادہ کرنا خلاف مصلحت تھا۔ ہر سہ خلفاء رضوان اللہ علیہم کی خلافت اور ان کے مناقب و محاسن پر اسی خیال کو منطبق کرتے ہیں۔

(۹) فرقہ مفوضہ - ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی پیدائش کا معاملہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپ رکھا ہے لہذا دنیا اور اس کی مخلوقات سب کی سب آنحضرت کی پیدا کردہ ہیں۔ ایک گروہ انہیں میں سے اس خیال کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر چسپاں کرتا ہے۔ اور ایک تیسرا طبقہ ہر دو پر!

مذکورہ بالا میں سے سات فرقے خلاۃ امامیہ کے ہیں یہ باتفاق کافر ہیں۔ ان سب کا مشترک عقیدہ ائمہ ستہ کی امامت ہے۔

(۱۰) فرقہ باقریہ - یہ فرقہ حضرت باقر رحمہ اللہ علیہ کے بارے میں حی لایوت کا عقیدہ رکھتا ہے۔ اور ان کو امام منتظر مانتا ہے۔

(۱۱) فرقہ حاضریہ - ان کا کہنا ہے کہ امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے بیٹے زکریا امام ہوئے جواب حاضریہ پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت تک چھپے رہیں گے تا آنکہ ان کو غیب سے خروج کا حکم نہ ملے۔

(۱۲) فرقہ تاوسیہ - اصحاب عبد اللہ بن ناس کا یہ فرقہ کہتا ہے کہ امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ ذرہ ہیں مگر پردہ غیب میں ہیں۔ وہی مہدی موعود ہیں اور وہی قائم منتظر۔ ان میں سے ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ بالکلیہ غائب نہیں ان کے دست کبھی ان کو خلوت و تنہائی میں دیکھ بھی لیتے ہیں۔

(۱۳) فرقہ عماریہ - یہ اصحاب عمار ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ مرچے ہیں اور ان کے بعد ان کے بیٹے محمد امام ہیں۔

اسماعیلی۔ اور ان کے فرقے | اسماعیلی بھی اگرچہ امامیہ میں شامل ہیں مگر الگ شاخ ہے اس لئے ان کے فرقوں کا عقیدہ ذکر کیا جاتا ہے، یہ فرقے جن کی تعداد آٹھ بلکہ دس ہے۔ ان کا مشترک عقیدہ یہ ہے کہ خود جناب جعفر کے اس قول صریح یعنی اِنَّ هَذَا لَمُرِّي الْاَكْبَرِ مَا لَمْ يَكُنْ بِهٖ عَاقِلَةٌ (یہ امامت بڑے بیٹے میں ہی رہے گی۔ تا آنکہ اس میں کوئی عیب نہ ہو) کے مطابق بڑے بیٹے اسماعیل امام ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت جعفر کی اولاد میں سب سے زائد شریف النفس ہیں کیونکہ ان کی ماں فاطمہ بن حسن بن علی کی بیٹی ہیں۔

(۱۴) فرقہ مبارکیہ - یہ فرقہ اسی مبارک کے ساتھیوں کا ہے جن کا کچھ حال پہلے بیان ہو چکا ہے یہ لوگ جناب اسماعیل کے بعد ان کے بیٹے محمد کو امام مانتے ہیں اور ان کو خاتم الانبیا قائم منتظر اور مہدی موعود یقین کرتے ہیں۔

(۲) فرقہ باطنیہ۔ یہ جناب اسمعیلؑ کے بعد ان کے قول سابق کی وجہ سے جو بعد میں آتا گیا امام ہوتا گیا کے قائل ہیں وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ عمل باطن کتاب پر واجب ہے نہ کہ ظاہر پر۔

(۳) فرقہ قمریہ۔ اس کے متعلق اہل لغت بہت مختلف خیال ہیں بعض کہتے ہیں کہ قمریہ مبارک مذکورہ کا نام یا لقب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نہیں یہ کسی اور شخص کا نام ہے، جو کوفہ کے مصنفات میں سے کسی جگہ کا رہنے والا تھا۔ اور مذہب قمریہ کا بانی تھا۔ بعض کے نزدیک اس کا نام حمدان بن قمریہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ واسطہ کے ایک گاؤں کا نام ہے، حمدان یہاں کا رہنے والا تھا تو وہ قمری ہو گیا اور اس کے متبعین قمریہ کہلائے۔ بہر حال یہ کوئی بھی ہوں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اسمعیل بن جعفر خاتم الائمہ ہیں۔ اور حجتی لا یعوت، محرمات شرعیہ کو یہ لوگ جائز سمجھتے ہیں۔

(۴) فرقہ شیعہ۔ یہ کئی بن ابی شعیبہ کا فرقہ ہے۔ ان کا قول ہے کہ جناب جعفر صادقؑ کے بعد امامت اس ترتیب سے ان کے بیٹوں تک پہنچی۔ (۱) اسمعیلؑ (۲) محمدؑ (۳) موسیٰ کاظمؑ (۴) عبداللہ افطحؑ اور (۵) اسحاقؑ رحمہم اللہ۔

(۵) فرقہ میمونہ۔ اس میں عبداللہ بن میمون اقداح اسوازی کے ساتھی شامل ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ظاہر پر عمل حرام ہے اور یہ قیامت کے بھی منکر ہیں۔

(۶) فرقہ خلیفہ۔ یہ کہتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا دیگر اعمال کتاب و احادیث میں جہاں مذکور ہیں وہاں ان کے لغوی معنی ملا ہیں اصطلاحی نہیں۔ یوم آخرت اور جنت و دوزخ کے یہ بھی منکر ہیں۔

(۷) فرقہ برقیہ۔ یہ محمد بن علی برقی کے ساتھیوں کا فرقہ ہے۔ یہ احکام شرعیہ کا انکار کرتے ہیں۔ نصوص میں تاویل کرتے ہیں۔ بعض انبیاء کی نبوت کو بھی نہیں مانتے بلکہ ان پر لعنت کو واجب مانتے ہیں۔

(۸) فرقہ جنابہ۔ یہ ابوطاہر جنابی کے پیروکاروں کا گروہ ہے۔ وہ اس مذہب میں اور بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ قیامت و احکام شرعیہ کے منکر ہی نہیں ان پر عمل کرنے والوں کو واجب القتل سمجھتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے حجاج بیت اللہ الحرام کو قتل کیا، حجر اسود کو کھود کر لے گئے۔ تاکہ لوگ بدعتیہ ہو کر خانہ کعبہ کا قصد نہ کریں اور اس کا طواف چھوڑ دیں۔

مذکورہ فرقوں میں سے شیعہ، میمونہ، خلیفہ، برقیہ اور جنابہ قمریہ میں داخل ہیں اور ان ہی میں ان کا شمار ہے۔ اس لئے اسمعیلیہ فرقوں کو آٹھ بتایا ہے ورنہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ چنانچہ اسمعیلی اصول کی بنا پر نواں فرقہ سببیہ ہے۔

(۹) فرقہ سببیہ۔ ان کا قول ہے کہ وہ انبیاء و شریعت لائے اور رسول ہیں ان کی تعداد سات ہے۔ آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد و مہدی (علیہم السلام)

اور درود رسولوں کے درمیان سات اور دوسرے آدمی ایسے ہوتے ہیں جو سابق شریعت کو آنے والی شریعت تک باقی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسمعیل بن جعفرؑ ان ہی سات آدمیوں میں سے ایک تھے کہ انہوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام مہدیؑ کے درمیان شریعت کو باقی رکھا۔

اور یہ بھی ان کا قول ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے سات آدمیوں کا ہونا ضروری ہے جو اقتدار کے قابل ہوں۔

(۱۰) فرقہ مہدیہ۔ یہ اصول اسمعیلیہ پر ایک فرقہ ہے۔ یہ فرقہ تک کے طول و عرض میں کافی پھیلا ان میں صاحبان تصنیف

و تالیف اہل علم بھی گئے ہیں اور ملک مغرب کے سلاطین و ملوک بھی اس مذہب کے ماننے والوں میں شامل ہیں۔ گویا تسلط و اقتدار اس فرقہ کے حصہ میں آیا۔ امامت کا سلسلہ اس طرح جانتے ہیں۔ اسماعیلؑ کے بعد ان کے بیٹے محمدؑ میں پھر ان کے بیٹے احمدؑ، ان کے بعد ان کے بیٹے محمد تقیؑ، پھر ان کے بیٹے عبداللہ رضی پھر ان کے بیٹے ابوالقاسم عبداللہ پھر ان کے بیٹے محمد ملقب محمد ہدی ان کے بعد ان کے بیٹے احمد قائم بامر اللہ پھر اسماعیل بن احمد منصور بقرۃ اللہ پھر محمد بن اسماعیل معز الدین اللہ ان کے بعد ابو منصور نزار بن معد عزیر باللہ پھر ابو علی منصور بن نزار حاکم بامر اللہ پھر ابو الحسن علی بن منصور نظام الدین اللہ پھر محمد بن علی بن منصور مستنصر باللہ۔

کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں باپ اپنے بیٹوں کے لئے وصیت کرتے گئے۔ جب امامت ہمدی کا عہد آیا تو اس نے اپنا حکم ملک مغرب میں نافذ کیا اور وہاں کا بادشاہ بننا چاہا اسوقت بے شمار مخلوق اس کے زیر اثر تھی۔ اس نے اقل بلاد افریقہ پر اقتدار قائم کیا پھر رفتہ رفتہ بلاد مصر پر قبضہ جمایا۔ مغرب اور مصر اس کی اولاد کے قبضہ میں رہے۔ بلکہ اس کی اولاد میں سے کچھ نے بلاد شام پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا اہل سین نے بھی اس مذہب پر لبیک کہا اور یہی مذہب انتہا کیا۔ مستنصر کے بعد امام نون ہوئے اس مسئلہ پر ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مستنصر نے پہلے تو اپنے بھائی نزار کی امامت کے احکامات جاری کیے مگر کچھ عرصہ بعد اپنے بیٹے ابوالقاسم احمد متعلیٰ باللہ کے امامت کا اعلان کر دیا۔ جن لوگوں نے حکم ثانی کو اول کا نسخہ قرار دے کر متعلیٰ کو امام مانا ان کو مستعلویہ کہتے ہیں اور متعلیٰ کے بعد اس کے بیٹے منصور بن احمد آمر باحکام باللہ کو امام مانتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے بھائی عبدالحمید ابوسمون بن احمد حافظ الدین اللہ کو اس کے بعد اس کے بیٹے منصور محمد بن عبدالحمید ظاہر بامر اللہ کو اس کے بعد اس کے بیٹے ابوالقاسم علی بن محمد فائز بنصرہ اللہ اور پھر اس کے بیٹے محمد بن علی فاضل الدین اللہ کو امام تسلیم کرتے ہیں۔

جب امامت پر فاضل فائز تھا تو امراء و ملوک شام نے اس پر چڑھائی کی اور اس کو گرفتار کر کے حوالہ زندان کر دیا اور وہی قید خانہ میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اب ہمدی کی اولاد میں امامت کا کوئی دعویٰ رہا۔ ادھر دوسرے گروہ نے حکم اول کی موجودگی میں دوسرے حکم کو لغو اور مہل قرار دے کر نظر انداز کر دیا اور نزار کو امام تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ہادی کو پھر اس کے بیٹے حسن کو! مگر ان کی یہ سب روایتیں جھوٹی ہیں، مورخین اس معاملہ میں کہتے ہیں کہ احمد متعلیٰ جب بادشاہ ہوا تو اس نے نزار اور اس کے دو چھوٹے بیٹوں کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور ان تینوں کی موت جیل ہی میں واقع ہوئی۔ ان کی نسل میں کوئی نہیں رہا۔

فرقہ نزاریہ کو مصباحیہ و حمیریہ بھی کہتے ہیں جس کی وجہ تشبیہ ابھی معلوم ہوگی۔ نیز نزاریہ کو ہی مسقطیہ اور سقطیہ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے مذہب میں امام فروعی احکامات کا مکلف نہیں اور اسے حق پہنچتا ہے کہ کچھ یا سب کی سب تکلیفات شرعیہ لوگوں سے ساقط کر دے۔

اور ان سے وابستہ لغویات میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے کہ حسن بن مصباح حمیری معری آیا اور نزار کی جرمورتیں اس کے بھتیجے کی قید میں تھیں ان سے ملا۔ ان سے ایک چھوٹا بچہ لے لیا اور ظاہر یہ کیا کہ یہ نزار کا بیٹا ہے۔ اس بچے کو رے لے گیا اور اسے ہادی کے نام سے شہرت دی اور اسی کے نام سے لوگوں کو دعوت دینے لگا۔ جب اس کے پاس ابھی خاصی جمعیت اکٹھی ہو گئی تو قلعہ الموت اور دوسرے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اپنے اہل و عیال مال و اسباب اور ہادی کو

قلعہ الموت میں رکھا۔ جب موت کا وقت آیا تو ہادی اس وقت بچہ ہی تھا، اس وقت اس نے ابن کتیا نامی ایک شخص کو اپنا نائب بنایا۔

اور ہادی کی تربیت اور اس کے اکرام و توقیر کی بڑے زوردار طریقہ پر وصیت کی۔ جب ابن کتیا بھی مرنے لگا تو اپنے بیٹے محمد کو اپنا نائب مقرر کیا اور حسن کی طرح اس نے بھی ہادی کی خدمت و توقیر کی زوردار وصیت کی۔ ایک روز ہادی پر شہوت غالب ہوئی اور اس نے ابن کتیا کی بیوی کو بلا کر اپنی خواہش پوری کی، اس لئے کہ ان کے گمان میں امام کے لئے تمام چیزیں حلال ہیں اور اس کو حق حاصل ہے کہ جو چاہے کرے، گویا لَا يُنْهَى عَمَّا يُفْعَلُ اسی کی نشان ہے۔

اتفاقاً اس صحبت سے ابن کتیا کی بیوی حاملہ ہوئی، اور ایک بچہ جنا جس کا نام حسن رکھا۔ اس دوران ہادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ ابن کتیا کی بیوی نے بتایا۔ جس پر ہادی کے اکثر متبعین نے اعتبار کر لیا۔ مگر بعض لوگوں نے اسے مشکوک قرار دیا۔ اور کہا کہ ہادی کی صحبت شدہ عورت کوئی اور تھی۔ ابن کتیا کی بیوی بھی اسی زمانہ میں حاملہ ہوئی اور اتفاقاً دونوں کے ہاں ولادت ایک ہی وقت ہوئی۔ ابن کتیا کی بیوی نے چالاکی سے اپنے بیٹے کو ہادی کے بیٹے سے بدل لیا اور اس کا نام حسن رکھا۔

بہر حال حقیقت جو بھی ہو ابن کتیا کے مرنے کے بعد حسن نے خود کو ہادی کا بیٹا اور تزار کی اولاد ظاہر کیا۔ اور امامت کا مدعی ہوا۔ یہ حسن نہایت زیرک، بلیغ الکلام اور حاضر جواب تھا۔ نہایت خوش گو خلیب تھا۔ خطبے بہت دیتا تھا۔ اپنے خطبوں میں اس مضمون پر تاکید و تکرار بہت زور دیتا تھا کہ امام کو یہ حق ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ بلکہ اسے تو یہ بھی حق ہے کہ شریعت کا جو حکم چاہے لوگوں سے اسے ساقط کر دے۔

اپنے متعلق کہتا تھا کہ مجھے غیب سے یہ امر الہی ہوا ہے کہ تم لوگوں کو احکام شرعیہ سے آزاد کر دوں۔ اور تمام حلال چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دوں، تم جو چاہو کرو، مگر آپس میں متہمد ہو، جدال و قتال نہ کرو اور امام کی اطاعت نہ چھوڑو۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد، پھر نوتا ملا، والدین محمد بن جلال الدین حسن محمد بن حسن اسی پنج اور روش پر چلتے رہے۔ مگر جلال الدین حسن جو محمد بن حسن کا صلیبی بیٹا تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے منکرو متغیر ہو کر سچا اور پکا مسلمان بن گیا۔ اس کے حسن اسلام کا حال تاریخ کی کتابوں میں مشہور و معروف انداز میں درج کیا ہے۔ اس نے تو یہاں تک کیا کہ باپ دادا کے اس کتب خانہ کو جو زندہ دلا داد اور کفر و کذب کے معظوظوں اور کتابوں سے بھرا ہوا تھا نذر آتش کر دیا۔ یہ اپنے اسلاف پر بڑے واضح اور پُر زور انداز میں لعن و طعن کرتا تھا اس نے تو گویا باطنی فرقہ کی جڑ کھود کر رکھ دی تھی۔ اپنے پیروکاروں کو اچھی باتوں کا حکم دیتا بری باتوں سے روکتا تھا، قلعوں میں شاندار مساجد بنوائیں، ان کو آباد کر لیا۔ اہل بغداد کو اپنے حسن اسلام سے واقف کیا۔ اپنی ماں کو تحفے تحائف دیکر خانہ کعبہ کے حج کو روانہ کیا۔

لیکن اس کا بیٹا اپنے باپ کی روش کو چھوڑ کر اپنے محمد و زندقہ اسلاف کے رویہ پر چلا، اور اس کا بیٹا جس کا لقب رکن الدین تھا وہ بھی محمد ہی رہا۔ اسی کے عہد میں تاتاری ترک یعنی چنگیزیوں نے اس کے ملک کو برباد اور اس کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ چند روز قلعہ الموت میں پناہ گزیں رہا۔ آخر کار ان کی اطاعت قبول کر کے ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ اس کو ساتھ لے کر اپنے وطن روانہ ہوئے مگر یہ راستہ ہی میں مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جو قلعہ الموت

ہی میں رہ گیا تھا۔ امامت کا مدعی ہوا اور عبداللہ لقب اختیار کیا۔ جب تاری امراد کو اس کی خبر ہوئی تو اس کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی جس نے قلعہ تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے ساتھی ادھر ادھر پراگندہ و منتشر ہو گئے اور یہ خود طبرستان کے کسی گاؤں میں مہکپ گیا۔ اس کے بعد پھر کوئی مدعی امامت نہ اٹھا۔

گویا اسماعیلی فرقوں میں باطنیہ، قرامطہ، سبعیہ اور حمیریہ تہذیبیں، مہدویہ بظاہر شرع کے معتقد ہیں۔ ان فرقوں میں حمیریہ زیادہ شدید الکفر ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسماعیلیہ کے دس فرقے ہیں، اور پر امامیہ کے تیرہ فرقوں کا تذکرہ ہوا دونوں مل کر تعداد تیس ہو گئی، باقی فرقوں کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

(۲۴) فرقہ افطہیہ۔ اس فرقہ کو عامیہ بھی کہتے ہیں اس لئے کہ یہ عبدالرحمن بن عمار کے پیرو ہیں۔ یہ گروہ عبداللہ بن جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کی امامت کا قائل ہے اس کا لقب افطہ تھا کیونکہ اس کے پاؤں چوڑے تھے اور یہ اسماعیل بن جعفر کے حقیقی بھائی تھے یہ لوگ ان کی موت اور پھر ظاہر ہونے کے معتقد ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے بعد کوئی نرہ اولاد نہیں چھوڑی کہ نسل میں امامت کا سلسلہ چلتا۔

(۲۵) فرقہ اسحاقیہ۔ یہ لوگ اسحاق بن جعفر رحمہ اللہ علیہ کی امامت کے معتقد ہیں، یہ واقعی علم و تقویٰ اور پرہیزگاری میں اپنے مالی قدر پر بزرگوار کے بہت مشابہ تھے۔

چنانچہ سفیان ابن عیینہ اور دیگر ثقہ محدثین نے ان سے روایات لی ہیں۔

(۲۶) فرقہ قطعیہ۔ یہ مفضل بن عمر کا گروہ ہے اس لئے مفضل بھی کہلاتے ہیں یہ جناب موسیٰ کاظمؑ کی امامت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کی وفات پر امامت کے سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔

(۲۷) فرقہ موسویہ۔ یہ لوگ جناب موسیٰ کاظمؑ کی موت و حیات میں متروک اور مشکوک الخیال ہیں اس لئے ان کی امامت پر توقف کرتے ہیں اور سلسلہ امامت ان کے آگے نہیں چلاتے۔

(۲۸) فرقہ مہدویہ۔ یہ جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ کی حیات کے قائل ہیں اور ان کو مہدی موعود اور منتظر مانتے ہیں اپنے عقیدے کے ثبوت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے دلیل لاتے ہیں سَابِعُهُمْ فَاِثْمُهُمْ سَبْعِيْ مَسْأَلَةٌ التَّوْبَةِ۔ یعنی ساتواں امام خروج کرے گا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم نام ہوگا۔

ان کو مہدویہ کہنے کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے فرقہ قطعیہ سے مناظرہ کیا۔ قطعیہ کے رئیس یونس بن عبدالرحمن نے ان سے کہا کہ تم ہمارے نزدیک بھینکے ہوئے کتوں سے بھی زیادہ حقیر ہو۔ یہ فقرہ ان پر ایسا چپاں ہوا کہ اس کے بعد یہ ان کا لقب ہی بن گیا جو آج تک باقی ہے۔

(۲۹) فرقہ رجعیہ۔ اس فرقہ کے لوگ جناب موسیٰ کاظمؑ کی موت کے قائل ہیں مگر دوبارہ ظہور کے منتظر ہیں۔ مذکورہ بالا یہ تینوں فرقے واقعیہ بھی کہلاتے ہیں کیونکہ یہ تینوں امامت کو جناب موسیٰ کاظمؑ پر ختم ملتے ہیں۔

(۳۰) فرقہ احمدیہ۔ یہ جناب موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد ان کے لڑکے احمد بن موسیٰ کو امام مانتے ہیں۔

(۳۱) فرقہ امامیہ۔ یہ گویا اس فرقہ کے اصل اصول ہیں۔ لفظ امامیہ جب بغیر کسی قید کے بولا جائے تو یہی فرقہ مراد ہوتا ہے۔ یہ اثنا عشریہ ہیں ان کے نزدیک سلسلہ امامت اس طرح ہے۔ پہلے علی موسیٰ الرضاؑ ان کے بعد ان کے بیٹے

محمد تقی جو الجواد کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کے بعد ان کے بیٹے علی نقی معروف بہادی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حسن مکی ان کے بعد ان کے بیٹے محمد مہدی ان کو یہ قائم منظر بھی مانتے ہیں اور ان کے خراج کے منظر ہیں۔ پھر ان ہی کے وقت غیبت اہل سن و سال میں مختلف الخیال ہو کر یہ چند فرقوں میں بٹ گئے۔ بلکہ بعض بعض ان کی موت اور رجعت کے بھی قائل ہیں ان فرقوں کو شامل کر کے گویا ان کی مجموعی تعداد اسی تیس تک پہنچتی ہے۔

(۳۲) فرقہ جعفریہ۔ یہ حسن عسکری کے بعد جعفر بن علی کی امامت کے قائل ہیں۔ جو ان کے بھائی تھے کہتے ہیں کہ حسن عسکری نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ یہ تولد مہدی کے بھی منکر ہیں۔

اسی بیان کے ذیل میں یہاں چند فائدہ لائق تحریر ہیں ناظرین انہیں بغور ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا فائدہ: شیخ کے لقب سے سب سے پہلے وہ انصار و مہاجرین لقب ہوئے جو ہر پہلو سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی متابعت اور ہمدردی میں سرگرم رہے اور خلافت کے وقت آپ کے رفیق صحبت رہے۔ آپ کے مخالفین سے لڑتے رہے۔ آپ کے اوامر و نواہی کو تسلیم کرتے رہے۔ دراصل مخلصین شیعہ ہی حضرات تھے، یہ لقب پہلے پہل شیخ میں روشن ہوا۔ اس کے بعد تین سال بعد فرقہ تفضیلیہ وجود میں آیا۔ ابوالاسود دلی جو علم نحو کا موجد اور امام مانا جاتا ہے اسی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا وہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاگرد تھا۔ اور آپ ہی کے حکم اور تعلیم کے مطابق علم نحو کے مدون اور تالیف کرنے میں مشغول ہوا۔

ابوسعید کھلی بن یحییٰ عدوانی جو تابعی تھے۔ اسی فرقہ میں سے تھے اور عبداللہ بن سید عدوی سے میل ملاقات رکھتے تھے۔ یہ قرأت، تفسیر، نحو اور لغات عرب کا بڑا عالم اور ماہر تھا۔ اس کا شمار بصرہ کے فرائ میں ہوتا ہے اور نحو میں ابوالاسود مذکور کا شاگرد تھا۔

قاضی شمس الدین احمد بن خلیکان۔ وفیات الامعیان میں بیان کرتے ہیں کہ یحییٰ بن یحییٰ شیعہ ان اولی کے اس فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جو اہل بیت کی تفضیل کے قائل تھے۔ بغیر اس بات کے کہ دیگر صاحبان فضل حضرت کی برائی میں ملوث ہو! یہ حضرات بھی اسی فرقہ سے متعلق تھے۔

(۱) سالم بن ابی حفصہ، جو امام محمد باقر اور امام جعفر سے حدیث کا راوی ہے۔

(۲) عبدالرزاق صاحب صنف جو اہل سنت کے معزز و مشہور محدث ہیں۔

(۳) ابو یوسف یعقوب بن اسحاق، جو اصلاح المنطق کے مصنف ہیں۔ ان کو ہی ابن سکیت کہتے ہیں۔

اس کے بعد ترائی شیعوں کا فرقہ وجود میں آیا۔ یہ بدعت بڑے علیل القدر صحابہ کرامؓ اور امامات المؤمنین و رضوان اللہ علیہم اجمعین پر نہ صرف لعن و طعن کرتے تھے بلکہ گالیاں بھی دیتے تھے۔

یہ بیان شدہ ترتیب مذاہب کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ یہ سب فرقے امیر المؤمنین کے عہد ہی میں عبداللہ بن سبا کے درغلانے اور ہر کانے سے وجود میں آچکے تھے۔

باقی کے معروف فرقوں کی سنین پیدائش حسب ذیل ہیں:-

کیسانہ ۶۹۷ھ میں مختاریہ ۷۱۵ھ میں ہشامیہ ۷۱۵ھ میں زیدیہ ۷۱۵ھ میں جو الیقینہ اور شیطانیہ ۱۱۳۳ھ میں فرائیہ، مونیہ، بدائیہ، تاوسیہ اور عاصیہ ۱۲۵۵ھ میں، اسماعیلیہ ۱۵۵۵ھ میں (اسماعیلیہ میں سے) مبارکیہ ۱۵۶۶ھ میں

(اور امامیہ میں سے) واقعہ ۸۳ھ میں حسنیہ ۱۹۵ھ میں۔ اثنا عشری امامیہ ۲۵۰ھ میں (اسماعیلیہ میں سے) مہدیہ ۲۹۹ھ میں۔

اس فرقہ کے لوگ محمد بن عبداللہ بن عبید اللہ کے جن کا لقب ان کے خیال میں مہدی تھا۔ کی امامت کے قائل ہیں۔ یہ مہدی خود کو اسمعیل بن جعفر کی اولاد میں شمار کرتا تھا اور امامت کا مدعی تھا۔ سنہ مذکور میں اطراف مغرب میں اس نے خرخرچ کیا اور سنہ ۳۱۰ھ میں افریقہ پر اقتدار حاصل کر لیا۔

یہ اپنا نسب یوں بیان کرتا تھا۔ محمد بن عبداللہ بن عبید اللہ بن قاسم بن احمد بن محمد بن اسمعیل بن جعفر۔ علما نسب اس نسب کے بیان میں اسے دروغ گو قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ اسمعیل بن جعفر اپنے والد سے پہلے فوت ہو چکے تھے اور انہوں نے سولہ تھے محمد کے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ یہ محمد اپنے دادا کے ساتھ بغداد گئے اور وہیں لاؤلف فوت ہوئے۔ شیعوں میں بھی سب کو اس نسب نامہ کی صحت سے انکار ہے۔

تو پھر اس کا حقیقی نسب کیا تھا؟ اس میں علمائے انساب کا اختلاف ہے، مغرب کے علمائے انساب کہتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن سالم بصری کی اولاد میں سے ہے۔ اور اس کا باپ بصرہ میں نان بائی تھا۔ اور عراق کے علمائے انساب کا کہنا ہے کہ وہ بمطابق بیان بالا عبداللہ بن میمون اقلح اہوازی کی نسل سے ہے۔

بہر حال مہدیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ محمد بن عبداللہ مذکور مہدی موعود ہے۔ اس کے ثبوت میں جنصور علی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: عَلٰی رَأْسِ ثَلَاثِثَاثَةِ نَطْلُمُ الشَّشَّ مِنْ مَعْرِبٍ بِهَا قِيسِرِي مَدِي كَسے اقتحام پر سورج اپنے عروبہ ہونے کی سمت سے طلوع ہوگا، اور سورج سے مراد ممدی اور مغرب سے مراد ملک مغرب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حدیث اور مرادی معنی دونوں ہی ان کے من گھڑت ہیں۔

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسمعیلیوں کا اصل عقیدہ یہ ہے کہ شرع کے احکام کا انکار کیا جائے اور نظم دین کو درہم برہم کیا جائے۔ چنانچہ اس فرقہ مہدیہ کے ایک بادشاہ نے جو امام بھی تھا مصر میں یہ فرمان جاری کیا تھا کہ مجلس میں جب اس کا نام آئے تو لوگ سجدہ میں گر جائیں۔ وہ خدا سے ہمکلامی کا بھی دعویدار تھا اور معلم غیب کا مدعی بھی! اگر اس کی بد اعمالیاں اور بد فعلیاں دیکھنی ہوں تو کتب تاریخ کا مطالعہ کرتا چاہیئے۔

مہدیہ کفر و الحاد، کودل میں چھپا کر، بظاہر پرہیزگاری، کثرت طاعت اور نفاذ احکام شرع میں بڑے سرگرم دکھائی دیتے اور زور دیتے تھے۔ تاکہ لوگوں کو اپنی طرف زیادہ سے زیادہ مائل رکھ کر فوجوں کے لئے نفری حاصل کر سکیں۔ یہی طرز عمل حمیرہ کا بھی تھا۔ کفر و الحاد کا برملا اظہار قرآن مطہ کی ایجاد ہے۔ یہ (قرآن مطہ) مقتدر عباسی کے خلاف مصروف پیکار ہوئے، بعض شہروں اور دیہات پر قبضہ کر لیا ج کے دنوں میں مکہ معظمہ پہنچے اور تین ہزار عابیوں کو بیدردی سے شہید کیا۔ یہ واقعہ ۳۱۰ھ میں پیش آیا اس گروہ کا سردار ابو سعید جنابی قرطبی تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے قدم بقدم چلا۔ بلکہ دو قدم آگے ہی رہا۔ اس نے بھی بڑے لاؤشکر کے ساتھ حج کے دنوں میں مکہ معظمہ پر چڑھائی کی، قمر و سرکشی کا یہ عالم کہ گھوڑے پر سوار مسجد الحرام میں گیا، شراب کا پیالہ ہاتھ میں تھا وہاں شراب پیتا رہا اور حاجی اس کے سامنے اس کے حکم سے قتل کئے جاتے رہے۔

گستاخی اور پاجبی پن کی انتہا کر دی کہ گھوڑے کو شتم کرا اور عین مسجد الحرام میں پیشاب کرایا، فوجیوں کو حکم دے

کہ حجر اسود اکھڑا یا پہلے تو اسے کوفہ کے گھوڑوں پر لادایا۔ پھر اٹھوا کر اپنے قبضہ میں کر لیا، چنانچہ حجر اسود اس ملعون کے قبضہ میں رہا۔ عباسی خلیفہ مطیع لامر اللہ البراقام فضل بن المقتدر نے تیس ہزار اشرفیوں کے عوض اس سے خرید لیا۔ خریداری کے سوئے کے وقت یہی ابوطاہر بن ابوسعید حجر اسود لے کر کوفہ کی مسجد میں آیا اور ایک ستون پر اس کو لٹکا دیا۔ شہر کے سربراہ آدرہ لوگوں کو جمع کیا اور ان کی موجودگی میں اسے خلیفہ کے وکیل کے حوالہ کیا۔ اس مجلس میں محدث ابن حکیم بھی موجود تھے۔ انہوں نے ایک حدیث بیان کی جس میں حجر اسود کی بعض علامات مذکور ہیں۔

يُحْشَرُ هَذَا الْحَجَرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَمَّا عَيْنَانِ يُصَيَّرُ مِثْلَ لِسَانٍ يَتَكَلَّمُ بِهِمُ يَشْفَعُ لِمَنْ اسْتَلَمَهُ بِحَقِّ قَرَاتِهِ حَجَرٌ يُطْفِئُ عَلَى الْمَاءِ وَلَا يَخْتَرِفُ يَا النَّارُ - قیامت کے دن حجر اسود کے آنکھیں بھی ہوں گی جن سے وہ دیکھتا بھی ہوگا، اس کے زبان بھی ہوگی جس سے وہ بولتا ہوگا۔ جس شخص نے اس کا استلام کیا ہوگا۔ اس کے متعلق گواہی دے گا۔ یہ وہ پتھر ہے جو پانی پر تیرتا ہے اور آگ اُسے جلا نہیں سکتی)

ابوطاہر نے اس کے یہ اوصاف سنے تو طنز و مذاق سے ہنسنے لگا۔ استمان کے لئے آگ منگائی حجر اسود کو اس میں ڈالا مگر وہ نہ جلا۔ پھر پانی منگوا کہ اس میں ڈالا تو وہ پانی پر تیرتا رہا۔ وہ بڑا حیران ہوا اور بے ساختہ کہنے لگا۔ آج مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح ہو گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس کی بیخ کنی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مگر ہٹ دھرمی دیکھئے کہ اس صریح اعتراف کے بعد بھی اپنے مذہب و عقیدہ سے دستکش نہیں ہوا اسی سے چٹا رہا۔

مہدیہ میں کافرتہ حمیریہ جس کو المونیہ بھی کہتے ہیں۔ اور جس کا بیان اوپر آچکا ہے سلسلہ میں ظاہر ہوا اور ان کا فرقہ مستقیمہ بھی فتنہ تاتار شروع ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

دوسرا فائدہ۔ جب شیعہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے، تو ہر فرقہ کا داعی مذہب، شہر شہر، ملک ملک پھیل گئے، تاکہ ملکی اور۔۔۔ اسی اور ریاستی تسلط و غلبہ حاصل کرنے کے لئے اپنے متبعین کی تعداد بڑھائیں۔ اس سلسلہ میں ان کا باہم رابطہ قائم رہتا اور وہ اپنی اس جدوجہد میں صلاح مشورہ بھی کرتے رہتے! اپنے مذہب اور فرقہ کی ترویج اور لوگوں کو اپنی طرف بلانے کی جتنی کوشش اور سعی شیعہ فرقوں نے کی کسی اور فرقہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کا اصل راز یہ ہے کہ ان کے مذہب کی بنیاد بعض خاص اشخاص کی امامت پر منحصر ہوتی تھی۔ اور امامت چونکہ ریاست کا ایک شعبہ ہے بلکہ اعلیٰ قسم کی ریاست ہے اس لئے ان کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے امام کے حالات کا زیادہ سے زیادہ پرو پگینڈا کریں اور لوگوں کو ترغیب دے کر ان کا معتقد بنائیں تاکہ امامت ریاست و اقتدار کی شکل اختیار کر لے۔ بخلاف دوسرے مذاہب کے کہ ان کا اصل مذہب ریاست سے کوئی خاص شغف نہیں رکھتا۔

شیعوں کے جن فرقوں کی تقدیر نے بادی کی ان کو اقتدار و جاہ و ثروت حاصل ہو گئی اور بعض ناکامیوں کا داغ دل پر لئے رخصت ہوئے۔ پھر جن کو جاہ و ثروت حاصل ہوئی تو بعض کے ہاں دو تین پشت تک اس کا سلسلہ چلا۔ اور بعض دوسروں کے ہاں چاروں کی چاندنی ثابت ہوئی۔ اس لئے ان میں ہر فرقہ کا زمانہ وجود مختلف رہا۔

اہل تاریخ کے بیان کے مطابق بغداد میں ناسیہ فرقہ کی منہدیہ کے دوران بہت کثرت تھی۔ شیعوں کے دوسرے فرقے اکثر مصر، شام، عراقین، آذربائیجان، فارس اور خراسان میں پھیلے ہوئے تھے۔ جب تاتاری فتنہ نمودار ہوا تو یہ اپنے شہر چھوڑ کر دوردراز اطراف و جوانب میں جا پڑے اور وہاں کے شہریوں کے لئے مصیبت اور وبال جان

دایمان بن گئے، لوگ ان کے بہکائے میں آکر راہِ راست سے بھٹک کر گمراہی میں جا پڑے۔ مگر فتنہ آتارنے کبھی کو نہ بھنٹا، ان کے اکثر فرقے بے نام و نشان اور نیست و نابود ہو گئے، سوائے چند غلامۂ اور باطنیہ کے، البتہ زید بن ابیہ اشعثی اور مہدیہ کی خاصی تعداد بچ گئی۔

غلامۂ میں سب سے بڑا فرقہ سبائیہ کا ہے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل ہیں۔ اردبیل اور آذربائیجان کے کچھ شہروں میں یہ برائے نام موجود ہیں۔ ان کی عبادت صرف یہ ہے کہ سال بھر میں تین روزے رکھ لئے جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترکی کے شہر بغداد میں بھی کچھ موجود ہیں۔ ان کا سردار کہتا ہے کہ وہ یحییٰ بن زید بن علی بن حسین کی نسل سے ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس شہر کے سارے باشندے قدرتی طور پر بے داڑھی کے ہوتے ہیں۔ البتہ سردار لمبی داڑھی والا ہوتا ہے۔ زابلستان کے دیہات میں بھی ان کا کچھ پتہ چلتا ہے۔

غلامۂ کے دوسرے فرقوں میں سے مغنلیہ اور نصیریہ ہیں ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اللہ تعالیٰ کے حلول کا مشیر رکھتے ہیں۔ ان میں مغنلیہ کا زمانہ وجود کافی راز ہوا اور وہ اب تک بلاد گنج میں موجود ہیں اور نصیریہ بھی کہ ان کا زمانہ وجود بھی کافی راز ہے اور وہ اب تک کوہستان خراسان میں اور کہیں کہیں خراسان کے شہروں میں بھی موجود ہیں، ان میں سے بعض محمد شاہ (غالباً رگیلہ) بادشاہ دہلی کے زمانہ میں ہندوستان بھی آئے تھے اور امیر خاں کے گھرانے سے تھے۔ چند معتبرین سے ان کی ملاقات بھی ہوئی، و دران ملاقات انہوں نے بتایا کہ کوہستان خراسان میں ابجیان نام کا ایک گاؤں ہے وہاں کے باشندے سب کے سب غلامۂ اور نصیریہ ہیں۔ اس گاؤں میں ان کا ایک امام ہے جو خود کو علوی کہتا ہے۔ خراسان کے ہر ایک شہر میں اپنا ایک نائب اور ایک واقعہ نویس بھجیتا ہے۔

ان کی اصلاح ہیں امام کو الہ نائب کو رسول اور واقعہ نویس کو جبرئیل کہتے ہیں۔ ان کو مذہب سے کوئی تفرقہ نہیں۔ کسی عبارت سے واقف نہیں۔ سوائے اس کے کہ اپنے امام کو خمس ادا کرتے ہیں۔ ابجیان کے قرب و جوار کے دیہات میں بھی اسی مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ دیہ نصیری اور غلامۂ علوی اب پندرہویں صدی ہجری میں بھی عراق و شام میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ حکومت و اقتدار پر بھی آجکل ان کا قبضہ ہے۔ (۱۲ نمٹانی)

ان کے لغو عقیدوں میں سے چند یہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی زمین کی رہائش سے اکتا جاتا ہے تو وہ ابر کو حکم دیتا ہے تو وہ سیڑھی کی طرح قائم ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر چڑھتا ہے اور آسمان پر پہنچ کر وہاں کی سپر کرتا ہے اور پھر زمین پر اتر آتا ہے۔ وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرستادہ ہیں۔

یہ قیامت کے منکر ہیں، اور اجسام و ابدان میں تنازع ارواح کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ روحیں ہمیشہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اس انسان کے بدن کا نام ہے جو صائب و نعت ہو اور دوزخ اس انسان کے بدن کا نام ہے جو صاحب فقر و مسکنت ہو (یعنی بھوکا ننگا)

اور زید بن ابیہ بلا د عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ میان بنک بعض شرفاء حنفیہ جو زیدی مذہب رکھتے تھے بلادِ مین پر مستقل ہو گئے۔ انہوں نے زیدیوں کو مین میں بلا کر اکٹھا کر لیا اور اب تک یہ وہیں جمع ہیں۔ مین کا نصیب غلامۂ جو بلند اور کوہستانی غلامۂ ہے اور نجد مین کہلاتا ہے زیدیہ مذہب کے لوگوں سے آباد ہے اور دوسرے نصف، یعنی

نیشی اور سائل علاقے میں شافعی المذہب لوگ سکونت پذیر ہیں۔

اور اسماعیلیہ فرقہ میں سے باطنیہ بعض بلاد خراسان، کوہستان بدخشان دریائے شور کے ساحلوں اور گجرات ہند میں موجود ہیں جن کو اہل خراسان کی اصطلاح میں مین کہتے ہیں۔ چیمپک میمنان جہاں سے عمدہ اور اچھے گھوڑے برآمد کئے جاتے ہیں۔ مینوں سے آباد و معمور اور بھرا پڑا ہے۔

اسماعیلیہ فرقہ کی شاخ مہدیہ کی رسی بہت دراز نہ ہوئی۔ اور ان کی طاقت و قوت باہم عروج تک پہنچی۔ چنانچہ محمد بن عبد اللہ کے حالات میں سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔

یہ شخص جس نے اپنا لقب مہدی رکھا ۲۹۶ھ میں بلاد مغرب میں اٹھا اور مقتدر عباسی کے امراء سے برسرِ پیکار ہوا جو ان اطراف کے صوبہ دار تھے۔ بالآخر ان پر قابو پا کر افریقہ پر فائز ہوا اور اپنا اقتدار اور قبضہ جما لیا۔ مہدی مغرب بھی مدت تک اس کی اولاد کے زیرِ نگیں رہے۔ رفتہ رفتہ مین واسلے بھی ان کے مذہب کے سلقہ جوڑ لگئے۔

ان کی سلطنت و اقتدار کا موراز ابتدا تا انتہا در سو ساٹھ برس ایک رفتار سے چلتا تا آنکہ حسن صباح حمیری نے ۵۳۳ھ میں مہر اٹھایا اور ان پر تسلط حاصل کر کے حسن الموت کو اپنا مستقر بنایا۔ اور حسن الموت سے باہر ایک صومعہ بنا کر ریاضات شاذہ میں مشغول ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کے تقویٰ و پرہیزگاری کو دیکھ کر دھوکہ کھا جائیں اور اس کے دامِ ترویر میں پھنس جائیں اور اس کا یہ مکر کامیاب رہا۔ اور قزاقین، طبریہ اور کوہستان کے لوگ جو حق و راجح اس کی عقیدت کا پھندا لگے میں ڈال کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے، اس کے بعد اس نے مذہبِ نزاریہ کو ظاہر کیا۔ اور اہل سنت کی جان کا لاگو ہو گیا۔ اور ان کی ایذا رسانی میں کوئی مکر، کوئی حیلہ باقی نہیں چھوڑا، اس کا سب سے بڑا مکر یہ تھا کہ اپنے متبعین میں سے فتنہ پرداز اور اندھے مقلد فلاحیوں کو چھانٹ چھانٹ کر اسلامی شہروں میں بھیجتا اور ان کو ہدایت کرنا کہ اہل سنت کے علماء، امراء اور حکام کو جس طرح اور جب بھی موقع ملے قتل کر دیں۔ چنانچہ کچھ فدائی طالب علم بن کر بعض علماء کے شاگرد بن کر رہے۔ جلوت و غلوت میں خدمت کر کے ان کا اعتماد حاصل کیا اور جب موقع ملا ان کو شہید کر کے چلتے بنے۔

اس حیلہ و فریب سے اہل سنت و الجماعت کے بہت سے علماء امراء اور علماء کی ایک جماعت کو قتل کر لیا جب قوت و اقتدار میں کافی اضافہ کر لیا تو اب امراء و حکام اور بادشاہوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہو گیا۔ اور ان کو شکست دی۔ یہ بات پہلے مذکور ہو چکی ہے کہ حسن صباح کا وقت آخر قریب آیا تو اس نے ابن کیا کو اپنا نائب بنا کر اپنا پیش جاری رکھنے کی تاکید کی۔ ابن کیا نے مرتے وقت اپنے بیٹے محمد کو اور اس نے اپنے بیٹے حسن کو جو اپنا نائب ہوا بن نزار سے ملا تا تھا، اپنا نائب بنایا۔ یہ حسن کفر و الحاد کا گویا مجسمہ تھا۔ اس کے اسلاف نے جن باتوں کو چھپا رکھا تھا یہ ان کو بر ملا ظاہر کرتا تھا۔ اس کے نائبوں اور پیروکاروں کی بادشاہت ایک سو اکتھتر برس تک چلی۔ بالآخر تاتاریوں نے ان کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔ گویا قدرت نے ان کا قلع قمع کرنے کو ہی تاتاری پیدا کئے تھے۔

فرزستہ مستعویہ کی بادشاہت پانچ سو ساٹھ برس رہی۔ مگر اب ان چند لوگوں کے سوا جن کا کچھ پتہ مین کے انتہائی اطراف میں یا دریائے سندھ کے کنارے ملتا ہے کوئی باقی نہیں بچا۔ واللہ اعلم

واضح رہے کہ ہندوستان میں ایک اور جماعت ہے جنہوں نے اپنا نام مہدیہ رکھا ہوا ہے۔ جن کا خیال ہے

کہ حضرت مہدی آئے بھی اور پہلے بھی گئے۔ یہ لوگ بلاد و کن اور راجپوتانہ میں کافی تعداد میں ہیں۔ مگر ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق اسمعیلیہ مہدویہ سے نہیں ہے یہ ایک جہل اور مستقل جماعت ہے اس کا مسئلہ امامت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اہل سنت سے فردعی مسائل مثلاً دعائیں ہاتھ اٹھانے یا تقسیم میراث میں کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ سید محمد جوہری کے پیروکار ہیں جو اپنے آپ کو مہدی موعود سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسی خیال کے رد میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے صمیم احادیث پر مشتمل ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں مہدی موعود کی علامات بالتفصیل بیان کی ہیں۔

اب رہے اثنا عشریہ، تو یہ ابتدا عراق کے گرد و نواح میں متفرق جماعتوں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ اکثر خود کو اہل سنت میں شمار کرتے اور تقیہ و اخفا سے کام لے کر دور دور رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بلاد عراق میں آل بویہ یا آل برمک برسر اقتدار آئے۔ ان کا پہلا بادشاہ حماد الدولہ تھا۔ جس نے اپنے علاقہ کے بادشاہ کو ذریعہ اس سے حکومت چھین لی، پھر مقتدر عباسی کی خلافت کے زمانہ میں اطراف و جوانب کے بادشاہوں سے بڑی بڑی لڑائیاں لڑ کر فتح حاصل کی۔

در حقیقت اس کا باپ اور بھائی بابتہ پیشہ شکاری تھے، جو پرندوں اور چھلیوں کا شکار کر کے ان کو فروخت کر کے گذر بسر کرتے تھے۔ اسی واسطے انہوں نے ولیم کے کوہستان سے عراق عجم کا سفر کیا، وہاں کسی شہر میں ٹھہرے ذرا ٹھنگ کا لباس پہن کر ایک امیر سے ملاقات کو گئے، وہ ان کی جسمانی وجاہت اور لچھے دار باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کو بادشاہ کے پاس لے گیا۔ وہاں ان کو کثرت کریں میں بھرتی کر لیا گیا۔ یہ اپنی کارگزاریوں اور تعلق و چرب زبانی کے باعث بلند سے بلند عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ تا آنکہ امامت عظمیٰ تک جا پہنچے، جب بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو حماد الدولہ جو عقل و تدبیر سے اہل خانہ میں اپنا اعتماد بجا چکا تھا۔ تخت شاہی پر متمکن ہو گیا۔ یہ سلسلہ کا واقعہ ہے ان کا دور حکومت ایک سو ستائیس برس تک دراز ہوا۔ اور اس دوران ان کی حکومت بلاد فارس، عراق عجم اور ولیم میں مضبوط و مستحکم ہو گئی۔

ان کا پورا خاندان غلہ اثنا عشری تھا۔ اس لئے سارے کے سارے اثنا عشریہ ادھر ادھر سے سمٹ کر ان کے شہروں میں اکٹھے ہو گئے، اور آذربائیجان، خراسان، جرجان، مازندران، جیلان اور جبال ولیم تک جو ان کی قلمرو کی آخری حد تھی اسی مذہب کا زور ہو گیا۔

اس مذہب میں کثرت سے اہل علم پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن اس غلبہ اور قوت کے باوجود تقیہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہاں تک کہ ان کا وزیر اعظم صاحب عباد غور کو معتزلی بتاتا تھا مالا محکہ در پردہ بڑا سخت اور کٹر افضی تھا۔

جب دیالمہ (ولیم والوں) کی سلطنت کا شیرازہ پراگندہ ہوا۔ اور سلطنت جاتی رہی تو اکثر اثنا عشریوں نے تقیہ سے کام لیا اور معتزلیوں اور اہل سنت سے شیر و شکر ہو گئے۔ تا آنکہ فتنہ تاتار کا ہنگامہ برپا ہوا جس نے سب خشک و تر کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ اس وقت کے عباسی خلیفہ کا نام وزیر علی تھا۔ جو غدار کی کر کے در پردہ تاتاریوں سے ساز باز رکھتا تھا۔ اول اول تو اس نے بہت زور بھرا مگر بالآخر تباہی و بربادی کی ذلت سے دوچار ہوا۔ پھر جب اسلام میں کچھ ضعف ہوا۔ اور اہل سنت کا ڈر دلوں سے نکلا تو پھر اس فرقہ نے پرچہ نکلے

اور خاصی قوت پکڑ گئے۔ ادران شہزادوں میں پھر اپنے مذہب کی اشاعت شروع کر دی۔

جب سلاطین غلامان بن ارغوان بن ابغابن ہلاکو بن توتلی بن چنگیز خاں۔ مسلمان ہوئے۔ اور اس کے ساتھ ہزاروں لاکھ کری اور اس کے پیروکار بھی مسلمان ہو گئے۔ اس نے اپنا نام محمود رکھا۔ اور طریق اہل سنت کے موافق نہایت سلامت روی کے ساتھ حکومت کی اور زندگی گذاری۔ اس کے بعد اس کا بیٹا المجاہد خدا بندہ بادشاہ بنا۔ یہ فن تعمیر کا دلدادہ، کھیل تماشاؤں اور لہو و لعب کا شوقین تھا۔ اتفاقاً ایک اثنا عشری رافضی جس کا نام تاج الدین تھا اس سے آگمرا یا۔ اس نے بادشاہ کو اپنے مذہب کی ترغیب دی، بادشاہ اس سے متاثر ہوا، اور اس کے بہ کائے میں اگر اپنا مذہب ترک کر کے شیعہ ہو گیا۔ اس بات سے شہ پاکر تاج الدین نے ندر شہر سے اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ اپنے مذہب کے علماء محمود بن مسکری علی کو دربار شاہی میں کھینچ لایا۔ بادشاہ کے سامنے تربیت توصیف کر کے ابن مسکری کی قدر و منزلت بادشاہ کے دل میں اتاری۔ اور رفتہ رفتہ سلطان کو یہ باور کرادیا کہ سب اسلامی فرقوں میں نجات یافتہ فرقہ میں اثنا عشری ہی ہے۔ کھنڈہ اس سلطان جو نو مسلم ہی تھا، حقیقت دین سے ناواقف اور تاریخ اسلامی سے ناہد۔ اس لئے تاج الدین کا جادہ اس پر اچھی طرح چل گیا۔ اور سلطان کو مع اہل خانہ و متبعین اپنے مذہب میں گھسیٹ لایا۔

ابن مسکری کی کتابیں مثلاً بیچ الحق۔ منہج الکرامہ وغیرہ خسوفی طور پر سلطان اور اس کے امراء و متبعین کے لئے لکھی گئیں۔ غرض اس زمانہ میں مذہب اثنا عشریہ کا غلبہ خوب بلند ہوا۔ ابن مسکری نے الفین شرح تجرید، استبصار نہایت غلامہ اور مبادی در اصول جیسی کتابیں اس فرقہ کے لئے لکھیں۔

سلطنت میں سلطان کا بیٹا تخت نشین ہوا تو علمائے اہل سنت کے بھانے بھانے سے مذہب رافضی سے توبہ کر لی، اور اس عقیدہ بد سے بیزاری کا اظہار کر کے تمام رافضیوں کو اپنی قلمرو سے نکال دیا، اور علی کا بوریا بستر بھی گول ہو گیا۔

غرض ان کے تمام علماء اور داعی ادھر ادھر روپوش ہو گئے۔

تا آنکہ تراکمہ نے جو دراصل اثنا عشری تھے، دیار بکر اور اس کے گرد و نواح میں قوت حاصل کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی، تو بھرے ہوئے آدارہ گرد، علماء اور فریب کار پھر ایک جگہ جمع ہو گئے اور تقریباً پچاس برس تراکمہ کے زیر سایہ سب و شتم کا غورہ مچاتے اور اپنی عاقبت خراب کرتے رہے۔ جب تراکمہ کی حکومت کمزور پڑی۔ تو اس مذہب کا دور ٹوٹا۔ مگر جب سلاطین میں سلاطین حیدریہ جو اپنے آپ کو صفوی کہتے تھے اور جن کی تراکمہ سے قربت ظاہری اور سمدھیانے کی رشتہ داری تھی۔ تراکمہ کی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ اور عراق، عجم، کرمان، مازندران، آذربائیجان، خراسان اور تبریز بغیر کسی مقابلہ و محاذ کے ان کے زیر اقتدار آ گئے تو ایک بار پھر ان کو یکجا ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور اس فرقہ کے علماء بڑے شد و مد سے پھر جمع ہو کر اپنے شیطانی کام میں جٹ گئے، اس دفعہ ایک نئے فتنہ کی داغ بیل ڈالی، کسی خوشامدی عالم نے بادشاہ کو نائب صاحب الزماں قرار دے کر مسجد کی رسم جاری کرائی۔ اس کی چالپوسی جب کامیاب ہوئی اور مصاجت شاہی کا اعزاز مل گیا تو بادشاہ کے کان بھرے کہ وہ لوگوں کو مسجد پر مجبور کرے اور مرتابی کرنے والے کو حوالہ تیغ کرے۔ جمعہ و جماعت کی ادائیگی سے مسلمانوں کو جبراً رکے۔ تحویل قبلہ بجانب یساراکے

غلیبوں کے لئے فرمان جاری کرے کہ منبروں پر جی نہیں لگی کو چروں میں بھی جلیل القدر صحابہ کرام اہل بیت حضرت صدیق و حضرت حفصہ رضی اللہ عنہم پر علی الاعلان گالی گلوچ کریں۔ مجوز نے تبریٰ ادرمن طعن کے وجوب پر کتاہیں شائع کیں۔ وہ جو کہنا بادشاہ دل و جان سے اس کو مانتا، علمائے اہل سنت کی ایک جماعت اس کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ مسعد دریان و برباد ہوئیں۔ صالحین امت میں سے عین القضاۃ ہمدانی، قاضی ناصر الدین بیضاوی و حمبا اللہ کی میتوں کی بے حرمتی کی حتیٰ کہ ان کی قبروں سے ان کی ہڈیاں نکال کر نذر آتش کی گئیں۔ البتہ بہت سے اور بزرگ علماء و صلحاء مثلاً شیخ الاسلام احمد جامی، شیخ ابوالحسن خیرقانی، ابو زید بسطامی، شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری اور تمام مشائخ ہرات رحمہم اللہ تعالیٰ جو وفات پا چکے تھے حمایت ایزدی سے اس فتنہ اور بے حرمتی سے محفوظ رہے۔

اس پرفتن دور میں اہل سنت کی جائے پناہ بلاد ماوراء النہر تھے۔

جو شخص بھی ان کے جوہر دستم سے بچ نکلتا وہ کسی نہ کسی صورت سرزمین توران پہنچتا اور ان کی بربریت و ظلم و شقاوت کی مجسم تصویر دہاں کے حکمرانوں کو دکھاتا۔ بہت سے اہل دین اور علمائے کرام کی طرح ہرات کے ملازمے بھی ان کے منہ سے نہ بچ سکے، جب وہ ظلم دستم سے کھڑے انتہا دکھ جھیل کر توران پہنچے تو خاقان اعظم عبد اللہ خاں کے پاس گئے اور اس کو مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی کے لئے غیرت دلائی، چنانچہ اس نے اس کا اثر لیا اور خراسان پر چڑھنا کر کے نہ صرف مظلوموں کا پورا پورا بدلہ لیا بلکہ ظالموں کا اقتدار بھی خاک میں ملا کر خراسان سے بے دخل کر کے خود اس پر قبضہ کر لیا۔

عبد اللہ خاں کے انتقال کے بعد صفویوں نے گو خراسان پر دوبارہ قبضہ کر لیا، مگر ملوک تجار و بلخ نے انہیں مین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اڑبک اور ترک ہر سال پے پے ان سے برسریکا رہتے۔ دوسری طرف ملوک و امراء خوارزم ان سے برابر جہاد کرتے رہتے اور قتل و غارت اور ان کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، اُدھر قیصر روم تبریز اور اردبیل کی طرف سے ان کے سر پر سوار رہتا۔ غرض دو سال بدظمی اور اختلال کے ساتھ گزار کر بالآخر افغانہ کے قدموں تلے روندے گئے۔ اور ذلت و خواری سے دوچار ہوئے۔ ان افغانوں نے بادشاہ وقت کو اصفہان میں نرنے میں لے لیا۔ بالآخر حصار کی بندشوں اور بھوک کی تکلیف سے تنگ آکر انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ افغانوں کا سردار شہر میں فاتحانہ داخل ہوا بادشاہ اور اس کے گھر والوں کو گرفتار کر کے مملکت پر قابض و متصرف ہو گیا۔ یہی وقت تھا کہ اس مذہب کے لوگ ان شہروں سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گیر ہوئے اور اچھا خاصہ جتھہ جمع ہو گیا۔ وہ یہاں کے امراء، تجار اور ملوک کے سامنے ہر ممکن طریقہ اور حربے سے اپنا اعتبار جالینے میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر یہاں بھی انہوں نے اپنی فطرت کے جوہر دکھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، رفتہ رفتہ یہاں بھی ان کا مذہب پھیل گیا۔ اور بالآخر ہندوستان کی وزارت، امارت اور صوبہ داریاں قبضانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں انہوں نے عراق و خراسان کی طرح اثر و رسوخ قائم کر لیا۔

تیسرا فائدہ :- شیعی فرقوں میں سے ہر فرقہ میں داعیان مذہب ہوتے تھے جن کو دُعا کہتے تھے۔ یہ صرف اپنے اپنے فرقہ کے مذہب کی طرف بلاتے تھے۔ ان کی دعوت کے چار طریقے تھے۔ (۱) علم (۲) مال (۳) زبان (۴) تلوار۔ (۱) علم سے وہ اس طرح کام لیتے کہ شبہات کو شہرت دیتے اور ان پر ایسی موزوں اور جچی تلی گفتگو کرتے

کہ ہر خاص و عام کے دل میں اتر جائے۔ اور ہر شخص کی قابلیت، عادت اور مذاق کے مطابق ہمکاری کرتے۔ اہلسنت کے دلائل توڑ مروڑ کر اپنے مذہب کی تائید و تعریف میں اور دوسرے کے مذہب کی مذمت میں استعمال کرتے۔

(۲) مال سے کام لینے کا طریقہ۔ مثلاً اس مذہب کو قبول کرنے والوں کو، ہدیئے، تحفے اور انعامات دینا۔ نوسلوں کی بہت تعظیم کرنا اور ان کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اپنے ہم مذہبوں کو ملازمتوں اور عہدوں کے ذریعہ فائدہ پہنچانا۔ غیر مذہب والوں کو ملازمتوں سے نکالنا۔ اور ان کو حقیر و ذلیل رکھنا۔ مقدمات، میں ہم مذہبوں کے ساتھ رعایت اور جانبداری کا سلوک کرنا۔ غیر مذہب والوں کو ملزم و قصور وار ٹھہرانا۔

(۳) زبان سے دعوت کا کام لینے کی صورت۔ قبولیت مذہب پر اچھے وعدہ کرنا۔ جو ان کے مذہب کی طرف مائل ہو تو محبت و شفقت، آمیز گفتگو کرنا، اور جو ان کے مذہب کا مخالف ہو تو اس سے تیوری چڑھا کر بات کرنا اور سختی و درشتی سے ہمکا م ہونا۔

(۴) اور تلوار سے یوں کام لیتے ہیں کہ مخالف مذہب کو قتل کر دیتے، لوگوں کو مذہب قبول کرنے پر مجبور کرتے۔ مخالف مذہب کے امراء و حکام سے جنگ کرتے۔ تاکہ ان کی شوکت کم ہو۔

جو داعی دعوت دینے کے لئے چاروں طریقے استعمال کرے وہ مکمل داعی کہلاتا، مگر ایسا داعی نادر الوجود ہوتا ہے بعض داعی، دو طریقے اور بعض تین طریقے استعمال کرتے۔ پھر دعوت کے اسباب بھی کئی ہیں۔

دعوت مذہب کے اسباب

پہلا سبب :- اہل مذہب کو گمراہ کرنا۔ ان کی جمیعت میں بھوٹ ڈالنا اور افتراق پیدا کرنا تاکہ اپنے ہم مذہب ان کی برائیوں سے امن و حفاظت میں رہیں۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا اور اس کے بھائی بندوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ دوسرا سبب :- لشکر کی تعداد بڑھانا تاکہ ان کی کثرت کے سہارے اپنے پروگرام پورے کر سکیں جیسا کہ کیسیائیوں نے کیا۔

تیسرا سبب :- حکومت و اقتدار اور جاہ و مرتبہ کی محبت اور ملک و مال کا حصول۔ جیسا کہ مختار کا حال تھا، کہ اس نے مذہب کو زینہ اقتدار و حکومت بنایا، اور اس کے ذریعہ جاہ و مرتبہ اور مال و دولت اکٹھا کیا۔

اس فرقہ میں ائمہ و امامیہ کے درمیان بہت سے لوگ سفیر و وکیل کا کام انجام دیتے تھے خصوصاً صاحب الزماں کی غیر موجودگی میں۔ دور عباسیہ میں تو اکثر ائمہ، سرمن رائے اور بغداد میں نظر بند ہوتے تھے، عوام سے ان کا براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ بلکہ یہی سفیر اور وکلاء سرگرم رہتے تھے۔ اور ائمہ کی طرف سے بناوٹی خطوط اور جعلی دستاویزات پیش کر کے لوگوں کے دلوں میں ائمہ کی صداقت بٹھاتے تھے۔ صرف اس لئے کہ تمام شیعہ ان داعیوں یا وکلاء اور سفراء کو اپنا پیشوا تسلیم کریں وہ شخص مال کے حقدار ٹھہریں۔ امہات اولاد اور بارگاہ و کنواری بڑکیاں ان کے لئے حلال قرار دی جائیں۔ وہ پُر تکلف و عورتیں اڑا سکیں۔ انہیں نذرانے پیش کئے جا سکیں۔

یہ لوگ جو وکلاء اور سفراء کہلاتے تھے مندرجہ بالا فوائد حاصل کرنے کے لئے ائمہ کی طرف سے سراسر جھوٹی روایتیں پیش کیا کرتے تھے۔ فروعات شیعہ میں اکثر خرابی کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔

چوتھا سبب :- صاحبان دولت و ثروت کی خوش آمد اور چاہوسی کرتے رہنا تاکہ وہ ان کے مذہب کا

ولدادہ اور اہل مذہب کا بنارس ہے۔

پانچواں سبب :- دعوت مذہب کے کام میں اللہ تعالیٰ سے آجرو ثواب کا امیدوار رہنا۔ مگر اس فرقہ نے اس سبب کو کبھی مقصد دعوت نہیں بنایا۔

چھٹا سبب :- ہم مذہب دوستوں، عزیزوں کے ساتھ مذہبی اتحاد باقی رکھنا، تاکہ باہم روابط استوار رہیں۔ اور گھری میں نہ پھوٹ پڑ جائے۔

ساتواں سبب :- بنی نوع انسان کو عذاب دوزخ سے نجات دلانا۔ بعض سادہ لوح احمق لوگوں نے اس غرض سے یہ تبلیغ کی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اصفہان میں کسی مشہدی خواجہ نے اپنے گھر میں ایک عجیب باغ لگایا تھا موسم بہار میں اذن عام دینا کہ ہر خاص و عام آکر باغ کی خوش منظری سے لطف اٹھائے اور اس کے پھولوں پھلوں سے بہرہ ور ہو۔ اب اگر اس مجمع میں کوئی اہل سنت بھی آ جاتا تو خواجہ ہائے ہائے کوکے چلاتا اور روتا تھا۔ لوگ سبب پوچھتے تو کہتا کہ مجھے بنی نوع انسانی کے ان لوگوں پر رحم آتا اور صدمہ ہوتا ہے کہ یہ پیچارسے دوزخ میں جلیں گے۔

آٹھواں سبب :- اہل سنت کے درمیان بغض و عناد اور دشمنی کا ایسا بیج بونا کہ ایک گھروالے بھی آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جائیں۔ تاکہ ان کا روزگار تباہ اور زندگی تلخ ہو جائے۔

گذشتہ تحریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر فرقہ کا پہلا داعی ہی اس فرقہ کا بانی یا موجد ہے۔ ان میں سب سے پہلا داعی عبداللہ بن سبا تھا۔ اس کی مذہبی دعوت کا سبب بھی یہی تھا کہ کسی طرح اسلام میں رخنہ اندازی کی جائے اور مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالی جائے۔ چنانچہ تاریخ طبری کے ترجمہ میں جس کا مترجم بھی شیعہ ہی ہے۔ اس کی دعوت کا تفصیلی واقعہ درج کیا گیا ہے وہ کہتا ہے کہ ۳۰ھ کے آغاز میں مذہب رجعت رونما ہوا، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر فتنوں کا ہجوم ہوا۔ اس مذہب رجعت کا بانی یہ عبداللہ بن سبا ہی ہے۔ یہ مین کا رہنے والا ایک یہودی تھا۔ قدیمی کتب کا مطالعہ کئے ہوئے تھا۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا میں آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا ہوں، اس اسلام لانے کا مطلب جو یہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا، یہ تھا کہ جب میں ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوں گا تو یہ میری ناز برداری کریں گے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے منہ نہ لگایا تو یہ ناراض ہو گیا۔ اب یہ جہاں بیٹھتا آپ کی برائی کرتا جب آپ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے اسے شہر بدر کر دیا۔ وہاں سے یہ سسر پہنچا، پڑھا لکھا، عقلمند و چالاک اور عیار و چرب زبان تھا، چند ہی دنوں میں اس کے پاس اچھا خاصا جگمگت ہونے لگا۔ اور جب لوگوں نے اس کی ملی باتیں سنیں تو اس کی قدر کرنے اور اس کی باتوں کی طرف دھیان دینے لگے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ لوگ میری باتوں پر توجہ دیتے اور ان سے متاثر ہوتے ہیں تو ان کے سامنے اپنا یہ نظریہ رکھا کہ عیسیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کے قائل ہیں، اس قسم کا عقیدہ اگر مسلمان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رکھیں تو زیادہ حق بجانب ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود فرمایا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَقَ مَیْکَکَ الْمُقْرَآنَ لَرَاٰذِلَکَ اِلٰی مَعَاہِجٍ۔ ”بے شک وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا تجھے لوٹنے کی جگہ پر دوبارہ لوٹائے گا۔“

کچھ لوگوں نے اس نظریہ کو بڑا پسند کیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ لوگ اس بات کو ہضم کر گئے اور اس پر چم

گئے ہیں تو ایک اور شوشہ چھوڑا اور کہنے لگا کہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آچکے ہیں اور ہر نبی کا ایک وزیر ہوتا رہا ہے تو ہمارے پیغمبر کا وزیر کیوں نہ ہو؟ ہمارے پیغمبر کے وزیر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) تھے اور انہیں کو جانشینی اور خلافت کا حق تھا۔ مگر عثمان (رضی اللہ عنہ) نے ظلم و ستم سے یہ حق لے لیا۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اس مسئلہ کو شوریٰ کے حوالہ کر دیا تھا۔ اہل شوریٰ سب علی (رضی اللہ عنہ) کی خلافت پر متفق اترے تھے۔ عبداللہ بن ابی سہل (رضی اللہ عنہ) نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا ہاتھ پکڑا کہ عثمان (رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لیں اور عمر بن ابی (رضی اللہ عنہ) نے دھوکہ دے کر بیعت کرادی۔ ادھر خود عثمان (رضی اللہ عنہ) خود بھی اس ناحق بات کے لئے آمادہ ہو گئے۔ لوگوں نے اس کی یہ بات بھی ٹھنڈے پٹیوں برداشت کر لی۔ اور اس کے خیال کی تائید کرنے اور اس کی بات ماننے لگے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ دونوں باتیں لوگوں نے کھلے دل سے قبول کر لی ہیں، تو کہنے لگا کہ دیکھو جس طرح نماز روزہ فرض ہے اسی طرح ہر مسلمان پر امر بالمعروف بھی فرض ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ ذَٰلِكُمْ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۖ فَاذْكُرُوا اللَّهَ الَّذِي هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُكْمِلُونَ** اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اب ہم عثمان (رضی اللہ عنہ) کے معاملہ میں اتنا کر سکتے ہیں کہ ان کا حکم مانیں اور نہ ان کے کارندوں کا۔ اور یوں ان کے ظلم سے اپنے کو محفوظ بنالیں۔

غرض ان باتوں سے بعد اللہ بن سبا کی یہ بھی کہ لوگوں کو حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کے احکام کی خلاف ورزی پر لوگوں کو ہمت و حوصلہ دلائے، اور انہیں جبری وجہ باک بنادے۔ مرثیہ دلوں کے لئے یہ مذہب ”سنہ و شفا تھا لوگوں کو یہ مذہب بہت اچھا لگا اور رحمت کے قائل ہو گئے، حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کو علی الاعلان تو نہیں مگر دل میں کافر کہتے تھے، آخر ابن سبا کا یہ گزروہ اس بات پر متفق ہو گیا کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو معزول کر دیا جائے اور ان کی جگہ کسی دوسرے کو غلیفہ بنایا جائے۔ ابن سبا نے سب سے وعدہ لیا۔ کہ سب کے سب فلاں دن مدینہ میں جمع ہو جائیں۔ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو بھی اس کی اطلاع مل گئی کہ شہروں میں لوگ جمع ہو ہو کر یہ فیصلے کر رہے ہیں کہ ان کو معزول کر دیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ

خلاصہ کلام یہ کہ اس پورے ہنگامہ اور غلغلا میں ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کا یہ کام رہا کہ جب بھی معاملہ کو رو باصلاح دیکھیں تو ہر طریقہ سے اُسے ناکام بنائیں اور معاملات کی اصلاح نہ ہونے دیں۔ بالآخر فتنہ کی یہ آگ پورے زور سے بھڑک اٹھی، اور مصر کے غنڈوں اور باشوں نے حضرت ذوالنون (رضی اللہ عنہ) کو شہید کر کے اس کی دلی مراد پوری کر دی۔

جب حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی بیعت خلافت ہو چکی تو اسے پھر اندیشوں نے گھیر لیا کہ ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں میں سکون لوٹ آئے اور جہاد کا سلسلہ پھر جاری ہو جائے، تو اب اس نے شیاع علی میں شمولیت اور شرکت کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ باہر رہنے کی نسبت اندر رہتے ہوئے حالات پر قابو رکھنا آسان ہے۔ چنانچہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے گرد جو اپنے اور پرلئے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے اپنے مطلب کے آدمی چھانٹ کر شیطانی و غلیفہ انجام دینے میں خوب موقع ملا۔ اہل بیت کی نئے سرے سے بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے کام کو کیسان اور غنمہ شیعہ

نے انجام دیا کیونکہ اس کے بعد یہی دونوں اس فرقہ کے داعی تھے۔

اب ان کا بھی طریق دعوت ملاحظہ فرمائیے، شام و عراق کے شقی لوگوں نے جب جناب امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا (اگرچہ قاتلانِ حسین میں شیعانِ کوفہ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں، تو کیسان نے جس کا حال ماقبل میں بیان ہوا۔ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد واصل محمد بن الحنفیہ امام ہیں نہ کہ حسین رضی اللہ عنہما) کیونکہ یہ دونوں حضرات اہل شام سے نرمی کا سلوک فرماتے اور زمانہ سازی سے کام لیتے تھے۔ مختار ثقفی بھی کیسان کے پیروکاروں میں شامل تھا۔ اور یہی اس کا مذہب تھا۔

جب مختار ثقفی کے ہاتھ میں کوفہ اور گرد و نواح کی زمام ولایت و اقتدار آگئی، تو اس نے اپنے مذہب کی دعوت دینی شریعت کی۔ مگر کوفہ کے شیعوں کی دلداری کی خاطر اپنے اور اپنے مرشد کیسان کے عقیدہ میں ترمیم کر کے جناب حسین رضی اللہ عنہما کی امامت کو بھی تسلیم کر لیا اور محمد بن الحنفیہ کو ان کے بعد کا دجہ دیا۔ (گو یا تفکوک کر جاٹ لیا، اس لئے کہ حسین رضی اللہ عنہما کی امامت سے یہ اسی لئے منکر تھا کہ وہ حضرات سیاست یا زمانہ سازی سے کام لیتے تھے، اور اب جو اس نے کوفہ کی شیعہ اکثریت کی خاطر اپنے عقیدہ کی ترمیم کی تو وہ سیاست یا زمانہ سازی نہیں تو اور کیا تھا۔ نہائی)

مختار کے عقیدہ میں ترمیم کر لینے سے کوفہ کے سب شیعوں نے اس کی متابعت اختیار کر لی۔ اب اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ نواصب مروانہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے انتقام اور بدلہ لینے کے لئے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اپنا نائب بنایا ہے اور مفتوحہ شہروں کی امامت بھی مجھے مرحمت فرمادی ہے۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں رسائے شیعہ کو ایک مہربان اور مہرشدہ خط دیا اور ان سے کہا کہ سب کے سامنے اسے کھولیں اور حاضرین کو پڑھ کر اس کا مضمون سنائیں۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

”محمد بن الحنفیہ کی طرف سے شیعانِ کوفہ اور اس کے رؤسا کے نام، فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں معلوم کریں کہ میں نے مختار بن ابی عبیدہ کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ پس اس کے حکم کی اطاعت کریں اور اس کی ہمرکابی میں جان و مال سے دشمنوں سے جہاد کریں۔ اپنے متبعین اور پیروں کو دشمنوں سے لڑنے اور مختار کی اطاعت پر پابند کریں۔“

اس فرقہ کی موجودگی میں کسی کو اب دمِ زون نہیں تھی سب نے اس کی اطاعت کر قبول کیا۔ اول اول انہوں نے کوفہ میں قاتلانِ امام کو تلاش کر کے قتل کیا، امیرِ کوفہ، اب مقابلہ نہ پا کر کوفہ سے بھاگ نکلا۔ تو مختار ثقفی کوفہ کا امیر بن بیٹھا۔ اس کے بعد ان لوگوں سے جہاد کے لئے جو مروانیوں کے ساتھی یا پیروکار تھے اور عراق میں رہتے تھے۔ ابراہیم بن اشتر کو نامزد کیا۔ چنانچہ ابراہیم کوفہ سے نکلا اور جو نا بوا گیا قتل کرتا پھیل گیا۔ تا آنکہ بلادِ عراق و اہواز پر قبضہ کر لیا اور دیارِ بحرِ آذربائیجان پر بھی اپنا اثر جما لیا۔ اس کے بعد شام اور دمشق پر حملہ کا ارادہ کیا۔

جب عبدالملک بن مروان کو اس کے ارادوں کی جھنک ملی۔ تو اس نے عبداللہ بن زیاد کو ایک لاکھ فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ ابراہیم کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج تھی، گھسان کی لڑائی کے بعد ابراہیم بن اشتر نے ایک لاکھ کے لڑکے کو شکست دی اور ابن زیاد قتل ہوا۔ ان واقعات کے بعد شیعوں کی نظر میں مختار کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی۔ اور بڑی فادہ فادہ ہوئی۔ یہاں تک کہ مخلص شیعوں نے بھی جو اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے مروانی فوج

کی شکست اور ابن زیاد کے قتل پر سجدہ شکر ادا کیا اور مختار کے اس کارنامے کو گو وہ ملک و ریاست کے لاپٹے میں کیا گیا تھا۔ بہت سراہا۔ مختار کی یہ اقبال مندی دیکھ کر چاروں طرف سے شیعہ سمٹ سمٹ کر اس کے پاس آنے لگے اور اس کا مذہب اختیار کرنے لگے۔

مختار کی حکومت تقریباً دس سال تک رہی اور جب دشمنوں کی طرف سے اسے خاطر خواہ طینان و تسلی ہو گئی تو وہ اپنے اصلی جامہ میں ظاہر ہو گیا اور دین میں تحریف اور ایجادات میں مشغول ہوا

پہلے پہل اس نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرسی کو تابوت الاسکینہ کا نام دے کر بتوں کی طرح اس کی پوجا کرائی، حالانکہ تاریخی حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امیر المؤمنین کی کرسی ہرگز نہیں تھی بلکہ طفیل بن جعدہ کسی روغن فروش کی دکان سے اٹھا لایا تھا۔ اس کے بعد وہ بلند بانگ دعووں پر اتر آیا مثلاً کہتا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آتے ہیں۔ اور مجھے غیب کا علم حاصل ہے۔ اس قسم کی باتیں بطور عقیدہ اپنے تک نہیں رکھتا تھا بلکہ لوگوں کے سامنے علی الاعلان کہتا تھا اس کی انہیں سفوات کی بناء پر کوفہ کے شیعوں کی اکثریت اس سے متغیر ہو گئی اور آپس میں بحث و مناظرہ کا دروازہ کھل گیا۔ بالآخر یہ تمام واقعات حضرت عبداللہ بن زبیر کے گوش گزار ہوئے اور لوگوں نے اس کا دوا کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہما کو جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے داماد اور جناب سیکندہ رحمہ اللہ علیہا کے شوہر تھے۔ مختار کی سرکوبی اور اس کے پھیلے ہوئے فتنہ کے دفعیہ کے لئے نامزد فرمایا۔ تاکہ کوفہ کے شیعہ ان کو مختار کے مقابلہ میں ریاست و سیادت کا زیادہ حقدار سمجھ کر مختار سے کنارہ کش ہو جائیں۔

حضرت مصعب پہلے بصرہ گئے اور اپنے برتاؤ اور طرز عمل سے ان کو اپنا گرویدہ بنایا۔ ادھر کوفہ کے شیعوں سے ملاسلٹی رابطہ قائم کر کے مختار سے برگشتہ اور اپنے ساتھ وابستہ کیا۔ اور ابراہیم بن اشتر کو جو مختار کا دست و بازو و شمشیر بران تھا موصول و دیار ہجر کی سرداری کا لاپٹے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور جب ہر طرف سے مختار کو تنہا کر دیا تو اس پر حملہ آور ہو کر قتل کر ڈالا، اور اس کی جمیعت کو پراگندہ و منتشر کر کے اس فتنہ کو پامال کیا۔ مختار کے زمانہ میں کلیدی اور بڑے بڑے عہدے مختاریوں اور کیسانیوں کے پاس تھے، ان عہدوں پر اہل سنت کو فائز و سرفراز کیا۔ کیسانیوں کی اکثریت نے اپنے مذہب سے توبہ کی اور جرنیل رہے وہ ادھر ادھر روپوش ہو گئے۔ ان بچے ہوئے کیسانیوں میں تعین امام میں اختلاف پیدا ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

آخر ان بچے کچھے کیسانیوں کے سرداروں میں سے ہشام احمول، ہشام بن سالم اور شیطان الطاق فرقہ امامیہ کے داعی بن کر اٹھے، اور خود کو امام زین العابدین رحمہ اللہ علیہ اور ان کی اولاد سے رشتہ و عقیدہ مندی کے ذریعہ وابستہ کیا۔ اور محمد بن الحنفیہ اور ان کی اولاد پر تبری بھیجنے لگے۔

تفصیلیوں کا ایک گروہ اور مختاریوں کے باقی ماندہ میں سے کچھ لوگ بھی ان کے مذہب میں شامل ہو گئے۔ اور اسی وقت انہیں ان لوگوں کے ذریعہ مذہب امامیہ وجود میں آیا۔ اور یہی لوگ اس مذہب کے داعی ہیں اور امامیہ کے اسلاف اور پیشوا اور راویان اخبار ہیں اور اس مذہب کے پیروؤں نے دین و ایمان، عقیدہ و عمل جو کچھ لیا انہیں مذکور المصدرین داعیوں سے لیا ان کے نزدیک ان کا قول و فعل قابل تقلید اور لائق اعتماد و پیروی ہے۔

یہ کیسے لوگ تھے، اور ان کے کیا کرتوت تھے ان کا بیان اس کتاب میں عنقریب مذکور ہوگا تو معلوم ہوگا

کہ مجھ پر مصرعہ ہیں (کھلا بھید ہیں) جو اپنے معبود و مومہوم کو اپنے ذہن میں ترتیب سے کر اور تراش کر ہزاروں برائیوں سے اس کا دامن آلودہ کرتے ہیں۔

اور وہ ائمہ کرام رحمہ اللہ جن سے یہ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے، وہ خود ان سے ان کے لغو عقائد سے ہمیشہ بیزار و متنفر رہے ان پر لعنت بھیجتے رہے۔ اور ان کو بد بخت اور گمراہ ٹھہراتے رہے۔

ان ہی دونوں میں ایک اور فرقہ۔ فرقہ زید یہ پیدا ہوا، اور اس کے داعی اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہو گئے، اس فرقہ کا مقصد پیدائش یہ تھا کہ حضرت زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم مروانیوں کے غلام اٹھ کھڑے ہوئے شیعیان مخلصین تفتنیلیہ اور کوفہ والوں کو اپنی طرف دعوت دی، چنانچہ بہت بڑی جماعت نے ان کی دعوت پر لبیک کہی۔

جناب امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو مبنی بر حقیقت اور درست سمجھتے تھے اور اہل کوفہ کو آپ کی متابعت کی ترغیب دلاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس لوگوں کی قابلِ داپسی امانتیں نہ ہوتیں یا مجھے اپنے پس ماندگان کے متعلق یہ اطمینان نہ ہوتا کہ ہر ایک امانت کو اس کے مالک تک پوری دیانت داری سے سپرد کرنے کی ان میں اہلیت ہے تو میں جناب زید کے شانہ بشانہ دشمنوں سے جہاد کرتا۔ (اسی کے ساتھ یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ اپنی فراست مومنانہ کوفہ کے شیعوں کے متعلق یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ اپنی تاریخِ عذر دہرائے بغیر نہیں رہیں گے اور جو یہ ایک مرتبہ امام حسین رضی اللہ عنہ سے کرچکے ہیں وہی کچھ جناب زید سے بھی کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے علیٰ شرکت کے بجائے ترغیب و تائید کا راستہ اختیار کیا۔

ان شیعوں نے امام زید کے ساتھ جو کچھ کیا اب اس کا قصہ پڑھئے۔ مترجم) القصبہ جب جناب زید رحمۃ اللہ علیہ کا مقابلہ مروانیوں سے ہوا۔ تو کوفہ کے تیس ہزار شیعہ عین عالم جنگ میں امام موصوف کو چھوڑ کر اپنے اپنے بلوں میں جا گھسے۔ بات یہ تھی یہ لوگ تمام قابلِ احترام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی دنیا میں گستاخیاں اور تبریٰ بازیاں کرتے تھے۔ جس کو جناب زید نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو سختی سے منع فرما دیا اور اس پر ڈانٹ پھڑکار بھی کرتے تھے۔ (یہ لوگ بد بخت نہ ہوتے اور ان کو امام کا یہ طرز عمل اچھا نہیں لگتا تھا تو جنگ کے نازک لمحے کے پیش آنے سے پہلے امام کا ساتھ چھوڑ کر چلے جاتے تو ان کا وہ عذر قابلِ قبول بھی ہوتا اور جناب زید کو بھی آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کا موقع مل جاتا۔ مگر عزت و ذلت دینے والے رب کریم نے ان کو ذلت کے قعرِ عظیم میں دائمی طور پر گرانا ہی تھا اس لئے وہی سرزد ہوا جو ان کی فطرت تھی۔ نعمانی)

چونکہ اس جنگ میں ان کو موت نظر آ گئی تھی اس لئے جناب زید کو اپنی جانوں کا صدقہ بنا کر دشمنوں کے حوالہ کر کے خود بھاگ گئے۔ اور عذر یہ تراشا کہ چونکہ جناب زید ہم کو صحابہ کرام پر تبریٰ سے منع کرتے ہیں تو یہ ہمارے مذہب و عقیدہ کے نہیں ہیں اس لئے ہم ان کے جھنڈے کے نیچے کیسے لڑ سکتے ہیں۔

بہر حال جناب زید شہادت کی سعادت و عزت سے سرفراز ہوئے، اور ان کے بچے کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو امام زادہ سے وابستہ کر لیا۔ اور ایک نئے فرقہ کی تشکیل ہو گئی۔ ان لوگوں میں سربراہِ آوردہ داعی یحییٰ بن زید بن علی بن حسین ہیں۔

حسن ابن حسن بن علی (رضی اللہ عنہم) کی نسل سے ایک شخص سحیلی بن حسین بن ہاشم حسنی تھا جس کا لقب ہادی تھا۔ ۲۵ھ میں اس نے خروج کیا۔ اس نے پہلے بلادین پر اور پھر بلاد حجاز پر اقتدار حاصل کیا۔ فقہ مذہب زیدیہ میں اس نے ایک کتاب بعنوان احکام، اپنی یادگار میں چھوڑی۔

اس کا بیٹا مرتضیٰ اور دو پوتے، حسن بن احمد بن سحیلی اور سحیلی بن احمد بن سحیلی بھی اس فرقہ کے داعی روپکے ہیں۔ بعض زیدیوں نے اپنے مذہب میں تحریف بھی کر ڈالی، مذہب امامیہ اور اسماعیلیہ سے چند باتیں اپنے مذہب میں شامل کر لیں۔ اور پھر خود ہی اس تحریف شدہ مذہب کے داعی بن بیٹھے، اور صاحب فرقہ کہلائے۔ چنانچہ ابوالجارود، سلیمان بن جریر، تبرتونی، حسین بن صالح، نعیم بن الیمان اور یعقوب، یہ سب اب زیدیہ فرقے میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

فرقہ امامیہ کے داعی دراصل ہشامین، شیطان الطاق اور اس کے ساتھی ہیں۔ لوگوں کے بہکانے اور اپنے مذہب کی طرف دعوت دینے میں جس مکر و فریب سے ان لوگوں نے کام لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان بھی ان کے سامنے کان پکڑنا ہے۔ اور دجال بھی اس پر حیران ہے۔ اسی لئے فرقہ امامیہ کی تعداد دوسرے تمام فرقہ والوں سے بڑھ گئی۔

جب فرقہ امامیہ مختلف فرقوں میں تقسیم ہوا تو ہر فرقہ کا علیحدہ اپنا داعی بنا۔ ہر امام کی وفات کے بعد یہ اختلاف اور وسیع ہوتا۔ بعض تو ان کی وفات تسلیم کر کے ان کے کسی بیٹے کو امام مانتے، بعض کسی دوسرے بیٹے کو۔ اور بعض ان کے بھائی کو امامت کی مسند پر بٹھاتے۔ اسی طرح ائمہ کے آخری سلسلہ تک اختلاف و اختلاف پیدا ہوتا گیا اور ان کا تفرقہ بڑھتا ہی گیا۔ درحقیقت یہ اس آیت کریمہ کے صحیح مصداق و محل بنے۔ (إِنَّ الَّذِیْنَ قَسَّوْا دِیْنَہُمْ وَكَانُوا شَیْعًا لَّسَتْ مِنْہُمْ فِی شَیْءٍ) (یہے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے فرقے ہو گئے۔ آپ ان سے بالکل علیحدہ ہیں)

یہاں تک کہ امام مسکریؒ کا زمانہ آیا، اور ان کی وفات پر یہ لوگ پھر مختلف الگے ہوئے۔ بعضوں نے کہا ان کے کوئی بیٹا نہیں۔ لہذا ان کے بھائی جعفر بن علیؒ امام ہیں۔ بعضوں نے کہا انہوں نے ایک لڑکا محمد نامی چھوڑا ہے جو مہدی موعود اور قائم الائمہ ہیں۔ لیکن دشمنوں کے خوف سے چھپے ہوئے ہیں۔ البتہ جس بات پر یہ سارے متفق ہوئے وہ ائمہ کی تعداد ہے۔ جو بارہ پر مشتمل ہے۔ اسی لئے ان کو اثنا عشری کہتے ہیں۔

ائمہ کے خاتمہ کے بعد، دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ہر ایک داعی مذہب بن بیٹھا پھر دعوت کو سفارت کا نام دے دیا گیا۔ اور ہر ایک سفارت کا مدعی بنا۔ اور کہنے لگا کہ میں امام غائب اور امامیہ کے درمیان سفیر ہوں، یہ واقعات ۳۶ھ کے ہیں۔ ہر سفیر مرتے وقت اپنا ایک خلیفہ بنا جاتا اور سفارت اس کے سپرد کر جاتا۔ سفارت کا یہ سلسلہ ۳۱۶ھ میں علی بن محمد تک پہنچا اور وہ خاتم السفراء کہلایا۔

کہتے ہیں علی بن محمد کی وفات ۳۳۷ھ میں ہوئی، اس کے بعد پھر کوئی امام نائب کی طرف سے سفارت کا مدعی نہ بنا۔ گویا امام کو پھر غیبت کبریٰ حاصل ہو گئی۔

ان داعیان مذہب میں سفیروں کی طرح بعض اصحاب کتابت بھی ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ امام

کے ساتھ ان کا خط و کتابت کا رابطہ تھا۔ جھوٹے اور جعلی خط شیعوں کے سامنے پیش کر کے کہتے تھے کہ یہ امام کے وہ دستخطی خط ہیں جو انہوں نے ہماری درخواستوں کے جواب میں تحریر فرمائے۔

اور ان میں سے کچھ لوگ وہ علماء ہیں جو مذہبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے لئے وقت ہو کر، علم، فقہ اور کلام کے معرشمہ بنے اور کچھ وہ راویان اخبار ہیں جو ائمہ یا ان کے اصحاب سے اصول، فروع یا فضائل افعال کو بواسطہ یا بلا واسطہ روایت کرتے ہیں۔ ان سب کا حال بھی انشاء اللہ عنقریب رقم ہوگا۔

اور ان میں سے چند وہ بادشاہ بھی ہیں جو کبھی تلوار کے زور سے اور کبھی انعام و احسان کا لالچ دے کر لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کرتے رہے ہیں۔ ان کے حالات بیان کرنے کی ذمہ دار تاریخ ہے۔

ناؤسیہ اور اسمعیلیہ، دونوں امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کے انکار پر متفق ہیں۔ لیکن امام جعفرؑ کے بارے میں باہم مخالفت! ناؤسیہ کہتے ہیں کہ امام جعفرؑ مرے نہیں، پوشیدہ ہیں اور پھر چند دن بعد ظاہر ہوں گے۔ ان کا داعی عبداللہ بن ناؤس ہے۔

اسمعیلیہ کہتے ہیں کہ امام جعفرؑ مر گئے، ان کے بعد ان کے بیٹے اسمعیلؑ امام ہیں حالانکہ اہل تاریخ اس پر متفق ہیں کہ وہ اپنے والد کی زندگی ہی میں وفات پا کر جنت البقیع، مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔ پھر اسمعیلؑ کو ایک گروہ زندہ اور منتظر موعود مانتا ہے، اور اس کا داعی مبارک ہے اور اس کے غفار اس کے قدم بقدم چلے ہیں۔

امام اسمعیلی امام جعفرؑ کے بعد محمد بن اسمعیل بن جعفرؑ کو امام مانتے ہیں اور ان کے بارے میں امام صادقؑ کی وصیت نقل کرتے ہیں۔ ان کا داعی حمدان بن قمرط ہے۔

چند اور دوسرے لوگ کہتے ہیں اسمعیلؑ نے امام جعفرؑ کے بعد وفات پائی۔ اور امامت ان میں اور ان کی اولاد میں جاری رہی۔ اس طرح کہ ہر جانے والا آنے والے کے لئے وصیت کرتا گیا۔ ان کا داعی عبداللہ بن میمون اقداحؑ، ابو ازی ہے۔

اب مہدویہ کو لبس جن کا تفصیلی حال بیان ہو چکا ہے۔ یہ لوگ سلسلہ امامت کو محمد بن عبداللہ ملقب بہمدی تک پہنچنے لگے ہیں۔ ملک مغرب میں انہوں نے اقتدار پایا۔ اور اپنے داعیوں کو مصر و شام اور دوسرے اسلامی شہروں میں پھیلا دیا، ان کے داعی اکثر صاحب شوکت تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مصر کی زمام حکومت سنبھال لی۔ علمائے وقت نے مال و دولت کی حرص میں ان کی صحبت اختیار کی اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہوئے، لہذا اسی وقت سے ان کے ہاں بھی عالم داعی ہوئے۔ مثلاً نعمان بن محمد بن منصور، علی بن نعمان، محمد بن نعمان، عبدالعزیز، محمد بن مسیب، مقلد بن مسیب عقیلی، ابو الفتوح رجوان اور محمد بن عمار کتابی ملقب بائین الدین، وغیرہ وغیرہ

پھر جب مصر و مغرب کی زمام سلطنت مستنصر کے ہاتھ میں آئی تو عامر بن عبداللہ رواجی کا شمار بڑے داعیان مذہب میں ہونے لگا۔ ادھر علی بن محمد بن علی الصلیبی جن کے والد سبھی المذہب، صالح اور مبتدین عالم اور یمن کے قاضی تھے، دولت کے لالچ میں مستنصر سے آئے۔ اور اس کے مذہب کو قبول کر لیا۔ پھر یہ عامر رواجی کے قلیفہ ہوئے۔ کہتے ہیں کہ عامر سوار ہو کر خود اس قاضی زادے کے پاس جاتا اور بڑی توقیر و عزت اور انعام و احسان کا برتاؤ کر کے اسے مسرور

دعوت دل کرتا۔

بعض اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ عامر کے پاس تصویریں کی ایک کتاب تھی جس میں وہ علی صلیبی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ بڑی رازداری اور خفیہ طریقہ سے علی کو بھی وہ تصویر دکھائی اور موجودہ آئندہ کی خوشخبری سنائی۔ موت کے وقت اس کو اپنے علم اور کتب پر خلیفہ بنایا۔ تصویریں کی یہ کتاب عامر کے پیش بہاذخیروں میں شمار ہوتی تھی۔ الغرض مہدویہ اور علی صلیبی عامر کے مذہب سے بہت متاثر تھے۔

علی صلیبی، نہایت ذکی، فہیم اور ذریک تھا۔ مختصر سی مدت میں، ادبی، کلامی، حکمی اور فقہی علوم میں کمال حاصل کر کے دولت بیداریہ میں چوٹی کا فقیہ شمار ہوا۔ اور کافی عرصہ تک اس کا یہی حال رہا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ پندرہ سال تک لوگوں کو کچکراتا رہا۔ وہ حجاج کے قافلے کا امیر لالچ بھی ہوتا تھا۔ ہر خاص و عام اس کی نوازشات اور انعامات و احسانات کا مورد ہوتا تھا۔

۳۲۸ھ میں ساٹھ آدمیوں کے ساتھ یمن کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جا چڑھا۔ وہاں اپنے ساتھ کے آدمیوں سے پختہ عہد و پیمان لے کر اس بات پر بیعت لی کہ وہ لوگوں کو مہدوی مذہب کی دعوت دیں گے اور مستنصر کی کے لئے لوگوں سے بیعت نہیں گے۔ وہاں بہت بڑی تعداد میں لوگ اس کے پاس اکٹھے ہوں گے۔ اور اس نے اسی پہاڑ پر بہت سنگین اور مضبوط قلعہ کی بنیاد رکھی۔

ظاہر میں تو تہامہ کے رئیس نجاح کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے دوستانہ اور خوش گوار تھے مگر در پردہ اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے ساز باز میں لگا ہوا تھا کیونکہ وہ اسے اپنے مقاصد کے حصول میں ایک رکاوٹ سمجھتا تھا۔ نجاح کو قتل کرنے کے سلسلے میں خفیہ طور پر بذریعہ خط و کتابت اس کا مستنصر سے بھی رابطہ تھا۔ بالآخر اظہار دوستی کے طور پر نجاح کو ایک کینز تحفہ بھیجی وہ کینز نہایت حسین ہونے کے ساتھ، آداب ملوکانہ سے بھی آراستہ و پیراستہ تھی، آداب مجلس میں ماسر اور انداز گفتگو و نشین، خوش گو، خوش مآوارہ، ہمہ صفت موصوف تھی۔

رئیس تہامہ نجاح کو یہ کینز بہت پسند آئی۔ اور دل کو بہت بھائی۔ اور پھر ۳۵۳ھ میں اسی کینز نے علی صلیبی کے ایما پر نجاح کو زہر سے کر مار ڈالا۔ جب یہ کانٹا درمیان سے نکل گیا تو ۳۵۳ھ میں مستنصر کو لکھا کہ اگر اجازت ہو تو دعوت کا کام علی الاملان شروع کر دیں کیونکہ جو رکاوٹ تھی وہ تو راستہ سے ہٹادی گئی۔ مستنصر نے اجازت دیدی۔ چنانچہ اس نے بلاد یمن پر رفتہ رفتہ اپنا تسلط جمانا شروع کیا۔ بہت سے قلعوں پر قبضہ کر لیا، اور دو سال کی مختصر

سخت مدت میں حسن تدبیر سے تمام یمن کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اور اس کے اثر سے یمن کی اکثریت نے مہدوی مذہب قبول کر لیا۔ ۳۵۳ھ میں دو ہزار سواروں کے ساتھ جن میں ایک سو ساٹھ نفر اس کے عزیز و اقارب تھے۔ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا جب ہیرام معبد نامی ایک گاؤں میں پہنچا، رئیس تہامہ نجاح کا بیٹا سعید اور اس کا بھائی جو شہر بنید میں اس کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ایک بیک اس پر ٹوٹ پڑے۔ فوجیوں کی اکثریت اپنی ضروریات کے سلسلے میں ادھر ادھر منتشر تھی، اس کے پاس بہت کم آدمی تھے۔ اس لئے ان کے قابو آ گیا، سعید نے اسے قتل کر دیا اور سر کاٹ کر لے گیا۔ اس کے علاوہ اس کے بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی تہ تیغ کیا۔ اور اس طرح اس فتنہ کی پوری پوری سرکوبی ہو گئی۔

صلاح بن زریک ازمنی مہدوی فرقہ کا ایک اور داعی ہے جو بڑے داعیوں میں شمار ہوتا ہے یہ فائز بن ظافر عبیدی کا وارث تھا۔ اس نے ہزاروں لوگوں کو دولت اور عہدوں کے لالچ دے کر شیعی مذہب قبول کرنے پر مجبور وائل کیا۔

تاریخ مین کا مصنف فقیہ حمادۃ یمنی بھی مہدوی فرقہ کے داعیان مذہب میں سے تھا۔ یہ خوش کلام مشہور شاعر تھا۔ اہل میں تو یہ شافعی المذہب تھا مگر دولت کی حرص میں پھنس کر مہدوی مذہب قبول کر کے ان کے مذہب کا داعی بنا۔ ان تمام حالات کے باوجود آخر عمر تک درپردہ شافعی المذہب ہی رہا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ فقیہ حمادۃ باوجودیکہ درپردہ خود مہدوی مذہب سے بیزار تھا مگر خلفاء، امراء اور وزرائے عبیدیہ کا سرچون کرم اور نیک خوار تھا عین اس وقت جب کہ سلطان صلاح الدین ایوبی دولت عبیدیہ کا تختہ الٹ کر مصر کو اپنے زیر اقتدار لایا، اور ان کے بچے بچے لوگوں کو ٹھکانے لگانے میں مصروف تھا، یہ سلطان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کو شمش میں لگ گیا کہ عبیدی حکومت از سر نو قائم ہو جائے چنانچہ اس نے اور اس کے ساتھ دولت عبیدیہ کے سات سربراہ آوردہ لوگوں نے باہم اتفاق کر کے ساحلی انگریزوں سے ساز باز کر لی اور ان سے کہا کہ وہ سامان حرب و منرب جہازوں میں بھر کر لائیں اور عاصد کے بیٹے کو تخت نشین کریں۔ جب سلطان کو اس ساز باز اور سازش کا پتہ چلا تو اس نے سارے سرغنوں کو سولی پر چڑھا کر زمین کو ان کے بوجھ سے ہلکا کر دیا۔ اس کے بعد مہدوی فرقہ صغیر ہستی سے بالکل نابود ہو گیا۔ مصر اور اس کے گرد و نواح میں اس مذہب کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ کیونکہ سلاطین ایوبیہ ان کی بیخ کنی میں لگ گئے، اور ان کا نام و نشان مٹا کر چھوڑا۔ وہی تھوڑے سے لوگ بچ سکے جو کشیتیوں یا جہازوں میں بیٹھ کر ہند کے آخری اطراف یا چین و جواٹر میں نکل گئے۔

چونکہ قرطبیہ اور نزاریہ کے داعیوں کا حال ہم صفات، مابین میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس لئے اس کے اماد کو بے فائدہ سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس باب میں جو کچھ لکھا گیا وہ گو بظاہر قصہ کہانی یا افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ حشیت نہیں رکھتا مگر اس کو بھی بے فائدہ جان کر نظر انداز نہ کرنا چاہیے، بلکہ اس کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھنا چاہئے کیونکہ اس کے لفظ لفظ میں ایک نقطہ اور اس کے ہر قصہ میں ایک کھلی حکمت ہے آئندہ ابواب میں جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

دوسرا باب

شیعی مکروفریب اور ورغلا کر اپنے مذہب کی طرف لانیکے طریقے

یہ ایک ایسا علم ہے جس کی بنیاد وہو کہ پراستوار ہوئی ہے اور جس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اول ہم اس فن کے اصول و کلیات بتائیں اور پھر ان کے مکروفریب کی جزئیات پر تفصیل بحث کریں۔ لہذا یہ باب دو فصول پر مشتمل و مرتب ہے۔

پہلی فصل۔ ورغلانے اور دھوکہ دینے کے قواعد کلیہ | یہ بات جان لینی چاہیے کہ اہل تشیع کے نزدیک مذہب کی بنیاد کے لئے سات قسم کے آدمی ضروری اور لازمی ہیں۔

اول۔ امام، کہ اس کو پردہ منیب سے بلا واسطہ علم ملتا ہے اور وہ علم حاصل کرنے کے لئے زنجیر کی آخری کرکچی ہے۔
دوسرا۔ جنت، یہ وہ ہے جو مخاطب یا سامع کے مذاق کے مطابق اصول خطابت و برہان کی رعایت کرتے ہوئے

امام کے علم کو بیان کرتا ہے۔

تیسرا :- دومقہ۔ یہ وہ ہے جو علم کو حجت کے ذریعہ چستا، یا کھینچتا ہے۔ کیونکہ عربی لغت میں نقص پستان سے دودھ چرنے کو کہتے ہیں۔

چوتھا۔ ابواب۔ ان کو دوسرے غفلوں میں دماۃ بھی کہتے ہیں۔ ان کے چند مراتب ہیں، سب سے بڑا داعی ہے جو مومنین کا درجہ بڑھائے اور ان کو ترقی کی راہ پر لگا کر امام دجست سے قریب کرے۔

پانچواں۔ داعی ماذون۔ یہ وہ ہے جو لوگوں سے ہمد و پیمان لے کر ان کو مذہب میں شامل کرتا ہے۔ اور ان پر علم و معرفت کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔

چھٹا۔ مکلب۔ یہ وہ ہے جو اگرچہ بذات خود بلند مرتبہ کا مالک ہے۔ لیکن وہ دعوت مذہب کا جواز نہیں۔ اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ دلیل و حجت سے لوگوں کو ہموار کرے، اور ان کو گھیر گھار کر داعی کی صحبت میں کھینچ لائے۔ اس کو شکاری کہتے سے تشبیہ دی ہے۔ جو شکار کو ہانک کر اور ہر طرف سے اس کا راستہ بند کر کے شکاری کے پاس لے آتا ہے۔ ویسا ہی یہ مکلب ہے کہ آدمی کے مذہب میں شبہات ڈالتا ہے اور اس کے ہر احتمال کا جواب دیتا ہے۔ جب وہ آدمی متحیر ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں حق طبعی کا جذبہ اور حق جوئی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ مکلب اس کو داعی ماذون کے پاس لے جاتا ہے اور داعی ماذون اس سے ہمد و پیمان لے کر دومقہ کے حوالے کرتا ہے اگر اس شخص کی استعداد قابلیت و ذمہ سے بلند تر ہو تو وہ اس کو حجت تک پہنچاتا ہے اور وہ اس کو اسی طرح امام تک، بشرطیکہ امام مفقود نہ ہو۔

ساتواں۔ وہ متبع مومن جو مکلب اور داعی کی کوشش سے امام کی تصدیق کر دے۔ اور دل میں امام کی متابعت کا عزم بالجزم رکھے۔

مراتب دعوت | پھر اسی طرح دعوت کے بھی سات مراتب ہیں۔

اول مرتبہ بد زرق۔ یعنی عقل و فراست سے مدعو کے بارے میں صحیح جانچ پرکھ کر وہ دعوت کے قابل ہے یا نہیں یا اس پر دعوت اثر کرے گی یا نہیں کیونکہ انہیں کے بقول بنجر زمین میں تخم بیری نہیں کئی جائیے یعنی جو دعوت کی قابلیت نہ رکھتا ہو اسے دعوت نہیں دینی چاہیے انکا یہ بھی قول ہے کہ جہاں روشنی ہو وہاں دم نہیں مارنا چاہیے۔ یعنی جس جگہ اہل سنت کا اصول، یا مستحکم عالم ہو وہاں لب کثائی مناسب نہیں۔

دوسرا مرتبہ۔ مدعو کو خود سے مافوس کرنا۔ اور ہر شخص کے مذاق کے مطابق اس کی دلجوئی کرنا مثلاً اگر ایک شخص نہ بد و طاعت کی طرف زیادہ مائل اور اس کا دلدادہ ہے تو اس کے سامنے اپنے آپ کو بھی زاہد و متقی ثابت کرتا۔ اگر کمزور سے زہد و طاعت کے ثواب کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا

یا کوئی دوسرا جو اہل زہد و ریاضت پر فدا ہے اور ان کا شوقین ہے تو اس کے سامنے عقیق و یا قوت اور فیروزے کی فضیلتوں کی روایات بیان کرتا۔ اور اس پر ثواب عظیم کا وعدہ دینا۔ اسی طرح دیگر تمام امور خصوصاً کھانے، اولاد و عورتوں باغات یا گھوڑوں یا ان کے علاوہ معاملات میں مخاطب کے طبعی رجحان کے موافق بات کرنا۔

تیسرا مرتبہ بد تشکیک۔ یعنی فریق مخالف کے عقائد و اعمال میں شک و شبہ پیدا کرنا۔ مثلاً قلعہ فک بیان کرنا۔ اور اور اس میں حدیث قرطاس کا بیان چھیڑ دینا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ معین نہ کرنا۔ اور ایسے ہی آپ

کے نسک کی تصیین و تشریح نہ کرتا۔ کہ آیا وہ صح افراد عطا یا قرآن پختہ۔

یا اہل سنت کے مسائل میں فروعی اختلاف کو چھوڑنا۔ مثلاً رتبہ یزیدین کرنا نہ کرنا بحسب اللہ بالجہر پڑھنا : یا نہ پڑھنا۔ یا ان مقطعات قرآنی کا ذکر درمیان میں لانا یا مٹا بہات کے بارے میں تفاسیری اختلاف کو چھوڑنا مومنوع بحث بنانا۔ یا ان جیسی کسی اور بات کی طرف کلام کا رخ بار بار پھیرنا۔ اور اس پر اظہارِ تعجب کرنا تاکہ سامع کے دل میں تردد اور شک پیدا ہو اور مطالب ان امور کی تحقیق حق کی طرف مائل ہو جائے۔ اور اپنے اہل سنت کے مذہبوں سے مایوس ہو کر دوسرے مذہب کی طرف جھک جائے۔

چوتھا مرتبہ۔ ربط۔ یعنی عہد و پیمان کرنا اور ہر شخص سے اس کے اعتقاد کے موافق پختہ قول و اقرار کرنا کہ وہ ان مجیدوں کو فائز نہ کرے اور ان کو منظرِ عام پر نہ لائے، ان میں بعض ایسے ہیں جو مرتبہ تفکیک کے بعد مرتبہ چہارم میں حوالہ کرتے ہیں ان کی اصلاح میں حوالہ کے یہ معنی ہیں کہ جو امور اپنے سے حل نہ ہو سکیں ان کی تشریح کے لئے امام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیئے کہ امام دراصل اسی کام کے لئے ہے کہ علم بلا واسطہ غیب سے حاصل کر کے امت تک پہنچائے اور ایسی پریشانی کے دنوں میں سب سے امور کا حل بیان کر کے اختلافات کی جڑ کاٹے۔ اگر اہل سنت بھی اپنے علوم کا استفادہ امام سے کرتے تو آج اس ذوقِ ذوقِ بک میں نہ پڑتے اور الٹی سیدھی باتیں نہ کرتے پانچواں مرتبہ۔ تدلیس۔ یعنی ان اکابرین، اکابر علماء اور برگزیدہ اولیاء کے بارے میں جو با جماع امت اس مذہب کے مخالف تھے یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ہمارے ہم مذہب تھے مثلاً انہوں نے یہ کہا کہ حضرت سلمان فارسی ابوذر غفاری، مقداد گندی، اور عمار یا سرد رمنی اللہ عنہم، شیعہ مذہب رکھتے تھے اور ان کے بعض کلمات کو اپنے جھوٹے دعوے پر بطور دلیل پیش کرنا۔ اور کہنا کہ حضرت حسان بن ثابت، حضرت محمد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت اویس قرنی اور تابعین میں سے حضرت حسن بصری اور امام غزالی ملقب بجمۃ الاسلام بھی شیعہ تھے۔

اور کتاب سرالعلمین کو جو محض ان بزرگ پر افتراء و بہتان ہے۔ اپنے دعویٰ کا شاہد بنانا اور کہنا کہ حکیم سنائی مولانا روم، شمس تبریزی اور خواجہ شیرازی رحمہم اللہ بھی باطن میں شیعہ تھے۔ اور ان اہیات کو جو ان سے منسوب ہیں یا ان کی مشنوبات اور دیوانوں سے ملتی ہیں اپنے کلام کا گواہ بنانا۔

یہ ساری دروغ گوئی اس غرض سے کرتے ہیں کہ سامع کا میلان مذہب شیعہ کی طرف زیادہ ہو اور وہ سوچے کہ جس چیز کو ان اکابرین دین نے اختیار کیا اور یہ پوشیدہ رکھا ہے لا محالہ اس میں بھی کوئی مجید اور راز ہے۔

چھٹا مرتبہ۔ تائیس۔ یعنی اپنے قاعدوں و ضابطوں کو سامع کے ذہن میں رفته رفته جمانا۔ اور ان کے اصول مبادیات کو جو بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ ایسے طریقہ پر ان کے ذہن نشین کرنا کہ جب نتیجہ ان کے سامنے لایا جائے تو سوچ بچار کی گنجائش نہ رہے اور اس کو قبول کرتے ہی رہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ قرآن مجید تمام مسلمانوں کا محور دین و ایمان ہے کسی کو اس سے جہال انکار نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں جو کچھ فرمایا ہے۔ واجب القبول اور لائق تسلیم ہے۔ یہ کہہ کر پھر کہتے ہیں کہ آپ تِلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ۔ آپ کہتے ہیں اس ہدایت پر قربات داروں سے محبت کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، کیا معنی رکھتی ہے۔ اور الفاظ لَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْخَائِلِينَ پھر دہرائے کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ کے متعلق کیا کہتے ہو۔ اور قراء متواترہ اُنْ جَلِیْکُمْ دُزِیْرُکُمْ کے ساتھ، کیا مطلب ظاہر کرتی ہے؟ اور قراء

شَادِه نَا اَسْتَنْفَعُوْا بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰی اَحَدٍ مُّسْتَقٰی۔ کیا معذور ادا کرتی ہے۔

ساتواں مرتبہ۔ طلع۔ یعنی چہرہ کا پردہ ایک طرف رکھ کر صحابہ کرام درمیان اللہ علیہم السلام کی طرف ظلم و غضب کی نسبت کھلم کھلا کرنا۔ اور اپنے مذہب کے اصول و فروع کو صاف صاف بیان کرنا جب دعویٰ اس حد تک پہنچ جانے کہ سب امور کو بدانت کیسے تو گویا مقصد حاصل ہو گیا۔ ان میں سے بعض مرتبہ طلع کے بعد ایک مرتبہ اور اضافہ کرتے ہیں جس کو سلع کہتے ہیں، یعنی مدعو سے اپنے سابقہ معتقدات سے اظہار بیزاری کرنا اور اس کے باوجود جو اس مذہب پر تھے ان سے اس کو قنفر کرنا۔ اور اولاد و اقارب سے قطع تعلق کرنا۔

عام طور پر تو ہوتا یہ ہے کہ ساتویں مرتبہ تک پہنچتے پہنچتے یہ باتیں از خود مدعو میں پیدا ہو کر رہتی ہیں۔ اس لئے داعی کو ان امور کی دعوت کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔

(دوسری فصل)

روافض کے دھوکوں کی تفصیلی جزییات

معلوم ہونا چاہیے کہ دھوکے تین قسموں سے زائد نہیں ہوتے۔

(۱) یا تو وہ محض اقترا اور بہتان ہے جو وہ اہل سنت پر باندھتے ہیں

(۲) یا انداز گفتگو اور طرز بیان میں کچھ گڑبڑ یا تبدیلی پیدا کرنا مثلاً ایک امر واقعی کو اس دھوکے سے بیان کرتے ہیں کہ اس کو سن کر عوام کے خیالات میں لازمی انتشار پیدا ہو۔ اور اصل میں۔

(۳) یا مذہب اصل سنت اصل میں تو بغیر تغیر و تبدل کے بے کم کاست ہے۔ اور بطور حقیقت وہ کسی لعن و لعن کے قابل ہے۔

تلف فرست کے سبب اور مادۃ سب کچھ نہ پا سکو تو سب کچھ چھوڑ دھبی نہ کے مصداق کے پیش نظر ہم ان کے دھوکوں کی جزییات میں سے کچھ حصہ بیان کرتے اور ہر قسم اقسام میں گڑبڑ کو بغیر ان میں آپس کے امتیازی فرق کو چھیڑے بیان کرتے ہیں،

اس لئے کہ جو کچھ ہم نے بیان میں چھوڑ دیا ہے اس کا اندازہ لگانے میں ہم سامع کی ذہانت و ذکاوت پر اعتماد

رکھتے ہیں۔

یہ بات بھی علم میں رہے کہ شیعی فرقوں میں باعتبار دھوکہ دہی اور لعن و لعن میں سب سے زیادہ سخت فرقہ امامیہ ہے۔ یہ لوگ مذہبی دعوت کو بہت اہمیت دیتے ہیں حالانکہ خود ان کے مذہب میں دوسرے کو اپنے مذہب کی دعوت دینا حرام اور ممنوع ہے۔ گویا اس دعوت میں وہ اپنے ہی اعتقاد کے

مطابق مجرم اور گنہگار ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ کلینی امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتا ہے کہ آپ نے فرمایا
كُتِبَ عَلٰی النَّاسِ وَاَلَّا يَدْعُوْا اِلٰی اٰمِرٍ مِّنْ دُوْنِکُمْ سِوَاکُمْ سے کنارہ کش رہو اور کسی ایک کو بھی اپنے مذہب کی دعوت نہ دو
جب امام مرجوم نے دعوت سے ممانعت فرمادی تو دعوت حرام ہوئی، اور اس کا ارتکاب بلکہ اس سے بھی زائد اسے عبادت کا درجہ دینا امام معصوم کی صریح مخالفت ہے:

پہلا دھوکہ ۱۔ یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ذمہ جو چیز واجب ہے اس کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے۔ اور جو بات اس کے مرتبہ الوہیت کے شان نمایاں اور لائق ہے اس کو چھوڑتا ہے۔ یہ کھلا جھوٹ اور محض افتراء ہے۔ کیونکہ اہل سنت نہ تو صراحتاً و صائراً اس کے قائل ہیں اور نہ ہی ان کے اصول و قواعد سے یہ بات لازم آتی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اہل سنت تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں کیونکہ کسی چیز کے وجوب کی نسبت اس کی طرف کرنا تصور و عقل سے باہر ہے جب واقعہ یہ ہو تو پھر کرتا ہی کرنے یا چھوڑ دینے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ البتہ خود شیعوں کے اصول کے مطابق یہ بات لازم آتی ہے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے۔ اور وہی اللہ تعالیٰ کی نسبت ایسی بات کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو درحقیقت ان ظالموں کی کبھی ہوتی باتوں سے بہت ہی بلند و بالا تر ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ایک وقت معلوم تک کے لئے ابلیس کو پیدا کیا اور مہلت دی۔ اور مہلکے اور گمراہ کرنے کی اس کو طاقت بخشی حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ بات لازم تھی کہ گمراہ کرنے اور بہکانے کے ارادہ کے بعد اس کو ایک لمحہ کی فرصت نہ دیتا بلکہ فوراً اس کی جان مارتا، کہ اس کے مکلف بندے اطمینان قلب کے ساتھ اس کی عبادت و طاعت میں لگ جاتے۔ اور اگر مہلت دیتا بھی تو اس کو چاہیے تھا کہ گمراہ کرنے کی طاقت اس کو نہ بخشا۔ کیونکہ شیعی قاعدہ ہے کہ جو ام بندوں کے حق میں زیادہ بہتر ہو اس کو انجام دینا اللہ تعالیٰ پر فرض و واجب ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس فرض کو چھوڑ دیا۔

اہل سنت تو اصل وجہ ہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ لَا يَسْتَلِمْ مَنَّا يَفْعَلُ ذَنْبًا يَسْتَوْفِي۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ بلکہ وہ سب سے باز پرس کرے گا اگر اس پر کوئی چیز واجب و فرض ہوتی تو وہ بھی مخلوق کی طرح محکوم اور کسی کے زیر فرمان ہوتا۔ حالانکہ وہ جملہ مخلوق پر غواہ و عاقل ہو تو ہر غلبہ رکھتا ہے۔

شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد بن حسن مہدی صاحب الزماں کے پاس سونے کی مہروں سے موزن ایک کتاب بھیجی تھی۔ جس میں ان کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کی نظروں سے ادھل اور پوشیدہ رہیں۔ اس طرح تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو امام کے فیض و ارشاد سے محروم کر دیا۔ اس کے جواب میں اگر شیعہ یہ کہیں کہ دشمنوں کے خوف سے ان کو اس قسم کا حکم دیا گیا تو اس پر ہم کہیں گے کہ ان کے دشمنوں کو پیدا ہی کیوں کیا۔ اور پیدا کیا بھی تھا تو ان کو امام کو تکلیف پہنچانے کی طاقت کیوں نہ سلب کر لی اور یہ سب کچھ نہیں کیا تھا تو امام کو مداخلت کیوں نہ دیدی۔

الغرض یہ لوگ اپنا عجیب و دوسروں پر چسپاں کرنے میں بڑے پالاک و ماہر ہیں اس موقع کی تحقیق یہ ہے کہ اہل سنت تو اہل تدم پر ہی اس کے منکر ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب ہے۔ تاکہ اس قسم کے شبہات میں ان کی عقل نہ پکرائے۔ یہ تو شیعہ اور معتزلہ ہی ہیں۔ جو وجہ اعظم کے قائل ہوئے اور جب واقعہ کے لحاظ سے اس کے خلاف دیکھا تو پھر اور ہل نکلفات سے ان شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جو مسائل کے دل کی کسی طرح تسلی و تشفی نہیں کر سکتے تھے۔ جب اس سے کام نہ چلا کھسیانی ملی نے کہا نوجا، اور اہل سنت پر طعن کرنے لگے۔ کہ

ہم اللہ تعالیٰ کے لئے جس چیز کو واجب مانتے ہیں اہل سنت اس کو کیوں نہیں مانتے، بلکہ اس کے ترک کو جائز خیال کرتے ہیں۔ بات کچھ نہیں یہ ایک دھوکہ ہے۔ جو اکثر تنزیہی مسائل میں پیش آتا ہے۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ جس چیز کو تم واجب کہتے ہو وہ درحقیقت واجب ہے ہی نہیں۔ تو اس کا ترک، واجب کا ترک کیسے کہلانے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک ہاتھ شخص مفتی کے پاس گیا، اور پوچھا کہ میری کی ماں بیوی ہو سکتی ہے۔ مفتی نے کہا نہیں؛ کہنے لگا میں نے تو ایسا کر لیا۔ اب کیا ہو؟

بہی حال ان کا ہے کہ عقلی گردن اور کرتبوں کے باوجود محدودوں کے شبہات دور کرنے میں جب ان کی سٹیم گرم جاتی ہے تو عاجز و شرمندہ ہو کر آخر میں یہ کہتے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کاموں کی مسلماتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ ان پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ انچور دانا کھڑا کھنڈا، لسیک بعد از خرابی بسیار دکھ دانا جو کچھ کرتا ہے نادان کو بھی جھک مار کر دہی کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا دھوکہ یہ ہے دھوکہ بھی اسی قسم کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل سنت اللہ تعالیٰ سے براٹیوں کے صدور کو ہائز مانتے ہیں، مثلاً زنا، چوری کا صدور اللہ تعالیٰ کے خلق و ارادہ کی بنا پر مانتے ہیں مگر انسان و شیطان کے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا سودا و ادب اور سخت گستاخی ہے۔ اور یہ نادان نہیں جانتے کہ اہل سنت کا تو یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل برا نہیں۔ جو فعل جو ان و شیطان کی نسبت سے برا ہے اور اس پر ان کی گرفت ہوگی وہی فعل اللہ تعالیٰ کی نسبت سے برائی سے پاک اور بری ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس وقیعہ اچھائی، برائی نسبتی امور میں سے ہیں جن کی طرف ان کی نسبت کی جائے ان کے اخلاق کی وجہ سے ان میں بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اصل قباحت اور برائی تو ان دونوں کا اللہ تعالیٰ سے صدور مانا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے گرداب میں پڑ جاتا ہے۔

امول شیعہ کے مطابق جب اچھائی اور برائی کو اللہ تعالیٰ کے افعال میں پایا گیا تو چاہے برائی پیدا کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مذہبی کی جائے تب بھی برے کاموں پر بندوں کو قدرت و اختیار دینا تو اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اور یہ بات چار دنا چار شیعوں کو بھی ماننی پڑ رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے براٹیوں کا صدور خود بخود لازم آ جاتا ہے لیکن برائی پر کسی کو قدرت و اختیار دینا بھی تو برائی ہے۔

مثلاً ایک شخص کے متعلق ہم یقین سے جانتے ہیں کہ اگر اسے چھری مل گئی تو وہ اپنا پیٹ پھاڑے گا اس کے باوجود اسے چھری عطا دیں۔ تو عقلمندوں کے نزدیک قابل ملامت و مذمت باہم ہوں گے مگر خود اور اس کے باوجود کہ اسنے اپنا پیٹ خود پھاڑا ہے، اس کے مار ڈالنے والے ہمیں ہوں گے۔ یہ دونوں صورتیں بالکل ایک جیسی ہیں۔ تو اس طعن کے سرور بھی شیعہ خود ہی ٹھہرے،

اہل سنت نے تو یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ کی فحاش افعال قبیحہ کے صدور سے پاک دہری ہے اور صدور فعل میں تو حیدر حقیقی کا اعتقاد رکھ کر بلا شرکت غیر اس سے افعال صادر ہوتے ہیں تمام اعتراضات و الزامات کی جڑیں ہی کاٹ دیں۔ اور امن چین سے سو رہ گئے۔ ذالک فعلی اللہ حکیم نہ۔ (یہ ان پر اللہ کا فضل ہے)۔ اور ایک بات یہ بھی کہ سب مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کے گوشت کو انسان کے لئے حلال کیا ہے اور

ان کو حیوانات پر پورا پورا تسلط دیا ہے، پس ان کو ذبح کرتے ہیں، ان کی کھال کھینچتے ہیں۔ اب انسانوں میں تو بہت سے نافرمان و سرکش بھی ہیں جب کہ حافر سب کے سب مطیع و فرمانبردار اور تسبیح خوان ہیں، تو نافرمانوں کو مطیع و فرمانبردار پر اس حد تک مسلط کرنا کہ وہ انہیں قتل بھی کریں، ان کی کھال بھی کھینچیں۔ اگرچہ یہ برائی نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ حیوانوں کو یہاں جو دکھ اور تکلیف پہنچ رہی ہے اس کے عوض آخرت میں یہ کئی گنا بدلہ پائیں گے۔ جیسا کہ شیعہ اور معتزلہ کا مذہب ہے۔ اور جس تکلیف کے عوض بہت کچھ اچھا بدلہ ملے۔ وہ ضائع اور رائیگاں نہیں ہوتا تو اس پر ہم کہیں گے کہ پہلے تکلیف پہنچانا پھر بدلہ دینے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ اسے تکلیف پہنچائی ہی نہ جائے کہ اس کا بدلہ دینا پڑے۔ اکثر عقلمندوں کے نزدیک یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شخص کے بیٹے کو اول مار ڈالا جائے اور پھر قتل کی دیت دیدی جائے اور یہ عذر کیا جائے کہ اس سے عرض تو یہ تھی کہ اس دیت کی رقم سے اس شخص کا اخلاس دور ہو تو کون عقلمند اس کو عدل و انصاف کہے گا۔

ایک اور صورت: کہ اللہ تعالیٰ اپنے اکثر گنہگاروں بندوں کو طبعی فراوانی سے دولت دیتا ہے حالانکہ ان لوگوں کے حق میں دولت کی کثرت سم قاتل سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے زمین پر فساد و تباہ کاری فسق و فجور، تکبر و بغاوت برپا کرتے اور غول ریزی، زنا کاری، نواطت، شراب نوشی وغیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں، بلکہ بعض تو سرور، فرعون اور منقن کی طرح خدا بن بیٹھتے ہیں۔ بعض پیغمبروں، پیغمبر زادوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ تو یہ سارے افعال سب ہی کے نزدیک برے اور قبیح ہیں اور ان برے کاموں پر قدرت دینا۔ یا ان کے لئے اسباب مہیا کر دینا۔ بجائے خود قبیح تر ہے۔

اس پر اگر شیعہ یہ کہیں کہ پیغمبروں یا پیغمبر زادوں پر قید و بند یا قتل و ذلت کی جو کچھ مصیبتیں آئیں وہ چونکہ آخرت میں ثواب عظیم کا سبب ہیں اس لئے ان مصیبتوں میں تو حسن و صلاح ہے نہ کہ قبیح و فساد، تو ہم ان سے پوچھیں گے کہ ان پیغمبروں یا پیغمبر زادوں کو جو ان مصائب سے دوچار نہیں ہوئے، یہ ثواب ملے گا یا نہیں۔ اگر لا تو مشائخ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں ترک اصلع ہوا اور فعل قبیح کا ارتکاب؛ اور اگر ان کو یہ ثواب نہیں ملے گا تو پھر ان کے حق میں ترک اصلع اور فعل قبیح کا ارتکاب ہوا کہ وہ ثواب عظیم سے محروم ہوئے۔ اب ہر دو مسئلوں کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ کہ وجوب کی اور حسن و قبح کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) طبعی، (۲) شرعی اور (۳) عقلی۔

تو معلوم ہوتا چاہیے کہ باجماع علماء یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وجوب طبعی و شرعی تصور نہیں کیونکہ پہلا وجوب بے اعتباری اور بیچارگی کی دلیل ہے کہ طبیعت سے مجبوری کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرا محکوم و مکلف ہونے کو متضمنی ہے اور اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب سے پاک و منزہ ہے اب یہاں وجوب عقلی کے یہ معنی کہ ہر خصوصی اور جزئی واقعہ میں عقل کے تقاضے کے خلاف کام کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہ ہو تو یہ معنی شان الوہیت کے سراسر خلاف ہے اور بحث بھی اسی میں ہے۔ کیونکہ شیعہ اور معتزلہ اسی معنی کو صرف دین، یا دین و دنیا دونوں میں ثابت کرتے ہیں ان کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی حیثیت، ارسطو، افلاطون، یا سکندر اور دیگر بزرگ کی سی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب عقلاء اور عقلوں حادث ہیں اور مخلوق و مقہور اور ہر حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے زیر فرمان تو اب اللہ تعالیٰ

کو اسی کی مخلوق اور حوادث کے زیر فرمان ماننا کتنی بے عقلی اور بد عقلی کی بات ہے۔

اور اگر وجوب عقلی کا یہ مطلب ہے کہ تمام عالم کی مصلحتوں کے پیش نظر جو کچھ حکمت کا تقاضا ہو اس کے مطابق اللہ تعالیٰ سے فعل سرزد ہو تو یہ بات اہل سنت کے ہاں بھی تسلیم شدہ ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ تَعَالٰی ہر چیز کی پیدائش اور اس کے حکم کے وقت حکمت کو مد نظر رکھنا ہے، جیسا کہ عقائد عقیدہ اور علم کلام کی دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن جب تمام عالم کی مصلحتوں کا لحاظ رکھنے کا نام حکمت الہیہ ہے اور ان مصلحتوں پر خدائے علام الغیوب کے سوا کسی کا احاطہ ممکن نہیں تو ہر خصوصی فرد یا جزئی واقعہ میں اصل پہلو کو متفق کرنا اور اس کو اللہ تعالیٰ پر واجب ٹھہرانا انتہائی بے ادبی اور حد درجہ کی بے عقلی ہے۔ اور پھر یہ ممکن بھی نہیں۔ اس لئے اہل سنت نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ سرزد ہو اس کے بارے میں یہ اجمالی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ وہ حکمت کے مطابق ہے۔ اور جو صادر نہ ہو اس کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ حکمت کے موافق نہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ ادھر سے جزئی اصول کلیہ جو عقلاء کی ایک جماعت نے گھڑ گھڑا کر مقرر کر لئے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر چسپاں کر دیا جائے۔ لہذا اہل سنت و جمہور یہاں بھی استعمال نہیں کرتے تاکہ خلاف مقصود کا وہم تک نہ ہو سکے۔

حاصل کلام یہ کہ ان شبہات کا جواب دینا شیعوں کے احاطہ امکان سے باہر ہے تا آنکہ وہ اہل سنت کے مذہب کو مان کر عقیدہ اَللّٰهُ یَعْلَمُ تسلیم نہ کر لیں۔

تیسرا دھوکہ۔ شیعہ یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ اہل سنت اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم منسوب کرتے ہیں اس لئے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ مومن مطیع کو ہمیشہ دوزخ میں رکھ کر ابدی عذاب بھی دے تو جائز ہے۔ اس دھوکہ کا جواب بھی اوپر کے بیان میں آگیا۔ کہ اہل سنت کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تو ظلم کا مدعا ممکن ہی نہیں اس لئے کہ تمام مخلوق اس کی ملک ہیں وہ مالک و مختار ہے جو چاہے کرے۔

پھر اس کے علاوہ عذاب کو جائز جاننا اور چیز ہے اور اس کے وقوع کا نااہلی ہونا دوسری چیز۔ بلکہ یہاں تو معاملہ الٹ ہے کہ اہل سنت کے بجائے شیعوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے ظلم جائز بھی ہے اور واقعہ بھی۔ چنانچہ الحکمہ سے ابن بابویہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ مَا کَانَ لِلْعَاقَرِ فِی الْاَثَرِ کَافِرُوں کی سب اولاد جہنم میں ہے، اب ظاہر ہے کہ کافروں باپ کے گناہوں میں معصوم ویسے قصور اولاد کو پکڑنا اور عذاب ابدی کی سزا دینا سراسر خلاف انصاف ہے اور یہ بھی کہ دنیا میں درندوں کو پیدا کیا۔ کمزور جانوروں کا گوشت ان کی غذا بنایا۔ حالانکہ یہ کمزور جانور بے گناہ ہیں تو قوی کو ضعیف و ناتواں پر مسلط کرنا عین ظلم ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں۔

دوسرے انسان کو پیدا کیا، اس میں قوت نہ ہو یہ رکھ کر نفس شہوانی کو غلبہ دیا پھر دنیاوی لطائف و لذائذ سے اسے باخبر کر کے ایسی شرعی ذمیہ داریاں اس پر لگائیں جو اس کے نفس پر شائق اور اسکی طبیعت کے خلاف ہیں اور دنیاوی مزلوں کے استغناء سے اس کو روک دیا، ایک چھپے ہوئے اور اس کی نظروں سے اوجھل دشمن کو اس پر مسلط کر دیا کہ اس کے دل میں دوسرے ڈالے۔ اور تو دشمن کو دل پر پورا تصرف دیا و سوسہ ڈالنے کی پوری قدرت بخشی اور دوسری طرف دل کو قوت مدافعت سے محروم کر دیا۔ تاکہ وہ محض بے اختیار ہو کر اس کا تابع ہو جائے۔ امام بزرگوار ایک حد تک اس کے شر کو دور کر سکتا تھا اس کو چھپنے کا حکم دے دیا یہ سب کھلم کھلا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک فقیر کو، ہم نے ایک مکان میں بند کر کے جو کا

پیاسا رکھا، جب وہ بھوک پیاس سے لب دم ہو گیا تو اس کے لئے طرح طرح کے خوش ذائقہ کھانے اور مشروبات لذیذہ کا انتظام کیا، اس کے ساتھ ایک مسماں بھی بٹھا دیا جو اس کو بار بار ان لذیذ کھانوں اور مشروبات کی طرف رغبت دلاتا رہے۔ اور ان کی خوں اس کے دل میں چاتا رہے اور اسے سمجھائے کہ ان کھانوں اور مشروبات کا مالک بڑا مہمانی بخشش کرنے والا، تجھ پر تیسے ماں باپ سے زیادہ شفیق و مہربان ہے، حضور درگزر اس کی غصت سے تو کیوں اپنی جان بھوک پیاس میں ضائع کرتا ہے کھا اور خوب کھا اور اس سے امید غفور رکھ۔

ایسے حالات میں اس بھوکے فقیر کو کم اگر یہ کہیں کہ دیکھ خبردار جو تو نے ان کھانوں اور مشروبات کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یا ان پر نظر بھی ڈالی، تو تجھے ایسا عذاب دیں گے، ظاہر ہے اس سکین فقیر کے حق میں یہ صاف صریح ظلم ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اہل بیت کرام کا جو مذہب نتیجی کتابوں میں منقول ہے و مروی ہے وہ قولاً و عملاً قابل قبول ہونا ہی چاہیے۔ سو ہم انشاء اللہ الہیات کی بحث میں حضرت سہاد بن العابدین کی وہ صاف صریح روایات شیعہ کتب سے نقل کریں گے جن میں کہا گیا ہے کہ یگانہ کو بدلہ دیئے بغیر تکلیف دینا جائز ہے۔

چوتھا دھوکہ در شیعہ کہتے ہیں کہ اہل سنت انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق یہ غلط و ناقص عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف شیعہ ان میں پوری نزاہت اور پاکیزگی کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ اسے درست نہیں سمجھتے کہ نبیوں سے نبوت سے پہلے یا نبوت کے بعد کوئی بڑا یا چھوٹا گناہ سرزد ہو سکتا ہے اس لحاظ سے اس اہل سنت کی نسبت شیعہ مذہب ادب سے زیادہ قریب ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انبیاء کرام سے گناہ سرزد ہونا تسلیم کر لیا جائے تو ان کے قول و فعل سے اعتماد اٹھ جائے گا اور ان کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

مگر یہ سب کچھ افتراء، بہتان، تحریف اور منہ ہے۔ کیونکہ اہل سنت گناہ کبیرہ کو بعد نبوت عہد اوسو ہرگز جائز نہیں رکھتے۔ البتہ گناہ صغیرہ کو سہوً جائز سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ اس پر اصرار نہ ہو۔ اور جھوٹ، نہ عمدہ نہ سہوً نہ قبل نبوت نہ بعد نبوت، ان سے منسوب کر نیکو جائز نہیں سمجھتے اس صورت میں ان سے اعتماد اٹھنے کا سوال ہی نہیں۔

یہاں ایک باریک بات قابل غور ہے کہ شیعہ اکثر مسائل میں زیادتی سے کام لیتے ہیں اور ہر بلند درجہ کو اپنا مذہب بنالیتے ہیں مگر واقعہ اور حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کا مذہب ایک دم اور غیر حقیقی بن کر رہ جاتا ہے۔

برخلاف اہل سنت کے کہ وہ ہر قدم، جانچ پرکھ اور خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتے ہیں اور واقعہ و حقیقت کبھی ان کی تکذیب نہیں کرتے۔ شیعہوں کے اکثر اعتقادی مسائل میں یہی نقص پیدا ہو گیا ہے، اسی وجہ سے وہ اپنے موجود عقائد کو نفس الامری سے ہم آہنگ کرنے میں عقلی طور پر فرومایہ رہ جاتے ہیں، اور عمیران و پریشان ہوتے ہیں اور پھر لچر و مہمل اقوال ان سے سرزد ہونے لگتے ہیں چنانچہ یہ عقیدہ بھی انہی مسائل میں سے ہے۔

بے شمار آیات قرآنی اور احادیث نبوی اثبات پر ناطق و شاہد ہیں کہ انبیاء کرام سے لغزشوں کا صدور ہوا اور ان پر عتاب الہی بھی ہوا اور نتیجہً اور ان حضرات کی جانب سے، بکاء، ندامت اور اظہار رجوع و زاری ہوا اگر ہم عصیت کو نکتہ عروج پر پہنچادیں تو پھر ان صریح آیات و احادیث کی توضیح و تشریح میں مہمل و بے معنی کلمات کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا تو اول ہی مرحلے پر ہم عصیت کے ایسے معنی کیوں نہ متعین کر لیں کہ بعد میں ان الجہنوں اور پریشانیوں سے سابقہ نہ پڑے۔

پھر تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بلندی اعتقاد کے باوجود یہ خود اپنے معصوم ائمہ سے ایسی روایات بیان کرتے ہیں جنہیں انبیاء کرام علیہم السلام سے نبوت کے بعد گناہ کبیرہ سرزد ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ کلینی سند صحیح کی نظر ان الفاظ سے ابرو بیفور سے روایت بیان کرتا ہے اور وہ ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہ أَنَّ يُوشَعَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَدْ أَقَى ذُنْبًا كَانَ الْمَوْتُ عَلَيْهِ حَلَاكًا۔

اسی طرح مرتضیٰ، جسکا شمار ان کے ان معتبر مجتہدین میں ہوتا ہے انبیاء کرام سے قبل البلوغ گناہ کے مدد کو جائز قرار دیتا ہے۔ اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کے سلوک کو صغیر سنی پر محمول کرتا ہے۔ اس کلام کی کمزوری ظاہر و باہر ہے۔

عزنی ان شیعوں نے جو کام بھی کئے ہیں چھوٹی عمر کے بچوں سے بھی ایسے کاموں کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ پانچواں دھوکہ۔ یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت پیغمبروں سے بھول چوک سرزد ہونے کو جائز کہتے ہیں اور دلیل میں اہل سنت کی یہ روایت لاتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چار رکعت والی نماز میں سہو ہوا اور آپ نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔

تو جبلا اس میں طعن کا کونسا پہلو ہے۔ بھول چوک خاصہ بشری ہے۔ اور چونکہ بشریت میں انبیاء کرام سب انسانوں کے ساتھ مشرک ہیں۔ لہذا ان میں امور بشریہ کا ہونا لازمی ہے۔ مثلاً مرض و درد سر۔ زخم اور قتل جیسے عوارض ان کو بھی لاحق ہوتے ہیں سانپ بچھوان کو بھی ڈستے ہیں، دکھ درد ان کو سستا تا ہے، نیند و غفلت ان کو بھی ہوتی ہے (جادو سے یہ بھی مشاثر ہوتے ہیں)۔ تو اب سہوان امور میں کونسا بلند مرتبہ رکھتا ہے جس کا لاحق ہونا انبیاء علیہم السلام کی ذات میں غلطی کا باعث ہوا۔ البتہ تبلیغی امور میں ان سے سہو کبھی سرزد نہیں ہوتا نہ اس کا اعتقاد جائز ہے کہ جائز کو ناجائز یا امر کے بجائے نہی فرمائیں۔

بعض محقق علماء نے لکھا ہے کہ انبیاء کرام سے سہو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ہر دم ذات باری کے حضور اور اس کے مشاہدہ میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور عوام کا سہو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ دنیوی امور میں پراگندہ دل ہوتے ہیں تو صورت سہو میں تو مشترک ہے۔ مگر سبب اور وجہ میں اختلاف؛ اسی لئے کہا گیا ہے۔

کار پاں کاں را قیاس از خود میگر
مرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

برگزیدہ لوگوں پر اپنے آپ کو قیاس نہ کرو اگرچہ شیر و درندہ
اور شیر ایک طرح لکھے جاتے ہیں و پھر بھی الگ الگ ہیں۔

شیخ علی نے فقہ ذوالیہدین کو اصل سنت پر طعن کا بڑا اچھا مورد خیال کیا ہے حالانکہ واقعہ کے بیان اور امر حق کی روایت میں طعن کیا ہے اس کے بعد باوجود دروغ گو حافظہ طہاشد کے مصداق شیخ مذکور کو یہ یاد نہیں رہا کہ خود کلینی اور ابو جعفر طوسی صحیح سندوں کے ساتھ ذوالیہدین کے فقہ کو روایت کرتے ہیں۔ جو ان کی کتابوں میں موجود ہے تو جس بات پر وہ اصل سنت کو ملحوظ کرتے ہیں وہ خود اس کا مورد ٹھہرتے ہیں اس لئے کہ اہل سنت تو سہو کو نقص نہیں سمجھتے اور شیعہ اس کو نقص ماننے کے باوجود اس کی روایت کرتے ہیں۔ جو زیادہ قابل طعن ہے۔

چھٹا دھوکہ۔ یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت پیغمبروں کے لئے زبان سے کلمہ کفر کی ادائیگی کو جائز کہتے ہیں اور روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لات و عزرائیل کی مدح فرمائی۔

ان کا طعن یہ بھی سخی و تحریف میں شمار ہوتا ہے، اس لئے اہل سنت کی کتب تفسیر میں منیف روایت کے خلاف سے یہ آئی ہے کہ سودہ خیم کی تلاد کے وقت شیطان نے اس مجلس میں شریک ہو کر بلند آواز سے چند ایسے کلمے ادا کئے جن سے عزائم کی ملامت نکلتی ہے حالانکہ غرائف کا لفظ بھی ملامت اور اسنام ہر دو میں شریک ہے۔ کفار اس کو اپنے تئوں کی تعریف سن کر بڑے خوش ہوئے۔ موسیٰ بن عقبہ نے روایت کی ہے کہ مسلمانوں نے یہ الفاظ بالکل نہیں سنے اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ کو بے انتہا رنج و صدمہ ہوا۔ پنا پھر آپ کی تسلی کی خاطر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ
إِلَّا إِذَا تَلَّقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسِفُ
اللَّهُ مَا يُبْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ لِيَجْعَلَ مَا يُبْقِي الشَّيْطَانُ
فَشَنَّةٌ لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَمٌ وَالْقَاسِيَةِ
قُلُوبُهُمْ۔

اور آپ سے پہلے بھی ہم نے کوئی نبی نہ بھیجا کہ کسی رت اس نے تمہارا شیطان نے اس میں کچھ نہ ڈالا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے ڈالے ہوئے کو دود کر دیتا ہے اور مضبوط کرتا ہے اپنی آیتوں کو اور اللہ تعالیٰ دانا اور بڑی حکمت والا ہے کہ کر دیتا ہے شیطان تلاد کو ان کے حق میں فساد جن کے دنوں میں دو گ سے اور جنکے دل سیاہ ہیں؟

اب بنظر انصاف بیاق آیت پر غور کیجئے کہ یہ آیت اس قسم پر کس حد تک چپاں ہوتی ہے، گو یا اس کے معنی صرف یہی ہیں اور پھر اس قسم پر غور و فکر کی نظر ڈالیں کہ اس میں برائی کونسی ہے۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر کون سے کلمات کھر آئے۔

شیطان کا انسان کو اشتباہ میں ڈالنا، آوازوں اور نغموں کے ذریعہ حکایات کرنا کونسی انوکھی اور تعجب کی بات ہے۔ ہاں اس بات پر تعجب ہے کہ کفار کے سامنے شیطان کی کلمات، فرقانی کلمات سے گڑبڑ کیسے ہو گئے کہ فرقانی کلمات تو اجماعی حضرت سے متصف ہوتے ہیں اور شیطان کلمات اس سے عاری۔ لیکن جب دافعہ کی گہرائی تک پہنچ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کفار کی محبت پسندی نے ان کو شیطان کلمات کے اجماعی پہلو اور بلاغت پر غور اور سوچ کا موقع ہی نہیں دیا۔ انہوں نے ان کلمات کے ظاہری مطلب کو اپنے عقیدہ کے مطابق پایا تو یہ سمجھ بیٹھے کہ سب کلمات فرقانی ہی ہیں جیسا کہ عام شیعہ کی حالت ہے اگر ان کو اپنے امام سے کوئی ضعیف روایت بھی مل جاتی ہے جو ان کے مذہب کے موافق ہو اور مذہب اہل سنت کے مخالف ہو تو اسے سر آنکھوں پر رکھتے اور اس کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں صحیح احادیث کو پس پشت ڈال دیتے ہیں حالانکہ کلام غیر ائمہ کے کلام کے ساتھ مشتبہ نہیں ہو سکتا لیکن حمیت و عصیت کا پردہ آنکھوں میں ایسا پڑا ہوتا ہے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ اگر اہل سنت اتنی سی بات پر مطعون قرار پاتے ہیں تو امامیہ تو جو اپنی کتب معیم میں انبیاء اور رسولوں کی ”کفریات“ کی روایت بیان کرتے ہیں جس کی مثالیں انشاء اللہ ان کے عقائد کے بیان میں پیش کی جائیں گی۔ ملعون ٹھہرتے ہیں۔ اور مطعون و ملعون کے فرق کو یقیناً ہر کوئی جانتا ہے۔

ساتواں دھوکہ۔ شیعہ کہتے ہیں کہ سوانے پانچ چھ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اہل بیت کے دشمن اور ان کی طرف سے بغض رکھنے والے تھے۔

یہ الزام بھی اہل بیت علیہم السلام پر ہے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اہل شام کا اور متعصب جماعت کا رئیس بناتے ہیں۔ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی تھے کہ جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزیدہ حتیٰ کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مرضی پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مرضی کو ترجیح دی واقعہ یہ ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کا رشتہ ام خالدہ سے جو حسن و جمال میں یکساں تھی کرنا چاہا۔ اور مقصد کے لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو شام سے مدینہ بھیجا۔ اس کے علاوہ عبد اللہ بن زبیرؓ عبد اللہ بن جعفرؓ اور عبد اللہ بن مطیع بن اسودؓ نے بھی اپنی منگنی کے مقامات انہی کے توسط سے بھیجے، رادھر غالباً حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس کے خواستگار ہوں گے جب ام خالدہ نے اس معاملہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کو اپنا مشیر بنا کر ان سے مشورہ کیا کہ ان لوگوں میں سے کس کو ترجیح دوں تو آپؓ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں رسول اللہ کے نواسے اور فاطمہ الزہراءؓ رضی اللہ عنہا کے لال سے بڑھ کر کسی کو نہیں سمجھتا تو دنیا کے مال و متاع پر خاک ڈال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہو بننے کو غنیمت جان! چنانچہ ام خالدہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کے مشورہ سے دولت کو ٹھکر کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا اور اس شرف سے مشرف ہوئی ملاوہ ازیں ابن السمان کی کتاب الموافقة میں اہل بیت کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و ادران کی خاص نسبتوں کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ وہاں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

آٹھواں دھوکہ۔ کہتے ہیں کہ اہل سنت قرآن کی مخالفت کرتے ہیں مثلاً و منہ میں پاؤں پر مس کرنے کے بھائے ان کو دھوتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی آیت صاف طور پر مس پر دلالت کرتی ہے۔ اس دھوکہ نے بہت سے ایسے جاہلوں کو راہ راست سے ٹھکرا دیا ہے جو خود دھڑکی کی معمول شدہ بد کے ساتھ احکام الہی کی تحقیق میں قدم رکھتے اور خود کو عالم سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اتنی قابلیت بھی نہیں رکھتے اصول اور قواعد اجتہاد کو سمجھ سکیں۔ یا مختلف مسائل میں باہم تطبیق دے سکیں۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو فریقین کے نزدیک قرآن مجید میں آیت و منہ میں آنجیکٹھل کے زیر اور دیگر قرآنی متواتر جہج اور درست ہیں۔

پھر دونوں اس اصول کا عدد پر بھی متفق ہیں کہ جب دو متواتر قرائتیں باہم متعارض ہوں تو وہ دو مختلف آیتوں کا حکم رکھتی ہیں۔ اس نے پہلے تو ان دونوں میں تطبیق کی کوشش کرنی چاہیئے۔ پھر ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کے بارے میں غور کرنا چاہیئے اگر دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو ان کو کالعدم تصور کر کے ان سے کم مرتبہ دلائل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے مثلاً دو آیتوں میں تطبیق ممکن نہ ہو تو حدیث کی طرف رجوع کریں، کیونکہ تعارض کے سبب آیتوں پر عمل ممکن نہ ہونے کے سبب وہ کالعدم ہوئیں اور اگر احادیث باہم متعارض ہوں تو اتنا زوال صحابہ اور اہل بیت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یا جو لوگ قیاس کے قائل ہیں ان کو مجتہدین کے قیاس پر عمل کرنا چاہیئے۔

پھر اس آیت و منہ میں ہم نے دونوں قرائتوں میں غور کیا تو اہل سنت کے نزدیک ہر دو قرائت میں دو وجوہ سے

تطبیق پائی۔

ایک یہ کہ مس کو غسل پر محمول کر دینا جیسا کہ ابو زید انصاری اور دوسرے اہل لغت نے ان الفاظ میں تصریح کی ہے۔
 اَلْمَسَّ فِي كَلَامِ النَّاسِ يَكُونُ غَسْلًا يَقَالُ لِلرَّجُلِ
 اِذَا لَوَّضَهُ تَسَمَّ وَيَقَالُ مَسَّهُ اللهُ مَا يَكُ اَيُّ اَدَالِ
 کلام عرب میں مس کے معنی غسل کے بھی ہوتے ہیں۔ و منہ کو ٹیٹلے کے لئے کہا جاتا ہے تسبیح یعنی اس نے وضو کیا یہ بھی کہتے ہیں مس اللہ

خُلِقَ الْمَرْءُ وَيُقَالُ مَسَحَ الْأَرْضَ مَنِ الْمَعْلَى۔ کہ انسان تیرے مرن کو دھو کرے اور اسی طرح مس الارض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بارش نے زمین کو دھو دیا۔

اس وجہ میں اگر شیعہ یہ جرح کریں کہ پند و سیکند میں مس کے حقیقی معنی مراد ہیں اور اس جگہ میں مجازی معنی۔ تو ایک ہی چیز میں حقیقت و مجاز کا اجتماع ناجائز اور متنع ہے۔

اس کا جواب یہ ہو گا کہ بار جگہ سے پہلے اس کا لفظ آگیا ہے تو اب جب لفظ دو ہو گئے تو دوسرے مراد میں کوئی منافقہ نہ رہا۔ شارح زبدۃ الأصول امامیہ کے ماہرین عربیت سے نقل کرتا ہے کہ حقیقت و مجاز کا اس طرح جمع ہونا جائز ہے مثلاً معطوف علیہ میں حقیقی معنی مراد ہوں اور معطوف میں مجازی۔ چنانچہ آیت: لَا تَقْرَبُوا الْمَوْتَةَ وَانْتَهَوْا عَنِ الْحَقِّ تَقْلُمُوا مَا تَقْوُونَ وَلَا جُنْبًا لِّلْأَعْيَارِ سَبِيلًا۔ میں کہا ہے کہ مولا بحالت معطوف علیہ محضین ارکان شریعت میں حقیقی معنی ہیں یعنی سب جو عمل نماز ہے میں مستعمل ہے۔ شارح زبدہ کا کہنا ہے کہ یہ استخدام کی ایک قسم ہے۔

امامیہ کے مفسرین کی ایک جماعت اور ان کے نقبانے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے پس آیت زیر بحث میں بھی یہی صورت ہو گی کہ وہ مس جو رؤس دوسرے تعلق رکھتا ہے اپنے حقیقی معنوں میں لیا جائے گا اور وہ مس جو پاؤں سے تعلق رکھتا ہے مجازی معنی غسلی میں لیا جائے گا۔

پھر اس بحث سے قطع نظر اس آیت کے نزول سے کئی سال پہلے ابتدائے بعثت ہی میں حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے سے وضو کی ضرورت اور اس کی تعلیم و قوع میں آپ کی تھی۔ پس اس قسم کا ایہام یہاں مراد لینے میں کوئی منافقہ نہیں کیونکہ فنا طہین، وضو کی کیفیت ترتیب ترتیب سے پہلے ہی سے سمجھتے تھے بلکہ روزانہ پانچ مرتبہ عملی مظاہرہ کرتے رہتے تھے اس لئے وضو کی کیفیت ترتیب کا سمجھنا ان کے لئے اس آیت پر ہی منحصر نہ تھا۔ بلکہ ظاہری طرز کلام سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کلام فاس و فساد اور غفل کے متبادل طریقہ تعلیم کے لئے ہے اور وضو کا ذکر بطور تہیہ و تقرب ہے اور جو بات بطور تہیہ و تقرب ہو اس کے بیان میں چنداں وضاحت ضروری نہیں ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اگر جل کا زیر اپنے متصل لفظ رؤس کے زیر کی وجہ سے ہے مگر معنی باعتبار زبرد کے ہوں گے اور جرجوار کو سیبویہ، اخفش، البراء، البقاء اور دیگر تمام معتبر نحوویں نے لغت اور عطف دونوں صورتوں میں جائز رکھا ہے۔ اور یہی قرآن میں بھی ہے۔ لغت کی حالت میں جرجوار کی مثال قرآن مجید کی اس آیت میں ہے۔ هَذَا بَلَدٌ يُّدَوَّرُ آيِنْدَہ کہ اس میں ایہم اگرچہ مذب کی صفت ہے مگر جرجوار یعنی یرم کی وجہ سے مجرور ہوا عطف کی حالت جرجوار کی مثال مَوْثَرًا حَلِيقًا كَالْمَالِ الْكَلْبُورِ الْكَلْبُورِ۔ ہے کہ اس میں بقراءہ حمزہ کسان اور بدایت مفعول مام کی قرات پر جرجوار الکوہاب و آبائین کی وجہ سے مجرور ہے۔ اور وَلَدَانِ مُتَلَدِّ وَتِ پر معطوف ہے کیونکہ الکوہاب و آبائین پر عطف کرنے سے اس کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

اس کے علاوہ فاس اور اصل شعر نے عرب کے نظم و نثر میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ نابغہ کا ایک شعر

ہے۔

ان میں سے کوئی قیدی زندہ نہیں رہا۔ مگر وہ جو دور سیوں سے پابستہ ہے۔

لَوَيْتَنِي إِلَّا أَسِيرٌ غَيْرُ مُنْقَلَبٍ
رَمَزْتُ فِي مَقَالِ الْوَسْطِ رَمَكُورِل

اس میں موثق اگر بہر عطف اسیر کی جرح آگاہیں اس پر معلوم ہے مگر سبب جرح جرح یعنی منفعت کے مجرور ہوا۔
اب اگر زبان حرمت عطف کی موجودگی کے سبب جرح جرح۔ یہ الکار کرے تو اس کا قول قابل توجہ نہیں۔ کیونکہ ماہرین لسان
اور ائمہ عربیت نے اس کو جائز رکھا ہے، اور قرآن مجید اور بلغاد عرب کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں درحاج کا قول دراصل اس کے
تبیح اور تحقیق کی غامض کے سبب ہے اسی کے ساتھ یہ ایک طرف کی شہادت بر نفی ہے اور ایسی شہادت معتبر نہیں۔

اس مسئلہ میں اہل سنت نے تطبیق کی ایک دوسری صورت بھی ذکر کی ہے وہ یہ کہ قرآن جرح جرح کو موزر پہننے کی حالت
پر محمول کرتے ہیں اور قرآنہ نصب (زبر) کو پاؤں میں موزر نہ ہونے کی صورت پر۔ لیکن اس صورت میں ہمیں ایک ضمیر ماننے کی
مجبوری درپیش ہے جو طبیعت سے کچھ دور ہے۔

شیعہ حضرات کے نزدیک بھی ان دونوں قراءتوں میں دو وجہ سے تطبیق دی جاتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اہل سنت
قراءة نصب کو جس کے ظاہری معنی غسل کے ہیں اصل قرار دیتے ہیں اور قراۃ جرح کو اسی طرف لواتے ہیں اور شیعہ اس کے
برعکاس کرتے ہیں۔

پہلی وجہ تطبیق یہ ہے کہ قراۃ نصب کی صورت میں ارجل کا عطف محل رؤس پر ہو اس صورت میں رؤس اور ارجل دوسرے
پاؤں، ہر دو پر مسح کا حکم ہوگا۔ اس لئے کہ اس قراۃ پر اگر منصوب پر عطف کرتے ہیں تو معطوف اور معطوف علیہ میں اجنبی جملے کا
فاعل آتا ہے اور یہ جائز نہیں۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وازع کے معنی میں ہو جیسا کہ کہتے ہیں۔ ۱۔ شَتَوَى الْمَاءُ وَالْخَشْيَةُ مَكْرَانِ دُونِ وَجْهِهِ
اہل سنت کی طرف سے چند اعتراضات ہیں اول تو یہ کہ محل پر عطف قرار دینا باجماع فریقین خلاف ظاہر ہے اس صورت میں عطف
نظاہر معسولات پر ہے۔ اور ظاہر سے انحراف بغیر دلیل ظاہر کے جائز نہیں۔ اگر اس پر قراءت جرح کو دلیل ٹھہرائیں جیسا کہ پچھلے
کلام سے معلوم ہوا تو وہ قراۃ نصب میں ہو سکتا ہے اور اجنبی جملے کا یہج میں آنے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وَاَمْسُوْهُ
یَبْرُؤُ سَبْکُوْهُ وَارْجُلُکُمْ کا تعلق معسولات سے کچھ نہ ہو اور اگر یہ معنی کئے جائیں کہ دھونے کے بعد اپنے ہاتھوں کو سر پر
ملو تو اجنبی کا فعل کیسے ہوا اکثر اہل سنت کا مذہب بھی یہی ہے کہ بقیہ غسل سے مسح کر سکتے ہیں۔

ایک وجہ اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ متخالف مجملوں یا معطوف علیہ میں کسی بھی اہل عربیت کے نزدیک فصل متیقہ نہیں۔
بلکہ ان کے ائمہ نے بھی اس کے جائز ہونے کی تصریح کی ہے اور ابوالبقائے ترقم نحویوں کا اس کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے
ہاں اہل بلاغت کے کلام میں اجنبی کا درمیان میں لانا کسی خاص مکتبہ پر مبنی ہوتا ہے۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اگر ارجل کو عطف محل بر دسم پر کرتے تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس سے غسل کے معنی سمجھیں کیونکہ
عربی کے مقررہ قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب قرب معنی دے دے فعل ایک جگہ جمع ہوں جن میں سے ہر ایک
کا ایک متعلق ہو تو ایک فعل کو حذف کر کے اس کے متعلق ہو تو ایک فعل کو حذف کر کے اس کے متعلق کا فعل مذکور پر عطف
کرنا گویا اس کا متعلق ہے۔ جائز ہے۔ البید بن ربیعہ العادری کا یہ شعر اس قبیل سے ہے

فَعَلَا مُرْدَعُ الْأَطْفَالِ وَالْمُفْلَتِ
بِالْجَنَّتَيْنِ طَبَا لَهَا وَلِغَا مَهَا
چڑھا ایقان کی شاخوں پر اور بچے دیئے پھاڑوں
میں ہرنیوں اور شترمرغوں نے
یہاں ہانست فعل حذف ہوا۔ ہانست لغا مہا۔ اس لئے کہ شترمرغ بچے نہیں اندھے دیتی ہے اسی قاعدہ کی ایک

اور مثال ایک اور شاعر کے کلام سے بھی ملتی ہے۔

تو اس کو دیکھو گا کہ گویا اس کا آقا اس کی ناک کا ٹلپہ ہے اور
اس کی آنکھیں چھوڑتا ہے۔ اس کا آقا بہت دو لقمہ تھا۔
اس شعر میں قاعدہ مذکورہ کے مطابق بقا فعل محذوف ہے اس کے متعلق کا عطف فعل مذکورہ کے متعلق پر کر

دیا ہے۔

اس قاعدہ کی تیسری مثال میں ایک اور شاعر کا قول ہے۔

اِذَا مَا الْغَانِيَاتُ بَرَزَتْ يَوْمًا
وَرَجَعْنَ الْجَوَابِ وَالْعَيْنُ نَا.
یہاں مکمل فعل محذوف ہے یعنی کھنکھیرنا۔
اسی قاعدہ کے مطابق کسی اعرابی کا قول۔
عَلَفْتُمَا بَيْنَنَا وَمَاءَ بَارِدًا۔ یہاں سقیمتھا فعل محذوف ہے۔ جس کا متعلق ما مذکور ہے۔

تیسرا فرض یہ ہے کہ داد کو جمع کے معنی میں لینا بغیر قرینے کے جائز نہیں اور یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں۔ بلکہ دیکھا جائے
تو اس کے خلاف قرینہ موجود ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب دونوں طرف تطبیق کی وجہ ہیں تو اب سوال تمییز کا رہ جاتا ہے۔ اس کے لئے اہل سنت
کے محققین اجماعیث نبویہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور انہیں کو بسبب ترجیح قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ قرآنی معانی کو یہی حل کرتی
ہیں۔ پھر نیز بحث وضو ایسا فعل ہے جس کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن رات میں پانچ مرتبہ عمل میں لاتے
تھے۔ اور نوسلوں کی خاطر ایسے احکام شرعی کو کھلم کھلا طریقے سے شہرت دیتے تھے۔ جو مسلمان ہوتا تو سب سے پہلے نماز اور
اس سے بھی پہلے اس کے شرائط مثلاً وضو سیکھنا ان میں سے کسی نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو میں پاؤں پر مسح کی روایت
نہیں کی بلکہ غسل کی ہی روایت کی ہے۔ یہاں تک کہ خود شیعہ اس کے معترف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غسل بر جلیں
ہی کی روایت ہے۔ البتہ شیعہ حضرات یہ کہہ کر بحث ختم کر دیتے ہیں۔ کہ آئمہ سے ہم کو صحیح روایات پہنچی ہیں کہ وہ مسح کیا کرتے
تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل سنت جن آئمہ سے غسل کی روایت بیان کرتے ہیں۔ وہ صرف تفسیر تھا۔ اب اس پر اہل سنت کہتے ہیں
کہ آئمہ کی کتب صحیحہ میں صاف صاف روایتیں موجود ہیں۔ جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ آئمہ اظہار ایسے موقعوں پر
جہاں تفسیر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ پاؤں وضو کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غسل کی روایت آئمہ سے اتفاق شدہ ہے
اور مسح کی روایت مختلف ذیل کہ بعض شیعہ روایت کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے۔

بہر حال یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بالاجماع غسل ہی کا ہے۔ آنحضرت سے مسح کی روایت ہر دو فرقہ
میں سے کسی نے نہیں کی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرآن کے معانی کوئی نہ سمجھتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس
کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ غسل کے جو معنی ہم نے سمجھے ہیں وہ عین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ کے مطابق ہیں۔
اور یہی ہے وہ الزام لوٹ گیا کہ ہم آنحضرت کے بموجب قرآن کی مخالفت شیعہ کرتے ہیں۔ اہل سنت نہیں۔
سچ ہے جو کوئی اپنے بھائی کے لئے غڑھا کھودتا ہے۔ اس میں خود ہی جاگرتا ہے۔

اور زیادہ تعجب اور اچنبہ کی بات یہ ہے کہ ان کے جلیل القدر علماء نے پاؤں دھونے کی روایتیں اپنی کتابوں میں کی ہیں اور ان کا کوئی جواب نہیں دیا نہ ہی راویوں کا کوئی غدر بیان کیا۔ ان کی اس انوکھی بات کا غدر کوئی ہو سکتا ہے۔ تو صرف یہ کہ دروغ گورا حاکم نے نباشد۔ اور غدر نہ بیان واقعی بالاجماع غدر شرعی ہے۔
اب ذرا ان حضرات کی اس سلسلہ کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے۔

(۱۱)۔ روی العیاشی عن علی بن حمزہ قال سالت ابا ابراہیم عن القدرمین فقال تغسلات غسل رعی بن حمزہ سے عیاشی روایت کرتا ہے کہ علی نے ابو ابراہیم سے قدرمیں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا یقیناً دھوئے جاؤں گے۔
(۱۲)۔ روی محمد بن النعمان عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال اذا نسیت مسح رأسک اغسل رجلیک فامسح رأسک ثم اغسل رجلیک۔

”محمد بن نعمان نے ابی بصیر سے اور انہوں نے ابو عبد اللہ علیہ السلام سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ اگر سر کا مسح بھول جائے اور پاؤں بھی دھوئے تو اب سر کا مسح کر اور پاؤں پھر دھو۔“
اس روایت کو کلینی اور ابو جعفر طوسی دونوں نے صحیح سندوں سے روایت کیا ہے۔ اس میں نہ ضعف کی گنجائش ہے نہ تقبیہ کی کیونکہ مخاطب مخلص شیعہ تھا۔

(۱۳)۔ روی محمد بن الحسن الصفار عن زید بن علی عن ابیہ عن جده عن امیر المومنین قال جئلت التوضاء فاقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما غسلت قدمی قال یا علی نحل بین الاصابا۔

محمد بن حسن صفار نے زید سے زید نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں وضو کرنے بیٹھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسر لیف لے آئے، جب میں نے پاؤں دھوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا علی، انگلیوں میں خلال بھی کر لو۔
اس طرح کی اور روایات بھی ان کی کتب صحیحہ میں موجود ہیں۔

اس بیان سے یہ دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول تو یہ کہ شیعہ حضرات کو چاہیے کہ بموجب قواعد اصول مسح وغسل ہر دو کو جائز رکھیں نہ صرف مسح کو، دوسرے یہ کہ اگر اہل سنت غسل کی روایت کو جس کی سند پر دونوں کا اتفاق ہے۔ اختیار اختیار کریں اور مسح کی روایت کو جس کی سند مختلف نہ ہے نہ نظر انداز کر دیں تو وہ ہرگز قابل الزام اور لائق ملامت نہ ہوں گے۔ خصوصاً صاحب کہ شریف رضی نے نہج البلاغہ میں امیر المومنین سے روایت کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی روایات بیان کی ہیں جن میں پاؤں کا وضو ثابت کیا ہے۔

اسی طرح دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح کی روایت کی ہے۔
اور وہ ضعیف روایات جو بطریق مجاہد بن تمیم اور اس کے چچا سے مروی ہیں کہ آپ نے وضو کی اور قدموں پر مسح کیا وہ سب غلطوں سے غافل نہیں۔ اس لئے کہ اول تو وہ اس روایت میں منفرد ہے۔ اور عام راویوں سے اپنی روایت میں مختلف دوسرے اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ ممکن ہے۔ اس وقت اپنے پاؤں میں موزے پہن رکھے ہوں اور راوی نے موزے نہ دیکھے ہوں صرف مسح کا عمل دیکھا ہو اور تفسیر سے یہ بھی ممکن ہے کہ راوی نے مسح کا لفظ مجازاً استعمال کیا ہو اور امیر المومنین سے جو روایت بایں الفاظ مروی ہے کہ

یعنی اپنے چہرے، ہاتھوں، سر اور پاؤں کا مسح کیا اور دس
کا بچا بواپانی کھڑے ہو کر پیا اور وضو کا لوگ کمان
کرتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینا جائز نہیں تو میں نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں
نے کیا۔ یہ دس اس شخص کا ہے جس کا وضو نہ ٹوٹا ہو۔

مَسَّحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَمَسَّحَ عَلَى رَأْسِهِ وَرِجْلَيْهِ
وَشَرِبَ فَمَنْ شَرِبَ قَانِمًا وَقَالَ اِنَّ النَّاسَ
يُذَقُّوْنَ اَنَّ الشَّرْبَ قَانِمًا لَا يَجُوزُ وَقَدْ رَأَيْتُ
رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنَعَ مِثْلَ مَا
صَنَعْتُ هَذَا اَوْ ضَرَبَ مِنْ كَمَدٍ يَجِدُثَ۔

شیعوں کی طرف سے یہ روایت اس لئے جھٹ نہیں بن سکتی کہ امر زیر بحث ہے وضو کا وضو ہے نہ وضو اسے کا وضو۔
کیونکہ معنی نظافت و پاکیزگی اطراف توسیع سے بھی ہو سکتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس روایت میں چہرے اور ہاتھوں
کا مسح بھی بیان کیا ہے۔ جب کہ خود شیعوں کے ہاں بھی ہاتھوں اور چہرے کے مسح کا کوئی نازل نہیں گواہوں میں سے ایک فرقہ
ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت کا مذہب یہی مسح ہے، جیسے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عبداللہ
بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابوذر اور انس رضی اللہ عنہما۔ حالانکہ یہ بعض افراد ہے، ان اصحاب میں سے کسی سے بھی صحیح
طریق پر کوئی ایسی روایت مروی نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ حضرات اس کے قائل تھے۔ بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ
تو بطور شبہ و تعجب یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم قرآن میں تو صرف مسح ہی کو پاتے ہیں مگر اہل اسلام نے غسل ہی کو مانا،
مطلب یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق قرآن کے ظاہری الفاظ سے تو مسح کا پتہ چلتا
ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا اس پر عمل نہ تھا وہ غسل فرماتے تھے۔ اس سے واضح طور پر یہی بات معلوم
ہوتی ہے کہ زیر کی قرأت قابل تاویل اور متروک الظاہر ہے۔

اس سے ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوتی کہ ابوالعالیہ، مکرمر اور شیبی سے جو لوگ یہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس
رضی اللہ عنہ مسح کو جاری رکھتے تھے بعض افراد اور ان پر بہتان ہے۔
اسی طرح جناب حسن بصری رحمہ اللہ علیہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مسح اور غسل ہر دو کو جمع کرنے کے قائل تھے۔
جیسے کہ زیدیہ میں سے ناصر کا یہ مذہب ہے۔ تو یہ بھی بہتان اور جھوٹ ہے۔

یہ محمد ابن جریر طبری کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ اختیار کے قائل تھے کہ چاہو مسح کرو اور چاہو غسل کر لو۔ یہ بھی
جھوٹ ہے۔

درحقیقت شیعہ راویوں نے اس قسم کے جھوٹ گھڑ کر ان کو مشہور کیا ہے، اور بعض اہل سنت نے بھی صیح و نعیف
میں تمیز کئے بغیر بے سند اس کی روایت کر دی ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ علیہ جو اہل سنت میں آثار صحابہ و تابعین کے علم میں بلند مرتبہ کے مالک ہیں عبدالملک بن سلیمان
سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عطاء سے دریافت کیا کہ کیا تم کو کسی صحابی سے ایسی روایت ملی ہے کہ انہوں نے پاؤں پر
مسح کیا ہو تو عطاء نے جواب دیا کہ نہیں۔

یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ محمد بن جریر طبری نام کے دو اشخاص ہیں ایک محمد بن جریر بن رستم آملی، اور یہ شیعہ ہے
جو کتاب "الایضاح والمستتر شد در بیان امارت" کا مصنف ہے۔ دوسرے محمد بن جریر بن غالب طبری، ابو جعفر ہے، جو
تفسیر ابن جریر اور تاریخ کبیر کا مصنف ہے۔ یہ اہل سنت میں سے ہے۔ اور انہوں نے صرف غسل کی روایت کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید کی اعرابی حالت کی توجیہ کرنے کو قرآن کی مخالفت کہنا اس شخص کے لئے ہرگز زیبا نہیں جس میں ذرا عقل بھی ہو۔ ہاں اگر قرآن کے الفاظ و کلمات کا جواز کا کرے وہ ضرور قرآن کی مخالفت کرتا ہے، جیسا کہ یہ شیعہ کہتے ہیں کہ قرآن میں الی المرافق کا لفظ نہیں ہے بلکہ من المرافق ہے۔ اسی طرح قرآن کے کسی حکم کا انکار کرنا یا اس کے کسی عام حکم کو خاص کرنا قرآن کی مخالفت ہے۔

چنانچہ شیعہ کہتے ہیں کہ باپ کی میراث میں سے تلوار قرآن، انگوٹھی اور بدنی پوشاک بڑے بڑے کا مخصوص حق ہے اس کے علاوہ اور بھی مال اگر چھوڑا ہو تو اس سے بھی حصہ لے گا۔ اسی طرح شوہر کی میراث میں زمین، جاگیر، مکان، جانور، ہتھیار اور باغات میں بیوی کا حصہ نہیں ماننے۔ حالانکہ قرآن مجید، ان ہر دو کے میراث میں حصہ اور حقوق بلا کسی تمحیص اور صاف صاف بتاتا ہے چنانچہ مطہر علی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح مہاجرین و انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مدح کی آیات کو ایک خاص زمانہ تک مخصوص کرنا۔ یا ان میں سے بعض کو مدح و تعریف کے لئے مخصوص کرنا قرآن کی سراسر مخالفت ہے۔ (نور بالہ)

فواں دھوکہ :- یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت حدیث کی مریخ مخالفت کرتے ہیں، کہ متعہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی وجہ سے اور صلوة الصغیٰ کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مَا صَلَّيْتُهَا سِوَالِ مُحَمَّدٍ صَلَّيْتُهَا عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی وجہ سے حرام بانتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں متعہ جائز تھا۔ اور صلوة الصغیٰ آپ پڑھا کرتے تھے۔ جیسا کہ ائمہ سے مروی ہے :-

اس طعن اور دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت ابتدائے اسلام میں اس کے جواز کو مانتے ہیں۔ اور اس کو بھی مانتے ہیں کہ اول مرتبہ حرام ہو جانے کے بعد بعض غزوات میں بوجہ ضرورت اس کی اجازت دی گئی تھی۔ البتہ اب تک اور ہمیشہ کے لئے اس کے جواز کے منکر ہیں۔ اس کے متعلق ممانعت اور حرمت اہل سنت کے نزدیک صحیح طریق سند سے ثابت ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس تحریم کو رائج کرنے اور تاکید کرنے والا مانتے ہیں، (نہ کہ حرام کرنے والا) اسی طرح صلوة الصغیٰ اہل سنت کے نزدیک مسنون ہے، مسند امام احمد میں بسند صحیح اور طبرانی کی کتاب الدعای میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اُمِرْتُ لِصَلْوَةِ الصَّغِيّی - مجھ کو صلوة نئی پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم، مسند احمد اور سنن ابن ماجہ میں معاذہ عدویہ سے ان الفاظ میں روایت کی گئی ہے سَأَلْتُ عَائِشَةَ كَوَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصَلِي صَلْوَةَ الصَّغِيّ فَقَالَتْ أَرْبَعٌ دُرَيْدٌ مَبِثَّةٌ۔ (میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھا کرتے تھے، آپ نے جواب دیا چار رکعت۔ اور حسب منشا اس میں اضافہ بھی فرمالتے)

پس معلوم ہوا کہ صلوة الصغیٰ سے انکار کی نسبت اہل سنت کی طرف سراسر کذب، بہتان اور افتراء ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انکار کو دو وجہ پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے یا تو اس کی ہمیشگی کا انکار فرمایا، اصل نماز سے انکار نہیں فرمایا۔ یا اس نماز کا دیگر نمازوں کی طرح باجماعت پڑھنے سے انکار فرمایا جس کا طریقہ اس زمانہ میں رائج ہو چکا تھا۔

یعنی آپ نے اس کا انکار فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیئت اجتماعی اور جماعت بندی کے ساتھ یہ نماز

کبھی نہیں پڑھی۔

متد کے متعلق تحقیق انشاء اللہ اپنے مقام پر آگے آئے گی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بعض روایات کو بعض دوسری روایات پر ترجیح دینے کا نام مخالفت حدیث رکھنا عقل سے بعید البتہ تعصب سے قریب ہے۔

ہاں مخالفت حدیث یہ ہے کہ جس کا ارتکاب شیعہ حضرات کرتے ہیں اور خلاف حدیث عقائد رکھتے ہیں۔ مثلاً ترک جمعہ و جماعت کا جائز سمجھنا۔ دوی۔ مذی کو طہر و پاک سمجھنا۔ اور ان کے خروج سے وضو نہ ٹوٹنا۔ عضو تناسل کے تین مرتبہ جھکنے کے بعد (نکلنے والے) پیشاب کا پاک ہونا۔ اس کے خروج بلکہ سیلان کے بعد نماز کا جائز ہونا۔ چنانچہ یہ تھوڑے سے چند مسائل باب فرع میں انشاء اللہ بیان کئے جائیں گے۔

وسوال دھوکہ دہا کہتے ہیں کہ اہل سنت خود کو شارع سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کا حکم خدا نے نہیں دیا یہ اپنی عقل سے اس کو شریعت میں داخل کر دیتے ہیں مثلاً قیاس کو بھی حکم شرعی کی ایک دلیل قرار دے کر اس سے احکام شرعی نکالتے ہیں۔ حقیقت اگر دیکھی جائے تو یہ طعن اہل سنت پر نہیں بلکہ اہل بیت پر ہے۔ کیونکہ زید یہ اور تمام اہل سنت قیاس کی روایت اہل بیت ہی سے کرتے ہیں اور انہوں نے طریق قیاس ان ہی بزرگوں سے سنا ہے۔ چنانچہ قیاس کی روایات کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ امامیہ میں سے ابو نصر ہبہ اللہ ابن احمد بن محمد اور اس کے پیرو اس کے قائل ہیں کہ قیاس بھی ایک شرعی حجت ہے۔ اس لئے امام اثنا عشری طعن کے طور پر ان کو ثلاثہ عشریہ کہتے ہیں اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ قیاس کی روایتیں خود اثنا عشریوں کی کتب صحاح میں سند صحیح کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روایت کو ابو جعفر طوسی تہذیب میں ابو جعفر محمد بن علی الباقری سے ان الفاظ میں روایت کرتا ہے۔

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کو جمع فرما کر ان سے سوال کیا کہ اس شخص کے متعلق تم کیا کہتے ہو جس نے اپنی بیوی سے صحبت کی مگر اس کو انزال نہیں ہوا؟ اس پر انصار بولے کہ قاعدہ المائد بالہاء کے موافق غسل انزال پر ہوتا ہے۔ مہاجرین نے فرمایا کہ جب وہ شرمگاہیں باہم مل جائیں تو غسل واجب ہو جائے گا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا ابو الحسن! تم اس بار میں کیا کہتے ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں تم لوگ اس پر حد کو تو واجب جانتے ہو مگر ایک صلح پائی یعنی غسل اس پر واجب نہیں جانتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا حد شرعی پر غسل کے قیاس کی کھلی اور صاف صورت ہے۔ بعض دانشمند شیعہ اس قیاس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قیاس نہیں ہے بلکہ ایک اولیٰ اور بہتر چیز سے غیر اولیٰ پر دلیل لانا ہے جس کو حنفیہ کی اصطلاح میں دلالت النص کہتے ہیں۔ جیسے رَاكَ نَقْلًا لَهَا أُفٍّ۔ کا مارنے کی حرمت پر دلالت کرنا۔ اس کے سمجھنے میں مجتہد اور غیر مجتہد دونوں برابر ہیں۔ شیعوں کی اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صحبت بلا انزال سخت و سنگین مشقت یعنی حد پر اثر انداز ہوئی تو کمزور و ضعیف مشقت یعنی غسل پر بطریق اولیٰ اثر انداز ہوگی۔ اس تقریر کا بے ڈھنگا

پن دیکھئے۔

اگر آپس میں ایک دوسرے سے مَس (دگر) کا عمل ہو تو یہ عمل اہل سنت کے نزدیک باعثِ تعزیر ہے۔ اور امامیہ کے نزدیک حدِ شرعی کا موجب ہے اور بالا جماع غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح دخول کے ساتھ لواطت کا فعل ہو تو وہ بعض اہل سنت اور امامیہ کے نزدیک حدِ شرعی کا موجب ہے ان کے علاوہ اوروں کے نزدیک موجبِ تعزیر ہے۔ اور امامیہ کے نزدیک اس پر غسل واجب نہیں۔ یا مثلاً اجنبی عورت کے ساتھ مباشرتِ فاحشہ صرف موجبِ تعزیر ہے نہ موجبِ غسل بالاتفاق۔ علی، شارح مبادی الاصول باوجود کثرت اور متعصب شیعہ ہونے کے اس بات کا مقر و معترف ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قیاس پر عمل ہوتا تھا۔

علاوہ انہیں آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ امام باقر، امام صادق اور امام زید شہید رحمۃ اللہ علیہم نے جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو قیاس کی امانت دی تھی۔ باقی یہ بات کہ قیاس کے ثبوت کے دلائل اور منکرین کے اقوال کی تردید تو ان سب کے لئے اہل سنت کی اصول کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

گیارہواں دھوکہ بیا کہتے ہیں کہ "اثناعشری مذہب حق ہے اور اہل سنت کا مذہب باطل ہے اس لئے کہ اکثر اوقات اور اکثر شہروں میں اثناعشری تعداد میں کم اور ذلیل و خوار ہیں جب کہ اہل سنت کی تعداد بھی بہت ہے اور عزت و وقار بھی ان کو حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل حق کے بارے میں وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (اہل حق کم ہیں) فرمایا اور ایک اور جگہ فرمایا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (میرے بندوں میں شکر گزار بندے کم ہی ہیں)۔"

شیعوں کی یہ بات کلام اللہ کی تحریف اور تبدیلی کہی جاسکتی ہے، انہوں نے کلام اللہ کے متعلق غلط بیانی کی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اصحاب الیمین دوہ جن کے اعمال نامے قیامت کے دن دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ کے بارے میں فرمایا ہے۔ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثَلَاثَةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ۔ (ایک انبوہ ہے پہلوں سے اور ایک انبوہ ہے پچھلوں سے) جس سے کثرت معلوم ہوتی ہے۔ البتہ جہاں کمی بتائی ہے وہاں شکر گزار بندے مراد ہیں۔ جیسا فرمایا وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔ (ان میں سے اکثر کو آپ شکر گزار نہیں پائیں گے) اور واقعہ بھی یہی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام نعمتوں کو ان کی فطری اور خلقی غرض و غایت میں صرف کرنے کا نام ہی شکر ہے۔ اور حقیقت میں یہ درجہ نادر و نادر واقع اور بہت ہی کمیاب ہے۔ تو ان آیات میں کسی مذہب کی حقانیت یا بطلان کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔ البتہ شاکرین کی قلت اور ناشکروں کی کثرت کا بیان ہے۔ اسی طرح آیت وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (مگر جو ایمان لائے اور کام نیک کئے وہ بہت کم ہیں) اس آیت میں بھی حق و باطل عقائد کا ذکر کہاں ہے؟ اور اگر ذلت و قلت حقانیت کا سبب ہو تو پھر انہیں مان لینا چاہیئے کہ تو اصعب، خوارج، زیدریہ، افطیہ، ناویریہ وغیرہ اثناعشریہ سے زیادہ حقانیت و صداقت کے حامل ہوں۔ کیونکہ یہ فرقے باعتبار تعداد بھی اثناعشریہ سے کم ہیں اور ان کی نسبت دلیل بھی زیادہ ہیں۔

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے تو اپنی کتاب عزیز میں، بار بار یہ فرمایا ہے کہ اہل حق کا ظہور، قلبہ اور تسطہ ہوگا چنانچہ ارشاد ہے وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ وَرِثَتْ جُنُودُهُمُ الْعَالَمُونَ۔

اپنے رسول، بندوں کے متعلق ہمارا حکم پہلے ہی جاری ہو چکا کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی بلا شک غالب ہونے والا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَمْرَ مِن يَوْمِنَا مِنَ الصَّالِحِينَ (زبور میں نصیحت کی باتوں) کے بعد ہم نے یہ بھی لکھا ہے کہ زمین کے دارِث میرے صالح بندے ہوں گے) ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَمْرِ مِنَّا وَمَن يَسْلِفْهُمُ اللَّهُ فَلاَ يُمْسِكْ لَهُمْ أَعْيُنُكَ لِيَفْهَمُوا لَقَدْ جَاءَ بِكَ دُخَانٌ مِن ذَاتِ الْعَذَىٰ (ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے پہلوں کو جس طرح اقتدار دیا تھا ان کو بھی زمین پر اقتدار دے گا اور ان کے دین کو مضبوط کرے گا جس کو اللہ نساں ہے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔)

اسی طرح کی اور بھی آیات ہیں اور امارت میں بھی جا بجا تاکید ملتی ہے کہ امت کی جہودیت کی موافقت و تابعداری کرنی چاہیے۔

پھر قرآن و امارت میں مجاہدین کی تعریف کی گئی ہے اور حدیث میں یوں آیا ہے۔ لَا يَزَالُ مِن أُمَّتِي أُمَّةٌ قَانِتَةٌ بِأَمْرِ اللَّهِ لَا يَفْتُرُهُمْ مِنْ خَالَتِهِمْ (میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر جمی رہے گی مخالفت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے)

اہل تاریخ اس پر متفق ہیں کہ شیعوں میں سے آج تک کوئی بھی جہاد پر کمر بستہ نہیں ہوا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے کسی ملک یا اس کے حصہ کو کفار سے چھین کر اسے دارالاسلام بنایا بلکہ اس کے برعکس انہیں اگر کسی شہر کی سیادت یا حکمرانی ملی بھی جیسے معروضات کی ریاست ان کے ہاتھ آ بھی گئی تو انہوں نے کفار ہی کی طرف درستی اور یگانگت کا ہاتھ بڑھا یا اور دین کو دنیا کے عوض بیچ کر دارالاسلام کو دارالکفر میں تبدیل کر دیا۔ یہ ہمیشہ کافروں سے دوستی اور مسلمانوں کے قتل پر شیر رہے، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں اس مذہب کے سبز دم، نہیں پہنچے وہاں کے باشندے ہمیشہ غالب، ذی عزت و شان رہے۔ چنانچہ توران، ترکستان، روم اور ہندوستان کے بادشاہوں نے شیعوں کے اختلاط اور درستی سے پہلے عزت و شان کی زندگی بسر کی ہے۔ اور جب بھی کسی شہر اور ملک میں شیعہ مذہب رائج ہوا وہیں فتنہ و فساد، بد بختی اور ذلت اور باہمی ففاق۔ جو زوال سلطنت کے اندر دینی اسباب شمار ہوتے ہیں۔ آسمان سے بارش کی طرح برسنے لگے، اور پھر وہاں کی فضا ناقابل اصلاح ہو گئی۔ ایران، دکن اور ہندوستان ہی نہیں، ملک عرب شام، روم، توران و ترکستان وغیرہ کے حالات کو دیکھ لیجئے (تو اس کی تصدیق ہو جائے گی)۔

اور تاریخ کا ایک یہ بھی مقابلہ تردیدِ تجربہ ہے کہ جب بھی اتفاق سے کسی ملک میں شیعہ غلبہ ہوا ہے تو اس کے متصل بعد ہی اس پر کفار کا غلبہ ہونا گویا لازمی ہو گیا۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کا تسلط کفار کے تسلط کا گویا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور یہ گویا چھوٹے کفار ہیں۔ بنگال، دکن، یورپ، دہلی و گردونواح، لاہور، پنجاب میں کفار کو یہی بد بخت سیاہ رو، سیاہ کار ہی برسرِ اقتدار لائے۔ اس سے بھی پہلے فتنہ تاندار، اہل اسلام کا قتل قرامطہ اور اسماعیلیہ کا زور ان ہی

کی وجہ سے ہوا۔ ان رافضیوں کے فرقے عرافین، بغداد، حنابلہ اور کثرت میں پھیل گئے پھر بمطابق آیت کریمہ **وَاقْتُلُوا فِئْتَنَةً لَا تُبَيِّنُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ غَاصَّةً** (ایسے فتنے سے بچو جس کی لمبیت میں صرف ظالم ہی نہیں آئیں گے) نیک بد سارے ہی تباہی و بربادی کا شکار ہو گئے۔

بارہواں دھوکہ :- ان شیعوں کے علماء نے محض اہل سنت پر لعن طعن کرنے اور ان کے اسلاف صحابہ کرام و تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عیب جوئی کے مقصد کی خاطر کتابیں اور رسائل سنسٹ کئے اور ان میں دانستہ افتراء، جھوٹ، اور بہتان کی خوب خوب داد دی۔ کہ سلسلہ کذاب کی طرح بھی رہیں آگئی ہوگی۔

ان لوگوں میں سے سمر نہرست مرتضیٰ ابن مسلم علی، اس کا بیٹا جرعتی کے لعن سے مشہور تھا۔ محمد بن حسن طوسی اور اس کا نواسہ جابر ابن طاووس کے نام سے معروف ہے اور ابن شہر آشوب سردی مازندرانی ہیں، اور ان میں سے بھی ابن مسلم علی زیادہ آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس دھوکہ کا زیادہ شکار وہ لوگ ہوئے جو اپنے اسلاف کے حالات اور اپنے مذہبی علوم سے ناواقف، بے بہرہ اور نابالغ تھے۔ وہ ان افتراء اور بہتانات پر اعتماد کر کے اپنے مذہب سے برگشتہ و بدعتیہ ہو گئے۔ اور بالآخر ان کی گود میں جا گرے۔

تیرہواں دھوکہ :- جانتے ہیں کہ ”حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم نے قرآن میں تحریف کر کے ان آیات اور سورتوں کو قرآن مجید سے خارج کر دیا جن میں اہل بیت کے فضائل و احکام تھے۔ جن میں ان کی اتباع کا حکم دیا گیا اور ان کی مخالفت سے رکھا گیا تھا اور ان کی محبت کو واجب قرار دیا گیا تھا۔ یا جن میں اہل بیت کے دشمنوں کے نام اور ان پر لعن و لعن کا بیان تھا، یہ سب کچھ چونکہ ان خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم) پر شاق تھا، اور ان کی تعریف سے ان کو حسد ہوا لہذا انہوں نے قرآن کو ان سب سے پاک کر دیا۔ ان تحریف شدہ حصوں میں سے ایک وہ ٹکڑا تھا جو سورہ الم نشرح کا جز تھا یعنی ”رَجَعْنَا عَلَيَّا صَهْرًا“ اور ہم نے علی کو تہار و داماد بنایا۔ (ذرا دبات تو دیکھئے کہ دو بیٹیوں کے داماد کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس طرح ایک لمبی سورت ”الولایت“ نامی بھی ساقط کر دی گئی جو فضائل اہل بیت اور ائمہ سے پُر تھی۔“

شیعوں کے اس الزام کو باطل ٹھہرانے کا ذمہ تو خود اللہ تعالیٰ نے یہ خبرا کر لے لیا **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ**۔ ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

نوحی کتاب و ذکر کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہو، بشر کی کیا طاقت کہ اس میں کمی یا زیادتی کر سکے۔ یا اس کا خیال دل میں لا سکے۔ ہاں اگر خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے اقتدار کو (نوروز اللہ) اقتدار الہی سے بڑھ کر مانیں یا ان حضرات کو کارخانہ الہی کا شریک غالب تسلیم کر لیں تو کچھ بات بن سکتی ہے، مگر پھر ان حضرات کی توہین و تحقیر کے مذہبی غبارہ میں ہوا کہاں رہے گی۔

چودھواں دھوکہ :- انعام کو دھوکہ دینے کے لئے ایسی روایات بیان کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہوتی ہیں کہ جناب علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کی اولاد کی محبت عذاب آخرت سے نجات دلانے کے لئے کافی ہے۔ (بشرطیکہ یہ محبت شیعوں کی عداوت نما محبت کی مانند ہو، سچی اور حقیقی محبت نہ ہو) اس محبت کے بعد (عذاب آخرت سے بچنے کے لئے) اطاعت بجالانا اور گناہوں سے بقتنا کرنا ضروری نہیں۔

منہ ان کے ایک روایت وہ ہے جس کا راوی باویہ ہے جو ان کے ہاں صدوق مشہور ہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے علیؑ سے محبت رکھی اللہ تعالیٰ اس کو دروزخ کا عذاب نہیں دے گا۔

اب چونکہ عام شہوت پرست اور حرص و ہوس کے بندے اس بات کے نہایت شوقین ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی قدغن اور پابندی نہ ہو۔ ان کو کھل کھیلنے کی آزادی ملے۔ دنیا بھر کی تمام چیزیں ان کے لئے جائز قرار دی جائیں۔ عیش و عشرت میں ان پر کوئی گرفت نہ ہو۔ گناہوں اور محرمات کے ارتکاب میں ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ عبادت الہی سے جان چراتے ہیں۔ اور اس میں سستی اور ڈھیل سے کام لیتے رہیں۔ اس لئے یہ بشارات ان کے ذہنوں پر کافی اثر انداز ہو کر ان کو اس مذہب کی طرف راغب کر سکتی ہے، اور یہ اس کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

حالانکہ خود ان شیعوں کی معتبر و صحیح کتابوں میں اس قسم کی روایات موجود ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد اور ذریت کو بار بار فرمایا کہ تم اپنے نسب پر گھنٹہ نہ کرو بلکہ طاعات و عبادت کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کرو۔ جب خوف دہراس میں خود اہل بیت کا یہ حال ہے تو دوسروں کو اہل بیت کی محبت پر بھروسہ کر کے ارتکاب معاصی و محرمات کے جائز ہونے کا امکان ہی کہاں ہے!

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اہل بیت کرام سے حقیقی محبت اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب کہ طاعات و بندگی، زہد و تقویٰ میں ان بزرگوں کی روش اختیار نہ کی جائے اس طریقے سے ان کی محبت حاصل کی جائے گی۔ تو اس ضمن میں تمام کمالات حسنہ خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔

پس الفاظ لَا يَعْذِبُ اللَّهُ النَّارِ مَنْ قَاتَىٰ عَلَيْهِ صَافٍ اس معنی میں صحیح ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت تمام دینی کمالات پر حاوی اور ان کو شامل ہے۔ نہ صرف زبانی، کلامی محبت، جو صرف زبان سے ادا ہو، اور اقوال و افعال میں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے کوئی مناسبت یا مشابہت نہ رکھتی ہو اور آپ کے اقربا و اصحاب کی شان میں بدزبانی سے نہ رکنا ہو۔

غرض ہر بات میں تو آنجناب رضی اللہ عنہ کے اقوال کی مخالفت کرنا اور پھر اس قطعہ کا سچا مصداق بننا۔

تَعْمَى الْإِلَهِ وَأَنْتَ تَظْهَرُ حُبَّكَ هَذَا الْعُمُورِي فِي الْقِيَامِ بِدِينِهِ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ مَادَقًا إِنَّ الْمُحِبَّ لَمَنْ يَحِبُّ مُطِيعٌ

(۱) تو خدا کی نافرمانی بھی کرتا ہے اور محبت بھی جتلاتا ہے بخدا میرے خیال میں تو بیڑی عجیب کی بات ہے۔

(۲) اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محب تو محبوب کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔

پندھرواں دھوکہ: بجا ہر التوریت کہتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ خلفاء مقرر کئے ہیں جو آپ کے بعد آپ کے نائب ہوں گے۔

(۱) ایلیاد (۲) فیراز (۳) ایراہیل (۴) مشوب (۵) مسہور (۶) مسوط (۷) ذومرا (۸) امراو (۹) ثمور (۱۰) تسطور

(۱۱) نفوش (۱۲) قدیمیونیا

حالانکہ توریت کے دستیاب چار نسخوں میں اس افتراء اور جھوٹ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ایک نسخہ فراسین کے

پاس ہے، دوسرا بائبل کے پاس تیسرا انصاری کے پاس جس کا ترجمہ انہوں نے عبرانی سے اپنی زبان میں کر لیا ہے۔ چوتھا سائرین کے پاس جس میں دیگر نسخوں کی نسبت مضامین کچھ زائد ہیں۔

اس پر طرّف تماشایہ کہ ایک شیعہ عالم نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں ایک بے اصل قلعہ گھڑا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے شوق ہوا کہ اس تورانی نص کا سراغ لگاؤں، اس کے لئے اہل کتاب سے ربط و ضبط بڑھایا مگر انہوں نے اس کی اصل کا کچھ پتہ نہ دیا۔ آخر انہیں اہل کتاب میں سے ایک کے پاس اس کا کھوج ملا۔ اس نے اس عالم کا نام بھی لکھا، اور بڑی شرح و بسط سے، اس کو بیان کیا ہے، مگر اس روایت میں کئی باتیں قابلِ توجہ اور وجہِ اعتراض ہیں۔

اول تو چونکہ یہ شیعہ کی روایت ہے جو ناقابلِ اعتماد ہے۔ دوسرے وہ عالم اہل کتاب بھی جس کی یہ روایت ہے۔ کب لائقِ بھروسہ ہو سکتا ہے۔ جس کا شیوہ خاص ہی اہل اسلام کے ساتھ بغض و عناد ہو۔ اور مسلمانوں کی جماعتوں میں تفرقہ، عناد اور پھوٹ ڈالنا اور ان میں باہم عداوت و دشمنی پیدا کرنا جن کی دلی آرزو ہو۔ جب بات یہ ہو تو ایسا معاند اور شدید العداوت شخص ایک سادہ ذہن شیعہ کو گمراہ کیوں نہ کرتا۔ جب کہ وہ اپنا قرآن اور حدیث چھوڑ کر، مسوخ شدہ اور تحریف کردہ کتابوں کی طرف لپکتا ہو اودادی ضلالت میں بھٹکتا پھرتا ہو۔ چنانچہ جیسا کہ معلوم ہوا۔

اس شیعہ مذہب کی بنیاد ہی اہل کتاب میں سے ایک بد اصل عبد اللہ بن سبا یہودی صنعانی کے ہاتھوں اور اس کے فریب سے پڑی۔ اب اگر ان ہی میں سے ایک اور اپنے بزرگوں کے لگائے ہوئے پودے کو سینچے اور پڑان چڑھائے تو تعجب کی کیا بات ہے۔

پھر بفرمنی محال، اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو شیعوں کو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ بارہ کا مدران کے ہاتھ لگتا ہے۔ اس میں نہ ان بارہ اماموں کے نام متعین کئے گئے ہیں، نہ ان کا اہل بیت سے ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی امامت کے دیگر لوازمات و اوصاف کا ذکر ہے۔ یہ عبرانی الفاظ تو ایسے ہیں کہ ان کے لفظی معنی معلوم نہ معانی کے مفہوم کا پتہ۔ جو دل چاہے معنی و مفہوم گھڑ لیجئے۔ اگر اس روایت کو لے کر نواسٹہ خوارج ان ناموں کو پیدا، مروان، حمّاج اور ولید وغیرہ پر چسپاں کر لیں تو کس بنیاد پر ان کو ایسا کرنے سے کوئی روک سکے گا۔

اور تعجب تو ان میں سے ان لوگوں پر ہے جو اہل علم کہلاتے ہیں اور ایسے سہل اور لغو خیالات پر پھولے پھرتے ہیں۔ اور بچوں کی طرح شیطانی کھلونوں پر مٹے جلتے ہیں۔ اور پھر اسے اپنے مذہب کے لئے ہمتہ دلیل بھی ٹھہراتے ہیں سچ ہے۔ من یضلل اللہ فلا ھادی لہ۔

سولہواں دھوکہ :- ایسے کہ ان کے مدار نے تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو اہل سنت کے مدّ ثین ظاہر کیا اور علم حدیث کے قابلِ اعتبار مدّ ثین اہل سنت سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور صحیح اسناد یاد و حفظ کیں۔ ظاہری زہد و تقویٰ سے اپنے کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان کی اس ظاہری حالت سے اہل سنت کے طلبائے حدیث نے بھی دھوکہ کھایا اور ان کی شاگردی کو قابلِ اعتماد سمجھا۔ اور ان سے علم حدیث پڑھا۔

اہل علم میں اعتماد پیدا کرنے کے بعد انہوں نے یہ حرکت شروع کی کہ صحیح و حسن احادیث کی روایت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی گھڑی ہوئی احادیث بھی غلط ملط کر دیں۔ عوام تو کیا خواص تک اس دھوکہ اور فریب کے شکار رہ گئے اس لئے کہ احادیث صحیحہ و مضمونہ میں تمیز کی صورت رواد حدیث ہیں۔ اور جب اس چالبازی کی وجہ سے اچھے اور

بڑے راوی مل جل گئے تو اب تیز کی کوئی صورت نہ رہی، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل اہل سنت کے شامل تھا اور ان مکاروں کے کید و فریب کا پرزہ چاک کرنا منظور تھا۔ لہذا فن رجال کے ماہرین اس طرف متوجہ ہوئے، تحقیق و تفتیش میں لگے اور بالآخر اس دھوکے کا پتہ چلا لیا۔ اور پورے طور پر اس سے آگاہ ہوئے۔

جب دھوکہ اور فریب کھلا اور معاملہ طشت از بام ہوا تو اس گروہ کے کچھ لوگوں نے تو حدیثیں گھڑنے اور وضع کرنے کا صاف صاف اقرار کر لیا اور بعض دوسروں نے گوربان سے قوا قرار نہیں کیا مگر کچھ اور قرائن و علامات نے ان کی سازش اور فریب دہی کا راز کھولا۔

چنانچہ اب تک ان کی مجموعی اور مصنفات میں یہی احادیث مشہور و معروف ہیں اور اکثر شیعہ اور نفیقلیہ دلیل میں انہیں موضوع اور گھڑی ہوئی "احادیث" کو پیش کرنے اور ان کا سہارا لیتے ہیں۔

ان میں بابر جعفری وہ پہلا شخص ہے جو اس دھوکے اور فریب کا مہم معنوں میں مجدد ہے اسی لئے بعد تحقیق حال امام بخاری اور مسلم نے احتیاطاً اس کی تمام مرویات کو درجہ اعتبار و اعتماد سے گرا کر نظر انداز کر دیا۔ ترمذی و ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایات کو متابعات و شواہد کے طور پر تو قبول کیا ہے دین دوسری صحیح احادیث کی تائید مل جانے پر (ورنہ جہود روایت وہ تنہا بیان کرتا ہے اس کو رد کر دیا اور ناقابل اعتماد قبول ٹھیکر یا۔

اور ان کا دوسرا شخص ابوالقاسم سعد بن عبد اللہ بن ابی خلف اشعری قمی ہے۔ وہ عیادی و چالاک میں خوب چاق و چوبند اور سب سے آگے ہے۔ بعض ناواقف اہل سنت بھی اس کو اسی اختلاف اسناد کی وجہ سے اپنے معتبر رجال اسناد میں سے سمجھتے ہیں، مگر نکاشی نے جو شیعہ رجال اسناد کو پرکھنے میں ماہر ہے، اس کو اپنے فرقہ کا فقیہ و سرگروہ قرار دیا ہے۔

سترھواں دھوکہ ہمایہ ہے کہ اہل بیت کرام سے ایسی احادیث اور روایتیں بیان کرتے ہیں۔ جن سے صحابہ کرام کی خدمت کا ثبوت ملے اور جن سے ان کے ظلم و تعدی پر اہل بیت کی شکایت ظاہر ہو۔ اور بعض ایسے آثار بیان کرتے ہیں جن سے صحابہ کرام کا دین سے ارتداد ظاہر ہو، اور جن سے یہ بتائیں کہ قبامت کے دن اہل بیت کے حقوق ٹھیک کرنے والوں پر سب سے زیادہ سخت عذاب ہو گا۔ اور یہ کہ صحابہ کرام چونکہ اہل بیت کے حقوق کے ناسب ہیں۔ اس لئے ان کو ان سے محبت رکھنے والوں کو دوزخ میں بلایا جائے گا۔ اور شیعہ اور اہل بیت سے محبت رکھنے والے جنت میں رکھے جائیں گے۔ اور پھر ان احادیث و روایات کی تائید میں وہ حدیثیں پیش کرتے ہیں جو اہل بیت کے ساتھ محبت رکھنے کی نفیلت اور ان کے دشمنوں کی بڑائی میں اہل سنت کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔

اس دھوکے کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تابعین تابعین رحمہم اللہ کے دور میں فواصیل اور خارجیوں کے ہاتھوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت کریمہ پر ظلم اور ان کی تحقیر و تذلیل ہوئی، اور بعض اوقات ائمہ اہل بیت نے ان ہی فواصیل کی بد اطواریاں اور سیاہ کاریاں دیکھ کر ان کی خدمت کی۔

مگر اتنی سی بات کو شیعہ کیجئے اور بغض و عناد نے ان لوگوں پر اپنا عائد نہ کرنے کا ذریعہ بنایا اور صحابہ کرام کی ذات گرامی کو اس میں ملوث کر لیا۔ اور ان مصلحتوں کو ان پر چھپا کر نے کی ناپاک جسارت کی۔ اس کا پورا پورا بیان انشاء اللہ باب مصلحت کے آخر میں آئے گا اور ہم دلائل شیعہوں کی کتابوں سے نقل کر کے اس فریب کا پردہ

چاک کر رہ گئے۔

اٹھارواں دھوکہ: ہایہ کہ اپنے مذہب کے موافق رسولِ ائدر علی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع احادیث گھڑ لیتے ہیں اور پھر ان کو درجِ دہرہ دیتے رہتے ہیں، ان کی اکثر حدیثیں، قصہ و کہانی کے انداز کی ہوتی ہیں۔ بعض الفاظ و صیغے صحیح احادیث سے اڑا کر اس انداز میں لیتے ہیں اور کرتے ہیں جن سے ان کے مذہب کی تائید نکل سکے۔ اور بعض دقت ایسے صیغے بھی گھڑ لیتے ہیں کہ احادیث صحیحہ میں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ انبیاءِ الاولیاء العزیز یہ آرزو رکھتے تھے کہ شیطان علی میں محسوس ہوں۔ (یعنی ان کا حشر انہیں کے ساتھ ہو) اسی جیسے اور الفاظ و صیغے۔

انیسواں دھوکہ: ہایہ دیتے ہیں کہ اہل سنت کے معتبر رجال اسناد پر نظر رکھتے ہیں ان میں سے کسی کا نام یا لقب ان کے رجال میں سے کسی سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ تو اس کی حدیث اور روایت کو اسی کی سند سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اب چونکہ دونوں کا نام و لقب ایک ہوتا ہے اس لئے تمیز مشکل ہو جاتی ہے اور ناواقف سنی ان کے راوی کو اپنا معتبر راوی سمجھنے کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور اس کی روایت پر اعتقاد کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً سدی کے نام کے دو راوی ہیں سدی کبیر۔ سدی سفیر۔ اول اہل سنت کے معتبر راوی ہیں اور دوسرا کذاب۔ روایتیں گھڑنے والا خالص متعصب شیعہ۔

یا مثلاً ابنِ قتیبہ کہ اس نام کے بھی دو راوی ہیں۔ ایک ابراہیم بن قتیبہ جو کٹر شیعہ ہے۔ دوسرے عبد اللہ ابن مسلم قتیبہ جو اہل سنت میں سے ہیں اور کتاب المعارف انہیں کی تصنیف ہے۔ ڈھیت پن ملاحظہ ہو کہ اس مذکورہ بالا رافضی نے بھی ایک کتاب لکھی اور اس کا نام بھی کتاب المعارف ہی رکھا۔ تاکہ دونوں کتابوں میں اشتباہ پیدا ہو جائے۔ بیسواں دھوکہ ہایہ ہے کہ لغت و عرف کا لحاظ کئے بغیر قرآنی کلمات کی من مانی تفسیر کرتے ہیں اور اس کو اہمیت دیتے اور قابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لئے اس کی نسبت اہل بیت کی طرف کر دیتے ہیں، مثلاً رب کہاں کہیں وہ مسلمان بغیر خطاب ہو اور جبرئیل کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہو، اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد لیتے ہیں۔ یا مؤمنین یا مومن سے شیعان علی مراد لینا اور کافرو کافرین سے اہل سنت اور منافق و منافقین سے کہا رہا ہے (روسلان اللہ علیہم)

اکیسواں دھوکہ: ہایہ دیتے ہیں کہ ایک ایسی کتاب جس میں صحابہ پر لعن طعن ہو اور مذہبِ اہل سنت کا بطلان ہو خود تصنیف کو کے اس کو اہل سنت کے کسی جلیل المرتبہ عالم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اور اس کے خطبہ میں مسنف کی طرف سے یہ وصیت بھی درج کر دیتے ہیں کہ ہم نے اس میں جو کچھ لکھا ہے یہ ہمارا اصلی اور پوشیدہ عقیدہ ہے، اس کو ایک محفوظ امانت اور پوشیدہ بھیجید محمد کرمانہ میں رکھیں۔ اس کے علاوہ دوسری کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اسے ظاہر داری اور زمانہ سازی محض تصور کریں۔ مثلاً کتاب سرائع العالمین کو امام غزالی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح کی اور کئی کتابیں ترتیب دے کر انہوں نے یہی حرکت کی ہے۔

اب چونکہ ایسے صاحبِ ذوق لوگ بہت ہی کم ہیں کہ وہ اس فرضی بزرگ مسنف کے طرزِ کلام سے گہری واقفیت رکھتے ہوں کہ ان کے اور دوسروں کے مذاقِ سخن میں فرق و امتیاز کر سکیں اس لئے لامحالہ عام طلبائے دین اس مکر کے پکڑ میں غوطے کھاتے اور بہت حیران و پریشان ہوتے ہیں۔

بانیسواں دھوکہ: استصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کی برائیاں اور مذہب اہل سنت کا بطلان ایسی کتابوں سے نقل کئے ہیں جو نہایت کم یاب اور نادر الوجود ہوتی ہیں حالانکہ ان کتابوں میں اس جھوٹ کا درد درد تک ذکر نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ کتابیں ہر جگہ ہر ایک کو دستیاب نہیں، اس لئے اکثر ان نقل حوالوں کو دیکھنے والے شک کے شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اور وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ نقل صحیح ہے تو اہل سنت کی مشہور روایات اور اس روایت میں تطبیق و موافقت کیسے ہوگی۔ حالانکہ ان بیچاروں کی یہ سوچ اور فکر مندی بے کار اور فصول ہے، یہ نہیں سوچتے کہ اگر بالفرض نقل صحیح بھی ہو تو موافقت اور تطبیق کی ضرورت اس دقت پر پڑتی ہے جب کہ دونوں روایتیں شہرت، صحت، مافذ و مباحث معنی اور عدالت رداۃ میں برابر، و ہم مرتبہ ہوں۔ اور جب یہ امور ان مشہور روایات کے مقابلہ میں جن کا مافذ معلوم اور جن کی دلالت واضح ہے اس موہوم و بے اصل نقل میں ناپید ہیں تو تطبیق کی ضرورت ہی کہاں رہی۔

غرض یہ شیعہ، اہل سنت پر الزام لگانے کے لئے جو حوالے لاتے ہیں وہ ایسی ہی نادر الوجود کتابوں سے لاتے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ کتب دستیاب بھی ہوں تو ہم کہیں گے کہ مصنف نے اپنی کتاب کی ہر بات کی صحت کی پابندی نہیں کی بلکہ اس نے اچھا اور برا سب اس میں جمع کر دیا ہے۔ اور اس پر نظر ثانی کا موقعہ دیا ہے۔ کہ جہاں مشکک کر اچھی بات لے لی جائے اور بری کو نکال کر پھینک دیا جائے۔ اور جہاں مصنف کشف الغمہ، اور محل مصنف القین اسی قسم کی کتابوں سے نقل پر نقل کرتے چلے گئے اور بڑے خود سمجھتے ہیں کہ ہم نے پالا مار لیا ہے۔ اسی طرح ابن طادس بھی اپنی تصانیف میں اسی قسم کے بے اصل نقلوں کے انبار پر انبار لگاتا چلا گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے واقعی اہل سنت کو ملزم ثابت کر دیا۔

تیسواں دھوکہ: ہذا امامیہ اشاعہ شریعہ، اور زیدیہ کو چھوڑ کر کسی اور فرقہ کے عالم کا نام لے کر نہایت شد و مد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش خام کرتے ہیں کہ وہ متعصب سنی تھا۔ اور بعض تو اس کو کٹر خارجی بتاتے ہیں۔ پھر اس کی طرف سے کوئی عبارت نقل کرتے ہیں، جس سے اہل سنت کے مذہب کا بطلان اور امامیہ اثنا عشریہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے اور اس حرکت سے غرض مذمومہ یہ ہوتی ہے کہ دیکھنے والا غلط فہمی میں پڑے، اور الجھن میں مبتلا ہو کر یہ سوچے کہ جب مصنف اتنا متعصب سنی ہوتے ہوئے ان روایات کو بیان کرتا ہے اور پھر ان کی تردید کے بجائے اس پر سکوت اختیار کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے یہ روایات صحیح ہی ہیں۔

مثلاً زعفرانی صاحب کشفات کہ تفضیل اور معترزی ہے خطاب خوارزم کہ کثر زیدی ہے، ابن قتیبہ کہ صاحب معارف کہ رافضی مرقوی ہے ابن ابی الحدید شارح ہبہ البلاغہ جس نے تشیع اور اعتزال کو جمع کیا ہے۔ مشام کلیتی مفسر جو شہید العقیدہ رافضی ہے۔ مسعودی صاحب مروج الذهب اور ابوالفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی یا اور ان جیسے دوسرے اشخاص کو شیعہ پہلے تو اہل سنت میں داخل کرتے ہیں اور پھر ان سے اقوال نقل کر کے اہل سنت کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔

چوبیسواں دھوکہ: یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت اہل بیت کے دشمن ہیں اور بعض بیوقوفوں کے سامنے اس بات سے قہقہے کہانیاں بھی بیان کرتے ہیں جن کو سن کر جاہل راستہ سے جھٹک جاتا ہے اور اپنے مذہب سے بیزار ہو جاتا ہے۔ تو یہ بات بھی تمام باتوں کی طرح جھوٹ اور افتراء محض ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ محبت

اہل بیت ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض و لازم بلکہ ان کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اہل بیت کے فضائل میں انہوں نے تنہا بھی اور اجتماعی طور پر بھی کتابیں لکھیں اور ان بزرگوں کے مناقب کی روایات بیان کی ہیں۔ چنانچہ اسی محبت اہل بیت کے سبب عرصہ دراز تک نواصب مردانہ و عیسائیہ سے برسرِ پرغاش رہ کر ایک جماعت نے شہادت پائی۔

جیسے عبید بن جریہ اور نسائی، جب کہ ایک اور جماعت رنج و اذیت کا شکار بنی، اور یہ وہ وقت تھا جب یہ مگر محمد کے آئینہ بہانے والے شیعہ تفسیر کر کے نواصب کی گود میں بیٹھتے جا رہے تھے، اور مال و دولت اور عہدوں کی خاطر نواصب کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ یہ اہل سنت ہی تھے جو ہر آٹھ وقت اہل بیت کرام کے رفیق و مددگار رہے۔ ہر نماز میں ان پر درود بھیجتے رہے۔ جو پیچھے دل سے ان سے لگاؤ اور تعلق رکھتے تھے۔ شیعوں کی طرح نہیں کہ ہر امام کے بعد ان کے بھائی بھتیجوں اور عزیزوں کو کافر بنائیں۔ یا ان کے فرزندوں کو امام مان کر دوسروں پر زبان طعن و لاذت کرنا بات سچی یہی ہے (جو شیعوں کے لئے کڑوی گولی بن کر رہ گئی ہے) کہ اہل بیت سے محبت کرنے والے، ان کی مدد کرنے والے سوائے اہل سنت کے کوئی نہیں ہے۔

حدیث نبویؐ افی تارک فیکو الثقلین کتاب اللہ و عترتی۔ (میں تم میں دو بھاری بھر کم اور باوقار چیزیں چھوڑ رہا ہوں قرآن اور میری عترت) میں عترت سے اہل بیت ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اب جس طرح قرآن کے ایک حصہ کو ماننا اور دوسرے جزو کا انکار کرنا بے سود و بے نتیجہ ہے اسی طرح بعض اہل بیت سے محبت اور بعض دوسروں پر لعن طعن آخرت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ یا جس طرح پورے قرآن پاک پر ایمان لانا اور اہل بیت کو چھوڑ کر اسی طرح تمام اہل بیت کو محبوب و دوست رکھنا چاہیے۔ اور یہ سعادت اور اس مطلب کا انکشاف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اہل سنت ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس لئے کہ خارجیوں نے توجنا ابیہ اور آپ کی ذات سے دشمنی رکھ کر بدگفتی کا ذخیرہ جمع کر لیا۔ اور تمام شیعوں نے اہانت المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ و حضرت حفصہ اور آپ کے بھوپتی زاد بھائی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم سے ملامت برت کر لعنت و ذلالت کا لبادہ اوڑھ لیا۔

پھر پھلوں میں کیسیانہ امامت حسین رضی اللہ عنہما کے منکر ہوئے۔ منار یہ امام زین العابدین کی امامت کے۔ امامیہ نے حضرت زید شہیدؑ کے ساتھ وفا کی اور اسماعیلیہ نے امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کو نہیں مانا جس کی کچھ تفصیل گذر چکی اور انشاء اللہ کچھ آگے آئے گی۔ اس طرح پوری قوم اہل بیت کی کسی نہ کسی وجہ سے اور اللہ کے فضل میں دشمن ٹھہری۔ (دستِ خدا دشمن)

پہلی سوال و جواب کہ یہ کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خاتونِ جنت رضی اللہ عنہما کے اس گھر کو جہاں جنابِ سنین، جنابِ امیر رضی اللہ عنہم، سادات اور بنو ہاشم تھے۔ نذر آتش کیا، اور اس پر تمام صحابہ کرامؓ نے ناراضگی کے بجائے خاموشی و رضا مندی ظاہر کی، اور اپنی تلوار کے قبضہ سے جنابِ سیدہ بتول الزہراء رضی اللہ عنہما کے پہلو پر ایسی ضرب و چوٹ لگائی جو اسقاطِ حمل کا سبب بنی۔

یہ ساری باتیں ان کی من گھڑت، افتراء اور بے اصل و جھوٹ ہیں۔ ان پر عقل کا اندھا اور بے بہرہ ہی یقین کرے گا۔ اور پھر مزہ کی بات یہ کہ یہ روایات خود شیعہ روایات سے ملکر آتی اور ان کے جھوٹ کا بھانڈا چھوڑتی ہیں۔ بابِ مطالعہ میں تفسیر کے تحت انشاء اللہ ہم ان کو بیان کریں گے۔

چھبیسواں دھوکہ ہے کہ کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب ہی اتباع کا زیادہ سزاوار و حقدار ہے کہ وہ اہل بیت کے مطیع ہیں۔ جن کی شان میں خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُفْرًا نَّطَهِّرًا۔ (لے اہل بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے رجس و برائی دور کر کے تم کو بالکل پاک کر دے)

اور ان ہی بزرگوں کے اقوال و افعال سے اپنے دعوے کی دلیل لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعوں کے علاوہ تمام فرقے غیر اہل بیت کی پیروی کرتے ہیں اور اہل بیت کے اقوال و افعال سے روگردانی اور احتراز کرتے ہیں۔ اس لئے شیعہ کے لئے نجات لازمی اور یقینی ہے جب کہ دوسرے فرقے گرفت کے خوف و خطر میں ہیں۔

پھر اسی جھوٹے مفروضے پر حدیث سفینہ سے تائید پیش کرتے ہیں۔ کہ مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوْحٍ مَنْ رَّكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنَّا ق۔ (میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے جو اس میں سوار ہو گیا بچ گیا اور جو اس سے بچھڑ گیا غرق ہو گیا)

یہاں انہوں نے غلط معبوث کیا ہے۔ اور حق و باطل کو غلط ملط کر دیا ہے۔ اس میں کلام کس کو ہے کہ اہل بیت کی اتباع موجب نجات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اہل بیت کا تتبع کون فرقہ ہے۔ اور شیطان کا پیرو گمراہ فرقہ کون ہے۔ جو ناجائز اور مشوم اغراض کی خاطر اہل بیت کا دامن تھامے ہوئے تھے، اور ان کے اور اہل بیت کے رسم و آئین میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ کس منطق کی رو سے، اہل بیت کے تتبع کہلا سکتے ہیں۔ اب اس بات کا ثبوت کسی بھی طرح ممکن نہیں کہ شیعہ اہل بیت کے تتبع ہیں۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ اور۔ جس کی روشنی ہو وہ کیا کہلا سکتا ہے۔ سب جانتے ہیں۔

مشرکین کہ خود کو ملت ابراہیم کا تتبع کہتے تھے اور مسلمانوں کو صابی یا صباۃ کا لقب دیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے خیال میں ان کو ملت ابراہیم کا مخالف سمجھتے تھے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی اتباع کا دم بھرتے تھے۔ اور عبداللہ بن سلام اور نجاشی یا ان جیسے دوسروں کو ان انبیاء کا مخالف بتاتے تھے۔ درحقیقت کسی کا نام لینا اور عمل میں اس کے خلاف، راستہ اختیار کرنا سرسوامی اور بے حیائی ہے۔ آزاد خیال اور کلمہ بھی خود کو قادری، سروردی یا چشتی کہتے ہیں، ایسے ہی سربرہنہ لبے بالوں والوں کا ایک فرقہ اپنے آپ کو ابراہیم کہتا ہے۔ ان سب کو معض ان نسبتوں سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ جب کہ یہ ایسے طرز عمل کے سبب اپنی رسوائی اور خفت کو زیادہ بڑھا لیتے ہیں۔ کاش! یہ ان بزرگوں کا نام شروع ہی سے نہ لیتے تو ان سے ان بزرگوں کی رسوم اور طریقوں کی پیروی کا کوئی مطالبہ بھی نہ کرتا۔

اس سلسلہ میں پچ صرف یہ ہے کہ اتباع کا زیادہ حقدار اہل سنت کا ہی مذہب ہے۔ اس لئے کہ جناب امیر المؤمنین حضرت علی و ائمہ اطہار رضی اللہ عنہم ظاہر و باطن میں اسی مذہب پر تھے۔ اور اس مذہب کے مخالف کو نہ صرف اپنی جملوں اور لشکروں سے باہر نکال دیتے بلکہ جلا وطن بھی کر دیتے تھے۔

ان حضرات نے امام ابوحنیفہ اور امام مالک (اسلمین اہل سنت)، رحما اللہ کے ساتھ عزت و نرمی روا رکھی۔ پھر ان اسلمین اہل سنت نے بھی ائمہ اہل بیت کی شاگردی اختیار کر کے کسب فیض کیا۔ اصول مذہب سیکھے۔ جب دوسروں کو بھی ائمہ کے موافق بچھا اور ائمہ نے بھی ان کی حقانیت کو تسلیم کر لیا تو انہوں نے ان سب سے معاملات دین کی تحقیق کی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر صرف اہل بیت کی طرف نسبت کر دینا حقیقت مذہب کے لئے کافی ہوتا تو چاہیے تھا کہ غلامہ کیساغیہ، حناریہ، اسماعیلیہ، زیدیہ، امامیہ، حمیریہ اور قرامطہ یا شیعوں کے دیگر فرقے بھی حق ہوتے اور پھر کسی کو کسی پر متعین اور محضوں کر کے فخر کرنے اور بغلیں بجانے کا حق نہ ہوتا۔ حالانکہ یہ سب فرقے ایک ادعا، ایک نسبت کے باوجود ایک دوسرے کو کافرو گمراہ کہتے رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ (اور اسی پر بس نہیں ماضی میں ایک دوسرے کی گردنیں تنک کاٹتے رہے ہیں اور آج بھی ان کی کینیت تعصب و جہاد و قلوبہ و شتی کے مین مطابق ہے نفعانی)

ستائیسواں دھوکہ یہ من گھڑت جھوٹا فقرہ ہے کہ ایک سیاہ فام لڑکی ہارون رشید کی مجلس میں پہنچی وہاں اس نے مذاہب پر بحث چھیڑ دی اور تمام مذاہب کے عیوب اور خامیاں گناہیں۔ مگر شیعہ مذہب کی تعریف کی اور ناقابل تردید دلائل سے اس کی حقانیت ثابت کر دی۔ حالانکہ ہارون رشید کی مجلس میں جید علمائے اہل سنت موجود تھے مگر اس نے کسی کی پرواہ نہ کی، اور نہ ہی اہل مجلس میں سے کسی سے اس کا جواب بن پڑا۔ اور یہ جبہ و دستار لے کر اس کی ایک بھی دلیل توڑنے سے عاجز رہے جب ہارون رشید نے اہل مجلس علماء کا یہ سکوت اور ہمزہ دیکھا تو شہر کے دیگر بزرگ علماء کو بلوایا جس میں جناب قاضی ابوالسوف رحمہ اللہ علیہ شاگرد رشید امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ بھی تھے۔ اب اس چھوڑ کر نے ان سے مناظرہ کیا اور ہر ایک پر ایسے الزام لگائے کہ کوئی بھی ان کا جواب نہ دے سکا۔ اور سب لاجواب ہو گئے۔

اس جھوٹے فقے کی گھڑت کا مقصد یہ تھا کہ علمائے اہل سنت کو بتایا جائے کہ تمہارا مذہب اس قدر بودا اور کمزور ہے کہ ایک معمولی چھوڑ کر اس کا تار، پود بکھیر سکتی ہے۔ اور تم کو لاجواب کر سکتی ہے۔ اور اس کی بحث کا تمہارے بلیل المرتبہ علماء بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اب اگر غور کیا جائے تو اس واقعہ سے بعد شیعہ عالموں کی ہی اڑتی ہے اور الزام انہیں پر آتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے سالوں ہی نہیں پوری عمر فن گویائی اور تقریر بازی کی مشق کرنے میں کھپادی پھر بھی اس سیاہ فام چھوڑ کر کے مقابلہ میں عشر عشیر تک بھی نہ پہنچ سکے۔ اس لئے کہ اپنے لمحہ پیدائش سے آج تک اتنی طویل مدت میں ان کا کوئی بھی عالم کسی بھی مجلس میں کسی بھی عالم اہل سنت پر ایک بھی الزام نہ لگا سکا۔ اور جب کبھی اس کی نوبت بھی آئی تو اس مجلس سے خود ہی ملزم بن کر اور الزامات کا پشت تارہ سر پر اٹھا کر نکلا ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس سیاہ فام کینز کی سٹاگر دی کر کے ہی طریقہ واردات سیکھ لیتے کہ دائمی ندامت اور شرمندگی سے تو چھٹکارہ پا جاتے۔

سچ تو یہ ہے کہ ان سیاہ دل بد باطنوں کا مذہب جو احمقوں اور بے وقوفوں کا گھڑا ہوا ہے اسی قابل ہے کہ اس کے منکلم، مجتہد یا منظر ایسی ہی سیاہ فام چھوڑ کر یاں ہوں۔ اگر بلند مرتبہ علماء اہل سنت ایسی جاہلانہ اور سو قیانہ گفتگو پر مہربان ہوں تو یہ ان کا نقص نہیں بلکہ جواب جاہلانہ باشد خوشی کے مطابق ایک بلیغ انداز میں مسکت جواب ہے۔ اور پھر جواب تو وہاں دیا جاتا ہے کہ جہاں مخاطب میں فہم و فراست کی کوئی رتق تو نظر آئے، اور وہ ماشاء اللہ ان سیاہ فام چھوڑ کر یوں میں تو کیا رکش چہرہ "عالمان جبر و دستار شیعوں میں بھی مفقود ہے۔

اٹھائیسواں دھوکہ یہ طریقہ واردات یہ ہے کہ شیعوں کے علمائے مذہب، اپنے مذہب کے اثبات اور اہل سنت کے مذہب کے بطلان میں ایک کتاب تصنیف کرتے ہیں اور مصنف یا مؤلف کی جگہ کسی کینز یا عورت کا نام لٹک دیتے ہیں اس کے ساتھ اس کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے جاتے ہیں کہ یہ کتاب اہل سنت کے علمائے بھی مطالعہ کی ہے مگر کوئی

بھی اس کی تردید نہ کر سکا۔ ایسی ہی ایک کتاب الحسنہ ہے جو لکھی تو شریف مرتضیٰ نے ہے مگر کہتے یہ ہیں کہ وہ کینز ان اہل بیت میں سے کسی کینز کی تصانیف ہے۔

انتیپسوال دھوکہ دہا کرتے یہ ہیں کہ اپنے مذہب کے ثبوت میں اور اہل سنت کے مذہب کو باطل ثابت کرتے ہیں۔ کتاب لکھتے تو خود ہیں مگر لعنت برکذاب کا مصداق بننے کے لئے ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ایک ذمی نے لکھی ہے۔ اور اس کتاب کے آغاز میں اسی جہول العلم ذمی کی زبانی بیان کراتے ہیں کہ جب میں بالغ ہوا، اور دین حق کے تلاش کرنے کی فکر ہوئی تو میں نے اس سلسلہ میں بڑی تکلیف اٹھائی۔ بہت تگ و تازہ کی، مزدورم دانے سے دوچار ہوا، تاکہ توفیق الہی نے رہنمائی و دستگیری فرمائی۔ اور مجھے دارالسلام پہنچایا، یہاں پہنچ کر میں نے دین اسلام کو جانچا پکھا اور ہر طرح سے اسے دین حق پایا اور میں نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد جب میں نے اس کے ماننے والوں میں اندرونی اختلاف رائے کو دیکھا تو میرے تو ہوش اُٹ گئے۔

میں تو بھانت بھانت کے اقوال و آراء سن کر سراپمہ ہو گیا کہ کس کو حق سمجھوں کس کو غلط، مختلف آزاد اور مذاہب کا جائزہ دلائل کی روشنی میں لیا تو مجھے معلوم ہو گیا اسلامی مذاہب میں سے صرف شیعہ مذہب ہی حق ہے۔ اس کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں سب گھڑے ہوئے اور تحریف شدہ ہیں ان ہی دلائل کی روشنی میں ملامت اہل سنت سے بحث و گفتگو کی اور ان پر الزام لگایا مگر کسی کو ان کے جوابات کی توفیق نہیں ہوئی اور کوئی بھی لگائے ہوئے الزامات کے جواب پر قادر نہ ہوا۔ اس کو دیکھ کر میرا عقیدہ پختہ تر ہو گیا کہ شیعہ مذہب ہی حق ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے سوچا کہ ان دلائل کو ضبط تحریر میں لے آؤں تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کو بھی راہ راست دکھا سکوں۔

اس نویت کی ایک کتاب یوحنا بن اسرائیل ذمی کی ہے۔ جس کا اصل مصنف شریف مرتضیٰ ہے، اس کو کسی نامعلوم الحال ذمی کی طرف منسوب کر کے اس کے شروع میں لکھتا ہے۔

کہ اول میں طلب حق میں حیران و سرگرداں رہا۔ ہر مذہب کی کتابوں کا بغور غامد اور انصاف پسندی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اور ہر مذہب کی مشکلات کو اس کے معتبر علماء سے حل کرنے کی کوشش کی۔ مگر میرے دل میں شیعہ مذہب کے سوا کسی مذہب کی حقانیت و صداقت نے اثر نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں ایک حکایت بھی کتاب میں بیان کی گئی۔ کہ فلاں تاریخ کو بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ میں گیا تو دیکھا کہ ایک عظیم الشان مجلس منعقد ہے۔ جس میں جلیل القدر علماء میں سے فلاں فلاں عالم موجود ہیں۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ حضرات میں بیسائی ہوں۔ اللہ کی توفیق سے حقیقت اسلام سے آگاہ ہوا۔ اور بجان و دل اس کا مالوہ شیدا ہوا۔ لیکن اہل اسلام میں، میں نے باہم بڑا اختلاف دیکھا کہ ہر ایک کا قول دوسرے کے قول سے ٹکراتا ہے۔ غرض میں سے ایسی جستجو میں تھا کہ علمائے اسلام کا اجتماع کسی مجلس میں دیکھوں اور اپنی غلطی دور کروں۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میں اس مبارک محفل تک پہنچ گیا، آپ حضرات کی بڑی عنایت اور کرم نوازی ہوگی اگر دلائل کی روشنی میں مذہب حق سے مجھے روشناس کرا دیا جائے۔

چنانچہ اہل سنت کے چاروں فرقوں میں سے ہر ایک نے اپنے حق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور ہر فرقہ دالے نے اپنا مذہب حق ثابت کرنے کے لئے دوسرے فرقہ کے مذہب کو باطل قرار دیا۔ ہر طرف سے باہم لعن طعن، کالم گلوچ کا

ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور بات بات پر پانی ٹپک آگئی۔ اس وقت میں نے انہیں لٹکا کر لے لیا، انسا فوراً بدلا ہوا مذہب حق دراصل تم چاروں فرقوں کے مذہب میں کوئی سا بھی نہیں، حق مذہب تو ایک اور ہی ہے جس کو تم رفض کا نام دیتے ہو، اس مذہب کو حقیر اور اس کے ماننے والوں کو ذلیل سمجھتے ہو۔ اس کے بعد جو میں نے مذہب رفض کے دلائل بیان کرنا شروع کئے تو چاروں فرقوں کے عاملوں میں سے کسی نے بھی دم نہ مارا بلکہ سب کے سب سرنگوں رہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ان دلائل کو بصورت کتاب ضبط تحریر میں لے آؤں، پس ثواب آخرت کی امید اور گمراہیوں کو راہ راست دکھانے کی خاطر میں نے یہ کتاب تصنیف کی۔

شریف مرتضیٰ پر پڑا تعجب ہے کہ اس نے اختلاف کی نسبت اہل سنت کی طرف کی حالانکہ وہی نہیں ساری شیعہ مذہب جانتی ہے اصول و بنیاد عقائد و اعمال میں ان میں باہم ہرگز کوئی اختلاف نہیں۔ فروعیات میں البتہ اختلاف ہے سو وہ بھی اتنا سنگین نہیں کہ ایک دوسرے کو کافر یا گمراہ کہنے کی حد تک جا پہنچے۔ پھر اتفاقی مسائل زیادہ ہیں اور ایسے مسائل بہت کم ہیں جن میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بن اور ہائزہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چاروں مذاہب میں جن فروعی مسائل میں اختلاف ہے ان کی تعداد تین سو سے کچھ زائد نہیں۔ اور وہ بھی وہ جن میں صراحت سے کوئی حکم شرعی نہیں ملتا۔ بخلاف مذہب شیعہ کے، کہ ان میں اختلاف ہی اصولی ہے۔ اور بہت زیادہ ہے۔ ہر فرقہ دوسرے کو کافر اور گمراہ کہتا ہے۔ امامیہ کے بارے میں چنانچہ پھٹک سے پتہ چلا ہے کہ اثنا عشریہ ایک ہزار فروعی مسائل میں باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مسائل کے بارے میں امام کا حکم صریح موجود ہے۔ مثلاً شراب کا پاک یا ناپاک ہونا، اور اسی طرح کے دوسرے مسائل! ان کی نئی اور پرانی کتابوں سے جو واقف ہے وہ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ تو پھر مرتضیٰ جس کا لقب ہی علم الہدیٰ ہے، وہ مجتہد کیا مذہب کا بانی مبنی ہے ان باتوں سے کیسے بے خبر رہ سکتا ہے۔ لیکن تعصب اور عناد کی پٹی اس کی آنکھوں پر ایسی چڑھی ہوئی ہے کہ اسے یہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔ رہیں وہ دلیلیں اور جنہیں جو وہ ذمی کے منہ سے اگلاتا ہے اور جن کو اپنے خیال خام میں بڑی مضبوط اور قہر خیز خیال کرتا ہے وہی برتے برتائے مضامین اور گھسی پٹی دلیلیں ہیں جو معین کے پرلے چھیڑوں کی طرح اُجڑے ہوئے گھوروں اٹھا لایا ہے۔ بار بار انہیں کو دھوٹا ہے اور انہیں سے شیعہ فرقہ کے لئے نیا لباس بنا لیتا ہے۔ حالانکہ وہ ساری دلیلیں اہل سنت کے نزدیک کھڑکی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور اور شہوت کے پتے سے بھی زیادہ بودی ہیں۔ جن کو ان کے مکتب کے بچوں نے روند رکھا ہے۔ اور انگلیوں کے ناخنوں نے ان کا حال خستہ کر رکھا ہے۔

قیسواں دھوکہ :- ان کے علماء مذاہب اربعہ کو باطل ٹھہرانے میں ایک اور گہری چال چلتے ہیں وہ یہ کہ ایک مذہب کو تو اشاروں کنایوں اور پردہ و آڑ میں رد کرتے ہیں اور باقی تین کو کھلم کھلا۔ چنانچہ ان کے کسی عالم کی ایک کتاب اسی نوعیت کی میری نظر سے گزری ہے۔ اس میں اس کے شیعہ مصنف نے اپنے آپ کو شافعی المذہب ظاہر کیا ہے اور اپنی کتاب کی بنیادی تین مذاہب کو باطل ثابت کرنے پر رکھی ہے۔ اب جہاں شافعی مذہب کو صحیح ثابت کرنے کا موقع آتا ہے وہاں وہ ایسے کمزور اور ناکارہ دلائل اور ناقابل قبول قیاسات حجت میں لاتا ہے۔ اور دور دراز کی خیالی تاویلات پیش کرتا ہے کہ کوئی بھی اس کے ماننے پر ہرگز تیار نہیں ہوتا مثلاً قیاس طرز۔ قیاس شبہ۔ وغیرہ جو خود اخلاف کے ہاں غیر مستند اور درجہ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔ پھر قیاس کے خلاف ایک حدیث بیان

کرنا۔ اور خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ حدیث قیاس کے مخالف ہے اور جر حدیث مخالف قیاس ہو وہ متروک الظاہر ہوتی ہے (یعنی اس کے ظاہری معنی چھوڑ دئے جاتے ہیں) گویا اس کتاب کی تصنیف معنی یہی بتانے کے لئے ہوتی ہے کہ سنی قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ پس جب اس نے مذاہب ثلاثہ کو شافعی مذہب کے دلائل سے سر کر دیا۔ اور مذہب شافعی کو ایسے کمزور اور پوچھ دلائل سے ثابت کیا جو ہر سننے اور دیکھنے والا ان کے کمزور ناکارہ اور ناقابل استدلال ہونے کو اول نظر ہی میں جان لے تو لامحالہ اس چال کا یہ نتیجہ برآمد ہونا لازمی ہے کہ چاروں مذہب بیک وقت وہ یک نوح دیکھنے والے کی نظر میں پوچھ اور بے اصل ثابت ہو جائیں گے۔ یہ دھوکہ بہت پوشیدہ اور بہت ہوشیاری سے ترتیب دادہ ہے۔ اس لئے علمائے اہل سنت میں سے اکثر اس فریب میں آجاتے اور حیران و دم بخور رہ جاتے ہیں۔ اکتیسواں دھوکہ: شیعیہ فرقہ کا کوئی عالم فقہ میں کوئی کتاب تالیف کرتا ہے۔ جو اہل سنت پر لعن و طعن اور رد و قدح پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کی نسبت اہل سنت کے کسی امام کی طرف کر دیتا ہے مثلاً عنقریب جس کو امام مالک رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ ایک شیعہ کی لکھی ہوئی ہے اس میں یہ بھی لکھ مارا ہے کہ آقا کے لئے اپنے مملوک سے لواطت جائز ہے کیونکہ آیت وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ کے معنی بظاہر عام ہیں۔

پھر ایک معتبر شخص کے ذریعہ یہ خبر ملے کہ اس نے اصفہان میں اسی قسم کی ایک کتاب دیکھی ہے جسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور جو ناشائستہ اور نازیبا مسائل سے پُر ہے۔ اس دھوکہ کی اصلیت غالباً یہ ہے کہ ملک مغرب جہاں مالکی حضرات کی اکثریت ہے وہاں تو اس کتاب کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی تصنیف ظاہر کرتے ہیں اور ہندوستان و توران میں جہاں احناف کی اکثریت ہے اس کتاب کو امام مالک رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اہل سنت کو تو اپنے ہی امام کی روایات پر زیادہ عبور ہوتا ہے۔ دوسرے ائمہ کی روایات کی زیادہ کھوج کر بیدار تحقیق نہیں کرتے۔ اس لئے اس کی صداقت ان کے دل میں جلد بیٹھ جاتی۔

اس دھوکہ میں بھی اکثر اہل سنت کے جلیل القدر علماء بھٹس گئے ہیں۔ مثلاً متعہ کی علت امام مالک رحمہ اللہ علیہ کی طرف صاحب مدایہ نے بھی کر دی حالانکہ امام مالک رحمہ اللہ علیہ متعہ پر حد جاری کرنے کو واجب کہتے ہیں۔ بخلاف امام اعظم رحمہ اللہ علیہ کے کہ وہ حد کو واجب نہیں کہتے۔

تیسواں دھوکہ: شیعیہ علماء کی ایک جماعت بڑی سعی و کوشش سے اہل سنت کی تفاسیر اور سیرت کی ان کتابوں میں جو علماء اور طلباء میں بہت کم معروف و مشہور ہوں۔ یا نادر الوجود ہوں، ایسی جھوٹی باتیں ملا دیتے ہیں۔ جو شیعیہ مذہب کی تائید اور اہل سنت کے مذہب کی تردید کرتی ہوں۔

چنانچہ باغ فدک کے سہہ کا قصہ بعض تفاسیر میں داخل کر دیا ہے اور اس کی روایت یوں بیان کی کہ جب آیت ذَاتِ الْقُرْبَىٰ حَقُّهُ (اور دیکھو اقربا کو ان کا حصہ) نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کو بلایا اور باغ فدک ان کو عطا فرمایا۔

مگر اس کو کیا کیجئے کہ ان بد بختوں کو جھوٹ بولنا بھی نہ آیا۔ اور وہ یہ بھول گئے کہ یہ آیت تو مکی ہے یعنی مکہ کے قیام کے زمانہ میں نازل ہوئی ہے اس وقت باغ فدک ملا ہی کہاں تھا۔ وہ مکہ میں تو تھا نہیں۔

پھر آیت میں صرف ذوالقربی ہی کو دینے کا حکم تو نہیں تھا۔ مساکین اور ابن سبیل کو بھی بخشش و عطایں شامی کیا

گیا تھا۔ ان کو اس عطیے اور بخشش سے کیوں محروم رکھا گیا۔ اس آیت کے مطابق ان کو بھی توران کا حصہ دیا جانا چاہیے تھا تاکہ پوری آیت پر عمل ہو جاتا۔

علاوہ ازیں، اعطاء حاذق کے الفاظ سے بہتہ و تلبیک تو ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے توران رو دھبہ کا لفظ گھڑانا چاہیے تھا۔ مگر پھر یہ رسوائی اور شرمندگی انہیں کہاں ملتی؟
اسی طرح بعض اور کتب تفاسیر و سیرت میں اسی قسم کی جھوٹی ملاوٹ کا پتہ چلتا ہے اس جھوٹ میں بھی اکثر پیغمبر علماء سنت المجد جاتے اور ذہنی تشویش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے زمانہ میں امرامشیہ میں دو افراد، مرتضیٰ خاں اور مرید خاں نامی تھے، ان کا وطیرہ ہی یہ تھا کہ اہل سنت کی کتابوں مثلاً معراج ستہ، مشکوٰۃ یا بعض تفاسیر کو خوشخط لکھواتے اور امامیہ کی کتابوں سے اپنے مطلب کی کوئی حدیث لے کر ان میں شامل کر دیتے، پھر اس غلط طرہ کو جہدوں، اور آپ زر سے مزین کر کے نہایت کم قیمت پر گلی کو چوں میں فروخت کر دیتے۔ اور دھوکہ دہی کا یہ طریقہ آغا ابراہیم بن علی شاہ کے زمانہ میں جو سلاطین صفویہ میں کا بڑا بادشاہ تھا۔ اس کا ایک امیر اصفہان میں استعمال کرتا تھا۔ لیکن ان کا یہ دھوکہ کچھ چلتا نہیں اس لئے کہ اہلسنت کی جو مشہور معروف کتب ہیں وہ تو علماء و طلباء کے ہر دم زیر مطالعہ رہتی تھیں اور بکثرت شائع اور دستیاب تھیں اس لئے ان میں رد و بدل کچھنا مشکل تھا۔ اور اس کا پتہ بھی آسانی سے لگ سکتا تھا۔ اور جو کتابیں مشہور نہیں تھیں وہ ناقابل اعتبار سمجھی جاتی تھیں۔ اسی لئے محققین علماء اہلسنت نے غیر مشہور کتابوں سے نقل و حوالہ کو جائز نہیں رکھا۔ البتہ ترغیب یا خوف دلانے کے مسائل میں ان کو سابقہ انبیاء کے صحف کا سادہ درجہ دیا ہے، کہ ان میں رد و بدل اور تحریف کے احتمال کی وجہ سے ان سے عقیدہ و عمل کا کوئی مسئلہ نہیں لے سکتے۔

یتیمبیسواں دھوکہ بنایا ہے کہ روایات کی نقل میں خیانت سے کام لیتے ہیں، نقل تو کتب اہل سنت سے کرتے ہیں مگر بیچ میں کہیں اپنے مفید مطلب ایک دو لفظ ایسے بڑھا دیتے ہیں جن کا اصل کتاب میں نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ اب بعض اہل سنت اس نقل پر غور و فکر کئے بغیر دیکھتے ہیں، اور اس حوالہ کو وہ اصل کتاب میں بھی دیکھ چکے ہوتے ہیں، جعلی اور ملاوٹی الفاظ کا لحاظ نہ رکھنے کے سبب حیران و پریشان ہوتے ہیں چنانچہ علی بن عیسیٰ اردبیلی نے اپنی کتاب کشف الغمہ میں اور ابن مطہر علی نے اپنی کتابوں الیقین، منہج الکرامہ اور نہج الحق میں اسی نوع کی بہت سی نقلیں اور حوالے دیئے ہیں۔ لہذا اس دھوکہ سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔

چوتھیں سوال دھوکہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب میں ایک کتاب تصنیف کرتے ہیں۔ جس میں اہلسنت کی مسانید، سنن، اجزاء اور معاجم سے صحیح احادیث نقل کرتے ہیں، مگر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کرنے کا موقع آتا ہے تو خود گھڑ کر، یا امامیہ کی کتابوں سے نقل کر کے ایسی بات شامل کر دیتے ہیں جو خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی شان میں موجب قدر ہوتی ہے۔ یا ایسی صریح روایات بیان کر دیتے ہیں۔ جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احق بالخلافت ہونے کا مضمون ہوتا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہوتا ہے کہ اُن کی موجودگی میں جو خلافت کرے وہ ایسا ہے، ویسا ہے، تاکہ سامع و ناظر دھوکہ میں پڑ جائے اس لئے کہ وہ فضائل خلفاء میں اس کے بیان سے یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہ مصنف کوئی اہل سنت ہے۔ اور اس کا یہی یقین اس کو یہ خیال کرنے پر مجبور کرتا

ہے کہ اہل سنت کی تعانیف میں بھی ایسی احادیث موجود ہیں جو قیمنوں خلفاء کی شان میں قدح کا سبب ہیں۔ اور یوں اس کے دین و یقین دونوں کو سخت ٹھیس ملتی ہے۔

چنانچہ اسی نوعیت کی ایک ضخیم کتاب نظر پڑی، جس میں ہر حدیث کے شروع میں حدیث کے راوی اور اس کی تخریج کرنے والے کا نام درج تھا۔ اس دھوکہ میں بعض بلند مرتبہ علماء حدیث بھی اقبیاز نہ کرنے کے سبب پھنس گئے۔ اور فریب کو سمجھنے سے قاصر رہے! چنانچہ ریاض النضرہ فی مناقب العشرہ کے مصنف بھی اس دھوکہ میں آگئے اور اس قسم کی احادیث مجموعہ فضائل خلفاء اربعہ سے اپنے ہاں نقل کر بیٹھے۔ البتہ فن حدیث میں جن کی نظر گہری ہوتی ہے وہ اس چال میں نہیں آتا۔ کیونکہ من گھڑت اور خود ساختہ، پرداختہ الفاظ کی کمزوری، بڑا پن اور معانی کا کچھ نہیں، ان کے جھوٹ کا مہانڈا پھوڑ دیتے اور اس فریب کا پتہ دیدیتے ہیں۔ اور صاحب سلیقہ، اور باذوق آدمی پہلی ہی نظر میں تار جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی شیطان صفت شخص کی کارستانی ہے۔

پہلی تیسواں دھوکہ۔ پہلے زمانہ میں اہل سنت، شیعوں کے بعض گندے مسائل پر ان کو بدعت لعن طعن بتاتے ہیں اس لعن طعن سے بچنے کی علامت شیعوں نے یہ صورت نکالی کہ ان کتابوں کے نئے ایڈیشنوں سے ایسے مسائل کو بالکل نکال ڈالا اور کتابوں کے پرانے نسخوں کو چھپا دیا۔ اور پھر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ان مسائل کو اہل سنت کی طرف منسوب کر دیا۔ مثلاً اپنے مملوک سے لواطت کا مسئلہ، کہ اسے امام مالک رحمہ اللہ علیہ کی طرف اور "لف حمیر یا مادر و خواہر" (کہ مضمون عام پر ریشم لپیٹ کر ماں بہن کو بے حرمت کیا جاسکتا ہے) کا مسئلہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس قسم کے افراد آمیز مسائل، سید مرتضیٰ، ابن مطہر علی، ابن طاہر اور علی کے بیٹے نے اپنی کتابوں میں بہت نقل کئے ہیں۔ اور غرض صرف یہ ہے کہ ناک والوں کو نکٹا کہو، تاکہ اپنے نکٹے بہن کو چھپایا جاسکے اور اپنے سر سے لعن و طعن کا بوجھ اہل سنت کے سروں پر لا دیا جائے کہ اس کی جوابدہی وہ کریں، اور اس طرح ان سے ہمارا بیچا جھوٹ جائے۔

چھٹی تیسواں دھوکہ۔ اہل سنت کے مقتداؤں کے اشعار میں ملاوٹ اور جعل سازی بھی ان کی فریب کاری کا ایک طریقہ ہے۔ ان اشعار کے ہوزن و ہم قافیہ، ایک دو شعر اپنے مفید مطلب گھڑ کر، ان کے اشعار میں شامل کر دیتے ہیں، جن کا مضمون وضاحت سے شیعہ مذہب کی موافقت اور اہل سنت کے مذہب کی مخالفت کرتا ہے اور پھر بے شرمی اور ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت نے شرمندگی اور خفت سے بچنے کے لئے ان اشعار کو اپنی نظم سے نکال دیا ہے۔

اس قسم کی حرکت اکثر و بیشتر اہل سنت کے مشہور اور مقبول شعرائے کرام کے کلام میں کرتے ہیں مثلاً شیخ فرید الدین عطار، شیخ اوحیدی، شمس تبریز، حکیم سنائی، مولانا روم، حافظ شیرازی اور حضرت خواجہ قطب الدین دہلوی، وغیرہ ان سے قطع نظر پہلوں میں سے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی انہوں نے یہی سلوک کیا ہے، اور ان کے اشعار میں بھی اپنے گھڑے ہوئے اشعار غلط ملط کر دیئے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے یہ اشعار ہیں۔

يَا ذَا كِبَارٍ قَسَتْ بِالْمُعْتَبِ مَنِيَّ
وَاهْتَبِ رَسَاكِينَ خَيْبِنَهَا وَالتَّاهِيَّ
سَحَرًا إِذَا أَفَاتَى الْحَبِيبُ إِلَى مَنِيَّ
فَنَبْنَا لَمَلْتَلَطَمَ الْفَرَاتِ الْقَائِيَّ
إِنْ كَانَ بِرَفْنَا حَبَّ إِلَى مَعْتَدٍ
فَلْيَشْهَدْ الثَّلَاثُونَ أَهْلِيَّ رَافِعِيَّ

(۱) اے شہزادہ سوار، منیٰ کی مد پر راوی مصعب میں ٹھہر کر نشیب میں رہنے والوں کو پکارا، اور وہاں سے اٹھنے والے۔

(۲) حجاج کو جو صبح کے وقت نہر فرات کے پانی کی طرح در موج در موج منیٰ کی طرف رواں دواں بہتے ہیں بتا۔

(۳) کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اہل بیت سے محبت رفس ہے تو میں جن دانس کو گواہ بنا کر اعلان کیا کہ میں رافعی ہوں۔
نرا مصعب، اور خارجی منس منور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت رکھنے والے کو رافعی کہتے تھے ان اشعار میں امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے ان کو مقابلہ میں لگا کر ہے۔

مگر شیعوں کی بد باطنی اور مرقہ سے غلط فائدہ اٹھانے کی غصلت دیکھئے کہ چند ابیات اپنی طرف سے گھر کر نہیں
سہی امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے سر منڈھ دیا۔ اور شرم و حیا بلائے طاق رکھ کر انہیں اشعار کی بناء پر امام صاحب موصوف
کو بھی شیعہ ثابت کرنے لگے، وہ جعلی اشعار یہ ہیں۔

فَقْتُ نَوَادٍ بِأَسْتَوِي لِمُحَمَّدٍ
وَدَوَّيْتُهُ وَبَيْنِيهِ لَسْتُ بِبَاغِيٍّ
أَخْبِرْهُمْ أَفِيٍّ مِنَ النَّفَرِ الَّذِي
يُولِيهِ أَهْلُ الْبَيْتِ لَيْسَ بِبَاغِيٍّ
وَقُلْ ابْنُ إِدْرِيسٍ يَتَقَدَّرُ لِي الَّذِي
قَدْ مَنَعُونِي عَلَى عِلِّيٍّ مَارِيٍّ

(۱) اس کے بعد یہ بھی پکارا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے دمی، اور دمی کے بیٹوں سے بغض نہیں رکھتا۔

(۲) اور یہ بھی بتا دے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں جو اہل بیت سے رشتہ توڑنے والے ہیں۔

(۳) اور یہ بھی کہہ کر ابن ادريس (شافعی) اسے پسند نہیں کرتا کہ ملی (رضی اللہ عنہ) پر کسی کو ترجیح دے۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے اصل کلام اور ان گھڑے ہوئے اشعار میں جو فرق ہے وہ عربی زبان کے ماہرین پروردگار
کی طرح عیاں و ظاہر ہے۔ اور ان کی یہ دھوکہ بازی بیہودہ اور لچر ہے۔ اس لئے کہ ان بزرگوں کا تو تمام کام، اور بناء
شریعت و طریقت اور سرتاپا اہل سنت کے مذہب پر ہے۔ پھر معنی ایک دو شعر کی وجہ سے ان کو شیعہ سمجھنا ایسی حماقت
ہے۔ جس کی توقع کسی طفل مکتب سے بھی بعید ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایسا بھی کرتے ہیں کہ کسی کے اشعار میں طلاق کئے
بغیر ان کا کوئی شاعر خود اپنے کہے ہوئے اشعار کو اہل سنت کے کسی بزرگ شاعر کی طرف منسوب کر کے انہیں ان اشعار
کا مصنف بنا دیتا ہے۔ مثلاً ان شیعوں کی کتابوں میں ان اشعار کو امام شافعی کے اشعار بتا کر درج کر دیا گیا۔

شَفِيعِي مَنِيٍّ وَالسُّبُوتُ لِحَيْدَرٍ
وَسَبْطَاةٌ وَالتَّحَارُّ وَالْبَاقِرُ الْمَجْدِيُّ
وَجَعْفَرُ وَالتَّائِي بِبَعْدِ أَدَّ وَالرَّهْمَا
وَقَلْدِيَّةٌ وَالْفُسْكَوَيَانِ وَالْمَعْدِي

(۱) میرے شفیعی منی، بتول اور حیدر ہیں، اور ان کے دونوں نواسے اور ستاد و باقر سخی (بھی)

(۲) اور بغداد کے رہنے والے جعفر اور علی رضا اور ان کے دونوں بیٹے، عسکری و مہدی ! (یہ سب میرے شفیعی ہیں)

اب قدرت کی طرف سے اس جھوٹ کی پردہ دری ملاحظہ ہو، کہ تاریخ ان کی عقلوں پر ماتم کر رہی ہے۔
امام علی نقیؑ ۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے، اور امام حسن عسکری کی پیدائش تو ان کے بھی بہت بعد کی ہے۔ اور امام تقی

کی وفات سنلہ میں ہوئی اور وہ کربخ میں مدفون ہوئے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کی وفات سنلہ میں ہو چکی تھی، تو کیا ان حضرات کی مدح میں یہ اشعار دوبارہ زندہ ہو کر کہے، اس کے علاوہ امام حسن عسکری کا قیام سرمن رائے میں تھا جسے اب سامترہ کہتے ہیں اور جو معتصم کا بسایا ہوا تھا۔ حالانکہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے معتصم کا زمانہ پایا ہی نہیں۔ سچ ہے دروغ گوراء حافظہ نباشد، (اور خیر حافظہ نباشد میں تو گنہائش ہے اور بھول چوک کہہ کر معاملہ رفع دفع ہو سکتا ہے مگر یہ مکار اور عیار گروہ تو یہ سب کچھ جانتے ہو جھٹے، دھڑے سے ملی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ لعنت الہی اس کا محبوب طرہ امتیاز ہے۔ نعمانی)

البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کو اپنے زمانہ میں جن اہل بیت کرام کا پتہ چلا تو ان کے فضائل و مناقب انہوں نے بیان کئے ہیں، اور یہ بات امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ تمام اہل سنت نے ان کی مدح سرائی کو ایک عبادت سمجھا ہے۔ اور اہل سنت کی کتابوں میں ائمہ کرام رحمہم اللہ سے بہت سی احادیث کی روایت کی گئی ہے اور اہل بیت کے اسی سلسلہ روایات کو سلسلۃ الذہب کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(انوار اودھو کہ دہی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہم نامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کفریہ اور شرکیہ مضامین پر مشتمل اشعار کو بزرگان اہل سنت کی طرف نسبت دینے کو بڑی شہرت دیتے ہیں، مثلاً فارسی کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔

شاہ است حسین الخ اس رباعی کو سرگروہ چشتیاں خواجہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ اور کیا غوام اور کیا خواص، سب کے سب اس رباعی کو خواجہ صاحب کلام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس رباعی کے مضمون کو دیکھتے ہوئے معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ خواجہ اجمیری رحمہ اللہ علیہ ایسے جاہلانہ عقیدے سے ہزار بار پناہ مانگتے ہیں۔

یہ اشعار دراصل ایک ایرانی شاعر معین الدین حسن سنجر نامی کے ہیں جو شیعہ تھا! اور اہل سنت نادانستہ طور پر اور شیعہ دانستہ طور پر خواجہ اجمیری رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نعمانی)

سینتیسواں دھوکہ۔ حاجب شیعوں نے تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ پڑھا کہ بعض عرب کاہنوں ستارہ شناسوں اور دانشمندان نے اہل کتاب سے معلوم کر کے یا علم نجوم کی مدد سے، جو کہ اس وقت تک حقیقت کے کچھ قریب تھا اس لئے کہ اس وقت تک شیطانوں کو کن سوئیاں لے کر آسمانی باتوں کی سن گن لینے کی ممانعت نہیں کی گئی تھی۔ بت پرستی چھوڑ دی تھی اور نبی موعود کے لئے چشم براہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبریں سنایا کرتے اور لوگوں کو ترغیب دلایا کرتے کہ جب آپ تشریف لے آئیں تو آپ کی متابعت کی سعادت سے مستفید ہوں۔ تو ان شیعوں کی رگ جلسازی پھڑکی اور ان قصوں کے ضمن میں چند ایسی باتوں کا بھی اضافہ کر دیا جن سے مذہبِ دفع کی تائید ہوتی ہو، اور اس کو اسی مرد جاہل کے سر تھوپا۔ بعض جگہ اسی قول کی تصدیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا پیوند بھی لگا دیا۔ اور پھر ان روایات و حکایت پر فخر کرتے اور خوشی سے بغلیں بجاتے۔ ایسی ہی باتوں میں سے بارودِ عہدی کا ایک قصہ ہے، جو ان کی کتابوں میں مشہور و معروف ہے اور ان کی حدیث کی کتابیں بڑے طعرات اور دھوم دھڑکے سے بیان کیا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

بارود و جہدی ایک نسرانی شخص تھا جو سال صلح حدیبیہ میں اسلام لایا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ اشعار بھی کہے ہیں، ان میں کا ایک شعر یہ ہے۔

أَنَا لَا أَذْكُرُكَ بِاسْمِكَ فِينَا ۖ وَبِاسْمِهِ أَوْصِيَاءُ حَكَمِهِ

یعنی ہمارے اگلوں نے ہیں آپ کے نام سے آگاہ کیا۔ اور آپ کے بزرگ وصیوں کے نام بھی۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسا ہے جو قیس بن ساعدہ کو جانتا ہو؟ بارود بولا حضرت یوں تو ہم سے ہر شخص اس کو جانتا ہے مگر میں اس کے حالات اور پردہ واقعات سے بخوبی واقف ہوں، اس مجلس میں حضرت سلمان فارسی بھی موجود تھے۔ انہوں نے بارود سے کہا کہ ہم کو اس کا کچھ مالہ اشعار سناؤ۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی خواہش ظاہر فرمائی تو اس نے کہا۔

يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي شَرَدْتُ قِتَاوَةً وَخَرَجْتُ مِنْ نَادٍ مِنْ
أَنْدَلِيَّةٍ أَيْدِي إِلَى صَحْصَحٍ ذِي قِتَادٍ وَشَمِيرٍ وَبِتَادٍ وَهُوَ
مُسْتَقِيلٌ بِنَجَادٍ فَوَقَفْتُ فِي أَضْجِيَانٍ اللَّيْلُ كَالشَّمْسِ لَافِعًا
إِلَى السَّمَاءِ وَجَهَتُهُ وَأَصْبَعُهُ نَدْوُونٌ مِنْهُ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ
اللَّهُمَّ رَبَّ السَّمَوَاتِ الْأَرْفَعَةِ وَالْأَرْضَيْنِ الْمُرْتَعَةِ
يُحَقِّقْ مُحْتَمِلَهُ وَالْثَلَاثَةَ الْحَامِيْدَةَ مَعَهُ وَالْعَلِيَيْنِ الْإِزْبَةَ
وَقَاطِمَةَ وَالْحُسَيْنِ الْأَبْرَعَةَ وَجَعْفَرَ وَمُوسَى الشَّيْعَةَ
سَمِيْعَ الطَّلِيْعَةِ الضَّرْعَةَ أُولَئِكَ التَّقِيَاءُ الشُّفْعَةُ وَ
الْعُرْفُ الْمَقْبِيْعَةُ دَرَسَةُ الْأَنَارِ جِلْدٌ وَنَفَاةٌ أَلَا بِأَطِيلُ
وَالصَّادِقُ الْقِيلُ عَدَدُ النَّقْبَاءِ مِنْ بَنِي إِسْرَاطِيلَ
فَهُمْ أَوَّلُ الْبَدَلِيَّةِ وَعَلَيْهِمْ تَقْوَمُ السَّاعَةُ وَرَاجِعُ
تَنَالِ الشُّفَاعَةِ وَكَلِمَةُ مِنْ اللَّهِ فَرَمَ الطَّاعَةَ اسْقِنَا
غَيْثًا مَقْبِيْنَا ثُمَّ قَالَ لَبِثْتُ أَدْبَرَ كَهْمُ وَلَوْ بَعْدَ لَدَيْهِ
عُمَيْرِي وَمَحْيَايَا ثُمَّ أُنْشَأَ يَقُولُ أَقْسَمُ قَسْمًا
لَيْسَ بِهِ مَكْلَبٌ لَوْ مَا شِئْتُ أَلْفِي سَنَةٍ لَوْ بَلِيْنٌ مِنْهُمْ سَاءَ
مَآحِقِي يَلَاقِي مُحْتَمِدَ النَّجِيَاءِ الْحُكَمَاءِ هَمُّ أَوْصِيَاءِ
أَحْمَدُ أَفْضَلُ مَنْ نَعَمَتِ السَّمَاءُ لِعَمِي الْأَنَامِ عَنْهُمْ
وَهُوَ ضِيَاءُ الْعَمَى لَسْتُ بِنَاسِي ذِكْرِهِمْ حَتَّى أَهْلَكَ
الرَّحْمَنُ مَا قَالِ الْجَارُودُ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي نَا
بِغَيْرِ هَذِهِ الْأَسْمَاءِ الَّتِي لَوْ تَشْهَدُهَا وَآمَنَتْهَا
قَسْمٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا جَارُودُ

یعنی جب قس قوم آیادی کی کسی مجلس سے ایک ایسے فراخ میدان کی طرف باہر نکلا جس میں قِتَاد۔ میوہ اور اسباب کے درخت تھے تو میں اس کے پاس ہی تھا، وہ پرندہ ڈلے ہوئے چاندنی رات میں اس طرح کھڑا تھا جیسے آسمان میں سورج۔ اس کا چہرہ اور انگلیاں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں میں اس کے کچھ اور قریب ہوا تو اس کو یہ کہنے ہوئے سنا۔ اے خداوند برتہ آسمانوں اور کاشت شدہ زمینوں کے مالک پروردگار، بحرمت خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور ہر سر محمد و ہر چہار علی فاطمہ، حسین کا ملین، جعفر اور موسیٰ جو سب کے تیور سے بلند مقام ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے مہنام یہ سب سرداروں کا گروہ ہے۔ شفاعت کرنے والے اور وحی کی سیدھی راہ کی طرف بلانے والے، جھوٹ کو مٹانے والے، سچ کہنے والے، جن کی تعداد سرداران اسرائیل سے ملتی ہے انہیں سے دنیا کی ابتدا ہے اور انہیں پر قیامت قائم ہوگی، شفاعت یہی کریں گے اور اللہ کی طرف سے ایسی اطاعت فرض ہے پس نصیب کر ہم کو فریاد کو پہنچنے والی بارش، پھر کہا کاش میں ان کو پاتا اگر چہ میری عمر اور زندگی کے بدلے میں وہ ملتے۔ پھر کہنے لگا کہ قیس صاف قسم کھاتا ہے کہ اگر یہ دو ہزار برس بھی زندہ رہے تو بھی ان سے تنگ دل نہ ہوگا، یہاں تک کہ ملاقات کرے محمد سے۔ وہ لوگ شرفاء ہیں، حکماء اور وصی، آسمان کے، نیچے سب سے زیادہ بزرگ۔ لوگ ان کی طرف سے اندھے ہیں اور یہ لوگ

بینائی کے نور نہ آگہ میں تہر ہیں نہ آؤں۔ ان کی یاد بھلانے والوں میں سے نہیں۔ جاردو نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی مجھے ان ناموں سے آگاہ فرمائے جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ پس ہی نے مجھے ان کے حالات سے واقف کرایا ہے حضور نے فرمایا اسے جاردو معراج کی رات اللہ کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی کہ ان پیغمبروں سے پوچھئے جو آپ سے پہلے مبعوث ہوئے کہ آپ کی بعثت کس پر ہوئی

میں نے کہا کس پر ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کی بعثت پر، اور علی اور ان کی اولاد میں سے ائمہ کی ولایت پر پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کے نام بتائے اور پھر یہی نام امام مہدی تک بالترتیب حضور نے مجھے بتائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے دوست ہیں اور یہ (مہدی) میرے دشمنوں سے بدلہ لینے والے ہیں۔

اب اس روایت کا تجزیہ کیا جائے تو بناوٹ، جھوٹ کے آثار اتنے واضح اور صاف ہیں گویا وہ خود بیاگنگ اصل اپنی تردید آپ کا مصداق ہیں۔

ماہر عربیت کو اس روایت کے الفاظ کا پھس پھسا پن اس کے من گھڑت ہونے کی جعلی کھاتا نظر آتا ہے کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلیغ سے ادنیٰ مناسبت بھی نہیں رکھتے۔ دوسری بات یہ وہی جاردو تو ہے جس کا بیٹا منذر نامی جناب امیر کی خلافت میں عامل تھا اور وہ تمام متعلقہ علاقوں کا خراج وصول کر کے فرار ہو گیا اور جناب امیر کے دشمنوں سے جا ملا۔ جناب امیر نے سرزنش و ملامت کے بہت سے خطوط لکھے۔ مگر اس نے کسی ایک کو بھی قابلِ توجہ نہ سمجھا اور ساری رقم منہم کر گیا۔

اب سوچئے کی بات یہ ہے کہ اگر اس کا باپ جناب امیر رضی اللہ عنہ اور آپ کی اولاد سے اتنا واقف اور متفق تھا۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو آپ کی جلالت شان سے واقف نہ کر دیا ہو۔ اور پھر ایسے باپ کا بیٹا ان کے ساتھ ایسی غداری کرنا اور بے حیائی سے پیش آتا۔ پھر اسی جاردو کے بیٹے نے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا مصاحب خاص تھا اور شاگرد بھی۔ اس نے ائمہ اطہار سے علم کیوں حاصل نہیں کیا۔ انس بن مالک کی شاگردی ہی پر قانع ہو کر کیوں بیٹھ رہا۔

صمیم اور قابلِ اعتبار کتابوں سے جاردو کا صرف اتنا سا حال معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کہا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَقَدْ وَجَدْنَا وَصْفَكَ فِي الرَّحِيلِ - وَلَقَدْ بَشَّرْنَا بِكَ ابْنَ الْمُبْتَلِ - (اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ آپ کا وصف ہم نے انجیل میں موجود پایا اور ابن مریم علیہ السلام نے ہم کو آپ کی بشارت دی)۔ البتہ قس بن ساعدہ الیادی کا حال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یوں معلوم ہوا ہے۔

قَالَ ابْنُ وَثَّاقٍ بَحْرُ بْنُ دَاوُدَ قَدِمُوا عَلَيَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا فَزَعُونِي مِنْ حَوْضِ الْجَمْعِ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ يُنْكِرُ أَحَدٌ يُخْرِفُ قَسَ بْنَ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بکرون داتل کا ایک وفد آیا جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کیا تم میں سے کوئی قس بن

سادہ کو جانتا ہے انہوں نے کہا ہم سب اس کو جانتے ہیں۔
 آپ نے فرمایا اب اس کا کیا حال ہے۔ وہ کہنے لگے اس کا تز
 انقال ہو گیا۔ اس پر آپ نے فرمایا، میری نظروں میں وہ نظر
 ابھی تک ہے کہ وہ عکاظ میں سرخ اونٹ پر بیٹھ کر وہ کہہ رہا
 ہے۔ لوگو! آؤ، سنو اور یاد رکھو کہ جو زندہ ہے وہ مرے گا
 اور جو مر گیا وہ فنا ہو گیا۔ اور جو آنے والا ہے وہ ضرور آئے
 گا۔ البتہ آسمان میں بھلائی ہے اور زمین کی عبرتیں! ایک
 ستون ہے گڑا ہوا۔ اس پر چھت ہے ڈالی ہوئی سمندر موج
 ہے! سوراہے بے نقصان! رات اندھیری ہے اور آسمان پر
 والا ہے اور قس قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس وقت اگر کام میں خوشی
 ہے تو بعد میں اس میں ناخوشی ہوگی اور اس اللہ کے نزدیک
 جس کی قدرت سب پر غالب ہے ایک دین ہے جو اس کو
 تمہارے دین سے زیادہ پسند اور محبوب ہے۔ کیا بات ہے
 کہ میں لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ دنیا سے چلے جا رہے ہیں
 اور پھر واپس نہیں ہوتے۔ کیا ان کو کوئی ایسی پیمبری ہے
 کہ وہیں رک گئے! یا معاف کر بیٹھے گئے تو سکون سے وہیں
 سو رہے۔

سَاعِدَةً الْاَيَادِي قَالُوا قُلْنَا نَعْرِفُهُ قَالِي مَا فَعَلَ قَالُوا
 هَكَذَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ سَلَامٌ كَأَنِّي بِهِ عَلَى
 جَبَلٍ أَحْمَرٍ يَمْلَأُ قَائِمًا يَقُولُ أَيُّهَا النَّاسُ اجْتَمِعُوا
 وَاسْمَعُوا وَذَمُّوا فَمَنْ مَاتَ وَكُلَّ مِنْ مَاتَ وَكُلَّ مِنْ مَاتَ وَ
 كُلُّ مَا هَوَاتِ ابْتِ بِنِ فِي النَّسَاءِ لَخِيرًا وَإِنْ فِي الْأَرْضِ مِنْ
 لَعِينٍ أَعْبَادٌ مُؤْمِنُونَ وَسَقَتْ مَرْحُوعٌ وَبِحَارٌ تَمُوتُ مَرْدُ
 فِجَارَةً لَكِنِ تَبُورُ۔ كَيْلٌ دَاوَجٌ وَمَكَاوُ ذَاتُ أُنْمَاوَجٍ أَهْشَعُ
 هَشٌّ حَقًّا لَكِنِ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَرَضَى لِيَكُونَنَّ بَعْدُ فَاسْخَطَ
 وَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ فَتَدْرَأُ نَهْ وَيُنَافِهُ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ
 وَيُنَكِّرُ الَّذِي أَنْتَعَرُ عَلَيْهِ مَا فِي أَرْضِ النَّاسِ يَذْهَبُونَ
 وَلَا يُرْجَعُونَ أَرْمَنُوا أَفَاقًا مَوْأَمَرُ كُتُوفًا مَوْأَمَرُ
 أَشَدُّ أَكْبَرُ بِكُورٍ شَدِيدًا كَانَ يَحْفَظُ لَهَا۔ بَيْتُ
 فِي الذَّاهِبِينَ الْأَوَّلِينَ مِنَ الْقُرُونِ لَنَا بَصَائِرُ
 كَمَا دُرَيْتُ مَوَارِدُ لَكُنْتُ لَيْسَ لَهَا مَصَادِيرُ
 وَرَأَيْتُ كُنْزِي خَوْفًا يَسْعَى الْأَصَانِدُ وَالْأَكَاوِرُ
 لَا يَرْجِعُ الْمَاخِضُ إِلَى وَلَا مِنْ بَاقِيْنَ غَنَائِسُ
 أَفَقْتُ أَثَرِي لَا مَعَالَةَ حَيْثُ مَصَارَ الْقَوْمِ مَصَارُ

پھر بکر نے ایک شعر پڑھا جو اس کو یاد تھا۔ (ترجمہ یہ ہے)

”پچھل صدیوں کے گزرے ہوئے لوگوں میں ہمارے لئے عبرت و نصیحت ہے کہ موت ایک دن آئے گی،
 اور اس پر اترنے کی جگہ تو ہے مگر واپسی کی جگہ نہیں اور میں نے دیکھا کہ میری قوم کے چھوٹے اور بڑے اسی
 کی طرف دوڑے جا رہے ہیں نہ گیا ہوا کوئی نوٹا ہے اور نہ ہی بغیر میں سے کوئی باقی رہے گا۔ تو میں نے
 یقین کر لیا کہ میں بھی ضرور وہیں جاؤں گا جہاں میری قوم چلی گئی“

اب اس عبارت اور پچھل جہد میں جو قس کی بتائی جاتی ہے زمین و آسمان کا فرق ہے عربی لغات کا انباء لگا دیے
 سے بھی کہیں کلام میں بلاغت پیدا ہوتی ہے، قس کا شمار عرب کے چوٹی کے بلفاد میں تھا اور پچھل عبارت میں بلاغت و
 فصاحت کا شاہد تک نہ تھا صرف قاسم کے لغت اکٹھے کر بیٹھے گئے اور اس اور جن کو فصاحت و بہت میں ذرا بھی دلکے حصہ والے ہوئے ہیں
 واصل وہ قطعہ سرتاپا، من گھڑت اور جھوٹ کی پوٹ ہے۔ اس کے جھوٹا ہونے کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ جناب
 امیر اور آپ کی اولاد کی ولایت شب معراج میں طے پا جاتی تو مسعودی علیہ وسلم بالتفصیل اور بالترتیب ان ائمہ
 کے نام بتاتے اور وہ بطریق تواتر ہم تک پہنچتے جس طرح نماز کی فرضیت اور دیگر واقعات معراج بوضاحت بیان فرماتے
 اور وہ بطریق تواتر ہم تک پہنچے، یا کم از کم جناب امیر اور آپ کا خاندان تو اس سے مطلع ہوتا تاکہ یہ پھر امامت کے معاملہ

میں آپس میں نہ جھگڑتے۔ اور اگر کتب سابقہ میں یہ قلعہ مذکور ہوتا تو یہود و نصاریٰ تو باخبر ہوتے، بلکہ جاہلیتِ اولیٰ کے عربوں کو بھی ضرور اطلاع ہوتی۔ اور وہ اس کی خبر دیتے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ شیعوں کے سارے فرقے یہ روایت بیان کرتے اور کیسیانیہ، اکامیلیہ، واقفیت، زیدیہ، اس معاملہ میں اثنا عشریوں کے ساتھ موافق ہوتے۔

اس کے علاوہ اسی شخص کی طرف منسوب کردہ کلام میں ائمہ کی طرف نفیۃ الالبابیل سے کی گئی ہے۔ یعنی برائیوں اور لغویات کے مٹانے والے، جب کہ ان حضرات کرام کو تو باطل کے مٹانے کی قدرت ہی حاصل نہ ہو سکی اس لئے کہ اثنا عشری شیعوں کے گمان و خیال کے موافق تو ان حضرات کی ساری زندگی تقیہ اور دشمنوں کے خوف میں بسر ہوئی۔ ان کے زمانہ میں عباسی اور مروانی لغویات کا رواج و چرچا ہوتا رہا۔ مگر یہ ایک حرف زبان سے نہ نکال سکے۔

اسی طرح ان کو صادق الثقیل (کہ وہ سچ بولنے والے ہیں) کہا گیا۔ حالانکہ بقول ان ہی شیعوں کے کہ تقیہ کی وجہ سے ان ائمہ کو عمر بھر حرف سچ زبان پر لانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

پھر ان کی مدح میں درستہ الانجیل (انجیل کے پڑھنے پڑھانے والے ہیں) کے الفاظ بھی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک صاحب سے بھی انجیل کا پڑھنا پڑھانا ثابت نہیں۔

اثر تیسواں دھوکہ کہ یہ ہے کہ ایک گھڑی ہوئی حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کا مفہور یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیخان علی کے کسی چھوٹے بڑے گناہ کے بارے میں اُن سے باز پرس نہیں کی جائے گی۔ بلکہ ان کی برائیاں اچھائیوں میں بدل دی جائیں گی۔ نیز یہ بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا أُعَذِّبُ أَحَدًا دَانِيًا عَلَيًّا وَلَا مَعْصِيًا۔ (علی سے محبت والوں میں سے میں ایک کو بھی عذاب نہیں دوں گا خواہ اس نے میری نافرمانی ہی کی ہو۔)

ان گھڑی ہوئی روایات نے ہوا و حرص کے بندوں، آزاد خیال لوگوں کو گمراہی کی کھل چھوٹ دے دی۔ اب وہ دھڑکے سے بدکاریوں کے مرتکب ہوئے اور خوب داد عیش دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس سند موجود ہے۔

کیا یہ احمق اتنا نہیں سمجھتے کہ جن بزرگوں سے صرف اظہارِ محبت جو بعض زبانی و کلامی ہے۔ گناہوں کو نیکیوں میں بدل سکتا ہے تو ان بزرگوں اور پاکباز بہتیموں کو خود طاعت و بندگی کی تکلیف و مشقت برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ہمیشہ گرفت اور باز پرس کے خوف و ہراس میں زندگی کیوں گزارتے۔

اگر باءِ اہلِ خاندان، احباب، خدام اور تبعین کو طاعت و عبادت کی ترغیب و تحریص کیوں دلاتے، کیوں تاکید فرماتے؟ گناہ اور محرکات کے ارتکاب پر دھکیاں دیتے اور سختیاں کیوں کرتے اور شروع ہی سے لوگوں کو نماز، روزہ، حج اور جہاد اور دوسری مشقتوں کے لئے کیوں دعوت دیتے۔ اور ان کی طبعی خواہشات و مرغوبات کے چھڑانے کا سبب کیوں بنتے؟ نجات کا آسان و قریب ترین راستہ صرف محبت کیوں نہ بتا دیتے؟ اور اسی کو نجات کا دار و مدار اور دعوت کا مقصد اصلی کیوں نہ ٹھہرنے کا آسان راستہ ہوتے ہوئے مشکل راستہ اختیار کرنے کا الزام لازم نہ آتا۔ اور مصلحین کے حق میں اختیارِ مصلح کا اصول بھی لامتناہی سے نہ جاتا۔

اسی طرح قرآن مجید میں باوجود انتہائی رحمت و شفقتِ الہی کے نجات کے اس راستہ کا پتہ کیوں نہیں دیا۔ اور دعوت کو اعمالِ طاعت و تقویٰ کے تنگ دائرہ میں کیوں محصور رکھا؟

حاصل کلام یہ کہ ان افتراء آمیز روایات سے ان کی غرض یہ ہے کہ شریعت کے احکام کا شیرازہ بکھیرا جائے۔ اور اس کے بجائے لادینییت اور لاندہبیت کو رواج دیا جائے۔

انسالیسواں دھوکہ ہا یہ ہے کہ شیعہ کہتے ہیں: "اہل بیت کے بارے میں یا خاص طور سے امامت و فضائل اہل بیت کے سلسلہ میں جو آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی صحت پر دونوں فریقوں سنی و شیعہ کا اتفاق ہے۔ اللہ جلالتہ ثلاثہ رضوان اللہ علیہم یا خلافت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ مختلف فیہ ہے۔ اب عقل کا تو یہ تقاضا ہے کہ جن باتوں پر اتفاق ہے ان کو لے لیا جائے، اور مختلف فیہ کو ترک کر دیا جائے تاکہ تردد اور شک سے بچ جائیں۔ اور حدیث دَعَا مَائِدَہٗ یُرِیْکَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْکَ (مشکوٰۃ) بات کو چھوڑ کر یقینی بات اختیار کرو، پر بھی عمل ہو سکے۔"

د الزنا ہم کہتے ہیں کہ شیعوں کا مذکور بالا شبہ یہود و نصاریٰ کا چر بہ ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت، فضائل و مناقب پر یہودیت، نصرانیت اور اسلام، تینوں مذاہب کا اتفاق ہے، اور نبوت، فضائل و مناقب پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر اختلاف، عقلمندوں کو چاہیے کہ متفق علیہ کو لے لیں اور مختلف فیہ کو چھوڑ دیں۔

اور پھر خراج کا نظریہ اور شبہ بھی اسی طرح کا ہے وہ بھی کہتے ہیں کہ حضرات شیعیان رضی اللہ عنہما کی خلافت اور ان کے خلافت اور ان کے مناقب پر ان کے زمانہ میں سب متفق تھے ان کے ساتھیوں میں سے نہ کسی نے مخالفت کی، نہ ان کے خلاف بغاوت کی اور نہ ان کی شان میں لعن طعن کی زبان دراز کی۔ اب عرصہ دراز اور مدت مدید کے بعد جب کہ جھوٹ پھیل چکا ہو ان پر کوئی تہمت دھرے اس کا کوئی اعتبار نہیں، اسے نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ ان پر اقتبا نہ کرنے والوں سے وہ زمانہ تو دیکھا ہی نہیں، صرف یہ کھڑی ہوئی جھوٹی باتیں سن کر براعتقاد میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے برخلاف حضرات حسین رضی اللہ عنہما کی خلافت خود ان کے زمانہ ہی میں مخالفتوں اور جھگڑوں کا شکار ہو گئی اور اور ان کے ساتھی بلکہ ان کے عزیز و اقارب اور اہل خاندان ان کی خلافت کے منکر ہوئے اور ان کی زندگی پر طعن کرنے لگے۔ اور تقاضائے عقل یہ ہے کہ متفق علیہ کو لے لیا جائے مختلف فیہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔"

اس قسم کے سارے شکوک و شبہات کا جو شیعہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جواب صرف ایک ہے وہ یہ کہ متفق علیہ کو لینا اور مختلف فیہ کو چھوڑ دینا عقلاً اس وقت ضروری ہوتا ہے جب ان دو باتوں پر سوائے اتفاق و اختلاف کے کوئی اور دلیل موجود ہی نہ ہو۔ اور اگر کوئی قوی دلیل ایسی مل جائے جو کسی ایک جانب کو ترجیح دیتی ہو، تو پھر اتفاق و اختلاف والی صورت سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ اسی قوی دلیل کو قابل اتباع اور لائق حجت مانا جائے گا۔ کیونکہ حق بہر حال حق ہے۔ اگرچہ اس کے حامی و مددگار محسوس ہی ہوں، اور باطل باطل ہی ہے چاہے اس کے، نقل کرنے والے بکثرت کیوں نہ ہوں۔

اور کاش شیعہ حضرات اپنے مقرر کردہ اس قاعدہ و اصول پر جمے رہیں مگر ان کا حال تو اس آیت کا مصداق ہے کہ یَقُولُونَ مَا لَا یَفْعَلُونَ (یہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں) خود ان کے فقہ کا مقرر اور تسلیم شدہ یہ اصول و قاعدہ ہے کہ جب ائمہ سے دو روایتیں منقول ہوں۔ ایک عام خیال کے مخالف، دوسری موافق۔ تو مخالفت روایت کو لینا چاہیے نہ کہ موافق کو، اس لئے کہ حقیقت کی بناء مخالفت عام

ہی پر تو ہے۔

ان کے اس مقررہ اصول پر غور کر کے ذرا ان کی سوچ بوجھ، فہم و فراست اور عقل و دانش کا اندازہ لگا لیا جائے۔ آگے چل کر ہم انشاء اللہ باب امامت اور باب مطاعن میں وضاحت کے ساتھ آپ کو بتائیں گے کہ خلفائے ثلاثہ، بلکہ تمام صحابہ کرام۔ رضوان اللہ علیہم کے فضائل و مناقب پر سنی اور شیعہ روایات، سب کا اتفاق ہے۔ اور ان بزرگوں کی برائیاں صرف بعض شیعی روایات میں آئی ہیں۔ ایسی صورت میں اب عقل کا کیا تقاضا ہے، وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

چالیسواں دھوکہ ہاشیہ مذہب کو حتیٰ ثابت کرنے اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے کا یہ اندکھا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ”شیعوں کو یقین ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے مگر اہل سنت کو اپنے بارے میں دونوں باتوں پر یقین نہیں ہے اور اپنے متعلق یقین رکھنے والا اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اپنے متعلق شک رکھنے والے کے مقابلہ میں اس کا اتباع اور پیروی کی جائے۔“

شیعوں کا یہ استدلال بہت ہلکا ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت عمومی طور پر تو اس میں ہرگز شک نہیں کرتے کہ وہ ہر شخص جو ایمان صحیح اور عمل صالح پر مرنے والے یقیناً جنتی ہے اور دوزخ سے اس کی نجات لازمی ہے۔ لیکن چونکہ عاقبت کا معاملہ نامعلوم الحال ہے، اس لئے انفرادی حیثیت سے ہر شخص کے بارے میں یہ دعوے کیا جائے کہ وہ یقیناً جنتی ہے یا دوزخ سے آزاد ہے ایک بے معنی بات ہے۔ بلکہ اس صورت میں تو اللہ کے خوف کو دلوں سے دور کرنا اور مکرانہی سے اپنے آپ کو مومن سمجھنا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اشد ہے وَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ اور اللہ تعالیٰ کے مکر سے دنیا میں بے خوف فاسق ہوتے ہیں کیونکہ حقیقی میں ایسے بے خوف لوگوں کی پوری پوری گرفت ہوگی۔

اور امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب تفسیر میں صراحت یہ موجود ہے کہ جو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتا وہ مومن ہی نہیں۔“

اور ادعیا صیغہ کاملہ میں جو شیعوں کے نزدیک بطریق تواتر جناب امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے ہے۔ جا بجا انجام کار سے خوف دلایا ہے۔

اور پھر یہ استدلال یوں بھی غلط ہو جاتا ہے کہ مثلاً یہود نصاریٰ غلط قرآن مطہر حیرہ اور اسمعیلیہ فرقے اپنی اپنی نجات کا یقین رکھتے ہیں۔ ان میں ایک طائفہ، اپنے آپ کو اَبْدَاءُ اللہ (اللہ کے بیٹے) اور اَجْدَاءُ اللہ (اللہ کے دوست) کہتا ہے تو دوسرا اپنے اندر اللہ تعالیٰ کا حلول مانتا ہے یا اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اتحاد کا قائل ہے تو شیعہ استدلال کے مطابق یہ فرقے اس بات کے زیادہ حقدار نہیں کہ ان کا اتباع کیا جائے حالانکہ یہ فرقے سب بالاتفاق باطل ہیں۔

اگتالیسواں دھوکہ۔ اہل سنت کو الزام دیتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مذہب میں ایسے لوگوں کا اتباع کرتے ہیں کہ جو معصوم نہیں ہونے اور جب غیر معصوم کو خود اپنے ہدایت یافتہ ہونے کا یقین نہیں وہ دوسرے کو کیا ہدایت کرے گا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَمَّنْ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يَتَّبَعَهُ اَمْ لَا يَهْدِيْ اِلَّا اَنْ يَفْسُدَ لَهَا كَلْبُ كَيْفَ يَهْدِيْكَوْن۔ (جو شخص حق کا راستہ بتائے وہ اتباع کا زیادہ مستحق ہے یا وہ جو اس وقت تک راستہ نہ پائے جب

تک کوئی دوسرا اس کو راستہ نہ بتائے۔ پس تمہیں کیا ہو گیا ہے یہ کیسے فیصلے کرتے ہو۔
 اہل سنت کی مثال تو اس اندھے کی سی ہے جس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو، اور وہ اپنے گھر پہنچنا چاہتا ہے
 مگر راستہ بھٹک جانے کا ڈر ہے۔ اس تردد و حیرانی کے دلت اسے ایک شخص ملتا ہے جو اس کے گھر سے واقف نہیں
 اور یہ اندھا اپنا ہاتھ اس کو تھما دیتا ہے اور بے کھٹکے اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ اب وہ شخص اس کو پہنچ کر ایسے
 جھک و غار دار جنگل میں جا چھوڑ دیتا ہے۔ جو درندوں اور موذی جانوروں سے بھرا ہوا تھا اور کہہ دیتا ہے تیری منزل
 مقصود یہی ہے۔“

اس طعن کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں۔ اور اس قرآن مجید کی
 جو جمل اللہ المتین ہے۔ لیکن احادیث کی روایت کرنے اور قرآن مجید کے معانی سمجھنے میں صحابہ کرام اور اہل بیت کی روایت
 کے محتاج رہتے ہیں۔ جن کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صداقت، صلاح اور نجات و نجات کی گواہی دی ہے۔ اور
 ایسی ہی ان حضرات کرام نے اپنے برگزیدہ شاگردوں اور بزرگ ہمعصروں کے حق میں شہادت دی ہے۔ چنانچہ اسی طرح
 صدی بعد صدی ایک دوسرے کی تصدیق کرتے چلے آتے ہیں۔ بخلاف مشیعہ کے کہ انہوں نے ائمہ اور اپنے درمیان، جھوٹے
 منقری۔ اور دنیا طلب لوگوں کو واسطہ بنایا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ خود ان کی صحیح کتابوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ ائمہ
 عظام نے ان بد بخت (واسطوں) سے ہزار زبان بیزاری ظاہر کی، ان پر تبری بھیجا اور لعنت برساتی۔ ان میں اکثر مجسمہ
 مشبہ، ابا حبیہ اور حلو لیہ ہوئے ہیں۔

اہل سنت کی مثال تو ایسے شخص کی ہے جو بادشاہ کی ملازمت کا ارادہ کر کے بادشاہ کے مقرب اور دربار سے ملے، وہ
 کسی امیر کے سپرد کرے اور امیر بادشاہ کے وزیر خاص سے ملائے اور ان واسطوں کے متعلق مشہور یہ ہو کہ ان سب کو بادشاہ
 کا مقرب خاص حاصل ہے اور یہ بھی زبان نہ غلامی ہو کہ بادشاہ کی ہر باتیں اور عنایتیں ان پر پیہم ہوتی ہیں (ایسے شخص
 کے متعلق کون کہے گا کہ وہ منزل سے بھٹکا ہوا ہے)

رہے شیعہ تو ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بلا اطلاع، بے سند اور غائبانہ، بادشاہ سے کوئی جاگیر، جائداد
 حاصل کرنے کا پروانہ حاصل کرنا چاہے اور اس کے مکاروں، دغا بازوں، جعل سازوں اور جعلی مہربانوں سے
 خفیہ ساز باز کر لے جو خود ہی بادشاہ کے خوف سے لرزاں ترساں رہتے ہوں اور چھپے چھپے پھرتے ہوں اور جن کے
 متعلق شاہی فرامین یہ ہوں کہ ان کے ہاتھ قلم ہوں، ناک، کان کاٹے جائیں۔ (نامزدی اس کی دیکھا چاہیے۔)
 تِلْكَ الْأَمْثَالُ لَضَرِبٍ لِلَّذِينَ لَمْ يَلْمُزُوا سَبْعَ مَرَّاتٍ (ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں شاید وہ ان پر
 غور کریں۔)

بیابلیسواں دھوکہ: یہ لوگ صحابہ کرام پر افتراء و الزام لگاتے ہیں کہ ان حضرات نے قرآن میں تحریف کر کے
 ان آیات کو اس سے خارج کر دیا جو امیر المؤمنین حضرت علیؑ یا اہل بیت کے فضائل میں نازل ہوئی تھیں یا جن میں
 لوگوں کو اہل بیت کی اتباع و اعانت کی رغبت دلائی گئی تھی۔ اور سب لوگوں پر ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا
 تھا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کے خلاف اتفاق کر کے اہل بیت کا
 حق غصب کیا اور ان کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔

وَأَنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ - قرآن ہم نے آٹا اور ہم ہی
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفْنَا الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ
وَلَيُعِدَّ لَهُمْ مِنْ بَعْدِهِمْ فَوْزًا أَمَّا تُعِيبُوا لِيُثْبِتُ
وَلَيُثْبِتَنَّ فِي شَيْءٍ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتُلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ
لَعْنِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ
حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ
وَلَكِنَّ اللَّهَ قَدِيرٌ أُولَئِكَ الَّذِينَ
اللَّهُ مَنَّ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ الَّذِينَ
مَلَكْنَا حُرُوفِي الْأَرْضِ مِنْ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
وَأَمَرُوا بِأَلْعَمَرُودَيْنِ وَهُمَا مَخِّنَا الْمُنْكَرَ وَبَلَّغْنَا قَابَتِ الْأُمُورِ
اللَّهُ تعالیٰ اسی کی مدد کرتا ہے جو اللہ کے مددگار ہوتے ہیں
کے بارے میں فرماتا ہے کہ یہ لوگ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم
قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں، بھلی باتوں کو نافذ کریں اور برے
صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔)

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِزْقًا مِنْهُوَ إِنَّا لَنَنظُرُ فِي وُجُوهِهِمْ مَنْ أَشْرَ السُّجَّادِينَ -

اب آپ دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن صحابہ کے متعلق یہ کچھ فرمایا ہے، یہ

بدعت ان پر کیا بہتان و افتراء مانہتے ہیں۔ (ختم اللہ علی قلوبہم)
بینتنا الیسواں دھوکہ :-

اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں کے متعلق یہ بہتان لگاتے ہیں کہ وہ دن رات صبح و شام میں اپنی رماؤں میں اللہ تعالیٰ سے یہی التجا کرتے تھے کہ ان کو شیعانِ علی میں داخل فرمائے ۱۱ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ بہتان اولوالعزم پیغمبروں کی شان میں نفی و کمزوری کا پتہ دیتا ہے، کہ ان کی پیہم دعائیں بھی اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائیں۔ اور ان کو یہ تک نہیں بتایا کہ شیعانِ علی کا زمانہ ابھی آیا کہاں ہے کہ آپ لوگ قبل از وقت اور بے عمل اظہار خواہش کی تکلیف میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

اس ذیل میں اہل سنت کی ضعیف روایات بھی سامنے لاتے ہیں جو شیعانِ علی کی طرح میں وارد ہیں۔ اول تو ان روایات کی صحت ہی امر کاں سے دور ہے۔ پھر اپنے اوپر یا اپنے جیسوں پر لفظ شیعہ کا اطلاق کرنا بھی دعویٰ لا دلیل ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صبیح شیعہ تو اہل سنت ہی ہیں وہی آنجنابؑ کی روش پر چلتے ہیں اور کسی کے لئے باؤٹ آزار نہیں۔ ہر ایک کو ٹکی اور بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔ عقائد و اعمال میں قرآن و حدیث کا اتباع کرتے ہیں۔ اور سیرت میں آپ کی پیروی۔

ہم صفاتِ سابق میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ شیعانِ علی کا لقب دراصل ان شیعیانِ اولیٰ کے ساتھ مخصوص تھا جو اہل سنت کے پیشوا ہیں۔

پھر جب رفتہ رفتہ جھوٹے، بناوٹی دعویٰ اور اٹھ کھڑے ہوئے تو ان بزرگوں نے اس لقب پر تین حجت بھیجے اور اس کو اپنے لئے ترک کر دیا۔ اور ان کی جگہ اہل نفس و اباحت اور زندیقوں نے اس کو اپنے لئے طرہ امتیاز بنا لیا۔ اور جب یہ قیمتی لقب رذیل لوگوں کے ہاتھ کا جھومر بنا تو اہل سنت نے اگر اس کو ترک کر دیا تو تعجب کی کیا بات ہے کیونکہ اب یہ عروت و شان کا منظر نہیں رہا تھا بلکہ رذالت و کم ہنسی کی نشانی بن گیا تھا۔

چوالیسواں دھوکہ :- یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام انبیاء اور رسولوں پر فضیلت دیتے ہیں البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم مرتبہ و ہمسر کہتے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور تمام ملکہ اور عاملین و عرش و کرسی پر بھی ان کی برتری کے قائل ہیں۔ اور اس معاملہ میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ اس سادی تنگ و دو کاراز صرف یہ ہے کہ جب کوئی اس تذمرات و منزلت کا معتقد ہو گا تو لا محالہ یہ بھی مان لے گا۔ کہ خلافت ان ہی کا حق تھا کہ دوسرے کو اس میں مداخلت کا حق نہیں تھا۔ حالانکہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ خلافت کا معاملہ افضلیت مرتبہ پر موقوف نہیں۔ چنانچہ عالم غیب میں حضرت جبرائیل و میکائیل علیہما السلام کے ہوتے ہوئے حضرت طاوت علیہ السلام کو جن کا پیشہ چمڑا رنگنا تھا۔ خلافت کے لئے چنا گیا۔ اور دنیا میں حضرت ثنویٰ پیغمبر علیہ السلام کی حیات میں منصب خلافت سے انہیں طاوت کو نوازا گیا۔ پھر نہ ادا بَسْطَةُ فِي الْعِلْمِ وَالْجَسْمِ (علم و جسم میں ان کو کث دگی بخشی) کے الفاظ سے ان کی مدح سرائی کی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ امور مملکت کی انجام دہی اور معاملات حکومت کا حل و عقد اور بسط و کشاد دوسری چیز ہے اور نسبت کی مشافہت و نجابت، علم کی گہرائی اور ذہن کی رسائی دوسری شے۔

بینتنا الیسواں دھوکہ :- شیعوں میں یہ بات معروف و مشہور ہے بلکہ ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی بھی ہے کہ

خلفائے راشدین، ازواجِ مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ معتمدہ رضی اللہ عنہم کو سب شتم کرنا عبادات میں سب سے افضل و اعلیٰ عبادت ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گالی دینا، ذکر اللہ اکبر سے زیادہ بہتر، اب ان کے اہق اور بے وقوف لوگ اس عقیدہ سے گمراہ ہو کر بہت سی فرض عبادت کو چھوڑ بیٹھے ہیں، اور اس "افضل عبادت" پر بڑی پابندی سے کاربند رہتے ہیں۔

اور اتنی بات نہیں سمجھتے کہ جو بھی انسان گمراہ ہوتا ہے وہ شیطان کے درغلانے سے، اور شیطان اپنے اس "مشن" میں اپنا بلند مرتبہ ہے کہ انسان کا تو خیال بھی اس بلندی کو نہیں چھو سکتا۔ اس کے باوجود کسی مذہب میں بھی شیطان ہر لعن ملعون کو عبادت شمار نہیں کیا گیا۔ نہ قرمت کا سبب و معیار بنایا گیا۔

حضرت اکبر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک حسب موقعہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

نئی ترکیب شیطان نے نکالی ہے یہ اغوا کی، خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھ کو بُرا کہیئے
چہ جائیکہ ان بزرگ ہستیوں کی شان میں جنہوں نے مدتوں خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت اٹھائی
اور آئینہ سسرال و قرابت کے گہرے رشتے رکھتے تھے۔ اہل سنت کی ایک عظیم اکثریت، بلکہ ان کے علاوہ دوسرے
فرقے مثلاً کرامیہ، معتزلہ اور نجاریہ ان بزرگوں کی ہمیشہ تعلیم و توفیر کرتے رہے۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ فرقہ اسلامیہ میں بڑے سے بڑا فرقہ اہل سنت ہی کا رہا ہے ان میں ایک جماعت ایسی بھی گذری ہے جس نے لوگوں کے حالات کو جانچا، پرکھا، مدح کے قابل کی مدح سرائی کی، قابلِ مذمت کی مذمت کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات کے نقل میں انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ جن کی ذکاوت و ذہانت اور سلیم عقول و ضرب المثل ہیں۔ چنانچہ عقلیہ، فلسفیات، ریاضیات اور طبیعیات میں انہوں نے ایسی ایسی بنیادیں اور گہرے نکات نکالے کہ اگر ان علوم کو مرتب کرنے والے ان موثر شگافیوں کو دیکھ پائیں تو یقیناً ان کے سرا حسانندی سے ان کے سامنے خم ہو جائیں بلکہ بعض علوم مثلاً علم اصول یا فنون ادبیہ کے تو یہ حضرات خود موجد بھی ہوئے۔ تو ایسے عقیل و فہیم صاحبانِ علم و دانش کی اکثریت جن کی مدح و تعریف، عزت و توقیر اور تعلیم پر متفق ہو تو لا محالہ ان کے سامنے متفقہ فیصلہ پدیدو
تھاج اور لعن ملعون کرنے والا کب معتبر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی آدمی کا کردار مشتبہ ہو گا کہ ان مبتدیوں کا اور درجی بات پر یقین کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا اور پھر ایسے پیشواؤں پر ان کا معذور ہونا اور ان سے دھوکہ کھانا جن کا حال آگے کھلے گا، دانشمندی سے بعید اور منافی ہے۔

چھبیسواں دھوکہ۔ انہوں نے اپنی احادیث کی کتابوں میں اس مضمون کی گھڑمی ہوئی چند روایات مدح کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اکثر و بیشتر یہ وحی بھیجتے رہے، ہیں کہ آپ ہم سے یہ دعا کریں کہ ہم آپ کو حب علی بن ابی طالب نصیب کریں، ان کے متاخرین نے ان روایات پر بڑا زور دیا اور بہت مشہور کیا۔ لیکن یہ نادان یہ نہیں سوچتے کہ ان کی افتراء پر دازی سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس کئی جہت سے مجروح ہوتی اور اس میں نقص لازم آتا ہے۔

اول :- یہ کہ "حب علی" جو ایمان کا جز اور دین کا ایک رکن ہے۔ آپ کو حاصل نہیں۔

دوم :- ایسے ضروری امر میں آپ سستی فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار تاکید فرمائی جا رہی ہے۔

سوم :- اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں محبت علی میں سوال و دعا کی احتیاج کیوں رکھی بلا طلب دعا کیوں عطا نہیں فرمادی۔ حالانکہ تمام انبیاء کو ضروریات ایمانی ابتدائے خلقت سے مرحمت فرمائی ہیں۔

ان شیعوں کی روایات گھڑنے اور تراشنے میں ایسی مثال ہے جیسے کسی غفلت مند نے کسی بیوقوف کے بارے میں کہا تھا۔ بَنِي قَصْرٍ أَوْ هَذِهِ مِصْرٌ۔ (ایک گھر تو بنا لیا مگر ساتھ ہی ایک شہر اجاڑ دیا)

سینتالیسواں دھوکہ :- ان میں کوئی عالم، مذہبِ اربعہ میں سے دکھاوے کے لئے کوئی مذہب قبول کوکے اس کا اپنے اوپر اتنا گہرا رنگ چڑھا لیتا ہے کہ لوگ ظاہری اور باطنی امتحان اور تجربے کے بعد اپنے مذہب کا مقتدا سمجھ لیتے ہیں۔ اور پھر اس مذہب کے مداروں میں تدبیریں بھی ان کے سپرد ہو جاتی ہیں اور منصبِ افتاد میں بھی ممتاز نظر آنے لگتے ہیں اور جب وہ فرشتہ اہل کو قریب آتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے نزدیک مذہبِ شیعہ ہی حق ہے۔ اور وصیت کرتا ہے۔ کہ میری تجہیز و تکفین کی رسوم کسی شیعہ سے ادا کرائی جائیں۔ اور مجھے شیعوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اور اس جیلہ کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ شاگردوں، معتقدوں اور دوست و احباب کے دلوں میں تردد اور شک و شبہ پیدا کر دیا جائے تاکہ وہ یہ سوچیں کہ اتنا عالم فاضل اور پرہیزگار شیعہ مذہب کو حق اور سچ نہ جانتا ہو تو اس کی طرف کیوں جھکتا اور اہل سنت کے مذہب سے کیوں درست بردار ہوتا۔

چنانچہ ابنِ مطہر علی نے اپنی کتاب پنج انکرامہ میں لکھا ہے، (ترجمہ) ہمارے زمانہ کے اکثر شافعی مدرسین مرتے وقت یہ وصیت کر گئے کہ ان کی تجہیز و تکفین کوئی شیعہ کرے۔ اور ان کو مشہدِ امام کاظم میں دفن کیا جائے۔ اڑتالیسواں دھوکہ :- ان کے کسی عالم معروف و مشہور نے ایک کتاب لکھی اور اس میں یہ افتراء بھی لکھ مارا کہ اہل سنت کے اکثر علماء و مشائخ درپردہ امامیہ مذہب پر کھتے تھے مگر ظاہر داری برتتے اور تقیہ کرتے تھے۔ چنانچہ ذبیات الاعیان جو ایک عراقی شیعہ عالم کی لکھی ہوئی کتاب ہے اسی نوع کی ہے اس میں حضرت بایزید بسطامی، حضرت معروف کرہی، جناب شفیق بلخی، جناب سہل بن عبد اللہ تستری اور ان کے ملاوہ اہل سنت کے مشہور مشائخ رحمہم اللہ کو امامیہ میں شمار کیا ہے۔ اور ان کے کچھ اقوال و کلمات کو افتراء اور بہتان کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جن سے ان کے امامیہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان بزرگوں کے مناقب و محاسن اور کرامتیں غیب شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور کتاب مجالس المؤمنین ہے۔ جس کا مؤلف قاضی نور اللہ شوشتری شیعہ ہے۔ اس نے بھی اسی قسم کے افتراء آمیز معنائیں کثرت سے اس میں درج کئے ہیں۔

علمائے ہرات میں سے اسی قاضی کے ہم مذہب ایک عالم نے اس سے کہا کہ تم نے اس کتاب میں روایات و حکایات وغیرہ جو کچھ بیان کی ہیں وہ اہل سنت ہی کے ملاوہ نہیں ثلثہ شیعہ حضرات نے بھی ان کو جھوٹ اور باطل ٹھہرایا ہے اور یہ بے اصل اور خلاف واقعہ باتیں ہیں۔

اور کتب تاریخ و اخبار میں بھی ان کا سراغ نہیں ملتا اس کے جواب میں شوشتری کہنے لگا کہ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ مگر میرا مقصد تو یہ ہے کہ جو کوئی بھی یہ کتاب پڑھے گا وہ ان حکایات و واقعات کو دوسرے سے بھی نقل کرے گا۔ اس طرح یہ روایات و حکایات اپنے انوکھے پن اور دلچسپ ہونے کی وجہ سے شہرت

پائیں گی اور بالآخر کسی نہ کسی مرحلہ پر قابل اعتبار کتابوں میں اپنی جگہ بنالیں گی اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ شیعوں کی تعداد بڑھ جائے گی، دوسرا یہ کہ اہل سنت شک و شبہ میں پڑ جائیں گے۔ اب اگر اہل سنت کے معق علماء ان کو نہیں مانتے، نہ مابین عوام تو اختلاف روایت پر ان کو معمول کر کے ان کو تسلیم کریں گے۔ چنانچہ عراق و خراسان کے علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مجالس المؤمنین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی شوشتری کی من گھڑت اور بے اصل اور سراپا جھوٹ ہے۔

انجا سوال دھوکہ ہے۔ ان کے بعض راوی اپنے آئمہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے امام سے یوں روایت منسوب کرتے ہیں کہ

”میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، تو آپ ایک شیعہ شاعر کی بڑی ستائش فرما رہے تھے اور اس کے لئے دوائے خیر فرما رہے تھے، کیونکہ اس نے ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں محبت اہل بیت کا خلفائے ثلاثہ و دیگر صحابہ کرام پر تبری کا مضمون باندھا ہے اور وہ حضور بارہا پڑھ اور اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔“

چنانچہ سہل بن دینار نے اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں ایک روز اور شیعوں کے آنے سے پہلے امام رضا کی خدمت میں باریاب ہوا امام اس وقت تنہا اور تخلیہ میں تھے میری آمد پر امام نے مجھے خوش آمدید کہی اور فرمایا ابن دینار تم خوب آئے میں تم کو کسی کے ذریعہ ابھی بلوانے والا تھا۔

امام اس وقت اگشت برزیں، کسی سوچ میں غرق تھے۔ میں نے عرض کیا جناب مجھے کسی غرض سے یاد فرما رہے تھے، فرمایا میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس نے مجھے مضطرب و بے چین کر رکھا ہے! اور میری نیند اڑا دی ہے۔ میں نے عرض کیا خیر تو ہے، بات کیا ہے۔ فرمایا کہ میں نے سوزنیوں کی ایک سیڑھی دیکھی جس پر میں چڑھ گیا ہوں میں نے عرض کیا مبارک ہو کہ آپ سو سال تک زندہ رہیں گے۔ فرمایا پھر میں نے دیکھا کہ سبز رنگ کا ایک برج ہے جو اتنا صاف و شفاف ہے کہ اندر کا حصہ باہر سے اور باہر کا حصہ اندر سے صاف نظر آتا ہے اور اس برج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں۔ آپ کے دائیں بائیں دو خوش جمال جوان رعنا بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک نے ایک بوڑھے کے زانو کا تکیہ لگایا ہوا ہے۔ بوڑھا اتنا ضعیف و عمر رسیدہ ہے کہ اس کی ہتھوڑیں آنکھوں پر پڑی ہوئی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم محمد سے ارشاد فرما رہے ہیں اپنے دادا حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کو سلام کرو۔ چنانچہ میں نے ان کو سلام کیا۔ پھر فرمایا اور اس شاعر کو بھی سلام کرو یہ ہمارا شاعر اور دین و دنیا میں ہمارا معاصب اور دوست ہے۔ یعنی اسمعیل بن محمد حمیری میں نے ان کو بھی سلام کیا۔ اس گفتگو کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعر سے کہا ہاں لا، وہی قصیدہ جس میں ہم مشغول تھے۔ بوڑھے شاعر نے ایک طویل قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ جب اس شعر پر پہنچا:

فَاكْذَابًا لَوْ شِئْتَ اَخْلَسْتَنَّا
اِلَى مِنَ الْعَايَةِ وَالْمَقْذَعِ

(انہوں نے اس سے کہا کہ تو اگر چاہتا تو ہم کو بتا دیتا کہ مال کار اور جائے پناہ کیا ہے)

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسمعیل ذرا ٹھہر! پھر آپ نے دونوں ہاتھ آسان کی طرف اٹھائے اور فرمایا

اے میرے خدا! اے میرے سردار! تو گواہ ہے کہ میں نے ان کو باخبر کر دیا تھا۔ کہ خوف کے وقت کس کے پاس جائیں۔ اور کس کی پناہ لیں، اور آپ اس وقت ہاتھ کا اشارہ امیر المؤمنین (رضی اللہ عنہ) کی طرف فرماتے ہمارے تھے۔ پھر میری طرف رخ کر کے فرمایا کہ اے علی، اس قصیدہ کو تو خود بھی یاد کر لے اور ہمارے شیعوں سے کہہ دے کہ وہ بھی یاد کر لیں۔ اس قصیدہ کو جو بھی یاد کر لے گا اس کے بہشتی ہونے کا میں ضمانت ہوں۔

امام رضا کہتے ہیں کہ میرے دادا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ قصیدہ بار بار دہرا کر مجھے یاد کرتے رہے تا آنکہ مجھے وہ یاد ہو گیا۔

وہ قصیدہ جس کے چار شعر ایسے ہیں کہ ان میں صحابہ کرام کی شان ارفع میں نہایت گندی اور سب و شتم سے لبریز زبان استعمال کی گئی ہے کوئی بھی مسلمان اس کو زبان پر لانا تو درکنار نوک قلم پر لانا بھی گوارا نہ کرے۔

مگر ہم (نقل کفر کفر نباشد کے مصداق) اس کو اس لئے نقل کر رہے ہیں کہ شیعوں کی طرف سے نرم گوشہ رکھنے

والے اور غیر طائفہ اندہ مدید والے افراد کہیں اے معنی بہت سمجھ کر کہہ کر کہ تم کسی کو غلامی کے لئے کسی کے متفق نہ بیٹھیں اور وہ انداز انصاف اپہر غرر فرمایاں کہ ان لوگوں کے دلوں میں صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خلاف کتنا کینہ اور بغض و عناد بھرا ہوا ہے۔ جو بات اہل عقل و مروت، کے نزدیک فرعون و ہامان کے لئے بھی کہنا جائز نہیں۔ ان اسالین اسلام کو ان کا بدھ بنانا کب جائز اور کہاں کی شائستگی اور شرافت ہے۔ اور پھر اس نازیبا حرکت اور معاندانہ طرز عمل کو بہشت کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔ تو ہے اس جسارت و غمراہی کا کوئی جواب؟

وہ قصیدہ یہ ہے

لَا مَرُوءَ بِاللَّوِي مُرْتَبِہٖ ۱
كَلَامُہٗ اَعْلَامُہٗ یَلْقَہٗ

ام عمرو کارمیتان میں مسکن تھا جواب بے نشان و دیران پڑا ہے۔

كَلَّمَا دَقَّتْ اَلْعِیْنُ فِی رَسْمِہَا ۲
وَالْعِیْنُ مِنْ عَرَفَاتِہٖ تَدْمَعُ

دوران سفر جب میں نے وہاں پڑاؤ کیا تو اس کی یاد مجھے رولانے لگی۔

ذَكَرْتُ مَنْ كُنْتُ اَلْمُؤَوِّبِہٖ ۳
قَبَّتْ وَاغْلَبَتْ شَیْءُ مُؤَجَّہٗ

مجھے یاد آیا کہ میں اس کے ساتھ یہاں کھیل کر رہا تھا، تو اس یاد نے رات بھر مجھے بین نہ لینے دیا۔

كَأَنَّ بِالنَّارِ لِسَا شَقِیْقِہٖ ۴
مِنْ حُبِّ اَدُوِّی كِدِّی تَلْدُہٗ

گویا اس کی طرف سے مجھے جو محبت مل اس کی آگ میرے دل کو جلا رہی ہے۔

یَجِبْتُ مِنْ قَوْمِ اَاقُوۡہَا اَحْمَدَا ۵
بِخَطَاۃِ لَیْسَ كَہَا مَوْصِفُہٗ

مجھے اس قوم کے حال پر تعجب ہے جو احمد کے پاس ایسی خصلت کے ساتھ آئی جس کی وہاں گنجائش نہیں۔

فَاَكُوۡلَاۡہَا شَبْتُ اَعْلَمْتُہَا ۶
اِلٰی مِّنَ النَّبَاۡیَہٗ وَالْمَقْدَرِہٗ

انہوں نے اس سے کہا کہ اگر تم چاہتے تو ہمیں باخبر کر سکتے تھے کہ قال کار اور جائے پناہ کہاں ہیں۔

اِذَا تَوَقَّیْتُ وَاَنۡہَاۡ قُتِلَا ۷
وَفِیۡہِہٖ فِی الْمَلَاۡئِکَہِ مِنْ یَطْمَعُ

جب آپ وفات پا جائیں اور ہم سے جدا ہو جائیں اور لوگوں میں کوئی ایسا جو جو سلطنت کا لاپٹ رکھتا ہو، تو

ہم کیا کریں

قَالَ لَوْ اَهْلَسْتُكَ مَفْزَعًا كُنْتُمْ عَسِيْرًا فَيَدَّ اَنْ تَصْنَعُوْا
فرمایا اگر میں تم سے فزع کا مرجع بیان کر دوں تو قریب ہے کہ تم اس کے حق میں وہ کام کر دو گے۔
مَنْعَهُ اَهْلُ الْعِيْلِ اِذَا قَامَ قَوْمًا هَامُوْنَ فَالْتَرَى لَهٗ اَوْ دَعُوْا

جو گوسالہ پر ستون نے ماروں سے جدا ہوتے وقت کیا تھا۔ اس نے اس ذکر کو جانے دو۔

كَوْنِي الَّذِي قَالَ بَيَانٌ لِّعَنْ كَانْ ذَا يَعْقِلُ اَوْ يَسْمَعُ
اس کام میں گوش ہوش رکھنے والوں کے لئے بیان ہے۔

ثُمَّ اَتَتْهُ بَعْدَ كَاهِرَ مَتَّ مِنْ رَبِّهٖ لَيْسَ لَهَا مَدْفَعُ
اس کے بعد پیغمبر کے پاس ان کے رب کی طرف سے تاکید آئی کہ اس میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں

اَبْلَغُ وَالَّذِي لَمْ تَكُنْ مُبَدِّحًا وَاللّٰهُ مِنْهُمْ حَاسِدٌ يِّنْعُرُ
(جو تم سے کہا گیا وہی) پہنچاؤ ورنہ تم پہچانے والے نہیں ہو گے، خدا تعالیٰ ان سے تم کو بچا کر لے گا۔

فَوَعَدَها قَامًا لِّشَيْءٍ الَّذِي كَانَتْ يَمَآيَا مُرَّهٖ يَصْدُقُ
پس اس وقت پیغمبر اللہ کے حکم کو صاف صاف بیان کرنے کے لئے اٹھے۔

يَخْلُبُ مَا مَوْءَا اَدْنٰى كَيْفَ كَفَّ عَلَيَّ ظَاهِرُ يَسْمَعُ
اور خدا کے حکم سے خطبہ دینا شروع کیا۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں علی کا چکنا ہوا ظاہری ہاتھ تھا۔

سَرَّاقَعَهَا اَلْوَدُّ يَكْفُ الَّذِي يَدْفَعُ اَلْكُفَّ الَّذِي يَبْرُدُ
اس ہاتھ کو اٹھایا۔ اور کیا کہنا اس ہاتھ کی برکت کا جو اٹھاتا ہے اور اٹھاتا ہے۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاكَ فَهَٰذَا اَلَهُ مَوْلَاكُمْ يَرْمُوْاكُمْ يَصْنَعُوْا
اور کہا میں کامیں دوست ہوں یہ اس کا مولیٰ ہے۔ پس وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اس پر قناعت کی۔

وَهَلْ قَوْمٌ مِّنْهُمْ فَعَلَهُ كَانَمَا اَنَا فَهَلْ تَجِدُ
اور وہ ایسے لوگ ہو گئے جنکو پیغمبر کا یہ فعل کینہ میں مبتلا کر گیا اس حال میں گویا ان کی ناکیں کاٹی جا رہی ہیں۔

حَتّٰى اِذَا دَاوُدُ فَاِذَا تَحَدَّمَ وَنَصَرَ قَوْمًا عَنِ وَفِّهِ فَيَتَعَوَّ
حتیٰ کہ جب پیغمبر علیہ السلام کو قبر میں رکھ کر دفن سے خارج ہوئے تو انہوں نے بھلا دیا۔

مَا كَالِ فِي اَذْنَمِسْ وَاَوْفَى بِهِ وَاشْتَرَوْا النَّصْرَ بِمَا يَنْفَعُ
وہ قول جو گل کہا گیا ہے اور جس کی وصیت کی گئی تھی۔ اس طرح انہوں نے نفع کے بجائے نقصان خریدا۔

وَنَقَرُوا اَسْمَاحًا مِّنْهُ بَعْدَهُ فَمَوْتُ يُجْزَوْنَ بِمَا قَطَعُوا
اس طرح اپنا رشتہ قرابت کاٹ ڈالا، اور عنقریب اس قطع کا بدلہ پالیں گے۔

وَاَنْ مَّوْءَا مَكْرًا يَمْوَلَا هُمْ تَبَا لِمَا كَانُوْا اِيْهِ اَرْمَعُوْا
اور انہوں نے اپنے مولیٰ کے بارے میں فریب کیا جو انہوں نے ٹھٹھا ہے خدا اس میں انہیں ہلاک کرے۔

لَوْ هُمْ عَلَيْهِ يَرُدُّ وَاحِدًا هَذَا اَدْلَاهُ لَهْمُ لَيْشَعَرٍ
ایسے لوگ کل نہ پیغمبر کے پاس حوض پر آسکیں گے اور نہ پیغمبر ان کی شفاعت کریں گے۔
وَحَوْضٌ لِّمَا بَيْنَ مَنَا إِلَى طُولِكَ وَالْعَوْضُ مِنْهُ اَوْسَعُ
پیغمبر کے اس حوض کا طول و عرض منار سے ایسے تک ہے بلکہ اس سے بھی وسیع تر۔

يُنْقَبُ نِيْلُهُ عَلَمٌ لِهْدَى وَالْحَوْضُ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَمْلَأْ
وہاں نشان ہدایت قائم ہوگا۔ اور وہ حوض اپنے پانی سے لبالب پر ہوگا۔
حَصَا لَا يَأْوُرُ وَمَوْجَانَةٌ وَتَوَلَّى لَمْ تَحْتِ اَمْبِعُ
اس کے سنگریسے باقوت و مرجان اور درنا سفتہ ہوں گے۔

وَالْعِطْرُ وَالرَّيْحَانُ الْوَالِغَةُ ذَلِكَ وَكَذَلِكَ هَبَّتْ بِرِزْقِهِ
اس کی خوشبو عطر و ریحان کی قسم کی ہوگی، اور تیز ہوا اس پر چلتی ہوگی دگر خوشبو ہر طرف اڑائے۔
بَارِئُ بَيْنَ الْجَنَّةِ مَا مَوْجَانَةٌ وَاجْبُهُ لَيْسَ لَهَا مَوْجَانَةٌ
جنت کی ایک ہوا اس رحمن پر مامور ہے۔ جو ہر وقت اس کی واپس نہیں ہوگی۔

اِذَا ذَلُّوا مِنْهُ لَكُنْ يَشْرَبُوا قَبْلَ تَبَا تَكْمُدُ مَا رَجَعُوا
جب یہ لوگ پانی پینے حوض کے قریب آئیں گے قرآن سے کہا جائے گا۔ تمہارا ناس ہو یہاں سے ہٹو۔
وَتَوَلَّى لَمْ تَحْتِ اَمْبِعُ يَوْمَ دُحْمٍ اَوْ مَلْعَا يَشْبَعُ
یہ پانی تمہارے لئے نہیں ہے، اپنی سیرابی کے لئے کوئی اور حوض ڈھونڈ لو، اور اپنا پیٹ بھرنے

کے لئے کوئی اور طعام خانہ تلاش کرو۔

هَذَا لَمِنْ وَآلِي نَبِيٍّ اَحْمَدٍ وَلَكِنَّ غَيُّهُمْ يَشْبَعُ
یہ چشمہ تو ان کے لئے ہے جو آل احمد سے محبت رکھتا اور ان کے غیر کا تابع نہیں ہے۔

فَانْفُورُ لِلشَّارِبِ مِنْ حَوْضِهِ وَالْوَيْلُ وَالْوَيْلُ لِمَنْ يَمْنَعُ
پس اس حوض سے پینے والے کے لئے کامیابی ہے اور ان کے لئے ہلاکی ہے جن کو اس سے روک دیا گیا۔

وَالنَّاسُ يَزِمُ الشَّيْءُ اَيُّاهُمْ خَسْفٌ فَيَمْنَعُ هَالِكٌ اَمَّا بَعْثُ
قیامت کے دن لوگوں کے لئے پانچ علم ہوں گے ان میں سے پار کے لئے ہلاکی ہے۔

فَرَايَةُ الْجَنَّةِ وَفَرَادُهَا سَابِرَتِ الدُّمَّةُ الشُّعْبَةُ
ایک علم گر سالہ ساری کا ہے۔ اور اس بدکردار گروہ کا ساری فرعون ہے۔

وَنَارُ آيَةِ يَقْدِرُ مَهَا جَبَتْ لَوْ بَدَا لَكَ وَاللَّهُ مُقْتَضٍ
اور ایک نشان کا پیشوا جبر و باطل شے ہے خدا کرے اس کی قبر ٹنڈی نہ ہو۔

وَنَارُ آيَةِ يَقْدِرُ مَهَا تَعْلَلُ كَلْبٌ بَنَ كَلْبٌ نَفْلُهُ مُقْتَضٍ

اور ایک نشان کا پیشتر نقل (مرثا کا نر) ہے۔ کلب ابن کلب اس کا انجام ہولناک ہے۔

وَمَا يَكْفُرُ بِمَا آتَىٰ بِكُمْ هَبْذَ لَهْدُكُمْ أَنْكُمْ

اور ایک نشان کا پیشوا گوزا بندہ ہے وہ لیم سے لیم سے

وَمَا يَكْفُرُ بِمَا آتَىٰ بِكُمْ هَبْذَ لَهْدُكُمْ أَنْكُمْ

اور ایک نشان ہے جسکے پیشوا حیدر ہیں گویا چودھویں رات کا چکنا ہوا چاند۔

إِمَامٌ مِدْقٍ مَكَّةَ شَيْعَةٍ سَمَوَاتٍ وَاعْنِ الْوَحْنِ وَكَمْ يَمْنَعُوا

وہ حیدر امام راستی اور ان کے تابعین ہی حوض سے سیراب ہوں گے کوئی انکو منع کرنے والا نہیں۔

بِذَلِكَ الْوَحْنِ هُنَّ تَمْنَا يَا شَيْعَةُ الْوَحْنِ فَلَا تَجْزَعُوا

ہمیں ہمارے پروردگار نے یہی حکم بھیجا ہے اے گردہ "حق" تم مت گھبراؤ۔

اب واضح رہنا چاہیے کہ اس فقرہ کی رد سے دہرہ رگوں اور لائق مدارام مہبتیوں پر الزام آتا ہے۔

اول تو جناب رسالتاب صلی اللہ علیہ وسلم پر دوسرے جناب امام علی رضا پر اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے خواب سچے اور بنی بر تحقیق ہوتے ہیں۔ اسی طرح امام معصوم کے خواب بھی نصانی اور شیطانی

نہیں ہوتے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان خوابوں میں منکرات و کفریات دین داخل ہو جائیں۔

پس لا محالہ ماننا پڑے گا کہ یہ اشعار ایسے ناکارہ اور کھوٹے سکے ہیں جو ابن دینار جیسے عبدالدرام

والد ثانیہ کی تخیل سے نکلے اور اس کی اختراع محض صد فی صد جھوٹے ہیں۔

نہم صمیم اور عقل سلیم رکھنے والے کیسے یوں توقعیدہ کا ہر مصرع افتراء و بہتان کی پوٹ سے محروم

بارہ اماموں کی گفتی کے مطابق تبرکا۔ بارہ وجوہ بیان کرتے ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ یہ فقرہ سراسر خلاف عقل

مخالف قرآن و حدیث خلاف دین اور خلاف واقعہ ہے۔

(۱) یہاں بسم اللہ ہی غلط ہو گئی کہ اس شیعہ نے سوزیموں والی سپرچی کی تعبیر یہ دی تھی کہ امام رضا کی

عمر سو سال ہوگی۔ سو یہ تعبیر غلط نکلی اور دونوں فرقوں کے مورخین کے مطابق ان کی عمر سو سال تک نہیں پہنچی

گو تعبیر کی غلطی خواب کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے مگر اس کو کیا کہا جائے کہ یہی راوی کہتا ہے کہ جب

میں نے امام کے سامنے یہ تعبیر بیان کی تو امام نے اس پر سکوت فرمایا اور کسی غلطی پر ایسے موقع پر معصوم

کا سکوت جہاں تفسیر کی گنجائش نہ ہو جائز نہیں اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ قصہ جھوٹا اور گھڑا ہوا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس خواب میں جناب رسالتاب صلی اللہ علیہ وسلم نے معصوم واجب الاملاعت امام کو حکم

دیا کہ وہ ایسے شاعر کو سلام کرے جس کے متعلق تاریخ کا فیصلہ ہے کہ وہ فاسق و ناجر اور شرابی تھا۔ تو یہ امام

معصوم کی تحقیر ہوئی۔ اور جناب رسالتاب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اختلاف شرع امر کے ارتکاب کی نسبت

ہوئی۔ اور تلب موضوع معاملہ الٹ دینا کہ بد نیک کو سلام کرے نہ کہ نیک بد کو سلام کوئے الزام آیا۔

(۳) راوی نے اس قصہ میں یہ بھی بیان کیا کہ خواب دیکھنے سے امام کو قلق اور بے چینی ہوئی اس سے پتہ چلا کہ

خلافے خلافت پر تبری کا جواز امام کو پہلے معلوم نہ تھا بلکہ وہ تو اس کے خلاف اس حرکت بد کو حرام اور کبیرہ

گناہ سمجھتے رہے۔ اب خواب میں اس کے جواز کا انکشاف ہوا تو اس پر قلعہ اضطراب، تشویش اور بے چینی کا پیدا ہونا لازم تھا۔ اسپر پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ واجب کا وجوب حرمت کی حرمت اور جائز چیزوں کا جواز امام کو معلوم ہونا امامت کے خواص میں سے ہے۔ اگر ان باتوں کا علم نہ ہو گا تو درجہ امامت سے گر جائے گا۔ اب اگر اس قصے کو سچ مانتے ہیں تو امام علی رضا کی امامت باقو سے جاتی ہے۔ بلکہ کلینی نے تو کتاب کافی میں اس امر کے اثبات کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ کہ امام کو چاہیے کہ گزشتہ و آئندہ معاملات کا ان کو علم حاصل ہو تو یہاں یہ کیسے ہوا کہ امام اس شاعر کے حال سے اور اس کے اس قدر مقبول قصیدہ سے بے خبر تھے کہ جس کے ایک مرتبہ پڑھنے سے جنت کے داخلے کی ضمانت مل جائے اور خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے، اور امام کو ایسے اہم معاملہ کا پتہ تک نہ ہو۔

امام کی بعثت تو ہوتی ہی اس لئے ہے کہ وہ خدا سے دور کرنے والی باتوں یا اس سے قرب کرنے والے امور کو وضاحت سے بیان کرے یہی نہیں یہ عیب تو گزشتہ ائمہ پر بھی لگتا ہے کہ وہ ایسے اہم امر سے غافل رہ کر دنیا سے چلے گئے اگر کوئی یہ کہے کہ ان ائمہ کو علم تھا تو یہ سوال ہوتا ہے کہ ان حضرات نے امام علی رضا کو اس کی تبلیغ کیوں نہ کی ان کو بے خبر کیوں رکھا۔

(۴) اس قصیدہ میں یہ سفید جھوٹ بھی ہے کہ صحابہ کرام اکٹھے ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تعین امام کیلئے گئے اور آپ سے درخواست کی اس لئے کہ یہ بات کسی بھی مؤرخ نے خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ نہ تو یہی نہ اپنی کسی کتاب میں لکھی۔

بلکہ اس قسم کا جھوٹ جوڑنا، پھر اس کی تکرار پر بعثت کی مفادیت دنیا، اسلوب نبوت در رسالت کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ باعث تو بہن بھی۔ کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام جھوٹ سے بالکل پاک ہوتے ہیں ان کے کلام میں کذب کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

(۵) قصیدہ کے جھوٹے ہونے کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ قصہ میں ایک مربع جھوٹ آغوش صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا کر دیا گیا کہ آپ نے شاعر مدکور کے بارے میں فرمایا کہ وہ دین دنیا میں ہمارا مصاحب و رفیق ہے حالانکہ اس حیرت انگیز شاعر نے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی نہ ہی اس کو رفاقت حاصل رہی اور یہ بات کون نہیں جانتا تو نبی کی نسبت ایسا جھوٹ تراشنا ان کے پاک دامن پر دھبہ لگانا ہے۔

(۶) اس قصیدہ میں ایک اور کھلا کفر بھی ہے کہ جہالت، بیوقوفی اور نا عاقبت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، اور پیغمبر کی عقل کو علم الہی سے کامل تر مستقیم تر قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ تعین امام کے سلسلے میں حضرت علیہ السلام اور ان کے نقمائنات اور خطرات کا اندیشہ تھا وہ سب واقع ہوئے، ان کا شیرازہ بکھر گیا کتاب کی تحریف ہوئی اور مسلمانوں کی ایک جماعت جس کی حیثیت قدرت سے دین کی اشاعت و شوکت کی امید کی جاسکتی تھی وہ مرتد ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے محض حکمرانی کی غرض سے صبر و اکرام سے کام لے کر پیغمبر علیہ السلام سے تعین امام کرائی اس کے بعد جو سانحات پیش آئے اس کا انہود بالشا یا تو اللہ تعالیٰ کو علم ہی نہ تھا اگر تھا تو ان کو دینے کو نہ لے کا قصد نہ فرمایا اور نبی کے لئے کو بلکہ خود اپنی سابقہ تائیدات و توفیقات کو یک قلم و یک حرف غلط

کی طرح مٹا ڈالا اور پھر وہ حالت ہوئی کہ جاہلیت اولیٰ بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

(۷) ساتویں وجہ یہ کہ ترک اصل، و ترک لطف کی رعایت جو بلحاظ اصول مذہب شیعہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ناگزیر ہے، اور جن کی قباحیت شیعوں کے نزدیک معلوم و مسلم ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوتاہی لازم آئی ہے اور یہی وہ بات ہے جس کا شیعہ بار بار اہل سنت کو الزام دیتے ہیں۔ (تو آپ اپنے دام میں میاں آگیا)۔

(۸) جھوٹ کی آٹھویں وجہ یہ ہے کہ صاحب قصیدہ نے لوگوں کو پانچ نشانوں (علموں) میں محصور کیا ہے حالانکہ یہود، نصاریٰ، مجوس، ہنود، صائبیں، اہل خطا، اہل حبش، اور یاجوج و ماجوج، بظاہر ان میں سے کسی بھی نشان میں نہیں ہیں۔ پھر اس کھلے جھوٹ کو پیغمبر علیہ السلام اپنی زبان مبارک سے کس طرح دھرائیں اور اس پر لطف اندوز ہوں!۔

(۹) غلطائے ثلاثہ اور ایسے ہی ان کے پیرو، عقیدے اور عمل میں باہم کسی بھی حیثیت سے مختلف نہ تھے تو پھر ان کے نشانات جدا جدا قرار دینا سراسر خلاف عقل ہے۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ یہی اشخاص بعینہ دوسرے نشان میں بھی تھے تو ایک ہی ذات کا ایک ہی وقت میں دو جگہ ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض کو ایک نشان میں اور بعض کو دوسرے نشان میں مانیں تو یہ ترجیح بلا مرجع ہے یعنی ایک چیز کو بلا معقول وجہ کے دوسرے پہنچا دینا، اور یہ دونوں صورتیں عقل کے نزدیک بالبدایت باطل و لغو ہیں ہاں شاعر کا کلام اس حد تک تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اناس (لوگ) سے مراد محض شیعہ ہوں۔ کیونکہ دوسروں کو بددینائی کی وجہ سے ناس سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر یہ پانچ نشان یوں ہوں۔ کہ شیعہ اولیٰ نشان حیدری کے تحت کیسائیہ نشان دوم میں، امامیہ نشان سوم میں زیدیہ نشان چہارم میں اور غلامہ نشان پنجم ہیں، تو ایسی صورت نشانات کا تعدد کچھ معقول ہو سکتا ہے، اس لئے کہ متبعین اور متعین آپس میں مختلف ہیں۔

(۱۰) قرآن مجید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا۔ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ۔ (ہم نے ان کو نہ شعر سکھایا اور نہ فن ان کے شایان شان تھا۔ اور اہل سیرت شیعہ و سنی اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ جناب پیغمبر علیہ السلام ایک شعر بھی وزن و قافیہ کی درستگی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے تھے، پھر اتنے طویل قصیدہ کو نہ صرف خود یاد کرنا بلکہ امام رضا کو بار بار پڑھ کر یاد کرانا اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔

(۱۱) تاریخ کے آئینہ میں بھی اس شاعر کا چہرہ دیکھ لیا جائے، کہ یہ کس درجہ خبیث، فاسق اور شراب خور تھا۔ پھر ایسے لعین کی عالم قدس میں آغاب تک رسائی یعنی چہ؟۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ نے شعراء کے بارے میں فرمایا ہے۔ وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ۔ وَالَّذِي يُقُولُونَ مَالَا يَفْعَلُونَ اِذَا دُعِيَ اَمْنًا وَهُمْ عَلَى الْقَيْلِطِ وَذَكَرُوا لِلّٰهِ كُتُبًا شَاعِرًا۔ (اور ان کے پیرو گمراہ ہیں اور وہ ہر گمراہی میں سرگشتہ ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں مگر وہ لوگ جو ایمان لانے، نیک کام کئے اور خوب اللہ کی یاد کی، ایسے شاعر گمراہوں کے پیرو نہیں۔

اور یہ حیرتی شاعر تمام موزنین کے نزدیک نہ اہل صلاح تھا نہ اہل ذکر میں سے تھا۔ بلکہ کھانا سنی و فاجر تھا، پس ایسے شخص کی اتہام بالکل گمراہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے شخص کی اتباع کا حکم دینا محال و ممتنع ہے،

پہچاسواں دھوکہ اشیاعوں میں سے بعض مکار اہل سنت کے ثقہ محدثین کی صحبت و ہم نشینی اختیار کرتے ہیں، اپنے مذہب سے بیزاری ظاہر کرتے اور اپنے مذہبی اسلاف کو برا اور مذہب کے فسادات و عیوب کو علی الاعلان بے نقاب کرتے ہیں، توبہ و دیانت، احسن سیرت، اور تقویٰ کی صفات سے اپنے آپ کو مستغف کرنے کی بظاہر کوشش کرتے ہیں۔ حدیث صرف ثقات سے لینے کی رغبت دکھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ علماء و طلباء ان کو قابل و ثوق اور لائق اعتماد سمجھنے اور صدق و پاکدامنی پر اطمینان ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جب ان کو یہ مرتبہ مل جاتا ہے تو یہ اپنی اصلیت پر آ جاتے ہیں۔ اور اپنی مکاری کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور معتبر و ثقہ روایات میں اپنی گھڑی ہوئی روایات کا جوڑ لگا دیتے یا بعض کلمات میں تحریف کر کے روایت کرتے ہیں تاکہ لوگ دھوکہ میں پڑ جائیں یہ ان کا بہت بڑا اور چلتا ہوا سکر و فریب ہے۔ اس قسم کا پہلا دھوکہ ہمارا جلد نامی ایک شخص تھا اور اس نے یہ دجل و فریب جاری کیا حتیٰ کہ یحییٰ بن معین جو اہل سنت کے نہایت قابل بھروسہ علماء میں سے ہیں دھوکہ کھا گئے اور باب جرح و تعدیل میں اس کی توثیق کر گئے اور اس کی درپردہ مکاریوں کا سراغ نہ لگا پائے اور اس کے بڑے گہرے تقید کی وجہ سے سچے توبہ کرنے والوں میں شمار کر لیا، مگر بعض دیگر اہل سنت علماء نے اس کی عیاری اور دھوکہ بازی کو پایا اور ان پر مشکف ہوا کہ یہ جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے اس کے برخلاف بڑا عیار مکار اور دھوکہ باز ہے چنانچہ جن روایات میں یہ تنہا ہے ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔

ان میں سے ایک روایت یہ ہے،

مَنْ بَوَّذَ مَوْفُوْعًا اَنْ عَلِيًّا وَ لِيَكُنْ مِنْ بَعْدِي دَعِيَ مِيْرَے بعد تمہارے و ن ہیں۔

اکیا و فوال دھوکہ ان کی ایک جماعت موزنین کو اس طرح دھوکہ دیتی ہے کہ ایک کتاب تاریخ میں تصنیف کرتے ہیں۔ اور اس میں اخبار و حکایات کے بیان کا ایسا اسلوب رکھتے ہیں جس سے یہ پتہ نہ چل سکے کہ اس کا مؤلف اہل سنت نہیں ہے، البتہ خلفاء کی سیرت احوال صحابہ اور ان کے عادات میں اپنے مذہب کے متعلق بھی کچھ ملا دیتے ہیں۔

پھر بعض سنی مؤلف یہ سمجھ کر کہ یہ سنی کی تصنیف ہے بطور حوالہ اسے نقل کر دیتے ہیں اور یوں دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کی یہی غلطی سطحی نظر رکھنے والے لوگوں کے لئے گمراہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اور وہ بات ان کے ذہن پر جم جاتی ہے۔

اس طرح مصنفین تاریخ کی ایک بڑی جماعت کو پکڑ دیتے ہیں اور ایسی تاریخیں کتابوں کے مطالعہ کرنے والوں کے گلے میں طوق ملامت و گمراہی پڑ جاتا ہے۔

حتیٰ کہ سید جمال الدین محدث مصنف روضۃ الاحباب بھی بعض جگہ اسی قسم کے غلط تاریخی مواد کو نقل کر گئے ہیں

خصوصاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بیعت کا معاملہ اور اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا سکوت و تامل۔
یا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے واقعہ قتل سے متعلق حوالہ !

اور جہاں اس قسم کی ملاوٹ ہوتی ہے وہاں وہ بوقت نقل یوں کہتا ہے کہ بعض روایات میں یوں آیا ہے۔
اس لئے محققین اہل سنت نے نامعلوم الحال مصنف کی تاریخوں سے احتراز کرنا ضروری سمجھا۔

باون والی دھوکہ مسورین کو یہ ایک اور دھوکہ دیتے اور نئی چال چلتے ہیں وہ اس طرح کہ تاریخ کی ایک کتاب لکھتے ہیں۔ اور اس میں اہل سنت کی معتبر کتب تواریخ سے بلا خیانت حوالہ جات نقل کرتے ہیں لیکن جب صحابہ کرام کا ذکر اور ان کے باہمی تنازعات کا موندہ آتا ہے۔ تو ان کی بعض برائیاں محمد بن جریر طبری شیعی کی تاریخ سے جو اس نے مذمت صحابہ میں لکھی ہے نقل کر دیتے ہیں۔ یا اس کی کتاب ایضاً از شیعہ سے جو امامت کے بیان میں ہے، کوئی حوالہ دینا کر دیتے ہیں۔ مگر ان کتابوں کا نام وضاحت سے ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً یوں کہیں کہ تاریخ طبری میں یوں لکھا ہے، یا مصنف تاریخ طبری نے اپنی ایک اور تفسیر میں اس طرح بیان کیا ہے۔ اور اس عدم وضاحت سے مقتصد ناظرین کو یہ دھوکہ دینا ہوتا ہے۔ کہ وہ یہ خیال کر لیں کہ یہ حوالہ محمد بن جریر طبری شافعی کا ہے جو تاریخ کی بہت مشہور کتاب اور اصح التواریخ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طبری کی ایک کتاب تاریخ کبیر بھی ہے۔ اس دھوکہ میں پھر نقل و نقل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس نقل کو صحیح سمجھنے والے بحر ضلالت کے مجنوں میں پھنس کر غوطے کھاتے رہتے ہیں طبری کی تاریخ کبیر اب نادر الوجود ہے، اس کا اصل بہت کم دستیاب ہے، جو نسخہ ملتا ہے۔ وہ اس کا اختصار ہے۔ اور یہ اختصار بھی ساطی نامی شیعہ کا تحریف کردہ ہے۔ اس کا بیان انشاء اللہ آگے چل کر ہو گا اور اس مختصر کے ترجمین میں اکثریت شیعوں کی ہے۔

ترہین والی دھوکہ۔ بعض مصنف تاریخ کی کوئی کتاب از خود لکھتے ہیں۔ اور اس میں تمام تر باتیں جو صحابہ کرام کی شان میں ہنس آمیز اور پراپیوں کو ظاہر کرتی ہوں گھر گھر کر شامل کرتے ہیں۔ تاکہ سطحی ذہن کے لوگ اس کے حوالہ جات اپنے ہاں نقل کریں اور اپنی روزمرہ گفتگو میں استعمال کریں تاکہ رفتہ رفتہ وہ شہرت پاجائیں اور لوگ ان کو اختلاف روایات سمجھنے کے فریب میں مبتلا ہو جائیں اس مکاری اور فریب کا موجد اور رائج کرنے والا پہلا شخص ابو مخنف موطن یحییٰ از دی نامی شیعہ ہے۔ اس کی کتاب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی لڑائیوں کے اکثر قصے زسر تاپا، جھوٹے، بناوٹی اور من گھڑت ہیں۔

چون والی دھوکہ۔ ان کے بعض علماء علم کلام کی کتابوں میں صحابہ کی مذمت کا مستقل باب قائم کرتے ہیں اور اس کے ثبوت میں اس باب کے تحت اہل سنت کی بیعت، حسن، اور ضعیف احادیث لفظی یا معنوی معمولی سی تحریف کے ساتھ لے آتے ہیں، حالانکہ اس پر ذرا سی توجہ اور معمولی غور بھی کر لیا جائے تو ان میں ان کے منہد مطلب کوئی بات بھی نہیں ہوتی بلکہ وہ ان کی تحریف کا بھانڈہ چھوڑ دیتی ہیں اور جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کی تردید کرتی ہیں اس کی ایک مثال۔

ایک مرتبہ خلیفہ ثانی عمر الفاروق رضی اللہ عنہ بسر منبر بھاری بھاری مہربانہ دھتے پر ماضی کو سمجھا رہے تھے کہ اگر بھاری مہر دیا تو آخرت میں موجب نفع ہوتا تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے

زیادہ لائق تھے کہ یہ فخر حاصل کرتے حالانکہ تم جانتے ہو کہ ازواجِ مطہرات اور آپ کی صاحبزادیوں اور عنان اللہ علیہم کا مہر پانچ سو درہم سے زیادہ نہیں بندھا۔ ایک عورت جو اس مجلس میں حاضر تھی بولی کہ اللہ تعالیٰ نے تو بھاری مہر کو جائز رکھا جب کہ فرمایا اَوْتِیْمُ اِلَیْکُمْ اَھْلُکُمْ تَنْظُرًا اور دیا تم نے ان میں سے ایک کو ڈھیر، تو آپ ہم کو اس سے کیوں منع کرتے ہیں۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے کلام الہی کے ادب کو ملحوظ رکھتے اور کچھ قواعد برتتے ہوئے فرمایا اِنَّکُمْ لَیْسَ بِکُمْ عَمْرٌ حَتّٰی اَلْخُدَّ رَاٰتِ فِی الْاَجْحَالِ۔ درہم سے تمام لوگ زیادہ فقیہ ہیں حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی۔

اسی شیعی مؤلف نے اس روایت کی ترجمانی یوں کی کہ آپ اس عورت کے جواب سے عاجز رہے لہذا اس کو اس بابِ مسلمان میں درج کر دیا۔

چھپنوں وال دھوکہ۔ ان کے بطور دھوکوں میں ایک بڑا دھوکہ یہ ہے کہ یہ اپنے مذہب کے موافق کوئی سفینہ گھر کر اس کو امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ حالانکہ آپ اس سے پاک اور بالکل بری الذمہ ہوتے ہیں۔ بڑی چھان بین اور تنگ دود کے بعد ان کی عیاری کا پتہ چلا کہ وہ یہ دھوکہ چند طریقوں سے دیتے ہیں۔

اول۔ پورے کا پورا کلام ہی گھڑ لیتے ہیں۔ آپ کے کلام کا ایک لفظ نہیں ہوتا۔

دوم۔ آپ کے کلام میں ایک دو لفظ گھسا بڑھا دیتے ہیں۔

سوم۔ روایت بالسنی کرتے ہیں۔ آپ کے الفاظ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ معنی جو یہ آپ کے کلام سے اپنے خیال نام میں سمجھتے ہیں اس کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر بیان کر دیتے ہیں۔

چنانچہ شیخ البلاغہ جو مشہور کتاب ہے جس کا مصنف بعضوں نے رضی کو کہا ہے اور یہی صحیح ہے اور بعضوں نے اس کے جہانی مرتفی کو اس کا مصنف کہا ہے وہ کتاب اسی نوعیت کے کلام سے بھری ہوئی ہے! کیا یہ ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خطبات، خطوط، مواعظ اور نصائح کو اول کیا پھر اس میں حسبِ منشا کانٹ چھانٹ، کمی بیشی، الفاظ، کلمات اور جملوں میں تغیر و تبدل اور تحریف کر کے اپنے مذہب کے موافق بنا کر اس کا نام شیخ البلاغہ رکھ دیا۔ بالغ نظر ارباب علم بیک نظر پہچان لیتے اور صاف صاف معلوم کر لیتے ہیں کہ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے کلام کا مشد کیا گیا ہے۔ اس میں سے کچھ حروف نکال دیئے گئے اور بے موقع کلمات کی آگے پیچھے پویند کاری کی گئی ہے۔ آپ کے کلام یا تقریر میں اگر کہیں کچھ نام آگئے ہیں تو بعض جگہ ناموں کی جگہ لفظ فلاں کا اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ کلام کی صحیح مراد سمجھنے میں دشواری ہو۔ اہل صفت اس سے دلیل نہ لاسکیں، رجب بن محمد بن رجب البرسی الحلی کی کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے بعض اور کتابوں کا بھی حال یہی ہے۔

چھپنوں وال دھوکہ۔ ان کا کوئی عالم کتاب خود تصنیف کرتا ہے مگر اس کو ائمہ طاہروں میں سے کسی کے نام منسوب کر دیتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں اس امام کے صحیح اقوال اور معتبر روایات درج کرتا ہے تاکہ قاری کو اطمینان ہو جائے کہ کتاب کی نسبت صحیح ہے مگر درمیان میں وہ ایسی روایات ٹھونس دیتا ہے جو من گھڑت اور بناوٹی و جعلی ہوتی ہیں اور اس کے مطلب کے موافق ہوتی ہیں۔ ایسی کتابوں میں سے ایک وہ تغیر ہے جس کو امام ابو محمد حسن بن علی عسکری کی طرف منسوب کیا گیا ہے، حالانکہ وہ ابن بابویہ کی تالیف ہے۔

ستاؤن دان دھوکہ :- ان میں کوئی فصیح البیان شخص ایک ایسی دعا گھڑتا ہے جس میں تینوں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے شان میں گستاخی اور لعن طعن ہوتا ہے۔ اس دعا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کہ آپ کی دعائے قنوت یہی تھی۔ ایسی ہی دعاؤں میں سے ایک وہ دعا ہے جس کو یہ لوگ دعائے صنوی قریشی کنواں سے مشہور کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں جناب شیخین رضی اللہ عنہما کو صنوی قریشی (قریش کے دریت) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بطور نقل کفر اس کا ترجمہ یہ ہے :-

اے خدا لعنت کر قریش کے دو بہتوں، درطاغوتوں اور دو معبودوں پر جنہوں نے تیرے حکم کے خلاف کیا دجی کے منکر ہوئے، تیرے انعام کا انکار کیا تیرے رسول کی نافرمانی کی تیرے دین کو الٹ دیا تیری کتاب کی تحریف کر دی الی آخر البکواس۔

اس دعا کے جھوٹ اور بے اصل اور مفادات ہونے میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں کیونکہ قریش کے ایسے دو بہتوں کا وجود شیعوں کے دہم کے سوا کہیں نہیں ہے!

اعطاؤن دان دھوکہ :- ان کا کوئی شاعر چھ ایسی ابیات لکھتا ہے جن میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی تعریف بعد الانبیاء آپ کی فضیلت، آپ کی امامت کی تعیین، اور شیعی مذہب کی حقانیت بیان ہوتی ہے پھر ان اشعار کو یہودی، یا نصرانی میں سے کسی ذمی کے سر قھوپ کر اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور مطلب ان کا حرف ایک ہی ہے کہ کسی سنی کو گمراہ کیا جائے ان کی ایسی حرکتوں سے کوئی جاہل شی دھوکہ کھا بھی جاتا ہے اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ ایک کافر نے جب ایسی باتیں کہیں ہیں تو لا محالہ ان کا مضمون، توریت و انجیل یا کسی صحیفے سے ہی لیا ہوگا۔

اسی قسم کے وہ اشعار ہیں جنکو شیعوں نے ابن ففلون یہودی کے سر منڈھا ہے۔

عَلَى آيَاتِ الْمُؤْمِنِينَ هَذَا مِثْلُهُ دَمَا لِسَوَاكُ فِي الْخِلَافَةِ مُطْعَمُهُ

باعتبار تحقیق امیر المومنین علی ہی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کو خلافت کی آرزو کرنے کا کوئی حق نہیں۔

لَكُمُ الشُّبُّ الْعَالِي وَالْإِسْلَامُ الَّذِي تَقَدَّمَ بَلْ فِيهِ الْفَضْلُ أَجْمَعُ

وہ بلند نسب ہیں۔ وہ اسلام میں سب سے مقدم ہیں بلکہ ان میں تمام فضائل یکجا ہیں۔

لَوْ كُنْتُ أَهْوَى مِلَّةَ غَيْرِ مِلَّتِي لَمَا كُنْتُ إِلَّا مُسْلِمًا أَتَشْتَعِرُ

اگر میں اپنے مذہب کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کرتا تو شیعہ مسلم ہوتا

ذیل کے دو اشعار بھی اسی کی طرف منسوب ہیں۔

حُبِّي فِي الْوَرَاةِ جَنَّةٌ قَامُوا بِهَا يَارَبِّ اَوْزَارِ نَسِي

علی کی محبت مخلوق کے حق میں دھال سے اے خدا اس کی برکت سے میرے گناہ معاف کر دے۔

فَلَوْلَا حُبِّي لَمْ تَوْحِي حُبَّنِي حَقَّقْتَ فِي النَّاسِ مِنَ النَّارِ

اگر آدمی ان کی محبت کی نیت کر لے تو وہ آگ میں ہوتے ہوئے بھی آگ جہنم سے محفوظ رہے گا۔

اسی قسم کی اور مثالیں بھی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

انسٹھواں دھوکہ: اس حدیث کو حضرت علی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَعْنُ شَجَرَةٍ أَنَا أَصْلُهَا وَفَاطِمَةُ فَرْعُهَا وَأَنْتَ لِقَاطُهَا وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ شَرَفُهَا وَالشَّيْعَةُ وَرَاقَتُهَا وَكُلُّهَا فِي الْجَنَّةِ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم ایک ایسا درخت ہیں جس کی جڑ میں ہوں فاطمہؑ اس کی شاخ، تم اس کے پھل حسن و حسینؑ اس کے میوے اور شیعہ اس کے پتے ہیں۔ اور یہ پورا درخت جنت میں ہے،

اسی مضمون کو کسی شیعہ شاعر نے یوں نظم کیا ہے۔

يَا جَبْدَ شَجَرَةٍ فِي الْخَلْدِ نَائِلَتُهُ مَا شَلَهَا نَبَتْ فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرٍ
وہ درخت جو جنت میں اگا ہوا ہے کیا ہی اچھا ہے کہ زمین میں اس جیسا کوئی درخت نہیں اگا۔

الْمُهَيَّطُ أَصْلُهَا وَالْفَرْعُ فَاطِمَةُ ثُمَّ الْإِقَامُ عَلَى سَيِّدِ الْبَشَرِ
جس کی جڑ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، میں تو فاطمہؑ شاخ، پھر پھل سید البشر علیؑ ہیں۔

وَالْهَاشِمِيَّانِ سَبْطَاءُ لَهَا تَسْرُ وَالشَّيْعَةُ الْوَرَقُ الْمَلْفُ بِالْشَجَرِ
ہاشمی کے دو ہاشمی نواسے اس کا میوہ ہیں اور شیعہ اس درخت کے پلٹے ہوئے پتے۔

هَذَا مَقَالُ رَسُولِ اللَّهِ جَاءَهُمْ أَهْلُ التَّوَايَعِ فِي عَالٍ مِنَ الْخَيْرِ
رسول اللہ کا یہ وہ قول ہے جس کو بلند سند راویوں نے روایت کیا ہے۔

إِنِّي بِجَبْدِهَا أَجُودُ النِّجَاةَ يَهْدُ وَالْفَوْزَ فِي نَارِ مَوْعِدٍ مِنَ الْفُتُورِ
میں ان کی محبت کے صدقہ نجات کی امید رکھتا ہوں اور کامیابی اسی جماعت کے لئے ہے جو سب

جماعتوں سے افضل ہے۔

اس روایت کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ کہ اس حدیث کی صحت پر کوئی قطعی دلیل نہیں اور دلیل ہو بھی تو اس سے شیعوں کی مطلب برآری نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ نام کے شیعہ نہیں بلکہ وہ اصلی شیعہ مراد میں جو دراصل اہل سنت تھے اور ابتدائے ہمد میں جو شیعہ اولیٰ کے لقب سے مشہور تھے اس لئے کہ اس درخت سے پلٹے ہوئے پتے وہی تھے کہ کلمہ حوادث کے جھگڑا اور آندھیاں بھی ان کو شجر نبوت سے جھاڑنے میں ناکام ہو گئیں۔ وہ جناب امیر کے سچے ساتھی، اور خوشی و غمی کے جان نثار دوست اور رفیق تھے،

لیکن جب رافضیوں نے جو جناب امیر و اہل بیت کے دوست و نماد دشمن تھے یہ لقب ہتھیالیا۔ تو اہل سنت نے اس سے دست برداری دیدی دیکھو کہ اس وقت یہ لقب لائق افتخار نہیں قابل مذمت بن گیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے حاملین جہان و جان نثاراں اہل بیت نہیں تھے۔ سیاحوں کا ایک غزل تھا جس پر امیر المومنین اور ائمہ کرام نے ہمیشہ لعنت بھیجی!

دارقطنی نے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ أَنْتَ وَشَيْعَتُكَ فِي الْجَنَّةِ إِذْ أَنْ مِثْنُ يَزَعْمُ أَنَّهُ يُجْبَدُ

أَتُوا مَنِ يَصِفُ رُؤْنَ الْإِسْلَامِ يُفِظُونَ لَهُ يَفْرَحُونَ الْقَوَاتِ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيهِمْ لَهُمْ نَبْرُ يُقَالُ لَهُمُ التَّرَافُفَةُ
فَبَايَعَهُمْ نَا لِهَمْ مُشْرِكُونَ قَالَ عَلِيٌّ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا الْعَلَامَةُ نَبِيهِ قَالَ لَا شَيْهَدُ وَدَتْ جُمُعَةً وَلَا
جَمَاعَةً وَ يُطِيعُونَ عَلَى السَّلَفِ -

ر حضور علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اور تمہارے تابعین جنت میں جائیں گے۔
مگر ان میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو تمہاری محبت کے دعویدار تو ہوں گے مگر زبان سے اسلام کی توہین کریں گے۔
قرآن پڑھیں گے۔ مگر قرآن ان کے حلق سے نہیں اترے گا رافضی لقب سے وہ مشہور ہوں گے ایسے لوگوں سے تم
جہاد کرنا کیونکہ وہ مشرک ہوں گے جناب علی کرم اللہ وجہہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ان کی ظاہری نشانی کیا ہے۔
آپ نے فرمایا کہ نماز جمعہ و جماعت میں حاضر نہیں ہوں گے۔ اور اسلاف پر لعن طعن کریں گے۔

افاضل اہل بیت جناب موسیٰ بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم) سے روایت ہے کہ وہ
اپنے باپ سے اور وہ داد اسے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے شیعوں نے انہوں نے اللہ
کی اطاعت کی اور ہمارے جیسے کام کئے۔

سا کھواں دھوکہ بلہ اماموں سے اس قسم کی روایت کر کے اسے شہرت دیتے ہیں کہ شیعیان علی سے قیامت
کے دن کوئی باز پرس نہیں ہوگی اور بہشت میں صرف وہی داخل ہوں گے۔

اول تو سرے سے یہ روایت ہی جعلی، جھوٹی، اور من گھڑت ہے۔ بغرض محال اگر اس کو درست بھی تسلیم کر لیا
جائے تو اس سے شیعیان اولیٰ اور ان کے متبعین مراد ہیں نہ کہ رافضی (ان کو تو جنت کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔
اکسٹھواں دھوکہ ائمہ کی طرف نسبت کر کے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا اِنَّ كُشَيْعَةً عَلِيٍّ
يُغِيْطُهُمُ الرَّسُلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (علی کے شیعوں پر قیامت کے دن انبیاء بھی رشک کریں گے۔

حسب دستور یہ بھی روایت جعلی اور بناوٹی ہے اور ائمہ پر افتراء ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو اس سے مراد
اہل سنت کے وہ اولیاء کرام ہو سکتے ہیں جن کے متعلق حدیث قدسیٰ میں یوں آیا ہے۔ اَلْمُتَابِرُونَ فِيْ جَلَدِيْ لِهَمْ
مَنَابِرٌ مِنْ نُورٍ يَغِيْطُهُمُ الْبَيْتُونَ وَالْمُتَقَدِّمُونَ (میرے جلال و عزت کی خاطر باہم محبت رکھنے والے قیامت کے
دن ایسے نورانی منبروں پر بیٹھے ہوں گے کہ ان پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے) اس سے صاف پتہ چلتا
ہے کہ اس زمرہ میں وہی لوگ آئیں گے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خالصتاً وجہ اللہ محبت کرتے ہوں گے۔

اور ان کے حق تو اس سے فیضانِ ہدایت حاصل کیا ہوگا۔ اور ایسے حضرات جو اس صفت و خوبی پر فخر کر سکیں
صرف اور صرف اولیاء اہل سنت ہی ہیں نہ کہ رافضی نہ کہ جن کے اسلاف نے دنیا کی ناکارہ و بیہودہ غرض کی خاطر
مثلاً ملک و مال یا ریاست و سیادت کے لالچ، جاہ و شہرت کی حرص، یا ملکوں و سلطنتوں میں عذر و فساد برپا کرنے
یا ان کا تختہ الٹنے کی غرض سے خود کو آجانب کی طرف منسوب کر رکھا تھا تاکہ اس نسبت سے لوگوں کو دھوکہ میں
ڈال کر اور ان کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنا آئو سیدھا کر سکیں۔ پھر ان کے اخلاف بمصدق آیت کریمہ اِنَّهُمْ
اَنفَعُوا اَبَاءَهُمْ مَّنْ لَّيْنًا فَهُمْ عَلَى اَثَارِهِمْ يَفْرَحُونَ۔ (انہوں نے اپنے باپ داداؤں کو گمراہ پایا تو
خود بھی انہیں کے نقش قدم پر دوڑ پڑے۔

باسٹھواں دھوکہ: شیعوں کی مدح و ثنا اور تعریف و توصیف میں زیادتی اور مبالغہ کی حد و بھی پار کر جاتے ہیں، اپنی نقاسیر میں انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ انبیاء آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش ان کا مشر شیعوں میں ہو چنانچہ شب معراج جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے شیعان علی کے چہروں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن دیکھا تو عایت تناسکے ساتھ اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ انہیں بھی شیعان علی میں داخل فرما۔

چنانچہ دعا قبول ہوئی اور قرآنی آیت **وَإِنَّ مِنْ شُعْبَةٍ لِّدِبْرَاهِيمٍ** میں اسی کی طرف اشارہ ہے اس کے شیعوں میں سے ابراہیم ہیں۔

اس ہفوات کی شناعت اور قباحیت اور اس افتراء و بہتان کی ذلت و برائئ ظاہر و باہر ہے کہ اس سے انوالعزم انبیاء اور حضرت ابراہیم علیہم السلام پر شیعوں کی برتری اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کا درجہ امتیاز سے بھی گھٹایا اور کمتر ہے اور پھر آیت کریمہ سے یہ معنی مراد لینا رکاکت و ذلت تو ہے ہی اسی کے ساتھ قرآن کی کھلی تحریف بھی ہے اور نظم قرآن میں اختلاف، اعمار قبل الذکر اور ایہام خلاف مقصود جیسے عیوب لازم آتے ہیں، جو عام لوگوں کی گشتگو اور کلام تک میں معیوب سمجھے جاتے ہیں چہ جائیکہ کلام ربانی میں یہ پائے جائیں۔

ترسیٹھواں دھوکہ: ان کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے احسانات و انعامات ہیں کہ وہ قیامت تک ان کی ادائیگی سے عہدہ بردار نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف مبالغہ نہیں بلکہ کفر کی حد سے بھی اونچا مبالغہ ہے یہ خالی غولی الزام نہیں اس بارے میں اس فرقہ کی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں ان میں سے ایک یہ ہے جس کو ان کے معتبر راویوں نے روایت کیا ہے۔

کہ ایک روز جبریل علیہ السلام حضور علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک حضرت علی رضی اللہ عنہ آگئے، جبریل علیہ السلام اٹھ کر تعظیم بجالانے، حضور علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تو جبریل علیہ السلام کہنے لگے۔ مجھ پر ان کا ایک اتنا بڑا احسان ہے کہ زندگی بھر اس کے شکر یہ سے عہدہ بردار نہیں ہو سکتا۔ حضور علیہ وسلم نے دریافت فرمایا وہ کس طرح؟

تو جبریل علیہ السلام نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تو مجھ سے پوچھا میں کون ہوں، تو کون ہے، اور تیرا نام کیا ہے؟ مجھے اس کا کوئی جواب نہ سوجھا میں حیران پریشان اور خاموش کھڑا تھا کہ یہ نوجوان عین بردقت آپہنچا اور مجھ سے کہا فرمت! کہدے تو رب جلیل ہے۔ میں غیب ذلیل ہوں اور میرا نام جبریل ہے۔ اس وقت میں اسی احسان کے حق کی ادائیگی میں اٹھا اور کذاب بجالایا۔ پھر حضور علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تمہاری عمر کتنی ہے۔ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا کہ ایک ستارہ ہے جو تیس ہزار سال بعد نکلتا ہے اور میں اس کو تیس ہزار مرتبہ نکلنے دیکھ چکا ہوں۔

یہ قصہ اس فرقہ کے بھوٹ کا شاہکار ہے۔ کیونکہ ان دو تین حرفوں کی تعلیم کیا اس پورے قرآن کی تعلیم برابر ہو سکتی ہے۔ جو صاف اور بے شبہ حکم قرآن کے موجب حضرت جبریل علیہ السلام کے درمیان پیغمبر علیہ السلام تک اور آپ سے حضرت رضی اللہ عنہ تک سبھی اتنی بڑی اور عظیم الشان نعمت کے مقابلہ میں ان دو حرفوں کی کیا حقیقت اور ان کا کیا حق اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی طالب علم استاد سے قرآن مجید حفظ کرتا ہے اور پھر تراویح میں اپنے استاد کو کہیں

ایک لقمہ دیدینا ہے تو استاد کے اتنے بڑے احسان کے مقابلہ میں اس لقمہ کی کیا حیثیت ہوگی۔
اب رہا حضرت جبریل علیہ السلام کی عمر کا معاملہ، یہ معاملہ خلاف عقل و مشاہدہ ہے کیونکہ کسی ستارہ کا تیس ہزار سال بعد طلوع محلات میں سے ہے اکثر آباد اقلیموں میں ستاروں کا طلوع و غروب تک الافلاک کی حرکت سے ہے جس کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہے کہ ملت دن میں عالم کا پورا پورا پیکر طے کر لیتا ہے۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام آٹھویں آسمان سے جو ثوابت ستاروں کا مرکز ہے دن رات میں کئی مرتبہ گزر جاتے ہیں تو ان کی طرف کسی ستارہ کے طلوع و غروب کے دیکھنے کی نسبت کرنا خلاف عقل ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل تو جس ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وجود ظاہری جو کچھ جبریل علیہ السلام سے ہزاروں سال بعد ہے تو آپ کی تعلیم کا مسئلہ کیسے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر جناب امیر کا وجود شمال یا ردی مائیں نور بھی بیکار سی بات ہے اس لئے کہ اس وقت نفس ناطقہ کا وجود کہاں تھا جس پر اختیاری اعمال کا دار و مدار ہے جو مدح و مذم ثواب و عقاب اور ثبوت حقوق کا مصداق ہے۔ بلکہ ان وجوہات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جو صفات و اسماء کی حیثیت میں اس کی پاک ذات میں ثابت و قائم ہیں اس وجود میں جو افعال کسی شخص سے صادر ہوں ان کی نسبت اس کی طرف نہیں کی جاسکتی اور وہ مدح و مذم یا اثبات حقوق کے قابل نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ ساری باتیں اپنی اپنی جگہ علمی طور پر ثابت شدہ حقیقت کے طور پر بیان و تحریر میں آچکی ہیں

آنے والے دھوکہ کا حل بھی مندرجہ بالا تحریر میں آگیا۔

چونکہ سٹھواں دھوکہ ان کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فرشتوں کو تسبیح و تہلیل کی تعلیم دی ہے۔

یہ بات بھی اس دروغ و فرقہ کی بے اصل زیادتیوں اور لغویات میں شمار کئے جانے والا جھوٹا ہے کیونکہ فرشتوں کی تسبیح و تہلیل تو وجود آدم سے پہلے ہی سے ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ اَہم حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وجود ظاہری جو اختیاری افعال کی جائے صدور ہے وجود آدم علیہ السلام سے ہزاروں سال بعد ہے۔

پہنچا سٹھواں دھوکہ بعض ایسے کلمات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں تو زبان زد معلق ہیں اور بہت مشہور و معروف بھی، مگر محدثین کے نزدیک بے اصل ہیں، جیسے ولولک لما خلقت الذلک و آپ نہ ہوتے تو ہی آسمانوں کو پیدا نہ کرتا، ان ہی کلمات کو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پسپا کرتے اور ان کو قطعی الثبوت بتاتے ہیں مثلاً ابن بابویہ نے ایک مرفوع حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے لولا علی لما خلق اللہ المبین والملائکہ را اگر علی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ پیغمبروں اور فرشتوں کو پیدا نہ کرتا۔

چھپا سٹھواں دھوکہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ مرنے والا مومن ہو یا ناجو، موت کے وقت اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دیدار ہوتا ہے۔ پس آپ اپنے شیعوں کو دوزخ کے عذاب، ملک الموت کے مددگاروں اور عذاب کے فرشتوں سے نجات دلاتے ہیں۔ اس کو خوشذائق، ٹھنڈا شراب پلاتے ہیں اور دوزخ کو مکمل دیتے ہیں کہ ان کے شیعہ کو کسی قسم کا آزار اور تکلیف نہ پہنچائے۔ اور ناجو کے لئے۔ اور ان کے نزدیک ہر وہ شخص ناجو ہے جو ان

کے نمبر سب پر نہیں ہے عذاب دیئے جانے کا حکم فرماتے ہیں گو یا ثواب و عذاب کے فرشتے ان کے زیر فرمان ہیں ان لوگوں کا یہ عقیدہ عیسائیوں کے اس عقیدہ سے ملتا جلتا ہے جو اس کے تائیل ہیں کہ تمام بنی نوع انسان کی ارواح حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ کے پاس لوٹ کر جاتی ہیں، اور تمام حساب کتاب جزا سزا، انعام بخشش اور دار و گیر آپ ہی کے سپرد ہیں فرق اتنا ہے کہ عیسائیوں کو ایک تنگ یہ اعتقاد زیب دیتا ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں اور ہر بیٹا اپنے باپ کے مہات کے اجراء و تنقیذ میں اس کا نائب اور ولیعہد اس کے بجائے کاغذات پر دستخط کرتا ہے سلام و بحر الیتا اور نذرانے وصول کرتا ہے برخلاف رافضیوں کے کہ وہ امیر المومنین کو وصی اور نائب رسول مانتے ہیں اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے فرستادہ بندہ ! پھر یہ لوگ معلوم نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ مرتبہ کس منطوق اور دلیل کے ساتھ دیتے ہیں۔

بعض شیعہ چند اشعار پیش کرتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ماریت امور مہدانی سے دوران گفتگو میں یہ اشعار سنائے جو آپ کے اس حق کو ثابت کرتے ہیں۔ یہ ماریت امور مہدانی دنیا کا مشہور چٹھا ہوا کذاب اور دروغ گو ہے۔ کچھ عجیب نہیں کہ اس نے خود یہ شعر گھڑ کر انہی نسبت جناب امیر کی طرف کر دی ہو۔ اور یوں لوگوں کی گمراہی کا ذریعہ بنا ہو۔ پھر ان اشعار کے شروع میں منادی مضاف کی ترمیم واقع ہے جو تمام ماہرین لسان عربی کے نزدیک غلط اور خطا ہے۔ لہذا یہ غلطی ہی اس بات کا واضح اور صاف اعلان ہے کہ یہ اشعار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نہیں ہو سکتے یہ اسی کذاب، نے گھڑے ہوں گے اشعار یہ ہیں۔

يَا حَاۤءَ هَمْدَانِ مَنْ يَنْتَ يَرْفِي مَنِ مَوْجِبِ اَوْ مَنَا فِتِي قَبْلَ

اے ماریت جو کوئی مریا ہے تو مجھے دیکھتا ہے خواہ وہ پہلے مومن ہو یا منافق۔

يَعْرِفُنِي لُخْطَةً وَاَعْوَدُهُ بِنَعْتِهِ وَاَسْمِهِ وَمَا نَعَكَ

وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے اور میں بھی اسے اس کے نام، اوصاف اور اعمال کے ساتھ پہچان لیتا ہوں۔

اَقُولُ لِلنَّارِ حِينَ تَعْرِضُ لِلْعَبْدِ ذَرِيَّةً لَا تَقْرَبِي الرَّجُلَا

جب بندہ کے پاس آگ آتی ہے تو میں اس سے کہتا ہوں اے چھوڑ اس کے قریب نہ جا۔

نَا رَيْدٍ لَا تَقْرَبِيۤهٗ اِنَّكَ لَهٗ جَلَدٌ بِجَلَلِ الْوَصِيِّ مُشَوِّدٌ

اے چھوڑ اس کے قریب نہ جا کہ اس کا رشتہ وصی سے منسلک ہے۔

اَسْتَقِيهِ مِنْ بَارِدٍ عَلَى ظَمَاۤءٍ تَخَالُهُ فِي حَلَاوَةِ عَسَلٍ

میں پیاس کے وقت اسے ٹھنڈا اور شہد سا شیریں پانی پلاتا ہوں۔

قَوْلٌ عَلَيَّ لِعَايَرٍ عَجَبٌ كَمْ ثَمًّا اُجْزِبُهُ لَهٗ مَثَلًا

ماریت کے لئے علی کا یہ قول عجیب ہے اور اس کے مثل اور بہت عجوبے ہیں۔

اور بضر محال یہ اشعار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہی ہوں تب بھی اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنے

مخلصوں کی نبرد اور شفاعت ثابت ہوتی ہے۔

اور یہ بات بھی شیعیان اہل سنت کے لئے باعث مسرت ہے۔ یہ ہے کہ رافضیوں کے لئے مگر یہ مبالغہ اس سے کہاں ثابت ہو کہ دارالجماد کا پورا کارخانہ ہی جناب امیر کے قبضہ قدرت میں ہے۔
طرسٹھواں دھوکہ کہ اہل سنت پر شیعہ یہ طعن کرتے ہیں کہ یہ لوگ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں کہ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَعَلِّي اِنَّ اللَّهَ قَدْ نَزَّ وَجَّكَ فَاُطِمَّةً وَجَعَلَ الْاَنَافُ مِثْلًا قُفَا حُفُورٍ صَلَّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فاطمہؑ کو تمہاری زوجیت میں دیا اور دسے زمین ان کے ہر میں دی

جب واقعہ یہ ہے تو خلیفہ ازل درہنی اللہ عنہ نے فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کیوں نہیں دیا اور اہل سنت اس معاملہ میں انکو حق بجانب کیوں کہتے ہیں۔ یہ تو کھلا تناقض ہے جو ان کے مذہب میں پایا جاتا ہے۔
 اس طعن کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے ہاں یہ روایت صحیح یا نہ حقیف کسی بھی طریقہ سے کہیں نہیں ہے یہ شیعوں کا خالص افتراء اور مبتداع ہے ہاں بنگال کے جاہلوں میں یہ فرد مشہور ہے کہ بنگال کا ملک برہمنستان کی ترائی میں واقع ہے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جہیز میں ہے یہ بات کیوں اور کیسے مشہور ہوئی اس کا پتہ بھید اور سبب نہیں کھتا ویسے جہاں بہت سی بے اصل باتیں مشہور ہوتی ہی رہتی ہیں اور فدک چونکہ بنگال میں نہیں اس لئے اس کا سامانہ ناقابل عمل ہی رہا۔

اگر ذرا بھی غور اور عقل سے کام لیا جائے تو اس روایت کی گھڑت اور افتراء صاف نظر آجاتا ہے اس لئے کہ شیعوں یا سنیوں کی کتابوں میں یا تو فدک کی میراث کا دعویٰ منقول ہے۔ یا دعویٰ ہبہ اور مذکورہ بالا روایت کی رو سے خاص میراث یا ہبہ کے دعویٰ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بلکہ ساری زمین کی ملکیت کا ہی دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔
 اور جب یہ ہوتا تو پھر کسی شیعہ یا سنی کو یہ حق نہ ہوتا کہ وہ جناب زہرا رضی اللہ عنہا یا آپ کی اولاد کی اجازت کے بغیر زمین کا کوئی ٹکڑا اپنی ملک میں لاسکے۔

اور اس کا تقاضا لازم یہ بھی تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیر یا دیگر مفزومہ علاقوں کو غنیمت پانے والوں میں بطور جاگیر یا انعام تقسیم کرنا یا یہ کار نظام ہو کہ چونکہ اس صورت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد کی حق تلفی ہوتی تھی۔

خلاصہ کلام یہ اس کلام فاسد کی برائیاں اور خرابیاں حد و شمار سے بھی زائد ہیں۔ لہذا ایسی لغو اور باطل روایت کی نسبت اہل سنت کی طرف کرنا ایک انوکھا افتراء ہے۔ اور کچھ نہیں۔

اڑسٹھواں دھوکہ کہ اہل سنت پر ان کا ایک طعن یہ ہے کہ یہ روایت نقل کرنے میں منافق اور مخلص کی بھی تمیز نہیں کرتے ہر صحابی روایت لے لیتے ہیں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذنات کے بعد سادہ دجی منقطع ہونے کے سبب منافق و مخلص میں تمیز اٹھ چکی تھی۔ بخلاف شیعہ کے کہ وہ صرف اہل بیت سے ہی روایت کرتے ہیں۔ جن کی پاک و طہارت اور ان کا گندگی سے پاک ہونا نص قرآنی سے قطعی الثبوت ہے۔ اس طعن کا جواب یہ ہے کہ شیعوں نے آئمہ سے براہ راست بلا واسطہ کچھ نہیں سنا۔ اور یہ واسطہ بھی ایسے مفتر یوں اور جھوٹوں کا ہے جن پر خود آئمہ لعنت بھیجتے اور ان کی تکذیب کرتے رہے۔ یہ واسطے زیادہ تر ہشام بن اعلین جیسے برا عقائد اور محدوزہ ذلیق لوگوں کے ہیں۔ اس کی

تفہیم جم باب سوم و چہارم میں شیعوں کی کتابوں کے حوالوں کے ساتھ بیان کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ شیعہ ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جن کا نفاق ائمہ معصومین کی قطعی شہادت سے ثابت ہے بخلاف اہل سنت کہ ان کے مجتہدین نے بلا واسطہ ائمہ کرام سے علمی خوشہ چینی کی ہے۔ اور انہوں نے ان ہی ائمہ کی اجازت اور شہادت سے ہی اجتہاد و فتویٰ کی ذمہ داری کو انجام دیا ہے۔

چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور ان دونوں حضرات کے بارے میں امام موسوف رحمہ اللہ علیہ نے بشارتیں دی ہیں۔ جو حسب موقع مناسب بیان ہونگی۔ دوسرے یہ کہ منافق اور بے دین کی روایت لینے میں غلطی اس وقت ہے کہ وہ اپنی روایت میں تنہا ہو اور جب اہل بیت یا اکابر صحابہ سے جن کے مرتبہ کی بلندی نصوص قرآنی سے ثابت ہے، کسی حدیث کی روایت ہو اور پھر اسی کی تائید میں دوسروں سے بھی روایت ہو جن کے نفاق پر بلا ہر کوئی دلیل نہ ہو تو اس روایت کے قبول کر لینے میں کیا تباہی ہے۔ خصوصاً قرن صحابہ و تابعین میں تو سب ہی صلاح و صدیق کی صفت سے مستصف تھے جب کہ امام لائے سرور کو نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس پر شاہد ہے۔

خَلِّوْا الْفُرُودَ قُرْبَىٰ لِّمَنْ يَكُوْنُ مِنْهُمْ (الی آخرہ روایت)

(سب صدیوں سے بہتر میری صدی ہے۔ پھر اس کے بعد والی)

نیز جناب امیر المومنین اور ائمہ اطہار رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو جبر صدیق رضی اللہ عنہ یا دوسرے خلفاء راشدین اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے روایتیں کی ہیں اور ان کی تصدیق فرمائی ہے۔

پھر یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر حیات کے وقت مومنین اور منافقین باہم ممتاز ہو چکے تھے اور آپ کی وفات کے بعد کوئی منافق زندہ نہیں رہا تھا۔ جس پر یہ آیت شاہد ہے۔ مَا كَانَتِ الْفِتْنَةُ الْفُتْنَةَ عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَیْہِ حَتٰی یَمِیْنُوْا الْحَبِیْثَ مَوْتَ الطَّیِّبِ (یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ پاک و ناپاک کو جدا کئے بغیر مومنوں کو اس حال میں چھوڑ دے جس پر تم ہو) اور یہ حدیث بھی آوِ اِنَّ الْمَدِیْنَةَ تَمُوتُ النَّاسَ کَمَا یَمُوتُ الْکَبِیْرُ حَتّٰی یَخْبُثَ الْحَدِیْدُ (یوں سمجھ لو کہ مدینہ لوگوں کو ایسے نکھار دیتا ہے جیسے جھڑی کو پھل سے) اور اگر نکلا چھپا منافق رہا بھی ہو تو صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کی شان و شوکت اور ان کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دہرے سنے اور ان کی گرفت سے جو وہ روایات میں تساہل برتنے والوں کے خلاف عمل میں لاتے تھے اتنا خوفزدہ و ہراساں رہتا ہو گا کہ دین یا واقعہ کے خلاف کوئی روایت گھڑنے کی اس میں جرات و ہمت ہی کہاں باقی رہتی ہوگی۔

چنانچہ سیر خلفاء کا گہرا مطالعہ کریں والوں پر یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ اور پھر اہل سنت نے بطور اصول ایک قاعدہ مقرر کیا ہے جسکی وجہ سے بفضل خدا وہ اس آمیزش کے خطرہ سے محفوظ ہیں کہ بمقتضائے تَبَعُوْا السَّوَادَ الَّذِیْنَ عَظَّمُوْا (اکثریت کی پیروی کرو) ان کو جو روایت خلاف جہور ملتی ہے وہ اس کو ترک کر دیتے ہیں۔ برخلاف شیعہ کے کہ وہ ان منافقین کے کھلونے ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد ہی جہور کی مخالفت پر رکھی ہے اور نادر و کمیاب روایتوں کا کھوج لگاتے پھرتے ہیں اور ان ہی کو معیار عمل بتاتے ہیں۔ پس منافقین کا دخل ایسی ہی روایات میں ہے بلکہ ان کے دین و مذہب اور ان کی روایات کا انحصار ہی ان پر ہے۔

انہتر واں دھوکہ اسلوا کہتے ہیں کہ قیامت کے دن حشر کی ہولناکی وزن اعمال اعمالوں کی پیشی اور اعمال پر سزا دیا جائے گا یہ سب خطرات جو روایات میں منقول ہیں غیر شیعہ کو درپیش ہوں گے شیعہ ان تمام شدائد سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ اور اس بہتان کی نسبت ائمہ کرام کی طرف کرتے ہیں۔

شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ بالیقین نجات یافتہ ہیں اس لئے کہ وہ نحن ابنا اللہ و اجاء میں ہم اللہ کے بیٹے اور ان کے محبوب ہیں، اور کہتے ہیں کُنْ تَقَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّتَدُودَاتٍ۔ (ہمیں آگ صرف چند دن ہی چھونگی۔ حالانکہ یہ دعویٰ ان نفوسِ قطعہ کے خلاف ہے یعنی مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ (جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اسے دیکھے گا۔ اس کا بدلہ پائے گا، اور مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اسے دیکھے گا۔) ستر واں دھوکہ اسلوا یہ اہل سنت پر بہتان لگاتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کوئی شخص اس وقت تک سنی نہیں ہو سکتا جب تک اس کے دل میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے خلاف چکوریامرغی کے انڈے کے برابر بغض نہ ہو اس افراد اور بہتان کی بنیاد و اصل یہ ہے کہ کسی شیعہ عالم نے ان ہی الفاظ کی ایک روایت علی بن الجہم بن بدر بن الجہم القرشی سے بیان کی ہے۔ اور یہ علی فرقہ نواصب میں اول درجہ شریہ اور چٹا ہوا لپا تھا جو کسی خفیہ مصلحت سے سنی کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ اور تقیہ پر عامل تھا اور عمر بھر امیر المومنین سے لوگوں کو برگشتہ کرنا اس کا مقصد زندگی رہا اور اس نے ایسا کیا تو کیا بعید ہے اور ان کے خلاف نے جو سطحی ذہن اور بے تحقیق تھے اس روایت کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اہل سنت کے حق میں خاص طور سے مجالس المومنین کے مصنف نے تو بالکل ہی یقین کر لیا ہے کہ ہر سنی کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ضرور بغض ہوتا ہے مگر مخالفین کے ڈر اور خوف سے آپ کے بعض فضائل بھی بیان کر دیتے ہیں مخالف کے خوف کا بائوس ایسا سوار ہے کہ اب سنی میں بھی انہیں "تقیہ" نظر آنے لگا۔

میرت اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ پڑھا لکھا شخص جو بزم خود عقلمند بھی ہے۔ اتنا نہیں سوچتا کہ دلوں کا حال تو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا تھے سنیوں کے دل کا حال کیسے معلوم ہو گیا ہے۔ (اَلْأَسْرُ يُقَدِّسُ عَلَى نَفْسِهِ ہر انسان دوسرے کو بھی اپنے اوپر قیاس کر لیتا ہے، یہ اپنے تقیہ اور خوف کی نسبت کر کے ان کو بھی اپنے جیسا بزدل اور منافق سمجھتا ہے کیا اس نے تاریخ میں نہیں دیکھا کہ علماء اہل سنت نے ظالم و سفاک اور خونخوار امراء نواصب حجاج و لید کے سامنے بے دھڑک اپنے مذہب کا اظہار کیا اور خاندان نبوت پر اپنی عزیز جانیں نثار کر دیں اور موت سے دوچار ہوئے چنانچہ اہل سنت کے جلیل القدر محدث و امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف اس جرم میں کہ امیر المومنین کے مناقب میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ جام شہادت نوش کیا، اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے جو جناب حسنین رضی اللہ عنہما کو ذریت رسول کہتے تھے حجاج کے سامنے اس کا اظہار کیا۔ وَ تِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا اَبْنَاءَ اٰدَمَ عَلٰی قَوْمِهِ۔ سے حجاج کو مسکت جواب دیا اور اس کی پادش میں خون شہادت سے گلدار ہوئے۔ اس تعصب اور اندھے پن کا کیا ٹھکانا کہ نادیدہ کو دیدہ بنانا اور ان سنی کو سنی خیال کر لینا سنی اگر ایسے ہی بزدل تھے تو انہوں نے جس طرح مخالفین کے ڈر سے امیر المومنین کے فضائل بیان کئے اسی طرح ان کے ڈر سے جناب شیعین رضی اللہ عنہم کی برائیاں کیوں نہ بیان کیں، کیونکہ مخالفین کے دلوں میں بھڑکتا ہوا جہنم صرف امیر المومنین کی تعریف سے تو ٹھنڈا نہیں پڑتا اس میں تو ٹھنڈک جناب شیعین رضی اللہ عنہما کی قدر سے پڑتی ہے۔

اکہتر سوال و جواب کہ شیعوں کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن اہل سنت کے اعمال و طاعات گرد و غبار کی طرح ہوا میں اڑ کر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس طعن کا بہترین جواب ہمارے خیال میں ان آیات میں موجود ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُفْنِيهِ أَجْرٌ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا وَاللَّهُ تَعَالَى اَجْبَدُ اَعْلَمُ

دوسری جگہ ارشاد ہے مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا۔)

شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ”رافضیوں کے علاوہ کوئی اور اگر ہزار سال بھی خدا کی عبادت کرے تقویٰ و زہد کا مجسمہ بھی بن جائے۔ تب بھی اس کو ہرگز اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ ہی وہ عذاب سے نجات پائے گا۔

مَالَكُمْ اَنْ كُنْتُمْ عَلَى الرَّغْمِ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى نَسِيًّا فَرِيًّا هَبْ لِيْ سَمْعًا يَسْمَعُ وَ لِيْ بَصَرًا يَبْصُرُ وَلَا اَمَانًا لِأَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزِيْهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا يُغْنِيْهِ اَنْ يَكُنْ مِنَ الصَّالِحِيْنَ مَنْ ذَكَرَ اَوْ اُنْشِيَ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولَئِكَ يَنْتَظِرُوْنَ الْجَنَّةَ وَكَانَ يُطْلَقُوْنَ يَقِيْنًا۔ یہ بات نہ تمہاری آرزو پر نہ اہل کتاب کی آرزو پر منحصر ہے بلکہ امر سب یہ ہے کہ جو کوئی برا کرے گا اس کی سزا پائے گا اور اللہ کے سوا کسی کو اپنا حامی و مددگار نہ پائے گا اور جو کوئی نیک کام کرے خواہ مرد ہو یا عورت اور ایمان رکھتا ہو گا تو ایسے سب لوگ جنت میں جائیں گے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ ہوگا

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ اہل سنت جناب امیر المومنین کی امامت تسلیم نہ کر کے اپنا ایمان ضائع کر چکے کیونکہ عقیدہ امامت بھی عقیدہ نبوت کی طرح ضروریات ایمان میں سے ہے۔

تو ہماری طرف سے یہ جواب ہے کہ امیر المومنین اور ائمہ طہرین کی امامت میں اہل سنت کو ذرہ برابر شک ہے نہ انکار ان کا قصور البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو بھی امامت کا مستحق سمجھتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ امامت کے مستحقین کی جماعت میں سے جب کسی ایک کی امامت پر اتفاق رائے ہو جائے تو وہی امام وقت ہے۔ چنانچہ ابابعل و عقد نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر اتفاق کیا اس وقت وہی امام تھے اور اہل سنت میں سے کسی نے ان کو امام ماننے سے انکار نہیں کیا خلاصہ کلام یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک اگر امامت کا استحقاق نص سے ثابت ہو تو وہ خلافت راشدہ ہے اور اگر عقل اور قرآن ظنیہ سے ثابت ہو تو وہ خلافت عادلہ ہوگی۔ اور بغیر استحقاق کوئی جاہلانہ طور پر تسلط حاصل کر لے تو اس کی خلافت جاہلہ کہلائے گی۔

اہل سنت کے نزدیک چاروں خلفاء کی خلافت و خلافت راشدہ ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا استحقاق نص سے ثابت ہے۔

اور اگر ہر امام کی امامت پر ہر وقت رچا ہے وہ اس وقت خلیفہ ہو یا نہ ہو اعتقاد رکھنا ضروریات ایمان میں سے شمار کیا جائے گا تو پھر شیعوں کو اپنے ایمان کی خیر ماننا چاہیے۔ کہ وہ تلف ہو جائے گا اس لئے کہ وہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی حیات میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی امامت کے معتقد نہیں تھے اور اسی طرح امام حسن رضی اللہ عنہ یہ تو ہر امام کی امامت کے زمانہ میں نہ تو ان سے پہلے کی امامت کو مانتے ہیں نہ آئندہ آنے والے امام کی امامت کو!

اس صورت میں شیعہ تمام ہی اماموں کی امامت کے معتقد نہ رہے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حین

حیات یہ سنت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کے بھی مستند نہیں تھے۔

اور پھر یہ شیعہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں کہ جناب محمد الحنفیہ اور جناب زید شہید رحمہما اللہ اور ان کے علاوہ دیگر امام زادوں نے امام زین العابدین اور امام باقر رحمۃ اللہ کی امامت اور استحقاق امامت کا صحت انکار کیا ہے اور مذکورہ الصدر و دونوں بزرگوں نے ان دونوں کو بھی امام تسلیم نہیں کیا تو اگر اس انکار کے باوجود محمد بن الحنفیہ اور زید شہید رحمہما اللہ کا ایمان صحیح و سالم ہے تو اہل سنت کا ایمان تو بدرجہ اولیٰ صحیح و سالم ہو گا۔ کیونکہ وہ تو اس کے قائل اور مستند ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ متقی امامت تو ہر وقت تھے۔ البتہ اپنے زمانہ میں امام و خلیفہ بالفعل ہو گئے۔

اور پھر کیا یہ بات باعث تعجب نہیں کہ شیعہ باوجود اہل سنت کے ساتھ شدید بغض و عناد رکھتے کے ان کی کتابوں میں خود ان ہی کی ایسی صحیح روایات موجود ہیں۔ جن سے اہل سنت کی نجات ثابت ہوتی ہے ہم انشاء اللہ باب معاد میں ان روایات کو نقل کریں گے۔ انہوں نے جس مباہلہ آرائی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان کے سطحی پن اور پست ذہنیت پر دال ہے، یہ نواصب اور اہل سنت میں تمیز نہ کر سکے اور ان کے عقائد کو اہل سنت کے سرخوہ دیا۔ ان کے اگلوں نے تو ناحق اور مغالطہ میں ایسا کیا مگر ان کے اخلاف نے خود یہ وہ داستانہ اس بد تمیزی

کو اپنا شعار بنایا

اسی طرح کی ایک اور بات ان کی کتابوں میں ملتی ہے، کہ اگر رافضی ہزاروں سال تک بھی اللہ کی نافرمانی اور اور محرمات قبیحہ کے مرتکب ہوتے رہے ہوں تب بھی ان سے قطعی باز پرس نہ ہوگی اور وہ بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ بلکہ شیعوں کو گناہ کے عوض بھلائیاں دی جائیں گی اور ان کی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ شیعوں کے بعض اعمال مثلاً اسلاف پر لعنت کرنا انبیاء کے اعمال کے برابر شمار ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایک شیعہ کا گناہ سنی کی عبادت سے افضل ہے اس لئے کہ شیعہ کا گناہ تو قیامت کے دن بھلائی سے بدل جائے گا اور اس پر اس کو اجر بھی ملے گا مگر سنی کا نیک عمل قیامت کے دن تلف ہو کر پرگندہ غبار کا ٹھونسا بن جائے گا۔

بہتر وال دھوکہ دہا ان کا اہل سنت پر یہ طعن ہے کہ انہوں نے اپنی صحیح کتابوں میں یہ روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چار رکعت والی نماز میں سہو ہوا اور آپ نے چار رکعت کے بجائے دو رکعت ادا فرمائیں۔ اگر کو آپ کے سہو کی روایت کرنا جرم ہے، اور حال یہ ہے کہ یہ روایت خود ان کی اپنی صحیح کتابوں میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ کلینی نے کتاب، کافی میں اور ابو جعفر طوسی نے تہذیب میں صحیح سندوں سے یہ روایت بیان کی ہے مگر خیر ہم اس سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور وہی جواب دیتے ہیں جو ایک دفعہ پہلے بھی دے چکے ہیں کہ انشاء اللہ میں سہو انبیاء کی شان میں کوئی عیب نہیں کہ اس سے لامحالہ صحیح بات کا انکار کیا جائے۔

ہاں البتہ تبلیغ احکام الہی میں انبیاء سے سہو ہونا متنع ہے اور نہ وہ کبھی واقع ہوا۔

بہتر وال دھوکہ دہا یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت نے اپنی احادیث میں یہ دافعہ نقل کیا ہے کہ لیلۃ القدر میں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح کی نماز قضا ہو گئی اس وادی میں ایک شیطان تھا۔ جس کے تسلط سے سب پر غفلت چھا گئی۔ تو

گویا آنحضرت علیہ السلام پر بھی شیطان کا تسلط ثابت کرتے ہیں۔

شیعوں کے اس دھوکہ میں وہ آسکتا ہے۔ جو ان کی کتابوں سے نادانف ہو گا یہی نے خود اپنی کتاب کافی میں اور ابو جعفر نے اپنی کتاب تہذیب میں بیۃ القریں کے اسی قصہ کو مختلف سندوں اور متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے پھر اہل سنت ہی ملزم کیوں؟ اپنے متعلق بھی تو کچھ بولئے۔

چوسہتر وال دھوکہ ہوا اہل سنت پر ان کا ایک افتراء یہ بھی ہے کہ انہوں نے خارجیوں اور حروریوں کو ثقہ و عادل تسلیم کر کے اپنی کتابوں میں ان سے احادیث کی روایت کی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابن بلجم سے بھی روایت کی ہے۔

ان کا یہ الزام بھی محض افتراء اور سر جھوٹ اور بہتان ہے، ان کو شرانے کے لئے اہل سنت کی ان روشن کتابوں کا آئینہ دکھادینا ہی کافی ہے۔

یہ کتابیں شرق سے غرب تک ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں کیا شیعوں کے علاوہ بھی کسی کو ان کتابوں میں خارجیوں اور ابن بلجم کی کوئی روایت نظر آئی یا آسکتی ہے!

کون نہیں جانتا کہ اہل سنت کے نزدیک تراویح اور امیر المؤمنین رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والے کی روایت کی محنت باطل ہے اگرچہ وہ صادق القول اور صالح العمل ہی کیوں نہ ہو، اور اسی بنا پر جریر بن عثمان کی توثیق کو اہل سنت نے غلط ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے ظاہری احوال اور کلام کی سچائی سے متاثر ہو کر جن لوگوں نے اس کی توثیق کی ہے ان کو دھوکہ لگا ہے اور انہیں اس کے باطنی عقیدہ کا پتہ نہ لگ سکا وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا۔

اسی طرح اہل سنت کی کتابوں میں ابن بلجم کو اشقی الاخرین کہا گیا ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی میں آچکا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کوچیں کاٹنے والا اشقی الادیین ہے اور امیر المؤمنین کا قاتل اشقی الاخرین ہے۔

پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابن بلجم نے شہید کر دیا۔ تو بعض حروریوں نے اس کی تعریف و توصیف میں نظمیں لکھیں اور اشعار کہے اور اس کے قابل نفرت فعل کی مدح و ستائش کی تو ان کا جواب بھی شعرائے اہل سنت نے دیا۔ اور ان کے جواب میں قصائد لکھے اور ان کو دندان شکن جواب دیئے چنانچہ یہ قصائد اور نظمیں کتاب استیعاب میں موجود ہیں۔

ابن بخاری میں مروان سے البتہ روایت آئی ہے باوجودیکہ وہ فاضل میں سے تھا بلکہ اس بد بخت گروہ کا سرغنہ اور سربراہ تھا۔ لیکن اس روایت میں بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی روایت کا مدار امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ پر رکھا ہے اور ان ہی پر روایت کو ختم کیا ہے اگر امام ہی مروان سے خود روایت کریں تو پھر امام بخاری کو اس سے بچنے اور احتراز نہ کرنے کا کب حق ہے۔ اس کے باوجود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تمام روایات سے کسی بھی جگہ روایت نہیں کی بلکہ مسرور بن محرزہ یا دوسروں کو اس کے ساتھ لائے ہیں اور یہ بات پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر کوئی منافق یا بدعتی یا بدعتی نقل حدیث میں اہل حق کے ساتھ موافق ہو تو اس کی روایت لینے میں کوئی تباہت

نہیں۔ اور پھر بخاری میں اس کی صرف دو روایتیں ہیں، ایک حدیث نبویہ کے قصہ میں دوسری سہی طائف وہ نبی تفتیف اور یہ دونوں جگہیں بھی عقیدہ اور عمل سے متعلق نہیں۔ ایسے ہی صحاح کی دوسری کتب میں بھی مردان سے اتنی ہی اور اسی قسم کی روایت ہے۔

اب رہ معاملہ عکرمہ کا جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خاص پیرو اور شاگرد رشید تھا، اہل سنت کی کتابوں میں اس کی کافی روایات ہیں۔ جن پر بعض نادانف نامی یا خارجی ہونے کا الزام لگاتے ہیں جو حقیقت میں خلاف النصف ہے اس لئے کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خاص غلام تھا۔ پروردہ اور شاگرد رشید تھا اور ہر دم ان کے ساتھ رہتا تھا۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما بالا جماع شیعانِ اولیٰ میں شامل ہیں اور امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے محب و مددگار ہیں۔ چنانچہ تاضی نور اللہ شوشتری نے بھی ان کو شیعہ شمار کیا ہے۔

ایسی صورت میں اثبات کا کیا امکان! کہ ان کا ایسا غلام جو ان کا ہم صحبت اور ہم مشرب ہو ان کے عقیدہ سے اس قدر ہٹ جائے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے مال سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اسے اپنی صحبت سے نکال باہر نہ کریں۔

پچھتر واں دھوکہ! کہتے ہیں کہ اہل سنت مٹی کی ٹنگیہ پر سجدہ نہیں کرتے اس لئے وہ شیطان کے مشابہ ہیں کیونکہ اس نے بھی خاک پر سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ جس کی وجہ سے راندہ بارگاہ ہوا اس کا قول اللہ تعالیٰ نے یوں نقل فرمایا خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ۔ دیکھئے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے) شیعوں کے کسی شاعر نے اس طعن کو نظم بھی کیا ہے۔

آنکس کہ دل از بغض علی پاک نکرد
بے شک تصدیق شہ لولاک نہ کرد
بر مہرہ نماز کے گزار دستی
شیطان زازل سجود بر خاک نکرد

(جس نے بغض علی سے اپنا دل پاک نہیں کیا بے شک اس نے شہ لولاک کی بھی تصدیق نہیں کی،
مٹی کی ٹنگیہ پر سنی کب سجدہ کر سکتا ہے۔ شیطان نے بھی تو خاک پر سجدہ نہیں کیا تھا)

اس طعن کا جواب یہ ہے، کہ اہل سنت کو خاک پر سجدہ سے کب اور کہاں انکار ہے البتہ وہ خاک کے

علاوہ دوسری اشیاء کبڑا، چمڑہ وغیرہ پر سجدہ کرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں،

اخبار مشہورہ میں آیا ہے کہ راندہ درگاہ ہونے سے پیشتر شیطان نے زمین و آسمان کے چیم چیم پر سجدے کئے۔ لیکن جب اس نے آدم خاکی کو جو بصورت گوشت پوشت تھے سجدہ نہ کیا۔ تو اس کی وجہ سے وہ سارے سابقہ سجدے رد اور نامقبول قرار پائے اور لعنت و پھٹکار کا موجب بنا! پس معلوم ہوا کہ خاک پر سجدہ کرنا اور ان چیزوں کے سجدے سے بچنا جو خاک سے پیدا ہوئی اور دوسری شکل اختیار کرنا ہے اس کا حشر و انجام وہی ہوتا ہے جو شیطان کا ہوا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تحفیر یا اہل بیت نبوی کے خلاف ان کا بغض و حسد یا ان کی نبوت سے انکار کے متعلق ان کی کتابوں میں جو کچھ مذکور ہے وہ سب انشاء اللہ باب نبوت میں بیان کیا جائے گا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس ذات کی تعظیم ترک کرنے پر شیطان اس درجہ پر پہنچا تو اسی ذات کی تحقیر و تذلیل کرنے سے شیعوں کا یہ فرقہ لعنت و ذلت کے کس درجہ تک پہنچے گا۔ اب ذرا انصاف کو کام میں لا کر فرمائیے کہ شیطان کی مشابہت کیا ہے اور شیطان کے مشابہ کون ہے۔

مذکورہ بالا اشعار میں سے پہلا شعر اہل سنت کے عقیدہ کا ترجمان ہے، مگر دوسرے شعر کا معنوں کچھ اور رہ گیا اس لئے کہ شیطان نے خاک پر سجدہ کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ خاک سے بنے ہوئے جسم آدم کے سجدہ سے منکر ہوا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شیعہ و سنی ہر دو خاک کو سجدہ نہیں کرتے ان کا مسجود تو کوئی شے دیگر ہی ہے اور تقاضائے انصاف بھی یہی ہے کہ خاک پر سجدہ ضرورت سے جائز ہو ورنہ ان میں کیا مناسبت اور معقولیت ہے کہ ہم اپنی نشست اور بیٹھک کی جگہ سرین جو اعضا بدنی میں کمتر درجہ کی ہے کے آرام کے لئے نوزیرین مسند یا رنگ برنگ نندے اور قالین سے آراستہ و پیراستہ کریں۔

اور جب پروردگار کے سامنے حاضری ہو اور اس سے التماس و مناجات کا وقت آئے تو سامنے خاک ڈال کر اعضائے بدن میں جو ممتاز و اشرف حصہ ہے یعنی سر و چہرہ اس کو خاک پر رکھیں (مسند و معنی موجود ہو تو اسے ہٹا دیں) حالانکہ حدیث کی رو سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اس لئے کہ وہ صفات واجب الوجود علم قدرت سمع و بصر اور کلام کا مظہر ہے اور ان تمام صفات کا منبع صدر و جسم انسانی کا یہی اعلیٰ حصہ ہے جس کو خاک پر ڈالا جا رہا ہے۔

اس معاملہ میں شیعہ حضرات کا قول و درجہ جاہلیت کے مشرکین کے طرز عمل سے ملتا جلتا ہے جو مادرزاد ننگ ہو کر غانہ کعبہ کا لطاف کرتے تھے۔ اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ گو انسان سے عبادت و تعظیم کا مطالبہ ہے۔ مگر انسان لو صاف کی رعایت کے ساتھ حیوانوں اور درندوں کی طرح ننگ ہو کر نہیں کہ شرافت و شریعت میں ستر عورت واجب قرار دیا گیا ہے۔ خذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ (غوش پوشاک ہو کر مسجد میں جاؤ) پھر ایک اور بات کہ ٹمکیہ مقام سجدہ پر رکھنے سے کئی دہم پیدا ہوتے ہیں۔

اول۔ ٹمکیہ رکھنا کفار اور منافقین کی خصوصیت ہے۔

دوسرے۔ خاک پر سر رکھنا بدنامی ہے جو عمل کے سوخت ہو جانے کی دلیل ہے۔

تیسرے۔ اس میں بت پرستوں کے فعل سے مشابہت ہے کہ وہ بھی عبادت کے وقت کسی نہ کسی چیز کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

اس طعن میں شیعوں کی ایک فارسی راہلی بھی درج ہوئی ہے اس کے جواب میں اہل سنت کی طرف سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف میں آٹھ رباعیاں بیان کی ہیں یہاں صرف ایک پر کفایت کی جاتی ہے اس لئے کہ ۶ نادان کو نہیں کافی دفتر نہ رسالہ ۱

سنی دل را بیا در حق رستہ کنند کافر ز پے آتش و خور خستہ کند

شیعی کہ خسیں تر بود وقت نماز دل را بکلورخ خاک وابستہ کند

سنی تو دل کو نماز میں، اللہ کی یاد میں لگاتا ہے، کافر آگ اور سورج کے پیچھے پڑ کر اسے خستہ حال

کرتا ہے اور شیعہ! جو کافروں سے بھی زیادہ خسیں ہے (بوقت نماز) اپنے دل کو مٹی کے ڈھیلے سے وابستہ کرتا ہے۔

چھتر واں دھوکہ کہ امام شیعہ مذہب کے حق اور اہل سنت کے مذہب ناحق ہونے کے بارے میں تو گھر گھر کر روایات بیان کرتا، ان کو شائع کرنا تو ان کا دیر سے ہی ایسی جھوٹی روایات بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے امامیہ مذہب کا انکار کر کے ان کے ساتھ مباہلہ کیا تو وہ فی الفور ہلاک ہو گیا۔ ایسی روایات میں سے ایک حدیث وہ ہے جس کا راوی نجاشی ہے وہ نقل کرتا ہے کہ محمد بن احمد بن عبد اللہ بن تغلبہ بن مہران حال ابو عبد اللہ شیخ الطائفہ نے امامت کے معاملہ میں ابن حمدان امیر موصل کے رد برد موصل کے قاضی سے مناظرہ کیا بحث کی گرما گرمی میں بات بڑھتے بڑھتے مناظرہ سے مباہلہ تک آگئی قاضی نے کہا کیا کل تم مجھ سے مباہلہ کر دو گے؟

پچنانچہ دوسرے دن دونوں مجلس میں آئے اور مباہلہ کیا قاضی نے اپنا ہاتھ ابن مہران کے ہاتھ میں دیا اور پھر دونوں جدا ہو گئے اور مجلس سے چلے گئے قاضی کا یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ امیر کے ہاں حاضری دیتا تھا دو روز گزر گئے مگر قاضی امیر کے پاس نہیں آیا امیر نے اپنے کسی معتد کو حال دریافت کرنے بھیجا تو معلوم ہوا کہ قاضی جوں ہی مجلس سے نکلا غبار نے آگھیرا اور اس کا وہ ہاتھ جو اس نے مباہلہ کے وقت ابن مہران کے ہاتھ میں دیا تھا سوچ کر سیاہ پڑھ گیا تھا اور دوسرے روز قاضی کا انتقال ہو گیا (غالباً ابن مہران نے کسی طرح چالاکی سے کسی انگلی میں نہراں بکٹ کر دیا ہو گا۔ نعمانی)

غرض اسی قسم کی جھوٹی روایات نقل کرتے ہیں جو سراسر افتراء ہیں۔ اہل سنت نے اس قصے کو بے اصل بنایا ہے بعض نے کہا ہے کہ ہاتھ سوچ کر مرنے والا مہرانی حال تھا واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ تاریخ سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہرانی حال دنیا طلب اور دروغ گو شخص تھا۔ جھوٹ بولنا اور افتراء پر داندی اس کی عادت تھی اسی نے یہ تصدق کر شیعوں کے حق میں نقل کر دیا ہو تو کوئی عجب نہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ قاضی، امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی امامت کا منکر ہو اور انکار امامت کو اہل سنت بھی غلط کہتے ہیں اور اسل امامت حضرت امیر رضی اللہ عنہ میں تو وہ بھی شیعوں سے متفق ہیں بحث و اختلاف تو تقدیم و تاخیر میں ہے قاضی کے انکار امامت کا قرینہ یہ ہو سکتا ہے کہ موصل کے لوگ شام کے پڑوسی ہونے کے سبب فواصیل کے عقیدہ کی طرف مائل تھے ممکن ہے قاضی بھی انہی میں ہو۔

ستتر واں دھوکہ۔ یہ اپنے آئمہ کرام سے اس مضمون کی جھوٹی روایات نقل کرتے ہیں کہ شیعوں کو دور رخ کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی اور ان روایات پر بہت زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے راویوں نے مرتے وقت یہ کہہ کر کہ یہ وقت جھوٹ بولنے کا نہیں، ان کو روایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جو نجاشی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔ **مِنْ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي جَدِّهِ الْوُشَّاءِ الْبَغْلِيِّ الْكُوفِيِّ وَكَانَ هَلْبًا مِّنْ عِيُونِ الطَّائِفَةِ وَوَجَّهًا تَرَى وَجْهَهُمْ وَهُمْ ابْنُ بَنِي الْأَيْسِ الْقَيْلَوِي الْخَزَّازِ مِّنْ أَصْحَابِ الرَّمَّانِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ سَرَى مِنْ جَدِّهِ الْأَيْسِ قَالَ لَمَّا حَضَرَهُ الْوُفَاةُ قَالَ لَنَا الْإِسْلَامُ عَلَى وَلَيْسَتْ سَامَةً أَلَكِنْ بِ هَذِهِ السَّاعَةِ سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ وَاللَّهِ لَا يَمُوتُ عَبْدٌ يُحِبُّ اللَّهَ وَمَا سَأَلَكَ**

وَيَتَوَلَّى أَوَّلُكُمْ فَمَنْ شَاءَ النَّارُ ثُمَّ عَادَ الثَّانِيَةَ ثُمَّ الثَّلَاثَةَ -

دھن بن علی بن زیاد و الشاد بجلی کوئی سے روایت ہے اور یہ شیعوں کا نامور رئیس الطائفہ اور الیاس صیرفی خراز کا نواسہ تھا اور یہ صیرفی امام رضاؑ کا ساتھی تھا۔ وہ اپنے نانا سے روایت کرتا ہے کہ اس نے عین نزع کے وقت سب کو گواہ بنا کر کہا کہ یہ وقت جھوٹ بولنے کا نہیں ہے میں نے ابو عبد اللہ علیہ السلام کو یہ کہتے سنا کہ اللہ کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی اللہ و رسول کی محبت اور ائمہ کی دوستی پر رے اور دوزخ کی آچ ان کو چھو لے پھر یہی قول مکرر سہ کر رہا ہے۔

اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیں تو یہاں ائمہ کی دوستی سے مراد ان کا اتباع ہے اور ائمہ کی روش اور طریق زندگی پر عمل کرنے کا فخر اہل سنت کے بڑے بڑے اولیاء کو حاصل ہے اور پھر اس روایت میں شیعوں کے لئے خوشی کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہاں ائمہ سے مراد دین کے سارے ہی پیشوا ہیں جن میں خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، بدرجہ اولیٰ اور سب سے پہلے شامل ہیں۔

اٹھتے وال دھوکہ دہا ان میں سے بعض دروغ گو عیار اپنے مذہب کے اصول و فروع میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اس کی نسبت امام صادق رحمہ اللہ علیہ کی طرف کر دیتے ہیں اور کبھی کوئی رسالہ لکھ کر امام باقر یا امام صادق کے اسماء کی طرف منسوب کرتے ہیں اور غرض یہ ہوتی ہے کہ جاہل لوگ اس پر جھٹ پڑتے یقین کر لیتے ہیں اور ملحدی حوزہ جان بنالیں حالانکہ تاریخ کے ناقابل تردید ثبوت سے یہ بات ظاہر و عیاں ہے کہ ان ائمہ میں سے کسی نے بھی تصنیف و تالیف کا کوئی کام کبھی بھی نہیں کیا۔ اور نہ ہی یہ فعل ان کے شایان شان تھا۔ ورنہ یہ بھی دیگر مضنیف کی طرح دانشمندان و روزگار کی طرف سے لکھ کر مستند کے سوالات کا نشانہ بنتے، بقول کبک من سنّف فَعَدَّ اسْتَهْذَفَ (جس نے کچھ تصنیف کیا اس نے اپنے آپ کو نشانہ بنالیا)۔

اناسی وال دھوکہ دہا کہتے ہیں کہ جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ جو مہاجرین اولین میں سے ہیں، اور غزوات میں اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمدم و ہمراہ رہے۔ اور اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسباب خاتمی پر دار و عنہ بھی رہے ہیں۔ وہ امامیہ میں سے تھے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور تمام اشرافیوں میں شریک رہے۔ اور پھر کوفہ میں بیت المال کے دار و عنہ بنا دیئے گئے یہ بات علمائے شیعہ نیز احمد بن علی النجاشی جو رجال شیعہ کا بحر انقاد ہے۔ نے بھی بیان کیا ہے۔

یہ ایسا تاریخی جھوٹ ہے کہ اس کی تردید تاریخ نے خود ہی کر دی ہے اس لئے کہ جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ کا انتقال تو حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی پہلے ہو گیا تھا البتہ ان کے دونوں صاحبزادے عبد اللہ اور علی رضی اللہ عنہما جناب امیر کی ہمرکابی میں تھے۔ انشاء و کتابت کی خدمت عبید اللہ کے سپرد تھی اہل سنت کی کتابوں میں اسی عبید اللہ کے واسطے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایات اکثر آئی ہیں البتہ ان کے بھائی علی کے حالات سے تاریخ خاموش ہے۔

نجاشی نے اس معاملہ میں افراد پر دازی کی حد کر دی، جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا بڑا شاگرد قرار دیا شیعہ مذہب فقہ کی ایک کتاب کو انکی طرف منسوب کیا اور ان کو امامیہ فرقہ میں شمار کیا۔ اسی پر بس

نہیں کی۔

امامیہ مذہب کی ایک اور کتاب جو سنن، انصاف اور احکام پر مشتمل ہے اسی کا ان کو مصنف بتایا حالانکہ دنیا بھر کے تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ ہجرت سے سو سال بعد تک اسلام میں کوئی تصنیف معوض و جرد میں نہیں آئی۔ اسی سے شیعوں کی تاریخ دانی کا پول کھل گیا۔ سچ ہے جب جیسا جاتی رہے تو جیسا ہو کر و۔

اسی وال دھوکہ ۱۔ اپنے مذہب کی بعض روایات علی بن محمد عروسی۔ ابو الحسن سمساطی شیعہ کی تاریخ سے نقل کرتے ہیں جو تاریخ طبری کا اختصار ہی ہے جس میں اس نے جلسازی کر کے بہت سی باتیں اپنی طرف سے بڑھا دی ہیں دیکھئے کہ تاریخ طبری کا اختصار بھی اسی نے کیا ہے۔ اور وہ سہل عبارت کے سبب شہرت و درواج پا گئی ہیں۔

ان روایات کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تاریخ طبری میں موجود ہیں، حالانکہ اصل تاریخ طبری میں ان کا نام نشان تک نہیں۔ تاریخ طبری کے اس اختصار نے اہل سنت کے بھی بہت سے مورخین کو گمراہ کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ان کو جو ملتا ہے وہ لاعلمی اور جعل سازی سے بے خبری کی بنا پر اصل تاریخ کی طرف اسے منسوب کر دیتے ہیں۔

اکیسا سی واں دھوکہ ہا اپنے مذہب کی بعض روایات یہ ایسے شخص سے نقل کرتے ہیں جو لوگوں کے خیال میں سنی ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہوتا ہے۔

چنانچہ ابن عقدہ بارود دی رافعی تھا۔ ابن قتیبہ کو شیعی، اور اخطب خوارزم متصب زیدی تھا۔
اور بعض روایات ایسے شمنوں سے نقل کرتے ہیں۔ جس کو اہل سنت اپنے میں شمار کرتے ہیں جب کہ
واقعہ وہ شیعہ ہوتا ہے۔

جیسے ہشام کلبی کہ اکثر لوگ اس کو سنی سمجھتے ہیں۔ مگر نجاشی خود ان کو اپنے رجال میں شمار کرتا ہے اور حقیقت میں وہ بے بھی انہیں کے رجال میں۔

بیاضیدوال دھوکہ دہا اہل سنت کے کسی عالم پر بہتان لگاتے ہیں کہ انہوں نے ائمہ اہل سنت میں سے کسی امام پر کوئی الزام لگانا چاہا مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے اور بالآخر خفیف و شرمندہ ہوئے اور ملزم ٹھہرے اور مقصد اس جھوٹ کا یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اس عالم کے خلاف بلکہ تمام علمائے اہل سنت کے خلاف بد اعتمادی اور نفرت کی فضا پیدا کی جائے اور لوگ ان کی پیروی اور شاگردی سے گریز کریں چنانچہ عیاشی کی یہ روایت جو وہ اپنی اسناد سے بیان کرتے ہیں۔ اس بہتان کی کھل مثال ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت سلیمان نے پرندوں کے غولی میں سے بد بد کی عدم موجودگی کو کیوں محسوس کیا۔ اس میں کیا خاص صفت ہوتی ہے، حضرت عبد اللہ گولے۔

لَدُنَّ الْهُدَىٰ هَدَىٰ فِي بطنِ الْأَرْضِ كَمَا يَدْرِي أَحَدُ كُتُبِ الْعِلْمِ هُنَّ فِي الْعَالَمِ وَهِيَ تَنْظُرُ أَبُو حَلِيفَةَ إِلَى أَصْحَابِهِمْ فَضَحِكَ فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ مَا يَعْجَلُكَ قَالَ خَفَرْتُ بِكَ قَالَ الَّذِي يَدْرِي مَا فِي بطنِ الْأَرْضِ كَيْفَ لَا يَدْرِي الْفَرُّ فِي الشَّرَابِ حَتَّى يَأْخُذَ بِعُنُقِهِ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ يَا نَعْمَانُ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ إِذَا أَنْزَلَ الْقُدْرُ عَنِ الْبَصَرِ -

دیکھو کہ بہر زمین کے اندر کی چیز کو اسی طرح دیکھ لیتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شیشی میں تیل کو دیکھ لیتا ہے اس وقت ابو حنیفہ نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور پھر منہس پڑے تو ابو عبد اللہ نے فرمایا کیونکہ تم کس بات پر ہلے انہوں نے کہا میں آپ سے جیت گیا اس لئے کہ جو زمین کے اندر دیکھ لیتا ہے۔ وہ مٹی میں چھپا ہوا پھندا کیوں نہیں دیکھ پاتا یہاں تک وہ اس میں اپنی گردن پھنسا بیٹھتا ہے۔ جناب ابو عبد اللہ بولے اے نعمان تم جانتے نہیں کہ جب حکم الہی ہو جاتا ہے تو آنکھ اندھ بھی ہو جاتی ہے۔

یہ اتنا کھلا افراد اور گندہ بہتان ہے۔ جس کے جھوٹ اور بے اصل ہونے میں کسی کو شبہ نہیں اتنا تو یہ منفرد بھی جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ امام اعظم عظیم المرتبت عالم تھے۔ جاہل نہیں تھے۔ باوقار اور خاص نمکنت کے مالک تھے شیعوں کی طرح سفلے یا پھوڑے نہیں تھے، بزرگوں اور بڑوں سے اس قسم کی چٹنگ زنی یا ان کی خردہ گیری کی توقع تو ان سے ممکن ہی نہیں تھی۔

اور یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ایک چیز کو دیکھ لینا اس کے سارے حالات اور نتائج جان لینے کو لازم نہیں اگر بہر زمین پر جال دیکھ بھی لے اور شکاری کی غرض سے واقف نہ ہو تو کچھ بعید نہیں اس کے نزدیک وہ دانے جو جال میں بکھرے ہوں اور وہ دانے جو چھلنی میں رکھے ہوئی دو نوں کیساں ہیں یہ اس کی نظر کا قصور نہیں۔ اور چھلنی اور جال کی غایت و مقصد کو علیحدہ علیحدہ جانا بھی اس کی نظر کا کھیل نہیں اور نہ صرف کسی چیز کو دیکھ لینے سے اس کی حقیقت کو سمجھ لینا لازم ہے۔

اور پھر امام اعظم قرظاب امام صادق رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و خدمت پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ قول تو بہت ہی مشہور ہے۔ کُلَّ السَّنَاتِ كُنَّا فِي السَّعْيِ وَالْمَدَقِ اِذَا كُنَّا مَعَ اِمَامِ مَادِقِ كِي صَحْبَتِ كِي وَدَسَالِ نَ سَلَتِ تَوْنَعَانِ هَلَاكِ هِي بَوُكِيَا تَقْهَرُ بِكِي مَكْنِ تَحَا كِه اِمَامِ اَبُو حَنِيفَةَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ كِه دِل مِي اِمَامِ مَادِقِ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ كِه مَتَلَقِ اِيَسَ خِيَالِ كَا كْذَرُ بِي بَوُتَا ۔ يَادِه اِيَسَ الْفَاظِ اِظْنِي زَبَانِ زَبَانِ پَر بِي لَاتِے اُور يِه بَاتِ تَوْشِيَعِ اُور سِي دُو نُوں كِه نَزْدِيكِ پَا يِه ثَبْرَتِ كُو پِي نَچِ چُكِي ہے كِه جَنَابِ زِيَدِ شَبِيذِ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ نَے مَرْدَانِيُوں پَر چُر بَانِي كِي تَرَامَامِ اَعْلَمُ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ كِه دَسِ هَزَارِ دِنَارِ سَرخِ سَے اُپ كِي مَدُوكِي اُور كُوفَرِ مِي اہل بَيْتِ كِه مُنَاقِبِ وَنَسَائِلِ بَيَانِ كَرْنِ شَرْعِ كُنْے اُور عَلِي لَاعِلَا بَيَا كِه اِس دَتِ جَنَابِ زِيَدِ كِي مَدَدِ عِيْنِ دِيْنِ اِسْلَامِ كِي مَدَدِ ہے۔

اور عہد منصور میں امام صاحب کا قید ہونا کوڑے کھانا اور بالاخر زہر سے ہلاک کیا جانا ان سب واقعات کا سبب و امد محبت اہل بیعت رسول ہی تھی۔

پھر اولاد زید شہید نے جب نواحِ خلاسان و سیستان میں منصور کے خلاف چڑھائی کی تو امام صاحب لوگوں کو ان کی اتباع و بیعت پر راغب کرتے تھے۔ جب منصور نے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ نے علم کس سے میکھا تو انہوں نے فرمایا کہ امام صاحب علی سے اور انہوں نے حضرت علیؑ اور اسباب ابن عباس سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور پھر خازنوں سے امام صاحب کا مناظرہ اور اس مناظرہ کے نتیجہ میں بعض کا ہدایت یاب ہو جانا یہ سارے واقعات مشہور و معروف اور زبان زد خلق ہیں،

ان میں سے ایک جگہ ہدایت یوں ہے کہ امام صاحب کا ایک بڑا بڑا کٹر حرمی (خارجی) تھا وہ امام صاحب

کو کا فر کہتا تھا۔ آپ حق ہمسائیگی کی خاطر ازراہ یہودی اس کو بہت نصیحت و ہدایت فرماتے مگر وہ کسی پہلو مانا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے چند روز اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا پھر چند روز بعد آپ اس کے ہاں تشریف لے گئے اور تنہائی میں اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ کہنے لگا تم میرے پاس آئے ہی کیوں اور تمہارا مقصد کیا ہے؛ امام صاحب نے فرمایا مجھ ایک شخص نے تیری لڑکی۔ اس کے لئے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ وہ کہنے لگا کون ہے وہ آپ نے اس کی دولت حشمت، اخلاق و کردار اور حسب نسب سب کچھ بتائے اور آخر میں فرمایا کہ ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عیب بھی ہے کہ وہ یہودی ہے اس پر وہ بہت جگڑا اور غصہ دکھاتے ہوئے کہنے لگا تم عجیب مسلمان ہو کہ مسلمان کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ اپنی لڑکی یہودی کو دیدے تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ مسلمان لڑکی یہودی سے کیسے بیاہی جاسکتی ہے اس پر امام صاحب نے بڑی رسالت سے کہا خواہ اتنے گرم کیوں ہوتے ہو، تم تو اسیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کا فر کہتے ہو میں نے سوچا کہ جب ایک نبی کی لڑکی کا فر کو دی جاسکتی ہے تو ایک حروی کی لڑکی ایک یہودی کو مل جائے تو کیا منافی ہے۔ یہ سنتے ہی حروی کی تو سٹی گم ہو گئی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد امام صاحب کے قدموں پر گر پڑا اور اپنے مذہب سے تائب ہو گیا۔

ادب کی ہر ہر والی روایت میں عیاشی کشی غلطیوں کا شکار ہوا۔

[illegible][illegible]

گھڑے ہوں گئے۔ امام صاحب نے ابن مسلمہ سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں انہوں نے کہا کہ یہ موسیٰ حضرت جعفرؓ کے بیٹے ہیں، امام صاحب کہنے لگے میں شیعوں کے سامنے ہی ان کی پیشانی پر بوسہ دوں گا ابن مسلمہ نے کہا تم ایسا نہیں کر سکتے۔ امام صاحب نے کہا اللہ میں ضرور ایسا کروں گا۔

پھر امام صاحب نے موسیٰ سے مخاطب ہو کر پوچھا میاں صاحبزادے تمہارے اس شعر میں آدمی تمہارے حاجت کہاں کرے؟ موسیٰ بڑے دیواروں کی آڑ میں، پڑوسی کی نظر سے بچے نہروں کے کنارے پر نہ کرے، یہودوں کے چھینکنے کی جگہ نہ کرے اور قبلہ کی طرف نہ منہ کرے نہ پشت ان باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جہاں چاہے فارغ ہو لے۔

یہ روایت بھی کسی متعصب شیعہ کی گھڑت اور ان کے گھڑے ہوئے جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ۔ اس میں صحیح اسی قدر ہے جو دوسرے شیعوں نے روایت کی ہے یا اہل سنت بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

كَمَا خَلَّ ابْنُ خَلْفَةَ الْمَدِينَةَ نَزَّاهَا قَبْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ أَتَى إِلَى دَاكِي الْقَادِقِ فَبَسَّ يَلْتَمِزُ خُرُوجَهُ فَخَرَجَ ابْنُهُ مُزْنِي وَهُوَ صَغِيرٌ فَقَامَ وَوَقَرَهُ ثُمَّ قَالَ آيَتُ يَفْعَلُ الْعَرَبُ حَاجَتَهُ فِي بَلَدٍ كُمْ فَأَخَابَ بِمَا دُكِرَ مَا يَتَقَالُ ابْنُ خَلْفَةَ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يُجْعَلُ رَسُولُ اللَّهِ - جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مدینہ النبی پہنچے تو پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر حاضری دی پھر حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر حاضر ہوئے اور ان کے انتظار میں وہاں بیٹھے کہ اتنے میں ان کے کمن بیٹے موسیٰ باہر آئے امام صاحب نے یہ آیت پڑھی اللہ اعلم حینٹ یجعل رسالت کس کو بخشنے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے بچے سے سوال اہل بیت کے بچوں کی ذکات و تیزی نہم سے متاثر ہو کر اظہار تعجب کے طور پر کیا تھا۔ اور یہ بات اس زمانہ ہی میں نہیں آج کل بھی ہے کہ بچوں کی ذکات و ذہانت سے حیرت زدہ ہو کر بطور امتحان اس قسم کے سوالات کر ہی پلتے ہیں

اور مقدمہ یا تو اس غاندان سے اظہار عقیدت ہوتا ہے یا دوسروں پر اس غاندان کی بلند مرتبت واضح کرنا الزام وطن کا تو ایسے موقع پر سوال ہی نہیں۔

تراسیوال دھوکہ اس لیے کہتے ہیں کہ خلیفہ اولیٰ رضی اللہ عنہ، جبکی خلافت کے اہل سنت قائل ہیں۔ خود اپنی خلافت میں متردد تھے ہر خلافت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے کہ ان کو شک و تردد کے بجائے پورا یقین و وثوق تھا اور ظاہر ہے یقین کی اتباع شک و تردد کی اتباع سے زیادہ بہتر ہے۔

اور خلیفہ اولیٰ کے شک و تردد ثابت کرنے کے لئے یہ روایت گھڑی کہ عین و نوات کے وقت آپ نے یہ الفاظ فرمائے یٰلَیْتِنِ کُنْتُ سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ لَانْصَارُ فِي هَذِهِ الْأَمْرِ شَيْئٌ دَکَاشَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یہ پوچھ لیتا کہ کیا اس خلافت میں انصار کا بھی کوئی حق ہے۔

اور جب یہ گھڑت شیخ علی کے ہاتھ لگی تو بڑا اچھلا کودا اور بڑی ڈینگ مارنے لگا اور بزم خودیہ سمجھ بیٹھا کہ ایسی دلیل ہاتھ لگی ہے کہ اس سے اہل سنت کا ناطقہ بند کیا جاسکتا ہے۔ اور اب تو مناظرہ کی بازی اپنے ہاتھ آگئی اور شیعوں کو یہ واقعی حق حاصل ہے کہ وہ افتراء بہتان اور جعل سازی پر جتنی چاہیں بغلیں جائیں کہ یہ ترانہ کے مذہب کی بنیاد ہی ہے مگر چونکہ اہل سنت کے نزدیک یہ دلیل بے اصل اور من گھڑت ہے۔ اس لئے وہ اس کے من گھڑت

ہونے کی تشریح یوں کرتے ہیں۔

کہ اگر خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) کو انصار کے معاملہ میں کچھ تردد تھا تو وہ خود ایک مہاجر یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حق میں حکم خلافت کیوں صادر فرماتے، اور اگر انصار کو خلافت نہیں دی تھی تو کم از کم ان کو کسی نوع اور خلافت ہی میں شریک کر دیتے،

اور بفرمانِ محال یہ روایت صحیح بھی مان لی جائے تو پھر ان الفاظ کا مقصد یہ تھا کہ کاش حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انصار کی موجودگی میں یہ سوال کر لیتا تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب باثواب کو یہ حضرات اپنے کافروں سے سن لیتے اور آج اس معاملہ میں مجھ سے بکبیدہ خاطر نہ ہوتے۔

اور پھر یہ کام اگر خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) کا ہی مان لیا جائے تو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے در ثانی مقرر کرنے کے معاملہ سے تو بڑھ کر نہیں۔

کیونکہ خارجی فرقہ تو پیدا ہی اس وجہ سے ہوا۔ اور وہ اسی وجہ سے بد عقیدہ ہو کر آپ کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے یہی تو اعتراض کیا کہ اگر اس شخص (امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ) کو اپنے بہ حق ہونے کا یقین ہوتا تو بیچاؤ کیوں ہلاتے لہذا معلوم ہوا کہ بغیر حکم صریح اور بلا استحقاق اس اہم کام کا دعویٰ کیا اور جب کچھ میں نہ پہنچا دیکھا تو علم پر رضامندی ظاہر کی اور معاملہ مشورہ پر چھوڑ دیا۔

دوسری بات یہ کہ خلیفہ اول کے زمانہ سے لے کر آج تک سوائے ان جھوٹے رافضیوں کے کسی نے بھی یہ روایت نقل نہیں کی۔ اس کے مقابلہ میں محکم کا معاملہ تو ایسا اہمیت کا ہے کہ کوئی لاکھ کوشش کرے اس کو جھپٹا نہیں سکتا پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) کے اس قول پر کوئی خلفشار اور انتشار پیدا نہیں ہوا کیونکہ اس کے بعد اور صورت حال کا علم ہو جانے سے خود انصار رضی اللہ عنہم معاملہ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ بخلاف معاملہ محکم دشمنی اس کے بعد جو فساد برپا ہوا اور ایسا برباد ہوا کہ اہل بیت کے خاندان سے خلافت ہی نکل گئی اور پھر کسی نے بھی ان کو خلافت میں داخل نہ ہونے دیا۔ اور انہوں نے اپنے طرز عمل کی بنیاد اسی دلیل کو بنایا کہ خاندان اہل بیت کا خلافت میں کوئی حق ہوتا تو وہ اس خلافت کو شائبوں کے پر دہ کرتے اور امیر المؤمنین بیچاؤ نہ ہلاتے نہ اس پر راضی ہوتے یہی وجہ تھی کہ حروری ان سے ناراض ہوئے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ فواسب اور مروانیوں کا جھنڈا اہل اسلام پر لہرایا اور ان کی امارت کو مستحکم بنانے کے لئے عام مسلمانوں نے بھی کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔

چو را سی وال دھوکہ دیا یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت عروج کی اس حد کو پہنچ گئی کہ لوگ ان کی اہمیت کے قائل ہو گئے، لیکن خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کو یہ عزت یہ قدر و منزلت حاصل نہ ہو سکی لہذا معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر سہ خلفاء رضوان اللہ علیہم سے افضل اور امامت و خلافت کے زیادہ حق دار ثابت ہو گئے۔ اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خرق عادات امور اور معجزات ظاہر ہوئے جو بتائے ہیں کہ آپ ہی امامت و خلافت کے حقدار ہیں، خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے ایسی کوئی بات ظاہر نہ ہوئی۔

شیعوں کا یہ بیان عیسائیوں کے خیالات کا چربہ دیا ان کا انکار ہوا تو الہ ہے (کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت

مسیح علیہ السلام کے ساتھ لوگوں میں جو بلند اعتقاد ہی ہے۔ وہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں اور خوارق عادات امور مثلاً مردوں کو زندہ کرنا اور زادات وصول اور کوڑھوں کو برباد اچھا کر دینا، حضرت مسیح علیہ السلام سے تو ان کا صدور بار بار اور پیدر پیہ ہوا مگر پیغمبر آخر الزماں سے ایسی کوئی بات صادر نہیں ہوئی اگر آپ سے کبھی کبھار دو چار معجزے صادر بھی ہوئے تو وہ شہرت و تواتر کی حد تک نہ پہنچے اس لئے ان وجوہ کی بنا پر پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتباع کے زیادہ حق دار ہیں۔

معلوم نہیں عقل کا جنازہ نکل گیا ہے یا لوگوں کی مت ماری گئی ہے کہ وہ اتنا نہیں سوچتے کہ اگر لوگوں نے خلاف واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو الوہیت کی مسند پر بٹھا دیا ہے تو کیا جاہلوں کی اس گندی عقیدت ہی کی بنا پر واقعی ان حضرات میں فضیلت و برتری کا پھندا لگ گیا ہے۔ کیا عرب کے ان گھڑ لوگوں نے لات و منات اور عزیٰ کو مسند الوہیت نہ بخشی؟ تو کیا ان گھڑ لوگوں کے گھڑے ہوئے پتھروں میں فضیلت و بزرگی پیدا ہو گئی پھر ان ہی گندہ ناتراشی جاہلوں نے یا ان کے اخلاف نے عبداللہ بن سبا یہودی کے بہکانے میں آکر اور اپنی عقل و دانشمندی کو اس کے ہاتھ گردی رکھ کر جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسا اعتقاد رکھا منہ سے نکالا کتابوں میں اچھالا تو کیا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی بزرگی میں اسے کچھ اضافہ کیا؟ اگر بزرگی اور فضیلت کا مدار جھانسنے زمانہ اور عوام کا لافنام پر ہی ہے تو ہمارے دیار میں تو پھر شیخ سعد وغیرہ فضیلت میں ان حضرات سے بازی لے جائیں گے

العیاذ باللہ وانا للہ وانا علیہ راجعون!

اور زیادہ ماتم تو شیعہ علماء کی عقلوں کا ہے کہ وہ ایسے پھر عقیدوں کو مطالب اصولیہ کے ثبوت میں دلیل بتاتے ہیں چنانچہ ان کے ہی ایک عالم نے ایک شعر کہا ہے اور حسب عادت درود اس کا رشتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جوڑ دیا ہے وہ کہتا ہے۔

کُنْ فِي فِئْتِلِ مَوْلَانَا عَلِيٍّ دُقْرُخُ الثَّلَاثِ بَيْنَهُ آتَهُ اللَّهُ
ہمارے آقا علیؑ کی فضیلت کے لئے ہی کافی ہے کہ ان کی ذات میں خدا ہونے کا شک ہو گیا۔

وَمَاتَ الشَّافِعِيُّ وَلَيْسَ يَدِي عَلَى رَأْبَةٍ أَهْدَرَهُ اللَّهُ
شافعی مرتے مر گئے مگر یہ نہ جان سکے کہ ان کا رب علیؑ ہے یا اللہ۔

رہا معجزات کا کثرت سے صادر ہونا تو یہ بھی شیعوں کے نزدیک وجہ فضیلت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ان ہی کے عقیدہ کے مطابق حضرت مہدیؑ سے اچھے کثیر معجزات کا صدور ہونے والا ہے کہ ان کے بزرگ اجداد سے بھی صادر نہ ہوئے ہوں گے تو اگر معجزوں کی کثرت کو وجہ فضیلت قرار دیں تو حضرت مہدیؑ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فضیلت و بزرگی میں بڑھ جائیں گے۔ اور یہ بات سنیوں کے نزدیک بھی باطل ہے اور شیعوں کے نزدیک بھی۔

اور زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ اثنا عشری جو غلاۃ کے اعتقاد سے امکان برأت اور کنارہ کشی کرتے ہیں اس قسم کی باتوں کی طرف دل ان کا بھی جھکتا ہے ان میں سے بعضی صاف الوہیت یا حلول کے عقیدہ سے گھبرا کر سرخفی کے اعتقاد کی چادر میں چھپ گئے ہیں۔ اور کہتے ہیں جو بھی مخفی جہید کھوے گا اس کا خون صاف ہے ان کے بعض شعرا نے اس مسنون کو شعروں میں ادا کیا ہے۔

لَا تَحْسَبُنِي هَوْنِي أَنْفَرُ حَيْدَ رَاجَعٍ يَعْلَمُهُ وَعَلَاهُ مِنْ ذَوِ النَّسَبِ

یہ نہ سمجھو کہ میں نے حیدر سے ہمدردی علم یا نسبی برتری کی وجہ سے محبت کی۔

وَلَا شَجَاعَةً فِي كُلِّ مَعْرَكَةٍ وَلَا التَّلَدُّ فِي الْجَنَابِ مِنْ رَبِّي

نہ اس وجہ سے کہ ہر معرکہ میں داد شجاعت دمی۔ اور نہ جنت کی ابدی لذتوں کے حصول کے لئے۔

وَلَا التَّبَرُّ مِنْ نَارِ الْجَحِيمِ وَلَا رَجُوتُهُ مِنْ عَذَابِ النَّارِ شَفَعِي

اور نہ دوزخ سے چھٹکارا پانے کے لالچ میں نہ اس امید میں کہ دوزخ کے عذاب سے بچانے کے لئے میری شفاعت کریں گے۔

الْبَلَّ مَرَّتٌ هُوَ السِّرُّ الْخَفِيُّ فَإِنْ أَدْفَعْتُهُ خَلَلْتُ قَتْلِي وَهَرَمَ رَأْيِي

لیکن میں نے انہیں پہچان لیا ہے کہ وہ سرخفی ہیں اگر میں اسے فاش کر دوں تو میرا خون صاف اور میں سزا کا مستحق ہو جاؤں گا۔

يُمَتِّدُ هُدًى عَنْهُ دَائِرَتَا دَاوُدَ كَأَمَّا يَفْرُغُ عَنْهُ صَاحِبُ الْكَلْبِ

لوگوں کو ان کی حقیقت جان لینے سے وہ بیماری روکتی ہے جس کی کوئی دوا نہیں (یعنی جہان) جس طرح کتے کا کاٹنا پانی سے بھاگتا ہے۔

ان کے بعض علماء اپنے دعویٰ انصافیت کی تائید میں یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کندھے پر ان کا پاؤں رکھا۔ پورا قصہ یوں نقل کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیجے میں داخل ہوئے تو کعبہ کو بتوں سے بھرا ہوا پایا آپ نے سب کو گرا کر کر توڑ ڈالا ایک بت کسی ادنیٰ جگہ پر رکھا ہوا تھا کہ وہاں تک آپ کا دست مبارک نہ پہنچ سکا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ میرے کندھے پر پاؤں رکھ کر پڑھ جاؤ اور اس بت کو توڑو۔ امیر المؤمنین نے یہ پاس ادب عرض کیا یا رسول آپ میرے شانے پر چڑھ جائیں اور پھر وہ بت توڑ دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بار نبوت کے برداشت کی تاب نہ لاسکو گے۔ اب اس واقعہ سے بات کھلی کہ امیر المؤمنین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے پر کیوں چڑھے تھے اور اس میں سرخفی کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ قصہ تراپنی جگہ بائبل صیغہ ہے کہ ہجرت کی شب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پشت پر اٹھا کر بخول کے بل کئی کوس تک گئے پورا پاؤں ٹیکنے سے اس خدشہ کے پیش نظر احتراز کیا کہ کہیں دشمن کھوج نہ لگائیں اس سے ایک بات بڑی واضح طور پر ثابت ہو گئی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں بار نبوت برداشت کرنے کی غایت وجہ ہلافت تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک پر چڑھنے کا قصہ اگرچہ زبان ذوق خلق ہے پھر بھی اس نوعیت سے یہ قصہ صرف شیعہ روایات میں ملتا ہے اہل سنت کی کتب صحاح میں اس کا سراغ نہیں ملتا اس لئے اس سے اہل سنت کو الزام دینا بھی صحیح نہ ہوگا۔ کتب صحاح میں یہ واقعہ اس طرح ملتا ہے۔

أَنَّه مَلَئَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْكُفَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَحَوَّلَ الْبَيْتَ ثَلَاثًا ثِيَابُهُ وَسُتُونُ نَصْبًا فَيَعْبَلُ يَطْفِئُهَا بَعُودَ فِي يَدِهِ وَيَقُولُ جَاءَ الْحَقُّ وَالْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زُهْوَ قَافَا كَأَنْتَ تَسْقُطُ بِأَسْأَلِهِ

دفعہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تو دیکھا وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہیں پس آپ اس چھڑی سے جو آپ کے ہاتھ میں تھی ان کو کچوکے لگاتے اور فرماتے ۔
حق آیا اور باطل مٹ گیا باطل تو بے شک مٹنے ہی والا ہے ۔ لہذا وہ بت آپ کے اشارے کے ساتھ ہٹا گرتے جاتے ۔

ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ بت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ ہی سے گرتے جا رہے تھے اس میں کا مذہب پر چڑھنے کی ضرورت ہی نہ تھی ممکن ہے یہ واقعہ کہنے کے ارد گرد نسب کئے ہوئے بتوں کا ہوا اور اندرون کعبہ کے بنوں کو کسی دوسرے دلت پھیل روایت میں مذکور مسورت کے مطابق توڑا ہو۔ بہر حال اہل سنت کی بیعت کتب میں تو روایت اسی قدر ہے۔ کہ وہ تصویریں جو کعبہ کی دیواروں پر بنی ہوئی تھیں آپ نے ان کو پانی سے دھویا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما، از مزم کا پانی لارہے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے ان تصویروں کو دھو دھو کر مٹا رہے تھے۔ جب مجھوں کی باری آئی تو آپ کے حکم سے وہ باہر نکالے گئے انہیں مجھوں میں حسرت ابراہیم و مسرت اسمعیل علیہما السلام کے مجھے بھی تھے ان کے ہاتھوں میں نال دیکھنے کے پانسے تھمائے ہوئے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان کا فروں پر لعنت کرے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان بزرگوں نے یہ کام نہیک بھیج بھی ناحی ان کے ہاتھوں میں یہ قرعے دیدئے۔

پہچانیدو! دھوکہ! شیعہ اہل سنت پر طعن کرتے ہیں کہ وہ ائمہ اربعہ، ابو حنیفہ، شافعی مالک اور احمد رحمہم اللہ کا مذہب نوا اختیار کرتے ہیں۔ مگر ائمہ اہل بیت کا مذہب اختیار نہیں کرتے۔ حالانکہ وجوہ ذیل سے ائمہ اہل بیت اتباع کے زیادہ حقدار ہیں۔

(۱) وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت جگر ہیں رسول اللہ کے گھر میں پر درش پائے ہوئے ہیں آئین شریعت بچپن ہی سے یاد کئے ہوئے ہیں اور صاحب البیت اُدری بمانیہ کے مصداق گھر کے یہ افراد گھر کے اندر کون حالت سے زیادہ واقف ہیں۔

(۲) صحیح حدیث میں جو اہل سنت کے نزدیک بھی معتبر ہے انکی اتباع کا حکم آیا ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ اَلْثَّقَلِیْنِ اِنْ تَسَلَّکْتُمَا بِہِمَا لَنْ تَضِلُّوا اَبَدِیْ کِتَابُ اللّٰہِ وَعِدَّتِیْ اَفْعَلْ بَنِیَّ رَہِیْ تُمْ فِیْ دَوَابِیْ قَابِلِ اسْتَاذِ حَیْزِیْ چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان سے وابستہ رہے تو میرے بعد گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب دوسرے میرے اہل بیت،

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے۔ مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي فِيكُمْ كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَّى وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ دُتَمِیں میرے اہل بیت کی سیثیت نوح علیہ السلام کی کشتی کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا بچ گیا اور جو اس سے پھر و گیا غرق ہوا۔)

(۳) ائمہ اہل بیت کی بزرگی، جہادیت، ان کا قوتی اور زہد و علم شیعہ و سنی ہر دو فریق کو تسلیم ہے بخلاف دوسروں کے اور ظاہر ہے کہ جن کی بزرگی پر اتفاق ہو وہی اتباع کے زیادہ حق دار ہیں نہ کہ دوسرے۔

اس مکر اور کید کا جواب یہ ہے کہ امام دراصل نبی کا نائب ہوتا ہے اور نبی صاحب شریعت ہوتا ہے نہ کہ

صاحبِ مذہب: اس لئے کہ مذہب اس راستہ کا نام ہے جو امت میں سے بعض ہی کے لئے کشادہ ہوتا ہے پھر وہ چند منفرہ قواعد و اصول کے ذریعہ شریعت کے مسائل کا استخراج کرتے ہیں چنانچہ مذہب میں خطا و ثواب دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ جبکہ امامِ خطا سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور نبی کا حکم رکھتا ہے عقل کا تقاضا نہیں کہ اس کی طرف مذہب کی نسبت کر دیں۔

اسی طرح مذہب کی نسبت خدا تعالیٰ، حضرت جبریل اور فرشتوں کی طرف کرنا بھی بے عقلی کی دلیل ہے اور اہل سنت کے نقباء صحابہ کی طرف بھی مذہب کی نسبت کر کے ان کو بھی صاحبِ مذہب نہیں کہتے باوجودیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو امام ابو حنیفہ و امام شافعی وغیرہ سے افضل و اعلیٰ مانتے ہیں۔ بلکہ صحابہ کرام کے اقوال و افعال کو فقہ کی اصل اور احکام شریعہ کی دلیل شمار کرتے ہیں اور خود ان کو امت تک علم کے پہنچنے کا غیبی ذریعہ اور وسیلہ۔

اور فقہا امت کی اتباع میں ائمہ ہی کی اتباع ہے اس لئے کہ انہوں نے فقہ مذہب اور قواعد ان حضرات ائمہ ہی سے تو سیکھے ہیں وہ اپنی شاکردگی کی نسبت انہیں سے قائم کرتے ہیں۔ پس اہل سنت تو ان ائمہ کی اتباع کو ہی مقصود نظر سمجھتے ہیں مگر مذہب کی نسبت انکی طرف نہیں کرتے۔ اور شیعوں کے حالات و واقعات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی براہِ راست ائمہ کی اتباع نہیں کرتے یہ بھی ان واسطوں کی پیروی کرتے ہیں۔ جو خود کو ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور انہیں سے علم حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے متبعینِ اہل سنت اصل عقائد میں ائمہ کی ہرگز مخالفت نہیں کرتے ان کے متعلق ائمہ کی بشارتیں اور خوشنودی مزاج کی سندیں موجود ہیں۔

بخلاف متبعینِ شیعہ کے۔ مثلاً ہشامین، احوال طاق ابنِ امین اور ان کے مثل کہ انہوں نے بنیادی عقائد میں ائمہ کے خلاف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جسمیت اور اس کے اعضا، ہر جیکے قائل ہوئے ائمہ کرام نے ان سے بیزاری کا اظہار فرمایا اور ان کے عقائد باطل ہونے پر شہادت دی ان کو دروغ گو اور افتراء پر داز بتایا چنانچہ یہ سب مباحث کتاب ہذا کے باب سوم و چہارم میں شیعوں کی معتبر کتابوں کے حوالوں کے ساتھ انشاء اللہ بیان کئے جائیں گے۔

درحقیقت امام کا منصب یہ ہے کہ عالم کی اصلاح کرے رفعِ شر اور دفعِ فساد کرے جس فن میں کمی دیکھے اس کی تکمیل کرے اور جو معاملہ ٹھیک چل رہا ہو اسے اس کے حال پر چھوڑ دے تاکہ تعمیل حاصل نہ لازم آئے۔ پس ائمہ نے اپنے منصب سے زیادہ مناسب اور اہم طریق سلوک و طریقت کو خیال کر کے اپنی پوری توجہ اور صریح مبذول رکھی اور امور شریعہ کو اپنے بزرگ دوستوں۔ برگزیدہ مصاحبوں اور لائق ترین شاگردوں کے سپرد کیا اور خود انہوں نے عبادت، ریاضت، تربیتِ باطن، تعیینِ اذکار اور ادغمازوں اور دعاؤں کی تعلیم تہذیبِ اخلاق طامینِ سلوک کو اس کے فوائد سے آگاہ و مطلع کرتا ہے اور کلام اللہ و کلام رسول سے حقائق و معارف اخذ کر کے ارشاد فرماتا اپنا خاص مشغلہ بنایا ان مشاغلِ مبارکہ کے لئے خلوت و گوشہ نشینی لازم ہے اس لئے یہ بزرگ حضرات استنباطِ احکام و اجتہاد مسائل کی طرف توجہ مبذول نہ رکھ سکے۔

میں سبب ہے کہ علم طریقت کے دقائق نکات اسرار اور بصیرت زیادہ تر انہی بزرگوں سے منقول ہیں اور اہل سنت اس وجہ سے ولایت کے تمام سلاسل انہی بلند ہستیوں پر ختم کرتے ہیں حدیث تسلیں بھی ان کی اسی حیثیت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ ظاہر شریعت کی تعلیم کے لئے کتاب اللہ کافی ہے اور علم لغت و اصول جود صنع اور عقل سے تعلق رکھتے ہیں فہم شریعت میں مدد پہنچانے کے لئے بہت ہیں ان میں امام کی کیا حاجت؟

ابنہ امام کی ضرورت سلوک و طریقت کے ان دقائق میں محسوس ہوتی ہے جو بظاہر کتاب اللہ سے سمجھے نہیں جاتے اور ائمہ نے بھی یہی راز معلوم کر کے اپنی توجہ اسی ضروری امر کی طرف مبذول رکھی اور شریعت کا صرف اجمالی بیان فرمایا علم و عقل کو مجتہدین پر چھوڑا۔ چنانچہ شیعہ و سنی دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی امام نے تصنیف و تالیف کا کام نہیں کیا نہ اصول نکالے نہ اصولوں سے فروع نہ کوئی کتاب لکھی نہ کوئی فن مرتب کیا کہ اس پر کفایت کی جاتی بلکہ مسائل و احکام کی روایات ائمہ کے دستوں اور شاگردوں میں مشہور و مسرور ہوئیں اور مسائل جزئیہ میں فوائد استنباط معروضِ خلفا میں رہے تو لا محالہ اب ایسے شخص کی ضرورت ہوئی جو ان تمام روایات کو جمع کرے قواعد کی چھان بین کرے ان کو علیحدہ کرے اور اس طرح اصول اجتہاد کی بنیاد ڈالے،

اس بحث سے معلوم ہوا کہ جس طرح مذہب کی نسبت کسی خاص امام کی طرف نہیں کی جاسکتی اسی طرح امام کا اتباع بھی بلا واسطہ مجتہد کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔

گویا پیغمبر علیہ السلام کی شریعت کا مفکر کے لئے اتباع مجتہد کو واسطہ بنائے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور شیعہ حضرات ہر چند ائمہ کے اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان مسائل میں کہ ائمہ سے ان کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی اپنے علمائے مجتہدین ہی کی طرف جھکتے ہیں مثلاً ابن عقیل عضائری، سید مرتضیٰ اور شیخ شہید ارد پھر ان کے افعال پر فتاویٰ صادر کرتے ہیں جو ائمہ کے روایات کی صیح روایات سے ٹکراتے ہیں۔ اس قسم کے مسائل میں سے کچھ تھوڑے سے مسائل بطور نمونہ باب فروع میں انشاء اللہ حوالہ قلم ہوں گے۔

تو اب اگر خود شیعوں کے نزدیک ایسے مجتہد کی بھی تقلید جائز ہے جس کے اقوال ائمہ کی بعض روایات کے مخالف ہوں اور یہ تقلید مجتہد ائمہ کی اتباع سے مانع نہیں تو اہل سنت کی اتباع امام ابو حنیفہ و شافعی وغیرہ کیوں قابلِ اعتراض سمجھی جائے۔

یہ ضرور ہے کہ ان مجتہدین کے بعد اقوال ائمہ کی بعض روایات کے مخالف ہیں مگر یہ مخالفت نہ نقصان دہ ہے اور نہ ائمہ کی اتباع اس سے متاثر ہوتی ہے کیونکہ اصول و قواعد میں یہ مجتہدین ائمہ کے ساتھ متفق ہیں۔

جیسا کہ امام محمد بن حسن شیبانی اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما دونوں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہوئے بعض مسائل میں ان کے خلاف گئے ہیں۔ اور تمام مذاہب میں ایسا ہوا ہے کہ امام مجتہد کی رائے سے ان کے شاگردوں نے اختلاف کیا ہے۔

اور ابن الاثیر جزری مصنف جامع الاموال نے امام علی بن موسیٰ الرضا کو جو امامیہ مذہب کا مجدد صدی سوم کا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امامیہ اپنے موجودہ مذہب کا سلسلہ سند ان تک پہنچاتے ہیں اور اس طرح اس مذہب کی ابتداء ان ہی سے جانتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تابعین میں حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ اور صحابہ میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ

عندہ مذہب حنفی کے بانی مہانی تھے۔ یا مانع وزہری رحمہما اللہ تابعین میں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ صحابہ میں مذہب مالک کے بانی مہانی ہیں۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ ابن الاثیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ امامیہ کے گمان اور عقیدہ کے مطابق لکھا ہے نہ کہ فی الواقعہ ایسا ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کے مجددوں کو اس نے اہل مذہب ہی کے اعتقاد کے مطابق نامزد کیا ہے۔

پھیا سیدواں دھوکہ، اہل سنت کی کتابوں سے چھانٹ چھانٹ کر ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن سے صحابہ کرام علیہم السلام کی شان ارفع و اعلیٰ میں بدگمانی کا دم پیدا کر دیں، اور ان روایات کو اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ وہ خلافت کے مستحق نہ تھے۔

وہ اپنے خیال میں اس مکروہ کید کو بڑی اہمیت دیتے اور تمام کیدوں کا سزناج سمجھتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی ان چالوں اور دھوکوں نے بہت سوں کو راہ ہدایت سے بھٹکا دیا۔

ان تمام اخباروں و روایات کی تفصیلی بحث قراب مطالعہ میں انشاء اللہ آئیں گی اور وہاں معلوم ہوگا کہ ان روایات سے نہ ان کی مطلب برآری موقی ہے اور نہ ان کی غرض پوری ہوتی ہے۔ البتہ یہاں مقام کی مناسبت سے ان کے اس دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کو الزام دینا ہی ہے تو انصاف سے تو کام لو، اور اسکی صورت یہ ہے کہ اہل سنت کی تمام صحیح روایات کا اعتبار کرو جو مناقب و بدائع خلفاء و صحابہ کرام میں اہل سنت کے نزدیک بطریق تواتر منقول ہیں اور پھر دونوں قسم کی روایات کو پیش نظر رکھ کر دیکھو ان میں باہم تعارض ہو تو علم اصول میں تعارض دور کرنے کی جو وجوہ مقرر کی گئیں ان کے مطابق تعارض دور کرنے کی کوشش کرو۔ یعنی اکثر کو اقل پر، اظہر کو اخفی پر اور اس رویہ کو جو عمل و اعتقاد کے موافق ہو اس کے خلاف پر قابل ترجیح بنائیں۔

اب اس جمع کرنے، چھان بین کرنے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے اور ان میں حق و ثواب معلوم کرنے کے بعد جو نتیجہ نکلے گا وہ عین اہل سنت کا مذہب ہوگا۔

یہ حرکت خلاف انصاف ہوگی کہ الزام دینے والی روایات کو یا گھڑی ہوئی اور ضعیف کو عام روایات کے خلاف صرف آحاد تنہا، کی روایات کو، جو تاویل شدہ اور صحیح معنوں پر معمول ہوں نظر اعتبار سے گرا دینا اور ان روایات سے چشم پوشی کرنا جو متواتر اور قطعی الثبوت ہوں، جیسا کہ اس فرقہ کا معمول ہے۔

ان کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو قرآن مجید سے ایسے جملوں کو چھانٹتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کی لغزش کا ثبوت دیتے ہیں جیسے وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ۔ یا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کے بارے میں سوال کرنا۔ یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو اپنا پروردگار کا کہنا اور بتوں کے نورٹنے کی جھوٹی نسبت بڑے بت کی طرف کرنا اور خود کو جھوٹ موٹ کا بیاد ظاہر کرنا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو قتل کر دینا اور اپنے بڑھے بھائی ہارون علیہ السلام کی دائرہ صحنہ پر کھڑے ہو کر بلا تحقیق و تامل کے کھینچنا، اور حضرت داؤد علیہ السلام کا اوریا کی بیوی کے معاملہ میں گناہ یا اور اسی قسم کی باتیں، اور پھر اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ جو حکم قرآن مجید میں ان انبیاء کی برائیاں قطعیت اور تواتر سے ثابت ہیں اس لئے یہ نبوت کے مستحق نہ تھے، بلکہ ان کو نیک جان نافرمان خداوندی کی خلاف ورزی ہے اور یہ بدتمیز اور عقل سے بیدل شخص اتنا نہیں سمجھتا اور اگر سمجھتا بھی ہے تو بدسخی کا پردہ اس کی عقل پر ایسا پڑا ہوا ہے کہ وہ ان

قطعی اور متواتر نفوس قرآن کو دیکھنے سے عاجز ہے۔ جو با بقراآن مجید میں آئی ہیں جو ان محترم حضرات کی تعریف ادران کے حال اور نتیجے کی خبر و خوبی سے بھر جی ہوئی ہیں۔

اگر کسی شخص نے یا معلم میں دوسروں کی عبرت کے لئے یا ان بزرگوں کی تادیب و ارشاد کے لئے کوئی کتاب آمیز جملہ وارد ہو اسے تو یہ ان کثیر قطعی الثبوت نسوس کو باطل نہیں کر سکتا لا محالہ اس کتاب آمیز کلام کو کسی ایسے معنی پر محمول کریں گے جو ان کی ارفع و اعلیٰ شان پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ جو قطعی طور پر ثابت ہے۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اگر کوئی چاہے کہ وہ متشابہ آیات جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں جمیعت یا لوازم جمیعت ثابت کرتی ہیں اور جن میں چہرے سے کر پڑی تک کے اعضاء و اجزاء جسمانی کا اللہ تعالیٰ کے لئے ظاہر ہونا سمجھا جاتا ہے۔ ان آیات کو لے کر اللہ تعالیٰ کے حق میں نقص کا تصور لے کر یہ کہے کہ جو ذات ان خوب سے متصف ہو خدا بننے کے لائق نہیں۔ تو اس قسم کے شبہات اور مفہومات کا ایک ہی جواب۔ یہ کہ۔ **حَفَظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ** ایک چیز کو بچانے کے لئے تو نے ساری چیزیں کھو دیں۔

اور شیعوں کا یہ شبہ اس جملہ کے شبہ سے ملتا جلتا ہے جو نماز کے انکار میں آیت **لَا تَقْرَأُوا الْقُرْآنَ** پیش کرتا ہے۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اسی آیت کو سیاق و سباق کے ساتھ یا دوسری آیت دیکھ کر کہتا ہے کہ بلائنا سے قرآن پر عمل کس نے کیا ہے۔ ایک دو کلموں پر ہی عمل ہو جائے تو غفیت۔ ہے۔

سستا سوال دھوکہ دہ ان کے دو علماء و جن کو اپنی تاریخ وانی پر بڑا اعزہ ہوتا ہے، بنا دٹی اور جھوٹی حکایتوں کو جنہیں تاریخ کذب صریح کہہ کر ردی میں ڈال دیتی ہے۔ اپنی بڑی معتبر کتابوں میں میں دھڑلے سے جگہ دینے ہیں۔ اور کذب و بہتان کی اسی پوٹ سے اپنے اعتقادی مسائل ثابت کرتے ہیں۔

ان حکایات میں بلند درجہ وہ جھوٹی حکایت ہے جو ان کے سیرت نگاروں اور اخبار نویسوں نے گھڑی ہے اور ان کے علمائے انہیں اخبار نویسوں پر اعتماد کر کے اور جن ظن سے کام لے کر ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اس کی تصدیق کی ہے۔

اسی حکایت سے وہ انبیاء الوالہ العزم علیہم السلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انصافیت ثابت کرتے ہیں۔ جو اس مسائل نبوت میں ہے اور شیعوں مذاہب یہودیت نصرانیت اور اسلام کے خلاف ہے وہ روایت علیہ بنت ابی ذؤیب عبداللہ بن حراث سعدیہ رضی اللہ عنہا کی ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دھڑلانے والی تھیں۔

یہ ایک دند کہ ہر اوراق میں مجاہد بن یوسف ثقفی کے پاس پہنچیں تو مجاہد نے ان سے کہا سلیمہ اچھا براتم خود ہی آگئیں میں تم کو پکڑ لوں گا۔ تاکہ تم سے انتقام لوں وہ بولیں آخر اس خفگی کی وجہ کیا ہے وہ بولا میں نے سنا ہے کہ تو علی کو، ابو بکر عمر رضی اللہ عنہم پر فضیلت دیتی ہے یہ منکر علیہ نے سر جھکا لیا اور بڑی دیر بعد اسراٹھا کر کہا میں اسے مجاہد میں اپنے امام کو خدا کی قسم یہ صرف ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما پر ترجیح دیتی ہوں کہ ان دونوں کی کیا حیثیت کہ آں جناب کے ساتھ ایک ترازو میں ملی سکیں، میں تو آپ کو آدم فوج ابراہیم سلیمان موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام پر فضیلت دیتی ہوں۔

یہ شکر جبار آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تو اس بات پر ناراض تھا کہ تو اس شخص درہنہ اندھنہ کو سفور سے اللہ
عزیز و مسلم کے دو صحابیوں درہنہ اندھنہ، پہنچنے دیتی ہے اور اب تو نے یہ کہہ کر تمام اہل العزم پیغمبروں پر ترجیح
دے کر اپنے جرم کو اور بھی سنگین اور میرے غصے کو اور بھی بھڑکا دیا ہے اگر تو اپنے اس دعوے سے دست بردار
نہ ہو تو میں تیرے حکم کو کڑا لوں گا۔ اور تمہیں فاشا سے نصرت بنا دوں گا۔ یا یہ بولیں اگر تیرا مقصد کیا ہے اگر مجھ
پر ظلم ہی توڑنا چاہتا اور احیائے میرے خون سے لانا دیکھنا چاہتا ہے تو یہ میرے اندر یہ طاقت اور اگر مجھ سے اس
دعوے کی دین سننا چاہتا ہے تو میرا باپ تو میرے سن۔ بارہ کہنے لگا، ان جا کس دین سے تو آدم علیہ السلام پر
علیٰ رضی اللہ عنہ کو فضیلت دیتی ہے حالانکہ آدم کے بغیر کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ سے گونہ دیا۔ چالیس دن ان پر
رحمت نازل کی پھر ان کے جسم میں اپنی ناس ہر درج پھرنی۔ ان کو اپنی جنت میں رکھا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ ان کو
سمجھا کر دے۔

علیمہ نے کہا اس میں کہ آدم کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَخَرْنَاكَ اَدَمُ کہ آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی انفرادی پس بیجا، اور سورہ حلّ اس میں طاعت و بندگی سے نقل رخا اللہ عنہ کی تعریف فرمائی اور اَتَمَّادِیْنِکُمُ اللّٰهُ وَمَا سَوَّوْنَا میں بھی نماز و زکوٰۃ کے حوالہ کے ساتھ انہی طرح سراہی کی۔ پھر عبد آدم علیہ السلام سے اب تک کوئی ایسا نہیں گزرا جس نے عین نمازیں فقیر کو بطور صدقہ انگوٹھی دی ہو (عجز علی کے) حجاج بر لاقر نے یہ کہا اچھا اب یہ بتا کہ تو نے نوح (علیہ السلام) پر ان کو کس درجہ سے فضیلت دی؟ علیمہ نے کہا یہ اس لئے کہ علیؑ کی زوجہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، نساء عالمین کی سیدہ تھیں جن کا نکاح سدرۃ المستقی کے نیچے جبریل علیہ السلام کی سفارت اور ملائکہ کی شہادت و گواہی سے منعقد ہوا۔ بخلاف زوجہ نوح علیہ السلام کے وہ کافروہ منافقہ تھیں چنانچہ نص قرآنی میں اس کا صاف ذکر ہے حجاج علیمہ کی اس حاضر جوابی سے بہت متاثر و حیران ہوا اور علیمہ کی بہت تعریف و ستائش کی۔

اس کے بعد پوچھا کہ اب یہ بتا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر علی (رضی اللہ عنہ) کو کس دلیل سے ترجیح دیتی ہو۔ وہ بولی کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کی تھی اِنِّیْ کَیْفَ تَھِیْ اَلْمَوْتِ قَالَتْ اَوَلَسْتَ تُوْمِنُ قَالَتْ بَلٰی وَ لَکِنِّیْ تَظُنُّنِیْ قَالَتْ اَمِیْرٌ رَّبِّ حَجَّجْہُ دَکْھَا دَکْہُ کَہْ اَپ مَرْدَہُ کَہْ طَرَحَ زَندَہ کَہْ سَیْ گَہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا ایمان نہیں لایا۔ کہا کیوں نہیں لیکن صرف اس لئے کہ میرا دل الطمینان حاصل کر لے، بخلاف اس کے علی (رضی اللہ عنہ) نے برسرِ منبر فرمایا اَنُکْشَفَ الْفِطَاعُ مَا اَنَارَتْ یَقِیْنًا اگر حجاب کا پردہ اٹھ بھی جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا، پھر علیہ نے کہا ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ اور مومنین و منافقین کی جماعتوں نے چاروں طرف سے آپ کے گرد حلقہ کیا ہوا تھا۔ تب میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا اسے جماعت مومنین معراج کی رات میرے لئے ایک منبر رکھا گیا جس پر میں بیٹھا پھر میرے والد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) آئے اور اسی منبر پر مجھ سے ایک درجہ نیچے بیٹھ گئے دوسرے پیغمبرانِ کرام بھی جوق در جوق آئے اور مجھے سلام کرنے لگے تا آنکہ میرے چچا زاد بھائی (علی رضی اللہ عنہ) کو جنت کی اونٹنی پر سوار کر کے لایا گیا۔ ان کے ہاتھ میں دو امداد ان کے چاروں طرف ایسی مخلوق تھی جن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے تھے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے پوچھا یہ جو ان کو نسا پیغمبر سے میں نے کہا یہ پیغمبر نہیں بلکہ میرے چچا زاد بھائی علی بن ابی طالب ہیں۔ پھر پوچھا ان کے ارد گرد کون لوگ ہیں؟ میں نے جواب دیا یہ ان کے شیعہ اور

محبین ہیں تو حضرت ابراہیم و علیہ السلام نے دعا فرمائی اے اللہ مجھے بھی علی کے شیعوں میں سے کر، چنانچہ سورۃ صافات کی اس آیت کے یہی معنی ہیں۔

وَاِنْ مِنْ شَيْعَتِهِمْ اِذْ جَاءَتْكَ بِهٖ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (البتہ ابراہیم بھی ان کے شیعہ میں سے ہیں جب کہ آیا وہ اپنے رب کے پاس قلب سلیم کے پاس آیا۔

مہاج نے کہا تو نے یہ بھی ٹھیک کہا۔ اب یہ بتا کہ سلیمان (علیہ السلام) پر علی رضی اللہ عنہ کی نفیست کی کیا وجہ ہے حلیمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ سلیمان (علیہ السلام) نے بادشاہ اور دنیاوی جاہ و عزت کیلئے ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

ترابِ حبیبی! مَلَاكَ يَنْبَغِي لِذِيهِ مِنْ بَعْدِي أَنْتَ الْوَحَّابُ دَاوِے میرے رب مجھے اس شان کا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو بے شک عطا کرنے والا تو ہی ہے۔ بخلاف اس کے جناب علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کو تین طلاقیں دیں اور کہا کہ اِنَّكَ عَنِّي يَا دُنْيَا طَلَقْتُكَ ثَلَاثًا لَا تَجْعَلْ بَعْدَ هَذَا بَيْكَ عَلِيٍّ غَارِبِي غَيْرِي لَا حَاجَتَهُ لِي بِذَلِكَ دے دنیا تجھ سے پرے ہٹ میں نے تجھ کو تین طلاقیں دی جس میں رجوع بھی نہیں ہو سکتا تو ایمان ترا کام جانے کسی اور کو باکرہ بیکہ مجھے تجھ سے کوئی سزاوار نہیں، حجاج نے کہا یہ بھی تو نے ٹھیک کہا ہے اب یہ بتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کس دلیل سے علی رضی اللہ عنہ کو نصیبت سے حلیمہ نے کہا کہ جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے بھاگے تو ہراساں اور ڈرے ہوئے تھے۔ بفرمان اللہ تعالیٰ نَفَخْنَا مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ اِیسا وہ سحر سے ڈرے ہوئے نکلے اور اہل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی رات جناب علی رضی اللہ عنہ، آپ کے بستر پر اطمینان کی نیند سو رہے تھے اگر ان پر خوف و ہراس ہوتا تو نیند حرام ہو جاتی حجاج نے کہا یہ بھی تو نے ٹھیک کہا۔ اب عیسیٰ علیہ السلام پر دہر نصیبت بتا بولی اس کی دلیل یہ ہے کہ مقام حساب میں جب عیسیٰ علیہ السلام کو کھڑا کیا جائے گا اور ان سے باز پرس ہوگی کہ کیا نصاریٰ نے تمہارے کہنے سے تمہاری عبادت کی اور تم نے ان کو آزاد کیا تو وہ معذرت چاہنے اور توبہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَنْتَ كُنْتَ لَنَا بِسِ الرِّجْزِ دُنْيَا وَ اَمْنِي الْاٰمِنِي مِنَ دُوْنِ اللّٰهِ دیکھتا مے لوگوں سے یہ کہا تھا۔ کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو خدا بنا لو، برخلاف اس کے سبائیہ نے جب امیر المومنین کو خدا کہا تو آپ بہت برا فرد خستہ ہوئے اور ان کو جلا وطن کر دیا اور ایسی سزا دی کہ مشرق سے مغرب تک اس کا شہرہ ہو گیا اور خود امیر المومنین بری الذمہ ہو گئے۔ حجاج بولا تو نے صبح کہا۔ پھر ایک ہزار دینار اعلان فرماؤ خودی کی خاطر ان کو دیئے اور مستقل سالانہ وظیفہ بھی مقرر کیا۔

اس کے بعد جلدی نے حجاج سے کہا کہ ایک دوسرا نکتہ بھی سن کہ جب مریم بنت عمران علیہا السلام کو درد نہ ہوا تو وہ بیت المقدس میں تھیں، ان کو حکم ہوا کہ ذرا جنگل میں جاؤ اور وہاں کسی خشک کھجور کے درخت کے نیچے عمل زیبی پورا کرو۔ تاکہ تمہارے نفاس کی گندگی سے بیت المقدس آلودہ نہ ہو۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ جو بنت اسد تھیں، کو درد نہ لاحق ہوا تو ان کو وحی الہی آئی کہ کعبے میں جاؤ اور میرے گھر کو اس مبارک بچے کی پیدائش سے مشرف کر اب ذرا انصاف کرو ان میں سے کونسا بچہ افضل ہے حجاج نے علیمہ کے لئے دعائے خیر کی اور عزت و احترام کے ساتھ ان کو رخصت کیا۔

آپ یقین کر لیں کہ پوری کہانی جھوٹوں کے سرداروں کی من گھڑت، بنادنی افتراء اور جھوٹ کی پوٹ ہے اور اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیمہ سعدیہ نے باتفاق مورخین خلفائے راشدین تک کا زمانہ نہیں پایا تو حجاج تک پہنچے کا تو امکان ہی نہیں اگر وہ حجاج کے زمانہ تک زندہ ہوتی تو ان کی عمر ایک سو چالیس سال ہونی چاہیے تھی بلکہ مورخین کا اس میں ہی اختلاف ہے کہ علیمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بعثت بھی پایا یا نہیں۔ اور وہ ایمان بھی لائی تھی یا نہیں۔

اس کے علاوہ حجاج، اشتر، سادات اور خاندان اہل بیت کے وابستگان کے قتل ناحق اور خونریزی بی خسومی طور پر شہرہ آفاق تھا۔ اور نواسب کا ایک بزرگین زد تھا۔ امیر المومنین اور آپ کے اولاد سے اس کی دشمنی تو بان زد خلق تھی۔ چنانچہ اہل سنت کی ایک جماعت کراچی دہرے اس نے شہید کیا پھر کسی کو اس کی مجال و تاب کب تھی کہ اس کی مجلس میں بن بلائے کوئی گھسی جائے۔

اس کے مصاحبوں اور خدام میں سے بھی اگر کوئی اس کے سامنے جاتا تو جان و آبرو جانے کی نگرہیں لرزان و ترسلا رہتا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادم خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام تک کی توہین و تذلیل سے باز نہ آیا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگان زمانہ کو مار ڈالنے کے کیا کیا جتن کئے اور کہاں کہاں ان کی تلاش نہ کرائی ان حالات میں یہ ممکن ہی کب تھا کہ علیمہ ان کے پاس آئیں اور اس دھڑے سے ان سے گفتگو کر پائیں۔ اور پھر یہ راز بھی نہیں کہتا کہ علیمہ اس کے پاس آئی کیوں تھیں۔ حجاج نہ تو شیعوں میں سے تھا۔ نہ اسی کے ہاں بخشش و داد و دہش کا سلسلہ تھا کہ کچھ ملنے اور پالنے کی امید میں اپنی قوم بنی سعد کی فرودگاہ سے جو حجاز میں طائف کے حوالی میں تھی عراق کے دور و دراز مقام پر چلی آئیں۔

اور یہ بات تو تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ اہل بیت کا انکار دشمن یہ شاری باتیں سن کر بھی علیمہ کو ایک ہزار دینار ہی نہیں دیگا بلکہ اس کا مستقل وظیفہ بھی مقرر کر دے گا یہ بات تو اس کے عقیدہ اور سرشت کے سراسر خلاف تھی اور پھر سارے ہی مورخ خواہ سنی ہوں یا شیعہ اس پر متفق ہیں کہ حجاج مرتے دم تک اپنے عقیدہ پر قائم تھا۔ تاؤ ہونا تو دور کی بات ہے اس نے اپنے عقیدہ میں نرمی یا کمزوری تک کو داخل نہ ہونے دیا اور یہ بات بھی سب متفق ہو کر کہتے ہیں کہ زندگی کے آخری گھڑی تک امیر المومنین اور آپ کی ذریت کے ساتھ دشمنی رکھنے اور سادات کشی پر تلا ہوا تھا۔

اب آئیے ذرا علیمہ مائی کے دلائل پر ایک تنقیدی نظر بھی ڈال لیں جن کو شیعہ نے بڑے طعراق اور بڑی چمک دمک سے بیان کیا ہے۔

ملاحظہ وہ سب چند در چند وجوہ سے جس پر بڑی طویل گفتگو درکار ہوگی بے حقیقت اور بے معنی ہی نہیں حدود چوبیس بھی ہیں یہاں ہم اطناب اور طواں سے گریز کر کے صرف بارہ وجوہ ہی سپرد قلم کرتے ہیں۔
(۱) یہ سارے دلائل اہل اسلام کے عقائد کے خلاف ہیں۔ بلکہ یہود و نصاریٰ کے بھی کیونکہ کوئی دلی کسی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

(۱۲) یہ سب باتیں قرآنی نصوص کے بھی خلاف ہیں۔ کیونکہ قرآن میں جا بجا انبیاء کو تمام مخلوقات پر فضیلت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کو ساری مخلوقات میں سے چنا اور منتخب کیا گیا ہے۔

(۱۳) ان استدلالات میں انبیاء کرام علیہم السلام کی لغزشوں کو شمار کیا گیا ہے اور پھر ان کا مقابلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب و مدائح سے کیا گیا ہے اور انبیاء کے مناقب و مدائح کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں ہیں۔ اگر دونوں کے مناقب اور مجد و شرف کو برابر رکھ کر کچھ کہا جاتا تو ادھر تو جہ کاشائے حواز نکل آتا ورنہ یہ طریقہ احتجاج تو ہر جگہ چل سکتا ہے۔ اس کی بنا پر تو کوئی شورہ اپشت اور بد بخت یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ عبس میں اسیران بدر سے ندیہ کے معاملے میں انشاء اللہ چھوڑ دینے پر منافق کی نماز جنازہ پڑھنے پر غزوہ تبوک میں منافقین کو عدم شرکت کی اجازت دینے، یا طعمیہ اور اس کے بھائیوں کو جانبداری پر اللہ تعالیٰ نے باندھنا خطاب فرمایا۔

اور دوسری طرف حضرت امیر المؤمنین بلکہ ابوذر، عمار، سلمان اور مقداد رضی اللہ عنہم کی فلاں فلاں آیات میں ستائش فرمائی۔ اور اس سے العیاذ باللہ وہ یہ نتیجہ نکالے کہ یہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوئے۔

(۱۴) حضرت آدم علیہ السلام جو تمام انسانوں کے باپ اور پوری نوع انسانی کے اصل اصول ہیں ان کی اولاد میں جو نیکی اور خوبی و نفع پذیر ہوتی ہے باپ ہونے کے ناطے ان کے اعمال نامے میں لکھی جاتی ہے کیونکہ یہ امر مذہباً طے شدہ ہے کہ والدین اگر مومن ہیں۔ تو ان کی اولاد کے اچھے اعمال ان کے نامہ عمل میں ثبت کئے جائیں گے لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بزرگی ان کے حق میں اصل اقی کا نزول اور عین نماز میں فقیہ کو انگوٹھی کا مسدقہ، حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت و بزرگی کے مقابلہ میں ذرہ حقیر سے زائد نہیں کیونکہ تمام انبیاء و اولیاء، علماء و صلحاء اللہ جل جلالہ اور خود امیر المؤمنین کے جتنے بھی اعمال خیر ہیں وہ سب حضرت آدم علیہ السلام کے اعمال نامہ میں درج اور آپ کی ذات پاک میں جاگزیں ہوں گے کہ بندگان و طاعت، نو بہر شرمندگی کی سنت آپ ہی سے نو جاری ہوئی اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صریح ہے۔ مَنْ شَقَّ فِي الْإِسْلَامِ سَنَةً فَلَهُ أَجْرٌ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (اسلام میں جس نے نیک رسم کی بنیاد ڈالی اس کو اجر و سنت کے اجر کے ساتھ اس پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی ملتا رہے گا)۔

(۱۵) بیان فضیلت کے سلسلہ میں حضرت نوح علیہ السلام اور علی رضی اللہ عنہ کی بیویوں میں موازنہ بھی عجیب اور انوکھا طرز استدلال ہے جو کسی بڑے دماغ والے شیعہ ہی کے لئے طرہ افتخار ہو تو ہو کسی مسلمان کو تو اپیل نہیں کرتا۔

کیونکہ کسی کی بیوی کا کسی دوسرے کی بیوی سے افضل ہونا اس کے شوہر کی افضلیت ثابت نہیں کرتا اس منطق کی رو سے ماننا پڑے گا کہ فرعون پیغمبروں سے افضل تھا کیونکہ وہ فرعون بالا جماع حضرت نوح و حضرت محمد علیہما السلام کی بیویوں سے افضل تھیں، اور بقول شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ازواج رسول اللہ سے افضل تھیں تو اب آپ دیکھ لیجئے کہ اس استدلال کی روشنی میں کون شوہر کس سے افضل ہوا۔ (یہی تو مکہ و فریب کے وہ جال ہیں جن سے شیعہ اہل ایمان کا لشکار کھیلے ہیں)۔

(۱۶) حدیث نو کشف الغطاء بعض گھڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ شیعوں اور سنیوں دونوں کی کتابوں میں مذکورہ

اور اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو اس سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یقین کی زیادتی کا انکار کیا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اطمینان کی طلب کی ہے اور اطمینان کوئی اور شے ہے۔ اور یقین کچھ اور لہذا اطمینان حاصل ہونے کے بعد یقین میں زیادتی لازم نہیں آتی بلکہ اطمینان تو عیاں سے مشابہہ ایک حالت کا نام ہے۔ اور یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ زیادہ ہونے والی چیز اس چیز کی جنس سے ہونی چاہیئے جس پر زیادتی کی گئی ہے۔

(۷) معراج کی رات میں جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حاضر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ یہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچایا بلکہ اس میں اختلاف ہے چنانچہ ابن بابویہ قمی نے کتاب المعراج میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں یوں بیان کیا ہے کہ آسمان پر فرشتوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں کہا اِذَا رَجَعْتَ اِلَى الْاَرْضِ قَاتِلُوا عَدُوًّا عَلِيًّا مَنَا الشَّدَاءُ جب آپ زمین پر تشریف لے جائیں تو علی سے ہمارا اسلام کیے۔ پھر اسی کتاب میں ابن بابویہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ معراج کی رات حضرت علی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے بلکہ زمین پر تھے البتہ حجاب کا پردہ نظر کے سامنے سے اٹھ گیا تھا۔ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم ملکوت میں مشاہدہ فرما رہے تھے اس کو حضرت علی یہیں زمین سے دیکھ رہے تھے۔

اور صاحب نوافذ الاول نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے اور قطب راوندی نے ہمدانی سے باہمی الفاظ فرمودے روایت نقل کی ہے۔ اِنَّ عَلِيًّا كَانَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ الدُّشُرَىٰ وَانَّهُ سَرَاىَ كُلَّمَا سَرَاىَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ مَوَاجٍ كِى رَاتِ جَابَ عَلٰى نَبِىِّ كَرِيْمٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِى هَمْرَاهُ تَحْتِى جَوَ كُجَرِ نَبِىِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِجِئْتِى دِهْىَ اَيِ دِجِئْتِى۔

شیعوں کے نزدیک درنوں روایتیں صحیح ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد اور باہم متناقض ہیں
(۸) جارد و عبدس کی گذشتہ حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ تمام انبیاء کی بعثت ولایت علیؑ پر ہوئی بلکہ تشیع کے مضمے
ہی ولایت علیؑ میں مضمر ہیں، چنانچہ قاضی نور اللہ ثومنتری نے اس کی تصریح کی ہے ایسی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام
کو جب ابتدائے نبوت سے ہی علیؑ کی ولایت حاصل تھی تو معراج کی رات کو اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنا تحصیل حاصل
اور پہلے سے موجود چیز کی طلب ہے جو ایک مہمل اور بے معنی عمل ہے۔

(۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور اور خوف، اور حضرت علی رضی اللہ کے اطمینان کے متعلق جو اس روایت میں کہا گیا ہے، وہ نرانا مبالغہ ہے۔

اس نے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ میں نو عمر بچہ ہوں اور پیغمبر کا تابع مجھ سے ان کو کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ اس کی بنا پر مجھے اردو الیں اس لئے ان کے ڈرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اپنا بچہ مشرکین کے مکہ نے ان کو ہاتھ بھی نہ لگا یا۔

اس کے علاوہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلیمی تھی اور فرمادیا تھا کہ وہ تمکو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے لہذا ان کے اطمینان کا سبب قرآن پیغمبر پر ایمان تھا۔ اسی نے ان کے دل کو مطمئن رکھا۔

اس کے علاوہ باہم جنگ و قتال کی ابھی نوبت ہی نہیں آئی تھی ان کے علاوہ دوسری طرف محبت کے اسباب قربت و رشتہ داری اور ابوطالب کی ریاست یہ سب چیزیں بدستور قائم اور برقرار تھیں اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی لگا ہوا تھا کہ اگر ان کو کوئی نقصان پہنچا تو حمزہ و عباس (رضی اللہ عنہم) اور دوسرے چچا زاد بھائی اس کا بدلہ لینے کو تیار و موجود ہیں۔

ادھر موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں میں سے کوئی بات حاصل نہ تھی بلکہ ان کو یہ گمان غالب تھا کہ یہ لوگ مجھے قبلی کے بدلہ قتل کر ڈالیں گے اور اس سلسلہ میں رُسائے قبضہ کے شور سے اور تدبیریں ایک معتبر ذریعہ سے ان کو بھی معلوم ہو گئی تھیں اور فرعون سے محفوظ رکھنے کا خدائی وعدہ بھی ابھی نہیں ہوا تھا۔ اور جب یہ وعدہ الہی اَتَبْنِيْ مَعَكُمْ اَسْمَعُوْا وَاَنْتُمْ دَرِيْنِ تَمِ دُونُوں کے ساتھ ہوں اور سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں اور اَنْتُمْ اَوْ مَعِ اَتَبْنِيْكُمْ اَلَا يَتَوَدَّ دَمِ دُونُوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب رہیں گے۔) کے الفاظ میں ان تک پہنچا تو ان کی پوری تسلی ہو گئی اور پھر اس فرعون کے مقابلہ میں ڈٹ گئے جس کے دبدبہ اور فوج و لشکر کا مال معلوم ہتی ہے کہ کفار قریش کی نسبت تو اس کے سامنے اتنی بھی نہیں جتنی ایک تنکے کی پہاڑ کے سامنے ہوتی ہے اور پھر اسی باسلط و جبروت بادشاہ کی عین ناک کے نیچے اسی شہر میں چالیس سال تک دستے بستے رہے۔

خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جب (بقول شیعہ) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے خلافت چھینی تو اس کمزور اور بزدل شخص کا خوف اور ڈر ان کے دل میں اس قدر بیٹھ گیا کہ امامت سے بھی دست بردار ہو گئے۔ حالانکہ ان کی امامت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف مقرر شدہ تھی، اسی خوف اور تعقید کی وجہ سے بہت سے فرائض اور واجبات کو چھوڑا اور قرآن کی تحریف اور احکام کی تبدیلی گوارا کی اور اس پر راضی رہے۔

اسی طرح جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں (بقول شیعہ) جب ان کی دختر کو چھینا تو انتہائی خوف اور ڈر کی وجہ سے اس ذلت کو بھی قبول کر لیا۔

حالانکہ یہ سارا خوف و ہراس صرف نقصان پہنچنے کے اندیشہ مومہم پر مبنی تھا۔ نہ جان جانے کے خطرے پر اس لئے کہ شیعوں کے نزدیک یہ امر تسلیم کردہ اور طے شدہ امور میں سے ہے کہ ہر امام کو اپنی موت کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے اختیار سے مرتا ہے۔

اور اہل سنت کے نزدیک بھی بطریق صحیح یہ ثابت ہے کہ جب ایک دفعہ قصبہ منیع میں حضرت علی بیار ہوئے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم عیادت کو آئے تو آپ سے کہا کہ یہ آبادی گنوار کسانوں کی ہے اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مدینہ منورہ تشریف لے چلیں اس لئے کہ خدا خواستہ کوئی امر معین و وقوع پذیر ہو جائے تو تجھیز و تکفین تو تسلی بخش طریقے سے ہو سکے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے قتل کی حقیقت سے پورے طور پر آگاہ فرمایا ہے، جب تک وہ وقت نہ آجائے۔ ایسی دلیلی بات کا مجھے کوئی خطرہ نہیں اسی طرح متعدد بار آپ نے اپنی شہادت کے متعلق تفصیلات بتائیں۔ بلکہ منقول تو یہاں تک ہے کہ آپ نے قاتل کی تعین بھی فرمادی تھی۔ تو ان معلومات کے ہوتے ہوئے (شیعوں کا بیان کردہ) خوف و ہراس

کہوں تشا۔ ؟

(۱۰) حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے کہ وہ جاہ و حشمت و نیاوی کے طالب ہوئے ہوں اس لئے کہ یہ عقیدہ رکھنا تو ان کے دامن نبوت پر دھبہ لگانے کے برابر ہے اور صریحاً ان کی نبوت کے انکار کے مترادف ہے۔ جسے غالباً شیعوں بھی گوارا نہ کریں گے۔ اس لئے لا محالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس دعا و طلب میں وجاہت و نیاوی نہیں بلکہ کوئی اور صیغ غرض مد نظر ہوگی۔

اس سلسلہ میں سید مرتضیٰ کی وہ کتاب قابل غور و توجہ ہے اور تنزیہ الانبیاء والائمہ کے سلسلہ میں شیعوں کے ہاں مستبر بھی جاتی ہے اس میں اس نے جو توجہات بیان کی ہیں۔ وہ ذرا سمجھنے کی ہیں۔

(۱) ہر کتاب ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس قسم کے ملک کا مطالبہ اس لئے کیا ہو کہ وہ آپ کی نبوت کی دلیل و معجزہ بن جائے۔ کیونکہ معجزہ وہی ہوتا ہے جس پر کوئی دوسرا قادر نہ ہو جائے۔

(۲) یا ملک کی طلب آپ نے صرف مخلوق خدا میں عدلی و انصافی قائم کرنے اور رشد و ہدایت پھیلانے کی غرض سے کی ہو کیونکہ یہ مقصد شاہی اقتدار کے تحت آسان طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے جو ان اقتدار بڑھنا ہے اس مقصد کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔

(۳) یا لا یحد بین یحدی سے مراد صرف ان کی امت ہو گویا درخواست کا یہ مطلب ہو گا کہ اس بادشاہی امتیاز سے وہ بحیثیت نبی اپنی امت سے ممتاز ہو جائیں۔ اس توجہ میں صاف غلطی ہے، کیونکہ احادیث صحیحہ اور اس نص کے ظاہری الفاظ عموم پر دلالت کرتے ہیں پھر کوئی توجہ یہ اس وقت صحیح ہوتی کہ وہ اسی صفت کی بادشاہت طلب کرتے نہ اصل بادشاہت اس لئے کہ نبی کا امتیاز اپنی امت سے اور دوسری چیزوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ بادشاہت ہی کیا ضروری ہے۔

(۴) یا اللہ تعالیٰ نے ان کو باخبر کر دیا ہو گا کہ اس طرح کا ملک ہو جانے کے بعد ہی ان کو دنیا میں صلاح و تقویٰ حاصل ہو گا۔ نیکوئی، بھلائیوں اور طاعات کی کثرت نصیب ہوگی۔ خلاف اس کے کہ اگر یہی ملک کسی دوسرے کے ہاتھ آتا تو بجا نہ اس کے کہ اس کے لئے صلاح و تقویٰ کا سبب بنے تو جہاں الی الحق اور طاعات و خیرات سے اس کے لئے مانع نہ ہو جائے۔

ان توجہات کے علاوہ اس قسم کی اور باتیں بھی اس کتاب میں درج ہیں بہر حال ان سے حضرت سلیمان کی کمتری اور حضرت علیؑ کی برتری ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کو طلاق دینے کے بعد بھی خوف کی نہ صرف خواہش کی بلکہ اس کے لئے جد و جہد بھی فرمائی تا آنکہ مسلمانوں میں باہم کشت و خون کی فزیت تک آئی۔

اس طرز عمل سے گویا یہ واضح ہو گیا کہ بعض لوگوں کے لئے دنیا سے دست برداری طلب ملک کے مخالف نہیں کیونکہ طلب ملک سے ان کا مقصد حصول جاہ و مال نہیں بلکہ دشمنان خدا سے جہاد کرنا کھانا کچھ کئی حکام شریعت کو رواج دینا بیت المال کی نگہداشت اور حقداروں پر اس کی تقسیم بھی اس طلب کا مقصد ہو سکتا ہے لہذا حضرت سلیمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں اس امر میں تو باہم متفق ہیں کہ طلب ملک و خلافت کے وقت دونوں کے دلوں میں یہی

ٹیک اور دوسے اور نیت صالحہ تھی اتنا فرق البتہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی بلا امداد و اسباب ظاہری مخلوقات ان کے تابع فرمان اور زیر نگین ہو چنا جبہ ایسا ہی ہوا فستغوثا کہے الزبجیم پس ہوا کو ہم نے ان کے تابع کر دیا۔ وَالشَّيَاطِينُ كُلٌّ مُتَّبِعُونَ اِیہو اے شیاطین ان کے لئے تعین فرماؤں گے کہ تم کرتے تھے،

اور جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسباب ظاہری یعنی فوج کشی اور جنگ و قتال کی معرفت میں اس قسم کی درخواست کی لیکن ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی صرف اس مصلحت کی وجہ سے کہ ان کی نظر سے اسباب ظاہری کی وقعت و منزلت گر جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خاص بندوں سے کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔ اسی لئے کہ ان کو ارب و رشد کا سبق دینا ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا سے بالکل قطع نعلن دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ہرگز نہیں ہوتا۔ اگر ترک دنیا ہی باعث فضیلت ہے تو ہند کے جوگی کشمیر کے رشی نصاریٰ کے رہبان اور چین کے لائے جو دنیا سے اپنا رشتہ بالکل کاٹ چکے ہیں اور عبادت اور خشک خوری کو اپنی عادت بنا چکے ہیں کیا نعوذ باللہ حضرت سلیمان و حضرت یوسف علیہما السلام سے افضل کہلا میں گے۔

(۱۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نصیحت دینے کے سلسلہ میں جو بیان ہوا اس کا لب لباب یہ اور خلاصہ دو باتوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے متعلق ابتدا اعتقادی کے مجموعوں کو جلا وطن کیا، ان کو مزا دی، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا،

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے باز پرس ہوگی اور وہ اپنا عذر پیش کرنے پر مجبور ہوں گے مگر جناب علی کرم اللہ وجہہ سے نہ باز پرس ہوگی اور نہ وہ عذر و معذرت پر مجبور ہوں گے، لیکن ہمیں ان دونوں باتوں پر اشکالی و اعتراض ہے اس لئے کہ یہ دونوں باتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی برتری حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ثابت نہیں کرتیں۔

اب دیکھئے سزا دینے نہ دینے کا معاملہ تو ہم کہتے ہیں کہ جناب امیرؓ کی محبت میں حد سے بڑھ جانے والوں نے تو یہ لغو عقیدہ اور کلمات کفر خود جناب امیرؓ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں شائع و فاعل کر دیئے اور عوام و خواص میں پھیلا دیئے تھے جب کہ حضرت عیسیٰ کی محبت میں غلو کرنے والوں نے جو کچھ کیا ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد کیا ان حالات کے پیش نظر جناب علی رضی اللہ عنہ کے لئے تو سزا دینا ممکن تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ممکن نہ تھا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے تو ان کا قتل بھی ممکن تھا۔ اور اگر یہ قتل ہو جاتا تو فتنہ کی حرط ہی کٹ جاتی اور پھر کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا لیکن چرچہ یہ مقدمہ نہ تھا اس لئے ایسا نہ ہوا جلا وطنی کے بعد بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے بلکہ اب محتاط ہو کر ان کو یہ کفر مانیں، عواقب اور تہریز میں پھیلانے کا بہتر موقع مل گیا۔

اب جواب طلبی کے معاملہ کو لیجئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے باز پرس کا ذکر تو قرآن مجید میں آگیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اس سلسلہ میں کچھ معلوم نہیں۔ اور کسی چیز سے لے کر اصل بات یا چیز کے وجود کی نفی کو لازم نہیں ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی رسول ہوتا یا ان پر وحی اترتی اور اس میں ان سے باز پرس کی نفی ہوتی تو یہ فرق کچھ قابل لحاظ ہوتا۔ بلکہ بعض آیات قرآن کا علوم تو یہ بتاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس باز پرس سے نہ بچیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یَوْمَ یُسْأَلُهُمْ رَبُّہُمْ مَا یَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قِیْلَ اَنْتُمْ اَضَلْتُمْ ہِیَ اَوْیَ حُلُلٍ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبیلَ۔ (جس دن وہ جمع کرے گا لوگوں کو اور ان کو جس کی وہ خدا کے سوا عبادت کرتے تھے میں ان

سے پوچھے گا کہ تم نے میرے ان بندوں کو بہکا یا تھا یا یہ خود ہی بہک گئے تھے)
اس پر یہ حضرات بھی عذر کر س گئے۔ تَاوَدُ سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْكَ مَوْثِقًا وَنَاوَدُكَ مِنْ اَوْدِيَا
دوہ کہیں گے تو پاک ہے ہمارے لئے یہ لائق ہی نہ تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو ولی بناتے، اور ظاہر ہے اس قسم کی
باز پرسی میں کوئی الزامی پہلو نہیں ہے کیونکہ اس باز پرس سے تو ان پرستش کرنے والوں کو ڈانٹنا و پٹنا مقصود ہے
اور تنبیہ کر کے خود ان کے معبودوں کی زبانی ان کے مذہب و عقیدہ کا کذب ظاہر کرنا ہے۔

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایسی باز پرس فرشتوں سے بھی ہوگی حالانکہ فرشتے بالاجماع معصوم ہیں اور غیر مکلف
نہ وہ قابل مواخذہ ہیں نہ لائق عقاب!
چنانچہ ارشاد ہے۔ وَكَذَٰلِكَ نَخْشِرُكُمْ مُّجِيبًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهْبِزُوْا اَيَّاكُمْ يَنْبِذُ وَنْ اَوْرِسْ وَنْ اَم
ان سب کو جمع کریں گے اس وقت فرشتوں سے پوچھیں گے کہ کیا یہ لوگ تم کو پوجتے تھے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باز پرس نہ ہونا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہونا یہ قرین انصاف تو ہے۔
قابل اعتراض بالکل نہیں۔ اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے اور پیغمبر کا فرمان قطعی دلیل ہوتا ہے اس لئے
اس سے استدلال کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر بیان کیا جاسکتا ہے بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کہ آپ سید الاولیاء تو
تھے مگر پیغمبر بالکل نہ تھے اور ولی کا قول قطعی بالکل نہیں اور نہ اس سے استدلال کر کے بارگاہ ایزدی میں
غور کیا جاسکتا ہے۔

اور پھر ایک بات اور بھی ہے کہ امت کی اچھان اور برائی پر پیغمبر کی شہادت ضروری ہے چنانچہ ارشاد باری
ہے۔ وَكَذَٰلِكَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بَشَرًا لِّدَعٰٓءِ اٰمِلِيْنَ اَلَا اِنَّكُمْ لَعِنَآ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (یوم بعثت میں ہم ہر امت سے
ایک گواہ اٹھائیں گے۔ اور ان سب پر آپ سے گواہی لیں گے۔ اس مضمون کی اور بھی آیات ہیں مگر امت پر
ولی کی شہادت ضروری نہیں! لہذا معلوم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کرنا اور حضرت علی سے نہ کرنا حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کی واضح دلیل ہے۔

(۱۱۲) روایت مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں جو ذکر کیا گیا ہے وہ محض پُر اور تاریخی
اعتبار سے سراسر بے اصل و بنیاد ہے اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش میں بڑا اختلاف ہے بعض
کہتے ہیں۔ فلسطین میں ہوئی تو بعض دوسرے مصر میں مانتے ہیں اور بعض دمشق دشنام ہیں، مگر مشہور قول یہ ہے کہ
آپ کی ولادت بیت اللحم میں ہوئی مگر یہ بات کسی مورخ نے لکھی نہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کو بیت المقدس
میں دروزہ لاقی ہوا اور اگر یہ صورت تسلیم کر لی جائے تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ ان کو بیت المقدس سے نکالا
گیا قرآنی عبارت تو صاف یہ بتاتی ہے کہ ان کو دروزہ کی وجہ سے سخت بے چینی لاقی تھی انہوں نے چاہا کہ کسی
چیز سے پیچھے لگا کر سہارا لیں چنانچہ ویرانے کی طرف نکل کھڑی ہوئیں۔

چونکہ بچہ بے باپ کا نفخ ملک (فرشتہ) سے تھا اس لئے وہ شرافتی بھی تھیں، اسی لئے کسی سے مدد بھی
نہ لینا چاہتی ہوں گی۔، لاحال اس وقت جنگی ہی ان کے حال کے مطابق تھا وہاں جا کر ایک کھجور کے تنے سے
ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں جنگل کا ماحول، ولادت کے عمل سے ناواقفیت تنہائی اور دروزہ اس لئے بے ساختہ موت

کی دعا بھوں پر آگئی، فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جُذْعِهَا فَأَلَمَتْهُ لَيْلَتُنِي مِثْلَ قَبْلِ هَذَا وَكُنْتُ نُسِيًا مَنِيًّا۔
دردزدہ ان کو ایک کھجور کے تنے کی طرف لایا (اس وقت)، انہوں نے کہا کاش میں اس سے قبل ہی مر کر بھولی
بھری ہو جاتی۔

فاطمہ بنت اسد، رضی اللہ عنہا کے متعلق جو یہ کہا گیا کہ ان کو وحی ہوئی کہ خانہ کعبہ میں جا کر وضع حمل کریں درحقیقت
ایک بے لطف جھوٹ ہے کیونکہ اسلامی یا غیر اسلامی کسی فرقہ کے نزدیک بھی وہ نبی نہیں تھیں پھر حجاج نے اس کو کسی بنا پر
تسلیم کر لیا یہ قابل تعجب بات ہے۔

مشہور روایت میں آیا ہے کہ ایام جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ رجب کی پندرہ تا سبغ کو کعبہ کا دروازہ کھولتے اور اس
مبارک گھر کی زیارت کے لئے اندر داخل ہوتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی چونکہ اسی دن ہوئی تھی اس لئے
اس کو یوم الاستنفاح یا روزہ مریم کہتے ہیں۔

بزرگوں نے اس دن کے کچھ اوراد و وظائف بھی مقرر کئے ہیں۔ رسم یہ تھی کہ اس دن سے ایک دو روز پہلے
عورتیں کعبہ کی زیارت کرتیں۔ اتفاقاً عورتوں کے لئے مخصوص انہیں دنوں میں فاطمہ بنت اسد نے بھی زیارت کا ارادہ
کیا گو ان کی موت گزر چکی تھی مگر یہ دن چونکہ سال میں ایک ہی مرتبہ آتا تھا۔ اس لئے باوجود ایسے دنوں میں حرکت و شمولی
اور باعث تکلیف ہوتی ہے مگر انہوں نے تکلیف برداشت کر کے اپنے کو کعبہ کے دروازے تک پہنچایا اس زمانہ میں بھی
باب کعبہ قد آدم سے اونچا تھا۔ اور سیڑھی وغیرہ بھی نہیں ہوتی تھی اس لئے عورتوں کو ان کے سر و بدقت تمام اوپر
چڑھاتے تھے

چنانچہ اس اٹھانے بٹھانے کے سبب درد میں اماند ہو گیا، فاطمہ نے خیال کیا کہ تھوڑی دیر میں یہ تکلیف جاتی رہے
گی میں اس کی وجہ سے زیارت کعبہ سے کیوں محروم رہوں وہ جیسے ہی دروازہ میں داخل ہوئیں۔ درد نے شدت اختیار کر لی
اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت ہو گئی۔

شیعوں کی روایات میں یہ واقعہ دوسرے انداز سے بیان ہوا ہے کہ مدت حمل گزر جانے اور مدد کی شدت میں اضافہ
کے سبب جناب ابوطالب مایوس ہو کر شفا طلبی کے لئے ان کو کعبہ میں لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور جلد
ولادت ہو گئی۔

کتب شیعہ میں یہ روایت جناب امام زین العابدین رحمہ اللہ سے ان الفاظ میں مروی ہے۔ اَخْبَرَتْنِي زَيْنَةُ
بِنْتُ جَحْلَانَ السَّاعِدِ بِقَوْلِ عَمَّارَةَ بِنْتِ عَبْدِ السَّاعِدِ تَيْهَ اَنَّهَا قَالَتْ كُنْتُ ذَاتَ يَوْمٍ فِي نِسَاءٍ مِنَ الْعَرَبِ
اِذَا اَقْبَلَ ابُو طَالِبٍ لِيُنِيَا فَنُكِّلْتُ لَهُ مَا شَأْنُكَ قَالَ اِنِّي فَاطِمَةُ بِنْتُ اَسَدٍ فِي شِدَّةٍ مِنَ السَّلَاقِ وَانْهَالِ لَنُفْعِ
ثُمَّ اِنَّهُ اَخَذَ بِيَدِهَا وَجَاءَ بِهَا اِلَى الْكُغْبَةِ فَدَخَلَ بِهَا وَتَالَ اِحْلِسِي عَلَيَّ اِسْمَ اللّٰهِ عَجَلَتْ وَطَلَقَتْ طَلَقَةً فَلَمَّ
غُلَا مَا تَطِيْفًا فَسَمَّاهُ اَبُو طَالِبٍ عَلَيْنَتْ۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھ کو زبدہ بنت عبلان الساعدیہ سے خبر دی اور انہوں
نے روایت کی ام امارہ بنت عباد ان عدیہ سے، انہوں نے کہا میں ایک روز مستورات عرب کے ساتھ بیٹھی ہوئی
تھی کہ اچانک ابوطالب فکر مند سے وہاں آئے میں نے ان سے خیریت اور حال پوچھا تو کہنے لگے فاطمہ بنت اسد
دردزدہ کی تکلیف میں مبتلا ہے مگر ولادت نہیں ہو رہی۔ پھر انہوں نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑا اور کعبہ تک لائے اور انور

لے گئے، اور کہا اللہ کا نام لے کر بیٹھ جاوہ بیٹھ گئیں تو درد کی شدت اور بڑھ گئی اور بالآخر ایک بچہ کو جنم دیا جس کا نام جناب ابو طالب نے علی رکھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر کعبہ میں پیدا ہونے ہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر برتری حاصل ہوئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کو افضل ہونا چاہیے حالانکہ ایسی بات نہ سنی سونچ سکتے ہیں اور نہ شیعہ اس کے قائل ہیں۔

اور پھر تاریخ کی متبرکت کتاب یہ بھی بتاتی ہیں کہ ام المومنین سرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے، حکیم بن حزام بن خویلد بھی کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ سو شیعہ منطلق کی روش سے ان کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی نہیں تمام انبیاء سے افضل ہونا چاہیے حالانکہ ایسے سر پرست و عقیدہ منقول کی شناسنت ظاہر ہے۔
اٹھا سیدواں دھوکہ کہ شیعہ توحید کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ شریعتیں صرف چھ گزری ہیں اور سہری کے بارہ وحی ہوئے ہیں۔

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت (۲) حضرت نوح علیہ السلام کی (۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام (۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی (۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور (۶) حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت۔

لاحیہ راہی (شیعہ) نے محیط اعظم (نامی کتاب) میں ان کے نام تفصیلاً درج کئے ہیں مگر نہ ان کے الفاظ و معانی کے بارے میں صحیح علم ہے نہ ان کے صحیح تلفظ سے کوئی واقف اور مزے کی بات یہ کہ خود توحید میں اس نقل کا کوئی نام و نشان نہیں۔ لہذا اس کے جھوٹ ہونے میں کیا شبہ ہے!

اور دلیل عقل سے بھی اس کا افتراء ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام تمام روئے زمین کے لئے مبعوث نہیں ہوتے تھے اس لئے شرائع کو خاص تعداد (مثلاً چھ) میں محدود کرنے کا کیا مطلب ہے؟

دوسری بات یہ کہ اس وقت سلسلہ نبوت ختم نہیں ہوا تھا، حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے حضرت شعیث علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے حضرت ادریس، پھر حضرت ابراہیم واسحاق علیہم السلام ان کے بعد حضرت یعقوب، حضرت یوسف حضرت موسیٰ، حضرت یوشع علیہم السلام نبوت و رسالت سے سرفراز ہوئے اور دین کی برقراری خود ان انبیاء کرام کی ذوات مبارکہ سے تھی تو ان کے ساتھ اوصیاء کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اگر یہ سب کچھ مان بھی لیا جائے تو توحید کے حوالہ سے بارہ کے عدد کے سوا اور کیا فائدہ حاصل ہو اور اس میں یہ اختلاف ہے کہ ان بارہ میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم، بیثیت اوصیاء شامل و داخل ہوں اور حقیقت میں وہ وحی ہونے کے لائق اور حقدار بھی ہیں۔

کیونکہ جہاد کرنا، شہروں کو فتح کرنا، کفر کو مٹا دینا، مسجدوں اور منبروں کی تعمیر کرنا اور شریعت کو مکمل طریقہ سے نافذ و رائج کرنا۔ ان ہی بزرگوں کے مبارک ہاتھوں سے بھلائی کے یہ سارے کام انجام پذیر ہوئے بخلاف ائمہ کے کہ دشمنوں کے صدمے میں، انہوں نے ساری زندگی خاموشی، عزت اور گوشہ نشینی میں گزار دی۔ (اور وصول والا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا)۔

نواسی والی دھوکہ دہا الزام لگاتے ہیں کہ اہل سنت ظاہر البشورت چیزوں کا بھی انکار کرتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے قائل ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا دیدار بالمشاحت باطل اور محال ہے کیونکہ کسی چیزوں کو دیکھنا چند بانوں کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ نہ پائی جائیں تو دیکھنا متحقق نہیں ہو سکتا، مثلاً۔

(۱) دیکھنے والی چیز دیکھنے والے کے مقابل یا مقابل کے مکمل (جیسے آئینہ میں صورت دیکھنا) میں ہو۔

(۲) بالکل قریب نہ ہو۔

(۳) دوردست سے بہت دور بھی نہ ہو۔

(۴) درمیان میں کوئی آڑ حاصل نہ ہو۔

(۵) اندھیرے اور تاریکی میں نہ ہو، بلکہ اس تک روشنی پہنچ رہی ہو۔

(۶) مدد جہ لطیف بھی نہ ہو، کچھ نہ کچھ کثافت بھی ہو، جیسے ہوا کی لطافت کے سبب ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۷) دیکھنے والے کی نظر بھی سالم ہو اندھے پن، ارتوندے یا اسی قسم کے امراض چشم لاحق نہ ہوں۔

(۸) دیکھنے والے کا دیکھنے کا ارادہ بھی ہو۔

اور ظاہر ہے یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے بارے میں مقصور نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں اہل سنت کا یہ جواب ہے کہ بطور عادت دیکھنے کے لئے درحقیقت یہی صورتیں شرط ہیں کہ ان

کے بغیر عام طور سے کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہیں لیکن بعض خاص حالات میں ان کے بغیر بھی دیکھا جاسکتا ہے اس بات کی کیا دلیل ہے کہ عقل بھی ان شرطوں کے بغیر کسی چیز کو دیکھنے کو جائز نہیں رکھتی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ بھی عام جاہلوں کی طرح عادات اور ادلیات میں فرق و تمیز نہیں کرتے۔ عالم اور

محقق ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں اگر اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ برف کے بطور بارش گرنے کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ

وہ خلاف عادت ہے۔ وہ انکار کی وجہ یہ بناتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پتھر کے مانند ٹھوس اور جمی ہوئی چیز

کے ٹوڑے کے ٹوڑے زمین و آسمان کے درمیان صانع اور ایسے ہوئے ہوں اور پھر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر برسیں۔

اور یہ بھی نہیں مانتے کہ موسم بہار میں چادر کی فصل اسی سے ہوتی ہے، حالانکہ سرد ممالک میں یہ بات عام

اور مشہور ہے۔

خط استوا میں آٹھ فصلیں ہوتی ہیں، اس کو بھی ہندو جاہل نہیں مانتے اور محالات میں شمار کرتے ہیں۔

اسی طرح ہر ملک کے جاہل اپنے ملک کے مقررہ موسم کے خلاف میوہ جات کی پیداوار کو بھی محالات میں

شمار کرتے ہیں۔

اگر بالفرض کسی شخص کی عادت طلوع آفتاب سے سونے اور غروب آفتاب کے بعد جاگنے کی ہو تو وہ ان چیزوں

کے علاوہ جو مشعل، چراغ یا موسم جی کی روشنی یا چاند کی چاندنی میں دکھائی دیتی ہیں، ان کی روشنی میں دیکھنے والی

چیزوں کا کبھی قائل نہ ہو گا، کیونکہ وہ دن کی حقیقت سے نا آشنا اور شعاع آفتاب کی کیفیت سے نا بلو ہے وہ نہیں

جانتا کہ آفتاب کی شعاع کو اس کی معلوم شدہ شعاعوں سے کیا نسبت ہے؛ وہ کیا جانتے کہ آفتاب کی روشنی میں

وہ جس چیز کو میل بھر سے دیکھ سکتا ہے شعل اور چراغ کی روشنی میں چند گز کی مسافت سے نہیں دیکھ سکتا۔ اور دکنے والی چیزوں کی دوسری باریکیاں اور مسامات جس طرح سورج کی روشنی میں دیکھے جاسکتے ہیں دوسری شمعوں میں ان کو دیکھنا غیر ممکن ہے!

جب عالم دنیا کے دن رات اور ملکوں اور شہروں کے اختلافات کا یہ حال ہو تو دوسرے عالم کے اختلاف کو کیوں اور کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے جس کا زمانہ دوسرا جس کا مکان جدا اور جس کے دن (یوم آخرت) کو شعاع انشورقت الشمس بنو ہوا تھا روشن کرے گی۔ اور جو قبلی المسواۃ اور فیم الغنیل کا مصداق ہے۔ اس دن کے مقابلہ میں تو عالم دنیا کے دن اندھیری کو ٹھہریں کی طرح معلوم ہوں گے۔

وہ دن تو اپنے رب کے نور سے سزدور و روشن ہو گا اس دن نہ دکنے والی اشیاء مثلاً پوشیدہ و چھپے ہوئے مخلوق و اعمال بھی دکھائی دیں گے۔ روح حیوانی میں صرف عالم بدل جانے سے وہ فراخی اور کشادگی پیدا ہو جاتی گی اور اس کے تمام حواس دنیاوی حواس کے مقابلہ میں ہزاروں گنا بڑے اور حساس ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے وَأَنَّ الْأَنْفُسَ الَّتِي كَانَتْ لَا تَأْتِيكُمُ الْيُسُوفَ - دارِ آخرت ہی حیات زندگی ہے، کاش یہ اس کو جانتے ہوتے اور فرمایا آئینم بہند و البصیر یومہ یا تو نہا جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو خوب دیکھتے اور خوب سننے والے ہوں گے۔ دیکھ فرمایا (فَنُفِثْنَا عَنْكَ غُلَامًا كَذِبًا) اَلْیَوْمَ حَدِثْنَا دیکھم نے تجھ سے تیرا پرہیز و معذرت کر دیا۔ بس اس کا دن تیری نگاہ تیز ہو گی۔

اب اس بارے میں کہ دیکھنے کے لئے مذکورہ عقلی شرطیں ضروری نہیں دلیل سنئے ہزار سے زائد قرآنی آیات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سنا بھی ہے دیکھتا بھی ہی ہے اور خود شیعہ بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور سننے والا مانتے اور کہتے ہیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں یہ شرائط ناپید ہیں۔ اور دیکھنے والی آنکھ کی پتلی میں دکنے والی چیز کی صورت کا چھینا اور اس سے شمعوں کا لکھنا اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ فلاسفہ جو عادات کے چھندے میں گرفتار اور عقلیات کی بیڑی میں جکڑے ہوئے ہیں دیدار کے لئے ان شرطوں کو ضروری نہیں سمجھتے۔

ثابت قرہ حرانی نے جہاں روحانی اشیاء کو دیکھنے یا ان سے گفتگو و ملاقات کو جائز بتایا ہے وہیں وہ کہتا ہے کہ زحل کی روح کو میرے ساتھ خاص وابستگی اور تعلق تھا۔ وہ میرے دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کرتی تھی ایک دن یہ سانحہ پیش آیا کہ خلیفہ وقت مورتی بائیس کسی نے میری چغلی کھائی کہ تمہارے لئے معتقد کو بیگانا اور پرے انفال پر ابھارتا اور ان کا باعث بنتا ہے۔ خلیفہ اس ماسدانہ چغلی پر بہت برم ہوا اور میرے قتل پر آمادہ ہو گیا اور مجھے کچھ خبر نہ تھی میں بے خبر اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ ایک بیک وہ روحانیت میرے پاس آئی اور مجھے جگا کر مورتی مالی سے آگاہ کر کے بھاگ جانے کی ہدایت کی۔

میں حواسِ باختر گھر سے نکلا اور ایک دوست کے گھر جا چھپا، ادھر خلیفہ نے ایک جماعت میری گرفتاری کے لئے بھیجی انہوں نے گھر میں مجھے تلاش کیا، پڑوسی پر بھی سختی کی مگر میرا سراغ نہ ملا میرا لڑکا سنان بھی گھر ہی میں رہ گیا تھا میرے ساتھ نہ آسکا حالانکہ وہ انہیں کے ساتھ چل پھر رہا تھا۔ مگر وہ اس کو نہ دیکھ سکے۔

دوسرے دن وہ روحانیت میرے پاس آئی اور سارا قصہ مجھے بتایا میں نے اس سے کہا کہ پھر مجھے بھی میرے لڑکے کی طرح کیوں نہ کر دیا کہ میں گھر ہی میں رہتا اور دوست کا احسان مند نہ ہوتا۔ وہ کہنے لگی کہ تیرا لڑکچہ مرتضیٰ کے مقابلہ میں تھا۔ اس لئے تجھ پر میری پوری توجہ نہ تھی اور تیرے بیٹے کا لڑکچہ غوست سے محفوظ تھا۔ اس لئے اس پر میری پوری توجہ تھی۔

ثابت قرہ مذکور نے یہ بھی لکھا ہے کہ فلاسفہ قدیم نے ایک سرمہ تیار کیا تھا جو اس قدر مقوی بصر تھا کہ اس کے لگانے سے دن کے وقت تارے نظر آجاتے تھے اور دور کی چیز ایسی نظر آتی تھی جیسے آنکھوں کے سامنے قریب ہی ہو میں نے وہ سرمہ بابل کے ایک شخص کے بطور تجربہ لگایا، وہ شخص کہنے لگا کہ ثوابت دسارے اپنی اپنی جگہ مجھے صاف نظر آ رہے ہیں۔ میری نظر کثیف اور ٹھوس چیزوں سے بھی گزر رہی ہے۔ اور میں ان کے پیچھے کی چیزوں کو بھی مان دیکھ رہا ہوں، چنانچہ میں اور قسطنطنیہ کے ایک بلبلکی بطور امتحان ایک گھر کے اندر گئے اور اس شخص کو باہر کھڑا کر دیا گھر کے اندر ہم نے ایک کتاب لکھنی شروع کی وہ شخص باہر کھڑا ہوا ہیکو کتاب کی عبارت پڑھ کر لفظ بلفظ سنا سنا لگا وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ پہلی سطر اس عبارت سے شروع ہوتی ہے۔ اور دوسری ان الفاظ سے پھر ہم نے ایک کاغذ لیا اور اس پر کچھ لکھنے لگے اس شخص نے بھی باہر ایک کاغذ لیا اور ہمارے لکھے کی ساتھ ساتھ نقل کرنے لگا۔ پھر ہم نے اپنے لکھے ہوئے سے اس کی تحریر ملانی تو لفظ بلفظ صحیح تھی۔

ایک مرتبہ قسطنطنیہ کے اس شخص سے اپنے بھائی کا حال دریافت کیا جو بلبلکی میں تھا اس نے نظر ڈالی اور کہا وہ بیمار ہے اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جس کا طالع برج ہے ثور کا تفسیر اور برج ہے چنانچہ تفتیش و تحقیق سے پتہ چلا کہ اس نے جو بتایا صحیح تھا۔

غلام کلایہ کہ جو شخص عالم دنیا اور عالم آخرت کے فرق و اختلاف کو مانتا دانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر اعتقاد رکھتا ہے وہ ان تمام امور کو بعید از عقل نہیں مانتا جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے جنت یا دوزخ میں کیا ہے اور اس میں تو اہل اسلام ہی نہیں ہر مذہب کا بھی اتفاق ہے کہ آخرت میں مومن و کافر کو فرشتے، حوریں اور غلمان دکھائی دیں گے۔ اسی طرح بہشتی اپنے ملکیتی رقبہ کو ایسے دیکھے گا جیسے ابتدائی جسے کو دیکھتا ہو گا مالانکہ دونوں کناروں کے بین بڑی طویل طویل مسافت اور بعد ہو گا۔ چنانچہ ابن بابویہ قمی کی روایت مذکورہ کتاب المعراج کا وہ حصہ اس کی تائید کرتا ہے جس میں اس نے بتایا تھا کہ جناب امیر مومنین علی رضی اللہ عنہ زمین پر وہی کچھ دیکھ رہے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر ملاحظہ فرما رہے تھے۔

اس کے علاوہ ابن بابویہ نے کتاب الروضہ میں متعدد صحیح طرق سند سے اور ابو جعفر طوسی نے کتاب الامالی میں روایات بیان کی ہیں کہ ہر مومن، جناب پیغمبر علیہ السلام و جناب علی و حسین رضی اللہ عنہ کی آرام گاہوں کو دیکھتا ہے۔ اور راوندی نے بھی روایت کی ہے کہ جب خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہ کی مدت حمل پوری ہو کر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی ولادت کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہ حضرت سارہ حضرت مریم حضرت آسیہ علیہم السلام کو ان کے پاس بھجیا کہ ان کی خدمت کریں۔ جیسا کہ ایک زندہ عورت کی زندہ عورتیں خدمت کرتی ہیں، حضرت خدیجہؓ ان کو دیکھتی تھیں ان سے ہم کلام ہوتیں۔

صفار نے کتاب البصائر میں بیان کیا۔ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو جبر صدیق رضی اللہ عنہ کی آنکھوں پر اپنا دست مبارک ملا اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے ابو جبر طیار رضی اللہ عنہ کو اور ان کے رشتہاء کو علیحدہ علیحدہ حبشہ کے دریا میں کشتی کے واپسی سفر میں دیکھ لیا۔

اور شیخ الطائف محمد بن النعمان نے کتاب المقالات میں دعویٰ کیا ہے کہ مذکورہ اور تحریر کردہ آثار و اخبار شیعوں کے نزدیک تو ائمہ کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔

یہ ساری گفتگو اس صورت میں ہے جب اہل سنت روایت خالق و مخلوق میں کوئی تمیز و فرق نہ کر سکیں اور دونوں مذہبوں کو سند الہا بیت مانیں لیکن اگر گفتگو اور کلام کی بنیاد محققین اہل سنت کے مذہب پر رکھیں جو یہ ہے کہ ان کے نزدیک مخلوق کا دیکھنا اور ہے۔ اور خالق کا دیکھنا جدا کہ ایسی روایت دنیا میں ایک دو بار سے زیادہ و فرغ پذیر نہیں ہوئی اور وہ عینی صورت پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس صورت میں اشکال و اعتراض بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بالکل ظاہر الثبوت ہے۔ کہ ایک قسم کا مشروط ہونا بعض شرطوں کے ساتھ یہ لازم نہیں کرنا کہ دوسری قسم بھی انہیں شرطوں کے ساتھ مشروط ہو۔

فوسے وال دھوکہ : یہ کہتے ہیں کہ قبر کا عذاب اہل سنت اور دوسرے اسلامی فرقوں کے لئے عفو ہے لیکن امامیہ کہتے ہیں فاسق و فاجر عاصی و خاطی کیوں نہ ہو ان کے لئے عالم قبر میں سوائے لذت و نعمت کے دکھ کا کوئی سوال ہی نہیں۔

ان کا یہ اعتقاد بے اصل اور لغو ہے کیونکہ خود شیعوں کی کتابوں میں صاف و صریح روایتیں اور آثار مروی ہیں جو ہر عاصی و گناہ گار مسلمان کے حق میں ہیں۔ بالخصوص شیعوں کے حق میں، چنانچہ ابن بابویہ قمی عمران بن زید سے ان الفاظ میں روایت کرتا ہے، قُلْتُ لِإِنِّي عَبْدُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنِّي سَمِعْتُكَ أَنْتَ تَقُولُ كُلُّ شَيْعَةٍ فِي الْجَنَّةِ عَلَى مَا كَانَ مِنْهُمْ قَالَ صَدَقْتُكَ وَاللَّهِ كُلُّهُمْ فِي الْجَنَّةِ قُلْتُ جَعَلْتَ فِدَاكَ إِنَّ الدُّوْبَ كَثِيرٌ وَمَعَاذَ رَبِّكَ فَقَالَ أَمَّا فِي الْقِيَمَةِ فَكُلُّهُمْ فِي الْجَنَّةِ بِشَفَاعَةِ النَّبِيِّ الْمَسَاحِ أَوْ رِسِّي النَّبِيِّ لَكَتِي وَاللَّهِ أَخَوْنِي عَلَيْهِمْ فِي الْبَرْزَخِ قَالِ الْكُفْرُ مِنْ حَيْثُ مَوْتِهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ رُكْبَانِ نَسَبِ ابْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ سے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے سارے شیعہ جنت میں ہیں خواہ وہ کسی بھی حال میں ہوں فرمایا واللہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ سب جنت میں ہیں۔ میں نے کہا میں آپ پر نذر چھوٹے بڑے گناہ کی تو کثرت ہے فرمایا (وہ گناہ تو) نبی اور ان کے وحی کی شفاعت سے دماں ہو جائیں گے اور وہ سب جنت میں ہیں لیکن واللہ میں برزخ میں تمہارے بارے میں خوفزدہ اور نگر مند ہوں میں نے کہا برزخ کیا؟ فرمایا قبر کا عرصہ موت سے قیامت تک۔

اکاٹوسے وال دھوکہ : کہتے ہیں کہ اہل سنت اہل بیت کے دشمنوں کو دوست رکھتے ہیں اور دشمنوں کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے کیونکہ کمانے کہا ہے کہ دشمن تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اپنا دشمن۔ اپنا دوست کا دشمن اپنے دشمنوں کا دوست اسی طرح دوست بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اپنا دوست اپنے دوست کا دوست اپنے دشمن کا دشمن۔

پس لا محالہ اہل سنت بھی اہل بیت کے دشمن ہونے اور یہ کلام اس قاعدہ پر مبنی ہے جو اہل مکر و اہل عقل

کا منکر کر دے اور ثابت کر دے کہ کسی سے محبت رکھنے والا اس کے حبیب اور محبوب مددوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کے دشمن کا دشمن یا جس کا وہ دشمن ہوتا ہے اس کا یہ بھی دشمن ہوتا ہے اسی طرح کسی دشمنی رکھنے والا محبت رکھتا ہے اس کے دشمن سے اور اس سے جس کا وہ خود دشمن ہے،

اور دشمنی رکھتا ہے اس کے حبیب و محبوب سے؛ لہذا اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوست عام ہے دوست رکھنے والے اور دوست رکھے ہوئے سے اور دشمن عام ہے دشمن رکھنے والے اور دشمن رکھے ہوئے سے؛

اہل سنت کی طرف سے اس طعن کا جواب ایک تو بظہر بن جہل ہے کہ اہل سنت خواص و فروع کے دشمن ہیں اور وہ اہل بیت کے دشمن ہیں۔ لہذا اہل سنت جب اہل بیت کے دشمن ہوئے تو اہل بیت کے دوست ہوئے۔

اور شیعہ خواص و فروع کے دشمن ہیں اور وہ پیغمبر علیہ السلام کے دوست ہیں تو گویا شیعہ پیغمبر علیہ السلام کے دوست کے دشمن ہوئے اور دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے تو ثابت ہوا کہ شیعہ پیغمبر علیہ السلام کے دشمن ہیں؛ اس ضمن میں اسی قسم کی اور باتیں بھی کہی جاسکتی ہیں جن سے شیعہ کی پیغمبر دشمنی ثابت ہوتی ہو

دوسرے؛ یہ کہ دوستی اور دشمنی جب براہ راست ہو تو بالواسطہ دوستی اور دشمنی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح تمام نسبتوں اور تعلقات میں بھی یہی اصول کار فرما ہے کہ بالواسطہ یا بلا واسطہ کے مقابلے میں قابل لحاظ نہیں۔

مثلاً ایک شخص کسی کا سگا بھائی ہے، اور اس کے دشمن کا ہم زلف بھی قریہ اپنے بھائی کا دشمن شمار نہیں ہوگا ایسے ہی اگر ایک شخص کا نوکر اس کے دشمن کے نوکر کا بھائی ہے اور اس نوکر کو اس شخص کے دشمن کا نوکر نہیں کہیں گے یہی حال باقی نسبتوں کا سمجھ لو؛ پس اب جب اہل سنت بلا واسطہ اہل بیت کے دوست ہوئے تو اسی بلا واسطہ دوستی کا اعتبار ہوگا اور وہ دشمنی جو ان کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھنے والوں سے بالواسطہ لازم آتی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ بالواسطہ اوصاف کا لحاظ اسی وقت سے جب بلا واسطہ اوصاف نہ ہوں کیونکہ بلا واسطہ اوصاف قوی تر اور اولیٰ تر ہیں اور قویٰ ترک موجودگی کے وقت کمزور علاقہ کا اعتبار غلط عقل ہے۔

تیسرے یہ کہ تحقیق یہ ہے کہ نفس و دشمنی کا اعتبار صفات و حیثیات کے لحاظ کئے بغیر خلاف عقل ہے بلکہ دوستی اور دشمنی کی عرض و غایات صفات و حیثیات ہی ہیں۔

پس اگر کوئی شخص کسی کو خاص وصف و حیثیت کی وجہ سے دوست رکھتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام حیثیات سے اس کو دوست رکھتا ہے اور دوستی اور دشمنی بالواسطہ کی تبدیلی اس وقت ہوتی ہے کہ ایک ہی حیثیت سے اس کو دوست بھی رکھتا ہے اور دشمن بھی؛ پس اہل سنت اہل بیت کے دشمنوں کو اس حیثیت سے دوست نہیں رکھتے کہ وہ اہل بیت کے دشمن ہیں۔ لہذا یہ الزام ان پر آتا ہی نہیں۔

چوتھے یہ بھی تحقیق شدہ امر ہے کہ اہل سنت ان کو دوست رکھتے ہیں جن کو وہ اپنے اعتقاد میں اہل بیت کا دشمن نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کے دوست اور اعتقاد میں موافق خیال کرتے ہیں اور ان کی روایتوں میں جو اثر یہ ثابت ہے کہ وہ ہمیشہ اہل بیت کے صالح اور شایع خواں رہے۔

اور ان کے دین و شریعت کے مددگار معادن، بنی خرقہ نمازوں اور خطبوں اور دوسری دعاؤں میں ان پر درود بھیجتے رہے۔ البتہ شیعوں نے اپنے گمان میں ان حضرات کو مخالف اور دشمن اہل بیت قرار دیا ہے تو شیعوں کے اس گمان

سے وہ واقعہ میں اہل بیت کے دشمن نہیں ہو جاتے پھر اہل سنت، اہل بیت کے دشمن کو کس طرح دوست رکھ سکتے ہیں جب کہ خود ان کی کتابوں میں اس مسنون کی صحیح روایات موجود ہیں کہ ترجمہ: جو شخص آل محمد سے بغض رکھنے کی حالت میں مر جائے تو اگرچہ وہ نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہو روزہ میں ڈالا جائے گا۔

اور طبرانی میں یہ روایات ہیں۔ مَنْ أَلْبَسَ أَهْلَ الْبَيْتِ فَهُوَ مُنَافِقٌ د اہل بیت سے بغض رکھنے والا منافق ہے۔ یا۔ لَا يُبَغِّضُنَا أَهْلَ الْبَيْتِ أَحَدٌ وَلَا يُحْسِنُ نَا أَحَدٌ إِلَّا تَرِيدَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَوْضِ بِسَاطِ النَّارِ ہم میں سے جو کوئی بھی اہل بیت سے مسدود بغض رکھے گا وہ قیامت کے دن حوض کوثر سے آگ کے کوڑے مارا ہوگا دیا جائے گا۔

اس طرح ترمذی نے نوادر اصول فی اخبار الرسول میں حضرت مقداد بن اسود سے روایت کی ہے کہ مَعْرِفَةُ آلِ مُحَمَّدٍ بَدَاةٌ مِنَ النَّارِ وَحُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ جَوَائِزٌ عَلَى الْقِيَامَةِ وَلَوْلَا يَتْلُو لَأَلَّاهُ مُحَمَّدٌ أَمَّا مَنْ مِمَّنْ الْعَدُوُّ لِرَّاءِ آلِ مُحَمَّدٍ مِنْ مَوْتِ آگ سے برأت ہے اور آل محمد علیہ السلام کی محبت پل صراط پار کرنے کا پیر واز ہے۔ اور آل محمد علیہ السلام سے دوستی عذاب سے ضمانت ہے۔

بلکہ فاضل کاشانی نے بھی جو شیعہ امامیہ کے فضلاء میں سے ہے اہل سنت کو کہا رہا ہے رضوان اللہ علیہم کی محبت پر معذور سمجھا ہے۔ اور اہل سنت کی نجات کا قائل ہوا تھا یہاں تک کہ ان کو اس پر جناب باری سے خواب و اجر کا امید وار قرار دیا ہے۔ یہی نہیں پھر ائمہ کرام کی روایات سے اپنے ان اقوال کو ثابت بھی کیا ہے یہاں ہم اس کے کلام کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ اس دھوکہ کا زائلہ شیعہ فضلاء کی شہادت سے بالکل ہو جائے۔ الْحُبُّ وَالْمُبَغِّضَةُ إِذَا كَانَ دَلِيلُ يَوْمَ مَصْرُوحِهِمْ وَإِنْ كَانَ الْمُجْبُودُ مِنَ أَهْلِ النَّارِ وَالْمُبَغُّوْنَ مِنَ أَهْلِ الْجَنَّةِ لَا عَقِيدَةَ الْغَيْبِ فِي الدُّوَلِ وَالشَّرِّ فِي النَّارِ وَإِنْ أَهْلَاءُ فِي عَقِيدَةِ يَدُلُّ عَلَى ذَالِكَ مَا مَوَاقِفُ الْكَافِي بِإِسْنَادِهِ عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لَوْ أَنَّ سَجْدَةَ أَحَبَّ رَجُلًا لِلَّهِ لَشَابَهُهُ عَلَى حَبِّهِ يَا قَاهُ وَإِنْ كَانَ الْمُجْبُودُ فِي عِلْمِ اللَّهِ مِنَ أَهْلِ النَّارِ وَلَوْ أَنَّ رَجُلًا أَقْبَضَ رَجُلًا لِلَّهِ أَثَابَهُ اللَّهُ عَلَى بُغْضِهِ يَا قَاهُ وَإِنْ كَانَ الْمُبَغُّوْنَ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ مِنَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَلَا يُبَغِّضُ أَنْ هَذَا الْحُبُّ وَالْبُغْضُ يَرْبُ إِلَى حُبِّهِ الْمُقَامِ وَالْحَقِيقَةِ دُونَ الشَّيْءِ الْخُزْنِيِّ وَكَذَا الْمُبَغِّضَةُ حُصُولًا إِذَا لَمْ يَكُنِ الْحُبُّ وَالْمُبَغِّضَةُ مَحْبُوبًا وَمُبْغُودًا وَمِنْهُمَا مَسْمُوعٌ بِصِفَاتِهِ وَأَخْلَاقِهِ وَمِنْ هَهُنَا يُحْكَمُ بِمَجَاةٍ كَثِيرَةٍ مِنَ الْمُتَافِقِينَ الْمُسْتَضْعَفِينَ سَيِّئًا لَوْ تَعَيَّنَ فِي عَصِي خِفَاءِ الْإِمَامِ الْحَقِّ الْمُحِبِّينَ لَا يَتَمَيَّزُ مَلَائِكَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمُ وَإِنْ لَمْ يَعْرِفُوا قَدْ رُفِعُوا وَإِمَامُهُمْ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ مَا مَوَاقِفُ الْكَافِي بِإِسْنَادِهِ السَّعِيدِ عَنْ زَمَرَةٍ عَنْ أَبِي هَبْدٍ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ ثَلَاثٌ أَصْلَحَتِ اللَّهُ أَرَدَيْتَ مِنْ مَلِكٍ وَمَا وَاجْتَنَبَ الْمَآيِمَ وَحَسَنَ وَنَعْلَهُ وَمَنْ لَا يَغْتَنِبُ وَلَا يَعْرِفُ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ يَدْخُلُ أُولَئِكَ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِهِ وَفِي إِيْتِجَارِ الطَّبْرَسِيِّ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ أَنَّهُ قَالَ فِي كَلَامٍ لَهُ فَمَنْ أَخَذَ بِمَا عَلَيْهِ أَهْلُ الْقِبْلَةِ الَّذِي لَيْسَ فِيهِ اخْتِلَافٌ وَرَدَّ عَلَيْهِ مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ إِلَى اللَّهِ سَلِمَ وَتَجَازَاهُ مِنَ النَّارِ وَدَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ وَقَفَاءُ اللَّهِ تَعَالَى وَفَعَلَ عَلَيْهِ وَاجْتَنَبَ عَلَيْهِمْ بِأَنْ تَوَسَّلَ قَلْبُهُ بِغُرْفَةٍ وَلَوْ أَنَّ مَرِيضًا أَلْبَسَهُ وَمَعْدِنَ الْوَلَدِ أَمَى هُوَ فَلَمْ يَمُتْ عِنْدَ اللَّهِ سَعِيدٌ وَلِلَّهِ وَلِيٌّ ثُمَّ قَالَ بَعْدَ كَلَامِهِ إِنَّمَا النَّاسُ ثَلَاثَةٌ مَرِيضٌ يَعْرِفُ حَقًّا وَيُسَلِّمُ لَنَا وَيَأْتِيَنَا وَفَذَلِكَ نَاجٍ حُبِّ اللَّهِ وَلِيٌّ وَنَا مَاتَ لَنَا الْعَدَاةُ يَتَبَرَّوْا مِنَّا وَيَلْجِئُنَا وَيَسْتَعْلِجُوا مَا رَأَوْا وَيَحْمِلُوا حَقًّا وَيَكُونُ لِلَّهِ

تَعَالَى بِالْبَرِّ اَوْ مِمَّا فَعَلُوْهُ كَانَ كَاذِبًا مُّشْرِكًا فَاسْقُوْا اِنَّكُمْ لَعَزَّوْنَ اَشْرَكَ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ كَمَا يَسْتَبُ اللّٰهُ عَذَابًا بِغَيْرِ
 عَلَيْهِ وَكَذَلِكَ يَنْشُرُكَ بِغَيْرِ عَلَيْهِ سَ جُلْ اَخَذَ بِمَا لَا يَحْتَلِفُ فِيْهِ وَرَدَّ عَلَيْهِ مَا اَشْكَلَ عَلَيْهِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالَى مَعَ
 وَكَذَلِكَ لَا يَأْتِيَنَّكَ وَلَا يَأْتِيَنَّكَ وَلَا يَعْرِفُ حَقًّا نَحْنُ نَرْجُوْا اَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكَ وَيَدْخُلَ الْجَنَّةَ هَذَا مُسَدِّدًا
 مُّجِيفًا اَسْتَهْلَى دُحْبَتِ اورد دشمنی جب صرف اللہ کے لئے ہو تو وہ ماجرہ من اللہ ہے اگرچہ اس کا محبوب دوزخی ہو اور
 دشمن جنتی کیونکہ اس کو محبوب سے اعتقاد نیک ہوتا ہے اور دشمن سے برائی کا اگرچہ وہ اپنے اعتقاد میں حق بجانب
 نہ ہو اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو صاحب کافی نے اپنے سندوں سے کافی میں بیان کی ہے کہ ابی جعفر علیہ السلام
 سے روایت ہے کہ فرمایا جس کسی نے کسی سے اللہ کے واسطے محبت رکھی اللہ تعالیٰ اس محبت رکھنے پر اس کو ثواب دے
 گا۔ اگرچہ اس کا محبوب اللہ کے علم میں دوزخی ہو اسی طرح اگر کسی نے کسی سے اللہ واسطے کابیر (بغض) رکھا تو اللہ
 تعالیٰ اس کے بغض رکھنے پر اس کو اجر دے گا اگرچہ اس کا مبغوض اللہ تعالیٰ کے علم میں جنتی ہو اور یہ بات پوشیدہ
 نہیں کہ یہ محبت و عداوت حقیقت اور مقام محبت کی طرف لومٹی ہے نہ اس خاص شخص کی طرف خصوصاً جب کہ محبت
 و بغض رکھنے والے نے محبوب و مبغوض کو نہ دیکھا ہو بلکہ اس کے اخلاق و اوصاف سے ہوں۔

اسی نظریہ کے تحت ان برائے نام مخالفوں کی نجات کا حکم لگایا گیا ہے جو کسی امام کی پوشیدگی کے وقت موجود
 ہوں مگر وہ ہمارے ائمہ کرام کے ساتھ محبت رکھتے ہوں گو وہ ان کی پوری قدر و منزلت اور امامت کو نہ پہچان سکے
 ہوں۔ اس پر کافی کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جو زرارہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابی عبد اللہ سے بایں الفاظ
 روایت کی ہے کہ میں نے آپ سے کہا اللہ آپ کو نیک بخت کرے مجھ کو اس شخص کے حال سے باخبر تو کیجئے جو نماز
 پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے مہربان سے چلتا ہے اور خرب تقویٰ والا ہے مگر ہے ایسے لوگوں میں سے جو نہ ائمہ
 کے دشمن ہیں نہ ان کی امامت کے قائل ہیں پس آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل
 کرے گا۔

اور احتجاج طبرسی نام کتاب میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے دوران گفتگو ایک مرتبہ آپ
 نے فرمایا جس نے اس بات کو لیا۔ جیسر سب اہل قبلہ متفق ہیں اور اختلافی بات کو حوالہ ادا کیا تو وہ محفوظ رہا اور اس نے
 دوزخ سے نجات پائی اور جنت میں جگہ پائی اور جس پر اللہ کا احسان ہوا اسے توفیق ملی اور محبت قائم ہوئی تو اس
 کے دل کو صاحب ریاست اور معدن علم ائمہ کی معرفت سے منور کیا۔ ایسا شخص اللہ کے نزدیک نیک بخت ہے
 اور اللہ کا دلی ولی ہے پھر کچھ مزید گفتگو کے بعد فرمایا کہ لوگ تین قسم کے ہیں ایک وہ مومن جو ہمارا حق پہچانتا ہے
 ہماری تابعداری اور پیروی کرتا ہے۔ پس وہ نجات پانے والا اللہ کا محبوب اور ولی ہے۔

دوسرا وہ جو ہم سے عداوت رکھتا ہے ہم سے بیزار ہے۔ ہم پر لعنت بھیجتا ہے ہماری خونریزی کو ملامت
 مانتا ہے ہمارے حق سے انکار کرتا ہے اور ہم سے بیزاری کو اللہ تعالیٰ کا دین کہتا ہے۔ پس ایسا شخص کافر
 مشرک اور ناسق ہے اس نے لاعلمی میں کفر و شرک کیا جیسے بغیر جانے بوجھے کوئی اللہ کو گالی دیتا ہے اسی طرح
 یہ بغیر علم کے مشرک کرتا ہے۔

اور تیسرا وہ شخص جو متفق علیہ بات کو قبول کر لیتا ہے اور جو بات محمد میں نہ آئے اسے اللہ کے حوالہ کرتا

ہے، ہم سے دوستی تو رکھتا ہے مگر ہماری پیروی نہیں کرتا اور نہ ہم سے عداوت رکھتا ہے۔ نہ ہمارے حق کو پہچانتا ہے۔ تو اس کے بارے میں ہم امید رکھتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ بخشدے اور جنت میں داخل کرے کہ یہ ضعیف الایمان مسلمان ہے۔

فاضل کاشی کا یہ کلام بظاہر تو بڑا معقول اور پر مغز اور نقص سے خالی نظر آتا ہے مگر اس کی تہ اور گہرائی میں جھانکا جائے تو وہ نقص عیاں ہو جاتا ہے۔ اور یہ کلام اصلاح و درستی کا محتاج نظر آتا ہے۔ اس کلام کا نقص نہ یہ ہے کہ یہ ائمہ کرام کے کلام کے خلاف اور متضاد معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ائمہ کرام نے تو نواصب کو روزخی کا فرد اور ناسق فرمایا ہے جب کہ خود کاشی نے کافی سے نقل کیا ہے۔ حالانکہ نواصب اس بات کے مدعی ہیں کہ ائمہ اہل بیت سے ان کا بغض صرف اللہ واسطے کہ ہے اور بموجب قول امام مذکور جب ان کا بغض اللہ واسطے کا ہو تو چاہے وہ خلاف واقعہ ہو وہ نجات بکارت ثواب کا موجب ہو گا ایسی صورت میں ان کو کافر و فاسق کہنا کیسے درست ہو گا۔ پھر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے کلام میں تفصیل ہے کہ جو شخص خاندان نبوت سے کم اور کم زور سی محبت رکھتا ہو، ان کی واقعی قدر و عزت کو نہ پہچانتا ہو اس کو ناجی قرار دیا ہے اور جو ان کے ساتھ عداوت رکھتا ہو اور اس میں خاندان نبوت سے محبت کی بوتل نہ ہو اس کو لاکھ ٹھیرایا ہے اس سے یہ پتہ چلا کہ محبوبان خدا سے عداوت کسی صورت میں عذر پذیر نہیں۔ البتہ محبت و تعظیم کے پتنے درجے ہیں سب مقبول ہیں اور درجہ اولیٰ سے اعلیٰ تک ناجی معذور محبت کے اعلیٰ درجہ میں قصور و کمی اور چیز ہے، اور عداوت اور چیز! قصور کو نظر انداز اور صاحب قصور کو معذور رکھیں تو بجا و درست ہے، لیکن عداوت میں اس کی گنجائش کہاں۔

اس کلام کی اصلاح و درستی پورے اور مکمل طور پر تو کتاب کے بارہویں باب تو لاوتبر میں انشاء اللہ پیش کی جائے گی جہاں صرف ناظرین کے انتظار کی تسکین کے لئے مختصر سا بیان کیا جاتا ہے لہذا اس کا مطالعہ نہایت توجہ اور غور سے کرنا چاہیئے۔

اول تو یہ کہ محبوب و مبغوض میں فرق و تمیز کرنی چاہیئے اور یوں سمجھنا چاہیئے کہ استحقاق محبوبیت و مبغوضیت دراصل دو قسموں پر منقسم ہے۔

(۱) ایک یہ کہ شارع کی طرف سے اس کا ثبوت قطعی اور تواتر کے ساتھ ہو اس قسم میں خلاف واقعہ اعتقاد کو قابل معذور و گزر نہیں سمجھنا چاہیئے کہ شرعاً جو محبوب ہو اسے مبغوض خیال کرے اور جو مبغوض ہو اسے محبوب اور اس اعتقاد میں نہ کسی باطل تاویل اور فاسد تفسیر کو دخل انداز ہونے دینا چاہیئے اور نہ ایسی باتوں پر کان دھرنا چاہیئے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ معاذ اللہ اس شخص کو بھی معذور اور مستحق اجر مانا پڑے گا جو انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کی لغزشوں کی وجہ سے اللہ مبغوض رکھتا ہو اور اہلسنت اور فراعنہ کو نیز ائمہ کفر کو صرف اس لئے کہ وہ بھی آخر اللہ کے بندے ہیں اس کی صفات کے مظہر ہیں اللہ واسطے محبوب رکھتا ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ یہ استحقاق بطریق تواتر ہم تک نہ پہنچا ہو۔ اور حضرت ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو اسی پر محمول کرنا چاہیئے اور آپ کا وہ کلام جو مطلق ہے۔ وہ اس بنا پر کہ محبت و بغض جو اللہ واسطے کا ہو گا وہ لامحالہ ضروریات دین کے مخالف نہ ہو گا۔ اگر غور کیا جائے تو آپ کا کلام صاف صاف اس قید کی خبر دیتا ہے جہاں آپ نے فرمایا ہے

وَرَأَى كَانُ فِي عِلْمِهِ خَلَقَ (عَقْدًا ۴) کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کشیدہ علم کی طرف حوالہ اسی جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے
جہاں شریعت سے اس کا قطع ثبوت صراحت کے ساتھ نہ ہو۔

قسم اول کے مجاہدین کی مثال اہل بیت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جن کی شان میں قرآن مجید میں ارشاد ہے
قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ وَأَن تَرْضَوْهُ سِرًّا وَعَظْمًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِمَّا يَتْرِكُونَ
سے محبت کے خواہاں نہیں ہوں،

دوسری جگہ یوں ارشاد ہے۔ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ۔ (اسے اہل بیت
اللہ تعالیٰ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ تم سے جس دور کر دے۔

یا اس کی مثال وہ صحابہ کرام ہیں جنہوں نے بیت رضوان کی ہجرت و نصرت پیغمبر کے فخر سے سرفراز ہوئے
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مرتدین کے فتنہ کا قلع قمع کرنے اٹھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد
ہے۔ يُحِبُّهُمْ يُحِبُّونَ لَكَ إِيمَانٌ كَرِيمٌ اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں۔ یا۔ يُحِبُّونَ مَنْ
حَاجَّكَ بِكَلِمَةٍ رَّحْمَةً يَخْتَصِمُونَ ان کو دوست رکھتے ہیں۔ جنہوں نے ان کی طرف ہجرت کی، یا سَاجِدِينَ اللّٰهُ فَهَمُّهُمُ وَرَحْمَةُ
اللّٰهِ ان سے راضی ہوا وہ اللہ سے راضی ہیں، یا لَدُنَّ تَجَعَلُ فِي قُلُوبِنَا غِلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا درجہ ایمان لائے ان کی
طرف سے ہمارے دل میں کھوٹ پیدا نہ کر)

اسی طرح قسم اول کے مغفرتین کی مثال ابلیس اور دیگر تمام معاندین کفار ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے
فرمایا ہے۔ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا أَلَيْسَ شَيْطَانًا تَهْتَدُونَ تمہارا دشمن ہے تم بھی اس کو اپنا دشمن
جانو، یا فرمایا لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ
مومنوں کو چاہیے کہ وہ مومنین کے علاوہ کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا اللہ کی طرف سے اسے
کچھ نہ ملے گا نہ حمایت نہ امداد و نصرت، یا فرمایا۔ لَا تَتَّخِذُوا مَنَافِرَ الْمُؤْمِنِينَ وَاللَّوْءَاءِ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ جَاءُوا مِنْ حَاضِرٍ
اللہ کو سزا دے کہ تم کسی قوم کو ایسا نہ پاؤ کہ وہ اللہ اور ایمان لاکر بھی ایسے شخص کو دوست بنائیں
جس نے اللہ و رسول کی نافرمانی کی ہو۔

ان ارشادات ربانی کی موجودگی میں اب کوئی ماضی اہل بیت کی عداوت میں اور کوئی رافضی صحابہ کرام رضی اللہ
عنہم کے خلاف بغض رکھنے میں حاسم کر ان صحابہ کے بارے میں جنکا شمار مہاجرین اولین اور انصار سابقین میں ہوتا
ہے اور جنہوں نے بیت رضوان کا شرف حاصل کیا اور مرتدین اسلام کو نہ تیغ کیا ہرگز معذور نہیں سمجھا جائے گا بل
کوئی فرقہ ان بزرگوں کی حقیقی اور واقعی قدر و منزلت سے کتر جانے اور اپنی جہالت یا نادانی کے سبب یا کسی شبہ نادلی
کی بنا پر ان کے کسی مرتبہ یا درجہ کا انکار کر بیٹھے تو وہ البتہ معذور شمار ہوگا۔

جیسے تفسیری شیعہ یا خود حضرات ائمہ رحمہم اللہ کے وہ دوست یا محب جنہوں نے ان کی امامت کا انکار کیا۔
مثلاً محمد بن الحنفیہ اور زید بن علی بن الحسین رضی اللہ عنہم چنانچہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے کلام میں بھی اسی
قسم کے لوگوں کو معذور قرار دیا گیا ہے۔

قسم ثانی کے مجاہدین کی مثال عام نیک بخت مسلمان خصوصاً عام صحابہ عرب اور قریش میں اور اسی قسم کے

مبغضین کی مثال عام فاسق نافرمان، ظالم اور کاذب لوگ ہیں کہ ان ہر دو فریق کی محبت و بغض کا ثبوت شریعت میں اوصاف عامہ کے تحت یا منفعات کلیہ کے منہ میں سے مثلاً فرمایا۔ **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ** (تحقیق اللہ نیک کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) یا **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الصَّالِحِينَ** (بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) یا فرمایا **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ مَقَاتِلًا كَانَتْهُمُ بَنِيَانًا مَذْمُومًا**۔ (بے شک اللہ ان غازیوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، صف بستہ ہو کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں) اور فرمایا **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الشَّوَّاعِينَ** وَ **يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ** بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف پہننے والوں کو پسند کرتا ہے، نیز فرمایا **إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَاسِقِينَ** بے شک اللہ تعالیٰ فاسقوں کو دوست نہیں رکھتا یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان **يُحِبُّ الْقُرْبَانَ إِلَى عَرَبِيٍّ وَالْقُرْآنَ** وَلَسَانَ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ (عربوں کو تین باتوں کے سبب دوست رکھو میں عربی ہوں قرآن عربی ہے، اور اہل جنت کی زبان عربی ہے)۔ یا فرمایا **مَنْ أَهَانَ قَوْمًا يَشَاءُ اللَّهُ**۔ وَمَنْ عَادَى قَوْمًا يَنْشَأُ اللَّهُ رَجْمَ قَرِيشٍ کی اہانت کرے اللہ اس کی اہانت کرتا ہے اور جو قریش سے دشمنی رکھے اس کو اللہ تعالیٰ نگوںسا روٹھساں کرے، یا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان **إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ** وَاللَّهُ تَعَالَى ظَالِمُونَ کو دوست نہیں رکھتا، نیز فرمایا **أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ** (سن رکھو۔ جھوٹے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے اور فرمایا **يُحِبُّ اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا** (جس دن اللہ اپنے نبی اور اس کے اصحاب کو رسوا نہیں کرے گا۔ اَللّٰهُ فِي الْأَمْثَالِ لَا يُحِبُّ الْفَاسِقِينَ وَهُوَ عَزِيزٌ مِّنْ بَعْدِ عَا مَنَ أَحَبَّهُمْ فَيُحِبُّهُمْ وَكَمِّنْ أَهْلِهِمْ فَيُحِبُّهُمْ) دیکھو دیکھو میرے بعد میرے صحابہ کو دشمن نہ بناؤ جو ان سے محبت رکھے وہ مجھ سے محبت کے سبب سے ان سے محبت کرتا ہے۔ اور جو ان سے بغض رکھے تو مجھ سے بغض رکھنے کے سبب سے ان سے بغض رکھے گا۔)

اسی قسم ثانی کے تمام متعلقہ اشخاص میں سے ہر ایک کی محبت و بغض دو وجوہ سے قطعی الثبوت نہیں اول یہ کہ ان عبادات کے مشاء اور مصنفوں کا ان خاص خاص ذاتوں میں قطعی طور سے پایا جانا نادر و کمیاب ہے، دوم مضمون عبارت یا کلام کا کسی جگہ متفق ہونا حکم کے تحقق اور وجود کے لئے اس وقت تک کافی نہیں جب تک تمام موانع دور نہ ہو جائیں مثلاً محبت میں جب کے موانع نفاق، خبث، باطن اور فاسد ارادوں کا نہ ہونا ضروری ہے اسی طرح بغض میں اس کے موانع یعنی صحت ایمان، صفائے باطن، اور صلاح نیت کا نہ ہونا لازمی ہے اور ان موانع کے دور نہ ہو جانے کا قطعی اور یقینی علم تکمیل و ختم نبوت اور سلسلہ وحی بند ہوجانے کے بعد حاصل ہو گیا ہے۔

رجب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ اور سلسلہ وحی جاری تھا کسی بھی معاملہ میں قطعی اور یقینی علم ہو جاتا تھا مثلاً صحابہ میں یگانہ صابان رضی اللہ عنہ پر باوجود ان کے شرابی ہونے کے برائی سے یاد کرنے اور ان پر لعنت کرنے پر زبرد قریح کی گئی آپ نے فرمایا کہ وہ اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہے (اس پر لعنت و پھٹکا نہ کرنا) مالک بن دیش جن کا منافقین میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ ان کا یہی خواہ بھی تھا۔ جب ظاہری حالات کی بناء پر ان کو منافق کہا گیا تو اس کو رد کیا گیا اور اس کے ایمان صحیح ہونیکی توثیق کی گئی۔ ایک اور بغض جو بڑا مسمومہ اور بد زبان تھا اس کے حق میں ارشاد فرمایا گیا۔ **يَحْيِيْتُ الْلَّسَانَ وَالْقَلْبَ** (زبان کا تو گزرا ہے مگر دل کا

پاک ہے، اسی طرح کی اور بہتری مثالیں ہیں۔

علی بذاتہ سے متعلق بھی بہت سی روایت اور آثار مروی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ محض گمان اور خیال آرائی پر بھروسہ کر کے کسی کی نجاست اور بلندی درجات کی شہادت نہیں دینی چاہیے تا آنکہ حقیقت حال پوری طرح منکشف نہ ہو جائے۔

خلافت قسم اول کے جب محبت یا بغض معینہ اشخاص کی قطعی دلیل سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو گئی تو اب مغوی کلام کا مستحق ہونا اور حکم کا پایا جانا قطعاً لازم ہو گیا۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا حال معلوم ہوا۔

پانچویں والے دھوکہ اس کہتے ہیں کہ اہل سنت خلافت و امامت کے معاملہ میں، بزدلی کو شجاع پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ خلافت و امامت کا تو مدار ہی بہادری اور شجاعت پر ہے۔ اور کفار کے ساتھ جدال و قتال اور ان پر فوج کشی اس کا خاصہ ہے۔ مزید وضاحت کے طور پر کہتے ہیں کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بہادری اور شجاعت میں تمام عالم میں ضرب المثل اور شہرہ آفاق ہیں۔ خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کہ وہ بزدلی ہیں۔ جسکی بزدلی پر قرآن کی یہ آیت دلالت کرتی ہے **إِنْ يَبْقُوا بِمَا كَانُوا فَيَكُونُوا لَصَاحِبَةً لَا تُفْزَنُ** (جب کہ وہ اپنے ساتھی سے فرار ہے تھے کہ غم نہ کر،) معلوم ہوا کہ غار میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غمگین اور فکر مند تھے۔ اور ایسے صبر آزما مرد ملے پر غم کرنا ہی بزدلی کی نشانی ہے۔

اس طعن اور طنز کا جواب کئی طریقوں سے دیا جاسکتا ہے۔

اول۔ حزن اور غم سے روکنا (صاحب حزن کی) بزدلی کی نشانی بالکل نہیں ہے اس لئے کہ حزن و غم تو شجاع اور بہادر کو بھی ہوتا ہے اس لئے کہ حزن اور غم کے معنی کسی محبوب چیز سے محرومی یا کسی ناگوار چیز کا سامنے آ جانا ہے۔ اور یہ شجاعت کے منافی بالکل نہیں ہے۔

چنانچہ رستم جیسے شجاع کو بھی سہراب کے قتل پر غم ہوا۔ اور اتنا ہوا کہ اس نے ماتمی سیاہ لباس پہن لیا۔ مام کیا اور گریبان چاک کیا یہ گھر کی بات نہیں یہ واقعہ تو زمانہ بھر میں مشہور ہے۔ ہاں حزن کے بجائے خوف ہوتا تو البتہ قابل توجہ بات ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اگر حزن سے روکنا بزدلی کی علامت ہوتا تو پھر حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام پر بھی یہی طعن وارد ہوگا کیونکہ ان حضرات کو تو حزن سے نہیں خوف سے منع کیا گیا ہے **يُؤْمِنُ سِرًّا لَا تَخَفُ** (اے موسیٰ ڈرو مت،) **إِنِّي لَا يَخَافُ لَدُنِّي الْمُرْسَلُونَ** (کیونکہ میرے رسول ڈرا نہیں کرتے۔) یا **فَرَمَا وَقَاؤُ لَا تَخَفُ وَلَا تَخَفْ** (اَنَا مُنَجِّوْكَ وَاهْلُكَ إِلَّا امْرَأَتُكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ) (فرشتوں نے کہا نہ ڈرو نہ غم کرو کہ ہم تم کو اور تمہارے اہل کو (اس عذاب سے نجات دیں گے، مگر تمہاری بیوی کہ وہ البتہ پیچھے رہ جائے والوں میں سے ہے،) یہی نہیں بلکہ بعض نصوص قرآنی میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام واقعی خوف زدہ بھی ہوئے **فَادْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّؤْمِنِي** (پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا۔)

تیسرے تاریخ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ جب کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر آپ کا گلا گھونٹا اور دم گھٹنے سے آپ کی مبارک آنکھیں سرخ ہو گئیں اور آپ کو سخت اذیت ہوئی تو ان کفار کے

ڈر اور خوف کے سبب یار دوست عزیز واقارب میں کوئی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نہ آ سکتا تھا۔ ایسے کھن لے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کی جرأت تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و حمایت میں آگے بڑھے اور مدد فرمائی۔

اسی طرح جب ابن الدغنه نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حمایت سے لڑتے اٹھایا اور کفار مکہ کے قہر و غلبہ سے آپ کو ڈرایا۔ اور آپ کو اسلامیہ عبادت اور قرآن پڑھنے سے ازراہ ہمدردی منع کیا، تو آپ نے ہمت و دلیری کا یوں مظاہر فرمایا کہ اپنے گھر سے باہر ایک جگہ مخصوص کر کے سب کے سامنے عبادت و تلاوت کا عمل شروع کر دیا اور بلند آواز سے قرات کی۔

ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مرتدوں کے قتل کے معاملہ میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و ازراہ احتیاط، خوف زدہ تھے، جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جس طرح جرأت و ہمت اور دلیری کا اظہار فرمایا اس پر دنیا بھر کے دلیر اور شہاع انگشت برداں ہیں۔

چوتھے، شیعوں کے شیخ الطائف ابو جعفر طوسی کی روایت کے مطابق جو اس نے امالی میں بیان کی ہے شب معراج کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بعد تم کو میرا وزیر میرا خلیفہ بنادیا ہے اور صاحب فواد الحکمۃ کی روایت کے بموجب جو اس نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بیان کی یا قطب راوندی کی روایت کے موافق جو اس نے بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے کی، جناب امیر رضی اللہ عنہ معراج کے سفر میں آپ کے ہمراہ تھے اور آپ نے روح محفوظ کا مطالعہ فرمایا تھا تو ان کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تیس سال زندہ رہوں گا اور امامت و خلافت کی مسند پر فائز ہوں گا اور پھر محمد کو ابن طعم مروی شہید کرے گا تو اس سب کچھ کے باوجود آپ لڑائیوں میں ڈرنے کیوں لگے۔

پانچویں، شیعوں کے ہاں یہ بات طے شدہ ہے کہ امام اپنی مرضی اور اختیار سے مرتبہ ایسی صورت میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ لڑائیوں میں شرکت فرماتے اور دشمنوں کے مقابلہ میں آتے تو آپ اپنی موت اختیار نہیں فرماتے تھے اور آپ کی مرضی کے بغیر موت کا آنا محال تھا۔ بخلاف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ ان کو باجماع امت نہ یہ درجہ حاصل تھا اور نہ ان کو اس قسم کا علم اور یہ بھی ظاہر اور فطری بات ہے کہ جس کو اپنی جان کا خطرہ ہو گا وہ امکان بھر جنگ و جہل میں ملوث ہونے میں پس و پیش کرے گا اور جس کو اپنی جان جانے کا خطرہ نہ ہو گا بلکہ یقین ہو گا کہ وہ ابھی نہیں مرے گا اس کو کسی بات کی پروا نہ ہوگی تو ایسی صورت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو باوجود جان جانے کے خطرہ اور خوف کے جان نثاری اور ہان بازی دکھائیں۔ دین کی نفرت فرمائیں اور مرتدین سے بے دھڑک قتال کریں تو یہ تو جرأت اور بہادری اور انتہائی دلیری اور ثبات قلبی کی دلیل ہے ان کو کیسے بزدل کہا جاسکتا ہے۔

چھٹے۔ پھر جب خود جناب امیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دلیری اور شہادت پر گواہی دی ہو تو اس کے بعد ان کو بزدل کہنا خود جناب امیر رضی اللہ عنہ کو ابی کا کاد اور سو کرنا ہے چنانچہ محمد بن عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ دہی ہیں کہ خَطْبَنَا عَلِيٌّ قَالَ اَيْهَا النَّاسُ مَنْ اَتْبَعْتُمُ النَّاسَ فَقُلْتُ اَنْتَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَقَالَ دَاوُدُ بْنُ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لَمَّا كَانَ يَوْمُ بَدْرٍ يَوْمَ مَضَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّي اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَرِيشُ فَقُلْنَا مَنْ يَقُوْمُ هُنْدًا لَا يَدْرِي اَنْ يَكُوْلَ

أَحَدًا مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَمَا قَامَ إِلَا أَبُو بَكْرٍ وَآلُهُ كَانَ كَشَاحِدًا شَهِيدًا بِمَا سَمِعَ فَلَمَّا دَنَى إِلَيْهِ أَحَدًا أَهْوَى إِلَيْهِ أَبُو بَكْرٍ بِالشَّيْفِ - ہمارے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقریر فرمائی اور حاضرین سے پوچھا بتاؤ سب سے زیادہ بہادر کون ہے۔ میں نے کہا اسے امیر المومنین آپ! آپ نے فرمایا۔ وہ بہادر، ابو بکر صدیق ہیں جنگ بدر کے دن ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے گھاس پھوس کا ایک ساٹھان بنایا پھر لوگوں سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے آپ کے پاس کون کھڑا ہو گا کسی مشرک کو آپ کے پاس پھٹکنے نہ دے تو اس کے لئے ابو بکر کے سوا کوئی آمادہ نہ ہوا۔ آپ عثمان بن عفان، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو گئے جب بھی کوئی مشرک ادھر کا رخ کرتا آپ تلوار لے کر اس پر ٹوٹ پڑتے۔

ساقیوں - ایک ایسا شخص جس سے بہادروں اور دلیروں جیسے کام سرزد ہوئے ہوں، جس کے ہاتھوں امور خلافت و امامت روز روشن کی طرح انجام پائے ہوں اس کے متعلق بزدلی کا دل میں خیال لانا یا یہ کہنا کہ یہ شخص خلافت و ریاست کے قابل نہ تھا نہ نہایت لغو و بے معنی بات ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص عین دوپہر کی دھوپ میں بیٹھ آفتاب کی شعاعوں کی روشنی میں سب کچھ دیکھے پھر بھی یہ کہے یا دل میں خیال لائے کہ آفتاب تو تاریک ہے تو یہ اس شعر کا مصداق ہوا اگر نہ بنید بروز شیرہ چشم چشم آفتاب را چو گماہ -

اور جو شخص واقف یرت ہو، اور جنگ و فتوحات عراق و شام کے حالات سے بخوبی آگاہ ہو، وہ یقیناً یہ مانے گا اور اس کی گواہی دے گا کہ محنت ہیوان کے وقت دل مضبوطی ارادہ کی انتہائی پختگی اور اس پر ٹپٹے پہننے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی ہمسار و مثیل نہ تھا۔

چنانچہ قاضی فاضل اپنے رسائل میں اس بادشاہ کی مدح سراہی کرتے ہوئے رقمطراز ہے جس نے مختصر سی مدت میں ملک شام کو فرنگیوں کے پنجے سے آزاد کر لیا ان سے جنگ آزما ہوا اور ان کے قلعوں کو مسمار کیا لَمْ تَقْرَسَاتِ الْقِدَّةَ يَقِيَّةَ وَالْفَتْوحَاتِ الْعُزِّيَّةَ وَالْعُزْمَانِيَّةَ أَوْ لُجَيْجًا أَوْ الْحَيْدَ حَائِيَّةَ - درجو صدیقی جیسے پختہ ارادے رکھنے والا اور عزم جہی فتوحات کرنے والا اور عثمان جیسی فوجی طاقت کا مالک اور حیدر جیسا حملہ آور تھا

البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہادری و قوت بازو، شمشیر زنی، نیزہ بازی پہلوانوں کو بچھاڑنے خود بنفس نفیس معرکہ کارزار اور جنگ و جدل میں حصہ لینے اور دشمنوں میں گھس پڑنے کی جتنی روایات منقول ہیں اتنی دوسرے کے بارے میں نہیں مگر یہ صفات چونکہ ہتھیار، سوار، نیزہ بازی کے فنون اور جنگوں اور میدان جنگ کی تجربہ کاریوں سے تعلق نہیں رکھتی ہیں، اصل شجاعت سے جو ایک قلبی صفت ہے زیادہ تعلق نہیں رکھتی اور ریاست کبریٰ و خلافت میں اس کی چندال ضرورت نہیں۔

کیونکہ مثلاً حضرت امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد بہت سے دوسرے ائمہ ان فنون اور باتوں سے بالکل نا آشنا تھے۔ حالانکہ ان سب کو امامت کبریٰ کا مستحق مانا گیا ہے۔

اسی طرح بہت سے بادشاہ مثلاً سکندر اورنگ زیب وغیرہ گزرے ہیں کہ جو شجاع قلب اور شیرانگن تھے مگر میدان جنگ میں کسی ہمسرے دوبر و نبرد آزمائی یا پہلوانوں سے کشتی لڑنے کا موقع پیش نہیں آیا اس کے باوجود ان کی شجاعت میں کسی نے شک نہیں کیا نہ ان کو بزدل کہا۔ دراصل ان ہر دو صفات شجاعت، جنگی مہارت میں فرق

ہے شہادت ایک قلبی صفت ہے اور یہ غلطی اور فطری ہوتی ہے جب کہ جگہ مہارت بدنی صفت ہے جو حشری اور کسی کام ہے۔ عام اصطلاح میں اس کو فن سپاہ گری بھی کہتے ہیں۔ اور شہادت کو اس سے بالکل الگ صفت شمار کرتے ہیں۔
دھوکہ (۹۳) اشعیوں کا ایک گروہ مثلاً ابن مطہر علی اور اس کے پیروا علی سنت پر طعن کر کے کہتے ہیں کہ یہ لوگ نمبرِ حمیرہ ہیں جو تجسیم الہی اور جبر مانتے ہیں، حالانکہ یہ طعن بھی حسبِ مادت افزہ اور جھوٹ اور سراسر بہتان ہے اہل سنت تو مجسمہ اور حمیرہ کو کافر مانتے ہیں ان کے اقوال و عقائد کے رد میں رسالے اور کتابیں لکھی ہیں البتہ ان شیعہ حضرات کے سربراہان پیشوا اور راویان اخبار بے شک مجسمہ گزرے ہیں جسکی پوری تفصیل انشاء اللہ آگے بیان ہوگی اور ان ہی میں سے ایک بڑی جماعت حمیرہ کی بھی گذری ہے۔ چنانچہ کلینی بخود کافی میں اسے مساویت کیا ہے۔

اس سلسلہ میں شہرستانی کے اس قول سے جس میں اس نے اہل سنت کو مجسمہ کہا ہے سند لانا اور دلیل میں پیش کرنا درست نہیں کیونکہ اہل سنت نے اس گروہ کے قول کو بھی رد کیا ہے۔ اگرچہ اہل سنت کے مذہب کی تعبیر میں لفظ جسم آتا ہے مگر اس سے مراد مروت و جود مستقل ہے۔ اور یہ درست ہے اور اسی لفظی اشتراک کے سبب ان کو بھی مجسمہ کہنا گیا ہے۔

ہاں وجود مستقل پر لفظ جسم کا اطلاق کرنا اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو البعد و ثلاثہ (عرض، طول، عمق) اور لازمِ جہانیت سے پاک جاننا شہر کی گنجائش اور اختلاف اسی میں ہے اس لئے کہ اکثر حضرات نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر حمیرہ ہاتھ آکھ وغیرہ کا اطلاق جائز بتایا ہے مگر ان کے نزدیک بھی ذات باری کو اجزاء میں بٹا ہوا ماننا اور اس حیثیت سے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کا اعتقاد رکھنا گمراہی ہے بخلاف شیعہ حضرات کے کہ وہ ابعاد و ثلاثہ کے اعتقاد کے ساتھ ذات باری کی حقیقی جمعیت کو مانتے ہیں اور بعض نے تو ذات باری کی شکل و صورت بھی بیان کی ہے (شنید ہے کہ بعض ملکوں میں ذات باری کے خیالی فوٹو بھی دستیاب ہیں)۔

اسی طرح اہل سنت جبر و متوسط کو مانتے ہیں جو بالکل حق اور درست ہے جیسا کہ جناب ابی عبد اللہ رحمہ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ وَلَا کُنْ اَمْرًا مَبْنِیًّا اَمْرًا مَبْنِیًّا نہ پورا جبر ہی ہے اور نہ پوری تفویض بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک چیز ہے۔

دھوکہ (۹۴) کہتے ہیں کہ اہل سنت کی اپنی صحیح کتابوں میں یہ روایت مروی ہے کانت حائشۃ تلعب بالبنات فی بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں گھڑیاں کھیل کر تھیں، اب ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف کرنا اور آپ کی زوجہ محترمہ کو متہم کرنا کہ وہ ناجائز صورت بناتی تھیں اور ایسے گھر میں جو اتنے جلیل القدر پیغمبر کی عبادت گاہ ہو اور وحی فرشتوں اور جبرائیل علیہ السلام کی فرد و گاہ ان میں حرام صورتوں کو رکھتی تھیں بہت ہی بری اور نازیبا بات ہے حالانکہ خود اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس گھر میں صورت یا بت ہو نماز جائز نہیں اور فرشتے اس گھر میں نہیں آتے اور ان ہی نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے تو وہاں حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل علیہما السلام کے بت رکھے دیکھے تو ان کو باہر نکالنے کا حکم فرمایا، اس لئے دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت پر یہ الزام اس وقت لگانا تو کچھ ٹھیک ہوتا جب وہ بجائے

بنات کے تصویر تمثال یا صورت کے الفاظ نقل کرتے بنات سے صورت ہی کے معنے کیوں مراد لئے جائیں اس سے مراد ہی لینا چاہئے جس زمانہ میں مروج و مشہور ہو، چنانچہ اس زمانہ میں گڑیا کی ہیئت کچھ اس طرح ہوتی تھی کہ گول شکل کا ایک کپڑا کرتے، پھر اس کے بیچ میں دوسرے کپڑے کی گول سی پٹی ہوتی گول رکھ دیتے اور گول کپڑے کے اطراف کو سیدھی الٹی سمت سے سمیٹ کر گولی کے نیچے دھاگہ سے مضبوطی کے ساتھ سی لیتے۔ کہ وہ گولی آدمی کے سر کی طرح ہو جاتی اور اس کے نیچے کا حصہ آدمی کے دھڑ کی مانند لگتا اس دھڑ میں ہاتھ پاؤں یا دوسرے اعضا نہیں ہوتے تھے نہ گول حصہ میں منہ ناک آنکھ کچھ ہوتا اسی گڑیا کو اڑھنی، کرتا پہنتے اور تیار کر دہ شکل کو کھلونے کے طرز پر بنات کہتے اور آج کل طرح طرح کی باریکیوں اور اور نوع بننے کارنگریوں کا جو رواج ہے اس زمانہ میں بالکل رواج نہ تھا اور ایک گڑیا ہی کیا رہن بہن کھانے پینے زیورات و ملبوسات فرش و فرش میں جو سادگی تھی اس میں اور آج کل کے تکلفات میں زمین و آسمان کا فرق ہے یہ آج کل کی بت اور صورت سازی تو فقہائے اہل سنت کے نزدیک حرام ہے البتہ لاصوری تصویر جس سے کوئی حکمت دینی مقصود نہ ہو تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے مثلاً ایک مرتبہ آپ نے ایک خط کھینچ کر اس انسانی شکل کو ظاہر فرمایا۔ اور دوسرے دو خطوں میں سے ایک سے اہل اور دوسرے سے اہل کی تصویر کھینچی ہے اور ایسی گڑیوں کی ایجاد بھی اس لئے تھی کہ چھوٹی بچیوں میں کم سنی ہی ہے۔ امور خانہ داری پڑھنے لکھنے سینے پر دے وغیرہ جیسے کاموں میں دلچسپی اور رغبت پیدا کی جائے جیسے ہر زمانہ میں حسب ضرورت و مناسب حالات بچوں کے لئے طرح طرح کے کھلونے بنائے جاتے ہیں تاکہ کم سنی ہی سے ان کے متعلق معلومات دلچسپی اور واقفیت پیدا ہو، اور ان سے کام لینے کی مشق ابھی سے کرانے۔ علاوہ ازیں اس طرز پر زبان کھولنا اس وقت نزدیک دیتا کہ اس وقت تک تصویر بنانا یا ان کو گھروں میں لکھنا حرام ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ گھر میں تصویر رکھنے سے فرشتے گھر میں نہیں آتے تھے اور یہ ثابت کیا بھی کیسے جاسکتا ہے جب کہ قصہ مذکورہ ہجرت کے مستقل زمانہ کا ہے اور تصویروں کا مٹانا اور کعبہ سے ان کا نکالنا آٹھ سال بعد واقعہ ہے۔ اور کسی چیز کی حرمت سے پہلے کی کسی بات پر نہ طرز درست ہے اور نہ وہ قابل گرفت مثلاً حرمت خمر سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شراب نوشی یا حرمت سود سے پیشتر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا سودی لین دین۔

اور تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ یہاں تو ان شیعوں نے زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خانہ مبارک کی بھرپوری کو اس طعن کی سند بنا کر پیش کیا ہے مگر جہاں ان ظالموں نے ام المؤمنین صدیقہ دام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا کی شان میں سراسر جعلی اور گھڑی ہوئی ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن سے ان کا ایمان سلب ہوتا اور یہ کفر و ارتداد تک پہنچ جاتے ہیں وہاں وہ ایسی ہمدردی کو کیوں بھول گئے۔ ان پر وہ مثل صادق آتی ہے "مرا یا دتمہ فراموش" درجہ کو تو یاد سے تو بھول گیا ہو گا، انشاء اللہ باب مطالعہ ادب باب ہفوات میں ہم لکھ اسی قسم کے بہت سے کھوٹے اور غیر منگسالی سکون کو گڑھا لکھ اور ان کا کھوٹ اور جعل بول بیان کریں گے۔

دھوکہ (۱۹۵) اہل سنت پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ بے غیرتی بے حجابی اور کبرے کام پر سکوت اور اس سے نہ دیکھنے کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے ہیں اور اس کے لئے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت باں الفاظ نقل کرتے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَا أَلَمْ تَرَ إِلَى الْحَبَشَةِ يَلْعَبُونَ بِاللَّذَقِ

اس پر ابھارا کہ گویہ فعل شرعاً جائز ہے مگر محبوب کے وقار و شان کے سامنے یہ خفیف الحرقہ ہے جو عجب کو بری لگتی ہے اور آپ کا سکوت اخلاق کرمانہ کا مظہر ہے۔ لیکن جب محبوب کا یہ فرمان سنا **يَا عَمْرُو اَمْنًا يَا بَنِي اَمْنًا** تو عمر انہیں نہ بچھڑو اور ہاں اسے بنی ارفدہ اطمینان سے اپنے مظاہرہ میں لگے رہو (تو نہ صرف ڈانٹ ڈپٹ ہی سے باز آگئے بلکہ خود بھی خوشدلی کے ساتھ اسے دیکھا کئے اور سمجھ گئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی مبارک یہی ہے تو یہ کھیل (اور جگہ مظاہرہ) اہل فضل کے وقار و تمکین سے بھی اونچی کوئی چیز ہے۔

شیعوں کی یہ بات باعث حیرت و تعجب ہے کہ قبل تحریم کے واقعات کو تو یہ بے عزتی اور سکوت منکر کہتے ہیں اور خود ائمہ اطہار سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لغت بگڑ اور آپ کے نائب ہیں اور وہ ان کے نزدیک معصوم اور واجب اطاعت بھی۔ ایسی روایات کی نسبت کرتے ہیں کہ ان کے حبان صادق تو کیا ہر خریف شخص کی زبان ان کی نقل و حکایت سے لڑکھڑاتی اور ان کے سینے سے ہر مسلمان کے روئنے کھڑے ہوا کرتے ہیں۔

مغلوں ان کے ایک یہ ہے کہ جو ان کی کتب میں بروایت صحیح منقول ہے کہ حضرت ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دوستوں اور شیعوں سے فرمایا **اِنَّ خَلْقَ مَكَّةَ جَعَلُوْا سَيِّئًا لَّنَا وَفَرَضُوْا جَهَنَّمَ عَلٰٓى دَعْوَانَا** ہماری چھوکریاں ہمارے لئے ان کی خدمت کافی ہے اور ان کی شرکاء ہیں تنہا سے لئے حلال ہیں، اسی لغو و بیہودہ روایت پر بنا رکھتے ہوئے شیعہ علماء نے اس وقت کہ امام حق روپوش تھے، جہاد معطل و سیکار تھا۔ جس مال غنیمت سے علیحدہ نہ ہونے کے سبب اپنے مصرف میں مصرف نہ تھا اور سارے مال غنیمت سے علیحدہ نہ ہو سیکے سبب اپنے مصرف میں مصرف نہ ہوتا تھا اور سارے مال غنیمت میں مل کر اس کو بھی خراب کر دیتا تھا شیعوں کے لئے چھوکریاں حلال ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔

اب ذرا چٹم عبرت واکریں اور اس ناشائستہ لفظ پر غور کریں کہ کیا اس کو غیرت و شرم سے دور کا واسطہ بھی ہے۔

اسی طرح اس فرقہ کے بڑے مفسران قرآن میں سے ایک مفسر مقدم کنتز العرفان فی احکام القرآن کا مصنف آیت **هَلْ اَوْلٰٓؤْا بَنَاتِنَاۤ اِیْ کُفْرًا فَاحْلِلْنَ** دیکھ کر یہی لڑکیاں ہیں اگر تم کرنا ہی چاہتے ہو۔ کی تفسیر یوں کرتا ہے۔ **اَاَوَلَاۤ اِیْمَانٌ فِیْ غَیْرِ النِّسْرِ فِیْ اَمْلَہُمْ وَبَنَاتِ النَّاسِ** (یہاں اتیان سے مراد مقرر اور راجع طریقے کے خلاف طریقہ مراد ہے) یہاں اس کے نہاد مفسر نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف ایسے شرناک کام کی نسبت کی ہے جس کو ذیل تریخ اور ادبائش آدمی بھی اپنے لئے باعث تنگ و عار سمجھتے اور اس سے گریز کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ شرفاء اور پیغمبر یا پیغمبر زادے۔

اگر کسی شیعہ کے دل میں یہ بات کھٹکے کہ گو اس وقت اجنبیوں کے دیکھنے کا حکم تحریم نہ آیا تھا۔ لیکن سلیم الطبع اشخاص کی فطری خصلت اسے عاری سمجھتی ہے اس لئے پیغمبر علیہ السلام کو اس کی اجازت نہ دینی چاہیے تھی بلکہ منع کرنا چاہیے تھا۔ تو اس کا یہ شک قابل تسلیم نہیں اس لئے کہ طبری کی مجمع البیان اور دوسری شیعہ تفسیر میں لکھا ہوا ہے کہ جس وقت خوش جمال اور خوش پرشاک فرشتے مہمانوں کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اس وقت ان کا فرشتہ ہونا ظاہر نہیں ہوا تھا۔ تو حضرت سارہ علیہا السلام بھی وہاں آئیں اور مہمانوں کی باتیں سن کر نہیں بھی مکاریں بھی۔ تو حضرت سارہ علیہا السلام کا آنا، غیر مردوں کی باتوں پر مسکرانا ہنسنا، غیرت و شرم سے کس قدر بعید بات ہے لہذا اس سے پتہ چلا اور شرم اس وقت لاحق ہوتی ہے کہ ذہنوں میں اس کے متعلق برائی بیٹھی ہو اور برائی دل

میں بیٹھنا حکم شرع کے نزول پر موقوف ہے۔ حکم شرع سے پہلے عار کسی اور کیوں؟

پھر دنیا بھر کی ان مختلف قوموں کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو مختلف ملکوں، اور شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے ہاں عورتوں کا مردوں سے پھینا یا ان کی طرف نظر نہ کرنا نہ معمول تھا اور نہ مروج اور نہ معیوب، کیا ان میں کوئی بھی سلیم الطبع فرد موجود نہ تھا ان کے بادشاہ، و امراء تاجر اور صاحب ثروت لوگ تو مسلمانوں سے بھی زیادہ نخت و تجر اور اقتدار کے مالک ہیں غیرت و ناموس کے بڑے بلند آہنگ و عری دار ہیں۔ بالخصوص ہند کے راجپوت! وغیرہ۔

لہذا حکم شریعت کے نزول سے پہلے ایسے امور کو غیرت کے سنا فی خیال کرنے اور اس کو بے غوری پن سے تعبیر کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ان میں عادی اور خلقی و پیدا نشی باتوں میں فرق و تمیز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں اور یہی دھوکے کی جڑ ہے۔

پھر مسلمانوں میں مختلف عادات و عوارض پائی ہیں، ان کے امراء و سلاطین باوجود مستحکم اقتدار رکھنے اور غیرت و شرم کے بڑے بڑے دعوؤں کے اپنی بیگمات کو بالا خانہ اور جھروکوں میں بٹھا کر فوجی مشقوں، جانوروں کی لڑائیوں یا مردوں کے دوسرے کھیل تماشے دکھاتے ہیں جنگلوں باغات اور دریاؤں، سمندروں کی سیر کراتے ہیں البتہ اس کا فہم خیال اور اہتمام کرتے ہیں کہ چیز مردوں کی نظر ان پر نہ پڑے۔

علاوہ ازیں عورتوں کا اجنبی مردوں کو ایسی حالت میں دیکھنا کہ ان کا ستر کھلا ہوا نہ ہو بالا جماع حرام نہیں ہے بلکہ یہ اختلافی مسئلہ ہے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اجنبی مرد کو دیکھنا عورت کے لئے اسی طرح حرام ہے جس طرح اجنبی عورت کو کسی مرد کا دیکھنا حرام ہے۔ اور اکثر شرعی دلائل اور قرون سابقہ خلفائے عباسیہ کے عہد تک کے حالات اسی اخیر قول کے موافق ہیں۔

پس ایسے فعل کو بری نظر سے دیکھنا یا اس پر اظہار تعجب کرنا جس کے جائز و حرام ہونے میں اختلاف موجود ہو جائے خود عمل نظر ہے اور بالآخر اس کو حرام بھی مان لیں تو وہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آیت عتاب و تحویم نازل نہیں ہوئی تھی۔

اور پھر یہ بات کیوں فراموش کر دی جاتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شارع ہونے کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے اور ان امور میں طرز گفتگو اور اعتراض کا بھر ایسا کیوں اختیار کیا جاتا ہے جیسا امام آدمی کے متعلق ہوتا ہے نبوت کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول ہر فعل ہر حکم، اور سکوت بجائے خود شریعت ہے چاہے اس کے متعلق کوئی حکم نازل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اور یہ کس کو معلوم نہیں کہ آیت تحریم کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی کم از کم مستورات نمازوں کے لئے تو مسجد نبوی میں آتی ہی رہی ہیں۔ کیا وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر تشریف لاتی تھیں کہ کسی مرد پر نظر نہ پڑ جائے۔

آیت تحریم کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مصائبات کو مسجد میں آنے سے نہ روکنے کا عاف مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا اجنبی مردوں کو دیکھ لینا حرام نہیں! نعمانی! اور پھر وہ کھیل ہوو لعب کے قاش کا نہیں تھا فنون سپہ گری کا مظاہرہ تھا دیکھنے والیاں بھی ان کرتبوں کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ مردوں کو ناک جھانک کر ان کے ماشیہ خیال ملک میں نہ بھتی۔

اس میں نہ کوئی اعتراض کی بات ہے نہ تعجب کی، تعجب اور ماتم تو ان لوگوں پر کرنا چاہیے جنہوں نے چھو کر یوں کی شرمگاہوں کو اپنے لئے حلال بنانا جس کو بھی لوگ ننگ و عار سمجھتے اور نازیبا و ناشائستہ حرکت خیال کرتے ہیں ان کے لئے کیے قابل قبول اور لائق تسلیم ہو گیا۔

وصو کہ (۹۶)۔ ان کا ایک طنز اہل سنت پر بصورت الزام یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صحاح میں یہ قصہ بیان کیا ہے کہ ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کے پاس قبضہ روح کے لئے آئے تو آپ نے ان کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا کہ ملک الموت کی ایک آنکھ جاتی رہی حالانکہ اس واقعہ میں کئی قابل اعتراض باتیں ہیں۔ اول یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدائی فیصلہ پر راضی نہ ہوئے۔ دوسرے۔ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کیا۔

حالانکہ خدا اہل سنت نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ من کثر یقارہ اللہ کثرہ اللہ یقارہ رجواہ کی ملاقات کو ناپسند کیسے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات پسند نہیں فرماتا۔

تیسرے یہ کہ کیا ملک الموت اتنے کمزور عاجز اور بے اختیار ہو گئے تھے کہ قبضہ نہ کھایا یا کھچ کر گناہی مگر اتنا نہ ہو سکا کہ روح قبضہ کر لیتے آخر ناکام ہو کر واپس ہوئے اور خالق الموت والہیات کے دوبار میں شکایت کی یہ ساری خرابیاں اصول شریعت کے خلاف ہیں۔

اس طنز کا جواب یہ ہے کہ روح قبضہ کامل و طریقوں پر ہوتا ہے، پہلا طریقہ تو یہ ہے جو ملک الموت عام مخلوق کے ساتھ برتتے ہیں کہ اس کو بغیر کوئی اختیار دیئے اور بے پوچھے اور تائے بغیر کہ میں ملک الموت ہوں اگر اجازت ہو تو ایسا کروں اس کی روح قبضہ کر لیتے ہیں دوسرا طریقہ وہ ہے کہ جو وہ پیغمبروں کے ساتھ اختیار کرتے ہیں کہ اول تو اپنا تعارف کرتے ہیں کہ میں ملک الموت ہوں پھر چلنے اور رہنے کا اختیار دیتے ہیں اور یہ پیغام دیتے ہیں۔ انا جی الی ربک اپنے رب کی طرف لوٹ چلئے، چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام تقاریر کے انتہائی شائق ہوتے اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے ان سے قبضہ روح کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ جب اجازت لے چکے ہیں تو اپنا کام انجام دیتے ہیں۔

پس موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہلی مرتبہ اسی عام طریقہ سے آئے نہ اپنا تعارف کرایا نہ ہی شکل و صورت فرشتے کی سی تھی اس لئے موسیٰ علیہ السلام نہ سمجھ سکے کہ کون ہیں۔ اور کیوں آئے ہیں۔ بلکہ انسانی شکل میں ہونے کے سبب یہ سمجھ کہ کوئی دشمن ہے جو قتل کرنے کے لئے آیا ہے۔ جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان دو فرشتوں کو جو جواب کی دیوار پھانڈ کر اندر آگئے اور آپس میں جھگڑنے لگے اپنا دشمن خیال کیا اور چلا آٹھے قرآن مجید میں بھی اس کا قصہ ہے اور اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت جبریل علیہ السلام کو اعرابی شکل میں دیکھ کر نہ پہچانا حالانکہ جبریل علیہ السلام سے آپ کو اتنا لگاؤ اور اتنی زیادہ محالست رہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کا سوال حصہ بھی میسر نہ تھا اور دشمن سے ہر ممکن طریقہ پر دفاع ضروری اور لازمی ہے اس لئے انہوں نے ملک الموت کے ساتھ یہ ہر تاؤ کیا دشمن سمجھ کر کیا اور ملک الموت نے خصوصی طریقہ اختیار نہیں کیا تھا۔ پھر ان کے مرتبے، نبوت اور اس قرب سے جو فائز باری سے ان کو تھا۔ واقف تھے۔ اس لئے مار کھا کر بھی ان کے سامنے جھک گئے اور کوئی حرکت نہ کی اور آخر تک اپنی حیثیت ظاہر نہ کی پھر دربار الہی میں حاضر ہو کر روزِ ادریس کی اور جو واقعہ گزرا تھا۔ عرض کیا

پھر دوسری مرتبہ اسی اصول و امتیاز کے ساتھ جو انبیاء کرام کے لئے مخصوص تھا ملک الموت کو بھیجا گیا تب انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور موسیٰ علیہ السلام کو چلنے یا رہنے کے متعلق اختیار دیا، تو آپ نے چلنے پر آمادگی ظاہر فرمائی اور اتنی مہلت مانگی کہ زمین مقدس کے نزدیک پہنچ جائوں تو اپنا کام کر گزرنا۔

اب ذرا اس پر انصاف کی نظر ڈال کر دیکھ لیجئے اس میں اعتراض کی کیا بات ہے اور کونسی خرابی لازم آتی ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی تنگی کی آخری گھڑی یہی مقرر تھی اس لئے اس میں موت کے ٹل جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اور ملک الموت قریش کا نہ طاقت و قوت کے مالک ہوتے ہوئے بھی بہت سی جگہ سپانڈانہ ہو جاتے ہیں ان میں مرتبہ شناسی ہوتی ہے حفظ مراتب کا خیال اور تعظیم کا لحاظ رکھتے ہوئے اجازت طلب ہوتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا واقعہ جو امام جعفر سے شیعہ سنی دونوں کے ہاں منقول ہے۔

اور جب موسیٰ علیہ السلام کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہ ملک الموت ہیں اور حکم الہی روح قبض کرنے کے لئے آئے ہیں، تو اس میں بقائے الہی سے ناخوشی اور تقارب سے ناپسندیدگی کا سوال ہی کہاں سے نکل آیا۔

اب ہم اس کتاب کو لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو پہلی دفعہ ہی اس ہیئت اور شکل میں کیوں نہ بھیجا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو پہچان کر متعجب نہ ہو جائیں جانتے تھے نہ جیل و جنت کا موقع آتا نہ مار پیٹ کی فزیت آتی تو اللہ تعالیٰ کے معاملات اور طریقے اپنے مخصوص بندوں کے ساتھ جس تنوع کے ہیں ان کی حکمتوں و مصلحتوں اور اسرار و رموز تک جو بہت نازک و باریک اور گہرے اور پوشیدہ ہیں ہر ذہن کی رسائی نہیں ہوتی اگر کوئی اپنے مذاق و مشرب کے مطابق حکمت کا نام، تصوف اور فقر سے اخذ کر کے یا سنی، شیعہ معتزلہ کے مذاہب کے اصول کی بنا پر لب کشائی کرے اور کوئی ایک اور گھنٹہ بیان کر دے تو اس نکتہ کی حقیقت اور واقعہ سے اتنی سی نسبت ہوتی ہے، جیسے قطرہ کی دہا سے یا ذرہ کی مولا سے اسلئے اہل تحقیق نے ان اسرار و رموز کے علم کو اللہ کے حوالے کیا اور خود ہر لب و لہجہ پر اتنا جانتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بعض معاملات میں بعض بندوں کو مخصوص کر لینا کئی اسباب سے ہوتا ہے کبھی۔

درجات قرب کے لحاظ سے کبھی لطائف و درجہ کے درجات کے مطابق اور کبھی ان اسامی و صفات الہی کے باعث جو اس بندہ کے مربی ہوتے ہیں انہیں اسباب پر مبنی ہوتا ہے بعض بندوں کا مخصوص کر لینا بعض رنگوں اور شکلوں کے ساتھ رزق کی فراخی و تنگی کے ساتھ، عمر کی درازی یا کوتاہی کے ساتھ،

چنانچہ بعض اسباب کا اہل طبائع یا اطباء کی نظر سرخ و گالیقی ہے تو بعض تک اہل نجوم و اہل حکام کی غور و فکر پہنچ جاتی ہے۔

غرض کارخانہ خداوندی کا احاطہ اس کی ذات کے سوا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس وقت اگر ہم اس معاملہ کے کہ جس کو علم تادیل الاحادیث کہتے ہیں جو باریک بینی کا اور باریک اموروں پر مبنی بھی اسباب کو حل کرنے بیٹھیں تو مومنوں اور مذاہب کتاب سے بہت دور جا پڑیں گے اور پھر سامع کے اکتا جانے اور گھبراہٹ کا باعث بھی ہوگا۔

دھوکہ (۹۷) ایک الزام اہل سنت پر یہ لوگ یہ بھی لگاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی صحاح میں ایسی روایات بھی وضع کی ہیں جن سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تشکیک کی نسبت پائی جاتی ہے مثلاً یہ حدیث جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نَحْنُ اَحَقُّ بِالْاَشْكَاتِ مِنْ اَبْنِ اٰدَمَ اِذْ قَالَ سَابَّ اَبْنِ اٰدَمَ كَيْفَ تَحْيِ الْاَوَّلٰی

دہم ابراہیم سے زیادہ شک کے حقدار ہیں، جس کا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مردوں کی دوبارہ زندگی کی کیفیت معلوم کر کے کیا سہاگہ آریٰ کَیْفَ تَحْیِی الْمَوْتٰی۔

اس طعن کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ خود شیعوں نے حضرت علیمہ سعدیہ کے مکالمہ میں جو حجاج کے ساتھ ہوا جس کا بیان اوپر آچکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے اور صرف ایک ہی پیغمبر کے متعلق شک کا اظہار طعن و تشنیع کے لئے کافی ہے تو جس بات کا اہل سنت کو الزام دیتے ہیں خود اسی الزام کے مورد ہیں۔ جب دونوں ہی اس میں شریک ہیں تو اہل سنت ہی کو اس کے لئے مخصوص کیوں کیا جاتا ہے۔

دوسرے۔ یہ کہ یہ حدیث شریف قیاس استثنائی کے مضنی میں ہے، کہ اس میں نقیض ثنائی کی استثنائی ہے تاکہ اس سے نقیض مقدم نتیجہ حاصل ہو۔ دراصل اس کلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نشاء مبارک یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت وَلَکِنْ تَیَسَّرُ لَکُنَّی سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ شک کے ہونے اور یقین کے حاصل نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے بلکہ آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک ہو تا تو ہم کو بھی شک ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہم ان سے زیادہ شک کے حقدار ہیں۔ اور جب ہم کو شک نہیں تو لا محالہ ان کو بھی شک نہیں تھا۔ تو گویا آپ کا سوال صرف علم الیقین سے ترقی کر کے بین الیقین تک پہنچنے کے لئے ہے، اور اگر کلام کو ظاہر پر محمول کریں تو بھی درست ہے اس لئے کہ شک یقین کے مقابل ہے اور جس طرح یقین کے درجے تین علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہیں اسی طرح شک کے بھی تین ہی درجے ہیں، لہذا یہاں شک سے مراد یہ ہے علم الیقین رکھتے ہوئے عین الیقین کا حاصل نہ ہونا اور پھر عین الیقین کا حاصل نہ دنا کوئی نقص یا عیب تو نہیں یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ انبیاء کرام علیہ السلام تمام امور فیہ کو ان ظاہری آنکھوں ہی سے ملاحظہ فرمائیں اور نہ شیعوں اور سنیوں میں سے کوئی بھی اس کے واجب ہونے کا قائل ہے۔ پس اس صحیح مطلب کو جو راہ حق سے ذرا بھی ادھر ادھر ہٹا ہوا نہیں ہے یہ مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور اپنے ہاں جو انہوں نے انبیاء کرام کے حق میں قابل الزام روایات کو اپنی کتابوں میں بھر رکھا ہے۔ اس کو بھول گئے چنانچہ اس کا کچھ حصہ شیعہ مؤرخوں نے خود اس لئے کے طور پر انشاء اللہ باب نبوت میں ذکر کیا جائے گا اور اس سے ان کے اس حقیقہ کی قلعی کھل جائے گی جو یہ انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق رکھتے ہیں۔

دھوکہ (۹۸) کہتے ہیں کہ اہل سنت نے یہ روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین بھوٹ بولے ہیں ملائکہ انبیاء کرام کا بھوٹ سے پاک ہونا بالاتفاق واجب ہے ورنہ پھر ان کی تبلیغ پر سے اعتماد اٹھ جائے اور بعثت کی غرض مفقود ہو جائے گی، اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں بھوٹ سے مراد تعریف ہے جو مورد توجہ و دکھاں دیتا ہے، مگر درحقیقت سچ ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاحمت میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا اُنْھَا رَیْذُ لَا تُکْذِبُ الْخَلْقَ الْجَنَّةُ (بوڑھی عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی) یا فرمایا اِنِّیْ حَاطِلٌ عَلٰی وَلَیِّ نَاقِۃٍ مِّنْ تَحْتِیْ (میں تجھے اونٹنی کے بچہ پر سواری کروں گا) اِنِّیْ فِیْ حَیْیِیْ سَآوِجِحٍ پُتَاہَا دَیْرَہُ شَہْرِہِیْ آنکھ میں سفیدی ہے)

اسی قسم کی اور مثالیں ملتی ہیں اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی بہت سی تعریفات مروی ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ تین بھوٹ بھی اسی نوعیت کے تھے اس لئے کہ انہوں نے اپنی زوجہ کو تشدد کے خوف سے بہن بتایا اور اس سے مراد اسلامی اخوت تھی اور اِنِّیْ سَیِّدٌ مُّہْمٌ فرمایا تو اس سے غرض روحانی کدورت اور شرہ مذہبی

تھی جو جسمانی سرمن سے زیادہ سنت چیز ہے اور نَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ كَفَارًا کو الزام دیتے ہوئے بطور قرین فرمایا۔ تو ان باتوں کو جھوٹ کہنا محض جھوٹ سے مشابہت رکھنے اور ہم شکل ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی ایک ضروری مسدلت کی بنا پر تھا۔ کیونکہ کسی ظالم کو اپنے مال، جان اور آبرو سے باز رکھنے میں اگر صاف جھوٹ بولنا پڑ جائے تو اس کی بھی شرعا اجازت ہے تعریفیں تو جھوٹ سے ہی نہیں، بہر حال ان صحیح المعنی روایات کو مورد الزام ٹھیرانا اور اپنی ان روایات کو بھول جانا یا پس پشت ڈال دینا جو انبیاء کرام علیہم السلام کے پاک دامن پر برائی اور الزام کا صبرہ لگاتی ہیں انتہائی دھیسٹ پن اور حد درجہ بے شرمی ہے۔

آگے چل کر باب نبوت میں انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ بعض انبیاء کو تو یہ وحی سے بھی منکر مانتے ہیں۔ بعض پر حد بعض عقائد کا اتہام لگاتے ہیں اور بعض کو گناہ کبیرہ کا مرتکب ٹھیراتے ہیں ان کے ہاں تو بطور اعتقاد یہ تک ملتا ہے کہ انبیاء پر کفر کا اظہار بطور تفسیر واجب ہے۔

اہل سنت کو الزام دینے سے پہلے ان کو چاہیے کہ اپنے عقائد اور ان روایات کا مقابلہ و موازنہ ان تعریفیات سے کریں، پھر زبان کھولیں،

دھوکہ (۹۹) : ایک طعن یہ کرتے ہیں کہ اہل سنت کی صحاح میں یہ روایت ہے کہ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَفْتَرُ مِنِّي ظُلْمٌ عَمَرَ دِشْطَان حضرت عمرؓ کے سایہ سے بھی بھاگتا ہے، حالانکہ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت انبیاء کرام علیہم السلام پر ظاہر ہوتی ہے، اس لئے کہ انبیاء تو نصوص قرآنیہ کے بموجب شیطان سے محفوظ نہ رہ سکے چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا، فَتَوَسَّسَ الْإِكِيدَةُ الشَّنَطَاتُ، شیطان نے ان کے دل میں دوسو سو ڈالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (یہ شیطان کا کام ہے) حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا، أَلَمْ يَكُنْ مِنَ الْإِنْسَانِ يَتَّبِعُ أَهْلَهُ وَخَلَّتْ آبَ دَبَّ شَكَّ جُھو اُجھے شیطان نے دشمنی اور تکلیف کے ساتھ، پھر تمام رسولوں اور نبیوں کی شان میں ارشاد ہوا ہے، وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ نَذِيرٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلَفَى الشَّيْطَانَ فِي أُمْنِيَّتِهِمْ، (آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان کی تناسل میں شیطان نے گڑبڑ کی ہو اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیات و احادیث ہیں اب جب کہ شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا بلکہ ان کے سائے سے بھی بھاگتا ہے اور انبیاء و رسول کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ ان کے دلوں پر قبضہ پا کر ان میں دوسو سو ڈالتا ہے تو حالہ حضرت عمر انبیاء سے افضل ہوئے اور یہ بات بالاجماع غلط و باطل ہے،

ان کے ہاں یہ الزام بڑا منکر اور ہتھیارتا ہے اور ان کے ہاں کے اہل علم اس شبہ کو بیان کر کے بڑی خوشی اور فخر کا اظہار کرتے ہیں۔

اہل سنت کی طرف سے اس الزام کا جواب کئی انداز اور وجوہ سے دیا جاتا ہے اول ہم خود ان شیعوں سے پوچھتے ہیں کہ تم ان آیات مذکورہ بالا ان ہی دوسری آیات کی روشنی میں انبیاء پر شیطان کا مل دخل مانتے ہو یا نہیں اگر مانتے ہوں تو انبیاء و آدم کرام کی عصمت کا عقیدہ تمہارے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ اور نہ ماننے کی صورت میں ان آیات کی تاویل کر کے انبیاء کرام کی عصمت شیطان سے محفوظ و برقرار رکھو گے تاکہ ان کی ذات پر کوئی الزام نہ آئے، اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس صفت میں انبیاء کرام کے شریک ہو جائیں گے اور اس میں

کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ بعض اولیاء انبیاء کے ساتھ بعض صفات میں شریک ہو جاتے ہیں، البتہ ان میں فرق یہ ہے کہ انبیاء کرام پر شیطان کا تسلط اور غلبہ ناممکن ہے اور ان کے اسی مرتبہ کا نام عصمت ہے اور اولیاء پر شیطان کا غلبہ ممکن ہے، اور ان کے اس مرتبہ کا نام محفلیت ہے، شیطان کا غلبہ ممکن ہے اور ان کے اس مرتبہ کا پتہ بعض قرآنی آیات سے بھی چلتا ہے کہ خدا کے بعض بندے بھی شیطان کے تسلط سے مامون ہیں، یہ خاصہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مختص نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: **اِنَّ جِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ** بے شک میرے خاص بندوں پر تجھ کو غلبہ حاصل نہیں ہوگا، نیز فرمایا **اِنَّ جِبَادَكَ مِنْهُمْ لَخٰلِصِيْنَ** مگر ان میں سے تیرے بعض مخلص بندے تو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شمار بھی ایسے بندوں میں ہو جائے تو اس میں کونسی شرعی یا عقلی خرابی لازم آتی ہے،

اب رہے یہ الفاظ کہ **فَلَا فَلَ**، فلاں کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ تو یہ محض ایک مثال ہے یہ کیا ضروری ہے کہ ان الفاظ کو حقیقی معنی پر معمول کر کے دوران عقل معنی پیدا کریں۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ شیطان ان کو بہکانے میں بے بس ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے اس فرمان **قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ** دیکھئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو، اس میں مراد بچتے ہو، یہ فرمایا **اِنَّ اَمْرًا لِّمَنْ يُّنْفِقُ** وہ دیوار جو ٹوٹا ہی چاہتی تھی، اس میں گرا ہی چاہتی تھی مراد ہے،

دوسرے۔ شیطان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈر کر بھاگنا اور انبیاء و رسل سے نہ ڈرنا اس بات سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت انبیاء کرام پر ثابت نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ چور کو تو مال، اور پیر سے دار سے اور لہزن فی جدار سے جتنا ڈرتے اور کانپتے ہیں اتنا بادشاہ وقت سے نہیں کیونکہ کو تو مال اور فرجدار کی تو ڈریوں اور فرنی ہی یہ ہے کہ مفسدوں چوروں ڈاکوؤں سے ملک و شہر کو پاک کریں اسی لئے یہ مفسدوں اور چوروں کے مکرو فریب اور شہکندوں کو بادشاہ کی نسبت زیادہ جانتے اور پہچانتے ہیں بادشاہ کو ملکی بہات اور معاملات میں الجھ کر یہ موقع کہاں کہ وہ چوروں کی نغیات اور ان کی دار و اتوں کی ٹوہ لگائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ عہدہ احتساب سے سرفراز تھے اس لئے ہر کرداروں اور بد اعمال اشخاص جو درپردہ شیطانی گرے تھے ان سے لرزاں و ترساں رہتے تھے بلکہ ان کے احتساب کو تو دریائے نیل بھی مانتا تھا۔ کہ ان کے حکم پر جاری ہوا۔

خلاصہ کلام یہ کہ شیطان کا کسی شخص یا چیز سے ڈرنا اس شخص یا چیز کی اصلیت کو اس شخص یا چیز پر ثابت نہیں کرتا جس کی انصافیت قطعی الثبوت ہے!

مثلاً اذان کے بارے میں فریقین کے ہاں یہ روایت صحیح مردی ہے کہ اذان سن کر شیطان گونڈ کر تا ہوا بھاگتا ہے اور پھر نماز میں آ موجود ہوتا ہے اور سوئے ڈالتا ہے حالانکہ یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ نماز تمام اصل عبادت میں افضل ہے چہ یا یکہ اذان کہ وہ تو وسیلہ نماز ہے نہ اصل عبادت ہے نہ فرض! اور نماز سے اس کی برابری کا سوال ہی نہیں اسی صورت پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے معاملہ کو قیاس کرنا چاہیے تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام تو شیطانی مکرو فریب اجمالی طور پر بیان کر کے اس کے راستے بند فرماتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے مکرو فریب کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کے سارے انجیر پتھر کو جانچتے اور پکھتے ہیں۔

اور بہکانے، گمراہ کرنے، کے ذرائع و وسائل، اور اوزاروں کی تفصیلی جانچ پڑتال کرتے اور ان کا توڑ تلاش

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا ان جیسی ہستیاں دنیاوی نفاق کے ساتھ رغبت دلا کر پاؤں ڈٹے کے زور سے اطاعت کی طرف راغب کرتی اور برائیوں سے باز رکھتی ہیں۔ پھر دنیا کے اکثر لوگ تو ترسے فائدے اور نفع ہی کو قابلِ توجہ سمجھتے اور یہیں کے مکافاتِ عمل سے ڈرتے اور خوف زدہ ہوتے ہیں، اس لئے لامحالہ شیطانی فوج اور اس کے گرگے، عمری دیدہ و قہر سے زیادہ نائف اور ان کے نام سے لڑہ براندام تھے، نہ کہ انبیاء سے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے، السُّلْطَانُ بَيْنَهُمُ الْكُفْرُ مَيَّا يَزِعُ الْقُرْآنُ (قرآن بندوبست سے زیادہ سلطانِ بندوبست دھمت ہوتا ہے)، اردو میں بھی ایک مثل مشہور ہے کہ ”مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے“ جو جن بھوت تعویذ گندلوں سے نہ بھاگے اس کی اگر پٹائی کر دی جائے تو فوراً دفع ہو جاتا ہے پانچویں یہ روایت بھی اس طعن کے بجائے ادھیڑی ہے جو شیعوں اور سنیوں دونوں کی کتب میں موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ کے احباب اور دوستوں کے مراتب دریافت کئے گئے تو آپ نے فرما فرمایا اور حضرت عمار کے فضائل میں یہ الفاظ فرمائے ذَا لِكَ الَّذِي اَجَارَكَ اللهُ عَنِ الشَّيْطَانِ عَلَى لِسَانِ نَبِيِّكَ يَدِ وَهْمَتِي هِيَ جِسْمُ الشَّيْطَانِ سَبَّاهُ فِي رَهْبَتِكَ اَللّٰهُ تَعَالٰی نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دوائی اس روایت سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا شیطان سے محفوظ ہونا ثابت ہوتا ہے، تو چاہیے انہیں بھی انبیاء کرام علیہم السلام پر فضیلت ہو، اور کسی کے نزدیک بھی ایسا نہیں ہے، بہر حال عمر ہوں یا عمار مادہ دونوں کا مشترک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عمار خود شیطان سے محفوظ ہیں اور حضرت

عمر رضی اللہ عنہ خود محفوظ ہونے کے ساتھ شیطان کے لئے ہوا بھی ہیں، کہ ان کے سایہ تک سے لرزتا ہے اور میدان چھوڑ بھاگتا ہے، اب اگر طعن کرنے والوں کی منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو بد یہی نتیجہ نکلے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام تو محفوظ باللہ شیطان سے محفوظ نہ رہ سکے اور حضرت عمار کی محفولیت کی لسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی تو گویا یہ بھی انبیاء سے افضل ہوئے،

الجھا ہے پاؤں مار کا زلف دراز میں لو آپ اپنے دام میں مباد آگیا:

دھوکہ (۱۰۰) ۱۔ کہتے ہیں کہ کتب صحاح میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہشت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے آگے آگے دیکھا اور ان کی جوتی کی آواز آپ کی سماعت میں آئی، اعتراض ان کا یہ ہے کہ اس روایت سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے غلام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت لازم آتی ہے، اور یہ بڑی ناریا بات، اس اعتراض میں بڑے ظلم اور تعصب سے کام لیا گیا ہے، اس لئے کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا بہشت میں آگے چلنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے زمین پر تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ آگے آگے ہی چلتے تھے تاکہ راہ کے موافقات اور تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دیں، صالۃ الجلب کی طرح بہتر ہے آپ کے دشمن تھے آپ کی ایذا رسانی کے لئے کچھ بھی آپ کے راستے میں ڈال سکتے تھے یہ بھی نہ ہو تو راستہ میں اینٹ، پتھر اور روڑے تو ہوتے ہی ہیں نعمانی، اور وہ اینٹ پتھر جو بھی ہوتا اٹھاتے اور آپ کے لئے راستہ صاف کرتے تھے عام طور پر خدام اسی لئے رکھے جاتے تھے اگر ان کو اس کام کے لئے خاص طور پر نہ بھی رکھا جاتا تو خدام از خود اسے اپنا فرض قرار دے لیتے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ آقا کو کلفت اور بے آرامی ہو۔

اور اس وقت یہ رسم غایت ادب کی علامت اور نشانی تھی۔ اور خدام کا یہ عام معمول تھا کہ اپنے آقا و مخدوم کے آگے چلیں، اور اس کا مشاہدہ آج بھی برائے العین کیا جاسکتا ہے۔ سلاطین زمانہ اور حکام وقت کے باڈی گارڈ کہاں چلتے ہیں، پیچھے ہاتھ باندھے یا آگے دندنا تے ہوئے، دنیا میں اعتراض کرنے والی یہی ایسی عجیب الخفقت مخلوق ہے جس کو بین ادب بے ادبی نظر آتا ہے نعمانی۔

اس ادب کے مقابلہ میں یہ بات سوادب ہے کہ مخدوم اپنے راستے کے موافقات خود اپنے ہاتھ سے ہٹائے راستہ صاف کرنے اور خدام دست بستہ تماشا بن بنے پیچھے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام امراء، اغنیاء اور بادشاہوں اور ذی اقتدار لوگوں میں ادب کی یہی صورت ہمیشہ رائج رہی ہے اور تو اور عرب کے جاہل اکھڑناک پرکھی نہ بیٹھنے والے ذی حشم لوگ بھی اسی کوشائستہ ادب مانتے تھے، چنانچہ مثل کے طور پر ان کے ہاں یہ مشہور ہے، ثَلَاثٌ يَتَقَدَّمُ فِيهَا الدَّصَاغِرُ عَلَى الْوَكَايِدِ اِسَارَةُ لَيْلًا اَوْ خَافَتُوا سَبِيلًا اَوْ صَادَفُوا خَيْلًا۔ تین مواقع پر چھوٹے بڑوں کے آگے ہتے ہیں جب رات کو کہیں جائیں یا پانی میں گھسیں یا شکر لے کر چلیں، اور اس قسم کا تقدم نہ جنت میں پہلے داخل ہونے کا متقاضی ہے، اور نہ ہی مرتبہ اور درجہ کی بلندی کا۔ جس سے کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں، اور فرض کر لیں کہ وہ جنت میں پہلے ہی داخل ہوئے تھے تو بھی جنت میں داخلہ اس وقت بزرگی و فضیلت کا باعث ہوتا ہے جب کہ ثواب اور اجر اعمال بھی اس سے سدا بہر ہوں ورنہ ہوں تو فرشتے بھی انبیاء سے پہلے جنت میں چلے جاتے ہیں اور حضرت ادریس علیہ السلام ہمارے حضور صلی اللہ

علیہ وسلم سے پہلے جنت میں چلے گئے بلکہ جنت میں تو ابلیس حضرت آدم سے پیشتر پیدا ہوا تھا۔
پھر بڑی نفیلت اور بزرگی تو یہ ہے کہ جینے جاگتے اس گوشت پرست کے جسم کے ساتھ بہشت میں داخل ہوا
جیسا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوا نہ یہ کہ خواب یا استغراق میں صرف درج جنت میں جائے اور خود کو پتہ
نہ پہلے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درمراج کی شب آپ کی امت کے مراتب اور ان کے ثواب و درجات کی مقدار
دکھائی اور بتائی جا رہی تھی تو ساتھ ساتھ صاحب درجات و مراتب کی صورتیں بھی پیش کی جا رہی تھیں اور بتایا جا رہا تھا کہ آپ
کی امت میں سے فلاں شخص کو فلاں عمل کے سبب یہ درجہ و مرتبہ نصیب ہوا تاکہ آپ لوگوں کو اس عمل کے خواص و فضائل
سے آگاہ فرمائیں۔

اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی سے فرماتے کہ میں نے تم کو اس مرتبہ و درجہ پر فائز دیکھا ہے
تم ایسا کیا کام کرتے ہو جس کے سبب اس مرتبہ کے مستحق سمجھے گئے مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اس عمل کی اہمیت و افادیت
سے واقف ہو اور پھر کبھی وہ عمل ترک نہ کرے اور دوسرے لوگ بھی اس کام کی طرف راغب ہوں اور ان میں بھی اس
کی حرص پیدا ہو۔ حالانکہ ایسے حضرات کو ان امور کا کچھ پتہ نہ ہوتا تھا اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو خواب میں بھی
جنت میں دیکھا تھا چنانچہ جناب بلال رضی اللہ عنہ کو بہشت میں اپنے آگے دیکھنے کا معاملہ بھی اسی طرح کا تھا، ایہ ان کی
مثالی صورت ہے جو آپ نے ملاحظہ فرمائی یا محسوس فرمائی، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عمل کے بارے میں
دریافت فرمایا تو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ تحیۃ الوضوء پابندی اور اہتمام سے پڑھتے تھے اور اس سے تحیۃ الوضوء
کی نفیلت واضح ہو گئی،

اسی طرح دوسرے صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم کے بارے میں متعدد احادیث میں یہ آیا ہے کہ آپ نے نام لے
لے کر فرمایا کہ فلاں کو ایسا دیکھا اور فلاں کو ایسا اور یہ فلاں فلاں عمل کے سبب تھے ان میں حضرت ابو طلحہ کی بیوی
حضرت رضیضا رضی اللہ عنہا بھی ہیں اور حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہ بھی کہ بہشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان کی خواتین سماعت فرمائی پھر معلوم ہوا کہ ان کا یہ اعزاز اور مرتبہ ان کی خدمت کا صلہ نتیجہ اور سبب ہے!
طبرانی میں اسی حدیث بلال کے آخر میں فقرہ اور ان کی اولاد کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے جس سے یہ شبہ بالکل ہی جاتا رہا۔
عَنْ أَبِي أَمَامَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَسَمِعْتُ حَرَكَةَ أُمَامِي فَتَنَظَّرْتُ فَإِذَا
بِلَالٍ وَنَظَرْتُ إِلَى أَعْلَاهَا فَإِذَا فَقَرَاءُ أُمِّي وَأَوْلَادُهُمْ وَنَظَرْتُ فِي أَسْفَلِهَا فَإِذَا حُلَّةُ الْأَعْيَانِ رِأْيِ أُمَامَةَ
رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے کچھ چاب سنی جب میں
نے ادھر نظر ڈالی تو بلال نظر آئے، اوپر کے حصہ کی طرف نظر اٹھائی تو وہاں میری امت کے فقرہ اور ان کی اولاد نظر
آئی اور نیچے کے حصہ کی طرف جھانکا تو وہاں امراء اور اغنیاء نظر آئے۔

شیعوں کے اعتراض میں اگر آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے متعلق تعارفی الفاظ غلام ابو بکر پر غور کریں گے تو ان
کے دلوں میں چھپا ہوا تعصب اور عناد عیاں ہو کر سامنے آ جائے گا یہ نامنصف متعصب اتنا نہیں سوچتے کہ اہل سنت
اگر حضرت بلال کے فضائل اور نیکی کا اعتقاد صرف اس بنا پر رکھتے ہیں کہ ان کی نسبت اور وابستگی حضرت ابو بکر صدیق

رضی اللہ عنہ سے ہے تو ان کی جگہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو جنت میں کیوں نہ دکھاتے اور ان کی تعریف کیوں نہ کرتے اس لئے کہ بیٹا بہر حال غلام ہے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ایمانی قوت صدق اخلاقی اور طاعات پر مداومت کی برکت سے نصیب ہوا اسی لئے یہ روایت تیحۃ الوضو کی طرف رغبت و شوق دلانے کے سلسلہ میں لائی گئی ہے نہ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں،

دھوکہ نمبر (۱۰۱) اعتراض یہ ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى نَزَلَ عَشِيَّةَ يَوْمٍ عَرَفَةَ إِلَى عِبَادِهِ فَأَبْهَأَ بَالَتَائِهِ عَامَّةً وَيُعَمِّدُ خَاصَّةً رَأَى اللَّهُ تَعَالَى يَوْمَ عَرَفَةَ
 کی شام اپنے بندوں پر نظر ڈالی تو سب پر عموماً اور عسراً خصوصاً فخر کیا، یہ روایت حضرت عمر کی فضیلت پیغمبر علیہ السلام پر اور جناب پیغمبر علیہ السلام کی حقیر ثابت کرنی ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں میں شمار کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاص ہیں،

اس اعتراض میں ظلم و نا انصافی تعصب و دشمنی حد سے بڑھ گئی اور کلام کو بالکل غیر محل پر استعال کیا ہے اول تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں میں شمار کرنے کی کوئی دلیل اور ثبوت نہیں کیونکہ اس سے مراد وہ تمام حجاج ہیں جو میدان عرفات میں حاضر تھے اصول کا قاعدہ ہی یہ ہے کہ منظم عموم کلام سے خارج ہوتا ہے دیہاں منظم خود حضور ہیں تو ان کا عام میں شمار نہیں، دوسرے اعتراض نے عوم و خصوص کے وہ منہ سجھے جو آج کل لوگوں میں مشہور و معروف ہیں، کہ کہتے ہیں فلاں شخص عام لوگوں میں سے ہے اور فلاں خواص میں سے۔ یہ سنی عربیت کے بالکل منہب نہیں اور جس نے ایسا سمجھا اس نے کلام عرب سے اپنے کو نا آشنا ثابت کیا، اس کے منہ سے تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس روز فرشتوں پر حاجیوں کی فضیلت بالعموم اور حضرت عمر کی بالخصوص بیان فرمائی پس اس حدیث میں مجہۃ الوداع کے سارے ہی حاجیوں کی فضیلت فرشتوں پر مقصود ہے

ہاں حضرت رضی اللہ عنہ کو ان کے مشرف کے اظہار کے لئے فخر سے مخصوص فرمایا۔ کیونکہ ملاو اہل میں آپ کی فضیلت شہرت پائیکل تھی اور سب فرشتے آپ کی بزرگی کے معتقد ہو چکے تھے اور اس وقت بھی ان کو حضرت عمر کے مال سے باخبر بتانے کیلئے کیا کہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں میں سے ایک یہ بھی ہیں، جو اس بلند مرتبہ سے شرفیاب ہوئے یہ فخر تو درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی پر ہے کہ آپ کے دوست اور ساتھی ایسے مرتبوں اور عزت کے مالک ہیں۔
 دھوکہ (۱۰۲) اہل سنت پر ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے اپنی روایت میں ایک رنگ اور نازا بابت کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے ان کا اشارہ حضرت مدیفر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی طرف ہے،
 أَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَى مَبَايِلَهُ قَوْمٌ خَبَالٌ قَائِمًا دُخَانًا حَضَرَ صُلَى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّ رَأْسَهُ كَأَنَّ رَأْسَهُ كَأَنَّ رَأْسَهُ
 نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا

اہل سنت کی طرف سے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے ہاں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی صحیح سند کے ساتھ یہ روایت بھی درج ہے کہ مَنْ حَقَّ تَلْبُؤُهُ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّ يَبُولَ كَأَنَّ يَبُولَ قَائِمًا دُخَانًا تَصَدَّقُ قَوْمٌ
 مَكَانَ يَبُولٍ إِذَا قَاعِدًا رَجُومًا۔ یہ بات کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا کرتے تھے اس

یاد رہے کہ وہ کیونکہ آپ بیٹھ کر ہی پیشاب فرماتے تھے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ کی عادت تشریف ہی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو ازواج مطہرات اور اہل بیت اس سے ضرور واقف ہوتیں کہ اکثر اس کی نوبت اندرون خانہ بھی پیش آتی تھی، لہذا جب دوسرے صحابہ کی روایات کی طرف رجوع کیا گیا تو اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مفصل روایت ملی جس میں اس کی پوری تشریح موجود ہے اور اس سے ہر قسم کا شک و شبہ دور ہو جاتا ہے چنانچہ امام حاکم بیہقی رحمہما اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت نقل کی ہے کہ اِنَّمَا بَالَ تَابًا لِّمَنَّا بِمَنَزِلٍ كَانَتْ فِي مَابِطِئِهِ۔ (آپ نے رگ مابین میں زخم کی وجہ سے کسر لے ہو کر پیشاب فرمایا، مابین زانو تک ایک رگ کا نام ہے،

اس سے معلوم ہو گیا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کی وجہ کیا تھی۔ اور تندرستی اور بیماری کی حالت کے فرق کو غور میں و آسان کا فرق ہے، کون بہتر طرف نہیں جانتا یا نہیں جانتا۔

جواب صحت و تندرستی کی حالت میں نازیبا اور خلوات مردت سمجھی جاتی ہے وہ بیماری کی حالت میں بری نہیں ہوتی اور نہ کوئی خلوات مردت کہتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے، كَيْفَ هَلَى الْمُتْرَفِيُّ حَرَجًا، مریض پر کون پابندی یا بندش نہیں،

اس فرق کے اندھے تعصب پر جبریت و تعصب ہوتا ہے کہ اہل سنت کی روایات کی صحیح توجیہ ہوتے ہوئے جن کو خود اہل سنت نے بڑی وضاحت و مراعات کے ساتھ بیان کیا ہے اعتراض کرتے ہیں حالانکہ سید مرتضیٰ اور دوسرے اہل علم نے خود یہ اصول اور قواعد مقرر کیا ہے، اِنَّ الْخَبْرَ مَتْنٌ وَجَدَلُ كَلِّهِمْ فَلَا يَزِيدُ مَجْجَبِ عَدِثٍ کا صحیح معنوں پر حمل ہونے کو اسے رد نہیں کرتے مان لیتے ہیں اور خود امام صادق رحمہ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ سے خذْنَةُ جَوَادٍ يَنْتَازُكَ دَرُزُ بَهْتَنٍ لَكُمُ جَبِي رَايَتِ نَقْلُ كَرْنِے پر ان ظنیوں کو شرم نہیں آتا اور اس کو کسی ایسے صحیح معنوں پر حمل کیوں نہیں کرتے جو غیرت و مردت کے خلاف نہ ہو۔ بلکہ یہ تو دانستہ دشمنی اور بے شرمی کیساتھ انبیاء کرام اور ائمہ پر جھوٹ کا الزام اس لئے لگاتے ہیں کہ ان بزرگوں اور قابل تقلید ہستیوں کے اقوال و افعال پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے۔

وضو کہ نمبر (۱۰۳) ایک الزام یہ لگاتے ہیں کہ اہل سنت کئے کی کھال پر نماز پڑھنے کو جائز کہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک احسان کے اس کئے کی ایسی رنج ہوئی کھال پر جس کی رطوبت مصالحوں اور کیمیکلز کے استعمال سے جاتی رہی ہو، نماز پڑھنا جائز ہے اور یہ حوالہ اس حدیث کی روشنی میں ہے جو فریدی کے نزدیک صحیح ہے کہ دَبَاغُ الْجِلْدِ طَهْرٌ وَكَالْكَافُ الْغَنَاءُ اس کی پاکی ہے۔ نیز ان میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے، اَيْتُكَ اَكْبَابُ دَبَاغٍ فَكُلْ اَكْهَوْرُ بَوَ كَالِ رُغْلِي جَانِي هِي دَن پَاكُ ہو جاتی ہے،

پھر یہ بات عقلی طور پر بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مثلاً حرام جانور اور شیر بھیڑ یا، بلی وغیرہ پر ان کی زندگی میں اگر کوئی ان پر ہاتھ پھیرے تو وہ ہاتھ ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ پسینہ وغیرہ کی تری نہ ہو اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کرام۔ سے اس قسم کے جانوروں پر ہاتھ پھیرنا ثابت ہے اور گدھوں، چھروں پر سواری تو بڑا تر مردی ہے،

ان با فردن کے کرنے کے بعد ان کی کھالوں کی حرمت کا حکم صرف اس لئے لگایا جاتا ہے کہ اس وقت بدن و طوبت خون چربی اور گوشت کے ساتھ مل جاتا ہے جب وہ طوبت مصالحوں اور کیمیکلز کے ذریعہ کھال سے نکال کر اسے صاف و خشک کر لیا جائے تو کھال پھر اپنی اصل و پاک حالت پر نہ آتی ہے اور اس کا حکم بدل جاتا ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی نباتت کپڑے پر لگ جائے اور دھو کر صاف کر لیا جائے تو کپڑا پاک ہو جاتا ہے، البتہ خنزیر کی کھال اس اصول کلی سے خارج ہے کہ کیونکہ قرآن مجید میں اس کو جھمہ ناپاک فرمایا گیا ہے، لہذا اس شخص کو وہ بالکل نجس ہے، اسی لئے اس کی کھال، جمانی، بالی اور ہڈی تک سب ناپاک ہیں اور اس مسئلہ میں اگر کتا بھی خنزیر کی مانند ہے کہ کوئی شرمی دین موبہ نہیں بلکہ قرآن مجید میں کتے کے شکار کو حلال فرمایا گیا ہے،

اور ایسے شکار کو سننے اور شہدہ و دونوں کھانے ہیں، حالانکہ شکار جس وقت اس کا لحاظ بدن شکار کو لگ جاتا ہے ایسی صورت میں کھال اور ردہ سے اعضا، بالی و چوڑی خنزیر کیوں ناپاک ہوں گے اگر کتا بھی خنزیر جیسا ہو تو اس کا شکار حلال کیوں ہوتا،

اس کلام سے واضح ہو گیا کہ اس مسئلہ میں اہل سنت پر اعتراض نہ قرآن کی رد یہ درست ہے نہ حدیث کی رد ہے! اور ان معتزلیں امامیہ کی اپنی حالت یہ ہے کہ ان کے نزدیک جہاں انسان کا بول و براز پھیلا ہوا ہو اس جگہ نماز پڑھنا جائز ہے حالانکہ انسانی براز بالاجماع نجس العین ہے جو کسی طرح بھی پاک نہیں ہو سکتا، چنانچہ شیخ علی نے (کتاب، ارشاد میں ابوالقاسم نے کتاب شرائع میں اور ابو جعفر طوسی نے اس مسئلہ کو بالمتصریح بیان کیا ہے عزمن جملہ امامیہ کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے، اب آپ انسانی گندگی اور کتے کی کھال میں خود ہی موازنہ کر کے معتزلیں کی دماغی ساخت کے متعلق غور فرمایا کیجئے۔

ردھو کہ نمبر (۱۱۰۴) :- اعتراض یہ ہے کہ اہل سنت شطرنج کے کھیل کو جائز کہتے ہیں حالانکہ اردوئے شرع ہمہ قسم ہو کتب برے ہیں اور ان کی برائی قرآنی نصوص سے ثابت ہے، اس اعتراض کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اخاف، مالکیہ اور حنابلہ شطرنج کی حرمت کے قائل ہیں اور اس کی حرمت میں احادیث بیان کرتے ہیں۔ البتہ شوافع کے نزدیک اس میں دو قول ہیں، اول یہ کہ مندرجہ ذیل پانچ شرائط کی رعایت کے ساتھ یہ مکروہ ہے حرام نہیں (۱) اس کی وجہ سے نماز و وقت سے موخر نہ ہو، نہ اس کی وجہ سے نماز کی ادائیگی میں عجلت کرنے اور نہ آداب سنت نماز کو ترک کرے (۲) شرط لگا کر نہ کھیلے نہ اس میں جوش کی کوئی اور شکل ہو، (۳) اس کی وجہ سے کسی دوسرے واجب میں فرق نہ آنے پائے، مثلاً اللہ کی سزوں کی خدمت، اہل و خیال کی دیکھ بھال، عزیز و اقارب سے میل جول، مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شمولیت (۴) کھیل کے دوران کھیل سے متعلق لڑائی جھگڑا، جھوٹے قسم وغیرہ قسم کی باتیں پیش نہ آئیں، (۵) اس کے مہر وں اور گرتوں پر انسان یا حیوانات کی تصاویر نہ ہوں،

اگر پانچوں شرطوں میں سے ایک کی بھی خلاف ورزی ہوگی تو یہ کھیل حرام ہو جائے گا، اور انکی پابندی نہ کرنے والا گناہ کبیرہ کا مستحق ہوگا (ایضاً دغالباً العلوم) میں بھی اسی طرح ذکر ہے،

اور امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کا دوسرا قول دیگر ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے موافق ہے، یعنی وہ بھی بغیر شرط مطلق حرام فرماتے ہیں اور یہ ثابت شدہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قول سے رجوع فرمایا ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے

بالتفصیل اس کو رقم کیا ہے،

اور بالفرض اس کو جائز ہی مان لیں تو گھوڑ دوڑ، تیر اندازی، نیرہ بازی وغیرہ کی طرح یہ بھی ایک مباح کھیل ہوگا کیونکہ اس کھیل میں یہ فائدہ ہوتے ہیں،

ذہن کو تیز کرتا ہے۔ جنگ بازی کے ہنر سکھاتا ہے، اور تاتا ہے کہ دشمن کی چالوں سے کس طرح بچا جائے وغیرہ وغیرہ۔ برا کھیل وہ ہوتا ہے جس میں کوئی دینی فائدہ نہ ہو، وہی ہرود لعب بھی کہلاتا ہے اور ایسے کھیل کو اہل سنت جائز نہیں بتاتے برخلاف امامیہ کے وہ عین حالت نماز میں جو خالق سمادات والارمنی کے ساتھ مناجات کا وقت ہے، اور ایک معنی کہ وہ اپنے رب کے ساتھ معراج کی حالت پر ہوتا ہے اعضاء مڑانے سے تلعب کو جائز کہتے ہیں چنانچہ ابو جعفر طوسی اور دوسروں نے تہذیب نامی کتاب اور دوسری کتابوں میں اسے لکھا ہے، اپنے موقع پر انشاء اللہ ہم بیان کریں گے۔

دھوکہ نمبر (۱۰۵)۔ اہل سنت کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ گانے بجانے کو جائز کہتے ہیں حالانکہ اس کی مذمت بے شمار احادیث و آثار میں بیان کی ہے۔

یہ اعتراض افتراء محض اور سراسر بہتان ہے، اس لئے کہ آلات موسیقی کے ساتھ گانا بجانا چاروں ائمہ رحمہم اللہ کے ماننے والے فقہاء کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے بڑے اور اونچے درجہ کے مشائخ اور بلند مرتبت صوفیائے کرام رحمہم اللہ نے اپنے حرام گانے نہ سنے اور نہ ان کو اس کی رغبت کوئی

بلکہ سیدالاولیاء، امام الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، رَأَيْتُكَ بَطْلًا قَدْ رَیَہُ بیہودہ اور لغو چیز ہے۔ اور شیخ برزوق فارسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اَلشَّاعِرُ حَرَامٌ کَالْمُیْتَةِ رِسَاعِ مَرَدٍ جانور کی طرح حرام ہے، سماع نام کی جو چیز بزرگان دین کی طرف منسوب ہے اور جس کا سماع ثابت بھی ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی قوال مرد خوش آواز ہوتے نہ مرد، یا عورت اجنبی، جن کو دیکھ کر سفلی جذبات جھٹکیں، اور کوئی فتنہ برپا ہو، ہرگز ہرگز ان کی محفل میں بار نہ پاسکتے تھے، اور آلات موسیقی میں سے کسی چیز کے ہونے کا قرآن کے ہاں سوال ہی نہیں تھا،

پھر جو اشعار وہ سنتے تھے اکثر جنت و دوزخ کے ذکر یا طاعات کی طرف رغبت اور معاشی سے نفرت کے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے یا پھر ان میں وصل ہجر کا بیان ہوتا تھا جو محبت الہی میں مستغرق حضرات کے حسب حال ہوتا تھا خلاف شرع کوئی مضمون نہ ہوتا ان کی اس پاکبازانہ مجلس میں، امر و یا عورت کی شرکت تو کجا وہ کچے ذہن کے مردوں کو بھی شریک نہ کرتے تھے۔ نہ انہی مجلسیں آج کل کی طرح سرعام سجائی جاتی تھیں، تخلیک میں ان یا بندیوں کے ساتھ ان بزرگان کرام کا سماع ہوتا تھا، ایسے سماع کو حرام کہنا ہی خلاف شرع ہے بلکہ خود ان شیعوں کے مذہب کے بھی خلاف ہے، چنانچہ ان شیخ مقتول نے کتاب الدروس میں ذکر کیا ہے یَجُوزُ اَلْغَنَاءُ بِشَرْطِ طَهْلِ النُّفُسِ، شادی کے موقع پر گانا شردط کا لحاظ رکھتے ہوئے جائز ہے، اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کے ہاں گانے کے جواز کے لئے جو شرائط مقرر ہے، فساد کی جڑ اور فاسقانہ ہے وَهُوَ اَنْ یَّکُونُ الْمُسَمِّعُ اَمْرًا اَوْ لَا یُکُونُ رَجُلًا وَلَا یُکُونُ السَّمْعُ فِي الْیَقِظِ فی النہجۃ وہ گانے والی عورت ہو مرد نہ ہو اور نہ شعر کسی کی بچو میں ہو، شرع القواعد میں بھی اسی طرح کامضون وجود ہے اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ کس صورت میں گانا سننا قبیح ہوگا۔ صوفیاء کی شرائط کے مطابق یا ان طاعنوں

اور معتز صوفی کی شرائط پر،

دھوکہ نمبر (۱۰۶) ان کے اسلاف سادہ دل بندوں اور کم عقول لوگوں کو دھوکہ اور فریب دینے کے لئے یہ حربہ استعمال کرتے ہیں کہ ائمہ اور بزرگان دین کی خدمت میں کثرت سے آمد و رفت رکھتے ان کی مجلسوں میں شرکت کرتے اور موقع بموقع ان کے مکانوں میں آتے جاتے ہیں تاکہ لوگ اس دھوکہ میں پڑ جائیں کہ یہ ان کے بہت چہیتے شاگرد یا بہت گہرے دوست ہیں اور اپنے دینی مسائل کا حل انہیں سے حاصل کرتے ہیں، اور ان کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب لوگ اس قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں تو ان کا اصل رنگ کھلتا ہے اس وقت پر اپنی گھڑی ہوئی لغو اور گمراہ کن باتیں ان روایات میں داخل کر کے ان کو پھیلانے اور خوب شہرت دیتے ہیں اور یوں وہ خوش فہم لوگ ان کے دام مکہ میں آکر اپنا دین و ایمان برباد کر بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کے مکار اور غداروں کے سرگروہ ہشام بن الحکم، ہشام بن سالم، احوال طاق ہمیشہ زید بن جہیم ہلالی زرارہ بن اعین حکم بن عتبہ اور عروہ نجی ہیں جو حضرت سجاد حضرت باقر اور حضرت سادق رحمۃ اللہ علیہم کے زمانے میں گزرے ہیں یہ ان ہی امان عالی مقام سے روایت کرنے کے مدعی ہیں پھر ان کے بعد صدی بعد صدی بہت سے گروہ اس قماش کے پیدا ہوتے رہے اور عقوق خدا کا دین و ایمان بے باکی سے غارت کرتے رہے۔

حتیٰ کہ امام محمد بن حسن المہدی کا زمانہ آیا آپ پیدا ہوئے بچپن اور کم سنی ہی میں وصال بھی فرما گئے ان کے بعد جھوٹ اور مکہ کا دائرہ وسیع۔ سے وسیع تر ہوتا گیا اصول و فروع میں بھوٹے اقوال داخل کئے گئے، صابہ، خلفاء اہمات المؤمنین سے متعلق دلچسپ، نازیبا اور سراسر جھوٹے الزامات تراشے گئے۔ شیعوں کی تعریف اور اہل سنت کی مذمت میں روایات کے انبار لگائے گئے حالانکہ ائمہ کرام نے ہر وقت ان کے عقیدوں کی تکذیب کی ان کی خرافات اور جلساڑیوں سے اپنی براءت اور میرا کا اظہار فرمایا ان کے عقیدوں کی تکذیب کی ان کی روایات کو یہ اصل اور من گھڑت قرار دیا۔

اور یہ ڈھیسٹ پنے۔ سے بھی کہتے رہے کہ یہ سب ائمہ کا تقید اور زمانہ سازی ہے اور ظاہر داری پر مبنی ہے، اور نہ ہم تو ان کے بڑے چہیتے ہیں ہمیں تو ان کی جناب میں وہ قرب و خصوصیت ماضی ہے جو دوسروں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتی،

اور اسی ذریعہ سے عام لوگوں خصوصاً عربینہ منودہ سے دور دراز ملک اور شہروں کے رہنے والوں مثلاً عراق فارس قم کاشان۔ سے نفس اور طرح طرح کے نذر و نیاز وصول کرتے رہے اس کام کے لئے جعلی مہر شدہ رقعہ بات حضرات ائمہ کی طرف سے پیش کرتے ہیں غرض اس طرح دین کو دشمن تلیل کے عوض بیچنے کا دھندہ کرتے تھے اور یہ دھندہ اتنا بڑھا کہ اس نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی۔

اور تعجب اس پہ ہے کہ کلینی اور دوسرے امامی علماء نے اپنی صحاح میں ائمہ سے ان ہی روایات کی خدمت بھی نقل کی ہے اور پھر ان ہی روایات کو اپنا قبضہ رکھ کر بھی بنایا ہے،

چنانچہ حضرت زید بن شہید رحمہ اللہ علیہ نے برملا اس گروہ کے عقائد سے انکار کیا ان کو ڈنڈا ڈپٹا بیان تک کہ ایک روز ہشام احوال سے کہا،

اَلَا تَسْتَحْيٰ نَبِيًّا تَقُوْلُ مِنْ اَيْ وَهُوَ
بِرُءُكَ عَنْهُ حَتّٰى تَاٰ اَلْخَوْلٰى لَهٗ
كِبْرًا اِنَّكَ لَسْتَ بِاَمْرٍ اِنَّمَا الْاِمَامُ
بَعْدَ اَيْدِكَ اَخُوْلَكَ مَعْتَدٌ فَقَالَ يَا
اَخُوْلَهٗ اَلَا تَسْتَحْيٰ نَبِيًّا تَقُوْلُ رَاٰتُ
اَفْءُ يُعَلِّمُكَ مَسَائِلَ الدِّيْنِ وَلَا
يُعَلِّمُنِيْ وَرَاٰتُهٗ كَاَنَّهُ يُحِبُّنِيْ حُبًّا شَدِيْدًا
كَأَنَّهُ يُبْرِئُ النَّفْسَ فَيَجْعَلُهَا فِيْ
تَكْلِيفٍ لَا يَكْفِيْ عَمَّا يَدَّخِرُ النَّاسُ هٰذَا لَوْلَا
اَبَدًا اِسْتَوَاكُمُ الْكَلْبِيُّ وَغَيْرُهُ مِنَ الْاَصَاِمِيَّةِ

تجھے میرے باپ پر مجھڑا الزام لگاتے شرم نہیں آتی حالانکہ وہ
اس الزام سے پاک ہی تو ایک روزہ احوال نے ان سے
کہا اپنے باپ کے بعد آپ امام ہی کہاں ہیں امام تو آپ
کے بھائی محمد ہیں آپ نے فرمایا تجھے یہ کہنے ہارنے بھی
چاہئیں آئی کہ میرے والد تجھے تو دین کے مسائل سکھاتے
تھے مگر مجھے نہیں مالا نکہ ان کو مجھ سے بہت محبت تھی وہ
لفظ کو تو ٹھنڈا کر کے میرے منہ میں دیتے تھے تو یہ کیسے
ہو سکتا ہے وہ مجھے ایسی بات سے آگاہ نہ فرماتے جو مجھے
آگ میں لے جانے کا باعث ہو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا
اس کی روایت کلینی اور دوسرے امامیوں نے کی ہے۔

پھر امامیہ مذہب کے داعیوں میں سے ایک اور شخص اسحاق بن ابراہیم نامی، جس کا لقب دیکھ لیں تھا اور وہ
شاعر بھی تھا خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں گزرا ہے وہ خود کو حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کرتا تھا
مگر درحقیقت پرلے درجے کا پلید زندقہ تھا صالح اور نبوت کا منکر تھا آخرت کو بھی نہیں مانتا تھا، اس کے عیب
کا پختہ تاریخ کی کتابوں میں بکھر پڑا ہے۔ اور اس معاملہ میں وہ کافی شہرت یافتہ ملزم ہے۔
اس کے باوجود امامیہ کے شیخ الملوف محمد بن محمد بن نعمان نے جو شیخ مفید کے لقب سے مشہور ہے جو محمد بن بابوہ
فی کا شاگرد اور سید مرتضیٰ اور ابو جعفر طوسی کا استاد ہے اپنی کتاب المثالب والمناقب میں اس زندقہ پلید کو اپنے فقہ اور پیغمبرؐ
میں شمار کیا ہے قیاس کن زنگستان من بہار مرا۔

ان لوگوں میں سے بعض نے جعلی نسخے جوڑی اور کتابیں مرتب کر لی ہیں اور ان کی منبت حضرت باقر حضرت صادق
اور دوسرے ائمہ کی طرف کر دی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ شوشہ بھی چھوڑا ہے کہ ان ائمہ نے اپنی زندگی میں بلور نقیہ
ان کو چھپائے رکھا اور ہم کو وصیت کی کہ وقت آنے پر ان روایات کو یاد کر کے ان کو پھیلائیں اور شائع کریں،
جب یہ کتابیں شیعوں کے ہاتھ لگیں تو انہوں نے جرم چاٹ کر سر پر رکھا اور بے دھرمک آزاری سے نکل
روایات کا کاروبار جاری ہو گیا اور جعلی نمکسال کے سکوں کی خوب قدر و منزلت ہوئی جیسا کہ کلینی نے ابوالشہرہ
سے روایت کی ہے۔

اسی طرح ان میں سے ایک جماعت نے ایک کتاب ائمہ کے کسی رشتہ دار کی طرف منسوب کر دی جیسے کتاب،
ترب الاسناد امامیہ۔

پھر ان کے اسلاف میں بعض نصرانی بھی ہوئے ہیں کہ اہل بیت کی محبت کے دعوے بن کر خود کو شیعوں میں داخل کیا
اور کہہ دیا کہ ہم فلاں امام کے ساتھی ہیں، حالانکہ اپنی قوم دقبیلہ میں اپنا اسلام تک ظاہر نہیں کیا ناز و زور، عبادات
مور و طریق اور رسوم میں ان کے ساتھ رہے اور ان ہی میں گھلے ملے رہے ساری عمر کھانا پینا اور دوسرے معاملات
نصرانیوں کی طرح کرتے رہے اور ادھر شیعہ ان کو اپنے میں شمار کر کے دین و ایمان و عقائد سے متعلق ان کی روایات

بے دخلی قبول کرتے رہے، چنانچہ ذکرِ بابین ابراہیم نصرانی اسی غماش کا شخص ہے جس سے ابو جعفر طوسی نے بھی تہذیبِ کتاب میں روایت کی ہے اور اسی طرح دوسرے بھی کرتے رہے،

دھوکہ نمبر (۱۰۷) ان کے کید و محکمہ کا سب سے بڑا اثر یہ تفسیر ہے، اس پر یہ باب انتہائی کم تر پہنچ رہا ہے تفسیر کا مطلب ہے اہل عقل و شعور سے اپنے باطل مذہب اور غلط عقیدوں کو چھپائے رکھنا سادہ لوحوں، بیوقوفوں جاہلوں بچوں اور اور عورتوں پر اس کو پیش کرنا اہل عقل و دانش سے چھپانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی گمراہی اور جھوٹ پر مطلع ہو کر کہیں وہ ان کا تار پود نہ بکھیر دیں، اہل علم کی طرف سے جب ان کی گرفت کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ غلامِ کتاب میں تو ائمہ سے ایسی روایات پائی جاتی ہیں جو تمہاری روایت اور عقیدہ و فہم کی تردید کرتی ہیں تو جان بچھڑانے کو ان کا بہترین جواب ایک یہ ہے کہ یہ ان کا تفسیر تھا۔ گویا یہ تفسیر ان کے مذہب کا سب سے بڑا اصول ہے اگر یہ بھی ان کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو بیوقوف اور احمق بھی ان کے ہاتھ نہ آتے اور ان کی نظروں سے بھی ان کا یہ مذہب گربانا اور اتار داج نہ پاتا۔

اب چونکہ اس فرقہ کی ساری خوشی اور تمام فخر اس بنا پر ہے کہ ہم نے اپنا مذہب اہل بیت سے لیا ہے اور ہم نازانِ نبوت کے نام شاکر گردیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس مذہب کے جہود مرتب اور مصنفین براہِ راست ائمہ کرام سے تو نہ شرفِ ملاقات رکھتے ہیں اور نہ ہی بلا واسطہ شاکر گرد ہیں، اس لئے لاعلم ان ان کے اور ائمہ کے درمیان ان کے وہی پیشوا واسطہ ہیں جو خود کو ائمہ سے منسوب کرتے ہیں اور ان ہی سے نقلِ مذہب کا دعویٰ کرتے تھے،

تو ان حالات میں یہ ضروری اور مناسب ہے کہ ان کے اسلاف، پیشواؤں اور واسطوں کا کچھ حال بھی ضبط تحریر میں لے آیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ ان کے اس مذہب کی حقیقت و درت کا پول بھی کھل جائے اور جو کچھ ان کے اسلاف سے لیا گیا ہے وہ بھی بے نقاب ہو جائے اس اہم مقصد کی خاطر ایک علیحدہ و مستقل باب قائم کیا گیا ہے۔

باب سوم شیعوں کے اسلاف کے حالات کے بیان میں

اگرچہ یہ بحث اجمالی حیثیت سے باب اول میں آچکی ہے جس میں شیعہ مذہب کی پیدائش کے حالات اس کے چند در چند شاخوں میں بٹ جانے کا بیان کیا گیا ہے لیکن اس باب میں ان کے اسلاف کے حالات، خیریاں اور بزرگیاں بالتفصیل سپردِ قلم ہوں گی۔ اور بحث و نظر کا رخ اصالتہً اسی مقصد کی سمت رکھا جائیگا کیونکہ بالقصہ نظرِ ضمنی نظرِ پر لا محالہ اہمیت رکھتی ہے اور تفصیلی بحث اور اجمالی بحث میں بہت فرق و تفاوت ہوتا ہے،

یہاں پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ شیعوں کے اسلاف چند در چند طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں،

پہلا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے براہ راست ضلالت و گمراہی کے سرگروہ اور اصل الاصول اہلین سے فائدہ اٹھایا، یہ طبقہ منافقین کا ہے جو درپردہ اپنے دلوں میں اہل اسلام سے دشمنی چھپائے ہوئے تھے زبان سے اسلام کا نام اس لیے دیتے تاکہ اہل اسلام میں سیل جول، آمد و رفت کی راہ کھلی رہے اور ان کی مخالفت، بغض و عناد ڈالنے اور ان کے بہکانے کے مواقع حاصل رہیں۔ اس طبقہ کا سرگروہ اور پیشوا وہی عبداللہ ابن سبا یہودی منافق تھا جس کا ابتدائی حال تاریخ طبری کے حوالے سے باب اول میں تحریر کیا گیا اس نے پہلے قدم کے طور پر حضرت علیؑ کی فضیلت و برتری کے عقیدہ کی طرف لوگوں کو بلایا اس میں کامیابی کے بعد صحابہ کرام اور خلفاء عظام رضوان اللہ علیہم کی تکفیر وارتداد کا شوشہ بھوڑا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کو مسند الوہیت پر لا بیٹھایا۔ اس کی کامیابی کا اصل راز مردم شناسی تھا وہ اپنے گروگوں میں جس قسم کی باتوں کو قبول کرنے کی استعداد دیکھتا اس کو وہی باتیں اور عقیدہ بتاتا تاکہ قابو میں آیا جہاں بچھی بھاگ نہ جائے چونکہ بہت کائیاں اور منصوبہ باز تھا اس لئے کوئی قدم اٹھانے سے ہیشتر معاملہ کے ہر پہلو کو جانچ کر قدم اٹھاتا،

لہذا وہی لعین سارے رافضی فرقوں کا سرخی اور سر تاج ہے، کہ گندگی سے بھرا ہوا یہ مذہب اسی کے سینہ پر کینہ سے ابلا ہے، اور اہل زمین کو ملوث اور ان کے دلوں میں اترا ہے اگرچہ ان فرقوں میں سے اکثر اس کا احسان نہیں مانتے اور اس کو برائی سے یاد کرتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا قاتل ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کو صرف غلامہ (غالی شیعوں) کا پیشوا سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب اسی کے شاگرد اور اسی کے فیض کے غرشہ چین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب فرقوں میں یہودیت کی بھلیکیاں صاف اور نمایاں دکھائی دیتی ہیں اور یہودیوں کے اخلاق خفیہ اور خیر محسوس طریقہ سے ان میں جڑ پکڑ گئے ہیں۔ مثلاً جھوٹ، افتراء، بہتان، بزرگوں اور اسلاف کو گالیاں دینا رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ہاں شاذ و نادر فیقوں اور دوستوں پر لعنت و تیرتی بھیجا اللہ اور رسول اللہ کے کلام کو غلط معانی پر محمول کرنا ان کا مطلب کچھ کا کچھ بتانا۔ اہل حق کی طرف سے دل میں دشمنی چھپائے رکھنا موقع مل جائے تو اس کے اظہار سے نہ چونکنا، خوف و طمع اور لالچ کی وجہ سے چاہی ہی اور خوشامد و آندہ سے کام نہ لانا نفاق کو بطور پیشہ اپنانا تقیہ کو دین کا رنگین شمار کرنا بناوٹی رقعے، اور جعلی خطوط و دستاویزات بنالینا اور بے شرمی کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام یا ائمہ کرام رحمہم اللہ کی طرف ان کو منسوب کر دینا دنیاوی اغراض فاسدہ اور چند ملکوں کی خاطر حق کو باطل، باطل کو حق کہہ دینا۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا یہ تو کچھ نہیں پہاڑ کی مانند ڈھیر کے باگی کے چند دانے ہیں، ان کے تفصیلی حال سے جو آگاہ ہونا چاہے، وہ سورہ بقرہ سے سورۃ انفال کا بغور مطالعہ کرے قرآن کے اس حصہ میں یہودیوں کے اوصاف اعمال و اخلاق جو کچھ ملتا جائے ذہن میں محفوظ کرتا جائے پھر اس فرقہ کے اوصاف اعمال و اخلاق سے ان کا موازنہ کرے اور انہیں آمنے سامنے کھ کر ملائے ہم کو یقین ہے کہ ہمارے قول کی سچائی اس کے دل میں اتر جائے گی اور زبان سے طابقی الغل بالغل کے محاورہ کی تصدیق پر مجبور ہو جائیگا اور دونوں کے اوصاف حروف بھرت لگے ملتے نظر آئیں گے۔ دوسرا طبقہ ابن ضعیف الایمان، منافق، قاتلین ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سبا کے ان پیروں کا ہے، جو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی شان میں دریدہ دہنی اور بد زبان سے کام لیتے تھے، یہ جن ہاتھوں اور بڑی بڑی

گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ ان منافقوں کے ساتھ یا ان منافقوں کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو سوا یا تھا جیسے سنت موسیٰ علیہ السلام سے یہودیوں کا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منافقین کا کہ نہ تو یہ لشکر سے اپنا منہ کالا کرتے تھے اور نہ اطاعت و فرماں برداری کرتے تھے بلکہ ہمیشہ رنج و ملال خاطر کا سبب اور سولہاں روح بنے رہتے تھے،

اب چونکہ شیعہ اہل سنت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اس لئے اس باب میں اہل سنت کی روایات کو چھوڑ کر مجبوراً جناب علی رضی اللہ عنہ کے فرمودات خود شیعوں کی معتبر کتابوں سے جن کے اکثر مصنفین زید بن اسلم نے نقل کرتے ہیں، ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں اور انصاف کو کام میں لائیں،

امام موید باللہ یحییٰ بن حمزہ زید بن اسلم اپنی کتاب اطواق الحماہ فی مباحث الاممہ کے آخر میں سوید بن غفلہ سے یہ روایت بیان کرتا ہے،

میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جو حضرات ابو جبر و عمر رضی اللہ عنہ کی توہین کے مرتکب ہو رہے تھے تو میں نے اس کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دی اور ان سے کہا کہ اگر ان لوگوں کو یہ خیال نہ ہوتا کہ جس بات کو وہ بڑا کہہ رہے ہیں اسی بات کو آپ دل میں چھپائے ہوئے ہیں تو وہ اس عیدہ دلیری کی کبھی ہمت نہ کر پاتے انہیں علامہ ابن سبہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا پناہ میں رکھے اللہ تعالیٰ ان دونوں رفیقوں پر رحم فرمائے پھر وہاں سے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر مسجد میں آئے، منبر پر تشریف فرما ہوئے اپنی سفید ریش مبارک مٹھی میں محتام کر آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بھائیوں، دو وزیروں اور دو ساتھیوں کا اور قریش کے دو سرداروں اور مسلمانوں کے دو باپوں کا ذکر برائی کے ساتھ کرتے ہیں اور میں ان کے اس قول سے بری الذمہ ہوں اور ان کو ایسی باتیں کہنے کی وجہ سے سزا دی جائے گی، ہم قسم جدوجہد و فدا اور حدود اللہ کے معاملات میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے امور نبی کا فرض ادا کرتے رہے، یہ فیصلہ بھی کرتے اور سزا بھی دیتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رائے کے سامنے کسی کی رائے کو اہمیت نہ دیتے تھے نہ ان کی برابر کسی سے

مَنْ لَمْ يَكُنْ يَكُونُ يَنْتَقِصُونَ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ فَأَخْبَرْتُ قَوْلِي وَتَلَّ كُرْ أَلَيْسَ بِرَسُولٍ أَنْتَ لَعْنَةُ مَا أَهْلُوا مَا خُتِرُوا عَلَى ذَالِكَ مِنْهُمْ عَبْدُ اللَّهِ ابْنُ سَبَّاحٍ كَانَتْ أَوَّلُ مَنْ أَظْهَرَ ذَالِكَ فَقَالَ مَعِيَ أَهْلُ بِلَالِ اللَّهِ مَا حَمَلَهُمَا اللَّهُ ثُمَّ نَهَقَ وَأَخَذَ بِدِرِّي وَأَذْخَلَ النَّجْدَ فَسَجَدَ الْمُنْفَرِّ كَسَمْعٍ عَلَى بَيْتِهِ وَهِيَ بَيْتُهَا فَجَعَلَتْ وَوَعْدَهُ النَّجْدَ وَاعْتَلَى بِبَيْتِهِمْ وَجَعَلَ النَّظَرَ لِلْبَقَاءِ حَتَّى اجْتَمَعَ النَّاسُ ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَكُونُونَ آخِرَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكُونُوا بَيْنَهُ وَمَا جِيئُوا وَسَيَكُونُ قَرِيشُ أَكْبَرُ مُسْلِمِينَ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا يَكُونُونَ عَلَيْهِمْ مِمَّا قَبِىَ عَمَّا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّجْدِ وَالْفَخْرِ وَالْحَدِّ فَإِذَا أَمَرَ اللَّهُ بِأَمْرٍ يَنْفَعُ الْيَقِينِ وَالْيَقِينِ وَإِيَّاكَ أَنْ يَكُونَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا يَكُونُ أَيْمًا وَلَا يَجِبُ كَعْبَهُمَا كَمَا يَكُونُ أَيْمًا مِنْ عَدَمِهِمَا فِي أَمْرِ اللَّهِ فَتُبْغِ وَهُوَ عَنْهُمَا سَامِعٌ وَالْمُسْلِمُونَ سَامِعُونَ فَمَا تَجَاوَزُوا فِي أَمْرِ هَذَا وَاسْلُوكَ سُلُوكًا أَيْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمْرًا فِي حَيَاتِهِ وَبَعْدَ مَوْتِهِ فَقُبْضًا عَلَى ذَالِكَ مَا جَعَلَ اللَّهُ قَوْلِي فَلَنْ أَلْحَقَ وَاللَّهِ وَبَرِيءٌ النَّسَةِ لَا يُجِبُهُمَا إِلَّا كَوْنِي فَأَضِلُّ وَلَا

جستہ کرتے تھے ان کی یہ نذر وعرضہ اللہ کے حکم میں ان کے ارادوں کے سبب تھی۔ پس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوصال ہوا تو آپ ان دونوں سے راضی تھے اور مسلمان بھی ان دونوں سے خوش اور مطمئن رہے۔

کیونکہ انہوں نے اپنے حکم اور سیرت میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جین دجیات نہ بعد وصال آپ کے رائے اور حکم سے ذرہ برابر انحراف نہیں کیا اور اسی حال پر ان کی دنات ہوئی اور اللہ تعالیٰ ان پر اپنا رحم فرمائے اس ذات پاک کی قسم جس نے دانہ کو اگایا اور جان کو پیدا کیا ان کو بلند درجہ میں ہی موت رکھ سکتا ہے اور ان سے بغض رکھنے والا مزید بد بخت ہی ہو سکتا ہے ان کی محبت قرب الی اللہ کی نشانی ہے اور ان سے بغض بے دینی کی علامت دلی آخر حدیث اور ایک روایت میں یوں ہے اللہ اس پر لعنت کرے جو ان کے متعلق اچھاں کے سوا کوئی اور بات اپنے دل میں رکھے اور غریب ہی تم اس کا نتیجہ دیکھ لو گے پھر آپ نے اپنے کاروبار سے کونجھ کر عبد اللہ بن سبا کو مدائن کی طرف ملامت کر دیا۔ اور کہا بھیا تو میرے سائق ایک شہر میں کبھی نہیں رہ سکتا۔

پھر جب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے قتل کی جو مصیبتیں ہوا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو آپ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو آپ کی طرف سے بعبرہ کے صوبہ دار تھے ایک خط لکھا جس میں اس بد بخت اور شقی کے گردہ کے متعلق شکایتوں کے انبار لگا دیئے۔

اب ہم کتاب نیچ البلاغ سے جو ان شیعوں کے نزدیک کتاب اللہ کے بعد جامع الکتاب کا درجہ رکھتی ہے اور متواتر ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کرامت نامہ کی بعینہ نقل کرتے ہیں تاکہ ان کے اسلاف کی بزرگی اور امام معصوم کی شہادت کی خوبی سے روز روشن سے زیادہ واضح اور گزیرے کل سے زیادہ صاف ہو جائے خط کی عبارت یہ ہے

د بعد حمد ثنا، مصرع ہو گیا اور محمد بن ابی بکرؓ شہید ہوئے ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے ثواب و اجر کی دعا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لو کا خیر خواہ، مخفی ننگی تلوار، اور ارکان کو بلند کر نیوالا تھا، اس سانچے سے پہلے میں نے لوگوں کو اس کی زناقت کی تاکید کی تھی اور ان کو حکم دیا تھا کہ اس کی فریاد نہ کری تو اس وقت یعنی لوگوں نے ابتداء میں تاکید کے ساتھ اس کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور دعوت دی تھی تو اس وقت یعنی لوگوں نے اس کو برا سمجھتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور بعض

آ مَا بَعْدَ ذَٰلِكَ مِمَّا رَأَيْتُمْ وَقَعْتُ مِنْ أَيْدِي الْبُحْرَانِ فَقَدْ اسْتَشْهَدْتُ فَيَنْدُ اللَّهُ تَحْسِبُهُ وَلَكِنَّا جَاءَ وَعَمَلًا كَاوِثًا وَسَيِّئَاتًا طَعَامًا مَرَكْنَا رَفَعًا وَكُنْتُ قَدْ خَشِيتُ أَنَّكَ عَلَى الْحَيَاتِهِ قَامَ مَرْكَبُهُ بِنِيَابِهِ قَبْلَ الْوَقْعَةِ وَخَوَّفَهُمْ سِرًّا وَجَهْرًا وَخَوَّفَهُمْ أَوْ بَدَّ وَفِيهِمْ لَذَابٌ كَاوِثًا وَمِنْهُمْ الْمُحْسِنُ كَاوِثًا وَمِنْهُمْ الْقَاوِدُ خَاوِلًا أَسْأَلُ اللَّهَ تَعَالَى أَنْ يَجْعَلَ لِي مِنْهُمْ كَرْجًا عَاجِدًا قَوْلَ اللَّهِ كُوْا لَطِيفٌ عِنْدَ لِقَاءِ الْعَذَابِ فِي الشَّهَادَةِ وَكُوْا لَطِيفٌ لِنَفْسِي عَلَى الْمَيْتَةِ لَا تَجِبُ أَنْ لَا أَلْقَى مَعَ هَؤُلَاءِ فَيَوْمًا قَوِي وَلَا أَنْتَقِي بِهِمْ أَبَدًا ۱۔

نے جھوٹ بولتے ہوئے بہانہ بازی کی اور بعض مدد سے دست کش ہو کر بیٹھ رہے ہیں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو ان لوگوں سے جلد خلاصی عطا فرمائے خدا کی آم اگر دشمن کے مقابلہ کے وقت مجھے شہادت کی کارزد نہ ہوتی اور میں اپنی جان کو موت پر آمادہ نہ کر لیتا تو میں اس بات کو پسند کرتا

کہ ان لوگوں کے ساتھ ایک دن بھی نہ رہوں اور ان کی شکل تک نہ دیکھوں،
اور پھر جب یہ خبر پہنچی کہ سفیان بن عوف جو قبیلہ بنی عامر سے تعلق رکھتا تھا اور امراء معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے
تھا، کے سواروں نے شہر انبار پہنچ کر وہاں کی رعایا کو تہ تیغ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا جس کا ایک حصہ
یہ ہے،

وَاللّٰهُ يُمِيتُ الْقُلُوبَ وَيَحْيِي الْمَوْتَى مِنْ جَمَاعٍ
هَؤُلَاءِ عَلَى بِلَاطِهِمْ وَتَفَرَّقُوا عَنْ حَقِّكُمْ فَعَمَّا كُنْتُمْ
وَمَرَحًا حِينَ مَرَرْتُمْ مَائِدِي يَوْمَ عَلِيٍّ عَلَيْكُمْ وَلَا تَغِيثُ
وَتَفَرَّقُوا وَلَا تَفَرَّقُونَ وَبَقِيَ اللَّهُ وَتَفَرَّقُوا فَإِذَا
أَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ كَيْفَ لِي فِي أَيَّامِ الْحَرْفِ قُلْتُمْ هَذَا
جَمَادُ الْقَيْطِ أَمْ هَذَا يُسَلِّمُ عَلَيْنَا الْحَرْفَ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ
بِالسَّيْرِ كَيْفَ لِي شَاءَ قُلْتُمْ هَذَا مَبَارَاةُ الْفَرِّ أَمْ هَذَا
يُسَلِّمُ عَلَيْنَا الْبَزْدَ فَكُلُّ هَذَا فِرَارٌ مِنَ الْحَرْفِ وَالْفَرِّ
فَإِذَا كُنْتُمْ مِنَ الْحَرْفِ وَالْفَرِّ تَفَرَّقُونَ فَأَنْتُمْ قَالْتُمْ
مِنَ السَّيْرِ أَفَرَّيَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا سَجَالَ جُلُومِ
الْأَطْعَالِ وَهَقُولُ لَهَا كَيْفَ النِّجَالُ كَوَدَّ ثَأْنِي لَمْ
أَهْ كُمْ وَكَيْدٌ أَعِيرَكُمْ مَغْفِرَةً.

اس خدا کی قسم جو دونوں کو مردہ کر دیتا ہے اور رنج کو کھینچ
لیتا ہے یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، کہ اہل شام تو باطل پر
جمع ہو گئے ہیں اور تم حق سے بچھڑ گئے ہو تمہارا ناس ہو اور
ذلیل و خوار ہو کہ تم تیروں کا نشانہ بن گئے ہو تمہیں تیر اندازی
ہوتی ہے تم پر حملہ کیا جاتا ہے مگر تم حملہ آور نہیں ہوتے
تم سے جہاد کیا جاتا ہے، تم جہاد نہیں کرتے جو نافرمانی کرتا
ہے تم اس کی نافرمانی پر خوش ہوتے ہو، میں لگ رہی میں تم
سے جہاد کا مطالبہ کرتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ یہ چلانی گری ہے اتنی جھلٹ
دیجئے کہ یہ گزر جائے اور جب موسم سرما میں جہاد کا تقاضا
کرتا ہوں تو تم کہتے ہو یہ تو پیلے کا چارٹہ ہے فراٹھہ چلے
یہ سردی گزر جائے دیجئے پس یہ سردی گری سے فرار ہے
اور جب تم سردی گری سے اتنے حواس باختہ ہو اور اس
کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تو خدا کی قسم تمہارے قوم کہیں زیادہ جہاد کر گئے اسے مرد نما مار دو پچوں جیسی عقل رکھنے والو اور پرتوں
جیسی بھور رکھنے والو کاش کہ میں نے تم کو دیکھا ہی نہ ہوتا، اور جانا ہی نہ ہوتا۔

پھر اسی خطبہ میں یہ بھی فرمایا۔

قَاتَلَكُمْ اللَّهُ لَقَدْ سَدَّ قُلُوبِي تَبَعًا وَشَبَّحْتُمْ مَدَى
حَيْضًا وَجَرَّ مَعْمُورِي تَغَبَّ التَّهَامِ الْفَاسَا فَا مَسَدُكُمْ
عَلَى تَرَابِي بِالْحَدِّ لَدُنَّ وَالْوُصْبَانِ حَتَّى قَالَتْ قُرَيْشٌ
إِنَّا ابْنُ أَبِي طَالِبٍ تَرَجَّلَ شُجَاعًا وَلَكِنْ لَا عِلْمَ لَهُ بِالْحَدِّ
لِللَّهِ أَبْزَكُمْ وَهَكَذَا أَحَلَّ أَشَدَّ لَهَا مِرَاسًا وَأَدْنَى فِيهَا
مَقَامًا مَرِي لَقَدْ خُصِّتْ فِيهَا وَمَا بَعَثْتُ الْعَشْرَةَ يَوْمَ
وَهَا أَنَا وَرَأَيْتُ عَلَى السَّبْتَيْنِ وَلَا وَلَكِي لَأَمْرًا أَيْ يَسْتَلِ
يُعَاظُ.

اللہ تمہیں ہلاک کرے تم نے میرا دل زخموں سے بھر دیا سینہ
خون سے لبریز کر دیا دمدم تم نے مجھے بھروسہ اور غبن
کے جرعہ پلائے میرا ساتھ چھوڑ کر میری نافرمانی کر کے تم نے
میرے تدمیروں کو تپلٹ اور برباد کر دیا اور قریش کو یہ کہنے
کا موقع دیا کہ ابن ابی طالب آدمی تو بہادر ہے مگر جنگ
کی اونچ نیچ اور اور دوا بیچ نہیں جانتا بخدا یہ غلط ہے کیا
کوئی ہے جو جنگ کا چھوڑے زیادہ ماہر ہو اور آزمودہ کاری
میں چھڑے بٹھا ہوا ہو۔ میری عمر بیس سال بھی نہیں ہوئی

تھی کہ میں عمارت میں کود پڑا تھا، اب تو میری عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر گئی لیکن جس کی بات ہی کوئی نہ مانے اس کی
راے ہی کیا،

ایک دوسرے خطبہ میں ارشاد فرمایا،

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ الْجَمِيْعَةُ اَبَدًا اَلْهَمُ الْمُتَخِلِّفَةُ اَهْوَاؤُهُمْ كَلَامُهُمْ
يُؤَدِّي السُّمَّةَ الْقَلْبَ وَفِيكُمْ يَلْعَبُ وَيَكْمُرُ اَدْعَاؤُكُمْ اَدْعَاؤُكُمْ
تَقْوَانُكُمْ فِي لُبَابِ كَيْفِيَّتِ وَكَيْفِيَّتِ فَاِذَا خَفَضَ اَلْقِيَالُ فَاَلْتَمَّ
حَيَاتِي مَا خَفَرْتُ دَعْوَتِي مَنْ دَعَاكُمْ وَلَدَ اسْتَرَامَ قَلْبُ
مَنْ قَامَاكُمْ اَعَالِيكُمْ يَا هَا لَيْلٍ وِدَاعِ دِي السَّيِّئِ
الْمَطْلُوعِ-

اے لوگو! جہاں خواہشوں میں گھسے ہوئے لوگو! باتیں تلاشی
کرتے ہو کہ چھتر موم ہو جائے اور تمہارا عمل ایسا ہے کہ
لوگ تم کو نرم چارہ سمجھ کر تم پر چھپٹ پڑیں مجلسوں میں
بڑے چرب لسان ہو لیکن جب جنگ کا موقع آتا ہے تو
ساری چوڑیاں بھول کر ہکا بکارہ جاتے ہو جس نے تم کو
اپنے زیر علم جمع کیا اس نے تم سے کوئی تقویت نہ پائی
اور جس نے تمہاری خاطر تکلیفیں اور معیبتیں اٹھائیں تم سے اس کے دل کو کوئی آرام و سکون نہ ملا قرمز اہوں کو ٹر خانے

کی طرح تمہارے پاس بھرے پہاڑ بہت ہیں،

دوسرے خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا۔

اَلْمَعْرُورُ وَاللَّهِ مَنْ خَفَرْتُ لَكُمْ وَمَنْ قَامَاكُمْ فَاِذَا
بِالسَّهْمِ الْبَاسِ وَمَنْ تَمَلَّيْكُمْ مَعِيَ مَا قُوِيَ فَاِذَا
اَفْتَحْتُ وَاللَّهِ لَدَا اَصْدَقُ قَوْلُكُمْ وَلَدَا اَطْمَعُ فِي نَهْمِكُمْ
وَمَا اَدْعَاؤُكُمْ اَدْعَاؤُكُمْ-

وہ دھوکہ کھایا ہو ہے جس کو تم نے دھوکہ دیا اور جس
نے تم کو پایا اس کے حصہ میں ایک ردی اور ناکارہ حصہ آیا
اور تم جس کے پاس پڑے اس کو لیے تیروں سے بلا پڑا
اور اُن کی قسم میری حالت ایسی ہو گئی ہے کہ نہ میں تمہاری بات کو
سچ سمجھتا ہوں نہ تمہاری مدد کی مجھے خواہش ہے اور نہ تمہارے ذریعہ میں دشمن کو مرعوب کر سکتا ہوں،

پھر ایک اور مرتبہ شامیوں کے بارے میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

اِنَّ كَلِمَةً لَقَدْ تَوَفَّقْتُ عَلَيْهَا كَلِمَةً اَمَّا فَبَيْنَكُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا
مِنَ الْاٰخِرَةِ عَرْمًا وَبِالَّذِي مِنَ الْعَزِيزِ خَلْقًا لَدَا اَدْعَاؤُكُمْ
اِلَى جِهَادٍ اَعْدَاؤُكُمْ قَاتِلَاتٍ اَعْيَنْكُمْ كَانَتْكُمْ مِنَ الْمَوْتِ
فِي عُسْرَةٍ وَمِنَ الزُّهْدِ فِي سُرُورَةٍ يَزِيحُ عَلَيْكُمْ حِجَابِي
فَتَعْلَمُونَ وَكَانَ قَوْلُكُمْ مَا دَسَّكُمْ فَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ
مَا اَنْتُمْ فِي مَنَعَةٍ تَحْتُمُّنَ اَللّٰبِي مَا اَنْتُمْ بِرُكْنٍ يُبَالِي بِكُمْ
وَلَا ذُو وَفَرَوْ حَزْرٍ يُفْتَمِرُ اِلَيْكُمْ مَا اَنْتُمْ اِلَّا كَابِلٍ مِّنْ
مُّعَاتِقًا فَاَنْتُمْ جَمِيعًا مِّنْ جَانِبٍ اَنْتُمْ شَرٌّ مِّنْ جَانِبٍ
اٰخِرُ وِبَسِّ لَعْنَةُ اللّٰهِ مَسْحُورًا اِلَى الْحَرْبِ اَنْتُمْ تَكَاوُنُ
وَلَا تَكْنِيْدُونَ وَتَقْفُ اَهْلَاؤُكُمْ وَلَا تَغْيِيْلُونَ وَلَا يَنَامُ
عَيْنُكُمْ وَاَنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ سَاهُونَ-

میں تم سے بہت دل تنگ ہو گئی میں نے تمہارا عتاب سن لیا
کیا تم آخرت کے برے میں دنیا کی زندگی سے خوش ہو گے
اور عزت کے عوض ذلت پسند کر لی جب میں تم کو تمہارے
ہی دشمنوں سے جہاد کے لئے بلاتا ہوں تو تمہاری آنکھیں
یوں چڑھ جاتی ہیں جیسے مرنے والے کی نزع کے وقت
یا بیہوشی کی حالت میں جان دینے والے کی طرح میرا جواب
تمہارے ذمہ ہے اور تم سرگشتہ ہو گئے ہو، گو یا تمہارے
دل سخت گھٹن میں ہیں اور تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم
عملہ کے وقت کی ایسی قوت ہو کہ سختی سے ڈٹ جاؤ نہ ایسے
سستوں ہو کہ تمہاری طرف میلان کیا جائے نہ ہی تم ذی عزت
و وقار ہو کہ کوئی کسی کی حاجت کی تم سے امید رکھے تم تو درحقیقت

ایسے ہستے ہوئے اونٹوں کی طرح ہو جیں گے چرواہے ہو گئے ہوں، ایک طرف سے اگر ان کو گھیر جائے تو دوسری طرف سے
نکل بھاگتے ہیں، اور اللہ کی قسم جو لڑائی بھڑکانے والا ہے اور تم پہ چالیں چل رہا ہے مگر تم کوئی چال اور دانہ نہیں

دیا۔ تو آپ نے ٹھنڈا سانس بھر کر ان سے کہا میں تم دو کا کیا کروں
پھر ان ملاؤں سے کہتا ہے،

هَذَا الَّذِي كُنْتُ مَعَهُ اَفْتَقِدُ حَيْثُ وَظَفَايَا حَيْثُ يَفْتَرِفُ
كَمَا عَيْتُمْ وَارْتَدَّ صَاحِبُ الْحَقِّ وَارْتَدَّ الَّذِينَ يَتَابِعُونَ عَزْوَدَهُ
عَلَى الْبَاطِلِ وَكَانَ هَلِكِي السَّوْمُ يَدُ اِيْمَانِي هَلِكُوْا وَلَكِنْ لَا
يُحْيِي لِيْلَهُ اَمَّا تَوَلَّوْا قَدْ سَمِعْتُمْ قَرِيبًا مِّنْ هَؤُلَاءِ
يَا كُوْنُ مِنْهُ فِي سَجْدَةِ الْوَلَدِ وَتَفْتَرِفُ بَيْنَ نَفْسٍ وَبَيْنَ اَمْرِ اَللّٰهِ
فَهَيَّا يَسْرِيْنَا فَيَكُنْ دَا اِمَامًا مَّسْمُومًا
بِعِدَّةٍ مِّنْ اَعْمَارِنَا مَا اَسْتَحْتَبْتُ
فَيَكُنْ مِنْهُمْ كَلْهَلًا وَدَعَا فَيَكُنْ هَلِكًا

ان لوگوں نے آپ کا ساتھ ایسی حالت میں چھوڑا کہ ان کی
عقیدت کے بھی دشمن تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ آپ کی
اطاعت فرض ہے اور وہ اطاعت کرنے کے صحیح مقدار
بھی ہیں اور آپ سے لڑنے والے ناحق جناب امیر مریض
عنه ان کی رکھوالی کرتے تھے گوان کو ان کی رکھوالی سے
کچھ نافرمان تھا اور ان میں سے ایک جماعت کو عین مسجد
کوڈ میں آپ کی تحقیر تو رہیں کرتے سنا گیا، اس وقت آپ
کے دروازے کے دونوں پٹ پکڑ کر تھپتھپا یہ شعر پڑھا۔
ہمارے محبوب کو بغیر کسی آزار کے گوارا و مرغوب ہو ہماری عزتیں اور جو کچھ وہ حلال جانے! پس آپ ان سے ناامید ہو گئے
اور ان کے لئے بد نما فرمائی!

ان تمام خطبوں اور ابن ملاؤں کی روایت سے ثابت ہوا کہ اس فرقہ کے حق میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شیعیت
کے دعویدار تھے آپ نے تاتلکملہ اللہ تعالیٰ کلمہ تھا جیسے کلمات فرمائے اور قسم کہا کہ فرمایا کہ ان سے کہے کہ کبھی سچ
نہ جائیگے،

جا بجا آپ کے حکم کی نافرمانی کرنے اور آپ کی بات نہ سننے کی شکایت کی بلکہ آپ تو ان کو دیکھنے یا ان کی بات
سننے تک سے بیزار تھے۔ ادھر وہ بھی اپنی عادت کے پکے تھے کہ ہمیشہ آپ سے دغا کرتے رہے رنج پہنچاتے اور
آپ کے دل میں خبیث و غضب پیدا کرنے کا سبب بننے رہے عین مسجد میں آپ کے پس پشت آپ کی شان میں بدگوئی
کرتے اور آپ کی تحقیر تو رہیں کرتے رہے ایک اور بات کا یہیں سے پتہ چلا کہ اس وقت کے سارے شیعہ بحر و دریا میں
کے اس بد اطواری اذلت و توہین میں شریک کار تھے، اب قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جب پہلی مبارک صدی کے پہلے
طبقہ کا یہ حال ہو جو ان کے نزدیک چھٹے ہوئے تیر اور چہیدہ بھول تھے تو پھر ان کے بعد والوں کا جو حال اور رویہ رہا ہوگا
اس کے افہام تک ہونے میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے،

تفسیر طبقہ اہل شیعہ اہل اسلام میں ہے اس جماعت کا ہے جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سید محتبی جگر
پارہ زہر اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو امام تسلیم کیا چالیس ہزار افراد نے موت پر بیعت کر کے جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ
کے خلاف جنگ و قتال پر آمادہ کیا اور کوفہ سے باہر نکال لائے مگر درپردہ یہ ناپاک پخت و پز کر چکے اور دل میں ٹھکان چکے
تھے کہ آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے، چنانچہ راستہ میں تنخواہ کی بابت جھگڑا اٹھا کہ آپ کو آزدہ خاطر کیا اور بدزبانی اور بد عملی
اور بے ادبی سے پیش آئے، یہاں تک کہ حقائق جو بڑا احماتی بنا چھڑتا تھا اور اپنے آپ کو شیعیانِ اولیٰ میں گنتا تھا آپ
کے قدم مبارک کے نیچے سے مصلیٰ کھینچ کر لے گیا۔ ایک دوسرے لعین نے آپ کے قدم مبارک پر کدال دھبی کوئی چیز اٹھا
ماری اور جب غربت لڑائی اور مقابلے کی آئی تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف جھک گئے اور آپ کی مدد سے کنارہ کش ہو کر

دنیا و آخرت کی برہادی اپنے لئے مولیٰ، حالانکہ دعویٰ یہ تھا کہ ہم آپ کے اور جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شیعوں میں سے ہیں اور مذہب شیعہ انہی کا نکالہا ہوا ہے اور اس کی بنیاد انہیں نے رکھی ہے

سید مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں اس جماعت کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، جہاں کہ اس نے امام من رضی اللہ عنہ کا جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینے اور خلافت سے دست برداری کا غلط بھی بیان کیا ہے،

کتاب الفصول الامیہ میں لکھا ہے کہ اس لشکر خدا کے روساء حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے خفیہ خط و کتابت کا رابطہ رکھے ہوئے تھے، ان کو تاکید لکھتے اور دروغ لگاتے کہ آپ جلد کارروائی کر دیں تاکہ ہم امام کو آپ کے حوالہ کر دیں اور یوں دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی چند ملکوں کے عوامین خرید سکیں، بلکہ ان میں سے بعض تو اپنے دل میں یہ ناپاک ارادہ چھپائے بیٹھے تھے کہ موقع پائیں اور امام کو دھوکے سے قتل کر ڈالیں۔

ادھر امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو ان غداروں اور مفسدوں کے فاسد ارادوں کی ثبوت کے ساتھ یقینی اطلاعات اور خبریں مل چکی تھی اسی لئے انہوں نے مصالحت پر گردن خم کی اور خلافت سے مجبوراً دست برداری اختیار کر لی۔

یہ کتاب فصول کی عبارت کا صحیح خلاصہ اور لب لباب ہے جو امامیہ کی معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے،

جو تھا طبقہ اول اسلاف شیعہ میں سے ان کثیر القعداد کو فیوں کا ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور خاتون جنت فاطمہ البتول رضی اللہ عنہا کے جگر پارے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو امراد بھری عریضیاں اور غلوس، بھرے خط بھیجا ان سے دغا بازی کی چال چلی اول آپ کو مجبور کیا کہ دارالامن حرم نبوی کو چھوڑ کر کوفہ روانہ ہوں اور جب آل جناب کوفہ کے نزدیک پہنچے اور دشمنوں سے مقابلے اور مقاتلے کی نوبت آئی۔ اور صدق اعلیٰ کے امتحان کا وقت آیا تو ان سب نے آپ کو دغا دی اور دشمنوں کی کثرت کے باوجود امام مظلوم کی مدد و نصرت سے بڑی دھڑائی کے ساتھ ہاتھ کھینچ لیا بلکہ ان میں سے کچھ تو آپ کے دشمنوں کے ساتھ ڈر بالا پر کسب مالے۔ اور جناب امام اور آپ کے رفقاء کی شہادت کا سبب بنے اور کربلا میں کچھ پیش آیا یہ سب کچھ اسی فرقہ کی بے وفائی اور دغا بازی کی وجہ سے پیش آیا۔

پانچواں طبقہ دوم اسلاف شیعہ میں سے ان لوگوں کا ہے جنہوں نے مختار ثقفی کے عراق وغیرہ پر اقتدار قائم کر لینے کے بعد امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سے مختار کی موافقت کی خاطر منہ پھیر کر جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلمہ پڑھا اور انہیں کو امام تسلیم کیا حالانکہ یہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب و نسل سے تعلق رکھتے تھے نہ ان کی امامت کی کوئی وجہ و جواز تھی چنانچہ ان اسلاف شیعہ کا پورا حال پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آخر آخر تو یہ دین ہی سے پھر کر بے دین ہو گئے تھے کیونکہ یہ مختار کی نبوت اور اس کے پاس وحی آنے کے قائل ہو گئے تھے

چھٹا طبقہ سوم ان کے اسلاف میں سے ان لوگوں کا ہے جنہوں نے پہلے تو دوسرے وعید کر کے حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کو مقابلہ میں لکھنے کے لئے مجبور کیا اور ان کا ساتھ دیا مگر جب نوبت دوبارہ مقابلہ اور مقاتلہ کی آئی تو ان کی امامت سے انکار کر کے کوفہ میں جا گئے۔

اور بہانہ یہ گھڑا کہ یہ حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم پر تبرائیں نہیں کرتے اس طرح حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح اس امام زادے کو دشمنوں کے پنجے میں دبا اور یوں وہ شہید ہوئے اور حضرت امام حسین کا واقعہ تازہ ہوا

اگر وہ امام نہ تھے تو امام زادہ ہونے میں تو ان کے کوئی شک نہ تھا اور خلفاء پہلے بڑا کرتا اتنا بڑا جہم تھا کہ ان کو موت کے جبڑے میں دیدیا۔

ائمہ کی صحیح روایات جو بفضل کاشی کے حوالہ سے پہلے گزر چکی ہیں کہ خلفاء کی شان میں بدگوئی کرنا جنت میں جانے کے لئے کوئی مزدوری نہیں، اگر وہ امام محمد بن الحنفیہ کی امامت کے تائیل نہ تھے تو دائرہ ایمان سے تو خارج نہیں ہوئے تھے یہ بھی انہیں کی روایات سے معلوم ہوا ہے،

ان سب باتوں کے باوجود آخر وہ مظلوم تھے پھر اہل بیت کے دشمنوں کے حوالے کر دینے کی آخر تک کیا تھی۔ حالانکہ قدرت ہوتے ہوئے ایسے مظلوم کافر کی اعانت خصوصاً جب کہ وہ کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہو فرض قطعی ہے، ساتواں طبقہ ان کے اسلاف میں ان لوگوں کا ہے جو خود تو ائمہ کی صحبت و شاگردی کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر ائمہ ان کو کافر ٹھہراتے اور چھوٹا اور بھونٹا کہتے ہیں۔ اگر ہم ان کو نام بنام گنائیں اور ائمہ نے ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا یا کتب امامیہ ہی سے اس کو نقل کون بڑا لمبا چوڑا دفتر اور ایک طول طویل کتاب چاہیے لیکن مطابق اصول مادیدہ کہ لا یتزکی یعنی جو چیز پوری کی پوری ساسل نہ کی جائے تو اس کو بالکل چھوڑا بھی نہ جائے ہم ان بزرگواروں کے نفسا ئل و مناسبات کو بھونٹنا ضروری جان کر ان کی خدمت انجام دیتے ہیں،

دفعہ رہنا چاہیے کہ شیعیت اور خصوصاً مذہب امامیہ کا دار و مدار اس جماعت پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ایسا جسم جس میں لمبائی چوڑائی اور موٹاپا پایا جائے۔ مانجی ہے، مثلاً ہشام بن، شیطان الطاق، اور ہیشی ان کا یہ عقیدہ مشہور شیعہ مصنف کلینی کی کتاب کافی میں مذکور ہے جس سے انکار کی کسی کو مجال نہیں،

پھر ان میں سے ہشام بن حکم اور شیطان الطاق نے اللہ تعالیٰ کے لئے صورت بھی ثابت کی ہے اور بعض نے ناف تک کا حصہ پولا اور کھوکھلا مانا ہے اور اس سے نیچے کا حصہ ٹھوس اور موٹا تصور کیا ہے جیسے ہشام بن سالم اور صفیٰ اور زرارہ بن اعین، سلیمان جعفری اور محمد بن اسم وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کو ازل میں جا بل مانا ہے، ان میں سے اکثر نے اللہ تعالیٰ کے لئے مکان اور جہت بھی ثابت و تسلیم کی ہے،

ان کے پیشواؤں میں بعض محدوبے دین بھی ہوئے ہیں جیسے دیکھ لجن شاعر اور اس کے مثل جو صانع، انبیاء اور بہشت کسی کے بھی تائیل نہیں،

ان میں سے بعض نصرانی بھی تھے جنہوں نے اپنی قومی وضع، قطع، طرز بود و باش اور لباس معاشرت کو بالکل نہیں بدلا اور انہیں میں ان کا حشر ہوا جیسے زکریا بن ابراہیم نصرانی جس سے ان کے شیخ الطائف ابو جعفر طوسی نے کتاب تنزیہ میں روایت کی ہے، اور اس کی جماعت اسلاف شیعہ میں گزری ہے جس کے بارے میں امام صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، یزدی عتاً الذ کا ذنب و کفتری علیتنا اھل البیت (یہ لوگ ہم سے جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں اور اہل بیت پر افتراء مائدہ دیتے ہیں، مثلاً بنان جس کی کفایت ابو احمد ہے، ان میں سے ایک گروہ شیعہ ایسا بھی گزرا ہے جن کے سے عقائد رکھنے سے حضرات ائمہ نے لوگوں کو ڈر دیا ہے اور ان شیعوں کی احادیث و آثار کے راوی اور نقل بھی یہی لوگ ہیں جن کے عقائد سے ائمہ نے ڈر دیا ہے،

ساری انکذبت عن ابراہیم بن محمد بن الحنفیہ عن ابراہیم بن محمد بن الحنفیہ عن ابراہیم بن محمد بن حسین سے روایت کی گئی ہے ابراہیم بن محمد بن الحنفیہ عن ابراہیم بن محمد بن الحنفیہ عن ابراہیم بن محمد بن حسین سے روایت کی گئی ہے

وَمُحَمَّدٌ بْنُ الْحُسَيْنِ قَالَا دَخَلْنَا عَلَى أَبِي الْحَسَنِ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقُلْنَا إِنَّ هِشَامَ بْنَ سَالِحٍ وَمَيْمُونُ وَمُصَاحِبُ الطَّاقِ يَقُولُونَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَخْرَفَ إِلَى السُّرَّةِ وَالْبَاقِي صَدَقَ فَخَرَّ اللَّهُ سَاجِدًا إِنَّهُ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا عَرَفُوهُ وَلَا وَحَدُّ وَرِكَ فَمِنْ أَجْلِ ذَالِكَ وَصَفَوْكَ

کہ یہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم ابی الحسن رضا کے پاس گئے اور آپ سے کہا کہ ہشام بن سالم مینعی اور صاحب الطاق کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ناف تک کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس تو آپ یہ سنتے ہی سجدے میں گر گئے اور فرمایا اے اللہ تو پاک ہے تجھ کو انہوں نے نہ پہچانا نہ واحد جانا اسی لئے تیرے بارے میں ایسی باتیں بنائیں،

اور اسی جماعت کو نیز زہراہ بن العین کو حضرت صادق نے خبر دے دی اور فرمایا اخذہم اللہ، واللہ ان کو ذلیل کرے، اس کی تفصیل انشاء اللہ اپنے مقام پر آئیگی۔

اور کلینی نے علی بن حمزہ سے یہ بھی روایت بیان کی ہے،

قَالَ ثُلُثُ رَدِّ عَلَى عَبْدِ اللَّهِ السَّلَامُ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ الْحَكَمِ يَرْوِي عَنْكَ أَنَّ اللَّهَ جَسَمٌ مَبْنِيٌّ لِي نُورِي مَعْرُوفَةً مُرَوَّرِي يَتَمَنَّي بِهَا عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَقَالَ سُبْحَانَ مَنْ لَا يَلْمُهُ أَحَدٌ كَيْفَ هُوَ (أَدَّاهُ لَكِنَّ كَيْفَ هُوَ) كَيْفَ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ لَا يَحُدُّ وَلَا يَحُسُّ وَلَا يَحِيطُ بِهِ شَيْءٌ وَلَا مُزْمَعٌ وَلَا تَحْطِيطُ وَلَا تَحْدِيدُ

کہ میں نے ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ سے کہا کہ میں نے ہشام بن حکم کو آپ کے حوالہ سے روایت بیان کرتے سنا کہ اللہ تعالیٰ ایک ٹھوس نور کا جسم ہے جس کا پہچانا ضروری ہے اپنے جس بندہ پر چاہتا ہے پہچان کر اگر اس کے ساتھ احسان کرتا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا پاک ہے وہ جس کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسا ہے نہ اس کو کوئی چیز گھیرتی ہے نہ جسم ہے نہ صورت نہ خطوط میں گھر سکتا ہے نہ بندہ میں،

ان کے اسلاف میں سے کچھ نواسیہ ہیں جو حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کی موت کے منکر ہیں، وہ آپ کو مہدی موعود جانتے ہیں۔ باقی ائمہ امامت سے انکار کرتے ہیں، ان کے اکثر راوی واقفینہ ہیں جن کے نام ان کی اسماء الرجال میں جا بجا اس حوالہ سے ملتے ہیں کہ فلاں فلاں واقفینہ ہیں،

یہ دونوں فرتے دناوسیہ و واقفینہ ائمہ کی تعداد اور تعیین کو نہیں مانتے جیسا کہ کتاب ہذا کے باب اول میں مذکور ہوا، اس کے برخلاف شیعہ منکر امامت کو منکر نبوت مانتے ہیں تو یہ دونوں فرقے بھی شیعوں کے نزدیک منکر نبوت ہوئے، اس کے باوجود دونوں فرقوں سے بے دھڑک اپنی جہان میں بہت سی روایات دہج کی ہیں، حالانکہ یہ دونوں فرقے خود بھی ان ائمہ سے روایت بیان کرتے ہیں اس طرح الکلا مجرط صاف کھل گیا۔

ان کے اسلاف میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے امام وقت کو ہی نہیں پہچانا اور ساری تردد و حیلان میں رہے چنانچہ یہ وعیدان پر صادق آئی مَنْ نَمَاتَ وَكَلَّ يَحْرُفُ إِمَامٌ بِنِي مَا يَدُ مَاتَ مَيِّتَةً جَاهِلِيَّةً جو امام زمانہ کو پہچانے بغیر مر گیا، وہ باہریت کی موت مرا، ایسے لوگوں میں حسن بن ساعہ بنی فضائل اور عمر بن سعید اور انہیں جیسے اور ان کے راویان حدیث بھی (امامیہ) جارود یہ سے بھی اپنی صحاح میں روایات لاتے ہیں حالانکہ ان کا مذہب معلوم ہو ہی چکا۔

ان کے بعض اسلاف نے کورا جھوٹ گھڑا اور پھر اسی پر جیسے رہے مثلاً ابن عمیر ابن معمر اور نصیر بن معمر، بعض وہ ہیں جنہوں نے امام صادق رحمہ اللہ علیہ کو اپنی مسجد سے نکال دیا اور پھر اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی۔ جیسے ابن مکان!

ان میں کا ابو بصیر وہ ہے جس نے اپنی دروغ گوئی کا خود انفراد اعتراف کیا ہے، ان میں سے داہم بن حکم، ربیع بن صلت، ابن ہلال جہی زرارہ، اور ابن سالم کا تعلق فرقہ بدایہ غایہ سے ہے اس عقیدہ کے یہ لوگ جمہور شیعہ کے نزدیک مذہباً بدترین اور باطل ترین ہیں (اس کے باوجود اسلاف میں شمار ہیں، ان اسلاف میں ایسے بھی ہیں، جو باہم ایک دوسرے کی تکذیب کرتے اور ایک دوسرے کی روایات کو غلط ثابت کرتے ہیں، مثل ہشام بن صاحب طلق اور میثمی۔

ان کے روایات احادیث و آثار میں سے ایک ابن عباس بھی ہے جس کو انہوں نے اپنے رجال میں کذاب ٹیک لکھا ہے اور ائمہ سے اس کے بارے میں ایسی روایات بیان کی ہیں جس میں اس کو جھوٹا کہا گیا ہے (پھر بھی اس سے روایات قبول کرتے ہیں)

ان کے متقدمین میں سے ابن بابویہ صاحب رقعہ مزورہ اور متاخرین میں سے شریف رضی بھی مسیدہ کذاب کی صیغہ یادگار ہیں۔

مذکورہ بلاد عودوں کے دلائل آئندہ باب میں ان ہی کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے بیان کے جائیں گے، اس کے علاوہ ان کے وہ علماء جو کتب سماء الرجال اور اپنے اسلاف کے حالات سے پوری واقفیت رکھتے ہیں ان کے لئے ممکن نہیں کہ اس سے انکار کر سکیں۔ اگر کوئی جاہل یہاں شک و تردد بھی کرے تو اس کا کوئی گلہ بھی نہیں کہ انشاء اللہ اس کا شک و تردد بھی آئندہ دور ہو جائے گا،

یہاں ایک بڑا عمدہ نکتہ جو انتہائی توجہ طلب ہے یہ ہے کہ شیعوں کے جملہ فرقوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے علوم اہل بیت ہی سے حاصل کئے ہیں، ان میں ہر ایک کسی امام زادے سے اپنی نسبت اور تعلق جوڑتا ہے اور انہیں سے اپنی نسبت تعلق جوڑتا ہے اور لڑتی ہے اپنے مذہب کے اصول و فروع کی روایات قیاسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ناقابل تردید ہے کہ یہ سب فرقے باہم ایک دوسرے کو جھٹلانے گمراہ بتانے اور کافر قرار دینے میں بھی مشغول و مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ اصول فقائد خصوصاً امامت کے بارے میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں ان کے اس باہم اختلاف و نزاع سے عقلمند اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ سب جھوٹے ہیں اس لئے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک ہی گھر سے یہ سب مختلف و متناقض تو جہات و روایات بیان کی جائیں اگر اہل خانہ میں کسی ایک کو صدق میں ترجیح دیں گے تو بعض دوسرے اہل خانہ کی تکذیب لازم آئے گی اور ان پر غلط گوئی اور مخلوق خدا کو گمراہ کرنے کا الزام آئے گا اور یہ بات نص قرآنی کے خلاف تو ہے ہی واقعہ کے بھی خلاف ہوگی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُتُبَكُمْ تَطْهِيراً اُدبے شک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اسے اہل بیت وہ تمکو ہمہ قسم برائے سے ایسا پاک کر دے جو پاک کر دینے کا حق ہے،

پھر تاریخ سے بھی گواہی اس کی ملتی ہے کہ اہل بیت کے بزرگ خصوصاً دیگر بندگان خدا میں سب سے بڑے

کے متبع اور پیرو تھے اس کا کوئی امکان ہی نہیں کہ وہ اپنی ریاست و سیاست کی خاطر جھوٹ بر لیں یا لوگوں کو دھوکہ اور فریب دیں، لا محالہ اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل بیت رحمہم اللہ ان روایات و حکایات سے بری الذمہ بھی ہیں اور بے خبر بھی اور ان مختلف فرقوں نے جس طرح مذہب تراشے اسی طرح اس کی اس تائید اور مخالف کی تردید میں حکایت و روایات بھی گھڑ لیں، جبکی نہ کوئی اصل ہے نہ بنیاد، اور جن کا مذہب جعلی ہو اس کو اس جعل سازی کے لئے صحیح روایات کہاں سے میسر آ سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَكَذَٰلِكَ مِّنْ عِندِ اللَّهِ وَعِندِ النَّبِيِّينَ اخْتِلَافٌ ۚ لَّكِن بَعْضُ الْاَشْيَاءِ اَكْثَرُ حَقًّا ۚ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نازل کردہ ہوتا تو البتہ وہ اس میں بہت اختلاف پارتے (معلوم ہوا کہ کلام الہی کی طرح دین و مذہب کے اصول بھی خدا کی طرف سے اس کے رسول ہی متعین و بیان کرتے ہیں اس لئے اس کے اصول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا، دین و مذہب کے اصول میں اختلافات و تضادات بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ دین باطل اور مذہب جعلی ہے)

اب رہا اہل سنت کا باہم اختلاف۔ تو اول تو یہ اختلاف اجتہادی ہے کہ انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے در سے لے کر فقہاء کے زمانہ تک سب کو مجتہد تسلیم کیا ہے اور مجتہد کو اپنی رائے پر عمل کا اختیار ہوتا ہے اور وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتا ہے، اور اجتہاد و آراء کا اختلاف نوع انسانی کی فطری بات ہے روایات کا اختلاف نہیں کہتے جس سے چھوٹ اور افراد کا ثبوت ہو،

دوسرے عقائد اہل سنت کا جو بھی باہم اختلاف ہے وہ فروعیات فقہیہ میں ہے، اصول عقائد میں نہیں اور فروعی اختلاف جو اجتہاد کا نتیجہ ہوتا ہے بطلان مذہب کی دلیل نہیں بن سکتا جس طرح مجتہدین امامیہ آپس میں فروع میں مختلف ہیں کہ شلّا شراب پاک ہے یا ناپاک یا عرق گلاب سے وضو جائز ہے یا نہیں، اب اس کے مقابلہ میں اہل بیت کے اختلاف کچھ جو شیعہ علوم کے دائرہ میں یہ بحث کو اجمالی طور پر باب اول میں گزر چکی ہے مگر تفصیل کی بات ہی کچھ اور ہے،

شیعی فرقوں میں غالی فرقہ تمام فرقوں کا سر تاج ہے اور خلافت دراصل عبداللہ بن سبا کے شاگرد ہیں، جو خود کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خاص الحافض شاگرد اور آپ کا محرم راز کہتا تھا، اور مختاریہ و کیسانیہ حضرت علی حضرت حسنین محمد بن علی اور ابو ہاشم بن محمد بن علی۔ رضوان اللہ علیہم کی روایات سے اپنے مذہب کو متعین کرتے ہیں۔ زید یہ :- حضرت علی، حضرت حسنین، امام زین العابدین، زید بن علی بن یحییٰ اور یحییٰ بن زید رضی اللہ عنہم سے،

باقریہ :- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر امام باقر رحمہ اللہ علیہ تک، پانچ اماموں سے،
نادسیر :- چھ آئمہ سے، پانچ تو اوپر والے اور چھٹے امام صادق رحمۃ اللہ علیہ،

مبارکباد سات سے چھ اوپر ولے ساتویں اسمعیل بن جعفر رحمۃ اللہ علیہ،
قرامطہ ہاٹ سے؛ سات مذکورہ بالا اور آٹھویں محمد بن اسمعیل رحمۃ اللہ علیہ۔
شمطیکہ؛ بارہ سے؛ آٹھ مذکورہ بالا اور چارہ محمد بن جعفر، موسیٰ بن جعفر عبداللہ بن جعفر،
مہدویہ۔ بائیس سے؛ ان کے نام باب اول میں بیان ہو چکے ہیں۔

اور یہ لوگ مصر اور دیار مغرب کے بادشاہوں کو جو محمد مہدی کی اولاد میں سے تھے۔ امام ملتے ہیں اور ان
کی عصمت اور ان کے علم محیط کے معتقد ہیں، چنانچہ ابو محمد نجم الدین عمارہ بن علی بن زبیر الزجی، مشہور شاعر اپنے قصیدہ
میں جو اس نے فائز بن نافر اور اس کے وزیر کی تعریف میں لکھا کہتا ہے،
أَفْشَتْ بِالْفَائِزِ الْمُعْصُومِ مُعْتَقِدًا كَوْنَهُ الْخَلِيفَةَ وَأَجْرًا لِّبَنِي الْقِسْمِ وَرَيْنَ فَائِزٍ مُعْصُومٍ كِي قِسْمِ اس اعتقاد کے
کے ساتھ لکھتا ہوں کہ میری قسم کامیابی اور سچائی کا اجر رکھتی ہے،
اور پھر یہ بادشاہ خود بھی اپنے متعلق معصوم ہونے اور علم غیب اور دیگر حقیقی علوم مثلاً کیمیا و سیمیا وغیرہ کے حامل
ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے چنانچہ مصر و دیار مغرب کی تواریخ اس پر گواہ ہیں۔
نزار یہ۔ اپنے مذہب کی روایت اشارہ حضرات سے کرتا ہے جن میں پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور
آخری مستصر۔

امامیہ۔ بارہ سے؛ اول ان میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آخر میں امام محمد مہدی۔
امامیہ کے معتقدات کی اگر کچھ اصلیت ہوتی تو حضرت یحییٰ بن علی رحمۃ اللہ علیہ سب کے رو برو احوال پر غنیمت ناک
ہو کر شدت سے اس کی برائی کیوں کرتے اور اس کو اپنی مجلس سے کیوں نکالتے یہی حال دوسرے فرقوں کے معتقدات
کا بھی سمجھنا چاہیے،
ان تمام فرقوں کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ ان سب نے اپنے لئے کتابیں اور دفتر کے دفتر تیار
کئے، اور ان میں علماء و فضلاء اہل زبان اور صاحب تصنیف سب ہی گزرے مگر اس ملک میں صرف امامیہ ہی کی کتب
نظر آتی ہیں، اور دوسروں کی کیا بلکہ نادر الوجود ہیں،
بہر حال ان فرقوں کے علماء کا حال علماء امامیہ کے حال سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سب کے سب ایک ہی شجر
کے شر اور شاخیں ہیں،

علمائے امامیہ اور ان کے راویان حدیث کی حقیقت ابھی معلوم ہو چکی، کہ بعض تو انہی سے متکبر کہاتے تھے جن
کی شکایت جناب امیر رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں، بعض مذہب و دیانت میں خراب اور مجسمہ و مشبہ
ہیں بعض ضعیف اور نامعلوم الحال جھوٹے اور جھلسا رہے ہیں۔ اور بعض وہ جن کی جرح و تعدیل میں یہ خود مختلف
انہی ہیں اور ان کے بارے میں کسی جانب کو ترجیح نہ دے سکے۔

بعض ان میں صرف خطوط اور رقعات کے راوی ہیں جنکی صحت پر کوئی اعتقاد اور بھروسہ نہیں کیا جاسکتا نیز کہ
ایک تحریر کو دوسری تحریر سے ملا دینا اس فن کے ماہرین کے بانیں ہاتھ کا کھیل ہے خصوصاً امام غائب کا خط و رقم
بنالینا، جن کا نہ کسی کو حال معلوم اور نہ کسی نے دیکھا بھالا۔

ان میں سے بعض ایسا کرتے ہیں کہ ایک پرچہ پر کوئی سوال لکھ کر رات کے وقت کسی درخت کے سوراخ میں رکھ آتے، اور صبح اسی پرچہ کو نکال لاتے اور شیعوں کو سناتے اور کہتے کہ اس رقعہ کے بین السطور میں لکھا جواب امام کے ہاتھ کا ہے اور امامیہ آنکھ بند کر کے اس پر یقین کر لیتے،

شیعی علماء اور اب ہم ہر فرقے کے عالموں اور ان کی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جو زیر نظر کتاب کے اہم مسائل ان کی کتاب میں سے ہے، اس غرض سے کہ اگر کوئی عبارت کسی کتاب سے یا کسی عالم کے حوالہ سے نقل کی جائے تو سامع اور ناظر کو بھی معلوم رہے کہ یہ کتاب یا یہ عالم کس فرقے سے متعلق ہے اور شیعوں کے نزدیک اس کا کیا مرتبہ ہے، یا اس کا قول اور اس کی روایت قابل اعتبار ہے یا نہیں،

خلاۃ ان کا سب سے پہلا عالم عبداللہ بن سبا ہے اس کے بعد ابو کا میل اور مغیرہ جلی ہیں امام جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ نے ان دونوں سے نفرت ظاہر فرمائی اور ان کو جھوٹا قرار دیا اور فرمایا، اَنَّهُمَا يَفْتَرِيَانِ عَلَيْنَا اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُرْوِيَانَا عَنْ اَهْلِ كَاذِبِيهِ دُونِ اَهْلِ بَيْتِ اَهْلِ بَيْتِ پر افتراء کرتے اور ہم سے جھوٹی روایات منسوب کرتے ہیں،

نصیر اسماعیل غبار رام مغفیل مرقی صریح بزیغ اور محمد بن یعفور بھی خلاۃ کے علماء ہیں سے ہیں، ان کا سارا کلام لغو و بیہودہ نہ کہنے کے لائق نہ سننے کے قابل،

کیا نتیجہ ۱۔ ان کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا عالم خود کیسان ہے، جو خود کو جناب محمد بن علی رحمہ اللہ علیہ کا شاگرد کہتا تھا، اس کے بعد ابو کریم فرزند اسماعیل بن عمرو اور عبداللہ بن حرب اور ان کے علاوہ دوسرے تھے۔

زید یہ ۱۔ ان کا سب سے بڑا عالم یحییٰ بن زید ہے اور دوسرے زید بن علی کے دوست ان کی زلیخہ تھے روایات حضرت علی جناب حسنین امام سجاد اور خود زید شہید رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ان کے اثر میں سے ایک نام صحیح ہے جس کا یہ مذہب مشہور ہے کہ پاؤں کا مسح بھی کرنا چاہیے اور دھونا بھی چاہیے، ان کے کبار علماء میں ہادی ہے جس نے مشنہ کے بعد اس مذہب کو رواج دیا اس کا بیٹا مرتضیٰ بھی ان کے بڑے عالموں میں شمار ہوتا ہے، یہ دونوں سادات حسینی سے تعلق رکھتے ہیں خود کو خالص زید یہ کہتے تھے، کیونکہ غیر خالص زیدیوں کی ایک اور جماعت بھی ہے جو اپنے آپ کو زید یہ کہتے ہیں حالانکہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے ان کے علماء یہ ہیں،

جارود بن احمد بن محمد بن سعید سیبی ہمدانی، ابن عقده، سیمان، تبرقوی، خلف بن عبداللہ، نعیم ابن الیمان یعقوب، حسین بن صالح اور اخطب خوارزمی صاحب مناقب امیر المومنین بھی زیدی ہیں،

زید یہ غیر خالص میں سے سوائے چند مسائل کے شواہد است صاحب الکبیرہ کا فر نعمت فاسق کے اصول میں معتزلہ کے پیرو ہیں اور فروع میں جناب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان میں سے بعض فروع میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی کرتے ہیں سوائے چند مسائل میں اختلاف کے شواہد موزوں پر مسیح کا انکار کرتے ہیں،

اسماعیل علیہ ۱۔ ان کے علماء یہ ہیں، مبارک، عبداللہ ابن میمون قداح، غیاث مصنف کتاب البیان محمد بن علی برقی اور مقفی،

مہدویہ ۱۔ یہ اسماعیلیہ ہی میں سے ہیں۔ ابتداء میں ان کے ہاں نہ کوئی عالم تھا نہ کتاب کیونکہ ان

کا سرگرد محمد بن عبداللہ جو مہدی کے لقب سے مشہور تھا، اکثر عراقی، حجازی، مصری اور شامی اس کی شرافت و سیادت کے منکر تھے، اور اس کی ہمراہی میں شورش پسند اور سپاہی پیشہ اور اکھڑ لوگوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ عزیز جو اس کی اولاد میں سے تھا خلافت تک پہنچا ایک جمعہ کو خطبہ دینے منبر پر چڑھا تو وہاں ایک رقعہ رکھا ہوا پایا جس میں یہ اشعار لکھے ہوئے تھے،

اِنَّا سَبَعْنَا نَسَبًا مُنْكَرًا
رَانِ كُنْتُ فِيمَا تَدَّحَى صَادِقًا
رَانِ تَرِدُ تَقْقِيْقَ مَا قُلْتَلْنٰ
اَوْ لَادَعِ اَلْاَنْسَابِ مُسْتَوْرًا
فَاِنَّ اَنْسَابَ بَنِي هَاشِمٍ
يَقْصُرُ عَنْهَا كَلِمَةُ الطَّامِعِ

جامع مجد کے منبر پر ہم نے ایک غیر مشہور لقب کا ذکر ہوتے سنا۔ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ذرا اپنے چوتھے باپ سے اوپر کے پانچویں باپ کے نام تو بتا اگر تم اپنی بات کو مؤثر بنانا چاہتے ہو تو یا تو ہمارے سامنے اپنے نسب کو چھپتے سورج کی روشنی کی طرح صاف بیان کر دیا اس کو اسی طرح چھپا رہنے دو اور ہمارے ساتھ کھلے اور وسیع نسب میں شامل ہو جاؤ کیونکہ بنو ہاشم کے نسبوں میں شرکت کی طمع رکھنے والا اپنی طمع کرنے سے تاسر رہ جاتا ہے،

ان اشعار میں طالع کے لفظ سے اشارہ عباسی خلیفہ طالع مابعد کی طرف ہے جو اس زمانہ میں بغداد کے اور دیگر اسلامی شہروں کا خلیفہ تھا۔ یہ واقعہ اسی کے عہد میں پیش آیا تھا، اور اس کا نسب شہرت میں اتنا واضح تھا، جیسا پہرہ چڑھے کا سورج۔

اور فاذکر آباء بعد الدب التراب، جو کہا ہے وہ اس لئے کہ طالع کا چچو تھا باپ مہدی کا بھی باپ تھا اور اس کا نام عبید اللہ بن عبداللہ تھا اس لئے ان کو عبیدین بھی کہتے ہیں۔

جب مہدی کے دماغ میں یہ خناس سما یا کہ وہ مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ اس وقت تک ممکن نہیں تھا۔ جب تک اس کے باپ کا نام نہ ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا تھا، یعنی عبداللہ اور مہدی کے باپ کا نام عبید اللہ تھا، اس لئے اس نے اپنے دلا کو باپ بنایا اور باپ کو دادا اور یوں اس نے سائے مہدی بن عبید اللہ کے اپنا نسب یوں چلایا مہدی بن عبداللہ بن عبید اللہ بن القاسم بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق جب دیا مصر میں ان کا اقتدار مستحکم ہوا اور عرصہ اقتدار طویل ہوا تو نوکر یوں اور عہدوں کے لالچ میں لوگ ان کے مذہب کے حلقہ گروش ہونے لگے۔ تو ان میں بھی علماء فضل اور ارباب پیدا ہوئے دیادہ بھی ملازمت یا قدرتی کے خیال سے مذہب بدل کر ان میں شامل ہو گئے چنانچہ ان کے چوٹی کے ملا میں ابوالحسن علی بن نعمان اور ابو عبداللہ محمد بن نعمان تھے جو معزز اور عزیز کے زمانہ میں گزرے ہیں پھر ابوالقاسم مشہور ہوئے یہ عبدالعزیز حاکم کے زمانہ میں ہوئے اور عامر بن عبداللہ رواجی اور علی بن محمد بن علی صلیبی مستنصر کے دور میں!

جن لوگوں نے مال و جاہ کی طمع میں ان کا مذہب قبول کیا ان میں فقیہ عمارہ یعنی ہے کہ عبیدین کے پورے

عہد سلطنت میں اس کا کوئی مثل پیدا نہیں ہوا علم و فضل میں یہ بہت بلند پایہ تھا اس لئے جب اس نے مذہب تبدیل کر لیا تو اس کے بے شمار پیرو اور شاگردوں کی ایک بڑی جماعت بھی گمراہ ہو گئی اور اس پر یہ مثل صادق آئی،

أَنَّى الْفَقِيهَةُ إِذَا غَوَى وَالْطَّاعَةُ
مِثْلُ الشَّيْئَةِ إِذَا هَوَتْ فِي تَجْبَةٍ
قَوْمٌ غَوَوْا مَعَهُ قَضَاهُ وَحِينَا
عَرَفَتْ وَلِيَعْرِفَ مَا هَذَا كَجِينَا

بے شک جب ایک عالم فقیہ گمراہ ہو جائے جس کی ایک قوم پیروی کرتی ہو تو وہ قوم بھی گمراہ ہو جاتی ہے پس وہ خود بھی ضائع ہو جاتا ہے اور وہ قوم بھی۔ اس کی مثال کشتی کی سی ہے، کہ جب وہ دریا میں ڈوبنے لگتی ہے تو اس کے ساتھ جو بھی ہوتا ہے ڈوب جاتا ہے،

خود مہدی کی اولاد میں بھی بعض اہل علم ہوئے مثلاً عزیز باد کہ وہ شاعر کے ساتھ ادیب اور فاضل عالم تھا۔ ایسے ہی معز اور اس کا بیٹا حاکم۔

ان میں سے اکثر علم غیب کا دعویٰ کیا کرتے خصوصاً حاکم کہ وہ تو کہتا تھا کہ وہ طور پر میرے ساتھ مناجات و مکالمہ ہوتا ہے جس طرح کہ موٹی علیہ السلام کے ساتھ ہوا تھا وہ کہہ طور پر بار بار جاتا تھا، علم کیمیا بھی جانتا تھا چنانچہ فن کیمیا میں تقوینہ الحاکم۔ اس کی مشہور کتاب ہے اسی طرح کتاب الحیاکل بھی اس کی مشہور کتابوں کے منجملہ ایک کتاب ہے، خلاصہ کلام یہ کہ ان لوگوں کی ہمہ دانی اور غیب دانی میں مورخین رطب اللسان میں اور اوراق تاریخ میں ان کے یہ اوصاف ثبت ہیں،

کہتے ہیں کہ ایک روز عزیز جمعہ کے خطبہ کے لئے منبر پر چڑھا تو وہاں ایک رقعہ رکھا ہوا تھا جس پر یہ قطعہ تحریر تھا،

بِالظُّلُمِ وَالْجَوْرِ سَاضِينَا
وَلَيْسَ بِالْكَفْرِ وَالْحِمَاقَةِ
إِن كُنْتُ أُعْطِيتُ هَلْمَةً عَيْنٍ
فَقُلْنَا كَاتِبَ الْبِطَاقَةِ

ہم ظلم و جور کی وجہ سے تمہارے تسلط سے راضی ہوئے ہیں مگر کفر و حماقت کو ہم برداشت نہیں کریں گے اگر تمہیں علم غیب عطا ہوا ہے تو ذرا ہمیں اس رقعہ کے کاتب کا نام تو بتانا،

ان میں حاکم بڑا سٹرا ہوا رافضی تھا اس نے چند آدمی بطور غصیہ طور سے مدینہ منورہ بھیجے کہ حضرت شیفین رضی اللہ عنہما کے جسوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک سے نکال دیں،

یہ بد بخت مدینہ منورہ پہنچے اور روضہ مطہرہ کے پاس ایک علوی کو دھوکہ دے کر اس کے مکان میں مقیم ہوئے رات کو موقع پا کر نقب لگائی اور وہ نقب جسد مبارک تک پہنچی ہی تھی کہ بیک ایک مدینہ پر محنت آندھی اور جھکڑ پلٹنے لگے ہیبت ناک بجلیاں کوند نے لگیں گرد و غبار کا گویا طوفان آگیا اور مدینہ منورہ میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ فضا کی ہولناکی اتنی بڑھی کہ لوگ سمجھنے لگے کہ ہلاکی یقینی ہے اور اس سے نجات و خلاصی سے نا امید ہو گئے کسی طرح اس علوی اور اس کے اہل خانہ کو بدر کرداروں کی حرکت نائنائستہ کا علم ہوا تو انہوں نے امیر مدینہ کو اس کی اطلاع دی حاکم مدینہ نے فی الفور ان کو پکڑ کر تہ تیغ کیا تو اس کے بعد طوفان تھا فضا سے گرد و غبار صاف ہوا اندھیرا دور ہوا اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔

قاضی فاضل ابو عبد اللہ ابو منصور سنائی نے اپنی کتاب الاستنصار میں یہ واقعہ تحریر کیا ہے،
نہزاریہ ۱۔ ان کا سب سے بڑا عالم فاضل حسن بن صباح چمڑی تھا۔ اس کے بعد ابو الحسن سلیمان بن محمد جو
لاشدرین کے لقب سے مشہور تھا وہی اسماعیلی قلعوں کا مالک تھا یہ ایک فاضل ادیب اور بہت اچھا شاعر بھی تھا فن
انشاء میں عالمانہ مقالے اور رسالے بھی لکھے ہیں، انہیں تحریروں میں اس کا وہ خط بھی ہے جو اس نے سلطان
نور الدین محمود ابن سلطان علا الدین شہید زنگی، شاہ شام کو اس وقت لکھا تھا جب صلاح الدین بن ایوب نے سلطان
کی طرف سے مصر فتح کیا تھا اور مہدویوں کے پنجے سے نکالا تھا، مصر پر چڑھائی کے ساتھ سلطان نور الدین زنگی نے
اس راشد الدین کو بھی تنبیہی خط لکھا تھا کیونکہ یہ بھی تو خود کو عبیدین کے پس ماندوں میں شمار کرتا تھا چنانچہ اس نے
بادشاہ کے خط کے جواب میں لکھا۔

يَا لَتَرْجَالٍ رَمِيْنَ هَاكِ مُنْقَطِعَةً
مَا تَرَكَتْ عَلَى سَنَعِي بَرْتَعَةً
يَا اَذَى الَّذِي يَفْرَحُ اِذَا سَفِهَ نَا
لَدَامَ قَاتِلُكُمْ جَلِيَّ حَلِيْنٍ لَمْ يَمْرُءُ
قَامَ لِحِمَامٍ اِلَى الْبَارِي يَهْدُوهُ
وَمَشَرَتْ لِيَصْرَامِ الْاُسْدِ اَسْبَعُهُ
اَفْطَحْ يَسَدُ فَمَا اَوْفَى يَا فَجِيحُ
بِكُفْيِهِ مَا اَذَى لِي مِنْهُ اَمُّ بَيْعٍ
قَضَى بِفَضْلِيهِ وَجَبَلِهِ مَا عَلِمْنَا
مَا هَدَّ دَنَا بِهِ مِنْ قَوْلِهِ فَبِيْلِهِ

يَا لِلّٰهِ اَتَقَبَّحُ مِنْ ذُنُوبٍ بَلَّغَتْ تَطْنُ بِأَذَى فِيلٍ وَتَبْرُمُ مَتَّعَتْ فِي الشَّائِلِ، وَقَدْ قَالَهَا قَوْمُ الْخُرُونِ
قَدْ مَرُّنَا هَهُنَا وَمَا كَانَ نَهْدًا فَاصْرُوفْ، أَمْ لِحَقِّي تَنْ حَصْرَتْ رَيْبًا حِلَّ تَنْصُرُونَ، سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَلَمْنَا
أَتَى مُنْقَلَبٍ يَفْقِدُ بَرْنَ، أَمَّا مَا صَدَرَتْ بِهِ قَوْلِكَ مِنْ قَطْعِ رَأْسِي وَكُلْعِكَ بَقْدَحِي فِي الْجِبَالِ التَّرَائِي
فَقُلْتَ اَلَمْ يَأْنِي كَاذِبَةٌ وَخِيَانَةٌ عَدُوٌّ صَائِبَةٌ، فَإِنَّ الْجَوَاهِرَ لَدُنْكَ زُفْرٌ بِأَذَى عَرَضَ كَمَا أَنَّ الْأَسْمَاحَ
لَدُنْكَ تَصْبَحُ مِنَ الْأَمْوَاسِ، كَمَا بَلَّغْتَ قُوَّتِي وَضَعِيْفَ وَدَفِي وَتَوَلَّيْتُ، إِنَّ عُدُنَا إِلَى التَّلَوَاهِرِ وَالْمُحَرَّاسِ
وَعَدَ لَنَا هِنَ الْهَرَاثِيْنَ وَالْمُحَرَّرَاتِ فَلَنَأْ سُرَّةً بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِهِ مَا أَوْذَى
نَبِيٌّ مِثْلَ مَا أَوْذَيْتَ، وَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جَعَلِي فِي عَثَرَتِهِمْ وَأَهْلِي بَيْتِهِمْ وَشَيْعَتِهِ وَالْمَالُ مَا حَالَ وَالْأُمُورُ
مَا زَالَ، وَلِلَّهِ الْحَمْدُ فِي الْأَخْرَجَةِ وَالْأَوَّلَى إِذْ نَحْنُ مَطْلُوعُونَ لَدُنْكَ الْخَالُونَ وَمُخْضَرُونَ لَدُنْكَ غَاصِبُونَ، وَقُلْتُ
جَاءَ الْحَقُّ وَمَنْ هُوَ إِلَّا الْبَاطِلُ كَانَ تَرْهُوقًا، وَقَدْ عَلِمْتُمْ ظَاهِرَ حَالِنَا وَكَيْفَ قِتَالِ بَرَجَانِنَا وَمَا يَتَمَوَّضُونَ
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ وَلَنْ يَتَمَوَّضُوا أَبَدًا إِمَّا قَدْ مَسَّ آيِدِيْهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ، وَفِي الْأُمُشَالِ السَّائِرَةِ أَوْ
لِلْبَطْرِ يَهْدُونَ بِأَشْطِ فَهَقَى لِلْبُؤْسِ جَلْبَابًا وَتَدْرَعُ لِيْكَرَامِيَا أَوْ لَا تَكُنْ كَالْبَاحِثِ عَنْ حَقِّهِمْ بَطْفُورِهِ وَالْحَاجَةِ
مَارِنَ أَنْفِهِمْ بِكُفْيِهِ، وَإِذَا وَقَعْتَ عَلَى كَيْتَا يَنَا فَنَكُنْ مِنْ أَمْوَاسِ الْبَرِّ صَادِقَةً قَدْ أَوَّلَ الْفَعْلُ وَالْخَوَارِصَاءُ
يَنَا قُلْتُ هَذَا اللَّذِيْ حَقِّي تَاثُلْتُ
بِمُؤْتِكَ فِيهِ وَتَمَوَّضُوا هَا
فَأَصْبَحْتُ تَرْمِيْنًا يَنْبُلُ قَدْ اسْتَوْرَى
مَقَامِهِ سَهَابًا فَيُنَا وَفِيْنَا جَبْرِيْلُ هَا

دو گروہ ہوں ان خطرہ ہمیں ڈرا رہا ہے جس کے متعلق میرے کان میں بھی جھنک بھی نہ پڑی۔
وہ شخص جو ہم کو تلواروں کی جھنکار کا ڈرا رہا ہے، جب تو اس پر پھٹے تو پھر اس کو میرے پاس

اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہنا چاہیے،

کبوتر باز کو دھمکا رہا ہے اور جو شیروں کو بچھاڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، وہ انڈے کے منہ کو اپنی انگلی سے بند کرنا چاہتا ہے اس تنگ دود میں انڈے کی طرف سے اسکی انگلی کو جو تکلیف پہنچے گی وہی اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیگی

اس نے ہمیں اشاروں میں اور صراحت سے بتا دیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ پس خدا کی شان ہے کہ مکھی اور چھپر باغی کو ذبح کرنے کے لئے اس کے کانوں پر بھنبھنانے لگے ہیں اور وہ بھی تصادیر میں شامل ہوتے ہیں،

دوسرے لوگوں نے بھی اس کو اسی طرح دھمکایا تھا، ہم انسان کو ایسی حالت میں موت کے گھاٹ اتارا کہ کوئی مددگار بھی نہ ملا کیا تم باطل کی مدد سے حق کو ڈمگانا چاہتے ہو؟ ظالموں کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ وہ کس پہلو پلٹے ہیں،

تم نے اپنے خلیفہ کی ابتداء میں میرا سر قلم کرنے اور میرے پہاڑی قلعوں کو پیوند زمین کرنے کے متعلق کہا ہے تو یہ تمہاری ناکام تمنا اور خام خیالی ہے، کیونکہ جو اہر اعراضی سے ملیا میٹ نہیں ہوتے اور نہ اہر لغوی سے رد میں کمزور و مضعیل ہوتی ہیں، طاقتور اور کمزور کے نیز ذلیل اور شریف کے درمیان بہت فرق ہے اور اگر ہم ان عقلی اور باطنی چیزوں میں جواب دینے کے بجائے ظاہر اور سی طور پر کچھ کہنا چاہیں تو ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور مسرت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ عینی اذیت و تکلیف تجھے دی گئی اتنی اور کسی نبی کو نہیں پہنچی اور تمہیں پتہ ہی ہے کہ آپ کی اولاد، آپ کے اہل بیت اور آپ کے شیعوں پر کیا کچھ نہیں گذرا دنیا و آخرت میں حمد و تعریف اللہ ہی کے لئے ہے اس وقت ہم ظالم نہیں مظلوم ہیں ہم کسی پر غضب و غارت نہیں ڈالتے ہم پر غارت ڈالی جا رہی ہے، ہم حق آیا، باطل مٹا ہے شک باطل تو مٹتا ہی ہے،

ہماری ظاہری حالت اور طاقت و قوت کو تم جانتے ہی ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے آدمی کیسی بے جگری سے لڑتے ہیں۔ اور موت کی ان کو کتنی تمنا رہتی ہے وہ جان ہار دیتے ہیں مگر میدان جنگ سکنہ نہیں سوڑتے۔ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو اور ایسا ہی کرنا چاہتے ہو تو موت کی تمنا کرو، مگر وہ ہرگز ان عملوں کی وجہ سے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے بطور شل کہتے ہیں کہ کیا تم بظلم کو دریا سے ڈراتے ہو تو اب تم مصیبت سے بچنے اور آفتوں کو سہنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور خود اپنے ناخن سے اپنی موت کریدنے والے نہ بنو نہ اپنے ہاتھ سے اپنی ناک کاٹنے والا بنو جب تم ہمارے جواب سے آگاہ ہو جاؤ تو ہم سے بپاؤ کے لئے جو تبرا بیر کر سکتے ہو کر لو اور ہمارے کام سے ہوشیار رہو۔

اور پھر سورہ نمل کا ابتدائی اور سورہ ص کا آخری حصہ مطالعہ کرو،

تم نے ہمارے طفیل ملک حاصل کیا تا آنکہ اپنے مکانات کو محفوظ و مضبوط بنا لیا اب تم میری تیر اندازی کرنے لگے ہم میں پوری ہمواری ہے،

اما مہیہ: اور خصوصاً اشاعت عشریہ میں تو ان کے علماء کی حدود شمار ہی نہیں البتہ ان کے قدام میں جو مشہور ہیں

یہ ہیں، قیس بن سلیم بن قیس ہلالی، ابان، ہشام بن حکم، ہشام بن سالم صاحب الطاق ابو الاحوص علی بن منصور، علی بن جعفر بنان بن سمان جس کی کنیت ابو احمد ہے اور جزدی لقب سے مشہور ہے، ابن ابی عمیر عبداللہ بن مغیرہ ظہیری ابو بصیر محمد بن حکم محمد بن فرح الرحبی، ابراہیم خزاعی محمد بن حسین، سلیمان جعفری محمد بن مسلم بکیر بن امین، ازراہ ابن امین اور ان دونوں کے بیٹے سامع بن مہران علی بن ابی حمزہ عینی عثمان علی، یہ تینوں ہی فضال ہیں احمد بن محمد بن عبداللہ ابو نصرہ ابو اسطی یونس بن عبداللہ القتی ارب بن نوح حسن بن عیاش الجریثی علی بن مظاہر واسطی احمد بن اسحاق جابر بن جعفری محمد بن جعفری، حسین بن سعید عبداللہ، عبید اللہ، محمد عمران اور عبدالاعلیٰ یہ سب علی بن شیبہ کے بیٹے ہیں،

اشاعرہ میں مصنفین میں یہ لوگ شمار کئے جاتے ہیں۔ صاحب معالم الاصول فخر الموقنین محمد بن علی الطرازی محمد بن علی البجای ابو الفتح کراچی کتبی جلال الدین حسن بن احمد شیخ مقتول، محمد بن ابی حسن الصفار ابان بن بشر البغالی عبید بن عبدالرحمن بن شعیب بن فضل بن شاذل قح حسین بن بابویہ قحی اور محمد بن بابویہ قحی، یہ قحی وہ نہیں ہے جس سے حدیث شفا میں امام بخاری نے استشہاد کیا ہے، صحیح بخاری کی کتاب الطب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے راہ القتی عن لیث عن جابر، اس لئے کہ یہ بابویہ قحی چوتھی صدی کا ہے اور لیث دوسری صدی کے، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ بابویہ قحی نے لیث کو دیکھا ہو، اور ان سے روایت کی ہو اور اگر رواہ عن لیث کو ارسال اور روایت بالواسطہ محمول کری تو اگرچہ یہ بخاری کے اصول کے خلاف بھی۔

پھر بھی اس موقع پر اس کی گنجائش نہیں کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تیسری صدی کے وسط کی ہے، جبکہ ابن بابویہ اس کے بہت بعد کا ہے تو اس سے استشہاد کا سوال ہی نہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش، وفات اور زمانہ حیات کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے کہ وہ سہائی کے ماحول میں پیدا ہوئے تعریف کے ساتھ زمرہ رہے اور نور میں وفات پائی، یہ بحساب الجبر آپ کی تینوں حالتوں کا بیان ہے، بعض جلیل القدر اہل علم کو سہائی کی مہارت سے یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ یہ قحی، وہی قحی ہے جس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے استشہاد کیا ہے، اس لئے یہاں سہائی کی مہارت نقل کر کے غلطی کے منشا کو واضح کیا جاتا ہے،

قَالَ السَّعْفَانِي فِي الْمُسَوِّدَاتِ إِلَى قَوْلِهِ جَعْفَرُ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ بْنِ الْحُسَيْنِ بِأَبِيهِ الْقَتِي نَزَلَ بَعْدَ إِذْ وَحَدَّثَ بِهَا عَنْ أَبِيهِ وَكَانَ مِنْ شَيْخِيهِ الشَّيْخَةِ وَشَهِدَ أَمَّا الرَّافِعَةُ سَمَوِي عَنْهُ مُحَمَّدُ بْنُ طَلْحَةَ النَّعَالِي وَيَقُولُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَعْدِ بْنِ الْقَتِي اسْتَشْهَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ فِي حَيْثُ فِي كِتَابِ التَّبِ فَقَالَ فِي حَدِيثِ الشَّهَادَةِ فِي ثَلَاثِ شُرُوطٍ مُحْتَجَةً وَشُرُوطَ عَمَلٍ وَكَيْفَ بَيِّنَاتٍ وَأَمَّا الْقَتِي عَنْ لَيْثٍ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَالْأَسَاذُ النَّعْمِي أَبُو طَاهِرٍ سَعْدُ بْنُ عَلِيٍّ بْنِ الْقَتِي مَاتَ وَفِي يَدِ السُّلْطَانِ سَعِيدِ بْنِ مَلِكٍ شَاكَ إِلَى مَا قَالَ هَذَا فِيهِ رَأْيٌ أَنْ لَا نَسَبَ وَصَحَّحْتُ أَنَّ الْبُخَارِيَّ يَأْتِي الْقَتِي الَّذِي اسْتَشْهَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ هُوَ يَقُولُ ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ سَعْدِ الْقَتِي لَهُ بَنُ بَابُوكِيَّةَ وَالضَّابِقَةُ فِي كِتَابِ الْأَنْسَابِ

أَنْ يُعْطَى أَحَدُ الْمُسَوِّبِينَ بِسَبَبِهِ وَاحِدٌ عَلَى الْآخَرِ بِوَاسِطَةِ مَكْتُوبِهِ بِالْحُمْدَةِ فَلَعَلَّ نَارَهُمْ تُنْفَخُ ذَٰلِكَ
الْبَعْضُ سَهْمًا فَلَكْتُبَ تِلْكَ الرَّاوِيَّ السَّوَادَ حَتَّى طَلَعَتْ مِنْ وَادِهِ بَنُو بَاوُزِيَّةَ وَأَنَّ مَا بَعْدَهُ وَهُوَ كَوَلُّهُ اسْتَشْهَدَ
بِهِ الْبُخَارِيُّ مَا يَتَعَلَّقُ بِحَالِ ابْنِ بَاوُزِيَّةَ وَالرَّاوِيَّ كَيْفَ كَذَبَ بَلْ قَتَلَتْ مُرْجُمَةً ابْنُ بَاوُزِيَّةَ إِلَى حَوَاطِ
مَوْزَى عَنْهُ مُحَمَّدُ بْنُ طَلْحَةَ النَّعَانِي وَأَبْدَأَ يَقُولُ يَعْقُوبُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَعْدِ الْقَسِيِّ اسْتَشْهَدَ بِهِ
الْبُخَارِيُّ فِي تَرْجُمَتِهِ أُخْرَى وَكُلُّ هَذَا الْإِنْشَاءُ مِنْ غِلَطِ النَّاسِ وَلَوْ تَصَرَّفَ النَّاسُ أَشَدَّ تَغْلِيظًا مِنْ هَذَا
الْفَقْدِ وَاللَّهُ الْعَازِمُ مِنْ كُلِّ نَاقِلٍ

سنانی نے تم کی طرف منسوب لوگوں کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بابوی قمی
نجداد میں آیا وہ اپنے باپ کی سند کے ساتھ امارت کی روایت کرتا تھا، یہ شیعوں کے شیعہ میں سے تھا اور شہر
رافضیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا محمد بن طلحہ نعانی اور یعقوب بن عبد اللہ بن سعد قمی نے اسی سے روایت کی ہے اور
امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کی کتاب الطب میں حدیث شفاء کے ذیل میں اسی سے استنباط کیا ہے،
اور کہا ہے کہ روایت کی اس کی قمی نے لیث سے انہوں نے مجاہد سے مجاہد بن ابی جاس رضی اللہ عنہ سے! اور
استاذ عمید ابوطاہر یعنی سعد بن علی ابن عیسیٰ قمی، سلطان سحر بن ملک شاہ کا وزیر ہو گیا تھا۔

یہ عبارت انساب سمعانی کی ہے بخاری کے شارحین کی جو تصدیقات اس عبارت سے متعلق ہیں وہ ظاہر
کرتی ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس سے استنباط کیا ہے وہ یعقوب بن عبد اللہ سعد قمی ہے ابن بابوی
قمی نہیں ہے،

کتاب الانساب میں یہ قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک ہی نسبت سے منسوب دو افراد میں سے جب ایک
کا عطف بذریعہ واؤ دوسرے پر کیا جاتا ہے تو اس واؤ کو سرخ روشنائی سے لکھتے ہیں اور یہاں کاتب نے بھول
کر واؤ خلاف قاعدہ سیاہی سے لکھ دیا اور اس طرح اس کے راویوں میں بابویہ قمی کو شمار کر لیا گیا،
اور یوں استنباط ابی جاس کا تعلق بظاہر بابویہ ہے جو گہا حالانکہ یہ خلاف واقع اور غلط تھا
کیونکہ اس کے متعلق تعارف توروی عنہ محمد بن طلحہ النعانی پر ختم ہو گیا، اور یعقوب بن عبد اللہ بن
سعد استنباط ابی جاس سے دوسرا تعارف شروع ہوا اور یہ ساری غلط فہمیاں کاتب کی اس غلطی سے
ہوئیں کہ اس نے عطف کا واؤ سرخ نہیں لکھا اور یہ غلطی تو کیا کاتب حضرات تو اتنی خطرناک غلطیاں کرتے ہیں کہ
خدا کی پناہ! اور ہر لغزش سے اللہ تعالیٰ ہی بچائے والا ہے،

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، اثنا عشریہ کے علماء و مصنفین میں یہ حضرات
مزید ہیں، عبید اللہ بن علی حلبی، علی بن مہران یا راہوازی، سالار علی بن ابراہیم قمی، ابن براح ابن زہرہ اور
ابن ادریس ہیں،

یہ ابن ادریس وہی ہے جس کے فرضی اشعار امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیئے گئے
ہیں جیسا کہ باب دوم میں گزرا ہے، دراصل یہ جرات کنیت کی کیسانی کے سبب عمل آئی ورنہ یہ تو اپنے خیال میں
کذب صریح سے بچا ہے،

نیز ان کے علماء و مصنفین میں یہ بھی شمار ہوتے ہیں، حسن کیدری، معین الدین مصری، ابن جنید، حمزہ ابو الصلاح ابن مشرعر، الواسطی، ابن عقیل، عضاہری، کشی، نجاشی، ملا حیدر، املی، برقی، محمد بن جریر طبری، املی، ابن ہشام، دیلمی، رجب بن رجب بن محمد البرسی، الحلی ابن شہر آشوب، سردی، بازندوانی، منتخب دین، ابو الحسن علی بن عبید اللہ جو علی بن حسین بن بابویہ قمی کا پانچ واسطوں سے پوتا ہے طبری، محمد بن احمد بن یحییٰ بن عمران اشعری، صاحب انوار الحکمۃ شیخ مفقوت، محمد بن مکی، سعدی بن عبد اللہ کتاب، الرحمہ کا مصنف محمد بن حسن بن ولید شیخ ابن بابویہ احمد بن محمد میثم بن میثم البحرانی، عبد الواحد بن صبیح نغانی، ابو علی ابن الوزان ابن راوندی، مسیحی ابو عبد اللہ محمد بن نمان، ملقب شیخ مفید، عبید بابا ابن المعلم سید مرتضیٰ، سید بن ابو جعفر محمد بن حسن طوسی، جس کا لقب شیخ الطائفہ ہے اور اس کے نواسے علی بن موسیٰ بن طاووس اور احمد بن طاووس، جمال الدین ابو علی بن حسن بن یوسف بن مظہر علی سے مشہور ہے اس کا بیٹا فخر الدین محمد بن علی جس کا لقب ہے نعیم الدین بن محمد طوسی جو خواجہ نعیم سے مشہور ہے، ابو القاسم نجم الدین بن سعید صاحب خزائن اس کا لقب محقق ہے، تقی الدین بن داؤد و سید الدین محمود گھمٹی رحمی الدین بن طاووس، جمال الدین بن طاووس اس کا بیٹا غیاث الدین مقداد علی بن عبد العالی اس کا دادا امیر باقر زین الدین مقتول، اس کا شاگرد بہاؤ الدین محمد عاملی، ایس تزدینی، شارح عد، تقی مجلسی، شاہ من لا یحضرہ الفقہاء اور اس کا بیٹا ابن مجلسی، صاحب بحار الانوار،

یہ گویا اس فرقے کے مصنفین کی آخری کڑی ہے اور ان کے مذہب معتقد علیہ کہ روایات سابقہ میں سے یہ جس روایت کو اپنے امتحان کی کسوٹی پر کسی کے کھلے تباہی سے تو وہ ان کے نزدیک وحی منزل من اللہ ہے بلکہ بالفعل اگر ان کے مذہب کی نسبت باقر مجلسی کی طرف کریں، ان کے سابقین کی طرف تو زیادہ اور بجا ہے۔
مذکورہ بالا کے علاوہ ان کے اور بھی علماء ہیں جنہوں نے علوم دینیہ میں زیادہ لب کشائی نہیں کی۔ جیسے صدر الدین شیرازی، آخون حسین خوانساری اور حبیب اللہ مشہدی، ابو القاسم قنذر سکھی، استاد محمود جو نپوری شمس بازغہ کا مصنف ان میں سے بعض نے مذہب و کلام میں البتہ دخل دیا ہے اور اس فرقہ کے عوام کے نزدیک درجہ اعتبار تک پہنچے مثلاً قاضی نور اللہ ثوستری، ملا عبد اللہ مشہدی، صاحب افکار الحق اور ملا رفیع واعظ ابواب الجنۃ کا مصنف،

اب ان کے علماء کی تعداد کے شمار کے بعد یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ ہم ان کی معتبر کتابوں سے بھی روشناس کریں۔

کیونکہ ان علماء کا جو علم بھی ہے وہ ان ہی کتابوں میں تو منضبط اور درجہ ہے اور ان سے روایت یا نقل ان کتابوں کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں، ان میں سلیم بن قیس ہلالی وہ پہلا شخص ہے جس نے ان کے اخبار میں کتاب تصنیف کی اور شیعوں کے تمام فرقوں نے اسے معتبر سمجھا ہے اور اب بھی اسے نایاب اور قیمتی چیز سمجھتے ہیں، اور گراں سے گراں حقیقت پر بھی بڑے شوق سے خرید لیتے ہیں،

سبائے کی کوئی معقول کتاب نہیں ہے مگر ان کے جو قوفوں کا جمع کردہ بہت قلیل سا ذخیرہ جس میں امیر المؤمنین کی کچھ تعریف آپ کی علامات الوہیت آپ کے خوارق عادات افعال اور کچھ بیان اس بارے میں کہ آپ شہید نہیں

ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں، اور اب پھر نزول فرمائیں گے،
حلولیہ، کے پاس کچھ تصنیفی ذخیرہ ہے جس کا ماحصل اور کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے محض روح کی
شکل میں تھا، پھر تالیب آدم میں داخل ہوا جس کی طرف ان کے خیال میں و نغمت فیہ منہی ہوجی سے اشارہ ملتا
ہے، پھر صدی بعد صدی اور پشت در پشت انبیاء کے اجسام میں حلول کرتا ہوا اور منتقل ہوتا ہوا اجاب امیر اور
ان کی ذریات تک پہنچا۔

کیسا نیمہ اسکے ہاں بھی دہلیات کے سوا کوئی قابل ذکر علمی کتاب نہیں مثلاً عربین الحنفیہ کا کچھ فنی حالی ان کے خوارقِ عادت ان کی کرامات، دیودن اور پریوں سے ان کی نبرد آزمائی اور ان کا جوں کو سحر و تابیہ کر لینا جس طرح داستانِ امیر حمزہ جو عام افسانہ گویوں اور قصہ خوانوں کی زبان ہے اسی ضمن میں کچھ نصوصِ امیر المومنین سے ان کی اور ان کی اولاد کی مخالفت کے بارے میں لے آئے ہیں،

نویسہ ۱۔ ابتداءً ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، اصولوں میں معتزلہ کی خوشہ چینی کرتے اور فروع میں حنفیہ کی۔ معدودے چند روایات ان کے ائمہ سے سینہ بسینہ پہلی آت تھیں جو ان دونوں کے خلاف تھی بعد میں ان کے علمائے مسائل فقہیہ میں اجتہاد کا سلسلہ شروع کیا اور اکثر مسائل میں حنفیہ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے اعتقادی مسائل کو جمع کیا اور بیرون تصنیف کا سلسلہ شروع ہو گیا اس کے بعد اصول و فروع میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں فروع کی کتابوں میں ان کے ہاں کتاب الاحکام ہے جو بلادین و حجاز میں شرفاء کے ہاں ملتی ہے۔ اصول میں عقیدہ الالیاس ہے جو بہت دلائل اور ابواب و فصول پر مرتب ہے اس کے رد میں شیخ ابراہیم کردی مدنی نے مبراہ اس کے نام سے بہت ضخیم شرح لکھی ہے حدیث و اخبار میں بھی ان کے پاس کچھ ذخیرہ ہے۔

اسما علیہ السلام۔ ان کے ہاں دولت عبیدین سے پیشتر سوائے کتاب البیان کے جن کا ذکر باب اول میں ہوا اور کوئی کتاب نہ تھی البتہ مہدی کے خروج کے بعد جب اس کا اور اس کی اولاد کا مصر و یار مغرب میں تسلط و اقتدار قائم ہو گیا بہت سی تصانیف معرض وجود میں آئیں ان میں سب سے اچھا مصنف نعمان بن محمد منور قاضی ہے ان کی کتب میں سے چند کتابیں یہ ہیں، کتاب اصول المذاہب کتاب الاخبار فی الفقہ کتاب الرد علی المناقضین اس میں امام ابو حنیفہ امام شافعی امام مالک اور ابن شریح (جہم اللہ) چاروں فقہوں پر رد لکھا ہے کتاب اختلاف الفقہاء اس کتاب میں اپنے خیال کے مطابق مذہب اہل بیت کی بہت تائید لکھی ہے کتاب الانتصار فی الفقہ اس میں بھی اس قسم کا مضمون ہے کتاب المناقب والمثالب، اور کتاب الابتداء والوعود العبدہ لیکن جب ان کی حکومت و اقتدار کا شیرازہ منتشر ہوا اور تسلط ختم ہوا تو ان کی کتابیں بھی صفحہ ہستی سے نابود ہو گئیں البتہ خال خال بلاد عدن و یمن میں جہاں ان کے مذہب کے کچھ لوگ رہتے ہیں ان کے پاس ملتی ہیں،

اہل سنت بھی ان کے مذہب کے بعض اصولی یا فرعی مسائل ان کی معتبر کتابوں سے اپنی تصانیف میں نقل کرتے ہیں بطور نمونہ ان مسائل میں سے کچھ کا تذکرہ ہم بھی یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ ان کے طرز کلام کا کچھ بہتر لگایا جاسکے مثلاً کہتے ہیں: یَجِبُ أَنْ يَكُونَ الدِّمَامُ مَعْصُومًا عَنِ الْمَعَاصِي عِنْدَ الْوَلَدِ يَتْلَا بُلْهًا وَقَالَ تَعْسُفُ قَبْلَهُ رِغًا ولایت سے پہلے یہ ضروری ہے کہ امام گناہوں سے پاک ہو اور ولایت سے قبل یہ ضروری نہیں مگر بعض کہتے

ہیں کہ ولایت سے پہلے بھی ضروری ہے، اور کہتے ہیں اِنْ نَحْنُ اِلَا مَا عَلٰی شَيْءٍ نَحْمَدُ عَلٰی تَقْوِيْنِهِ فَاَلَا نَفِيْ مَا سَمِعْنَا لِقَدْ لِيْ عِنْدَ الْمُهَنْدِ وَبَيْتِهٖ وَالْقَدْ مَاءٍ وَقَالَتْ اَلَنْزَارُ يَدُهٗ يَسْتَلِكُ بِالْاَزْلِ وَيَكْفِيْ الشَّامِي رَاكِرًا مَّا نَعْنِيْ كُوْنُ فَرَاغًا مَّارِيْ كِيَا اور پھر اس کے خلاف کوئی حکم صادر کیا تو دوسرا حکم پہلے حکم کے لئے ناسخ ہو گا مہمدیوں اور قدامت کے نزدیک اور نزاری کہتے ہیں کہ پہلے حکم پر عمل کیا جائے گا اور دوسرا حکم لغو سمجھا جائے گا

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب امام کوئی حکم صادر کرے تو مسلمان مرد و عورت پر اس کی تعمیل واجب و لازم ہوتی ہے چاہے وہ حکم ان کی مرضی کے خلاف ہو کیوں نہ ہو پس اگر امام کسی عورت کو کسی بے زور و بر مرد کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے نامزد کرے تو دونوں پر عقد لازم ہو گیا اس کو توڑا نہیں جاسکتا چاہے عورت اسے ناپسند کرے یہی حکم دوسرے معاملات میں جاریہ وغیرہ کا ہے

فقیر عمارہ یمنی نے جو مشہور شاعر تھا کہا ہے کہ سیدہ بنت احمد بن جعفر بن احمد علیہ صلیہ حسن و جمال حسن ادب حسن اخلاق اور نزاکت و ظرافت میں شہرہ آفاق اور کینے ریز گار تھی اہل یمن اس کو بلبقیس الاسلام کہتے تھے اس کا شوہر شاہ بن محرم صلیہ تھا شہر فوس حیلہ میں دارالغزاسی کا بنوایا ہوا تھا۔ اس کی وفات کے بعد بخت و اتفاق سے سبا ابن احمد بن مظفر صلیہ یمن کا حاکم بن گیا۔ ملک پر اقتدار و تسلط کے ساتھ اس کی خواہش ہوئی کہ سیدہ پر بھی تسلط حاصل کر لے مگر باوجود صاحب اقتدار و عروج کے سیدہ کی طرف سے پیہم انکار ہوتا رہا اور معاملہ نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ دونوں فریق آمادہ پیکار ہو گئے اور جنگ کی دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں سبا کے مصاحبوں نے اس کو مشورہ دیا کہ لڑائی میں خطرہ نظر آتا ہے کہیں یہ اقتدار ہی ہاتھ سے نہ جاتا رہے حصول مقصد کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مستنصر عبیدی کو جو والی مصر تھا اور اہل یمن اس کی دعوت پر قائم تھے خط لکھو چنانچہ بات اس کی سمجھ میں آگئی، اپنے آدمیوں میں سے دو مقتدا اشخاص کو مناسب پیشکش کے ساتھ مصر روانہ کیا اور سارا قصہ اسے لکھ بھیجا، مستنصر نے اپنا ایک متمدن خواجہ سرا اور دو آدمی بطور ایچی بھیج دیئے خواجہ سرا نے یمن پہنچ کر روساء اور امر اکو جمع کیا اور سبا کو سیدہ کے گھر لے گیا ان کو دروازہ پر کھڑا کر کے خود سیدہ کے پاس گیا اور کہا کہ امیر المومنین مستنصر نے تم کو امیر الامراء ابو حمیرہ سبا ابن احمد بن مظفر کے عقد میں ایک لاکھ دینار نقد اور اور بصورت زہرہ و تائف دہا یا قیمتی پچاس ہزار دینار کے عوض دیدہ یا ہے اور امیر المومنین نے یہ بھی کہا ہے یہاں قرآنی آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لئے یہ بڑا دامن ہے، یہ کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حکم دیں تو ان کو اس بات میں کوئی اعتراض باقی رہے اور جس نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی وہ مروج گمراہی میں مبتلا ہو گیا،

سیدہ نے اپنے مذہب و عقیدہ کی پاسداری میں اسے قبول تو کر لیا مگر دونوں کی نہیں نہیں اور رنجشیں پیدا ہو گئیں جس کی تفصیل تاریخوں میں موجود مذکور ہے۔

ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ امام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مومن علیہ السلام کی طرح حکام ہونا چاہیے چنانچہ حاکم عبیدی اس بات کا مدعی تھا اور کوہ طور پر اکثر جانا رہتا تھا انہیں کہتے ہیں اور اشعار عربیہ کا یہ قول ہے کہ امام کے لئے غیب والا لازم ہے،

اور اس کے معنی ہیں کہ یہ عدد بھی طلال ہے اور یہ بھی باعتبار لغت تمام معطوفات ہیں یہی معنی سمجھے جاتے ہیں۔ جمع یا ترتیب کے مضمر دینے کے لئے لفظ مع ہے واد یا دوسرے حروف عاطف اس کے لئے استعمال نہیں ہوتے اور اگر یہاں واد کو مع کے معنی میں لے لیں تو گویہ عربی زبان کے قاعدہ کے خلاف ہو گا تاہم بھی ان کا مقصد اس سے حاصل نہ ہو گا اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ دو مجہولوں کے ایک با جمع ہونے سے چھوٹا عدد بڑے عدد سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں شک سر ا بھارے کہ ممکن ہے کہ آئین آئین میں گول لفظی اعتبار سے حرف عطف نہیں لیکن ممکن ہے معنی میں حرف عطف ملحوظ ہو کیونکہ حرف عطف کا قاعدہ میں حذف جائز ہے، جیسا ایک شاعر شری شاعر کا یہ شعر۔

ثَلَّثْتُ لَكَ عِدَّةً ۖ اَمَلَدَ مِيَمٌ اَسْبَعَةُ اَسْبَعَةُ اَمَّا بَعْدُ

(میں نے اس سے کہا ان کے بڑوں کی تعداد کیا ہے (تو کہا) چار چار چار)

تو یہاں بارہ کی تعداد مراد ہے اور یہاں حرف عطف واؤ درمیان سے گزرا یا نہ

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اہل لغت اس طرح کے معنی مراد لینے کو غلط کہتے ہیں دوسرے اسمائیلہ مذہب

کے نبوت میں کسی شاعر شری شاعر کا کلام پیش کرنا پھر کا بھائی گرہ کٹ کے عاودہ کے پیش کر دینے بھی غلط ہے،

اس کے علاوہ بھی اس کا کلام سند میں پیش نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ مولدین میں سے ہے اور عربی میں

سنداً جاہلین اور محضین کے کلام کے سوا کسی اور کا کلام پیش نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ قبول کیا جاسکتا ہے

اور یہ بات اپنے مقام اور موقع پر طے شدہ ہے

اور پھر یہ بھی ہے کہ شاعر ضرورت شعری کی بنا پر خلاف قاعدہ باتیں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ جو نثر میں

بالکل کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس شاعر کے پورے کلام کی بنیاد تفسیر پر ہے جیسا

کہ اسی شعر کے ساتھ کے دوسرے اشعار کے الفاظ مذہبی السنۃ یا فی میتہ ابنائے اسپر دلالت کرتے ہیں

اس شعر میں شاعر ان الفاظ کو اس ڈھب اور طریقے پر لایا ہے کہ لغت کے اعتبار سے اہل سنت کے مذہب

کے موافق ظاہر ہوں اور خلفائے اربعہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو اس طرح تو اس کے کلام میں بھی اس حد کی تکرار

صرف تاکید کو ظاہر کرتی ہے نہ جمع کو

شرح کے خلاف یہ اس وجہ سے ہے کہ اگر معنی مذکور بد نظر ہوں تو یہ لازم آتا ہے کہ آیت مذکور میں جو اعداد بیان

ہوئے ہیں، ان سے کم کی تعداد میں نکاح جائز نہ ہو۔ کیونکہ مثنیٰ مع اپنے معطوفات کے حال سے اور مال، باجماع اہل

عرب اپنے عامل کی قید ہوتا ہے، جیسے اضمات نہائیۃ، اکیا میں رکبا حال بھی ہے اور قید بھی کہ بغیر حالت رکوب

کے مارنا جائز نہیں اور جب واؤ کو جمع و ترتیب کے معنی میں لیں، شرکت فی الحکم کے معنی میں نہ لیں تو لا محالہ حدت

نکاح ان اعداد کی جمع و ترتیب کے ساتھ مفید ہوگی، حالانکہ یہ صورت بالا جماع باطل ہے،

پھر اگر اس آیت میں یہی معنی مراد ہوں تو اس سے ایک اور بات لازم آئی گی کہ پھر ہر فرشتے کے اٹھارہ

اٹھارہ بازو ہوں، کیونکہ قرآن مجید میں ان کے لئے بعینہ یہی الفاظ آئے،

جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُجُلًا اُولٰٓئِیْ اَجْمَعٍ مَّثْنٰی، وَثَلَّثَ وَاِیَّ

دبنائے والا فرشتوں کو رسول دو دو تین تین، چار چار بازو والے)

کیونکہ یہاں لائحہ لفظ جمع لایا گیا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جمع پر ال۔ داخل ہو تو اس کے سارے ہی افزو

مراد ہوتے ہیں،

عقل کے خلاف اس طور پر کہ اگر یہی معنی مراد ہوتے تو یوں کہنا چاہیے تھا، مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النَّسَاءِ

ثَمَانِیَّةَ عَشْرَ عَوْرَتُوں میں سے اٹھارہ عورتوں سے نکاح کرو جو تم کو پسند ہوں،

ایک ظاہر المعنی اور نسبتاً مختصر لفظ کو چھوڑ کر غیر ظاہر اور دراز لفظ کو لانا ایسی بات ہے جو حکم فہوں کو

بھی خذ، استہزاء پر مائل کرتی ہے اور پھر ایسی رکیک حرکت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا کہ اس نے اپنے اس کتاب میں جو لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمائی ہے، ایسی عبارت درج فرمائی۔

اور پھر اگر کس مجلس میں کسی اٹھارہ سالہ نوجوان سے اس کی ضروریات کی جائے اور وہ جواب اسی طرح دے دو تو تعین، تین، چار، چار کہہ کر دے تو پھر ہی مجلس میں جو اس کا مذاق اڑے گا اسے کون نہیں جانتا، بعض اسماعیلی نوغورزوں تک نکاح جائز سمجھتے ہیں $2 + 3 + 4 = 9$ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس آیت میں عطف کے معنی ملحوظ نہیں ہیں، یہ گویا عطف اور جمع میں تمیز نہیں کرتے،

اسماعیلی فرقہ میں باطنیہ کی کتابیں کثرت سے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب البیان ہے جو غیث کی لکھی ہوئی ہے، جس کا ذکر پہلے گزر چکا۔ اور کتاب تادیل الانجار اور کتاب التاویلات بھی ان کی کتابیں ہیں جو ناصر خسرو کی طرف منسوب ہیں۔

نور الدین۔ ان کے ہاں بھی بہت سی کتب معروف ہیں، جن کے معنف ابن صباح اور نعیر الدین طوسی صاحب تجربہ ہیں۔ طوسی اگرچہ خود اشاعری ہے مگر بعض سلاطین کی فرمائش پر نزاری مذہب کے لئے اس نے کتابیں لکھی ہیں،

سلطان جلال الدین جس نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے توبہ کر لی تھی اس نے ان کے کتب خانوں کو نذر آتش کر دیا تھا، یونان کی کتابیں ضائع ہو گئیں اور چنگیزی فتنہ کے وقت قرآن کے فرقے ہی باقی نہ رہے کتابیں تو کی بجائیں ان کا نام و نشان بھی نہ رہا،

البتہ امامیہ کے جن ابن الوقتوں نے چنگیزی دربار سے تعلقی استوار کر کے آمد و رفت کی راہ نکال لی تھی وہ خوب پھلے پھولے، ان کے مذہب نے بھی خاصا عروج پایا،

امامیہ۔ اب ہم فرقہ امامیہ کی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے مختلف علوم و فنون مثلاً علم کلام، تفسیر حدیث، اصول فقہ اور فروع فقہ میں تصنیف کیں اور بکثرت لکھیں۔ مذہب و کلام ہشام بن حکم کی کتابیں ہیں جو علم کلام پر پہلا مصنف شمار ہوتا ہے اس کے علاوہ ہشام بن سالم محمد بن نعمان حیرق الطاق ابن جہم طالی ابوالاحسن علی بن منصور حسین بن سعید فسن بن شادان قسری کی تصانیف بھی ہیں فضل فی کی ایک کتاب القام بہت مشہور ہے تامل اعتبار بھی بھی جاتی ہے

ابوعلیٰ الموزان، ابن راوندی کی کتابیں اور سیحی کی کتاب الیافوت اور محمد بن صفار کی کتابیں مثلاً الدرر جات وغیرہ اسی طرح علی بن مظاہر واسطی کی کتاب اور علی بن بابویہ کی کتاب التوحید اور محمد بن علی بن بابویہ کی کتاب التوحید اور اعتقالات جو اعتقادات صدق کے نام سے مشہور ہے اور حسین بن علی بن بابویہ کی بھی کتاب التوحید کے نام سے تصنیف، مسک امامت میں مرتضیٰ کی کتاب الشافی اور بن محمد بن جریر طبری کی کتاب استرشد میں طوسی کی کتاب تجرید العقائد اور اس کی شرح اور ابن مطر حلّی کی کتاب الایضین، نہج البلاغہ، نہج الکرامہ اور باب حادی عشر مقداد کی شرح باب حادی عشر، قواعد نظم اربعین، اور اس کی شرح شیخ الراہین اور اس کی شرح نہج المسترشدین اور اس کی شرح واجب الاعتقاد اور اس کی شرح کتاب میثم بن میثم السجستانی اور تقویم وغیرہ وغیرہ۔

ان کی کتب تفسیر میں ایک تفسیر وہ ہے جس کو یہ حضرات امام حسن و محمد رحمہما کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی روایت ابن بابویہ نے بھی اپنی سند سے کی ہے اور دوسروں نے بھی اپنا اسناد سے قدرے کمی بیشی کے ساتھ روایت کی ہے۔

اہل سنت نے بھی امام مذکور اور دیگر ائمہ سے تفسیری روایات لی ہیں، جس کی تفصیل درجہ مشورہ میں مذکور ہے اسی طرح تفسیر شاہی میں بھی اس کا پورا ذخیرہ ہے،
ابنہ شیعہ حضرات نے ائمہ سے جو تفسیری روایات بیان کی ہیں اہل سنت کی روایات کے ساتھ بالکل سلی نہیں کھاتیں۔

مشہور ابن ابراہیم کی تفسیر مجتبیٰ، ابیان، محمد بن حسن طوسی کی تفسیر ابیان، تفسیر النعمان، تفسیر البیاض حیدر آملی کی الحیدر الاظم فی تفسیر القرآن المکرم، مقدار کی تفسیر کفر اعراف، احکام القرآن اور کسی اور کی تفسیر الاحکام۔
اب رہیں ان کی کتب حدیث، اخبار، تواریخ، کہنا ہے، اور اس کے پیچ جھوٹ کی بڑی ذمہ داری انہیں پر ہے کہ چار سو مصنفین کے چار سو نسخے تھے، جن کو اصول کہا جاتا تھا، رفتہ رفتہ وہ سب نسخے ضائع ہو گئے، پھر ایک جماعت نے ان نسخوں کا خلاصہ تیار کیا اور ان سے چند نسخے تیار کئے ان میں سے،

محمد بن یعقوب کلینی کی کافی۔ ابی جعفر محمد بن حسن طوسی کی تہذیب، الاستبصار،
محمد بن علی بن بابویہ قمی و جوان کے ہاں مدون مشہور ہے، کی من لا یحضرہ الفقیہ، ولیی کی معتبر سرائر اور ارشاد القلوب، علی بن جعفر کی قربہ الاسناد، کتاب المسائل،

حسن قمی کی نوادر برد نظمی کی جامع برقی کی کتاب المسائل اور ابن بابویہ کی کتاب العلل ابن شہر آشوب سوی مازنی کی دعاء الاسلام و کشف المقنع والاسلام المہیوف، کتاب العیاشی، فلاح السائل اور کتاب المناقب ابن معلم کی الارشاد معانی الاخبار، العباس ابی علی بن ابی جعفر طوسی کی کتاب الروضہ، کتاب المجالس، ابن فہد کی مدۃ الدوامی ابن طاہر کی کتاب الطرف ابن بابویہ کی کتاب المجالس، الفقیہ اور المجالس ابن مطہر علی کی الاستنصار۔ ابن عیاش کی کتاب اثنا اثنا فی ایلة القدر۔ برقی کی کتاب الفضائل۔ سعد بن عبد اللہ کی کتاب البعائر۔ ولیی کی اعلام الدین۔ راوندی کی مجمع البیان، البصائر الصغار، الجامع کتاب النوادر، غنقی الجہان، کتاب الجراح والحجاج ابی جعفر طوسی کی کتاب المجالس معانی الاخبار۔ ابن بابویہ کی نوادر الحکمة، کتاب الرحمة، ثواب الاعمال والفضائل، کتاب المعراج اور عیون اخبار الرضا، طوسی کی جامع الاخبار والحکمة اور مصباح اور ابن شریف واسطی کی اکمال الدین والنیون عقاب الآمال والامانی الہدایہ علی الشرائع والاحکام، احتیاج مشارق انوار البقیہ فی کشف اسرار امیر المومنین اور کتاب اللباب۔

یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اصول حدیث میں اس فرقہ کے ہاں کوئی کتاب نہیں تھی، نہ ان کے ہاں اس کے اصول و قواعد منضبط تھے نہ یہ روایات کو کسی کسوٹی پر پرکھتے تھے غرض اس معاملہ میں بہت غفلت سستی اور لاپرواہی ان کا شعار تھا ان کے اگلوں نے اپنے اسلاف کی کتابوں میں جو کچھ لکھا پایا بغیر جانچے پرکھے اس کو قبول کر لیا یہ انہوں نے کیا اور یہ سمجھ لیا کہ ان کے راویان اخبار و احادیث میں وہم خطا، نسیان اور کذب کا شک محال ہے اس سے

جب ان اختلاف نے اپنے ہاں کی روایات میں اختلاف بلکہ تناقض کو دکھا اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا تو اہل سنت کے اصول حدیث کو لے کر اور حسبِ منشا ان میں کچھ کمی بیشی کر کے چند ایسے قواعد بنا ڈالے جو ان کے اصول و دھن سے نہ ٹکرائیں، اور ان سے چند کتب مرتب کر لیں، ان میں سے ایک کتاب تو بدایہ فی علم الہدایہ ہے اور ایک اس کی طرح اور دوسری تحفۃ القاصدین فی معرفۃ اصطلاح المحدثین اسی طرح ان کے اسلاف کے پاس فنِ جرح و تعدیل میں بھی کوئی کتاب نہ تھی اس فن میں ان کے ہاں پہلی کتاب کٹھی ہے مگر بہت مختصر،

اس کے بعد ابو جعفر طوسی جال الدین بن طاووس کی مضامیری اور غاشی ہیں علامہ علی کی کتاب الخلاصہ اور ایضاح ہیں اور سن بن وادد کی کتاب نفعی الدین اس فن میں یہ کتاب بہت مفصل ہے، اصول فقہ میں ان کے ہاں مشہور معتد اور عمدہ اور ان دونوں کی شرحیں ہیں پھر علامہ علی کی مبادی اور اس کی شرح مقداد کی قواعد شیخ مقتول اور اس کی شرح زبدۃ الاصول اور اس کی شرح عراق و خراسان میں اس کی بہترین شرح مازنی کی مانی جاتی ہے اور ہندوستان میں مولوی احمد اللہ سندیلوی کی جواہروں نے صفر جنگ البر المفسرہ خال کے ہاں تقریب حاصل کرنے کی غرض سے لکھی تھی،

فقہ میں ان کی سب سے پہلی کتاب فقہ الرضا ہے، پھر ابن مطہر علی کی قرب المسائل، مبسوط اسناد غتہی الطب، تحریر تذکرۃ الفقہاء ابن بابویہ کی مقنعہ محمد بن علی بن ابراہیم کی، مقنعہ معتبر مکارم الاخلاق اور کتاب العطل۔ کر جکی کی کنز الفوائد ابن بابویہ کی کتاب الافعال مدینۃ العلم اور مجلس لکھنؤ کی فلاح المسائل اور جنتہ الامان ابن جنید کی لمعۃ اس کی شرح ایضاح خلاف تحریر ارشاد نافع اس کی شرح، نہایا، قواعد مصباح اور مختصر ابن فہد کی، فتاویٰ محقق اور مہذب۔ ابن بابویہ کی ایضاح القواعد غتہی شرائع اور اس کی شرحیں مدارک اور مسالک اور ان کے علاوہ علامہ مختلف معالم اور مجلس، شیخ مقتول کی دروس ذکر بی اور بیان باقر مجلس کی بخار الانوار،

وہ کتابیں جو ابن بابویہ نے اپنے اساتذہ کے حالات میں لکھیں یا غاشی نے اپنے رجال کی سیرت پر لکھیں ان سب کا اب نام و نشان بھی باقی نہیں، البتہ جن کتابوں کا ذکر اوپر آیا ہے بلا دایران میں رائج اور مستعمل ہیں اور ان کے اکثر نسخے یہاں بھی مل جاتے ہیں، یعنی ہندوستان برنالہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ (فائدہ ۱) واضح رہے کہ ان کے تمام علوم مثلاً کلام، عقائد اور تفسیر ان سب کی بناءً احادیث پر ہے اور دار و مدار محمد بن پر، اور باجماع اشاعتیہ احادیث کا پورا ذخیرہ چار کتابوں پر تقسیم ہے جن کو یہ اپنے ہاں کی اصح

الکتب کہتے ہیں اور جو اصول اربعہ کے نام سے مشہور ہیں، کافی جو لکھنی کر کے مشہور ہے۔ من لایحضرہ الفقیہ جہذیب، اور استبصار، ان چاروں کتابوں پر عمل کرنے کو انہوں نے صراحت کے ساتھ واجب و لازم قرار دیا ہے، یہ بھی انہوں نے صاف صاف کہا ہے کہ امامی کی روایت پر بشرطیکہ وہ محدثین کی روایت سے نہ ٹکرائے عمل واجب ہے چنانچہ ابو جعفر طوسی شریف مرتضیٰ اور فخر الدین مقلب بمحقق علی نے ان دونوں باتوں کو واضح اند غیر مبہم الفاظ میں لکھا

ہے اس لئے ان دونوں قاعدوں کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کیونکہ آئندہ بحثوں میں یہ بہت سی جگہ کام آئیں گے،

ان چاروں کتابوں میں باہم ایک دوسرے کے مراتب و درجات فضیلت میں علمائے اشاعرہ کا اختلاف ہے بعض کافی کو سب سے بلند درجہ سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے من لایحضرہ الفقیہ کو، اور ان کے خلاف نے جو اسلاف کے کلام کو پرکھنے میں زیادہ دسترس رکھتے ہیں ہر دو فریق بالا میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ اصول میں احسن کتب کافی انکیینی تہذیب اور استعمار ہیں، اور کتاب من لایحضرہ الفقیہ حسن ہے احسن نہیں ہے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان حضرات کے مذہب کا پورا پورا مدار و قرار ان چار کتابوں پر ہی ہے اصول فقائد فقہی مسائل اور امامت کے مباحث سب کے سب انہیں کتابوں سے لیتے اور ان ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں،

اب ہم ذرا ان کے اعتبار کی اسناد پر ایک تحقیقی نظر ڈال لیں اس میں تو شک نہیں کہ ان میں ہمہ رنگ راوی ملتے ہیں مجسہ مہرہ مثل ہشام بن اور صاحب الطاق جیسے راوی بھی ان میں ملتے ہیں جو دل میں اللہ تعالیٰ کو مبالغہ جانتے ہیں، جیسے زرارہ بن اعین، اخولین سلیمان جعفری محمد بن اسم اور ان کے ملاوہ ایسے بھی بد عقیدہ ان میں موجود ہیں، جو کسی بھی امام کو نہیں مانتے، یا امام وقت کو نہیں مانتے جیسے نجی فعال، ابن مہران اور ابن بکیر اور ان جیسے دوسرے روایات گھڑنے والے جن کے متعلق خود شیعوں کو اقرار ہے کہ ان کا ہی پیشہ ہے مثلاً جعفر فردی، ابن عیاش اور بعض ایسے ہیں جو ان کے خود کے نزدیک جھوٹے غلط گو ہیں مثل محمد بن عیسیٰ کے بعض ایسے جو کمزور اور نامعلوم الحال ہیں جیسے ابن عمار ابن سکان ابن سکر اور دیدیامی اور کچھ ایسے جو نا تحقیق الحال ہیں جیسے نفلس قاسم خذرا بن فرقد اور ان کے مثل پھر ان کی سندوں کی آخری کڑی ایسے لوگ ہیں، جو گناہ کے مرتکب ہی نہیں امامت کے غیب و غضب کا شکار بھی ہیں، جیسے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر یا سبط محبتی امام حسن رضی اللہ عنہ کے فرجی، یا سبط شہید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دغا دینے اور ان کے ساتھ بے وفائی کرنے والے چنانچہ کتاب کلینی ابن عیاش کی روایات سے بھری پڑی ہے اور یہ ابن عیاش وہی ہے جس کے متعلق سب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے، کہ وہ جھوٹا اور روایتوں کو گھڑنے والا ہے،

اسی طرح ابو جعفر موسیٰ ایسے راویوں سے روایت لاتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ براہ راست امام عالی مقام سے روایت کرتے اور انہیں امام کی صحبت بھی نصیب ہے، مگر امام کے دوسرے دوستوں نے نہایت شد و مد سے ان کی تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ ان کو کبھی بھی امام کی صحبت نصیب نہیں ہوئی، اور نہ ہی ملاقات، جیسے ابن مہران جو براہ راست امام صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرنے کا مدعی ہے مگر امام کے دوسرے دوست اس کو جھٹلاتے ہیں،

اسی طرح ابو جعفر طوسی ابن مسلم سے بھی روایت کرتا ہے اور وہ ابن بابویہ صاحب رقعہ مذکورہ سے،

اور حیرت تو خریف مرتضیٰ پر ہے، کہ پڑھا لکھا اور عقلمند ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کر بیٹھا کہ ہمارے فرقہ کی تمام احادیث درجہ تواتر تک پہنچ چکی ہیں، حالانکہ خود ان کے علمائے تمام کتابوں میں کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ سوائے حدیث من کذب علی متعیناً اَفَلَا یَتَوَقَّعُ مَقْعَدُکَ مِنَ النَّارِ جسے قصداً مجھ سے جھوٹ منسوب کیا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں

بنائے کوئی حدیث متواتر نہیں!

شیخ مقبول نے بھی اس کی تصریح کی ہے، بلکہ اگر کوئی انکی کتابوں کی چھان بین کرے تو اس پر یہ راز بھی کھلے گا کہ ان کی احادیث میں سے کوئی بھی حدیث حدیث متواتر کو نہیں پہنچی، بلکہ احادیث کے درجہ ہی سے آگے نہیں بڑھی اگر کوئی حدیث کسی جماعت سے لائی بھی گئی ہے تو اس حدیث کے راوی نہ الفاظ و حدیث میں متفق ہوتے ہیں نہ قریب قریب ہی پہنچتے ہیں، بلکہ پورا اختلاف موجود ہوتا ہے، اور وہ اختلاف واضعاً بھی اس درجہ کا ہوتا ہے کہ ان میں باہم تطبیق و موافقت دینا دشوار ہو جاتا ہے اور جب راویوں کی کثرت اس رنگ ڈھنگ کی ہو کہ ایک ہی واقعہ میں ہر راوی دوسرے سے مختلف الہیان ہو تو یہ بات حدیث کو درجہ صحت ہی سے گرا دیتی ہے، درجہ شہرت اور حدیث متواتر تک پہنچنے کا کیا سوال! پھر اس اختلاف و اضطراب کے ساتھ ساتھ ان کی سندوں کا سلسلہ ایسے لوگوں پر جا کر ختم ہوتا ہے جن پر یہ خود جھوٹ کی تہمت لگاتے ہیں،

ایک دوسری صورت انجیز بات یہ ہے کہ ان کے ثقہ حضرات کی ایک جماعت ایک حدیث روایت کرتی اور اسے صحیح قرار دیتی ہے پھر اسی جماعت کے ہم مرتبہ ایک اور جماعت اسی حدیث کو موضوع اور گھڑی ہوئی بتاتی ہے اور اسی سب روایات ان کی کتب صحاح میں موجود ہیں مثلاً ابن بابویہ نے ان احادیث کو موضوع بتایا ہے جو تحریف قرآن اور اسقاط آیات کے سلسلہ میں وارد ہیں یہی روایات کافی کہنی ہیں اس کے گمان کے مطابق صحیح سندوں سے لائی گئی ہیں اسی طرح ابن مطہر حل نے خبر لیلة التقریب اور خبر فی الیدین کے موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے جو کافی کہنی میں موجود ہیں اور شریف مرتضیٰ نے بڑے ذور دار الفاظ میں خبر یثاق کو جو اس کے استاذ الاستاذ ابن ابویہ اور محسن حسن صفار کی روایت ہے موضوع قرار دیا ہے حالانکہ ان کے خیال میں ان میں سے ہر ایک کی سند صحیح ہے،

اب جب سلسلہ کلام روایات و احادیث کے حال تک پہنچا ہے کہ جن پر یہ درحقیقت ان کے مذہب کا دار و مدار ہے اور وہ اپنے اوپر وارد شدہ تمام الزامات کو ان اخبار کے ذریعے ٹالتے ہیں، اور اسی بنا پر ان کے محدثین دوسرے علماء پر فخر کرتے اور اس پر خوشی منسوب کرتے ہیں تو اب یہ بات مناسب اور ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان کی اخبار و احادیث کا اصل حال جاننے کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا جائے کیونکہ ان جیسے معاملات میں استقلال اور تفصیلی بیان کے بجائے ضمنی اور اجابی بیان ناظر و سامع اور قاری کو مطمئن نہیں کیا کرتا اللہ ہی سے مدد و توفیق کی دعا ہے،

چوتھا باب

شیعوں کی احادیث کے اقسام

اور

راویان اسناد کے حالات

ان کے نزدیک حدیث کی اصل چار قسمیں ہیں (۱) صحیح (۲) حسن (۳) مؤثق اور (۴) ضعیف،

(۱) حدیث صحیح المصیح وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو اور وہ عادل امامی راویوں کے واسطے سے امام معصوم تک پہنچے ان کی اس تعریف سے مرسل اور منقطع مصیح سے خارج ہو گئیں حالانکہ انہوں نے اپنے کلام میں ان ہر دو کو مصیح کہا ہے، جیسا کہ کہتے ہیں راوی ابن حمید بن عیسیٰ کذا و فی مصیح ابن عبید کذا پھر مصیح کے بولنے میں عدالت کا لحاظ نہیں کرتے اگرچہ اس تعریف میں عدالت کو دخل ہے کہ روایت مجہول الحال کو مصیح کہہ دیتے ہیں مثلاً حسین بن حسین بن ابان کی روایت کو جو مجہول الحال ہے مصیح کہا ہے، چنانچہ علی نے منتهی میں اور تقی الدین بن داؤد نے اس کی تصریح کی ہے اور خلاصہ میں کہا ہے طریق الفقہاء الی معاویۃ بن مہیرۃ والی عابد بن حمس والی خالد بن نجیم والی عبد اللہ بن علی صحیحۃ (کہ فقہ کا سلسلہ سند معاویہ ابن مہیرہ اور عابد بن حمس اور خالد بن نجیم والی عبد اللہ بن علی صحیح ہے) حالانکہ مذکورہ ہر سہ راویوں کا ذکر کسی نے توثیق یا جرح میں نہیں کیا اور جو شخص کی تصدیق انہوں نے خود نہیں کی ہے بلکہ مصیح کے بولنے میں انہوں نے امامی ہونے کا اعتبار بھی درمیان سے اٹھا دیا ہے گویا انہوں نے مصیح کی تعریف کی تمام قیود سے غفلت برت کر ان کو نظر انداز کر دیا ہے،

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حسن بن ساعد کی روایت کو مصیح کہا ہے اور وہ مقتضب واقفی ہے اور امام وقت کی امامت سے منکر اسی طرح ابان بن عثمان کی روایت کو مصیح بتاتے ہیں، جو انطقی تھا اور امام وقت کی امامت سے منکر ہو کر دوسرے امام کو ماننا تھا ایسا ہی علی بن فضال اور عبد اللہ بن بکر کی روایات کو مصیح کہتے ہیں حالانکہ دونوں بد مذہب تھے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سب کچھ ان کے علماء و احوال رجال میں لاتے بھی ہیں، اور پھر بھی ان کی روایات بیٹے اور بالاتفاق ان کی توثیق و تصحیح بھی کرتے ہیں،

مثلاً ابن مطہر علی غلامۃ الاقوال میں کہتا ہے علی بن فضال کان فقیہاً بالکوفۃ و وجہہم و وثیقہم و عارفہم بالحدیث کہ علی بن فضال کوفہ کا فقیہ تھا اور ان سب میں سر بلند قابل اعتماد اور حدیث میں کافی درک رکھنے والا تھا، نہایت ہی کہتا ہے۔ لَمَّا اُخْتُلِیْ لَمْ اَعْلَمْ اَنْتَیْ فِیْہِمْ اِسْمٌ سِوَیْ عَلِیٍّ عَلَیْہِ سَلَامٌ (میں نے اپنے مقرر کردہ قواعد کے بموجب ان جلیسوں کی روایتوں کو موقوف ہونا چاہیے نہ کہ مصیح کیونکہ مصیح میں راوی کا امامی ہونا شرط ہے محض عدالت سے کام نہیں چلتا،

اور یہ تو اس راوی کی حدیث کو بھی مصیح کہہ دیتے ہیں جس کو امام معصوم نے بدو عادی ہو اور لعنت بھیجی ہو یا اس کے حق اخذاء اللہ قاتلہ اللہ یا ان جیسے کلمات فرمائے ہوں اس کے عقیدہ کی برائی بیان کی ہو اور خود کو اس سے بری اور بیزار ظاہر کیا ہو۔

یہ اس کی روایت کو بھی مصیح بتاتے ہیں جس نے امام وقت پر افتراء بانہا اور امام نے اس کو اس روایت میں جھٹلایا ہو جو اس نے ان سے کی ہو؛ بلکہ خود اس نے بھی اپنے جھوٹ کا اعتراف و افتراء کر لیا ہو، یہ مجسمہ مشبہ اور معرہ راویوں کی روایات کو بھی مصیح کہتے ہیں، جو اشد تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ جسم رکھتا ہے، مکان و جہت رکھتا اور صورت و شکل والا ہے۔ لہذا رکھتا ہے۔ اور یہ کہ ازل میں اس کے اندر یہ صفتیں نہ تھیں حالانکہ یہ سب باتیں بالاجماع کفر ہیں۔ اور کافر کی تو روایت ہی مہرگز قابل لحاظ نہیں چہ جائیکہ اس کو مصیح مانا جائے،

پھر ابن بابویہ کے نقل کردہ رقموں کی روایات کو اور ان خطوط کی جن کو یہ ائمہ کے بتاتے ہیں عمل میں اپنی صحیح الاسناد روایات پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ابن بابویہ نے اس کی تصریح کی ہے آئندہ بیان میں انشاء اللہ یہ سب کچھ سامنے آئے گا،

یہ اس شخص کی روایت کو بھی صحیح کہتے ہیں جس نے امام کے راز کو فاش کیا اور یوں خیانت کا مرتکب ہوا مثلاً ابی بصیر اس کا حال بھی انشاء اللہ ابھی آئے گا،

اور صحیح حدیث کا اطلاق ایسے شخص کی حدیث پر بھی کر دیتے ہیں جو کاذب الاسناد ہو کہ ایک شخص سے حدیث سنا ہے مگر اس کو منسوب اس کے باپ یا داد اسے کر دیتا ہے،

اور جس کے جہول الحال ہونے پر سب کا اتفاق ہے اس کی حدیث کو بھی صحیح کہتے ہیں مثلاً حسن بن ابان کہ ابن مطہر نے غتبہ اور مختلف میں اور شیخ مفقود نے دروس میں اس کی حدیث کو صحیح کہا ہے،

اسی طرح اس شخص کی حدیث کو بھی قابل اعتماد کہتے ہیں جس کی یہ خود تصنیف کرتے ہیں، جیسے غبر بن سنان جس کو یہ بہت ہی ضعیف شمار کرتے ہیں،

اور اس کی روایت کو صحیح کہتے ہیں جس کو امام اور شیعوں کے درمیان ایلیی ہونے کا دعویٰ ہوتا ہے، بغیر کسی گواہ یا دلیل کے بلکہ جس عادل امامی نے صاحب الامر کو دیکھا ہو اگرچہ ایلیی ہونے کا مدعی نہ ہو اس کی حدیث کو بھی صحیح بتاتے ہیں جیسے ابن سہریار اور داود جعفری تو یہ ہے چہرہ ان کی صحیح حدیث کا جو قوی ترین بلند ترین اقسام حدیث میں سے ہے،

(۲) حدیث حسن ابی ابی حدیث حسن کو بیٹے حسن کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں، کہ حدیث حسن وہ ہے جس کا سلسلہ سند متصل ہو، اور ایسے تعریف شدہ امامی کے واسطے سے وہ امام معصوم تک پہنچے جن کی عدالت پر تفریح نہ ہو۔

اس تعریف سے بھی یہ لازم آتا ہے کہ مرسل و منقطع حسن نہ ہوں۔ حالانکہ مرسل و منقطع کو حسن کہنا ان کے ہاں مشہور و معروف بات ہے، چنانچہ ان کے فقہائے تفریح کی ہے کہ زرارہ کی روایت مفید حج کے بارے میں جبکہ اس کی فضا کی جائے حسن سے، حالانکہ وہ روایت منقطع ہے اور یہ واقعہ ان کی احادیث میں بے شمار جگہ سے،

پھر یہ حسن کا اطلاق ان لوگوں کی روایتوں پر بھی کرتے ہیں جو تعریف سے یاد نہیں گئے مثلاً ابن مطہر کہتا ہے، *فَرَيْتُ النَّفْقَةَ إِلَى مُنْذِرٍ بِنِجَابٍ حَسَنٍ* کہ فقیہ کا سلسلہ سند منذر بن جبر تک حسن ہے حالانکہ منذر بن جبر کو اس فرقے میں سے کسی نے بھی تعریف سے یاد نہیں کیا یہی حال فقیہ کے سلسلہ سند کا اولین تک ہے،

یہ واقفوں کی روایت کو بھی حسن کہتے ہیں حالانکہ اس کا امامی نہ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے جیسے فقیہ کا سلسلہ سند سامع بن مہران تک جو واقعی تھا،

(۳) حدیث موثق ابی موثق جن کو قوی بھی کہتے ہیں کی تعریف یوں کرتے ہیں *مَا دَخَلَ فِي حَرْفِ نَفَقَةٍ مِنْ ثَلَاثَةِ الْأَفْعَالِ عَلَى تَوْثِيقَةٍ سَعَةٍ وَنَادٍ عَقِيدَةٍ مَعَ سَلَامَةٍ بَاقِيَةِ الطَّرِيقَةِ عَنِ الْقَنْعِ* (موثق وہ حدیث ہے جس کے سلسلہ سند میں وہ راوی ہے جس کی توثیق علمائے بالصرحت الاتفاق کی ہو اور اس کے عقیدہ میں خرابی ہو مگر باقی سلسلہ سند ضعیف سے پاک ہو اس میں بھی ان کو ضبط ہو گیا ہے، کہ انہوں نے سکونی کی روایت کو جو اس نے ابی عبد اللہ

(۴) حدیث ضعیف ۱۔ حدیث ضعیف کی تعریف ان کے ہاں یوں ہے، مَا أَشْتَقُّ طَرِيقَهُ عَلَى تَجَرُّدٍ بِالنِّسْبِ وَتَجَرُّدٍ آوِ تَجَرُّدٍ الْحَالِ۔ (مگر جس سند میں ایسا راوی ہو جو فسق یا اس جیسے کسی غیب سے متہم ہو یا جہول الحال ہو) صحیح پر عمل ۱۔ ان کے ہاں حدیث صحیح پر عمل بلا خوف واجب ہے۔ حالانکہ یہ خود اپنے خیال میں ایک روایت کو صحیح کہتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ شاذ ہے اگرچہ دوسری صحیح روایات سے اس کی تائید ہوتی ہو مثلاً سعد بن ابی خلف کی روایت ابی الحسن وکالم علیہ السلام سے ان الفاظ کے ساتھ، قَالَ سَأَلْتُهُ عَنْ بَنَاتِ الْإِسْنَةِ وَبَنَاتِ الْفُتُوحِ وَالْبَنَاتِ الْبَنَاتِ الْإِسْنَةِ۔ راوی کہتا ہے میں نے آپ سے نو اسیویں اور وادی کے حبس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا وادی کے لئے چھٹا حصہ ہے اور باقی نو اسیویں کے لئے ہے، یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے،

حدیث حسن پر عمل | حدیث حسن پر عمل کرنے کے بارے میں بھی یہ بات ہم مختلف رائے ہیں، بعض اس پر صحیح کی طرح مطلقاً عمل واجب قرار دیتے ہیں، چنانچہ شیخ الطائفہ کا یہی مذہب ہے بعض نے اس کو بالکل منع کیا ہے اور بیشتر لوگوں نے یہی مذہب اختیار کیا ہے بعض تفصیل کے قائل ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ حدیث کا مسنون اصحاب میں مشہور ہو تو اس پر عمل واجب ہے، اور نہ نہیں اور یہ حدیث موثق اور ضعیف کو بھی اس میں داخل کرتے ہیں فخر الدین بن جمال الدین بن مطہر نے یہی مسلک لکھا ہے اور معتبر میں اس کی تصریح کی ہے پھر اس کا شاگرد شیخ مقبول محمد بن علی اسی کے نقش قدم پر چلا ہے اور ذکر ہی میں اس کی تصریح کی ہے!

حدیث موثق پر عمل ۱۔ ان کے اکثر علماء نے موثق پر عمل جائز نہیں رکھا، باوجودیکہ ابن حجر اور ابن فضال کی روایات کو صحیح مانتے ہیں۔ اور واجب العمل بھی جیسا کہ پہلے گزرا اور غفر الدین اور ہاس کا شکر داس پر بھی عمل کو واجب العمل کہتے ہیں، مگر ان شرطوں کے ساتھ کہ شہرت سے اس کو تقویت مل چکی ہو یا ایک ہی جیسے یا قریب قریب الفاظ سے

وہ روایت رواج میں آگئی ہو اور اکثر و بیشتر کتب میں اس نے جگہ بھی پائی ہو اور علماء نے اسی روایت کے مضمون پر فتوے بھی صادر کئے ہوں۔

پس اس لحاظ سے تو اہل سنت کی اکثر احادیث جہاں کی کتابوں میں ثبت ہیں اور ان کے اندر شہرت یافتہ اور ان کے علماء کے نزدیک معنی بہ ہوں واجب العمل قرار پائے گی۔

حدیث ضعیف پر عمل ہا۔ ان کے افعال نے ضعیف روایت پر بھی عمل جائز قرار دیا ہے اگر وہ مشہور ہو جائے، بلکہ شیخ الطائف نے تو ناسقوں کی روایات کو بھی قابل عمل بتایا ہے اور اس میں شہرت کی بھی قید نہیں لگائی اسی طرح کلینی اس شخص کی روایت کو بھی قابل عمل بتاتا ہے جو صرف ائمہ کے اصحاب میں سے ہو گو وہ ان کی امانت کا منکر ہی کیوں نہ ہو حالانکہ ایسا شخص ان کے نزدیک کا فر ہے خصوصاً جب کہ امام نے اس کو دعوت دی اور اس نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا ہو،

پھر یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اکثر علماء شیعہ زمانہ ماضی میں اپنے اصحاب کی روایات پر ان کو جانچے پرکھے بغیر عمل کرتے رہے ہیں، رواۃ کے اچھے بے کی ان میں تیز ہی نہ تھی اس لئے رجال کے حالات یا ان کی اچھائی برائی میں ان کے پاس کوئی کتاب ہی نہ تھی۔ اور عرصہ دراز تک یہی حال رہا پھر کہیں جا کر شیعہ کے لگ بھگ کسی نے اسناد رجال اور ان کے حالات میں کتاب کیا مفسر سار سالہ لکھا۔ اس صورت حال سے ناظر کی حیرت اور تشویش اور بھی بڑھی کیونکہ وہ جرح و تعدیل میں متعارف احادیث تو بیان کرتا تھا لیکن ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے قاصر و عاجز رہتا تھا تو گریبا تب بھی رجال کے حالات پر اشتباہ کا پردہ پڑا ہی رہا۔

پھر عسائبر نے صنعاء پر کچھ گفتگو کی اس کے بعد نجاشی اور ابو جعفر طوسی نے جرح و تعدیل میں کتابیں لکھیں اور جمال الدین بن لماؤس ابن مطہر تقی الدین بن داؤد نے بھی اس سلسلہ میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے لیکن سب ہی نے تعریف و تہنیت کے ٹکڑاؤ اور تضاد کو دور کرنے میں غفلت اور سستی سے کام لیا اور کسی قوی دلیل سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے قاصر رہے۔

اسی لئے صاحب درایہ نے انصاف سے کام لیتے ہوئے جرح و تعدیل کے معاملہ میں ان لوگوں کی تقلید سے طبعی رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر جگہ وہ ایسے فرد کی تعدیل کر جاتے ہیں جو تعدیل کے بالکل بھی قابل نہیں ہوتا اور اس بات کا پتہ ان کی کتب اسناد رجال کے مطالعہ سے خصوصاً خلاصہ اول سے جو سارے ہی دفاتر کا خلاصہ ہے چلتا ہے، ان حالات میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ خود ان پر ہی ان کے رجال کے حالات نہ کھل سکے اور اتنے دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے باوجود ان سے اشتباہ کا پردہ نہ اٹھ سکا۔

اور پھر یہ ستم کیا کہ ان علماء رجال نے راویوں کے ناموں کو بدل ڈالا جس کی وجہ سے حدیث میں بھی اشتباہ پیدا ہو گیا مثلاً ابو نعیم کو ابو بصیر اور مزاحم کو مزاحم لکھ مارا، پس اس وجہ سے ان کے نزدیک مقبول الروایت اور غیر مقبول الروایت آپس میں گٹھڑ ہو گئیں۔ اور تیز سمع و غلط کی صورت نہ رہی،

ناموں کے تبدیل میں ابن مطہر سب کا گر گھٹال ہے، اس نے بہت سے ناموں کو بدل ڈالا ہمارے اس قول کی صداقت کی گواہی اگر کسی کو مطلوب ہو تو وہ ابن مطہر کا خلاصہ ایک طرف اور ایضاً الاشتباہ کو دیکھ کر ہی

طرف رکھنے پھر دونوں کا تقابلی مطالعہ کرتا جائے اور قدرت الہی کا تماشا دیکھتا جائے،
اس بے رعبی اور گڑبڑ پر مطلق ہو کر تقی المدین بن داؤد نے ہر غلطی پکڑی اور اپنے خیال کے مطابق اسکی تصحیح
بھی کی مگر پھر بھی قابل گرفت مقامات کی کافی تعداد حوالہ کی توں رہی دین ہمہ داغ داغ شدہ پلنبہ کا کجاہم کا معاملہ ہے
بات دراصل یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے محدثین نے حد درجہ غفلت اور سستی برتی اور عین غریبہ اس فن کی طرف
دین چاہئے تھی نہ رہی۔ (ہمارا خیال ہے کہ یہ غفلت دانستہ ہے کیونکہ اگر اسامہ الرجال کا ذخیرہ صحیح طور پر مرتب
ہو جاتا تو کتنی صحیح روایات ان کے ہاتھ آئیں، اور پھر اس مجلسازی کے کارخانہ کا کیا بنتا۔ اس کو چلانے کے لئے
عام مال کہاں سے میسر آتا؟)

متفرق اور متفق کی تمیز کا رواج ان کے ہاں تھا ہی نہیں اکثر مرتبہ راوی کا اپنے نام اور باپ کے نام کے ساتھ
کسی اور راوی سے اشتراک ہو جاتا ہے قرآن کے محدثین انہی مشترک ناموں کو کسی علامت سے ان میں تمیز کے بغیر روایت
میں ذکر کر جاتے ہیں، اور اس طرح ثقہ اور غیر ثقہ آپس میں گڑبڑ ہو جاتے اور مقبول الروایت وغیرہ مقبول الروایت ایک
دوسرے کے لباس میں نمودار ہوتی ہیں،

مثلاً ان کے تمام محدثین محمد بن قیس سے روایت کرتے ہیں حالانکہ یہ نام چار آدمیوں میں مشترک ہے ان میں سے
دو محمد بن قیس الاسدی جس کی کفایت ابی نصر ہے اور محمد بن قیس الجعفی جس کی کفایت ابی عبد اللہ ہے ثقہ ہیں تیسرا محمد بن
قیس الاسدی مدنی بن نصر ممدوح غیر موثق ہے، چوتھا محمد بن قیس جس کی کفایت ابو اعر ہے بہت ہی ضعیف ہے ابن بابوہ
اسی آخری راوی سے بہت روایات بیان کرتا ہے اور ان کو بغیر تمیز کے یوں ہی مطلق چھوڑ جاتا ہے۔ اس لئے لوگوں
کو لامحالہ دھوکا لگتا ہے اس قسم کی غفلت اور سستی میں شیخ الطائفہ سب کا سرگروہ ہے، اور دوسرے بھی اس کی تقلید
میں اس فکر کو پیٹے جا رہے ہیں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ان کی روایت خود ان کے ہاں قابل اعتماد نہیں رہیں
کبھی ایک روایت موثق آتی ہے تو اس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ وہ موثق ہے جس طرح سکونی نے ابی عبد اللہ سے روایت
کی اور کہا ہے، قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَعَثَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا عَلِيُّ لَا تَقَارِنُ
أَحَدًا أَحَدًا تَنْحَرُّهُ وَأَيُّدُ اللَّهِ لَا تَلْقَى اللَّهِ عَلَى يَدَيْكَ تَأْخُذُ خَيْرُكَ حَلَفْتُ عَلَيْكَ الْفَسْخَ وَغَرَبْتُ
وَلَدَكَ وَكَأَيُّهَا عَلِيُّ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ نَفَرَا بِكَ فَجَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي يَدَيْهِ كِتَابًا وَكَأَيُّهَا عَلِيُّ
يَكُنْ تَمَّاسًا كِي وَدَعَتْهُ دُورُ كَسِي سَعْدُ لَرْدُ اللَّهِ كِي قَمِ اِكْر اِكْ اِدْمِي بِي تِيرِي دَر بَر اِيْتِ پَالِي قُودِ اِن تَمَّ اِيْزِي
سے بہتر ہے جن پر آفتاب طلوع و غروب ہوتا ہے اور اسے ملی اس کی دلائل سے ہی لئے ہے،

پس اس روایت پر اس کے موثق ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کرتے اور حدیث ضعیف پر حوالہ کے ہاں بالاتفاق درجہ
موثق سے باقبار درجہ گری ہوئی ہے عمل کرتے ہیں اسکی یہ مثال ہے، تَذِي عُبَيْدِ بْنِ نُمَيْرٍ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ
عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ يُرْوَى عَنْ النَّبِيِّ هَلْ يَتَوَلَّى ثَاثٌ فَقَالَ لَنَحْدَا ذَاكَ اَنَّا أَبْرَاهِمَانُ وَجَهْمَا۔
د عبید بن ازہرہ نے ابی عبد اللہ سے روایت کی کہ آپ سے اس بچہ کے بارے میں جس نے ایک بچی سے شادی کر لی ہو
ہوں چھانگیا کہ کیا وہ دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر ان کے باپوں نے ان دونوں کا
نکاح کیا ہو،

اس فرق کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس سند میں ایک راوی قاسم بن سلیمان ہے جو مجہول العلیت ہے اس کے باوجود اس پر سب نے عمل کیا،

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں شیخ الطائف نے بہت آزادی دی ہے اور حدیث ضعیف پر عمل نہ صرف جائز بتایا ہے بلکہ واجب قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں عمرو بن حنظلہ کی حدیث پیش کی ہے کہ باوجود اس کے وہ حدیث ضعیف ہے مگر سب نے عمل کیا ہے،

ابن حنظلہ کی روایت کا ضعف اس لئے ہے کہ اس میں محمد بن عیسیٰ اور داؤد بن حصین دونوں بہت ضعیف ہیں، مگر ابن حنظلہ نے تعدیل و جمع کسی پر کوئی نص نہیں کی۔ ایسی حدیث کو مقبول المتن کہتے ہیں اور اس قسم کی احادیث ان کے ہاں اتنی ہیں کہ عدد شمار سے باہر پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی آزادی اور اتنی گنجائش کے باوجود حدیث موثق پر عمل نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے،

اور اس سے بڑھ کر یہ بات باعث تعجب ہے کہ کلینی میں ابو عبد اللہ سے مراسیل پر عمل کرنیکی صحیح روایت موجود ہے جو انشاء اللہ ہم نقل کریں گے اور خود انہوں نے صحیح و حسن میں اتعال سند کی شرط لگائی ہے اس کے باوجود بھی ابن ابی عمیر کی مراسیل پر عمل واجب کہتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ابن ابی عمر ثقات کے علاوہ کسی سے مراسیل روایت نہیں کرتا مگر ان کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اسی بنا پر بشری شرح ذکر کے مصنف نے اس معاملہ میں جہور سے نزاع کیا ہے،

علی بن ابی حمزہ اور عبد اللہ بن مغیرہ کی مراسیل کو بھی واجب العمل کہتے ہیں اور ان دونوں کا جو مال ہے وہ منقوب ظاہر ہو گا،

شیخ الطائف اور متاخرین میں سے اس کے شاگردوں نے سند کے اضطراب کو حدیث پر عمل کرنے میں مانع نہیں سمجھا ہے۔ اضطراب سند کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی راوی کی روایت الفاظ سند حدیث میں مختلف ہو ایک مرتبہ ایک طریق سے روایت کرے اور دوسری مرتبہ دوسرے طریقہ پر بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی پر کسی کو ترجیح دی جائے،

حالانکہ عقل بھی اضطراب محل سے مانع ہوتا ہے کہ دو مخالف اور باہم متضاد باتوں پر بیک وقت کسی طرح اور کیونکر عمل کیا جاسکتا ہے اور سبب ترجیح کے بغیر ایک کو دوسری پر ترجیح کس طرح دی جاسکتی ہے، ان کے اصولوں نے بھی سند کے اضطراب کو مانع عمل کہا ہے، اور ان کے محدثین نے اس پر اتفاق بھی کیا ہے کہ جب دو حدیثیں باہم مختلف ہوں تو ان میں وہ حدیث جو اس کے خط کی ہو اس حدیث کے لحاظ سے قابل ترجیح ہے جو سند صحیح سے مروی ہو چنانچہ ابن بابویہ نے اس پر نص کی ہے اور خط پر عمل کرنا اس کے خلاف ہے، جس کی کلینی نے صحیح سند سے روایت کی ہے،

اور پھر یہ بات ثابت کرنا بھی تو مشکل اور دشوار ہے کہ یہ خط امام کا ہی ہے اور احکام شرعیہ کو جن پر دین و ایمان کا مدار ہے اس قسم کی مشتبہ شہادت سے ثابت کرنا عقل سے بعید اور دیانت سے دور ہے، اور غالی شیعوں کی ایک بڑی جماعت نے تو اس حدیث گھڑنے کو جائز قرار دیا ہے،

چنانچہ ابو الخطاب یونس طلیان اور یزید بن صانع نے اپنے مذہب کی تائید میں بے شمار احادیث گھڑ لیں صاحب تحفۃ القاصدین فی اصطلاح الحدیث نے اس کو بڑے واضح اور صاف الفاظ میں لکھا ہے،
ان میں سے ایک نبان مہدی ہے جو امامیہ کے شیوخ میں سے ہے اور ان کا مجتہد ہے مگر پرے درجہ کا بڑا گہرا زندقہ ہے اور دوسرا متغیرہ بن سعید سنجی جو کوفہ کا رہنے والا اور جھوٹا جادوگر ہے یہ دونوں حدیث گھڑنے میں بدنامی کی حد تک مشہور ہیں ان دونوں کو خالد بن عبداللہ القری نے قتل کر کے جلا دیا۔ ان کی عادت تھی کہ جب کسی معاملہ میں ان کی کوئی رائے ہوتی تو اسی کے موافق حدیث گھڑ لیتے،

یہ لوگ عبداللہ بن میمون قداح سے بھی اپنی کتابوں میں بہت سی روایات لاتے ہیں، صاحب معالم الاموال تو ابتداء بطلون تبرک اس کی چند حدیثوں کو اپنے ہاں لایا ہے، حالانکہ گذشتہ اوراق میں معلوم ہو چکا ہے کہ بڑا گھاگ زندقہ اور مجسمہ کذاب تھا علاوہ انہیں ان رجال میں باطنیہ اسماعیلیہ اور قرامطہ بھی اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اگر ان کے مقتداؤں اور پیشواؤں کے تفصیلی حالات ضبط تحریر میں لائے جائیں تو طویل و ضمیمہ دفتر درکار ہوگا یہاں بطور نمونہ فقوڑا سا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے،

قاصی نور اللہ شوستری زرارہ بن اعین شیبانی کوئی کے حالات میزان ذہبی سے نقل کرتا ہے، مگر اس پر سکوت اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے،

زرارہ بن اعین شیبانی کوئی برادر حمران رافضی تھا عقلی نے جو منفا میں سے کہا کہ مجھ سے یحییٰ بن اسمعیل نے حدیث بیان کی اس نے یزید بن خالد ثقفی سے اس نے عبداللہ بن خالد سعیدی سے اس نے ابی مباح سے اس نے زرارہ بن اعین سے اس نے محمد بن علی بن عباس سے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اے علی مجھ کو کوئی تیرے سوا نسیل نہ دے

"حدیث بیان کی مجھ سے یحییٰ نے اس سے اس کے باپ نے اس سے سعد بن مسعود نے اس سے ابن السمان نے وہ کہتا ہے کہ جب میں حج کو گیا تو میری ملاقات زرارہ بن اعین سے قادسیہ میں ہوئی وہ مجھ سے کہنے لگا کہ مجھے تجھ سے بہت ضروری کام ہے اور اس کی بڑی اہمیت جاتی۔ میں نے پوچھا وہ کام کیا ہے تو کہنے لگا کہ جب تیری ملاقات جعفر بن محمد سے ہو تو پہلے تو ان کو میرا سلام کہنا پھر میری جانب سے پوچھنا کہ میں کونہ خیوں میں سے ہوں یا جنتیوں میں سے میں اس کی بات پر حیران ہوا اور اس سے کہا وہ کیسے بتا سکتے ہیں تو کہنے لگا کہ وہ اس کو جانتے ہیں پھر جب میں جعفر بن محمد سے ملا تو ان کو یہ سارا قصہ سنایا تو آپ نے جواب دیا کہ وہ دونوں میں سے ہے میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا تو کہا کہ اس کی بد عقیدگی سے!"

قاصی نور اللہ شوستری نے لکھا ہے کہ زرارہ کے چار بھائی تھے ۱، حمران ۲، عبدالملک ۳، بکیر ۴، عبدالرحمن ۵ اور دو بیٹے حن اور حسین۔ حمران کے دو بیٹے تھے حمزہ اور محمد عبدالملک کا صرف ایک بیٹا حریش تھا، بکیر کے پانچ بیٹے عبدالرحیم، عبدالجلیل عبدالاعلیٰ اور عمرو قاصی کے قول کے مطابق یہ ان سب کا وہی عقیدہ تھا جو زرارہ کا تھا، پھر قاصی نور اللہ نے عصابری سے جابر بن جعفر بن یزید جعفی کوئی کا حال نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ جعفر خود وثوق ہے لیکن اس کی اکثر روایات جو اس سے نقل ہوئی ہیں ضعیف ہیں، قاصی نے اس کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے

حضرت امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد لوگوں پر اس راز کا انکشاف کیا کہ امام سوموف نے اپنی زندگی میں مجھے دو کتابیں دی تھیں، ایک کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی تھی کہ بنو امیہ کے زمانے تک قراس کی روایت نہ کرنا اگر تو نے اس کے خلاف کیا تو تجھ پر خدا کی لعنت ہو، البتہ ان کے عہد کے بعد اس کی روایت کر سکتا ہے دوسری کتاب کے متعلق ارشاد فرمایا کہ قراس کی روایت کسی سے بھی قطعاً نہ کرنا میں نے اس بھیید کو حتی الامکان چھپایا مگر جب تاب برداشت نہ پاسکا اور ضبط راز کے سبب میرے پیٹ میں مروڑ اٹھا تو میں نے ایسے بیابان کا رخ کیا جہاں انسان کا گزرنہ تھا وہاں میں نے اس کتاب کی روایت کی تو مجھے اس مروڑ سے چھٹکارا ملا۔ اب میں اس کتاب کو لوگوں پر ظاہر کر رہا ہوں جس کی روایت کی تو مجھے اجازت مل چکی ہے۔ قاضی یہاں یہ بھی لکھتا ہے کہ ولید کے بارے جانے کے بعد ابھی بنی امیہ کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ جابر نے مسجد میں جا کر اس کی روایت کرنی شروع کر دی یہ حرکت چونکہ امام کی ہدایت و حکم کے خلاف تھی اس لئے وہ مروڑ خدا کی لعنت کا شکار ہوا ہو گا،

اب جب گفتگو ان کے رجال کے حالات تک آپہنچی ہے تو ضروری معلوم ہوا کہ ان کے بعض راویوں کے حالات نقل کر دیئے جائیں،

اول تو یہ بات جان لینی چاہیے کہ شیعوں کے ہر فرقہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے پاس روایات کا جو ذخیرہ ہے وہ سب اہل بیت سے لیا گیا ہے، اور نہایت صحیح و معتبر ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ من گھڑت اور بے اصل ہے اور ان کا آپس میں ایک دوسرے کو جھٹلانے کا یہ رویہ ابتدا ہی سے ہے اور اب تک جاری ہے اس کا ایک ہی نتیجہ ہے کہ ان سب ہی سے اعتبار و اعتماد اٹھ گیا ہے دوسری طرف زید، اسماعیلیہ اور امامیہ جو ایک دوسرے سے ٹٹتے جھگڑتے اور باہم یک دگر تکذیب کرتے رہے ہیں ان کے قلعے مشہور و معروف ہیں، اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ امامیہ کے اسلاف اور ان کے مقتداجوان کے عہد میں سندوں کی آخری کڑیاں ہیں، مثلاً ہشام بن حکم، ہشام بن سالم جو ایققی اور صاحب الطاق یہ خود آپس میں ایک دوسرے کی تکذیب کرتے ایک دوسرے کی روایات کو جو ہر سرائفہ امام سجاد، امام کاظم اور امام صادق رحمہم اللہ سے مروی تھیں غلط ثابت کیا کرتے، اور ایک دوسرے کو گمراہ اور کافر قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ہشام بن حکم نے جو ایققی اور صاحب الطاق کے رد میں ایک کتاب لکھی، جس کا غاشی نے بھی ذکر کیا ہے، لہذا ان سب کی احادیث درجہ اعتبار سے ساقط ہو گئیں اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے شیعوں کا حال پہلے گزر ہی چکا کہ سب کے سب گناہ گبیرہ کے مرتکب تھے اور آخر تک امام وقت کی نافرمانی پر مجھے رہے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو رنج پہنچاتے رہے اور آئندہ بھی ان کو جھوٹا قرار دیتے رہے اور ان کے قول کی ہرگز تصدیق نہ فرماتے۔ ان میں بعض نے جناب حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی امداد سے کنارہ کشی ہی نہیں کی جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور جناب یزید سے خفیہ حفظ کتابت رکھی اور یوں دین فروش کر کے دنیا کے خریدار بنے اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جنہوں نے اپنے اموی کے ساتھ ایسی نازیبا اور ناشائستہ حرکات کی ہوں ان سے دین لینے اسلام کا پیشوا بنانے اور ان کی روایات کو وقعت کی نظر سے دیکھنے کا کیا جواز رہ جاتا اور کیا وجہ بیان کی جاسکتی،

پھر ان کا آپس کا اختلاف و تعارض اور ان کی احادیث میں اضطراب اس درجہ کا ہے جس کی کوئی حد ہی نہیں چنانچہ من لا یحضرہ الفقیہ اور استبصار کے مطالعہ سے اس بات کا پورا انکشاف ہوتا ہے غرض ہر علمند اس قدر اختلاف، تعارض

اور اضطراب کے ہوتے ہوئے کسی جانب کی حدیث پر بھی عمل پیرا نہیں ہو سکتا،
خود ان کے شیخ الطائفہ بھی اس امر کے اعتراف پر مجبور ہوئے کہ جن احادیث صحیحہ، دلیل لاتے ہیں ان کی سندوں میں
ضعیف، نامعلوم الحال، مجھوٹے اور حدیث گھڑنے والے موجود ہیں،
ان سب واقعات کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد اب ذرا تفصیل کی طرف توجہ دینی چاہیے اور اس خانہ ہمہ آفتاب
کی تصویر دیکھنی چاہیے،

جعفر بن محمد بن عیسیٰ ابن شاپور تواریری جسکی کنیت ابن عبداللہ ہے، جھوٹا اور منہ حدیث ہے پھر بھی ان کے ثقہ اس کی روایات قبول کرنے اور اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں۔

[illegible]

اسی طرح حسن بن عیاش بن جریش رازی جس نے جعفر ثانی سے روایت کی ہے بہت ضعیف ہے **وَأَنَا أَذِلُّ لَنَدِّهِ فِي لَيْلَةِ الْقَدَرِ**، اسی کی تصنیف ہے جس میں منطرب الالفاظ حدیثوں کی روایات لایا ہے، اس کے باوجود بھی کلینی نے اس سے چند حدیثوں کی روایت کی ہے جبکہ کلینی کی کتاب ان کے ہاں صحیح ترین شمار ہوتی ہے، حدیثیں گھڑنے والا علی بن حسان بھی ہے، **قَالَ النَّبَاشِيُّ ضَعِيفٌ جِدًّا أَذْكَرُ بَعْضُ أَصْحَابِنَا فِي الْغُلَاةِ فَاسِدٌ** **الْغُلَاةُ** لکے کتاب **تَفْسِيرُ الْبَاطِنِ تَحْلِيلٌ كَلْبٌ**، رہنمائی نے کہا وہ بہت ضعیف ہے۔ ہمارے بعض نے اس کو بد عقیدہ غلّاء میں سے بتایا ہے اس کی تفسیر میں ایک کتاب تفسیر الباطن کے نام سے مشہور ہے جو از سر تا پایا بے ربط اور بے جوڑ ہے، حالانکہ اسی سے کلینی نے اپنی صحیح میں روایت لی ہے،

ایک ایسا ہی شخص محمد بن عیسیٰ ہے جس کے متعلق نصر بن صبراح نے کہا ہے وہ جھوٹا تھا حالانکہ ابو عمرو کشتی اور دوسروں نے اس سے روایت بیان کی ہے

اور ایک نام عبدالرحمن بن کثیر دمشقی کا ہے اس کے بارے میں بخاشی کہتا ہے کہ ہمارے اصحاب کے اس پر ناک
 صحوں چڑھائی ہے کہ یہ تو حدیثیں گھڑتا ہے پھر بھی ان کے ثقہ حضرات اس سے روایت کرتے ہیں مثلاً حسین بن علی بن فضال
 وغیرہ اور کلینی ابن بابویہ اور محمد بن حنطوسی نے بھی اس کی روایت قبول کی ہیں ہشامی اور ان کے ہم عصروں کے
 حالات میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم اور صورت مانسنے میں ائمہ پر صاف اور کھلا بہتان باندھتے
 ہیں چنانچہ حضرت امام علی رضا رحمۃ اللہ علیہ نے اس افتراء اور بہتان پر گواہی بھی دی ہے پھر بھی ان کے محدثین کا سارا
 دار و مدار انہیں پر ہے،

ان کے وہ راوی جو مجہول اور ضعیف ہیں اور فقہی مسائل میں یہ جن سے حوالے اور حجت لاتے ہیں بے حدود بے شمار ہیں، ان دونوں میں سے نمونہ کے طور پر ہم چند نام گنتاے ہیں، ان میں سے ضعیف یہ ہیں،

شیعوں کے ضعیف راوی ابو ابراہیم بن صالح انطاکی، ابواسحاق احسن بن اہل نوفلی، احسن بن راشد طفاوی، اسمعیل بن عمران بن ابابیل لینی، اسمعیل بن یسار، اٹخی حسین بن احمد منقری، اور جاعن بن سعید خثعی یہ ضعیف کے ساتھ فاسد بھی ہے اس سے کلینی نے روایت لی ہے عثمان بن عیسیٰ اس سے شیخ الطائفة اور دوسروں نے روایت کی عمر بن شمر اس سے ایک جماعت نے روایت کی ہے، جیسے طوسی وغیرہ سہل بن زیاد اس سے ابو جعفر نے بھی روایت کی ہے اور اس کی روایت پر اعتماد کیا ہے، اس کے باوجود کہ اس کے ضعف پر سب نے اتفاق بھی کیا ہے ابراہیم بن عمر دیلمی اور داؤد بن یزید بن عقیق جو ضعیف اور فاسد ہے، اس سے طوسی نے تہذیب اور استبصار میں اور دوسروں نے بھی روایت کی ہے صالح بن حماد امیر جس کی کفایت ابو خدیجہ ہے معاویہ بن عبیدہ، عابد بن احمد بن محمد بن عیسیٰ داؤد بن حصیل علی بن حمزہ، رقیہ بن مصدق، حسین بن یزید، اہرق اسمعیل بن زیاد، سکونی، واہب بن وارب اور حسین بن عبیدہ اور ان جیسے بے شمار دوسرے، مگر جن کے ضعف اور بطلان کے تمام علمائے حدیث اور خصوصاً علمائے جرح و تعدیل کا اتفاق ہے، مثلاً غیاثی، عفا بری، نقی الدین بن داؤد، بسکی اور علی جیسا کہ اس نے خلاص میں ذکر کیا ہے اور اس سب کچھ کے باوجود ان کے محدثین نے ان ہی راویوں کی روایتوں سے اپنی صحاح کا پیٹ بھرا ہے اور پھر ان کے فقہان ہی روایات سے استدلال کر کے اپنے فقہی مسائل ہی نہیں اعتقادات کو بھی ثابت کرتے ہیں،

شیعوں کے مجہول راوی | اب رہے ان کے مجہول راوی تو ان کا شمار و حساب نہیں ہے مثلاً احسن بن ابان کہ اس کی حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے، حالانکہ ابن مطہر نے مختلف اور منتہی دکتاؤں کے نام میں، اور شیخ مقتول نے دروس میں اس کی جہالت کی تصریح کی ہے، اسی طرح قاسم ابن سلیمان اور عبد بن حنظلہ دونوں مجہول ہیں دکن مرا عمر بن ربیع بن حسین بن علا اور ابن ابی العالیہ، تینوں مجہول الاسم بھی ہیں اور ان کی شخصیت بھی مجہول ہے، اور عباس بن عمر ثقفی، فضل بن سکن، علی بن عقبہ بن قیس بن سمان، ہاشم بن ابی عمار حسینی، بغیر بن یسار، یساری موسیٰ بن جعفر فضل بن سکرہ زید الہامی سعید بن زید عبد الرحمن بن ابی ہاشم، یحییٰ بن ابی بکر، فیح بن زید، محمد بن سہیل، عبد اللہ بن یزید، غالب بن عثمان ابی حبیب لاری ابی سعید الکمار، ارکان بن فرقہ، حسن ثقفی، قاسم بن خزاز، صالح سعدی، علی بن وکیل، حسین بن علی بن ابراہیم، ابراہیم بن محمد حسن بن علی، اسحاق الثوری، عثمان بن عبد الملک، عثمان بن عبد اللہ، عیسیٰ بن عمر مولیٰ الانصار، ربیع بن محمد سلمی، علی بن سعد السعدی، محمد بن یوسف بن ابراہیم، محمود بن میمون اور خضر بن سوید ابن جعفر بن کلاب،

پس یہ سب کے سب اور ان جیسے ان گنت راوی مجہول ہیں، مگر شیعوں کے شیوخ مثلاً علی بن ابراہیم اور اس کا بیٹا ابراہیم محمد یعقوب الکلبی، ابن بابویہ، ابی جعفر طوسی، اسکا استاد ابی عبد اللہ ملقب بہ مفید نے اپنی کتابیں جنہیں یہ صحاح کہتے ہیں انہی مجہول الحال راویوں سے بھری ہیں جن کو ان کے مجتہدین نے واجب العمل قرار دیا ہے اور یہ ممکن کیا ہے کہ یہ علم یقینی کو مفید ہیں، جیسا کہ مرتضیٰ طوسی اور علی نے اس کی تصریح کی ہے،

اور حد درجہ تعجب و حیرت ہے کہ ان کے علمائے حدیث ایسے راویوں سے روایت کرتے ہیں جن کی تکذیب علی اسماء اللہ حال نے کی ہے۔ جیسے عبد اللہ بن مسکان جو ابی عبد اللہ سے روایت کرتا ہے اس کی چند حدیثیں محمد بن یعقوب کافی میں ابن بابویہ نقیہ میں، ابو جعفر تہذیب میں اور دوسرے اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں جب کہ غیاثی کہتا ہے کہ یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ اس نے ابی عبد اللہ سے کسی بھی چیز کی روایت کی ہو اور یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں

امامیہ میں خوب مشہور ہے۔ محمد بن عیسیٰ بھی اسی زمرے میں آتا ہے جو محمد بن محبوب اور دوسروں سے روایت کرتا ہے۔ ابو عمر کشی نے اس کے بارے میں کہا ہے نصر بن جراح کہتا ہے کہ محمد بن عیسیٰ محمد بن محبوب سے عمر میں اس قدر چھوٹا ہے کہ اس سے روایت کرنا قریب قیاس ہی نہیں، محمد بن عیسیٰ بن عبد یقین بھی اسی قاش کار اوی ہے جس کے متعلق محمد بن بابویہ قمی نے ابن الولید سے یہ قول نقل کیا ہے۔ **وانہ قال ما انفرد بہ محمد بن عیسیٰ من حدیث یونس وکتبہ لہ یعد علیہ۔** (ابن الولید نے کہا محمد بن عیسیٰ جو حدیث یونس سے روایت کرے اور وہ اس میں تنہا ہو، اس کو اگر وہ لکھ بھی لے تب بھی اسی پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے)۔

محمد بن احمد بن یحییٰ بن عمران الاشوی القمی بھی اسی قاش کار ہے اس میں بغاشی اور دوسروں نے عیب لگایا ہے اور کہا ہے کہ وہ ضعیفوں سے روایت کرتا ہے، اور جس سے روایت کرتا ہے اس کی اچھائی برائی سے سروکار نہیں رکھتا اور مراسیل پر اعتماد رکھتا ہے،

پھر ان کے بعض معتبر راوی اسناد میں ارسال کرتے ہیں جیسے ابن ابی عمیر نظیری، اور عبد اللہ بن شہیرہ اسانکھ ان کے نزدیک ارسال کبیرہ گناہ ہے۔

ابن یعقوب کلینی اور دوسرے علماء حدیث ابی عبد اللہ رحمہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا شاخ در شاخ جھوٹ کیا ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم سے کوئی شخص حدیث بیان کرے اور جب تم وہ حدیث بیان کرنے لگو تو جس نے تم سے کوئی حدیث بیان کی اس کا نام تو درمیان سے نکال دو اور اس شخص نے جس شخص سے وہ حدیث تمہیں سنائی تھی تم اس سے روایت کرنے لگو،

ان کے معتبر راویوں میں سے بہت سے وہ ہیں جو امام وقت کے منکر ہی نہ تھے بلکہ ان کے خلاف دل میں دشمنی رکھتے تھے۔ اور اکثر امامیہ شیعوں کے نزدیک ان کا یہ برا عقیدہ پایہ شہرت تک پہنچ چکا تھا، مثلاً واقفیہ میں سے حسن بن محمد سماعہ ابو محمد الکندی المیرنی۔ یہ وقت کے محالہ میں دل میں دشمنی اور تعصب رکھتا ہے، حسن بن محمد سعید ہاشم بن حیان المسکری ابو عبد اللہ، حسین بن مہران بن محمد بن ابی نصر اسکونی، احمد بن محمد البطاحی الحیری جو طائری کے لقب سے مشہور ہے، صفوان ابن یحییٰ ابی محمد البعلی، عثمان بن عیسیٰ ابی حمزہ العامری الراسی، مولیٰ بنی رواس وغیرہ وغیرہ جارود یا فطیہ میں سے۔ مثلاً احمد بن محمد بن سعید سبیعی ہمدانی، حسن ابن علی بن فضال، عبد اللہ بن بکر بن اسین شیبانی، اور عمرو بن سعید ابی الحسن مدائنی اور ان جیسے دوسرے۔

ان سب سے شیعوں کی حدیث کی صحیح کتابوں میں روایات موجود ہیں، شیخ مفقوت نے ذکر کر دی ہیں یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت صادق نے عبد اللہ بن مسکان کو اپنے پاس آنے سے روک دیا تھا۔ اور یہ پھر بھی ان سے روایت کرنے سے باز نہیں آیا۔

ابو جعفر طوسی عدہ میں لکھتا ہے، یعنی اعفائے بدنی سے سرزد شدہ بدکاریاں روایت کے قبول کرنے میں حارج نہیں،

اور اس کا تو کوئی حواز ہی نہیں کہ نصرانیوں تک سے ان لوگوں نے حدیث کی روایت کی اور اسے قبول کرتے اور ان کو اپنے ائمہ کا دوست سمجھتے ہیں مثلاً ذکر یا بن ابراہیم نصرانی کہ اس سے طوسی اور دوسرے لوگوں نے

پھر ایک بات اور بھی ہے جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کی کتابوں کی چھان بین کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی اکثر احادیث آحاد ہیں نہ متواتر اور مشہورہ اور وہ آحاد بھی ضعیف ماجن ہیں سے کچھ دوسرے صحیح سمجھتے ہیں

کچھ کو موثق اور حسن اسادیتہ خود ان کے نزدیک ضعیف ہیں۔
 گویا خود ان ہی کے خیال کے مطابق ان کی کتب میں صحیح و حسن حدیثیں نہیں ہیں ان کے صرف عقلی مفہومات ہیں
 خارج و ظاہر ہیں ان کا کوئی جواب نہیں ہے، چنانچہ یہی بات صاحب ہدایہ نے صراحت سے بیان کی ہے۔ چلئے یہ سب
 سہی مگر ان کی ضعیف اور موثق حدیثیں بھی تو اس قسم کی ہیں کہ آپس میں ایک دوسری سے متعارض اور مخالف ہیں اور ان
 کی اسناد و متون ہر دو میں اضطراب ہے۔

شیخ ابو جعفر نے جس طریقے سے ان متعارض روایات کو جمع کرنے اور تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور پھر ایک کو دوسرے
 پر ترجیح دی ہے وہ درحقیقت اہل تحقیق و اہل نظر کے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز ہے ہم اس میں سے صرف ایک نمونہ بطور
 نمونہ ذکر کرتے ہیں دوسرے مسائل اسی پر قیاس کر لئے جائیں،

ان کی اکثر روایات میں آتا ہے کہ گلاب کے پانی سے وضو جائز ہے، اور بہت سی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جائز
 نہیں ہے اس کے بارے میں شیخ ابو جعفر کہتا ہے کہ صحیح تو یہ ہے کہ وضو درست نہیں اور حسن روایات سے جواز معلوم
 ہوتا ہے، ان سے مراد عرق گلاب نہیں بلکہ وہ عام پانی مراد ہے جس میں کچھ پھول ڈال دیئے گئے ہوں،
 لہذا ان مذکورہ اسباب سے ان کی روایات خود ان کے آگے گمان کے مطابق نہ قابلِ محبت ہیں نہ لائقِ اعتماد پھر
 مخالفین کی کیا منہ لے کر مخالفت اور مقابلہ کرتے ہیں،

یہ حال تو ان ظاہر السنہ روایات کا تھا، جو ظاہر اور عالم وجود میں آئے ہوئے ائمہ ظاہرین سے مروی ہیں کہ جن
 کے وجود میں کسی نے شک نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ملاقاتیں کیں ان کو دیکھا اور ان سے بھلا م ہوئے،
 اب شیعوں کی ان روایات کا حال سنئے جو صاحب الزماں سے مروی ہیں، اول تو امامیہ کے نزدیک ان کی پیدائش
 ہی بالاتفاق ثابت نہیں، کیونکہ بعض ان کی پیدائش سے انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں امام حسن عسکری نے کوئی پس
 ماندہ نہیں چھوڑا۔ یہ منکر بن جعفر یہ ہیں اس لئے کہ وہ حسن بن علی عسکری کی وفات کے بعد جعفر بن علی الہادی کی امامت
 کے قائل ہیں، ایک طائفہ ان بزرگوار کے وجود کا تو البتہ قائل ہے مگر ان کے بقا و حیات سے منکر ہے اور کہتا ہے
 کہ وہ بچپن ہی میں وفات پا گئے، پھر جو ان کو بلوغ تک پہنچاتا ہے ان کے درمیان بھی مختلف الحیالی پائی جاتی ہے بعض کہتے
 ہیں کہ بابت نماز اچانک انتقال فرما گئے بعض کہتے ہیں کہ کس وقت غائب ہوئے بعض ۲۵۷ھ بتاتے ہیں تو بعض دوسرے
 ۲۶۵ھ یا ۲۶۶ھ پھر مکان غیبت کے بارے میں بہت اختلاف ہے ان کے ثقات مثلاً محمد بن یعقوب کلینی اور اس کے
 ہم خیال اکثر شیعہ متقدمین کہتے ہیں کہ ان کا مکان غیبت بجز خال خال شیعہ کے کوئی نہیں جانتا،

پس اب یہاں ان کا خاتمہ تباہی اور پریشانی پر ہے کیونکہ ان کے اسناد کی آخری کڑیاں یا جائے انتہا ایسے لوگ ہیں جو خود
 کو امام کی غیبت مغربی کے زمانہ میں جس کی مدت جو ہتر برس ہے، سفرائے ائمہ کہتے ہیں۔ اول سفیر ابو عمرو عثمان بن سعید ہے اس
 کے بعد اس کا بیٹا ابو جعفر محمد بن عثمان جو ۳۲۸ھ میں فوت ہوا، اس کے بعد ابو القاسم حسین بن اوج جو ماہ شعبان ۳۳۸ھ میں مرا
 اور آخری سفیر علی بن محمد ہو جس کو خاتم السفراء کہتے ہیں، اس کے بعد غیبت کبریٰ کا زمانہ شروع اور سفارت کا سلسلہ ختم ہو گیا،
 اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان میں سے جس کسی نے بھی سفارت کا دعویٰ کیا خالی خالی اپنے دعوے کے اپنی سفارت پر کوئی
 گواہ پیش نہ کر سکا اور اس پر مارے شیعوں کا اتفاق ہے،

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نفس انسانی میں جب جاہ اکثر اس دعویٰ کا سبب ہوتا ہے خصوصاً جب اس پر دلیل و گواہ کا مطالبہ بھی نہ ہو تو پھر دعویٰ کا میدان بہت وسیع و فراخ ہوتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ امام صاحب الامر سے روایت کرنے میں سفراء کا واسطہ بھی چنداں ضروری نہیں بلکہ جس نے صرف یہ دعویٰ کیا کہ اس نے جناب کو دیکھا ہے اور اس کو گرفتار سے کوئی سرکار نہ ہو اس کی روایت بھی ان کے ہاں معتبر اور واجب القبول ہے۔ چنانچہ ابو ہاشم داؤد بن ابی القاسم جعفری، محمد بن علی بن ہلال، احمد بن اسحاق، ابراہیم بن مہرہ اور محمد بن ابراہیم وغیرہ انہوں نے صرف روایات کا دعویٰ کیا اور آفتاب سے عجیب و غریب روایات بیان کیں پھر بھی انہوں نے ان روایات میں کسی احتمال و شک کو دخل دینے بغیر ان کو بسوچ سمجھ قبول کیا۔ یہ بات دراصل ان جیسے بلند باگ دعویٰ کرنے والوں کے لئے عبرت کا مقام ہے کہ ایک طرف تو دروغ گوئی خطا و لغزش سے اس قدر احتیاط اور اس درجہ گریز کا دعویٰ کر اسی مقصد کی خاطر امام کا تقرر خدا تعالیٰ پر واجب و ضروری قرار دیا اور خدا امام کی فضیلت و عظمت پر فیض متواتر کی شرط رکھی،

اور دوسری طرف دین کے اہم معاملات میں ایسے بے اصل، لغو، لجز احتمالات اور باتوں سے استدلالات کئے اور ہر حقیقت و بلا دلیل ہر کائنات میں پر خدا اور انکرامات پر فریفتہ ہو گئے ان پر تو یہ مثل سولہ آنے راست آتی ہے کہ بوچھاڑ سے بھاگے اور پر نالاکے نیچے جا گرے ہوئے۔

اور پھر یہ عجب بھی لائق توجہ ہے کہ یہ صاحب الامر سے صرف روایات ہی پر مبنی نہیں کرتے بلکہ ان کے ثقات نے رقعہ کی روایت کا شکر فرم بھی چھوڑ رکھا ہے، بعض نے سفراء کے ذریعہ مسائل کے رقعے بھیجے اور ان کا جواب آیا، اور بعض نے سفراء کے واسطے بغیر ہی رقعے ارسال کئے،

اب چونکہ سفیر ولی کی سفارت کو تر کے بازوؤں سے بندھی ہوئی ہے رقعہ کا جو جواب ان کے ذریعہ ملے ظاہر ہے وہ کس قدر قابل اعتماد ہو گا اور جو جواب ان کے واسطے کے بغیر ہو گا وہ اس سے زیادہ بدتر ہو گا،

سفراء کے ذریعہ جوابات ملنے والے بہت سے ہیں، ان میں سے ایک وہ جو علی بن حسین بن روح نے جو سفراء میں سے تھا علی بن جعفر بن اسود کو دیا کہ وہ اس کو صاحب الامر کے پاس پہنچا دے پھر یہ رقعہ اس نے بیگان کرتے ہوئے اس کے پاس بھیجا کہ وہ صاحب الامر کا جواب ہے، محمد بن عبد اللہ بن جعفر بن حسین بن جامع بن مالک حیرانی، ابی جعفر قمی، کے رقعے بھی اسی نوعیت کے ہیں،

اس کے متعلق تجاویز کتاب ہے کہ ابو جعفر قمی صاحب الامر کا منشی تھا۔ اور اس نے بہت سے مسائل شرعیہ کو حل کیا ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم سے احمد بن حسین نے بیان کیا کہ اصل نسخے میں نے ان مسائل پر واقفیت حاصل کی جن میں بین السطور دستخط تھے محمد بن حسن طوسی نے بھی کتاب العینہ اور کتاب الاختلاج میں ان جوابات کا ذکر کیا ہے، ابو العباس جعفر بن عبد اللہ بن جعفر قمی کے رقعے بھی اسی قسم کے ہیں، یہ دونوں قیوں کا استاد اور سردار ہے، اور اس کے دوسرے بھی حسین اور تیسرے بھائی احمد کے رقعے ایک ہی جیسے ہیں، ان تینوں بھائیوں کا دعویٰ تھا کہ صاحب الامر سے ان کی خط و کتابت ہے اور یہ کہ ہم مسائل شریعت انہیں سے حل کرتے ہیں، اور ان کے پاس مسائل کے جوابات ہیں وہ صاحب الامر ہی کی طرف سے ہی تجاویز اور دوسروں سے ملنا س کا تذکرہ کیا ہے،

اسی ابو العباس نے ان رقعہ مات کو جمع کر کے ان سے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام اقرب الاسناد، الی صاحب الامر لکھا

علی بن سلیمان بن حسین بن جہم بن کبیر بن امین ابو الحسین الرازی، کے رقبے بھی اسی قماش کے ہیں، ان کے متعلق نباشی کا کہنا ہے کہ یہ رقبہ جات صاحب الامر تک پہنچے اور ان پر کو خط ثبت ہیں،

اب رہے بلا واسطہ کے رقبہ جات اتراویسے رقبات محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قبی کے ہیں، جن کی صداقت پر غلطو ہی سے دلیل دیتا ہے، کہتا ہے کہ میں جواب طلب کوئی مسئلہ لکھ لیتا اور شہر قم سے باہر ایک درخت کے سوراخ میں رکھ دیتا ایک دن رات اس کو قبی رکھا رہنے دیتا دوسرے صبح اس کو لے آتا۔ تو اس مسئلہ کا جواب اس میں لکھا ہوا پاتا،

صاحب الامر اور گذشتہ ائمہ کی تحریرات جو شیعوں کے سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہیں، اور ان کے گمان میں وہ ائمہ کی دستی ہیں وہ سب ان کے نزدیک صحیح الاسناد و روایات پر قابل ترجیح ہیں، چنانچہ ابن بابویہ فقیہ نامی کتاب میں باب الرسل یروی الی ربین میں جانب مقدس سے آنے والی تحریرات میں سے کسی تحریر کو نقل کر کے کہتا ہے کہ میرے پاس ابی محمد بن علی کی یہ دستی تحریر موجود ہے، اور دوسری طرف محمد بن یحیٰب کی کتاب کلینی میں جاب امام صادق سے ایک روایت مذکور ہے جو اس تحریر کے خلاف ہے، پھر اس نے وہ حدیث نقل کر کے کہا ہے کہ میں اس حدیث پر فتویٰ نہیں دیتا بلکہ میں اس تحریر پر فتویٰ دیتا ہوں جو میرے پاس جن بن علی کی دستی موجود ہے،

ان میں اگر نقل ہو تو وہ یہاں اس بات پر عقد کریں کہ اس کا ثابت کرنا کیسے ممکن ہے کہ یہ تحریر امام ہی کی ہے کیونکہ ایک تحریر دوسری سے اکثر ملتی رہتی ہے، اور اس میں بناوٹ اور جعل سازی اتنی رواج پا چکی ہے، کہ ایک شخص نے کسی دوسرے کے خط کی نقل کر کے اسی شخص کے سامنے پیش کی تو وہ بھی چکر لگایا اور تیز نہ کر سکا۔ اور اس نے یہی خیال کیا کہ وہ اسی کی تحریر ہے، اور پھر اسنا طویل عمر گزارنے کے بعد کوئی اس کی تصدیق کر سکتا ہے امام کی تحریر عمر بھر میں اگر کبھی کسی نے دیکھی بھی ہوگی تو ایک دوسرے تہ وہ بھی تبرکات اور بطور تبرک ایک دو دفعہ دیکھنے سے کیا دوسرے غفلت میں کوئی تیز و فرق کر سکتا ہے ایسا ممکن نہیں، چنانچہ اب خط کوئی میں اگر کوئی تحریر کسی کی نظر ٹپتی ہے تو وہ جھٹ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ تحریر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی ہے حالانکہ ذریعہ شناخت کسی کے پاس نہیں اور نہ ہی اب اس کی تصدیق ممکن ہے،

اور پھر صاحب الامر کا خط جس کو کسی نے دیکھا ہی نہ ہو، وہاں اس بات کا تو سوال ہی نہیں کہ اس کے دیکھنے پڑھنے کا اس کا اکثر واسطہ پڑا ہوگا جس پر خط کی شناخت و معرفت موقوف ہے،

حاصل کلام یہ کہ دین کے احکامات ان مہم اور دراز کار احتمالات سے ثابت کرنا کسی بے وقوف اور احمق ہی کا کام ہو سکتا ہے عقل مندوں کے نزدیک تو یہ پاگل پنہ کی حرکت کے سوا کچھ نہیں اور امام کو ابھی تک حیات ماننا جب کہ تقریباً ہزار سال کا طویل عرصہ بیت چلکا ہے اسی قسم کی حرکت ہے، اور لغو خیالی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں کسی انسان کی اتنی طویل العمری عاذنا محال ہے اور حضرت نوح علیہ السلام، یا لقمان بن عادیا یا اسی قسم کے حضرات کے مثال سامنے رکھنے اور اس پر قیاس کر کے حکم لگانے کی حرکت تو اس فرقہ کی مزید بیوقوفی ہوگی اس لئے کہ اگر اس قیاس سے یہ جملہ نام مقصود ہو کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو اس سے ان کی مطلب برآری یوں نہیں ہو سکتی کہ اس امکان کا تو کوئی بھی منکر نہیں، اور اگر غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ عمر کی اس قدر درازی عادیہ جائز ہے تو یہ بالکل غلط ہے غور ارقی عادت اور امور نادرہ پر قیاس کرنا جائز نہیں خصوصاً جب کہ اس میں بدن کی ساخت اور زمان و مکان کو بھی دخل ہو۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہو گا کہ کوئی ولایت گرم سیر کو ولایت سرد سیر کہے اور اس زمانہ کے لوگوں کو قوم عادیہ اور موسم سرما کو موسم گرما پر قیاس کر لے اور ظاہر ہے اس زمانہ میں عمر کا اتنا دراز ہونا عادی امر تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر تو ندرت سے اتنی

یہی ہو گئی چنانچہ اس زمانہ میں سوا ایک سو بیس برس کی عمر ندرت میں حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کے برابر کا حکم رکھتی ہے، اور لقمان بن عادیا کی عمر ان کی دعا قبول ہو جانے کی وجہ سے خلاف عادت اتنی دراز ہوئی اور یہ کی ضروری ہے کہ جو حزن عادت ساقی بنیوں یا دوسرے مسلمانوں سے ظہور میں آیا وہ ہمارے پیغمبر اور ان کی امت کے ائمہ سے بھی ظہور پذیر ہو۔ ورنہ پھر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی حضرت نوح و حضرت لقمان علیہما السلام سے کم نہ ہوتی۔

اگر حضرت خضر و حضرت ایسا علیہما السلام کی درازی عمر کی بات صحیح ہو تو وہ بھی اس امت اور اس دوسرے سے خارج ہیں اور پھر وہ فرشتوں کے حکم میں ہیں جس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔

ان سے احکام دین و اصول شریعت لینا اور واقعات و حادثات میں ان کی طرف رجوع کرنا ضروری و لازمی نہیں اور اگر وہ اپنی زندگی پوشیدہ گزار رہے ہیں گوارا ہے کہ کسی کو کیا پرواہ بھلاں امام وقت کے، کہ امت کا کاروبار احکام شریعت کی مخالفت ادا و نواہی کا اجراء، حدود و تعزیرات کا قیام کرنا، جمعہ و جماعت افراخ اور لشکروں کی تیاری کافروں اور سرکشوں کے ساتھ جنگ و قتال، یہ سارے امور ان کی تدبیر سے وابستہ اور ان کے احکام و فرامین پر موقوف ہیں اور پھر وہ نہ کسی کو نظر آتے ہیں نہ کسی سے ملاقات ہوتی ہے بلکہ کوئی نہ ان کو جانتا پہچانتا ہے نہ ان کی آواز سنتا ہے، لوگوں نے ان پر افتراء اور بہتان باندھ لئے ہیں جعلی غلط اور بناوٹی تحریریں بنانا کہ لوگوں کو منکالت و گمراہی کے غار میں دھکیل رہے ہیں، یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی بادشاہ کسی کو کوئی شہر بنا کر یہ حکم دیدے کہ لوگوں کی نظر سے اوجھل رہو نہ کسی کو اپنی صورت دکھاؤ نہ آواز سناؤ نہ اپنے مسکن اور ٹھکانے کا لوگوں کو پتہ بتاؤ، کہ وہ تم تک پہنچ نہ سکیں اور تمہارا سراغ نہ لگالیں،

اب کوئی بتائے ہم بتائیں کیا؟ کیا یہ باتیں عقائدوں کے ہیں؟ جہالت نے یہ سارے گل کھلائے ہیں،

اگر طریل العری کے بارے میں ابوریحان بیرونی، ابو معشر علی، ماشاء اللہ مہری، ابن شادان مسی اور دیگر اہل نجوم سے اگر یہ فرقہ دلیل لائے تو یہ باطل محض اور بے فائدہ بات ہے،

اہل نجوم کہتے ہیں کہ اگر کسی کی پیدائش قرآن اکبر کی تحریک سے قریب ہو اور طالع، زحل یا مشتری کے دونوں میں سے کسی ایک میں ہو اور حیدر (اصطلاح نجوم میں دلیل عمر) آفتاب کا دن میں ہو یا مانتاب کالات میں ہو اور خمسہ متحیرہ آفتاب و مانتاب کے علاوہ سات ستاروں میں سے پانچ ستارے، قویۃ الحال او تاد میں ناظر، تاکہ خدا بنظر تو ذرا تو ممکن ہے وہ بچہ قرآن اکبر کے سالوں کے مطابق فوسا سی شمسی سال زندہ رہے۔ یا اسباب فلکی اگر اس کے خلاف بتائیں تو اس سے کچھ کم یا زیادہ رہ سکے۔

اول تو نجومیوں کی ہنرات کو شریعت کے اقتدادی امور میں دخل دینا پرلے درجہ کی بے دینی ہے دوسرے ان نجومیوں نے بھی کوئی حتمی و یقینی بات نہیں کہی عمر کی کمی و زیادتی کو اسباب فلکیہ کے حوالہ سے کہا ہے اور ایک امکان کا ذکر کیا ہے، اور یہ سلور بالامیں معلوم ہو چکا کہ امکان سے کسی کو انکار نہیں لیکن ہر ممکن کو یقینی، اور واقع ہونا، جانشایہ تو صحیح مبالغویا اور جنوں ہے یا اس سے بھی کچھ سوا،

تیسرے، تھوڑی دیر کو اگر ان باتوں کو مان بھی لیں تو باتفاق مبین و موردین اور بشادات ان کتابوں کے جن سے انہ کی پیدائش کا پتہ چلتا ہے مثل کتاب اعدام الوری وغیرہ حضرت امام صاحب الامر کی پیدائش ایسے حالات و مواقع میں نہیں ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو،

امام مہدی علیہ السلام کی پیدائش کے وقت کے بارے میں دو قول ہیں،

اول یہ کہ ان کی پیدائش شبِ برات ۱۵ شعبان ۵۰۰ھ میں ہوئی بعد گزرنے چاند ماہِ قرآنِ اصغر سے کہ چوتھا تھا، قرآنِ اکبر کا جو قوس میں واقع ہوا۔ اور طالع، سرطان سے پچیس تھا، اور اصل قوس کے آٹھویں درجے اور بارہویں دقیقے میں مشتری رجبت میں تھا اور مریخ جوزا کے بیسیویں درجے اور چونتیسویں دقیقے میں، اور زہرا جوزا کے پچیسویں دقیقے میں اور عطارد اسد کے چوتھے درجے اور تیسویں دقیقے میں، اور قمر دلو کے تیسویں درجے اور تیرہویں دقیقے میں، اور راس حمل کے انتیسویں درجے اور انٹھویں دقیقے میں، اور ذنب میزان کے اٹھائیسویں درجے اور انتھویں دقیقے میں،

دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی پیدائش ۲۳ شعبان ۵۰۰ھ جو وقت صبح ہوئی آپ کا طالع سرطان پچیسواں درجہ اور ساتواں دقیقہ تھا، اور زحل عقرب کے بیسیویں درجے اور اٹھارھویں دقیقے میں، مشتری و مریخ حمل کے آٹھویں درجے اور چونتیسویں دقیقے میں، اور سورج اسد کے اکیسویں درجے اور اڑتیسویں دقیقے میں اور زہرا جوزا کے پچیسویں درجے اور سترھویں دقیقے میں اور چاند دلو کے تیسویں درجے اور تیرہویں دقیقے میں،

لہذا اس سے پہچان لیں کہ دلائلِ فلیکس آپ کی درازی عمر پر دلالت نہیں کر رہے تھے، بلکہ اس کے خلاف کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور اس بات کو باہر نجوم ان دونوں زائچوں کی روشنی میں بخوبی معلوم کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ثابت نہ ہو کہ آپ کی پیدائش تحویلِ قرآنِ اکبر کے نزدیک تھی اور امام صاحب الامر کی پیدائش سے متعلق ان دو اقوال کے علاوہ کوئی اور قول نہ مروی ہے، نہ منقول، بخلاف حضرت نوح علیہ السلام کے کہ اتفاقِ نجومی مورخین آپ کی پیدائش تحویلِ قرآنِ اکبر کے نزدیک تھی، اور دلائلِ فلیکس بھی آپ کی درازی عمر پر صاف دلالت کر رہے تھے چنانچہ غریبوں نے آپ کے زائچہ ولادت کی شرح میں اس کا ذکر کیا ہے، پھر قطع نظر ان سب باتوں کے دلائلِ قطعیہ عقلیہ بھی ایسے موجود ہیں جو امام صاحب الامر کی درازی عمر کو خود اصولِ شیعہ کے مطابق رد کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر ان کو زندہ مانیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف ترک واجب کا الزام آتا ہے کہ ایک طرف تو آپ کو اس کے باوجود کہ آپ حکمرانی اور امورات کو سرانجام دینے میں سب سے زیادہ قابلِ دلائل تھے اہل دنیا میں مقبول نہیں بنایا بلکہ اس کے برخلاف اہل دنیا کو ان سے متنفر کیا اور اس حد تک کہ وہ آپ کے قتل اور ایذا رسانی کے درپے ہو گئے جسکی وجہ سے آپ کو غیبتِ کبریٰ کے پردہ میں چھپنا پڑا۔ اور دوسری طرف ظالموں، کافروں، اور ناسقوں کو آپ کے ہوتے ہوئے زمین پر مسلط کیا لہذا اصل کی جو رعایت اللہ تعالیٰ پر واجب تھی اس نے ترک کر دی،

اس کے ساتھ ہی بھی لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف امرِ قبیح کی نسبت بھی کی نہ ہو بلکہ کہ ایک ایسے شخص کے ہوتے ہوئے جو امامت اور ریاست کے قابل ہو دوسرے کو جو قطعی نااہل ہو ملک و سلطنت اور امور دینا پر تصرف دیدینا امرِ اسرفیق ہے، پھر ایک شخص کو امامت بخشا اور اس کو غائب و روپوش ہو جانے کا بھی حکم دینا اور دوسروں کو مجبور کرنا کہ اس پر شیعہ مآورد روپوش شخص سے جن کے نام کے سوا وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں احکامِ دین کی تحقیق کریں اور مشکلاتِ دنیا میں اسی کی طرف رجوع کریں اور جملہ امور تقسیم ملک و غنیمت، فوجوں کی تیاری، شہروں کا فتح کرنا جنگ و صلح سب اسی کی صوابدیر پر کریں تو یہ سب تکلیفِ مالِ بیطاق ہے، جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے جبرائیل کو تمہارا امام بنایا۔ اپنے تمام دینی مسائل انہی سے سیکھو اور کوئی دنیاوی کام بغیر ان کی مرضی کے نہ کرو تو ہر عقائد ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں کرتا اور ہر دو کو تکلیفِ مالِ بیطاق سمجھتا ہے، جو بالا جماع محال ہے، اور ایسے امام کو مقرر کرنا ہی عبث اور بے فائدہ ہے، کہ جس کی ذات سے امامت کے

فوائد سے ظہور پذیر ہی نہ ہوں مگر میں کری کہ کوئی فرق عفا کر اپنا امام مان کر اپنے کو فرقہ عفا یہ کہنے لگے تو اس کے مذہب کو کوئی کیسے باطل کرے اور ایک بحث فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا انتہائی قبیح ہے جس کی نفی اللہ تعالیٰ کی ذات سے کرنا خود شیعوں کے نزدیک بھی واجب ہے،

خلاصہ کلام یہ کہ ان لوگوں کے خیال ناسد کے رد اور بطلان پر دلائل اتنے ہیں کہ دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں مگر چونکہ یہ معنی بحث کا مقام ہے اور اس موقع کی مناسبت سے جتنا کچھ تحریر ہوا وہ حق کے متکاشی اور انصاف پسندوں کے لئے انشاء اللہ کافی ہوگا، اس لئے اب اسب قلم کی باگ اس میدان سے موڑ کر موضوع باب کی طرف موڑتے ہیں،

ان کے راویوں میں سے بعض نے ایسی چیز کی بھی روایت کر دی ہے جس کو قطعی اور عقلی دلائل حمال قرار دیتے ہیں پھر بھی یہ اس کی کمزوری پر کھڑے کے بجائے اس کی روایت کو قبول کر لیتے اور اپنی ہر تصدیق ثبت کر کے خود کو بھی اس راوی کی سطح پر لے آتے ہیں، مثلاً ابو بکر نے امام صادق رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ وہ الوہیت کا دعویٰ کرتے تھے، یہاں تک کہ شیعوں کے اخبار در حال کے حالات بطور نمونہ مشتمل از خود اسے بیان کر رہے تھے، اب مناسب اور ضروری معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے بقیہ دلائل کا بھی اجمالی جائزہ نظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ ان پر ان دلائل کی حقیقت بھی منکشف ہو جائے اور ان کے جملہ استدلال کی کمزوری بھی عینی طور پر ان کے علم میں آجائے اور وہ ان کے جزئی و تفصیلی دلائل کو انہی بیانات کلیہ کی کسوٹی پر پرکھ کے ان کے کھوٹے اور ناکارہ ہونے کا بخوبی اندازہ لگا لیں،

بقیہ باب

شیعوں کے بقیہ دلائل

واضح رہے کہ ان کے نزدیک دلیل کی چار قسمیں ہیں، کتاب، خبر، اجتماع، اور عقل کتاب یعنی قرآن مجید تو ان کے خیال میں قابل استدلال نہیں، کیونکہ اس کے قرآن ہونے پر اسی وقت اعتماد کیا جاسکتا ہے جبکہ یہ امام معصوم کے واسطے سے پہنچے اور ائمہ کے واسطے سے پہنچا ہوا کوئی قرآن ان کے پاس موجود نہیں اور مرد و عورت قرآن ان کے گمان میں ائمہ کے نزدیک معتبر نہیں تھا اور انہوں نے نہ اس کو قابل استدلال یا حجت کے قابل جانا، چنانچہ یہ سب کچھ کلینی اور ان کے دوسری کتابوں سے نقل ہوگا کتاب کے متعلق ہم نے جو ان کا گمان بیان کیا ہے تو ہمارے اسی قول کا ثبوت مندرجہ ذیل وجوہ سے ہو سکتا ہے،

اول۔ امامیہ کی ایک بڑی جماعت نے اپنے ائمہ سے روایت کی ہے کہ کلمات قرآن منزل میں تحریف کی گئی ہے اور نہ صرف آیتیں بلکہ صورتیں تک حذف کر دی گئیں ہیں،

اور ترتیب اصلی میں بہت کچھ فرق آچکا ہے اور اب جو نسخہ دستیاب ہوتا ہے وہ مصحف عثمان ہے کہ انہوں نے سات لکھ لکھ کر عالم میں اس کی اشاعت کرائی اور جو اصلی ترتیب وہ منع کے قرآن کو پڑھتا اس سے ماہر بیٹ کرتے اور طرہ سے حکمات اس لئے مجبوراً سب اہل دنیا نے اس مصحف پر اجماع کر لیا اور یوں یہ قرآن قابل استدلال اور لائق تسک نہ رہا نہ اس کی عبارت و الفاظ عام و خاص قابل اعتماد رہے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ احکام جو اس وقت قرآن میں موجود ہیں سب کے سب یا اکثر ان آیات و سورتوں سے منسوخ یا مخصوص ہوں جو قرآن سے خارج کر دی گئیں،

دوسرے یہ کہ اس قرآن کو نقل کرنے والے بلاشبہ توریت و انجیل کے نقل کرنے والوں کی طرح تھے کہ بعض تو اہل نفاق،

تھے مثلاً کبار و سربراہ اور دوصحابہ (رضی اللہ عنہم) اور بعض زمانہ ساز دنیا طلب، دین فروش، جیسے عام صحابہ بجز چار کے جو مال اور عہدوں کے لالچ سے اپنے سرداروں کے پیچھے ہوئے اور مرتد ہو گئے سنت رسول کو خیر یاد کیا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان کے ساتھ صداقت و دشمنی رکھی، اس کی کتاب تحریف کڑا لی اور اس کے کلام کو بدل ڈالا مثال کے طور پر مین المواقف کی جگہ الی المواقف بنا دیا اور المنہ حی امنہ کی جگہ المنہ حی امنہ لکھ دیا اسی طرح اور بھی؛ چنانچہ مناہ ضعیف قریش میں جس کو یہ قنوت امیر المؤمنین (رضی اللہ عنہ) کہتے اور متواتر خیالی کرتے ہیں اس کا ذکر ہے، اس کا کچھ بیان باب دوم میں گزر چکا ہے،

لہذا جس طرح قنوت واقعی کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور نہ عقیدہ و عمل کی کوئی بات لی جاسکتی ہے گویا ہر دو ناقابلِ تمسک ہیں، اسی طرح قرآن موجود سے بھی تمسک مشکل ہے، اور جس طرح ان دونوں کتابوں کے احکام قرآن مجید سے منسوخ ہوئے اسی طرح خود قرآن کی بہت سی چیزیں منسوخ ہو چکی ہیں، اور ناسخ کو سوائے ائمہ کے کون جان سکتا ہے،

تیسرے یہ کہ نزولِ اجماع قرآن کا ثبوت بلکہ خود نبوت کا ثبوت نقل کرنے والوں کی صداقت سے وابستہ ہے، جب ناقصین نبوت پیغمبر اتفاق سے ایسی جماعت ہو، جنہوں نے اپنی لغو اغراض کی ناسپاس صریح حکم کو جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے رد و رد کیا گیا تھا، چھپا دیا اور بوقت ضرورت کسی نے اس کے ظاہر کرنے کی جرات نہ کی حتیٰ کہ خاندان نبوت کا حق تلف ہوا اور اس اصول دین یعنی امامت کا تختہ الٹا جو درحقیقت نبوت کے ہم پلہ ہے تو ایسے لوگوں کی نقل پر کیسے اعتماد اور ہر دوسرے کیا جاسکتا ہے، ان سے کیا بعید کہ کسی غرض فاسد کے لئے سب کے سب یک زبان ہو گئے کہ فلاں نبی تھا، معجزے لایا اور اس پر قرآن اترا اور بلغا عرب و عجم اس کے مقابلہ سے عاجز رہے اور حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو،

اب رہا خبر کا معاملہ تو اس کا بیان اسی باب کے اوراقِ ماضی میں گزر چکا ہے، نئی بات یہ ہے کہ خبر کے لئے ناقل درکار ہے، اور وہ ناقل یا شیعہ ہو یا غیر شیعہ، غیر شیعہ تو درجہ اعتبار سے یوں گر گئے کہ ان کا پہلا طبقہ جن پر ان کی سندیں ختم ہوتی ہیں مرتد ہو گیا، اور منافق و عارف کتاب اور خاندان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن گزر رہے ہیں رہے شیعہ تو یہ آپس میں خود اصل امامت، اس کی تعیین اور ائمہ کی تعداد میں شدید اختلاف رکھتے ہیں،

کتاب چونکہ ان امور میں ایسا ثبوت ہم پہنچانے سے سناکت ہے جو مخالف پر چسپاں ہو سکے اس لئے لا محالہ ان میں سے کسی ایک کے قول کا ثبوت خبر سے ہی ہو سکتا ہے، تو اگر خبر کا ثبوت بھی نیز اس کی بحیثیت اسی قول پر موقوف ہو تو یہ صاف دور ہو گا، یعنی قول کا ثبوت خبر سے اور خبر کا ثبوت قول سے، اور دور باطل اور غلط ہے، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ خبر کا حجت ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ معصوم کا قول ہو یا کسی معصوم کا قول بھی کسی معصوم کے واسطے سے پہنچا ہوا ہو اس شخص معین کی عصمت پھر اسی خبر پر موقوف ہے کیونکہ کتاب تو ساقط ہے ہی عقل بھی ثبوت سے عاجز و در ماندہ ہے اسی طرح معجزہ کا ثبوت بھی خبر پر موقوف ہے اس لئے کہ اگر ثبوتی تو بذات خود معجزہ دیکھتا ہی نہیں یہی حال اجماع کا ہے کہ غائبین تک اجماع کی نقل میں خبر ہی ذریعہ لازم اور ضروری ہے، اور اس کے حجت ہونے کا مدار بھی اسی پر ہے کہ اس میں معصوم کو دخل ہے اور شخص معین کی عصمت اس معصوم کی قبر سے یا کسی دوسرے معصوم سے جو اس کے واسطے سے ہر ثابت کہ نہ اعاف اور داغ دور ہے علاوہ از یہ خبر کی بحیثیت نبی کی نبوت اور امام کی امامت کے ثبوت پر موقوف ہے وہ کیسے ثابت کی جاسکتی ہے،

غرضیکہ غوثیوں کے نزدیک تو اتر سے بھی اعتقاد اٹھ گیا اور وہ بھی معتبر نہیں رہا۔ اس لئے کہ واقعہ کی پوشیدگی عدوتوں سے ظہور میں آئی اور یہ حال غیر واقع کا ہے، اس کے علاوہ اخباراً عاد تو وہ اس قسم کے مطالب میں قابل لحاظ نہیں لہذا اب خبر سے استدلال کسی صورت بھی ممکن نہ رہا،

اب رہا اجماع تو اس کا بطلان تو سب شقوں سے زیادہ ظاہر ہے و باہر ہے کیونکہ اجماع کا ثبوت موقوف ہے ثبوت و ختم کے ثبوت پر اور جب یہ دونوں ہی اپنے ثبوت کے لئے معرض شک میں ہوں تو اجماع کا ثبوت کیسے ہو گا اور پھر اجماع بذات خود حجت ہے نہیں وہ تو معصوم کے قول کے دخل کی وجہ ہے: اور اس کا معصوم ہونا اور تعین شخص کہ وہ ایسا کون ہے اور پھر اس کا قول کون اور کیسا شخص بیان کر رہا ہے، یہ سب ہی باتیں ابھی موضوع بحث و تفتیش میں ہیں۔ تو اجماع کے ثبوت کا سوال ہی کہاں رہا۔

قطع نظر اس کے مدار اول و دوم کا اجماع جبکہ ابھی امت میں اختلافات رونما نہیں ہوئے تھے یوں غیر معتبر ٹھہرا کر ان شیعوں نے ان امور خلافت ابو جعفر رضی اللہ عنہما حرمت متعہ تعریف کتاب، منع از میلث پیغمبر، امام حق کو حق سے محروم کرنے اور تعلقات خاندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو غصب کرنے پر اجماع کر لیا،

تو اب اس وقت کا اجماع جب کہ امت اختلاف کا شکار ہو کر فرقہ فرقہ ہو گئی، اس طرح معتبر ہو اور یوں بھی مختلف فیہ مسائل میں کہ جن میں استدلال و حجت کی سنت اور خصوصی ضرورت و احتیاج ہے۔ پھر امت اجماع میں معصوم کا دخل ہونا یا اس کا تمام امت کے قول کے مطابق ہونا سب کچھ خبر ہی سے ثابت ہوتا ہے اور خبر کا تعارض، تساقط اور ضعف جیسا کچھ ہے وہ عیاں و ظاہر ہے،

اور ہر مسئلہ مختلف فیہ میں اجماع کا نقل و حوالہ خصوصیت سے ایسا امر ہے کہ جو کبھی واقع نہیں ہو سکتا اور علانیہ شیعہ خصوصاً اثنا عشریہ کا یہ حال ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکذیب و تردید میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک فرقہ اگر اپنے فرقہ کا اجماع نقل کرتا ہے تو دوسرا سے جھٹلاتا ہے اور تکذیب کرتا ہے، تو جب صرف ایک فرقہ امامیہ کا اجماع جو شیعوں ہی کا ایک فرقہ ہے، شیعوں کے دوسرے فرقہ کے نزدیک ثابت نہیں ہوتا۔ تو پوری امت کے اجماع کو ثابت کرنا تصور تک میں نہیں آ سکتا۔

اس کی وضاحت ذیل کی مثالوں سے اچھی طرح ہو جائے گی مثلاً سبیل السلام الی معالم الاسلام کا مصنف محدث علی کے ذیل میں کہتا ہے۔ کَلَامُ الشَّيْخِ أَبِي الْفَتْحِ الْكَزْجِي فِي كُنْزِ الْفَوَائِدِ عَلَى رِجَالِ اِجْمَاعِ الدِّمَاثِيِّ عَلَى الْبَدَا وَ اَنَّكَ مِنْ حَصَانِ صِرْطِهِ وَ اَنَّكَ كَمَا سَأَلْتُ الْفَرَقِي وَ كَلَامُ الْحَلَفِي فِي الْبَهَائِيَّةِ وَ اَلْهَدْيِ وَ كُنْزِ الْحَقِّ يَدِينُ عَلَى الدُّخُولِ فِي الْاِيْدِ نَكَادٍ، کہ کنز الفوائد میں شیخ ابو الفتح کراچی کے کام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امامیہ کا مسئلہ بداء پر اجماع ہے اور ہر مسئلہ ان کے خصائص میں سے ہے و مگر یہ غلط ہے کیونکہ تمام فرقوں نے اس سے انکار کیا ہے بلکہ علی نے نہایا، تہذیب اور کشف الحقائق میں اس انکار پر اصرار کیا ہے۔

اسی طرح ان کے شیخ شہید ثانی نے ایک پوری فصل صرف اس لئے رکھی کہ ان کے شیخ نے با بجا فرقہ کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ دوسری جگہ اس نے خود ہی اس کے خلاف رکھا ہے، اس فصل سے مختصر سا حوالہ ہم یہاں تحریر کئے دیتے ہیں،

قَالَ فَسَلُّ نِيْمَا شَيْخٌ عَلَى مَسَائِلَ اِدْرَعِي الشَّيْخِ اَلْجَمَاعُ فِيْهِ اَفْرَدْنَا هَا لِلتَّنْبِيْهِ عَلَى اَنْ لَا يَغْتَبِرُوْا الْفُقَهَاءَ بِدَعْوَى اَلْجَمَاعِ فَقَدْ وَ تَحَرَّفُوْا الْخَطَا وَ اَلْجَمَاعُ كَثِيْرٌ مِّنْ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنَ الْفُقَهَاءِ سَيِّمَاتِ الشَّيْخِ مَرْتَعِيْ ذِيَا اَدْعَى فِيْهِ اَلْجَمَاعُ

[illegible]

اب رہ گئی عقل۔ نواس سے تمک و حجت لانا یا تو امور شرعیہ میں ہوگا، یا غیر شرعیہ میں امور شرعیہ میں تو اس فرقہ کے نزدیک عقل بالکل ہی غیر معتبر اور نااہل تمک و حجت ہے، کیونکہ اسی سبب سے تو وہ قیاس کے منکر ہیں اور اسے حجت تسلیم نہیں کرتے۔

اور امور غیر شرعیہ میں اس کا قابلِ محبت ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ دہم، عاداتِ طبعیت کے شبہات سے پاک ہو اور صودہ اشکال میں ترتیب کی غلطی سے بری اور دور ہو اور ان سب باتوں کا علم ایام کے ارشاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر فرقہ کے انسان کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی عقل سے چند چیزوں کو قبول کرتا اور بعض دوسری چند کا انکار کرتا ہے اور یوں گروہ انسان میں اصولی اور فروعی اختلاف پیدا ہوتا ہے، اب اس اختلاف میں محض عقل سے ترجیح کیسے ہو ورنہ تو پھر ترجیحات میں پیچیدگی اور اختلاف پیدا ہوگا،

اس لئے لائحہ عمل یہ ضروری ہے کہ عقل سے بالا تر مفید کن ترجیحات دینے والی کوئی اور ہستی ہونی چاہیے جو ایک جانب کو درست اور دوسری جانب کو غلط ٹھہرا سکے اور اس قسم کی ہستی سوائے نبی یا امام کے اور کون ہو سکتی ہے اور چونکہ شہرت نبوت و امامت کا معاملہ ہی ابھی طے نہیں وہ معترض بحث ہی میں ہے اس لئے یہ عقل بھی بیکار ہو گئی اس سے بھی تسک نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ بات یہ بھی ہے کہ عنوان گفتگو دلائل شرعیہ ہیں اور شرعی امور عقل کی رہنمائی سے ثابت نہیں کئے جاسکتے اس لئے کہ عقل ان کے تفصیل علم سے بالاجماع عاجز ہے ہاں جب بذریعہ شریعت شارع سے اصلی حکم حاصل و معلوم کر لیتی ہے تو دوسرے امور پر تکیاں کر سکتی ہے مگر مطلق میں بات ہی یہ چھٹی ہے کہ تکیاں کو یہ فرقہ باطل تسلیم کرتا ہے اس میں ماننا ایسی صورت میں صرف عقل کو امور شرعیہ میں دخل دینے کا نہ جواز رہا نہ ہی راستہ! خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ قواعد کلیات شرع ہی میں تردد و اضطراب جاری ہو تو عقل کس کام آئے گی، گھوڑے سے پہلے لگام کیسی! پہلے چھت تو بناؤ پھر نقش و نگار کرو!

فائدہ جلیلمہ ادا مانع رہے کہ تمام عقلی دلائل کا ثبوت بدیہیات و بلادیں سمجھ میں آنے والی ہے اعتقاد پر موقوف ہے۔
مشکل سو فیضائی فرقہ ان تمام بدیہی مقدّمات کو نہیں مانتے کہ ایک دو کا نصف ہے۔ نفی و اثبات ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

بڑا ایک ساتھ بیک وقت اٹھ سکتے ہیں، ایک جسم ایک آن میں دو جگہ نہیں پایا جاسکتا جو خواص کی گرفت سے باہر اور غائب ہوا سے حاضر نہیں کہہ سکتے اور کسی چیز کا نام عین وہی چیز نہیں ہے یا ان جیسے اور بدیہی امور۔ تو ایسے لوگوں کے نزدیک تو کوئی بھی دعویٰ عقلی دلائل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا،

اور یہی حالی شرعی دلائل اور دینی مقدمات کا ہے، جو ملت حنفیہ کے اثبات کے لئے لائے گئے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اب تک تمام ادیان و مذاہب میں مسلم اور متفق علیہ رہے ہیں، مثلاً اللہ ایک ہے، وہ ایک سول بھیجتا ہے جو معجزات اپنے ساتھ لاتا ہے۔ فرشتے اللہ کے فرستادے ہیں جو غلوں کے پاس آتے ہیں، اور جو تبلیغ و ارسال میں جھوٹ و خیانت سے قطعی پاک ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو احکام کی تکلیف دیتا ہے، جن پر انکو قیامت کے دن اٹھنے پر جنت کی صورت میں ثواب یا دوزخ کی شکل میں عذاب دے گا،

اور ملت حنفیہ کے اصول و قواعد کا ثبوت شیعہ طریقے پر تو ممکن نہیں تو پھر کوئی بھی دینی مسئلہ ان کے نزدیک دلیل سے ثابت نہیں، تو گو یا یہ شیعہ دین کے سوسلطانی ہوئے۔

اس اجمال و اختصار کی تفصیل اور تشریح یہ ہے کہ یہ لوگ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو جو تمام اصول و قواعد کا منبع اور سرچشمہ ہے امیر المومنین و ائمہ کی روایت اور واسطہ سے ثابت کرتے ہیں، اور یہ بات عیاں اور اظہر من الشمس ہے کہ براہ راست روایت کرنا ان کو نہ امیر المومنین سے نصیب نہ ائمہ سے، بلکہ واسطوں کے محتاج ہیں اور پھر وہ واسطہ بھی ایسے ہیں جن کی تکذیب خود امیر المومنین و ائمہ نے فرمائی ان کو متہم کیا اور حقیقت الامر یہ ہے کہ انہوں نے جس طرح نبوت کے متعلق روایت کی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جمیعت اور صورت و شکل کی بھی روایت کی،

اور یوں بزرگوں پر جھوٹ جوڑا۔ اور پھر یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ شرائط امامت اور اس کے تعین میں اثنا عشریہ متفق رکھتے ہیں کہ اس کو رفع کرنا امکان سے باہر ہے ایسی صورت میں ان میں سے کسی ایک فرقہ کا جھڑپا ہونا یقینی ہوا اور ظاہر ہے کہ جھوٹوں کا تو اثر جو کسی بیہودہ و ناشائستہ عزمی سے کسی جھوٹ کی اشاعت پر ایک زبان ہو جانا جس طرح قرن اول کے مسئلہ خلافت پر قابل اعتماد بھروسہ نہیں ہے، اور پھر ان کے نزدیک تو لاکھوں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف چار یا چھ ہی قابل اعتبار ہیں تو صرف ان چار یا چھ کی روایات پر تو اثر کا اطلاق کیسا، اور بطور فرضی حال اس کو مان بھی لیں تو چار یا چھ آدمیوں کی حدیث میں کو عام لوگ عقل سے بعید اور محال جانیں یقین کو کس طرح مفید ہوں گی۔

سليم بن قيس ہلانی نے کتاب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی اور انہوں نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور بہنوں نے امام صادق رحمۃ اللہ علیہ سے کہ
مد سوائے چار کے سب صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے، اور جناب صدوق کی ایک روایت میں چھ کی تعداد آئی ہے۔

گو یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ان شیعوں کے نزدیک مرتد، وینچ سے خارج، فاسد اغراض رکھنے والے اور دوزخ گو تھے۔ لہذا ان کے خیال فاسد اور گمان غلط کے مطابق ”مرتدین“ کی یہ جماعت جو بھی روایت کرے مثلاً دعوائے رسالت اسی دعوے کے ثبوت میں معجزہ پیش کرے فقہ قرآن کے نزول قرآن کے مقابلہ میں فضائے عرب کا حجر، جنت و دوزخ کے حالات شرعی تکلیفات و محال و محال بلکہ گزشتہ انبیاء کی نبوت، توحید کی دعوت، شرک سے روکنے والی ساری احادیث مردود

ہوں گی، کیونکہ یہ ساری روایات آخری جماعت کی تو ہیں، جنہوں نے اس وصیت کے خلاف پر اجماع کیا جو ایک الکھمیں ہزار پینچویں کے مجمع میں باطل و تاکید کی گئی تھی، خصوصاً جب کہ اس جماعت کی روایات شیعوں اور ان کی ہم مشرب جماعتوں کے نزدیک حد تو اترو بھی نہ پہنچی ہوں اور اس صدی میں یا بعد صدیوں میں صوفی شہرت اور اشاعت کو ان امور بالاک صداقت کے لئے کافی سمجھا جائے تو یہ دینی امور میں کمال درجہ کی بے اعتباطی ہے کیونکہ یہ دینی اس صدی یا بعد کی صدیوں سب کے سب پیغمبر کے اور امر و نہی کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے،

چنانچہ انہوں نے قرآن کی تحریف کر ڈالی، اور بہت سے ان احکام کو جو اللہ کی طرف سے نازل کئے حکم کے خلاف تھے ان صدیوں میں اتنا مشہور و معروف کر دیا کہ اصل شریعت، اگر بھی اتنی شہرت نصیب نہ ہوئی، جیسے وضو میں پاؤں دھونے کا مسئلہ کہ اس نے اس درجہ شہرت پکڑی کہ روزانہ پانچ وقت، اے شمار شماس نے اس کو دیکھا اور سب غلط روایات کرنے چلے گئے یہی حال موزوں پر مسیح کا ہوا اور اسی طرح کی اور بدلتی ان کے مقتداؤں اور پیروؤں نے اپنی طرف سے گھڑ کر ان کو رواج دینے میں اتنا اندر لگایا کہ لوگ ان کو بھی اصل شریعت سمجھنے لگے، مثلاً سنت تراویح اور حرمت متعہ وغیرہ،

تو ایسی بے دین "اور بے باک" جماعت سے کیا بعید کہ انہوں نے امر نہوت اور زندقہ و ملائکہ اور ذکر جنت و دوزخ پر لوگوں کو ڈرنے یا ترغیب دلانے کی غرض سے اتفاق و اجماع کر لیا ہو، اور تو اترو اس وقت یقین پیدا کرتا ہے جب اہل تو اترو اغراض فاسدہ سے پاک ہوں اور یہاں تو ان وسفیوں کی ان گنت اور بے شمار اغراض موجود ہیں بہت ممکن ہے ان میں چند کسی اپنی پوشیدہ غرض کے تحت دعوائے نبوت و اظہار معجزات کی روایات بیان کرتے ہوں اور دوسروں نے موافقت کے لالچ میں اور دین میں بے جا سستی کو کام میں لاتے ہوئے اور بغیر تحقیق کئے ان کو قبول کر کے شہرت دیدی ہو،

اور اس کا بھی احتمال ہے کہ گزشتہ کامہنوں اور نحو میںوں سے انہوں نے سن لیا ہو کہ قریش میں عبد مناف کی اولاد میں فلاں شخص کے ہاں فلاں نام کا بیٹا پیدا ہوگا، جو روئے زمین کا اور ان کے خزانوں کا مالک و متصرف ہوگا۔ تو یہ مفلس فاقہ کشی کا مادہ اڑھو ٹٹتے ہوئے اور ہر عیاش طبع خطہ ایران کی نازک اندام پریزادوں سے لطف اندوزی کے ارادے دل میں چھپائے ہوئے اور ہر دنیا پرست منافق قدرت کا دلدادہ کسری کے بانات قزوین و شیراز کی تفریح گاہوں، قیصر کے محلات و آسائش گاہوں کے خیالی لطف و لذت سے متاثر ہو کر اس قریشی لقب ہاشمی و مطلبی دندہ ار و اخانہ کے پیچھے لگ پڑے ہوں دوسری طرف یہودیوں کی بھی ایک جماعت اپنی پرانی کتابوں کے ذریعہ اس قصہ و واقعہ سے باخبر ہو کر تواریت سے اس مدعی نبوت کی تائید میں کوئی نص نکال لائی ہو، اور تواریت کے قصص و اخبار کو فصیح و بلیغ عبارات سے آراستہ کر کے اسی کو دیدیا ہو، گو ابھی خود تواریت کا نزول اور اس کے قصص کی صداقت ہی موت و زلیست کے خطرے اور گڑبڑی میں مبتلا ہے، اس کی موافقت یا مخالفت کیسے نتیجہ خیز ہو سکتی ہے،

اول اول تو عرب کے جاہلوں نے ان اغراض کے سبب اتباع میں پیش قدمی کی پھر لوگ اندھا دھند غلطی پر غلطی کا نشانہ ہوتے ہوئے نفسانی خواہشات اور دنیاوی طمع و لالچ کے سبب مسلسل اس بھیر کے نقش قدم پر چلتے چلے گئے اور دھیر دھیر یہی غلط روی اور غلط رفتاری ایک دین و مذہب کی شکل اختیار کر گئی، چنانچہ شیعوں کے خیال کے مطابق اکثر امور شریعہ میں بھی صورت پیش آئی،

مثلاً شیعوں نے وضو میں پاؤں دھونے کے مسئلہ میں جو بہت سی شبہات و احتمالات پیدا کئے ہیں، جب کہ مسیح کے

مقابلہ میں پاؤں دھونے میں زیادہ مشقت اور تکلیف ہے، اور مشقت و تکلیف کے کام کو رواج دینے اور مشہور کرنے میں دنیا کا کوئی فائدہ نظر بھی نہیں آتا تو جن امور میں بظاہر آرام ہی آرام اور مزے ہی مزے نظر آتے ہوں وہاں تو ان کے لئے ایسے شبہات و احتمالات نکالنے میں بڑی آسانی اور زیادہ مواقع ہیں مثلاً معاملہ نبوت، کہ وہ ریاست عامہ کا معاملہ ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے اور دل پسند بھی، اور طمع و حرص کے لئے اچھی آماجگاہ بھی؛ ہزاروں لاکھوں اشخاص سوارسی اور ریلست کے لئے اپنی جائیں تک دسے ڈالتے ہیں اس کے لئے کوئی ایک بات یا ایک روایت پر یک زبان ہو جائیں تو کوئی تعجب بھی نہیں اور پھر جب اس جھوٹ کے لئے یہ تائید بھی مل جائے کہ جو ان سے آمادہ پیکار ہوا تو دولت و خواری اور تباہی و بربادی کا شکار ہوا اور یہ ایسی تائید ہے کہ آئندہ آنے والے اپنے اسلاف کے ایسے حالات دیکھ کر اور معلوم کر کے ان کی روایت کی صداقت پر پختہ خیال ہو گئے،

اور یہی وہ احتمالات و شبہات ہیں جو یہ شیعہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت اہل مصر میں ان کی شہرت اور آئندہ آنے والی اہل سنت کی جماعتوں کے متعلق نیز ان کے اعتقادات کے بارے میں نکالتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر اسی قسم کے لوگوں کا تواثر مفید ہوتا تو پھر یہودی و نصاریٰ کا تواثر بھی مفید ہونا چاہیے، جب کہ یہودی کا تواثر اللہ کی کتاب میں تحریف انبیاء کی مخالفت و تکذیب اور ان کی وصیتوں کو دین موسوی کی خاطر ٹھکانے میں ان (دسنیوں) سے بھی چند قدم آگے ہے اس لئے کہ یہودی بھی موسیٰ علیہ السلام سے بطریق تواثر یہ نفس صریح نقل کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا کہ جب تک آسمان و زمین قائم ہیں میری شریعت قائم رہے گی۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں سچ کی تعلیم قائم رہے گی۔ یہی حالی نصاریٰ کے تواثر کا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ نفس صریح روایت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں، اور یہ کہ انسانی رسالت ان کے آنے سے پہلے ختم ہو چکی۔

اب اس دینی جماعت کے پاس جو تحریف شدہ قرآن ہے اس کی وہی حیثیت ہے جو تحریف شدہ توریت اور انجیل کی ہے کہ کوئی شخص اس میں سے بہت سی آیات اور متعدد سورتیں نکال دی گئی ہیں اس کے کلمات کو اپنی جگہ سے بدل گیا ہے اور ترتیب کو بگاڑا ہے، اگر اس قسم کے متواتر قرآن سے ہم تسک کر سکتے ہیں تو انجیل سے بھی تسک ہو سکتا ہے اور انجیل مرقس میں جو صماح ثانی میں انجیل ثانی ہے یہ نفس موجود ہے اور چاروں انجیلیں ان کے نزدیک متواتر ہیں،

قَالَ عَرَسَ رَجُلٌ أَشْجَارًا فِي أَرْضِهِ وَبَنَى حَوْلَ أَلْفِهَا
الْجُدَّ رَانَ وَحَفَّضَ فِيهَا بَيْتًا وَبَنَى عَلَيْهَا مَبْرَأَةً فَلَمَّا
كَمَلَتْ عَمَارَةُ الْبُشَانِ أَوْ دَهَلْ عِنْدَ التَّرَارِجِ وَ
سَافَرَ إِلَى بَلَدٍ آخَرَ وَأَقَامَ بِهَا فَلَمَّا خَانَ أَنْ يَنْفِخَ
الْقَمَارُ أَمْرًا سَلَّ عَيْنَهُ إِلَى الْبُشَانِ وَدَلَّهَا
أَنَّمَا رَكَ فَلَمَّا جَاءَهُ وَارَادَ أَنْ يَأْخُذَ ثَمَرَةً مِمَّا
وَأَسْلَمَهُ خَابِئًا ثُمَّ أَمْرًا سَلَّ عَيْنَهُ الْآخَرَ فَادُّوهُ
وَأَسْرُكُوهُ وَأَذْمُوهُ وَنَجِّوهُ أَمَّا سَلَّ عَيْنَهُ

ایک شخص نے اپنی زمین میں درخت لگائے اس کے گرد چار دیواری بنائی اس میں کسوں کھدوایا اور عمارت بڑائی جب باغ کی عمارت مکمل ہو گئیں تو وہ باغ کا شکاروں کے حوالہ کر کے خود کسی اور شہر میں جا بسا جب باغ پھیلے آیا تو اپنے ایک غلام کو کاشتکاروں کے پاس بھیجا کہ باغ سے پھیلے آئے۔ جب غلام وہاں پہنچا اور پھیل لینے کا ارادہ کیا تو کاشتکاروں نے اسے مار پیٹ کر نکال دیا اس نے پھر اپنا دوسرا غلام بھیجا انہوں نے اسے فک و کوب

اَخْرَجُوْهُ فَاَنْتَحَلُوْهُ فَاَنْتَحَلُوْهُ فَاَنْتَحَلُوْهُ فَاَنْتَحَلُوْهُ فَاَنْتَحَلُوْهُ
بَعْضُهُمْ وَاَنْتَحَلُوْهُ بَعْضُهُمْ وَكَانَ لَهُ ابْنٌ وَاحِدٌ يُحِبُّهُ
وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ سِوَاهُ فَاسْتَلَمَ اِلَيْهِ فَلَمَّا رَاَهُ
اَلْكُفَّاسُ قَالُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ هٰذَا الَّذِيْ يَرِيْثُ بَعْدَكَ
اَلْحَيَّةُ فَهَلُوْا اَفَقَتَلُوْهُ وَتَرِثُ الْبَشَرُ فَوَيْلٌ لِّهٖ
فَقَتَلُوْهُ فَلَا جُرْمَ لِّبَعْضِهِمْ عَلَيْهِمْ صَاحِبُ الْحَارِطِ يَزِيْجُهُمْ
اِلَيْهِمْ وَيَنْزِعُهُمْ مِنْ اَيْدِيْهِمْ وَيَذَرُهُمْ فَيَضَعُهُمْ عِنْدَ
اَلْخَرِيْثَةِ۔

اور لوہا نہ کر دیا اور سر بھاڑ دیا اس نے تمہارا غلام بھیجا
تو اس کو قتل کر دیا وہ اسی طرح غلام پر غلام جھیتا اور یہ بعض
کو مار پیٹ کر نکال دیتے اور بعض کو قتل کر دیتے اس شخص
کا ایک ہی بیٹا تھا جس سے اسے بہت محبت تھی اس کے سوا
دوسرا بیٹا بھی نہ تھا اس نے اسے بھی بھیجا جب کاشتکاروں
نے رطے کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ اس باغ کا وارث
و مالک یہی لڑکا ہو گا آداسے قتل کر دیں تاکہ پھر ہم ہی اس
باغ کے مالک بن سکیں پس سب مل کر اس پر پل پڑے اور
اس کو قتل کر ڈالا اب اس کے بعد ظاہر ہے کہ یہی ہو گا کہ باغ کا مالک غصہ میں بھر کر خود ان کے پاس جانے کا باغ ان سے چھینے
گا، ان کو ہلاک کرے گا اور پھر باغ دوسروں کے سپرد کر دے گا۔

ان تمام تفصیل سے یہی بات ثابت ہوئی کہ ملت عقیقہ کا ثبوت جو قائم القیدیین علیہ السلام کی نبوت کے ماننے
پر ہو سکتا ہے اہل سنت کے اصول مذہب کا اتباع کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ وہ ان اصول کو ان کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم کی
جماعت سے حاصل کرتے ہیں جو عشرہ مبشرہ بنیاد لہ اربعہ اور کثرین میں داخل اور اہل بدر اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم
اولین ہیں کہ جن کی سچائی اور صلاح عمل پر حق تعالیٰ خود اپنی کتاب میں ان مختلف الفاظ سے گواہی دیتا ہے کہ اُولَئِكَ هُمُ
الصَّادِقُونَ دسپے وہی ہیں یا یہ فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ تَمَعَّدَ اَشْتَقَ اَعْلٰی الْكُفَّاسِ د محمد اللہ کے رسول ہیں اور
ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں الخ۔ اور اسی طرح بہت سی آیتوں میں ان کی شان میں خوشنودی و رضامندی کے کلمات ارشاد
فرمائے ہیں مثلاً لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔ اللہ راضی ہوا مومنین سے جب کہ وہ درخت
کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اور ان جیسی دوسری آیات۔

پھر اہل سنت کے اسلاف نے قرآن و احادیث میں یہ نسوس پڑھ اور سن کر ان بزرگوں کے متعلق حالات کی واجبی چھان
بین اور تحقیق کی تو یہ پھر بھی اسی نتیجہ پر پہنچے۔ کہ واقعی یہ سب کے سب سچے عقیدہ والے اور نہایت محبت و درو بخ والے
منصف اور عدول تھے۔ اس روشن شریعت کے جھنڈوں کو بلند کرنے میں کسی کو کوتاہی سے کام نہیں لیا، نہ اس میں سستی اور
غفلت سے کام لے کر ملت عقیقہ کے احکام کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت کیا خدا کی کتاب کو اپنی بانوں سے زیادہ
عزیز رکھا دین الہی کی عزت و برداشت اپنے آپ سے بڑھ کر کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو نہ صرف عبادت کی
حیثیت دیکر ہی مضبوطی سے کار بند رہے بلکہ آپ کی عادات کو بھی عبادات ہی کی طرح اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔

عام سہ ماہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کبار صحابہؓ کے فیض محبت سے متاثر ہو کر اور ان کے سیاسی تدبیر اور انتظام کے
تحت یہی طریق زندگی اختیار کیا۔ اسی طرح ان کی صحبت اور ان کے انوار کی کرنوں سے فیضیاب ہو کر تابعین و رحمہم اللہ بھی اسی
ویژہ زندگی کو تھا مے اور عمل پیرا رہے اور صدی بعد صدی یہ طریقہ یونہی جاری و ساری رہا۔ بلکہ ہوتا یوں رہا کہ سردارانِ عرب
میں سے اگر کسی کا دل محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالی رہا تو وہ اپنی قوم کا سردار و مکھیسا ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں
میں حقیر و ہلکا ہی رہا خلیفہ دوم کے ہاں اقرہ بن حابس وغیرہ تو مجلس میں نشست کے لئے بڑی مشکل اور مقبوں سے جوتیوں

میں جگہ پاتے تھے۔ جب کہ اہل ایمان کے فقراء و مساکین اور غلام مثلاً، صہیب و عمار وغیرہ (رضی اللہ عنہم) صدر مجلس ہوتے اور اقتدار کے وقت ان بزرگوں کا طرز عمل یہ رہتا تھا کہ اختیارات کی تقسیم کے وقت قربت و رشتہ داری کے لحاظ کی جگہ اسلام میں قدیم ہونے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور رفاقت میں بلند درجہ ہونے کو باعث ترجیح جانتے پھر ان میں سے بہتوں نے کافی خون خرابے اور قتل و غارت، عزیز و اقارب کے کٹ جانے اور کفر پر عرصے تک ڈٹے رہنے کے بعد جب قوی معجزے دیکھ لئے تو ایمان کے سامنے سرنگوں ہوئے اور اس کو قبول کیا۔ اگر کاسنوں، غویوں اور اہل کتاب کے قول کے مطابق مالی و دولت اور عہدہ و اقتدار کے لالچ میں ایمان لانا ہوتا تو وہ اتنی کھکھیر میں پڑتے ہی کیوں شروع ہی میں ایمان لے آتے، اتنے عرصہ تک پیغمبر سے دشمنی مول لینے اور ان کو اذیت و بکراہی دینا و آخرت خراب کرنے کی محافقت کیوں کرتے اور اپنے پیادوں کو کیوں قتل کراتے، اور کیوں اہل ایمان کے کاموں میں استغری پھیلاتے اور اہل جہنم جلاتے،

اور جب ایسے لوگوں کی روایت سے دعویٰ بہت ظہور معجزہ انمول قرآن اور فضا نے عرب کا عجز بمقابلہ قرآن ثابت ہو تو اس پر یقین ہونا لازمی ہے کہ یہ سب واقعی ایسا ہی فضا اور آپ کی صداقت و صلاح کا علم قرآنی و نبوی شہادت سے دور کی شکل میں نہیں تھا، جس سے کوئی خرابی لازم آئے بلکہ وہ محض اعتقاد کی پختگی اور یقین کی زیادتی کے طریقے پر تھا۔ ورنہ ان کی متواتر روایات کی صداقت کا اعتقاد اور ان کے طریقوں کی اتباع و پیروی کا لازم ہونا تو ان کے حالات کی تحقیق سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے پس اگر شیعہ قرآن و حدیث رسول یا اجماع سے محبت لائیں تو لامحالہ وہ اپنی شیعیت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اہل سنت کے اثر سے آلودہ ہو جائیں گے ورنہ ان کے منکات محض سب کی چمک اور نقش بر آب کی طرح بے حقیقت اور بے اصل ہو جائیں گے، اب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ اصل شیعیت کی بنا پر ان کی کوئی بھی دلیل ٹھیک نہیں اتری۔ اور جب انہوں نے قرآن کے ماننے اور اصول ملت ضعیفہ کے قبول کرنے میں اہل سنت ہی کا دامن پکڑا تو اب انہیں چاہیے کہ وہ تمام متواتر امور مثلاً ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز کا اختیار دینا ان کے فضائل و مناقب یا غسل ربلیں اور مسح خضیں جو قرآن و اصول ہی کی طرح متواتر ہیں انہیں بھی قبول کر لیں ورنہ یہ کیا بات ہوئی کہ کھامی کسی کا اور شکریہ ادا کر میں، دوسرے کا، اس میں کوئی مزے داری نہیں، وجد و منغ باوہ اسے زاہد چہ کافر نعمتی اسرت دشمن سے ہون و ہم رنگ مستان زلیستن

(اسے زاہد یہ کیا ناشکری ہے کہ شراب کی مانعت بھی اور وجد و حال بھی، شراب کا دشمن بھی اور مستوں کی طرح جینا بھی) لہذا یہ فائدہ بہت ہی قیمتی اور مفید ہے، اسے معمول سمجھ کر ہاتھ سے نہ جانے دیں،

گزشتہ بابوں سے اس کا علم ہو چکا ہے، کہ شیعہ مذہب کی تمام تر بنا اصحاب ائمہ کی روایات پر ہے اور آئمہ نیز ان کے اصحاب کے حالات سے اس کا بھی پتہ چلا کہ آئمہ کے اکثر اصحاب جھوٹے تھے، جن کے کذب و دروغ کی آئمہ نے خود شہادت دی اور کوئی امام ایسا نہیں گزرا کہ آئمہ والے اس کے کچھ اصحاب کی تکذیب نہ کی ہو اور سبب اس کا صرف یہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس امام کی امامت کے قائل نہ رہے یا اس کے علاوہ دوسرے کسی کو امام مان بیٹھے یا وہ ترد و اور تشک میں پڑ کر سلسلہ امامت رک جانے کے قائل ہو گئے،

ان حالات کے ہوتے بھی ان شیعوں کو اصحاب امام سے "حسن ظن" ہے، اور اسی وجہ سے وہ نہ امام وقت کی اور نہ امام لاحق کی تکذیب کو ذرہ برابر دقت بھی دینے کو تیار نہیں، اور ان سب کی روایات پر پورا پورا اعتماد بھی کر لیتے ہیں تو پھر کیا بات ہے کہ وہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسن ظن رکھ کر ان کی روایات کو کیوں قبول کر نہیں لیتے جو تاثر محبت میں آئمہ

سے ہرگز روایات ائمہ کی روایات سے ٹکرائیں گی اور ان کو مصابہ کی صداقت پر شک ہو گا۔ مگر یہ کوئی ایسی اہم اور بڑی بات یوں نہیں کہ آراء اور روایات کا اختلاف و محاذ تو ہر امام کے اصحاب میں بھی ہوتا رہا ہے، اور یہ اختلاف و محاذ پھر بھی اصحاب ائمہ کی روایات قبول کرنے میں رکاوٹ نہیں بننا تو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں قبول ہوا بیت سے مانع کیوں ہو گا،

لہذا معلوم یہ ہوا کہ بات اصول و دیانت کی نہیں، بات صرف تعصب و دشمنی کی ہے اور اس سے بھی زیادہ تاثیر صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت و تذلیل کی ہے، لاحول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم حالانکہ خود ائمہ کرام نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو باہمی تخالف میں مندر کر رکھا، اور ان حضرات کی صداقت بیان فرمائی اور یہ سب کچھ ان کی اپنی صحاح میں موجود ہے، لیکن اس تعصب کا کیا علاج جس نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور کانوں کو بہرا کر دیا چنانچہ کتاب کافی کلینی میں باب اختلاف الحدیث میں حذف اسناد کے ساتھ منصوص بن عازم سے پوری روایت ہے،

قَالَ قُلْتُ لِإِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ مَا بَالِي أَسْأَلُكَ مِنَ الْمَسْئَلَةِ فَتَجِيبُنِي فِيهَا بِالْجَوَابِ ثُمَّ يُجِيبُنِيكَ غَيْرِي فَجِيبْنِي فِيهَا بِالْجَوَابِ
الْمُفْرَقَ قَالَ إِنَّمَا يُجِيبُ النَّاسَ عَلَى التَّزْيَادَةِ وَالنُّقْصَانِ قَالَ قُلْتُ فَأَخْبِرْنِي مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مَدُّوا عَلَى مُحَمَّدٍ أَمْ كَذَبُوا قَالَ بَلَى مَدُّوا قَالَ قُلْتُ فَمَا بَالُهُمْ اخْتَلَفُوا فَقَالَ أَمَا تَعْلَمُونَ أَنَّ الرَّجُلَ كَانَ يَأْتِي عَلَى
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَسْأَلُهُ مِنَ الْمَسْئَلَةِ فَيَجِيبُهُ فِيهَا بِالْجَوَابِ ثُمَّ يُجِيبُهُ بَعْدَ ذَلِكَ بِمَا يُنْسِيهِ ذَلِكَ
بِمَا يُنْسِيهِ ذَلِكَ فَتَسْمَعُ ذَلِكَ حَدِيثًا بَعْضُهَا بَعْضًا -

میں نے ابی عبد اللہ سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھوں تو آپ مجھے تو اس کا ایک جواب دیتے ہیں اور جب دوسرا شخص وہی مسئلہ پوچھتا ہے تو اس کو آپ دوسرا جواب دیتے ہیں، فرمایا کہ ہم لوگوں کو کبھی زیادتی کے ساتھ جواب دیتے ہیں، پھر میں نے یہ کہا کہ ذرا یہ بتائیے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے صحیح روایات کرتے ہیں یا جھوٹی؟ تو فرمایا صحیح تو میں نے کہا کہ پھر انہوں نے اختلاف کیوں کیا؟ فرمایا کیا تو اتنا نہیں جانتا کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا اور آپ سے کوئی مسئلہ پوچھتا ہے تو اس کو ایک جواب دے دیتے پھر اس کو اس کے بعد ایسا جواب دیتے جو پہلے جواب کو منسوخ کرتا، اسی لئے بعض احادیث نے بعض کو منسوخ کیا،

پھر حذیفہ اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے اور وہ ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتا ہے، قَالَ ثَلَاثُ مَا جَاءَ أَقْرَبُ مِنْ رُؤْيٍ عَنْ فُلَانٍ وَفُلَانٍ مِنْ سَمْعٍ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يَتَّبِعُونَ بِالْكَذِبِ نَبِيَّكُمْ مِنْكُمْ خَلَافُهُ قَالَ إِنَّ الْحَدِيثَ كَمَا تَقُولُونَ الْقَوَاتُ۔ اس نے کہا کہ میں نے پوچھا، کیا بات ہے کہ بہت لوگ فلال فلاں سے روایت کرتے ہیں، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کسی کو جھوٹ سے متہم بھی نہیں کیا جاتا۔ پھر آپ اس کے خلاف فرماتے ہیں آپ نے فرمایا کہ قرآن کی طرح حدیث بھی منسوخ ہوتی ہے،

دوسرا فائدہ | یہ دوسرا فائدہ پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے ہم نے اس کو "سعادة الوارثین فی مشرح حدیث الثقلین" کے لقب سے ملقب کیا، اگر کوئی چاہے تو اس کو بعد کے پانچ ابواب کے ساتھ ملا کر الگ رسالہ بنالے،

واضح رہنا چاہیے کہ شیعہ اور سنی دونوں کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ فرمودہ حدیث صحیح ہے لہٰذا تبارک و تعالیٰ تمہارے عقائد پر ایمان لائے کہ تمہارا عقیدہ اچھا ہے اور تمہارا عقیدہ غلط ہے۔ اللہ عزوجل اہل بیت علیہم السلام سے تمہاری طرف سے جو کچھ چاہے وہ تمہاری طرف سے ہی ہے۔

نہ ہنگو گے وہ ایک دوسرے سے اہم ہیں، یعنی اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری سعادت میرے اہل بیت، لہذا معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام نے دینی معاملات اور شرعی احکام میں یہ دو عظیم القدر چیزیں ہمارے حوالہ کی ہیں، اب جو مذہب ان دونوں کا مخالف ہو وہ باطل اور نامعتبر ہے، اور ایسے ہی جو ان دونوں بزرگ مرتبہ چیزوں سے منکر ہو وہ گمراہ اور دین اسلام سے خارج ہے،

اب ہمیں یہ دیکھنا اور اس کی تحقیق کرنی ہے کہ دونوں فریق میں سے کونسا فرقہ ان دونوں مضبوط رسدوں کو بھٹا ہے جوٹے ہے اور کون سا ان کی تحقیر و ہانت کرتا اور ان سے روگرداں ہے، ان کو درجہ اعتبار سے گراتا اور ان پر طعن کرتا ہے برائے خدا اس بحث کو بہت قویہ اور غور سے نیز ازراہ انصاف ملاحظہ فرمائیں۔ کہ ایک بہت انوکھی بات اور عجیب قصہ ہے، جس طرح اس پوری کتاب میں سارے کے سارے حوالے شیعوں کی معتبر کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں اس بحث میں بھی یہی التزام ملحوظ رکھا گیا ہے، اور اسی کی پابندی کی گئی ہے،

اب شیعہ عقیدہ کے مطابق کتاب اللہ موجود قرآن تو قدرت و انجیل کی طرح معتبر اور قابل اعتبار رہی نہیں کیونکہ بقول ان کے اس میں تحریف کی گئی ہے، اس کے بہت سے احکام منسوخ ہو گئے ہیں اس کی بیشتر آیات اور سورتیں جو احکام کی ناسخ اور عومات کی تخصیص کرنے والی تھیں چوری ہو گئی ہیں، باقی جو ہے اس کے بھی الفاظ بدلے ہوئے اور بعض الفاظ میں کمی بیشی کی گئی ہے، چنانچہ کلینی نے ہشام بن سالم سے روایت کی ہے اور اس نے ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہ، اِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِي جَاءَ بِهِ جَبْرَائِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَةَ عَشَرَ آفَ آيَةٍ جِئْتُ بِهَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَكَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا هُوَ فِي الْقُرْآنِ الْكَرِيمِ اس میں سترہ ہزار آیات تھیں۔

اور محمد بن نضر نے انہیں سے روایت کی ہے کہ کان فی کتبہ لیکن اسنادہ سبجین تہجد من قریش یا شامیہ و انما آتایہم کہ سورہ لم یکن میں قریش کے ستر آدمیوں کے نام مع دلالت و روح تھے اور سالم بن سلمہ کی روایت یوں ہے، وَ تَوَاتَى عَنْ سَالِمِ بْنِ سَدَّةٍ قَالَ قَرَأْتُ مَا جُلَّ عَلَى أَبِي عَبْدِ اللَّهِ وَأَنَا أَسْمَعُهُ حُرُوفًا مِنَ الْقُرْآنِ لَيْسَ مَا يَقْرَأُهُ النَّاسُ فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ اللَّهُمَّ اكْفُفْ عَنِّي هَذَا الْقُرْآنَ وَ اقْرَأْ كَمَا يَقْرَأُهُ النَّاسُ حَتَّى يَقُومَ الْقَائِدُ فَإِذَا قَامَ الْقَائِدُ اقْرَأْ كَمَا كَتَبَ اللَّهُ عَلَى خَدِّكَ اس نے کہا کہ میری موجودگی میں ابی عبد اللہ کے پاس ایک آدمی نے قرآن کے ایسے الفاظ پڑھے جو اور لوگ نہیں پڑھا کرتے آپ نے وہ الفاظ سن کر اس سے کہا ٹھہرا! ان الفاظ میں قرأت کرنے سے اس وقت تک باز رہو جب تک امام مہدی نہ آجائیں اب تو جیسے اور لوگ پڑھتے ہیں تو بھی پڑھو ان کے آنے کے بعد کتاب اللہ کو صحیح طریق پر پڑھنا،

اور کلینی نے نیز دوسروں نے جو روایت حکم بن عتبہ سے کی ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ علی بن حسین نے آیت وَ مَا آتَيْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ شَيْءٍ لَّئِنْ لَمْ يَنْهَیْهِمْ عَنْ ذَٰلِكَ لَكُنَّ مِنْ أَجْلٍ خَلْدٍ کے بعد لفظ مُحَمَّدٌ پڑھا کر اسے تلاوت کیا اور کہا کہ جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مُحَمَّدٌ صاحب الہام تھے،

اور محمد بن جہم ہمدانی اور دوسروں نے ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی کہ اُمّۃٌ مِّنْ آتِیَ مِنْ أُمَّةٍ اللہ کا کلام نہیں بلکہ اس آیت میں تحریف ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ تو اَللّٰہُ ہے اُنہی کی میں اُمّۃٌ کہ یہ امام تمہارے (امروں سے زیادہ پاک ہیں)۔

اور ان کے اپنے ہاں یہ بات ثابت دے شدہ ہے اور مشہور ہے کہ بعض سورتیں پوری کی پوری حذف کر دی گئی ہیں، مثلاً سورہ اولیاء اور بعض سورتوں کا اکثر حصہ مثلاً سورہ الاحزاب کہ وہ سورہ انعام جتنی طویل تھی اور اس سورت میں سے اہل بیت کے فضائل اور ان کی امامت کے مسائل نکال دیئے گئے، اور آیت لَا تَحْزَنْ ذَا اللّٰہِ مَعَنَا کے شروع سے وَبَلَدًا بَیْرُ النَّاسِ ہو، اور آیت وَقَفَّوْاْ هَہْمُ الْکَلْبِ مَسْنُوْکُوْنَ کے آخر سے عَنْ وَدَّ یَدَ عَلَیْ سَاطِطِہِیْنِ اور وَبَلَدًا بَیْرُ النَّاسِ کو حذف کر دیا گیا، اور آیت تَحِیْرُ ثَمَیْنِ اَلْفِ کے آخر سے حذف ہے، اور بَیْرُ ثَمَیْنِ اَلْفِ کو آیت لَیْسَ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَلْقِتَالِ کے بعد سے نکال دیا لفظ اَلِیْ کو آیت وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَنّٰی مُنْقَلِبٌ یَّنْقَلِبُوْنَ میں ظَلَمُوْا اور اَنّٰی کے بیچ میں سے نکال دیا اور لفظ عَلٰی تو آیت بَلٰکُمْ فَوَہِہَا کے بعد سے حذف ہے، چنانچہ ابن شہر آشوب نے المازندرانی نے کتاب المتألیف میں ان تمام تحریفات کا ذکر کیا ہے اور ان آیات کے علاوہ بہت سے کلمات اور بے شمار آیات گنوائیں ہیں۔

پس ایسے حالات میں موجودہ قرآن اور توریت و انجیل میں ان کے ہاں کوئی فرق نہیں رہا اور ان کے نزدیک ان تینوں سے کسی بھی طرح تمسک نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ تحریف شدہ، منہ شدہ اور کسی نامعلوم الحال کی منسوخ کی ہوئی ہیں، اب رہا عزت کا معاملہ؛ تو اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ لفظ حضرت انسان کے اقارب پر بولا جاتا ہے اور یہ لوگ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کے سب افراد کو عزت سے خارج کرتے ہیں، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ و حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کو، اور بعض کو عزت میں شمار نہیں کرتے مثلاً آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اور ان کی اولاد کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھوٹی کے بیٹے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو، اور حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہ کی اکثر اولاد کو دشمن جانتے ہیں اور ان کو برائی سے یاد کرتے ہیں، مثلاً حضرت زید بن علی حین رضی اللہ عنہم کہ بڑے متقی اور عالم تھے۔ جو مروانیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے ان کے بیٹے حضرت یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دشمن خیال کرتے ہیں۔ یہی حال جناب ابراہیم بن موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے،

اور جناب جعفر بن موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو تو کذاب کے لقب سے یاد کرتے ہیں حالانکہ وہ بڑے پایہ کے اولیا اللہ میں سے تھے۔ کہ حضرت بابر بدلسطای رحمۃ اللہ علیہ نے علم طریقت انہیں سے سیکھا ہے ان کے بارے میں انہوں نے یہ غلط شہور کیا کہ وہ حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، اور جعفر بن علی حضرت امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی کو کذاب کہتے ہیں۔

اور حسن بن حسن مثنی ان کے بیٹے عبد اللہ محض اور ان کے بیٹے محمد بن محمد بن عبد اللہ بن حسین بن محمد بن قاسم بن حسن اور مرتد کہتے ہیں۔ اسی طرح ابراہیم بن عبد اللہ ذکر یا بن محمد باقر محمد بن عبد اللہ بن حسین بن محمد بن قاسم بن حسن اور یحییٰ بن عمر کہ زید بن علی بن حسین کے پوتوں میں سے ہیں، سب کو کافر و مرتد کہتے ہیں،

اور سادات حسیدہ و حسینیہ رحمہم اللہ میں سے ایک جماعت کو جو جناب زید بن علی بن حسین کی امامت اور جہاد کے قائل ہیں مگر اہل قرار دیتے ہیں، حالانکہ کتب انساب اور کتب تاریخ سادات اس پر بصرحت دلالت کرتی ہیں کہ اکثر اہل بیت حسنی و حسینی حضرت زید بن علی بن حسین رحمہم اللہ کی امامت و نصیبت کے قائل تھے اور اکثر اشاعرہ شیعیان بزرگوں کے مشائخ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ کافر و مرتد تھے اور یہ کہ یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ چنانچہ آگے چل کر باب سادات میں

ان کی کتابوں سے سارے حوالے نقل کئے جا چکی گئے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک منکر امامت ایسا ہی ہے جیسا منکر نبوت! اور منکر نبوت کا فرہوتا ہے اور وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہے گا، اس میں کسی کو کیا شک! اور یہ بزرگ حضرات امام وقت کی ہی امامت کے منکر نہیں ہوئے بلکہ بعض ائمہ گذشتہ کی امامت کے بھی منکر ہوئے،

اثنا عشریہ کی ایک چھوٹی سی جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ لوگ مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ اعراف میں رہیں گے، بعض کہتے ہیں کہ سخت عذاب بھگنے کے بعد اپنے باپ دادا کی شفاعت سے عذاب سے نجات پائیں گے۔ مگر یہ دونوں ہی قول لغو اور مردود ہیں ان کے اصول و قواعد کے موافق وہ پہلا ہی قول ہے کیونکہ کفار کے حق میں بالاجماع شفاعت مقبول نہیں۔ اور اعراف مہدی رہنے کی جگہ بھی نہیں پھر اعراف میں رہنے کی ان کی کوئی وجہ بھی نہیں کہ یہ نو امامت کے منکر تھے اور امامت کا منکر کافر ہوتا ہے اور کافر کی جگہ دوزخ ہی ہے اعراف نہیں مرنے کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ لوگ یہ روایت بھی کرتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت رکھنے والا دوزخ میں نہیں جائے گا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بزرگ امیر المؤمنین کو بہ اختلاف محبوب رکھتے ہیں۔

اب یہاں ذرا اس فرقہ کے نامیدیوں کا متناظر دیکھیں کہ ائمہ کرام کے جگر پاروں اور بھائیوں کی یہ کتنی قدر قربین و تزیل کرتے ہیں اور اہل بیت کی معدودے چند ہستیوں مثلاً باہہ اماموں یا ان کے چند قرابت داروں کی محبت کی آڑ میں ہزاروں عیوب اور برائیوں کو ان کے سر تھوپتے ہیں اور خوارج سے بڑھ کر ان کی قربین و تزیل کا ارتکاب کرتے ہیں، پس سے نادان دوست سے دانا دشمن بہر حال بہتر ہے، چنانچہ ان کی کتابوں اور روایات کے جائزہ اور چھان بھٹک اور تحقیق و جستجو سے ان سب برائیوں کا راز روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے لیکن یہاں ان کی کفر آمیز بکواس اور گندگی کے انبار در انبار سے بطور نمونہ چند باتیں تحریر کرتے ہیں:-

اول:- یہ کہتے ہیں کہ امام وقت "صاحب عھد و زماں امام مہدی، اس قدر بزدل و ڈر پوک، خوفزدہ اور ترسیدہ ہیں کہ ایک چھوٹی سی جماعت کے ڈر سے روپوش ہو گئے اور چھپے ہوئے ہیں ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر ان کو منظر عام پر آنے کی جرات نہیں ہو رہی گویا اس درمیان بڑے بڑے انقلاب برپا ہو چکے عباسی حکومت کا تختہ الٹا چنگیزی دنیا پر چھا گئے پھر وہ مسلمان بھی ہوئے اور محب اہل بیت بھی ہوئے بلکہ بعض تو شیعہ مذہب کے بھی ملتے جلتے رہے اور عراق و خراسان پر چڑھ گئے، ک کاں اور ان کے لئے غلط مروجہ فہرے۔ صفویوں نے اپنا تسلط قائم کر لیا اور دوسری طرف ہندوستان میں سلاطین دکن، بنگالہ، یورپ کی امامت و وزارت ان کے ہاں تھا،

دوسرے:- ان کی تمام کتابوں میں جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت موجود ہے یا مَعَشَرَ الشَّيْعَةِ خِدْمَةُ جَلِيلِنَا لَنَا وَفَوْزُ جَهَنَّمَ لِكُفْرِهِ۔ غضب خدا کا بد باطن لوگ کتنی آسانی اور اپنے بزرگوں پر اس گندے بہتان کو تھوپنے میں کتنے جری اور بے شرم ہیں،

تیسرے:- یہ عزت رسول پر یہ تمہت دھرتے ہیں، کہ حضرت سیدہ انسا رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی کے بارے میں حضرت نے یہ کہا هَذَا آتِلُ فَوْزُ عَصِيبٍ لَنَا كَسْ جَرَاتِ بے باکی اور آسانی سے یہ گندہ و بیہودہ کلمہ اپنی زبانی سے نکال رہے ہیں ان پر تو آسان ٹوٹ پڑنا چاہیئے آپ دیکھیں تو یہی کہ اول تو پاکدامن سیدہ کے حتیٰ میں جو رسول

کے بدن کا حصہ اور جنول کے جگر کا پھوٹا ہے۔ یہ کسی قدر گستاخی اور بے ادبی ہے کہ ایسی نجس خلعت کا داغ اس پاکدامن پاک طینت پر لگاتے ہیں،

پھر حضرت امیر و حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کی اس میں کسی درجہ بے حرمتی اور بے عزتی ظاہر ہو رہی ہے، اور ایسے ہی حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ان نازیبا کلمات سے کتنی بے غیرتی کا ثبوت ملتا ہے، اول تو ایسے گندے ناشائستہ الفاظ بزرگ لوگ اپنی زبان پر لاتے ہی نہیں۔ پھر ایسے معنوبدنی کا لفظ جس کے نام دسمی ہرود شرمناک اور دھبی اپنے بزرگ اقدار کی نسبت کہ ادبش اور شہدہ بھی تو اس سے بچتا ہے، چنانچہ درانیوں کے ہنگامہ کے وقت عورتوں کی جو بے حرمتی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ دہلی کے بازاری لوگ بھی اس شرمناک جیاسو ز فعل کو زبان پر لانا اپنے لئے عار سمجھتے تھے چہ جائیکہ اس گندے واقعہ کا احتمال جگر پارہ رسول کی نسبت گو جبر واکرہ ہی ہو، کسی مسلمان کو کیا تاب کہ اس نازیبا بات کو زبان پر لائے،

چوتھے ۱۔ کہتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی صاحبزادیاں اور بہنیں کافروں اور فاجروں کے نکاح میں دیدیتے ہیں کہ حضرت سکینہ رحمۃ اللہ علیہا مصعب بن زبیر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، اسی طرح اپنی قریبی ستورات کو کافرانہ صوبوں کے عقد میں دیتے ہیں جس کی تفصیل کتب انساب سادات میں شرح و بسط سے ملتی ہے،

پانچویں ۱۔ حضرت صادق رحمۃ اللہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید زمین پر پھینک دیا۔ اور اس کی توبہ میں کی اس طرح انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصعب کو جلانے کا جو الزام لگایا ہے اسی جیسا الزام یہ خود حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ پر لگاتے ہیں، چنانچہ کلینی نے زبیر بن جہم ہلالی سے ان الفاظ کی روایت کی ہے اِنَّهُ قَرَأَ وَكَانَ يَكُونُ فَاَتَتْهُ نَقَعَتْ خَذْلَهَا مِنْ بَعْدِ ثَوْبَةٍ اَلَا شَاؤُا تَخَذُوْنَ اَلَيْسَا نَكُمُ وَخَلَا بَيْنَكُمُ اَنْ تَكُوْنُوْا اِيْمَةً هِيَ اَتَمُّكِي مِنْ اَلَيْسَتِكُمُ فَقُلْتُ حَيْلُكَ اَيُّ اِيْمَةٍ اَمِي وَاللّٰهُ قُلْتُ اِنَّمَا يَشْرُوْهُ اُمِّي قَالَ مَا اَمْرُ حَيْلٍ وَ اَفُوْا مَا يَسِيْرُ فَنَطَرَ حَقًّا اِهَانَتُهُ اُنْهَرُوْا اَكَا تَنْتِي نَقَعَتْ خَذْلَهَا پھر ہی اور جب ائمہ ہی ارباب من ائمہ پر پہنچے تو اس کی جگہ اللہ ہی ان کی مین ائمتہ پڑھا دی کہتا ہے میں نے آپ سے کہا میں آپ پر قربان کیا یہ لفظ ائمہ ہے کہا ہاں خدا کی قسم میں نے کہا کہ پڑھا تو ارباب جاتا ہے فرمایا ارباب کیا، پھر ہاتھ سے اشارہ کیا اور قرآن مجید کو زمین پر پھینک دیا۔

چھٹے ۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نفس سے ائمہ کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہیں جو ایمان کے بالکل منافی اور علامات مومن کے سراسر مخالف ہے۔ غرض اس سے یہ ہے کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حوالہ سے ائمہ کے ایمان کو شکوک اور اس میں رخنہ پیدا کریں اور یہ بات ثابت کر سں کہ ائمہ اپنی پوری زندگی میں کسی خوف و خطر کے نہ ہوتے ہوئے بھی حق کو چھپانے اور باطل کو ظاہر کرنے (یعنی ثقیف) پر مجبوری سے۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی وہ کس متواتر جو کہ حج البلاغہ میں موجود ہے یہ ہے، قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَامَةُ الْاِيْمَانِ اَنْ لَا تُؤْثِرَ الْقُلْدَ حَيْثُ يُلْفَعُ لَكَ عَلَى الْكَيْدِ حَيْثُ يُلْفَعُ لَكَ۔ و جناب امیر نے فرمایا کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ تو اس وقت سچ نہ بولے جب سچ تجھے نقصان اور جھوٹ فائدہ دیتا ہو)

ساتویں ۱۔ یہ کہ ائمہ سے بعض قرآن آیات کی ایسی تفسیر نقل کرتے ہیں جو عربی قواعد نحو کے لحاظ سے بالکل ٹھیک نہیں

ہوتی فرض خفیہ وہی کہ ائمہ کی ثقاہت علمی کو مجرد کیا جائے، ایسی صورت میں لامحالہ سامع کے دل میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگی کہ یہ حضرات متین عربیہ اور قواعد نحو سے بھی نا بلد ہیں یا اس طرح بعض ایسی تفاسیر نقل کرتے ہیں جن میں کام کا ربط نافع عبارت بے جوڑ عناصر میں گڑبڑ اور سیاقی سخن مختل ہو جاتا ہے اور جس کی وجہ سے ان حضرات کے کمال علمی کے بارے میں بدظنی پیدا ہوتی ہے،

آٹھویں:- ائمہ سے ایسی روایت نقل کریں گے جس سے معلوم ہو کہ وہ جہاد سے روکتے ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں جس تاکید اور پر زور الفاظ میں جہاد کا حکم دیا ہے، وہ ایک مکتبی کچھ سے بھی پوشیدہ نہیں، اس طرح یہ تعلیق میں اختلاف پیدا کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں اگرچہ خود ہی روایت بھی بیان کرتے ہیں اگرچہ خود ہی یہ روایت کرتے ہیں کہ لَنْ يَنْتَفِرَ قَاتِلٌ يَرَى اَهْلًا اَوْ مَوْتًا۔ (جب تک یہ حرمین پر آئیں گے، ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے)۔

لہذا اس عبارت سے صاف پتہ چلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرماتے ہوئے کہ لوگ میری عزت پر جھوٹ و افترا جوڑیں گے اس لئے ہمیں ان جھوٹوں اور مفتریوں کے قول اور مذہب کو سچ کھنے اور جانچنے کے لئے ایک کسوٹی اور ایک معیار عنایت فرما گئے اور وہ ہے قرآن کہ ہم ان لوگوں سے جو کچھ سنیں ان کو قرآن کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھ لیں ان کی جس روایت یا قول کی قرآن نصرت کر دے اسے صحیح سمجھیں اور جس کی کسوٹی پر تعدی نہ کرے اسے جھوٹ اور افترا سمجھ کر جھوٹوں اور مفتریوں کے منہ پر ماریں اور قرآن جو ہم کو تواتر ہے، ہر وقت ہر جگہ ہر ایک کے پاس ہے یا اس تک رسائی آسان ہے پھر اس کی حفاظت کا انتظام خود اللہ تعالیٰ نے ایسا فرما دیا ہے کہ بقول اس کے فرمان لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ۔ تَنْزِيلُ مِّنْ حَكِيمٍ حَنِينٍ۔ (کہ باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے ہٹ سکتا ہے) وہ حکمت والے اور لائق تعریف اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتاب ہے، اس لئے وہی معیار اور کسوٹی مقرر کئے جانے کے لائق تھا۔

چھٹا عزت کے کہ بتقاضائے بشریت، موت، فیست مکانی، بند زبانی اور دوسرے ایسے موارد میں موجود ہیں، جن کی وجہ سے درد غلوی، افترا پر دلازی اور بہتان تراشی کا دردازہ کھل سکتا ہے اور سوا بھی ہے۔ کہ قرآن کے متعلق تو ان کی اڑائی ہوئی خاک نے انہیں کے منہ کاٹے کئے، مگر عزت کے ساتھ جس انداز اور طور طریقوں سے اپنا جث نکالا اور جس جس طرح ان کی عزت کے دریے رہے وہی آپ یہاں ملاحظہ فرمائیے (۱)۔

نویں:- یہ ائمہ کی طرف منسوب کر کے کہتے ہیں کہ انہوں نے مطلقہ سے جماع جائز بتایا ہے، حالانکہ یہ تو صاف زنا کر جائز قرار دینا ہوا۔

دسویں:- عین ادائیگی نواز کی حالت میں مردانہ محسوس اعفا سے کھیلنا ائمہ کے حوالہ اور نسبت سے جائز بتاتے ہیں، کھیل آپ سمجھتے ہی ہیں، اسے آپ بوقت مزدورت ملاحظہ ہو جائے پر محمول نہیں کر سکتے اور پھر ایسے کھیل کی عین نواز ہیں ائمہ کی طرف سے اجازت بھی نسبت تغویر تو اسے ... ۱۔

گیارہویں:- ائمہ کی طرف یہ بھی منسوب کرتے ہیں کہ جس کپڑے پر نجاست غلیظہ و پاخانہ وغیرہ، لگی ہو اس پر ناز پڑنا جائز ہے، حالانکہ اسد بانہ کے متعلق ائمہ کی طرف سے جواز کا تصور بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا،

بارہویں: یہ بھی ان کا کہن ہے کہ امام نے مردہ جانور کے بچے کا گوشت کھانا جائز بنایا ہے،
تیرھویں: حالت ناز میں بیوی کے ساتھ چرامپائی کو بھی ائمہ کے حوالہ سے جائز کہتے ہیں۔ (باب فروع میں انشاء اللہ ان
سب کے حوالہ بات انہیں کی کتابوں سے نقل کئے جائیں گے)

چودھویں ا۔ عام لوگ خصوصاً عورتوں کو واجبات دینی سے روکنے اور منع کرنے کی نسبت بھی ائمہ کی طرف کرتے ہیں یقیناً طائفہ نے ادیم بن حمرکی روایت جناب ابی عبداللہ سے بایں الفاظ نقل کی ہے، قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ حَدِيثًا لِمَدَامِ عَنْ الْمَرْأَةِ تَعْدِي فِيمَا يَسْتَلْزِمُهَا عَلَيْكَ قَالَ لَا تُحْبِقِي وَلَا تُدْعِكِي فَيَتَّخِذَنَّ ذَلِكَ حِلَّةً رَمِينَ نَعَى إِلَيْنِ عَوْرَتِكَ بَارِعَةٍ فِي مَسْلَكٍ بِوَجْهِ خُرَابٍ هِيَ وَهِيَ دَيْكَةٌ جَوْسُونٌ وَالِدَاكِ كُنْتَ كَمَا اس پر عمل ہے آپ نے فرمایا ہاں مگر عورتوں کو نہ بتادینا ورنہ وہ اس کو بہانہ بنا لیں گی، اس سے جو بات ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ائمہ جنابت کی حالت میں عورتوں کے نماز پڑھنے کو جائز خیال فرماتے تھے، جو بالاتفاق کفر ہے اور پھر کفر پر راضی ہونا بھی بالاتفاق کفر ہے اور دوسری یہ بات کہ ائمہ مکلف انسان کے ولجبات شریعت سے لاعلم وجاہل رہتے سے غرض تھے، حالانکہ یہ بات منصب واستحقاق امامت اور عدل و حقوق کے سراسر خلاف ہے اور اس سے بھی زیادہ صاف اور زیادہ بدتر وہ روایت ہے کہ جو صاحب حماس دنام کتاب نے امام کاظم سے روایت کی ہے، أَنْتَ قَالِي أَنْ تَعْلَمُوا أَنَّ الْخُلُقَ الْأَمْثُولَ يُبْذَلُ مِنْهُ عِلْمٌ وَمَنْعُومٌ كَمَا أَنَّ اس طبقہ کو ان کے دین کے اصولوں کی تعلیم نہ دو، اس نوع حکایت و روایت کو کون تسلیم کرے گا کہ جن کا کام ہی دین سکھانا ہے، وہی جب مکلفین کے ایک طبقہ کو دین نہ سکھائے کہ نفیقین کریں گے تو دوسرا کون دین سکھائے گا، جو کفر از کعبہ بر شیر ذکھا اند مسلمان کا پسند رکھیں ا۔ اللہ کے احکام پر متحرک عمل کے لئے یہ لوگ ائمہ کو خصوصاً امام باقر و امام صادق رحمۃ اللہ علیہما کو مورد الزام گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تقیہ پر عمل نہیں کرتے حالانکہ یہ خود ہی امام صادق سے یہ روایت بھی کرتے ہیں کہ التقیہ دین آبادی القیہ میرے آباد کا دین ہے، تو پھر ان حضرات نے اپنے باپ دادا کے دین میں ایسے کیا عیب دیکھے کہ اس کو خیر باد کہہ دیا۔

سوال نمبر ۱۔ ایسے امور کی نسبت ائمہ کی طرف کرتے ہیں جو کتاب اللہ کے احکام کے مریخ خلاف ہے اور غرض یہ ہوتی ہے کہ ثقلین۔ کتاب اللہ و عمرت رسول میں اختلاف پیدا اور لوگ دین کے معاملہ میں حیرت و پریشانی کا شکار ہوں چنانچہ کہتے ہیں کہ جو سونا چاندی سکوں کی شکل میں نہ ہو تو ائمہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور نہ ائمہ نے اس کی زکوٰۃ غرودی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی وعید اَلَّذِي لَا يَكُنْزُهُنَّ وَاللَّهُ بِمَا كُفَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
درجہ سنا چاندی جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ آخر آیت تک، کا آئمہ کو مصلوق طغیر ایسے۔
ستر صہریٰ کہتے ہیں کہ بیٹے اور دوسرے اعزہ کی موت پر نوحہ، شور و شیون اور کپڑے بھاڑنا مرد و عورت سب کے لئے
ائمہ جائز سمجھتے تھے۔ اس اہتمام سے ان کا مقصد ان بزرگان دین کو بے ممبروں اور روئے پٹینے والوں میں شمار کر کے ان کو
اس بشارت قرآنی سے محروم کرنا ہے جو ممبر کرنے والوں کی شان میں آئی ہے، اور لَيْسَ رِثَاةً لِّكَ الْيَتِيمُ (جس نے
دامن چاک کیا وہ ہم میں سے نہیں) کی وعید میں ان کو داخل کرنا ہے،
اٹھار دیں۔ حکم قصاص سے نابینا کو یہ مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، جو نفع قرآنی کے صریحاً خلاف ہے، اور نسبت اس کی بھی

اماموں ہی کی طرف کرتے ہیں۔

انیسویں۔ اگر کسی ذمی نے مسلمان کو قتل کر دیا ہو تو اس کی اولاد کو غلام بنالینے کے حکم کو بھی اماموں کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ لذتیں و سہولتیں و ثروت و ثنائی آخری کے شرعی تقادد کے پر اسر خلاف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بوجہ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجہ نہیں اٹھائے گا۔

یا یوں آیا ہے۔ لَا یَجْنِبُ عَلٰی وَلَدِہٖ وَلَا مَوْلَاہٖ عَلٰی وَالِدِہٖ وَ ذَوِّہٖ بَطْنِہٖ کے بدلے کوئی نہ بچکتے گا نہ بیٹا باپ کے بدلے، اس لئے کہ اگر اس قسم کا انتقام شرعاً جائز ہو جائے۔ تو شرعاً محمدی اور قانون چنگیزی میں پھر فرق کیا رہ جائے گا۔ البتہ کافر عربی کی ایسی اولاد کو غلام بنانا جائز ہے جس سے یہ خطرہ ہو کہ اس میں جنگ کی صلاحیت ہے وہ بھی اس مصلحت سے کہ اہل حرب کی آبادی کم ہو۔ اور قاتل ذمی کی اولاد نہ تو لڑائی کے قابل ہے اور نہ وہ اہل حرب آبادی میں داخل ہے وہ تو مسلمانوں کی فساد داری میں رہنے والی پر اسن آبادی ہے، ان کو کسی جرم کی بنا پر غلام بنانا جائز ہے، برخلاف اسی کے کہ یہ تو کھلم کھلا عہد شکنی ہے جس کی تمام ادیان و مذاہب مخالفت کرتے اور ایضاً عہد کو سب ہی واجب قرار دیتے ہیں اس کے علاوہ یہ بات قرآنی حکم (لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ فِیْہِ نَفْسٌ) (بے شک جان کا بدلہ جان کے بھی خلاف ہے)

بیسویں۔ حضرات ائمہ سے یہ بات منسوب کر کے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یوم قتل سے جو ان کے خیال میں ۹ ربیع الاول کو ہوا اور نہ بعد تک کسی کے اعلان سے میں کوئی گناہ کبیرہ ہو یا منغیرہ نہیں لکھا تا داس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اعمال نامے لکھنے والے سارے فرشتوں کو دشمنانِ فاروق اور ان کے قاتل۔ اور قتل کی شازش میں شریک لوگوں کے اعلان سے سیاہ کرنے پر لگا دیا ہو گا کہ ان کا جرم اتنا شدید تھا اور فرد جرم اتنی طویل تھی کہ دو روز اس کی تکمیل میں لگ گئے ہوں گے، گویا یہ کہہ کر وہ اماموں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے تین دن تک لوگوں کو گناہ حتیٰ کہ کفر تک کی اجازت دیدی کہ ان دنوں میں جو چاہو کر و نامہ اعمالی سادہ کے سادہ رہیں گے۔

اکیسویں۔ ان پاک اور برگزیدہ ہستیوں کی طرف یہ بات بھی منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے استنجے کے پانی کو پینے کے کام کے لئے یا طہارت اور دیگر ضروریات میں استعمال کو جائز قرار دیا ہے،

بانیسویں۔ حضرات ائمہ سے روایت کرتے ہیں کہ امت مرحومہ کا لقب امتِ ملعونہ ہے۔ میر فی نے ابی عبد اللہ رحمہ سے اس کی روایت کی ہے۔ یعنی اور جناب صادقؑ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے امتِ مصطفویہ کو خنازیر سے تشبیہ دی ہے۔ یہ روایت کلین نے امام صادقؑ سے نقل کی ہے۔ حالانکہ قرآن نے اس امت کو غیر امت کے لقب سے سرفراز کیا اور ان ہی کی شان میں اُمّتٌ کُتِبَ لَہُمْ فَرِیَاضٌ فرمایا۔

تحریر بالا کی روشنی میں یہ بات دامن ہو گئی کہ اس ساری ہفوات کا مقصد و حید صرف یہ ہے کہ تقیین۔ جو حرم پر پہنچنے تک متعدد متفق رہیں گے۔ ان میں مخالفت، عدائی اور افتراق کی راہ نکالی جائے۔ تاکہ سرشتہ دین با حق سے جاتا رہے اور مادرِ پدر آزاد ہو کر چوپایوں اور درندوں کی زندگی بسر کرنے کا سنہرا موقع مل جائے، اس لئے کہ جب ایک طرف کتاب اللہ میں تحریف، کمی بیشی، تغیر و تبدل، اس کے سبب تک کے قابل نہ رہے اور دوسری طرف عترت بھی مجروح ہو کر کھلی کے قابل نہ رہے تو انسانی اور دینی زندگی کی تصدیق کون کرے گا جب تقیین سے مگر غلامی کمرالی، ترواب حیوانی زندگی کے سراسر مخلوق کے پاس کیا ہے۔ اسی کو تو جنگل کا قانون کہا جاتا ہے جس کا جو چاہے کرے، کوئی بندش نہیں کوئی پابندی

نہیں۔ کوئی ردک ٹوک نہیں جس کی چاہو جان لے مگر جس کی اور جب چاہو آبدوریزی کر ڈالو اب آپ دیکھ لیں احادیث نقلیں، مکی پاسداری کون کر رہا ہے اور اس کی تحقیق تو بین الاقوامی

اس اہم فائدہ کے اختتام پر ایک ذیلی فائدہ کا ہم اور اضافہ کر رہے ہیں کہ اس کا مضمون بہت عمدہ اور نفیس ہے، ذیلی فائدہ واضح رہے کہ شیعہ پیشواؤں نے امامان محترم سے جو کچھ روایات بیان کی ہیں اور ان کی تائید میں طہرت رسول کے جراتوال و افعال بیان کئے ہیں ان سب کی ائمہ کے فرزندوں کے اور چھپرے مجاہدوں نے شد و مد اور تکرار و اصرار کے ساتھ تردید و تکذیب کی ہے،

اور یہ بات ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے کہ انسان کے احوال و افعال پر جس طرح اس کے بیٹے، بھائی، خویشتن، اقربا جتنے واقف ہوتے ہیں، دوسرے لوگ اتنے واقف نہیں ہوتے، اور پھر وہ بیٹے، بھائی اور عزیزان کے ہمدرد مساند ہم مشرب اور طریق بود و ماند و رسم و آئین میں ان کے ہم جنس بھی ہوں اور ان کی تردید و تکذیب صحیح روایات کی صورت میں خود ان کی کتابوں میں بھی موجود ہو، اسی کے مقابلہ میں ایسے لوگ جنہیں ائمہ کی محبت لگا ہے بلکہ ہی نصیب ہو ان اقرباء کے مقابلہ میں اعتماد میں کیسے بڑھ سکتے ہیں۔

ہم یہاں دو ایک مسائل بطور نمونہ تحریر کرتے ہیں وہ بھی اس لئے تاکہ ان کے جھوٹ کا پول اچھی طرح کھل جائے شہنا حضرت زید شہید رحمہ اللہ علیہ، جو حضرت امام سجاد رحمہ اللہ علیہ کے فرزندوں میں سے ہیں، اور علم و تقریعی نیکی و پارسائی اور بزرگی میں سر بلند و ممتاز انہوں نے امام موصوف کے راویوں کی بہت سی روایات کو جھٹلایا اور ان کی تکذیب کی ہے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام پر ائمہ کی فضیلت والی روایات، اور علقائے ثلاثہ روضان اللہ علیہم پر تبرا کرنے اور ان کی شان میں دریدہ دہنی اور گستاخی کرنے پر ان کو گمراہ قرار دیا ہے،

[illegible]

کر سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا تو کیا میرے بغیر زندگی چاہتے ہو؟ اس پر میں نے کہا اچھا اٹھئے یہ ایک جان ہے جو حاضر ہے۔ اگر زمین میں اللہ کے لئے محبت ہے تو آپ کے ساتھ چلنے اور چلنے والا دونوں برابر ہیں اس کے بعد انہوں نے کہا ابو جعفر میں اپنے باپ کے دسترخوان پر ہوتا تھا وہ مجھ کو بہتر چیز کا لقمہ کھلاتے اور مجھ پر شفقت کر کے گرم لقمہ کو کھٹا کر کے کھلاتے، تو کیا دوزخ کی آگ سے بچانے کے لئے ان کی شفقت میرے ساتھ نہ رہی ہوگی کہ اس معاملہ کی تجھے تو خبر دی اور مجھے نہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ ان کو یہ ڈر تھا کہ اگر آپ نے ان کی وہ بات نہ مانی تو آپ دوزخ میں چلے جائیں گے اور مجھے اس لئے خبر دی کہ میں اسے مان لوں گا، تو نفات پا جاؤں گا، اور انکار کر دوں گا۔ تو مجھے دوزخ میں جانے کا اتنا ڈر بھی نہیں ہے۔

در اصل بات یہ تھی کہ احوال کا کہنا تھا کہ جناب زید کے مقابلہ میں ان کے والد نے محمد باقر کو امام متعین کیا ہے اور اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت زید شہید نے امام باقر کی تعیین کی روایت کو جھٹلایا ہے، اب امام صادق جو امام محمد باقر کے بیٹے اور فرزند ہیں ان کی دوسری روایت کو بھی ملحوظ فرمائیے اور دیکھئے کہ وہ جناب زید شہید کی تائید کر رہی ہے یا اس بھیگے راحول کے قول کی تاقضی نور اللہ شریستی مجالس المؤمنین میں فضیل بن یسار کے حالات کہتے ہوئے امالی شیخ ابن بابویہ سے فضیل کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا کہ جب زید بن علی رحمہ اللہ علیہ کی شام کے باغی لشکر سے لڑائی ہوئی تو میں ان کے ہمراہ تھا حضرت زید کی شہادت کے بعد میں مدینہ حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گیا تو آپ نے مجھ سے پوچھا فضیل تم شامیوں کے ساتھ لڑائی میں ہمارے چپکے ساتھ تھے میں نے کہا ہاں، پوچھا تم نے کتنے آدمی مارے؟ میں نے کہا چھ، پھر پوچھا کہ تمہارے دل میں یہ شک تو نہیں کہ تم نے ان کو ناحق مارا؟ میں نے کہا یہ شک ہوتا تو ان کو مارتا ہی کیوں اس وقت میں نے آپ کو یہ الفاظ فرماتے سنا اَشْرَکُنِی اللّٰهُ فِی تِلْکَ الذَّمِّ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُذِلُّ حَقِّیْ حَقَّوْا اَصْحَابُکَ شَہِدُوْا مِثْلَ مَا مَفِیْ عَلٰی حَقِّیْ فَبِیْ اِلٰہِ طَالِبِ اَصْحَابِہَا اَنْتَہِیْ بِلَفْظِہٖ، واللہ مجھے بھی ان خونوں میں شکر فرمائے اللہ کی قسم میرے چا زاد اور ان کے ساتھی ایسے ہی شہید ہیں، جیسے حضرت علی بن ابوطالب اور ان کے ساتھی شہید ہیں۔ اس کے الفاظ ختم ہوئے

اب حق گو ایام صادق رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں جو تشبیہ ہے وہ غور طلب ہے، یہ تو ظاہر ہے، کہ جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کے اعتقاد میں حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کا حال جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے حال کے مماثل، ہم سرزمینہ اور ہم جنس ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ حضرت زید اپنے اعتقاد کے مطابق دشمن کے مقابلہ میں بنفس نفیس خود بخود جانے میں حق بجانب ہوں گے یہ نہیں ہوا کہ اپنے کسی مناسب نائب کو مقرر کیا ہو اگر ایسا ہوتا تو آپ شریک نہ ہوتے تو آپ کی شہادت کی گواہی اور اس شہادت کو امیر المؤمنین کی شہادت کے مماثل قرار دینے والی گواہی بے معنی اور بے فائدہ ہوگی اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ احوال نے امام زادے کے متعلق جو کہو اس کی اور بیروانی کو اس کا سبب قرار دیا وہ چند وجوہ سے لغو پوچھ اور بے معنی ہے،

اول۔ اس صورت کو اگر درست مانا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اپنے والد کے معاملہ میں ترک الصلح کا الزام آئے گا لہذا ان کو دین کی دعوت ہی کیوں دی کہ جن کا انکار کر کے وہ دوزخ میں چلے گئے ممکن ہے شیعہ اسے تسلیم نہ کریں کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے ایمان کے قائل ہیں تو چلے ہم یہی بات آئندہ کے متعلق کہتے ہیں

جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پرورش کیا اور وہ بمنزلہ باپ کے تھے اسی لئے قرآن میں جا بجا اب کے لفظ سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ تو ان کے معاملہ میں یہ رویہ کیسے رد رکھا۔

اور یہ بات یہیں ختم نہیں ہوگی تاہی پیغمبر ان حتی کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی اور ان پر بھی اس ظلم ناز و
اور قطع رحمی کے ارتکاب کا الزام آئیگا و نفوذ باللہ! کیونکہ ان تمام گرامی قدر حضرات نے اپنے اعتراف و اقارب کو دین کی
دعوت دی مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابولہب کو دعوت دی اور اس نے اسے قبول نہ کیا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم اپنی تمام امت کی حیات ابدی کا سبب اور اس پر ماں باپ سے زائد مہربان، شفیق اور ہمدرد تھے اور کل عالم و
عالمیان کے لئے مجسم رحمت ان تمام غریبوں کے ہوتے ہوئے بھی آپ نے تعین امام کی مصلحت محسوس نہ فرمائی بلکہ اس پر کثرت
فرمایا۔ چنانچہ علامہ عبد اللہ مشدیدی نے اظہار الحق میں حضرت خذیفہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ قَالَ خَالُوْا اَيُّهَا النَّبِيُّ
لَنْ اَسْتَمْلِفَتْ۔ قَالَ اِنْ اَسْتَمْلِفْتُ عَلَيْكُمْ قَعْنَبِيَّةٌ مَوْءُوْدٌ عَنْ نَبِيٍّ وَلٰكِنْ كَذًا نَكَمْتُ حَنْدَقًا يَفْتَدِيَنَّ قَوْمًا وَمَا اَنْتَ رَكْبٌ
عَبْدُ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْهُ رَابِعًا لِيَفِيَّ كَيْتَہِیْ کہ تو کوئی نے پوچھا یا رسول اللہ کیا آپ نے کوئی غلیفہ مقول فرمادیا ہے آپ نے ارشاد
فرمایا کہ اگر میں تم پر کسی غلیفہ کو مقرر کر دوں اور تم اس کی نافرمانی کرو تو غضاب کے مستحق ہو جاؤ گے، ہاں ابو حذیفہ جو تم سے کہے
اسے سچ مانو اور جو عبد اللہ تم کو پڑھائے اسی کو پڑھو،

اے پڑ جانے اور جو عبداللہ کو پرکھنے کے لیے کہہ رہا تھا، اس پر حضرت امیر مومنین علیؓ نے امارت کا حکم صریح فرمایا اور اس کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا۔ پھر آخر یہ کیا ہوا کہ آپ نے حضرت امیر مومنین علیؓ کی امارت کا حکم صریح فرمایا اور اس کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا۔ گویا اپنے تئیں بیسالی مدت تک سلسلے تمام ساتھیوں اور جانثاروں کو جگو آپ نے آئین اسلامی سکھا کر راہ راست پر لگایا تھا۔ ابھی ہر گزت میں ڈال کر سب کو دوزخی بنا گئے، اور ان کی دیکھا دیکھی ساری ہی امت بہک کر فتنہ و فساد میں جا گری۔

دوسرے۔ امامت تو اصولی واجبات میں سے ہے تو اس سے ناواقفیت مذکب بن سکتی ہے اگر جناب زید کے والدین بگڑا
نے ان کو اصل اعتقاد ہی سے باخبر نہ کیا تھا تو انہوں نے بغیر علم و اطلاع کے نام کر کے دوزخ بننا کیوں چاہا پھر یہ نہیں

کہ خیاب زید صرف جہیل پر ہی قائم رہے ہوں بلکہ امام باقر کی امامت کے منکر بھی ہوئے اور اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور اگر اس قسم کا جہیل بھی مدعی نکلتا ہے تو کبار صحابہ بلکہ فواصی کے ناجی ہونے میں کیا شک رہ جائے گا کیونکہ ان کو بھی تو خیاب

امیر مبنی اللہ عنہ کے بارے میں نفوسِ قطعی اور تو اتر سے نہیں پہنچیں، اور جو پہنچیں وہ مسیح روایات کے معارضی محض ہیں چنانچہ کلینی نے ایک طویل حدیث کے ذیل میں مقرن سے اور اس نے ابی عبد اللہ سے یہ روایت بیان کی، اِنَّهُ قَالَ لَا يَدْخُلُ

اور جس کو ہم نے چھپانا اور دوزخ میں صرفہ ہی جانے کا جس نے ہم کو نہ چھپا نا۔

مٹیرے۔ جناب زبیر کا قہر و غول۔ اور مذہب ہے کہ ان کے والد کے نوان کو یہ ملک نہ بایا کہ یہاں ایک کاما ہوا
 بھی ضروری ہے جو قیادت کمری کا مالک ہو اور زمین پر اللہ کی محبت بنے یہی نہیں بلکہ تعین امام اور ان کے نقد اسے بھی
 ماتر نہ کیا۔ اور یہاں مات اگر ان کے والد ماتے تو اس میں تو قہر نہ کرنے کا کوئی خوف بھی نہ تھا۔ لہذا اس جینگے احوال نے

باخبر نہ کیا۔ اور پہلی بات انہوں نے والدہ بچاؤ کے واسطے کر دی تھی کہ بچہ کو کھانسی دے کر اس کی موت کا بندوبست کر دیا جائے۔

شده اور ذات بریدہ ہو تاکہ یہ دوسرے میں نہیں ہو رہیں اور جناب زید کا معصوم ہستی ان نشانہوں سے سادہ تھا۔

چوتھے۔ یہ کہ امام چرنکھنہی کا قائم مقام ہے اس پر بھی یہ فرض ہے کہ ہر مکلف کو وہ جو بھی ہو ضروریات دین سے واقف کرے کہ اس کا فیض عام ہو یہاں باپ کا پیار، بیٹے کی محبت کو دخل انداز نہ ہونا چاہیے اور اپنے پرایوں میں فرق کرنا شان نبوت و امامت کے ہر سرخلاف ہے، بلکہ اپنوں کو پرایوں سے پہلے اور زیادہ ڈرانا چاہیے چنانچہ ارشاد باری ہے
وَآذِنُوا فِي حَبِشَتِكَ الْأَشْرَافِيَّةِ رَأْسُكُمْ كُنْبُهُ وَالْوَلَدُ كُوْدْرَانِيَّةِ يَأْفَرُ مَا يَلْتَنِي تَأْمُرُ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا
تاکہ وہ اہل مکہ اور گرد و نواح کے لوگوں کو ڈرائے،

پانچویں۔ شیعوں کے نزدیک یہ طے شد بات ہے کہ بارہ اماموں کی تعیین اور ان کی ترتیب جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحکم صریح منقول ہی نہیں بلکہ منزل من اللہ ہے۔ جب یہ بات ہے تو پھر باپ کے قول کو قبول کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں،

ان کو تو چاہیے تھا کہ یہ حکم بھی تمام احکام دین کی طرح ان تک پہنچاتے کہ جان کے ساتھ اس کو بھی قبول کرتے، چھٹے۔ یہ کہ باپ کی تبلیغ کی اس میں ضرورت ہی کیا تھی جب کہ یہ نص تمام عالم میں شہرت پا چکی تھی کیونکہ یہ منواتر تھی، خصوصاً اہل بیت میں کہ وہ وہاں تو اس قدر مشہور اور معروف تھی کہ ہر گھر کی لڑکی پڑھتی پڑھاتی رہتی تھی مشہر رکعات نماز کی گنتی اور اس کے اوقات کیونکہ امام پر مسائل خفیہ کی تعلیم موقوف ہوتی ہے نہ ان نفوس متواترہ کی جو صاف ظاہر ہیں۔

اور پھر تمام مذاہب وادیان میں یہ بات مشہور و معروف اور رائج ہے کہ سن بلوغ سے پہلے بچوں کو دینی مسائل کے اصول سکھائے جاتے ہیں، تو یہ مسئلہ جو دین کے اہم مسائل میں سے ہے تو حضرت سجاد نے کس طرح اپنے فرزند دہلند سے چھپائے رکھا۔ حالانکہ جناب زید با اتفاق شیعہ و سنی سعادتمند بیٹوں میں سے تھے، اپنے والد بزرگوار کے ہر دم رفیق صحبت اور زندگی پھر والد کے نقش قدم پر چلے، تو ایسے فرزند سے انکار و تکذیب کا کیا خطرہ۔
ساتویں۔ اگر جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ نے یہ مسئلہ جناب زید کو نہ بھی بتایا ہو تب بھی امام وقت نے تو بہر حال اپنی امامت کی دعوت دی ہوگی خواہ انہوں نے یہ دعوت قبول کی ہو یا نہ کی ہو، لہذا اس کا خبر نہ دینا بالکل عبرت رہا۔ حالانکہ حضرت ائمہ کا دامن ان تمام لغو اور بے فائدہ حرکات سے پاک ہے،

بعین نام سمجھ شیعہ اس معاملہ کو حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب پر قیاس کرتے ہیں کہ وہاں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے آپ کو منع فرمادیا تھا کہ بھائیوں کو خواب نہ سنانا کہیں وہ حسد میں آکر کوئی ایذا نہ پہنچائیں حالانکہ یہ قیاس بالکل ہی غلط اور ناسد ہے کیونکہ دونوں صورتیں ایک نہیں ہیں، وہاں خواب کا بیان کرنا نہ حضرت یوسف علیہ السلام پر واجب اور ضروری تھا نہ حضرت یعقوب علیہ السلام پر اور نہ وہ اصول دین تھا، نہ مسائل شرعیہ میں کا کوئی مسئلہ، وہ محض ایک بشارت جو حضرت یوسف علیہ السلام کی علوشان کو ظاہر کرتی تھی۔ اور بشارت کا ظاہر کرنا پیغمبر پر واجب نہیں بلکہ بہت سے مواقع پر تو اس سے روکا گیا ہے، تاکہ صاحب خواب کے لئے باعث عجب و خود بینی اور سامع کے لئے باعث حسد نہ ہو، چنانچہ سنن سنن صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر قریش کے امرا جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو اللہ کے ہاں ان کی جو غریباں ہیں انہیں ناش کر دیتا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اس شخص کے جنت میں داخل ہونے کی خوشخبری سنائی جو صدق دل سے کلمہ پڑھ لے، تو اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ لوگوں میں اس

خوشخبری کا چرچا نہ کرنا کہیں لوگ اس پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ رہیں، اور عمل چھوڑ بیٹھیں، اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت اس خواب کی تعبیر پر موقوف بھی نہ تھی، برخلاف آنے والے اماموں کی امامت کے کہ وہ پوری کی پوری ائمہ سابقہ کی نص اور تبلیغ پر موقوف ہے، اور مکلف کے لئے اس کے بغیر علم حاصل کرنا محال و ناممکن ہے،

غرضیکہ حضرت پاک سے تمسک کا جو طریقہ شیعوں کا ہے اس کا محال و مانع ہو گیا اور کتاب اللہ ان کے خیال و گمان کے مطابق پہلے سے ہی قابل تمسک نہیں ہے لہذا دین کی دونوں مضبوط رسیاں رجل المتین، ان کے مانتوں سے نکل گئیں اور یوں یہ میدان گمراہی میں حیران و پریشان رہ گئے اور آج تک ہیں اور انشاء اللہ تا قیام قیامت رہیں گے۔ اگر شیعہ یہ کہیں کہ ہم بعض ائمہ کو کافر یا گمراہ کہتے اور بعضوں کی برائیاں اور عیوب بیان کرتے ہیں، مگر پھر بھی ان کے اقوال و افعال کو اپنے لئے حجت بناتے ہیں بخلاف اہل سنت کے۔

اور تمسک کے معنی بھی یہی ہیں کہ کسی شخص کے قول و فعل کو اپنے لئے ہدایت کا نمونہ بنایا جائے خواہ وہ تعظیم کی صورت میں ہو یا امامت و تحقیر کے پیرائے میں مثلاً اگر کوئی شخص خدا غواستہ کتاب اللہ کو کوڑی پھینک دے یا اپنے پیرومرشد کے پاؤں میں رسی باندھ کر جھانکروں میں گھسیٹے، مگر اسی کے ساتھ قرآن مجید کے احکام کی بجا آوری اور مرشد کے قول و فعل کی بجا آوری میں سرموفق نہ آنے دے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اقوال و افعال دونوں کے ساتھ تمسک کیا بخلاف اس کے کہ قرآن کی تعظیم تو خوب کریں اسے سر پہ اٹھائیں آنکھوں سے لگائیں۔ پر اس کے ساتھ اس کے احکام کی پوری خلاف ورزی کریں۔

ایسے ہی پیرومرشد کی تعظیم و تکریم تو حد سے زیادہ کریں مگر اس کے قول کو ٹھکرا دیں تو اس وقت اس کو تمسک نہ کیا جائے گا۔ ان کے اسی قول کی تردید میں کتاب میں پانچ ابواب کا اضافہ مناسب سمجھا گیا کہ عقائد و فقہ کے ہر مسئلہ میں تقلید سے جہاں جہاں مخالفت کی ہے اس کو ان ہی کی معتبر کتابوں میں درج صحیح و مستند روایات سے بیان کیا جائے کہ ان کا منہ بند ہو اور ان کا طریقہ تمسک روز روشن کی طرح سامنے آجائے۔

پانچواں باب: مسائل الہیات

عقیدہ (۱)۔ ان مسائل میں سب سے پہلا اللہ تعالیٰ کی معرفت میں غور و فکر کے وجوب کا ہے، اور اس میں اہل سنت اور اہل تشیع مختلف ان خیال ہیں۔

امامیہ کہتے ہیں کہ اس میں غور و فکر کا وجوب عقلی ہے، شرعی نہیں ہے۔ یعنی قطع نظر اللہ تعالیٰ کے حکم کے صرف عقل کا یہ تقاضا ہے کہ ہر مکلف اللہ تعالیٰ کو جانے اور اس کی صفات کو پہچانے۔

جب کہ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شرعی وجوب ہے عقلی نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے قطع نظر کر کے محض عقل سے اس پر غور و فکر واجب نہیں اور اسی مسئلہ پر کیا مختصر کسی بھی دینی معاملہ میں عقل کو حاکم و حکم نہیں سمجھا جائیے اور نہ اس کے حکم کی پیروی کرنی چاہیے۔

شریک ہو گئے۔ حالانکہ ائمہ کی صحیح و متواتر روایات آسان و ذہین کے فنا ہونے پر ناطق ہیں اور قرآنی آیات میں تو اس حقیقت کو واضح گاف الفاظ میں بیان کر دیے ہیں، ارشاد ہے، اِذَا تَنَاسَّأُ الشَّقَاتُ رَجِبَ آسَمَانُ پھٹ جائے گا، اِذَا تَنَاسَّأُ الْفَطَرَاتُ رَجِبَ آسَمَانُ کھل جائے گا، وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَامِرِ (جس دن آسمان مع ابر کے شق ہو جائے گا، وَ كُلُّ شَيْءٍ عَالٍ اِذَا وَجِئَهُ) اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز مٹ جانے والی ہے۔

عقیدہ (۵) یہ کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے ساتھ زندہ علم کے ساتھ عالم اور قدرت کے ساتھ قدرت والا ہے اور اسی طرح اور صفات بھی اس میں موجود ہیں جس طرح اس کے نام اس کی ذات پر اطلاق ہوتے ہیں، امامیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صفات سے عاری ہے۔ البتہ ان صفات کے شتعات اس کی ذات پر بولے جاسکتے ہیں، مثلاً یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ وحی ہے عالم ہے سمیع ہے، بصیر ہے قدیر ہے، اور قوی ہے، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے لئے حیات ہے، علم ہے، قدرت ہے، سمیع ہے و بصیر ہے،

ان کا یہ عقیدہ عقل کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ ثقلین اس کے بھی مخالفت ہے قرآن کی مخالفت تو اس طرح ہے کہ بہت سی آیات ان صفات کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتی ہیں، مثلاً وَ لَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ حَيْثُ هُوَ (وہ اس کے علم کا کچھ بھی احاطہ نہیں کر سکتے، اِنَّهٗ لَعَلَّٰمٌ) (اس کو اتنا علم کے ساتھ) عزت کی مخالفت اس طرح کہ جناب امیر مبنی اللہ عنہ کے ان خطبوں میں جو سبج البلاغہ میں درج ہیں بابجا اللہ تعالیٰ کی صفات مذکور ہیں،

مَثَلًا عَزَّ وَ جَلَّ تَعَالٰی (اس کی قدرت غالب ہے) وَ سَمِعَ سَمْعَهُ الْاُصْوَاتِ (اس کا سنا آوازوں پر حاوی ہو گیا)۔

علاوہ انہی ائمہ سے بطریق تواتر یہ صفات مروی ہیں۔

عقیدہ (۶) یہ ہے کہ ذات باری کی صفات قدیم ہیں، وہ کسی بھی وقت عاجز و جاہل نہ تھا۔

مگر نہ راہ بن اعلیٰ، سلیمان جعفری، محمد بن مسلم، جو امامیہ فرقہ کے مقتدا اور پیشوا اور ان کی امامیت کے راوی ہیں اور جن کو وہ وجہ الطائفہ اور عمیون الطائفہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انزل میں نہ عالم تھا نہ سمیع و بصیر بیان تک کہ جب تمام مخلوقات کو یہ صفات بخشے تو خود کو بھی علم و سمیع و بصیر کی صفات سے متصف فرمایا۔

اب اس عقیدہ کی مخالفت کتاب اللہ سے تو روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ بابجا کَانَ اللہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا عَزِیْزًا حَکِیْمًا، سَمِیْعًا بَصِیْرًا فرمایا۔

اور عزت سے مخالفت سورہ اس طرح کہ کلینی نے ابی جعفر رحمہ اللہ علیہ سے روایت کی ہے اِنَّہٗ قَالِ کَانَ اللہُ وَ کَلَّمَ یَکُنْ شَیْءٌ غَیْرُہٗ وَ کَلَّمَ یَزَلْ عَادِلًا، انہوں نے فرمایا ایک وقت ایسا تھا کہ اللہ تھا اور کوئی چیز اس کے ساتھ نہ تھی، اور وہ ہمیشہ سے عالم ہے،

ایسے ہی کلینی اور دوسرے امامیہ مختلف طرق سے ائمہ سے روایت کرتے ہیں اِنَّہُمْ کَانُوْا یَقْدُوْنَ اِنَّ اللہَ

سُبْحَانَكَ لَمْ يَزَلْ عَالِمًا سَبِيحًا بَصِيحًا (کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے سبوح و مبہر ہے) عقیدہ (۷) اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے۔ جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے، مگر اسما علیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر و مختار نہیں ہے۔ وہ جس چیز کو پسند کر لیتا ہے، وہ چیز بے اختیار اس طرح موجود ہو جاتی ہے جس طرح سورج نکلنے پر شعاع موجود ہو جاتی ہے،

یہ عقیدہ کتاب اللہ کے یوں مخالف ہے کہ قرآن میں ارشاد فرمایا وَتَبْتَكَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ تَبَارَكَ جَوَّارًا ہے کرتا ہے اور اس کرنے میں وہ مختار ہے، يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (جو چاہتا ہے کرتا ہے)، تَبْتَكَ عَلَى أَنْ يَنْزِلَ (وہ نازل کرنے پر قادر ہے)، بَلَى قَادِرِينَ عَلَى أَنْ نَسْتَدِي بِنَاذِرًا بَلْ تُشَكُّ بَمِ اس پر قادر ہیں کہ برابر کریں الگ الگ کہیں ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں،

اور عزت کی مخالفت اس طرح ہے کہ امامیہ نے جناب صادق رحمہ اللہ علیہ سے روایت کی ہے، اِنَّهُ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی بَصِيحٌ وَ لَا يُحِبُّ (انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے اور نہیں پسند کرتا) مزید انشاء اللہ آگے آئے گا اگر مخلوقات کے وجہ سے لئے بغیر ارادہ و اختیار کے فعل کے صرف پسند کافی ہوئی تو مکلفین کے سر پر فریضہ ایمان و طاعت، احسان و عدل موجود ہوتے، اس کے خلاف صفات موجود نہ ہوتیں، کیونکہ ان صفات کا محبوب خدا ہونا ایسا ہی یقینی ہے جس طرح ان کی مخالف صفات کا مبغوض خدا ہونا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)، وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے)، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُقَابِلِينَ (اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) عقیدہ (۸) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

مگر شیخ ابو جعفر طوسی، شریف، اور امامیہ کی ایک جماعت نے اس عقیدہ کی مخالفت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مین مقدور بندہ پر قادر نہیں ہے، ان لوگوں کے اس خیال باطل کی تردید کے لئے کتاب اللہ کی یہ آیت کافی ہے، وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے) عقیدہ (۹) اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اس کے وجود سے پہلے جانتا ہے۔ یہی معنی تقدیر کے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز کا اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ ایسی یا دلی ہوگی، چنانچہ وہ اپنے مقررہ وقت پر اسی کے مطابق وجود میں آتی ہے۔

احول طاق کے متبعین جو فرقہ شیطانیہ کہلاتا ہے، اس کا مخالف ہے وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کے وجود میں آنے سے پہلے نہیں جانتا۔

فرقہ حکمیہ اور اشاعتیہ کے متقدمین و متاخرین کی ایک جماعت جن میں کثر العرفان کا مصنف مقداد جلی شامل ہے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کو ان کے وجود سے پہلے نہیں جانتا۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن میں تو ارشادات خداوندی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (اللہ ہر چیز کو جانتا ہے) قَدْ احَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (اس نے ہر چیز کا احاطہ علم سے کر رکھا ہے، مَا آ مَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الدُّرُزِ وَلَا فِي الْفُكُكِ اَلَا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ اَنْ نُّبَوِّاَهَا

عقیدہ (۱۰) قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اس میں تحریف یا کمی زیادتی نہ اب تک ہوئی ہے نہ آئندہ ہو سکے گی۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے اِنَّا نُنَزِّلُ الذِّكْرَ وِیْ فَا لَمَّا لَمِ الْخَفِیْقُوْنَ رَہْمَیْ نے ذکر قرآن نازل کیا ہے

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ لَمََّا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ رَأْسُ رَسُولٍ

گلتا۔ تا آنکہ حضور علیہ السلام نے ہزاروں کو قرآن پڑھایا، بعض لڑائیوں میں شہر ستر حفاظ قرآن شہید ہوئے اور اس

عہد کے بعد سے آج تک شہر شہر قریہ قریہ اس کی عداوت کو تمام مسلمان قرب الہی کا ذریعہ اور بڑا سبب جانتے ہیں اور

صبح وشام نماز میں نماز سے باہر اس کی تلاوت میں لگے ہوئے ہیں اور بچہ جب سیانا ہو جاتا ہے اور اسے مکتب میں بٹھاتے

ہیں تو سب سے پہلے اسی کے یاد کرانے پر لگاتے ہیں۔ یہ قرآن ہے جیہنی کی کتاب ہا تہذیب نہیں کہ بطور تفتیح کھڑے کسی کو نہ

میں صندوق میں مقفل پڑی ہو اور تنہائی کے وقت غیروں سے لڑنا تو سال کہ کوئی تو رانی نہ دیکھ جائے اسی کے ایک

دوسرے پڑھتے ہوں۔ جب اس قسم کی کتابوں میں تغیر و تبدل کو راستہ نہیں ملتا تو قرآن میں اس کی گنجائش کہاں!

اور حضرت کی یہ عقیدہ یوں مخالفت کر رہا ہے کہ امامیہ کی تمام روایات میں یہی موجود ہے کہ اہل بیت ائمہ کرام کو بطور حجت (اسی کے عام و خاص) اور وجہ نظر سے تمسک کرتے اور اس کے دلائل اور شواہد پر بیشک کرتے اور ان پر

آیات کی تفسیر کرتے تھے، بخانیجہ وہ تفسیر جو خطاب حسن عسکری رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے اسی قرآن کو تو ہے اس

ایک سیئر کے اپنا چہرہ، سینہ و گلابوں سے تزیین کردہ لباس کی سیر کی دیکھ کر وہ یہ کہہ کر اٹھ اٹھا کہ یہ تو میری سیر ہے۔ اس کا لفظ لفظ ملتا ہے ملا وہ اسی اسنے بھون، بھون، کنزوں اور غاموں اور اہل و عیال کو اسی قرآن کی

کے اس واسطے سے کہ اس کے لیے چھوٹے پیروں اور بڑے پیروں اور ان کے گھرانوں کے

عقیدہ (۱۱)۔ اللہ تعالیٰ ارادہ قدیم کا مالک ہے۔ ازل میں ہر ہر چیز کے متعلق جہد امور طے کر کے ان کو خاص اوقات کے ساتھ معین کیا، کہ اس میں آگے پیچھے تقدیم و تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہذا ہر چیز اپنے اپنے وقت میں اس کے ارادہ کے موافق پیدا ہوتی اور بطور میں آتی ہے،

یہ بات مکرشتہ اوراق میں آچکی ہے کہ شیعوں میں سے اسماعیلی اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے صاف منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے، جیسے آفتاب کے لئے روشنی یا آگ کے لئے گرمی! اس عقیدہ کی تردید کے لئے سابق قرآن کافی ہے۔ سارے امامیہ اور زیدیہ کے آٹھوں فرقے جن کے نام ولقب اب اول میں مذکور ہوئے۔ خدا تعالیٰ کے ارادہ کو حادث جانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ تمام کائنات کو شامل نہیں بہت سے موجودات اس کے ارادہ کے بغیر وجود میں آتے ہیں، مثلاً فتنہ و فساد و کفر و معیبت؛ اس عقیدہ کی تردید میں بھی قرآن آیات موجود ہیں۔

مثلاً وَمِنْ يَرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَكُلَّ مَلَكٍ كَمَا مِنْ اللَّهِ شَيْئًا اور اللہ جس فتنہ کا ارادہ کرے اس میں اللہ کی طرف سے آپ کا کوئی دخل نہیں، اُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَحْمَةِ اللَّهِ أَنْ يُطَهَّرَ قُلُوبُهُمْ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا، اگر اس کے بعد ان کے ایمان کا ارادہ کرے تو وہ تناقض لازم آئے گا لیکن یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کا ارادہ نہیں تھا ارادہ تو تھا مگر منفی اس وجہ سے وہ ایمان سے محروم ہوئے اور ان کے دل پاک نہیں ہوئے جو کچھ ہوا اسی کے ارادہ سے ہوا)

[illegible]

اسی طرح محنت کے اقوال بھی اس عقیدے کی ترمذید کرتے ہیں، چنانچہ کلینی نے محمد بن ابی بکر سے یوں روایت کی ہے۔ قَالَ قُلْتُ لِرَبِّهِ الْعَسَنِ الرَّضَا اِنَّ بَعْضَ اَمَّا يَنَا يَقُولُ يَا حَبْرُو بَعْضُكُمْ وَنَقُولُ يَا ذَا سَطَاةٍ فَقَالَ لِي كُتِبَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ عَلٰی بَنِي الْعَسَنِ قَالَ كَاللّٰهِ تَعَالٰی بِمَشِيَّتِيْ كُنْتُ اَفْتَدِیْ رَمِيْنِ ابْنِ الْعَسَنِ رَمَا سَے کہا کہ ہمارے بعض اصحاب مبرکے قائل ہیں اور بعض استطاعت کے ہیں آپ نے فرمایا بسم اللہ کے بعد لکھو کہ علی بن حسین کہتا ہے کہ میری مشیت اور ارادہ مجھ سے قویٰ ہے،

پھر کہیں ہی نے سیکان بن خالد سے اور اس نے ابی عبداللہ سے روایت کی کہ رَضِیَ اللہ تَعَالٰی اِذَا اَلَاہُ یَعْبُدُ خَیْرًا اَنْکَتَ فِی قَلْبِہِ کَلِمَۃٌ مِنْ دُوْخٍ وَکَفَّہُ مَسَامَیْعَ قُنْبِہِ وَکُلَّ یَوْمٍ یُّسَبِّحُہُ کُلٌّ اَوَّلًا اَوَّلًا اللّٰہُ یَعْبُدُ سُوْرَہٗ اَنْکَتَ فِی قَلْبِہِ کَلِمَۃٌ سُوْرًا وَّسَمَیْعَ مَسَامَیْعَ قُنْبِہِ وَکُلَّ یَوْمٍ یُّسَبِّحُہُ الشَّیْطَانُ یُضِیْکَ رَجَبُ اللّٰہِ تَعَالٰی کِسْرِہِ

ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک نرانی نکتہ لگا دیتا ہے اور اس کے دل کے کان کھول دیتا ہے اور اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس کو بھلائی پر ثابت قدم رکھتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیتا ہے اور اس کے دل کے کان بند کر دیتا ہے اور اس پر شیطان مسلط کر دیتا ہے اور وہ اس کو گمراہ کرتا ہے ،

پھر یہ آیت پڑھی کہ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلَّهِ سُلُوكٌ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا رِاسَةً تَلْوِينَ حُنُفَى السُّجُودِ وَمَنْ يَحْمِلْ ذُنُوبَهُ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ عَمَلًا غَرَضًا (اللہ تعالیٰ جس کی ہدایت کا ارادہ کرتا ہے اسلام کے لئے اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جس کے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سینہ کو تنگ اور سخت بنا دیتا ہے)

نیز کلمینی اور صاحب الحما سن نے علی بن ابراہیم بلشعی سے روایت کی ہے قَالَ سَمِعْتُ أَبَا الْحَسَنِ مُوسَى عَلِيَّهِ
السَّلَامُ يَقُولُ لَيْدِيكَوْنْتُ شَيْئًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَإِنِّي أَدْرِي مَا فِي نَفْسِي مِنْ عَدُوٍّ لِي وَهُوَ اللَّهُ عَلَيْهِ كَوَيْتُ هُوَ سَنَّاكَ وَهِيَ
حَبِيزٌ وَجُودِي أَتَى هِيَ، جس کو اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کا ارادہ کرے،

اور کلینی نے فتح بن زید جرجانی سے روایت کی اور اس نے ابی الحسن رحمہ اللہ علیہ سے جن میں صراحت سے فرمایا ہے کہ بندہ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے پر غالب نہیں آسکتا چاہے وہ ارادہ خواہش کی حد تک ہو یا اس سے بڑھ کر عزم بالغیر ہو جائے،

اور کلینی نے ثابت بن عبد اللہ سے بھی روایت کی اور اس نے ابی عبد اللہ سے جو اس کی تقریر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو گمراہ کرنے کا ارادہ با لجرم کرتا ہے تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی اور ثابت بن سینہ بھی اس قسم کی روایت کی ہے۔

تیسرا اصل مقیدہ، کی کئی شاخیں ہو گئی ہیں، امامیہ تو سب کے سب اور زیدیہ کے آخر فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی بات کا حکم دیتا ہے، جس کا وہ ارادہ کرتا ہے، اور صرف اسی سے روکتا ہے جس کا ارادہ نہیں کرتا۔

ان لوگوں کا خیال یہ بھی باطل اور قلیلین کے خلاف ہے، کتاب اللہ کی مخالفت تو یوں کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے،
وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذَا ضَلُّوا سَلَّمُوا وَلَمْ يُلْحِقُوا الْفِتْرَةَ وَلَا يَحْمِلُوا أَوْعَالَهَا وَلَمْ يَلْمِزُوكَ فِي شَيْءٍ مِّنْهُ لَافْتِنًا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۚ
اگر وہ نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لئے کوئی تیار ہی کرتے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا نکلنا ناپسند فرمایا پس ان کو اپنی جگہ
پر ہی برقرار رکھا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو، لہذا معلوم ہوا کہ اس جماعت کا
نکلنے کا ارادہ ہی نہ تھا، اس لئے کہ ناپسندیدگی ارادے کی ضد ہے، حالانکہ وہ نکلنے کے لئے بلاشبہ مامور و مکلف تھے۔ ورنہ
پھر ان کو طاعت و عتاب کیوں کیا جاتا۔ یا فرمایا یُرِيدُ اللَّهُ أَنْ لَا يَجْعَلَ لَكُمُ الْخَطَايَا أَزْوَاجًا ۚ وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أَمْرَهُ
میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے، حالانکہ ایمان کا حکم ان کو بھی دیا گیا تھا۔ ایسے ہی کافروں کے ایمان نہ چاہئے پر قرآن کی بے
شمار آیات دلالت کرتی ہیں، حالانکہ وہ مامور و پایمان تھے،

اور حضرت کی مخالفت اس طرح ہے کہ خود شیعوں کی روایات سے بطریق قوت اثر ایسا ثابت ہے جو ان کے اس خیال کی ضد ہے، اور اس کی مخالفت کرتا ہے اور یہ مخالفت ایسی ہے کہ نہ اس میں تاویل کی گنجائش ہے اور نہ انکار کی ان میں سے ایک روایت تو دوسری ہے جو برقی نے عاص میں اور کلینی نے کافی میں علی بن ابراہیم ہاشمی سے روایت کی ہے اور

أَهْلُ السَّمَوَاتِ وَأَهْلُ الْأَرْضِ اجْعَلُوا لِي آيَةً
 عَبْدًا أُبَرِّدُ اللَّهَ هَذِهِ آيَتُهُ مَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يُصَلُّوا
 وَكَوْنُوا أَهْلَ السَّمَوَاتِ وَأَهْلُ الْأَرْضِ اجْعَلُوا لِي آيَةً
 أَنْ يَبْرُدَ عَبْدًا أُبَرِّدُ اللَّهَ هَذِهِ آيَتُهُ مَا اسْتَطَاعُوا
 أَنْ يَبْرُدُوا عَبْدًا -

زمین و آسمان واسے سارے مل کر بھی یہ کوشش کوں کہ
 اس شخص کو گمراہ کر دیں جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کا ارادہ
 کرتا ہے تو سب اس کے گمراہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اسی
 طرح اگر زمین و آسمان واسے سارے مل کر بھی کسی کو ہدایت
 کریں۔ اور اللہ اس کی ہدایت نہ چاہے تو وہ اس کو سارے

مل کر بھی ہدایت نہ کر پائیں گے۔

عقیدہ ۱۲۲۔ ”اللہ تعالیٰ جسم نہیں رکھتا۔ نہ طول و عرض اور عمق، نہ ہی وہ شکل و صورت رکھتا ہے“ مگر امامیہ کے فرقوں
 میں حکمیہ، سالمیہ، شیطانیہ، اور میثبیہ، یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسم رکھتا ہے،
 اس کے ثبوت کے لئے کلینی کی یہ روایت ملاحظہ ہو جو اس نے ابراہیم بن محمد عہد آتی سے کی ہے اَقَالَ كُنْتُ
 رَأَى الرَّجُلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ مَن قُبُلًا مِّنْ هَوَايَاكَ قَدْ اخْتَفَرُوا فِي التَّوْحِيدِ فَبَدَّلُوا مِنْ يَقُولِ جَنَّمَ وَمِنْهُمْ
 مَنْ يَقُولُ مَوْجًا يَجْرِي فِيهِ نَارٌ مِنْهُمُ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ لِقَوْلِهِمْ مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ مَوْجًا يَجْرِي فِيهِ نَارٌ مِنْهُمْ
 الْعَقِيدَةُ هِيَ بَعْضُ أَهْلِ الْإِسْلَامِ يَجْعَلُونَ لِقَوْلِهِمْ مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ مَوْجًا يَجْرِي فِيهِ نَارٌ مِنْهُمْ
 جَبَّيْ هِيَ -

اور سہل بن زیادہ سے بھی ایک روایت ہے کہ اس نے کہا ”میں نے ابی محمد کو لکھا کہ اے سردار ہمارے

سامعی عقیدہ توحید میں مختلف اقوال ہیں، بعض اس کو جسم ٹھہراتے ہیں اور بعض صورت“

ان روایات سے مختصر یہ قرابت ہو گیا کہ ان میں ایسے لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کے لئے جسم، صورت شکل

مانتے تھے اب ان ترسیاں امامیہ کے اس لچر مذہب کی تفصیل دیکھئے،

حکمیہ کہتے ہیں کہ وہ طول، عرض اور عمق، رکھنے والا ایک جسم ہے، جس کے ہر سہ اطراف مذکورہ برابر ہیں اور اس
 کے باہر بھی ہیں، وہ پچھلی ہوئی چاندی کی طرح سفید ہے ہر طرف چمکتا ہوا، وہ رنگ بھی رکھتا ہے تو بھی مزہ بھی اور
 محبت بھی! وہ اپنے بالشت سے ساتھ بالشت قد کا ہے۔ عرش سے بغیر فاصلہ کے چٹا ہوا ہے،

کلینی نے علی بن حمزہ سے روایت کی ہے کہ ہشام بن حکم (پیشوائے حکمیہ) کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ٹھوس جسم

ہے، جس کا پہچانا ضروری ہے،

اس کے علاوہ محمد بن حکم، یونس بن طہیان اور حسن بن عبد الرحمن سے بھی مختلف سندوں کے ساتھ اس قسم

کی روایت لایا ہے،

سالمیہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ، انسان کی شکل کا ایک جسم ہے، جو چہرہ، آنکھ، کان، ناک، منہ اور ہاتھ پاؤں رکھتا

اس کے حواس خمسہ بھی ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ کان کی تودہ بڑی، تنک اس کے سیاہ بال بھی ہیں،

کلینی نے محمد بن خراج سے روایت کی ہے کہ ہشام بن حکم کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے اور ہشام بن سالم (سالمیہ فرقہ

کا بانی) اس کو صورت و شکل والا کہتا ہے ناف تک کھوکھلا۔ اور باقی ٹھوس۔ شیطانیہ، اور میثبیہ بھی سالمیہ کے ہم خیال

وہم عقیدہ ہیں،

کلینی نے ابن الخزاز اور ابن الحسین سے روایت کی ہے کہ پیشی کہتا ہے کہ وہ کھوکھلا ہے ناف تک اور باقی ٹھوس ہے اور یہی قول جر البقی اور صاحب الطاق کا بھی ہے،

اب ظاہر ہے کہ امامیہ کا یہ عقیدہ مستحکم خیر تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ تقلید کے بھی مخالف ہے۔ کتاب اللہ کو کہتی ہے تیس کتبہ شیعی اس کے مثل کوئی چیز نہیں، اور عسوت کی مخالفت یوں کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے حوالہ سے یہ الفاظ روایت کئے گئے ہیں اِنَّهُ قَالَ لَا يُوصَفُ بِشَيْءٍ مِنَ الْاَجْنَادِ وَلَا بِالْجَوَادِ وَلَا اَعْصَاءٍ (آپ نے فرمایا کہ اس کی صفت نہ اجزا اسے بیان کی جاسکتی ہے نہ اعضاء بدنی بلکہ پاؤں وغیرہ سے رفیع البہانہ میں بھی اسی طرح ہے اور کلینی نے بھی ابہاہیم بن محمد بن الخزاز اور محمد بن الحسین سے اسی طرح روایت کی ہے وہ کہتے ہیں۔

وَعَلْنَا عَلَى ابْنِ الْحُسَيْنِ الرَّفَا وَكُنَّا رَأَى هِشَامَ بْنِ سَالِمٍ وَمُصَاحِبِ الطَّاقِ وَالْيَمِينِ يَقُولُونَ اِنَّهُ تَعَالَى اَجْبُوفُ اِلَى السُّرُورِ وَالْبَاقِي مَسَدٌ فَهَذَا سَاجِدٌ اِنَّهُ قَالَ سُبْحَانَكَ كَيْفَ كَانُوا وَعَقْدُهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ شَبَّهُوهُ بِغَيْرِ لِقَاءِ اَللّٰهِمْ لَا اَصْفَكَ اِلَّا بِمَا وَصَفْتَ بِغَيْرِ نَفْسِكَ وَلَا اَشْبَهَكَ بِخَلْقِكَ اَمَّا اَهْلُ بَيْتِكَ خَلِيْفَتِكَ فَجَلَعْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ

ہم جناب ابی الحسن رضا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے کہا کہ ہشام بن سالم، صاحب الطاق اور پیشی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ناف تک پولا اور کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس۔ (یہ سن کر توبہ توبہ کرتے ہوئے) آپ سجدہ میں گر گئے۔ اور فرمایا اے اللہ تو پاک ہے یہ لوگ اپنے نفسوں کے کتے مطلق ہو گئے ہیں کہ تیرے غیر سے مجھے مشابہ کرنے لگے میرے اللہ میں تیری صفت اسی کے ساتھ کرتا ہوں جس کے ساتھ تیرے اپنی صفت بیان کی ہے اور تیری مخلوق کے ساتھ تجھ کو ہرگز تشبیہ نہیں دیتا تو ہر مصلیٰ کا مستحق ہے ترجمہ کو ان ظالموں کے ساتھ شامل نہ فرما،

پھر اسی سلسلہ میں کلینی نے حسن بن عبد الرحمن الکمالی سے بھی روایت کی ہے کہ اس نے کہا قُلْتُ لِابْنِ الْحُسَيْنِ اَلْكَاطِمُ اِنَّ هِشَامَ بْنَ الْحَكَمِ يُزْعِمُ اَنَّ اَللّٰهَ جَسَمٌ قَالَ قَاتَلَهُ اَللّٰهُ مَا عَلِمْتُ اَنْ الْجَسْمَ يَحْدُوْهُ مَعَ اَللّٰهِ وَابْنُ اِلَى اَللّٰهِ مِنْ هَذِهِ الْقَوْلِ۔ میں نے جناب ابی الحسن کاظم سے کہا کہ ہشام بن حکم کا گمان ہے کہ اللہ جسم ہے فرمایا اللہ اس کا ناس کرے کیا اسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ جسم حدوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے، خدا کی پناہ۔ میں اللہ کے سامنے اس قول سے مکمل برأت ظاہر کرتا ہوں، کلینی نے اسی ذیل میں کافی کی کتاب التوحید میں بھی محمد بن فرح زنجی سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا۔

كُتِبَتْ اِلَى ابْنِ الْحُسَيْنِ اَسْأَلُكَ قَالَ هِشَامُ الْحَكَمُ فِي الْيَمِينِ وَهَشَامُ ابْنِ سَالِمٍ فِي الْقَوْرِ تَرَوُفْتُكَ دَعَا عَنْ فَمِنْ حَيْثُكَ اَلْمُحِلُّ اَنْ وَلَسْتُ عِزُّ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ لَيْسَ اَلْقَوْلُ مَا اَلِهَشَامَاتِ۔

میں نے جناب ابی الحسن کو ایک خط لکھا جس میں ہشام بن حکم کا مذہب اللہ کے جسم ہونے میں اور ہشام کا خیال اللہ کی صورت ہونے میں پیش کر کے اس بارے میں آپ سے استفسار کیا۔ تو آپ نے مجھ کو جواباً لکھا تو اس حیرانی میں

کیوں پڑ گیا شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ دو دونوں ہشاموں کا قول لغو ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عقیدہ (۱۳)۔ اللہ تعالیٰ کے لئے مکانت نہیں ہے نہ اوپر نیچے کی طرح اس کے لئے کوئی طرف یا سمت ہے، یہ اہل سنت

کا نہ ہر عقیدہ ہے مگر امامیہ میں سے حکمیہ اور یونسیہ کہتے ہیں کہ عرش اس کا مکان ہے، حکمیہ کا خیال ہے کہ عرش سے چٹا ہوا ہے اس فرش کی طرح جو تخت پر بیٹھا یا جانا ہے کہ اس کے اور عرش کے درمیان کوئی واسطہ یا حامل نہیں ہے اور درجہ میں عرش کے برابر نہ ہوا زیادہ نہ ہو زیادہ۔ یونسیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح برتر نہیں ہے جس طرح کوئی تخت پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے، بلکہ وہ تخت برقراری کے وقت کھڑا بھی ہوتا ہے بیٹھتا بھی ہے اور حرکت بھی کرتا ہے اور اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں اگرچہ وہ ان سے قوی تر بھی ہے اور بگڑ بھی جیسا کہ کلنگد جانور کو اس کے پاؤں اگرچہ بڑاں اور قوت میں کم تر ہیں اٹھائے ہوئے ہیں،

سالمیہ، شیطانیہ اور میثمیہ کہتے ہیں کہ اس کا مکان آسمان میں ہے مگر ستر نہیں وہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں، ایک آسمان سے دوسرے آسمان میں منتقل ہوتا رہتا ہے، اترتا ہے، اچڑھتا ہے، کھڑا ہوتا ہے، بیٹھتا ہے، حرکت کرتا ہے، سکون میں آجاتا ہے، رہتا ہے کہ اس کی قیام گاہ آسمان میں ہے لیکن موسم بہار میں گلزار اور لالہ زار مقامات اور شگوفہ لائے رنگارنگ کی سیر کے لئے زمین پر آتا ہے اور پھر آسمان پر چڑھ جاتا ہے دیکھئے ہندکا بادشاہ جہانگیر کہ اس کی قیام گاہ تو اگرچہ میں تھی مگر موسم میں بہار کی سیر کے لئے کشمیر چلا کرتا تھا۔

اس کو اس کی مخالفت کتاب اللہ اور عزت رسول سے بین و ظاہر ہے، اس لئے کہ قرآن میں قرئیس رکبہ شئی فرمایا گیا ہے اور امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض خطبات میں یوں روایت ملتی ہے لَا فِی الْمَکَانِ کَیْفُورًا عَلَیْہِ اِذْ مَقَّی، وہ کسی مکان میں نہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال ممکن ہو۔

اور ایک خطبہ میں یوں ہے، لَا یَقْدِرُ اَنْ اَذْفَعَامَ بِاَمْنٍ وَاَنْ یَحْرُکَ کَیْفَ ہمارے وہم و گمان حدود و حرکات اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے،

پھر آپ ہی کے ایک اور خطبہ میں یوں آیا ہے کہ اس کو ایک حالت دوسری حالت سے غافل نہیں رکھتی نہ اس کو کوئی مکان گھیرتا ہے۔

یہ سب کچھ نوح البلاء میں موجود ہے۔

امامیہ میں سے حکمیہ، سالمیہ، شیطانیہ اور میثمیہ جہت و طرف کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے لئے اوپر کی چھت ثابت کرتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے اس کی قرار گاہ عرش اور آسمان کو اوپر ہی کی طرف مانا ہے البتہ اتنا ہے کہ جب وہ آسمان دنیا پر ہوتا ہے تو اوپر کے آسمانوں پر رہنے والے فرشتے، حاملان عرش، خاندان کرسی، اور جنت میں بود و باش رکھنے والے حور و عفان، سالمیہ، شیطانیہ اور میثمیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے اوپر ہو جانے ہیں اور وہ جہت و طرف میں ان سے نیچے ہو جاتا ہے، لیکن زمین پر رہنے والوں سے تو ہمیشہ اونچا ہی رہتا ہے۔

اور ربیبہ کے نزدیک وہ کوئی جہت نہیں رکھتا کبھی اوپر رہتا ہے اور کبھی نیچے، حالانکہ نوح البلاء میں سب شیعوں کے نزدیک ثابت ہے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا لَا یُحِیْ۔ اس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اب اس قول سے نیزان افراں سے جو اس کے مکان میں ہونے کی نفی کرتے ہیں جہت کی نفی لازم آتی ہے کیونکہ جہات مکان کے اطراف و حدود ہی کا نونا ہے۔

اثناعشری شیعہ ان لغویات و خروانات کو سن کر چیں بچیں ہونے ہیں اور وہ ان طور پر یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ جب ہم ان تمام اقوال و مذاہب کو مردود و باطل قرار دینے ہیں، تو ان میں ان سرانبات کا الزام کیوں دیا جاتا ہے، حقیقت میں تو ایسا ہی ہے، لیکن ہمارے دشمن نے تمام شیعہ کی طرف سے ہمارے سارے امامیہ میں گوان میں اثناعشری شیعہ ہوں البتہ اثناعشریوں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ جب تم ان اہل مذاہب کو نہایت پر طعن کرنے اور سب امت میں اپنا مفقہ اور پیشوا اور معتمد علیہ اور سند بناتے ہو اور انہیں کی روایت اور نقل سے اپنا تشیعہ و اعتقاد انہیں مقرر کرنے ہو تو مسئلہ توحید کے معاملہ میں ان بزرگوں کی روایات کی کہوں ذرا براہِ قدر نہیں کرنے اور ان کو مائل میں لاتے ہو۔

اور پھر جب کہ یہ لوگ روایات حضرات ائمہ ہی سے نقل کرتے ہیں۔ اور اگر ان سے گریز نہ کرنا رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ ان روایات کی ائمہ نے تکذیب فرمائی ہے تو ان سببات نے ان روایات کی بھی تکذیب و تردید کی ہے۔ جو طعن صحابہ اور مسئلہ امامت پر مشتمل ہیں۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان روایات کی تکذیب میں دوسرے شیعہوں نے بھی ائمہ سے روایت کی ہے اور ائمہ کی تکذیب نقل کی ہے، اور طعن صحابہ و مسئلہ امامت میں تکذیب کی روایات ائمہ سے صرف اہل سنت نے نقل کی ہے۔ اور یہ تو واضح عقلی بات ہے کہ جب ایک شخص کسی بزرگ سے کوئی روایت کریگا تو خود وہ اس کی تکذیب کیوں روایت کریگا۔ ایسا وہ ہرگز ہرگز نہیں کریگا۔ اس سے تو اپنا تھوکا ہوا پانی ٹاپڑے گا اور اپنے پاؤں پر خود کھلاڑی ماری ہوگی۔

مثلاً حکیم، سالمیہ اور میثمیہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم و صورت کی روایت کرتے ہیں تو یہ ہی اس کی تکذیب و تردید کی روایت کیوں نقل کریں گے اگر یہ ایسا کریں گے تو ان کے مذہب کی امیر انہیں کے سروں پر نہ آ پڑیگی اور یہ اپنی موت آپ نہ مرجائیں گے۔

چنانچہ تمام امامیہ جب اپنی اغراض فاسدہ یا کسی غلط فہمی کے سبب ان ہی حضرات سے طعن صحابہ یا مسئلہ امامت کی روایت لیتے اور قبول کرتے اور نقل کرنے ہیں تو اب ان سے توقع رکھنا کہ یہی اس کی تکذیب کی روایت بھی نقل کریں عقل سے بہت دور کی بات ہے، اگر کوئی عقل مند ان کی سچائی اور جھوٹ پر کھنا اور جانچنا چاہے تو لا محالہ اسے دوسرے فرقہ کی روایات کو دیکھنا چاہیے۔

چنانچہ اہل عقل کے لوگ یہ طریقہ اور اسلوب رائج و جاری ہے اور وہ اسی طور ان جیسے معاملات کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ جب کسی خبر دینے والے کی خبر کا استمان مفسود ہوتا ہے۔ تو اسی خبر سے اس کی روایات کے خلاف روایت کا مسالہ نہیں کرنے۔ کیونکہ وہ اپنی بات کی تیج یا اغراض کے ماتحت دشمن پر دوسری ہی کرے گا کبھی اپنی عقلی یا جعلی کا جھانڈا پھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ بلکہ وہ دوسروں سے جو موقع و محل پر موجود تھے واقعہ کی تحقیق کرتے ہیں،

دین کے معاملہ کو دنیا کے معاملہ سے ہلکا نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ اس میں سستی و غفلت کو روا رکھنا چاہئے اور اس سے قطع نظر خود شیعوں نے کہیں کہیں طعن امامت کے بارے میں روایت کرنے میں اپنے معتقدات

وسرویات کے بھی خلاف کیا ہے، باب مطامن و امامت میں انشاء اللہ ان کا سب ذکر آئے گا۔ اور جھوٹوں کا تو طریقہ اور قاعدہ یہی ہے کہ اگر کھلم کھلا صاف طور سے ان کی روایت کے خلاف روایت کا مطالبہ کیا جائے تو وہ اس سے انکار کرتے اور راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب کسی دوسرے سلسلے میں وہ خود اس روایت کو بیان کر بیٹھتے اور ایسی بات ظاہر کر دیتے ہیں جو خود ہی ان کی تکذیب و تردید کر دیتی ہے،

اور دوسری گزارش اثنا عشری حضرات سے یہ ہے کہ جب حضرات ائمہ نے اس جماعت کی تکذیب فرمائی اور اس ضد و مد سے اور اس مذہب کو برائی فرمائی کہ ان کے لئے۔ قاتلہ اللہ۔ اخذہ اللہ و لا تعجلن فیہم القوم الظالمین اور واستعذ باللہ من الشیطان جیسے سنت الفاظ استعمال فرمائے، تو پھر ایسے رسوا ذلیل لوگوں ہی کی روایات دین دایمان کے بارے میں لانا اور ان روایات پر اعتماد کر لینا۔ آخر اس کو کیا سمجھا جائے، معمولی سے معمولی ذہن کا آدمی یہی کہے گا کہ سب ایک ہی عیسیٰ کے چٹے بٹے ہیں، اور یہ حقیقت سے بعید بھی نہیں،

بہٹ دھرم اما یہ یہ عذر بھی تراش سکتے ہیں کہ اہل سنت کی روایات حضرات ائمہ سے تقیہ پر محمول ہیں اور امامیہ کی روایات بیان واقع پر۔

قوم کہیں گے کہ ابھی تو حضرات ائمہ کے تقیہ کا معاملہ ہی زیرہ تقیہ اور حل طلب ہے، اس لئے کہ ان کے تقیہ کی روایات یہی شیعہ حضرات تو کرتے ہیں، تو پھر کلام کی تو جہیہ ان ہی کی روایات پر کرنا مناسب اور بے لطف ہے اس کنایہ کو عقلمند خوب سمجھتے ہیں۔

اور پھر دوسری بات بھی محتاج بیان و تشریح ہے کہ تقیہ، مسئلہ کن کا ہے، شیعوں کا یا اہل سنت کا اگر ان روایات میں کسی کو انہی اشخاص کی روایت سے ترجیح دی جائے تو پھر وہی بات ہوگی، کہ دعویٰ بھی شیعوں کا اور حجت بھی شیعہ روایات سے اور اگر ترجیح دوسری روایات سے ہے تو ان کو بیان کیا جائے۔ یہاں یہ بحث چرکہ منہا ہے اس لئے ہم اس کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتے اس لئے بحث کا رخ پھر اصل مقصد کے آغاز کی طرف موڑتے ہیں۔

داعیہ سے کہ ان دو مذکورہ بالا عقیدوں میں سے بہت سی شاخیں نکلتی ہیں، اور ان لوگوں نے ہر ایک میں تقیین کی مخالفت کی ہے ان میں ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے لئے اجزا ہیں جو خارج ہیں، ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہیں، مثلاً سر، ہاتھ، پاؤں، لمبائی، چوڑائی اور گہرائی حالانکہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

لَا یُصَفُّ بِشَیْءٍ مِنَ الدُّنْیَا وَلَا بِالْجَوَارِحِ وَالْأَعْضَاءِ
وَلَا بِعَزَازٍ مِنَ الدُّنْیَا وَلَا بِالْبَقَرِیَّةِ وَالْإِنْبِیَاسِ
وَلَا یُقَالُ لَهُ حَدٌّ وَلَا نِهَایَہُ وَلَا الْقِطَاعُ وَلَا غَایَہُ
كَذَآءِ نَحْمُ الْبَدَیْعَ وَرَوْسَ الْکَلْبِیَّةِ مَنْ مَحَمَّدٌ بَعِیْ
الْحَکِیْمَ قَالَ وَصِفَ لِذَوِّ ابْنِ اَبْنِیِّهِمْ قَوْلَ هِشَامِ الْجَوَالِیْقِ
اللّٰهُ مُرَّةٌ لَا وَحْکِیْمَ قَوْلَ هِشَامِ بْنِ الْحَکَمِ اَنْتَ حِیْمٌ نَقَالَ رَاَ اللّٰهُ لَا یُشَبَّہُ بِشَیْءٍ اَوْ فُحِیْ وَهَنَآءِ اَعْظَمَ مِنْ قَوْلِ

اللہ کی اجزا و بدن، ہاتھ، پیر، اعضائے انسانی و غیرہ، جنز کرنے یا ٹکڑے کرنے سے صفت بیان نہیں کی جاسکتی نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے لئے کوئی حد و نہایت ہے یا اس کے لئے خاتمہ یا غایت ہے نہج البلاغہ میں اسی طرح ہے،

مَنْ يَصِفُ خَالِقَ الْأَشْيَاءِ بِحُجْمٍ أَوْ بِمُتَعَدٍّ وَتَحْدِيدٍ وَاعْظَاهُ -

اور کلینی نے محمد بن حکم سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے کہ ابی ابراہیم کے سامنے ہشام جو البقی کا یہ کلام بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ شکل و صورت رکھتا ہے اور ہشام بن حکم کے اس قول کا بھی ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ جسم سے تو ابی ابراہیم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کسی کے مشابہ نہیں ہے۔ اس سے بڑا اور قابلِ نفرت قول کیا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ جو پوری کائنات کا پیدا کرنے والا ہے، اس کی صفت صورت و شکل جسم اعضائے جسم جدا اور اس کی مخلوق کے جو الہ سے بیان کی جائے،

عقیدہ (۱۱۴)۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی چیز میں سرایت کرتا ہے نہ کسی بدنی قالب میں حلول کرتا ہے یا نمودار ہوتا ہے۔ مگر غالی شیعہ ائمہ کے جہاد و ابدان میں اللہ تعالیٰ کے حلول کے قائل ہیں، یہاں تک کہ زوامیہ فرقے نے ابو مسلم مروزی صاحب الدعوة کے بدن میں اللہ تعالیٰ کو پیرا ہوا مانا ہے۔ اور قعب و حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ ابن مطہر علی نے دعویٰ محمد دانی کے علی الرغم شیخ الحق کتاب میں عقیدہ حلول کو مونیائے اہل سنت کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ حضرات اہل حق تو حلول کا عقیدہ رکھنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں، دراصل یہ ساری خطابی اور جمل اور کلام نہ سمجھنے کے سبب سے ہے، اس نے مسئلہ وحدت الوجود سے دھوکہ کھایا اور اس کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اسے حلول پر عمل کر بیٹھا ہے جس سے ان کے علماء کے فہم و تدبر کا پول کھلتا ہے، اور رسائی فہم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور جب ائمہ کرام کے کلام میں ایسے گہرے اور دقیق مطالب آئے تو انہوں نے اپنی کم فہمی بلکہ کچھ فہمی کے سبب ان کو نسخ کر ڈالا اور اپنی ناقص سمجھ کی وجہ سے ان مطالب میں نامحسوس تبدیلی کر ڈالی۔

غالیوں کے بعض فرقے۔ بنائے، نصیریہ اور اسماعیلیہ حلول کے بجائے اتحاد کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اتحاد تو حلول سے بھی زیادہ باطل اور غلط ہے اور اس کا بطلان نہایت واضح بدیہات میں سے ہے اور شیخ علی اپنی اسی ناقص و باریک سمجھ کی وجہ سے اتحاد کی نسبت بھی سائلین اہل سنت کی طرف کر بیٹھا ہے، حالانکہ ان بزرگوں کے نزدیک اتحاد سے حقیقی معنی مراد ہی نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں معنی مراد ہی اولیٰ یہ کہ بروقت ظہور و تجلی نور حق بندے کی خودی کا مٹ جانا اور مست و کمزور ہو جانا مراد ہے جس طرح آفتاب کی روشنی کے وقت چراغ کی حالت ہوتی، چنانچہ نور کی تجلی کے وقت بندے کی یہ کیفیت پیدا ہو جانے کا ثبوت قرآن سے بھی ہے، اور اقوالِ عزت سے بھی بالکل ظاہر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے، قُلْنَا تَجَلَّى رَبُّكَ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا مِّنْ حَيْثُ رَأَىٰ رَبَّهُ فَخَلَسَ بَدَا لَهُ نُورٌ فَبَصَّاهُ اللَّهُ فِي النَّارِ وَمِنْ حَرِّهَا وَصَبَّحَانَ اللَّهُ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ پس جب وہ آیا اس کے پاس تو نادانی گئی اس کو کہ برکت دیا گیا وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو اس کے آس پاس ہے اور سارے جہاں کا رب اللہ پاک ہے،

اور اقوالِ عزت سے اس کا ثبوت یوں ہے کہ بروایت کلینی سابق جناب صادق ابو بصیر کے ساتھ گفتگو میں کہتے ہیں کہ وہاں مومن اللہ تعالیٰ کو قیامت سے پہلے اس دنیا میں دیکھیں گے کیا تو اس کو اس وقت نہیں دیکھ رہا؟ اسی معنی و مطلب کو شیخ ابن فارغ مصری رحمہ اللہ علیہ نے اپنے اشار میں بیان کیا ہے،

وَجَاءَ أَحَدُهُمْ فِي إِثْنَاءِ دَعْوَى ثَابِتٍ رَأَىٰ آيَتَهُ فِي السَّمَاءِ غَيْرَ مُتَوَعِّفَةٍ

فَيَكُونُ الْكُلُّ وَاحِدًا مِّنْ حَيْثُ أَنَّكَ إِذَا صَارَ كَبِيرًا
يَكُونُ تَجَلُّدًا لَا يَمُوتُ إِلَّا ذَاتَهُ أَوَّلَ الرَّاغِبِ وَلَا الْمُرْتَدِّ
پس اس کی نظر سے سب ایک ہی ہوں گے کہ جب وہ
نفس اس کے نور کی تجلی دیکھنے والا ہو گیا تو نہیں دیکھے
گا۔ مگر اسی کی ذات کو نہ دیکھنے والے کو اور نہ دیکھے گئے کو۔

عقیدہ (۱۵)۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نظر آنے والے اعراس کے ساتھ متعین نہیں اس لئے رنگ و بو یا ان جیسی دوسری
کیفیات، جیسے حواس خمسہ وغیرہ نہیں رکھتا۔ مگر امامیہ کے فرقوں میں سے حکم یہ اس کے لئے مزہ رنگ و بو وغیرہ
ثابت کرتے ہیں۔

اور اس کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور غالی شیعہ تو ان سے بھی آگے بڑھ گئے اللہ کے ابدان میں اللہ تعالیٰ کے حلول
کو مان کر نہ ان کیفیات بالائی کا عقیدہ رکھتے ہیں بلکہ وہ تو اس کے لئے بھوک، پیاس بول و براز، جیسی ضروریات
اس کی ذات کے لئے جائز رکھتے ہیں۔

اس کی تردید میں ابھی اور پر جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ کسی
بھی عرض سے متعین نہیں۔

عقیدہ (۱۶)۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کسی بھی چیز میں چھپ نہیں سکتی اور نہ وہ سایہ رکھتی ہے،
مگر سارے ہی غالی شیعہ کہتے ہیں کہ وہ سایہ رکھتی ہے اور پانی و آئینہ میں چھپتی ہے۔ وغیرہ علی۔ جو فرقہ
مغیرہ کا سرگروہ ہے کہتا ہے،

لَمَّا أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ تَكَلَّمَ بِأَدْنَى الْأَعْظَمِ فَنَظَرَ قَوْمٌ
تَأْتِجًا عَلَى تَرَابِهِ وَذَلِكَ سَمِعَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي
خَلَقَ فَسَمِعُوا ثُمَّ كَتَبَ عَلَى كِفِّهِ أَعْمَالُ الْعِبَادِ فَغُضِبَ
مِنَ الْمَاءِ فَنَمَرَتْ فَمَسَمَسَ مِنْ حَزَقِهِ يَمْرَانِ أَحَدُهُمَا
مِلْمٌ مُّطْلَمٌ وَالْآخَرُ حُمُرٌ تَقَرَّبَ ثُمَّ أَطْلَعَ فِي الْبَحْرِ
الْبَيْدَ فَا بُصِّرَ بِيَاءَ طَلْقَةٍ فَانْتَرَعَ بَعْضُ الدِّينِ كَيْفَ تَخْلُقُ مِنْهُ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَأَنْتَ بَاقِي الْفِطْرِ نَفْعًا لِلشَّرِيعِ وَقَالَ
لَوْ يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ (لَا تَخْرُجُ مِنْهُ خَلْقُ الْخَلْقِ مِنَ الْبَحْرِ
فَالْكَفَّاءُ مِنَ الطَّلَمِ وَالْمُؤْمِنُونَ مِنَ النَّجْوِ -

باقی عکس کو مشاہد کیا کہ شریک مرٹ جائے عکس مٹاتے وقت یہ کہا کہ شریک نہیں ہونا چاہیے پھر ساری مخلوق کو
ان دو دہیادوں سے پیدا کیا کھاری و تاریک سے کافر بیٹھے اور روشن سے مومن۔

اس عقیدہ کا غلط ہونا تو بالکل ظاہر ہے کیونکہ جھینا، اور عکس کا پڑنا کثیف اجسام میں سے ہے اور یہ غلاۃ
تو صرف اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ وہ تو اس کی ذات پاک کو تمام نفسانی کیفیات متعین مانتے ہیں، مثلاً رنج کینہ
حسد، عجب و غم و غیظ وغیرہ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حلول کو مانتے ہیں،

اللہ تو ہر حال و بلائیک ان صفات سے متعین ہیں لیکن یہ ظلم تو ان اوصاف سے بھی آگے بڑھ کر تمام حیوانی

الاداء كذا اختيار فرماتے۔ یہ خیالی عقیدہ اسی بات کو چاہتا ہے کہ گویا نور باریک اللہ تعالیٰ ناماقبت اندیش اور امور کے نتائج سے ناواقف ہے، اللہ تعالیٰ کی شان اس گدھے خیال سے بہت بالاتر ہے،

زراریہ، سالمیہ، بدائیہ اور دوسرے امامیہ فرقے، مثلاً مالک، جمعی، دار بن حکم، ریان بن صامت اور ان کے علاوہ اہل اہل کو مانتے ہیں، اور انہ سے اس کے بارے میں روایات بیان کرتے ہیں، چنانچہ کلینی میں زرارہ بن ابیہ سے روایت ہے کہ ائمہ میں سے کسی ایک سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بداء سے اچھی کوئی چیز نہیں، مہشام بن سالم نے ابی عبد اللہ سے روایت کی ماعظمہ اللہ بشل البداء و بداء سے عظیم اللہ تعالیٰ کسی اور چیز کو نہیں جانتا، اور ریان بن صامت کہتا ہے کہ میں نے جناب رضا کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

”اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو کبھی نہیں بھیجا مگر یہ کہ شراب کو حرام کرنے کے لئے اور بداء کا اقرار کرنے کے لئے۔“

زرارہ اور مہشام بن سالم کے حال سے تو آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ تو وہ ہیں کہ جنہوں نے ائمہ سے جسم اور صورت تک کی روایت بیان کر دی ہیں، مگر اشاعری بداء کے مسئلہ میں اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں جس سے اس کے منسوخ ہونے کا اشارہ ملتا ہے، تاکہ لعن و تشنیع کی گنجائش نہ رہے۔ لہذا ہم مجبوراً رسالہ اعلام الہدی فی تحقیق البداء سے مناسب مقام چند عبارات اور ترجمہ پیش کرتے ہیں،

يَقَالُ بَدَأَ لَهُ إِذَا ظَهَرَ لَهُ سَائِيٌّ مُخَالِفٌ لِتَرَاثُ الْأَوَّلِ وَهُوَ الَّذِي حَقَّقَهُ الشَّيْخُ فِي الْعُدَّةِ وَالْبُرْهَانِ أَنْكَرَ أَجْمَلِي فِي كُنُوزِ الْفَرَائِدِ وَالَّذِي حَقَّقَهُ الْمُرْتَضَى فِي النَّارِ يُعَلِّقُ وَيُشِيرُ بِهِ كَلَامُ التَّلْهِيزِيِّ وَهُوَ أَنَّ مَعْنَى قَوْلِنَا بَدَأَ لَكَ تَعَالَى أَنَّهُ ظَهَرَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ مَا لَمْ يَكُنْ ظَاهِرًا إِلَى خَيْرِ مَا تَقَعَّ -

بداء اس وقت بولا جاتا ہے کہ اس کے لئے پہلی رائے کے خلاف کوئی رائے ظاہر ہو، چنانچہ شیخ نے عدہ (کتاب) میں اور ابو فریح کراچی نے کتاب، کنز الفوائد میں اسی کی تحقیق کی ہے اور اس کو حق ٹھہرایا ہے اور مرتضیٰ نے دربیعہ کتاب، میں جس کو حق ثابت کیا ہے، طبری کا کلام بھی اس کی طرف تائیدی اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

ہمارے اس قول بداء اللہ تعالیٰ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کسی معاملہ میں وہ بات ظاہر ہو گئی جو پہلے ظاہر نہ تھی۔“

اسی طرح کی اور نقلیں بھی اس کتاب میں درج کی ہیں اس کے بعد امام مہدی کا مصنف کہتا ہے،

أَلْحَاصِلُ أَنَّ عِلْمَهُ سَبَّحًا نَهَ بِأَلْوَابِ حَادِثٍ عَلَى مَا دَلَّ عَلَيْهِ الْحَادِثُ وَالْآيَةُ الْمَذْكُورَةُ وَنَفْثَ مَا مَكَوَسَّرَ بِهِ الْمُرْتَضَى وَالطَّبْرِسِيُّ وَلِیَعْلَمَ قَدَرُ اللَّهِ أَنْوَاجَهُ

حاصل کلام یہ ہے کہ حوادث کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا علم قديم نہیں ہے چنانچہ مادیث اور آیت مذکورہ اور ان جیسی بہت سی چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں اور مرتضیٰ طبری اور مقداد نے بھی اسی بات کی تصریح کی ہے اللہ

ان کی روحوں کو پاک کرے

پھر بداء کے اقسام کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد کہتا ہے

وَمِنْ جُزْأَتِهَا تَحْوِيلُ الْأَشْيَاءِ ذِكْرُ مَا رَوَاهُ فِي الْكَافِي

اور ان میں سے ایک عورت کو مرد کی شکل میں تبدیل

کردنا ہے، جیسا کہ حسن بن جہم سے کہانی کی کتاب العقیقہ کے باب برداد غنی الانسان میں روایت کیا گیا ہے اور اس

عَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ جُهَيْمٍ عَنِ الرَّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي
بَابِ بَدَادِ غَنِى الْاِنْسَانِ فِي كِتَابِ الْعَقِيْقَةِ
فِي هَذِهِ رَوَايَتُ جَنَابِ رَمَا سَعِي كِي هِي
اَكْمِي كَمَا سَعِي كَم -

دوسرا برداد اخبار میں، اس کو طبرسی نے صراحت سے رد کیا ہے
(برداد اخبار کے سلسلہ کی ایک دہ روایت ہے جو کہانی اور
امال میں امیر المومنین سے بطریق صدوق مروی ہے کہ
آپ نے فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم کو قیامت
تک ہرنے والی باتوں کی خبر دیتا آپ سے مراد اللہ تعالیٰ
کا یہ قول ہے يَخْتَوِي اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ آخِرَ آيَاتِهِ تَمَك
اور ایک دہ روایت سے جو آیت السَّعْيُ غَلَبَتِ الرُّومَ
کی تفسیر کے ذیل میں علی بن ابراہیم سے منقول ہے پھر وہ
روایت ہے جو عمیون اخبار الرضا میں بطریق صدوق منقول
ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھ سے والد نے اور ان سے ان
کے باپ دادا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیروں میں سے کسی نبی کے پاس وحی
بھیجی۔ اور روایت جو صاحب کافی نے کتاب الزکوۃ کے
باب ان الصدقة تدفع البؤس میں ذکر کی ہے اور وہ
روایت جو امال کی مجلس ۵ء میں اس قصہ کے دوران کہ حضرت
عیسیٰ علیہ السلام قوم مجلیں پر گزر رہے ہیں، بیان کی ہے
اور وہ روایت جو راوندی نے قصص فی اخبار بنی اسرائیل
میں جناب صادق سے کی ہے کہ ایک پرند ایک درخت
پر اڑ رہے تھے دیکر تھکا وہاں ایک آدمی آتا اور بچے
اٹھا لے جاتا اس پر نہ لے لے اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کی
شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تیری شکایت جلد دور
کر دوں گا۔ چنانچہ پرند نے پھر بچے دے دیے اور وہ آدمی پھر
آیا اور اپنے ساتھ دو روٹیاں بھی لایا، جب وہ درخت
پر چڑھنے لگا تو ایک سائل آگیا، اس کے سوال پر اس شخص نے ایک سائل کو روٹی دیدی پھر درخت پر چڑھ کر بچوں کو
دے گیا فراس مقدمہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سزا سے بچا دیا،

وَالْقَافِي اَلْبَدَا فِي الْاَخْبَارِ وَصَوْرَةُ الطَّبْرِي
بِسُيُوعِهِ وَمَا رَوَى فِي الْكَافِي وَالْاَمَالِي الْقَدُّوْنِي عَنْ
اَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ قَوْلِهِ لَوْلَا اَيُّهُ فِي كِتَابِ اللَّهِ
تَعَالَى لَوَضَعْتُ لَكُمْ رِبَا يَكُونُ لَكُمْ لِقَاءُ مَلَكٍ يُرِيدُ
بِالْاَيَةِ قَوْلَهُ تَعَالَى يَخْتَوِي اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ
مَا رَوَاهُ عَنْ ابْنِ اِبْرَاهِيمَ فِي تَهْذِيبِ قَوْلِهِ تَعَالَى اَلَمْ
عَلِمْتِ الزُّوْمَ وَمَا رَوَاهُ الْقَدُّوْنِي فِي عُيُونِ اَخْبَارِ
الرَّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا تَلَا قَالَ اَخْبَرَنِي ابْنِي عَنْ اَبَائِهِمْ
عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مَا تَلَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَالَ اِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ اَوْحَى اِلَى نَبِيِّهِ مِنَ الْاَشْيَاءِ الْاَلَا
وَمَا رَوَاهُ صَاحِبُ الْكَافِي فِي بَابِ اَنَّ الْقَدْقَةَ تَنْقُضُ
الْبَلَاكَ مِنْ كِتَابِ الزُّكُوْفِ فِي قِسْمَةِ الْيَهُودِي وَمَا
رَوَاهُ فِي الْاَمَالِي فِي الْجُلُوسِ الْاَمَامِ وَالسَّبْعِيْنَ
مِنْ قِسْمَةِ مُرُوسٍ هَيْسَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمْ يَقُوْرْ تَحْلِيْنِ
وَمَا رَوَاهُ الرَّاوَنْدِي فِي قِصَصِ الْاَشْيَاءِ وَفِي اَخْبَارِ
بَنِي اِسْمَاعِيْلَ عَنِ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا تَلَا وَرَوَاهُ
كَانَ يَفْرَحُ فِي تَجَرُّدِهِ وَكَانَ دَجَلٌ يَأْتِيهِ اِذَا اَدْرَكَ
الْفَرَحَانُ فَيَأْخُذُ الْفَرَحَانِ فَيَقْلُ ذَلِكِ الْوَرْدُ شَانَ
رَأَى اللَّهُ تَعَالَى فَقَالَ سَأَلْتُكَ قَالَ فَاَخْرَجَ
الْوَرْدُ شَانَ دَجَلَةَ الرَّجُلِ وَمَعَهُ رَحِيْمَانِ فَمَعِدَ
الشَّجَرَةَ وَهَرَمَ لَهُ سَائِلٌ فَاَعْطَاهُ اَحَدَ الْوَرْدَيْنِ
ثُمَّ مَعِدَ فَاَخَذَ الْفَرَحَانِ فَسَلَّمَ اللَّهُ تَعَالَى لَسَا
تَمَدَّقَ تَدَلُّ مَا جُمِعَ عَلَيْهَا وَفِي الْاَبْدَانِ الْاَخْبَارِ
پر چڑھنے لگا تو ایک سائل آگیا، اس کے سوال پر اس شخص نے ایک سائل کو روٹی دیدی پھر درخت پر چڑھ کر بچوں کو
دے گیا فراس مقدمہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سزا سے بچا دیا،

لہذا یہ ساری روایات مل کر یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ اخبار میں بدلا ہوتا ہے
 واضح رہے کہ امامیہ کے متاخرین نے برا کے قول کی برائی محسوس کر کے بد کو اللہ تعالیٰ کے مخفی علوم کے ساتھ محقق
 کیا ہے اور کہا ہے وہ علم جو اللہ تعالیٰ فرشتوں یا اہل بیت تک پہنچانے اس میں بداء نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے
 دوستوں کو چھوڑ کر انہیں چاہتا، مگر نظام الدین جیلانی صاحب رسالہ علم الہدی جو اٹھ عشر یوں کا بڑا محقق گزرا ہے اس
 تخصیص کو نہیں مانتا اور اس بارے میں ان کو چھٹلاتا ہے اور کہتا ہے کہ۔

تیسرا واضح ہے جو کچھ ہم نے امیر المومنینؑ سے نقل
 کیا ان کا قول آیت لولا آیتہ آخر تک اور جو کچھ نقل کیا
 کافی سے یہودی کے قصہ کے سلسلہ میں اور امالی سے حضرت
 علیؑ علیہ السلام کے قصہ میں اور وہ روایت بھی جو صاحب
 کافی نے کتاب النکاح کے بات لواطت میں ایک حدیث
 کے سلسلہ میں اپنے رواد کی سند سے ابی جعفر سے بیان
 کی ہے۔ اس کا ضروری اختصار یہاں کرنا ضروری ہے
 لوط علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا کہ میرے رب نے
 ان لوگوں (قوم لوط) کے بارے میں کیا حکم فرمایا ہے؟ فرشتوں
 نے کہا کہ ہمیں یہ حکم ہے کہ محمدؐ ان کو آگھیریں۔ لوط علیہ السلام
 نے کہا کہ تم سے میری ایک درخواست ہے کہ تم ان کو ابھی
 گھیر لو مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں میرے رب
 کو بداد نہ ہو جائے، علاوہ ازیں صاحب کافی نے کتاب
 العقیقہ کے باب بد خلق الانسان میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ
 ان فرشتوں سے جو تخلیق انسان پر مامور ہیں کہتا ہے
 کہ اس پر میرا فیصلہ، میرا اندازہ اور مرا چلنے والا حکم لکھو
 اور اس لکھے پر میرے لئے بدائی شرط کا مزید اضافہ کرو۔
 اور وہ روایت جو بطریق صدوق حسن بن محبوب ابی
 طلحہ سے مروی ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے جناب رضاد
 سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکامات
 و ہدایات ملتی ہیں اس کے خلاف بھی آپ سے کوئی چیز
 ملتی ہے انہوں نے کہا ہاں۔ تم کہو تو اس کے ثبوت میں
 آپ بیان کروں اور کہو تو حدیث سے ثبات کروں اور
 دیکھو آیت میں ہے کہ ہر مومن مقدس تھا رہے لئے مکہ کی گئی ہے اس میں داخل ہو جاؤ۔ مگر وہ تو اس میں داخل

لَا يَخْفَى عَلَيْكَ اَنْتَ مَا تَقْلُبُ اَعْيُنُ السُّورِيِّينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ
 مِنْ قَوْلِهِ لَوْلَا اَيُّهُ الْوَمَا تَقْلُبُ اَعْيُنُ الْكَافِي فِي
 قِصَّةِ الْيَهُودِيِّ وَعَنِ الْاِمَالِي فِي قِصَّةِ عِيسَى وَمَا
 رَوَاهُ اَيْضًا صَاحِبُ الْكَافِي فِي كِتَابِ النِّكَاحِ فِي بَابِ
 الْاِطْلَاقِ فِي تَهْنِئَةِ عَيْفِ حَبِيبِ رَوَاهُ كَمَا لَا سَنَادَ عَنْ
 اَبِي جَعْفَرٍ وَهَذَا امْرُؤٌ مِمَّنْ لَمْ يَحْجُجْ مِنْهُ خَالَ كَهْمُ لَوْ كُتِبَ
 يَا رُسُلَ رَبِّي فَمَا امْرُؤُكُمْ رَبِّي فَيُهِمُّ خَالُوا امْرُؤًا اَنْ
 تَاخُذَ هُمَا لَتَعْرِ قَالَ غُلِي اَيْلَكَ حَاجَةٌ فَكُلُوا اَوْ مَا
 حَاجَتُكَ قَالَ تَاخُذُ وَهَذَا السَّاعَةَ خَالِي اَخْفَا اَنْ يَنْتَبِذَ
 فِيهِمْ لِيَرْبِي الْوَمَا اَيْضًا رَوَاهُ صَاحِبُ الْكَافِي فِي بَابِ
 بَدْءِ خَلْقِ الْاِنْسَانِ مِنْ كِتَابِ الْعَقِيْقَةِ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى
 يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ الْخَلَائِقِينَ اَكْتُسَا عَلَيَّهِ قَضَائِي وَكَذَرِي
 وَفَافِدْ اَمْرِي وَاشْتَرَطَايَ الْبَدَا اَنْ يَمَّا تَلْتَبَيَانِ وَمَا
 رَوَاهُ الْقَدْوُوقُ بِالْاَسْنَادِ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ مُحَمَّدٍ مِنْ اَبِي
 طَلْحَةَ قَالَ مَلَكٌ لِمَنْ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَا لِي الرُّسُلُ عَنْ
 اللّٰهِ يَشْنُ شَرُّ تَائِي بِخِلَافِهِ قُلْ لَعَنَهُ اَنْ شَدَّكَ حَدَّثَكَ
 وَانْ شَدَّ اَتَيْتَكَ بِهِ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ اَوْ خَلَا اَلْاَرْضُ
 الْمُقَدَّسَةَ اَلَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ الْاَيَّةَ فَمَا وَدَّ كُوهَا وَ
 دَعَلَ اَبْنَاءُ اَبْنَاءِهِمْ وَقَالَ عِيسَى اِنْ اَللّٰهُ وَعَدَنِي اَنْ
 تَهَبَ لِي عِلْمًا مَائِي سَتَنِي هَذَا وَتَهَبِي هَذَا اَشْرَعَ عَابَ وَ
 وَلَدَ هُوَ اَمْرًا اَنْهُ مَوْتِيَمُ مُتَافِي لِي لَللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى
 قَدْ اَلْكَزِبَ فِيْهَا الْوَيْبِ وَجَبِلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَشَرُّ مَدَّ عَلَى
 الْمَلَائِكَةِ الْبَدَا

نہیں ہوئے ان کے پوتے داخل ہوئے۔ اور دیکھو کہ عمرؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اسی سال اور اسی ماہ لڑکا دینے کا وعدہ کیا ہے، پھر وہ تو غائب ہو گئے مگر ان کی عورت نے لڑکے کے بجائے لڑکی کو جنا۔

پس یہ ساری روایات و واقعات اس خیال کی وجہ امامیہ کے متاخرین کا ہے، تردید کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی عیسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا پڑوا دیا اور یہ کہ فرشتوں پر شرط رکھا،

خلاصہ کلام یہ کہ اس سلسلہ میں شیعوں کی تمام روایات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بدائے حقین اقسام یا معنی ہیں، اول علم میں بداء کہ اپنے پچھلے اور سابقہ علم کے خلاف انکشاف ہو دوسرے ارادہ میں بداء کہ پہلے ارادہ کے خلاف نظر آئے، اور تیسرے حکم میں بداء کہ پہلے ایک بات کا حکم دیا جائے پھر اسی کے خلاف حکم دیا جائے شیعوں کے نزدیک تینوں قسم کا بداء اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود وثابت ہے،

تیسرے قسم کا بداء نسخ سے ملتا جلتا ہے اسے یہ اہل سنت کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ یہ لوگ اسے مانتے ہیں۔ ان کی اصطلاح میں پہلا بداء بدائی الاخبار کہلاتا ہے دوسرا بدائی التکلیف اور تیسرا بدائی التکلیف

یہاں قابل غور اور لائق توجہ بہت باریک نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ آخری بداء تو نسخ ہے اور نہ ہی اہل سنت کی اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے اس مسئلہ کی تحقیقی صورت یہ ہے کہ اہل سنت اور شیعہ ہر دو فریق اس پر تو متفق ہیں کہ جب نسخ کو رد کرنے والے شرائط ثابت و متحقق ہو جائیں تو نسخ جائز نہیں وہ شرائط اہل سنت کے نزدیک چار ہیں، (۱) کام (۲) وجہ (۳) وقت اور (۴) مکلف کا ایک ہونا۔ نسخ کے جواز کے قائل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو بطور دلیل و ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ان کا ذبح منسوخ کیا گیا، اور ان کی جگہ مینڈھا ذبح کر دیا گیا۔ تو یہ دلیل وجہ غلط و باطل ہے، اس لئے کہ یہ صورت نسخ کی ہرگز نہیں ہے یہ تو اصل پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں بدل کو اسی کی جگہ قائم کرنے کی بات ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو حق الوحی چھری تیز کر لی تھی، اور چلائے میں بھی کوئی کمی نہیں کی تھی، لیکن خرق عادت یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی رگ ہائے گلو اور زخروہ نہ کٹنے کی وجہ سے ارادہ پورا کرنے میں بے بس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی دیکھتے ہوئے مینڈھا بھیجا۔ اور اصل کی جگہ بدل قائم کرنے کو کوئی بھی نسخ نہیں کہتا۔ مثلاً منو کی جگہ تیم و منو کے لئے نسخ نہیں۔ اسی طرح پچاس نمازوں کا نسخ جس کے مخاطب صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے امت کو تو اس کا پتہ بھی نہ تھا۔ اس لئے وہ مکلف بھی نہ ہوئے،

شیعوں کے اہل تحقیق مذکورہ چار شرائط پائے جانے کے باوجود بھی نسخ کو جائز بتاتے ہیں، اور ایک پانچویں شرط کا مزید اضافہ کرتے ہیں اور وہ یہی بدائی التکلیف ہے، جیسا کہ صاحب علم الہدی کہتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بدائی التکلیف اس وقت منع ہے جبکہ مذکورہ چاروں شرطوں کے ساتھ پانچویں شرط بھی پائی جائے وہ یہ کہ حکم اور تکلیف دینے کی بہتری اس شخص کی مصلحت سے وابستہ ہو جس کو حکم دیا گیا ہے لیکن جب کہ اس کے خلاف خود حکم دینے والے کی مصلحت کی طرف وہ بہتری عائد ہوتی ہو تو اس وقت وہ بدائی التکلیف منع نہیں، لہذا ہمارے

وَحِينَ يَقُولُ الْبَدَاءُ فِي التَّكْلِيفِ اِنَّمَا يَسْتَعْرِجُ رَاجَةً اِجْتِمَاعَ مَعَ الشَّرْطِ وَالْزُبْدَةِ الْمَذْكُورَةِ شَرْطًا مِّنْهُ وَهُوَ اَنْ يَكُونَ حَسَنُ التَّكْلِيفِ وَالْأَمْرُ مَسْبُوحًا حَتَّى مَصْلَحَةُ حَائِدَةٍ إِلَى الْمَأْمُورِ بِهِ وَأَمَّا إِذَا كَانَ حَسَنُ الْأَمْرِ بِمَصْلَحَةٍ عَائِدَةٍ إِلَى الْأَمْرِ لِنَفْسِهِ فَلَا يُبْتَنَى الْبَدَاءُ فَاَلَمْ يَأْتِ الْبَدَاءُ الْمُجَوِّزِينَ مِنْ فَا مَّا اجْتَمَعَ فِيهِ اَرْبَعَةٌ

دُونَ الْخَامِسِ وَكَوْنُ الْإِلَاقِ الْبَدَا عَلَيْهِمْ بِجَانِبِهَا الْأَوْقَعُ
لَهُ بَعْدَ النَّصْرِ مِنَ الْمُنْزَوَاتِ مِنَ الْعِصَةِ الطَّاهِرَةِ
عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَإِذْ جُمِعَتِ الشُّرَاطُ الْخَمْسَةُ فَلَا
تَرَايَ فِي أَمْتِنَا حَالُ الْبَدَا أَوْ كَمَا نَقْلُنَا عَنْ عَنِ الشَّهِيدِ الْأَمَلِيِّ
نزدیک ہر ایک جائز شدہ صورت یہ ہے کہ چاروں شرطیں
اگر چہ پائی جائیں مگر پانچویں شرط نہ ہو اب اگر اس پر
مجازاً ابداء کا اطلاق ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جب
کہ عزت پاک سے اس بارے میں متوازن نصوں موجود ہیں
جب پانچویں شرط پائی گئی تو ہمارے منع ہونے میں کوئی شک نہیں جیسا کہ ہم نے شہید سے نقل کیا۔

یہاں اس بات کا پتہ چلا کہ بدائی التکلیف بدائی الارادہ کا مقتضی ہے کیونکہ اگر کوئی نئی مصلحت سامنے نہ آئے تو حکم
کو بدائی التکلیف کیوں لاحق ہونے لگا اور اسی طرح بدائی الارادہ، بدائی العلم کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ علم کے بغیر ارادہ ہوتا
ہی نہیں جب تک علم میں تبدیلی نہ ہو ارادہ میں تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

لہذا اگر امامیہ بدائی العلم کے منکر ہوں اور باقی دو کو مانیں تو ان کا یہ انکار بے معنی اور بے کار بات ہوگی،
اسی کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یہ لوگ بدایین حکم کے نسخ کو مانتے ہیں اس طرح کے کسی مصلحت کی بنا پر
حکم اول حکم ثانی سے بدل جاتا ہے اس پر ہم پورے توجہ میں کہ یہ مصلحت صرف اسی وقت ظاہر ہوئی یا پہلے بھی ظاہر تھی، پہلی
صورت میں ہمارا مدعا مائل ہو گیا کہ بدائی العلم ضروری ہوا جس کا وہ انکار کرتے ہیں دوسری صورت میں یہ فعل لا یعنی
عبرت ہوا کیونکہ نسخ مختلف اوقات کے اعتبار سے مسکھین کی مصلحتوں کے بدل جانے سے ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ
اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی مصلحت غیر ظاہر تھی، اب ظاہر ہو گئی،

کیونکہ تغیر و تبدل کا حکم تو ہمارے لحاظ سے ہوتا ہے کہ ہم جہالت کے غاروں میں پھنسے ہوئے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ
کے نزدیک تو ہر حکم کی ایک مدت اور اس کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ اسی مدت یا وقت تک باقی ہے اب اس آیت
يَخْلُقُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنَبِّئُ فِي حُجُومِ أَعْمَالِنَا مَوْلَى سَعْنَانِ ہوں کا مٹانا اور اس میں توبہ کا اثبات ہے یا فاسد کو مٹانا اور
کائنات کا مٹانے کے صوف میں ثبت کرتا ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ محو و اثبات ہے۔ اس لئے کہ آیت کے آخری
جز میں فرمایا گیا ہے وَجَدْنَا كَأُمِّ الْكِتَابِ کہ اصل کتاب اس کے پاس ہے،

اس بارے میں انہوں نے جو حدیثیں بیان کی ہیں، وہ سب کی سب موقوف اور گھڑی ہوئی ہیں جن کے راوی
مجبوٹے اور حدیثیں گھڑنے والے ہیں اور جب عقلی و شرعی دلائل قطعی موجود ہیں تو ان کے مقابلے میں ان تھوڑی باتوں پر
کان دھرے جائیں تو کیوں؟

ان سب سے قطع نظر گوشہ اور اقی میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ائمہ سے ایسی صریح و متواتر روایات منقول ہیں جو یہ
ثابت کرتی ہیں کہ اللہ کا علم سب کو شامل ہے اور اس کے لئے اشباہ کے وجود سے پہلے اور بعد کا علم کیسا ہے اور
طرفہ تماشا یہ ہے کہ انہی کا شیخ صدوق (سچا)، اپنی کتاب التوحید میں آیت وَبَدَا الْكَلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُنْ لَوْ لَا فَجَاءَ بَدْنِ
سے اسی خیال پر دلیل لایا ہے،

میں نے ان کے اہل علم کے معیار فہم و عقل کی قلعی بھی کھل جاتی ہے کہ جب اس قرآن مجید کے سمجھنے میں قسم
قسم کی غلطیوں کے شکار ہوئے اور جگہ جگہ ٹھوکر کھائیں جس کی تفسیر و خدمت میں ساری مخلوق لگی ہوئی ہے تو ائمہ
کے اس کلام کے سمجھنے میں تو معلوم نہیں کہاں کہاں منہ کے بل گرے ہوں گے جو انہوں نے اپنی تھیلیوں اور

مصدقوں میں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں، اور جن کی ہر ایک کسی کو نہیں دیتے! اگر کسی کے دل میں یہ شبہ ہو کہ شیعوں کی اپنے ائمہ سے منقول کی ہوئی روایات کے مطابق خود مسیح بخاری میں بھی فوارق، ابرس اور امعی سے بھی تو روایات موجود ہیں جن میں **بَدَّ اللَّهُ أَنْ يَنْتَكِلَهُمُ** کے الفاظ آئے ہیں اس کو اہل سنت کس معنی پر محمول کرتے ہیں، تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اگر یہ جملہ ان روایات میں اپنی صحیح جگہ استعمال ہوا ہے اور وہ روایات صحیح الاسناد بھی ہیں تو ہمارے کے مجازی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے افعال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ ہر طرف سے اسباب ان کے وجود کے متقاضی ہوں دوسرے وہ کہ ان کے وجود کا مطالبہ کرنے والے کچھ اسباب بھی موجود نہ ہوں بلکہ وجود اسباب کے موانع موجود ہوں تو دوسری قسم میں لفظ ہذا بطور استعارہ اور تشبیہ استعمال ہوتا ہے، اور صرف ہذا ہی نہیں جس میں مجاز برتا گیا ہو احادیث و آثار میں سینکڑوں ایسے الفاظ ہیں جن میں مجاز برتا گیا ہے، مثلاً **اِهْتَمَنْ**، **اِبْتَغِ**، **اُفْكِكْ**، اور تردد کہ یقیناً ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں یا صفات کی وہ تمام آیات جن میں اللہ تعالیٰ کے لئے **وَجْہ**، **بَیِّن**، **اَصْبَاح** اور **بَیِّن** وغیرہ کا ذکر ہے کہ یہ سب کے سب مجازی معنی پر محمول ہیں اور پھر ائمہ نے بعض آثار میں ہذا کا لفظ صرف لوگوں کو نہایت کرنے کی غرض سے استعمال کیا ہے۔ حقیقت میں وہ ہذا نہیں!

ان کی روایت میں قصہ عمران کے سلسلہ میں ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے **وَعَدَ فِي سَرَاتٍ فُلَا مَا اسْأَلْنَاهُ** کہا کہ ان کی بیوی اپنے چھٹ کی اولاد کی نذر مان چکی تھیں، اور آیت **كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ** سے کسی خاص وقت و زمانہ کے خاص ماضی مراد نہیں، بلکہ سارے بنی اسرائیل مراد ہیں۔

اور فرشتوں کے خطاب کے سلسلہ میں ہذا کی شرط فرشتوں کے علم کے لحاظ سے تھی اسی طرح پرند کے قصہ میں صرف کفایت وہ مدد کا وعدہ ہے اسی میں وقت کی تعیین نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ بھی وہ شخص بیچے جا سکا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں بنا یا گیا کہ آپ اور اور آپ کے صحابہ مسجد میں داخل ہوں گے اور اس سے آپ نیز آپ کے اصحاب یہی سمجھے کہ داخلہ اسی سال ہو گا،

حالانکہ فی الواقعہ اتنی غلط مراد نہ تھی، لہذا پرند کے معاملہ میں وعدہ کفایت سے غلط سمجھ لی جائے تو تعجب کی کیا بات ہے۔ یہاں ہذا ہوا بھی تو علم میں ہوا واقع اور نفس الامر میں واقع نہیں ہوا۔ اسی طرح دوسری روایات میں غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ کیا مراد ہے،

عقیدہ (۱۸) **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَٰذَا الْغُلَقِ الْأَمْرَ** کہ کسی کے کفر و گمراہی سے خوش و راضی نہیں ہوتا، جیسے فرمایا **وَلَا يَزْنِي زَيْنًا وَلَا يَكْفُرُ** (وہ اپنے بندوں کے کفر پر خوش نہیں)۔ مگر شیعہ کہتے ہیں وہ شیعوں کے علاوہ دوسروں کے کفر پر راضی ہے۔

چنانچہ صاحب محاسن نے جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ **لَا تَتَّبِعُوا هَٰذَا الْغُلَقِ الْأَمْرَ** نہ سکا اور جن طرح اللہ تعالیٰ ان کی گمراہی پر راضی ہوا تم بھی راضی رہو، اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو اہل سنت کے لئے

تو بڑی خوشخبری ہے، اس لئے کہ وہ بقرہ انہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق بسر کر رہے ہیں جب ہی تو اللہ ان سے راضی ہے، اور رمضانے الہی جہاں دین کی دلی مراد ہے گویا انہیں اللہ کی گواہی سے حاصل ہے،

اب علمائے شیعہ کو چاہئے کہ وہ اس روایت کی بھی تکذیب کر دیں جس طرح صورت و شکل اور جسم والی روایات کو جھٹک دیا ہے۔ کیونکہ عقلی دلائل اور خود ان کے اصول شرعیہ کے یہ خلاف ہے دراصل یہ روایت ایک طرف تو امامت کی غرض کا قلع قمع کرتی ہے اور وجوب اصلح و النفع والطف کے بھی منافی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے طے شدہ اصول کہ ”اللہ تعالیٰ شر و برائی کفر و گناہ کو نہیں چاہتا“ کی بیخ کنی کرتی ہے!

عقیدہ (د ۱۹)۔ ۱۔ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے، مگر سارے شیعہ اس پر متفق القول ہیں کہ بقائے عقل اللہ تعالیٰ پر بہت سی چیزیں واجب و لازم ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ضرور دلا بوی انجام گویا عقل کا رخا نہ قدرت کی بڑی شریک کار ہوئی اور اللہ تعالیٰ محکم عقل ہو گیا حالانکہ اس کی ذات اس سے کہیں بلند و بالا تر ہے!

یہ عقل سے پیدل اتنا بھی سمجھنے سے عاجز ہیں کہ بادشاہ اگر رعایا کا محکوم ہو جائے تو یہ عیب اس کی شہنشاہیت پر بڑھ لگاتا ہے!

اسی طرح کائنات کے مالک، خالق اور بادشاہ کو اسی کی مخلوق کا محکوم بنادینا اس کے مرتبہ کے کتنے بڑے نقصان کا اقرار ہے، ایسا خیال ربوبیت اور الوہیت کے مرتبہ کے ہرگز شایان شان نہیں ایک بندہ عاجز اور ذرہ حقیر کی یہ تاب یہ مجال کہاں کہ وہ اپنے مالک حقیقی پر کوئی چیز واجب و لازمی ٹھیرائے جو کچھ وہ عطا فرماتا ہے وہ اس کی مہربانی ہے اور جو نہیں دیتا وہ اس کا عین عدل و انصاف ہے وہ ہر فعل پر قابلِ تحسین ہے، چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ جو آپ نے صفین کے موقع پر دیا بیچ البلاغ میں درج ہے جس میں آپ فرماتے ہیں،

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِي عَلَيْكُمْ حَقًّا بِرَأْيِي اَمْرًا كَرِهًا
وَجَعَلَ لَكُمْ عَلَيَّ مِنَ الْحَقِّ مِثْلَ الَّذِي عَلَيْكُمْ وَالْحَقُّ
اَوْسَعُ الْاَشْيَاءِ فِي التَّوَاصُفِ وَ اَمِيقًا فِي التَّنَاصُفِ
لَا يَجُزِي لِاَحَدٍ اِلَّا جَزَى عَلَيْهِ وَلَا يَجُزِي عَلَيَّ اَحَدٌ اِلَّا
جَزَى لِي وَلَوْ كَانَ لِاَحَدٍ اَنْ يَجِيءَ لِي لَمْ وَلَا يَجُزِي عَلَيَّ
لَكَ اَنْ تَكُنْ خَالِصًا لِلَّهِ سُبْحَانَهُ دُونَ خَلْقِهِ لَقَدْ نَزَّ
عَلَيَّ عِمَادَةٌ وَعَلَى لِي فِي كُلِّ مَا جَرَتْ عَلَيْكُمْ صُرُوفٌ تَنَافً
وَلَكِنَّهُ سُبْحَانَهُ جَعَلَ حَقَّهُ عَلَيَّ اَلْعِبَادِ اَنْ يُطِيعُوهُ وَ
جَعَلَ جَزَاءَهُمْ عَلَيْهِ مِمَّا عَقَدَ التَّوَابَ تَفَضُّلًا مِنْهُ
وَتَوْسَعًا بِمَا هُوَ لِكُلِّ نِدَاءٍ اَهْلُ النُّفُوسِ بِالْفِطْرِ الْمُقَدَّسِ۔

اطاعت کا بلکہ مہربانی و فراخی کی چند در چند ثواب دینا اپنے ذمہ کیا ہے اور وہ اس سے زیادہ مہربانی و بخشش کا بھی اہل ہے،

اب ذرا ان واجبات کی فہرست بھی دیکھ لیجئے جو یہ بزمِ خود و بخال خام اپنے پروردگار پر لازم و واجب قرار دیتے ہیں۔

کیسا نیک، زبردستوں کے آٹھوں فرقے اور امامیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر یہ واجب ہے کہ وہ مکلفین کو امر و نہی فرمائے۔ اور رسولوں کے ذریعہ بندوں کے لئے واجبات و محرمات مقرر کرے۔
حالانکہ یہ عقل کا تقاضا نہیں کہ کافر کو ایمان کی اور فاجر کو اطاعت کی تکلیف دی جائے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کو کیا فائدہ ہوگا۔ جب کہ دوسری طرف بندہ کے حق میں یہ سراسر خسارہ اور دائمی ہلاکت اور محض ضرر و نقصان ہے، اب چونکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے کام کے نتیجہ کو جانتا ہے اسے یہ بھی معلوم ہے کہ کون حکم قبول کرے گا کون نہیں تعمیل کرے گا یا نہیں تو پھر جان بوجھ کر بندہ کو ہلاکت اور تلف کے خطرہ میں ڈالنا جبکہ اس کی خود ذات کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا کوئی عقل اور سمجھ کا تقاضا ہے۔ ماقبل تو کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا کہ دوسرے کو تو اس سے نقصان پہنچے اور اس کو خود کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ خاص طور پر یہ ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے ساری عمر تو ایمان و اطاعت میں بتلائی اور مرنے تو کفر کی حالت میں، جیسے بلعم باغور اور امیر بن الصلت وغیرہ کہ دنیا میں عبادت و اطاعت کی کٹھنائیوں سے گزرے اور آخرت میں دوزخ کا کندہ بنے اور اللہ تعالیٰ کو ان کی تکلیف سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اور پھر اللہ تعالیٰ پر تکلیف دینا واجب ہوتا تو چاہیے تھا کہ رسولوں کا سلسلہ نہ ٹوٹتا، بلکہ ہر شہر، ہر قریہ اور ہر گاؤں میں پھر پھر رسول آتے رہتے اور زمین کا چہرہ چہرہ رسولوں کی آمد سے معمور ہوتا کوئی آبادی خالی نہ رہتی اس لئے کہ تکالیف معلوم کرنے اور جاننے کے لئے بلا جماع عقل کافی نہیں۔ رسول ہی ایک ذریعہ ہے جس سے یہ کچھ معلوم ہو سکتا ہے،

حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان، خراسان، ماوراء النہر، ترکستان، غلط و غش، چین و حبش کے بسنے والے صدیوں تک رسول کے مفہوم سے نا آشنا رہے نہ ان کی تاریخ اس کا پتہ دیتی ہے کہ کوئی اللہ کا رسول ان کے پاس آیا غلطی معجزہ ان کو دکھایا اور اللہ کا پیغام ان تک پہنچایا۔

اور پھر یہ بھی ہوتا کہ نبی کی وفات کے بعد ایک نذر جبری امام غالب کو بھیجتا اور واضح نشانیوں اور زبردست خرق عادات و اوقات سے اس کی تائید کرتا کہ وہ بید صراط ہو کر احکام کی تبلیغ میں مصروف ہوتا اور مکلفین کو شرعی احکام سے غافل نہ ہونے دیتا اور پہاڑوں کی چوٹیوں تک پر بسنے والے کو دعوت پہنچاتا اور فریضہ امامت کو علوم کا انبیا کے ہاتھوں میں نہ دیتا کہ وہ بے چارے احکام و افعیہ شریعہ کے اظہار کو کیا جانیں،

ایسا کرنے کے بجائے ان مغربیوں نے تو دوسرے کافروں و ظالموں کی طرح خود بھی تقیہ میں اپنی ساری زندگی گزار دی اور یہی کیسا نیک، زبردست، اور امامیہ سب کے سب اللہ تعالیٰ پر لطف و غایت کو بھی واجب قرار دیتے ہیں اور لطف کی تشبیہ یوں کرتے ہیں کہ وہ بندہ کو طاعت سے نزدیک اور معصیت سے دور کرنا ہے جو مجبور کرنے کی حد تک پہنچے۔

غفلت ان کا یہ خیال و عقیدہ بھی غلط لغو اور باطل ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر گنہگار کو نافرمانی کے اسباب ذرائع

میسرہ ہوتے۔ اور فرمانبرداروں اور اطاعت کیشوں کو اسباب طاعت ہر وقت فراہم رہتے، حالانکہ مشاہدہ اس کی سراسر تکذیب کر رہا ہے، کہ اکثر صاحب ثروت، کثرت مال، بددبہ، لشکری اور قوت و طاقت کے گھنٹ میں ظلم و ستم دھکتے، اور نادار مفلس، انکس و بے سرو سامانی کے باعث عبادت سے محروم رہتے ہیں، اکتھے طالب ہیں کہ جن کو نہ معلم نصیب ہے، نہ فراغت و روزی میسر ہے، اور اکتھے ہنگام ہوا و ہوس اور شریکند ہیں، جن کے چاروں طرف فسق و عصیان کے ڈھلے ڈھلے لوازمات و اسباب موجود ہیں،

اور پھر یہ عقیدہ تعلیم و کتاب اللہ و عورت کے بھی مخالف ہے۔ کتاب اللہ کے تو یہ کہ وہاں یہ ارشاد فرمایا گیا، وَتُؤْتِنَا اَدْنٰیٰ کُلِّ نَفْسٍ مَّعْدٰتًا وَذٰلَکَ حَقُّ اَنْقَدٍ وَّیٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْ الْجَنَّةِ وَالتَّائِبِیْنَ اَجْمَعِیْنَ اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت نصیب کرتے لیکن ہمارے قول کی کسی نشین ہے کہ میں جہنم کو جن و انس سب سے بھولوں گا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے، وَتُؤْتِنَا اللّٰهُ بِحَبْلٍ مِّنْ اَمَلٍ وَّاحِدٍ وَّذٰلَکَ لَیْسَ مِنْ اَنْقَدٍ وَّیٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اگر اللہ چاہتا تو ہر ایک و ہر شے پر ایک، امت بنا دیتا، مگر وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے،

اور یہ بھی ارشاد ہے، تَحْتَمِلُ اللّٰهُ عَنْ قُلُوْبِہُمْ وَّعَنْ سَمْعِہُمْ وَّعَنْ اَبْصَارِہُمْ غَشَاوًا وَّیٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہ دلوں اور کانوں کو مہر بند کر دیا اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے۔

ان کے علاوہ ایسی آیات بھی ہیں۔ جو تدبیر الہی و حیل اور ایمان و طاعت سے دور کر دینے پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً وَلٰکِنْ کَرٰہَ اللّٰهُ اَنْتَبَہُ فَنَنْصِفُہُمْ وَّیٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَمَّا الْقَادِرِیْنَ اَوْرَیْکَ اللّٰہ تعالیٰ نے ان کے ٹکٹے کو پسند نہیں کیا تو ان کو بوجھل کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ رہو، اور یہی اس نوع کی بہت سی آیات ہیں، اور عزت کی مخالفت اس طرح ہوئی کہ کلینی میں جناب صادق رحمہ اللہ علیہ سے ایک روایت منقول ہے جس کا حوالہ

پہلے دیا جا چکا ہے، قَالَ اِذَا ارَادَ اللّٰهُ یُعَذِّبُ سُوْرَۃً نَّکَلْتُ فِیْ قَلْبِہِ مُّکَلَّۃً وَّیٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَمَّا الْقَادِرِیْنَ اَوْرَیْکَ اللّٰہ تعالیٰ نے اس کو بھل کر دیا ہے جو اس کو بھگاتا اور بھگاتا رہتا ہے

اور کیسا نیمہ امامیہ اور زیدیہ کے سب فرقے، اللہ تعالیٰ پر اصل کو اختیار کرنا بھی واجب قرار دیتے ہیں، یہ عقیدہ بھی مذکورہ بالا بیان سے باطل ہوگی اس کے علاوہ قابل غور یہ بات بھی ہے کہ اگر اصل کی رعایت اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتی تو شیطان کو انسان پر مسلط کیوں کرتا جو اس کا قوی دشمن ہے اور انسان کی جنس سے بھی نہیں ہے انسان اس کو دیکھ نہیں سکتا کہ اس سے بچ سکے اور اپنے سے اسے دور رکھے جب کہ وہ انسان کو خوب دیکھتا ہے انسان اس سے دوسرے ڈالنے پر بھی قادر ہے اور اعضائے انسانی تو رہے اپنی جگہ نہیں لایا اعضا، قلب پر بھی اس کو پورا پورا اختیار حاصل ہے اب شیطان کا پیدا کرنا، پھر اس میں اور انسان میں باہم عداوت ڈالنا، اس کو برقرار رکھ کر اور و حیل دے کر بنی آدم کے گمراہ کرنے پر اس کو قدرت دے دینا اور ہر انسان کے دل کو اس کے تصرف میں دے دینا عقیدہ اصل کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے،

اسی نوعیت سے نبی اسرائیل کے حق میں اصل یہ تھا کہ اول تو سامری حضرت جبرائیلؑ کو نہ دیکھتا نہ اس کو آپ کے گھوڑے کی ٹاپ کی خاصیت معلوم ہوتی، اور معلوم بھی ہو گئی تھی تو مٹی کے اٹھانے پر قادر نہ ہوتا قادر بھی ہو گیا تھا تو اس کو ضائع کر دیا جاتا اور وہاں یہ سب چونکہ خلاف واقعہ تھا۔ اس میں اصل کہاں رہا۔

اور پھر ایک اور رخ یہ بھی ہے کہ بیچارے فقیر و مسکین، رنج و غم اور دکھ کے مارے ہوئے کافر کے حق میں اصل یہ تھا کہ وہ دوسرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر پیدا ہو جاتا تو بچپن میں ہی مر جاتا کہ آخرت کے ابدی عذاب سے بچ جاتا۔

اسی طرح اصحاب رسول اور امت محمدیہ علیہ السلام کے لئے اصل یہ تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حکم صریح نہ بھیجتا تاکہ سارے ہی اتفاق و اتحاد سے رہتے، اور کوئی بھی اس کی خلاف ورزی نہ کرتا،

پھر کتاب اللہ میں تو یوں آیا ہے، بَلِیَ اللّٰهُ یَسْتَحْلِلُکُمْ اَنْ تَقُولُوا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِمَنْعِ اللّٰهِ تَعَالٰی مِمَّا رَحِمَ اللّٰهُ تَعَالٰی مِنْ اَمْرِہُمْ اَنْ یَّکُوْنُوْا کَاۡفِرًا ۝۱۰۰ (اگر تم کو ایمان کی ہدایت دی، اگر تم کو تمہارے اللہ پر ہدایت واجب و لازم تھی تو وہ احسان کیوں جبار ہا ہے، ادا نہ واجب پر کوئی احسان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص کسی کافر من ادا کر کے قرض خواہ پر احسان رکھے تو سب لوگ اسے ملعون کریں گے۔

امامیہ کیسائیہ اور زیدیہ کے سب فرقوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بدلہ و صلہ بھی واجب ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو کسی غم و دکھ میں مبتلا کرتا ہے تو اس کے بدلہ اپنی مصلحت کے لحاظ سے کوئی نفع ضرور پہنچاتا ہے مثلاً ذکوۃ و صدقہ فطر، یا کوئی ایسی عام چیز جس میں بندہ کے عمل کو کوئی دخل نہ ہو یا اگر کسی غیر عاقل مثلاً درندہ سانپ بچہ کو اس پر مسلط کرتا ہے تو اس کے ذمہ واجب ہوتا ہے کہ اس کو کوئی ایسا فائدہ پہنچائے جو تعظیم سے خالی ہو،

ان کا یہ عقیدہ خدا اور انسان کے درمیان ملک و ملکیت کے تعلق کو سمجھ لینے کے بعد سراسر باطل ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بدلہ تو اس وقت واجب ہوتا ہے جب غیر کی ملکیت میں تصرف کیا جائے اور یہاں سوائے خدا کی ملکیت کے کسی غیر کی ملکیت سے ہی کہاں! ساری کائنات تو اس کی ملکیت ہے۔ لہذا غرض و بدلہ کا سوال ہی نہیں،

در حقیقت جنت کی تمام نعمتیں، انوار و لہذا نہ محض اور صرف اس کی مہربانیاں ہی، اگر کوئی شخص پوری زندگی اس کی عبادت میں کھپا دے تو اس کی ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ خدا تعالیٰ پر اس کا عزم واجب ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کو گلستان کے ابتدائی دیباچہ پڑھنے والا مکتب کا طالب علم بھی سمجھتا ہے۔ علامہ و فضلاء تو رہے اپنی جگہ اور ان کے نزدیک تو ائمہ کی احادیث سے یہ مطلب بتواتر ثابت ہے اور ابن بابویہ قمی نے امالی میں علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ سے بطریق صریح روایت کی ہے۔

آپ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ تم سے تیری عزت اور تیرے عظمت و جلال کی کہ تو نے مجھ کو پیدا کیا اگر میں اسی لمحہ سے بال بال تیری عبادت میں لگ پڑتا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا اور تیری ربوبیت کے دوام تک معنوق کے ساتھ شکر و حمد میں لگا رہتا تب بھی تیری ایک ادنیٰ نعمت

اَتَدْرَا کَانَ یَدْعُوْا بِهٰذَا اللّٰہُ عَادِلًا اِلٰی بَعْدَ تِلْکَ وَ عَظَمٰتِکَ وَ جَدَدِکَ کَوْنِیْ مَدَّ اَبَدٌ مَّتَّ فِطْرَتِیْ مِنْ اَوَّلِ الدّٰہِرِ عِبَدَتُکَ وَ اَمَ خُلُوْدِیْ سُبْحَکَ یَتٰی بِکَ لَیْلٌ شَعْرَتِیْ فِیْ کُلِّ طَوْفٍ عَلٰی سُرْمَدٍ اَلَا یُبْدِیْ بَعْنِیْدِیْ الْخَلَادَ لَیْلِ وَ شُکْرِہُمْ اَجْمَعِیْنَ کَلَنْتُ مُقْصِرًا فِیْ بُلُوْغِ شُکْرِکَ اُخْفِیْ لِعِزَّتِکَ مِنْ

کے شکر بحالانے سے قاصر رہتا اگر میں دنیا کی وجہ سے کالوں کو اپنے دانتوں سے کھودوں اور اپنی ہلکوں سے زمین کو بھاڑوں اور تیرے خوف میں خون و پیپ کے آنسو آسمانوں و زمینوں کے سمندر برابر بہاؤں تب بھی یہ اس حق سے کم تر ہوگا جو تیرا مجھ پر ہے اور اے خدا تو اگر اس کے بعد بھی مجھ کو عذاب دے تمام مخلوق کے عذاب جتنا اور آگ کے لٹنے میرے جثہ اور جسم کو اتنا بڑھا دے کہ وہ تمام طبقات جہنم کو گھیر لے اور میرے سوا جہنم میں نہ کوئی عذاب دیا جا رہا ہو اور نہ میرے جسم کے علاوہ جھٹنے کے لئے کوئی اور چیز

نَعْمَلُكَ وَكَوْنُ آتِي كَثْرَتِ مَعَادِنِ حَدِيدٍ الذُّنُوبُ بَا سَنَلَا
وَحَرَّتْ آتِي مَقَامًا شَفَا عِلْيَ وَبَكِيَّتِ مِنْ تَحْشِيَةٍ
مِثْلَ بَحْرِي اسْتَوَتْ وَالْأَمْنُ مِثْلَ مَاءٍ وَصَدِيدٍ
لَكَ ذَالِكَ قَلِيلٌ مِنْ كَثِيرٍ مَا يَجِبُ مِنْ وَفَى حَقِّكَ
عَلَى وَلَوْ أَنَّكَ الْهَى عَدَّ نَبِيَّ بَعْدَ ذَالِكَ بِعَذَابِ الْخَلَائِقِ
أَجْمَعِينَ وَفَطَنْتَ لِلنَّارِ خَلْقِي كَرْهِيٍّ وَمَلَأْتَ جَهَنَّمَ
وَالْهَابِ قَبْلَ مَنِي حَتَّى لَا يَكُونُ فِي النَّارِ مَعَكَ غَيْرِي
وَلَا يَكُونُ يَجْهَنَّمُ سِوَايَ كَانَ بَعْدَ ذَالِكَ
عَلَى قَلِيلٍ مِنْ كَثِيرٍ مَا شَرُّ جَهَنَّمَ مِنْ مَقُولَتِكَ

ہو تو اس سب کے باوجود میرا سزا کا تھوڑا سا حصہ ہوگا جس میں تیری طرف سے مستحق ہوں

اور شیخ البلاغہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمایا ہوا درج ہے کہ اس امت کا بہترین آدمی بھی اللہ کے عذاب سے امن میں نہ ہوگا

عقیدہ ۱۷۰۔ بندہ سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں یعنی ایمان و کفر، عیالی برائی، اطاعت و نافرمانی وہ سب کے سب اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، ان کی پیدائش میں بندہ کو کوئی دخل نہیں ہاں کسب و عمل بندہ کی طرف سے ہے اور اسی کسب و عمل پر بندہ کو بدلہ ملے گا یہی اہل سنت کا مسلک ہے

مگر کیسا نیر، امامیہ، اور سارے زیدی فرقے اس سچے اور درست عقیدہ کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے اعمال کو خود پیدا کرتا ہے اور بندہ ہی نہیں تمام پرندوں، چوپایوں، کیڑوں، مکوڑوں اور ان تمام حیوانات کے افعال و اعمال میں اللہ تعالیٰ کو کوئی دخل نہیں جو ارادہ رکھتے ہیں

ان کا یہ عقیدہ کتاب اللہ کے بھی خلاف ہے اور عزت رسول کے بھی

کتاب اللہ کے اس طرح کہ ارشادِ باری ہے - وَاللَّهُ خَافِكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (اللہ ہی نے تم کو اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا، خالقِ کلِ شئی لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ دوسرے چیز کا خالق ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اللہ میرا ہی الطیرِ مسجرات فی جوارِ التَّسَارُّمِ مَا يَكْسِبُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جو آسانی فضا میں گھرے ہوئے ہیں فضا میں انکو اللہ کے سوا کوئی نہیں ٹھہراتا - اللَّهُ يَرْزُقُ الْطَيْرَ فَمَا تَحْمِلْنَ وَمَا يَنْسِفُ إِلَّا أَنْتُمْ كَيْفَ لَا يَكُنْ لَكُمْ عِلْمٌ بِمَا تَعْمَلُونَ اور جس طرح کہ تم نے ان کو پیدا کیا اب عزت کی مخالفت اس طرح ہے کہ تمام امامیہ ائمہ سے یہ روایات بیان کی ہیں، بندوں کے عمل اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، چنانچہ شارحِ عدۃ اور دوسروں نے ان روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں یہ لوگ خود اپنے خیال کے موافق ائمہ کے خلاف اعتقاد رکھتے ہیں، اور ان ہی جیسے چند دوسروں کی گواہی کے علاوہ ان کے پاس

اغراض سے بچاؤ اور نجات کی کوئی جگہ نہیں

یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا خالق مان لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ ثواب و عقاب اور جزا و سب باطل و بیکار ہو جائیں کیونکہ بندوں کو اپنے اعمال میں اختیار رکھا رہا اور کسی ایسے شخص کو ایسے فعل و عمل پر سزا دینا

جس میں اس کو کوئی دخل نہ ہو سراسر ظلم ہے!

اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا خالق مانتے ہوئے، ثواب و عقاب و جزاء کے معاملہ کو خود شیعوں کے اصول اور ائمہ کی روایات کے مطابق ہم دو طرح ثبات کئے دیتے ہیں،

طریق اولیٰ: ہر شخص کے افعال و اعمال کی جزا اس علم و اندازہ الہی کے موافق ہے جو اس شخص کے حق میں ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ یہ خوب جانتے ہیں کہ اگر بندہ کے افعال و اعمال خود انہیں پر پھوڑ دوں اور ان اعمال کی پیدائش ان ہی کے سپرد کروں تو فلاں شخص طاعت کرے گا اور فلاں معصیت فلاں ایمان لائے گا اور فلاں کفر کرے گا۔ اور اس علم و اندازہ الہی کی علامت و نشانی بندوں کو بھی بتادی اور وہ نفس انسانی کی خواہش اور رجحان ہے لہذا مومن ایمان کی طرف جھکے گا اور کافر کفر کی طرف۔

اہل طاعت کی طرف اور اہل فسق فسق کی طرف بہر شخص اپنے دل میں ہی جانتا ہے جو اللہ تعالیٰ اس کے
ملاقات سے کرانا چاہتا ہے تو گو بانک و بد کی جزا علم الہی پر ہے، اگر بندوں کی ایبادت انہیں کے سپرد ہوتی تو وہ
اگرچہ حقیقتاً ان کے خالق نہ ہوتے تو تقدیراً تو ہوتے ہی۔ مثلاً اگر کافر کو افعال کی پیدائش کی قدرت ہوتی تو وہ کفر ہی پہلے کرتا
اور اگر مومن کو قدرت بخشی جاتی تو وہ ایمان کی بنیاد ڈالتا۔ یہی حال دوسرے اعمال و افعال میں ہوتا۔ اور اپنے علم کے موافق
بدلہ و صلہ دینا شیعوں کے نزدیک بھی علم نہیں ہے اس لئے کہ کفار کے بچوں کی جزا امامیہ کے نزدیک بالاتفاق اسی طریقہ
کے موافق تو ہے جیسا کہ ابن بابویہ نے عبد اللہ بن یسار سے روایت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔

قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ هُنَّ طِفْلٌ الشَّكِينِ
 قَبْلَ أَنْ يُلْبَسُوا الْحَنْبَ قَالَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا
 بَابِ مَرْغَمِ وَهِيَ الْوَهْمُ بِمَنْ يَنْتَهِي كَسِي

اسی طرح وسب بن وہب نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ابی عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ "کافروں کی اولادیں دوزخ میں ہیں"

تو جب معصوم بچوں کو عذاب صرف اس لئے ہو گا کہ وہ علم الہی میں کافرونا فرمان ہونے والا تھا، حالانکہ ابھی اس میں خواہش دلی یا رغبت نفس کی کوئی نشانی ظاہر بھی نہ ہوئی تھی پھر بھی یہ عذاب ظلم قرار نہیں دیا گیا تو بندے کے اس فعل پر جس کو وہ اپنی خواہش اور ارادہ سے پیدا کرتا ہے اس نے بندہ بھی بوقت قدرت اسی فعل کو پیدا کرتے ظلم کیوں اور کس لئے ہو گا اگر ائمہ کی روایات میں یہ سب کچھ وضاحت سے آگیا ہے،

اور کلینی ابن بابویہ اور ان میں سے دوسرے حضرات ائمہ سے یوں روایت کرتے ہیں، اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ بَعْضَ عِبَادِهِ سَعِيْدًا وَبَعْضَ عِبَادِهِ مُسْقِيًا يَعْلَمُوْنَ لَمَّا كَانُوْا يَعْشَوْنَ (اللہ نے بعض بندوں کو نیک بخت اور بعض کو بر بخت پیدا کیا اپنے اس علم کی وجہ سے جو ان کے آنے والے عملوں سے متعلق تھا) لفظ کَانُوْا پر غور کرو کہ صاف فرمن و تقدیر کو ظاہر کرتا ہے، پھر کلینی اور دوسرے امامیہ نے ابو بصیر سے جو روایت کی ہے وہ یہ ہے،

اَنَّهُ قَالَ كُنْتُ بَيْنَ يَدَيْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَهُوَ كَتَبَ لِي فِي ابْنِ عَبْدِ الرَّثَكِ بِاسْمِ مَعْصُومٍ أَنَّهُ لَا يُؤْتَى بِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ

والے نے ان سے پوچھا کہ ابن رسول اللہ میں آپ پر قربان گنہگاروں کو یہ بد بختی کیسے نصیب ہوئی کہ ان کو اللہ کے علم میں ان کے عملوں پر عذاب کا حکم لگایا گیا ابو عبد اللہ نے جواباً کہا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ اس کے حق کی وجہ سے متعلق نہیں ہوتا پس جب اس نے حکم دیا تو اہل محبت کو ان کی طاعت کی قوت بخشی اور جس حقیقت کے وہ اہل ہیں اس کا جو بھراس سے ہلکا کیا۔ اسی طرح اہل معصیت کو ان کی نافرمانی کی قوت نصیب کی اس علم کے باعث جو ان کے بارے میں پہلے سے قائم ہو چکا تھا اور قبول طاعت سے ان کو روکا اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے آئندہ کے علم سے انحراف نہ کر سکے اور ایسی حالت پیدا نہ کر سکے کہ اس کے طلب کے اور یہ ایک بھیدا ہے،

جَا لِسَا تَسْأَلُكَ سَائِلٌ فَقَالَ جُعِلْتُ فِدَاكَ يَا ابْنَ رَسُولِ اللَّهِ مِنْ ابْنِ الْحَقِّ الشَّافِعِ بِأَهْلِ الْمُعْصِيَةِ هُنَّ حَكَمَهُ لَقَدْ يَا لَعَنَ ابْنُ عَلِيٍّ عَلَيْهِمْ فِي عَلَيْهِ فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ أَيُّهَا السَّائِلُ عِلْمُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَفُوتُ لَكَ أَحَدٌ مِنْ خَلْقِهِ بِحَقِّهِ فَلَمَّا حَكَمَ بَيْنَكَ وَهَبَ لَكَ هَلِ مُحِبَّةُ الْقُوَّةِ عَلَى طَاعَتِهِ وَوَعَدَ عَنْهُمْ ثِقَتُ الْعَصْرِ بِحَقِّقَتِهِ مَا هُوَ أَهْلُهُ وَوَهَبَ لِأَهْلِ الْمُعْصِيَةِ الْقُوَّةَ عَلَى تَعْيِيدِهِمْ لِسَبْقِ عَلَيْهِمْ فِيهِمْ وَمَنْعَهُمْ طَاعَةَ الْقَبُولِ وَمَنْعَهُمْ فَوَاقِفًا مِمَّا سَبَقَ لَهُمْ فِيهِ عَلَيْهِ تَعَالَى وَلَمْ يَفُوتُوا أَنْ تَيَسَّرَ هَذَا تَعْيِيدِهِمْ مِنْ عَذَابِهِمْ إِنْ هُوَ عَلَيْهِ أَوْ لِي بِحَقِّقَةِ التَّصْدِيقِ وَهُوَ مُعْنَى سَاءَ مَا شَاءَ وَهُوَ سَيِّئًا -

اور کلینی نے منصور بن حازم سے اور اس نے ابی عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پیدا کرنے سے پہلے نیک بنی اور بد بنی کو پیدا کیا۔ پس جن کو اس نے نیک بنیت کیا اس سے کبھی بغض نہ رکھا، اگر اس نے کوئی بُرا عمل کیا تو اس کے عمل کو بُری نظر سے دیکھا، اس طرح جن کو بد بنیت کیا تو اس سے کبھی محبت نہ کی اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا تو اس کے عمل کو اچھی نظر سے دیکھا۔

اور اگر ایسے عمل کے پیدا کرنے پر جو زندہ کی خواہش کے مطابق ہو جزا دینا ظلم ٹھیکرے تو چاہیے کہ نفس اور اس میں اس کے قوی کی پیدا نش اور پھر اس پر شیطان کا تسلط اور مہربانی اور قبول حق سے باز رکھا بھی اس کے حق میں ظلم ہو حالانکہ اس کا ثبوت گزشتہ روایات کے ان الفاظ سے وَوَهَبَ لَكَ قُوَّةَ الْمُعْصِيَةِ الخ سے صاف ظاہر ہے، اسی طرح جناب ابو عبد اللہ کی مذکورہ المصدر روایات سے جس میں یہ ہے کہ جب اللہ کسی بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل کے کان بند کر دیتا ہے۔

چتہ چلتا ہے کہ بندے کے ساتھ ایسا معاملہ اس کو فعل معصیت پر مجبور و مضطر کرتا ہے اور اس سے طاعت و بندگی کی قوت سلب کر لیتا ہے،

دوسری بات یہ کہ جزا نفس کی خواہش اور میلان پر موقوف ہے جو عمل کے ساتھ ہوتا ہے وہ عمل خیر ہو یا شر نہ کہ عمل پر تا کہ اس میں بندہ کے عمل دخل کا سوال اٹھے اس لئے بھول چوک خطا اور مجبوری کو معاف فرمایا اگرچہ ان حالات میں شر بندہ ہی سے سرزد ہوا ہے، لیکن چونکہ میلان نفس اور خواہش نہیں ہوتی اس لئے جزا کا دار و مدار خیر و

شرکی نیت پر رکھا۔ گو عمل نہ سرزد ہوا۔

اور کافی میں مسکونی سے ابو عبد اللہ سے یوں روایت نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ كُنْزُهُ تَمِينٌ مَسْلُومٌ وَنِيَّةُ الْكَافِرِ شَرٌّ مِّنْ حَمَلَةٍ**، مومن کی نیت اس کے عمل سے جلی ہے اور کافر کی نیت اس کے عمل سے بری ہے، اور اسی خیر و شر پر جزا کا دار و مدار ہے،

اور اسی کتاب کافی میں ابو بصیر سے اس معنون کی روایت کی گئی ہے کہ

إِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيرَ لَيَقْدِرُ عَلَى مَا تَبَاهَى الرُّزُقِيُّ حَتَّى أَفْضَلَ كَذَا كَذَا مِنْ الْبُتْرِ وَوُجُوهِ الْغُبَرِ كَمَا ذَا عَيْبِ اللَّهِ ذَا بَيْتٍ مِنْهُ بِمَعْنَى نِيَّتِهِ كَتَبَ اللَّهُ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ مَا كُنْتُ وَكَوْنُهُ

ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک مومن بندہ فقیر اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے کہ ترجمہ مال و رزق فراخ عطا فرمائے تو میں یہ یہ عبادائی کے کام کروں جب اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کی نیت کی سہائی کو جان لیتا ہے تو اس کے لئے وہ اجر

کھدیتا ہے، جو اس کے عمل پر لکھا جب وہ عمل کر گزرتا۔

اسی لئے ریا اور دکھاوے کو۔ عمل کا ضائع اور برباد کرنے والا کہا گیا ہے چنانچہ کلینی نے باب الریاء میں بڑی تفصیل و وضاحت سے بیان کیا ہے منجملہ ان کے ایک وہ روایت بھی ہے جو علید بن خلیفہ کے واسطے سے ابو عبد اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ **كُلُّ رِيَاءٍ شَرٌّ إِنَّهُ مِنْ عَمَلِ النَّاسِ كَانَ ثَوَابُهُ عَلَى النَّاسِ وَمِنْ عَمَلِ اللَّهِ كَانَ ثَوَابُهُ عَلَى اللَّهِ** ہر ریا اور دکھاوا شرک ہے جس نے لوگوں کے لئے عمل کیا تو اس کا ثواب (دنیا، لوگوں پر ہے اور جس نے اللہ کے لئے عمل کیا تو اس عمل کا اجر اللہ پر ہے۔)

اسی طرح ایک متفق علیہ روایت میں ندامت کو توبہ کہا گیا ہے، لہذا معلوم ہوا کہ عمل کی تاثیر کا دار و مدار قلبی خواہش پر ہے اور جب ندامت میں قلب کی خواہش باقی نہ رہی تو اس کا اثر بھی جاتا رہا اگرچہ طویل مدت اور بڑے نقصان کے بعد ایسا ہوا۔

اور کلینی میں خباب ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے آپ نے فرمایا،

إِنَّ التَّوَجَّلَ يَنْتَرِبُ فَيَدْخُلُهُ اللَّهُ بِهِ الْجَنَّةَ قُلْتُ يَدْخُلُهُ اللَّهُ بِأَلَا ذَاكَ الْجَنَّةَ قَالَ نَعَمْ إِنَّهُ يَنْتَرِبُ فَلَا يَزَالُ مِنْهُ خَائِفًا مَا تَنَأَى نَفْسُهُ فَيُزَحِّمُ لَهُ اللَّهُ فَيَدْخُلُهُ الْجَنَّةَ

آدمی گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس گناہ کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے راوی نے تعجب سے پوچھا کیا گناہ کی وجہ سے اسے جنت میں داخل کیا جاتا ہے کہا ہاں! وہ گناہ تو کر بیٹھتا ہے مگر پھر لرزتا تا کہ پتہ پتا

ہے اور اپنے آپ سے بیزار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس پر رحم آتا ہے اور اس کو جنت میں بھیج دیتا ہے

تو چونکہ جزا کا دار و مدار نیت میلان نفس اور دل کی رضامندی پر ہوا لہذا اگر اللہ تعالیٰ بندہ کے ارادہ سے اور خواہش کے مطابق بندے کے افعال پیدا کرے اور اس پر جزا و بدلہ دے تو یہ ظلم کیسے ہوا۔

ہاں اس وقت تو ظلم ہو سکتا تھا کہ بندوں کے افعال ان کے ارادے اور خواہش سے پہلے وجود میں آجاتے جیسے جلالت کے افعال، شے آگ کا جلنا، زہر کا قاتل ہونا، اور تلوار کا کاٹ کرنا اور جب کسی کے افعال خود ان کے ارادے کے تابع ہوں اور ان کے بعد وجود میں آئیں، تو ان میں صاحب ارادہ کا دخل ہو گیا تو ان کو جزا کی شکل میں اس کا مزہ بھی

چکھنا پڑا اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے، کہ کسب و اختیار سے بھی معنی مراد ہیں،
اب بحث طلب یہ بات ہے کہ یہ خواہش اور میلان کس کی ایجاد سے ظاہر ہے بندہ تو قدرت الہیہ سے محروم ہے
اور اگر اللہ تعالیٰ اس خواہش کو بھی پیدا کرے تو وہ اس خواہش پر گرفت کیوں کرے اور اس پر جزا کیوں دے اس
کا جواب یہ ہے کہ شبہ تو اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے جبکہ بندوں کے افعال کا علقہ بندوں کو انہیں، جیسا کہ شیعوں
کا خیال ہے اب اس کے جواب کی فکر شیعوں کو بھی کرنی چاہیے اس لئے کہ سب کے نزدیک یہ ظاہر ہے کہ تمام اسباب و اوقات
بلکہ نسل کے سرزد ہونے کے جملہ اسباب، خواہ قدرت، خواہ قوت، خواہ حواس و اعضا، حتیٰ کہ خود بندہ کی ذات
بھی جبران افعال و اعمال کا سرچشمہ اور مرکز ہے اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں بندہ کا ان میں کوئی دخل نہیں،
اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جب کسی نسل میں اختیار کا دخل ہوگا وہ فعل اختیاری ہوگا اور اضطراب و مجبوری
کی حد سے نکل گیا اور جب اختیاری ہو تو تعریف و برائی کا ہدف بنا اور ثواب و عقاب کا سبب قرار پایا اور اختیار
کا خود اپنے اختیار سے پیدا ہونا اور حقیقت محال و ناممکن ہے ورنہ تسلسل لازم آئے گا،
اب جب کہ کسی دوسرے میں اختیار پیدا کرنے کی قدرت ہلکا ہر فطر نہیں آتی تو عقل کے لئے محض قیاس کے ذریعہ
یہ سمجھ لینا دشوار ہوا البتہ وہم کی آلودگیوں اور طبعی بندشوں سے نجات پا کر وہ اتنا ضرور کرتی ہے کہ فعل کی اختیاریت
وجود اختیار پر معروف ہے مگر ایجاد فعل یا ایجاد اختیار پر شبہ کسی کا غلام فرار ہونا چاہتا ہے دوسرا آدمی خواہ غلام
کے حکم و دباؤ سے یا خود کسی ذریعہ سے اس کی ہشک پا کر اس غلام کو اس کی منزل مقصود پہ پہنچا دیتا ہے تو یہ فرار عقل تو
اس غلام کی طرف منسوب ہوگا اگرچہ اس نسل کا وجود و تکمیل دوسرے کی مدد سے ہوئی مگر خواہش قلب تو بہر حال غلام ہی
کی تھی،

اب اہل سنت و اہل تشیع کے اعتقاد میں فرق اس قدر ہے کہ اہل سنت بندہ کے اختیار کو ادنیٰ سے محروم مانے
سے فعل الہی سے گھرا ہوا مانتے ہیں، اور یہ ہے یوں کہ اختیار، ارادہ، خواہش اور میلان نفس کی پیدائش بھی اسی کی
طرف سے مانتے ہیں، اور نیچے سے یعنی فعل کی پیدائش بھی اسی کی جانب سے، اور شیعہ اور پرک جانب میں تو اہل سنت
سے متفق ہیں مگر فعل کے بارے میں مختلف خیال ہو کر کہتے ہیں کہ فعل تو اسی کا کام ہے،
یہاں اگر کسی کام میں عقل ہو تو ذرا گہرائی میں اتر کر غور کرے کہ جب اختیار دوسرے کے ہاتھ میں آگئی تو یہ کھلا
جبر ہوا اور جزاء، ثواب و عقاب میں وہی اشکالی پھر ٹوٹ آیا تو پھر اس میں کیا مزیداری ہے کہ اوپر کے حکم صریح کو
چھوڑا جو ممکن سے ایجاد فعل کو محال بنا تا ہے اور اسی شیطانی دلدل میں پھر ٹوٹے کھانے لگے۔

اور اہل سابق میں صاحب حاسن برقی اور کلینی کی یہ روایت جناب ابی حننہ کا ظلم سے بیان ہو چکی ہے کہ روایت
کینی اَللّٰہُ مَا شَاءَ اللّٰہُ وَاَسَاَدَا، کوئی چیز اللہ کی مشیت و ارادہ کے بغیر نہیں ہوتی،

اور تعجب تو علماء امامیہ کی علم و دانش پر آتا ہے کہ قرآن کی واضح اور صاف آیات سے انھیں بند کر لیں، انہی کی معیہ
امادیث سے منہ موڑا اور اپنے اعتقاد کی بنیاد رکھی بھی تو ایک جاہل شاعر کے قول پر اور یوں قرآن کی اس آیت کے معنی
مصدق بنے وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں،

شریف مصلحی نے غرر والدر میں ثوری سے اور اس نے ابی عییدہ سے اس معنوی کی روایت کی ہے کہ،

قَالَ لِحَقِّمَ رَأْيِيَّةَ ذُو الرِّمَّةِ عِنْدَ هِلَالِ بْنِ أَبِي
بُرْدَةَ فَقَالَ سَوِيَّةٌ وَاللَّهِ مَا تَقْصُ مَا يُرْتَضَى مَا وَدَّ
تَقْرَأُ مَعِ سَبْعَةَ ذُرِّ مَوْصِلًا لَا يَفْصَأُ رَمَقٌ وَاللَّهِ وَكَذَلِكَ
فَقَالَ لَهُ ذُو الرِّمَّةِ وَاللَّهِ مَا قَدَّرَ اللَّهُ عَلَى الذَّنْبِ
أَنْ يَأْكُلَ حُلَّةً بَنَةً عِيَالٍ حَيْثُ أُنْذِرَ قَالَ رَأْيِيَّةَ أَنْ يَفْصَأَ رَمَقٌ
أَلَمْ يَأْكُلْ هَذَا أَكْبَدَ عَلَى الذَّنْبِ فَقَالَ ذُو الرِّمَّةِ الْكُذِبُ
عَلَى الذَّنْبِ خَيْرٌ مِنَ الْكُذِبِ عَلَى سَبِّ الذَّنْبِ تَكَانَ
الْمُرْتَضَى هَذَا الْخَيْرُ صَرِيحٌ فِي تَوَلُّهِ بِاللَّهِ وَاجْتِنَابِهِ
عَلَيْهِ وَنَصْرِهِ لَكَ أَنْتَ بِي كَلَامُ الْمُرْتَضَى

روایت اور ذوالریمہ (دشمن) ہلال بن ابی بردہ کے پاس
بیٹھے ہوئے آپس میں جھگڑ پڑے، روایت نے کہا کہ مذکورہ قسم
نہ کوئی دیندار بھٹے بناتا ہے نہ کوئی پرندہ گھونسا مگر
مذکورہ حکم و اندازہ کے ساتھ اس پر ذوالریمہ بولا خدا کی
قسم اللہ نے یہ تقریر نہیں کی کہ بھیڑ یا تیرے پڑوسی کے بال
بچوں کی دودھ دیتی بکریاں بھڑکھائے۔ روایت نے کہا
تو کی بھر بھیڑ یا ان کو اپنے اُتیار سے کھا گیا؟ یہ تو بھیڑیے
پر جھوٹ لگانا ہوا۔ اس پر ذوالریمہ نے جواب دیا
کہ بھیڑیے پر جھوٹ باندھنا بھیڑیے کے رب پر جھوٹ

باندھنے سے بہتر ہے، مرتضیٰ نے کہا کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اس نے انصاف کو مانا حجت کو تسلیم کیا اور اس مذکورہ باور کیا،
اب یہاں غور کرنے کی بات ہے کہ شیعوں کے عاقلوں اور دانشمندوں نے ذوالریمہ کے لغو اور پوچ اور سراسر
کھڑاس پر کیسے کان دھریا اور دل میں اس کو جگہ دے لی اور اس کو اس اور بڑے اس کی مدح سرائی کیسے کی اور شاہان کیوں
وسی وہ اتنا نہیں سمجھے کہ ذوالریمہ ایک دیہاتی شاعر کو جسے بول و براز صحیح طریقہ پر کر سکی بھی نہیں۔ ایسے گہرے الہی مطالب
سے کیا واسطہ اور کیا مناسبت!

اور اتنے اہم اعتقادی مسائل میں اعتماد کر کے اس کو اپنا پیشوا بنانا کس حد تک منہ دار ہے۔ جب کہ اس کا کلام
درحقیقت نہایت بے بنیاد اور بے معنی ہے، کیونکہ بکریوں کے گوشت کو بھیڑیے کی غذا بنانا بکریوں کو شکار کرنے
کی طاقت اس کو بخش کر ایسے قوی و خورخوار کو ایسے کمزور پر مسلط کرنا بکریوں کو مار ڈالنے اور نہ بھی کر دینے کا جذبہ
اس کے دل میں پیدا کرنا اور پھر اس کو اس قدر دہونے کی قدرت دینا آخر یہ سب کس کا کام ہے اور شیعوں کے اصول پر
یہ سب کھلا ظلم ہے!

اور پھر شریف مرتضیٰ نے اصمعی سے اور اس نے اسحاق بن سیرید سے روایت کی ہے کہ ذوالریمہ نے محمد کو یہ
شعر سنایا۔

وَعَيْنَانِ قَالَ اللَّهُ مُؤَنَّا فَتَنَّا فَعَزَّكَ بَالُ لَهَابٍ مَا يَلْعَلُ الْخَسْرُ فَقُلْتُ فَعُولَيْنِ خَيْرٌ مِنَ الْكُذِبِ فَقَالَ أَوْ
شُحْتُ أَوْ بَحْتُ - رَأْسًا قُلْتُ عَيْنَانِ فَعُولَانِ فَوَصَفْتُهُمَا بِذَلِكَ - قَالَ الْمُرْتَضَى إِنَّمَا تَحْتَرِّ ذُو الرِّمَّةِ بِلَهَابِ الْكَلَامِ
مِنْ الْعُزْلَةِ جَلَدِي - رَأْسًا قُلْتُ كَلَامُهُ -

ترجمہ شعر۔ اور دونوں آنکھوں کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جو باؤ تو وہ ہو گئیں، عقلوں میں شراب کا سا کام کرنے والیں۔
اولیٰ کہتا ہے، میں نے اس سے کہا فحولین کہو کہ یہ کون کی خبر ہے (جو منسوب ہوئی چاہئے) تو اس نے جواب دیا۔
کہ تو اگر بوڑھا ہو تا تو تجربہ کار، تو تجھے اس تنگ پر ملامت کی جاتی۔ پھر کہا میں نے فحولان کو عینان کی صفت باندھا ہے
اس پر مرتضیٰ نے کہا کہ ذوالریمہ اس تاویل سے ناواقف بات سے بچ گیا۔

شریف مرتضیٰ پر حیرت ہے اور سخت حیرت کہ اس نے ذوالریمہ کے اس کلام سے یہ عقیدہ سمجھا لیا کہ ذوالریمہ

کا مقصد یہ ہے کہ اگر فطری کو میں کان کی خبر بتاتا تو کلام کی غرض بظاہر یہ معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے محبوب کی دونوں آنکھوں کو فتنہ ساز جادوگر اور عقل ربانیا سے، حالانکہ یہ معنی یہاں پیش نظر نہیں اور جس صورت میں کان کو تمامہ لایا اور فعلان کو عینان کی صفت ٹھہرایا تو کلام کی غرض بالاسالت محبوب کی دونوں آنکھوں کی فتنہ پرداز جادوگری اور عقل ربائی بنی،

اور یہ معنی مد نظر ہیں اور مطلب میں بھی بلند پایہ! اور اس قادیل عبارت سے اس کا ارشاد بھی ملا کہ محبوب کی دونوں آنکھوں کے نہ تو ادے میں یہ صلاحیت تھی کہ یہ صورت از خود اختیار کرے اور نہ مسرور قدرت میں یہ طاقت کراس صورت کی نقش نگاری کر سکے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت خاص سے اور اپنے حکمتی امر سے بنفس نفیس ان کو پیدا کیا۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ شریف مرتضیٰ شاعر بھی میں) کس جنگل میں جھٹک رہا ہے اور اسی سے اس بلند پایہ عالم کی شعر سبکی کا بھرم بھی کھلا، پھر فطرت لانے پر بھی خلاف عدل سے بچا جاسکتا تھا، کیونکہ اس صورت میں بھی فتنہ اور سحر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ محبوب کی آنکھوں کی طرف ہے اور جادوگر یا فتنہ پرداز کو جادوگر یا فتنہ پرداز بنانا کسی کے نزدیک خلاف عدل نہیں، اگر خلاف عدل ہے تو وہ جادوگری اور فتنہ پرداز ہی ہے، اور اگر نظر غائر دیکھیں تو رقع کی صورت میں بھی ان کے اعتقاد کے بموجب باعتبار معنی خلاف عدل لازم آتا ہے، کیونکہ کوئی نہیں کہتا کہ شراب نشہ کے لئے خالق ہے اور محبوب کی آنکھ عاشق کے دل میں عشق و جہن کی خالق۔ مگر بے شک شریف مرتضیٰ کی فہم بتا رہی ہے کہ شراب اور محبوب کی آنکھ جو اعراض کی موجودات ہیں ہیں خالق ہیں۔ اور یوں یہ دونوں چیزیں پروردگار کی شریک کار ہو گئیں، حالانکہ امامیہ بھی حیرانات میں اشراک کے قائل ہیں نہ جمادات میں۔ شاعر کا کلام صرف مبالغہ آرائی ہے، حقیقی معنوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ یہاں مراد ہیں،

یہاں شریف مرتضیٰ کا یہ کلام لانا اور اس پر رد و قدح کرنا گویا بیکار سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے نقل کرنے سے ہمارا صرف یہ مقصد ہے کہ ان کے بزرگوں اور بزرگوں کی فہم و دانش سے پروردگار اٹھایا جائے اور ان کی دقیقہ بینی سے سب کو باخبر کر دیا جائے کہ یہ ایک دیہاتی کے ایک شعر کے سمجھنے میں کتنے بے دست و پا ہو کر کیسی دلدل میں پھنس گئے ہیں، اور پھر اس پر ایسی ہدایات کا گفتگو کی جسے نرم سے نرم الفاظ میں مضحکہ خیز ہی کہا جاسکتا ہے اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ اسی کو سارے شیعوں نے علم الہدیٰ کے خطاب سے نوازا اور اپنے دین و ایمان کی بنیاد اس کی عقل و رائے پر رکھی،

حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ عقیدہ جو سی زندقوں سے لیا گیا ہے۔ جو شر و برائی کا خالق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مانتے اور اس کو الٰہیت میں خدا کا شریک مانتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ مجوس نے صرف ایک ہستی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا اور یہ سچ چینی اور ناپاک کتے اور گورھے تک کو بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ خلق و ایجاد میں شریک قدرت جانتے ہیں، اللہ ایسی بد عقیدگی سے اپنی پناہیں رکھے،

اور شیعوں میں سے فقہانہ فرقہ اس کا قائل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور علی رضی اللہ عنہ۔ دنیا کی پیدائش میں اس کے شریک کار ہیں جیسا کہ تفصیل باب اول میں گذر چکا ہے اور اسامیہ فلسفہ کی طرح ایجاد عالم میں عقلی و نفوس

ہے اس نے جناب ابی ہریرہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بہن کنبرا میں فرمایا اِنَّا
 اٰلَہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَّا فَکُنْتَ الْخَیْرُ وَکَانَ فُلُوْجٌ لِّکُنْ اَسْبَحْتَ عَلٰی یَدِیْہِ الْخَبْرِ وَرَبِّکُنْ اَجَبْتَ عَلٰی یَدِیْہِ
 الْمَلٰئِکَۃِ وَرَجَعْتَ اَدْرَکُور ہوا۔

اس غرض کی، درحقیقت یہ صحیح روایت ہے جو ان لوگوں کے کانوں میں موجود رہی جو کتب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول کرتے
 ہیں ان روایات میں آپ نے دیگر لیا کہ ائمہ کرام ان کا جواب کی روایت کے متعلق کو کتبہ، سناؤں سے بحیثیتہ کلام الہی
 نقل فرمائے ہیں۔

لیکن تاہم یہ سنا کر بھی کچھ بند کر کے ان سب روایات کے علی الرغم شروحات کتب کو ابلیس اور بن لوطی
 کا پیدا کر دیا، ماننے ہیں اور کاش وہ اس پر یقین کرتے، وہ نونام خیرات و حسنات اور طاعات و عبادات پر اپنی طرف منسوب
 کر لیتے ہیں اور یوں تمام چیزوں سے خالق کائنات کو بے دخل کر دیتے ہیں، اسما ملک ہذا بہتان عظیم۔
 ان کے دانشمندان اور علمائے ان روایات کی تاویلات میں بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے ہیں لیکن ان کو کتاب
 و عصمت کی غمازت کے بند سے لٹکان اور نجات کا کنرہ پادینا شیب نہیں ہوا ان میں سے ایک مفسر کا کلام بطور نمونہ یہاں
 نقل کرتے ہیں تاکہ ان کی خوش فہمی اور بلیغ علی، عالم آشکارا ہو جائے۔

وہ کہتا ہے کہ خیر سے مراد مرغوب صبح اور شر سے مراد مکروہ صبح ہے، ایمان و کفر اور طاعت و معصیت نہیں۔
 ہم کہتے ہیں کہ اول تو اس بات کو خور کلام کا آئینہ حصہ رد کرتا ہے، اس لئے کہ فرمایا ہے، اَسْلُوْا لَیِّنْ اَخْبِرْ سَلْمَ
 فوریہ خیر و شر بندوں کے لحاظ پر اس طرح جاری ہو سکتے ہیں، اور پھر چلنے مان بھی لیں فوراً اس قسم کے خیر و شر پر طرب اور دلیل
 کے الفاظ کیا مینے رکھتے ہیں۔

اگر کسی کے گھر میں کوئی حسینہ سہری والی ہو اور وہ مرغوب علی ہو گئی ہو تو صاحب خانہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوش حال
 اور مبارک باد کا مستحق کیوں ہے اگر کسی بادشاہ کے سامنے کوئی مجلس اور کمریہ المظفر شخص جو مکرمہ الطبع ہو تو اس کی
 وجہ سے وہ بادشاہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دلیل ہلاکی اور مغرب کا کیوں سزاوار قرار پائے،

دوسری بات یہ کہ گناہ بھی دوسم کے ہوتے ہیں ایک مرغوب الطبع ایک مکروہ الطبع کسی حسینہ سے زنا میں دل
 خوش اور رغب ہوتا ہے۔ جب کہ کمریہ المظفر اس کے سے فتنہ ہم نہیں میں دل فرحت کرتا ہے اسی طرح نفرت و حسانت
 بھی دوسم کی ہوتی ہیں مثلاً موسم گرما میں ٹھنڈے پانی سے وضو اور غسل باعث فرحت ہوتا ہے مگر گرمی کی سردی
 سے نہ پانی سے وضو اور غسل سے طبیعت بھاگتی ہے، تو پھر خیر و شر مذکورہ تفسیر و تاویل سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا نہ کوئی
 مزید نکتہ سمجھا گیا ان کے جوہر سے پہلے سمجھے جانے لے تاویلی کے بعد بھی وہی سمجھے گئے، اور جو اعتراض و اشکال یا تشکیک پہلے
 تھا، وہ اب بھی باقی ہے ان دونوں حکموں کا مفہوم، طاعت و معصیت کفر و ایمان کے ضد قورہ ہو کہ اس مفہوم کے ارادے
 سے ان کی فتن ہو جائے بلکہ یہ منہی قرآن سے عام ہیں اور عام معنی کا مراد لینا منہی خاص کو اس حکم میں داخل کر دیتا ہے جس
 کا منقح عام سے ہے،

ان کے علماء اپنے جہاں کو بہلانے کے لئے الفاظ کے اس نام کے طور پر مینا بناتے ہیں، تاکہ معاش کا سلسلہ جاری رہے،
 قائم رہے۔ فقہائے اہل سنت کے سرگرم اور امام اعظم جناب ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ۔

قُلْتُ رَدَّ عَلَيَّ عَبْدُ اللَّهِ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا أَبَا
سَؤْلٍ اللَّهُ هَلْ قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَقَالَ اللَّهُ
أَجَبْتُ مِنْ أَنْ يُقَرَّبَ إِلَيَّ الرَّبُّ يُقَرَّبَ إِلَيَّ الْعِبَادُ فَقُلْتُ هَلْ
جَبَدَ هَهُ عَلَى ذَلِكَ فَقَالَ اللَّهُ أَعَدَلْتُ مِنْ أَنْ يُجَبَّدَ هَهُ
عَلَى ذَلِكَ فَقُلْتُ فَيَكُنْ ذَلِكَ فَقَالَ بَلَيْنَ بَلَيْنَ لَا جَبَدَ
وَلَا تَغْوِي بَلَيْنَ وَلَا كَرِهَ وَلَا تَسْتَنْبِطَ -

میں نے جناب ابو عبد اللہ جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ سے
ورایت کیا کہ اے ابن رسول اللہ اے اللہ علیہ وسلم کیا اللہ
تعالیٰ نے کام کو بندوں کے سپرد کر دیا ہے؟ آپ نے جواباً
فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ وہ اپنی ربوبیت
کا کام بندوں کے سپرد کرے اس پر میں نے پوچھا تو کیسے
نے ان کو اس پر مجبور کیا ہے؟ تو فرمایا کہ یہ اس کے عدل
انصاف کے خلاف ہے کہ وہ ان کو مجبور کرے؛ میں نے کہا اس کے علاوہ کیا صورت ہے، فرمایا صورت بیچ بیچ کی ہے

کہ نہ بالکل مجبور کیا ہے اور نہ بالکل انہی کے سپرد کر دیا ہے
چنانچہ اہل سنت کے مذہب کی بنیاد ہی روایت ہے وہ تعلیفی امور کی بندوں سے نفی، اور کسب و عمل ان کے لئے
ثابت کرتے ہیں اور یہ اعتقاد جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد بالا کے عین مطابق ہے
اب اس روایت کو اثنا عشری شیعوں کی کتابوں سے بھی جانچ لیجئے تاکہ اہل سنت کا جھڑپ کھل جائے محمد
بن یعقوب کلینی نے جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، اِنَّهُ قَالَ لَا جَبَدَ وَلَا تَغْوِي
وَلَكِنْ اَمْرٌ بَيْنَ الْأَمْرَيْنِ انہوں نے فرمایا نہ جبر ہے نہ تغویٰ بلکہ معاملہ بین بین کا ہے نیز کلینی نے ابراہیم سے اور اس
نے ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت بیان کی ہے اور کلینی ہی نے ابی الحسن محمد بن رضا رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت
کی ہے وہ بھی ایسی ہی ہے،

چونکہ یہ تمام روایات اہل سنت کی روایت سے واضح طور پر متفق ہیں اس لئے شیعوں کے مالوں نے ان پر
تاویلات کا کھڑا چلا کر اپنے مطلب کے مطابق بنا ناپا ہا ہے اس لئے کہتے ہیں امر بین الامرین سے مراد قوت و قدرت
کا پیدا کرنا ہے اور فعل پر مجادینا ہے، نہ یہ کہ وہ افعال کی ایجاد میں دخل انداز ہو مگر یہ بھولے بادشاہ اتنا نہیں دیکھتے
کہ سائل نے پوچھا کیا ہے، جو بغیر سوچے سمجھے جواب کی کھینچ تان کر کے کہیں کا کہیں لے جانے کی سعی ناکام کر رہے ہیں کیونکہ
قوت و قدرت کے خلق کو سپرد کرنے نہ کرنے کا سوال کوئی عقلمند کڑی کیسے سکتا ہے یہ تو سامنے کی چیز اور ظاہر السلطان
ہے، جو کچھ جھگڑایا بحث ہے وہ خلقِ نفس میں ہے اس توجہ و تاویل سے تو وہ جناب ابی عبد اللہ کے جواب با صواب کو
لغو اور مہمل بنا رہے ہیں، اور اسی توجہ سے اس تغویٰ میں بحث و اعتراض کی غلط جہل کی توں موجود ہے اور آپ کے
وہی الفاظ اللہ عادل من ذلک بھی پیش نظر ہیں اور یہ بات بالکل صاف اور ظاہر ہے مثلاً ایک شخص اپنے دشمن کو جو
اسے قتل کر دینا چاہتا ہے یا بزدل خیر کر کے ایک مکان میں قید کر کے دیتا ہے، اب دوسرا دشمن آتا ہے، اسے قید سے
نکالتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں آزاد کرتا ہے اور اسے کہتا ہے تو اپنی مرضی کا خنثار اور آزاد ہے کوئی پابندی تجھ پر نہیں
یہی نہیں اپنا ایک خادم بھی اس کے ساتھ کر دیتا ہے کہ شخص اول کے قتل میں پوری پوری مدد دے جذبات سرد و پرجوش
نوازے گرائے اور قتل پر جھڑپ کا نئے ایسی صورت میں دوسرا دشمن پہلے شخص کے حق میں کھلا ظالم ہے،

اور ان سے بھی قطع نظر اہل سنت و خود شیعوں کی کتابوں سے واضح اور صاف روایات فراہم کر کے وہ ہتھیار اپنے
ہاتھ میں رکھتے ہیں جو ان کے شجر تاویلات کو جھڑپ سے اکھاڑ ڈالتا ہے ان میں سے ایک وہ روایت ہے جو امامیہ

ایک عالم صاحب الفضل نے فضول کتاب میں ابراہیم بن عیاش سے نقل کر کے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے، اور وہ یہ ہے،
 اِنَّهٗ قَالَ سَاَلْتُ جَبْرَئِيْلَ الْمُرْتَمَا عَلَیْهِ السَّلَامُ
 اَیْکَلِفُ اللّٰهُ الْعِبَادَ مَا لَا یُطِیْعُوْنَ فَقَالَ هُوَ اَعْدَلُ
 مِنْ ذٰلِکَ قَالَ فِیْقِدُ رَوْقَ عَلٰی الْفِعْلِ کَمَا یُرِیْدُ وَنَا
 قَالَ هٰذَا خِیْرٌ مِنْ ذٰلِکَ
 ارادہ کے مطابق کسی فعل پر قدرت رکھتے ہیں؛ آپ نے فرمایا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ عاجز و بے بس ہیں، یعنی مرضی کے مطابق فعل پر قادر نہیں،

اس روایت میں تو نفی قدرت نہایت واضح اور صاف طور پر موجود ہے اسی طرح نثر الدردر کتاب میں تحریر ہے،
 سَاَلْتُ الْفَضْلَ بْنَ سَهْلٍ عَلٰی بْنِ مُوسٰی الشَّرْحَ مَا
 عَلَیْهِ السَّلَامُ فِی تَحْلِیْلِ الْمَأْمُوْر فَقَالَ یَا اَمَّا
 الْحَسَنِ اَخْلَقَ یَجْبُرُوْنَ قَالَ اللّٰهُ اَعْدَلُ اَنْ یَّجْبُرَ کَیْ
 یُعْذِبَ قَالَ فَطُغٰنٌ قَالَ اللّٰهُ اَحْسَدُ مِنْ اَنْ
 یَّهْمَلَ عَبْدًا وَیُکَلِّهٖ اِلٰی نَفْسِهِ
 بڑی حکمت والا ہے وہ اپنے بندہ کو بیکار چھوڑ کر اس کے نفس کے حوالہ کیسے کرے،

کاش ان کے دانشوروں عالموں کو عقل سلیم سے بھی کچھ حصہ مل سکتا کہ گہری نظر سے یہ دیکھ لیتے کہ بندہ کو شر پر قدرت
 دے کر اس کو عذاب دینا تو ظلم ہے نیز یہ بھی سمجھ لیتے کہ خلق فعل اور خلق قدرت پر فعل میں کوئی فرق ہے یا نہیں،
 اگر کوئی شخص یقین سے جانتا ہے کہ حامد محمود کا جانی دشمن ہے اس کو قتل پر تلا ہوا ہے ہتھیار کی جتوئی ہے
 کہ کہیں سے مل جائے تو محمود کو بے دھڑک قتل کر دے یہ سب کچھ جانتے بوجھتے وہ شخص حامد کو تلوار دے دیتا ہے اور
 حامد اس سے محمود کو قتل کر دیتا ہے تو یہ شخص ہاشک محمود کے حق میں صریح ظلم کا مرتکب ہو گا۔

جب ان کے اس عقیدہ کی مخالفت حضرات ائمہ کے عقیدہ سے انہیں کی معتبر کتابوں سے ہر ممکن پہلو سے واضح
 اور آشکارا ہو گئی تو ان کی ہی معتبر کتابوں سے ان کے کچھ القاب و خطابات بھی سن لیجئے جو اس مخالفت کے سبب حضرات
 ائمہ کے کلام ارشاد الہیام پر مشتمل دو ایک روایات گوش گزار کر لیجئے تاکہ بات مزید وضاحت و انکشاف سے سامنے آجائے
 محمد بن بابویہ قمی کے کتاب التوحید میں صحیح اسناد کے ساتھ ابی عبد اللہ رحمہ اللہ علیہ سے یوں روایت کی ہے،

اِنَّهٗ قَالَ الْقَدَرُ بِکَ جَبُوْسٌ هٰذَا اَلْاَمْرُ اَمَّا دُوْا
 اَنْ یَّصِفُوْا اللّٰهَ یَعْدِلُ فَاَخْرَجُوْهُ مِنْ سُلْکَانِهِمْ
 وَفِیْهِمْ قَوْلٌ هٰذَا اَلْاَمْرُ - یَوْمَ یَسْجُوْنَ فِی النَّارِ
 عَلٰی وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرٍ اِنَّا کُلُّ شَیْءٍ
 خَلَقْنٰهُ یَقْدِرُ -
 آپ نے فرمایا قدرت یہ ایک فرقہ جو قدر کا منکر ہے، اس
 امت کے مجوسی ہیں، انہوں نے چاہا کہ اللہ کی صفت عدل
 سے بیان کریں (تو اس کو شمش) میں انہوں نے اس
 کے اقتیارات سلطنت ہی سلب کر لئے انہیں جیسے لوگوں
 کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس دن یہ منہ کے بل

دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے تو کہا جائے گا، اب دوزخ کا عذاب چکھو ہم نے ہر چیز کو ایک انداز سے پیدا کیا تھا،

وہ از روئے عقل اس کو بعید کہتے ہیں۔ یہ غائب کو نظر آنے والی چیز پر قیاس کرتے ہیں اور عادی جو عادتاً اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں، اور ظاہری الثبوت چیزوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں، اور یہ کتنی بڑی جسارت اور گستاخی ہے کہ آیات قرانہ کی اپنی عقل نارسا و ناکارہ کے ذریعہ تاویل کرتے اور ان کو ظاہری معنی سے پھیر دیتے ہیں، اور ان کے معانی و مطالب میں غور و فکر کی نوبت نہیں آنے دیتے۔

آیت **لَا تَدْرِي لَكَ الْآبَعَادُ** میں اور اک کی نفی ہے اور اک کے معنی دریافت کے ہیں روایت کی نفی اس آیت میں نہیں اور ایک عامی بھی جانتا ہے کہ اور اک اور ہے روایت اور اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی ان ظاہری آنکھوں سے دریافت نہیں ہوتی بلکہ عقل، اور غور و تامل سے ہوتی ہے،

اور بغیر منی حال اور اک کے معنی روایت ہی کے ہیں تو یہ نفی روایت بطور عادت کے ہے کہ جو کوئی چاہے اور جب چاہے اس کو دیکھ لے اس کی نفی ہے بلکہ جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ دکھا۔ نئے کوئی نہیں دیکھ سکتا اور عادت کی مطاقاً بغیر قید کے نفی کلام الہی میں موجود ہے،

جیسے **إِنَّهُ يَرَاكَ هَذَا وَتَقِينَهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَاهُ**۔ بے شک وہ اس کا نذر و کنہ نم کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ تم اس کو نہیں دیکھتے، شیاطین اور جنوں کا دیکھنا عادت کے خلاف سب کے نزدیک ثابت ہے۔

لہذا جب کفار نے فرشتوں کو دیکھنے کی درخواست کی تو اس کو بڑے اچھے کی اور بڑی انوکھی بات ظاہر فرمائی حالانکہ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور مرسلین بھی ان کو دیکھتے ہیں،

اور عزت سے اس عقیدہ کی مخالفت اس طرح ہے کہ ابن بابویہ کی ایک روایت بسند ابو نعیمہ پہلے گزر چکی ہے جس میں ایک سائل نے جناب ابی عبد اللہ سے پوچھا تھا کہ قیامت کے دن مومن بندے اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے تو آپ نے جواباً فرمایا تھا ہاں اس کے علاوہ اس مسنون کی اور بھی روایات ان کے ہاں موجود ہیں۔

نعمت کی بات تو یہ ہے کہ کلام اللہ اور ائمہ کے اقوال میں جہاں روایت کا لفظ آتا ہے یہ اس نے علم یقینی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ کلام اللہ میں نظر کا صدمہ الی آتا ہے، اور اس صورت میں روایت حقیقی کے سوا کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے اور ائمہ کے کلام میں روایت کا لفظ سوال پوچھنے والوں کے جواب میں آیا ہے جو قیامت کے روز کی روایت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں حصول علم یقینی کا کو کوئی سوال ہی کیوں کرنے لگا،

اور علم یقینی کو یوم قیامت سے خصوصیت ہی کیا ہے یہ کیا دنیا میں مومن کو ذات و صفات کے بارے میں علم یقینی نہیں بلکہ اہل سنت کے نزدیک تو ذات و صفات کے بارے میں علم یقینی ضروریات ایمان میں سے ہے شیعوں کو شاید حاصل نہ ہوتا ہو تب ہی اہل یقینی علیٰ نفسہ کے مطابق کرداروں کو اپنے اوپر تکیا کرتا ہے، شیعوں نے بھی اہل سنت کو علوم حصول علم یقینی میں اپنے جیسا سمجھ لیا ہو تو کیا تعجب

چھٹا باب

انبیاء علیہم السلام پر ایمان اور ان کی نبوت کی بحث

عقیدہ تالیف بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ امامیہ کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ پر یہ بات واجب و لازم ہے، کہ بندوں کو ادا و نواہی کی تکالیف کا مکلف کرے اور مکلف بنانا بغیر انبیاء کی بعثت کے کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں لہذا پیغمبروں کو بھیجا بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب اور ضروری ہے،

اس عقیدہ کی برائی اور خرابی کوئی ڈھکی چھپی نہیں بالکل واضح اور ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بات کوئی چیز واجب نہیں، اور پھر یہ بات مرتبہ الوہیت اور ربوبیت کے شایان شان بھی نہیں ہاں پیغمبروں کی بعثت اور بندوں کو مکلف ٹھہرنے کا عمل اس کا معنی فضل و کرم ہے جو دوزخ میں آتا ہے۔ ایسا اگر وہ کرتا ہے تو عین عنایت ہے نہ کرے تو شکایت کا حق کوئی کی گز نہیں، اہل سنت کا یہی عقیدہ و مذہب ہے،

اگر انبیاء کی بعثت اللہ تعالیٰ کے لئے لازم ہوتی، تو وہ آیات قرآنیہ میں بعثت پر اپنا انعام و احسان ظاہر نہ فرماتا کیونکہ ادا نے فرمان و واجب پر احسان و انعام کا موقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ لِيُخْرِجَهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ بعثت اگر واجب ہوتی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذریت میں رسول مبعوث کرنے کی درخواست نہ کرتے کیونکہ جب چیز کا واقعہ ہونا لازمی و ضروری ہو تو اس کے لئے طلب اور دعا کے کیا معنی؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے الفاظ یوں نقل فرمائے وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ۔ ان میں انہی میں سے رسول بھیج۔

امامیہ کے عقیدہ کے مطابق جب نبی یا اس کے قائم مقام وحی کی بعثت اللہ تعالیٰ کے ذمہ لازم و ضروری ہوئی تو اس کا اتفاق ہے، کہ کوئی وقت کوئی زمانہ ان سے خالی نہ ہونا چاہیے حالانکہ اسامیہ میں سے فرقہ سبعیہ ایک زمانہ میں نبی یا وحی کی بعثت اللہ پر واجب کہتے ہیں، یہ بات ان کے مذہب کے بیان میں پہلے گزر چکی دوسرے فرقے مقلدین اور جلیہ ہر زمانہ میں نبی کی بعثت کو واجب کہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک نبوت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل بھی گزر چکی۔

دوسرے اہل سنت تو وہ دوسرے سے اللہ تعالیٰ پر کسی بھی بات کو واجب نہیں کہتے!

یہ شیعہ عقیدہ بھی کتاب و سنت کے خلاف ہے، کتاب اللہ کے تو اس طور پر کہ بہت سی قرآنی آیات ایسے زمانہ کا پتہ دیتی ہیں جب نہ کوئی نبی موجود تھا اور نہ آثار نبوت ہی پائے جاتے تھے اس کے علاوہ قرآنی آیات ختم نبوت پر بھی صاف صاف دلالت کرتی موجود ہیں، مثلاً وَلَکُمْ دَلِيلٌ فِي سُبُحِ الْأَنْبِيَاءِ۔ اس کے علاوہ یوحنا کی انجیل ص ۴۷ میں یہ ہے کہ

قَالَ يَسُوعُ لِلْحَوَارِيِّينَ وَأَنَا أَطْلُبُ لَكُمْ دَمِين

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے کہا کہ میں اپنے

رَبِّهِ يَخْضَعُ لَكَ وَيُعْبِدُكَ فَإِنَّ قَلِيلًا يَكُونُ مَعَكَ
وَالْيَمَّا إِلَى الْأَبَدِ - رب سے تمہارے لئے سوال کروں گا کہ وہ تم کو فار قلیط بخشے
اور غایت کرے کہ وہ ابد تک ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔

عبرانی لغت میں فار قلیط سے روح حق و یقین مراد ہے، جو یقیناً ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گرامی ہے
یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت جو اسلام لائی انہوں نے اس بات کی شہادت دی اور تصدیق کی ہے ان میں سے ایک ابو
علی یحییٰ بن عیسیٰ بن جرلم الطیب ہے، جو فن طب میں کتاب النجوم اور منہاج کا مصنف ہے۔ دراصل تو یہ نصرانی
تھا مگر بعد میں مسلمان ہو گیا۔ رد نصاریٰ میں بھی اس نے ایک کتاب تصنیف کی، اس توحید کی آیات اور انجیل
کی وہ عبارات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اور آپ کے ظہور پر نور کے متعلق تھیں اور جن کو خود اس
نے پڑھا تھا، سب جمع کر دی تھیں
اس کے علاوہ اس مسئلہ میں ائمہ کی بے شمار احادیث بھی موجود ہیں،

امامیہ کے پاس اس کی بس وہی ایک دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ لطف و مہربانی واجب ہے اور بعثت بھی لطف
ہی کا ایک شعبہ ہے لہذا یہ بھی واجب ہے، اس خیال کی غرابی اور تردید کلام ماسبق میں گزر چکی۔ یہاں اعادہ کی ضرورت
نہیں!۔

اسٹیمیلہ نے اس مسئلہ میں اپنے خیال کی بنیاد ان چند نکات شرعیہ پر رکھی ہے، جو انہوں نے فلاسفہ سے چرائے
ہیں، اور اس سلسلہ میں اپنے عقلی گدے یوں پلاتے ہیں کہ ”جس طرح عالم علوی میں ایک عقل کامل کلی اور نفس ناقص
کلی ہے جن سے کائنات کا صدور ہوتا ہے، اسی طرح عالم سفلی میں بھی ایک عقل کامل کلی اور ایک نفس ناقص کلی چاہیے،
اور شرع میں رسول کا وہی مرتبہ ہے جو ایباد میں عقل کامل کلی کا۔ اسی طرح وحی کی شرع میں وہی حیثیت ہے
جو ایباد میں نفس ناقص کلی کی، اور جیسے افلاک کی حرکت عقل و نفس پر موقوف ہے، ایسے ہی نجات و تکمیل درجات
کے لئے نفوس انسانیہ کی حرکت کا دار و مدار رسول و وحی پر ہے اور ہر زمانے اور ہر دور میں عالم سفلی میں عقل و نفس کے
یہ دونوں خلیفہ موجود رہتے ہیں،“

ہر ہوشمند اور ذی عقل و شعور کو یہ اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہر سب کچھ اوام باطل کی زلیات اور فلسفہ ناقص
کی غرافات ہیں، کیونکہ اول تو عالم علوی میں عقل و نفس کا وجود ہی پایہ ثبوت کو کہاں پہنچا جو اس کی مثال پر عالم سفلی
میں بھی یہ نقشہ بچایا جائے اور پھر جناب امیر المومنین سے کتب امامیہ میں بطریق تواتر و رد و شریف کے یہ الفاظ منقول
و ثابت ہیں اللَّهُمَّ دَاخِلِ الْمُنْ حُزَاثٍ وَكَاعِبَةٍ
الْمُسْمُوكَاتِ لِنَجْمِ شَرِيفٍ مَلَائِكَةٍ وَتَوَافِي
بَرَكَاتِكَ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُولِكَ
الْحَقَّائِدِ يَمَّا سَنَقَّ - اے میرے خدا ساری چیزوں کو بچھانے والے بلند یوں
کو بے ستون قائم کرنے والے اپنی شریف ترین درود اور
اور بلند ترین برکتیں اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ
وسلم پر نازل فرما جو گزشتہ سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں،

نغمہ امامیہ کے نزدیک آپ کے بعض خطبوں میں جو متواتر الثبوت ہیں یہ الفاظ موجود ہیں۔ اَسْأَلُكَ عَلَى قُلُوبِ
مِنَ الرُّسُلِ وَطَوَائِفِ جَبَلِيَّةِ بَنِي الْأُمَمِ إِلَى أَنْ قَالَ وَآمِينَ وَخِيَّةِ خَاتِمَةِ سُلَيْمٍ وَبَشِيرَةِ مَحْمَدٍ وَ
وَقَدْ يَوْمَ نَفْسَتِهِ اِدَانِ كُوْ بِيْهِيَا رُسُلُوْكَ كَا سَلْسَلَةٍ مُنْقَطِعَةٍ مُوْجَانَةٍ بِرَاهِ رُوحِي بَرُطُوحَانَةٍ كِي دَرَجَةٍ،

یہ اسباب نفسیت ہر نبی میں موجود اور ہر نائب دامام میں مفقود ہیں۔ تو اس کا صرف ایک نتیجہ ہی نکلتا ہے کہ لامحالہ ہر نبی ہر نائب دامام سے افضل و برتر ہوا۔

حاضر تک تمام امامیہ تمام ائمہ کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ تمام انبیاء سے افضل ہیں، اس کے علاوہ قرآن کریم میں جا بجا صدیقین، شہداء اور صالحین پر انبیاء کی فینیت جو ثابت ہے وہ بھی سہلحت کے ساتھ اس عقیدہ کی ترویج کرتی ہے،

امامیہ کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ فروعات میں اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ اصول کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ جاتا ہے، چنانچہ انبیاء میں بندوں کی طرفداری میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ خالق العباد پر وجوب اللطف کو جائز قرار دے دیا اور بدی و برائی اور بندوں کے افعال کی تخلیق کو بندوں کی طرف منسوب کر کے مرتبہ الوہیت و ربوبیت کو درجہ برہم کر ڈالا اور اللہ تعالیٰ کی توحید اس کی قدرت عامہ اور اس کی کمال بے نیازی کو اس کے انصاف سے مشاڈالا۔ اسی طرح شرائط امامت کے تحت جو بالا جماع نبوت کی نائب اور اس کی فرع ہے، ائمہ کے مدارج اور مناتب کو اس قدر بڑھایا چڑھایا کہ منصب نبوت کو بے وقار اور حقیر کر دیا اور جناب امیر المؤمنین اور آپ کی ذریت رضی اللہ عنہم کی تعریف و توصیف میں جو اگرچہ ایمان و شریعت کا ایک شعبہ ہے اتنے مبالغہ سے کام لیا کہ انبیاء کو اس علیہ السلام پر ایمان ہی ہاتھ سے جاتا رہا۔

اور اس کے عوض ان کی تحقیر و تذلیل کا الزام اپنے سر منڈھ لیا حالانکہ خود ہی یہ کہتے بھی ہیں کہ امامت نبوت کی فرع و نائب ہے تو یہ نبوت کے درجہ کے برابر یا اس سے بالا و برتر کیسے ہو سکتی ہے، اس بارے میں ان کی تمام ترجمت وہ شبہات ہیں جو ان کے چند مقتداؤں و پیشواؤں کے کلام سے پیدا ہوئے ہیں۔ جو وہ اپنی کتابوں میں لکھ کر چل بسے اور اپنے پیروں کو ان کا حکم دے گئے،

اس سلسلہ میں کہنے کی پہلی قوت بات یہ ہے کہ ان کی روایات اور راویوں کے حالات نیز اپنے علماء سے روایت کردہ روایات کو صحیح قرار دینے کا جو طریقہ رہا ہے وہ ناظرین کتاب ہذا پر گزشتہ ادراک میں بخوبی واضح ہو چکا ہے، لہذا پھر انہیں روایات کو ثبوت میں پیش کرنا اصول قواعد کے مناسب نہیں کیونکہ انہیں اسے اجماع قطعی وہ ظہور مخالف سے پہلے معارض ہیں، ان کے ظاہری الفاظ پر عمل ممکن نہیں۔ البتہ تاویل کی جاسکتی ہے،

دوسری بات یہ کہ یہ روایات بعض دوسری روایات سے ٹکراتی ہیں مثلاً کلینی کی روایات جناب زید بن علیؑ سے یا ابن بابویہ کی روایات جناب صادقؑ سے اور اسی طرح اور بھی بہت سی روایات ہیں اور بالفرض یہ روایات باہم نہ بھی ٹکرائیں تو بھی چونکہ یہ ظنی ہیں، اس لئے معتقدات میں ان سے شک جائز نہیں علاوہ ازیں خود امامیہ کے اکثر متحقق کے نزدیک بھی مثلاً ابن زہرہ ابن ادریس ابن براج اور شریف مرتضیٰ بلکہ ان کے اکثر قدامت کے نزدیک بھی وہ قابل حجت نہیں اور ان کے پھیپوں نے بھی اس مذہب کو اختیار کر کے نہ صرف یہی کہ اخبار امارہ کو دلائل میں شمار کیا بلکہ ان کی ترویج کو خاص کر اعتقادات کے معاملات میں واجب و سنوری قرار دیا چنانچہ ابن مطہر علی نے اپنی کتاب مبادی الاصول فی الاموال میں یوں لکھا ہے، **اِنَّ خَلْقَ الْوَحِيدِ اِذَا اُتِفِقَ عَلَيْهِمْ وَكُنْهُ كَوْنًا فِي الْاَدْلَةِ الْقَاطِعَةِ مَا يَدُلُّ عَلَيْهِ وَجِبَ سَدُّهُ**، وجب خبر واحد سے کسی اعتقاد کا ثبوت ملتا ہو اور اس ثبوت پر دلالت کرنے والی قطعی دلیل موجود نہ ہو تو خبر واحد کو رد کر دینا

کہ یہاں فضیلت کا معیار کثرت ثواب ہے کثرت علم نہیں، ورنہ تو ماننا پڑے گا کہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فضیلت میں برتر تھے اور یہ بات بالاجماع صحیح نہیں،

اور پھر اگر یہ بھی مان لیں کہ کثرت علم ہی کثرت ثواب کو مستلزم ہے تو اس سے وہ علم مراد ہے جس پر اعتقاد و عمل کلا رو مدد ہے علوم زائدہ اس سے مراد نہیں اور آیت قرآنی هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَكْفُلُونَ وَالَّذِينَ لَا يَكْفُلُونَ میں یہی علم عقیدہ و عمل مراد ہے،

اور ہر غیبی کو یہ علم بدرجہ کمال و تمام حاصل ہوتا تھا، اگر ائمہ کو یاد دوسرے علماء کو ان سے علم میں زیادتی یا برتری ہوگی تو وہ دوسرے علوم ہوں گے یہ نہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر غیبی کو یہ اعتقادی و عملی علم بدرجہ کمال نصیب نہ ہوتا تو وہ تبدیلینی اور دینی احکام رسائی کی ذمہ داریوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکے گا، اور پھر بعثت کی غرض کیسے اور کیوں کر پوری ہوگی، دوسرا شبہ امام مسند بالا کی دلیل میں یہ لوگ حسن بن کبیش کی ایک روایت بحوالہ ابی ذریوں بیان کرتے ہیں،

قَالَ لَقَدْ نَظَرَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ وَقَالَ هَذَا خَيْرُ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ مِنْ أَهْلِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مَنِ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف نظر اٹھا کر فرمایا کہ یہ آسمانوں اور زمینوں کے انگوں اور پچھلوں میں سب سے افضل ہیں،

پھر انہوں نے اسی حسن بن کبیش کی ایک اور روایت بحوالہ ابی داؤد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے لی لی بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

”مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کا یہ کہنا بیان فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ تمام انسانوں میں افضل ہیں، جس نے اس سے انکار کیا وہ کافر ہوا“

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت ان روایات میں سے ہے جسکی روایت کرنے میں امامیہ منفرد اور تنہا ہیں کسی اور نے یہ روایت نہیں کی اور ان کے راوی جیسے کچھ ہیں ان کا حال صفات ماضی میں بیان ہو چکا اور خود امامیہ کے نزدیک بھی یہ دونوں روایات سند ٹھیک نہ ہونے کے سبب نظر اقبال سے کر چکی ہیں کیونکہ ان روایات کے رجال کی تحقیق پر حسن بن کبیش اور اس کے بعد کے راوی مجهول الحال اور ضعیف ثابت ہوئے،

اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی ان روایات سے ان کا مدعا اور مقصد ثابت نہیں ہوتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس قسم کی عام اور مطلق عبارات میں انبیاء کا مستثنیٰ ہونا ایک مشہور و معروف بات ہے اگر کسی ایک مقام پر استثناء نہ ہو تو اسے دوسرے مقام پر قیاس کریں گے، اور وہ عام جس کی تخصیص کرنی گئی ہو قابل حجت نہیں اور پھر یہ حجت ظنی ہے معتقدات میں اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اگر عموم کو تسلیم بھی کر لیں تو عموم فی الاوقات دینی ہر زمانے میں قابل تسلیم نہیں کیونکہ اس قسم کی فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بلا شک و نزاع بالکل نہ تھی آپ اپنے زمانہ میں اولین و آخرین میں داخل ہوتے ہوئے، ہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل و برتر تھے، لہذا آپ کے زمانہ کے علاوہ کوئی اور زمانہ مراد ہوگا یعنی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ تو اس زمانہ میں بے شک آپ سب سے افضل و برتر تھے اور اسے اہل سنت بھی مانتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی خرابی ہے نہ عجولانہ۔

تیسرا شبہ امام اس شبہ کے ثبوت میں یہ لوگ ایک روایت تو سعد بن عبداللہ بن ابی خلف اشعری قمی کی پیش کرتے ہیں،

جو اس نے جناب ابی بکر کے حوالہ سے کتاب قصاس میں نقل کی ہے، اور دوسری روایت محمد بن یعقوب کلینی کی ہے جو اس نے اپنی کتاب کافی میں بحوالہ جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نقل کی ہے، دونوں روایات اللہ تعالیٰ کے فرمان قُلْ اَللّٰهُ رَزَقَنَا مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کی تفسیر کے ذیل میں بایں الفاظ بیان کی گئی ہیں، هُوَ خَلَقَ عَظِیْمٌ مِنْ جَبَرِیْلَ وَ مِکَآئِیْلَ ثُمَّ یُکَلِّمُ مَعَهُ اَحَدٌ مِّنْ مَّسْئِیْ غَیْرِ مُحَمَّدٍ وَ هُوَ مَعَهُ اَزْوَاجٌ مِّنْ نَّوْفَلٍ وَ یُسَدِّدُ وَ هُوَ رَدَّ جَبَرِیْلَ وَ مِکَآئِیْلَ عَلَیْہِمَا السَّلَامَ سے بھی بڑی حقیت سے جو سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انبیاء سابقین کے ساتھ نہیں تھی، اور راءمہ کے ساتھ ہے وہ ان کو توفیق دینا ہے اور مضبوط رکھتی ہے،

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ پہلی روایت کی سند میں ہشام بن سالم ہے جس کو سب جانتے ہیں کہ کڑا معصوم تھا اور حضرات ائمہ کی طرف سے چھٹکارا اور لعنت کیا ہوا ہے اور دوسری روایت میں ابوبکر ہے جو ائمہ پر چھوٹے بولنے کا خود معترف ہے اور ان کے رائے کے اثبات کا اثر اسی بھر ہے،

اور بفرض حال اس روایت کو درست بھی تسلیم کر لیں تو اس روایت کا معصوم جناب پیغمبر علیہ السلام اور ائمہ کی عصمت کے سرِ سبک خلاف ہے اور منافی ہے اس لئے کہ اتالیق اور مؤدب کا محتاج وہ ہو سکتا ہے جو خود مسموم نہ ہو۔ اسی لئے فرشتے اتالیق و مؤدب کے اسی لئے محتاج نہیں کہ وہ معصوم ہیں، لہذا اس صورت میں انبیاء سابقہ کے مقابلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی ذات میں ایک واضح نقیص ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام تو گویا خود بخود تمام کمال مسموم تھے کہ ان کو نہ کسی توفیق رسائی کی حاجت تھی نہ وہ کسی مضبوط کرنے والے کے ضرورت مند تھے بخلاف اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ اتالیق کے ایسے محتاج تھے کہ جو ان کو ہر وقت راہ راست پر رکھے اور بیدار! اس فاسد گمان و خیال سے اللہ اپنی پناہ میں رکھے،

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی روح کا ہونا ان کی عصمت کے لئے شرط ہے یا نہیں ان دو ہی صورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں اب اگر تمہارا جواب اثبات میں ہو تو یہ لازم آتا ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام غیر معصوم تھے کیونکہ یہ روح ان کے ساتھ نہیں مانتے اور یہ بات بالاجماع غلط اور باطل ہے اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی عصمت کی نفی ہوتی ہے کہ وہ معصوم نہ تھے (نور الہدایہ) اس لئے ایک اتالیق کے محتاج ہونے اور دوسرے پہلے سے تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کی افضلیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ پر ثابت ہوتی ہے کہ وہ تو اپنی عصمت کے لئے اس روح کے محتاج نہیں تھے اور آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم روح کی وجہ سے معصوم تھے،

اب یہاں شیخ ابن بابویہ کی ایک تعلق قابل تماشہ ہے، اس نے اپنی کتاب الاعتقاد میں بڑی بلند آہنگی سے یہ لکھا۔

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی نے کون مخلوق محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ سے افضل پیدا نہیں کی اور یہ اللہ کو سب در سبوں میں زیادہ محبوب اور عزیز سے زیادہ پیارا ہے میں اپنی تمام مخلوق سے برتر ان کو دوست رکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَکَذِیْکَ خَلَقَ اَنْثٰنًا مِّنْ مُحَمَّدٍ وَ اَزْوَاجَہٗ وَ طَوْلٰہٗ اَحَبَّ اَحْبَاءِ اللّٰہِ وَاَنَّ اللّٰہَ یُحِبُّکُمْ اَکْثَرَ مِنْ غَیْرِہُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ یُحِبُّکُمْ اَکْثَرَ مِنْ جَمِیْعِ خَلْقِہٖ وَ بَرِیَّتِہٖ۔

پھر یہی حضرت ابنی دوسری کتاب الامالی میں بھی روایت سے ایک لمبی حدیث میں جو جناب امیر اور ربی بن زہرہ رضی اللہ عنہما کی شادی کے قصہ پر مشتمل ہے۔ یہ روایت جناب صادقؑ سے نقل کرتا ہے،
 اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ لِنَسْكَانِ الْجَنَّةِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَالْاِنَامِ
 الرَّسُلَ وَمَنْ فِيْهَا اِلَّا اِلٰی مَنْ رَّجَعْتُ اَحَبَّ النَّسَاءِ
 اِلٰی مَنْ اَحَبَّ الرَّجَالَ اِلٰی بَعْدَ الْقَبِيْنِ۔
 ہے جو انبیاء کے بعد مجھ کو محبوب ترین انسان ہے،

یہ روایت بالکل وصل کہہ رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک انبیاء کرام جناب امیرؑ سے محبوب تر ہیں اب جناب بابویہ کی اس اختلاف بیان اور تناقض کلامی کو کیا کہا جائے دروغ گورہ حافظہ نباشد شاید مزدوں سے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ان کے ہاں تو مذہب و دلائل میں یہ تناقض اور اختلاف بیان شروع سے آخر تک ہے اور یہ بابویہ تو اس فن کے ماہر اور سب کے استاد مانے جاتے ہیں،

مزید بات آگے بڑھانے سے پہلے اسی مسئلہ زیر بحث کی ایک مثال پیش کر کے اس اختلاف بیان کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً تمام امامیہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام انبیاء سے زیادہ اللہ کو پہچانتے ہیں، اور اس بارے میں شیخ ابن بابویہ نے جناب ابی عبد اللہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ:-

اَنَّهُ قَالَ لِعَلِّيْ يَأْخُذُ مَا خُفِيَ مِنَ اللّٰهِ اِذَا اَنَا وَاَنْتَ
 وَلَا غَرْفَنِيْ اِلَّا اللّٰهَ وَاَنْتَ وَلَا غَرْفَكَ اِلَّا اللّٰهَ
 وَاَنَا۔
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا ہے
 علی اللہ کو مجھ سے اور تجھ سے بڑھ کر کسی نے نہیں پہچانا اور
 اور مجھ کو سوائے اللہ کے اور تیرے کسی نے نہیں پہچانا اور
 تجھ کو سوائے اللہ کے اور میرے کسی نے نہیں پہچانا۔

اور پھر خود شیخ بابویہ کتاب المعراج میں ایک طویل روایت میں بحوالہ ابو ذرؓ لکھتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَنَّهُ قَالَ لَمَّا عَرَّجَنِيْ اِلَى السَّمٰوٰتِ جَادَتْْنِيْ مَلَائِكَةٌ
 كُلُّ سَمَاءٍ وَ سَكَنُوْا عَلَيَّ وَقَالُوْا اِذَا مَا جِئْتَ اِلَى الْاَرْضِ
 فَاَقْرُءْ عَلَيْنَا مِمَّا السَّمَاءِ وَاَعْلَمْنَاهُ اَنْ شَوْقًا لِّهٖ طَرَبُ
 نَقَلْتُمْ لِهٖمْ يَمْلِكُ مَا مَلَكَ نَبِيَّ هَلْ تَعْرِفُوْنَ مَا حَقَّ لَعْنُوْهُ
 قَالُوْا لَعْنُوْكَ فَمَكَدَ اِلَى الْاَرْضِ الْحَدِيْثِ
 جب مجھے آسمانوں کی طرف معراج ہوئی تو ہر آسمان کے
 فرشتے میرے پاس آئے اور مجھے سلام کیا پھر مجھ سے کہا
 کہ جب آپ زمین پر واپس ہوں تو علی کو ہمارا سلام پہنچائے
 اور فرمائے کہ آپ کے لئے ہمارا اشتیاق بہت بڑھ چکا ہے
 تو میں نے فرشتوں سے کہا کہ اسے میرے رب کے فرشتوں کی
 تم ہم کو خوب جانتے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کو کیوں نہیں پہچانیں گے۔ الی آخرہ

اس روایت سے واضح اور صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر آسمان کے فرشتے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسا پہچانتے تھے جو پہچاننے کا حق ہے، تو پھر روایت بالا میں جو درجہ مرتبہ معصرتا ہے وہ تو غلط ثابت ہو گیا، یہاں بھی شیخ بابویہ کو دروغ گورہ حافظہ نباشد کا ہی اعزاز دیا جاسکتا ہے،

اور پھر روایت اول میں صراحت سے اس بات کا بھی پتہ چلا کہ انبیاء و رسول کو بظاہر اصل معرفت اور درپردہ حق معرفت حاصل نہ تھی اور جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت جیسا کہ معرفت کا حق ہے حاصل نہ ہو وہ نبوت و رسالت کے قابل کب اور کیسے ہو گا۔ اور روایت مذکور اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ائمہ اطہار مثلاً جناب حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کے بعد کے لوگوں کو حق معرفت نصیب نہ تھی حالانکہ یہ بات خردان کے مذہب کے بھی خلاف ہے،

انبیاء کرام علیہم السلام اور ائمہ کی تفصیل کے سلسلہ میں ان کے شبہات بطور نمونہ بیان کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کے متعلق جو غلو اور حد سے تجاوز ان کے ہاں پایا جاتا ہے اور انبیاء کی تحقیر و اہانت یہ کرتے ہیں رسالت کی مناسبت سے مختصراً اس کو بھی بیان کر دیا جائے تاکہ بندہ مومن کو ان سے میل جول اور نشست و برخاست کے سبب قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے شرمندگی نہ ہو اور ائمہ و اولیاء و صلحائے امت کے حق میں جو اعتقاد رکھتا ہے، اس میں جادۂ اعتقاد سے نہ بہٹ جائے،

پہلا غلو ۱۔ ائمہ کے حق میں غلو اور انبیاء کرام کی نسبت تحقیر کی باتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کی پیدائش ائمہ کے ضمن میں ہے اور عارضی ہے، اصل مقصد تو ائمہ کی پیدائش ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ اصل کو طفیلی کا نائب مقرر کر دیں اور کہیں کہ اصل کا تقرر معنی نائب کے تقرر کی وجہ سے ہے، حالانکہ یہ بات خلاف عقل ہے اس غلو کے حق میں دلیل وہ روایت ہے، جو شیخ مفید یعنی محمد بن نفعان استاد شریف مرتضیٰ اور شیخ ابو جعفر طوسی نے محمد بن الحنفیہ سے نقل کی ہے۔

انہوں نے کہا کہ ۱۔

قَالَ قُلُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ سَيَفُتْ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ أَنَا سَيِّدُ الْأَنْبِيَاءِ وَأَنْتَ سَيِّدُ الْأَوْصِيَاءِ لَوْلَا أَنَا لَمْ يَخْلُقِ اللَّهُ الْخَلْقَ يَا عَلِيُّ لَا الْمَلِكَةَ وَلَا الْأَنْبِيَاءَ۔
امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نبیوں کا سردار ہوں اور تم و وصیوں کے اگر میں نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ نہ جنت پیدا کرتا نہ فرشتوں کو اور نہ انبیاء کو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ روایت اس قوم کی من گھڑت روایتوں میں سے ایک ہے کیونکہ لفظ لولا کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کے متنبہ یعنی ناممکن الوقوع ہونے پر دوسری چیز بھی ناممکن الوقوع ہو اور یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک چیز موقوف و محتاج ہو دوسری چیز کی ورنہ پھر ایک کا امتناع دوسری پر کس طرح متصور ہو گا، اور یہاں ایسا نہیں ہے یعنی تمام انبیاء کا وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف نہیں ہے اگر کسی قسم کا توقف ہو سکتا ہے تو انہیں حضرات کے باپ و دادا یا ان پیغمبروں کی نسبت ہو سکتا ہے جو اسی سلسلہ میں ہیں، اور یہ توقف بھی نسبی سلسلہ میں ہو سکتا ہے نہ نبوت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی پیدائش سے صرف نسل جاری ہو جائے اور وہ پیغمبر نہ ہوں اور فرشتوں کے حق میں تو اتنے کا بھی امکان نہیں زیادہ سے زیادہ وہ فرشتے جو آپ کی حفاظت، نصرت و امداد پر مامور ہیں، یا اعمان مہ لکھنے پر متعین ہیں یا جنت میں اس جگہ کے فرشتے جو آپ کے یا آپ کے متعلقین کے لئے نامزد ہیں پیدا نہ کئے جاتے لہذا اول تو یہ حدیث صحیح نہیں پھر اگر صحیح بھی ہوتی تو اس کے حقیقی معنی مراد نہ ہوتے بلکہ غرضی معنی اللہ تعالیٰ کی عنایت بیان کرنا ہوتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب امیر رضی اللہ

عنہ پر تھی۔

اب چونکہ حقوق کی ہدایت و رشد کے دور استے ہیں ظاہر کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارتقاء اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہیں اور باطن کے اکثر طرف اور سلسلوں کا مرتبہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ہر دو طریق کا منبع و سنگم آنحضرت صلی اللہ وسلم ہیں،

اور یہ سب کچھ انبیاء و اوصیاء سے پہلے ہی مقدور ہو چکا تھا تو یہ چیز صرف جناب امیرِ مومنین اللہ عنہ کی انبیاء پر فضیلت ثابت نہیں کرتی، کیونکہ مجموعہ کی مجموعہ پر تفصیل آپس میں آماد کی تفصیل کو مستلزم نہیں، تو آماد کی تفصیل مجموعہ پر کیسے مستلزم ہو سکتی ہے

دوسرا غلو :- ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ائمہ کی ولایت کی تصدیق اور ان کی اطاعت پر فرشتوں اور انبیاء سے عہد لیا تھا ان کی یہ بات بھی عقل کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ ایسی صورت میں جب کہ ائمہ کے زمانہ میں انبیاء کا موجود نہ ہونا قطعی طور پر معلوم ہے، ایسا عہد لینا بیکار محض ہے، جب وہ موجود ہی نہیں تو ایسا عہد سے کس طرح عہدہ بردار ہو سکتے ہیں کیونکہ کسی عہد کی اکثر و بیشتر غرض نصرت و حمایت اور امانت و امداد ہوتی ہے یا محاسن اور خوبیوں کا بیان یا اشاعت اور جب زمانہ ہی دونوں کا ایک نہ ہو تو عہد بیکار اور لغو رہا۔ اب اگر کسی کو اس پر شبہ ہو کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق و مدد پر بھی تو انبیاء سابقین سے عہد لیا گیا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصریح اور آپ کے محاسن و مناقب آسمانی کتابوں میں بڑی تصریح کے ساتھ نازل ہو چکی تھیں اور ضرورت کے وقت ان کو ظاہر کرنے کے لئے اہل کتاب کا موجود ہونا بھی قطعی الثبوت تھا۔ لہذا ان انبیاء سے عہد لیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق آسمانی کتب میں جو نازل کیا گیا ہے ان امور کے متعلق اپنی امت کو بتاؤ اور ان کی ان میں تبلیغ کرو اور ان کو تاکید کرو عہدے کران کو پابند کرو کہ نسل در نسل اور پشت در پشت ملازم و کاست ان نفوس کی حفاظت کرو ان کو تازہ رکھیں۔ اور جب ان کے ظاہر کرنے کا وقت آئے تو پوری سپاہی سے ان کو ظاہر کریں لیکن امامت ائمہ کا معاملہ ایسا نہیں ہے نہ وہ انبیاء سابقین کی کتابوں میں نازل ہوئی نہ ہی اہم ماسبق میں وہ رائج ہوئی اور نہ ہی اس کے اظہار کی کبھی ضرورت پیش آئی اس لئے کہ امامت و خلافت کو نبوت کی نیابت اور نائب ہے یہ تو نبی کے حکم سے ثابت ہوتی ہے اہل کتاب کی طرف اس کے ثبوت و اثبات کے لئے رجوع کرنے کی تک ہی کیا ہے اور ضرورت کو نبی ہے اور اگر اہل کتاب اندر خود اس معاملہ میں لب کثائی کریں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں،

اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ امامت کے لئے عہد ضروری ہے تو پھر ایسا ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے عہد و میثاق لیتے ان سے دست برداری تحریر کر کر اپنی مہر سے اسے منکوح ترین فرما کر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حوالہ فرماتے،

یہ کیا بات ہوئی کہ موجود و متعلق حضرات کو نظر انداز کر کے غیر متعلق و غیر موجود غیر متعلق حضرات سے عہد لیا گیا جنکو خود اور نہ ان کے پیروکاروں کو معاملات امامت و خلافت کے غصب و تسلیم سے کوئی تعلق اور کچھ سرحد کار نہیں،

اور اس لغو و بیہودہ غلو کی دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن حسن مفار نے محمد بن مسلم سے اور انہوں نے جناب ابی جعفر سے بیان کی ہے وہ کہے ہیں۔ **إِنَّ اللَّهَ أَخَذَ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ بَوَلَايَةِ عَلِيٍّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ** اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے

ولایت علی بن ابی طالب کا عہد لیا ہے، اس کے علاوہ محمد بن بابویہ کی اس روایت سے بھی یہ سند لاتے ہیں جو اس نے دائود رقی کے حوالہ سے ابی عبد اللہ سے اپنی کتاب کتاب التوحید میں ایک طویل روایت کے ذیل میں بیان کی ہے جو یہ ہے، جب اللہ تعالیٰ نے خلق مخلوق کا ارادہ کیا تو ان کو اپنے سامنے بھیلایا اور ان سے پوچھا میں کون ہوں جواب میں سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امیر المؤمنین اور ائمہ ہوئے آپ ہمارے رب ہیں! پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و دین کا حامل بنایا۔ اور فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میری مخلوق میں یہی وہ ہیں جن کو میں نے علم دین اور امانت کا حامل بنایا پھر بنی آدم سے کہا ان کی ربوبیت تسلیم کرو، اور ان لوگوں کی اطاعت مانو تو سب نے عرض کیا اے ہمارے رب ہم اس کا اقرار کرتے ہیں۔

ان دونوں روایتوں میں فرشتوں سے عہد کا ذکر نہیں، دوسری روایت میں فرشتوں کے سامنے ان حضرات کے صرف فضل و شرف کا اظہار کیا ہے، ویسے بھی ملائکہ سے عہد لینا قرین قیاس بھی نہیں اسی لئے فرشتے کسی یشاق میں داخل نہیں اس لئے کہ یشاق تو دراصل مکلفین سے ہوتا ہے، جن سے طاعت و نافرمانی ہر دو کا احتمال ہوتا ہے فرشتوں میں تو صرف اطاعت و نہ نافرمانی ہی کا پہلو ہے وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتے کہ ان کی صفت نورانیہ یقولون اللہ ما امرہم اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادی ہے اس لئے ان سے عہد لینے کی ضرورت نہ کیا رہی،

اس مذکورہ بالا دوسری روایت میں انبیاء علیہم السلام سے بھی یشاق کا ذکر نہیں بلکہ بنی آدم سے جو سب کو شامل ہے عہد لیا ہے اور یہ بات بطور قاعدہ مشہور ہے کہ کوئی ایسا کام عام نہیں جس سے بعض کی تخفیف نہ کی گئی ہو اس کے علاوہ اس عہد میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیر اور ائمہ کی اطاعت پر انصار معلوم ہوتا ہے اور دیگر اولوالعزم پیغمبروں کی جو اطاعت بلاشبہ واجب ہے اس کو غالباً بطور بدائمی دوسرے وقت پر مصلحتاً اٹھا رکھا ہوا،

اب ان کے مفید مطلب وہ خاص روایت ملاحظہ فرمائے جو شیخ بابویہ کی زنجیل سے نکلی ہے یہ روایت بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی گئی ہے روایت طویل ہے اس کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجئے،

اَقْبَلْنَا اَسْرٰی بَابًا وَكَلَّمَكَ رَبُّكَ قَالَ بَدَّلْ كَلَامًا
اِنَّكَ تَسْأَلُنِي اِلٰی عِلْمٍ وَاِنِّي عَلِيٌّ وَاِنِّي اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَخَذْتُ مِيثَاقَ الْبَشَرِيَّةِ وَوَعَدْتُ لِكُلِّ وَبَشِيَّةٍ
خَلْقِي بِوَلَايَتِي۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج حاصل ہوا آپ کا رب آپ سے بولام ہوا تو گفتگو کے بعد فرمایا بے شک آپ میری مخلوق کے لئے رسول ہیں اور علی بن ابی طالب میرے امیر ہیں بنیوں، اپنے فرشتوں اور اپنی ساری مخلوق سے

اس کی ولایت پر عہد لیا ہے۔

اب صفار ابن بابویہ اور ان کے راوی خصوصاً محمد بن مسلم کا جو حال ہے اور جو خطاب و القاب ان کو علماء رجال کی طرف سے ملے ہیں وہ ردش و ظاہر ہیں اس کے علاوہ بھی روایات کے انشاء کی کمزوری خود ان کے کذب و انحراف پر عاری گواہ ہے،

اور پھر خدا کے فضل و کرم سے اہل سنت کو کسی کد و کاوش کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ ان روایات کی توہین یا تنقیف کریں یا ان من گھڑت روایات کی تاویل و توجہ میں اپنا وقت، اپنی توانائی ضائع کریں۔ کیونکہ شریف مرتضیٰ نے جو شیعوں کی طرف سے علم اٹھادی، اس کے خطاب سے متعسف ہے اپنے لقب کی شرم رکھتے ہوئے اپنی کتاب الدر والغور میں ان روایات عیاشی کی بڑے شد و مد اور مستحی سے تکذیب و تردید کی ہے اور آخر میں ان کے افتراء و کذب کا قطعی فیصلہ دیا ہے، و کفی اللہ المؤمنین القتلا د لڑائی میں مومنوں کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔

تفسیر غلو :- کہتے ہیں کہ انبیاء نے ائمہ کے انوار سے اقتباس کیا ہے اور ان ہی بزرگوں کے نقش قدم پر چلے ہیں مصلیہ بات عقل میں آنے والی ہے کہ پہلے والا پچھلے کی اقتدا کرے اور اس سے انوار حاصل کرے اگر یہ کہا جائے کہ ان کو وحی و الہام سے ائمہ کے حالات معلوم ہوتے تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ اتنے گھٹا و پھلڑ کی کی ضرورت تھی اصلۃً ان کو طریقت کی تعلیم کیوں نہ ہوئی اس طول عمل میں مصلحت کیا تھی کہ فلاں فلاں آئندہ ایسا کریں گے تم بھی ان کی اتباع کرو۔ سیدھے سیدھے یہ کہا جاسکتا تھا کہ فلاں فلاں طاعت انجام دو۔

ہر عقلمند پر یہ بات روشن ہے کہ کسی کی اتباع کر دیا اس سے اقتباس انوار کا مطالبہ اس وقت کیا جاسکتا ہے کہ بے واسطہ راہ نجات کی معرفت اور درجات تک وصولی اس کو نصیب نہ ہو اور جب کہ ان انبیاء سے وحی کا رابطہ تھا ان سے پیغام و گفتگو جاری تھی ان پر کئی ہیں حکم احکام سب براہ راست نازل اور پہنچ رہے تھے تو پھر کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو غیر کی اتباع کا حکم دیا اور پھر کسی تاریخ سے یا کسی شرعی و صبیح خبر سے یہ ثابت نہیں کہ کسی نبی نے روزہ نماز زکوٰۃ حج اور دوسری عبادات و معاملات کو نجم الدین ابوالقاسم کی یا جامع عباسی عاملی کی شریعت کے مطابق جو ان کے نزدیک ائمہ کے آئین و طریقہ کے مطابق ہی انجام دی ہوئی۔ اور نہ ان انبیاء کی امتوں میں یہ طریقہ رائج تھا ان حالات میں انبیاء کرام کا ائمہ کی اتباع کیا معنی رکھتے ہیں،

اس غلو کے لئے بھی حجت ابن بابویہ ہی کی زنجیلی روایت سامنے آتی ہے یہ جناب ابی محمد حسن عسکریؑ کا ایک خط

ہے لہذا بن بابویہ کے علاوہ دوسرے امامیہ نے بھی اس کی روایت کی ہے وہ یہ ہے،

میں اللہ سے اس قوم سے پناہ مانگتا ہوں جس نے قرآن کی ظاہر الثبوت آیات کو ترک کیا، اپنے رب، نبی، ساتی کو ترک کر دیا، حساب، آتش و دوزخ جو بڑی آفت ہے اور پرہیزگاروں کی نعت کے گھر کو جھلادیا پس ہم بڑی شان و مرتبہ کے لوگ ہیں نبوت ہم میں ہے ولایت و کرم ہم میں ہے، ہم ہدایت کے مینار اور مضبوط سہارا ہیں انبیاء ہمارے انوار سے اقتباس کرتے تھے اور ہمارے نقش قدم پر چلتے تھے عقرب

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ قَوْلِهِمْ خَدُّوا حُكْمَاتِ الْكُتُبِ وَتَسُوا
مَتَابَ الْأَرْبَابِ وَالنَّبِيِّ وَسَاقِ الْكُفْرِ يَوْمَ الْحِسَابِ
وَنَلْغِي السَّاطِمَةَ الْكُبْرَى وَنُعِيمُ دَارَ الْمُتَّقِينَ نَعْمَ الْإِنَّمَا
الْعُظْمَى وَفِينَا النَّبُوَّةُ وَالْوَلَايَةُ وَالْكَرِيمُ نَحْنُ مَنْدَرُ
الْهَدْيِ وَالْعَزِيزَةُ الْوُفْقَةُ وَالْأَنْبِيَاءُ كَالْأَوْفِقِينَ مِنْ
أَنْوَارِنَا وَنُفُتُونَ أَفَارِنَا وَسَيُظْهِرُ حُجَّةُ اللَّهِ عَلَى الْخَلْقِ
وَالسَّيْفُ الْمُسْكِرُ لَا يَظْهَرُ إِلَّا بِحُجَّتِهِ

انظہار حق کے لئے اللہ کی حجت اور ننگی تنوار مخلوق پر ظاہر ہوگی،

خط کی یہ عبارت من گھڑت ہے، اپنی طرف سے جناب عسکریؑ کی طرف منسوب کر دی، اس سلسلہ میں اس فقرہ کی زود اعتمادی کا یہ حال ہے کہ جھوٹوں بھی سننے لیتے ہیں کہ یہ فلاں امام کا خط ہے تو بے کھٹکے فوراً اعتماد کر بیٹھتے

سے بلند درجہ پر ہوں گا اور باقی انبیاء و رسل ہم سے نیچے زمینوں پر ہوں گے،
اور امالی میں جناب ابی عبد اللہ اپنے دادا امیر المومنین سے یوں روایت کرتے ہیں کہ:-

قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَلِيُّ
أَنْتَ آخِرُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَنْتَ أَقْرَبُ الْخَلَائِقِ
لِي بِمَا لِقِيَا مَتَدِي الْمَوْثِقَ بَيْنَ بَدَنِ الْجَبَّارِ -
مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ اے
علی تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے، اور قیامت کے
دن جبار کے سامنے کھڑے ہونے میں تو مجھ سے تمام مخلوق
سے زیادہ قریب ہو گا،

اور روایت کی سعد نے اربعین میں ابی صالح سے اور اس نے سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) سے اور انہوں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ سے کہا،

”جب قیامت کا دن ہو گا تو آپ کے لئے منبر عرش کے دائیں جانب کیا جائے گا اور باقی انبیاء کے لئے بائیں
جانب اور اس کے سامنے آپ کے پہلو میں بطور اعزاز و اکرام جناب علی کی کرسی لگائی جائے گی،“

اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات جو من گھڑٹ ہیں ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں بالقرن ان روایات کی صحت
تسلیم بھی کر لی جائے تب بھی یہ روایات انبیاء پر ائمہ کی فضیلت ثابت کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیتیں اس لئے کہ ان
روایات کا زیادہ سے زیادہ مقدمہ اور فائدہ یہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدمہ اور طفیل میں آپ کی ذریت
کے بعض افراد کو بعض مقامات پر تمام مخلوق پر تقدم حاصل ہو گا اور اس قسم کے ضمنی تقدم اور تفوق سے کسی برتری کا
کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مثلاً بالا جماع یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام امتوں سے پہلے جنت میں
داخل ہو گی اور ہر نبی اپنی امت کے ساتھ ہو گا تا کہ ہر املا کی تنگ گھاٹی سے بچاؤت ان کو گزار لیجائے۔

لہذا اس پہلو سے ساری امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیغمبر علیہ السلام کے طفیل دیگر انبیاء اور ان کی امتوں سے
دخول جنت میں تقدم حاصل ہو گیا تو اب چاہیے کہ اس امت کے ہر فرد کو انبیاء پر برتری و فضیلت ہو جائے سب ہی کے
نزدیک ساری امت انبیاء سے افضل نہیں ہے اور یہ فضیلت نہ عقل کی رو سے درست ہے نہ بملاحظہ شرع و عرف مثلاً
شاہی قلعہ میں اگر ایک امیر اپنے خدام کے ساتھ دوسرے امراء سے پہلے داخل ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس
امیر کے خدام کو پہلے داخل ہو جانے کے سبب دوسرے شاہی امراء پر تفوق و برتری حاصل ہو گئی،

عقیدہ (۱۱) انبیاء علیہ السلام گن ہوں سے پاک ہیں۔ اور یہی اہل سنت کا عقیدہ و مذہب ہے البتہ بطور تشریح
تقریبی سی تفصیل یہ ہے کہ کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا اقتدا کسی نبی سے
سرزد نہیں ہوتا البتہ بھول چوک سے ایسے معمولی امور پیش آجاتے ہیں جن کو ترک کہتے ہیں یعنی قدم پھسلان کی طرف
گناہ کی نسبت صحیح نہیں اس وقت ان کی کیفیت اس راہ رو کے مشابہ ہوتی ہے جو راہ راست پر ہونے کے باوجود راستہ کے
دو طرفے یا پھسلنے پر نظر نہ کر سکنے کے سبب ٹھوکر کھائے یا پاؤں رپٹ جاتے،

اس قسم کے مسائل میں ایک بات تو ہر دم یہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ساتھ جو بھی معاملہ کرے
یا کسی انداز و الفاظ میں ان کو یاد کرے اس نے مخلوق کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ ان الفاظ کو نبی کے لئے استعمال
کر دیں، اللہ تعالیٰ کو یہ سولہ آنے حق ہے کہ وہ جس کا چاہے جو نام رکھے جس لفظ سے چاہے خطاب کرے ہمیں اس کی

رہیں کی اجازت نہیں۔ وہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کے لئے "غصا آدم" کہہ سکتا ہے مگر کسی بندہ کو ایسا کہنے کی نہ اس نے اجازت دی نہ حق یا یوسف علیہ السلام نے بھائی کی خوجی میں خود ہی پیالہ رکھ دیا اور پھر خود ہی قافلہ والوں پر چوہی کا الزام لگا یا نظاہر تو یہ نازیبا بات تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کنک کنک نالیوسف یہ تدبیر ہم ہی نے یوسف کو بتائی تھی تو اب اسے کون نازیبا بات کہہ سکتا ہے سورہ منافقون کی شروع آیت پر ٹھٹھے یہ منافق آپ کے پاس آکر تباہ شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ بھی جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں،

تو یہاں سچی بات کی گواہی دینے والے کو کوئی جھوٹا نہیں کہہ سکتا مگر اللہ تعالیٰ کو اس کا حق ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو جس طرح بھی مخاطب کرے بندوں کو اس کی نقل جائز نہیں بندوں کو یہی اعتقاد رکھنا چاہیے کہ ہر وہ بات جس پر شرعاً گناہ کا اطلاق ہو سکے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، قصد او عدا ہو، معمول چوک سے انبیاء علیہم السلام ان سے پاک اور معصوم ہیں نعمانی،

پھر اہل سنت نے یہ بھی کہا ہے کہ ایسی معمولی باتیں جو زینت یا دنائت طبع کے سبب ہوں وہ انبیاء کرام علیہم السلام سے معمول چوک سے بھی سرزد نہیں ہوتیں کہ ان کی وجہ سے بدعت کی غرض و غایت پر حرف آسکتا ہے اور لوگوں کو ایسی صورت میں اتباع میں تنفر ہو سکتا ہے،

مرتبہ نبوت اور مقصد بدعت کا قطری تقاضا یہ ہے کہ جو اس اعزاز سے مشرف کئے جائیں، وہ معصوم عن الخطا ہوں گناہوں کے صدور سے ان کو پاک رکھا اور مانا جائے کیونکہ اگر ان سے گناہوں کا صدور ممکن ہوتا تو،
(۱) یہ ان کی دعوت و تبلیغ میں قوی فعلی تناقص ثابت کرتا ہے۔ کہ امت کو گناہوں سے بچنے اور اپنے اتباع کی دعوت کے ساتھ خود ایسا نہیں کرتے۔

(۲) گناہ پر بندے مستحق عذاب ہوتے ہیں، بلکہ مقربین کو تو دو چند عذاب کی وعید ہے ایسی صورت میں ان کا مستحق عذاب ہونے والا کام کرنا منصب نبوت کے خلاف اور منافی ہے کیونکہ نبی تو اپنی امت کی نیکی و بدی کا گواہ اور ان کا شفیع ہوتا ہے، اور جب وہ خود ہی اپنے کام میں قاصر ہوا تو کیسے شفاعت کرے گا اور کیسی گواہی دے گا۔

(۳) اگر نبی سے بھی صدور گناہ مان لیا جائے تو پھر وہ جابر حاکموں کے مانند ہو جائیں گے کہ لوگوں کو تو بد اطواروں پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور سزائیں دیتے ہیں، مگر خود انہیں بد اعمالیوں کے مرتکب ہوتے ہیں حالانکہ جابر حاکم اور نبی کی روش میں فرق ہونا چاہیے،

(۴) اگر وہ بھی گناہ کریں۔ تو اللہ کی طرف سے گناہ کی جو عقوبت اور سزا ہے، اس کا مستحق بننے سے کیسے بچیں گے۔

(۵) اگر یہ گناہ کریں تو جب وہ امت پر ظاہر ہوں گے تو وہ ان کی اطاعت کہاں کریں گی اس کی دل میں جو عزت و وقار ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔ وہ پھر ان کی کسی بات کی بھی تصدیق نہ کریں گے۔

یہ چند ظاہری وجوہ ایسی ہیں، کہ ان کا تقاضا ہے کہ نبی، ہر قسم کے گناہوں اور لغزشوں سے پاک اور معصوم ہو۔ اور اہل سنت ہمہ جہت نبی کو معصوم اور گناہوں سے پاک مانتے ہیں،

مگر امامیہ کا ایک فرقہ یعفور یہ اس کا قائل ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صدور جائز ہے، یہ فرقہ جس عقیدہ کا اظہار کھلے الفاظ میں کرتا ہے بقیہ تمام امامیہ درپردہ ہمنوائی کرتے اور اپنی کتابوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے

میں ناپاک کاموں اور گندے اعمال کی روایات نقل کرتے ہیں عنقریب اپنے موقع پر اس کی تفصیل گوش گزار کی جائے گی
 عقیدہ (۴) - انبیاء کرام علیہم السلام، دروغ گوئی اور بہتان بازی سے بہرہ ریشیت و حالت پاک ہیں، سہو اچھی اور
 عمد اچھی، قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی،

لیکن امامیہ کہتے ہیں کہ انبیاء کے لئے کذب جائز ہے، بلکہ بلحاظ تقیید واجب ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کے قول الیٰ یقیم کو ای پر عمل کرتے ہیں حالانکہ ان حضرات کے متعلق کذب جائز ہو کر بطور تقیید ہی ہسی تو انہیں سے اعتقاد اور ہدایت ملے اور بہشت کا
 عرض بھی جاتی رہے اور اگر تقیید کو انبیاء کے لئے جائز مانا جائے تو تبلیغ احکام ناقابل عمل ہو جائے گی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بقولانی ہمیں جب کوئی کام
 و مددگار نہ تھا، آپ اگر تقیید فرماتے، کہ تقیید کی ایسے وقت ہی زیادہ احتیاج ہوتی ہے، اور قوم کی ایذا رسانی سے خوف
 زدہ ہو کر حکم الہی کے خلاف ظاہر کرنے تو حکم الہی کے معلوم ہونے کی پھر کیا صورت رہ جاتی چنانچہ اس مسئلہ کی تحقیق اشارۃ
 عنقریب معلوم ہو جائیگی،

دہیہ بات کہ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ لَنْ یُکَذِبَ اِبْرٰہِیْمُ اِلَّا شَدَّتْ کَذِبَاتِہٖ تُو اس میں کذب کے حقیقی معنی مراد
 نہیں ہیں، بلکہ اشارات و استعارات مراد ہیں، جس کو کم سمجھ اور کم فکر آدمی جھوٹ سمجھ لیتا ہے اور ان کو شکل مشابہت
 کے سبب لفظ کتب سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اس کی کافی ثانی بحث باب دوم میں گزر چکی۔

عقیدہ (۵) - انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے واجبات ایمان کا علم قبل و بعد نبوت ضروری ہے، جبکہ عقائد میں جہالت
 و لاعلمی کفر و زندقیت ہے تو انبیاء پر اس کیفیت کے کسی لمحہ کا تصور کیسے درست ہو سکتا ہے، ہاں وحی الہی کے نزول
 سے پہلے احکام شرعی سے لاعلمی ہوتی ہے۔ اور عَلَمٌ مَّا کُنْتَ تَعْلَمُ آپ کو وہ علم سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے،
 میں اسی کی طرف اشارہ ہے، مسلمان اور اکثر یہود و نصاریٰ اس عقیدہ کو بالاجماع صیح و درست مانتے ہیں، اور جابہ انصاف
 قرآنہ بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً، وَ کُلًّا اَتَيْنٰہُ حُکْمًا وَّ جِلْدًا ہِم نے ہر ایک کو علم و حکمت بخشی، وَ اَتَيْنٰہُ الْحُکْمَ
 صَبِیۡۃً اہم نے چھپن ہی میں حکم سے سرفراز کیا، وَ اَتَيْنٰہُ الْحُکْمَ وَ فُضِّلَ الْخَطِّابُ دہم نے ان کو حکمت اور فضل خطاب عطا
 کی، اسی مضمون پر دلالت کرنے والی اور بھی بہت سی آیات ہیں بعض مقامات پر اس مضمون کے بعد بعثت، رسالت، وحی
 اور نزول کتاب کا ذکر آیا ہے، بلکہ حضرت لقمان کے حق میں حکمت کا لفظ استعمال فرمایا جن کے پاس نہ وحی آئی نہ ان کو
 نبوت ملی تو معلوم ہوا کہ یہ علم قبل نبوت اور قبل نزول وحی بھی حاصل ہوتا ہے،

مگر امامیہ اس کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ بعثت کے وقت بلکہ اپنے رب سے مناجات اور مکالمہ کے وقت جوا اللہ تعالیٰ
 سے بشری قرب کا اعلیٰ مقام ہے انبیاء کو اصول عقائد کی معرفت نہیں ہوتی،

ان کی اس بدعقیدگی کی سند وہ روایت ہے جو محمد بن بابویہ قمی نے عیون میں اخبار رضا رحمۃ اللہ علیہ میں اور کتاب التحفیر
 میں بحوالہ علی بن موسیٰ رضا بسند باپ دادا امیر المومنین رضی اللہ عنہ تک پہنچائی۔ اور جسے محمد بن یعقوب کلینی نے کافی میں
 ابی جعفر سے بیان کی کہ اِنَّ مُوسٰی بِنَ عِیْرَانَ مَسَّاتِ اللّٰہِ وَ سَلَّ مَلٰٓئِکَہٗ عَلَیْہِ سَلٰٓئِلَ اللّٰہِ تَعَالٰی فَنَقَالَ یَا اَبِیۡ
 اَبِیۡنَا اَنْتَ مَتٰی فَا مَا ذٰلِکَ اَمْرٌ قَرِیۡنُکَ فَا مَا جِیۡکَ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اے رب
 آپ مجھ سے دور ہیں کہ میں آپ کو پکاروں یا میرے قریب ہی ہیں کہ میں سرگوشی کروں، یہ روایت بتاتی ہے کہ
 مناجات و مکالمہ کے وقت تک موسیٰ علیہ السلام کو یہ پتہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قرب و بعد مکانی سے پاک ہے ا

ان لوگوں کی مذکورہ بالا روایت کی اصلیت و حقیقت یہ نہیں ہے جو انہوں نے بیان کی ہے، بلکہ سوال و جواب کا یہ واقعہ ایک اعرابی کا ہے۔ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پوچھا یا مُحَمَّدُ ابْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَرِيبٌ اَمْ قَرِيبٌ فَتَنَّا جَنِيْدًا۔ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارا رب دور ہے کہ ہم اسے آواز سے پکاریں یا قریب ہے کہ ننگر گونشی کریں، اعرابی نے تو اپنی فہم و سمجھ کے مطابق ایک عام سا سوال کر دیا تھا، مگر اس سوال کے جواب کے بہت سے نازک اور دقیق گوشے بھی تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح تھے اور آپ کے جواب کا تعلق صرف اسی اعرابی تک محدود نہیں تھا بلکہ صاحبان فہم و شعور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم جو حاضر تھے یا جن تک یہ جواب پہنچتا ان سے بھی اس کا تعلق تھا اس لئے آپ نے فوری جواب دینے میں کچھ تامل فرمایا،۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب اپنے ذمہ لے کر فرمایا، اِنْ سَاَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَاَقْبِرْنِيْ بِجِبْرِیْنِ۔ جب میرا بندہ آپ سے میرے متعلق سوال کرتا ہے تو میں ان سے قریب ہوتا ہوں، اس آیت سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے دور نہیں نزدیک ہی ہیں، گو یہ نزدیکی مکانی نہ ہو اس لئے نزدیکی مکانی کے جو فوائد و آثار مرتب ہوتے ہیں وہ یہاں بھی حاصل ہیں، اسی لئے اس سے کہے غور و فرماتا ہے، اُحِبُّبْ مَطْلُوْقَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَاكَ فِيْ مِیْنِ اِسْمِیْ پکارنے والے کی پکار کو جب وہ مجھے پکارتا ہے سنا ہوں۔

اگرچہ یہاں ان الفاظ کے حقیقی معنی مراد نہیں لیکن خدا تعالیٰ کی ہدایت کا طریقہ یہی ہے کہ ہم کے قیدیوں کو انہیں کی معلومات اور اوہام کے مطابق جواب دیتا اور تسلی خاطر کرتا ہے یہ اعرابی چونکہ وہم کا قیدی اور حواس کی بندشوں میں جکڑا ہوا تھا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے قرب و بعد کو بھی اسی پیمانے سے ناپتا تھا، جیسے دوسری اشیاء کو جو اس کے سامنے تھیں اس لئے کہ جب ایک موجود شئی کا مقابلہ دوسری موجود شے سے کیا جائے تو وہ یا اس کے قریب ہوگی یا بعید اس کی محدود سمجھ میں یہ بات کسی طرح آ ہی نہیں سکتی تھی کہ شے موجود بھی ہو اور اس قسم کے مکان و جہت اور قرب و بعد سے پاک بھی ہو۔ تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کے اوہام و معلومات کے مطابق جواب دیا، کہ اس کی تشفی ہو جائے اس کو معقولہ کی طرف ترقی کرنے پر مجبور کرنے والا جواب مرحمت نہیں فرمایا جیسے کسی کم سن بچی سے سوال کیا گیا۔ اَیْنَ اللہ اللہ کہاں ہے، اس نے جواب دیا فی السماء و آسمان میں، تو اس پر سکوت فرمایا۔

تقریباً ہی قصہ تھا جس کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے بھی بیان فرمایا اب ان کے راویوں کی قوت حافظہ کا کمال کہنے یا اندرونی جنت و شہادت کہ ایک اعرابی کی جگہ ایک اولو علم مزیغہ کا نام ٹانک دیا اور یوں قعر ذلت و ضلالت میں جا پڑے اور اہل فہم و دانش و بچھڑیں کہ اہل سنت کی روایات میں اور ان کی روایات میں جو فرق ہے وہ یہی ہے اور اسی غلطی سے ہی بآسانی یہ نتیجہ نکل آتا ہے، دعائے صنتی قریش اور صحابہ کرام کی دوسری برائیوں والی روایات میں بھی انہوں نے ناموں اور القاب میں اس قسم کا رد و بدل اور شنائل و صفات میں اسی نوعیت کی تحریفات کر کے بات کہاں سے کہا لے جانے کی سعی ناشکور کی ہے! یہ سادہ کی ٹوپی محمود کے سروائی کہادت کے عملی و علمی ماہر ہیں،

اور یہ سب کچھ دین و دیانت سے غفلت اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے اس فرقہ نے اسی غفلت اور لاپرواہی سے ہر کہ و ناکس کو دین سے استفادہ کا اہل گردانا۔ اور اس کی باتوں اور روایتوں کو امتحانی کسوٹی پر نہیں دیکھا کہ کھرا کھرا خالص اور خالص ایک دوسرے سے جدا و ممتاز ہو جائے!

اسی طرح کی ایک روایت ان کے ہاں حضرت یونس کے متعلق بھی ہے جو کہ یحییٰ نے ابی عبد اللہ سے روایت کی ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ -

إِنَّ يُونُسَ كَانَ يَقُولُ فِي مُجُودٍ أَمْرًا مَعَدًّا وَقَدْ عَقَرْتُ لَكَ فِي الثَّوَابِ وَخُجْئِي أَمْرًا مَعَدًّا وَقَدْ أَطَمَّاتُ لَكَ فِي أَجْرِي أَمْرًا مَعَدًّا وَقَدْ اسْتَهْزَتْ لَكَ كَيْلِي - أَمْرًا مَعَدًّا وَقَدْ اجْتَنَبْتُ لَكَ الْمَكَايِي قَالَ فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ أَنْ تَكُنْ مَرَأً سَلَفًا فَإِنِّي خَلِّدُ مَعَدًّا نَبِيَّ فَقَالَ إِنَّ كَلْبًا لَأُعَذِّبُكَ ثُمَّ عَذَّبَنِي كَأَنَّمَا ذَاكَ عَبْدُكَ وَأَنْتَ بِرَبِّي فَأَوْحَى اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ إِسْمًا مَرَأً سَلَفًا فَإِنِّي خَلِّدُ مَعَدًّا بِكَ وَإِنِّي إِذَا وَعَدْتُ وَعْدًا أَوْفَيْتُ بِهِ -

حضرت یونس سجدہ میں پڑے کہہ رہے تھے کہ کیا تو مجھے عذاب دے گا جب کہ میں نے تیرے لئے اپنا چہرہ گروا کر دیا کیا تو مجھے عذاب دینا پسند کرے گا جب کہ میں نے اجر و ثواب کی خاطر خود کو پیسا مارا کیا تو مجھے عذاب دینا گوارا کرے گا جب کہ میں نے تیری خوشنودی کی خاطر اپنے اور پر رات کی نیند حرام کر لی کیا تو مجھے عذاب دینا جائز سمجھے گا جبکہ میں نے تیرے خوف کے سبب گناہوں سے پرہیز کیا (راوی کہتا ہے) اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کی کہ اپنا سر اٹھا میں تجھے عذاب نہیں دوں گا تب حضرت یونس نے کہا کہ تو کہتا ہے کہ عذاب

نہیں دوں گا مگر اس کے باوجود عذاب دیدیا تو پھر کیا ہوگا کیا میں تیرا بندہ اور تو میرا رب نہیں ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے پھر وحی فرمائی کہ تو سر اٹھا میں تجھے عذاب نہیں دوں گا جب میں وعدہ کرتا ہوں تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اس روایت معیم سے دو باتوں کا ثبوت ملتا ہے کہ اول حضرت یونس علیہ السلام کو یہ معلوم نہیں تھا کہ خلاف وعدگی بری بات ہے، اور علامات نفاق سے ہے، اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے،

دوسرے یہ کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے ایک معصوم کو عذاب دینا اس لئے ناممکن ہے ورنہ اپنے متعلق عذاب سے خوفزدہ کیوں ہوتے۔

لیکن اگر یہی بات ہوتی کہ حضرت یونس علیہ السلام اصول کے اعتقادی مسئلہ سے ناواقف ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں یہ فرماتے کہ ہم مطیع و فرمانبردار کو عذاب نہیں دیتے، اس کے بجائے وعدہ والی بات نہ فرماتے یہ بات تو اسی لئے فرمائی کہ یونس علیہ السلام اس کو جانتے اور مانتے تھے کہ خلاف وعدہ برا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے، خلاف کلام یہ کہ یہ روایت بھی ان کی من گھڑت اور جلساری کا ایک نمونہ ہے اور انہیں کے خیال و گمان کے موافق بھی وہ قطعی دلائل سے باطل اور ناقابلِ سماع ہے،

ان کی ساری ہی ہدایتوں کا یہی حال ہے کہ وہ خود ہی بزبانِ حال و الفاظِ آپ ہی اپنی تردید ہوتی ہیں، عقیدہ (۶) انبیاء کرام علیہم السلام ایسے گناہوں سے پاک ہیں جن کی پاداش میں موت یا ہلاکت ہو، مگر امامیہ اس عقیدہ میں بھی اختلاف کرتے ہیں۔ اور بعض انبیاء علیہم السلام کے متعلق درج ذیل قسم کی روایت بیان کرتے ہیں، چنانچہ یحییٰ نے ابن ابی یعفور کے حوالہ سے جناب ابی عبد اللہ سے یہ روایت بیان کی ہے،

وہ کہتا ہے کہ میں نے ابی عبد اللہ کو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے یہ کہتے سنے کہ اے میرے رب مجھے پلک بھپکنے یا اس سے بھی کم مدت کے لئے میرے نفس کے حوالہ نہ کر یہ الفاظ پوری

قَالَ سَبَّغْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ لِيُقُولَ وَهُوَ سَائِمٌ يَدُلُّهُ إِلَى الشَّأْنِ سَبَّ لَأَتَكَلَّمُنِي إِلَى نَفْسِي طَوَّفَتْ عَلَيْنِ أَهْلًا وَلَا أَهْلًا مِنْ ذَالِكَ فَمَا كَانَ بِمَثَرٍ عَلَيْنِ أَنْ

تَحْلِلَ رَأْسَهُ مِنْ جَوَانِبِ يَحْيَى ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى فَقَالَ
يَا ابْنُ الْكَفَّورِ إِنَّ يُونُسَ ابْنِي مَتَّى وَكَلَّمَ اللَّهُ إِلَى نَفْسِهِ
أَقْبَلَ مِنْ طُورٍ عَلَيْهِ فَأَحْدَثَ ذَالِكَ قُلْتُ كَيْفَ بِهِ
كُفْرًا أَفَلَا يَكْفُرُ اللَّهُ فَقَالَ لَا وَلَكِنَّ الْمَوْتَ هَلَكِي تِلْكَ أَعْلَالُ
كَانَ هَكَذَا

طرح ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور
دراویحی کے اطراف گرنے لگے پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا
کہ اسے ابن ابی یعفور اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام
کو پک بھینکنے سے کم مدت کے لئے ان کے نفس کے حوالہ کر دیا
تھا کہ یہ آفت و امتحان درپیش ہو گیا میں نے کہا اللہ آپ کو

نیک نجات کرے کیا وہ کفر تک پہنچ گئے تھے آپ نے فرمایا نہیں لیکن اس حالت پر موت آ جانا ہلاک و بربادی ہوتی ہے
حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق واضح رہنا چاہیے کہ ان کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے، وہ اسی قدر ہے
کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر ہی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اسی پر یہ ابتلا پیش آیا دوسری بات یہ تھی کہ قوم کو بددعا
دینے میں انتظار کم کیا اور ان کو ایذا رسانی اور تکذیب پر صبر و تحمل کی باگ ہاتھ سے جلد ہی چھوٹ گئی اور ظاہر سے کہ یہ دونوں
باتیں سرے سے گناہ ہی نہیں تو کبیرہ ہونے کا کیا سوال،

بات یہ تھی کہ آپ اپنی تبلیغ تبلیغ کے باوجود اپنی قوم کی نا ہنجاری کے سبب سے بعض قوی قرائن سے یہ سمجھ چکے تھے
کہ اب ان کے ایمان لانے کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں اس لئے ان کے حق میں بددعا کی اور جب یہ دیکھا کہ اس قوم پر آیا
ہوا عذاب ٹل گیا تو اندیشہ ہوا کہ اب تو یہ میری تکذیب میں اور بھی نڈر اور بے دھڑک ہو جائیں گے ہو سکتا ہے ایذا
رسانی میں اور بڑھ جائیں گے اور تمغہ بھی اڑائیں گے کہ بددعا بھی رائج ہو گئی۔ یہی سوچ کر قوم کو چھوڑ کر نکل کھڑے
ہوئے، وحی الہی اور اجازت ربانی کا انتظار نہیں کیا، اور جن کے رتبے ہیں سو ان کو سوا مشکل ہے، کے تحت ذرا
سی بات پر خاصے سخت عتاب اور تادیب کے مورد بنے،

حضرت یونس علیہ السلام کے سارے قصہ میں کہیں ان کے کسی فعل و عمل سے نافرمانی کا ثبوت نہیں ملتا بس اندیشوں
میں گھر کر گھبراہٹ کا شکار ہو گئے اور اجازت ربانی کی ضرورت سے توجہ ہٹ گئی اگر حضور اصبر کر لیتے تو سارے اندیشے
بھی دور ہو جاتے اور اس کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی کہ قوم پر آیا ہوا عذاب کیوں ٹل گیا تھا۔ ہوا یہ کہ آپ کی بددعا کے بعد
عذاب کے آثار دیکھ کر قوم کو تنبیہ ہوا وہ نادوم ہو کر توبہ استغفار میں لگ گئی اللہ تعالیٰ سے اپنی خطاؤں اور گناہوں کی
معافی مانگی اور آئندہ حضرت یونس علیہ السلام کی فرمانبرداری و اطاعت کا سچے دل سے اقرار کیا،
مگر ان ساری باتوں کا علم ہونے سے پیشتر ہی حضرت یونس علیہ السلام شہر چھوڑ گئے تھے اگر وہ انہیں میں کچھ اور
رہ جاتے تو ان کی قوم آپ ہی کے وسیلے اور توسط سے توبہ استغفار پیش کرتی،

اب قرآن مجید میں جو ان کے متعلق فَخْلًا لَّكَ لَنْ تُقْدِرَ عَلَيْهِ آیہ ہے تو اس میں قدر قدرت سے مشتق نہیں ہے،
جس کی وجہ سے آپ کو فساد عقیدہ کا الزام دیا جائے بلکہ اس کے معنی یہاں ضیق و تنگی کے ہیں، جیسے اللہ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ اللہ جس کا چاہتا ہے، رزق فراغ کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے، اور ان معنوں کے
مراد لینے کا قرینہ یہ ہے کہ اسی کے متصل فرمایا فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ اس ندا اور فریاد کو بعد میں لانا قدرت کے معنی
کے مناسب نہیں، یہاں اول معنی ہی بخوبی چسپاں اور موزوں ہیں اس صورت میں یہ معنی ہوں گے، کہ اس نے گمان کیا
کہ ہم اس کی عتاب سے گزرت نہ کریں گے پس بامید قبولیت توبہ کی اور استغفار بجالایا اور حضرت یونس علیہ السلام کا

اقرار ظلم میں اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ۔ کہنا اللہ تعالیٰ کی جناب میں صرف کسر نفسی اور انتہائی تصرف و زاری کا اظہار ہے فرمانبردار بندوں کی عادت اور طریقہ یہی ہوتا ہے، کہ اعتراف قصور کے وقت اپنی معمولی بات کو بھی بڑا قصور ظاہر کرتے ہیں یا ایسا اس بنا پر کہہ کہ انبیاء کے لئے ترک اولیٰ ایسا ہی ظلم ہے جیسے عوام کے حق میں گناہ ظلم ہے، عقیدہ (۷)؛ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام حسد بغض اور نافرمانی پر اصرار، اور جے رہنے سے پاک تھے۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے، چنانچہ ارشادات ربانی ہیں، ثُمَّ اجْبَلْنَاهُ نَبَاتًا عَلَیْهِ وَهَدَّاهُ رَجْعًا اِسْمَ رَبِّهِ اس کے رب نے اس کو برگزیدہ کیا، اس کی توبہ قبول کی اور ہدایت دی۔ فَتَنَّا اٰدَمَ مِنْ تَحْتِهَا فَاَتَتْهُ الشَّيْطَانُ فَخَلَا مِنْهَا سَبْعَ اَلْفَ سَنًا اِسْمَ رَبِّهِ اس کی توبہ قبول ہو گئی، بلا شک وہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے، اِنَّ اللّٰهَ اَسْفُطَ اٰدَمَ وَنُوحًا وَاٰلَ اِبْرٰهٖمَ وَاٰلَ اِسمٰوٰنَ عَلٰی النَّارِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی نے آدم و نوح اور آل ابراہیم کو عالم والوں پر برگزیدہ کیا۔

مخلوقاتِ آسمانیہ کے وہ اپنے باپوں کے باپ کے حق میں شرمناک ناخلفی کا ثبوت دیتے ہیں، اور انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کو حسد بغض اور دوسری نازیبا خصلتوں سے مستصف کرتے اور یہ گمان بد کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور عدول مکملی پر بصد تھے اور ابلیس کا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جو رویہ رہا کہ اس نے حسد کر کے سجدہ کے حکم کو ٹھکرایا خدا کے عہد کو ترک کیا اور ابدی لعنت کا مستحق ہوا۔ وہ کہتے ہیں یہی رویہ حضرت آدم علیہ السلام کا ائمہ کے ساتھ تھا کہ ان سے حسد کیا، ان کی ولایت کا عہد کر کے گویا اللہ تعالیٰ سے عہد شکنی کی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی پاداش میں ان پر غصہ کیا اور ہمیشہ غضبناک ہی رہا۔ کوئی حد ہے اس دریدہ و ہنسی کی پناہ بخدا۔

محمد بن بابر نے عیون اخبار الرضا میں علی بن موسیٰ الرضا سے روایت کی کہ انہوں نے فرمایا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ عزت بخشی کہ فرشتوں سے ان کو سجدہ کرایا اور جنت میں رکھا تو انہوں نے دل میں سوچا کہ میں مخلوقات میں سب سے زیادہ باعزت ہوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم اذرا اپنا سر تو اٹھاؤ اور میرے عرش کے پایہ کو دیکھو، حضرت آدم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس پر یہ لکھا دیکھا کوئی معبود اللہ کے سوا نہیں محمد اللہ کے رسول ہیں، علی اللہ کے دوست اور امیر المؤمنین ہیں اور ان کی زوجہ فاطمہ سارے عالم کی عورتوں کی سردار اور حسن حسین اہل جنت کے جوانوں کے سردار اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا اے میرے رب یہ کون لوگ ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تیری اولاد میں سے ہیں جو تجھ سے

اِنَّہٗ قَالَ اِنَّ اٰدَمَ لَمَّا اٰتٰہُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِرَسْمِہٖ اَلْمَلٰئِکَۃَ لَہٗ وَ اِذْ خَالِیَ الْجَنَّةَ قَالَ فِیْ نَفْسِہٖ اَنَا اَكْرَمُ الْخَلْقِ فَنَادٰی اللّٰهُ هَٰذَا وَجَلْ لَہٗ نَعْمَ ہَا اَسَدُکَ یَا اٰدَمُ فَاَنْطَرٰ اِلٰی سَاقِ حَورِشٰی فَرَفَعَ اَدَمَ ہَا اُسُّکَ فَجَعَلَ فِیْہِ مَخْرَجًا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلٰی وِلٰی اللّٰہِ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ ہَا وَجَّہُکَ فَا طَمَعَتْ سَیِّدَۃُ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ وَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ سَیِّدَا اَسْبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَقَالَ اَدَمُ یَا رَبِّ مَنْ هَٰذَا لِیْ فَقَالَ

عَدُوٌّ لِّیْ طَرَدَہٗ مِنْ ذِمَّتِکَ وَ هُمْ خَدِیْرٌ مِّنْکَ وَ مِنْ جَمِیْعِ خَلْقِیْ وَ کَوْلَاہُمْ مَا خَلَقْتُکَ وَ مَا خَلَقْتُ الْجَنَّةَ وَ النَّارَ وَ لَا السَّمَاءَ وَ لَا اَرْضَ

فَإِنَّمَا أَنْ تَنْظُرَ إِلَيْهِمْ بِعَيْنِ الْخَسَدِ نَاجِحِيكَ مِنْ
جَوَارِي النَّظَرِ إِلَيْهِمْ بِعَيْنِ الْخَسَدِ فَسَلِّطْ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانَ
حَتَّى أَكَلَ مِنَ الشَّجَرِ الَّتِي نَهَى اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا -
سے دور کروں گا تو حضرت آدم نے ان پر حسد کی نظر ڈالی اور اللہ نے ان پر شیطان کو مسلط کر دیا یہاں تک کہ انہوں
نے اس درخت کو کھایا جس سے روکا تھا،

اور ابن بابویہ نعمانی الاخبار میں مفصل بن عمر سے اور اس نے ابی عبد اللہ سے بھی یہ روایت بیان کی ہے
”جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو جنت
میں ٹھیکہ کیا تو ان سے کہا کہ جنت میں جہاں سے اور جو
جی چاہے خوب سیر ہو کر کھاؤ مگر اس درخت کے قریب
نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ جب انہوں
نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، علی فاطمہ حسن حسین (رضی اللہ عنہم)
ان کے بعد ائمہ کے درجے کو دیکھا تو اس کو اہل جنت کے
تمام درجوں سے اشرف و اعلیٰ پایا۔ بولے اے میرے رب
یہ درجہ کس کا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے عرش
کے پایہ کو تو ذرا سراٹھا کے دیکھو انہوں نے جب سراٹھایا
تو وہاں جبار کے نور سے پایہ عرش پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم
علی فاطمہ حسن حسین اور ائمہ رضی اللہ عنہم کے اسلئے گرمی
لکھے ہوئے دیکھے اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اے ہمارے
رب آپ کے نزدیک باعزت محبوب اور اشرف اس مرتبہ کو کس
نے بنایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ
کرتا۔ یہ میرے علم کے خزانے ہیں، اور میرے جید کے انندار
تم حسد کی نظر سے ان کو دیکھنے سے بچو۔ اس مرتبہ کی تمنا کرو جو
ان کو میرے حضور میں حاصل ہے، نہ اس عزت کی جگہ کی آرزو
رکھو جو ان کو میرے دربار میں میسر ہے کہ ایسا کرنے سے تم میری
نافرمانی اور عدول علی کے مرتکب ہو گے اور تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا، پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور فریب
سے اپنے قابو میں کر کے ان کو درجوں کی تمنا پر اکسایا تو انہوں نے ان کو حسد سے دیکھا اور اس کی وجہ سے خوار ہوئے“

اب اگر کوئی عقلمند ان دونوں روایتوں پر غور کر کے دیکھے تو وہ دیکھے گا کہ ان میں حضرت آدم علیہ السلام کے شان
میں تحقیر و اہانت میں یہ حد سے بھی گزر گئے سب جانتے ہیں کہ اول تو حسد ویسے ہی تمام ادیان و مذاہب میں ہی اور نازیبا
صفت شمار ہوتی ہے، اور پھر بزرگوں اور برگزیدہ بندوں کے نزدیک تو وہ بڑے سے بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے اس کے

باوجود بھی وہ اس کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کس ڈھٹائی سے کر رہے ہیں اور وہ بھی جناب باری کی طرف سے انتہائی تاکید و ممانعت کے بعد گویا ان کے مذہب میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس میں کوئی فرق نہ رہا ابلیس نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا تھا، وہی انہوں نے اپنی اولاد کی برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ کیا۔

بلکہ آپ کا فعل ابلیس سے بھی بدتر ہوا۔ کہ ابلیس کا تو حضرت آدم علیہ السلام سے کوئی تعلق نہ تھا بخلاف حضرت آدم علیہ السلام کے کہ ان کا توان بزرگوں سے باپ بیٹوں کا رشتہ تھا، اور یوں قطع رحمی کا الزام بھی آیا اور پھر اولاد سے حسد کرنا جابر ظار محال میں سے ہے، سب سے پہلے پیغمبر مسعود ملائک اور جنت میں لینے والے کی طرف منسوب ہوا کوئی حد ہے، بدعتی کی العیاذ باللہ!

امامیہ کے مذہب میں حضرت آدم علیہ السلام کا بندوں کے ساتھ معاملہ میں تو یہ عقیدہ ہے۔ اب فرایہ دیکھئے کہ آدم علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ میں ان کی خباثت کیا گل کھاتی ہے اور وہ کس طرح اپنی بددینی اور بے ایمانی پر مہر تصدیق بدست خود ثبت کرتے ہیں اس کے لئے یہ روایت ملاحظہ فرمائیے،

محمد بن صفار نے ابی جعفر سے یوں روایت کی ہے،

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لِأَدَمَ وَمَنْ وَجَّهْتَهُمْ أَعْرَجْنَا مِنْ مُنْبِتِهِمْ
أَنْتُمْ يَرْكَبُكُمْ وَهَذَا مُحَمَّدٌ تَرْكَبُكَ اللَّهُ وَعَلَيْكَ
أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ وَأَوْصِيَانُهُ مِنْ بَنِيهِ وَوَلَاؤُكُمْ أَمْرِي
وَأَنْ الْمَلِكُ فِي رَأْسِهِ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي وَأَهْبَدُ بِهِ
كُلَّ عَمَلٍ وَكَرِهًا قَالُوا أَأَقْرَبُ نَا وَشَهِدْنَا وَأَدَمُ لَمْ
يَقْرَ وَكَمْ يَكُنْ لَهُ هَذِهِ عَلَى الْأَفْوَارِ بِهِ-

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت سے
جس کو اس نے انہیں کی پشت سے نکالا تھا سوال کیا کہ
میں تمہارا رب نہیں ہوں اور یہ محمد اللہ کا رسول علی امیر المؤمنین
اور ان کے بعد ان کے وحی میرے حکم کو نافذ کرنے والے۔
اور البتہ مہدی نے میرے دشمنوں سے بدلہ لیا۔ اور اس کی
وجہ سے میری عبادت کی جگہ کے خوشی سے بانا خوشی سے
سب نے جواب دیا۔ کہ ہم اقرار کرتے اور گواہ ہوتے ہیں، اور حضرت آدم علیہ السلام نے نہ اقرار کیا اور نہ اقرار کا ارادہ
رکھتے تھے،

اس روایت میں ان کا خبیث کھل کر سامنے آگیا، اور حضرت آدم علیہ السلام پر کفر صریح کا الزام عائد کر دیا کیونکہ جو
دانکار کفر صریح ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اس پیغمبر کو کافر ٹھہرایا جس کو اس نے دونوں ہاتھوں سے بنایا اپنی روح خاص
اس میں بیوقوفی اور جس کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ - واللہ تعالیٰ نے آدم کو برگزیدہ کیا، اور فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم فرمایا ہودین و ایمان
سے کس قدر دور ہے۔

ان امور کے بارے میں شریف مرتضیٰ نے خاص جمیعت اسلامی کا مظاہرہ کیا اور اپنی کتاب الغرر واللہ میں حدیث
بیشاق کی صحت سے صاف انکار کیا، اور کہا کہ یہ حدیث من گھڑت اور موضوع ہے، اور اسی وجہ سے ابن صفار اور شیوخ
نے اس کو دائرہ ایمان سے خارج قرار دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تعصب میں اتنے اندھے کیوں ہو گئے ہیں کہ قرآن مجید کو کھول کر دیکھنا بھی گوارا نہیں،
یا پھر اتنے ماہل ہو گئے اور بد عقل ہیں کہ قرآن مجید سے اتنی بات کا ان کو پتہ نہیں چل سکا کہ حضرت آدم علیہ السلام

پر عتاب محض درخت سے کچھ کھالینے کے سبب تھا، جو بالا جماع گناہ کبیرہ نہیں ہے اور اگر عتاب کا سبب وہ امور ہوتے جن کا یہ ذکر کرتے ہیں، تو ان ہی کو قرآن میں سبب عتاب ٹھیرایا جاتا۔ آخر کیا بات تھی کہ ان کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا جاتا۔ ان امور کے ذکر کرنے سے یہ بھی فائدہ ہوتا کہ جناب حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کو بھی سخت ہو جاتی اور وہ بھی بسلسلہ امامت برائیوں سے بچ جاتے اور براہ راست بلا فیصل بہت جلد حقداروں کو ان کا حق مل جاتا اور دین و شرع کا توبہ معاملہ ہے ہی، عقل سلیم بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے، مثلاً ایک شخص نے خواہ مہمان بن کر یا ہجرانگھر میں گھس کر ایک شخص کے درکے کو مار ڈالا، اس کے حکم کی بھی نافرمانی کی اور اس کے گھر کے درخت کا پھل بھی توڑ کھایا۔ اب مواخذہ کرنے والا وہ شخص سارے قسروں کو ایک طرف کر کے درخت کے چند پھلوں کے کھانے پر تو واہل مچار ہے، مگر نہ لڑکے کے قتل کا ذکر کرتا ہے نہ اس کی عدول حکمی کا اور نہ کسی اور بات کا۔ تو عقل سلیم اس کو کب گوارا کر سکتی ہے۔

اور ترک عہد کے سلسلہ کی ایک اور روایت بھی ان کے ہاں ملتی ہے چنانچہ سفارہ مذکورہ آیت وَلَقَدْ عٰهَدْنَا اٰدَمَکَ ذٰلِکَ فِیْہِیْنَ لَکُمْ تَابَہُ۔

وہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے بعد ائمہ کے بارے میں عہد لیا مگر انہوں نے عہد کو ترک کیا اور ان کے خیال میں وہ ایسے تھے،۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سفارہ جو سی تھا۔ اس کے دادا کا نام فرخ تھا۔ اور یہ خود کو موسیٰ بن عیسیٰ اشعری کا غلام کہتا تھا، جو سیت کی ناپاکی اس کی اہل نسل میں ابھی تک رہی بس تھی، شیعوں کے مہیا کردہ ہتھیار تفسیر سے کام لیتے ہوئے، مذہب شیعہ پر بھی پردہ ڈالے رکھتا تھا، اور درپردہ یہ اسلام دشمنی کے ساتھ ساتھ ائمہ کرام کا بھی چھپا دشمن تھا، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی روایات سب ایسی ہی ہیں، جو یہ ائمہ سے بیان کرتا ہے، کہ ان سے خود ائمہ کا وقار و محروم اور ان کی شان میں بڑھ گلتا ہے، اور ان کی عزت پر حرف آتا ہے، مثلاً یہی مذکورہ بالا روایات کہ اہل مذہب کے تمام طبقات خواہ یہودی ہوں، نصرانی ہوں یا مسلمان حضرت ابوبکر و آدم علیہ السلام کی بزرگی اور کرامت پر جو ان کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حاصل تھی متفق الحیال، اور تمام عالم والوں میں ان کی بزرگی پر متفق الرائے ہیں، ایسی صورت میں جب اس قسم کی روایات ائمہ سے منسوب ہو کر تمام عالم میں پھیل گئیں تو سارے انسان استحقاق امامت تو رہا ایک طرف ان کی ذاتی خوبی و زیادتی و دینداری اور بزرگی سے ہی منکر و بدعقیدہ ہو جائیں گے۔

اور اسلامی فضا میں پہلے بچ جائے گی اور یوں ان مجوسیوں کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی،

الحمد للہ اہل سنت پر ان کی بددیانتی بے ایمانی اور خیانت فاش ہو گئی انہوں نے ان کی روایات کو گندے، نجس اور ناپاک چیتھڑوں کی طرح کوڑھی پر پھینک دیا، ہاں شیعہ شیطان کے پھندے میں آ گئے، اس نے بڑھاری اور اہل ہرنی کر کے ان کا اور ان کے شیوخ ضلالت آب کا رخ ان کی طرف پھیر دیا کہ انہوں نے اپنے دین و ایمان کا مدار ان بے دین و بد مذہب مجوسیوں پر دیا۔ اور اپنا ایمان اہل بیت و مفسرین اور جعل سازوں اور کذابوں کی کھینٹ چڑھا دیا۔ پس ہے مِنَ یُضِلِّ اللّٰهُ فَمَا لَمْ یَکُنْ حَآجِدٍ رَّجْسٍ کَؤُا ائمہ گمراہ کرتا ہے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

عقیدہ (۸) اہل کسی نبی نے فرائض رسالت کی ادائیگی سے معافی نہیں چاہی اور نہ احکام الہی کا بجا آوری سے کبھی معذرت کی۔ اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ بعض اولوالعزم رسولوں نے رسالت کی ذمہ داریوں سے نہ صرف سبکدوشی حاصل کرنی چاہی بلکہ طاعن اور جیلے حوالے سے کام لیا اور غرض پیش کئے ان میں سے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جب ان کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست حکم دیا۔ اِنَّ اِلٰہَ الْقَوْمِ الْمَلٰٓئِیْنِ قُوۡدَرٌ فِیۡہِمْ وَہُوَ عَلٰمُ الْغُیۡوٰتِ اظالم قوم قوم فرعون کے پاس پہنچا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ مجھ کو اس کام سے معافی دیجئے اسے میرے رب مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری تکذیب نہ کریں اور میں ان کی چہ میگوئیوں سے تنگ دل نہ ہو جاؤں۔ اور نکنت کی وجہ سے ادائیگی مطلب سے قاصر نہ ہو جاؤں اور پھر میں اس قوم کا مجرم ہوں کہ ان کا ایک آدمی میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے کہیں اس کی پاداش میں مجھے قتل نہ کر دیں بہتر ہے میرے بھائی ہارون کو وہاں بھیج دیجئے اور مجھے معافی دیجئے۔

یہ لوگ یہ معنون قرآنی آیات سے اخذ کر کے اسے کلام الہی سمجھتے ہیں، حالانکہ رسالت سے معافی دراصل وحی کو ٹھکرانا اور اللہ کے حکم کو نہ ماننا ہے اور انبیاء اس سے معصوم ہیں،

امامیہ کے لئے آیات قرآنی سے تنگ کا کوئی راستہ نہیں، بلکہ اگر آیات میں غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان آیات میں انہیں پر الزام عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ آیات میں یہ بات کہ مجھ کو اس کام سے معافی دیجئے اور میرے بھائی کو میری بجائے رسالت سے نواز دیے، بالکل مذکور نہیں۔

یہ سب کچھ اس فرقہ کی ناتجربگی کا کرشمہ ہے۔ ہاں ادائے رسالت سے قبل قوم فرعون کی تکذیب کا اندیشہ اور یہ ڈر کہ وہ ان کو مار ڈالیں اور ان کی کبیدہ خاطر ہو اور نکنت زبانی یہ سب کچھ جو آپ نے فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ آپ طاعن ٹھہر رہے ہیں یا معافی کے خواستگار تھے، بلکہ احکام الہی کا بجا آوری میں مددگاری کی درخواست کر رہے تھے اور اعذار و اندیشے تو اس درخواست مددگاری کی تہدید کے طور پر پیش کئے تھے تو یہ تو قبول رسالت کی دلیل ہے، انکار کی نہیں۔

مثلاً ایک بادشاہ کسی کو ایک مہم سپرد کرتا ہے وہ شخص اپنے ساتھیوں کی کمی، دشمنوں کی کثرت اور شان و شوکت بیان کر کے ان کے مقابلہ میں اپنی کمزوری قائل و حال بیان کرتا ہے تو اس سے اس کی غرض یہ ہے بادشاہ اس کو مزید مدد سے سرفراز کرے اور آزمودہ کار افراد سے اس کو مزید طاقتور بنائے تو اس شخص کا یہ کلام قبول حکم پر دلالت کرتا ہے انکار پر نہیں اور آیت وَاجْعَلْ لِّیۡ ذَرِیۡئًا مِّنْ اٰہْلِیۡ طٰہِرٰتٍ اٰخِیۡ اَشَدُّ ذٰلِہٖ اٰمَرًا وَّ اَشَدُّ لَکَ فِیۡ اَمْرِیۡ دَمِیۡرٌ اہل میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا۔ اس سے میری پشت مضبوط کر اور میرے کام میں اس کو شریک کر، اس کی تفسیر مبہم ہے۔ آپ کی عرض یہ ہے کہ اس عزت و مرتبہ والے کام میں میرے بھائی کو بھی شریک فرما۔ یہ نہیں کہ رسالت کو خود سے طاعن کر۔ ہارون کو اپنا قائم مقام بنائیں اسی طرح اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوۡنَ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ میری تکذیب نہ کرتے۔

یہ سب درخواست تھی کہ ان اندیشوں کو دور فرما مجھے اپنی پناہ میں لے لے نہ کہ مرتبہ رسالت کو اپنے سے طاعن چاہا ہو۔ انبیاء و خصوصاً اولوالعزم نبی سے اس قسم کی سوء ظنی اور بدظنی سے خدا کی پناہ۔

عقیدہ (۹) فخر و پرویز کے عہد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام بنی نوع انسان کی طرف حضرت محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوئے تھے۔ علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نہیں اور یہ کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی کے معاملہ میں اللہ کے امین تھے اپنی طرف سے وحی نہیں لائے تھے انہوں نے پیغام رسانی میں کوئی خیانت نہیں کی اور وہ ہر معاملہ خصوصاً ان اہم ترین مسائل میں ہر قسم کی جھوٹی چوک سے پاک ہیں اس وحی کے لانے میں نہ ان سے کوئی غلطی و کوتاہی ہوئی اور نہ کسی قسم کا اشتباہ پیش آیا،

مگر فرقہ غرابیہ جن کا حال باب اول میں گزر چکا ہے اس عقیدہ میں اختلاف کرتا ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام

پر لعنت بھیجتا ہے۔
ایسے کم فہم اور ناہنجاروں کے سامنے قرآنی آیات اور ائمہ کی ہدایات لانا بے کار و بے فائدہ سی بات ہے اور نہ مد مقابل کو خاموش کرنے میں اس سے مدد مل سکتی ہے اس لئے کہ جب جبرائیل علیہ السلام ہی متہم کر دیئے گئے تو پوری شریعت اور قرآن ان کے لئے تو بے اعتبار ہو گیا اور پھر اہل بیت اپنے جدا مجہد کے مرتبہ کے خلاف کیوں لب کشائی کریں کہ ان کا تو شرف ہی ان کی وجہ سے ہے، اس لئے جھوٹے کو گھڑ تک پہنچانے کے لئے مجبوراً غیروں سے مدد لی جا رہی ہے اور ان کے باطل عقیدہ کے روکے لئے تو ریت و انجیل سے جو اسے پیش کئے جاتے ہیں، کیونکہ غالباً غرابیہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں اس پیش بندی کے معتقد تو نہیں ہوں گے کہ ان کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اس دوران پیشی سے رکھ دیئے ہوں کہ آگے چل کر بھی ان سے میرا واسطہ پڑے گا اور اگر ان کی موتی عقل میں یہ شک پیدا بھی ہو تو ان پر واضح رہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر وحی اکثر حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطے کے بغیر ہی آتی رہی ہے، خصوصاً توریت کو بیک وقت بلا واسطہ دینے والا اور پھر یہودیوں کی تحقیر پر لکھی ہوئی عنایت ہوئی اس میں حضرت جبرائیل کا دخل، چنانچہ توریت کے سفر ۴ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خطاب ہو کر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے،

وَإِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْهُ لَنَنْزِلْنَاهُ بِقُرْآنٍ مُّبِينٍ وَنَزَّلْنَاهُ بِقُرْآنٍ مُّبِينٍ وَإِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْهُ لَنَنْزِلْنَاهُ بِقُرْآنٍ مُّبِينٍ - والبتہ

باجرہ کے ہاں اولاد ہوگی اور اس کی اولاد میں وہ شخص ہوگا جس کا ہاتھ سب کے ہاتھوں سے بالا تر ہوگا اور سب کے ہاتھ اس کی طرف عاجزی سے دراز ہوں گے۔

یہ جو الہ جس نسخہ توریت سے منقول ہے وہ یہود کے قبضہ میں ہے مسلمانوں کی اس تک دسترس نہیں اور نہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا اس میں دخل ہے۔ یہ تو حضرت جبرائیل سے عداوت رکھتے تھے، اور یہ بات بلا کسی شک و شبہ کے ظاہر ہے کہ حضرت باجرہ کی اولاد میں اس صفت کا شخص جس کے ہاتھ سب سے بالا تر ہوں اور جبرائیل و اس کے سامنے عاجزی سے جھکیں، سوائے محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کے کسی بھی وقت کوئی بھی نہیں ہوا اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو خلفاء شاکثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد میں، مغلوب، خائف، معصوب، اور مظلوم زندگی بسر کرتے رہے۔ اور جب خود ان کا زمانہ آیا۔ تو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ باغیوں اور خارجیوں کی طرف سے خشوع کی جو فضا پیدا ہوئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اور اسی توریت کے سفر ۴ میں یوں ہے یٰمُوسٰی اِنِّیْ مَقِیْمٌ لِّبَنِّیْ اِسْمٰعِیْلَ یٰمُوسٰی اِنِّیْ اَجْرٰہُ وَاٰخِرُیْ قَوْلِیْ فِیْ ذٰلِکَ وَیَقُوْلُ لَہُمْ مَا مَرْتُ بِہُمْ - اے موسیٰ میں اولاد اسمعیل میں اپنے گھر سے ایک نبی بھیجوں گا جو ان کو

رواں کرے گا۔ اور میں اپنے کلام کو اس کے منہ کے ذریعہ رواں کروں گا، اور وہ ان سے وہی کہے گا جو میں اس کو مکمل دوں گا۔ اب اس امر الہی کے مطابق اس قسم کا بنی اولاد اسمعیل میں ہونا ضرور ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو جو نیکہ امر الہی بلا استقلال رواں نہیں کیا اور نہ خدا کا کلام اصلہ ان کے منہ سے جاری ہوا بلکہ انہوں نے تو خود کو ہمیشہ پیغمبر علیہ السلام علیہ وسلم کا تابع اور شاگرد مانا، تو لا محالہ وہ تو وہ بنی ہوئے نہیں لہذا وہ معصوم نبی سوائے محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کون ہو سکتا ہے،

اور یوحنا کی انجیل کی چودھویں صراح میں اس طرح آیا ہے،

أَمَّا مَا قَلْبِي طَبَعَ بِمَوْثِقِ الْقُدْسِ الَّذِي يَرْسُلُهُ إِلَيَّ يَا مَعْشَرَ الْبَشَرِ هُوَ يُعَلِّمُكُمْ وَيُنَمِّسُكُمْ خَبِيرَ الْبَشَرِ وَهُوَ يُدَلِّكُمْ كَرِيمَ مَا كَلَّمَهُ لَكُمْ۔

فارقلیط روح القدس کو بھیجتا میری طرف، میرے نام سے جو تم کو تعلیم دے گا اور سب چیزیں تم کو عطا کرے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اس کی وہ یاد دہانی کرے گا،

اور انجیل یوحنا کی چھٹی صراح میں بھی اسی طرح ہے، الْكَتَبِي أَقُولُ لَكُمْ الْآنَ حَقًّا وَبَقِيْنَا أَنَّ الْفَلَاحَ عَنْكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ فَإِنْ أَنْطَلَقْتُ إِلَيْكُمْ يَا تَكْمُ فَاثَمٌ قَلْبِي وَإِنْ أَنْطَلَقْتُ أَنَا سَلْتُ بِهِ لَا تَكْمُ فَإِذَا مَا جَاءَ هُوَ يُعَبِّدُ الْفَلَاحَ وَيُدْرِي نِيَّتَهُ وَيُؤْتِيهِمْ وَيُوَفِّيهِمْ عَلَى الْخَطِيئَةِ وَالْبُتْرِ۔ (لیکن میں سچائی اور یقین کے ساتھ تم سے کہتا ہوں کہ میرا تمہارے پاس پلا ہانا بہتر ہے، اگر میں اپنے باپ

کے پاس نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے اور اگر چاہاؤں تو تمہارے پاس اس کو بھیج دوں جب وہ آجائے گا تو سب اہل عالم کو عبادت گزار دیندار بنا دیگا۔ جھوٹے گمان کو اور واقف کرے گا ان کو خطا اور بھلائی سے،

اور اسی انجیل میں یہ بھی درج ہے إِنْ بِي كَلَامًا كَيْفَ أَهْلًا أَنْ أَقُولَ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا يُفِيدُ مَوْلًى عَلَى قَوْلِهِ وَلَا خُفْيَاظَ بِهِ وَلَكِنْ جَاءَ مَوْثِقُ الْحَقِّ يَرْسُلُهُ وَيُعَلِّمُكُمْ وَيُرِيدُ كَمُجْمِيعِ الْخَيْرِ لَا تَكْلِسُ بِيَّتَكُمْ مِنْ تِلْكَ آدَاءِ نَفْسِهِ۔ (میرے پاس کہنے کی باتیں بہت ہیں، جو میں بہت تم سے کہنا چاہتا ہوں، لیکن نہ تم کو ان کے یاد رکھنے کی قدرت ہے نہ ان کو قبول کرنے کی ہمت لیکن روح القدس تمہارے پاس آئے گا جو تم کو ہدایت کریگا اور تعلیم دے گا اور تمام بھلائیوں تم تک پہنچائے گا اس لئے کہ وہ اپنے دل سے کچھ نہ کہے گا،

اور زبور میں تو صراحت سے آپ کا اسم مبارک بھی آچکا ہے جو سارے احتمالات اور اشتباہات کی بیخ کر دیتا ہے چنانچہ اس زبور میں جو یہود کے پاس محفوظ ہے، یوں تحریر ہے،

اے احمد اہل پڑی تیرے منہ سے رحمت اس لئے ہیں تجھ کو برکت دیتا ہوں پس تو تلوار باندھ، کیونکہ تیری روشنی اور تعریف غالب ہے اور کلہ حق کو برکت نصیب ہوئی بیشک نیز امان و شریعت تیرے ہاتھ کے دبر سے ملتی ہے میرا تیرے امت تیرے ذریعہ فرمان ہوگی، سچی کتاب ہے جو اللہ نے مین و تقدیس کے ساتھ جبل فاراں سے بھیجی اور

يَا أَحْمَدُ فَأَمَاتِ الرُّوحَةَ عَلَى شَفَتَيْكَ مِنْ أَجْلِ ذَلِكِ أَبَادِيْنُ عَلَيْكَ فَتَقْلُدُ السَّيْفَ فَإِنْ جَاءَكَ وَحْمَدُكَ الْغَالِبُ وَبُورُكَتْ كَلِمَةُ الْحَقِّ فَإِنَّ تَامُوسَكَ وَشَوَاعَكَ مَقْرُودَتَكَ وَهَيْبَةَ يَمِينِكَ سَهَامَكَ مَسْمُودَةً وَالْأُمَمُ يَخْجُرُونَ عَنْكَ كَتَابُ حَقِّ جَاءَ اللَّهُ بِهِ مِنَ الْيُسُومِ وَالتَّقْدِيسِ مِنْ جَبَلِ فَاثَمٍ اِنْ كَامَتْ لَكَ الْإِسْرَافُ مِنْ

تَحْمِيدِ أَحْمَدَ وَتَقْدِيرِ يَسِيْرِهِ وَتَمَكِّنِ الْأَرْضَ وَتَمَكِّنِ الْقَاتِلَ
 زمین احمد کی تقدیس و تعریف سے بھر گئی اور وہ زمین کا
 فرمانروا اور امتزل کا مالک بنا۔

اور زبور میں ہی ایک جگہ یہ درج ہے، لَقَدْ اَنْكَسَفَتِ السَّمَاوَاتُ بِمَا اَرْسَلْنَا مِنْ اَنْبِيَاۡتِ الْاَرْضِ مِنْ حَيْثُ ۱۶
 اور احمد کی روشنی سے آسمان گھبرا گیا۔ اور زمین اس کی تعریف سے پر ہونے لگی۔

اور اہل کتاب آپ کی جائے پیدائش، مقام بعثت، آپ کا نسب، آپ کی علامات و خوبیاں، کفار کا آپ کو وطن
 سے نکالنا اور مقام محرت، ان سب باتوں کی خبریں اپنی کتابوں کے حوالہ سے دیتے ہیں جن میں امتیازات و قبروات
 کی وجہ سے شرکت یا پرشیدگی کا کوئی احتمال یا شک نہیں بلکہ سب کا اشارہ ذات واحد بنی آخر الزمان حضرت محمد بن
 عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور مسعود کے وقت ان تمام اوصاف کو آپ پر منطبق بلکہ منحصر پا کر
 کچھ اہل کتاب تو آپ پر فوراً ایمان لا کر آپ کے اطاعت گزار اور فرمانبردار بن گئے اور کچھ نے وقت آنے پر نصرت و امداد
 کا بیخ و بوم وعدہ کیا۔ پھر یہ اور بات ہے کہ وقت آنے سے پیشتر ہی حکم قضا و قدر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اور پیدائش مبارک کے وقت ان علامتوں کو اور نشانیوں کا ظہور کہ پھر و درخت بول پڑے۔ انجوسوں نے خبریں
 دینا شروع کیں جنہوں نے غائبانہ آوازیں دیں، بت اور شیطان چلا پڑے اور اسی طرح بعثت کے وقت جو کچھ رونما ہوا
 یہ ساری باتیں دوسرے تمام احتمالات کا خاتمہ کر دیتی ہیں،

اس کے بعد معجزات کا ظہور، دعاؤں کی قبولیت، باری تعالیٰ عز اسمہ کی طرف سے مسلسل اور پے پے آپ کو
 نیز آپ کے پیروکاروں کو امداد و نصرت کا حصول اور آپ کی وہ برکتیں اور انوار جو اقصائے عالم میں پھیل گئے اور
 اب تک باقی ہیں یہ سب کی سب اس بات کی نشانی ہیں کہ وہ ذات ستودہ صفات آپ ہی ہیں صلی اللہ علیہ وسلم
 اور پھر ان ساری باتوں کے علی الرغم حضرت جبرائیل علیہ السلام کی غلطی اور اشتباہ کا دہم و خیال اس وقت ہو
 سکتا تھا کہ جب وحی کا دار و مدار محض صورت بتا دینے پر ہوتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام، نشان آپ کی تعریف
 آپ کے اوصاف اور خوبیاں بیان نہ کی جاتیں اور اللہ تعالیٰ بھی اس اشتباہ و غلط فہمی کے ازالہ کرنے پر قادر نہ ہوتا۔

لہذا معلوم ہو گیا کہ یہ سارے احتمالات اور شکوک بالکل ظاہر البطلان ہیں، اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت
 علی رضی اللہ عنہ کی ہم شکل اور علیہ کی یکسانیت کی جو خبریں شیعہ و غیرہ و شیعہ بتواتر نقل کرتے ہیں، وہ بالکل بے اصل اور سراسر
 بے معنی و غلط ہیں ان پر اگر غرابیہ اور ذبابیہ کوئی شوشہ لگائیں یا ماحشیہ آرائی کریں تو وہ ایک کجواس ہے ناقابل التفات
 عقیدہ (۱۰) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلسلہ نبوت کے آخری نبی ہیں، نبوت آپ پر ختم اور مکمل ہو گئی، آپ کے بعد یہ
 سلسلہ بند ہو گیا، اب کوئی نبی نہیں، سارے ہی اسلامی فرقے یہی عقیدہ رکھتے ہیں، مگر شیعوں کے فرقوں میں سے خطابیہ
 معمریہ، منصورہ، اسماعیلیہ، مفسنیہ اور سبعیہ ایسے ہیں جو اس عقیدہ کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں۔ جیسا کہ باب اول میں
 مذکور ہوا۔

اور امامیہ اگرچہ نقل بر تو آخرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر درپردہ ائمہ کی نبوت کے بھی قائل
 ہیں، بلکہ وہ ائمہ کو انبیاء سے برتر اور بزرگتر مانتے ہیں، جیسا کہ اوراق سابق میں بیان ہوا اور کسی چیز کو حلال و حرام قرار

دینے کے اختیارات جو خاصہ نبوت بلکہ اس سے بھی بالاتر ہیں وہ ائمہ کے سپرد حوالہ کرتے ہیں یعنی جو چیز اللہ و رسول نے حرام و حلال نہیں کی اس کو حلال و حرام قرار دینے کا ائمہ کو اختیار ہے اس عقیدہ کی موجودگی میں وہ بھی ختم نبوت کے منکر ہوئے، اس سلسلہ کی یہ روایت ملاحظہ کیجئے، جس کو حسین بن محمد ابن جعفر قمی نے کتاب فرائد میں بحوالہ محمد بن سنان، ابی جعفر سے بیان کی ہے۔

ابن سنان کہتا ہے کہ میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے اختلاف شیعہ کا ذکر چھیڑا تو آپ نے فرمایا اے محمد اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے وحدانیت کے ساتھ تھا ہے پھر اس نے محمد علی، فاطمہ، حسن و حسین کو پیدا کیا۔ اور یہ ہزار زمانے تک، عقیقے رہے پھر تمام اشیاء کو پیدا کیا اور ان کو ان اشیاء کی پیدائش دکھائی اور ان کی اطاعت ان سب پر واجب قرار دی، اور ان کے کام انہیں کے سپرد کئے کہ ان پر جو چاہیں حلال کر دیں اور جو چاہیں حرام کریں۔

اس کے علاوہ دوسری روایت وہ ہے، جو کلینی نے محمد بن حسن میثقی سے اور اس نے ابی عبد اللہ سے روایت کی ہے،

اس نے کہا میں نے ان کو ابی عبد اللہ کو کہنے سنا کہ اللہ نے ادب سکھایا رسول کو یہاں تک کہ ان کو اپنی منشا تک لے آیا پھر اس کو اپنا دین سپرد کیا اور کہا کہ جو کچھ تم کو رسول دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو سونپا وہی کچھ تم کو بھی سونپا،

یہ دونوں روایات موضوع اور گمراہی ہوئی ہیں اس لئے کہ حسین بن محمد بن عقیق راویوں سے روایت بیان کرتا ہے اور اپنی کتاب میں زیادہ تر اسل نقل کرتا ہے چنانچہ نجاشی نے اپنے اصحاب کے حوالہ سے اس کی تصدیق کی ہے اور محمد بن حسن میثقی تو فرقہ جسیہ سے ہے۔ وہ وہ من ہی کہاں ہے تو اس کی روایت کیسے قابل اعتبار مانی جاسکتی ہے، اگر یہاں اس کی روایت تسلیم ہو تو پھر چاہیے کہ مسئلہ تجسیم کو بھی مانیں کہ اس کی روایت بھی اس نے ائمہ ہی سے کی ہے،

اول قریبی بات محل کلام ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حلت و حرمت کا اختیار سپرد ہوا ہے، یا نہ۔ اس کے متنازع میں کسی دوسرے کا کیا ذکر چنانچہ مذہب صبیح یہ ہے کہ شریعت کا مقرر کرنا پیغمبر کے سپرد نہیں ہے، کہ ان کا کام خدا تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانا ہے خدا کی نیابت اور اس کے کارنامہ میں وہ شریک نہیں ہیں اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانا ہے اللہ تعالیٰ جس کو حرام و حلال قرار دیتا ہے رسول اس کی تبلیغ کرتے اور بندوں کو اس کی خبر دیتے ہیں اپنی طرف سے اس میں ترمیم و تبدیلی کا ان کو حق نہیں اس لئے کہ اگر رسول کے دین کا معاملہ سپرد ہوتا کہ ان کے کسی حاملہ میں باز پرس یا نہائش نہ ہوتی، مثلاً بدر کے قیدیوں کے فریہ میں، تحریم ماریہ قبلیہ میں، یا غزوہ تبوک سے منافقین

کے بچپڑ جاننے کی اجازت دینے میں۔ اور ان کے علاوہ دیگر بعض اور امرد کہ ان میں بانہ پر من فدا سمیت اندازہ کی ہوئی،

اور وہ مسلمان نہ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی حکم کے بیان کے دوران کسی سوال پر، یا کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر بغیر انتظار و حرج آپ نے کوئی استثنایا تخصیص فرمائی مثلاً الا ذخر (سوائے ذخیرے) یا تخیزی (مذکورہ) ولا تعزونی من احد بعدک (میرے لئے کان ہے تیرے بعد کسی اور کے لئے نہیں) یا آپ کا یہ ارشاد و قولت لعمدہ وجبت (میں نے کہا یہ تینا تدریج واجب ہو جاتا۔ ان الفاظ سے تفویض کے قائل جو استدلال کرتے ہیں) کہ آپ کو حلال و حرام کے اختیارات تفویض ہیں، وہ غلطی پر ہیں، کیونکہ حقیقت میں یہ تفویض کی صورتیں نہیں ہیں بلکہ یہ اجتہاد کی تشکیل ہیں، کہ عام میں داخل و شامل ہونے کے سبب یا ایسا نفسی کی بنا پر آپ اس کا استنباط فرمائے اور اس طرح مسائل کی تشفی فرماتے تھے اور نبی کا اجتہاد امت پر غرض کو واجب کر دیتا ہے، لہذا تفویض کی اس صورت میں کہ قواعد کلیہ سے احکام کا استنباط کر کے فتویٰ دیا جائے کوئی تباحث نہیں، تمام مجتہدین سہی تو کرتے ہیں، اور امور دنیا میں اگر یہ تفویض مان لیں تو یہ مذہب کفر در ہے تب بھی اس معاملہ میں ائمہ کو یہ غیر کے برابر اور ہمسر قرار دینا اجماع کے خلاف ہے۔

ورنہ یہ لازم آئے گا کہ ائمہ اور پیغمبر علیہ السلام ہر دوسے منقولہ روایات پر عمل یکساں ہو جس پر چاہیں عمل پیرا ہو جائیں کیونکہ اس صورت میں دونوں صاحب شرع ہوں گے،

پھر متعارض اور باہمی ٹکرائے والی روایات کو ایک کو دوسری میں تطبیق دینے کی کون تکلیف گوارا کرے گا یا یہ صورت ہوگی کہ ائمہ سے سرری روایات اور پیغمبر علیہ السلام سے منقول روایات کسی پر عمل جائز نہ رہے کیونکہ ہر ایک اپنی قری، شخصی یا زمانی مصلحت کے پیش نظر ہی احکام شرع کی بنیاد رکھیں گے، اور وہ مسلح چوبھرا امت سے پوشیدہ ہوں گے اس لئے دوسرے مقامات پر مختلف احکام کا استنباط غیر ممکن ہو جائے گا۔ اور یوں احکام شرع بغیر عمل کے رہ جائیں گے اور یہ مذکورہ لوازم امامیہ کے نزدیک بھی باطل ہیں، لہذا لوازم کے ساتھ ملزوم بھی باطل ہوا۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اوامردین ائمہ یا پیغمبر علیہ السلام کے سپرد ہوتے تو یہ ضروری تھا کہ وہ حکم کے مختلف پہلوؤں پر اجتہاد کر کے اولیٰ و اربعہ کو معین کرتے مگر امامی شیعوں کے نزدیک نبی یا امام کے لئے اجتہاد بھی جائز نہیں اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ائمہ حلال و حرام کی روایات اپنے باپ دادا سے بیان کرتے ہیں، اور تفویض کی شکل میں ذکر در خود ہی صاحب شرع پیغمبر سے کسی روایت کی ضرورت ہی کیا پڑتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تفویض ایسا لغو اور بے معنی اصول ہے کہ از سر تا پیرا روایات امور اور برائیوں کا سرچشمہ ہے، اسی کو مان لینا ایسا ہی ہے کہ جیسے ختم نبوت کا انکار کر دینا جس کے امامیہ بھی قائل نہیں،

عقیدہ (۱) بمعراج حق ہے اور حضور رختی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص اہل عصر میں سے سیر ملکوت السادات والارسل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی شریک نہیں، یہی اہل سنت کا مذہب ہے اور کتاب اللہ اور حضرت رسول اللہ پر وہی نصوص سے ثابت ہے قرآن میں ارشاد ہے، تَجْعَلُ الَّذِي يَتَّبِعِيكَ كَبِئْرًا مُّسَوًّى الْمُجِدِّ الْمَحْرَمِ إِلَى الْمُحْسِنِ الْاَخْلَیْ وَ پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندہ کو راقول رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا،

میں سے ایک اونٹنی پر سوار تھے ان کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا تھا۔ ان کے ارد گرد ان کے شیعہ تھے) یہ روایات پہلے گزر چکی ہیں۔ وہاں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ دونوں روایات باہم ٹکراؤ کی وجہ سے ساقط ہو گئیں۔ اور یوں ناقابل عمل قرار پائیں، اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو اس کے مطابق سارے شیعوں کو بھی مولا میں ان کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس روایت کو ترجیح دیں۔

امامیہ کے فرقہ امویہ کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نبوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے اور ان کی نسبت آپ سے ایسی ہی ہے جیسی ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ۔ حالانکہ تمام امامیہ کے نزدیک خاتم النبیین کا لفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بطریق تواتر منقول ہے۔

تو اس عقیدہ کی بنا پر ختم نبوت کہاں ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ تیس سال بقید حیات رہے، اور یہ تو امر محال ہے کہ نبی بھی معزول بھی ہو سکتا ہے،

عقیدہ (۱۲) قرآن کریم کی تمام نفوس اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اسامیہٹ ظاہری معنی پر محمول ہیں۔ مگر شیعوں کے تمام فرقے مثلاً خطابیہ، مستوریہ، معریہ، قرطبیہ، باطنیہ، زراعیہ، اور اسمعیلیہ میں سے سبھیہ عقیدہ رکھتے ہیں، کہ کتاب و سنت میں جو کچھ آیا ہے مثلاً وصو، تمیم، صلوا، صوم، زکوٰۃ، حج، جنت، دوزخ، قیامت، اور حشر وغیرہ سب امور ظاہری معنی پر محمول نہیں ہیں، بلکہ ایسے دوسرے معنوں پر محمول ہیں جن کو امام معصوم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس عقیدہ کی بنا پر اس فرقہ کے نزدیک سب سے بڑی تقلید یعنی کتاب اللہ قابل تسک نہ رہی، چنانچہ سبھیہ کہتے ہیں کہ وضو، امام کے ساتھ دوستی کا نام ہے تمیم امام کے غائب ہونے کے بعد ازون سے استعاذہ کرنا۔ نماز سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ناطق تھے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَهْتَفُ بِمَنْ النُّشَاءُ وَالْمُكْبَرُ، البتہ نماز یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کہتی ہے برائی اور نازیبا بات سے)

اور زکوٰۃ نفس کو ساری حقہ کے ذریعہ پاک کرنے کا نام ہے۔ کعبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور دروازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، صفاد مردہ، حضرت حسن و حسین (رضی اللہ عنہ) میقات سے لوگ مولا ہیں، تبلیہ اجابت دعوت، کعبہ کے سات طواف سے ساتوں آدمی کی محبت و دوستی کی طرف اشارہ ہے جو شریعت کے حامل ہیں، اور اگلی شریعت کو آنے والی شریعت تک باقی رکھنے کے ذمہ دار! اختلاف سے مراد ناطقوں کے سامنے آئمہ کے اسرار کو بغیر قصد کے افشا کر دینا ہے اور مثل سے آئمہ سے بھرتاز، عہد استوار کر لینے کی طرف اشارہ ہے۔ جنت تکالیف شرعیہ سے راحت پالینے کا نام ہے، اور دوزخ تکالیف برداشت کرنے اور ظاہر پر عمل کرنے کا نام۔

قرامطہ اور باطنیہ بھی اسی قسم کی خرافات اور کبر اس دگاتے ہیں، اور ظاہر پر عمل کرنے کے سخت مخالف ہیں، اسی لئے انہوں نے حاجیوں کو عین حرم شریف میں قتل کیا ان کا مال لوٹا اور حرج اسود اکھاڑ کر لے گئے اور کوفہ میں لے جا کر کسی کوڑی پر ڈال دیا۔ یہ سب حرام چیزوں کے جائز ہونے کے قائل ہیں،

برقیہ اکثر انبیاء علیہم السلام کے کارنامے ہی نہیں ان پر معنی بھی کرتے ہیں، باطنیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سب غفلتے مثلاً رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ساختہ پڑاوتہ باقی ہیں، رمضان کے روزے حضرت عمر کی نکالی ہوئی بدعت ہے، خطابیہ، مستوریہ، معریہ اور جناب سبھیہ کہتے ہیں،

کہ مذکورہ فرائض ان لوگوں کے نام ہیں جن کی دوستی کا ہم کو حکم ہے۔

اور محرمات ان لوگوں کے نام ہیں، جن کے ساتھ دشمنی رکھنے پر ہم مامور ہیں،

مقصود یہ اور زراعیہ جنت سے مراد امام لیتے ہیں اور دوزخ سے مراد ان کے دشمن مثلاً ابوجہر و عمر رضی اللہ عنہما مصریہ کہتے ہیں کہ جنت دنیا کی نعمتوں کا نام ہے اور دوزخ دنیا کی تکالیفوں کا۔ اور یہ کہ دنیا کو فنا نہیں طبع باللہ کے دور میں اس فرقے نے اس سمجھ بوجھ پر بھی پورا تسلط اور غلبہ پایا اور ایک دنیا کو گمراہ کر ڈالا کہ عقلمندوں کے لئے عزت کا باعث ہوا۔

آخر چنگیزیوں کے ہاتھوں پروردگار کے غضب کا شکار ہو کر کیف و کوار کو پہنچے اور اس حلفدار میں سب خشک و تزیل گیا، اور کردہ و نا کردہ سب اس کی پیٹ میں آ گئے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے، **وَأَلْقُوا فِتْنَةً لِّدَعِيَتِكَ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ** (متفقہ) اس فتنہ سے ڈرو جو صرف انہیں کو پیٹ میں نہیں لے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو گا۔ عقیدہ (۱۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی کے پاس بھی کوئی فرشتہ پیغام رساں بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی وحی نازل ہوئی نہ ہی کسی نے فرشتہ کی صورت آدمی کی صورت دیکھے،

لیکن امامیہ کہتے ہیں، جناب امیر کو یہ مرتبہ حاصل تھا اور آپ کے پاس وحی آتی تھی آپ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں اتنا فرق تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ دکھائی دیتا اللہ جناب امیر صرف اس کی آواز سنتے تھے، دیکھتے نہیں تھے، چنانچہ کلینی نے کافی میں جناب سجاد سے یہ الفاظ روایت کئے ہیں **إِنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ كَانَ مُحَدَّثًا وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ إِلَيْهِ الْمَلِكُ فَيُكَلِّمُهُ وَيَسْمَعُ السُّرُوكَ وَلَا يَرَى الْقُتُوبَ**۔

کہ حضرت علی بن ابی طالب محدث تھے۔ اور جناب محدث وہ ہوتا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے جو اس سے کلام کرتا ہے، وہ آواز سنتا ہے صورت نہیں دیکھتا۔

یہ سب کچھ اس قوم کی سن گھڑت باتیں اور بھڑائی روایات ہیں اور پھر یہ ائمہ کی ان روایات سے بھی مخلوق ہیں جو خود انہیں کی کتابوں میں موجود ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **إِنَّهَا النَّاسُ كَالْبُيُوتِ يُبْنَى** **فِيهَا النَّبُوتَاتُ** (ان النبوتات) اسے مگر نبوت تو میرے بعد باقی نہیں رہے گی، مگر نبوت باقی رہیں گی،

اور انہیں کے ہاں یہ روایت بھی موجود ہے کہ

ہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سونے کی مہروں سے مہر شدہ ایک کتاب نازل ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کتاب جناب امیرؓ کو دی آپ نے حضرت حسنؓ کو دی اور اسی طرح وہ دست بدست ہوتی ہوئی جناب مہدیؓ تک پہنچی۔ ہر گاہ بھیجے آنے والے کو یہ وصیت کرتا گیا کہ وہ ایک مہر توڑے اور اس کے معنوں پر عمل پیرا ہو چنانچہ ائمہ کا علم اسی کتاب سے ماخوذ ہے،

لہذا جب صورت حال یہ ہے تو اب فرشتہ بھیج کر اس کی آواز سنوانے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی اور یہ کیا کام کا وجود کا رخاۃ قدرت میں محال ہے،

امامیہ کا ایک اور گردہ مصحف فاطمیہ کے وجود کا مفروضہ اور یہ ہے، وہ کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال

کے بعد بی بی فاطمہ الزہراء علیہا السلام کے پاس وحی آتی تھی، اور ان کو بکبا کر کے جناب امیر مومنین علی رضی اللہ عنہ نے مصحف فاطمہ کو مرتب کیا تھا، بعد میں پیش آنے والے اکثر واقعات اور اس امت کے نشتے اس میں درج ہیں، اور اسی مصحف کی روشنی میں ائمہ لوگوں کو عین کی خبروں سے مطلع کیا کرتے تھے،

شیعوں میں سے ممتاز یہ فرقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مختار تقی کے پاس وحی آتی تھی، باب اول میں اس کے متعلق

بیان آچکا ہے

اور اسٹیلیہ میں سے سبعیہ، مفسلیہ، مغیریہ، اور عجمیہ، اپنے پیشواؤں کی نبوت اور ان پر نزول وحی کا دعویٰ علی الاعلان صاف الفاظ میں کرتے ہیں یہ بیان بھی باب اول میں سپرد قلم ہو چکا۔
عقیدہ (۱۴) ۱۔ انہی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد نہ تو کتابت شرعیہ و عبادات وغیرہ غم کی گئیں نہ ختم کی جائیں گی۔

مگر اسماعیلیوں میں سے مصریہ، منصورہ، اور حمیرہ فرقوں کا عقیدہ ہے کہ امام وقت کے حکم سے یہ تمام تکالیف شرعیہ اٹھائی اور منسوخ کی جاسکتی ہیں، چنانچہ ابوالخطاب نے جس کا نام مصر تھا، دمر یہ اس نسبت سے اس فرستے کا نام ہے، اپنے ماننے والوں کے ذمہ سے تمام تکالیف کو اٹھا دیا اور تمام حرام چیزوں اور باتوں کو حلال کر دیا اور ان کے ترک کر دینے کا حکم جاری کیا۔

منصورہ کہتے ہیں کہ جس شخص کی امام سے ملاقات ہو گئی تمام تکالیف خود بخود اس کے ذمہ سے ساقط ہو گئیں، اب وہ مادر پدر آزاد ہے، جو چاہے کرے۔ کیونکہ ان کے نزدیک جنت امام ہی کا نام ہے اور جنت میں پہنچ جانے پر کوئی تکلیف باقی نہیں رہتی!

حمیرہ کہتے ہیں کہ امور شرعیہ و دین حجت وقت کے سپرد ہیں، تکالیف شرعیہ کا معاف کرنا یا ان میں کمی بیشی کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ حسن بن ہادی بن نزار بن مستنصر نے جو پانچویں صدی ہجری میں گزرا اور جس کو یہ لوگ حجت وقت جانتے اور مانتے ہیں، تکالیف شرعیہ کو کسی مصلحت کے تحت ساقط کر دیا تھا، اور تمام حرام چیزوں کے حلال ہونے اور زانیوں کو چھوڑ دینے کا حکم نافذ کر دیا تھا،

عقیدہ (۱۵) ۱۔ کسی امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ شرعی احکام میں سے کوئی ایک ساقط کرے یا تبديل کرے۔
مگر اثنا عشریہ، بلکہ سارے ہی امامیہ اور حمیرہ اس کے قائل ہیں کہ امام کو ایسا کرنے کا حق ہے،

ان لوگوں کا یہ عقیدہ عقلاً بھی غلط ہے، کیونکہ امام کا بحیثیت نائب نبی یہ کام ہے کہ وہ نبی کی شریعت کو پھیلانے اس کی تعلیم کو رائج کرے اس پر عمل درآمد کی نگرانی کرے اگر اس کو ان احکام میں رد و بدل کا کوئی حق ہو گا تو وہ نائب پیغمبر تو نہ ہو ا مخالف پیغمبر ہو گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ شارع شریعت بنائے والا نہ نبی ہے نہ امام بلکہ وہ تراندہ تعالیٰ خود ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے، **شَرَعْنَا لَكَ مِنْ الدِّينِ مَا وَضَّيْ لَهُ نُوْحًا**۔ تمہارے لئے وہ دین مقرر کیا گئی جس کو نوح کو حکم کیا گیا تھا، یا ارشاد ہوا **اِنَّكَ جَعَلْنَا مِنْكَ شَرْعًا وَ مِثْقَالًا**۔ تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے گھاٹ اور راہیں مقرر کیں، اور پھر جا بجا ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے اپنی سمجھ اور عقل سے بھری اور جنگلی وحال جانوروں، اور دوسری کھائی جانے والی حلال چیزوں کو حرام ٹھیکرایا یا مرقار اور اس جیسی حرام چیزوں کو حلال

قرار دیا قرآن مجید میں عام الفاظ میں ان پر مخاب فرمایا جس میں بلا تخصیص دوسرے بھی شامل ہیں،
پس جب نبی ہی کو کوئی حکم منسوخ کرنے کا حق نہیں تو امام کو یہ حق کہاں سے اور کیسے ملے گا ورنہ تو چرچا امت نبی
کی نیابت نہ ہوئی بلکہ اور بیت میں شرکت ہو گئی،

اپنے اس عقیدہ بالاکے ثبوت میں بھی اثنا عشریوں نے ائمہ سے چند بناوٹی اور من گھڑت روایات نقل کی ہیں ان
میں سے ایک روایت وہ ہے جو محمد بن بابویہ قمی نے ابی عبد اللہ سے کی ہے، اَللّٰهُ تَعَالٰی اَنْزَلَ اَحَدًا بَيْنَهُ
اَلْاَوَّلُ رَاجِعًا فِي الْاَوَّلِ اَنْ يَخْلُقَ الْوَحْدَانُ بِاَنْفُسِهِمْ فَلَمَّا قَامَ فَلَمَّا قَامَ فَكَانَ اَحَدًا اَحَدًا اَحَدًا اَحَدًا اَحَدًا
اَلَّذِيْنَ اَحَدًا بَيْنَهُمَا فِي الْاَوَّلِ وَكَسَدُ يَوْمَاتٍ اَلَّذِيْنَ فِي الْوَحْدَانِ حَرَمٌ۔

”آپ نے کہا کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے اجسام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل روحوں میں بھائی چارہ کرایا
تھا، اگر اہل بیت میں سے کوئی حاکم ہو تو وہ اپنا وارث اس بھائی کو ٹھیرائے جس سے ازل میں بھائی چارگی
پیدا ہو چکی ہے، ماں کے پیٹ کے بھائی کو وارث نہ بنائے“

اس روایت کے غلط اور جھوٹ ہونے پر صاف دلیل یہ ہے کہ تکالیف شرعیہ کا تعلق چوبیس عام لوگوں سے ہے اس
لئے یہ ضروری ہے کہ ان کا مدار ان ظاہری علامات اور واضح امور پر ہو جو جن تک انسان علم کی رسائی ہو سکے مثلاً پیدائش و
نکاح کے سلسلہ کی قرابت؛ اس کے خلاف ازل بھائی چارگی تو ایسی بات ہے کہ کسی پہلو سے بھی اس تک عقل کی رسائی
نہیں مثلاً یہ کیسے معلوم ہو کہ اس قسم کی اخوت کس کے ساتھ ہے؛ اس کی جگہ کہاں ہے؛ اور اس ازل بھائیوں کی
تعداد کیا ہے، اور یہ کہ اخوت میں قرب و بعد کے لحاظ سے ان کے مراتب کیا ہیں، تاکہ بعض کو بعض پر ترجیح دی جا سکے
اور صغیف کو قوی کے مقابلہ میں محروم کیا جائے، اگر اس بارے میں ہر فرد سے متعلق امام کا حکم صریح کاٹل کیا جائے
تو یہ بھی ناقابل عمل بات ہے لہذا میراث کا معاملہ تو اس صورت میں نفاذ پذیر یہ ہی نہ ہو سکے گا۔ پھر تو لوگوں کے تمام
اموال بحق بیت المال ضبط کئے جانے کے لائق ہو گئے۔

ساتواں باب

امامت کا بیان

معلوم رہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کے وہ مسائل جو مختلف فیہ ہیں ان میں پہلا مسئلہ یہ ہے۔

مسئلہ (۱)۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ مکلفین کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک رئیس و خلیفہ امیر کا انتخاب
کریں اور پھر شریعت کی روشنی میں اس کی اتباع اپنے اوپر لازم جانیں، اور شرعی امور میں اپنے رئیس کی ہر طرح مدد اور
اعانت کریں یوں تو ہر فرقہ اپنے فطری جذبہ کے تحت اپنے لئے ایک رئیس منتخب کرتا ہے مگر شارع نے ایسے رئیس
کے لئے اوصاف اور شرائط و لوازمات متعین اور بیان کر دیئے ہیں تاکہ ان شرائط و لوازمات کی وجہ سے ریاست
فساد و بدانتظامی کا شکار نہ ہو۔ اور یہی شریعت کا قانون ہے اس کا انسان کے فطری امور کی تعیین و تخصیص

میں کوئی دخل نہیں بلکہ ان امور کے عموماً اوصاف اور شرائط و لوازم کی وضاحت کرتا ہے، جو صلاح و فلاح عالم کا باعث ہوں اور جن سے انتظام کی حفاظت میسر ہو۔

اور تعین و تقصیر کو عقل کے حوالہ کیا گیا ہے خواہ در عقل انفرادی یعنی شخص متعلق کی ہو یا عقل اجتماعی کنہہ برادر یا پنچایت کی۔

مثلاً نکاح کے بارے میں یہ تو بیان کیا گیا ہے کہ جس سے نکاح کیا جائے اس میں کیا اوصاف ہوں اور شرائط نکاح مثلاً کفالت و ہم نسبی، ولایت نہادت اور سہرا نیز اس کے لوازمات مثلاً نان و نفقہ جائے رہائش وغیرہ منکوحات کی تعین سے مثلاً فلاں سے فلاں کا نکاح ہو اور فلاں سے فلاں کا کوئی تفریق نہیں کیا گیا اس کو عقل انفرادی یا اجتماعی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔

اور یہی حال تمام معاملات کا ہے، بلکہ دینی امور میں بھی یہ تو فرمایا گیا ہے کہ ا۔ فَاسْتَلْزِمُوا الْبِرَّ كَمَا كُنْتُمْ لَا تَلْعَنُونَ راگرتم نہ جانتے ہو تو کسی جاننے والے سے پوچھ لو مگر اہل علم و مجتہدین کی کوئی تحفیس نہیں فرمائی کہ فلاں عالم یا مجتہد سے پوچھو۔

ہاں اگر پیغمبر علیہ السلام کی زندگی و موجودگی میں کسی شخص میں ریاست کبریٰ کی قابلیت حاصل ہوئی یا اس کو فتویٰ و اجتہاد کا درجہ نصیب ہوا اور پیغمبر علیہ السلام کو بذریعہ وحی پارساں طبع یا قرآن سے اس کا علم ہوا پھر آپ نے اس شخص کے استحقاق و اہلیت کو بیان فرمایا تو پھر اس کے کیا کہنے یہ تو فروعی نذر کا معاملہ ہو گیا، جیسا کہ خلفائے اربعہ اور بعض دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہوا۔

اس مسئلہ میں امامیہ اختلاف کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ رئیس عام کا مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب ہے حالانکہ الہیات کے باب میں گزر چکا کہ اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کے واجب ہونے کے کوئی معنی نہیں یعنی اس پر کوئی چیز واجب و لازم نہیں بلکہ اس پر کسی چیز کا واجب ہونا اس کی الوہیت اور ربوبیت کے منافی ہے،

بلکہ تمام تکلیفات سیادت، مثلاً نظام سیاست کا اجراء و دشمنوں سے جہاد و عسکری تیاری مالی خفیت، خمس فنی کی تقسیم، احکام کا نفاذ وغیرہ وغیرہ رئیس عام کے وجود سے وابستہ ہیں۔ تو پھر اس کا تقرر انہیں کے ذمہ ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ پر اسے کیوں واجب و لازم کیا جائے۔ اس لئے کہ واجب کا مقدمہ (پیش خیمہ) اسی پر واجب و لازم ہوتا ہے جس کی طرف اس واجب کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے نہ کہ کسی دوسرے پر! مثلاً و مگر کرنا ستر کو چھپانا قبلہ کی سمت رخ کرنا، کپڑے، جائے نماز کا پاک رکھنا، جو تکلیفات دینیہ و شرعیہ ہیں، یہ سب نمازی کے ذمہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہیں،

لہذا امام و خلیفہ اور رئیس کا مقرر کرنا جو بہت سے واجبات کا پیش خیمہ ہے جو تکلیف پر واجب ہیں تو یہ بھی ان تکلیفین ہی پر واجب ہو گا نہ اللہ تعالیٰ پر!۔

اور اگر اس معاملہ میں ذرا غور سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رئیس کا تقرر بہت سے مناسبات کا سبب ہے، اس لئے کہ اہل عالم کی آراء و نفوس انسان کی خواہشات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا پورے عالم کے لئے دائی و باقیانے دیا امام و عالم کی حیثیت سے تقرر و تقرر کرنا جو اسی سے باعث ہو گا۔

اور بے انتہا رخصتے پیدا ہو سکتے ہیں ایسا کرنا امر امانت کو نفو و بیکار کر دینے کا سبب ہو گا۔ اور سرکشوں کے غابہ کا باعث ہو گا۔ اور خود ارجان امر کے مایوس ہو جانے اور نفیقہ کرنے کا سبب ہو گا۔ بلکہ ان کو معرض خطر و ہلاکت میں ڈالنے کا باعث کیونکہ ان حالات میں یہ حضرات رؤساء، امرامہروم خوف نرہ، دبے دبے اور چھپے رہیں گے، چنانچہ جن حضرات کے بارے میں یہ امانت کا اعتقاد رکھتے ہیں، وہ حالات مذکورہ بالا سے دوچار ہوئے نہ کھل کر حکومت کر سکے نہ نفاذ احکام کی جرأت ہوئی نہ لوگوں میں نظم و ضبط قائم کر کے فتنوں کا سد باب کر سکے۔

بلکہ وہ تو اتنے مجبور اور دبے رہے کہ ان لوگوں کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکے جو علی الاطلاق ان پر افتراء اور بہتان کے طومار باندھتے اور اس بھڑک و جھلساڑی کو دراصل سے دنیا میں پھیلاتے رہے، وہ نفیقہ نرا کر گوشتہ نشین رہے! اور کارِ رسالت وہ لوگ چلاتے رہے، جو اہل نہ تھے۔

تقرر امانت و خلافت کو لطف خداوندی کہہ کر اس کو خدا کے ذمہ کرنے کی بات گواہی دیتی ہے کہ سرسری عقل اس کو باور کریتی ہے، مگر تقرر و فکر اس کو کہیں گوارا نہیں کرتے،

ہاں رئیس کا تقرر اس شکل اور اس شرط کے ساتھ ضرور لطف الہی قرار پا سکتا ہے کہ امام و حاکم کی تائید کی جائے نصرت و اعانت کے ساتھ اس کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں اور اس کو غلبہ و برتری حاصل ہے، اس کے دشمن اور مخالف غائب و خاموش و ذلیل و رسوا رہیں ورنہ تو وہی فتنہ، فساد، فساد و بغاوت لگے گا بارہنتے ہیں اور جب تائید کے بجائے سازش ہو اور غلبہ کے بجائے مقبوری مقسوم ہو تو پھر اس منصب کو لطف کہنا خلاف عقل ہی نہیں عقل کا ماتم ہے،

اس سلسلہ میں امامیہ بطور جواب یہ کہتے ہیں کہ امام کا وجود ایک مہربانی (لطف) ہے، اور اس کی مدد کرنا یا تلف و اختیار سے نوازا دوسری مہربانی اور غلبہ و تصرف اگر حاصل نہ ہو تو یہ بندوں کا تصور اور ان کی کوتاہی ہے کہ انہوں نے اماموں کو اتنا ڈرایا دھمکایا کہ ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور اظہار امانت سے پہلو تہی کرنے لگے رفتہ رفتہ نوبت غیبت کبریٰ کی آگئی، اور پھر سوائے نام و نشان کچھ نہ رہا، لہذا جب بندوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے ان کی مدد چھوڑ دی تو اس میں خدا کے ذمہ کی کیا قیامت لازم آئی۔ اور دشمنوں سے چھپنا یا ان سے خوفزدہ ہونا تو انبیاء اور اوصیاء کی خاص سنت ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کفار کے خوف سے ظاہر میں پوشیدہ رہے، امامیہ کے اس جواب میں ان مقدمات سے سراسر غفلت اور چشم پوشی برتی گئی ہے جو اعتراض میں ذکر کئے گئے تھے، اس لئے کہ کہا گیا تھا کہ امام کا وجود بشرط تصرف و نصرت نہ ہو گا تو نتیجہ وہی فساد ہو گا، لہذا جواب میں عجیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان فسادات کے لزوم کی دلیل کے ساتھ تردید کرے، اس کے بغیر وہ جواب محض بک بک ہو گا اور یہاں عجیب کے اس جواب میں فسادات کے لزوم و عدم پر توجہ ہی نہیں دی گئی،

اور بندوں کی مدد ترک کرنے کی جرأت کہاں ہے، وہ بھی ناقابل تسلیم ہے، اس لئے کہ اہل سنت اور شیعوں خصوصاً زید یوں، واقفینوں، اور ناؤ سببوں اور افضلیوں کے موزنین میں سے کسی نے نہ یہ لکھا نہ اس کا ذکر کیا، بلکہ وسلاطین میں سے کسی نے بھی اپنے امام وقت کو ڈرایا ہوتا اور پھر ایسا ڈرایا جو چھپنے کا سبب ہو وہ ڈرانا تو قتل ہی کا ہو سکتا ہے، اور انہم کے لئے قتل کی دھمکی نہ چھپنے کا سبب ہے نہ خوف کا بلکہ وہ دھمکی تو ان کے لئے بے معنی اور

فصل سی بات ہے، اس لئے کہ ائمہ تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں، جب موت ان کی اپنی مرضی پر موقوف ہوئی تو پھر قتل سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں، جب تک ان کی مرضی نہ ہو کوئی ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا چنانچہ کلیئہ نے اس قاعدہ کو بہت سی روایات سے ثابت کیا ہے اور اس کے لئے ایک مستقل باب علیحدہ سے بانٹھا ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ ائمہ، حکم الہی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تو ان کی یہ روپوشی بھی حکم خداوندی کے مطابق ہوگی اور یہ روپوشی بھی حکم الہی سے ہوئی اور اس نے اتنا طویل کھینچا کہ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت گزر گئی، اور ان کی روپوشی کے دوران اتنا بڑا فساد اور انقلاب رونما ہو گیا کہ دین و ایمان کی نہ صرف شکل ہی بگڑ گئی بلکہ اس کا شیرازہ اتنا پریشان اور ایسا بکھرا کہ اس میں اصلاح کی بھی گنجائش نہ رہی تو یہ منصب لطف کہاں رہا۔ دوسری بات یہ کہ جب ان کی روپوشی امر الہی سے ثابت ہوگئی تو ان انبیاء و اوصیاء کو آپ کیا کہیں گے جو روپوش نہ ہوئے، بلکہ ثبات قدمی کے ساتھ دین و ایمان کے بقا و سلامتی کی خاطر اپنی جان دیدی۔

مثلاً حضرت یحییٰ علیہما السلام اور حضرت سبط نبی حسین رضی اللہ عنہ، یہ تو پھر آپ کے خیال و عقیدہ کے مطابق نفوذ باللہ واجب کے تارک ہوئے،

اچھا آپ اگر اسے یعنی روپوشی کو واجب نہیں مندوب و مستحب ہی کہیں تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ روپوشی ہونے والے حضرات نے ایسے امور کا ترک کیا جو یقیناً ان کے لئے واجب تھے مثلاً اقامت دین اور تبلیغ احکام تو ایک مندوب و مستحب کام کی خاطر ترک فرما دیا تو ان حضرات کے شایان شان تھا؛ یہ بات تو ان حضرات کے لئے پچھلی بات سے بھی زیادہ سخت ہوگی،

اور اگر بیجا چڑھنے کے لئے کوئی یہ کہے کہ امر الہی مختلف نوع پر آئے تارکین کے حق میں تو وہ مندوب و مستحب تھے اور روپوشوں کے حق میں وجوب و فرضیت کی شکل میں تو پھر یہاں بھی یہ اشکال رہا کہ ہر دو میں سے کسی ایک فریق کے لئے اللہ تعالیٰ نے ترک اصل کیا اور یہ صورت بھی شیعری کے نزدیک غلط اور باطل ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ ائمہ کی روپوشی قتل کے ڈر سے تو نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جیسا کہ ابھی ہم سطور ماضی میں بتا چکے ہیں کہ ائمہ جبرجی خود قوت ہوتے ہیں ان کی مرضی کے خلاف کوئی انہیں موت سے ہم کنار نہیں کر سکتا اور اپنی مرضی و پسند کی موت خوف و ڈر کا باعث نہیں ہوا کرتی۔ تو پھر ڈر اور خوف کا سبب کوئی جسمانی ایذا ہوگی لیکن اس میں یہ خرابی ہے کہ گویا ائمہ عبادات و عبادات اور ممبر و مشقت کے اجر جزئی سے بھی اباد لغز کر رہے ہوں گے کیونکہ خدا کی راہ میں اذیت و مشقت کی برداشت تو اپنے اندر بہت بڑے اجر و ثواب رکھتی ہے اور جہاد تو نام ہی سہی تپا پا مشقت کا بے ادب و جبر کے مجاہدین کے بلند درجات مسلم الثبوت ہیں،

اور پھر ائمہ تو بڑے بلند مراتب کے لوگ ہیں، ان کی عبادات تو عام بندوں سے اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے اور ان میں خاص طور پر صاحب ازاں کا چھپاؤ بائیں ہاتھ میں اور بے منی بات سے اس لئے کہ ان کو تو یقین سے یہ بات علم ہے کہ یہاں علی بن ابی طالب علیہ السلام کے نزدیک نہ رہوں گا نہ مجھے نہ آسکتی ہے نہ کوئی مجھے مار سکتا ہے اور میں تو سربراہ آئے سلفیت مشرق و مغرب، ہوں گا نو وہ کیسے اور کہیں مخالفین اور دشمنوں کی طعن و تشنیع اور تحریف و تکذیب کی دھونس میں آگئے وہ ان سے کیوں درتے ہیں، اور حکم خدا علی الامان دین کی دعوت اور اس کی اقامت کا

فریبِ نیکو، اور انہیں کہتے۔ اور اس راہ کی صعوبت و مشقت کیوں برداشت نہیں کرتے اور ایسا ذکر کے اثر سانسہ خصوصاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے کیوں مضامین کرنے ہیں کہ وہ سابر اور ثابت قدم رہے کہ ظالموں اور ناجائزوں نے اتار ڈرایا اور خود زہر کیا کہ بالاخر نہایت کشت و خرابی تک پہنچے اور اس پر اسروف و نبی من المنکر کا فریب نہ بھانسنے پر سب راہ ان کو تو اپنی عمر کی بھی قربانی نہ تھی۔ نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ ان کا اترار اور قتل ہو گا بھی کہ نہیں۔ اجماع نے نہ صرف اسے نزع اور نہ الہی کی خاطر ہر قسم کی اذیت اور تکلیف خواہ وہ بدنی تھی یا مالی، بخندہ پیشانی برداشت کی۔ اور اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔

انہیں اور اس جہنم ترمین عظیم باتوں اور نعم و دلائل کی گفتگو سے آگاہ ہو کر وہی طریقہ ترسینے لپٹنے کی تہنیزہ الایہا والامہ میں نکسا ہے کہ صاحب الزمان اور ان کے آبائے کرام کے مابین فرق ہے اور وہ یہ کہ ان کو تو اس بات کا پتہ ہے کہ وہ ہوتے قائم ہیں۔ اندیزہ و سنان، تیغ و تنگہ کے وہنی ہیں، دشمنوں کو زیر و زبر کرنا سہی اور انہیں سے انتقام لینے کے اس کے ہاتھ دولت کو صفحہ ہستی سے مٹانے والے لہذا ان کو وہ خوف و ڈر ہے جو دوسروں کو نہیں تھا۔

مگر شریف مرتضیٰ کی گفتگو برائے گفتگو یہ ہے، بلکہ محزون کی بڑ اور بارہ گویوں کی بکراں بھی کہیں نہ بھانسنے اس سے زیادہ۔ اہل جان عقل و شعور اسے کوئی عشان نہیں دیں گے کیونکہ کئی سربہ بابت و ہر دس گئی ہے کہ ان کو اپنے قتال کا ہر حال ڈر و خوف نہ ہو۔ ان کو یہ یقین ہے کہ محمد کو کوئی قتل نہیں کرے گا، میں عیسیٰ بن مریم علیہا السلام سے ملاقات کروں گا۔ ان کی ہانک امانت کرنے کا دجال۔ سہنہ و آزاد ہوں گا و گوں کو بار بار اچار عیالیت پر گادوں گا اپنے اور اپنے اسلاف کے دشمنوں سے پورا پورا بدلہ لوں گا۔ پھر ان تمام امور سے منت کر، ہر کی موت مروں گا۔

تو پھر ان اسباب امن و امانیت کو کیوں خاطر میں نہیں لاتے، اسباب خوف کو ہی برصن و ہم کی پیداوار ہیں، کیوں ہر دم پیش نظر رکھ کر کیوں اپنے آپ سے بڑا حالانکہ حقیقت میں یہ اسباب خوف بھی بالکل خلاف واقعہ ہیں۔ کیونکہ صاحب الزمان تو امام ہیں ان کو تو جو کچھ ہوایا ہونے والا ہے سب کا علم ہو گا۔ اور کم از کم زمان غیبت میں کسی شیعہ سے جبکی ان تک رسائی ہو گئی ہوگی سنا ہو گا کہ مخالفین ان کے دعویٰ مہریت کو ہزار سال سے رائد ورت تک طوائف کھینچ کر قبول و تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ مخالفین کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ آثار قیامت تیسری ہجری سے بارہ سو برس گزر جائیں گے۔ ان کے مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ مہدی صدی کے اداکل میں ظہور کریں گے و سلسلہ صحت میں نہیں اور یہ ظہور بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متصل ہو گا۔

کچھ زمان فاصلہ دے کر نہیں، اور ان کے سر پر وقت ظہور ابر کا سایہ ہو گا سر و ابر سر من رائے، کا نہیں۔ ان کے ظہور کی جا، مکہ مکرمہ کا حرم شریف ہو گا، امر من رائے نہیں،

اور امانت کا دعوئے عمر کے چالیس سال گزرنے کے بعد کریں گے، بچپن یا بڑھاپے میں نہیں۔

لہذا مذکورہ علامات و نشانیوں کے برعکس ظاہر ہو جائیں اور کسی وقت علاوہ مشائخ کے جیسے میں دین کی دعوت اور احکام شرع کی تبلیغ کریں اور کرامات و کسا، تو یقین ہے کہ ان سے کوئی تعرض نہ کریں گا خصوصاً شیعہ کہ وہ نزول و بان سے اس کے متنبہ اور شیدا ہیں، اور خدا سے اس کے لئے مرادیں مانگتے ہیں۔

نیز ان کو یہ خبر بھی ملی ہوگی کہ باقرؑ یہ موعودؑ کو جاب باقرؑ ہیں اور نادر سید یہ کہتے ہیں کہ اس منصب پر جناب جعفر صادقؑ مقرر ہیں، اور قسطنطین اس مسئلہ پر موسیٰ بن جعفر کو جھٹاتے ہیں، اور ان لوگوں کے یہ دوسرے امت میں شورش اور سرسبز ہیں، پھر بھی ان بزرگوں کے پیچھے کوئی نہیں پڑا۔

اور نہ مہر دین کی وجہ سے کسی نے ان کو ڈرا یا دھمکا یا تو صاحب الزماں کو کیوں ڈرائیں گے، اور ان کے پیچھے کیوں پڑیں گے۔ اسی طرح جو پور کے سید محمد نے بیان دیل مہر سے ہونے کا دعویٰ کیا، اور انسان، دکن، اور راجپوتانہ کے ایکسٹیم فیئر نے اپنا لقب مہدویہ رکھ کر انہیں خزانہ عقیدت پیش کیا اور ان کا اتباع کیا۔ اور کسی نے بھی ان کو قتل نہیں کیا۔ نہ کوئی ہزاوی۔

خصوصاً مسئلہ عربی کہ عراق و خراسان پر فائز ان صفوی کا تسلط ہوا اور دکن میں سلطین بہمنیہ اور عادل شاہیہ جو مذہب شیعیت میں مدد دہر شدت اور غلو رکھتے تھے برسرِ اقتدار آئے اور ہندو سندھ اور بنگالہ جو اس عہد میں بظاہر توجہ انگریز بادشاہ کے زیرِ نگیں لیکن دراصل نور جہاں کے زیرِ نقاب تھے، اس لئے کہ حکمران و حقیقت اس کے عراقی و خراسانی اقارب کر رہے تھے، اور اسرار و مزلہ اور صوبہ دار کٹر شیعہ تھے، تو ایسے زیریں موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیا اور اسی وقت ظہور کیوں نہ فرمایا، اور اپنے نہ سنوں کو محض بے بنیاد و ہم کی وجہ سے مادرِ اہلہ کے غانوں اور روم کے قیدیوں کے لطف و کرم اور فرائض سے کیوں محروم رکھا یہ ان سے کون کہتا تھا کہ آپ اپنے ان علاقوں کو چھوڑ کر جو ان کے شیعہ یائوں اور جاں نثاروں سے بھرے پڑے ہیں، بخار اور سمرقند یا اسلامبول میں ظاہر ہوں اور خواہ مخواہ لوگوں کے ڈراوے اور خوف کا سکار چوں کیا ان کو یہ وسیع ممالک اور کشادہ زمین نہ مناسب نظر آئی۔

اور خلیفہ مرتضیٰ نے جو یہ کہا جسکے صاحب الزماں شروع شروع میں دوستوں سے تو مل ملا جیتے اور ان پر ظاہر ہو جاتے، صرف دشمنوں ہی سے چھپے رہتے تھے مگر بعد میں دوست دشمن سب ہی سے غائب ہو گئے خطرہ یہ تھا کہ نادان دوست، دانا دشمنوں پر ان کے راز فاش نہ کر دیں، اور یوں دشمنوں کو جھڑکانے کا ذریعہ نہ بن جائیں،

یہ ایسی فساد طرازی ہے جس سے شاید تاریخ سے نادانف لوگ کو تو فریب دیا جاسکے، لیکن تاریخ دان تو قراس الحشاش کو خندہ استہزاء سے زیادہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں کسی بھی سوچنے والے آج تک کبھی یہ نہیں لکھا کہ کوئی گروہ باجماعت محمد بن حسن عسکری کی تلاش میں سرافران بنی گھروں میں ناممکن جھانختی پھری ہو یا اس وقت ان کی جستجو بغداد یا سمرن رائے میں لوگوں میں موعودؑ گفتگو بنی ہو یا اس زمانہ کے خلفاء و ملوک کے دل میں اس کا خیال بھی آیا ہو، سوائے اثنا عشریہ کے انہوں نے البتہ ان کی غیبت کی توجہ کرتے وقت یہ مہم اور فرضی احتمالات ذکر کئے ہیں، ان کے علاوہ اور کئی زمانے سے دانندہ آشنا۔ بلکہ اب تک تاریخ اس بات کا ثبوت دینے سے قاصر ہے کہ اس میں کہیں یہ ذکر بھی آیا ہو کہ جناب حسن عسکریؑ کے گھر اس شکل و ثنبا بہت اور دو صاف کا کوئی بچہ پیدا ہوا جس کو مہدی موعودؑ جان کر لوگ اس کے درپے آزار اور درپے قتل ہوئے ہوں،

اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان بزرگوں کی غیبت صفوی کا عرصہ ستر سالوں سے زیادہ رہا اس دوران اس عہد کے کئی خلفاء و ملوک سب ختم ہو گئے ان کی سلطنتیں خراب و خیال ہو گئیں تو اس بات کو کون عقلمند درست و صمیم مانے گا کہ ان خلفاء و ملوک کے عہد میں چار یا پانچ سال کا ایکسٹیم فیئر امت کا دعویٰ کرتا ہے، اور پھر اپنے دعویٰ

کے مطابق معجزہ بھی پیش کرتا ہے اور اسی وقت سے اس عسکر کے لوگ و خلفاء و امرا اس کی تکذیب کر کے اسی کے ڈرانے اور ابزار رسانی کے درپے ہو گئے ہوں، جگہ بگہہ اسوس منکر کر دیئے ہوں اور پھر ایک دوسرے کو رسیت کر سوتے ہیں کہ صدیاں گزرنے کے بعد جو بھی ان خلائق و ملکوں کے جانشین اس کی تلاش سے نہ نکلے ہوں نہ پچلے بیٹے ہوں باکر پچنانہ پیش تضحی سے تلاش و تجسس میں میں گئے رہے ہوں، ایسی صورت یہاں درپیش اور غیبت کبریٰ کا اندر کیسے قابل پذیرائی ہو سکتا ہے،

اور پھر یہ وہم بھی ایسے زمانہ میں جب کہ کوئی ان عال مقام کی ابزار رسانی کا خواہاں نہ ہو مثلاً جنہ صفر یہ کہ اس دور میں تو لوگ ان کے لئے آنکھیں فرش راہ کئے ہوئے تھے، ان کے دیدار کے مشاق تھے، جان رسانی اس مجرب مبارکسی آمد پر تیار کرنے کے لئے کمر بستہ تھے اور سب کے سب ایک زبان ہو کر نالہ و زاری فرما رہے تھے ان میں مشغول رہ کر یہ راہ گار ہے تھے کہ امام زماں ہماری فریاد سنو اور اپنی نہایت سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی کیجئے اور یہ کوئی کیم و تنہا فرد بھی نہ ہو بلکہ مود و مخلص کی ایک جماعت اور رحم غفیر جو اس پر بھی یہ حضرت مومن چند قدانی اور دردمی اور باتوں کے در سے اس قدر بزدل سے کام لیتے ہوئے خود کو ظاہر نہ کرتی بلکہ روز بروز پیسے سے جلی زائد چھپنے اور پوشیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہوں تو ان امام عالی مقام کا یہ عمل درجہ امامت کے حدود و جہ منافی ہوگا، کیونکہ امامت کی بنیاد تو دیر و بہادری پر استوار ہے،

باوجود اس کے کہ جان کا خوف بالکل نہیں ہے کہ خود کی درازی عمر کا علم ہے اس لئے کہ اثنا عشریہ کے نزدیک گزشتہ و آئندہ کا علم ان کے لئے لازمی ہے تو ان کے شیعوں کا اشتیاق ملک عراق و خراسان، ہند و سندھ خصوصاً یورپ اور بنگالہ، رکن، لکھنؤ و نین آباد میں ان کو با تفصیل معلوم ہوگا نیز یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے منسلکوں مقتدوں کے پاس کتنی فرجیاں اور آلات حرب و ضرب پیہ اور انگریزوں کے کئی زبردست ساز باز ہے یہ سب ہی ان پر منکشف ہوگا ان سب حالات کے ہوتے ہوئے بھی خود کو درپیش رکھنا اور دیکھنا کہ کہیں کچھ کو بھی مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی طرح کوئی دیکھ کر سے قتل نہ کرے حالانکہ مارا جانا مقدور نہیں تو آخر کس مقولہ پر محمول کیا جاسکتا ہے،

اور پھر ہر امت دلت و دین میں نیکی و نیکوئی انبیاء و اسیاء گذرے، ان کے دشمن بھی ہوئے اور وہ درپے آزار بھی رہے باہر تنگ عزت کے ساتھ ساغر جہاں آزار و نقصان پہنچانا بھی اور ان کو ہلاکت تک پر قدرت پا گئے، اسی پر بھی ان حضرات نے اپنے جسم کو مصائب پر قربان کر دیا اور صبر کو اپنی ہمت کا پیش خمیہ بنایا اور چھپنے یا درپوش ہونے یا میدان عمل سے جگان گوارہ نہ کیا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے، وَكَانَ جَمْعٌ تَائِبٌ تَائِلٌ مَعَهُ مِنْ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا ذُكِرُوا أَبَاحُ اللَّهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا نَعَفُوا وَكَانَ اسْتَكْبَارًا لِلَّهِ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ داور بہت سے نبی ایسے ہیں کہ اللہ والوں نے ان کی محبت میں جہاد کیا اور اللہ کے راستہ میں ان کو جو کچھ درپیش ہوا اس پر نہ دوست پڑے نہ کمزوری دکھائی نہ فریاد و انتہا کی اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے حالانکہ ان حضرات کو نہ اپنی موت پر اختیار تھا نہ اپنی درازگی عمر غلبہ و تسلط کا یقین تھا۔

سارے ہی شیعوں کا یہ دینی طرز عمل حیرت میں ڈالنے والا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ غم اور فکر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار و مشرکین کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچ جائے جب کہ آیت واللہ اعلمک من اناس و اللہ تعالیٰ

لوگوں سے آپ کی حفاظت نہ رہے گا، کا مشرہ مع مبارک نبویؐ تک نہیں پہنچا تھا تو ان کو قابل طعن نظر آتا ہے، اور وہ اسے بزدلی کہتے ہیں مگر اس سخت خوف کو بزدلی کی حدوں سے بھی کئی درجہ بڑھا ہوا ہے، خود اپنے خیال خاتم میں امام زمان کے بارے میں ثابت کرتے ہیں اور انہیں ہر شے نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس کے شکنجے میں رہے ہیں بات دراصل نعم فرست کی نہیں تعصب اور انہیں سے پن کی ہے، اور طرز فکر کی بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ درمروں پر وہ بات قلمو پنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، جو ان کے اپنے بزرگوں اور ان کے قیامت پر راست آتی ہے،

ان سکینوں کو یہ پتہ نہیں کہ غم چیز ہے دیگر اور خوف شے دیگر اور بزدلی ان دونوں ہی سے الگ چیز ہے۔ ابن مہلبہ علی نے کہا ہے۔ اَلْجَبَانُ لَا يَتَّقُونَ اِلَّا مَا مَنَعَهُمُ الْبَزُولُ اَمَامَتِ كَاسْتَقِي نَهْيُ (اور حقیقت بھی یہی ہے اس لئے کہ اس سے مقاصد امامت حاصل نہیں ہوتے اب اگر وہ غم اور خوف کو بھی اسی زمرہ میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پاؤں پر کھلم اٹھا مارنے سے انہیں کون روک سکتا ہے اس لئے کہ امامیہ کے تمام راویان اخبار نے ابی حمزہ سے اور اس نے علی بن حسین رحمہ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے،

ابو حمزہ کہتا ہے کہ مجھ سے علی بن حسین نے فرمایا کہ میں فکین
قَالَ الْوَلَدُ زَكَتُ عَلَيَّ بَيْنَ حُسَيْنٍ كُنْتُ مَسْكَاً عَلَيَّ الْخَائِلُ
وَاَنَا سَرِيٌّ شَدِيدٌ اِذَا دَاوَى قَاتِلُ حَسَنِ الْقِيَامِ
يُطِيبُ التَّرَائِيحَ فَنَظَرْتُ فِي وَجْهِهِ قَالَ اسْتَبْ حُزْنُكَ
قُلْتُ الْخَوْفُ مِنْ وَثْقَةِ الذِّمِّيِّ قَالَ فَجَعَلْتُ ثُمَّ قَالَ
يَا عَلِيُّ هَلْ مَرَّ اَيْتٌ اَحَدٌ اَخَافُ اللّٰهَ فَنَمَّ يَجُودُ كُنْتُ لَا
قَالَ يَا عَلِيُّ هَلْ مَرَّ اَيْتٌ اَحَدٌ اَسْأَلُ اللّٰهَ فَلَمْ يُطِمْ
قُلْتُ لَا ثُمَّ نَظَرْتُ فَلَمَّا اَمَّ قَدَّاحِي اَمَّنَا فَجَعَلْتُ
مِنْ ذَالِكَ يَادَا اِبْقَا اَيْلَ اسْتَمُّ مَرْثَةً وَلَدَا اَمَّيْ شَحْنَةً
يَقُولُ يَا عَلِيُّ هَذَا الْخَوْفُ۔

سے سوال کیا ہوا اور اس نے اس کا سوال پر راند کیا ہو۔ میں نے کہا نہیں، اب جو میں جواب دے کر دیکھتا ہوں تو وہ شخص مرے سامنے سے غائب تھا، مجھے اس پر بہت تعجب ہوا کہ ناگاہ غیب سے کسی آواز دینے والے نے آواز دی جو میں نے سنی تو لیکن صاحب آواز کو نہیں دیکھ سکتا تھا، کہ اسے علیؑ پر خوف تھا،

اس خبر سے چند مفید مطلب باتیں ماحصل ہوئیں۔ اول تو یہ کہ غم اور دشمنوں کا خوف بزدلی کی نشانی نہیں ورنہ خباب سجاد امامت کے مستحق نہ ہوتے جیسا کہ علیؑ نے بزدلی کو امامت کا مستحق نہ مان کر ان کی امامت کی نفی کرنی چاہی ہے۔ جو از روئے اجماع غلط ہے۔

دوسرے یہ کہ ائمہ بھی بعض اوقات حضرت خضر علیہ السلام کی نصیحت، ہدایت اور تنبیہ کے محتاج رہے ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام کا یہ مرتبہ ہے کہ وہ ائمہ کو نصیحت و ہدایت اور تنبیہ کر سکیں،

جب حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق یہ بات تسلیم کر لی گئی تو پھر یہ بات از خود ثابت ہو گئی کہ حضرت خضر علیہ السلام سے انفسل نہیں ہیں، نیز بالاجماع یہ بات بھی طے ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام یا تو انبیاء علیہ السلام سے باعتبار درجہ

کہ آپؐ، یا ماری، لہذا اللہ کی افضلیت، انبیاء کرامؑ پرستہ ثابت نہ ہوئی۔

اب رہے یہ قسم کہ سید الامام علیؑ نے کفار کے دوسرے غار میں منہمک ہوئے، تو یہ بات میں سے کسی سے بالکل بے جوڑ ہے، اس لئے کہ حضور علیہ السلام کا غار میں قیام و دعوائے نبوت کو چھپانے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ آپؐ اپنے ہجرت کے پرگزرم کو کفار سے چھپا، اچاہتے تھے کہ وہ اس سے آگاہ ہو کر اس پر دگرگام میں مزام نہ ہوں اور کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کر دیں، اور یہ ماجرا تین راتوں میں ختم ہو گیا۔ کفار آپؐ کی تلاش سے ہار تھک کر اور کوئی اندر پنہا کر لیں واپس لوٹ گئے، اور آپؐ نے علیہ السلام متقا ہجرت مدینہ طیبہ کی جانب روانہ ہو گئے تو آپؐ کے غار میں تین شبانہ قیام کو اللہ کی غیبت معفری و کبریٰ پر قیاس کرنا سفاقت، ہی کہلا سکتا ہے، ہاں آپؐ کے اس قیام کے وقت یا سترش و عورت دین، تبلیغ احکام اور اہل اہل بیتؑ سے کسی بدچیز یا مشاغل میں پڑتا یا وہ دردم برہم ہو جاتی تو اس پر قیاس درست مانا جاتا یا جاتا بلکہ یہ ان کو تاریخ پرست کی کتابیں مہر ہو جاتیں، انہیں اٹھا کر دیکھ دیا جائے کہ وہ کونسی جہانی درد و حالی ہیں اور سترش ہے جو ان بزم کفار کے باغ و خرم کا نشانہ اور وجہ موجودات علیہ السلام کو نہ پہنچی ہو۔ مگر آپؐ ایک لمحہ کے لئے بھی ادائے فریضہ اور اعلائے کلمہ الحق سے باز نہیں رہے،

اور اگر اس لطیف نکتہ کو کسی کی عقل نارسا اور فہم کچ میں بار نہ مل سکے تو اس سے قطع نظر ایک اور ظاہر دین نزق ان دونوں صورتوں میں ایسا ہے کہ معمولی عقل و شعور رکھنے والا بھی اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ اس پوشیدگی میں جو ظہور و غیبت (چھپنے، کماپوشی) خیمہ ہوا اور اس اختداد پر غیبیگی میں جس کا لازماً نتیجہ گناہ کا بھرجانا اور ترک دعویٰ ہو زمین و آسمان کا فرق ہے، چنانچہ سید البراء علیہ السلام نے تین راتوں میں بداندیشیوں کی بیخ و بن اکھاڑ ڈالی اور خیر اندیشوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچا دی لہذا یہ قیام تو مقصد کے لئے ایک تدبیر تھی،

کہ اگر باب عزم ابتداءئے عمل میں ان سے کام لینے ہیں اور حصول منفرد کا بہترین موجب شمار کرتے ہیں، یہ وہ پوشیدگی نہیں تھی جس کا سبب شیعہ سزات بنام صاحب الزمانؑ کو سزا ہے، بلکہ ظاہر و طور پر اس سے بزدلی ہو رہی ہے اور دوسرے دست برداری اور محنت امت سے خود کو دور کرنا صاف آشکارا ہے، انہوں نے اس غیبت کے دوران کس فرقہ و طبقہ کو متاثر کیا اور غر کیا، کس ملک و سلطنت کی بنیاد قائم کی؟

اگر صاحب الزمانؑ کو یمن و افوی کے بجائے تین سو سال لئے اور فاروق کے بجائے مروانہ ہرمن رائے اور مدینہ نذرہ کے بجائے دارالمؤمنین قم یا دارالایمان کاشان، اور بجائے انصاری کے فارسی و عراق کے شیعہ جو انصار سے کثرت سامان میں ہزار گز زائد ہیں، اس وقت یہ ضرور کرتے کہ میں ہر طرح سے جو کس ہو کر امت کی اصلاح احوال کے لئے ظہور کر دوں گا تو اہل سنت اور دیگر مسلمان ان شرائط کی فراہمی پر ان کو معذور سمجھتے کہ آخر امام کا رہنما پیغمبر سے تو کم ہی ہوتا ہے مگر ستم ظریف تو دیکھئے کہ ہزار سال سے زائد گزر گئے، اتنی لمبی مدت ملی اور اکثر بلاد اسلامی میں مذہب کا چرچا ہوا اور وسیع و پرفضا دیار و امصار و سنوئل کے قبضے میں آئے، کہ ان میں سے ہر ایک دشک جابر صبا اور جالبقار اور حیرت مینوارم ہے۔ اور انصار و اعوان نے وہ قوت پکڑ لی جو کسی اور مذہب کو نہ ملی۔ اس سب کے باوجود آپؐ نے ظاہر ہونے کا میلان یا اس کا خیال نہ کیا، اور روز بروز اختلاف اور پوشیدگی میں قدم آگے ہی بڑھتا گیا۔ تو ایسے شواہد اور مشکل طلب امام کے باقوتوں نہ جانے اور کیا کی بھگتا ہے کہ ابتدا ہی میں امت میں طاقت برداشت سے زیادہ تکلیفیں ڈال دیں

یہ تو اہمست نہ ہوئی قیامت ہو گئی۔ ان ہی باتوں کو دیکھ اور ان پر غور کر کے مہرین شیعہ کے شیخ کٹر العزیزان کے مصنف متقار نے تریف مرقفی اور مفیدین کے راستہ سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کیا اور کہا: اِنَّمَا كَاتِ الْاُخْتِفَاوُ الْحُكْمَةُ اسْتَشَارَةُ الْاَلَانَةِ لَعَالَى فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عَمْدًا پر شیعہ کی ایک حکمت پر مبنی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم غیب میں اپنے لئے پسند کیا، ظاہر ہے کہ یہ نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس طرح تو ہر چیز کے بارے میں جب اس کو خلاف لطف و مہربانیں کہہ سکتے ہیں تو پھر کسی بھی چیز میں لطف ثابت نہ ہو گا مثلاً تقرر امام دیرہ اور اس انتقال کی وجہ سے شعبوں کا سرشتہ کام عقل ہر جانے گا کیونکہ ان کی دلیلوں کی بنیاد ہی قول پر تو ہے کہ نفلان ہر لطف ہے اور لطف اللہ پر واجب ہے، لہذا اس بحث کو غور و فکر سے سمجھنا چاہیے اور پھر اس موآزما سمندر میں ان کا ہاتھ پاؤں مارنا دیکھنا چاہیے، کہ ہمیں سے ان کی عقل و دانش کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مسئلہ (۲)۔ امام کو ظاہر بنایا ہے پوشیدہ اور پردہ پوش بنایا ہے ہی اہل سنت کا مذہب ہے نہ وہ ظہور و کواہست کی طور پر دینے ہی پوشیدہ اس شرط کو نہیں مانتے اور چونکہ عقل و نفس ہر دور کی نفوذ و مدد کے مرکب ہوتے ہیں عقل کی خدمت و رزق تو سطرہ ہوتی ہے نہ امام و خلیفہ کے قدر کی تو غرض یہ کہ ہونے سے کہ وہ صد و نو زین اور سترائوں کا ہر اندر سے، فوجوں اور لشکروں کو تیار کرے اسلام کی فوج کی حفاظت اور نظم و ضبط برقرار رکھے، اس و شریعت کا جملہ بالائے سرے اور سرزبان کا نفاذ کرے برائیں اور گناہوں پر لوگوں کو سزائیں دے غفیلین اور انہوں کی تقرر میں ہی لائے اور یہ امر بنیاد کے کلام عالم ظہور میں آئے فساد پیشہ لوگوں پر اس کا رعب و دہرہ بڑھا جائے دوسرا یہ اسی کے خلاف کہ اس کا بیڑہ باطل اور ملکی مکتب و سلطنت کا اقبال نام ہو جائے۔ مہرین اس کے اگر اسے حاصل نہ ہر ان تو امام کا بڑا نہ ہونا ہر بار ہے بلکہ بیگانہ ہے اور کارخانہ قدرت میں بیگانہ شے کا وجود محال ہے امام و خلیفہ کا ظاہر ہونا عقل کے نزدیک۔ اسنا ظاہر ہر بار ہے کہ اہل مذہب امتیں ہی نہیں ہے یہ مذہب مجوسی ہی اسے جاننے ہی پناہ فرمادی ہے اپنے شاہنامہ میں انہیں کا یہ نزل فعل کیا ہے

نرمید ہر چلوی تاج و تخت بنی بایدیکہ شاہ فرخندہ بخت کہ بادشہ برونسرو ایزدی بنی بتابد ز گفتار او بجزوی ہر چلوی کو تاج و تخت زیب نہیں دینا اسکے لئے تو ایک مبارک بخت کا بادشاہ چاہیے کہ جس سے شان ایزدی ہو یا ہر اور ملکی لشکر میں عقل کی روشنی جھلکتی ہو اور عقل کی غفلت و رزق ہوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِعَسَىٰ يُفْعَلُ اَلَمْ يَجْعَلْ لَكُمْ فِي الْأَنْفُسِ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تُعْقِلُونَ اور اسلحہ کے لئے ان سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ کیا تھا اور ان کو اپنے پسند فرمودہ دین پر ملکن و جہان عطا فرمائے گا اور ان کے خوف کو دور کر کے اس خوف کو امن سے بدل دے گا نیز فرمایا: الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْغُفُورِ وَرَحِيمِهِمْ اَلَمْ يَجْعَلْ لَكُمْ فِي الْأَنْفُسِ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تُعْقِلُونَ اور ان کو زمین میں ملکن و قدرت و اختیار عطا کرے تو یہ نظم و نفاذ قائم کرے اور زکوٰۃ دیں بھلے کاموں کا حکم کریں برے (اور باحقول و ناگوار کاموں سے روکیں لہذا معلوم ہوا کہ خلیفہ بنانے کی یہ افرائض و مقاصد ہیں، انکے ذریعہ پسندیدہ دین کا استحکام و اشاعت اہل خیر کی امن و صلاح، غنا و جمع و جماعت عین کا قیام و انصار و زکوٰۃ صدقات کی وصولی اور پھر مستحقین میں اسکی تفصیل اور اسر بالمعروف بنی من المنکر چنانچہ کتاب المجاہد کتاب الاحساب کتاب الحدود و العقاب و المجاہدات انہیں دو مکمل اور بالمعروف و بنی من المنکر کی تشریح و تفصیل ہیں، اسر مذکورہ کے علاوہ بھی مختلف کے مقاصد جو سکتے ہیں جیسا کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَابْتَغُوا لَنَا مِلَّةً نَّفْعًا لِّفِي سَبِيلِ اللَّهِ جِلْدَ لَعَلَّكُمْ تُعْقِلُونَ اور اس کے وزیر علم اللہ کے راستہ میں قتال کریں تو معلوم ہوا کہ بادشاہ و رئیس کے تقرر کی ایک غرض جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے پھر ارشاد ہوا: وَابْتَغُوا لَنَا مِلَّةً نَّفْعًا لِّفِي سَبِيلِ اللَّهِ جِلْدَ لَعَلَّكُمْ تُعْقِلُونَ اور ان کو ہدایت کرتے تھے جلد سے حکم کی جب ممبرک انہوں نے تو معلوم ہوا لوگوں کو ہدایت کرنا اور ان کو ہدایت کرنے میں تکالیف پیش آئیں ان پر ممبر کرنا بھی امامت کے لوازمات میں سے ہے۔

قائدہ عقلیہ ہے کہ جب کسی چیز سے وہ کام نہ لیا جائے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی یا اس سے کوئی مقصد حاصل نہ ہو تو وہ بیکار ہو جاتی ہے نیز ازل عقل کے نزدیک یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ جب کوئی چیز موجود ہو تو وہ اپنے تمام لوازمات کیساتھ موجود رہتی ہے ورنہ وجود عدم برابر ہوتے ہیں، شیعہ عقیدہ عقل و نقل کی خلاف ورزی کیے ساتھ عزت کے بھی مخالف ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے روایت صحیح بطریق تواتر پنج البیانہ میں یہ روایت مذکور ہے اِنَّهُ قَالَ لَا بُدَّ لَنَا مِنْ اَمِيرٍ يَدُ اَوْ قَا جَعَلَنِي فِي اَمْرَةٍ الْمَوْ مِنْ وَيَسْتَتِعْ فِيهَا الْكَافِرُ وَيَبْلُغَ فِيهَا الدَّجَلُ وَيَا مَنْ فِيهَا السُّبُلُ وَلَيْزَ خَذُ لِبَصْعَتَيْنِ مِنَ الْقَوِي حَتَّى يَسْتَتِجَ بَنُو وَيَسْتَرَا مِنْ قَا جَعَلَنِي

آپ نے فرمایا لوگوں کیلئے ایک امیر ضروری ہے وہ ایک ہو یا بہرے کے زیرِ ذل و من کام کرے اور کافرانہ اٹھائے اور اسکی حکومت میں اپنی موت ہوتی کرے اسکی امارت میں رہتے محفوظ و مامون ہوں طاقتور سے کمزور کا حق دلوئے

نیکان سے رہیں اور بدوں سے ان کی حفاظت ہو،

اور جناب امیر کے اس کلام کو تفسیر پر بھی محمول نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ صحیح البیانہ میں اس کی تصریح ہے کہ آپ نے خوارج کی یہ بات لدا امرة کوئی حکومت نہیں ہے، سکر یہ کلام فرمایا تھا، اور خوارج کے مقابلہ میں تفسیر کا کیا سوال اور کیا جواز!۔

مسئلہ (۱۲۳)۔ امام وغنیہ کا علم و اجتہاد میں خطا سے پاک ہونا ضروری نہیں اور عکاسہ سے معصوم ہونا امامت کی شرط ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ تقریر کے وقت کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو اور صغیرہ پر مفسر نہ ہو کیونکہ یہ عدالت کے خلاف ہے، اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے،

مگر شیعہ خصوصاً امامیہ اور اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ علم میں غلطی سے پاک ہونا اور عمل میں گناہ سے کہ ان کا صدور اس سے مستغنی ہونا کے نزدیک انبیاء کی طرح امام بھی ہونا ہے، ان کا یہ عقیدہ بھی کتاب و سنت کے خلاف ہے، کتاب اللہ کے تو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ فَا بَقِيَتْ لَكُمْ كَمَا كُنْتُمْ مِدْكَ اَبَيْتُ شَكَ اللّٰهَ تَعَالٰی نے طاہرات کو تہار بادشاہ بنا کر بھیجا۔ لہذا طاہرات واجب الاطاعت امام ہوئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ تھے حالانکہ یہ بالاجماع معصوم نہیں تھے،

بلکہ ان کا جو معاملہ حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوا اس سے تو ان کی عدالت پر بھی حرف آتا ہے، عصمت تو بعد کی بات ہے، پھر دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے، اِنِّيْ جَاعِلٌ فِی الدُّنْيَا خَلِیْفَةً لِّمَنْ فِی الدُّنْيَا میں اپنا خلیفہ مقرر کر رہا ہوں تو حضرت آدم علیہ السلام نبوت سے پیشتر ہی خلیفہ اللہ فی الارض ہو گئے اور بالاجماع ان سے لغزش ہوئی، دَعَوٰی اَدَمُ سَابَقَهُ فَعَزَّزْنِیْ رَیْسُ اَدَمُ نے نافرمانی کی اپنے رب کی وہ بیک گئے، اور یہ قصہ خلافت و امامت کے زمانہ کا ہے نبوت کے وقت کا نہیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے، فَتَبَّ الْجَنَّةُ لِمَا كَانَتْ تَفْتَابُ عَلَیْهِ وَهَدٰی فِیْ اَیْمَنِ رَّبِّیْ اَسَیْ كُوْنَا، اس کی توجہ قبول کی اور ان کو ہدایت دی،

اور عزت کی مخالفت اس طرح کہ ایک تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وہ قول جو بحوالہ پنج البیانہ ابھی مذکور ہوا، دوسرے کلینی کی کافی میں بروایت صحیح یہ مذکور ہے کہ جناب امیر اپنے دوستوں سے فرما رہے تھے، اَوْ تَكُونُوْنَ عَنْ مَّقَالَةٍ یَّحْتَقِیْ اَوْ تَكُونُوْنَ مَعَهُ لَیْلَ فَا تِلْكَ اَمْرٌ اَنْ اَخْطِیْ اِنْ۔ (تم حق بات کہنے سے اور منصفانہ مشورہ دینے سے باز نہ رہو، کیونکہ میں مطمئن نہیں ہوں کہ غلطی مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتی، یہ پوری روایت باب مطالع میں انشاء اللہ بیان کی جائے گی،

یہاں شیعروں کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں کہ وہ اُٹھتے سے اُٹھ کر علیہ وسلم کے اس فرمان اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِمَا مَضَى دُنْيَاكُمْ۔ تم اپنے دنیاوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو، پر قیاس کر کے حضرت امیرِ مومنین علیہ السلام کے کلام کو دوسری مشورہ پر محمول کر دیں۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہاں دو جملے ارشاد فرمائے۔ عَنْ مَقَاتِلَةَ بَنِي قُلَيْبٍ - اَوْ مَشُورٍ تَابَعْدَلِ اس میں آخری جملہ کو دنیاوی مشورہ پر محمول کر لیں، تو پہلے جملے کو کہاں لے جائیں۔

پھر امام میر میں سے صاحب الفصول نے ابو عصف سے یوں روایت کی ہے کہ اِنَّهُ قَالَ كَانَ الْعَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ يَبْدُو فِي الْكُرَامَةِ لِمَا كَانَ مِنْ اخِيَةِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ مَا يُوَدُّ الْيُفْرَأُ لَوْ خُذَ الْاُتَى كَانَ أَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا فَضَّلَ اخِي۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت حسین بن علی حضرت حسن (رضی اللہ عنہم) سے صلح پر ناپسندیدگی کا اظہار فراتے اور کہتے تھے اگر میری ناک کٹ جاتی تو مجھے یہ پسند تھا، بقابلہ اس کے جو میر سے بھائی نے کیا،۔

اور جب ایک معصوم، دوسرے معصوم، کی کس معاملہ میں گرفت کرے تو لا مالہ ان دونوں میں سے ایک کی خطا ضروری ہوگی کیونکہ وہ مختلف چیزوں یا باتوں کا جچ کرنا محال و ناممکن ہے،

اور جناب سجادؑ کے اس صحیفے میں جو امامیہ کے نزدیک بطریق صحیح ثابت ہے، اس طرح مروی ہے، قَدْ نَلَتْ
الشَّيْطَانُ عَنَّا فِي سُرٍّ وَنَلَقَ وَضَعُفَ الْيَقِينِ وَرَأَى أَشْكَو سُرٍّ وَجَادَ وَنَهَى بِي وَطَاعَةَ نَفْسِي لِمَا رَجَى نَكَبٌ بَر
گمانی اور یقین کی کمزوری میں میری باگ شیلان کے ہاتھ میں آگئی اور میں فریاد کرتا ہوں اس کی ہمتاگی سے اور
اس بات سے کہ میرے نفس نے اس کی پروردی کٹی۔ اور ظاہر ہے کہ اس کلام کو سچ مانیں یا جھوٹ، عصمت کے خلاف
ضرور ہے،

ابہ الامیہ اور اسمعیلیہ کے پاس کتاب و عزت سے ترک کوئی دلیل ہی نہیں ان کے استدلال کا مدار شبہات عقلیہ پر رہ جاتا ہے، لہذا ہم مجبوراً اس پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں اور ان میں جہاں جہاں غلط فہمی ہوئی ہے، اس کو بھی واضح و شفاف کرتے ہیں۔

سببہ (۱۱)۔ اگر امام معصوم نہ ہو تو تسلسل لازم آتا ہے، اس لئے کہ امت کے لئے جو امام کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ محض اس لئے کہ امت سے علم و عمل میں غلطی نہ ہو جانا جائز ہے پس اگر امام سے بھی غلط و غلطی کا صدور مان لیا جائے تو اس کی تعمیع کے لئے پھر ایک اور امام کی ضرورت ہوتی، اور احتیاج ہوگی اور یہ سلسلہ یوں نہیں دروازہ ہوتا رہے گا، کہیں بھی ختم نہیں ہوگا، یہی تسلسل ہے جو ممال ہے ا

ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ امت سے چونکہ خطا سرزد ہو سکتی ہے اس لئے اس کی درستگی کے لئے امام کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ امام کے تقرر کے جو فوائد و اغراض ہیں وہ ہم اور پر بیان کر آئے ہیں یعنی احکام کا نافذ کرنا فساد و ہشت گردی، تخریب اور بد نظمی کو دور کرنا اور سرزمین اسلام کی حفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ اور ان اغراض کے حصول اور ان امور کی انجام دہی کے لئے علمت ضروری نہیں۔ اجتہاد و عدل کافی ہیں،

اور جب اجتہاد میں غلطی ہو جانے سے امام پر اور ان کے متبعین پر کوئی مراخذہ نہیں، تو خطا کا جواز و عدم دونوں برابر ہوئے۔

اور اگر اس شبہ کو تسلیم بھی کر لیں تو ہم اس سلسلہ میں تسلسل کو نہیں مانتے اس لئے کہ عصمت کا سلسلہ بالاتفاق

نبی پر ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے بعد کوئی معصوم نہیں، اور اگر بالفرض اس کا اجراء تسلیم کریں تب بھی ان کا یہ شبہ اس مجتہد جامع شریعت سے ٹوٹ جاتا ہے، جو امامیہ کے نزدیک امام رد و پیش کے وقت ان کا نائب مقرر ہوتا ہے اس لئے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ یہ نائب غلطی کر سکتا ہے، اب یہاں ان کا جو جواب ہو گا امام کے بارے میں وہی ہمدرد جواب ہے!

شعبہ ۱۱۲۶۔ امام شریعت کا نگہبان ہوتا ہے، اگر اس سے غلطی کا صدور جائز مان لیں تو وہ شریعت کی حفاظت کس طرح کرے گا،

ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ مندرجہ بھی قابل تسلیم نہیں کہ امام نگہبان شریعت ہے وہ صرف احکام شرع کی تردید دینے اور امور و نواہی کا نفاذ کرنے والا ہے۔ شریعت کی نگہبانی علماء اسلام کا کام ہے اور انہیں سے متعلق ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے وَاللّٰہُ یَتْلُو اٰیٰتِہٖ عَلَیْکُمْ وَیَاۡدُجِبُ اِلَیْہِ اَسْتَجِیْبُوْا لَہٗ وَکَآذِبُوْا عَلَیْہِ شَہَدَآءُ اور اہل اللہ اور اہل علم کہ ان سے کتاب اللہ کی حفاظت کی توقع کی گئی تھی، اور وہی اس پر گواہ تھے، نیز دوسری جگہ ارشاد ہے کُوْنُوْا اٰمَنًا یٰۤاٰیُّہِیْنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ اَلْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تُدۡرِکُوْنَ اَوَّلَیِّہٖ وَاٰخِرَہٗیْنَ بِنَہۡیِہٖ لَعَلَّکُمْ تَحۡفَظُوْنَ اَوَّلَیِّہٖہَا وَآخِرَہَا وَتَعۡلَمُوْنَ اَنَّہٗ ہِیَ الْحَقُّ وَتَعۡلَمُوْنَ اَنَّہٗ ہِیَ الْحَقُّ وَتَعۡلَمُوْنَ اَنَّہٗ ہِیَ الْحَقُّ کی تعلیم دیا کرتے اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہتے تھے، اور جب فترت کے زمانہ میں کہ اماموں کا سلسلہ رک جانے سے عبارت ہے، امامیہ کے نزدیک بھی شریعت کی حفاظت علماء کے ذمہ ہے تو اسی طرح حضور و روپوشی امام کے وقت بھی شریعت کی حفاظت علماء کے ذریعہ ہوگی،

چنانچہ ابن مسعود علی نے کشف الکرامہ میں لکھا ہے، اِنْ حَاصَلَ بَیِّنٌ اِلٰی مَامِ الْمُتَّعِیْلِ بِالْبَیِّنِ الْمُتَّعِیْلِ بِاللّٰہِ فَاِنَّ شَرِیْعَتَ النَّبِیِّ اِلٰی رَبِّہِیْ اَلْحَقَّ حَفَظَہُ اللّٰہُ فَاِنَّ ذٰلِکَ اَلْوَعِیۃَ بِرِجَالِہِیْ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اگر نبی سے متصل امام اور اللہ سے واصل نبی کے درمیان اور دوسرے وحی کے درمیان زمانہ فترت اور خلا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی وصیت کی حفاظت مؤمنین کے ذریعہ کرتا ہے،

اور اگر ان کا شبہ حضور ہی دیکر ممان بھی ہیں تو امام شریعت کی حفاظت و نگہبانی، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت کے ذریعہ سے کرتا ہے ہذا خود نہیں، ان تینوں ذرائع حفاظت شریعت میں غلط و غلطی جائز و درست نہیں ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زمرہ اجتہاد میں شامل ہے، زمرہ شریعت میں نہیں اس لئے اس کی نگہبانی کی بھی امام کے لئے چنداں ضرورت نہیں،

ان شبہات کی صحت کی صورت میں یا علمین پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر امام کے لئے معصوم ہونا اس لئے ضروری ہوتا کہ وہ غلطی اور خطا سے بچتا رہے تو پھر یہ چاہیے تھا کہ ہر ملک بلکہ ہر شہر میں ایسا ایک شخص موجود ہوتا جو صرف ایک آدمی ایسا معصوم، پوری دنیا کو غلطی و خطا سے نہیں بچا سکتا اس لئے کہ مکلفین تو مشرق سے عرب تک پھیلے ہوئے ہیں، اور پھر ہر ایک اپنی حاجتوں اور ضروریات میں گھرا ہوا ہے، ہر ایک کو اتنی فرصت کہاں کہ اپنی غلطیاں امام سے درست کرانے کی خدمت میں حاضر ہو اور نہ باعتبار سقنفت ایسا ہونا ممکن ہے بلکہ مادہ محال ہے، اور اگر امام سے دوری کے سبب امام ہر شہر ہر قریہ میں اپنا نائب مقرر کرے تو اس میں عصمت نہ ہونے کی وجہ سے غلطی جائز ہوگی اور امام سے دوری کے سبب امام اس کی غلطی پر مطلع بھی نہ ہو سکے گا خصوصاً روزانہ کے

نت سہ واقعات اور گونا گوں مسائل اور نہ رکھنے والے حوادث پیش آنے کے سبب تو ایسا ممکن نہیں کہ غلطی سے بچ بچ کر رہتا رہے، خاص طور پر نیت کبریٰ کے زمانہ میں تو اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں، پھر امام اگر نائب کی غلطی پر مطلع نہ ہو جائے تو بالمشافہ اس کو ٹوکنے اور اصلاح کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں، بجز اس کے کہ یا تا حد کے ذریعہ مطلع کرے یا بذریعہ مراسلات۔ اور تا حد جو کچھ معصوم نہیں ہوگا تو وہ غلط و غلطی سے محفوظ نہ رہا۔ لہذا غیر معتبر ٹھہرا اور مراسلات و تحریرات میں جو دھوکے بازی اور جعل سازی چل رہی ہے اس کے پیش نظر اس میں بھی غلطی کا احتمال موجود ہوگا۔

پھر اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اگر نائب کو تحریر کا مطلب سمجھنے یا تا حد کی گفتگو کے ذریعہ امام کا مقصد سمجھنے میں کوئی دشواری اگر پیش آگئی تو وہ اپنی رائے اور تیس کے اصول کو کام میں لائے بغیر اس کو حل نہ کر سکے گا اور ان سب صورتوں میں شبہات غلطی کی گنجائش ہے، لہذا خطا سے حفاظت کی اس کے بغیر کوئی صورت ہی نہیں کہ سربراہ ملک اور ہر شہر میں ایک معصوم، مقرر ہو،

مسئلہ ۱۴۲۔ یہ ضروری نہیں کہ امام کے تقرر کے وقت خدا کا صریح حکم بھی آئے، کیونکہ اس تقرری کی ذمہ داری تو مکلفین پر ہے، وہ ضرورت کے وقت، حالات کے تحت اپنی مصلحت اور تقاضائے زمانہ کے موافق اپنے میں سے ایک رئیس چن لیں۔ اور چونکہ یہ ان کا اپنا انتخاب ہوگا اس لئے اس کی لاج رکھیں گے اور پاسداری کرتے ہوئے اس رئیس کی اطاعت میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے اور اگر اس کا تقرر خدا کی طرف سے کسی نفس کے ذریعہ ہو تو دیگر تمام احکام شرعیہ کی طرح اس کے متعین و مقرر کرنے میں غفلت اور سستی پیش آنے کی اور غلبہ دام کے تقرر کرنے سے جو غرضی تھی وہ ہاتھ نہ آئے گی، اگر مکلفین ایسے ہی جھٹھکناں ہوتے کہ ان کے لئے صرف فرمان الہی کافی ہوتا تو قرآن کی اطاعت کرنے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرامین کی کوئی کمی باقی رکھی یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کسر اٹھا رکھی اور ان مکلفین نے ان کے ساتھ کیا کیا؟

امام و خلیفہ کا تقرر و نصب اسی لئے تو ہوتا ہے کہ مکلفین کی نیند توڑی جائے احکام شریعت میں ان کی سستی و کاہلی کا فوراً جانے اور جن کا بصورت باتوں سے نہ اترا ہوا ان کو لاتوں کی مار دی جائے اور لوگوں کو چاروں طرف چاروں طرف بھرت سے ادھر ادھر کی جانے ان کو باز نہ کر رکھا جائے وہ اپنے کو مادر پدر آزاد نہ سمجھیں۔

اور اگر خود امام و خلیفہ بھی دیگر شرعی احکام کی طرح کی ایک کڑی ہوتا تو وہ بھی دیگر احکام شرعی کی طرح غفلت و سستی کا شکار ہوتا۔ لہذا مکلفین کے حق میں یہی اصل ہے کہ انتخاب امیر کی ذمہ داری انہیں کی عقلوں پر ڈالی جائے،

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ امام کا تقرر خدا پر واجب ہے لہذا خدا کی طرف سے تقرر نامہ آنا چاہیے، حالانکہ ان کا یہ عقیدہ بھی عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے، عقل کے خلاف ہونا تو سطور بالا سے معلوم ہو گیا۔ نقل کے خلاف اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جا بجا ان لوگوں کے بعض فرقوں مثلاً بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَا هُمْ آيَةً لِّكَ لَعَلَّكَ تَتَّقِي (ہم نے ان کو امام بنایا، وَتَرِيدُ أَنْ نَمُنَّ بِمَا آيَةً لِّكَ لَعَلَّكَ تَتَّقِي) (ہم چاہتے ہیں کہ ان کو امام بنائیں اور وارث کریں) اور یہ بھی فرمایا وَجَعَلْنَا مَلُوكًا وَآتَيْنَاكَ مَلَكًا يُوْثِقُ أَحَدًا مِنَ الْمَلِكِينَ (اور اس نے، یہیں بادشاہ بنایا اور وہ کچھ جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیا تھا، اور یہ بھی ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ خَدَّيْكَ رِجًا لِّرِجِّهِ وَهُوَ الَّذِي

ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

اور ان مختلف فرقوں کے ملوک امارتوں اور خلفاء میں سے کسی ایک نام کی بھی تصریح نہیں فرمائی۔ بلکہ ہر تائید رہا کہ ان فرقوں کے ارباب اختیار خود ہی اپنے عقل و تدبیر اور سمجھ بوجھ سے کسی ایک فرد کو تمام ریاست پر دیکرتے یا وہ خود اپنی شوکت و غلبہ سے سب پر تسلط ہو جاتا اور سب اس کے حلقہ اطاعت میں آ جاتے۔

لہذا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے امام و خلیفہ بنانے کے یہ منہ ہی کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے ان لوگوں کے دلوں میں جھلکی کہی ہوئی بات و وقت اور اعتبار رکھتی تھی، یہ بات جاگزین کر دیتا تھا کہ فلاں شخص نور میں بناو، تاکہ وہ تعالیٰ تائید آسانی اور شوکت غیبی سے اس کو مخلوق پر تسلط عطا فرمائے۔

اب اگر وہ ریاست و سیادت کا اہل ہے تو امام عادل ہے، ورنہ امام جابر۔

مسئلہ (۵)۔ امام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک تمام اہل زمانہ سے افضل ہوں۔ ان سے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طاہر ت کر اپنے حکم سے خلیفہ بنایا جب کہ پیغمبروں میں حضرت داؤد اور حضرت شمویل علیہما السلام موجود تھے، جو بلا ریب و شک ان سے افضل تھے اور عند اللہ برتر تھے۔ ہاں اگر امیر و خلیفہ کا جنازہ اہل صل و عند کی میت سے برتر اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ حکمرانی کے اوسانہ سرداری کے شرائط میں جو بلند و افضل ہو، اس کو منتخب کرے دوسرے سردار میں افضل و برتر ہونے کا لحاظ نہ کرتے۔ اس لئے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

کہ ذاتی طور پر ایک شخص ولی کامل، عالم متبحر اور غیب الطریقین ہو مگر وہ اپنے اکیلے گھر کا بھی انتظام نہ چلا سکتا ہو، تو وہ اپنے ملک کی سرداری کے فرائض کیسے پورے کر سکے گا، لہذا یہاں دوسری ہی قسم کی صلاحیت و فضیلت ہونی چاہیے،

اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ امامیہ نرے بدھو بھی نہیں ہیں کہ وہ نہی الی شپ عقیدہ گھڑ لیتے ہوں یہ بڑے کائیاں اور منصوبہ باز لوگ ہیں، یہ کوشش تو بھی کرتے ہیں کہ زخم زخم سے ہی کے گئے، مگر بیچارے مکانات عمل کے قانون کی زد میں ہاتھ پاؤں اپنے ہی تڑوا بیٹھتے ہیں، اس عقیدہ میں بھی یہ تینوں شرائط (معصوم ہونا، منصوص ہونا، اور افضل ہونا) بڑی چالاکی اور بدینیتی سے بڑھائے ہیں کہ عقیدہ کے پروردہ ہی میں خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کا انکار کر دیں اور اہل سنت کو علیحدہ جواب نہ دینا پڑے اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم نہ معصوم ہیں نہ منصوص علیہ اور فضیلت میں بھی بحث کا میدان خاما و سیل ہے لہذا ہم بھی یہاں ان شروط کو نظر انداز کرتے ہیں اپنی نئی کریان یعنی حضرت ابو جعفر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت کے اثبات کے موقع پر ان کے یہ ہتھیار بھی پرکھیں گے اور ان شرائط کے انشاء اللہ پر غصے اڑائیں گے، لیکن امامیہ نے اپنی کتابوں میں سارے مسائل کی اصل و نبیاد انہیں شرائط کو ٹھیرا یا ہے اور اس میں بڑی طبی چوڑی سمجھیں کی ہیں اس لئے محبراً مقام کی مناسبت سے ان شرائط کی جدا جدا لغوی بیان کر دی گئی لیکن نسل بخش کلام کے لئے اصل محل و مقام تک پہنچنے تک کا انتظار کر لیا جائے،

مسئلہ (۶)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے نائب یا فضل حضرت ابو جعفر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔

مگر شیعاں اس عقیدہ کے سب سے جدا انداز میں مخالف ہیں، شیعوں کے تمام فرقوں میں تو رشتہ رک (اور نہ کہ)

خیال جس میں سب متفق ہوں یہ ہے کہ امام بلا فصل بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خاتم بدہن، غاصب خلافت تھے کہ جیل حوالہ اور اپنے اثرات سے کام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منصب امامت سے محروم کر کے خود اس پر فائز ہوئے اس خیال پر دنیا جہاں کے سارے ہی شیعہ متفق ہیں، ان میں اختلاف تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد ہے کہ ان کے بعد امام برحق کون ہے،

اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت سے امام ہیں جب ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی اس سے پیشتر آپ امام نہیں تھے ہاں امت کا استحقاق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی سے تھا اور اس استحقاق سے کئی نے بھی کئے انکار نہیں کیا، خود سب سے زائد خلفائے رضوان اللہ علیہم بھی اس استحقاق کو مانگتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ امام ہوئے اس کے بعد دوسرے اگر بھی استحقاق تو رکھتے تھے لیکن چونکہ بعض سے تو اہل حل و عقد نے بیعت نہیں کی اور بعض نے کبیر باطن اور اشاعت علم میں مشغول رہ کر امامت کے دعوے مار نہ بنے اس لئے وہ امام نہ ہوئے،

نیز یہ بھی رافضی رہے کہ اہل سنت کے نزدیک امام پیشوائے دین کو بھی کہتے ہیں، اور اس معنی کے لحاظ سے امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ جو فقہ ہیں پیشوا تھے، امام عزیزی، امام رازی رحمہما اللہ کو جو عقائد و کلام میں پیشوا تھے اور تانہ و عاصم رحمہما اللہ کو جو قرأت میں پیشوا تھے امام کہتے ہیں، اور ائمہ اہل بیت الطہار ان تمام علوم و فنون میں پیشوا تھے خسرو ہدایت باطن اور ارشاد طریقت میں کہ اس میں ان کو درجہ انبیا از حاصل تھا لہذا اسی نقطہ نظر سے اہل سنت بھی عام طور پر ان کے لئے امام کا لقب استعمال کرتے ہیں، امام بمعنی خلیفہ کے نہیں، کیونکہ خلافت کے لئے ان کے نزدیک زمین پر اقتدار، استحقاق امامت، غلبہ و شوکت اور حاکم کا نفاذ ضروری ہے اسی وجہ سے انہوں نے خلافت کو صرف پانچ حضرات پر منحصر و محدود رکھا ہے،

اور کبھی بادشاہت و ریاست پر بھی لفظ امامت استعمال کرتے ہیں، گویا شاہ خورشید سیرت نہ ہو لیکن بہت سے دینی امور میں وہ پیشوا ہوتا ہے مثلاً جہاد میں غنیمتوں کی تقسیم میں جمعہ وغیرہ کے تمام کرنے میں لہذا ان تینوں معانی کو جو اہل مذہب و عقیدہ نے اپنا چاہا ہے، اگرچہ ان سب معانی میں لفظ مشترک ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ امور دینی میں جس کی پیروی اور اقتدار کی جائے، وہ امام ہے، یہاں تک کہ امیر الحج کہ وہ بھی ایک لحاظ سے مقتدا اور امام ہے، اور اسی لئے تو پیشوائے غار کو امام کہتے ہیں،

اور جب دین کے تمام ظاہری و باطنی امور میں کسی کو پیشوائی نصیب ہو تو وہ خلافت حقہ کا مستحق ہے یہ خلافت صرف پانچ حضرات میں منحصر ہے اور اہل سنت کا یہ خیال محض ہوائی نہیں ارشادات قرآنی پر مبنی ہے کہ اس میں ان پیشواؤں کو جو بظاہر اقتدار نہیں رکھتے تھے، ائمہ کہا ہے مثلاً - وَجَعَلْنَا هُمْ أُمَّةً يَهْدُونَ بِهَا مَرِئًا - ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہمارے احکام کی تبلیغ کرتے تھے، اور ہر شخص کو یہ دعا سکھائی وَجَعَلْنَا الشَّاقِينَ أَمَمًا مَلَا اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا، اور خلافت میں ہر جگہ زمین کی قید لگائی۔ مثلاً فَمَا يَسْتَفِئُهُمْ فِي الْأَمْثَلِ - يَا - فَجَعَلْنَاهُمْ خُلَفَاءَ مَا آذَنُوا يَا مَعْزُورَ الَّذِي جَعَلْنَاهُ خَلَفًا لِّكَ الْأَمْرِ اِسِي طَرَحِ کی اور آیاتہ!

اور اس کی وجہ کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کیوں کی جب کہ اہل حق

آپ کی ذات عالی صفات استحقاق امامت میں مخصوص و ممتاز تھی، اور فریقِ ثانی کی بے استحقاقی واضح اور روشن تھی، یہ ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ واقف تھے، اور جانتے تھے، کہ خلافت کا زمانہ ختم ہوا کھٹکے بادشاہوں کا وقت آپہنچا اور ظلم و شگرے کا دور دورہ شروع ہوا اگر میں بھی ریاست کا مدعی بنا رہا اور تقدیر میں چونکہ ہے نہیں تو ریاست انتظام پذیر نہ ہوگی اور فتنہ و فساد، غضب و عناد درویشوں کے اور امامت کے جو مصالح ملحوظ منظور ہونے چاہئیں، وہ یکسر فوت ہو جائیں گے، لہذا مجبوراً ریاست و سیادت سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور امور ریاست حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیئے جو اس وقت ریاست کی اہلیت رکھتے تھے اور یہ صلح و تسلیم کسی خامی، کمزوری یا ذلت کی وجہ سے نہیں تھی اس لئے کہ امام کے ہمراہ جانثاروں اور جانبازوں کی ایسی مستند فوج موجود تھی جو یکدلی اور یکتہی سے امام کی مدد کے لئے تیار تھی اور تعداد کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہ تھی لیکن چونکہ مدت امامت جو پورے تیس سال تھی ختم ہو چکی آپ نے اس کو ترک ہی فرمادیا۔

اس سلسلہ میں امامیہ کے صاحبِ فصول نے جو یہ لکھا ہے کہ رؤسا و لشکر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساز باز کر لی تھی اور بنابِ امام کو اس کا علم یقینی ہو چکا تھا، کہ وہ اپنے اس فاسد ارادے پر تلے ہوئے ہیں، کہ آپ کو گرفتار کر کے ان کے سپرد کر دیں،

یہ محض اقرار ہے، اس لئے کہ امامیہ ہی نے اپنی کتابوں میں حضرت امام کا خطبہ نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا
 اِنَّمَا فَعَلْتُ هَٰذَا فَعَلْتُ شَفَاعًا عَلَيَّكُمْ دِیْنِ نے جو کچھ کیا وہ تم پر ترس کھا کر کیا، اور ایک دوسرے خطبہ میں جس کو شریف مرتضیٰ اور صاحبِ الفصول سرور نے نقل کیا ہے یوں ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے اس وقت جب کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا پختہ ارادہ کر چکے تھے فرمایا۔ اِنَّ مَعَادِيْةَ قَدْ نَاسَنَ عَنِّي حَقًا لِّیْ دُوْنَكَ فَظَنَرْتُ الصَّلَاحَ لِمَلَّةٍ وَ قَطَعُ الْفِتْنَةَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بَالِغَ مَعْنُوْنِیْ عَلٰی اَنْ تَسْأَلُوْا مِنْ سَآلَیْیَ وَ تَتَّعِبُوْا مِنْ حَآئِنَیْ بِمَآئِنِ حَآئِنِ اِنْ خَشِنَ دِمَآءُ الْمُسْلِمِیْنَ خَلِیْءٌ مِنْ سَفْکِیْہَا وَ کَلِّ اُسْ ذِیْ الْاَلٰکِ اِلَاصْلَاحُ حُکْمُ الْاَبْنَةِ مَعَ اَبِیْہِ نے میرے ساتھ اس حق میں جھگڑا کیا جس کا حقدار میں تھا، وہ نہیں فتنہ مگر میں نے فتنے کی بیج کنی اور است کی بھلائی کو پیش نظر رکھا اور تم نے مجھ سے اس بات پر بیعت کر لی تھی کہ جس نے مجھ سے صلح کی تم بھی اس سے صلح کرو گے اور جو مجھ سے لڑائی لڑے گا تم بھی اس کو لڑو گے اور میں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت ان کی غمخیزی سے اچھی ہے تو اگر کیا اس سے تمہاری صرف ریاست ملک و تصرف کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دینے اور ان سے دست بردار ہونے کا سبب کمزوری و بے بسی نہ تھا، بلکہ آپ نے اس مصلحت کی بنا پر صلح فرمائی جس کی رعایت آپ ہی کے شایانِ شان تھی اور خطبہ ثانی سے صاف طور پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریقِ ثانی، حضرت معاویہ اور آپ کے ساتھی بھی مسلمان تھے، کیونکہ کفار و مرتدین سے فتنہ و فساد کے خوف سے بھی صلح جائز نہیں بلکہ ان سے نہ لڑنا اور اور ان کے غلبہ کو نہ روکنا ہی عین فتنہ ہے، جیسا کہ ارشادِ ربی ہے، وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنُوْا فِتْنَةً وَ یُکُوْنُ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ (ان سے اتنا لڑو کہ فتنہ نا ہو جو جائے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے)

اور علمائے امامیہ میں سے صاحبِ الفصول نے ابی مخنف سے جو روایت کی ہے اور جو صفحاتِ سابق میں گزری چکی ہے جس میں حضرت حیدر رضی اللہ عنہ نے اپنے برادرِ اکبر پر اس صلح کے سلسلہ میں اظہارِ ناراضگی فرمایا تھا بلکہ یہ تک

اہل سنت اپنے اس دعویٰ کی دلیل بھی قرآن و سنت سے لاتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَاللَّسُوْمِيْنُ وَالْمُؤْمِنَاتُ** اپنی لغزش سے اگر کبھی ہو جائے اور مومن مرد و عورت کے گناہوں سے اللہ کی

بخشش طلب کرو کتاب اللہ کی یہ آیت صاف دلالت کرتی ہے کہ شارع اللہ تعالیٰ کی غرض اہل ایمان کے حق میں استغناء ہے لعن نہیں اس لئے کہ قاعدہ اصولیہ کے مطابق جس کو امامیہ بھی مانتے ہیں، ایک چیز کے لئے حکم دینا اس کے خلاف سے انکار کا مراد ہے، لہذا استغفار کا حکم اس کے مخالف دامن اس کے انکار کا متقاضی ہے؛

اور پھر گناہ کبیرہ کا مرتکب شیعہ دینی ہرود کے نزدیک ایمان سے ملحق نہیں دھو بیٹھا وہ مومن رہتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَرَأٰی کَآئِفَتَیْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَتَشْكُرُوْنَ اَمْ یُکْفِرُوْنَ اَبْلَیْہُمْ**۔ اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں میں صلح کرادو، لہذا لعن سے ممانعت ثابت ہو گئی، ہاں اہل کبار متصف بالوصف پر خود کتاب اللہ میں لعنت آئی ہے، **اَذْکُنْتُمْ اللّٰہَ عَلٰی الظَّالِمِیْنَ**۔ خبردار درو کہ ظالم پر اللہ کی لعنت ہے **فَنَجْعَلُ لَعْنَتُہٗ اَشَدَّ** **عَلٰی الْکَاذِبِیْنَ** آپس ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں، مگر یہ لعنت دراصل صفت پر سے موصوف پر نہیں اور بالآخر ان کو مان لیں کہ لعنت موصوف پر ہی ہے تو یہاں ایمان تو ماننے لعنت ہو رہا ہے اور صفت کذب و ظلم کا وجود لعنت کو جائز قرار دے رہا ہے تو اس سلسلہ میں امامیہ شیعوں کے اصول میں یہ طے شدہ امر ہے کہ جب ایک صفت کسی حکم کو چاہے اور وہ ماننے حکم کے ساتھ جمع ہو تو حکم رک جاتا۔ یہ لہذا یہاں بھی صرف صفت کے پائے جانے پر لعنت کا حکم ثابت نہ ہو گا تا وقتیکہ اس کا ماننے ایمان نہ لگ جائے جس طرح کافر کے حق میں جب اس کی موت یقینی کفر پر ہوئی ہو اس میں اچھے صفات پائے جائے نہ کہے، لہذا مختلف ادراک کے لئے جائز نہیں ہو گا۔

اور ایک دلیل، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہم سب کے **وَالَّذِیْنَ یُنَادُوْنَ اٰیٰتِہٖمْ یَقُوْلُوْنَ مَا تَبٰنَا اَخِیْرًا وَلَا شَرٰہَا اَلَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاٰیٰتِہٖمْ وَلَا یَجْعَلْ فِیْہِمْ فَرْقًا بَلْ اَعْلٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تَبٰنَا اِنَّکَ تَرٰوْنَا ہٗم** و جبرائیل کے بعد آئے وہ میرا کہتے، کیا اسے اس کا بھی مغفرت ہو اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے اور ہمارے دلیلیں اہل ایمان کی عداوت نہ پیدا کرنا اسے ہمارے رب بے شک تو مہربان اور رحم والا ہے، اس آیت مبارکہ میں مغفرت کی طلب اور بغض و عداوت پیدا نہ کرنے کی بنا پر محض ایمان پر راسخ گئی ہے اس میں عمل کی کوئی قید نہ کر نہیں لہذا یہ دونوں معاملات برتنا، یعنی ترک بغض و عداوت اور لعنت سے احتراز جو طلب مغفرت کا لازمی حصہ ہے، ہر مومن کے ساتھ ضروری ہوتے۔

جب تیرا اور تلاش کی جائے تو اس مسنون کی اور بھی بہت سی آیات قرآن مجید میں ملیں گی۔

اور بحوالہ غزوات اس سے استدلال یوں ہے کہ کتب امامیہ سے بطریق تو اتنی بات ثابت ہے، کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اہل شام پر لعنت کرنے سے روکا اور منع فرمایا ہے،

اہل سنت تو بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منع کی اثرنا باتوں کے از کتاب کی حرأت نہیں کر سکتے یہ تو شیعہ ہی ہیں جو ادھر ادھر بات کو لکھا پھیر کر یا جھوٹی سچی تاویلات کا سہارا لے کر خلافِ درذی کی صورت پیدا کرنے میں ماہر ہیں، چنانچہ یہاں بھی جناب امیر اس مخالفت کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اہل شام پر آپ نے لعنت سے اس لئے منع نہیں فرمایا تھا کہ وہ لعنت کے مستحق نہ تھے، بلکہ مخالفت اپنے درستی کو تہذیب اخلاق اور حسن کلام کا سبق سکھانے کے لئے آپ نے ایسا فرمایا تھا، چنانچہ روایت کے الفاظ اس کی گواہی دے رہے ہیں، **اِنَّکُمْ اَنْ تَنْکُرُوْا سِبَا کَیْنِ** میں تمہارے لئے پسند نہیں کرتا کہ تم گالی دینے والے بنو۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ امام نے جو چیز ہمارے لئے ناپسنک کیا ہم اس کو پسند کر سکتے ہیں، اور پسند ہی نہ کریں بلکہ اس کو وجہ قرب و عبادت بھی سمجھیں ہمارا کام تو امام کے احکام کی بجا آوری ہے جس بات کو آپ نے مکروہ و برا سمجھا ہم بھی اسے مکروہ ہی سمجھیں اور سبب و علت کا سلسلہ امام پر چھوڑ دیں، خواہ مخواہ کے قیاسی گھوڑے بوڑا کر خسرانِ آخرت کا خطرہ کیوں مول لیں اس کے علاوہ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شیعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس دوسری روایت سے آنکھیں کیوں چراتے ہیں، جس میں لعنت کی ممانعت اسلامی و ایمانی اخوت و شرکت کی بنا پر کی گئی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ **أَتَيْنَا كَثَا سَمِعَ كُنْ أَهْلَ الشَّامِ مِنْ أَصْحَابِهِمْ خَطْبٌ وَقَالَ أَصْحَابُنَا لَنَا إِيَّاكُمْ فِي الْإِسْلَامِ عَلَى مَا دَخَلَ فِيهِ مِنَ التَّرْلِيلِ وَالْغُرْحَارِ وَالشَّهَادَةِ وَالْأَوْبِيلِ** جب آپ نے اپنے ساتھیوں کو اہل شام پر لعنت کرتے سنا تو آپ نے ان سے خطاب فرمایا کہ ہماری اپنے سلمان بھائیوں سے لڑائی اس لئے ہے کہ بعض اسلامی امور میں بے راہ روی، کجی شبہات اور تاویلات داخل ہو گئی ہیں،

امیر کے کتابوں میں دونوں روایات موجود ہیں، یہ بھی اور اس سے پہلے والی بھی پہلی روایت اگر لعنت سے ممانعت کا یہ سبب بتاتی ہے کہ زبانِ درازی اور خلافِ ادب گفتگو کے عادی نہ بنیں تو ہم اس روایت کو اس بات پر محمول کرتے ہیں کہ یہ روایت ان لوگوں کے حق میں ہے جو لعن باوصف کرتے ہیں اور جو شرعاً جائز ہے،

اب یہ بات ایسے اشخاص کے لئے تو ناجائز یہ ہوتی ہے جو شریعت کو پہنچانے والے ہیں، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کہ ان اوصاف کی برائی لوگوں کے سامنے لائے اور ان کے ذہن نشین کرنے کی خاطر متصفین صفات مذمومہ پر لیں فرمایں مگر انبیاء کرام کے علاوہ جو دوسرے ہیں، اور اس منصب پر فائز نہیں ہیں وہ بڑے بے لگام ہوتے ہیں ان کے لئے اب ایسا کرنا جائز نہیں، ورنہ لعن و لعن کی عادی زبانیں اور جہانِ جو طبات ان لوگوں پر بھی لعن کرنے لگیں گے جو اس کے مستحق نہ ہوں گے اور لعن اللہ السارق لعن اللہ النشار لعن اللہ الخمر۔ وغیرہ وغیرہ ان کا اور دین جائے گا اور بات بے بات کلی کو چوں میں یہ لعنتی نعرے گونجتے رہیں گے،

اور دوسری روایت میں ان لوگوں کو منع کیا گیا ہے جو اسلام و ایمان کا لحاظ کئے بغیر اہل شام کی تعین و تخصیص

کر کے خصوصیت سے لعنت کرنے لگے۔

اسی طرح جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دونوں روایات پر عمل کی صورت نکل آئی اور کلامِ عزت بھی کلامِ اللہ کے موافق ہو گیا بجز لفظ کتاب اللہ و عزت رسول اللہ کے فہم اور تطابق میں اہل سنت کا یہی طریقہ و طریقہ اور وہ یہ ہے، اب یہاں بعض دانشمندان شیعہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بھی لعنت اسی کافر پر جائز ہے جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ کفر ہو کر ہے اور ہمارے اصول کا بھی یہ تقاضا نہیں کہ باغیوں پر جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں، لعنت کرنی لیکن یہ ایسے ہی لوگوں سے متعلق ہے جو جناب امیر کے ساتھ نہ لڑیں کیونکہ ان سے لڑنے والے کافر ہیں اور ایسا اسی حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں جو شیعہ اور سنی دونوں میں متفق علیہ ہے اور دونوں کے نزدیک صحیح بھی کہ جناب رسول اللہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا **خَرَجْتَ خَرَجْتَ** (خیرے ساتھ لڑنا میرے ساتھ لڑنا ہے)

اسی لئے خوامہ نصیر طوسی نے تجرید میں جناب امیر کے بعض مخالفوں اور ان سے لڑنے والوں میں فرق کرتے

یہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بھی خدا اور رسول و دونوں ہی کے ساتھ رہنے والے تھے، لہذا اس سے یہ معلوم ہو گیا سخت کبیرہ گناہ کے ارتکاب کی صورت میں اللہ و رسول سے لڑائی تو لازم آتی ہے مگر ایمان باقی رہتا ہے یہ بحث یہاں چونکہ ضائع ہو گئی، اس لئے اس پر اکتفا کر کے اصل مسئلہ کی طرف لڑتے ہیں،

اس فرقہ کو یہ اشتباہ پیش آنے کا راز یہ ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آنے والے مروانی و عباسی اپنے آپ کو خلیفہ ہدایت دہاتے تھے اور خود بھی کہتے تھے۔ اور یہ صرف ان کاموں میں ظاہری مشابہت کی وجہ سے تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھتے تھے،

مثلاً جہاد کا سرانجام کرنا، شہروں کی فتح، فوجوں اور لشکروں کی تیاری، غنائم اور صدقات کی تقسیم اور کفار کی دست و برد سے دلالہ اسلام کی حفاظت۔ اور علماء اہل سنت بھی کاموں کی اسی ظاہری مشابہت کی وجہ سے ان کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں،

اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ہر فرقہ و طائفہ کے القاب یا نام خود ان کی اپنی معنی و اصطلاح کے مطابق ہوتے ہیں دوسروں کو ان میں الجھنے کی کیا ضرورت! چنانچہ آج کل جو شخص کہلا جا کر ملائیم اور انھوں باقر سے کتاب شرائع پڑھ کر آتا ہے تو اس فرقہ کے نزدیک وہ مجتہد کہلاتا ہے اسی طرح ان کے زمانے میں خلیفہ کا لفظ کافی معروف اور کثیر الاستعمال تھا اس لئے اس کو امام کا مرادف سمجھ کر اختیار کر لیا، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اہل سنت ان حضرات کو خلیفہ اربعہ کی طرح برحق جانتے ہیں، ایسا سمجھنے والوں کی غلط فہمی ہے محققین اہل سنت تو اس معاملہ میں زیادہ محتاط تھے وہ ان حضرات کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، چنانچہ مرثیہ صبیح الخیلا کتبہ بنی امیہ ثلثون سنة خلافت کا زمانہ میرے بعد تیس سال ہے، اسکے ایک راوی سعید بن جبشہ سے امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ مروانیوں کو بھی تو خلیفہ کہتے ہیں، تو اس نے کہا جزا الزور یعنی جو امیہ کا خیال غلط ہے وہ تو بلا شاہ ہیں بادشاہ بھی شرمیہ!

اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے جبکہ شمار اہل سنت کے چوٹی کے محدثین میں ہوتا ہے۔ حضرت عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے بطریق حسن روایت کی ہے،

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
إِنَّ أَوَّلَ دِينِكُمْ بَدَأَ نَبِيَّةٌ وَرَحْمَةً ثُمَّ يَكُونُ
خِلَافَةٌ وَرَحْمَةً ثُمَّ يَكُونُ مِلْكٌ وَجَبَرِيَّةٌ

بادشاہت و جبریت دیکھ گے گا،

خلاصہ کلام یہ کہ اہل سنت کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ خلافت حقہ بلا شبہ تیس برس تک جاری رہی اور ہاجی الاولیٰ سلمہ کو امام حسن رضی اللہ عنہ کی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح پر غم ہو گیا،

اور ان کے نزدیک خلفاء کی وہی ترتیب حق صبیح و درست ہے جو عملاً پیش آئی اس میں کسی تقدم و تاخر کا کوئی سوال نہیں، گو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں، اہل سنت کے پاس اپنے اس قول کی کتاب و دعوت کے بہت سے دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ کتاب از الہ الخفا عن خلافة الخلفاء میں کتاب سنت

اجماع است، اور ان احوالِ عزت سے ہزاروں دلائل اس پر ایہ اور اس انوارِ مظلوم سے بیان کئے گئے ہیں جو دانشمندان روزگار کے لئے سرمایہ مسرت و ذریعہ طمانینت ہیں اور اس کتاب کے مصنف کو جو پرانی دہلی میں سکونت پذیر تھے آیت الہی اور معجزہ نبوی ہی کہا جاسکتا ہے۔ کاتبِ حروف بھی بارہان کی زیارت سے شرفیاب ہوا اور ان کی رنگیں بیانی سے دامن میں گل چینی کی اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا عطا فرمائے! آمین۔

مذکورہ بالا دعویٰ کی دلیل میں اب چند قرآنی آیات اور احادیث شریفہ پیش کی جاتی ہیں تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ فرقہ جو تعقلین سمجھا جاتا ہے اصل الاصول بنائے ہوئے اور شیعیت کی بنیاد اس پر رکھے ہوئے ہے کسی طرح تعقلین کی مخالفت کرتا ہے، اللہ ہی ہے مدد و توفیق کی امید ہے اور اسی سے یہ سیدھے راتانگہ سینچنے کی انتہی ۱۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيُخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ وَتُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ
لَهُمْ وَكَيِّدَنَّ لَهُمْ تَأْمِيْنًا مِّنْهُمَا يُنْفِخُ
لَا يُشْرِكُونَ بِإِغْيَاثِهِمْ وَتَرْكِهِمْ فَلْيَزَكِّهِمْ
وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ فَاِذْ رَأٰى اَسَافُ وَهُوَ اَمْرٌ اَخْبَرُ
 انبيا و بنی اسرائیل کے بارے میں بھی خلافت کے وعدہ کے علاوہ یہ وعدہ بھی فرمایا کہ اس کے ام و بن کو جو اللہ تعالیٰ
 کو پسندیدہ و مرغوب ہے زمین میں تمکن اور جاہ و عطا فرمائے گا یعنی اسے روان شہرت بخشے گا نیز وعدہ فرمایا کہ انہیں
 جو غور و اس وقت ماحق و درپیش ہے ان کو تمکن امن و سکون سے بدل دے گا،

یہ وہ مرا عبد ہیں جو آیت بالائیں اللہ تعالیٰ نے فرمائے اور اس کی شان کو یخفی المبعاد ہے اس لئے ان کا وقوع پذیر ہونا ضروری ہے، ورنہ وعدہ خلائی لازم آئیگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارے وعدے پورے فرمائے اور ان امور کا وقوع پذیر ہونا ضروری ہے، ورنہ وعدہ خلائی لازم آئے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارے وعدے پورے فرمائے اور ان امور کے وقوع پذیر ہونے کا زمانہ نفلائے ثلاثہ رمضان اللہ علیہم کے عہد مبارک کے ادا کر دیا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ امام مہدی سورہ نور کے نزول کے وقت موجود ہی نہ تھے اور جناب امیر مکی اللہ عنہ کو موجود تھے، لیکن شیعوں کے گمان کے مطابق اللہ کا پسندیدہ و مرغوب دین اس وقت رائج نہ ہو سکا جس کی بارگاہ میں شریف سر لکھی نے تمغہ یہ الانبیاء والائمة میں تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ جناب امیر اور ان کے شیعوں نے اپنے دین کو ہمیشہ پردہ اخفاء میں رکھا، اور مخالفین کے دین کے زیر سایہ اپنی زندگی گزاری ان کو مکمل امن اور پوری بخشنی بھی نصیب نہ ہو سکی کیونکہ اکثر لشہروں اور درواز ملکوں مثلاً شام مصر و مغرب میں آپ کی راست تسلیم نہ ہو سکی چہ جائے کہ آپ کے احکام قبول کئے جاتے آپ کے لشکر اور احکام ہمیشہ شامی افواج سے خائف و ہراساں رہے پھر جناب امیر اسی جماعت کے جس سے دندہ خلافت ہوا ایک فرد ہیں اور ایک شخص پہ جماعت کا لفظ بولنا اصول شیعہ کے خلاف ہے کہ از کم تین افراد تو ہوں کہ ان پر جمع کا اطلاق صحیح ہو،

اب رہے وہ ائمہ جرنیاب امیرین کے بعد پیدا ہوئے وہ اس سلسلہ میں قابل ذکر ہی نہیں کہ بوقت وعدہ نہ خود موجود تھے۔ نہ ان کا زمین پر تسلط ہوا۔ اور نہ ان کا پسندیدہ دین بقول شیعوں کے رائج ہی ہوا اور نہ ان کو زندگی بھر امن و سکون ہی نصیب ہوا بلکہ وہ ہمیشہ خوف زدہ اور روپوش ہی رہے، ان سب امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خلافت فی الارض کا وعدہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے تھا، اور وہ دین جو ان حضرات کے زمانہ میں رائج اور شائع ہوا وہی خدا کا پسندیدہ اور مغرب دین تھا، یہی خلافت حق ہے جو امامت کے مراد ہے،

اور علامہ عبداللہ شہیدی نے بہت باختر پاؤں مار کر اور بڑی چھان بین کے بعد اظہار الحق نامی کتاب میں کہا ہے کہ احتمال ہے کہ خلیفہ سے بمعنی لغوی مراد ہو، یعنی استخفاف سے مطلب صرف ایک شخص کو دوسرے کے بعد لانا ہو جیسا کہ بنی اسرائیل کے حق میں آیا ہے، یعنی تَبَيَّنَ أَنَّ يَهُيَّاكَ عَدُوًّا وَكَذَّبَ، وَلَيَسْتَحْلِلُكُمْ فِي الْأَرْضِ اقْرَبَ سَكَنَ تَبَارَكَ رَبُّكُمْ تَبَارَكَ وَثَمَنَ كَوْبَلَاكُ كَرَسَ اور تگز زمین میں خلیفہ بنا دے،

اور یہ خاص معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کی پیدا کردہ اصطلاح ہو، اور اس اصطلاح نے اہل سیر، محدثین، اور مورخین کے اقوال میں سید عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے بعد اور مسلمانوں میں اسم امامت کے وجود میں آنے کے بعد مذکورہ مکتوبہ معنوں میں مشہور ہوا،

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ کب کہا ہے کہ استخفاف بمعنی لغوی کلام میں مستعمل نہیں لیکن یہ تو خود شیعوں کا اپنا اصولی قاعدہ ہے کہ الفاظ قرآنی کو حتی الامکان شرعی اصطلاحی معانی پر محمول کیا جائے لغوی معنوں پر محمول کیا جائے ورنہ تمام شریعت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور دینی احکام میں سے کسی کا ثبوت نہ مل سکے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں جہاں کہیں ایمان کا لفظ آئے وہاں اس کے لغوی معنی تصدیقی مراد لیں یا مسلوٰۃ سے دماغ سے تصدیقی طرح دوسرے احکام تو کوئی بھی شرعی حکم ثابت نہ ہو گا اس لئے نازع اور ایمان سے شرعی اصطلاحی معنی ہی مراد لئے جائیں گے،

اب رہی یہ بحث کہ خلیفہ کے یہ معنی شرعی اصطلاح ہیں یا بعد کے نکالے ہوئے، تو اس بارے میں ہم خود شیعوں ہی کو پوچھ جانتے اور کہتے ہیں کہ وہ چاہیں تو اس حدیث سے تمک کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صحت ثابت کر دیں وہ حدیث یہ ہے، اَنْتَ بَعِثْتُكَ لِيَهْدِيَكَ هَادُونَ مِنْ مَوْنِي تَوْبِيْرِي لِيَايَا جِيْجِي مَوْنِي كِي لِيَا رَوْنَاوَرِ اس حدیث کے ساتھ قرآن کی یہ آیت لگانا نہ بھولیں کہ اَخْلَفْنِي فِيْ قَوْمِيْ تَوْبِيْرِي خَلِيْفِيْ (ہو جا)

یا چاہیں تو اس حدیث سے ایسا کر دکھائیں یا عَيْنَ اَنْتَ خَلِيْفَتِيْ مِنْ كَلْبِيْ - اسے علی تو میرے بعد میرا خلیفہ ہے اس کو شمش ناکام کے بعد وہ خود ہی کہ اٹھیکے کہ حقیقت و صداقت کیا ہے اور یہی نہیں پھر ان کو لفظ امام سے امامت کے اصطلاحی معنی ثابت کرنا بھی بہت دشوار ہو جائے گا، کیونکہ قرآن مجید میں بمعنی مستعمل نہیں،

اور خدا اپنی پناہ میں رکھے کہ اگر نواسب قرآن کی دو چار آیات بطور شہادت تلاوت کر کے لفظ امام کے خراب معنی مراد لیں تو ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا مثلاً وہ آیت پڑھ دیں، فَقَالُوا لِمَ اَنْتَ اَكْبَرُ سِرْدَارِ اَنْ كَفَرَسِي لِرُو (یا وَجَلْنَا هُوَ اَلَيْسَ لَكَ عُوْنٌ اِلَّا لَنَا) ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ بلا تھے ہیں ووزخ کی طرف، اور جرح شخص بھی قرآن مجید میں غور و فکر سے کام لے کر اس کا مطالعہ کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن

مجید میں غزوہ نکر سے کام لے کر اس کا مطالعہ کر لیا، تو اسے معلوم ہو جانے لگا، کہ قرآن مجید میں لفظ امام بمعنی رئیس عام میں مستعمل نہیں ہے بلکہ بمعنی نبی، راشد یا ہادی کے استعمال ہوا ہے، بخلاف لفظ خلیفہ کے کہ وہ ہر جگہ لفظی الارض کے ساتھ متصل ہے، جو تصرف عام پر دلالت کرتا ہے،

اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی صحت خلاف پر ہم صرف لفظ استخفاف سے دلیل نہیں لائے کہ اس میں بحث کی گنجائش ہو بلکہ ہمارا نکتہ استدلال تو استخفاف کی وہ نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، لہذا جب استخفاف لغوی معنی کے ساتھ حق جل مجدہ کی طرف منسوب ہوگا تو وہ لامحالہ استخفاف شرعی ہی ہوگا،

اور ہم اس سلسلہ میں علمائے شیعہ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں، کہ وہ یہ بتائیں کہ نبی اسرائیل کو آل فرعون کے بجائے صاحب تخت و تاج بنانا اور آل فرعون و عاقلہ کے بجائے زمین معوشام میں تصرف عام ان کے ہاتھ میں دیدینا حق تھا، یا باطل و نا صواب، اب ان کی مرئی ہے کہ جواب میں وہ کونسی شق اختیار کرتے ہیں، ہمارا مقصد ہر حال میں حاصل ہوتا،

اور اگر ملا جی کا دلی غرض کرنے کو ہم ان سب سے قطع نظر کر لیں تب بھی ان کا مدعا و مقصد حاصل نہیں ہوگا بلکہ شکاف اور گہرا اور زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ کیونکہ استخفاف لغوی تو تمام امت کو شامل ہے جو بھی ایمان و عمل صالح رکھتا ہو گا وہ اس میں داخل اور اس کا مصداق ہوگا۔ اور خلفائے ثلاثہ طو جی کے نزدیک بھی ایمان و عمل صالح کے حامل تھے تو وہ بھی اس استخفاف لغوی میں داخل ہوئے،

پھر دوسرے ذرا زیادہ باریک بین اور دقیقہ بین شیعہ نے بھی اس آیت کے مفید مطلب منہ متعین کرنے میں بہت زور لگایا ہے، اور ان کی اس سعی و جد کا حاصل چند ترجیحات کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اول یہ کہ آیت میں من بیان کے لئے ہے بتعین کے لئے نہیں ہے، اور استخفاف کے معنی کسی زمین کو وطن بنانے کے ہیں۔

اسپر ہم کہتے ہیں کہ جب من منمیر یہ داخل ہو تو اس کو یہاں یہ کہنا اہل عرب کے استعمال کے خلاف ہے اور یہ مان بھی لیں تو پھر حیل و استلحاظ کی قید لغو اور بیکار ثابت ہوتی ہے کیونکہ زمین میں وطنیت جس طرح نیک عمل والے کو حاصل ہے اسی طرح برے اعمال والے کو بھی ہے، بلکہ اس کو تو بڑا اچھے اور خوب تر نوعیت کی وطنیت حاصل ہے اور یہی نہیں اس صورت میں تو ایمان کی قید بھی بیکار ہوگی کیونکہ وطنیت تو کفار کو بھی حاصل ہے، اور لغو و بیکار کلام کی قرآن مجید میں موجودگی محال و باطل ہے،

دوسرے یہ کہ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، اور جمع کا صیغہ بطور تعظیم ہے یا آپ اور آپ کی اولاد یعنی ائمہ مراد ہیں۔

اس پر ہم کہیں گے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی دین کی برقراری و ثبات اور خوف سے امن نصیب نہ ہوا تو وعدہ خلاف لازم آئی اور واللہ لا یخلف الیعدا!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں خلیفہ بنانا، دین پسندیرہ الہی کو رواج دینا خوف کا زائل ہونا اور ریا و شرک سے پاک عبادت کا رواج پانا، ان سب باتوں کا مومنین صالحین کی جماعت کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ

ہے، اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ اس امت کی پوری زندگی میں یہ امور معروض وجود میں نہیں آئے، لہذا مجبوراً ایسے زمانے اور ایسے چند اشخاص کی تعیین لازم ہے کہ جن میں یہ سب باتیں بیک زمانہ و وقت موجود ہوں اور یہ مذکورہ بالا اجتماعات اس جگہ سیکارہ و لغو بات ثابت ہوتے ہیں، پس اہل سنت نے اس آیت کے صحیح مصداق کی تعیین میں جو اللہ تعالیٰ کے سپہ اور یکے وعدہ پر مشتمل ہے، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام کی طرف رجوع کیا جو بیچ الہامہ میں مذکور ہے، ہذا الہامہ ان کے نزدیک بلا شک و شبہ اصح الکتب اور متواتر شمار ہوتی ہے تو اس میں مذکور آپ کے بابرکت کلام نے اس اختلاف و نزاع کی جڑ ہی کاٹ دی آپ کا فیصلہ ہے کہ یہ جماعت خلفائے ثلاثہ اور ان کے معاونین و مددگاروں کی ہے، اور آپ نے خود کو بھی انہیں مددگاروں میں شمار فرمایا ہے،

چسپت پاران طریقہ بعد از تدبیر

ایسا نہ حضرت کو چاہیے کہ آپ کے اس کلام صدق نظام کو دل کے کانوں سے سنیں، اور اپنی عقل خام کو پس پشت پھینکیں۔ کہ اب اس معاملہ میں لیت و دلت کی آپ نے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی،

ہججہ البلاغہ میں یوں ذکر ہے کہ جب اہل فارس کی جمع شدہ افواج کے مقابلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بنفس نفیس شریک ہونے کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو آپ نے اس کے جواب میں یوں فرمایا:

إِنَّ هَذَا أَمْرٌ لَمْ يَكُنْ تَقْصُرُ عَنْهُ وَلَا خَصْلَةٌ لَهُ بِكُثْرَةِ وَلَا
يَقَلَّتِهِ وَهُوَ دِينُ اللَّهِ الَّذِي أَظْهَرَ وَجْهَهُ الَّذِي
أَعَدَّ الْأَيْدِيَ حَتَّى بَلَغَ مَا بَلَغَ وَطَلَعَ حَيْثُ طَلَعَ وَخَبَّرَ
عَلَى مُرْفُوعٍ مِنَ اللَّهِ حَيْثُ قَالَ عَنَّا سَمِعَهُ وَعَدَّ اللَّهُ
الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ الْحَامَانَ وَاللَّهُ مُنْجِرُ وَعَدُّهُ
وَنَاصِرُ جُنْدِهِ وَمَكَانُ الْقَهْرِ مِنَ الْإِسْلَامِ
مَكَانُ النِّظَامِ مِنَ الْخُرُوجِ فَإِنَّ انْقِطَاعَ النِّظَامِ
تَفَرَّقَ وَتَهَيَّأَتْ مُتَفَرِّقٌ لَمْ يَجْتَمِعْ وَالْعَرَبُ الْيَوْمَ
وَأَنْ كَانُوا قَلِيلًا فَهُمْ كَثِيرُونَ بِإِلَاسِدَامِ عَزِيزُونَ
بِالْجَبْتِ عَمَّ فَنَنْ قُطْبًا وَاسْتَدْبَرَ الرَّحَى بِالْعَرَبِ
وَأَصْلُهُمْ دُونُكَ كَمَا أَنَّهُ الْحَرْبُ فَإِنَّكَ إِنْ كُنْتَ
مِنْ هَذِهِ الْأَرْضِ تَقْصَصْتَ عَلَيْكَ الْعَرَبُ مِنْ
أَطْرَافِهَا وَأَطْرَافِهَا حَتَّى يَكُونَنَّ مَا تَأْتِيهِمْ وَأَنْ
مِنَ الْعُدُوَاتِ أَهْمُ إِلَيْكَ لِتَأْتِيَنَّ يَدُكَ وَكَانَ
قَدْ رَأَى الْأَمَامُ أَنَّ تَنْظُرُوا إِلَيْكَ غَدًا يَقُولُوا
هَذَا أَضَلُّ الْعَرَبِ فَإِذَا قَدْ لَعَنُوا لَسْتَ رَحِمَهُ

بے شک یہ وہ دین ہے جس کی نصرت وہ نصرتِ کثرت و قلت پر مبنی نہیں اور یہ دین اللہ کا وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرمایا اور وہ فوج ہے جس کو اللہ نے عزت دی اور اس کی مدد فرمائی یہاں تک کہ وہ اس وجہ تک پہنچا جہاں اسے پہنچنا تھا اور اتنا بلند و ظاہر ہوا جتنا اس کو بلند و ظاہر ہونا تھا، اور ہم اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر ہیں جو اس نے فرمایا تھا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی، وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ أَنْ يَخْرُجَهُمْ مِنْكُمْ ااور اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرتے والا ہے اور اپنی فوج کا مددگار اور اسلامی رئیس کا مرکز قیام گاہ، موتی کی لڑی کی طرح ہے کہ اگر ٹوٹ جائے تو سارے موتی بکھر جائیں، اور بہت سی بکھری ہوئی چیزیں اکٹھی نہیں ہوا کرتیں، اور آج عرب گوا فرادی اعدائے کم ہیں، مگر اسلام کی قوت سے بہت ہیں اور اتفاق و اتحاد کے سبب قوت غالب! پس تم تو قطب بنے مرکز پر جے رہو اور ارد گرد عرب کی چمکی چلنے دو اور انہی کو لڑائی کی آگ سے نکلنے دو

يَكُونُ ذَالِكَ أَشَدَّ بِكُمْ عَلَيْنَا وَطَعْنَهُمْ فِيهِ
فَأَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ مُسَيِّرِ الْقَدَمِ إِلَى قِبَالِ السُّلَيْمِيَّةِ
فَإِنَّ اللَّهَ سُبْحَانَهُ هُوَ أَكْبَرُ مَا يَسِيرُ مِنْكَ وَهُوَ
أَفْهَمُ عَلَى تَعْيِيدِ مَا يَكْرَهُهُ وَأَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ
عَبْدٍ دَعَاكَ فَانْكَرْتُمْ لِقَائِهِ فِيمَا مَضَى بِالْكَتُوبَةِ
فَإِنَّمَا كُنَّا نَقَارُكَ بِالنَّصْرِ وَالْعَزَّةِ أَنْتَ هِيَ بِلَفْظِهِ
یہی ہے اس پر قابو پا کر مشاڈ الہی کے تو آرام سے بیٹھو گے اس لئے تمہارا مرکز سے بٹھان کی دوسری اور سب بات
کا تمہارے متعلق لاجبی سوت کا سب ہوگا،

خود کو اس میں نہ ڈالو اگر تم مرکز چھوڑ کر اس زمین سے نکل
کھڑے ہوئے تو اس کے اطراف و جواب سے عرب مرکز
دتم پر، ٹوٹ پڑیں گے، یہاں تک سرحدی خطرات جو تم
اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ گے اتنے زیادہ اہم ہوں گے جو تمہاری
سامنے کی مہم کے خطرہ سے بھی زیادہ ہوں گے اور کل جب
عرب تم کو مرکز سے ہٹا دیں گے تو کہیں گے کہ "خلاصہ عرب"
یہی ہے اس پر قابو پا کر مشاڈ الہی کے تو آرام سے بیٹھو گے اس لئے تمہارا مرکز سے بٹھان کی دوسری اور سب بات

اور یہ جو تم نے کہا ہے کہ قوم عجم مسلمانوں سے لڑنے نکل پڑی ہے تو ان کا نکلنا تم سے زیادہ اللہ کو ناکارہ ہوا
ہے ناپسندیدہ چیز بدل دینے پر زیادہ قادر ہے اور تم نے جو کثرت تعداد کا ذکر کیا ہے تو ماضی میں ہم کثرت کی بنا
پر کبھی نہیں لڑے تم تو اللہ کی مدد و نصرت کے بھروسے اور اعتماد پر لڑا کرتے تھے
یہ عبارت سراسر ہدایت ہے اس سے تمام شبہات کا حل اور پوری تسکین و دلچسپی حاصل ہوتی ہے اور اللہ کے
دعوت کی سچائی ظہور پذیر ہوتی،

اسی سلسلہ بالکل ایک دوسری آیت یہ ہے، جو خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہ کی صحت و خلافت پر دال ہے مگر شیعہ
جس کی مخالفت کرتے ہیں،

قُلْ لِلْمُتَكَلِّفِينَ مِنَ الْفِرَاقِ سِتْرٌ مَعُودٌ إِلَى قَوْمِ أُولَى
بِأَسْوَاقٍ شَدِيدَةٍ تَعْلُوهُمْ أَوْ يُسَلِّمُونَ فَإِنْ تَطِيعُوا
يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ
قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا
تم نے اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ تم کو بہت اچھا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تم نے اس دعوت سے، پہلوں کی طرح روگردانی
کی تو پھر تم کو بڑا دردناک عذاب دیا جائے گا

یہ آیت بعض عرب قبائل مثلاً اسلم، جہنیہ، مزینہ، غفار، اور اشجع کے بارے میں ہے، جو سفر حدیبیہ میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے،

اور دونوں فرقوں کے مورخین اس پر متفق ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد
مبارک میں سوائے غزوہ تبوک کے کوئی ایسی جنگ پیش نہیں آئی جس میں تمام عرب کو دعوت قتالی دی جانی اور غزوہ
تبوک تو بہر حال یہاں مراد ہے ہی نہیں اس لئے کہ اس لڑائی کے لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ یا تو اپنے دشمنوں سے لڑو گے
یا وہ اسلام لے آئیں گے اور غزوہ تبوک میں ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی وقوع پذیر نہیں ہوئی نہ قتال
ہوا نہ مخالفتیں اسلام لائے، لہذا وہ کوئی اور ہی لڑائی ہے اس لئے اس کو کسی اور زمانہ میں تلاش کرنا چاہیے
اور وہ زمانہ لا محالہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی خلیفہ کا ہی ہوگا چنانچہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

کے عہد میں عرب کو قتال مرتبین کے لئے دعوت دی گئی اور اہل فارس و روم سے لڑنے کے لئے دعوت خلیفہ اول و خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دی گئی،

بہر حال خلیفہ اول کی خلافت قابل تسلیم قرار پائی اس لئے کہ ان کی دعوت کی اطاعت پر اچھے اجر کا وعدہ کیا گیا اور عدم اطاعت پر عذاب الیم کی دھمکی دی گئی۔ اور جو واجب اطاعت ہو وہی امام و خلیفہ ہے۔
اس آیت کے متعلق شیخ ابن مطہر علی نے بڑی تنگ و در کے بعد ایک جواب گھڑا ہے کہ داعی آحضرت صلوات اللہ علیہ وسلم ہیں، اور ممکن ہے کہ آپ نے دوسری لڑائیوں میں جن میں قتال نہ ہوا ہو دعوت دی ہو، لیکن وہ نقل و بیان میں نہ آئی ہو،

اس جواب کا لغوی ہونا بالکل سامنے کی بات ہے کہ اخبار و سیر اور تواریخ میں محض احتمالات سے تنکے ملتے ہیں عقلمندوں کا شیوہ نہیں، ورنہ تو ہر بات میں اختال نکالا جاسکتا ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے ضررِ عم کے بعد آحضرت صلوات اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت منسوخ و موقوف کر کے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کا حکم فرمایا ہو، اور لوگوں کو اس پر اہمیت کی ساتھ تاکید کی ہو، اس طرح کے اور بھی مسامحات ہو سکتے ہیں،

اور بعض شیعہ کہتے ہیں کہ داعی حضرت امیر ہیں، کہ جنہوں نے عہدِ شکستوں، بدکاروں اور مرتزقین کے قتال کے لئے دعوت دی،

یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کے جواب میں بہت غرور و خرمی کی ضرورت پڑے، جواب صاف ظاہر ہے کہ نہ جواب امیر رضی اللہ عنہ کا قتال طلب اسلام کے لئے نہ تھا بلکہ وہ محض انتظامِ امامت کے لئے تھا، اور عرفِ قدیم و جدید میں یہ کہیں منقول نہیں کہ امام کی اطاعت اسلام ہے، اور اس کی مخالفت کفر ہے،

اور اس کے علاوہ خود شیعوں نے صحیح روایات سے نقل کیا ہے کہ حضور صلوات اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا۔ اِنَّكَ يَا عَلِيُّ تَقَاتِلُ عَلٰى تَاْوِيْلِ الْقُرْاٰنِ كَمَا قَاتَلْتَ عَلٰى تَنْزِيْلِهِ (اے علی تم تاویلِ قرآن پر لڑو گے جس طرح میں اس کے نزول پر لڑا) اور ظاہر ہے کہ مخالفین سے تاویلِ قرآن پر لڑنا قبولِ تنزیلِ قرآن پر لڑنے سے بعد میں ہوا۔ اور قبولِ تنزیلِ قرآن اسلام کے بغیر متصور نہیں بلکہ وہ عین اسلام ہے گویا تاویلِ قرآن پر مقاتلہ اور اسلام پر مقاتلہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ بالکل ظاہر بات ہے،

اسی سلسلہ کی ایک اور روایت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، يَا جِبْرِالُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ يَدَيْكَ مَنْكُذٌ مِّنْ دِيْنِكَ فَسَوْفَ يٰۤاِيُّ اللّٰهُ يَبْعَثُ مُّجْتَبِئًا مِّنْهُمْ لِيُخْبِرُوْهُ اَخْلَبَ عَلٰى الْمُؤْمِنِيْنَ اَهْلًا عَلٰى الْكَافِرِيْنَ يَجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ كُوْمًا رَّكَهَ ذٰلِكَ فَعَلَّ اللّٰهُ يَوْمَئِذٍ مِّنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ مَخْذُوْلُ الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

”اے ایمان والو تم میں جو کوئی دین سے پھر جائے گا تو سیدہ بی اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کو اللہ تعالیٰ بھی پسند کرتا ہو گا اور وہ بھی اللہ سے محبت کرتے ہوں گے، جو مسلمانوں سے دینے والے ہوں گے اور کافروں کو دہانے والے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں گے طاعت کرنے والوں کی طاعت سے نہیں ڈریں گے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے،“

اس آیت میں ان لوگوں کی تعریف ہے جنہوں نے مرتدین سے قتال کیا، ایسے بلند اوصاف سے کی جے بن سے بالاتر اوصاف اصطلاح قرآن میں نہیں۔

پہلا وصف، ان کے درجہ قرب اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ، کہ وہی اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے بھی وہ محبوب ہوں گے، گویا وہ محبوب الہی بھی ہوں گے اور محب الہی بھی،
دوسرا وصف۔ مومنین کے ساتھ ان کا معاملہ۔

تیسرا وصف۔ کفار کے ساتھ ان کا رویہ اور طرز عمل،

چوتھا وصف۔ منافقین اور ضعیف الایمان سے ان کا برتاؤ،

اور ظاہر ہے کہ امام کا معاملہ یا خدا کے ساتھ ہونا ہے یا خلق کے ساتھ۔ اور خلق، مومن ہوگی یا کافر یا منافق

اور ضعیف الایمان اور جب امام چاروں معاملوں میں خدا کا پسند فرمودہ ہو اور اس کا عمل بھی راست و درست ہو

تو وہی امام برحق ہے اسی لئے اخیر آیت میں اپنے فضل و رحمت کی نوید ذکر فرمائی،

اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ مرتدین کی جنگ خلیفہ اول اور آپ کے پیروکاروں سے ہوئی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے آخر میں تین گروہ مرتد ہوئے،

(۱) اسود غسی ذوالنخار کی قوم، بنی مدعی جنہ یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور فیروز دلمی کے ہاتھوں

مارا گیا،

(۲) مسیلہ کذاب کے ساتھی بنو حنیفہ۔ مسیلہ خلیفہ اول کے عہد میں وحشی کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔

(۳) طلحہ بن خویلد متنبی کی قوم بنو اسد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس

کی سرکوبی کو بھیجا وہ ان کے ڈر سے شام بھاگ گیا۔ آخر میں ایمان لے آیا۔
اور خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں سات گروہ مرتد ہوئے،

(۱) عیینہ بن حصن کی قوم بنو فزارہ،

(۲) فروہ ابن سلمہ کی قوم عطفان،

(۳) ابن عید یا بیل کی قوم بنو سلیم،

(۴) مالک بن نویرہ کی قوم بنو بکر بن

(۵) شجاع بنت المنذر کی قوم بنو نمیم (یہ مسیلہ کذاب کی زویہ تھی اور متنبی)

(۶) اشعث بن قیس کنذی کی قوم بنو کنذہ

(۷) بنو بکر یہ بحرین میں رہتے تھے!

مرتدین کے ان تمام فرقوں کو خلیفہ اول نے بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور سب کو اسلام میں واپس لائے

مؤرخین کا ان واقعات پر اجماع ہے:

خلیفہ دوم کے عہد میں ایک گروہ مرتد ہو کر نصاریٰ سے جا ملا،

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرتدین کے ساتھ لڑنیکا کا اتفاق ہی نہیں ہوا اس سلسلہ میں خود آپ فرماتے

ہیں، اُبْلَیْتُ بِعَالِ آھِلِ الْقُبَّةِ میں تو اہل قبہ کے ساتھ لڑائی میں مبتلا ہو گئی، آپ کا یہ فرمان امامیہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے،

اور اگر امامیہ منکرین امامت کو جنہیں جناب امیر اہل قبہ فرما رہے ہیں، مرتدین میں شمار کریں تو ہم کہیں گے کہ عرف قدیم و جدید میں اصل دین سے انکار کرنے والے کو مرتد کہتے ہیں، اگر غلط تاویل سے کسی اسلامی عقیدہ کا منکر ہو جائے تو ایسے شخص کو مرتد کہنا عرف عام میں رائج نہیں اور قرآن کے معانی کو بالاجماع لغوی عرف پر محمول کرنا چاہیے ہر قوم کے الگ الگ اصطلاحی معنوں پر نہیں۔

اور پھر من دینکہ کے لفظ کی واضح دلالت یہی بتاتی ہے کہ اصل دین اور پورے دین سے جو منکر ہو وہ مرتد ہے کسی ایک مسئلہ سے انکار پر نہیں،

اور غلیفہ اول کے جہد میں مانعین زکوٰۃ کو جو مرتد کہا گیا تو اس لئے کہ وہ زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر تھے اور جو ضروریات دین میں سے کسی ضرورت کا انکار کرے وہ گویا اصل بنیاد دین کا منکر ہے اور امامت کو خود شیعہ بھی ضروریات دین میں سے نہیں مانتے جس کے انکار کی وجہ سے کوئی مرتد کہلا سکے یا کافر ہو جائے اس سلسلہ میں فاضل کاشی کا کلام بحوالہ روایات کافی وغیرہ باب دوم میں مذکور ہو چکا۔

اور ملا عبد اللہ مصنف اظہار الحق کی ایک تحریر جو سوال و جواب کی شکل میں اس موقع کے بہت مناسب ہے ملاحظہ فرمائیے وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں امامیہ کے پاس کوئی صریح نص نہیں ہے تو امامیہ جھوٹے پڑتے ہیں، اور اگر نص صریح ہے تو پھر جن صحابہ نے مسئلہ خلافت میں مخالفت کی وہ مرتد ہو گئے،

اس کے جواب میں وہ رقمطراز ہے کہ نص صریح کے انکار سے کفر اس وقت لازم آتا ہے جب ممنوع شدہ امر کے متعلق باطل ہونے کا اعتقاد رکھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نص کے بارے میں (معاذ اللہ) تکذیب کرے،

لیکن اگر نص کو، حق اور درست تسلیم کرے، مگر دنیوی اغراض، یا حب مال و جاہ کے سبب اس کو ترک کرے اس پر عمل نہ کرے تو یہ فسق و عصیان تو ہو گا مگر کفر نہ ہو گا،

مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی پر قرآن و حدیث میں حکم صریح موجود ہے اور یہ بالاجماع امت فرض ہے اب اگر کوئی اس کی فرضیت کا انکار کر دے تو کافر ہو گا، لیکن اگر فرضیت کا اعتقاد رکھتے ہوئے مال کی محبت، طبعی بخل، یا کسی ایسی ہی وجہ سے ادائیگی نہ کرے اور اپنے ذمہ اسے باقی رکھے تو یہ گنہگار ہو گا۔ اور وہ لوگ جو غلیفہ اول کی مخالفت پر متفق ہوئے یہ نہیں کہتے کہ اس پر پیغمبر نے نص فرمائی ہے لیکن یہ جھوٹ ہے۔ بلکہ بعض اوقات بعض اثناس نے نص کے تحقیق سے انکار کیا ہے مگر دراز کار تاویلات سے کام لے کر لا کا کلام ختم ہوا۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں جس کا حوالہ آجھی چکا ہے، جو امامیہ کے نزدیک بطریق صحیح مروی ہے فرمایا ہے، اَصْحَبْنَا لِقَائِلِ الْاَخَوَانِ اِنَّا اِلَى الْاِسْلَامِ عَلٰی مَا دَخَلَ فِيْهِ مِنَ التَّوْبَةِ وَالْاِغْرَابِ وَالْاِثْمِ وَالْاِثْمِ وَالْاِثْمِ وَالْاِثْمِ۔ ہم اپنے اسلامی بھائیوں سے اس لئے لڑ بیٹھے کہ اسلام میں کبھی بے راہ روی اور شبہات

وتا دیلات کا عمل و عمل ہونے لگا تھا)

پھر یہ بات بھی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے سے بڑے والوں کو سب دشمن کرنے سے منع فرمایا جیسا کہ رضی نے بیچ البلاغہ میں بیان کیا ہے۔ حالانکہ مرتدین پر دشنام منع نہیں ہے۔

اور اگر ان سب باتوں کے علی الرغم یہ مان بھی لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مرتدین سے اپنے عہد میں جہاد کیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر اور خلیفہ اول کے اول عہد میں جو افراد یا قبیلے مرتد ہو گئے تھے ان سے بھی تو کسی نے قتال کیا ہوگا، تو وہ جنگ کرنے والا بھی اس تعریف و توصیف میں شریک ہو اور دعائیات ہو گیا۔

اور یہ اصول قاعدہ طے شدہ ہے کہ جب حرف من شرط جزا میں واقع ہوتا ہے، تو اس سے عام معنی مراد ہوتے ہیں، مَنْ دَخَلَ حِصْنًا كَذَبَ كَذِبًا جو کوئی اس قلعہ میں داخل ہو اس کے لئے یہ ہے میں دیکھا جاسکتا ہے،

لہذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو کوئی مرتد ہوگا اس کے لئے مذکورہ اوصاف سے متصف ایک قوم پیدا ہوگی،

خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب سلسلہ ارتداد بہت تیزی سے بڑھا، اس وقت ان اوصاف کی کسی قوم کا وجود تسلیم نہ کریں تو اس سے دو غریباں لازم آئیں ایک تو یہ کہ مرتدین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا۔ اور دوسرے یہ کہ اس صورت حال سے وعدہ الہی کے خلاف بات ثابت ہوجاتی (مگر چونکہ اوصاف قرآنی کی حاصل قوم موجود تھی انہوں نے مرتدوں کا قلع قمع کر ڈالا اور مابقی کو اسلام میں لوٹا لائے) اس قوم کی تعیین میں سوال اٹھے کہ وہ کون تھی۔ جس نے صدر اول میں مرتدین سے قتال کیا و تہریر بات تو بلا شک و شبہ کہی جاسکتی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے تو ان کا مقابلہ نہیں کیا وہ اس وقت اس پوزیشن ہی میں نہیں تھے، اس لئے لافالہ یہ کارنامہ خلیفہ اول اور آپ کے پیروکاروں کے چاروں چار سب کو ماننا ہی پڑے گا،

اس وقت ایک تو جناب امیر رضی اللہ عنہ مدافعت کی پوزیشن میں نہیں تھے، دوسرے ان کے دوست ساتھی اور لشکر بھی ان صفات سے متصف نہ تھے، کیونکہ ان کے متعلق جو شکایت جناب امیر رضی اللہ عنہ کو تھی اس کی ایک جھلک آپ گزشتہ اور ان میں بحوالہ بیچ البلاغہ ملاحظہ فرما چکے ہیں اور کوئی حرج نہیں کہ اس موقع پر بھی بات کو بخیرتہ مرکز نیکی خاطر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دیگر فرمودات جو بیچ البلاغہ میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں پیش کر دیئے جائیں، یہ تو ایسی باتیں ہیں کہ ان کی تکرار سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ کیونکہ شک کو جتنی مرتبہ بھی سنو گھوڑوہ خوشبو ہی دے گی،

بیچ البلاغہ میں ہے کہ جناب امیر نے اپنے ساتھیوں، دوستوں کی شکایت کرتے ہوئے کہ وہ ان کی دعوت قبول نہیں کرتے اور ان کے وعظ و نصیحت پر کان نہیں دھرتے وہ عبارات ذیل سے تفصیلاً بیان کی ہے،

أَمَّا الَّذِينَ نَفْسِي بَيِّدَ وَيَلْطَمُونَ هُوَذَا الْقَوْمُ هَلِكُكُمْ
خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان سے سن لو کہ یہ قوم (مخالف) نمبر ضرور غالب آکر رہے گی اس لئے

مستشار رہ کر بھرے ہوئے ہوتے ہیں امام کی حق بات بھی نہیں
مانتے اور نافرمانی کرتے ہوئے، مگر وہ ناحق باتیں بھی
اپنے امام کی تابعداری کرتے ہیں وہ اپنے سردار کے
نیک خواہ ہیں اور تم خیانت کا برتاؤ کرتے ہو وہ شہر میں
میں امن پھیلاتے ہیں اور تم فساد اگر میں تم سے کسی
کے پاس کوئی پیارا امانت رکھوں تو مجھے ڈر ہے وہ اس
کا کندہ اسی نہ لے جائے، اے میرے اللہ میں ان سے
بھر رہا یا یہ مجھ سے آگے گئے ہیں ان سے سیر ہو گیا تو مجھے
ان سے بہت سویرا کار عطا فرما۔ اور ان کو مجھ سے بدتر
امیر، اے اللہ تو ان کو اس طرح گھلا جس طرح نمک پانی
میں گھلتا ہے، خدا کی قسم میں یہ تمنا کرتا ہوں کہ تمہارے بدلے میرے پاس بنی فراس بن غنم کے صرف ایک ہزار سوار
ہوتے کہ تو ان کو لہائے تو کف اچھالتی موحلوں کی طرح فوراً حاضر ہو جائیں۔

اور ایک دوسرے خطبہ میں جس کا کچھ حصہ پہلے باب سوم میں گذر چکا ہوں فرماتے ہیں،
اَيُّمُ اللّٰهُ لَا طَلْقَ بِكُمْ تَوْحَمَشِ التَّوْحَمِ وَلَا تَنْتَحِبُ التَّوْحَمُ قَدْ اَلْفَرَجْتُمْ عَنْ اِبْنِ اَبِي جَالِبٍ اَلْفَرَجِ
الْوَرَأْسِ اِذَا كَلِمَتُمْ تَمَّارَ بَارِئِ مِيَا خِيَالِ يَرْسُ كَمَا مِيْدَانِ كَارِزَارِ مِيَا مَوْتِ كِي كَرَمِ بَا زَارِ شَرْعِ هُوَ جَا لِي
تو تم ابن ابی طالب سے اس طرح الگ ہو جاؤ گے جس طرح سر سے بال،

پھر ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں۔ اَحْمَدُ اللّٰهُ عَلَى مَا قَضَىٰ وَوَقَدَّ مِّنْ فَعَلٍ رَّغِبٍ اَبْتَدَىٰ بِكُمْ اَيُّمًا
الْفَقِيَةِ اَلَّتِي اِذَا اَمَرْتُ لَكُمْ تَطْعَمُ وَاِذَا هَوَمْتُ لَكُمْ تَجِبُ تَقَالِ بَعْدَ كَلَامِ رَوَانِي بَعْجَتُكُمْ مِلْتُ و
بِكُمْ غَيْرُ كَثِيْرٍ اِنَّهُ تَعَالَىٰ نَعِيْصِلُهُ فَرَا يَا اُوْرَجُ كَامِ اِسْنِ مَقْدَرِ فَرَا يَا مِيَا اِسْنِ پَرِ اِسْنِ كِي حَمْدُ وَاَكْرَمُ اُوْر
اور اس پر بھی کہ اس نے مجھ کو تمہارے ساتھ مبتلا کیا، اے لوگو جب میں تم کو حکم دیتا ہوں تو تم اس کو نہیں مانتے
اھب بلاتا ہوں تو آتے نہیں، پھر اور باتیں فرما کر فرمایا بے شک میں تم سے بیزار ہوں اور تمہارے ہوتے ہوئے بھی
اپنے آپ کو تنہا سمجھتا ہوں۔

اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ حضرت معاویہ کے لشکر نے شہر نابار کو تھیس تھیس کر دیا ہے تو خود
نہیں نفیس مکان سے نکل کر موضع خلیلہ تک جا پہنچے جو شہر کوفہ سے باہر تھا آپ کے پیچھے کچھ دوست بھی دوڑے
آئے اور کہنے لگے آپ کے بدلے ہم کافی ہیں تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم تم نواچی جانوں کو ہی نہیں سنبھال سکتے
دوسرے کے لئے تم کیا کافی ہو گے، کوئی رعایا اگر اپنے حاکم سے شکایتیں اپنی رعایا سے نالائی ہوں گویا میں
تو ان کا تابع ہوں اور وہ میرے امیر، اور میں تو متعین شدہ ہوں اور وہ میرے تعین کرنے والے۔ تب آپ
کے دوستوں کے گروہ میں سے دو افراد آگے بڑھے اور عرض کیا اے امیر المومنین میں اپنے اور اپنے بھائی کی جانوں
کا قمار و ذمہ دار ہوں آپ حکم دیجئے ہم سب چشم اس کی تعمیل کریں گے آپ نے فرمایا میرے مقصد کے لئے تم دونوں

کیا کام آؤ گے!

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قسم کے بیانات و خطابات بہت ہیں، جو سب کے سب نبی البلاغہ کے حاشیہ پر درج ہیں یہ کئی بیانیوں کے ہاں بڑی معتبر اور واضح الکتیب اور متواتر شمار ہوتی ہے اس کے مندرجات سے کسی شیعہ کو انکار کی مجال نہیں،

اس بیان صادق سے صاف صاف عیاں ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مرتدین سے لڑنے والوں کے جوا و صاف بیان کئے ہیں، حضرت امیر کے لشکریوں میں ان کا موجود ہونا تو در کی بات ہے ان کو تو اس کی ہوا بھی معلوم ہوتا ہے نہیں لگی تھی، وہ خائف تھے، اور چہرہ بھی جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ اور پھر وہ فساد پیشہ بھی تھے جن کے لئے ارشاد باری ہے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُنْكَرِیْنَ۔ انہوں نے اول الامر کی اطاعت بھی نہیں کی جو خدا کا محبوب، کرنے کا ذریعہ ہے، قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ رَاىَ اللّٰهَ سے درستی کا ادعا ہے تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنا دوست بنائے گا، اس طرح وہ یحییٰ بن زکریا کے وقت نہ آسکے نہ اس کا مصداق بن سکے اور جناب امیر کی اطاعت کے بدلے، جناب امیر پر ازراہ تکبر و سرکشی حکم چلاتے تھے، آپ کو ایذا اور صدمات پہنچاتے اس طرح تو وہ دمرتین کے بجائے مومنین بلکہ امیر المومنین پر غلبہ کرنے والے ہوئے، اور چونکہ باغیوں اور خارجوں سے خوفزدہ اور ڈرتے تھے تو اِذْ لَیْسَ عَلَیْکَ فِیْہِیْ ذَکَا فِرُوْنَ سے دہنے والے ہوئے اور جہاد سے جان چرانے کے باعث یحییٰ بن زکریا کے بعد اللہ سے دور جا پڑے اور بجائے لَا یُحِبُّ الْقُوَّةَ لَوْ مِمَّا لَا یُحِبُّ کے لَا یُسْتَعُوْنُ نَصِیْحَتِہٖ شَاکِرِہِ دناصح کی نسبت نہیں سنتے تھے کی عبارت ان کے حال کی زیادہ تر جمالی کرتی ہے کیونکہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی نسبت پر کان ہی نہ دھرتے تھے،

الفرمن وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں بیان فرمائے ہیں، ان کا جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں پر چسپاں ہونا ناممکن اور محال ہے، کیونکہ دو ضدین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں، پھر آیت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی جدوجہد سے ارتداد کا فتنہ ختم ہو جائے گا اور دین اصلاح پذیر ہو جائے گا اس لئے کہ سلسلہ کلام مومنین کی تسلی اور تقریت کے لئے ہے اور ان کے دلوں سے مرتدین کا خوف نکالنا ہے۔

اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کہ لڑائیوں تو اصلاح کا سبب بنیں اور نہ ان کو غلبہ حاصل ہو سکا۔ اور باغیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا، اور فساد نے دین میں جڑ پکڑ لی،

پس ثابت ہو گیا کہ کتاب اللہ کی مذکورہ بالا تینوں آیات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت و امامت کی واضح گواہ ہیں، اور ان سے اندر وہ قیود و اقتیارات رکھتی ہیں کہ بجاظ اصولی عقیدہ کسی غیر کا احتمال نہیں چھوڑتی اور اگر عقلی قواعد سے ہٹ کر کٹھنوی شیعہ عالم انجان بنتے ہوئے کوئی دوزخ گزار احتمال ذکر کرے تو وہ احتمال اس لئے لائق جواب اور قابل توجہ نہیں کہ ہمارا ردئے سخن اور خطاب اہل عقل و دانش سے ہے، وہم پرست اور اور انجانوں کی طرف نہیں،

اب جس کسی کو ان تمام استدہات کی تفصیل درکار ہو، اور اس بحث کی تکمیل مدنظر، اور دوسری آیات سے

جواسی نبی میں وارد ہیں، استدلالت کر کے بحث کا تمام اطراف و جوانب سے احاطہ کرنا چاہتا ہو، تو اسے کتاب الخلفاء الخلفاء خلافت الخلفاء کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ اس میں یہ موضوع مد اتمام و تکمیل تک پہنچا ہوا ہے اور کتاب اللہ کے ظاہر و باطن معنی کو دانشگاہ کیا گیا ہے، اس کے مصنف تمام امت کی طرف سے قابلِ داد ہیں،

اور چوتھے یہاں اصل مقصد یہ ہے کہ ہر اصولی اور فروعی مسئلہ میں شیعوں نے جو مخالفت کی ہے اس کی تردید ثقلین "کتاب اللہ و عزت رسول اللہ" سے واضح و آشکارا کی جائے اور اس کے ثبوت کے لئے کتاب اللہ کی ایک آیت ہو یا صدہا آیات، باعتبار شہادت و گواہی یکساں اور برابر ہیں اس لئے طوالت کلام اور درازی بیان سے بچتے ہوئے جو بیان ہو چکا اسی پر اکتفا کی جاتی ہے اور اس سلسلہ میں بطریق اہل سنت عزت کے اقوال بے حد و شمار منقول ہیں، ان کی تفصیل بھی ازالتہ الخلفاء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے البتہ ہم نے اس کتاب میں چونکہ یہ اہتمام کیا ہے اور پابندی برتی ہے کہ کسی بھی معاملہ میں سوائے شیعوں کی روایات کے کوئی دلیل نہیں پیش کرتے اس لئے یہاں بھی انہیں کی روایات اور صحیح کتب کے حوالہ سے عزت رسول کے وہ اقوال نقل کرتے ہیں جن کو انہوں نے معتبر سمجھ کر درج کیا ہے،

ان میں سے ایک روایت یہ ہے جس کو رضی بحوالہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ شیخ البلاغہ میں بیان کرتا ہے کہ آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ بَيْعِي لِرَسُولِكَ وَأَنْتَ بِالْإِشْرَافِ فَإِنَّكَ بَا
لِعَفْوِ الْقَوْمِ الَّذِينَ بَايَعُوا أَبَا بَكْرٍ وَعُمَيْرَ وَعُثْمَانَ
عَلَى مَا بَايَعُوهُمْ عَلَيْهِ فَلَمْ يَكُنْ لِلشَّاهِدِ أَنْ
يُخْفَا أَنْ يُولَى الْخَائِبَ أَنْ يَتَوَدَّ أَنْ أَمَّا الشُّوْهُاءُ هَاجِرُونَ
وَأُولُ الْبُصَايَا كَوَانِ اجْتُمَعُوا عَلَى مَا حَبْلِي وَسَمَوُهُ رَمَامَا
كَانَ لِلَّهِ رَحْمَتِي فَإِنْ خَرَجَ مِنْهُمْ خَافَ بِحَبْلِي أَوْ
بِذَعَةِ سَمَوُهُ إِلَى مَا خَرَجَ مِنْهُ أَلَيْ قَاتِلُهُ
فَلْيُإِتْبَاعِهِمْ عَلَى سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ وَوَلَاكَ اللَّهُ
مَا تَوَلَّى وَمَنْ دَلَّ جَهَنَّمَ دَسَاتُ مَصْنُوعًا -

ہو کر اسے امام تسلیم کیوں تر وہ اللہ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہو گا، پس اگر کسی طعن یا بدعت کے سبب کوئی اختلاف کرنے والا اس سے

ہو اسے اگر نہ آئے تو اس سے جنگ کر دیکر جو اس نے مؤمنین کے خلاف راستہ اختیار کر لیا ہے اللہ اسے وہاں پہنچائے جہاں سے وہ لوٹا ہے اور داخل کرے اسے جہنم میں اور وہاں کسی کا وہ بہت برا ٹھکانا ہے

اب قابلِ غور و توجہ یہ بات ہے کہ ایسی پاک صاف اور واضح تحریر کہ جو امام معصوم کے علم سے نکلی علماء امامیہ اس کی کھینچ ناک میں لگ پڑے وہ کہتے ہیں کہ یہ تحریر ایک الزامی دلیل ہے جس کو اصطلاحاً جہالتِ خصم کہتے ہیں اور یہ دلیل ان مقدمات سے مرکب ہوئی ہے جن کو (عظم) افریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہو چاہے،

استدلال کرنے والا ان مقدمات کو تسلیم نہ کرتا ہو۔

اب خدا اس دور انداز کا رد ادا دلی، بلکہ تحریف اور بلکہ تکذیب پر نظر غور و فکر ڈال لینی چاہیے،
اولیٰ تو ”معصوم“ کے کلام کو خلافت واقعہ سے پر محمول کرنا جو خلافت عقل ہے،

پھر کلام کے مالہ وہ علیہ کو نظر انداز کرنا بھی ہے کہ اگر جناب امیر کو صرف الزام دینا ہی مقصود ہوتا تو وہ
بیعت کی حد تک کافی تھا اس سے آگے کی عبارت فاذا اجتمعوا الخ کو الزام سے کوئی تعلق نہیں، اور امام معصوم ہے
فائدہ تھوٹ اپنی زبان پر لانا کیسے گوارہ کر سکتا ہے، پھر وہ جھوٹ بھی خدا پر بالفاظ کان اللہ منی، اور وہ بھی تاکید
و تکرار کے ساتھ، العیاذ باللہ!

اور اگر ان باتوں سے قطع نظر بھی کر لیں تو الزامی دلیل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مقدمات کو فرقی مخالف
بھی تسلیم کرے ورنہ تو الزامی دلیل نہیں رہے گی، اور یہاں جناب معاذیہ رضی اللہ عنہ نے یہ مقدمات کب اور کس موقعہ
پر تسلیم کئے تھے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو ان پر الزام رکھنے کے لئے ان مقدمات کے ترتیب دینے اور تسلیم کرنے
کی ضرورت محسوس ہوئی،

بہر حال جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خط کے جواب میں جناب معاذیہ رضی اللہ عنہ کے خط کے جواب میں جناب
معاذیہ رضی اللہ عنہ نے جو لکھا، اور جو امام امیر اور زید یہ کی کتابوں میں درج ہے، اس سے ان کا جو مذہب اور مسلک
بابت خلافت و امامت معلوم ہوتا گوہ یہ ہے کہ۔

ہر قریشی مسلمان، خواہ مہاجرین اولین میں سے ہو یا بعد والوں میں سے جو وہ اگر احکام نافذ کرنے پر
قاد، کفار سے جہاد، ریاست کے انتظام و انصرام، تیار ہی لشکر حلقہ اسلام کی دیکھ بھال سرحدوں کی حفاظت اور
فسادات کو فرو کرنے پر متکفل و قادر ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس سے بیعت کر لے خواہ وہ عراقی ہوں خواہ شامی
یا اہل مدینہ تو وہ شخص امام ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہو،

اسی نظریہ کے تحت وہ اپنی امامت کا دعویٰ کرتے تھے وہ اس بات کے مدعی نہیں تھے کہ ان کو مہاجر و انصار
میں سے کسی نے جہا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے،

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع سے گریز اور ان کی امامت سے انکار کا سبب حضرت عثمان غنی رضی اللہ
عنہ کی شہادت اور ان کے تابعین کی حمایت کے الزامات ہیں، جو ان کے نزدیک فساد فی الارض کے مترادف تھے،
اصلاح احوال کے نہیں،

اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فسادات کے رفع و دفع کرنے، حدود اسلام کی حفاظت کرنے اور حکم تعاص کے
نافذ کرنے پر، جو بلند مرتبہ قدر شرمی احکام ہیں، اتنا نہیں سمجھتے تھے اور مہاجرین و انصار کی بیعت بھی ان کے علم
میں تھی اگر وہ اس کو فہم برآمد وقت دیتے تو اپنی جاس اور غلطیوں میں ان کی بے ایمانیوں کو آشکارا کرتے بلکہ وہ
تو اس کے ساتھ یہ بھی کہتے تھے، کہ مہاجرین و انصار نے بیعت کر کے غلطی کی ہے،

یہی ان کا مذہب معصوم اور مسلک مشہور ہے، اسی بنا پر وہ اپنے زمانہ امارت میں بار بار انصار کی شکایت
کرتے رہے، اور طعن و تہلیل بھی ان کے مقابلہ میں مہاجرین و انصار کی بیعت کا ذکر کرنا دلیل تحقیقی ہے جو مقدمات

خفیرہ وائیدہ سے مرکب ہوتی ہے، چاہے وہ مفادات فریق ثانی کو تسلیم ہوں یا نہ ہوں، لہذا علماء امامیہ کی یہ تاویل صحیح نہیں کہ یہ الزامی دلیل ہے،

مجموعہ اقوال حضرت کے ایک قول یہ ہے، جس کو رمیٰ ہی نے اپنی کتاب بیج البلاغہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، مگر طبعی مقتضی، اور اپنے مذہب کے پاس کی خاطر بس اتنی سی تحریف کروئی ہے کہ جناب امیرؑ نے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام لیا تھا مگر اس نے وہاں فلاں بنا دیا، تاکہ اہل سنت اس سے استدلال نہ کر لیں، مگر اس کو بھول گیا کہ بعض اوقات اشارہ کنایہ تصریح سے بھی زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور وہی بات یہاں بھی ہے کہ جناب امیر کے اس بیان میں جو اوصاف بیان ہوئے وہ بذات خود اسی شخصیت کی طرف پکار پکار کر اشارہ کر رہے ہیں جس کو رمیٰ نے فلاں کے پردہ میں روپوش کرنا چاہا تھا۔ ملاحظہ فرمائے،

آپؑ نے فرمایا ابو بکر فلاں قابل تعریف ہیں کہ کبھی کو سیدھا کیا اور راہوں کو ہموار سنت قائم کی بدعت کو مٹا دیا، وہ پاکدامن تھے کم غیب والے خلافت کی مصلحت حاصل کر لی اور سوائے اس کے بڑھ گئے اللہ کی اطاعت کی، اور کما حقہ پیر گاری برقی خود تو میل بسے مگر دوسروں کو دور رہے پر چھوڑ گئے نہ گمراہ کو راستہ ملتا ہے، نہ راہ یاب کو یقین۔

اب بیج البلاغہ کے شارحین امامیہ اس بات میں مختلف رائے ہیں کہ فلاں سے مراد کون سے، بعض نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ اور بعض نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مگر اکثریت قول اول کی موید ہے اور یہی صحیح و ظاہر ہے،

اس عبارت سر پا ہدایت و بشارت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دس بڑے اوصاف سے متصف فرمایا ہے اور اس کو قسم کھا کر پختہ اور موکد کیا ہے،

(۱) سنت کو قائم کرنا (۲) بدعت سے بچنا (۳) حسن تدبیر سے فتنوں کا قلع قمع۔ (۴) دنیا سے پاکدامن بنانا (۵) عیوب کی کمی۔ (۶) امامت و خلافت کا فخر حاصل، عدل۔ اور عروج دین الہی کا ان کے ذریعہ انجام پانا (۷) طاعت الہی جو بالانا۔ (۸) آخر عمر تک تقویٰ و پنداری پر کار بند رہنا۔

اور اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جس نوعیت کی امامت و خلافت مشہادت جناب امیر وقوع پذیر ہوئی اگر اس کو معراج خلافت و امامت کہیں تو بیجا نہیں۔

اور یہ مقام ہے جہاں شیعہ حضرات کے مانتے پاؤں چھل جاتے ہیں، اور ساری چوکر دیاں بھول جاتے ہیں، گھبراہٹ اور بکھلاہٹ میں ایسی برکیک اور نازیا تاویلات کا سہارا لے کر خفت و در کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا نہ ذکر کرنا ہی، بھلا ہے ہاں جن توجیہات میں کچھ معجزانہ فہم و شعور کی کوئی رمیٰ ہو ان میں سے چند اپنے ناظرین کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ بھی اس فرقہ کے دانشمندوں کی قوت فکر و فہم کا اندازہ

لگالیں۔

ایک توجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کبھی کبھی حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی تعریف اور خوبیاں محض اس لئے بیان کر دیا کرتے تھے کہ لوگوں کی دلجوئی ہو جائے اور رعایا میں سے جو طبقہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت حسنہ پر دلدادگی کی حد تک فریفتہ تھا، اور اس بات کا معتقد تھا کہ امور دین کے انتظام میں ان حضرات کا عہد مبارک زریں دور تھا ان کو اپنی طرف مائل کر لیں چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق جناب امیر کا یہ بیان اور اسی نوعیت کا ہے،

لیکن ہر انصاف پسند صاحب عقل و شعور سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ کیا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان ان کے نزدیک بس یہی ہے کہ آپ نے دس اوصاف قسم کھا کر جو بیان کئے ہیں ان کو آپ لوگ جھوٹا قرار دیں اور وہ بھی صرف دنیا کے حقیر لالچ کے خاطر کہ چند لوگوں کی دلجوئی ہو جائے اور ہر سے ٹوٹ کر کچھ لوگ ادھر کو آ جائیں تاکہ ان کے ذریعہ انتظام ریاست درست ہو جائے حالانکہ اس کا بھی کوئی یقین نہیں تھا، بلکہ اس سے تو ایک حد تک ساتھیوں کے طرز عمل کی وجہ سے ایسی ہر سبھی تھی اتنی معمولی باتوں کے خاطر اور حقیقہ دنیا کے لالچ میں زمانہ سازی اور دفع کوئی کا الزام آپ کے متبع اور ساتھی لگائیں تو لگائیں اہل سنت تو ایسی باتوں کے تصور سے بھی ہزار بار اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

اور اسی کے ساتھ یہ عقل سے پیدل یہ نہیں سوچتے کہ ہم جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کہاں کھینچنے لے جا رہے ہیں اس توجہ و تاویل سے تو دین کی غرض و غایت ہی اللہ سے نکلی جا رہی ہے کہ اس قسم کے فراعنہ جاہلہ کی طرح سرائی کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح نافرمانی پر اتر آئے ہوں اور "ارتداد" کی حد تک پہنچ چکے ہوں اور کتاب اللہ کی تحریف کی ہو اور "دین خدا" کو بدل ڈالا ہو کہاں تک جائز ہے حالانکہ انہوں نے یہ حدیث صحیح ضرور سنی ہوگی، **إِذَا مِئِمَّةُ الْفَارِسِيِّ خَضِبَ الرَّبَّ** (جب فارس کی تعریف کی جائے تو اللہ تعالیٰ کا غضب ٹوٹ پڑتا ہے) لہذا یہ سب کچھ دین و دیانت اور عقل و فراست سے کتنی بعید بات ہے جو یہ نادان دوست جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

آخر ایسی کوئی ضرورت تھی جس کی وجہ سے اتنی تاکیدات مبالغہ اور سخت قسموں سے کام لیا گیا اور اگر ان کی مدح و تعریف کا مقصد اتنا ہی تھا کہ ایک آسان ترین مصلحت سے امور خلافت حسن انتظام سے انجام پاسکیں تو پھر ان دس جھوٹ "بصورت توصیف و تعریف بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کیلئے تو اتنا کہنا بھی کافی ہوتا تھا۔ **لِللّٰهِ بَلَدٌ فَلَا يَنْقُصُ فِيهِ جَاهِدٌ أَلَسَتْهُ وَلَمْ يَزِدْ دِينَ وَشَاقَّ يَسْفِيهِ أَلَسَلَهُ فِي الْبُلْدَانِ وَوَصَلَ الْجَزِيَّةَ وَبَنَى الْمَسَاجِدَ وَكَسَمَ لِقَعْمٍ فِي خَلْدِهِ فَلَنَنْتَهُ** صرف اللہ ہی کے لئے تعریف ہے فلاں شہروں کی البتہ جہاد کیا اس نے کافروں و مرتدوں سے اور اس کی کوشش سے شہروں میں اسلام پھیل گیا اس نے جزیہ مقرر کیا، مساجد بنوائیں اور اس کی خلافت میں کوئی فتنہ رونما نہ ہوا یا اس جیسی کوئی اور عبارت!

پھر یہ مضامین جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی عبارت میں درج ہیں اور آپ کے دوسرے مضامین میں زمین و آسمان کا فرق ہے در ایک معصوم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ باطل و ناحق کو اتنا سراہے اور اپنے یلین سے اپنے متبعین

کو گمراہ کرے اور کافروں اور فاجروں کی تعریف کرے اور ان کی اصلاح باطن اور قرب مدارج کا حکم لگا کر اپنے اوپر الزام لگائے جانے کا سبب بنے بلکہ آنجنابؐ کو توبہ چاہیے تھا، اور واجب تھا کہ ایسی جماعت کے محبوب اور برائیاں "تفصیل وار منظر عام پر لاتے تاکہ لوگ ان کی اقتدا اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھنے سے باز رہتے اور گمراہی کے بھنور میں نہ پھنس جاتے بمطابق حدیث صحیحہ اُذْ كُنْ لَنَا سِتْرًا مِّنْهُ يَخْتَرُكَ النَّاسُ كَاكِبًا جِطْرًا كَهْوًا کہ لوگ اس سے دور بھاگیں۔

اگر اسی قسم کی حقیر و معمولی دنیاوی اغراض ان پاک طینت حضرات کی نظر میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت رکھتیں تو پھر جھوٹے مکہ پیشہ اور دنیا طلب لوگوں میں جو ریاست و سادت کی طرح میں اس قسم کے نازیبا امور کے مرتکب ہوتے ہیں اور خورشامد اور مفردوں کی طرح سرائی میں جو ریاست میں لگے رہتے ہیں اور ان پاک باز، پاک طینت حضرات میں فرق ہی کیا رہ جاتا تھا جناب امیرؒ کے پاک دامن کو ان نجس و پاک دہموں سے پاک صاف اور بجائے رکھے جو یہ نادان دوست غلط سلط و دیلات و توجہیہات کے فدیہ دان پر لگانے کے لئے اودھا دکھائے بیٹھے ہیں، اور بعض دوسرے عقلمندوں نے کہا ہے کہ اس عبارت سے آپ کا اشارہ کسی اور صحابی کی طرف تھا اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ہی میں فوت ہو گئے اور قنبرہ رونما ہونے سے پیشتر ہی جہان سے سد ہار گئے تھے۔ براہِ ندی نے اسی قول کو پسند کیا اور اسی کو اختیار بھی کیا ہے،

واقعی ان لوگوں کی عقل و دانش پر قربان ہو جانا چاہیے جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی "یہ لوگ تو آنکھ بند کر کے جو منہ میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں مگر جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دانش و بینش اور عقل و شعور سے کچھ حصہ ملا ہے اسے تو بہر حال کوئی بات قبول یا رد کرنے میں غور و فکر ہی سے کام لینا چاہیے اور اسی لئے ہم یہ دیکھیں گے کہ اوصاف مذکورہ در بیان جناب امیرؒ شخص مذکورہ پر منطبق ہوتے بھی ہیں یا نہیں، اول تو یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حینِ حیات نزول وحی کا سلسلہ جاری تھا، آپ موجود تھے تو اعمال کی ناہمواری، کجی کی درستی اور سنت کا قیام، یہ آپ کے علاوہ دوسرا کوئی کس استحقاق کی بنا پر کرتا اور کیوں کرتا اور اگر کرتا تو گنہگار اور بے نشان کیوں رہتا، کسی کو اس کا نام و نشان کیوں معلوم نہیں ہوا اور کون عقلمند یہ بات باور کر لے گا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص مرے اور لوگوں کو مختلف اطراف میں پھیلنے والے چور ہے پر چھوڑ جائے جو گمراہوں کی حیرانی کا باعث ہو تو اول ہدایت کے لئے طلبِ یقین کا حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود ہیں، وحی کا نزول جاری ہے، فیض الہی و مہم دین کی تکمیل اور نعت کے اتمام میں شدد مد سے مصروف کار۔

اور بعض اہلِ امیہ نے کہا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی غرض اس بیان سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر تشریف کرنا ہے اور اس بات پر سرزنش کہ وہ شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت پر نہ چلے اور ان کے زمانہ میں فساد پیدا ہوا یہ توجہ و تاویل کھپلی و توجہیہات سے بھی زیادہ لچر و لغو ہے،

اول تو اس وجہ سے کہ اگر تعریف ہی مقصود تھی تو اس سے بہتر عبارت سے بھی ہو سکتی تھی یہ دس قسم کے جھوٹ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی، دوسرے یہ کہ سیرتِ شیخین اگر پسندیدہ ہے تو ان کی خلافت

برحق ثابت ہو گئی اور اگر پسندیدہ نہیں تھی تو جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اس کے ترک پر سرزنش کیوں ہو رہی ہے، تیسرے اس عبارت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شیخین رضی اللہ عنہما سے مخالف ہرگز ظاہر نہیں ہوتی نہ ظاہر نہ اشارہ، پھر یہ کہ عبارات کو فقہ کے خطبوں میں اس وقت بیان ہو رہی ہیں، جب نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ موجود تھے نہ ان کا نساد نہ نہ بلکہ ظاہر یہ اپنے زمانہ میں امور خلافت کے پورے طور پر سرانجام نہ پانے پر دست و انوس ہے، اس خیال کے پیش نظر کہ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی تہذیب و تمدن کے کیسے موافق رہی کہ سارے کام پوری آسانی سے بے کھلے ظہور پذیر ہو رہے،

اور پھر اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ڈانٹ ڈپٹ ہی مقصود تھی تو لاگ پٹیٹ کے بغیر صاف صاف یوں کیوں نہ فرمایا کہ انہوں نے ایسا ایسا کیا، اور ایسا نہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توبیخ سے اگر کوئی خطرہ تھا تو وہ اہل شام ہی سے تھا کیونکہ وہی اپنے آپ کو ان کا مددگار کہتے تھے، اور وہ خطرہ تو ویسے خود ہی بڑھ رہا تھا اور پھر جب اہل شام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی نسبت یقینی طور پر آنجناب رضی اللہ عنہ کی طرف کرتے تھے تو خطرہ کی کوئی بات ہی نہ تھی، بمصدق اس مثل کے کہ میں تو ڈوبا ہوا ہوں مجھے تری کا کیا ڈر!

اقوال عزت کے منجملہ ایک وہ قول بھی ہے جس کو امامیہ نے جناب ابی محمد حسن عسکری سے ان کی تفسیر میں نقل کیا ہے،

انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرما کر اپنی مہکلامی کے لئے انتخاب فرمایا ان کے لئے دریا میں راستے کھول دیئے۔ بنی اسرائیل کو نجات بخشی اور تختیوں کی شکل میں تہذیب عنایت فرمائی اور انہوں نے اپنے رب سے اپنا قرب جان لیا تو عرض کی کہ اے میرے رب تر نے مجھے وہ عزت بخشی جو مجھ سے پہلے کسی کو نہ بخشی تو کیا میرے انبیاء میں ایسا ہے جو مجھ سے زیادہ باعزت ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ کیا تم کو معلوم نہیں کہ محمد میرے نزدیک تمام مخلوقات سے زیادہ افضل ہیں، حضرت موسیٰ نے کہا کہ اگر محمد تیرے نزدیک تمام مخلوقات سے افضل ہیں تو کیا انبیاء کی اولاد میں کوئی ایسا ہے جو میری اولاد سے زیادہ بزرگ ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم کو پتہ نہیں کہ محمد کی اولاد تمام انبیاء کی اولاد سے بزرگ تر ہے اس پر موسیٰ بولے کہ اگر محمد کی اولاد تیرے نزدیک

اِنَّهٗ قَالَ مِّنْ اٰتِيَتْكَ اُمَّةٌ عَلَيْهِ سَلٰةٌ لِّتَاٰبِعَكَ اللّٰهُ مُوسٰى
ابْنُ عِمْرَانَ وَاصْطَفٰهُ نَجِيًّا وَفَوَّضَ لَهٗ الْكِتٰبَ وَفَوَّضَ بَيْنَ
اِسْرَآئِيْلَ وَاعْطٰهُ الشُّرٰٓئِلَ وَالْاَنْوَامَ زَاوِيًا كَاٰتِهٖ
مِّنْ تَرْتِيْبٍ عَزَّ وَجَلَّ فَقَالَ يٰ اٰرَبَ لَقَدْ اَكْرَمْتَنِيْ بِكُلِّ اَمِيَّةٍ
لَّكَ تَكْرِيْمٌ مِّمَّا اَحَدًا اَقْبَلَنِيْ فِهَلْ فِىْ اَصْحٰبِيَّكَ عِنْدَكَ
مَنْ هُوَ اَكْرَمُ مِنِّيْ فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يٰ اَمُّوْسٰى اَمَّا عَلِمْتَ
اَنْ مُحَمَّدًا اَفْضَلُ عِنْدِيْ مِنْ جَمِيْعِ خَلْقِيْ فَقَالَ يٰ اَرَبَ
اِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ اَفْضَلَ عِنْدَكَ لَمْ يَنْجِبْ خَلْقَكَ فِهَلْ فِى
اِلَ الْاَنْبِيَاۓ اَكْرَمُ مِنْ اِلٰى قَالَ فَزَوِّدْ يٰ اَمُّوْسٰى
اَمَّا عَلِمْتَ اَنْ فَضْلَ اِلٰى مُحَمَّدٍ عَلَى اِلَ جَمِيْعِ النَّبِيِّيْنَ كَفَضْلِ
مُحَمَّدٍ عَلَى جَمِيْعِ الْمُرْسَلِيْنَ فَقَالَ يٰ اَرَبَ اِنْ كَانَ
فَضْلُ اِلَ مُحَمَّدٍ عِنْدَكَ كَذٰلِكَ فِهَلْ مِنْ مَّحَابَّةٍ
الْاَنْبِيَاۓ اَكْرَمُ عِنْدَكَ مِنْ اَصْحٰبِىْ قَالَ يٰ اَمُّوْسٰى
اَمَّا عَلِمْتَ اَنْ فَضْلَ مَحَابَّةٍ مُحَمَّدٍ عَلَى مَحَابَّةِ جَمِيْعِ
الْمُرْسَلِيْنَ كَفَضْلِ اِلَ مُحَمَّدٍ عَلَى اِلَ جَمِيْعِ النَّبِيِّيْنَ فَقَالَ

مُوسَىٰ إِنَّ كَانَ فَعَلْتُ مُحَمَّدًا قَالَ مُحَمَّدٌ وَاصْطَبَ
 مُحَمَّدٌ كَمَا دَمَعَتْ قَهْلٌ فِي أُمِّهِ وَأَوْشِكِيَا وَافْعَلُ
 عِنْدَكَ مِنْ أُمَّتِي طَلَلْتُ فَلَهُمُ الْغَنَامُ فَأَسْرَلَتْ عَلَيْهِمُ
 السِّنُّ وَالسَّنَوِيُّ وَفَلَعْتُ لَهُمُ الْبَعْرُ فَقَالَ اللَّهُ يُعْطِي
 إِنَّ فَعَلْتُ أُمَّةً مُحَمَّدًا عَلَى أُمَّةٍ جَبِيحَةٍ إِلَّا نَبِيًّا وَكَفَعْنِي
 عَلَى خَلْقِي.

ایسی انسل ہے نہ کیا انبیاء کے ساتھیوں میں کوئی ایسا
 ہے کہ میرے ساتھیوں سے زیادہ باعزت ہو تو انسانی
 نے فرمایا تمکو خبر نہیں کہ محمد کے ساتھ تمام رسولوں کے
 ساتھیوں سے انسل ہیں جیسے ان کے ارادہ تمام انبیاء
 کی اولادوں سے موسیٰ بولے کہ اگر محمد ان کی اولاد ان
 کے ساتھیوں کی فضیلت ایسی ہے جیسی آپ نے فرما

تو انبیاء میں سے کسی کی امت ایسی ہے جو تیرے نزدیک میری امت سے انسل ہر جن پر تو نے ایک کا سایہ فرمایا
 ان پر من و سلوی نازل کیا اور دریا میں ان کے لئے راستے بنائے اللہ نسا نے فرمایا اسے دس محمد کی امت کی
 فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر ایسی ہے جیسی میری ذات کی فضیلت تمام مخلوق پر۔

اب ان بزرگ امام کی اس روایت سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا درجہ فقہوں سے
 ثبوت ملتا ہے،

اول۔ اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی مصاحبت از روئے کتاب و اجماع اہل سنت و شیعہ
 قطعی الثبوت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزُفْ جِبْ كَمَا أَنَّهُمْ لَمْ يَكُنْ لِي
 سے فرمایا تو غم نہ کر۔ اور یہاں سے صاحب سے مراد بالاجماع حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں، اور پھر یہ
 بھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت خصوصیت اور ہر اسی اس قدر مشہور زمانہ ہوئی کہ ہر خاص و عام
 اور محرم راز کو بطریق ضرب المثل ان ہی کی صفت سے یاد کیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کا رفیق غار ہے، لہذا ان کی
 افضلیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب پر صفت محبت میں ثابت ہو گئی اور یوں وہ کم از کم تمام انبیاء کے
 ساتھیوں سے تو قطعاً افضل ہوئے اور جو انبیاء کے تمام اصحاب میں افضل ہو وہ ہی خلافت و امامت کے لائق ہوگا
 اس لئے کہ ان میں بھی تو اس یاقوت و قابلیت کے بہت سے گزرتے ہیں مثلاً کالب و قاسم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام
 کے اصحاب میں سے تھے۔ اور حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد آپ کے خلیفہ ہوئے اور آمن بن برخیا کہ حضرت
 سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں تھے اور اس قابلیت کے مالک،

اور اگر ان امور سے قطع نظر بھی کریں تو ان کے ہاتھ سے عام مسلمانوں پر ظلم چہ جائیکہ عزت رسول پر یا ان
 کے حقوق غصب کرنا تو سرزد ہو ہی نہیں سکتا ورنہ تو پھر افضلیت کجا فضیلت جی ہاتھ سے جاتی رہی
 دوم۔ اس طرح کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جملہ پیغمبروں کے اصحاب سے افضل قرار پائے
 تو اہل سنت رسول اللہ پر جو ظلم ان کی حق تلفی اور اس عالی قدر و عالی مرتبہ خاندان کی تحقیر و اہانت وہ کس طرح
 کریں گے جب کہ سارے پیغمبروں کے اصحاب میں سے کسی نے ایسی حرکت کبھی نہ کی ہو،

اگر یہ حضرات دیگر انبیاء کے اصحاب کے ہجرت بھی ہوتے تب بھی ضروری ہوتا کہ ایسے ناشائستہ کام ان
 سے سرزد نہ ہوں چہ جائیکہ ان سے افضل ہوں اور پھر بھی ان سے ان امور کا ارتکاب ہو۔

اس مرتبہ کے لحاظ سے امام فخر الدین رازی، رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بحث بڑی دلچسپ اور ذہن نشین کر نیکی

لائق ہے۔ وہ فرماتے ہیں، کہ میرے نزدیک رافضیوں کا فرقہ عقل اور اپنے رسول کے ساتھ نیک اعتقاد ہی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چوٹی سے بھی کیا گنرا سہے، کیونکہ اس چوٹی نے تو اپنے ماتحت افراد سے یوں خطاب کیا،
يَا أَيُّهَا النَّاسُ ادْخُلُوا مَسَاجِدَكُمْ لَا يُخْطَبُ عَلَيْكُمْ سُبُحَاتُ وَخُبْرُكُمْ وَهَمُّكُمْ لَا يَشْعُرُونَ اے چوٹیوں میں اپنے ٹھکانوں
میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو سلیمان اور ان کے لشکر ہی ان جانے میں تم کو رو دندڑا لیں،

گویا وہ چوٹی اتنا تو سمجھتی تھی کہ فوجی اور لشکر، ظلم و ستم ڈھانے میں جری بے باک اور بے دھرمک ہوتے
ہیں، مگر سلیمان علیہ السلام کے فوجی ان کی صحبت کی تاثیر سے اتنے مہذب ہو گئے ہیں اور نبی کی سرسری سی صحبت
ان پر اس حد تک اثر انداز ہو گئی ہے کہ دیدہ و دانستہ ایک چوٹی پر بھی ظلم نہ کریں گے بلکہ پاؤں تلے بھی نہ روندیں
گے اور یہ رافضی اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اتنا سمجھنے سے ناسر رہے کہ سرتاج الانبیاء حضرت خاتم المرسلین
صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہمہ دم نے ان کے اصحاب حاضر باش اور آپ کے یار غار اور رفیق فکسار پہ اتنا بھی اثر نہ کیا
ہو، اور خیانت، شرارت اور شیطنت ان سے مٹا ڈال ہو۔

کیا صحبت پیغمبر سے انہوں نے منفی اثر لیا تھا اور ناشائستہ باتوں نے دوسرے لوگوں کی نسبت ان پر زیادہ
تسلط جمالیا تھا جو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نور نظر ان کے داماد اور فراسوں کو حالت بے کسی رنج پہنچاتے ان پر
ظلم ڈھاتے ان کے گھر دن کو نذر آتش کرتے اور ان کو بے وسیلہ و بے قدر کرتے ان کے باغ و زمیں ضبط کرتے
ان کے روزینے روکتے رہے اور ہمیشہ ان کی انذار سانی کی فکر میں لگے رہے تفویہ تو اسے چرخ گردان نفوا
اقوال حیرت میں سے ایک اور قول وہ ہے جس کو علی بن عیسیٰ اردبیلی امامی اثنا عشری نے اپنی کتاب کشف
الغمر عن معرفۃ الائمه میں نقل کیا ہے۔

اَنَّهُ سَبَّلَ اِلٰى مَامَ اَبُو جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ حَلِيَّةِ
السَّيْفِ هَلْ يَجُوزُ فَقَالَ نَعَمْ ثُمَّ حَتَّى الْوُجْهِ الْقَيْدِي
سَيْفُهُ يَالْفَيْفَةَ فَقَالَ الرَّادِي اَتَقُولُ هَكَذَا فَرَسَّ
اِلٰى مَامَ عَنِ مَكَانِهِ فَقَالَ نَعَمْ صِدِّيقٍ نَعَمْ صِدِّيقٍ
فَمَنْ تَدَّيْقِلَ لَهٗ الصِّدِّيقُ فَلَا صَدَقَ اللّٰهُ قَوْلًا
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔

جناب ابو جعفر سے تلوار کے زیور کے بارے میں سوال
کیا گیا کہ وہ ہاتھ ہے یا نہیں آپ نے فرمایا جائز ہے
اس لئے کہ ابو بکر صدیق نے اپنی تلوار پر چاندی جڑوائی
ہوئی تھی راوی نے حیرت سے پوچھا کیا آپ ایسا دینی
صدیق کہتے ہیں؟ یہ سن کر آپ اچھل پڑے اور فرمایا
ہاں صدیق ہاں صدیق ہاں صدیق! اور جس نے آپ کو

صدیق نہ کہا اللہ اس کے قول کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے،

مذہب و دین اور قرآن کریم کے طے شدہ اصولوں کی روشنی میں انبیاء کے بعد صدیقین کا درجہ ہے اور یہ
تمام امت میں افضل شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں آیات ذیل ملاحظہ ہوں،
فَاُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اٰتَمَّ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ
وَالْقِيَمَةِ لَيَقِيْنَ وَالشَّهَادَةِ اِلَٰهَ الصَّالِحِيْنَ وَحَسْبُ
اُولَٰئِكَ مَرْفِقًا۔
۱۶۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُولٌ وَّاتَمَّ

پس یہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے
الانعام فرمایا وہ انعام یافتہ حضرات (انبیاء و صدیقین و شہداء
اور صالحین) ہیں اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں،
عیسیٰ بن مریم اور کچھ نہیں ہیں، مگر رسول اور ان

صِدِّيقَةُ -

(۳۰) - وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشَّهَادَةُ مِنْهُمْ لَهُمْ أَجْرٌ هُمْ -

کی والدہ صدیقہ ہیں،

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولین پر ایمان لائے وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق و شہداء ہیں ان کے لئے ان کا اجر ہے،

اور اس انصافیت سے قطع نظر بہت سی دیگر آیات اور احادیث سے یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ صدیق کا لقب تعریفی لقب ہے جو باعتبار مرتبہ شہید و صالح سے برتر ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو یہ لقب دیا۔ یوسف الصدیق اور خود امامیہ کی کتابوں میں مروی اور ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے لئے یہ لقب استعمال فرمایا۔ انا الصدیق الذکبر (میں صدیق اکبر ہوں) بلکہ مستقبل میں آنے والوں کے مقابلہ میں اسے اپنے اندر ہی منحصر قرار دیا، لا یقولہا بعدی الذکاب (یہ لقب میرے بعد وہی استعمال کرے گا جو کذاب ہوگا) یہی سبب ہے کہ ائمہ نے اپنے لئے یہ لقب استعمال نہیں کیا اور کہیں استعمال ہوا بھی ہو تو وہ حقیقی معنی میں نہیں بلکہ بطور مجاز ہوگا،

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے من بعدی فرمایا اس سے صاف طور پر معلوم ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ اس امت میں آپ سے پہلے بھی کوئی صدیق گذر چکا ہے جس کا یہ لقب مشہور تھا اور اس کی صفت صدیقیت برحق اور قابل تسلیم تھی،

اگر کوئی یہ کہے کہ انحصار صدیقیت پر نہیں، اکبریت پر ہے، کہ کوئی صدیق تو ہو سکتا ہے مگر مجھ سے اکبر نہیں ہوگا، تو اس کے باوجود بھی لفظ بَعْدِی سے صدیقیت کہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کے لئے قرار پاتی ہے،

حاصل کلام یہ کہ جس شخص کے لئے "امام معصوم" لفظ صالح استعمال فرمائیں تو جو وقت و مقام و غلبہ و غصب کا احتمال اس شخص صالح سے بالکل جاتا رہتا ہے ایسا نہ ہو تو "امام معصوم" پر دروغ کوئی کا الزام آئے گا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس کسی شخص کو ایک "امام معصوم" نے اس قدر شہادت تاکید سے نہ صرف صدیق کہا ہی ہو، بلکہ اس کی صدیقیت کا اعتقاد تمام مکلف مخلوق پر واجب قرار دیا ہو اور اس کا انکار کرنے والے کو بددعا دی ہو تو ایسے شخص کے متعلق کیا خیال اور کیا گمان کرنا چاہیئے،

اگر ایسے شخص کی امامت و خلافت نہ مانی جائے یا ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ انہوں نے حق امامت و بزعیم خود کی امامت غصب کر لی تو یہ تو ان کی صدیقیت کا انکار ہوگا اور اس سے تو امام معصوم، بھی بددعا میں شریک ہو جائیں گے۔

علمائے امامیہ اس روایت کی بحث سے بچ اور لاجواب ہو کر اب اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ اس روایت ہی سے انکار کر دیں کیونکہ اس روایت کو تقیہ پر محمول کر کے بھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ کشف الغمہ کوئی نایاب کتاب نہیں جہاں تہاں دستیاب ہے اور اگر کوئی تعصب و عناد سے مجبور ہو کر کسی ایک کتاب دیا (ایک ایڈیشن) سے اس روایت کو حذف بھی کر دے تو دوسرے نسخے (اور سابقہ ایڈیشن) اس کی خود تردید کر دینگے،

پیچھا چھوٹنے کی البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ چونکہ اہل سنت نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایت بیان کی ہے، اس لئے فرقہ امامیہ کے پرہیزگار علماء، شریک روایت علماء اہل سنت کی کم مائیگی علم دینی اپنے مقابل میں بیٹھا سمجھ کر روایت سے انکار کر دیں تو ان سے یہ کچھ بعید بھی نہیں، مگر یہ ذہن نشین کر لیں کہ پھر اس اصول کی تمام دینی اور شرعی امور میں پابندی کرنی ہوگی، اور یوں ان کا کلمہ نماز اور بہت سے امور شرع اس انکار کی نذر ہو کر ختم ہو جائیں گے، اور ان سے متعلق ساری روایات سے دست بردار ہونا پڑے گا کیونکہ ان میں بھی اہل سنت شریک روایت ہیں،

چنانچہ روایت بالا کو اہل سنت میں سے دارقطنی نے سالم بن ابی حفصہ سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا۔

دَخَلْتُ عَلَى أَبِي جَعْفَرٍ فَقَالَ اللَّهُمَّ إِنِّي أَلُوَدُّ
أَبَا بَكْرٍ وَهَمَزَ اللَّهُمَّ إِن كَانَ فِي نَفْسِي غَيْرُ
ذَلِكَ فَدَنَا لِي شَفَاعَةً مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ قَالَ سَأَلَهُ أَسَاكَ قَالَ خَلِيلًا
مِنْ أَجَلِي۔

جب میں ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا
تو آپ نے فرمایا اے اللہ (تو گواہ رہ) میں ابو بکر
و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہوں اے اللہ
اگر میرے دل میں اس کے علاوہ کوئی اور جذبہ بیابان
ہو تو قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت

سے مجھے محروم رکھ سالم کہتا ہے کہ میرا خیال ہے آپ نے ایسا میری وجہ سے کہا،
تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ سالم بن ابی حفصہ ضعیف تھا، اور یہ روایت بھی اس کی شیعیت کو ثابت کرتی
ہے، اور جناب ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سنانے کے لئے یہ الفاظ فرمائے کہ ممکن ہے یہ میرے خیالات
اور عقائد سن کر ہی اپنے غلط و بے کار عقیدہ اور گمان باطل سے تاب ہو جائے،
یہ روایت یہاں اس عرض سے بیان کی گئی ہے کہ جناب امام کے کلام میں تفسیر کا احتمال نہ رہے کیونکہ یہاں
آجناب نے اس سلسلہ میں شرط و جزاء، ذکر کر کے اپنے خدا سے اپنے لئے کفر کی دعا فرمائی اس لئے کہ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کی شفاعت سے بالاجماع کافر ہی محروم ہوگا اور امام معصوم، کی دعا مقبول ہی ہوتی ہے، اگر شرط پوری
ہو جائے تو جزا پوری ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہتا؛

اب اسی امر زیر بحث پر اہل سنت کی روایات ملاحظہ فرمائے:

دارقطنی نے عروہ بن عبد اللہ سے روایت کی ہے

قَالَ سَأَلْتُ أَمَّا جَعْفَرٌ عَنْ حَلِيقَةِ السَّيْفِ فَقَالَ
لَا بَأْسَ نَعْدَهُ عَلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ سَبَقَهُ قَالَ
قُلْتُ تَقُولُ الصِّدِّيقُ قَالَ نَعْدُ صِدِّيقِي نَعْدُ صِدِّيقِي
نَعْدُ صِدِّيقِي مَنْ لَمْ يَقُلْ الصِّدِّيقُ فَلَهُ صَدَقَ قَوْلُهُ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔

کہتا ہے میں نے ابی جعفر سے تلوار کے زلیور کے بارے
میں پوچھا، آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں کیونکہ ابو بکر
صدیق نے اپنی تلوار پر حلاؤ کر لیا تھا، میں نے آپ سے
کہا آپ ان کو صدیق کہہ رہے ہیں، فرمایا ہاں صدیق
ہاں صدیق (اور) ہاں صدیق جو ان کو صدیق نہ کہے،

دنیا و آخرت میں اس کے قول کی کوئی تصدیق نہ کرے گا،

اور علامہ ابن جوزی رحمہ کی کتاب صفوۃ الصفوۃ میں مذکور ہے کہ اس میں یہ الفاظ زائد ہیں قَوْثَبٌ وَثَبَةٌ وَاسْتَقْبَلُ الْقَبْلَةَ دس دہا اچھلی پڑے اور قبلہ رخ ہو کر لہذا یہ روایت جو کشف الغمہ کی روایت کے مطابق ہے بدو کا کو ظاہر کرتی ہے، اور تفسیر کی کوئی گنجائش نہیں رکھتی، اور شیعوں کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ جناب ابو جعفر اور جناب جعفر صادق رحمہما اللہ سونے کی مہروں سے مہر شدہ کتاب کی رو سے تفسیر سے روک دیئے گئے تھے، اس لئے ان کی روایات کو تفسیر پر محمول نہیں کیا جاسکتا اور یہ بات انشاء اللہ اپنے موقع پر ان کی معتبر کتابوں کے حوالہ سے بیان کی جائے گی، اور دارقطنی ہی نے ایک اور روایت جناب ابی عبد اللہ ابن محمد بن صادق کے حوالہ سے بھی بیان کی ہے جو انہوں نے اپنے والد محترم سے بیان کی ہے۔

ایک شخص میرے والد زین العابدین رحمہ اللہ کے پاس گیا کہ بولا مجھے ابو جعفر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق کچھ بتائیے آپ نے کہا صدیق کے بارے میں؛ وہ بولا آپ بھی انہیں صدیق کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تجھے تیری ماں روئے، خدا کی قسم ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق کا لقب دیا اور مہاجرین و انصار نے ان کو صدیق نام سے پکارا، اور جو ان کو صدیق نہ کہے اللہ اس کے قول کو دنیا

أَنْ تَجْلُوَ جَاءَ إِلَى أَبِي عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْعَبَّادِ بْنِ عَلِيٍّ ابْنِ الْحُسَيْنِ فَقَالَ أَخْبِرْنِي عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ وَعُمَرَ فَقَالَ عَنْ الصِّدِّيقِ قَالَ وَتَسْمِيَةِ الصِّدِّيقِ قَالَ فَلَمْ يَكُنْ لَكَ أَمَّا كَذَلِكَ الصِّدِّيقِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ وَمَنْ لَمْ يَسْمَعْ بِمَا قَدْ مَدَّقَ اللَّهُ قَوْلِي فِي الذُّنُوبِ وَأَذَى حَرَكَةِ أَهْلِ قَاهِيتِ أَبَا جَعْفَرٍ وَعُمَرَ۔

وآخرت میں سپاؤں کرے جا اور ابو جعفر و عمر سے محبت کر (رضی اللہ عنہما)

اب جب اس مسئلہ میں واضح وصاف آیات اور عزت پلک کے غیر مبہم اقوال کے بیان سے فارغ ہو چکے تو بجائے اس کے کہ نتیجہ مرتب کر نیکی کے مقدمات کی ترکیب یا اشکال کی ترتیب میں لکھیں جو اس مدعا پر دلالت کرتے ہیں بلکہ ہاتھوں بعض ایسے دلائل بھی یہاں ذکر کئے دیتے ہیں جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں اور ادنیٰ شامل و تفکر سے ناظر و قاری کو مقصد و مدعا تک پہنچا دیتے ہیں،

۱۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی اس جماعت کو جو حضرت ابو جعفر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے وقت موجود تھے اور امور خلافت میں آپ کی معین و مددگار تھے، مختلف القابات سے سرفراز فرمایا کہیں انہیں اُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ (وہی کامیاب و کامگار ہیں، فرمایا تو کہیں رضی اللہ عنہم دَرَجَاتُكَ اللَّهُ ان سے راضی ہوا) اور وہ اللہ سے ایک جگہ جنت کے وعدے اور اجر عظیم کی خوشخبری کا شرف بخشا تو دوسری جگہ بلند درجات اور اپنی رحمت و عنایت اور رخصا مندی کی بشارت سے خوشدل!

اب بھلا کوئی یہ بتائے کہ اسی معزز کرم اور انعامات الہیہ کی مورد، اور جنت اور رضا الہی کی حقدار جماعت کسی ایسی بات پر متفق ہونے کا سوتیل بھی سکتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے صریح مخالف ہو اور اس سے آپ کا مہر ٹوٹا ہو، سرگزنہ نہیں، وہ تو ایسی کسی بات کا تصور تک نہیں کر سکتی، جو قرآنی بشارت کی تکذیب یا رسول اللہ کے کسی ادنیٰ حکم کی نافرمانی کا موجب بنے!

(۲) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی توصیف میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ الفاظ فرمائے،
 حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الدِّينَ وَبَيَّنَّ فِي قُلُوبِكُمْ دَوَائِرَهُ
 اَلَيْكُمُ الْكُفْرُ وَالْفُسُوقُ وَالْعِصْيَانُ
 عملی اور گنہ کی نفرت و کراہت تمہارے دل میں ڈال دی۔

اب اسے کون مان سکتا ہے کہ اس شان کے افراد باجماعت باہم متفق ہو کر کفر و فسق اور عصیان کا ارتکاب
 کریں گے اور نہ ایک دو دن ماہ سال نہیں بلکہ زندگی بھر ایسا ہی کرنے پر مصدق رہیں گے،
 (۳) تقسیم ثلثے والی آیت میں فقرہ مہاجرین کے ذکر کے بعد اولئک صدقوا (وہی سچے ہیں)
 فرمایا ہے، اور سارے ہی مہاجرین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کہتے تھے
 اب اگر کوئی ان کو خلیفہ برحق نہ مانے تو گویا وہ ان مہاجرین کو جھوٹا کہتا ہے جن کو خدا نے سچا کہا تھا، اب وہ
 اپنی اوقات خود بچان لے۔

(۴) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان حضرات نے بیعت کی تھی جو دینی معاملات میں اپنے بیٹوں بھائیوں
 باپوں اور عزیز و اقارب کسی کا بھی پاس و لحاظ نہ کرتے تھے، موقع آتا تو دینی تقاضے کی خاطر اپنے یا رول کو اپنے
 ہاتھ سے جام مرگ پلا دیتے تھے، جہاد کی سختیوں پر وہ صابر تھے مشقت برداشت کرتے تھے، کسی مخالف سے
 نہ ڈرتے نہ دبتے! اور دین کی خاطر اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے بار بار اپنی جان، تحصیل پر رکھے دشمن کے
 دودر رو ہوتے۔ اور یہ خواہش کرتے کہ اللہ تعالیٰ یہ جہان کا نذرانہ جہان قبول کرے اور دشمن کا کوئی وار کام کر
 جائے،

اور یہ سب وہ ہی جن کی خود امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبات میں شہادت دی ہے،
 جو انشاء اللہ باب مطاعن الصحابہ میں بیان ہوئی ایسی حالت اور اوصاف والی جماعت اگر کسی بات پر اتفاق
 کر لے تو یقیناً وہ امر خلاف شرع ہرگز نہیں ہوگا،

(۵) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہ نے اتفاق کیا اور جس بات پر تمام صحابہ کرام رضوان
 اللہ علیہم اتفاق کر لیں وہ حق ہے اور اس کے خلاف بات باطل ہوگی، اس دلیل کی پختگی کے لئے اب امیر المومنین
 رضی اللہ عنہ کا وہ کلام ملاحظہ کریں جو نوح البلاء جیبی کتاب میں جسے تمام شیعہ بہت ہی معتبر و مصیح سمجھتے ہیں
 روایت کیا گیا ہے، آپ نے ایک گفتگو کے دوران فرمایا۔

اَلْزُّمُو السَّوَادَ اِذَا غَظَمَ خَاتَمُكَ يَدَا اللّٰهِ عَلٰى
 الْجَمَاعَةِ وَ اَيَاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّاذَّ مِنَ
 النَّاسِ الشَّيْطَانُ لَمَّا أَتَى الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَدِ
 الدَّائِبُ،
 سواد اعظم میں شامل رہو کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ
 ہوتا ہے۔ اور دیکھو چھوٹ اور تفرقہ سے بہت بچو
 کیونکہ جماعت سے بچھڑ کر اکیلے رہ جانے والا شیطان
 کا ایسا ہی شکار ہے جیسے ریڑسے علیحدہ ہو جانے

والی بکری بھیڑیے کا،

نوح البلاء کی جو شرح امامیہ نے لکھی ہے اس میں تحریر ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

متعلق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ تحریر ارسال کی،
 اَلَا اِنَّ لِلنَّاسِ جَنَاعًا يَدُ اللّٰهِ عَلَيْهَا وَفَقَّيْبُ اللّٰهِ عَلٰى مَنْ خَالَفَهَا فَتَنَفَسَكَ نَفْسَكَ قَبْلَكَ
 آگاہ رہو کہ لوگوں کی جمعیت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے
 اور اس جماعت کے مخالف پر اللہ کا غضب پس اپنے
 آپ کو اس کا غضب نازل ہونے سے پہلے پھا لیا۔
 حُكْمُ الْغَضَبِ۔

اس کا کچھ حصہ رضی شریف نے بھی نقل کیا مگر راجی عادت سے مجبور ہو کر اس کا بالائی حصہ کھا گیا ہے،
 کیونکہ وہ اس کے مذہب سے ٹکراتا تھا، جو سراسر تفرقہ پر مبنی ہے، اور اس کا آخری حصہ بیان
 کر دیا ہے کہ۔

اِنَّتَ اللّٰهُ نِيْمًا لَّدُنْكَ وَالنُّظْرُفِي حَقِّهِ
 جو تمہارے قبضہ میں ہے، اس کے بارے میں اللہ
 سے ڈرو اور اس کا حق جو تم پر ہے ذرا دھیان سے
 عَلِيْكَ۔

اس کی دیکھ بھال کرو،

اور انہیں امامیہ و معتزلہ کی تشریح صحیح البلاغہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھے ہوئے خطوط
 میں سے ایک خط کا مضمون یہ ہے،

مَا كُنْتُ اِلَّا سَاجِدًا مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ اَوْ
 سَاجِدًا كَمَا اَوْ سَاجِدًا۔ وَ اَمَدُ مَا كُنْتُ كَمَا
 اَمَدُ مَا وَا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ يَجْمَعُهُمْ صَلٰى
 میں بھی مہاجرین کا ایک فرد تھا، جیسے وہ آئے ہیں
 بھی آیا اور جیسے وہ لوٹے ہیں بھی لوٹا۔
 اور ان کو اللہ تعالیٰ منالت و گمراہی پر اکٹھا
 نہیں کرے گا،
 الْفَصْلُ الْاٰخِرُ۔

رضی نے پورے خط کو باقی رکھ کر کسی ایک جگہ نقل نہیں کیا، بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے
 کسی کو کہیں کسی کو کہیں، بیان کیا۔ اسی خط کے ایک ٹکڑے کو اس نے بیج البلاغہ میں یوں درج
 کیا ہے،

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ وَهَدَ عَلٰى كِتَابِ اَمْرٍ اَدِ
 كُنْيسَ لَدَى بَصْرَ تِيَهْدِيُوْهُ لَدَا يَدُ
 میرے پاس ایک ایسے شخص کا خط آیا ہے جس کے
 پاس نہ آنکھیں کہ راستہ دیکھ سکے نہ اس کا کوئی راہبر
 ہے جو اس کو راستہ پر لگائے،
 يَزِيْدُ كَ۔

اور اسی خط کو ایک دوسرے جگہ
 رضی اللہ عنہ کے خطوں اور خطوں کا یہی حشر کرتا ہے اپنے مذہب کے مطابق ان کی قطع برید کر کے ان کا
 علیہ بگاڑا اور ان کی تخریب کرتا ہے،

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گزشتہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم
 کے متعلق استفسار کیا گیا تو آپ ان کا وہ وصف بیان فرمایا جو ولایت کو لازم ہے،
 آپ نے فرمایا۔

كَانُوْا اِذَا ذَكَرُوْا اللّٰهَ هَمَلْتُ اَعْيُنُهُمْ
 ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے سامنے ذکر الہی

حَتَّى تَبْلُغَ بَعْبَاهُمْ مَاءً وَكَمَا كَيْمِيْدُ الشَّجَرِ يَدِيْدُ
الزَّيْبُ الْعَاصِفُ خَوْفًا مِّنَ الْعِقَابِ وَرَيْحًا
کیا بات تو ان کی آنکھیں برس پڑتیں حتیٰ کہ ان کے چہرے
تر ہو جاتے اور وہ خوف عتاب اور امید ثواب سے
اس طرح کانپنے لگتے جس طرح سخت آندھی میں درخت جنبش کرتا ہے،
پھر ایک اور مرتبہ انہیں حضرات صحابہ کے متعلق فرمایا۔

أَحَبُّ النَّفْسِ إِلَيْهِ لِقَاءُ اللَّهِ وَأَنَّهُمْ يَتَقَلَّبُونَ
هَلِي مِثْلَ الْجَسْرِ فِي ذِكْرِ مَعَادِهِ
ان کو سب سے محبوب چیز اللہ سے ملاقات تھی اور وہ
آخرت کے ذکر پر چنگاری کی طرح پہلو بدلتے تھے جب
چینی کا اظہار کرتے تھے،

تو ایسی جماعت یا اس کے ایک فرد کا کسی باطل امر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کے خلاف اصرار
کرنا محالات میں سے ہے،

۱، مدنی اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ایک ثبوت اس جماعت کا آپ کی بیعت کرتا ہے، جبکہ تشریف میں جناب
سجاد رحمۃ اللہ علیہ صحیفہ کاسر کی دعاؤں میں بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں مناجات کرتے وقت کہ جو بندگان خاص کے
ساتھ راز و نیاز کا وقت ہے رطب اللسان ہیں، بلکہ ان کے متبعین کے حق میں بھی طویل طویل دعائیں ان الفاظ
میں فرماتے تھے،

اللَّهُمَّ وَأَوْصِلْ إِلَى التَّابِعِينَ لَهُمْ بِإِحْسَانِ الْوَلِيَّةِ
يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا
بِالْإِيمَانِ خَيْرَ حِزْبٍ أَمَّاكَ الَّذِينَ قَصَدُوا سَبْقَهُمْ
وَتَخَوَّوْا وَجْهَهُمْ وَمَصْرَافِي قَفْوَانَا هُمْ وَلَا يَتَّكِمُ
بِهَذَا آيَةً مِّنَّا هُمْ يَدْعُونَ بِدِينِهِمْ عَلَى مَنَّا كَلِمَةً
لَّوْنَهُمْ هُمْ تَابَتْ فِي قَصْدِهِمْ وَلَمْ يَخْتَلِكْ شَيْئًا
اے اللہ ان کے ان متبعین کو بہترین صلہ اور جزا
عطا فرما جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی
اور جو اپنی دعاؤں میں کہتے تھے اے ہمارے رب
ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ایمان کے ساتھ
ہم سے پہلے گزرے مغفرت فرما، جنہوں نے اپنا رخ
ان کے رخ پر رکھا اور ان کی طرف کا قصد رکھا اور ان

کے نشان قدم پر پہلے اور ان کی قائم کردہ علامات ہدایت کو قبول کیا انہیں کے طریقہ پر ان کا دین اختیار کیا کوئی شک ان
کو نہ اپنے ارادہ سے باز رکھ سکتا تھا، اور نہ ہی کوئی شک ان کے دل میں کھٹکتا تھا۔ الی آخرہ۔

اب امام معصوم جن کے متعلق اپنی تشریف فرمائیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں مناجات کے وقت
جو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے، کہ ایسے وقت تقیہ کا خیال بھی کفر اور باطل پر اصرار ہے تو ان کے مراتب
کا کیا ٹھکانا۔

اس لئے کہ امام کے متعلق یہ سوچنا اور خیال کرنا محال و متنع ہے کہ انہوں نے حتیٰ کہ چھپایا یا باروداری برقی ہو
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان پر ظلم و غضب کو روا رکھا ہو۔

۸، کلینی کے باب السبق الی الایمان میں کمالہ ابو عمر زبیری جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے
میں نے ابی عبد اللہ سے پوچھا کہ کیا ایمان کے بھی درجے
اور مرتبے ہوتے ہیں، کہ اس کی وجہ سے مومنین اللہ تعالیٰ
تُمَلِّتْ لِذِي عَيْنٍ اللَّهُ إِنَّ لِلْإِيمَانِ دَرَجَاتٍ وَ
مَنَازِلَ يَتَفَاعَلُونَ الْمُؤْمِنُونَ فِيهَا عِنْدَ اللَّهِ قَالَ

لَعَدْتُكَ مِنْهُ لِيَرْحَمَكَ اللَّهُ حَتَّى أَفْهَمَهُ قَالَ إِنَّ
 اللَّهُ سَبَقَ بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ كَمَا يَسْتَبِقُ بَيْنَ الْغَنِيِّ
 يَوْمَ الزَّهَانِ ثُمَّ فَضَّلَهُمْ عَلَى دَرَجَاتِهِمْ فِي السَّبْقِ فَجَعَلَ
 كُلَّ أَمْرٍ مِنْهُمْ عَلَى دَرَجَةٍ سَبَقَهُ لَا يَنْقُصُهُ فِيهَا مِنْ
 حَقِّهِ وَلَا يَتَقَدَّرُ مَسْبُوقٌ سَابِقًا وَلَا مَفْضُولٌ فَاضِلًا
 تَفَاضَلَ بِذَلِكَ أَوَّلُ الْأُمَّةِ وَآخِرُهَا وَكُلُّهُمْ يَكُونُ
 لِلسَّابِقِ إِلَى الْإِيمَانِ فَضْلٌ عَلَى الْمُسْبُوتِ إِذَا لُحِقَ آخِرُ
 هَذِهِ الْأُمَّةِ أَوَّلُهَا لَعَدَّ وَلَيَقْدَرُ مَوْهَدٌ إِذْ لَمْ يَكُنْ لِيَنْ
 سَبِقَ إِلَى الْإِيمَانِ الْفَضْلُ عَلَى مَنْ أَبْطَأَ عَنْهُ وَلَكِنْ
 بَلَدًا جَاءَ الْإِيمَانُ فَدَّمَ اللَّهُ السَّابِقِينَ وَبَالَذِكَا
 مِنَ الْإِيمَانِ أَخَّرَ اللَّهُ الْمُفْتَصِّرِينَ وَأَتَمَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ
 مِنَ الْآخِرِينَ مَنْ هُوَ أَكْثَرُ عَمَلًا مِنَ الْأَوَّلِينَ وَأَكْثَرُ
 صَلَوةً وَمَوْمًا وَحَمًّا وَكَوَاةً وَجِهَادًا وَزَانِقًا وَلَوْ
 كُنْ يَكُونُ سَوَاءً يَفْضُلُ بِهَا الْمُؤْمِنُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا
 عِنْدَ اللَّهِ لَكَانَ الْآخِرُونَ بِكَثْرَةِ الْعَمَلِ مَقْدَمِينَ عَلَى
 الْأَوَّلِينَ وَلَكِنْ أَرَادَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يُذَكِّرَ آخِرُ
 دَرَجَاتِ الْإِيمَانِ أَوَّلُهَا وَيَقْوَمَ فِيهَا مَنْ أَخَّرَ اللَّهُ
 يُؤَقِّرُ فِيهَا مَنْ دَرَجَاتِ اللَّهِ قُلْتُ أَخْبِرْنِي بِمَا نَدَّبَ اللَّهُ
 عَزَّ وَجَلَّ لِلْمُؤْمِنِينَ إِلَيْهِ مِنَ السَّبْقِ إِلَى الْإِيمَانِ
 فَقَالَ قَوْلُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَسَأَقُولُ لَكُمْ مَغْفِرَةً مِنْ رَبِّكُمْ
 وَجَنَّةً عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ مِنْ أَعْدَتِ اللَّيْلِ
 أَمْتُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَقَالَ السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ
 أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ وَقَالَ السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ
 الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ
 رَزَقْنَاهُمْ مِنْهُم مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ قَبْلَ آيَاتِ الْمُهَاجِرِينَ
 عَلَى قَدَرٍ دَرَجَاتٍ سَبَقَهُمْ ثُمَّ فَتَى بِالْأَنْصَارِ ثُمَّ شَلَفَ
 النَّابِعِينَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ فَرَضَ كُلُّ قَوْمٍ عَلَى قَوْمٍ
 دَرَجَاتِهِمْ وَمَنْ رَزَقْنَاهُمْ مِنْهُ ثُمَّ ذَكَرَ مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ
 أُولَئِكَ وَبَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ فَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ تِلْكَ الرُّسُلُ

کے نزدیک باعتبار درجات کھٹے بڑھتے ہوئے؛ آپ نے
 فرمایا۔ ہاں! میں نے کہا آپ پر اللہ مہربانی فرمائے مجھے
 اس کی ذرا تفصیل تو بتائیے کہ میں بھی اس کو سمجھ لوں
 آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنین میں باہم ایک دوسرے
 کو اسی طرح سبقت دی ہے، جس طرح گھڑ دوڑ میں گھوڑوں
 کو ایک دوسرے پہ سبقت دی جاتی ہے، پھر سبقت
 کے درجہ کے لحاظ سے ان کو فضیلت مرحمت فرمائے، لہذا
 ان میں سے ہر آدمی کو اس کی سبقت کے درجہ پہ رکھا
 اس میں سے اس کا حق بالکل کم نہیں کرتا نہ پیچھے رہ جانے
 والا آگے بڑھ جانے والے

آگے ہو سکتا ہے، نہ مفضول و جبر فضیلت دیکھنی ناممکن
 پر فضیلت پاسکتا ہے اس طرح سے امت کے اگلوں
 اور پچھلوں میں باعتبار سبقت گھٹت بڑھت ہوئی ہے
 اور اگر ایمان میں پیچھے رہ جاتے والوں پر فضیلت نہ رکھتا
 تو اس امت کے بعد والے مراتب میں پہلے والوں پر فضیلت
 نہ صرف جا ہی ملتے بلکہ آگے بھی نکل جاتے اگر ایمان میں
 پہل کرنے والوں کو اپنے بعد ایمان لانے والوں پر نہ دے
 دی گئی ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے درجات ایمان میں سابقین
 کو آگے بڑھایا اور ایمان میں تاخیر کر کے پیچھے رہ جانے
 والوں کو پیچھے رکھا، مومنین میں بلحاظ عمل تم پچھلوں
 کو اگلوں سے زیادہ نہیں پاؤ گے نہ نماز روزہ میں نہ حج
 و زکوٰۃ میں نہ جہاد میں نہ راہِ خدا میں خرچ کرنے میں اگر
 یہ سابقین نہ ہوتیں کہ جن کی وجہ سے ایک دوسرے
 سے اللہ کے نزدیک بڑھا ہوا ہے تو بعد والے عمل کے
 لحاظ سے اگلوں سے آگے نکل جاتے لیکن اللہ تعالیٰ
 نے اسے پسند نہیں فرمایا کہ بعد والا پہلے والے جتنی درجات
 ایمان پاسے یا اللہ نے جیسے پیچھے ڈالا ہو وہ آگے بڑھ
 جائے یا جس کو اللہ تعالیٰ نے آگے بڑھایا ہے وہ پیچھے
 رہ جائے راوی نے کہا مجھے اس سے بھی مطلع فرمائے کہ

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَخَرَجَ عَنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَقَالَ وَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَقَالَ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَقَالَ وَلَافِيهِ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْصِيلًا إِلَى آخِرِ الْحَدِيثِ - وَقَالَ فِي آخِرِهِ هَذَا أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ الْإِيمَانِ وَمَنَازِلِهِ عِنْدَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ -

وہ سبقت ایمانی کیا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے مومنین کو رغبت دلائی ہے، تو آپ نے فرمایا وہ اللہ کا قول (وَسَابِقُوا إِلَى مَفْصَلَةٍ مِنْ هَاهُنَا) ہے اور سبقت کرو اللہ کی منفرت کی طرف اور جنت کی طرف جس کا عرض (چوڑائی) آسانی اور زمین کے برابر ہے جو اللہ و رسول اللہ پر ایمان لانے والوں کے لئے تیار

کی گئی ہے۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے) اور پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں اور وہی مقرب ہیں۔ نیز فرمایا (اللہ نے) کہ پہل کرنے والوں میں اولین مہاجرین و انصار اور ان کے مخلص پیروکار و متبعین، ہی وہ ہیں جن سے اللہ راضی ہوا اور جو راضی ہوئے اللہ سے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کا ذکر ان کے درجہ سبقت کے لحاظ سے پہلے کیا۔ دوسرے درجہ پر انصار کا ذکر فرمایا اور درجہ سوم پر تابعین کا ذکر کیا، جنہوں نے صدق دل سے اپنے پہلوں کی اتباع کی۔ پس اللہ کے نزدیک جس گروہ کا جو درجہ مقرر ہے اس نے اس کو اسی درجہ پر رکھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو اہم و گرجہ فضیلت دی اس کا ذکر کیا اور فرمایا یہ رسول ہیں کہ جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے، ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام فرمایا۔ اور بعض کے درجات بلند فرمائے الٰہ اور فرمایا بے شک ہم نے بعض انبیاء کو بعض دوسروں پر فضیلت بخشی اور فرمایا دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دی، اور ارشاد فرمایا آخرت اپنے درجات اور فضیلت میں بہت بڑی ہے الخ۔

اختتام حدیث پر کہا یہ ہے ان درجوں اور مرتبوں کا ذکر جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان میں قائم ہیں اس روایت سے صاف پتہ چل گیا کہ درجہ ایمانی میں مہاجرین و انصار سب سے بلند و بالا تر ہیں ان کے بعد والاکوئی ان سے ہمسر نہیں کر سکا۔

چنانچہ ذیل میں درج شدہ آیات قرآنی بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں،

(۱) اُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا - کہے مومن وہی ہیں،

أَعْلَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ - یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبت ہیں،

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْتَقَى مِنَ الْقِتَامِ وَمَنْ قَاتَلَ - فتح مکہ سے قبل خریج کرنے والے یا لڑنے والے

کے کو برابر نہیں،

اب ایسا شخص جو اتنا عظیم المرتبت ہو وہ ایسے ناشائستہ امور پر اصرار کرتا یا ان پر اجتماع و اتفاق کر لے محال در محال ہے!

(۲) نبی البلاغہ کے شارحین نے اپنے ہاں ایک غلط نقل کیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا۔ اس خط میں حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ذکر کے بعد ان کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرمائے،

لَعْنَةُ رِائِكَ مَا نَهَمَا فِي الْإِسْلَامِ لِعَظِيمِ وَرَاقَتِ الصَّابِ
میر سی جان کی قسم ان دونوں کا اسلام میں بہت بڑا مقام
ہے اور ان دونوں کا اٹھ جانا اسلام کے لئے بڑا کاری
زخم ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں پر اپنی رحمت فرمائے اور
ان دونوں کے اعمال کی بہترین جزا مرحمت فرمائے،

اگر شیعوں کے بقول یہ حضرات "ظالم و غاصب" تھے تو ایک "امام معصوم" ان کی ایسے شاندار الفاظ میں مدح
و توصیف کیسے کر سکتے تھے،

تبعب اور حیرت کی بات ہے کہ یہ خط صاحب پنج البلاغ نے خود بھی نقل کیا مگر اسی غیث باطنی کے ساتھ جو اس
کی طبیعت شانیں بن چکی ہے یعنی تعریف سے سیاں بھی باز نہیں رہا، الفاظ و عبارت کو آگے پیچھے تو کیا ہی سے کوئی
بات جو اس کے مذہب پر چوٹ لگاتی تھی، اس کو اس نے عبارت سے ساقط بھی کر دیا ہے چنانچہ اس کتاب کے
تمام شارحین نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس خط کی نقل میں رحنی سے ایسی بے ربطی اور بے ترتیبی عمل
میں آئی ہے کہ عبارت میں ایسی گڑبڑ اور مطلب میں ایسی گھٹک پیدا ہو گئی ہے کہ شراح اس کی توجیہ اور عبارت
کی ترکیب سے عاجز آگئے،

بحث امامت بلا فصل

اہل تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے لئے بہت سی دلیلیں بیان کرتے ہیں
جن کی چھان بھٹک اور تحقیق و تفتیش کی گئی، تو معلوم ہوا کہ بہت روایتیں تو ایسی ہیں جو موضوع بحث سے
بالکل ہی ہٹتی ہوئی ہیں، اور بہت سی روایتیں ایسی ہیں جو موضوع اہل سنت کے ذخیرہ علمی و دینی سے چرائی
گئی ہیں، اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو،
اس سلسلہ میں ان کے دلائل تین قسم کے ہیں،

(۱) وہ آیات و احادیث جو حضرت علی و اہل بیت رضوان اللہ علیہم کے مناقب و فضائل میں وارد ہوئی
ہیں۔ یہ سب اہل سنت کی ذکر کردہ ہیں جو انہوں نے خوارج اور انصاب کے مقابلہ میں لکھی اور بیان کی کیونکہ
یہ لوگ حضرت علی و اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی شان میں لعن و طعن کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے رہتے تھے،
اب یہ شیعوں کی بے وقوفی ہی سے کہ وہ جناب امیر کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے دلائل کے طور پر ان کو
اہل سنت ہی کے مقابلہ پر لے آئے!

ان کے اگلوں نے جب علم کلام و اصول میں اہل سنت و معتزلہ کی شاگردی کر کے کچھ شد بد حاصل کر لی اور
کچھ سمجھداری آگئی اور دلائل مرتب کرنے سے بھی کچھ واقف ہو گئے تو انہوں نے ان مقدمات علمی میں کچھ المٹ بھیجی
اور چند من گھڑت کلمات کا ان میں اضافہ کر کے اپنے مفید مطلب بنالیا حالانکہ وہ پھر بھی ان کے مفید مطلب
نہ تھے، مگر خیر بزم خود وہ اپنے کو یہی سمجھتے تھے، تب انہیں دلائل کی تہذیب و اصلاح کے لئے ان کی ایک کتاب

کتاب الالفین کے نام سے تصنیف ہوئی

ظاہر ہے ان حالات کے تحت اہل سنت کے لئے ان دلائل کے جوابات دینا مفید ہے، نہ مناسب البتہ ان کے یہ دلائل اس مقصد سے نقلیٰ مژدہ کئے جائیں گے کہ ان بزرگواروں کی دانشمندی اور خوش تقریری سے نقاب ہوا اور مصنوعی کلمات اور زبردستی کے بڑھائے ہوئے مقدمات پر واقفیت حاصل ہو،

(۲) وہ دلائل میں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استحقاق خلافت بحیثیت خصوصی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایک وقت و مدت خاص و معینہ میں خلیفہ برحق اور امام مطلق ہیں، یہ دلائل بھی وہ ہیں، جو اہل سنت ان غوامض و نواصب کے مقابلہ میں بیان کرتے تھے جو آپ کی خلافت و امامت کے منکر تھے اور آپ کے مرتبہ امامت میں رد و قدح کرتے تھے،

ان دلائل سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ صرف یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ خلافت راشدہ کے مستحق ہیں اور آپ کی خلافت شارع کی پسندیدہ ہے، ان میں وقت و زمانہ کی تعیین ہے نہ اس بات کی تشریح کہ ان کا زمانہ خلافت و مادہ نبوت سے متصل ہے یا منفصل،

یہ بات تو پھر نگاہ اہل اہل سنت کے مذہب کے مطابق اور ان کے مطلب کا خلاصہ ہے، اس لئے ان روایات کے جواب کی طرف وہ کیوں متوجہ ہوں! ہاں کہیں کہیں ان مقدمات پر تنبیہ و تنقید ضرور ہوگی، جو انہوں نے بے ضابطہ طور پر گھڑ گھڑ کر دلائل میں شامل کر لئے ہیں اور اپنے خیال نام میں اس پر بڑے خوش کہ کارنے کر دم، (۳) وہ دلیلیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت پر بلا تفصیل دلالت کرتی ہیں، یا آپ کے غیر سے امامت سلب کرتی ہیں، یہی وہ دلیلیں ہیں کہ جن پر مذہب شیعہ کی بنیاد قائم ہے اور ان کی روایت و نقل میں، یہ تنہا ہیں، اس قسم کی دلیلیں اولیٰ تو بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی تو ان کے مقدمات ناقابل تسلیم ہیں، کیونکہ ان کی تردید کے لئے بصورت ثقلین کتاب اللہ و عزت رسول اللہ جیسے سچے گواہ اور عادل شاہر موجود ہیں،

لہذا اس کتاب میں موقع کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ بحث تینوں قسم کے دلائل پر کی جائے گی البتہ قسم آخر کو ذرا تفصیل سے سامنے لایا جائے گا، اور بنا غلطی اور موقع شک پر ضرور تنبیہ کی جائیگی، تاکہ ان کی دلیلوں کی حقیقت الم نشرح ہو جائے،

اس بحث میں ضابطہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اتنی بات تو ضروری ہونی چاہئے کہ ان دلائل کے بنیادیات اور مقدمات ایسے ہوں جو اہل سنت کے ہاں بھی قابل تسلیم ہوں اس لئے کہ ان دلائل سے مقصود اہل سنت ہی کو تو الزام دینا ہے، ورنہ اپنی جگہ تو سارے ہی باون گزے بنتے ہیں،

شیعوں کی وہ روایات اور اصول جو ابواب ماسبق میں تفصیلاً مذکور ہوئے وہ تو اہل سنت کے نزدیک ذرہ برابر نہ قابل قدر ہیں نہ لائق توجہ البتہ وہ دلائل جو آیات قرآنی پر مشتمل ہوں یا احادیث متفق علیہا پر یا پھر وہ عقلی دلائل جن کے مقدمات طرہین کے نزدیک مسلم ہوں یا پھر وہ طعن آمیز اقوال جو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کے انکار کے سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں، موضوع گفتگو بن سکتے ہیں، ہم نے جو نکتہ باب

مطالعین کو مستقل طور پر کتاب ہذا کا جز بنایا ہے، اس کو چھوڑ کر باقی کے تین اصناف دلائل پر یہاں گفتگو کرتے ہیں۔

ان کی طرف سے پہلی آیت یہ ہے،
 اِنَّمَا وَكَلَنُكَ اللَّهُ دَنَا سَوْلًا وَاَلَّذِينَ اٰمَنُوا اَلَّذِيْنَ
 يَتَّبِعُوْنَ السَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ اَكْبَرُوْنَ
 بے شک تمہارا ولی، اللہ اور وہ مومن ہیں جو نماز
 قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں اس حال میں
 کہ بزرگوار کئے ہوئے ہیں،

اس آیت کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت جناب امیر مبنی اللہ
 عنہ کی شان میں نازل ہوئی کہ آپ نے حالت رکوع میں ہی ایک سائل کو اپنی انجمنی دی تھی،
 پھر انما کا کلمہ مصر پاتا ہے اور ولی سے مراد اوامر چلانے والا یا نافذ کرنے والا ہے اور ظاہر ہے
 یہاں وہ تصرف عام مراد سے جو سب مسلمانوں پر ہے، اور جو امامت کا مراد ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ
 ان کی ولایت کو خدا اور رسول کی ولایت کے ساتھ ذکر کیا ہے لہذا آپ کی امامت ثابت ہو گئی اور آپ کے
 علاوہ دوسروں کی امامت کی نفی؛ کیونکہ انما مصر پر دلالت کرتا ہے، اور یہی مدعا ہے،

اس کا جواب چند صورتوں میں دیا جاسکتا ہے، اول بطریق نقص، کہ یہ دلیل آپ کے بیان کے مطابق
 جناب امیر کے پہلے والے ائمہ کی جس طرح نفی کرتی ہے اسی طرح آپ کے بعد کے ائمہ کی تردید بھی یہی آیت
 ساتھ ساتھ ہی کر رہی ہے، اور آپ کی اسی تقریر سے بعد میں آنے والوں کی امامت کی نفی بھی اس سے نکلتی ہے
 جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما، اور بعد کے ائمہ کی امامت برحق نہ ہو، اگر شیعہ اس
 انکار کے لئے تیار ہیں، تو چشم مارو دشمن دل ماشا دہلا کھٹکے اس دلیل سے ضرور استدلال کریں،

خود مدعا کلام یہ کہ یہ استدلال جس وجہ سے اہل سنت کے مقابل لایا گیا ہے کلمہ مصر پر مبنی ہے اور مصر
 جس طرح اہل سنت کے لئے معضہ ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شیعوں کے لئے معضہ ہے، کیونکہ اسی صورت
 میں اگر جناب امیر سے قبل کے ائمہ کی تردید ہوتی ہے تو بعد کے ائمہ کی بد رجہ اولی ہوتی ہے، گو مذہب
 اہل سنت باطل قرار پاتا ہے مگر شیعہ مذہب کی عمارت بھی زمین بوس ہو جی جارہی ہے، اس کا باطل ہونا
 تو حقیقت ہے ہی اسی کے ساتھ اس کی بنیاد ہی نیست و نابود ہو جی جارہی ہے اگر اہل سنت کے تین اماموں
 پر زور پڑتی ہے تو شیعوں کے تو بارہ امام، با حق سے جارہے ہیں، تین اور بارہ کافر امیر ہے وہ بھی بخوبی
 سمجھتے ہوں گے، جناب امیر تو دونوں فریق کے نزدیک امام و خلیفہ ہیں، باقی سب اگلے پچھلے اس اعزاز
 سے محروم ہوں گے،

(ترجمہ شعر) گو میری توشت خاک ہی برباد ہوئی، مگر خوشی اس کی ہے کہ رقیب تو نہ ارا دگیا،
 اگر وہ نقص کا جواب یہ دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت وقت کے ایک حصہ میں منحصر ہے یعنی
 اپنے عہد امامت میں نہ حضرات حسنین و ائمہ مابعد کے وقت میں، تو ہم اس اتفاق پر ان کو مبارکباد پیش
 کرتے ہیں، ہمارا عقیدہ وہ مذہب بھی تو یہی ہے کہ آپ کی ولایت عامہ ایک محدود وقت کے ساتھ مخصوص

تھی۔ یعنی جب آپ علیہ السلام مقرر ہوئے اس سے پہلے نہیں کہ وہ خلفاء ثلاثہ کا دور تھا، اگر وہ یہ کہیں، کہ جناب امیر خلفاء ثلاثہ کے عہد میں اگر ولایت عامہ سے خالی مانے جائیں تو ان کے لئے ان کی ذات میں نقص لازم آئے گا بخلاف سبطین کی امامت کے وقت کہ اس وقت آپ زندہ ہی نہ تھے، کسی دوسرے کا امام ہونا اس وقت آپ کی ذات میں نقص شمار نہیں ہوگا کیونکہ موت تمام دینی احکام و ذمہ داریوں سے بری الذمہ کر دیتی ہے، تو ہم کہیں گے، یہ ایک دوسرا مستقل استدلال ہوا۔ آیت سے تو استدلال نہ رہا، کیونکہ یہ استدلال مذکور دو مقدمات پر استوار ہے ایک یہ کہ صاحب ولایت عامہ کا کسی دوسرے کی ولایت میں ہونا خواہ کسی وقت میں بھی ہو نقص کا سبب ہے دوسرے یہ کہ صاحب ولایت عامہ میں کسی طرح بھی اور کسی وقت بھی نقص پیدا نہیں ہو سکتا۔ تو یہ دونوں مقدمات آیت سے کہاں سمجھے جاتے ہیں، یہ صمدت اصطلاح مناظرہ میں فرار کہلاتی ہے کہ ایک دلیل کو چھوڑ کر دوسری باجگڑنا، جب کہ پہلی دلیل کے مقدمات کا جھگڑانا اقرار سے نہ اثبات سے ملے ہوا ہو،

اور اگر ہم چھوٹے کو گھٹے تک پہنچانے کی خاطر اس فرار کو نظر انداز کر دیں اور نئے استدلال کے مقدمات کی طرف توجہ دیں تو ہم کہیں گے کہ یہ دونوں مقدمات ہی غلط ہیں، اور یہ استدلال ہی اس وجہ سے باقی نہیں رہتا کہ اس صورت میں حضرات حنفیہ ولایت مستقل سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ جناب امیر کی موجودگی میں ان کی ولایت میں تھے اور پھر خود جناب امیر کی ولایت سے بھی یہ استدلال ختم ہو جاتا ہے، کہ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مستقل ولایت نہیں رکھتے تھے بلکہ حضور کی ولایت کے زیر سایہ تھے، لہذا معلوم ہوا کہ صاحب ولایت کا دوسرے کی ولایت میں کچھ عرصہ کے لئے رہنا نقص نہیں ہے اور اگر نقص ہے تو صاحب ولایت عامہ میں یہ کوئی عیب نہیں ہے تو وہ استدلال ہی مع مقدمات کے غلط ہوا جس کی طرف پھلانگ لگائی تھی

ایک دوسرا جواب جناب شیخ ابراہیم کریمی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اہل سنت نے یہ دیا ہے کہ الذین امنوا میں بوقت خطاب ولایت مراد نہیں کہ خطاب کا زمانہ نبی کا زمانہ اور عہد تھا، اور امامت نبی کے بعد نبی کی نیابت ہے اس کے حین حیات نہیں تو لامحالہ بعد ہی کا زمانہ مراد ہوگا اور بعد کی کوئی حد نہیں، وہ ایک منٹ بعد ہو سکتا ہے تو ایک یا چند سال بھی ہو سکتا ہے، لہذا یہ دلیل بھی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی اور یوں شیعوں کا مدعا امامت بلا فضل فخر بود ہو گیا۔

اور اگر ان کی دلیل کے مقدمات پر تفصیلی نظر ڈالیں تو اجماع مفسرین کا ان کا دعویٰ بھی غلط اور ناقابل تسلیم ہے اس لئے کہ علماء تفسیر تو اس آیت کے نازل ہونے کے سبب میں مختلف رائے ہیں، ابو بکر نقاشی جو ان کے ہاں کی مشہور تفسیر کا مصنف ہے جناب ابو جعفر محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ نزلت فی المهاجرین والذین اتبعوا، یہ آیت ہاجرین و انصار کے بارے میں نازل ہوئی، کسی کہنے والے نے کہا کہ ہم نے تو سنا ہے یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی تو انہیں میں سے تھے، اور یہ روایت الذین اور جمع کے صیغوں یقیناً، یقیناً، وہم، اکون کے بہت مناسب اور موزوں ہے

اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ عکرم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی اور اس آیت کا ربط پچھلی آیت سے جو مرتبین کے قتال کے بارے میں ہے اسی قول کی تائید کرتا ہے،

اب یہ قول کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اتری، اور بجا لکھ کر کوع سائل کو انگوٹھی دینے کا یہ قصہ، تو یہ روایت تنہا ثعلبی نے روایت کی ہے، اور سارے ہی محدثین اس روایت کو رتی بھرا ہیبت نہیں دیتے اور اس کو "حاطب اللیل" کہہ کر پکارتے ہیں، اس لئے کہ اسے خشک و تر میں کوئی تمیز نہیں، غلط سلط سہاوت روایت کر دیتا ہے، یہ تفسیری روایات ثعلبی سے لیتا ہے، ابی صالح کہتا ہے کہ تفسیری روایات میں اس کی روایت سب سے زیادہ درست ہے،

تادمی شمس الدین بن خلکان نے ثعلبی کے حال میں لکھا ہے کہ یہ عبداللہ بن سبا یہودی کے ان ساتھیوں میں سے ہے جو کہتے تھے کہ علی بن ابی طالب مرے نہیں اور وہ دنیا میں پھر آئیں گے، ثعلبی کی بعض روایات کا سلسلہ محمد بن مروان اسدی الضعیف پر ختم ہوتا ہے جو کٹر افضی تھا اور سلسلہ کذب و دمنع کی ایک کڑی کے طور پر جاتا ہے،

باب التفسیر کا مصنف کہتا ہے کہ یہ آیت عبادہ بن الصامت کے حق میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے خلفائے یہود سے بیزاری و نفرت ظاہر کی۔ جب کہ عبداللہ بن ابی (مشہور منافق) نے بیزار کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی حمایت و خیر خواہی پر تیار رہا۔ یہ قول آگے آنیوالی آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الَّذِينَ يَمْشَوْنَ عَلَىٰ مَوَازٍ مُّطْمَئِنِّينَ وَمَا لَهُمْ لَكُمْ أَلَّا يُخَبِّرُوا أَنَّ مَوْزِعَهُمْ يَحْشَوْنَ سے ملتا ہے۔

پھر مفسرین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ جناب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو علماء یہود میں سے تھے جب اسلام لے آئے تو ان کے پورے قبیلے نے ان کا بائیکاٹ کر دیا انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں اس کی اطلاع باس الفاظ فرمائی يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ قَوْمَنَا حَجَرُوا وَخَارُوا اور یا رسول اللہ ہماری قوم نے ہمیں چھوڑ دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور قواعد فن حدیث کی رو سے یہ قول یہ نسبت دوسرے تمام اقوال کے زیادہ صحیح ہے،

آیت مذکورہ بالا متعلقہ امت کے سلسلہ کا دوسری طرح سے جواب یہ ہے کہ لفظ ولی۔ محب نامہ صریح اور صاحب تصرف سب معانی کے لئے آتا ہے اور ان سب میں مشترک ہے اور مشترک لفظ سے کوئی خاص معنی اسی وقت مراد لئے جاسکتے ہیں، جب اس کے لئے کوئی خارجی وجہ موجود ہو۔

اور یہاں اس آیت سے اگلا کلام اس آیت میں نامہ کے معنی کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہ آیت مومنوں کی تسلی، دلی تقویت اور مرتدوں سے ان کے خوف کو دور کرنے کی خاطر نازل ہوئی اور آنے والا کلام محب و صبیق کے معنی کو متعین کرتا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دُونَكُمْ
هَضْرًا وَلَعَلَّكُمْ مِنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ
قَبْلِكُمْ وَالْغَفَارَ أَرْبَابًا

اسے ایمان والوں کو جو تمہارے دین کو مذاق و کھیل
بناتے ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں جن کو تم سے پہلے
کتاب دی گئی یا وہ کافروں دوست مست بناؤ۔

معلوم ہو گیا کہ یہاں اولیاء کے معنی حب و محبت کے متعین ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ اور کافر کو کوئی
مسلمان امام نہیں بناتا اور نہ ہی وہ آپس میں ایک دوسرے کو اپنا امام بناتے ہیں،
پھر کلمہ حصر ائمہ بھی انہیں معنی کو چاہتا ہے، کیونکہ قاعدہ کے مطابق حضرت کی وہی ضرورت پیش
آتی ہے جہاں کسی نزاع، شک اور شرکت کے اعتقاد کا احتمال ہو۔ اس امر پر اجماع ہے کہ اس آیت کے
نازل ہونے کے وقت امامت اور ولایت تصرف کے سلسلہ میں نہ کوئی جھگڑا تھا نہ شک بلکہ نصرت و داد
اور محبت کا مسئلہ درپیش تھا،

تیسرے طریقہ سے جواب یہ ہے کہ اس اصول قاعدہ کے مطابق جو سنی و شیعہ دونوں میں متفق ہے عموم
لفظ کا لحاظ ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں۔ لہذا آیت کا مقصد یہ ہو گا کہ ولایت عامہ چند اشخاص میں منحصر
کر دی جائے اور ان اشخاص میں جناب امیر بھی داخل ہیں، کیونکہ جمع کے صیغے اور کلمہ الذین کے الفاظ عمومی
ہیں یا بقول مرتضیٰ ابن مطہر جو اس بعد اور نہایت دنامی تصنیف میں مذکور ہے۔ الفاظ عمومی کے مساوی
ہیں، ایسی صورت میں جمع کو واحد پر محمول کرنا دشوار ہے اور اسی طرح عام کا خاص پر محمول کرنا خلاف اصل
ہے کہ بغیر ضرورت ایسا نہیں کیا جاسکتا۔

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ یہاں ایسا کرنے کی ضرورت ہے کہ رکوع کی حالت میں سائل کو صدقہ دینے کا واقعہ
ایک شخص سے صادر ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس آیت سے اس قصہ کا پتہ کہاں چلتا ہے جس کی وجہ سے
لفظ کو عموم پر محمول نہ کر سکیں بلکہ وہم، اکعون، ایک عطفی جملہ ہے، جو اگلے جملوں پر معطوف ہے اور محمول
کا صلہ ہے، یعنی الذین ہمد اکعون، یا یقیمون الصلوٰۃ سے حال ہے، ہر صورت یہاں رکوع سے
خشوع مراد سے اصطلاح رکوع نہیں؛

اس پر اگر شیعوں کو یہ اعتراض ہو کہ رکوع سے خشوع مراد لینا خود شارع کے کلام میں لفظ کو غیر شرعی
معنی میں استعمال کرنے کے مرادف ہے جو خلاف اصل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں دوسری
جگہ رکوع، خشوع کے معنی میں آیا ہے، اور استعمال ہوا ہے،

چنانچہ ارشاد ہے۔ وَاسْمُكَ مَعَ الرَّكْعَيْنِ دُرُكُوعُ كَرْنِے وَالْوَلُ كے ساتھ رکوع کر سالانہ یہ بالا جماع
ثابت ہے کہ پہلے کی امتوں کی نماز میں اصطلاحی رکوع موجود نہیں تھا، یا فرمایا فَخَرَّ اِكْفَادًا پیر گر پڑا رکوع کرتے
ہوئے اور ظاہر ہے اصطلاحی رکوع میں خوار و رسقوط نہیں ہوتا اب جب کہ رکوع کے مشہور معنی مجازی
خشوع کے ہونگے تو طے شدہ قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو بلا ضرورت بھی محمول کر سکتے ہیں،

بلکہ ہم تو الٹ کر یہ کہتے ہیں کہ یُوْتُوْنَ السُّكُوتَ سے سائل کو انگشتری صدقہ کر دینے کے معنی سمجھنا
لفظ رکوع کو غیر شرعی معنی پر حمل کرنے کی مانند ہے، اب جو ہم اس کا جواب دو وہی ہمارا جواب بھی رکوع

میں سمجھ لو، علیکم اقامت صلوٰۃ کے بعد رکوع کا ذکر ہمارے خیال کی تائید ہے تاکہ بے جا تکرار لازم نہ آئے، اور صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا ذکر کرنا تمہاری تردید کرتا ہے کہ قرآنی عرت میں جہاں کہیں زکوٰۃ صلوٰۃ سے متصل بیان ہوئی ہے اس سے فرض زکوٰۃ مراد ہوتی ہے نہ کہ مطلقاً صدقہ!

اور اگر رکوع کو اس کے حقیقی معنی پر ہی محمول کریں تب بھی دُنْ یَقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ سے حال واقع ہوگا اور تمام مومنین کو شامل ہوگا۔ اس لئے کہ مومنوں کی نماز کو یہود کی نماز سے جدا کرنا ہے جس میں یہ رکوع نہیں ہوتا اس صورت میں بعد والی آیت میں جو یہود سے ترک موالات کا حکم ہے بہت چسپال ہوتا ہے،

اور اگر یُوْثِقُوْنَ الزَّکٰوۃَ سے حال واقع ہو تو معنی کے لحاظ سے نیز نہ صفت ہوگا نہ تعریف بلکہ یہ یَقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں نفس کا باعث ہوگا اس لئے کہ نماز کا رستہ اور تعریف تو یہ ہے کہ وہ اس عمل سے پاک ہو جس کا تعلق نماز سے نہیں، خواہ وہ عمل قلیل ہو یا کثیر، فرق صرف اتنا ہے کہ عمل قلیل مفسد نماز نہیں جب کہ عمل کثیر مفسد نماز ہے، بہر حال اقامت صلوٰۃ کے معنی میں دونوں ہی صورتیں کسی نہ کسی مقدار کا نقص پیدا کرتے ہیں، اور کلام الہی کو تناقص پر محمول کرنا جائز نہیں۔ اور پھر اسی کے ساتھ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ امامت کی حقیقت میں اس قید کو دخل بھی نہیں۔ کہ جس میں یہ صفت ہو وہ امام ہو اور جس میں نہ ہو وہ قابل امامت نہیں۔

لہذا اگر امامت کے حکم کو اس قید کے ساتھ معلق یا موقوف کیا جائے تو نعوذ باللہ تعالیٰ کا کلام بے کار ثابت ہوگا یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ تمہاری بادشاہت کے قابل وہ شخص ہے جس کے کپڑے سرخ ہوں تو کیا بات ہوئی۔

اور اگر ان سب باتوں کو نظر انداز بھی کریں تو بھی یہ آیت اگر حضرت امیرِ مومنین کی امامت کے حصر کی دلیل ہوگی تو درہی آیات اس کے متعارض ہوں گی، اور شیعوں کو بھی ان معارض آیات سے خلفاء ثلاثہ کی امامت سے بھی استدلال کرنا پڑے گا اور کوئی دلیل قابل استدلال اس وقت ہوتی ہے جب معارضات سے محفوظ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے متعلق آیات اور بیان ہو چکیں،

اور تعجب تو ملا عبد اللہ صاحبِ اظہار الحق پر ہوتا ہے کہ وہ اس گروہ کا کچھ سمجھدار اور پڑھا لکھا لگتا ہے، مگر وہ بھی اس استدلال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بڑی کوشش اور رنگ و دو میں پڑ گیا اور چند بے سرو پایاؤں کے سوا کوئی چر مغز علمی بات نہ لاسکا۔

ہم صرف اس غرض سے کہ اس فرقہ کی ممتاز شخصیات کے مبلغ علمی اور ان کی دانشمندی روشنی میں آجائے ان کی باتیں نقل کرتے ہیں۔ اور جہاں جہاں ان کو غلطی لگی اس کی نشاندہی بھی ساتھ ساتھ کرتے جا رہے ہیں، ایک بات ملا عبد اللہ نے یہ کہی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ محبت اور دوستی کا حکم دجوبی ہے تو جو مومن ان اوصاف سے متصف ہوں ان کے ساتھ بھی محبت و دوستی کا حکم دجوبی ہو جانا چاہیے کیونکہ کلام بھی ایک ہے اور قصہ بھی ایک اور جس کا موضوع ایک ہو، اور محمول بھی ایک اور کئی صورتوں میں ایک دوسرے پر معطوف بھی ہوں تو یہ جائز نہیں کہ ایک جگہ تو حکم کو بطریق دجوب نامیں اور دوسری جگہ بطریق ندب (مستحب) اور ایک لفظ کو ایک ہی استعمال میں دو معنوں کے لئے لینا یہ بھی جائز نہیں، لہذا اس آیت کے مفاد اور مطلب

کے بموجب مومنین متصفین بصفات مذکورہ کی ولایت اور دوستی واجب ہوگی، اور ان کی دوستی مطلقاً بغیر کسی قید و محبت کے ہونے میں خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پر ہوگی، اب اگر مومنین سے سارے مسلمان مراد ہوں اور پوری امت اس اعتبار سے کہ سارے مسلمان ان صفات سے متصف ہو سکتے ہیں، تو یہ ناقابل عمل ہے کیونکہ ہر شخص پر سب سے تعارف ہی دشوار ہے چہ جائیکہ ان سے دوستی رکھنا یہ تو اس سے بھی دشوار تر ہے، پھر بعض وجود سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مومن کی دوسرے مومن کے ساتھ دشمنی مباح ہو جاتی ہے بلکہ واجب لہذا یہاں اس آیت میں مراد حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) ہی ہوں گے، ملاجی کی بات ختم ہوئی،

ان کی اس تحریر میں عقلمندوں کو فٹوڑا سا غور و فکر کرنا پڑے گا، تب ہی اس فرقہ کے علماء کی فہم ملاح کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تمام مومنین کے ساتھ محبت و دوستی بسبب صفت ایمانی کسی قید و محبت سے محض نہیں بلکہ عام ہے، جیسے مولات ایمانی کہتے ہیں، اگر کسی سبب سے عداوت مباح کیا واجب بھی ہو تب بھی مولات ایمانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس معاملہ میں ہم فیصلہ کا حق شیعہ حضرات کو ہی دیتے ہیں وہ بتائیں کہ شیعہ باہم ایک دوسرے سے دوستی اور محبت اتحاد مذہب شیعیت کی ہی وجہ تو رکھتے ہیں اور یہ دوستی کسی قید کے ساتھ مقید بھی نہیں اور نہ کسی محبت سے مخصوص اسی کے ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات میں چچقلش اور عداوت بھی ہو جاتی ہے تو کیا اس وقت محبت مذہبی ختم ہو جاتی ہے یا اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے؟

اور اگر اس آیت کو سمجھنے میں انہیں کوئی مشکل پیش آرہی ہے یا اسے سمجھنا محال خیال کر رہے ہیں تو پورے قرآن سے یہ کیسے چشم پوشی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسری آیت دیکھئے۔

اَلْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ يٰۤاٰمُوْنَ
يٰۤاَلْعَرٰوِفُ وَيَهْمُؤُنَ عِيْنَ الشُّكْرِ وَيَقِيْمُوْنَ اَعْلٰةً
وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوٰةَ وَيُطِيعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلًاۙ اُولٰٓئِكَ
سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ۔

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے باہم دوست ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور منکرات سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں، اللہ عنقریب ان پر رحم فرمائے گا،

اور اگر ایمانی دوستی سب مومنین سے عام اس سے کہ وہ مطیع ہوں یا نافرمان خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پر ہو تو اس میں کوئی عقلی خرابی لازم آتی ہے ہاں خرابی اس وقت ہے کہ یہ تینوں دوستیاں ایک درجہ اور مرتبہ کی ہوں اور جب خدا کی محبت اصل ہوئی اور رسول کی محبت اس کے تابع اور مومنین و عام مسلمانوں کی اس کے تابع تو یہ تینوں محبتیں برابر کب ہوئیں اور موضوع و محمول کے اتحاد کا قضيہ یہاں متحقق نہیں یہ تو ملا جلی کی ایک دھونس ہے جو اہل سنت کے جاہل لوگوں کو ڈرانے اور مرغوب کرنے کے لئے، یہ منطقی اصطلاحی بولنے لگا ہے کہ لوگ اس کو منطقی سمجھ کر اس کے کلام میں رد و قدح کرنے کی حرأت نہ کریں۔

پھر کچھ ہوش آیا تو ”متعدد ہوں“ مگر ایک دوسرے پر معطوف ”کا ٹکڑا رکھا دیا مگر اتنا نہیں سمجھ سکا

اور پھر ان کا اعتراض مولانا علویہ (اولاد علی) سے بھی ٹوٹتا ہے جو ان کے اعتقادات میں داخل ہے کہ چونکہ علوی حضرات اور ان کی گنتی معلوم کرتا جب کہ وہ اکناف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں عام مومنین ہی کی طرح کی شکل سے کم نہیں،

علامہ عبد اللہ کی مندرجہ بالا بات کی طرح ان کی ایک اور بات یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ خود اہل سنت کی بعض امارت سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ آپ اپنا خلیفہ نامزد فرما جائیں چنانچہ مشکوٰۃ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی گئی ہے،

قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَوْ اسْتَحْلَفْتُكَ لَوَسَّيْتُكَ فَيَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ اسْتَحْلَفْتُكَ
عَلَيْكَ فَقَصِّمْهُ لِي عَنْ نَبِيِّكَ وَلَكِنْ مَا حَذَّيْنِي
نَصِيْقَهُ وَمَا أَقْرَأَكُمْ عَبْدُ اللَّهِ فَاَقْرُؤْهُ
سَ وَاءُ التَّرمذی

میں ابو حذیفہ جو حدیث تم کو سنائے اس کو سچ جانو اور جو چیز (جس طرح) تم کو عبد اللہ پڑھائے اسکو پڑھو رواہ الترمذی اس طرح آپ سے اس شخص کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا جو خلافت و امامت کے لائق ہو اس کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنو وہ روایت فرماتے ہیں،

قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ تَوَمَّيْتُ بَعْدَكَ
قَالَ إِنْ تَوَمَّيْتُ وَأَيُّكُمْ تَجِدُ وَكَلَامُنَا إِيَّاهُ
الَّذِي نَاغِبَانِي الْآخِرَةَ وَإِنْ تَوَمَّيْتُ أَعَسَّ تَجِدُ
قَرِيْبًا أَمِينًا لَا يَخْفَى فِي اللَّهِ تَوَمُّدُهُ لَكَ وَإِنْ
تَوَمَّيْتُ عَيْنًا وَلَا أَلْسِنَةً فَاَعْلَيْنِ تَجِدُ وَهَذَا يَأْتِيهِ
يَأْخُذُ بِكُمْ الصَّيْحُ الْمُسْتَقِيمُ سَوَاهُ أَحْمَدُ

تم علی کو امام بناؤ گے، اور میرا خیال ہے تم ایسا نہیں کرو گے تو اس کو ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ پاؤ گے تم کو سیدھے رستے پر لگائے گا۔ رواہ احمد

یہ التماس اور استفسار بتاتا ہے کہ نزول آیت کے وقت موجودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امارات میں تردد موجود تھا تو اس صورت میں انسا کے معنی باطل نہ ہوئے مدت کلام،

یہاں بھی بات غور و فکر کی ہے اس لئے کہ محض سوال و دریافت، تردد کا تقاضہ نہیں کرتا بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سننے کے بعد باہمی مشورہ کرنے اور امیر بنانے میں ایک دوسرے سے مختلف انجیل ہوتے اور نزاع و جھگڑا کرتے قرابتہ انسا کے معنی متحقق ہوتے اس وقت یہ کہہ سکتے تھے کہ ان میں تردد و تشکیک پایا جاتا تھا، صرف التماس و استفسار انسا کی ضرورت نہیں، یہ موقع تواتر کا ہے جیسا کہ علم معانی کے ابتداء میں بحث موکرات اسناد میں اس کا ذکر ہے، کہ ایسے موقع پر ان کا استعمال ہوتا ہے انسا کا نہیں۔ آہ ہے چارے ملاجی، کہ ان کو ابھی تک ان اور انسا میں بھی تمیز کرنا نہ آیا،

اور اگر ان کا دل رکھنے کی خاطر، تردد کی موجودگی مان بھی لیں تو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ یہ تردد نزولِ آیت سے پہلے تھا یا بعد میں پیدا ہوا ہو، اگر پہلے تھا تو متصل تھا یا کچھ فاصلہ ہے، اگر متصل تھا تو یہ اتصال اتفاقی تھا یا یہ واقعہ آیت کے نزول کا سبب بھی تھا، یہ تمام امور سندِ صحیح کے ساتھ منور تشنہ بیان ہیں اور مقامِ استدلال میں خالی خولی احتمالات کی کوئی گنجائش نہیں دوسرے اسبابِ نزول کوئی عقلی امر نہیں، بغیر خبرِ صحیح کے محض احتمالات پر کوئی کیوں کان دھرے ان سے کسی طرح ثبوت فراہم کرے اس کو تو مفسرین ہر دو فرقہ میں سے کسی نے بھی سببِ نزول قرار نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ نزولِ آیت کے متصل نہیں تھا ممکن ہے بعد کا واقعہ ہو بہر صورت یہ ان کے مفید مطلب بالکل نہیں،

اور طرفہ تماشا یہ کہ جو حدیث بیان کی ہے وہ کلمہ اندا کے ساتھ واضح خلاف اور منافات رکھتی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا جواب اس سوال کے ذیل میں ہے کہ لائقِ خلافت و امامت کون ہے اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اشخاص میں سے ہر ایک کو استحقاقِ خلافت ہے لیکن ترتیبِ اسما میں درحقیقت شیخین کو مقدم رکھنے کی طرف اشارہ ہے،

تو اس حدیث میں حضور کے جواب اور سائل کے سوال میں صاف منافات نکلی کیونکہ آیت میں تو اندا خلافت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص کر رہا ہے اب اگر آیت کو حدیث سے مقدم مانیں تو رسول اللہ کا فرمانِ قرآن کے مخالف ہوتا ہے اور اگر آیت حدیث سے بعید ہے تو قرآن سے نبی کریم کے قول کی تردید و تکذیب لازم آتی ہے اور اس بات کی یہاں گنجائش نہیں کہ یہ کہہ دیں کہ ایک نے دوسرے کو منسوخ کر دیا، کیونکہ حدیث و آیت دونوں بابِ اخبار سے ہیں اور اخبار میں نسخ جائز نہیں، اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ چونکہ ان میں سے ایک کا دوسرے پر تقدم و تاخر معلوم نہیں تو منافات کے سبب، ہر دو کا عمل ساقط ہوا۔ اگر وہ یہ کہیں کہ حدیث خبر واحد ہونے کی وجہ سے مسئلہ امامت میں قابلِ تمسک نہیں تو ہم کہیں گے کہ پھر یہ تردد اور اثباتِ نزاع میں بھی قابلِ استدلال نہیں رہے گی،

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ خود آیت کے ساتھ استدلال بھی تردد و نزاع کے ثبوت پر موقوف ہے اور وہ ثبوت ہے نہیں تو شیعوں کا اس آیت سے استدلال بھی غلط ہوا کیونکہ مسئلہ امامت میں ایسی آیت سے بھی استدلال جائز نہیں جس کی خبر واحد پر موقوف ہو،

اور پہلی حدیث میں استخلاف کو امامت کے حق میں ترکِ اصلح فرمایا پس اگر آیت اندا ویکم اللہ استخلاف پر دلالت کرے تو جنابِ الہی سے ترکِ اصلح کا صدور لازم آئے گا، جو محال ہے لہذا پہلی حدیث ان کو منع کرتی ہے کہ اس مسئلہ میں اس آیت سے استدلال نہ کریں،

یہ ان کے چیدہ اور برگزیدہ علماء کی باتیں ہیں کہ علمی جلالِ شان رکھتے ہوئے بھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کہہ سکتے پھر ان کی دوسری پادر ہوا باتیں جو ان کے منہ سے بے سوچے سمجھے نکلتی ہیں ہم نقل کرنے بیچڑ جائیں تو خواہ مخواہ وقت کا ضیاع ہو گا اور بات بے فائدہ ملے گی، ان کے بعض اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ آیت،

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ لَبِیْذُ هَبْ هَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَکَ
اَلنَّبِیْتَ وَیُطْفِرْکُمْ تَطْهِیْرًا۔
اسے اہل بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے نجاست
دور کر کے تم کو پورا پورا پاک کر دے،
کے بارے میں سارے مفسرین متفق القول ہیں کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب اور حضرات حسین رضی اللہ
عنہم کے حق میں نازل ہوئی اور تاکید پہلے کے لحاظ سے ان کی عصمت کا ثبوت دیتی ہے، اور غیر معصوم امام
نہیں ہوتا۔

یہاں بھی مقدمات گڑبڑ ہیں۔ اول تو اجماع مفسرین ان کے اتفاق قول کا دعویٰ ہی غلط ہے، اس لئے
کہ ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے حق میں نازل
ہوئی ہے، اور ابن جریر عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ علی الامان کو صوبہ بازار میں یہ کہتے پھرتے
تھے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے بارے میں اتری ہے، اور سیاق و سباق آیت کے لحاظ سے یہ بات ظاہر
و صیح ہے، کیونکہ لَیْسَ اَمَّا الَّذِیْ کَسَتْکَ کَا حِدٍ مِّنَ النِّسَاءِ سے اظہار بلکہ والحکمۃ تک ازواج مطہرات
ہی سے خطاب ہے اور امر و نہی کا تعلق انہیں سے ہے، تو اب ایک سلسلہ کلام میں دوسروں کا حال لے
آنا اس تنبیہ کے بغیر کہ پہلا کلام ختم دوسرا شروع، طریقہ بلاغت کے خلاف ہے جس سے قرآن مجید کو پاک
جاننا اور ماننا چاہیے پھر بیوتکن کا لفظ بڑھا کر بیوت ازواج مطہرات کی طرف اشارہ کرنا بھی اس پر دلالت
کرنا ہے کہ آیت میں اہل بیت سے ازواج مطہرات ہی مراد ہیں اس
لئے کہ ازواج مطہرات کے بیوت کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کون سا بیت تھا یا ہو سکتا تھا،
ملا عبد اللہ کہتا ہے کہ بیوتکن میں بیوت کو جمع کی صورت میں لانا اور اہل بیت میں واحد کی صورت میں
یہ بتاتا ہے کہ ان کے بیوت ہی بیوت نبوت کے علاوہ ہیں اگر وہ اہل بیت ہوتی تو کلام یوں ہوتا واذکرت
نمایلی فی بیتکن بجائے بیوتکن کے۔

اب ذرا انصاف سے کام لے کر دیکھیں کہ یہ پڑھے لکھے عالم و دانشمند ملاجی کتنی بے مغز اور پوچھ بات
کہہ رہے ہیں۔ اہل بیت میں بیوت کو جو اسم جنس ہے جس کا اطلاق قلیل رکشہ سب پر ہوتا ہے، اس اعتبار
سے کہ اس کی نسبت و اضافت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے موقوف لائے کہ ازواج مطہرات کے سب
گھر اس اضافت کے اعتبار سے ایک گھر کی جگہ ہیں اور بیوتکن میں چونکہ اصافت ازواج مطہرات کی طرف ہے
اور وہ متعدد ہیں، اس اعتبار سے جمع کا صیغہ لائے

اور ملا عبد اللہ نے جو یہ کہا ہے کہ معطوف معطوف علیہ میں فاصلہ لانا اگرچہ طویل ہو کوئی حرج کی بات
نہیں اس لئے کہ اس آیت کریمہ میں یہ واقعہ طبعاً اللہ والترمذی فان توفیاً لئلا علیہ ما حیکل
پھر آیت کے ختم پر فرمایا وَاَقْبُوا الْقُلُوبَ وَاَقْرُوا الزُّكُوةَ مفسرین کا قول ہے کہ اَقْبُوا الْقُلُوبَ کا عطف
اطیعوا الترمذی پر ہے تمت کلامہ

ان کا یہ قول پہلے قول سے بھی زیادہ پچر اور پوچھ ہے اس لئے کہ معطوف علیہ و معطوف میں فاصلہ
ایسے اجنبی امر سے جو غویٰ اغراب کے اعتبار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو بے شک جائز ہے لیکن یہ فاصلہ

ہمارے لئے موجب نقص نہیں اس لئے کہ ہماری بحث کا تعلق اس اجنبیت اور مناسرت میں ہے جو اگلی پچھلی آیات کے موقع و محل کے اعتبار سے پیدا ہوتی ہے اور بلاغت کے خلاف یہ صورت ہے وہ نہیں،

اور یہ بات جو انہوں نے بعض مفسرین کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ اَقْبُوا الصَّلَاةَ طِيعُوا الرَّسُولَ پر معطوف سے صرہ غلط ہے اس لئے کہ اَقْبُوا الصَّلَاةَ کے بعد پھر طِيعُوا الرَّسُولَ آیا ہے، اس صورت میں عطف اشئ علی نفسہ کسی چیز کا عطف خود اسی چیز پر لازم آتا ہے،

اور اس سے بھی زیادہ لچر اور مضحکہ خیز بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ ”آیات میں مناسرت انشائی اور خبری کا ہے“ کیونکہ آیت تطہیر جو جملہ نذائیہ اور خبریہ ہے اور اس کے قبل و بعد امر و نہی ہے۔ یہ انشائیہ ہے اور انشائیہ کا عطف خبریہ پر قطعاً ممنوع ہے۔“

اولیٰ تو آیت تطہیر میں حرف عطف ہے ہی کہاں بلکہ وہ تو اَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ میں جو اطاعت کا امر ہے اس کی علت ہے اور انشائیہ کو خبریہ کی علت ٹھہرانا، پورے قرآن و حدیث اور فہم و بلغاد عرب کے کلام میں مشہور اور رائج ہے مثلاً یہ کہتے ہیں، اَصْحَابُ نَجْدٍ اِنَّهُ فَاَسَقٍ يٰۤاَطْعَنِيْ بِاَعْلٰى هَرَامٍ اَمَّا اِبْرَاهِيْمُ اَنْ اَكْرِمَكَ اور اگر ذاکر کے کا عطف مراد لیتا ہے، تو اس کے معطوف علیہ، اَطْعَن قُرْبَ اور دوسرے سابق مکم ہیں و کہ اَقْتَمَا۔

سب سے ان کے علماء کی عربی و ان کی بول بھی کھل جاتی ہے اور خود صرف میں اتنی واضح کوتاہی کے باوجود چاہتے یہ ہیں کہ کلام اللہ کے مفسرین، شاید خواب میں کسی چوہے کو اونٹ بننے دیکھ لیا ہو گا یا بھدی کی گرہ پا کر پنساری بننے کا خواب دیکھنا چاہتے ہوں گے،

اور عنکد میں مذکر کے صیغہ کا استعمال اھل کے لفظ کے لحاظ سے ہے اہل عرب کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ایسی چیز کو جو حقیقت میں مؤنث ہو مذکر لفظ سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں جیسے قرآن مجید کی اس آیت میں

اَتَعْبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ مَا حَسَدُ اللّٰهِ وَبَسَا كَاتِهٌ
عَلَيْكَمْ اَهْلُ الْبَيْتِ اِنَّهُمْ حَمِيْدٌ رَّحِيْمٌ۔

کیا ہوا بزرگ ہے،

اور ترمذی نیز صحاح کی دوسری کتابوں میں جو یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار افراد کو اپنے کبیل کی شکل میں لے کر یہ دعا فرمائی،

اللّٰهُمَّ هُوَ الَّذِيْ اَهْلُ بَيْتِيْ فَادْهَبْ عَنْهُمْ
الْبَرَحَ وَطَهِّرْهُمْ وَطَهِّرْ لِيْ

اور جب ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اسوقت آئیں اور کہا کہ مجھے بھی ان میں شریک فرمائیے تو آپ نے فرمایا۔ اَنْتِ عَلٰى خَيْرٍ كَاَنْتِ عَلٰى مَا فَدَتْ قَوْمُ مِیْرَی ہوی اور تمہارا تو خدا ایک مقام ہے یہ واقعہ صاف طور پر اس بات کی دلیل کہ آیت تطہیر ازواج مطہرات ہی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور یہ

چار بج چوتھ آپ کے جگر پارے اور عزیز تھے مگر آیت کا مصداق نہ تھے اس لئے آپ نے ان کو بھی اس وعدہ الہی میں شریک کرنے کی خصوصی دعا فرمائی اگر آیت انہیں کے حق میں اتنی ہوتی تو اس انتہام سے دعا کی ضرورت تھی اور ایک حاصل شدہ بات کی خاطر آپ دوبارہ کیوں کوشش فرماتے اور اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اس میں شریک نہیں فرمایا کہ ان کے لئے تو وعدہ الہی نازل ہو چکا تھا اس لئے ان کے حق میں یہ دعا تحصیل حاصل ہوئی،

اور اہل سنت کے محقق علماء کا یہ خیال ہے کہ گویا آیت خطاب تو ازواج مطہرات سے کر رہی ہے لیکن چونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سب کا نہیں اس لئے تمامی اہل بیت اس بشارت میں داخل ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چار افراد کے لئے دعا فرمائی وہ کسی سبب خاص کی بنا پر فرمائی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاق و سباق کلام یا کسی قرینہ سے یہ محسوس فرمایا ہو کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے لئے ہی خاص ہے۔ دیگر اہل بیت اس سے مراد نہیں تو آپ نے خصوصیت کے ساتھ چار اشخاص کے لئے دعا فرمائی۔ اور یہ بھی کی صحیح روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی معاملہ آپ نے اپنے محترم چچا حضرت عباس اور آپ کی اولاد کیلئے بھی فرمایا، یہ بھی نے ابی السید الساعدی سے یہ روایت باہی الفاظ نقل کی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس بن عبد المطلب سے فرمایا اے ابوالفضل کل جب تک میں تمہارے پاس نہ آؤں تم اور تمہارے لڑکے باغے گھر سے نہ جاؤں مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ پس وہ آپ کے منتظر رہے یہاں تک کہ آپ چاشت کے بعد تشریف لے آئے، اور ان کے پاس پہنچ کر السلام علیکم فرمایا ان سب نے جواب میں و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا پھر آپ نے فرمایا صبح کیسی گزری سب نے کہا خدا کا شکر ہے خیریت سے گزری پھر آپ نے فرمایا قریب قریب آ جاؤ وہ سب کھسک کر آپ کے قریب مل جل کر بیٹھ گئے تب آپ نے ان سب کو اپنی چادر مبارک کی بکلی میں لے لیا اور فرمایا اے میرے رب یہ میرے چچا ہیں، میرے باپ کے سگے۔ اور یہ میرے اہل بیت۔ تو ان کو آتش و دوزخ سے اس طرح آڑ میں لے لے جس طرح میں نے ان کو اپنی چادر کی اوٹ میں لے لیا سے راوی کا بیان ہے کہ آپ کی اس دعا پر گھر کے در و دیوار بام و در سب نے تین مرتبہ آواز بلند آمین کہی۔

قَالَ قَالَ، سَلَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَا أَبَا الْفَضْلِ لَا تَزُومَنَّ زُلُمًا أَنْتَ وَبَنُوكَ فَمَا أَجَلْتُمْ أَنْتُمْ فَإِنِّي يَكْفِيكُمْ أَجَلَةً فَإِنَّتُمْ تَعْلَمُونَ حَتَّى جَاءَ بَعْدَ مَا أَفْخَى فَنَخَلَ عَلَيْهِمْ وَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْهِمْ فَقَالُوا وَكَلَامُهُ قَالَ قَالَ كَيْفَ أَصْبَحْتُمْ قَالُوا أَصْبَحْنَا بِخَيْرٍ نَحْمَدُكَ اللَّهُ فَقَالَ لَهُمْ تَعَارَفُوا أَفْتَرَفَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ حَتَّى إِذَا امْتَلَأُوا رَاحُوا عَلَيْهِمْ بِسَلَامٍ ثُمَّ قَالَ يَا رَبِّ هَذَا عَيْنِي وَبَنُو أَبِي وَهُوَ لَدِي أَهْلِي بَلِيغِي أَسْأَلُكَ مِنْ النَّارِ كَسْتَعْرِىَ إِسَاءَةً بِمَلَأَتْ هَذِهِ قَالَتْ غَاثَتْ أَسْكَنَتْ الْبَابَ دَحَا يُطْلُبُ الْبَيْتِ وَقَالَتْ أَمِينُ آمِينَ آمِينَ

ابن ماجہ نے بھی یہ روایت مختصراً اپنے ہاں بیان کی ہے اور دوسرے محدثین نے بھی یہ قصہ متعدد طریقوں سے اعلام النبوة میں روایت کیا ہے۔

”ملا عبد اللہ نے یہ کہا ہے کہ بیت سے مراد بیت نبوت ہے، اور اس میں تو شک نہیں کہ اہل بیت کا لفظ باعتبار لغوی معنی ازواج کو بھی شامل ہے بلکہ اس فرد پر بولا جاتا ہے جو اس گھر میں رہتا جتنا ہو، مثلاً خادم غلام وغیرہ۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ یہ وسیع لغوی معنی مراد نہیں لہذا اس سے مراد محض آل عبا ہوں گے جن کی تخصیص حدیث کسانے کی“

اس کی یہ بات بھی پہلے بیان شدہ باتوں جیسی ہی ہے۔ کیونکہ اس وسیع لغوی معنی کے مراد لینے میں جو بات ان کو لازم آتی ہے، وہ عصمت کی عمومیت ہے اگر یہ سب کو مراد لے لیتے ہیں، تو سب کو ”معصوم“ بھی مانا پڑے کیونکہ وہ اہل بیت کی معصومیت پر اس آیت ہی سے تو استدلال کرتے ہیں،

اور جب اہل سنت شیعوں کے ساتھ اس بات میں متفق نہیں کہ اس آیت سے عصمت سمجھی جاتی ہے اور محض آل عبا۔ اور ازواج مطہرات میں عصمت (معصومیت) کے قائل نہیں، تو اس عمومی معنی مراد لینے میں ان سے کیوں متفق ہونگے یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے وسیع دائرہ کو تنگ کرنا ہوگا،

پھر اگر وہ وسیع لغوی معنی مراد نہ بھی ہوں تب بھی وہ اس لحاظ سے کہ اگلی پچھلی آیات کے قرائن مراد کو متعین کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ باعتبار عرف عقل بھی اس لفظ کو ان لوگوں کے لئے مخصوص کرتی ہے جو گھر میں سکونت پذیر ہوں اور عادیان میں انتقال، تحول اور تبدل کا سلسلہ جاری نہ ہو مثلاً ازواج و اولاد نہ کہ غلام، غلام اور کنیزیں؛ کہ یہ تبدیلی، رد و بدل کا نشانہ بنے رہتے ہیں

خادم نوکری چھوڑ کر دوسرے کے پاس چلا جاسکتا ہے غلام و کنیز کی ملکیت بدل سکتی ہے وہ بیک کر کسی اور مالک کے پاس چلے جاسکتے ہیں، یا بخشش کے طور پر کسی کو دیئے جاسکتے ہیں یا آزاد ہو کر یہ گھر چھوڑ دیتے ہیں، اور حدیث کسا۔ اہل بیت کے ساتھ ان چند اشخاص کو اس وقت مخصوص کرتی جب اس تخصیص کا کوئی اور فائدہ نظر نہ آتا۔ حالانکہ یہاں اس کا دوسرا فائدہ یہ پیش نظر ہے کہ صرف ازواج مطہرات کے مخاطب ہونے کے سبب یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ چند اشخاص اہل بیت میں نہیں۔

کتنی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ پورا عالم اسلام، کیا سنی یا شیعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے ذکر کے وقت ہمیشہ ان کی تعظیمی لقب مطہرات سے یاد کرتا ہے، چنانچہ نور اللہ شوشتری اور ملا عبد اللہ شہیدی اور ان کے دوسرے علمائے تحریروں میں ہزاروں جگہ لکھا دیکھا گیا ہے اور ظاہر ہے یہ لقب اسی آیت تطہیر سے لیا گیا ہے اور لفظ مطہرات بلا ریب و شک اور بے غرضہ ان کے منصف لوگوں کی زبانوں پر جاری ساری رہتا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی ان سے یہ کہدے کہ آیت تطہیر ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طہارت و تطہیر کا پتہ دیر ہی ہے، قرآن کی رگ پھول جاتی ہے، اور لڑاکا مرغ کی طرح دجھت و جلال میں، الجھ پڑتے اور جھگڑنے لگتے ہیں،

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ آیت عصمت پر دلالت کرتی ہے یا نہ، تو یہ چند سمجھوتوں پر مبنی ہے ایک تو یہ کہ کلمہ لَیْذِ هَبْ هُنْکَ الذَّجْسِ ترکیب لغوی میں کیا واقع ہوا ہے۔ آیا یہ میرید کا مفعول ہے یا مفعول بہ دوسرے اہل بیت سے کیا مراد ہے، اور تیسرے رجس سے کیا مراد ہے۔

ان تینوں امور میں بحث و گفتگو کی بڑی گنجائش ہے، اس پر کئی کئی بحثوں کے لئے بڑی بڑی کتب تفاسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، رد و کر کے بعد اگر نتیجہ یہ نکلے کہ بیذہب مفعول بہ ہے اور اہل بیت کا انحصار انہیں چار اشخاص میں ہے۔ اور جس سے مراد مطلق گناہ ہیں۔ پھر بھی اس آیت کی عصمت پر دلالت قابل تسلیم نہیں بلکہ یہ اس وقت بھی عدم عصمت پر ہی دلالت کریگی۔ کیونکہ کسی پاک چیز کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم اس کو پاک کرنا چاہتے ہیں زیادہ سے زیادہ اس ارادہ کے وجود میں آنے کے بعد ان چند اشخاص کا گناہ سے محفوظ رہنا ثابت ہوگا اور یہ حفاظت بھی اہل سنت کے اصول کے ماتحت ہوگی، شیعہ اصول کے بموجب نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ارادہ الہی، مراد الہی کے وقوع کے لئے لازم نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت سی چیزوں کا ارادہ کرتا ہے مگر شیطان یا بنی آدم اس کو وقوع میں نہیں آنے دیتے، اس کی تفصیل باب الہیات میں گزر چکی، اور اگر مقصود الہی عصمت ہی ظاہر کرنا ہوتا تو اس کے لئے یوں عبارت لائی جاتی،

إِنَّ اللَّهَ أَذْهَبَ عَنْكُمْ الشَّيْطَانِيَّ وَطَهَّرَكُمْ تَطْهِيراً اور یہ ایسی صاف و ظاہر بات ہے جسے غبی اور معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے یہ جانیکہ ذکی، اور علامہ:

اور پھر اگر یہ کلمہ عصمت کو ثابت کرنا ہوتا تو پھر تمام صحابہ بالعموم اور اصحاب بدر بالخصوص سب کے سب معصوم ہوتے اس لئے کہ ان کے حق میں تو یہ کلمہ کئی مرتبہ فرمایا گیا ہے، مثلاً۔

وَلَكِنْ يَرْيَدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَيُكَيِّمَ نَفْسَكُمْ عَلَيْكُمْ اور لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر و نعلکم تشکروا۔

وَيَذْهَبُ عَنْكُمْ الشَّيْطَانُ۔ اور دور کر دے تم سے شیطانی گندگی کو۔

ان دو لفظوں سے جن سے عصمت کا اظہار ہوتا ہے ان آیات میں نو صحابہ کے لئے تمام نعمت کی مہربانی و عنایت مزید ثابت ہوگئی کیونکہ تمام نعمت تو اس وقت تک تصور میں بھی نہیں آسکتا جب تک گناہوں اور شر شیطان سے حفاظت نہ کی جائے،

اب وہ تخصیصات جو لفظ تطہیر اور اذہاب رجس سے بطریق احتمال و تشک ثابت کی جا رہی تھیں، کہاں گئیں وہ تو غبار کی طرح ہوا میں اڑ گئیں،

تیسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ غیر معصوم امام نہیں ہوتا ان کا یہ خیال بھی سراسر باطل اور ناقابل تسلیم ہے۔ کتاب اللہ اور عزت رسول درنوں اس کی تردید کرتی ہیں،

پھر اگر اسے مان بھی لیں تو اس دلیل سے جناب علی رضی اللہ عنہ کی صرف امامت ثابت ہوئی لیکن یہ کہ وہ امام بلا فصل تھے یہ کیسے ثابت ہوا۔

کیا یہ جائز ہے کہ سبطین محترمین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی ایک جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عین حیات امام ہو سکتا ہے! اگر نہیں۔ تو اس طرح یہ کیسے جائز و ممکن ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت اگرچہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے بعد ہو مگر وہ ہوں امام بلا فصل، ایسی بات سے استدلال کرنا جس کا کوئی قائل ہی نہ ہو علم و عقل سے عاجزوں کا کام ہے، کیونکہ معتزین کا جب کوئی مذہب نہ ہو تو وہ اعتزائین سے کیسے

بخش دے گا،

ان کے سابقہ سلسلہ کے مسائل میں سے ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے
 - قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْوَدَاعَ فِي
 الْقُبُورِ۔
 آپ کہئے کہ میں تبلیغِ دینِ الہی کے سلسلہ میں بجز
 اپنے قریب داروں سے محبت کے تم سے کوئی بدلہ
 نہیں مانگتا۔

اس وقت سب نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے وہ قریب دار کون ہیں، جن کی محبت ہم
 پر واجب کی گئی ہے، آپ نے فرمایا۔ علی۔ فاطمہ اور ان کے دو بیٹے رضی اللہ عنہم، واضح رہے کہ یہ آیت
 قرآنِ اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ لواصب کے مقابلہ میں اہل بیت کی محبت کو واجب ثابت کرنے کی غرض سے
 پیش کرتے ہیں، چنانچہ علامہ قرطبی اور دوسرے اہل سنت جو شام کے لواصب سے مناظرہ کرتے تھے اس آیت
 کو اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے، شیعوں نے اسے ان کی کتابوں سے چرایا اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم
 کی خلافت کی نفی کی دلیل بنا بیٹھے اور دلیل میں دو تین کلمے اپنی طرف سے بڑھا کر یوں کہنے لگے، کلہل بیت کی محبت
 واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہو اس کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے گویا یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی
 اطاعت واجب ہوئی، اور یہی امام ہونے کے معنی ہیں۔ اور ان کے علاوہ کسی کی محبت واجب نہیں لہذا اطاعت
 بھی واجب نہیں،

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی مراد کیا ہے اس میں مفسرین کا بدست اختلاف ہے طبرانی
 اور امام احمد رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت اسی طرح کی ہے لیکن اکثر محدثین نے
 اس روایت کو کمزور ثابت کیا ہے کیونکہ یہ آیت سورہ شوریٰ کی ہے اور پوری کی پوری سورہ شوریٰ مکی ہے
 جب کہ حضرات حسین کی پیدائش کا تو کیا سوال بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت علی سے منسوب تک نہ
 ہوئی تھیں،

پھر اس سند میں کٹر شیعہ بھی گھسے ہوئے ہیں محدثین میں سے جس نے اس شیعہ کو سچا سمجھا ہو گا وہ اس
 کے ظاہری حالات کو دیکھ کر اور اس کے عقیدہ سے ناواقف ہوئے ہوئے کہا ہو گا اور گمان غالب یہ ہے کہ
 اس شیعہ نے بھی جھوٹ نہیں بولا ہو گا بلکہ روایت بالمعنی کی ہوگی،

حدیث میں لفظ اہل بیتی ہو گا اس نے اپنے عقیدہ کے مطابق اہل بیت کی تشریح انہیں چار سے کڑی
 چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت جوں کی توں بیان کی ہے اس
 کے الفاظ یوں ہیں۔ اَلْقُرْبَىٰ مِنْ بَنِيكَ وَبَنِي اَلْبَيْتِ صَلَّی اللہ علیہ وسلم قَرَابَةً دَقْرَبَىٰ وَہ ہیں جس کے اور نبی صلی اللہ
 علیہ وسلم کے درمیان قرابت ہو،

اور تیارہ، سدی کبیر اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے وثوق سے کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں،
 ”کہ میں تم سے دینی دعوت اور تبلیغ مذہبی کا کوئی صلہ نہیں مانگتا لیکن تم سے اپنے ساتھ رفتی
 چاہتا ہوں اس قرابت کی بنا پر جو تمہارے ساتھ رکھتا ہوں“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بخاری میں یہ روایت تفصیل سے مذکور ہے کہ قریش میں کا کوئی خاندانی سلسلہ ایسا نہ تھا، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قرابت نہ ہو، لہذا آپ نے اس کی یاد دہانی فرمائی اور اس قرابت کے حق کی ادائیگی چاہی کہ کم از کم ایذا رسانی سے تو باز رہیں، جو صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ ہے اس صورت میں یہ استثنا منقطع ہے،

چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ علیہ اور تمام مفسرین متاخرین نے اس معنی کو پسند کیا ہے اس لئے کہ پہلے معنی شان نبوت کے مناسب نہیں یہ تو دنیا داروں کی خصلت ہے کہ جب کوئی کام کرتے ہیں، تو اس کا صلہ اولاد و اقارب کے لئے چاہتے، اگر انبیاء کی بھی یہی روش ہو تو ان کے اور عام دنیا داروں کے مابین فرق و امتیاز کی بارہ جائے اور ہجران کے احوال و افعال میں لوگوں کی شک و شبہ کرنے کا بہانہ بھی ہاتھ آ سکتا تھا، اور یوں بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا،

اور ہجران معنوں کے مطابق یہ آیت بہت سی دوسری آیات کے منافی بھی ہو جاتی جیسے کہ دوسری جگہ ارشاد ہے،

مَا سَأَلَكَ مِنْ آجْرٍ فَهُوَ لَكَ مِنْ آخِرَتِي
أَرَى عَلَى اللَّهِ -
أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْكُمْ مَغْرُوبٌ
مُتَّفِقُونَ -

جو احسب میں تم سے چاہوں وہ تمہارے لئے
میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے،
کیا تم ان سے اجر مانو گے یہ تو آپ ہی ٹوٹے سے
بو جھل ہو رہے ہیں،

اور سورہ شعراء میں تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے اجرت طلبی سے انکار نقل فرمایا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو افضل الانبیاء ہیں، کب اجر طلب فرما سکتے تھے کیا اس صورت میں آپ کا مقام ان انبیاء اکرام سے نیچا نہ ہو جاتا۔ حالانکہ ایسا ہونا خلاف اجماع ہے،

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ مفروضہ تسلیم نہیں کرتے کہ جو واجب المجتہد ہو وہ واجب الطاعت بھی ہو اور نہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو واجب الطاعت ہو وہ امام یعنی رئیس عام بھی ہو،

پہلی صورت کی یہ دلیل ہے کہ اگر محبت کا واجب ہونا اطاعت کے واجب ہونے کو لازم ہوتا تو یہ ضروری ہوتا کہ تمام علوی حضرات واجب الطاعت ہوں اس لئے کہ شیخ بابویہ نے اپنی کتاب الاعتقاد میں لکھا ہے کہ باجماع امامیہ علوی کی محبت واجب ہے،

اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس دلیل کی بنا پر بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا بھی امام ہوں حالانکہ یہ خلاف اجماع ہے، اور اس کی بنا پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ چاروں حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جیات مبارکہ میں بھی امام ہوں اسی طرح جناب حسنین رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی امام ہوں حالانکہ یہ صورت بالاتفاق غلط اور باطل ہے،

دوسری صورت یہ کہ اگر سر واجب الطاعت خلافت کبریٰ کا مالک ہے تو ہر نبی کو بھی خلافت کبریٰ کا مالک ہونا چاہیئے۔ حالانکہ یہ غلط ہے اس لئے کہ مثلاً حضرت شمس بنی واجب الطاعت تھے، اور حضرت طاوت

خلافت کبریٰ کے مالک۔ خود قرآن ارشاد میں فرمایا ہے،

إِنَّ اللَّهَ كَذَّبَتْ لَكُمْ طَاوُتَ مَدِكَ - اللہ تعالیٰ نے طاووت کو تمہارا بادشاہ کر کے بھیجا۔

ہماری طرف سے ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ محبت صرف ان ہی چار حضرات کی واجب ہے بلکہ دوسرے بھی اس میں شریک ہیں، چنانچہ حافظ ابوطاہر سلفی نے اپنی مشیخت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُبُّ أَبِي بَكْرٍ وَشُكْرُهُ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ أُمَّتٍ - ابو بکر و رضی اللہ عنہ کی محبت اور ان کا شکر یہ میری ساری امت پر واجب ہے،

ابن عساکر نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابوطاہر سلفی جیسی روایت نقل کی ہے، اور ایک دوسرے طریقہ سے سہل بن سعد ساعدی سے یہ روایت مروی ہے، اور حافظ عمر بن محمد خفضر المصنف اپنی سیرت میں یوں روایت کرتا ہے،

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى فَرَمَ عَلَيْكُمْ حُبَّ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ كَمَا فَرَمَ عَلَيْكُمْ السَّجْدَةَ وَالزَّكَاةَ وَالصَّوْمَ وَالْحَجَّ - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ابو بکر، عمر، عثمان، اور علی رضی اللہ عنہم کی محبت اسی طرح فرض کی ہے جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تم پر فرض کئے،

ابن عدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ حُبُّ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ إِيْمَانٌ وَبُغْضُهُمَا إِفْكَارٌ - ابوراحمہ نے فرمایا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض کفر ہے،

اور ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حُبُّ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ مِنَ الْإِيْمَانِ وَبُغْضُهُمَا كُفْرٌ - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان کا جز ہے اور ان سے بغض کفر ہے،

اور ترمذی نے روایت کی،

أَنَّهُ أَتَى بِجَنَانَةٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا بَصَلَ عَلَيْهِ وَقَالَ إِنَّكَ كَانَتْ تُبْغِضُ عُثْمَانَ فَأَبْغَضَهُ اللَّهُ - ایک جنازہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا آپ نے اس کی نماز نہیں پڑھی اور یہ فرمایا یہ عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا تو اللہ نے بھی اس سے بغض رکھا

یہ روایات اگرچہ اہل سنت کی کتابوں سے مذکور ہیں لیکن چونکہ شیعہ اہل سنت کو الزام دینا چاہتے ہیں، اس لئے اس سلسلہ کی تمام روایات کو پیش نظر رکھے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اپنے مطلب کی ایک آدھ روایت سنا دینے سے وہ دھوش میں نہیں آسکتے،

اور اگر شیعہ اہل سنت کو تنگ کرنے سے باز نہ آئیں تو کتاب اللہ اور عزت رسول کے اقوال سے بھی ان کو جواب دے کر ان کا منہ بند کیا جاسکتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا بجمہد و یجہدہ - یہ بالا جماع مرتبین سے لڑنے والوں کے حق میں ہے اور دنیا جاتی ہے کہ غلامی کرام ان کے سرگروہ تھے اور اللہ تعالیٰ جس سے دوستی رکھے وہ واجب المحبت ہر ساری طرح اور بھی آیات ہیں،

خلافت بلا فصل کے سلسلہ میں ان کی طرف سے آیت مباہلہ بھی پیش کی گئی ہے،
قُلْ تَعَالَوْا اَنْدَحْ اَبْنَاءَنَا وَابْنَاتَنَا كَسَدَ وَنِسَانَا
وَفِیْہَا كَسَدٌ وَنَفْسَانَا وَافْئُكُمُ الْخ

شیعہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لئے گھر سے نکلے اور علیؓ، فاطمہؓ، اور حسینؓ کو ساتھ لیا تو معلوم ہوا کہ انبیاء سے مراد حضرت حسن حسین رضی اللہ عنہما اور انفس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، گویا جناب امیر نسی رسول بھیڑے اور یہ تو ظاہر ہے کہ نفس کے حقیقی معنی مراد لینا تو محال ہے، لامحالہ مساوی کے معنی ہوں گے اب جو مساوی رسول ہو تو رہے یقیناً دوسروں سے افضل اور اول بالتصرف ہوگا اس لئے کہ افضل و اولیٰ بالتصرف کا مساوی بھی افضل و اولیٰ بالتصرف ہوگا تو وہ امام ہوگا کیونکہ امام وہی تو ہے جو افضل و اولیٰ بالتصرف ہو۔ تک سب سے درست اور نظم و ترتیب کے ساتھ دلیل کی یہ تقریر ہمارے فطوں میں ہے خود شیعہ علماء میں اتنا سلیقہ بھی نہیں کہ وہ اپنا مافی الضمیر قاعدہ مضابطہ میں پیش کر سکیں دراصل ان پر اس کتاب کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان کی اکثریہ ترتیب، غیر منظم و سیو کو مناسب ترتیب اور دل آویز تقریر سے آراستہ و پیراستہ کیا اگر کسی کو ہماری یہ بات ماننے میں تامل ہو تو وہ ان کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھ لے۔ کہ ان کا کلام کس قدر پیرا کنڈہ، بے ربط و بے جوڑ ہے یہاں تک کہ وہ اپنا مطلب بھی واضح نہ کر سکے۔

یہ آیت بھی دراصل اہل سنت کی دلیل ہے جس سے انہوں نے فواہب کے مقابلہ میں استدلال کیا سب استدلالی تو ظاہر ہے کہ جناب امیر اور دیگر افراد کو بوقت مباہلہ ساتھ لے جانا کسی وجہ اور سبب ترجیح پر مبنی ہے اور وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ ان حضرات کو عزیز و پیارا جانتے تھے مقصد یہ تھا کہ جب ان کو مباہلہ کے وقت جو بظاہر خطرہ ہلاکت سے غالی نہ تھا، لے آئیں گے تو مخالف کو آپ کی نبوت کی صداقت پر پورا وثوق اور اعتماد پیدا ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں جس کی آپ خبر دے رہے ہیں ہرگز شک نہ کریں گے کیونکہ کوئی بھی عقلمند جب تک اپنے دعویٰ کی سچائی پر پورا یقین رکھتا ہو خود کو اور اپنے پیاروں کو معصوم ہلاکت میں نہیں ڈال کرنا۔ نہ اس پر قسم کھاتا ہے۔
اکثر اہل سنت و شیعہوں نے یہ وجہ پسند کی ہے۔ اور ملا عبد اللہ نے اظہار الحق میں اس کو پسند کر کے ترجیح دی ہے،

اس بنا پر اس آیت سے ان حضرات کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عزیز و محبوب ہونا ثابت ہوگا چونکہ پیغمبر حب و بغض نفسانی سے پاک ہوتا ہے اس لئے لامحالہ ان سے محبت دین، تقویٰ و صلاح پر مبنی ہوگی تو ان حضرات میں یہ صفات ثابت ہوئیں اور چونکہ فواہب کا مذہب اس کے خلاف ہے اس

کے خلاف ہے، اس لئے یہ آیت ان کے مقابلہ میں کارآمد و مفید رہی۔

یا ان حضرات کو اپنے ساتھ لے جانے کی وجہ و مقصد یہ تھا، کہ یہ حضرات بھی نجران کے کافروں پر بددعا میں شریک ہو جائیں۔ اور آپ کی بددعا پر آمین کہیں۔ کہ ان کی آمین کے سبب جلد درجہ قبولیت کو پہنچے، اکثر شیعہوں نے یہ احتمال اور وجہ بیان کی ہے، ملا عبد اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اس صورت میں بھی ان بزرگوں کے دینی مرتبہ کی بلندی اور ان کا مستجاب الدعوات ہونا ثابت ہوتا ہے، اور نواصب کے مقابلہ میں یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

نواصب نے دونوں وجوہ پر رد و قرح کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان حضرات کو اپنے ہمراہ لے جانا نہ وجہ اول کی بنا پر تھا نہ وجہ ثانی کی بنا پر بلکہ مخالف کے لئے الزامی پہلو نظر تھا، کیونکہ کفار کے نزدیک یہ تسلیم شدہ اور ثابت شدہ امر تھا کہ جب تک قسم کے وقت اولاد و داماد کو حاضر نہ کرتیں اور ان کی ہلاکی پر قسم نہ کھائیں قسم مستبر نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بغیر الزام ہی صورت اختیار فرمائی اور ظاہر ہے کہ اولاد و اقارب کیسے بھی ہوں بہر حال لوگوں کے خیال میں غیروں سے زیادہ عزیز و پیارے ہوتے ہیں گو اس شخص کی نظر میں وہ ایسے نہ ہوں۔

ہماری طرف سے شیعہوں کے استدلال کے سلسلہ میں یہ جواب ہے کہ اس طرح مباہلہ کرنا اور اولاد کی قسم کھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسلم نہ تھا اگر ہوتا تو شریعت میں ایسی قسم آئی ہوتی حالانکہ شریعت میں تو اس پر مانعت وارد ہوئی، یعنی اولاد کو حاضر کر کے قسم نہ کھائیں نتیجہ یہ نکلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ مخالف کو خاموشی اور لاجواب کرنے کے لئے کیا،

اسی طرح دوسری وجہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ نجرانی وفد کی ہلاکی و تباہی کوئی بڑی اہم بات نہ تھی نہ کوئی سنگین امر تھا، اس سے زیادہ اور سخت تر حوادث سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوچار ہوئے مصائب و دکھ جھیلے مگر کبھی بھی ان پیاروں سے دعائیں مدد کے خواستگار نہ ہوئے،

اور یہ متفق علیہ امر ہے کہ کفار کے ساتھ مقابلے اور معارضہ میں پیغمبر کی دعا مقبول ہوتی ہے ورنہ تو پھر پیغمبر کی تکذیب لازم آتی ہے اور بعثت کی غرض فوت ہوتی ہے اور پیغمبر کو خود اپنی دعا کے قبول ہونے میں کس طرح شک لاحق ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کی آمین کی مدد لیتے۔ لہذا یہ وجہ بھی باطل و ناسد و غلط ثابت ہوئی،

اس موقع پر اس بحث کو طول دینا نامناسب سمجھتے ہوئے اسے یہیں ختم کرتے ہیں حاصل بحث یہ ہے کہ ثبوت دعا کے لئے دراصل یہی آیت دلیل ہے شیعہ ازراہ تعصب حواہ محواہ اہل سنت کے مقابلہ میں یہ دلیل پیش کر بیٹھے۔

شیعوں کے اس آیت سے استدلال میں بہت سی خامیاں اور قابل گرفت باتیں پائی جاتی ہیں، اول یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ انفسا سے مراد جناب امیر ہیں، بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس مراد ہیں،

اس قول کو غلط ثابت کرنے کے لئے علماء شیعہ نے یہ احتمال و شبہ بیان کیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہیں بلایا کرتا ان کی یہ بات تو اس گاؤں کی بات کی طرح ہے کہ کسی گاؤں سے چلا آ رہا تھا کہ کسی عالم نے پوچھا کہ میاں یہ تو بتاؤ کہ کیا اس گاؤں میں ہل بھی چلانے یا ہل بھی گھومتے ہیں، تو وہ کہنے لگا، ارے بھائی کچھ سوچ کے تو بات کر ہل کو نہ وہ چلاتے ہیں نہ وہ چلتے ہیں، جیلوں کو چلاتے ہیں اور وہی چلتے ہیں،

پھر عرف قسیم و مدیر میں یہ محاورات ہمیشہ استعمال میں آتے رہتے ہیں،
 ذَعَتْهُ نَفْسُهُ إِلَى كَذِّ ادْعَوْتَ نَفْسِي
 اس کے نفس نے اس کو اس طرف بلایا میں نے
 اپنے نفس کو اس طرف بلایا۔

یا قرآن مجید کی یہ آیت،

فَطَوَّعَتْ لَهَا نَفْسُهَا قَتْلَ أَخِيهِ -
 کے قتل کی۔

رغبت دلائی اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی

یہ بھی بولتے ہیں اَمَرْتُ نَفْسِي - میں نے اپنے نفس کو حکم دیا یا۔ شَاوَرْتُ نَفْسِي میں نے اپنے نفس سے مشورہ کیا۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے استعمالات فصحاء کے کلام میں پائے جاتے ہیں پس نَذَرُ اَنْفُسَا کے حاصل معنی تَخَضُّعُ اَنْفُسَا کے ہوئے یعنی حاضر کونیں ہم اپنے نفسوں کو،

پھر ایک قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کے انفسا سے جناب امیر مراد ہوں تو کفار کی جانب کے انفسکد کا مصداق کون ہوگا، حالانکہ نعت میں بحیثیت فریق ثنائی وہ بھی شریک ہیں، اور یہ معنی ہونے کے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اور ان کے بیٹوں کو بلائیں۔ جب کہ آپ تعادلوں فرما چکے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ جناب امیر، حضرات حسنین (رضی اللہ عنہم) کی طرح ابناء نامی حکماء حقیقہ و اعلیٰ ہیں، اور عرف میں داماد کو بیٹا ہی شمار کیا جاتا ہے،

اور نفس، قریب، شریک نسب دین و ملت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ آیا ہے مِجْرِبُونَ اَنْفُسَهُمْ مِثْلَ دِيَارِهِمْ نکالتے ہیں وہ اپنے نفسوں کو شریک مذنب لوگوں کو، اپنے یا۔ وَ لَا تَلْبِسُوا اَلْفُسْكَد - مت نام دھرو اپنے نفسوں کا اپنے شریک دین بھائیوں کا،
 یا۔ وَ كَذَلَا اِذْ سَمِعْتُمُوهُ فَلْيَكْفُرُوا مَنَوْتِ
 جب یہ بات مرسوں اور مومنات نے سنی تھی تو اپنے نفسوں کے ساتھ گمان نیک کیوں نہیں کیا ہم ملت افراد کے ساتھ،

لہذا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتصال نسبی، قرابتی اور مصاہرت حاصل تھا اور اتحاد دینی، ملی، و ہم صحبتی اس قدر زیادہ حاصل تھا کہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے حق میں یہ تنگ فرمایا علی منی وانا من علی۔ تو آپ کو نفس سے تعبیر کیا تو یہ کون اچھے کی بات ہے اور اس سے مساوات کب لازم آتی ہے، جیسی آیات بالا میں نہیں آتی،

دوسرے یہ بات بھی ہے کہ اگر تمام صفات میں مساوات مراد ہیں تو ضروری ہے کہ جناب امیر خاتم النبیین

خصوصیات میں بھی آپ کے شریک ہوں۔ مثلاً نبوت رسالت غایتیت تمام مخلوق کی طرت بشت چارہ یوں سے زائد نکاح کا جواز قیامت کے دن ارفع و اعلیٰ درجہ پر فائز ہونا، شفاعت کبریٰ کا حصول مقام محمود کا حصول وحی کا نزول وغیرہ وغیرہ حالانکہ ان اوصاف میں، شرکت بالاجماع باطل ہے، اور اگر بعض اوصاف میں مساوات مراد لیں تو اس سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ افضل و اولیٰ بالتصرف کے ساتھ بعض صفات میں مساوات افضل و اولیٰ بالتصرف نہیں باقی، ظاہر بات ہے،

اور اس آیت کو امامت کی دلیل ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کے معین حیات بھی امام ہوں، اور یہ بات بالاتفاق غلط ہے، اور اگر کسی خاص وقت کی قید لگائیں، کہ اس وقت نہیں اس وقت، تو اگرچہ اس پر بھی کوئی لفظی دلیل آیت میں نہیں مگر پھر بھی مدعا ثابت نہیں ہوگا کیونکہ کسی نہ کسی وقت کی خلافت و امامت تو اہل سنت بھی مانتے اور ثابت کرتے ہیں، ان کا مدعا بلا فصل تو ثابت نہ ہوا۔

ان کی ایک اور دلیل یہ آیت ہے،

إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَبِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ البتہ آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر ایک قوم کے

لئے ایک ہدایت دینے والا ہے،

اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک متفق علیہ روایت ان الفاظ میں منقول ہے،
عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ أَنَا
الْمُنذِرُ وَعَلَى الْإِهَادِ جِي
بنی کریم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا میں ڈرانے

یہ روایت بسلسلہ تفسیر تعلیمی کی روایت ہے اور اس کی سرودیات ساری ہی درجہ اعتبار سے گری ہوئی ہیں، اور یہ آیت بھی انہیں دلائل میں سے ایک ہے جو اہل سنت نے فواہب کی تردید میں بیان کئے ہیں، یہ آیت نہ اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہے اور نہ دوسروں کی امامت سے انکار پر اس لئے کہ کسی کا ہادی ہونا اس کے امام ہونے کا ہرگز متقاضی نہیں۔ اور نہ ہی دوسرے کی ہدایت کی نفی کو مستلزم اور اگر صرف ہدایت امامت پر دلالت کرے تو یہ اصطلاحی امامت ہوگی جو اہل سنت کے ہاں پیشوائے دین کے معنوں میں مستعمل ہے اس میں کوئی جھگڑا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد۔

وَجَعَلْنَا هُمُ أَوَّلَ قَوْمٍ يَهْدِيهِمْ بِأَمْرِنَا
لَمَّا صَبَرُوا۔ ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہماری احکام کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں جب انہوں نے صبر کیا۔

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَ
يَاْمُرُونَ بِالْعُودِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے اچھی باتوں کا حکم کرے اور برائیوں سے روکے

اسی قسم کی اور بھی آیات اس سلسلہ کی موجود ہیں،

ان کے دلائل میں کی ایک دلیل یہ آیت ہے وَتَقُودُهُمْ أَتْلَهُمْ مَسْئُودُونَ انہیں روکے رکھو ان سے

پوچھ پچھ پانچ ہوگی۔

اس کے بارے میں یہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ انہوں

نے کہا وَفَعَلُوهُ هَذَا أَفَلَمْ يَسْأَلُوا عَنْ وَلَا يَكُونُوا عَلَىٰ أَمْرٍ آتِيٍّ طَالِبٍ،

در اصل یہ تمسک تو پھر روایت سے ہوا۔ آیت سے تو نہیں ہوا اور ان کی روایات کا جو حال ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اہل سنت کے نزدیک سب بے اعتبار ہیں، خصوصاً یہ روایت جو مسند فردوس دہلی میں بیان کی گئی ہے اور یہ وہ کتاب ہے جو خصوصیت کے ساتھ ضعیف اور بے اصل روایت سے بھری ہوئی ہے اور پھر یہ یہ روایت کہ اس کی سند میں تو خاص طور پر ضعیف اور مبہول الحال راوی ہی بھرے ہوئے ہیں جو سرگزشتی دہلی میں بھی ناسل حجت نہیں اور اصول مسائل میں تو بالکل بھی نہیں،

اور پھر قرآن کا نظم بھی اس روایت کی تخریب کرتا ہے کیونکہ اس میں مشرکین کے حق میں خطاب ہے، وَمَا يُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ اور مشرکین سے یہاں سوال تو مشرک اور غیر اللہ کی عبادت کے بارے میں ہو گا۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ولایت سے نہیں ہو گا نظم قرآنی دلالت کرتا ہے کہ مَا لَكُمْ لَدُنَّا مَا فَعَلْتُمْ دُنَيْهِمْ کیا ہو گیا کہ مدد نہیں کرتے؟ اس سوال اس جملہ استفہامیہ کے مصنون سے ہے، جو محض ڈانٹ ڈپٹ اور غیرت دلانے کی غرض سے ہے، کسی اور مقصد سے نہیں اس لئے عالمان قرأت کا اس پر اجماع ہے کہ آیت نکاح کے وقت مسؤلون پر وقت نہ کیا جائے،

پھر اگر روایت کو صمیم بھی مان لیا جائے اور نظم قرآنی میں بے ربطی کا سوال نہ بھی اٹھایا تب بھی ولایت سے مراد محبت ہو گی۔ ریاست گبرنی تو اس صورت میں مراد نہیں ہو گی جو عمل نزاع ہے اور جلودہ ہی مراد لے لیں تب بھی مفید مقصد نہیں کیونکہ آیت اپنے مصنون کے لحاظ سے اس عقیدہ کو واجب کرتی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت امام ہیں، اور بالکل ہی عقیدہ اہل سنت کا ہے،

دوسری نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ عَنْ وَلَا يَكُونُوا عَلَىٰ وَاحِلِ الْبَيْتِ ظاہر ہے سارے کے سارے اہل بیت تو امام نہیں تھے، شیعہ بھی اس کے قائل نہیں، ایسی صورت میں تو ولایت کو محبت پر محمول کرنا یقینی ہو گیا۔ اس لئے کہ ولایت ایک مشترک لفظ ہے اور خارجی قرائن اور اندازوں سے اس کے ایک معنی متعین ہو گئے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی محبت اور نفس امامت کا جہاں تک تعلق ہے سب اس پر متفق انجیال و عقیدہ ہیں، اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ ہے، بحث تو دراصل جناب امیرؑ کے خلیفہ بلا فضل ہونے میں تھی اور یہ بات کہ آپ کے علاوہ کوئی اور صحابی مستحق امامت نہیں اس آیت کا اس موضوع سے کوئی تعلق سرے سے ہی نہیں ہے،

موضوع بالا کے سلسلہ کی ایک یہ آیت بھی یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ الْمُقَدَّمُونَ پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں وہی مقرب ہیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے،

أَمَّا قَالَ السَّابِقُونَ ثَلَاثَةٌ فَالسَّابِقُ الْأَمْرُ انہوں نے کہا سابق تین ہیں، موسیٰ علیہ السلام کی نسبت

موسىٰ عليه السلام يَوْمَ شَعْرٍ يَوْمَ نُوحٍ وَالسَّابِقُ سے یوشع بن نون اور عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے

إِلَىٰ جَبَلٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا جَبَّ لَيْسَ وَالسَّابِقِ
إِلَىٰ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَىٰ ابْنِ أَبِي
طَالِبٍ -
صاحبِ یسین اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
کے لحاظ سے جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما

پہلی بات تربیہ کہ استدلال بھی حدیث سے ہوا آیت قرآنی سے نہیں، یہ حدیث طبرانی اور مردویہ کے
نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور دہلی کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما
سے لیکن سندوں کا مدار ابوالحسن اشعری پر ہے جو بالاجماع ضعیف ہے عقیل نے کہا ہے کہ وہ شیعہ ہے جس کی
روایت ناقابلِ قبول ہے اور یہ حدیث منکر ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں بلکہ اس میں بناوٹی اور گھڑی ہوئی ہونے
کی علامات پائی جاتی ہیں، اس لئے کہ صاحبِ یسین حضرت عبید اللہ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہے
بلکہ آپ کے رسولوں (نقادوں) پر اول ایمان لانے والوں میں سے ہے جس کا پتہ نص سے چلتا ہے،
اب جو حدیث اخبار و قصص میں مدلولِ کتاب سے متناقض و خلاف ہو اور اس سے ٹکرائے وہ محدثین کے
طے شدہ اصولوں کے اعتبار سے موندوغ اور گھڑی ہوئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ سابق کا انحصار صرف تین میں خلافِ عقل ہے، کیونکہ سہری کا کوئی نہ کوئی ایک سابق ہوگا
اور پھر روکد، یہ کیا ضروری ہے کہ سہری کا سابق ریاستِ عظمیٰ کا مالک ہو، اور مقربِ امامت کا مستحق قرار پائے
اور پھر اگر روایت صحیح بھی قرار پائے تو یہ صریح آیت کے متناقض ثابت ہوتی ہے، کیونکہ انہیں سابقین کے
متعلق فرمایا ہے،

ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَ قَلِيلٌ مِنَ الْآخِرِينَ
ثَلَاثَةٌ جمع کثیر کے معنی میں بولا جاتا ہے جو دو آدمیوں پر نہیں بولا جاتا اسی طرح ایک کو قلیل نہیں کہہ سکتے
نتیجہ ظاہر ہے کہ آیت میں سبق (پہلے) حقیقی مراد نہیں بلکہ سبقِ عربی یا اضافی مراد ہے، جو جماعت کثیر کو شامل
ہے اس کی دلیل ایک دوسری آیت ہے

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ
اور سابقین اولین مہاجرین و انصار سے۔
اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے قاعدہ معروف و مشہور ہے!

پھر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ شیعہ اور سنیوں دونوں کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ سب
سے پہلے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اسلام لائیں۔ اور اگر ایمان میں سبقت ہی امامت کے لئے کافی ہے
تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ وہ بھی امامت کے قابل ہوں اور یہ بات بالاجماع غلط ہے اگر یہ کہا جائے کہ وہ عورت
ہیں، تو ہم کہیں گے کہ جنابِ امیرِ رضی اللہ عنہ کی امامت میں بھی کوئی مانع ہوا ہوگا اور وہ ان کی امامت کے
وقت کا ابھی نہ آنا تھا جب یہ مانع نہ رہا تو امام آپ ہو گئے اور وہ مانع خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم ہیں دکران
کا زمانہ پہلے تھا، اور جو آپ کی نسبت جمہورِ اہل سنت کے نزدیک (اصلی تھے) یا خلفاء ثلاثہ کے بعد آپ کا باقی
رہنا۔ اور ان حضرات کی موت آپ سے پہلے ہوئی۔ یہ تو جمیع تفضیلیہ کی ہے اس لئے کہ وہ کہتے ہیں،
لَوْ كَانَ إِلَّا مَا عِنْدَ وَفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت امام

وَسَلَّمَ لَكُمْ يَسْلُ أَحَدٌ مِنَ الْخُلَفَاءِ إِذْ مَا مَاتَ
وَمَا تَوَاتَرَتْ فِي عَهْدِهِ وَقَدْ سَبَقَ فِي عِلْمِهِ اللَّهُ
أَنَّ الْخُلَفَاءَ أَرْبَعَةٌ فَلَوْلَا تَرْتِيبُ عَلَى الْمَوْتِ
لازم ہوتی،

ماصل گفتگو یہ ہے کہ آیات قرآنیہ سے شیعوں کے سارے کے سارے منکالات اور استدلالات ایسے ہی اونٹے بونٹے ہیں۔ اور کتاب الغین کا مصنف بھی اسی طرح کی بہت سی آیات اپنے مدعا کی تائید بیان کرتا ہے یہ قرآن کے چیدہ اور برگزیدہ اہل علم کا حال ہے باقی کا جو حال ہوگا اس کا ان پر قیاس کیا جاتا ہے قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

ان کے دعویٰ اور تقریرات کا اصول کلی یہ ہے کہ آیات پر ان کے استدلالات اس وقت تک پورے نہیں اترتے اور نہ احتمالات اور شکوک دور ہوتے ہیں جب تک ان کی گھڑی ہوئی، بناوٹی ناقابل تسلیم ناقابل عمل اور مردود روایات کو بطور لاحقہ ان کے سامنے شائع نہ کریں،

اس لئے ان کے استدلالات میں کوئی علمی لطیفہ یا دلچسپی بھی نہیں ہوتی لیکن چونکہ ان کی چشم بصیرت پر تعصب کا گہرا اور دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، اس لئے ان کی اچھے اور بُرے میں تمیز کی حس ہی رہ گئی ان کو تو اپنی من گھڑت اور بناوٹی باتیں ہی دنیا جہاں کے علوم اور باتوں سے اچھی معلوم ہوتی ہیں آیات کا معاملہ تو آپ نے مل حفظ فرمایا اب وہ احادیث مل حفظ فرمائے جو یہ اپنے مدعا و مقصد کے حاصل کرنے میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں، اور ایسی احادیث کی تعداد کل بارہ ہے۔

(۱) ان میں سے پہلی حدیث غدیر خم ہے کہ ان کی کتابوں میں جس کا ذکر بڑے دھوم دھڑکے اور ان بان سے آتا ہے اور یہ بزم غم خود اس کو اپنے مدعا کے لئے نص قطعی خیال کرتے ہیں، اس کا حال یہ ہے کہ ہدایت برید بن الحبیب اسمی حجة الوداع سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب غدیر خم نامی ایک مقام پر جو مکہ و مدینہ کے درمیان پڑتا ہے فروکش ہوئے، تو آپ نے شریک سفر ساقیوں کو اپنے پاس بلا یا اور ان الفاظ میں ان کو خطاب فرمایا۔

يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ اَلَسْتُ اَعْلَىٰ بِكُمْ مِنْ نَفْسِكُمْ
قَالُوْا بَلَىٰ. قَالَ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاكَ فَقُلِيْ مَوْلَاكَ
اَللّٰهُمَّ وَاِلٰهَ مَنْ وَاَدَاكَ وَاَدَاكَ
اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ جو علی کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔

اس روایت کے نتیجہ کے طور پر بات جو یہ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بالنسب ہے اور اسی کو امام کہتے ہیں، اس طرح استدلال و حجت میں پہلی خرابی اور خامی تو یہ ہے کہ سارے کے سارے اہل زبان (عرب) اس کے

منکر ہیں کہ اولیٰ کے معنی مولیٰ ہوں۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مفعول بمعنی افعول کسی جگہ اور کسی بھی مادہ میں استعمال نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس خاص مادہ میں ابوریذ لغوی اسے جائز کہنے والا کیسا ہے اور دلیل میں ابو عبیدہ کا قول بیان کرتا ہے جس نے ہی مولیٰ کی تفسیر اولیٰ لکھی۔ سے کی ہے لیکن عام اہل زبان عربوں نے اس کے مذہب اور تمسک کے غلط بتایا ہے، اور کہا ہے کہ اگر اس کا قول صحیح ہو تو ہمیں فلاں اولیٰ منک کی جگہ فلاں مولیٰ منک کہنا چاہیے حالانکہ یہ غلط اور بالاجماع نامقبول ہے اسپر یہ کہا گیا ہے کہ ابو عبیدہ کی تفسیر ماضی معنی بیان کرتی ہے۔ مولیٰ کی تفسیر اولیٰ سے کرنے کا یہ مطلب ہے کہ آگ تمہارا اٹھکانا۔ ہے جائے بازگشت اور وہ جگہ جو تمہارے لائق ہے۔ ہے یہ نہیں کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ ہے۔

دوسری بات یہ کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ ہو بھی تو بالتصرف سے اس کا صلیغ تفسیر انا کسی لغت سے ثابت ہو سکتا ہے، اولیٰ بالحبوت یا اولیٰ بالتفہیم مراد ہو، اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں کہیں اولیٰ کا لفظ سنیں اس سے اولیٰ بالتصرف مراد لیں۔ مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِآرِثِ آلِهِمْ لَذَٰلِكَ يُتَّبَعُ وَ هَٰذَا فَنِيٌّ وَالَّذِينَ آمَنُوا۔

بے شک ابراہیم علیہ السلام سے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی اولاد نبی کی پیروی کی اور جو ایمان لائے

اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے متبعین اولیٰ بالتصرف نہیں ہیں،

تیسری بات یہ کہ روایت کے بعد کے الفاظ واللہ صاف پتہ دیتے ہیں کہ لفظ خواہ مولیٰ ہو خواہ اولیٰ، ولایت سے مراد محبت ہے کیونکہ مولیٰ اگر متصرف فی الامر کے معنی میں ہوتا یا اولیٰ سے اولیٰ بالتصرف مراد ہوتا تو یوں فرمانا قرین قیاس تھا، کہ ”اے خدا اس کو دوست رکھ جو اس کے تصرف میں ہو اور اس کو دشمن رکھ جو اس کے تصرف سے باہر ہو“ دوستی اور دشمنی کا ذکر اس بات کی صاف دلیل ہے کہ مقصد دوستی کو واجب ٹھیرانا ہے اور دشمنی سے ڈرنا تصرف و عدم تصرف، مقصد ہی نہیں۔

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی واجبات ہی نہیں بلکہ سنن نشئت و برخاستہ اکل و شرب وغیرہ کے آداب تک اس خورش اسلوب سے بیان فرمائے ہیں کہ ان کے مراد ہی معنی ہر اس شخص کی سمجھ میں بے تکلف آجاتے ہیں جو عربی زبان سے واقفیت رکھتا ہو خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور درحقیقت بلند میار بلاغت بھی ہے اور منصب ارشاد ہدایت بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے،

اتنے اہم اور اعلیٰ پایہ کے مسئلہ میں بھی اگر آپ اسی قسم کے کلام پر اکتفا فرمائیں کہ بائبا رخت عرب اس کے معنی و مفہوم تک بھی رسائی نہ ہو سکے۔ تو تعوذ باللہ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کے تصور کا اقرار ہو اور اس سے بھی آگے بڑھ کر تبلیغ و ہدایت کے معاملہ میں سستی و دراکھنے کا الزام لگانا ہو جس کا کوئی اولیٰ مسلمان بھی تصور نہیں کر سکتا،

لہذا معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر ہی معنی ہیں جو آپ کے کلام سے بے تکلف سمجھ میں آئے ہیں کہ جیسے پیغمبر کی محبت تم پر فرض ہے ایسے ہی علی رضی اللہ عنہ اسے دشمنی رکھنا بھی حرام ہے یہی اہل سنت کا مذہب ہے،

اور اہل سنت کی سنی فہمی بھی اس کی تائید کرتی ہے، چنانچہ ابو نعیم نے جناب حسن مثنیٰ بن امام حسن سبط رسول رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آیا حدیث میں کثرت مولد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خلافت مراد لیتے تو لوگوں کے ذہن نشین کر نیچے کے لئے اس کو وضاحت سے بیان فرماتے مگر حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ فصیح اور واضح البیان (صاف گو) تھے، اس مراد کے لئے آپ یوں فرماتے،
يَا أَيُّهَا النَّاسُ هَذَا وَبِئْسَ الْأَمْرُ وَاللَّعْنَةُ عَلَيْكُمْ ائْتُوا بَعْدِي فَنَسُفُكُمْ أَوْ أَطِيعُوا
بعد تم پر نگران۔ پس ان کی بات سننا اور ان کی اطاعت کرنا،

پھر جناب مثنیٰ نے کہا خدا کی قسم اگر خدا رسول، جناب علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لئے منتخب کرتے اور جناب علی، اس حکم کی پاسداری نہ کرتے اور اس پر کار بند نہ ہوتے تو خدا اور رسول کی دم پیروی کے سبب امت کے سب سے بڑے خطا کار شمار ہوتے،

اس پر ایک شخص بولا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں۔ تو آپ نے فرمایا سنو میاں، خدا کی قسم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قول سے مراد خلافت ہوتی تو وضاحت کے ساتھ صاف فرمادیتے جس طرح غارِ رزہ کی وضاحت فرمائی اور یوں ارشاد فرماتے
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ عَلِيًّا وَآلِيَّ أَمْوَكُم مِّنْ بَعْدِي وَاللَّعْنَةُ فِي النَّاسِ بِأَمْوِيَّ
لوگو! علی میرے بعد تمہارے امور کے مختار ہوں گے اور لوگو! میں میرے معاملات کے نگران۔

پھر اس صورت میں یہ حدیث ایک زمانہ میں دو دلائلوں کے جمع ہونے کی کھلی دلیل ہے کیونکہ اس میں لفظ بعد کی قید نہیں ہے (میں جب اور جس وقت، جس کا مولا ہوں، علی بھی اسی وقت اس کے مولا ہیں) بلکہ سلسلہ کلام جیسا کہ ظاہر ہے ہر دو دلائلوں کی مساوات و برابری بہر حقیقت و تمام وقت، کو چاہتا ہے حالانکہ یہ بڑی واضح بات ہے کہ جناب امیر کی شرکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ولایت میں آپ کے حین حیات ممکن و محال دنیا ممکن ہے،

لہذا یہ اس بات کی دلیل اول ہے، کہ مراد وجوب محبت ہے، اور دو محبتوں کے جمع ہونے میں نہ کوئی اشکال ہے نہ تباہی (مع تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں) بلکہ ایک محبت دوسری محبت کا تقاضا کرتی ہے، البتہ دو تصرفات کے بیک وقت جمع ہونے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور اگر کلام، اس قید کے ساتھ مقید کریں کہ اس سے امامت فی الوقت اور فوری مراد نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ کچھ وقت ٹھہر کر مراد ہے تو پھر یہ اتفاق مومنوں مبارک ہو، کیونکہ اہل سنت خود آپ کے عہد میں بعد بیعت خلافت آپ کی خلافت و امامت کے قائل ہیں،

اب رہی یہ بات کہ اس طرز کلام کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو کیوں منحصر فرمایا تو اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالتاب صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عہدِ تنزیہ

میں فتنہ و فساد اور بنادت کی آگ بھڑک اٹھے گی اور کچھ لوگ آپ کی خلافت سے منکر ہو جائیں گے تو اسی لئے آپ کو معذور فرمایا۔

اور ایک طرف متاثرہ ہے کہ ان کے بعض علماء اس بات کے ثابت کرنے میں کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف ہے، حدیث کے ابتدائی الفاظ الست، اولیٰ بالمومنین من القہود سے دلیل لاتے ہیں، یہ وہی بات ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، کہ ان کو جہاں اولیٰ کا لفظ نظر آتا ہے تو فوراً ہی وہاں بالتصرف کا دم چھلکے لگانے دوڑ پڑتے ہیں یہاں کون سا داعیہ ہے کہ اس سے اولیٰ بالتصرف کے ہی معنی لیں بلکہ یہاں بھی معنی محبت مراد لینا ہی چیتا ہے۔ کہ دیکھا میں مومنوں کو ان کی اپنی جانوں سے زیادہ پیارا نہیں، اس لئے یہاں کا اولیٰ دلالت بمعنی محبت سے مشتق ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ ”کیا میں مومنوں کو ان کی جانوں سے زیادہ محبوب و پیارا نہیں“ تاکہ اجزاء کلام اور ایک سلسلہ میں منسلک جملوں میں تناسب اور ربط برقرار رہے، اور حسن کلام دو چند ہو۔ پھر اس خطبہ کا اصل مطلب یہ ہوگا، ”اے گروہ مسلماناں! یہ تو ہے ہی کہ تم مجھ کو اپنی جانوں سے زیادہ دوست رکھتے ہو، تو جو کوئی مجھ کو دوست رکھتا ہے وہ علی کو بھی دوست رکھے اے اللہ جو اس کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ“

مقصد وہی ہے جو اس کلام کے ربط کو ملحوظ رکھ کر کلام کے تسلسل کو دیکھئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد الست اولیٰ بکم من القہود، آیت قرآنی سے ماخوذ ہے۔ اسی لئے اس کو اہل اسلام کی تسلیم کردہ بات کو بنیاد بنا کر اس پر آئندہ کے کلام کو موقوف فرمایا۔ اور قرآن میں یہ لفظ ایسے موقع اور جگہ پر آیا ہے جہاں اولیٰ بالتصرف کے معنی مناسب ہی نہیں لگتے۔

النبی اولیٰ بالمومنین من القہود و انما و اجلہا تمہا
تمہا و اولو الدنیا حاکم بقہود اولیٰ یبعثہ
فی کتاب اللہ۔

نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں، اور ان کی ازواج مسلمانوں کی مائیں ہیں لہذا ان کے کتاب اللہ شدہ دار باہم ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت دوسرے مومنین کے،

لہذا اس آیت کا سلسلہ کلام بتا رہا ہے کہ اس میں نبی کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے سے انکار ہے یعنی زبیر بن عارضہ کو زبیر بن محمد نہیں کہنا چاہیے اس لئے کہ آپ کی نسبت تمام مسلمانوں سے ایک تحقیق باپ کی سی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور آپ کی ازواج مطہرات اہل اسلام کی ماؤں کے بمنزلہ ہیں اور اہل قرابت نسبت کرنے میں غیروں سے زیادہ محترم ہیں، اور بہتر بھی! اگرچہ مشقت اور تعظیم میں دوسرے ہی زیادہ ہوں،

لہذا نسبت کا دار مدار قرابت پر ہوا جو یقینی میں موجود نہیں، اس کا مدار شفقت و تعظیم پر نہیں! یہ ہے کہ اللہ اور حکم خدا کا مفہوم و مطلب اب اس میں اولیٰ بالتصرف کو کسی نوع کا بھی دخل نہیں لہذا یہاں وہی معنی مراد ہوں گے جو حدیث میں ہیں،

اور اگر حدیث کی ابتدائی عبارت میں اولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف لیں تو بھی مولیٰ، اولیٰ بالتصرف سے

کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ اس صورت میں یہ عبارت مخاطبین کی توجہ اور بیداری کے لئے ہوگی کہ دوسری توجہ اور ہم تن گوش ہو کر آئندہ آنے والی بات سنیں اور اس فرمودہ کو مکمل واجب جان کر اس کی اطاعت پر کمر بستہ ہو جائیں، جس طرح ایک باپ بیٹے کو وعظ و نصیحت کے ذوق کہتا ہے کہ کیا میں تیرا باپ نہیں ہوں بیٹا اس سوال سے چونکہ ہو جاتا ہے، کہ باپ کہنا کیا چاہتا ہے، کہ ایسے یقینی تعلق کو سوال بنا رہا ہے وہ اقرار کرتا ہے تو باپ جو باتیں کہنا چاہتا ہے، کہدیتا ہے، تاکہ جس تعلق کا اس نے ابھی اقرار کیا ہے اس کا پاس خاطر کرتے ہوئے تعمیل حکم کرے اور اطاعت شکاری کا ثبوت دے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہو۔

پس اس جگہ الست ادلی بالمؤمنین والست بالکفر ایکنہ" یا الست بتبکدہ کے مثل ہے آئندہ کے کلام سے ایک لفظ کے ذریعہ نسبت و تصور نڈنا اور چاہنا نہایت بے وقوفی ہے، اس عبارت سے سادے کلام کو جو ربط ہے، وہی کافی ہے،

اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے بعض باریک بین لوگ محبت و دوستی کے معنی مراد نہ ہونے کی دلیل میں کہتے ہیں کہ جناب امیر مری اللہ عنہ کے ساتھ دوستی اس آیت۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاؤُا بَعْضٍ مومن اور مومنات ہا ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، کے ضمن میں ثابت ہے۔ یہ حدیث بھی اگر اس معنی کا نائدہ دے تو کلام بے نائدہ اور لغو ہو جائے گا،

یہ "زیرک لوگ" اتنا بھی سمجھنے سے غاصر ہیں کہ ایک شخص کی دوستی کا ثبوت سب کے ضمن میں اور جہیز ہے،

اور اسی شخص کی دوستی کا جو ب خصوصی پہلو سے کچھ اور چیز اگر کوئی شخص اللہ کے سارے نبیوں اور رسولوں پر

ایمان لاتا ہے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر نہیں لاتا تو اس کا ایمان مستبر نہیں یہاں، خاص

جناب امیر مری اللہ عنہ کی ذات سے دوستی منظور ہے اور آیت میں دوستی وصف ایمانی کے باعث، جو عام

ہے مقصود محقی، پھر اگر آیت و حدیث کا معنوں مل بھی گیا تو اس میں قباح کی کیا بات ہے پیغمبر کا کام یہی

ہوتا ہے کہ مسلمان قرآن کی بار بار تاکید اور اس کی یاد دہانی کرتا رہے خصوصاً جہاں کہیں کہ مکلفین کی طرف

سے احکام قرآن میں غفلت و سستی یا عمل میں کوتاہی رونما ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ يُكْثِفُ الْمُؤْمِنِينَ۔ اور نصیحت کرتے رہتے کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے

اور قرآن مجید میں کوئی معنوں ایسا نہیں جس کی تاکید کئی آیات میں نہ کی گئی ہو۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کی زبان مبارک سے اس کی تاکید مزید کر ان گنی، تاکہ بندوں پر محبت کو لازم اور ان پر نعمت کو پورا فرمائیں

جس نے قرآن پڑھا اور اسے سمجھا ہو گا وہ ایسے کلام کو پونچ نہیں کہہ سکتا، ورنہ پھر روزہ نماز زکوٰۃ و تلاوت قرآن

کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکیدات بھی سب بول ہی ہوں گی،

اور خود شیعوں کے نزدیک جناب امیر کی امامت کی نفس کو بار بار دہرانا اور اس پر تاکید کرنا بھی لغو

اور بیکار ٹھہریگا۔

اور اہل تاریخ و سیر کے کلام کی روشنی میں اگر اس خطبہ کا سبب و مقصد معلوم کرنا چاہیں تو صاف معلوم ہوگا

کہ یہاں پیش نظر جناب امیر مری اللہ عنہ کی دوستی اور محبت کا ثبوت ہے اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ

عنہم کی وہ جماعت جو ملک مین کی مہم میں آپ کے ہمراہ تھی انہوں نے سفر سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی چند شکایات کا چرچا کیا جو بے باقیوں نے یہ خیال فرما کر کہ یہ باتیں لوگوں کی زبانوں پر آگئی ہیں اگر دو چار کورؤں کا تو خاطر خواہ اثر نہ ہوگا ممکن ہے کوئی نا عاقبت اندیش اسے جانبداری اور پاسداری تعلق پر عمل کرے اور وہ بات ختم نہ سمجھے لہذا آپ نے انفرادی فہمائش کے بجائے خطبہ عام دیا اور اور الست اولی بالمومنین من النفسہم کے کلمہ سے شروع فرمایا جو نفع قرآن سے تھا۔ یعنی جو کچھ کہہ رہا ہوں ازراہ خبر خواہی و شفقت ہے، اسے جانبداری یا پاسداری پر محمول نہ کریں اور نہ میرے تعلق خاطر کا باعث سمجھیں۔ چنانچہ محمد بن اسحاق اور دیگر اہل سیر کے اس قصہ کو بتفصیل بیان کیا ہے۔

(۲) اس سلسلہ کی دوسری حدیث وہ ہے جو بخاری مسلم میں جناب براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عذوہ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل بیت کی مستورات و بچیوں پر خلیفہ مقرر فرمایا اور عذوہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس وقت جناب امیر نے نے عین کیا یا رسول اللہ۔

آ تَحْلِفُنِي فِي الْبَسَاءِ وَالْقَبِيَا تِ - کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں پر خلیفہ بنا رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

أَمَّا تَدْعَانِ أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَامُوزٍ مِن مَّوَسَىٰ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ مِنِّي بَعْدِي مبرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ مندرجہ اسم جنس ہے جو حکم کی طرف منسوب ہے اس لئے تمام منازل کو عام ہوگا۔ تاکہ اس سے استثنائے صمیم ہو سکے۔ اور جب مرتبہ نبوت کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تو اب وہ تمام منازل و مراتب جو حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے ثابت تھے وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لئے بھی ثابت ہوں گے۔ اور ان میں سے امامت کا بیع ہونا اور ان کی اطاعت کا فرض ہونا بھی شامل ہے، اگر حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ رہتے تو جو مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عین حیات حاصل تھا۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام کی دنات کے بعد وہ محروم قرار پائیں تو یہ ان کا نبوت سے موزول ہونا کہا جائے گا اور نبی کا نبوت سے موزول ہونا جائز نہیں کیونکہ اس میں توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ لہذا یہ مرتبہ جناب امیرؓ کو بھی حاصل ہوا اور یہی امامت ہے۔

در اصل یہ حدیث بھی اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ جناب امیر کی فضیلت اور آپ کے عہد میں آپ کی امامت کے اثبات میں پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیرؓ امامت کا استحقاق رکھتے تھے،

اب ہم اس موضوع پر کہ آپ کے علاوہ کوئی امام نہ تھا اور جناب امیر بلا فصل امام تھے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ لہذا ہم کہتے ہیں کہ یہ بات اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتی، گونوا سب نے اہل سنت کے استدلال پر رد و قدح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ عورتوں بچوں کی اخلافت

وہ خلافت ہی نہیں تھی جو ہمارے تہا رے درمیان زیر بحث ہے کہ اس خلافت کی سپردگی سے اس خلافت کا ثبوت ہم پہنچ سکے کیونکہ باجماع اہل سیر سے یہ بات ثابت ہے کہ اسی مؤلف پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا سوبہ وادبائع عرفیہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا کوثر وال اور جناب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنی مسجد کا امام نماز بنا یا اگر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت عام ہوتی تو پھر ان امور کے کیا معنی تھے، لہذا معلوم ہوا کہ یہ خلافت محض امور خانگی کی غور وپرداخت اور اہل دیہات کی دیکھ بھال سے عبارت تھی جب کہ اس قسم کی دیکھ بھال ایسے آدمی سے سراغ نام پاسکتی ہے جو محرم ہو اور اندن خانہ کے حالات سے آگاہی رکھتا ہو اسی وجہ سے ایسے کاموں کے لئے لڑکے داماد یا ان جیسوں کو ہی مقرر کیا جاتا ہے، بہر حال ایسا استخلاف خلافت کبریٰ کو نہیں چاہتا،

بفضلہ تعالیٰ اہل سنت نے ان تمام اعتراضات کے ثانی اور مسکت جوابات اپنی کتابوں میں دیدئے ہیں جو اپنی جگہ اور مقام پر موجود ہیں،

شیعوں کے اس مدبث سے طریق استدلال کو جس انداز میں ہم نے ترتیب دے کر بیان کر دیا ہے اس سے درحقیقت ان کی بات سمجھ میں آنے کے قابل ہو گئی ہے ورنہ ان کی اپنی کتابوں میں اگر دیکھا جائے تو یہی استدلالی عبارت ایسی رہی تباہی اور پرانگندہ باتوں پر ختم ہوتی ہے جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

بہر حال ان کا یہ استدلال بھی کئی خرابیوں کا مجموعہ ہے اول یہ کہ اسم جنس جو علم کی طرف منسوب ہو وہ تمام اصولیوں کے نزدیک الفاظ عموم سے نہیں بلکہ اس کی تصریح کی ہے کہ وہ عہد کے لئے ہے مثلاً غلام زید وغیرہ کہ اس میں خاص غلام مراد ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر ان مثالوں میں کوئی کیا گئے گا۔

ثانی یہ کہ غلام زید (میں زید کے گھوڑے پر سوار ہوا) کینست ثوبت زید؟ میں نے زید کے کپڑے پہنے اور ثوبت زید؟ میں نے زید کے لڑکے کو دیکھا کہ غلام ہے کہ یہاں عموم باطل ہے،

اور کلام زیر بحث میں بھی خصوصیت کا قرینہ موجود ہے اور وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا قول المتخلفی فی النساء والمہیان ہے،

یعنی جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے جب وہ کوہ طور پر تشریف لے گئے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے بعد خلیفہ تھے، اور وہ استخلاف جو غیر موجودگی کی مدت کے ساتھ مقید ہو، وہ مدت کے ختم ہو جانے کے بعد باقید ہی ختم ہو جاتا ہے چنانچہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کے حق میں بھی ختم ہو گیا۔ اور استخلاف کے اس صورت میں ختم ہونے کو مغزول ہونا نہیں کہتے جو کسی کی امانت کا سوال پیدا ہو،

اب رہا استثناء تو اس میں عموم اس وقت پایا جاتا ہے جب کہ استثناء متصل ہو اور یہاں استثناء متصل نہیں بلکہ منقطع ہے لفظی اور معنوی قرائن اس کی تائید کرتے ہیں،

لفظی تزیید کہ لاد نبی بعدی جملہ خبریہ ہے جس کو ماضی حضرت ہارون سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے اور اگر جملہ کی تاء بیل مغزول سے کریں تو ان کے داخل ہونے سے ادا کا حکم عدم الثبوت ہو گا۔ اور غلام ہے کہ عدم الثبوت آپ کے منازل میں سے ہے نہیں جو استثناء مبیع ہو۔

اور معصومی یہ کہ منجملہ منازل حضرت ہارون میں سے ایک ان کا عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑا ہونا ہے دوسرے یہ کہ بجا نظر زبان ان سے گویائی میں فصیح تر تھے تیسرے یہ کہ نبوت میں ان کے شریک تھے چوتھے یہ کہ وہ باعتبار نسب ان کے حقیقی بھائی تھے اور یہ تمام منازل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل نہیں تھے لہذا اگر استثناء کو متصل ٹھہرائیں اور منزلۃ "کو معلوم پر محمول کریں تو معلوم کے کلام پر حرف آتا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ ہم اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ منازل ہارون علیہ السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی خلافت بھی تھی، اس لئے کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ بھی رہتے تو تبلیغ و ہدایت میں وہ مستقل رسول ہوتے اور یہ مرتبہ ان کے ہاتھ سے کبھی نہ جاتا اور یہ مرتبہ خلافت سے منافات رکھتا ہے کیونکہ خلافت تو اس مرتبہ کی نیابت ہے اور اصل اصل ہے۔ نیابت، نیابت، باہم نیابت کو اصل سے کیا علاقہ:-

لہذا معلوم ہو گیا کہ اس طرز تقریر و استدلال سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت پائے ثبوت کو ہرگز نہیں پہنچتی۔

تیسرے یہ جو بات کہی گئی ہے کہ یہ مرتبہ اگر حضرت ہارون علیہ السلام سے زائل ہو جاتا تو یہ ان کی معزول ہوتی اور نبی کا معزول ہونا جائز نہیں، اس کے متعلق ہمارا کہنا یہ ہے کہ کام کے ختم ہونے کو عزل کہنا عرف کے خلاف تو ہے ہی لغت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ شاہ و حکام اپنے دار السلطنت سے باہر جاتے وقت نائبوں اور اپنے گمشدوں کو اپنا جانشین مقرر کر جاتے ہیں، اور ان کی مراجعت و واپسی کے بعد ان کی جانشینی ختم ہو جاتی ہے تو اسے کوئی بھی معزول نہ کہتا ہے نہ سمجھتا ہے اور ان کے حق میں نہ اسے امانت کا سبب مانا جاتا ہے، اور دہاندلی سے کوئی عزل ہی سمجھتا رہے تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام نبوت کے مستقل درجہ سے سرفراز ہوئے جو خلافت سے ہزار درجہ اعلیٰ دارفع ہے تو یہ ان کے حق میں توہین و تحقیر کیوں ہونے لگی بلکہ وہ تو اس طرح کا ہوتا کہ ایک ذریعہ کے مرنے کے بعد نائب کو عہدہ نیابت سے ہٹا کر مستقل ذریعہ بنا دیا جائے، یہاں تو اعزاز بڑھتا ہے تحقیر توہین کا کیا کام!

بات کا ایک سیلہ اور ہے کہ جب حضرت امیرؑ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی اور یہ معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں غیر موجودگی کے وقت حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے خلیفہ ہوتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد یرشع بن نون اور کالب بن یوتنا خلیفہ ہوئے تو اس سے لازم آیا جناب امیرؑ حضرت علیؑ علیہ السلام کی حیات میں آپ کی غیر موجودگی میں تو آپ کے خلیفہ ہوں مگر وفات کے بعد نہ ہوں بلکہ دوسرے ہوں تاکہ تشبیہ پوری پوری صحیح ہو سکے۔ کیونکہ کلام رسول میں موجود تشبیہ کو ناقص قرار دینا تو رسول کی شان میں انتہائی بے ادبی ہے۔

اور اگر ان سب باتوں سے صرف نظر بھی کر لی جائے تو اس حدیث سے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کی نفی کیسے ثابت ہوئی اور وہ بھی ثابت نہیں تو اصل مدعا کہاں حاصل ہوا۔ بہت کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کی جاسکتی ہے وہ جناب امیرؑ کی خلافت کا استحقاق ہے اور بھی کسی وقت اور اسے تو اہل سنت پہلے ہی سے مانتے ہیں۔

(۳۰) غیر صحیح حدیث وہ ہے جو حضرت بربرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ۔

أَنَّهُ قَالَ إِنَّ عَلِيًّا قَتَلَنِي وَأَنَا مِنْ حَلِيٍّ وَهُوَ
وَأَنَا كُلِّي مُؤْمِنٌ مِّنْ بَنِيهِ
جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی محمد
سے ہیں اور میں علی سے اور وہ میرے بعد ہر مومن کے
ولی ہیں،

یہ حدیث باطل اور ناقابل استناد ہے کیونکہ اس کی سند میں احب نامی ایک شخص ہے جو شیعہ تھے اور روایات
میں گڑبڑ کا اہتمام سپرنگا ہوا ہے، جمہور علماء نے اسے ضعیف کہا ہے لہذا اس کی روایت حجت میں پیش
نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ کہ اس کے الفاظ مشترک "میں سے ہیں" تو کیا قرینہ ہے اور کیا ضروری ہے اس سے ادلی
بالقوف ہی مراد ہیں دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور پھر ایک بات یہ کہ وہ کسی وقت کے ساتھ عقیدہ نہیں
اہل سنت کا نہ سب پہلے معلوم ہو ہی چکا کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر کسی
وقت ضرور واجب الطاعت امیر تھے،

(۳۱) چوتھی حدیث استدلال وہ ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے،
أَنَّهُ كَانَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّ
قَدْ طُبِعَ لَهُ أَوْ أُهْدِيَ إِلَيْهِ نَعْلَانِ الْفُتَيْهِ
يَا قَتَلَ النَّاسَ إِلَيْكَ يَا كُلِّ مَعِي هَذَا الطَّيْرِ
جناب آپ کے لئے لگایا گیا تھا، یا دیکھا گیا یا بطور ہدیہ
پیش ہوا تھا، اس وقت آپ نے فرمایا اے اللہ اپنے
اس بندہ کو جو سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو
میرے پاس بھیج تاکہ وہ اس پرندہ کے تناول میں میرے ساتھ ہو اس وقت حضرت علی تشریف لے آئے،

پہلی بات تو یہ کہ اس جھٹے ہوئے پرندہ کے بارے میں روایات مختلف اللفظ ہیں بعض میں سہام ہے
جو ایک پرندہ کا نام ہے، بعض میں جباری معنی چوڑہ ہے، اور بعض میں جل کا لفظ ہے معنی چکورا
اس روایت کو اکثر محدثین نے موضوع قرار دیا ہے، اس کے مومنین ہونے کی تصریح کرنے والوں میں
حافظ شمس الدین جزیری کا نام بھی ہے اور امام حدیث شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد و شقی ذہبی (معروف
بہ علامہ ذہبی) نے اپنی کتاب التبعین میں لکھا ہے،

بہت دنوں تک میرا بھی خیال رہا کہ ماکہ نے اپنی کتاب
میں حدیث طبر کو ذکر کر کے اچھا نہیں کیا جب میں نے
اس کتاب پر حاشیہ لکھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اسے
موضوعات کے زمرہ میں رکھا ہے،
تَقَدُّ كُنْتُ نَمَطًا طَوِيلًا أَكُنْتُ أَنَّ حَدِيثَ الطَّيْرِ
لَمْ يُجْزِئِ الْحَاكِمَ أَنْ يُزَادَ فِي مُتَدَارِكِهِ
فَلَمَّا عَظُمَتْ هَذِهِ الْكُتُبُ رَأَيْتُ الْقَوْلَ مِنَ
الْمَوْضُوعَاتِ الَّتِي فِيهَا،

ادراہی کے ساتھ ساتھ یہ روایات ان حضرات کے لئے مفید مطلب بھی نہیں کہ قرینہ اس بات پر دلالت
کر رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم طعمی کے لئے جناب امیر بن اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین لوگوں
میں سے تھے اور بے شک جناب امیر ایسے ہی تھے کیونکہ بیٹے کا یا جو بنزلہ بیٹے کے ہوا اس کا شریک طعام ہونا

کھانے کے لطف کو دو بالا کر دیتا ہے اور اگر مطلقاً احب بھی مراد میں تو بھی مدعا کو ثابت کرنے میں قاصر رہینگے۔ کیونکہ مخلوق میں خدا کا محبوب ترین ہونے کے لئے یہ لازم و ضروری نہیں کہ وہ ریاست عامہ کا مالک بھی ہو۔ بہت سے ادیب و کبار اور انبیاءِ اعلیٰ مقدار مخلوق میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین تھے، مگر ریاست عامہ کے مالک نہ ہو سکے،

مثلاً حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام بلکہ حضرت شمعون علیہ السلام بھی، کہ جن کے زمانہ میں جناب طاوت ریاست کے مالک تھے جبیر قرآنی آیت شاہد ہے،

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ منورہ میں رہتے ہوں اور یہ دعا خاص حاضرین کے بارے میں ہو نہ کہ غائبین کے بارے میں۔ اس کی دلیل آپ کا اتنی فرمانا ہے اس لئے کہ غائب شخص کو دور دراز کی مسافت سے ایک لمحہ میں ہر طعمائی کے لئے خرق عادت کے طریقہ سے لے آنا یہاں متصور نہیں، اور انبیاءِ کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ سے خرق و معجزہ کا سوال صرف کنار کے مطالبہ کے وقت ہی کرتے ہیں، ورنہ پھر جنگ و جہاد یا کسی اور کام کے لئے اسباب ظاہری کی تیاری کی کیا ضرورت تھی تمام امور خرق عادت سے انجام فرمایا کرتے،

اور ممکن ہے اس سے مراد ایسی ہی ہر جیسے عام بول چال میں لوگوں کی ہوتی ہے جیسے یہ کہنا مکی کا حَبّ النَّاسِ اِلَيْكَ۔ تیرے نزدیک سب لوگوں میں محبوب ترین کون ہے؛ اور یہ استعمال بہت رائج اور شہور ہے اسی طرح اہل زبان کا یہ قول فلان اعقل الناس و افضلہم و لوگوں میں غلاں بڑا عقلمند اور ان سے افضل ہے۔

اور بالفرض یہ مدعا کے لئے دلیل ہو بھی تو یہ ان صریح و صمیم احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو کھلے اور سات الفاظ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً۔

اِنَّكَ وَاِياكَ لَتَيُؤَيِّنُنِي بَعْدِي اَبُو بَكْرٍ وَ عُمَرُو۔ میرے بعد دین کے معاملہ میں ابوبکر اور عمر کی پیروی کروا

(۵) یا غریب حدیث وہ جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،
اِنَّ الْيَتِيَّ صَلَّيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَقَامَ مَدِيْنَتَهُ
النَّبِيِّ وَعَلَىٰ بَا بَيْتِهِ۔ اور علی اس کا رد وارہ ہیں،

یہ حدیث بھی خرابیوں سے خالی نہیں یحییٰ بن معین نے کہا ”اس کی کوئی اصل نہیں امام بخاری نے کہا یہ ”منکر“ ہے۔ ترمذی نے کہا کہ ”منکر غریب“ ہے۔ ابن جوزی نے اسے مومنات میں شمار کیا ہے شیخ تقی الدین ابن دلق العید نے کہا کہ ملاح حدیث نے اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا شیخ محمد الدین نووی، حافظہ کمال الدین ذہبی، اور شیخ شمس الدین جزری نے اس کو ممنوع بتایا ہے،

لہذا ایسی روایت سے جو ممنوع ہو اور جسے اہل سنت نے احتجاج و تمسک کے ذارہ سے باہر کر دیا ہو، استدلال و تمسک کرنا اور وہ بھی اہل سنت ہی کو الزام دینے کے لئے علماء شیعہ کی دانشمندی کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں،

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کسی شخص نے اپنے ملازم کی بددیانتی، خیانت اور غلطیوں سے آگاہ ہو کر ملازمت اور گھر سے نکال دیا ہو اور سادہ عام کے ذریعہ اعلان بھی کرا دیا ہو کہ اس کو فلاں قصور دل اور غلطیوں کی بنا پر نکال دیا گیا ہے اب اس سے میری ذمہ داری پر کوئی لین دین نہ کرے میں اس کی کسی بات و معاملہ کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ پھر بھی کوئی احمق جس کی اس کو نوکر سے شناسائی ہو وہ اس سے لین دین کرے اور تقاضے کے لئے مالک کو پکڑے، تو کون اس احمق کو عقلمند کہے گا،

اور پھر یہ روایت ان کے مفید مطلب بھی نہیں، چلو مان لیا کہ جناب امیر بن شہر علم کا دروازہ ہی مگر یہ کیا ضروری ہے کہ وہ ریاست عامہ کے مالک ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلا تسلسل بھی زیادہ سے زیادہ آپ کے لئے جو بات ثابت ہو گی وہ یہ کہ شرائط امامت میں سے ایک شرط بوجہ اکمل آپ میں پائی گئی اور پھر ایک شرط پائی جانے سے تو مشروط کا وجود لازم نہیں آتا۔ نا۔ جب اس کے سائے بہ بات بھی ہو کہ وہی شرط یا اس سے بھی زیادہ دوسروں میں بروایت اہل سنت ثابت ہو۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا مَنَّبَ اللَّهُ سَكِينًا فِي مَدِينَةٍ إِلَّا وَ قَدْ مَنَّبَنَاهُ فِي مَدِينَةٍ أُخْرَى
اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ میں کوئی چیز نہیں ڈالی جو میں نے ابوبکر کے سینے میں نہ ڈالی ہو،
يَا مَثَلًا لِدَوَاكٍ بَعْدَى نَبِيٍّ لَكَانَ عَمْرًا
میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔
اگر اہل سنت کی روایات کا اقتدار کرنا ہے تو ہر جگہ کہیں ورنہ ان کے منہ ہی نہ آنا چاہیے کیونکہ یہ ایک ادھر روایت سے مات کھانے والے نہیں،

(۶) اس حدیث کو امامیہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے،
أَنَّهُ قَالَ مَنْ آمَنَ آدَانُ يُنْظَرُ إِلَى آدَمَ فِي
آپ نے فرمایا جو آدم کے علم کو، فوج کے تقویٰ کو
عَلَيْهِ وَالْإِي فُزَّحَ فِي تَقْوَاهُ وَالْإِي بُرَاهِيمَ فِي
ابراہیم کے علم کو موسیٰ کی سختی کو، عیسیٰ کی عبادت
عَلَيْهِ وَالْإِي مُوسَى فِي كُتُوبِهِ وَالْإِي عِيسَى
کو دیکھنا چاہیے تو اسے چاہیئے کہ علی بن ابی طالب
فِي عِبَادَتِهِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ
کو دیکھ لے،

اس حدیث سے ان کا طریق استدلال یوں ہے کہ اس روایت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جناب امیر کی ہم صفتی ظاہر ہوئی۔ اور انبیاء دوسروں پر افضل ہیں اور افضل کا سادہ بھی خود افضل ہوتا ہے لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے افضل ہوئے، اور امامت کا حقدار افضل ہی ہوتا ہے دوسرا کوئی نہیں!۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو عقل کی نعمت دی ہے تو وہ اس استدلال و تمسک کی زمرنا پانچاریاں کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے اول تو یہ کہ یہ روایت اہل سنت کی احادیث میں سے نہیں۔ ابن مطہر نے اپنی کتابوں میں کبھی تو اس کو بیہوش کی طرف منسوب کیا ہے اور کبھی بنووی کی طرف حالانکہ ان دونوں کی تصانیف میں اس روایت کا نشان تک نہیں، افزاد و بہتان نہ سے اہل سنت کو الزام دینے کا طریقہ ان کا فلزِ حربہ ہے،

جبکہ اس طریقہ سے نہ ان پر التزام آسکتا ہے، نہ وہ اس دعوت سے رُبوب ہو سکتے ہیں اس سنت کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ ایسی حدیث حجت و تمسک کے لائق نہیں جو ائمہ حدیث نے اپنی کتاب میں درج تو کیا ہو مگر صاحب کتاب نے کتاب میں مندرج احادیث کی سمت کا التزام و انتہام نہ کیا ہو جیسا کہ امام بخاری، مسلم اور دیگر اصحاب صحاح نے التزام کیا ہے۔ اور اس حدیث کی نہ صاحب کتاب نے بالخصوص تصریح کی ہے اور نہ کسی ثقہ اور محدث نے:

اسی محدثین کی وہ جماعت جو پچھلے طبقہ میں گزری ہے مثلاً ویلی، خطیب، ابن عساکر وغیرہ جب انہوں نے دیکھا کہ محدثین سلف احادیث صحاح و حسان کو خوب جانچ پرکھ کر مرتب کر گئے اور اس کوشش میں کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا تو انہوں نے ضعیف و موضوع روایات پر توجہ دے کر روایات پر جن کی اسانید یا سون میں الٹ پھیر کیا گیا تھا، اور یا سن کی صورت میں ان کو جمع کیا تاکہ ان پر نظر ثانی کریں اور موضوعات کو حسان سے الگ کر لیں۔ لیکن فرصت کی کمی اور عمر کی کوتاہی کے سبب اس اہم کام کو سرانجام نہ دے سکے اور یہ کام ان کے بعد والوں نے انجام دیا اور ان میں فرق کرنے اور تمیز دینے کی ذمہ داری کو پورا کیا چنانچہ علامہ ابن جوزی نے موضوعات کو علیحدہ کیا اور اس کے مقابلہ میں حسان لغیرہ کو مفاد حسنہ میں جدا لکھا۔

ادھر علامہ سیوطی نے تفسیر و تفسیر کی شکل میں کام کیا۔

اور اس قسم کے مجموعوں کے مرتبین نے اپنی کتابوں کے مقدمات میں یہ بات صاف لکھ دی کہ یہ مجموعہ کس غرض کے لئے مرتب کئے گئے اور ان میں کس کس طرح کی روایات ہیں۔ لہذا ان کتابوں کا حال و حیثیت خود مرتبین سے معلوم ہو جانے کے بعد ایسی روایات سے استدلال و تمسک کہاں تک جائز ہے اسی سے صاحب جامع الاصول نے یہ بات نقل کی ہے کہ خطیب بغدادی نے شریف مرتضیٰ سے جو رضی کا بھائی تھا، یہی روایات کو لیا ہے اور اس غرض سے ان کو کیا و مرتب کیا کہ ان کی جانچ کر کے اور بحث کر کے یہ پتہ چلائے کہ ان کی کوئی اصل بھی ہے یا نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ حدیث زبیر بحث تو ایسی بھی نہیں جو اہل سنت کی کسی کتاب میں مروی ہو مگر بطریق ضعیف ہی ہو!

دوسرے یہ کلام محض تشبیہ کے طور پر ہے کہ جناب امیر کی بعض مقامات کو انبیائے مذکورین کے بعض صفات سے تشبیہ دینا مقصود ہے، اور تشبیہ جس طرح مشہور ہے حدوت تشبیہ کاف کاف مثل غوکے ساتھ ہوتی ہے،

اس طرح بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ علم بیان میں طے شدہ ہے کہ مَنْ أَدَارَأْنُ يَنْظُرُ إِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدَا فَلْيَنْظُرْ إِلَى وَجْهِ فَلَانِ كَالْكَلامِ مَبْنِي تَشْبِيهِ فِي دَاخِلِ هُوَ رَجُولِيَّةُ الْبَدْرِ فِي جَانِبِ دِكْهُنَا يَابِئِ اسے چاہیے کہ فلاں کا چہرہ دیکھ لے،

اور یہ شعر بھی تشبیہ ہے،

لَا تَعْجَبُوا مِنْ بَلَاغَةِ لَيْلَةٍ قَدْ نَسِيَ آتَا أَمْرًا عَلَى الْقَمَرِ

و اس کے جامہ کتان کے پھٹ جانے پر تعجب نہ کرو یہ تو پانڈ پر تکمہ لگا یا گیا ہے اور تبنی کے یہ دو شعر بھی تشبیہ کے ہیں۔

تَشْرِيفٌ ثَلَاثٌ ذَوَاتُ بٍ مِنْ تَحْلِفُهَا فِي لَيْلَةٍ فَأَمَاتَ لَيَالِيَّ آمِنًا بَعَا
وَاسْتَقْبَلَتْ قَسَمُ السَّاءِ بِرُجُوعِهَا فَأَمَاتُ ثَنِي الْقَسَرِيْنَ فِي وَقْتِ مَعَا

(۱) بوقت شب معشورہ نے پیچھے کی طرف اپنے تین گیسو بکھیر دئے تو لوگوں کو تین راتیں یکجا دکھائیں،

(۲) اور اپنے چہرے سے آسمانی پاند کے سانسے آئی تو مجھ کو درد چاند ایک ساتھ دکھائے!

اور اگر اس سے بھی قطع نظر کریں تو یہ استعارہ ہو گا جس کی بنا تشبیہ پر ہے اور تشبیہ یا استعارہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے ساتھ سادی جانا پرلے درجہ کی بے وفائی ہے،

چنانچہ اشعار میں یہ بات عام ہے کہ بادشاہوں کے صحن کی خاک کو مشک کے ساتھ اور دہال کے سنگریزوں کو مراد پر دیا قوت سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان دونوں میں سادات کو کوئی بھی نہیں مانتا۔ یہ شعر دیکھئے۔

أَنَامِي بَارِقًا بِأَلَدِ بُرْقِي الْفَرْدِ مِرْصُ فَيَكْشِفُ جَنَابُ الدُّجَى ثَمَّ يَغْمُصُ
كَأَنَّ سُلُومِي مِنْ أَعَالِيهِ أَشْرَكْتُ فَمَدَّ لَنَا كَفًّا خَضِيئًا وَتَقَبَّضُ

(۱) میں دیکھتا ہوں کہ بجلی تنہا مٹی کے تودہ پر چمکتی ہے تو اندھیری کا پردہ چاک کر دیتی ہے اور

پھر چھپا دیتی ہے!

(۲) گوہر یا کہ سلیمانی اس ٹیلہ کی طرف متوجہ ہے پس منہ دی لگی ہتھیلیاں کو کھول دیتی ہے اور پھر بند کر لیتی ہے اب اس شعر کے مسنون سے یہ لازم نہیں آتا کہ سلیمانی کا منہ دی لگا ہاتھ چمک اور درخشندگی میں بجلی کے برابر ہو۔

اہل سنت کی احادیث صحیحہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ اندر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی ہے،

لیکن چونکہ فرقہ اہل سنت عقل خدا داد سے بہرہ ور ہے اس لئے وہ اس تشبیہ کو انبیاء و مکرورین کے ساتھ ان اصحاب گرامی کے برابر ہو جاتے پر محمول نہیں کرتے مشبہ کو اپنے مقام پر اور مشبہ بہ کو اپنے مرتبہ پر رکھتے ہیں!

تکلمہ اس قسم کے کلمات میں تشبیہ سے اس طرف اشارہ خاص ہے کہ پیغمبر کے مختص اوصاف میں سے اس شخص میں جو وصف ہے وہ اس درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہے،

بدر کے قیدیوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جب مشورہ طلب فرمایا تو اس کا قصہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں منقول ہے -

قَالَ قَالَ تَسْأَلُونَ اللَّهَ عَنِّي اللَّهُ عَالِمُ مَا فِي بَاطِنِي أَنَا أَسْأَلُ اللَّهَ عَنِّي اللَّهُ عَالِمُ مَا فِي بَاطِنِي

تَقُولُونَ فِي هَؤُلَاءِ لَآئِكَ مَثَلُ هَؤُلَاءِ كَمَثَلِ إِخْوَةِ
لَهُمْ كَأَنفُسِهِمْ قَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ لَدُنَّ
الَّذِينَ مِنْ آلِ الْكَافِرِينَ دَيَّانًا وَقَالَ مُوسَى إِنَّا
أَطِيعُ عَلَى أَمْرِ إِلَهِكُمْ وَآشَدُّ وَعَلَى قَوْلِهِمْ أَلَيْكِهِ
وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ هَؤُلَاءِ تَبِعُونِي يَا نَاطِقُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي
يَا نَذِيرُكَ عَفْوُكَ سَرَّحْتُمْ وَقَالَ عِيسَى إِنْ لَعَنْتُكُمْ
يَا نَهْمُكُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَعْفُوهُمْ فَهَمْ يَا نَذِيرُكَ أَنْتَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

تم ان کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ بے شک ان کی مثال
ان کے ان بھائیوں کی سی ہے جو ان سے پہلے تھے
یعنی جس طرح بعض انبیاء صفات جمال و سلف منظر
ہیں اور بعض صفات جلال و فہر کے۔ اسی طرح ابو بکرؓ
صفات جمال کا منظر ہیں اور عمرؓ صفات جلال کا منظر
نوح علیہ السلام نے فرمایا اسے میرے پروردگار! زمین
پر بسنے والے کسی کافر کو بھی نہ چھوڑا!

اور موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اسے میرے پروردگار!
ان کے مال ناچید کر اور ان کے دلوں پر سختی ڈال، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا پس میں
نے میری نافرمانی کی نہیں تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تو ان کو عذاب
دے گا تو وہ تیرے بندے میں اور اگر بخشدیگا تو ان کو پس تو غالب اور حکمت والا ہے،

یہ روایت حاکم نے بیان کی اور اس کی تصحیح کی ہے،
اور حضرت ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اے ابو
موسیٰ تمکو حضرت داؤد علیہ السلام کی خوش آوازیوں

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهَا يَا أَبَا مُوسَى
لَقَدْ أُعْطِيتَ مِثْرًا مِمَّا تَمِنُ مِثْرًا مِثْرًا لِي دَلِيلُ
مِنْ سَعَةِ خَوْشِ آوَاذِي رَحْمَتِ هَوْنِي
نیز فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
مَنْ سَمِعَهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى تَوَاضُعِ عِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ فَلْيَنْظُرْ إِلَى أَبِي ذَرٍّ
اسے استیعاب میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے،

جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ عیسیٰ بن مریم علیہا السلام
کی تواضع کا نمونہ دیکھے تو اسے چاہیے کہ بی فداؤں کو دیکھے

ترمذی نے اسی کو مختلف الفاظ میں روایت کیا گیا ہے، یعنی،

فرمایا نیلگوں آسمان نہیں سایہ نکلن ہوا کسی پروردگار
اٹھایا کسی کو زمین نے اپنی پشت پر جو زیادہ راست
گو ہوا بی دروغی اللہ عنہ) سیسہ جو زہد میں عیسیٰ بن

قَالَ مَا أَظَلَّتِ الْخِضْرَاءُ وَلَا أَظَلَّتِ الْغُبُورُ
أَمْدُكَ لَعْبَةٍ مِنْ أَبِي ذَرٍّ شَيْئَةً عِيسَى ابْنُ
مَرْيَمَ بَعْنِي فِي الْوَهْدِ

مریم علیہا السلام سے مشابہ ہیں،

میرے یہ کہ افضل کسی ایک صفت میں مساوات و برابر ہی افضلیت کا سبب نہیں کیونکہ اس افضل
میں اور جو صفات ہیں ان کی وجہ سے وہ افضل ہی رہا،

پھر یہ بات جیسے ہم بار بار دہرا چکے ہیں کہ افضلیت کا تقاضا ریاست کبریٰ کو کب ہے،
جو مٹنے یہ کہ اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیغور خلفا پر اس وقت تو ثابت

ہو سکتی ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ان یا ان جیسی صفات میں مساوی نہ ہوں اور اس سے انکار بہت ہی مشکل ہے۔ بلکہ اگر اہل سنت کی کتابوں کی واقعی چھان بین کی جائے تو جناب ابو بکر و جناب عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق انبیاء کرام علیہم السلام سے مشابہت کی اتنی حدیثیں ملیں گی کہ ان کا کوئی ہم عصر اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

اسی لئے محققین صوفیہ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کمالات نبوت کے حامل ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کمالات ولایت کے حامل۔ چنانچہ انبیاء کے کام یعنی کفار سے جہاد، احکام شریعت کو دینا، دنیا کی اصلاح، بحسن و خوبی شیخین رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سرانجام پائے اور اولیاء کے کام مثلاً تعلیم طریقت ارشاد و مقامات سالکین، نفس کے اسرار سے آگاہی اور دنیا میں رہیں ترغیب زیادہ تر حضرت علی سے مروی و منقول ہے۔

اور یہ بات عقل سے سمجھی جاسکتی ہے کہ ملکات کا سرخ ان افعال کے صدور سے لگ سکتا ہے جو ان کے ساتھ مفسوس ہے،

مثلاً اگر ایک شخص میدان کارزار میں ثابت قدمی دکھاتا ہے اور اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں تیغ زنی اور نیزہ بازی میں بازی بیجا ہے، تو یہ اس کی شجاعت نفسی کی واضح دلیل ہے۔ بلکہ محبت و عداوت، خوف و امید اور دوسرے باطنی امور بھی انہیں معاملات و افعال کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں،

اسی قیاس پر کسی شخص کے کمالات باطنی کے پتہ لگانے میں کہ آیا وہ کمالات نبوت کا حامل ہے یا کمالات اولیاء کا۔ اس کے خارجی افعال سے جو انہیں دو عمدہ اوصاف سے تعلق رکھتے ہیں، امتیاز حاصل ہوتا ہے اور شیعوں کی خود اپنی کتابوں سے منقول اس حدیث سے کہ اِنَّكَ يَا عَلِيُّ ثَقَاتِلُ لِلنَّاسِ عَلَى تَاْوِيلِ الْقُرْآنِ كَمَا قَاتَلَهُمْ عَلَى تَنْزِيلِهِ۔ میں واضح اشارہ ہے اسی تفرقہ امتیاز کی طرف ہے کیونکہ شیخین رضی اللہ عنہما کی جنگ و جہاد تنزیل قرآن پر مبنی تھی گویا ان کا عہد عہد نبوت کا ہی بقایا حصہ ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہما کا دور دور ولایت کا آغاز ہے اسی لئے شیوخ طریقت اور ارباب معرفت و حقیقت آغناہ کو باب ولایت محمدیہ کا قانع اور ولایت مطلقہ انبیاء کا خاتم لکھتے ہیں، یہی سبب ہے کہ اکثر اولیاء اللہ کے فرقوں کے سلسلے آغناہ ہی پر ختم ہوتے ہیں، اور وہ سب مذہبوں کی طرح آپ کی ہی ذات بحجرات سے بچھڑتے ہیں،

بالکل اسی طرح جس طرح فقہا شریعت و مجتہدین ملت کی شاگردی کے سلسلے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے متبعین تک پہنچتے ہیں مثلاً عبد اللہ بن مسعود و معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور ان ہی کے قطراتِ علیہ سے سب کے سب سیراب ہوتے ہیں،

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں جس معنی کی امامت باقی رہی اور بس کہے۔ لئے وہ ایک دوسرے کو دعی بناتے رہے وہ ارشاد ولایت کے قطب اور سرچشمہ ہونے کے معنی میں تھی گویا آپ ہی کی طرح آپ کی ذہبت بھی ارشاد و ولایت کا چشمہ فیض بنی رہی اور یہی وجہ ہے کہ اس امر کا تمام مخلوق پر لازم ہونا ان ائمہ کرام سے مروی نہیں بلکہ وہ اپنے چیدہ اور منتخب دوستوں اور برگزیدہ مساجد کو اس فیض خاص سے مشرف

فرماتے اور ان کی استعداد کے موافق اس دولت سے نوازتے۔ اور ان میں کے نام سجدہ ان تمام اشارات کو رہاست عامہ اور اسوہ ملک و مال میں استغفار و تقویٰ پر ڈھالتے رہے اور یوں گمراہی کے بھنور میں ڈبکیاں کھاتے رہے، اور یہی راز ہے کہ جناب امیرِ اہلِ آپ کی ذریت کرامِ رُحی اللہ عنہم کو پوری است پیروں، سرشدوں کی طرح مائیں اور عقیدت رکھتی ہے۔ اور دنیا کے کاموں کو ان سے وابستہ سمجھتی ہے اور فاتحہ و نذر و منت ان کے نام سے اسی طرح رائج ہیں جس طرح پیروں اور سرشدوں اور دیگر اولیاء اللہ کے ساتھ ہوتا ہے مگر ان معاملات میں شیعیانِ رُحی اللہ عنہا کا نام کوئی نہیں لیتا، اور نہ نذر و منت، مجالس و اعراس میں ان کو شریک کرتے ہیں نہ اس قسم کے دنیاوی کاموں سے انہیں وابستہ کرتے ہیں، گو ان سے محبت و عقیدت رکھتے اور ان کے فضل و کمال کے معتقد ہیں۔

(۶) سابقہ حدیث وہ ہے جس کی روایت جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں کہ مَنْ مَنَّا صَبَّ حَيْلًا لِيُخْلَدَ ذَنْبُهُ كَأَقْبَرٍ۔ جس نے خلافت کے لئے حضرت علیؑ سے جھگڑا کیا وہ کافر ہے، اہل سنت کے ہاں اس روایت کا کوئی اتہ پتہ، نام و نشان مطلق نہیں! ابنِ سطرہ علی نے اس روایت کی نسبت اخطب خوارزم کی طرف کی ہے اول تو خود ابنِ سطرہ نقل روایات میں بدنامی کی حد تک خائف ہے، اور پھر اخطب کثر زید یہ ہے،

پھر اس کی کتاب جو مناقب امیر المومنین میں ہے اس روایت کے وجود سے خالی ہے، باوجود تلاش اس کا کھوج نہیں لگایا جاسکتا۔ اور اگر ہو بھی تو وہ اس لئے غیر معتبر ہوگی کہ یہ ان احادیثِ صحیحہ کے مخالف ہے جو خود امامیہ کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً جناب امیرِ رُحی اللہ عنہ ہی کا یہ قول بیچ البلاغہ میں موجود ہے، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے،

أَحْبَبْنَا لِقَاتِلِ إِخْوَانِنَا فِي الدِّنْدَمِ عَلَى مَا دَخَلَ فِيهِ مِنَ التَّرِيغِ وَالِذِّغِ جَابِجٌ۔

اور اگر اس حدیث کو مقبر بھی مان لیں تو اس حدیث کا مضمون اس وقت متحقق ہو سکتا ہے کہ جناب امیرِ رُحی اللہ عنہ نے کسی وقت مطالبہ خلافت کیا بھی ہو، اور اس وقت کسی دوسرے نے ان سے اسے چھیننا چاہا ہو حالانکہ ایسا واقعہ کسی زمانہ میں بھی پیش نہیں آیا،

خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے زمانہ میں تو جناب امیرِ رُحی اللہ عنہ نے خلافت کا مطالبہ ہی نہیں کیا جیسا کہ امامیہ کی اپنی کتابوں میں موجود ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو وصیت فرما گئے تھے کہ اگر کوئی مددگار نہ ہو تو اس معاملہ میں سکوت اختیار کرے چنانچہ اسی وصیت کی پاسداری میں آپ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کے زمانہ میں خاموش رہے اور جب آپ نے خلافت کا مطالبہ کیا۔ اس وقت بھی حضرت طلحہ، زبیر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم نے بھی خلافت چھیننے کی نہ کوئی کوشش کی نہ مطالبہ کیا۔ ان حضرات کا مطالبہ تو صرف اتنا تھا کہ اب آپ باتنہارا امیر ہیں تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلین کی تقبیل اور ان کے بارے میں قصاص کا جلد بند و بستی فرمائیں۔ دگر سازشوں کی درپردہ سامی سے، رفتہ رفتہ یہ معاملہ جانہن کے قصد و ارادہ کے علی الرغم جنگ و جدال کی شکل اختیار کر گیا۔ چنانچہ کتب سیر اور جناب امیر کے خطبات (امیر گواہ ہیں،

پھر اگر یہ بھی تسلیم کر لیں تو لفظ کفر سے (حقیقی کفر نہیں بلکہ) کفرانِ نعمت مراد ہے اس لئے کہ اس پر سب متفق ہیں کہ آپ کے عہد میں آپ کی خلافت انتہی بڑی نعمت تھی جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور اس پر دلیل لفظ خلافت ہے کیونکہ خلافت بالا جماع زمین میں تصرف کے ساتھ مشروط ہے اور یہ تصرف آپ کو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد میں ملا ہی کہاں رجو کوئی اسے چھینتا یا انکار کرتا، اسی لئے حدیث میں لفظ امامت نہیں آیا۔ اور اگر اس کو مان بھی لیں۔ تو قرآن مجید کی آیت استخلاف میں خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے منکر کو بھی کافر فرمایا ہے اور آیت کو اسی پر ختم بھی فرمایا ہے،

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ اور جو کوئی اس آیت کے سننے اور اس کا علم ہو جانے پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلیفہ بنایا ہے اسے بعد انکار کرے وہی کاسل فاسق ہے،

اور محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ اخطب ذہیری کی ساری روایات مجہول الحال ضعیف راویوں سے منقول ہیں اور یہ کہ اس کی اکثر روایات منکر اور موضوع ہیں اسی لئے فقہانے اہل سنت اس کی روایات سے کوئی حجت و دلیل نہیں دیتے اور اسی وجہ سے علماء اہل سنت سے اس کا نام پوچھا جائے تو کوئی اسے نہیں پہچانتا۔

ان حالات میں اہل سنت کو اس زیدی کی روایت کے حوالہ سے الزام دینا بالکل اسی قطعہ طرے سے کہ ایک بوڑھا سنی ماثورہ کے دونوں میں کہیں جا رہا تھا، راستہ میں ایک سانپ دکھائی پڑا یہ اپنے بڑھاپے کے سبب سانپ کو مار نہ سکتا تھا، اتفاقاً وہاں سے ایک شیعہ نوجوان گزر رہا تھا۔ اس کو آواز دیکر بلا یا اور کہا اسے شیعہ بھائی تجھے عثمان غنیؓ کا واسطہ اس سانپ کو مار ڈال۔ یہ سکر شیعہ جوان واویلا کرنے اور فریاد کرنے لگا کہ مسلمانوں میری فریاد سنو، دیکھو یہ کس کو، کس کا واسطہ دیکر کن دونوں ہیں، کس جانور کو مارنے کے لئے کہہ رہا ہے۔

(۸) وہ حدیث جس کی ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

أَنَا وَ عَلِيٌّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ نَوْأُ ابْنَيْ يَدِي
اللَّهُ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ آدَمَ بِأَمْرٍ بَعْدَ عَشْرَةِ آَلَفٍ
عَامٍ فَلَمَّا خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ قَسَمَ ذَٰلِكَ النَّوْمَ
جُزْأَيْنِ فَجُزْءُ أَكَأ وَ جُزْءُ عَلِيٍّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ
میں اور اور علی بن ابی طالب بشکل نور اللہ تعالیٰ کے
سامنے چودہ ہزار سال رہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم
کو پیدا کیا تو اس نور کے دو حصے کئے پس ایک حصہ
میں اور ایک حصہ علی بن ابی طالب میں

اہل سنت کے نزدیک یہ روایت بالا جماع موضوع ہے۔ اس کی اسناد میں ایک راوی محمد بن خلف مزونی ہے یحییٰ بن معین نے اسے کذاب کہا ہے۔ دارقطنی نے اسے متردک کہا ہے اور اس کے جھوٹا ہونے کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس روایت کا ایک دوسرا سلسلہ سند بھی ہے جس میں ایک راوی جعفر بن احمد ہے۔ یہ منقشب رافضی اور جھوٹی روایات کرنے والا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی برائی اور ان کی سب و شتم کے سلسلہ میں روایات گھڑا کرتا تھا،

اور اگر اسے کسی درجہ میں قابل لحاظ مان لیں تو یہ ایک دوسری روایت کے مخالف ہے جو اس سے فی الجملہ بہتر ہے اس کی سند میں کوئی جھوٹا اور وضاع نہیں ہے جسے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كُنْتُ اَنَا وَابْنُ بَكْرٍ وَهَمِيرٌ وَعُمَانٌ وَعَلَى بَيْنِي يَدِي
اللَّهُ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ آدَمَ بِالْفَ عَامِ فَلَمَّا خُلِقَ
أَسْكَنَنَا طَهْرَةَ وَكَمْ نَزَلَ نَقْلٌ فِي الْأَصْلَابِ
النَّاهِرَةِ حَتَّى تَقْلَبَ اللَّهُ تَعَالَى إِلَى مُلْبِ إِلَى اللَّهِ
وَنَقْلٌ أَمَا بَكْرٍ إِلَى مُلْبِ أَبِي قَهَافَةَ وَنَقْلٌ عَمَرَ
إِلَى مُلْبِ الْخَطَّابِ وَنَقْلٌ عُمَانٌ إِلَى مُلْبِ
عَمَانَ وَنَقْلٌ حَيْثَا إِلَى مُلْبِ أَبِي طَالِبٍ

میں، ابو بکر، عمر، عثمان و علی تخلیق آدم سے ہزار سال
پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے تھے جب ان کو پیدا کیا تو ہمیں
ان کی پشت میں قائم فرمایا اور یوں ہم پاک پشتوں
میں منتقل ہوتے رہے حتیٰ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے
عبداللہ کی صلب میں منتقل کیا تو ابو بکر کو ابو قحافہ
کی عمر کو خطاب کی عثمان کو عفان کی اور علی کو ابی
طالب کی صلب میں منتقل فرمایا۔

اس حدیث کی کوئی ایک دوسری مشہور حدیث بھی ہے، وہ یہ ہے،

الدُّسُودُ أُمُّ جُنُودٍ مُجْتَمِعَةٍ مِمَّا تَعَامَفَ مِنْهَا
إِخْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا إِخْتَلَفَ
اور جن میں نا آشنائی تھی وہ دنیا میں بھی باہم اگان رہے۔

اور ساری ننگ و دو اور رد و کہ کے بعد بھی یہ روایت ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرنی کیونکہ جناب امیر کی
فور نبوی میں شرکت بھی ان کی امامت بلا فصل ثابت نہیں کرتی ان ہر دو کے درمیان تلازم اس طرح ثابت ہونا
چاہیے کہ اعتبار کا اعتبار بھی اسے نہ چھو سکے مگر اس کے ثبوت میں مشکلات کے مراحل حاصل ہیں۔ جناب امیر کو
حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قرب حاصل تھا، اس میں تو کوئی کلام نہیں کلام تو اس میں ہے کہ یہ قرب امامت
بلا فصل کا سبب ہے، یا نہیں! اگر قرب نبوی ہی صرف امامت کا سبب ہوتا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ امامت
و خلافت کے زیادہ حقدار تھے کیونکہ آپ چچا بھی تھے اور والد بزرگوار کے شریک اصل بھی! اور ظاہر ہے
چچا، چچا زاد بھائی سے عرفاً و مشرماً اقرب ہے،

اور اگر کوئی یہ کہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نور سے محروم تھے اس لئے بیات امامت سے محروم ہوئے
کیونکہ نور عبد المطلب حضرت عبداللہ اور جناب ابوطالب میں بٹ گیا دوسرے بیٹوں کے حصہ میں نہیں آیا تو ہم یہ
کہیں گے کہ اگر نور کی قوت و کثرت پر مدار تقدم ہے تو پھر حضرات حسنین رضی اللہ عنہما قوت و کثرت ہر دو جہت
سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بھی امامت میں احق اول ہوں گے باعتبار قوت تو اس طرح کہ جب نور بیٹا تو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ حضور ہی کو ملا اور وہی نور حضرات حسنین کو تقسیم ہوا۔ بخلاف جناب امیر کے کہ آپ
اصل نور میں ہی شریک تھے، نور پیغمبر میں تو شریک نہیں تھے، اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ کا نور
دوسرے کے نور سے زیادہ قوی ہے،

اور بلحاظ کثرت اس طرح کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اپنے اندر نور مصطفویٰ اور نور مرتضویٰ دونوں رکھتے
تھے، اور دو نور ایک نور سے قطعاً زیادہ اور اکثر ہے!۔

(۹) وہ حدیث جو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیر کے دن آپ نے فرمایا۔

لَا عَظِيمَيْنِ الرَّأْيَةِ قَدْ أَرَادَ جَدُّ حَبِيبِ اللَّهِ وَ
کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں کا جو اللہ و رسول سے

سَمُّوْكَ وَيُحِبُّكَ اللهُ وَسَمُّوْكَ يَفْتَحُ اللهُ
عَلَى يَدَيْهِ۔

محبت رکھتا ہے اور اللہ در رسول اس کو محبوب رکھتے
ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح دے گا۔

یہ حدیث صحیح تر بھی ہے اور قوی الروایت بھی، یہ اہل سنت کے سر کا جھومر اور آنکھوں کی روشنی ہے اور خراج
وفراصب کے اقوال کو رد کرنے کی خاطر اپنی کتابوں میں بڑے اعتماد و وثوق سے درج بھی کرتے ہیں مگر افسوس
ہے کہ شیعوں کا مدعا اس روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ خدا و رسول کا محب محبوب ہونا بھی اس بات کو
مستلزم نہیں کہ وہ امام بلا نسل بھی ہو۔ (اور اگر انہیں اس پر اصرار ہی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جو خدا و رسول کو محبوب
مکھے وہی امام بلا نسل ہوئے یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) کیونکہ ان دو صفوں کا کسی ایک شخص کے لئے
ایک کلام میں ثابت کرنا دوسروں سے ان صفات کی نفی نہیں کرتا اور یہ ہر بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ
نے یُحِبُّكَ وَيُحِبُّوْكَ، خود حضرت ابو بکر اور ان کے رفقاء رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا ہو یا اہل بدر
کے حق میں ارشاد فرمایا۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ
صَفًا كَانَتْهُمْ بُيُوتًا مَرْمُوسًا۔

بے شک اللہ تعالیٰ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی
راہ میں صف بستہ ہو کر قتال کرتے ہیں گویا وہ سیسہ
پلائی ہوئی ایک دیوار ہیں،

اور اس میں کوئی شک نہیں اللہ جسے دوست رکھے اس کا رسول بھی ان کو دوست رکھتا ہے اور مومنوں میں
جو اللہ کو دوست رکھتا ہے وہ اس کے رسول کا بھی محب ہے!

اور اہل مسجد تبا کی شان میں ارشاد فرمایا ہے،
فِيهِ مَجَالٌ يَجْتَنِبُونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ
الْمُتَطَهِّرِينَ

اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت کو بہت پسند کرتے
اور اللہ تعالیٰ طہارت پسند لوگوں کو محبوب رکھتا ہے،

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنِّي أُحِبُّكَ دِمْ تَمُّوْكَ دُوسْت رُكْهَتَا
مہوں!۔

وَكَمَا سَأَلَ مَنْ أَحَبَّ النِّسَاءَ اِيْكَ قَالَتْ
عَائِشَةُ قِيْلَ مِنَ الرِّجَالِ قَالَ اَبُوْهَا۔

اور جب آپ سے پوچھا گیا اہل بیت مستورات میں سے
آپ کو کونسی زیادہ محبوب ہیں، تو آپ نے فرمایا عائشہ

پوچھ لیا کہ مردوں میں سے کون؟ فرمایا ان کے والد۔
اگر شیعوں کو یہ اشکال ہو کہ جب خدا و رسول کا محب و محبوب ہونا دوسروں میں بھی پایا گیا تو پھر جناب امیر
رضی اللہ عنہ سے اس کی تخصیص نہ رہی حالانکہ یہاں (واقعہ خیر میں) تخصیص ہونی چاہیے تو اس کے جواب میں
یہ کہا جائیگا کہ یہاں تخصیص باعتبار مجموع صفات کے ہے یعنی بلا لا یفتحہ اللہ علی یدہ اور چونکہ علم الہی میں
جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر اس کی فتح مقدر تھی، اس لئے وہ سب صفات محمودی حیثیت سے جناب امیر
کے ساتھ مخصوص ہوئیں گو علیہ علیہ دوسروں میں پائی باقی ہیں۔

پھر اس صفت کا ذکر جو دوسروں میں بھی مشترک ہے۔ یہاں ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے،

وہ یہ کہ حدیث صحیح میں وارد ہے **إِنَّ اللَّهَ يُؤْتِي هَذَا الدِّينَ بِالنَّجْلِ الْعَاجِرِ** بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کی مدد و تائید ناچر شخص سے بھی کر دیتا ہے۔

لہذا اگر صرف تلمذ کی نفع جناب امیرِ مہدی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیان کر دی جاتی تو وہ آپ کی فضیلت و بزرگی کا سبب نہ ہوتی، اسی وجہ سے ان مناسبات کو پہلے ذکر فرمایا۔

دوسرا جواب تنقیس کا یہ ہے کہ کلامِ عرب بلکہ تمام فروع کی گفتگو میں پہلے ایک خبر بطور تمہید ہر تائب اور مقصود اس کے بعد کا حصہ ہے۔ جیسے رجال کا لفظ اس حدیث میں۔ یا جیسے کہتے ہیں **أَوَّلُ مَا يَكُونُ مِنْ عَقْلِنَا** ہے۔ تو یہاں زید کا مرد ہونا بیان میں مفہور نہیں بلکہ اس کا عقلمند ہونا مفہور بیان ہے۔ اسی طرح یہاں بھی مقصود **تَوْفِيقُ اللَّهِ عَلَى يَدَيْهِ** سے آپ کی تنقیس ہے اور **سَاجِدًا لِلَّهِ يُحْيِيهِ اللَّهُ وَكَمَا مَوَّلَانَا وَيُحْيِي اللَّهُ وَرَسُولُهُ** محسن تمہید بیان ہے۔

(۱۰) یہ حدیث، **سَاجِدًا لِلَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ** اور **الْحَقُّ مَعَهُ حَيْثُ دَامَ اللَّهُ عَلَى** پر رحم کرے اسے اللہ حق کو علی کے ساتھ گھما دے۔

اہل سنت بھی اس حدیث کو سرائے نکھوں پر جگہ دیتے ہیں مگر اس کو کہی کہا جائے کہ شیعوں کا مدعا یعنی امامت بلا فصل اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ یہ حدیث اس مدعا سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی یوں تو جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ فرمایا ہے، **أَلْحَقْنِي مَعَ عَمَّارٍ حَيْثُ دَامَ**۔ حق عمار کے ساتھ ہے وہ بدر بھی گھر سے بلکہ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو حضرت عمر کے ساتھ حق کی معیت کی خبر دی جا رہی ہے بخلاف جناب امیرِ مہدی اللہ عنہ کے کہ وہاں ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جا رہی ہے کہ حق ان کے ساتھ گھومتا رہے۔ اب اخبار و دعا کا فرق جو ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں، خاص طور پر شیعوں کے طے شدہ اصول کے مطابق کیونکہ وہ نبی کی ہر دعا قبول ہو نامزدوری خیال نہیں کرتے چنانچہ ابن بابویہ قمی نے ایک روایت بحوالہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی ہے کہ آپ نے اپنے رب سے دعا کی کہ آپ کے سب اصحاب کو آپ کی محبت پر جمع کرے الی آخر الروایت۔ (۱) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں بعد ہی بھی فرمایا جس سے آپ کی امامت کے صحیح ہونے اور ہر اس شخص کی صحت امامت کا جس کو آپ امام سمجھیں ضعیف اشارہ نکلتا ہے،

اگر شیعوں کی طرح اہل سنت کا بھی یہ عقیدہ و مذہب ہو تا کہ نبی کے علاوہ بھی کوئی اور معصوم ہو سکتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صحت پر یہ پہلی دلیل ہوتی مگر چونکہ یہاں شیعوں کے پیش نظر اہل سنت کی روایات سے تمسک اور ان کو الزام دینا ہے اس لئے یہ مزدوری ہے کہ ان کی تمام روایات کو قبول کریں،

اہل سنت کے بعض ظریف البلع حضرات نے شیعوں کے مقابلہ میں حدیث اور الحق معہ سیث داسما

سے حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت صحیح ہونے پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر معاملہ میں ان کے ساتھ تھے بیعت میں ساتھ تھے ان کی متابعت فرماتے، جمعہ و جماعت میں ان کے ہمراہ نماز کی ادائیگی میں اسدِ ریاست میں مشورہ دینے میں ان کے دست راست لہذا اس سے قیاس مساوات بنتا ہے

کہ حق علی کے ساتھ ہے اور علی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں، لہذا حق بھی ابو بکر و عمر کے ساتھ ہے اور مقدمہ اجنبیہ جو اس قیاس میں صحت کا نتیجہ کا مدار ہے سچا ہے اس لئے کہ مقارن کا مقارن مقارن ہوتا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ یہ استدلال اپنی جگہ بہت مضبوط اور محسوس ہے گو ذکر کرنے والے نے بطور لطیفہ و ظرافت اس کو بیان کیا ہے اس لئے کہ شیعہوں کی اس روایت کے مطابق ہے جو بیچ البیانہ میں ہے یہ کتاب ان کے نزدیک اصح الکتاب اور متواتر ہے چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتنہ نہادند کے فرو کرنے کے لئے خود بنفس نفیس جانا چاہا تو مشورہ میں صحابہ کی آراء مختلف ہوئیں، بعض نے اس اقدام کی حمایت کی اور بعض نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا، تب آپ نے جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا وہ تفصیل سے باب ہفتم کے عقیدہ ششم میں تحریر کر آئے ہیں وہاں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے،

جناب امیرِ مومنین رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ دل و جان سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ناصر و مدینِ ناصح و امین تھے۔ اگر معاذ اللہ آپ دل میں ان کی طرف سے کوئی گرو رکھے ہوتے تو اس سے زیادہ اچھا موقع کب آسکتا تھا، کہ ان کو عمر کی طرف جانے کا مشورہ دیتے اور حبیب وہ اور ان کے عساکر جنگ میں الجھ جاتے یا شکست سے دوچار تو آپ حجاز میں جو اسلام کا دار السلطنت تھا۔ صاحبِ تصرف قرار پا جاتے تو لوگ چار و ناچار آپ کی اتباع کے لئے سر جھکا دیتے مگر آپ کے قلب مبارک میں نہ کوئی کھوٹ تھا اور نہ آپ اپنے کو ان حضرات کے زمرہ سے علیحدہ شمار فرماتے تھے، بلکہ اس روایت سے تو واضح اشارہ اسی بات کا ملتا ہے کہ جناب امیرِ مومنین رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو زمرہ ابو بکر و عمر میں شمار فرماتے تھے، اسی لئے آپ نے یہ ارشاد الفاظ ارشاد فرمائے و نحن علی موعود من اللہ۔

اور بیچ البیانہ ہی میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے خود وہ روم کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا۔

ترجمہ: آپ بنفس نفیس دشمن سے مقابلہ کے لئے جائیں گے اور اگر شکست کھا کر واپس ہوں گے تو مملکت کے آخری سرے سے لے کر یہاں تک مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی نہ آپ کے بعد کوئی ایسا ٹھکانہ و مرکز ہوگا کہ لوگ وہاں جمع ہو جائیں لہذا ایک آزمودہ کار آدمی ان کے مقابلہ کے لئے بھیجئے اور ساری ادنیٰ بیچ بچھا کر اس کا حوصلہ و بہمت بلند کیجئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے قلب و فتح عطا فرمائی تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور اگر نتیجہ برعکس نکلا تو آپ لوگوں کے لئے پشت پناہ اور جائے امن ثابت ہوں گے۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ شیعہ اس قسم کی روایات کو جو ان کی اصح اور متواتر روایت کتابوں میں موجود ہیں، پڑھتے اور سنتے ہیں، تو ان دیکھی اور ان سنی خیال کو کہ گزر جاتے ہیں، اور حوصلوں کی گھڑی ہوئی افرادِ امین و راہبوں کو مددِ جبر کی مخالفت اور منافقت کی بنا پر باہم روایت کرتے اور پھیلاتے ہیں ان کے مقابلہ کی ان صمیم

روایات کو دیکھ کر اوسان خطا ہو جاتے ہیں، تو آئیں بائیں کرتے ہوئے کبھی تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ جناب امیر کی یہ بیوی اور متابعت شیعین رضی اللہ عنہما کے حق میں محض اس وجہ سے تھی کہ آپ کے سعادن اور مدگار کم تھے اور پھر جب خود اپنی صیغہ السنہ و روایات دیکھتے ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی قوت غلبہ اور اعوان و انصار کی کثرت پر واضح ظہور دلاتی کرتی ہیں، تو شرمزدہ اور نادام ہوتے ہیں مثلاً وہ روایت جو ابان بن ابی عباس نے سلیم بن قیس ہلالی سے کی ہے۔ یا اس کے علاوہ کچھ اوروں نے بعض دوسروں سے نقل کی ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

وَاللّٰهُ كَيْدٌ لِّدُنِّيَّ بَايَعُ اَبَا بَكْرٍ لَا تُفْلِكَ قَالَ
لِيْ عَلَيَّ لَوْ لَا عَهْدِيْ عَمَلًا اِلَىٰ خَلِيلِيْ لَسْتُ اُخَوِّفُكَ
فَعَلِمْتُ اَيُّنَا اَضْعَفُ نَاصِرًا اَوْ اَقْلُ عَدُوًّا

خدا کی قسم اگر تم نے ابو بکر کی بیعت نہ کی تو میں تم کو قتل کر دوں گا جناب میں جناب علی نے فرمایا اگر وہ عہد نہ ہوتا مجھ سے میرے خلیل نے کیا ہے اور جس کو میں

ٹوڑنا نہیں چاہتا تو چننے چل جاتا کہ ہم میں سے کسی کے مددگار کمزور یا عدد میں کم ہیں، یہ روایت ڈنکے کی چوٹ کہہ رہی ہے کہ جناب امیر کا سکوت محض اس بات کی وجہ سے تھا جو آپ اپنے خلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے کہ خلافت بلا فصل اول ابو بکر کا حق ہے، پھر عمر کا (رضی اللہ عنہم)، اور اس بات پر کہ عہد مذکور بھی ہے اصول شیعہ کے موافق برہان عقلی بھی ہے۔ کہ اگر امامت کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، باوجود انصار و اعوان کے جیسا کہ اس روایت سے آشکار ہے آپ کو شیعین رضی اللہ عنہما سے جھگڑا نہ کرنے کی وصیت فرما جاتے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ امر الہی کو مطلق چھڑ دینے کی وصیت فرما گئے ہوں کیونکہ اس صورت میں جناب امیر کو "اہل باطل کے اتباع کی وصیت فرمائے اور امت کو لطف سے محروم فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا، یا ایہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی القالی اسے نبی مومنوں کو لڑائی پر ابھاریے اس وقت کہ دس کافروں کے مقابل ایک مسلمان ہوتا تھا، جناب رسالتاب صلی اللہ علیہ وسلم بڑی تاکیدات سے جہاد پر آمادہ فرماتے تھے، اور جب دین مکمل ہوا اور اتمام نعمت ہو چکا تو آپ شیعہ خدا جیسے شخص کو بزدلی اور خوف کا سبق دین تبلیغ احکام کو ترک کر لیں فتنہ فساد، تحریف کتاب اللہ اور تبدیل دین کو روا رکھیں البتہ بال اللہ شان نبوت و رسالت کو اس وصیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آیَا مُرَّكُمْ بِالْكَفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (کیا تمہارے مسلمان ہونے کے بعد وہ تم کو کفر کا حکم دیتے ہیں) اور کبھی شرمندگی مٹانے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ جھگڑے سے کنارہ کشی اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلفاء خلافت

رضوان اللہ علیہم کے ساتھ موافقت، وفاداری اور صلح جوئی میں محض افعال الہی کی اقتداء نہ نظر تھی۔ یہ توجہ ابو جعفر طوسی کے پوتے ابن طاووس کی زہنی اختراع ہے جیسے دوسروں نے بھی سینوں سے لگا لیا ہے حالانکہ یہ ایسی توجہ یہ ہے کہ نہ اس کا سر ہے نہ پیر کیونکہ افعال الہی کی اقتداء واجب تو کیا ہوتی جائزہ بھی نہیں البتہ امثال اوامر ضروری ہے خدا تعالیٰ کا فعل تو بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کافر کی مدد کرتا ہے اور مسلمان صالح کو نکال دیتا ہے

حالانکہ یہ کسی مسلمان کے لئے بھی جائز نہیں، کہ کافر کی مدد کرے اور مسلمان کو قتل کر دے شان بندگی تو یہی ہے کہ اپنے مالک و آقا حکم کی

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اطمینان سے کام لینا اور کام میں جلدی نہ کرنا قابلِ تشریف ہے تو یہ بات اچھے اور نیک کاموں کے لئے نہیں اس لئے کہ مثلاً آقا اپنے رسولوں، پیامبروں اور غلاموں کو فوری حکم صادر کرے اور وہ سچا ہوں دکھا سکیں یا سستی کریں تو وہ کھلم کھلا نافرمانی کے داعی سے دامن دار ہوں گے جیسا کہ فرمایا۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ**۔ اور جلد بازوں کی تشریف میں فرمایا **أَرْسَلَكُمْ فِي الْأَنْحِلِثِ وَحَدَسَاتِكُمْ** (یہی ہیں جو اچھے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی سبقت لے جانے والے ہیں، اسی لئے مثل مشہور ہے نیک کام میں سوتی، بھار کی حاجت نہیں! (درکارِ خیر حاجتِ بیجا استنہاہ نیست)

اور امام کے لئے دھیمہ اپن کس طرح جائز ہو سکتا ہے جبکہ حقوق کی ہدایت اور گمراہیوں کی رہنمائی اس کے ذمہ لازم ہے کیونکہ سستی اور دھیمے پن سے بہت سے واجبات ہاتھ سے نکل جائیں گے اور پھر اطمینان کہ بھی کوئی حد بندی چاہیے پچیس سال کا عرصہ کوئی اطمینان میں نہیں گزارتا۔

اگر اس پر یہ کہا جائے کہ جناب امیر مہدی علیہ السلام کی یہ آہستہ مدعی امر الہی کی وجہ سے مٹھی اس لئے نرک واجب لازم نہیں آتا تو ہم کہیں گے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جناب امیر کی امامت و حدود میں نہیں آئی ہوگی ورنہ امام کا مقرر کرنا اور حکم دینا کہ آہستگی برتے اور لوازم امامت کو معطل رکھے، دونوں باتیں باہم متضاد و مخالف ہیں اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ کسی کو قاضی مقرر کرے اور کہے کہ پچیس سال تک اپنی تشا کا اظہار نہ کر کوئی مقدمہ اپنے سامنے پیش نہ ہونے دے اور دو آدمیوں کے بارے میں لب نہ بلا۔ یہ الفاظ تو واضح طور پر ایک ہی بات ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی صرف تشا کا وعدہ ہے، قاضی کا تقرر عمل میں نہیں آیا۔ پچیس سال بعد وہ قاضی ہو گا۔

اگر اس کو ظاہر پر محمول کریں تو یہ کھلا تناقض ہو گا۔ اور تائیدی کے تقرر سے جو غرض و مقصد مد نظر ہوتا ہے اس کا فہم ہونا لازم آئے گا یہ کوئی عقل مند کی بات نہ ہوگی اس کی قباحت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک اور بالا و برتر ہے۔

اور ایک بات اس سے یہ بھی نکلتی ہے کہ جب جناب امیر ربیعہ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آمدنگی برتنے کے لئے مامور ہوئے، اور آپ نے دعوائے امامت قطعاً ظاہر بھی نہ فرمایا تو لہذا محالہ مکلفین آپ کی اتباع اور پیروی نہ کرنے میں معذور ہوں گے۔ اسباب گروہ دین و دنیا کے اہم کاموں کو انجام دینے کے لئے اس درمیانی مدت میں کسی اور کو نامزد کر لیں تو وہ عتاب و عقاب کے سزاوار ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، (۱) یہ حدیث جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اَنَّا اَنْزَلْنَاهُ عَلَىٰ نَبِيِّكَ بِالْحَقِّ مَصْرُورًا ۝ فَلَوْلَا اِذْ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ عَلٰى رَبِّكَ اَنْ يَّسْمِعَكَ الْاَعْيُنُ السَّمْعَ اَوْ يَنْزِلَ عَلٰىكَ الْقُوَّةُ اَنْ تَقُلَ مَا يَمْشِي السَّجْدُ ۝ فَلَوْلَا اِذْ جَاءَكَ الْاَنْصَارُ اَنْ تَقُلَ مَا يَمْشِي السَّجْدُ ۝ فَلَوْلَا اِذْ جَاءَكَ الْاَنْصَارُ اَنْ تَقُلَ مَا يَمْشِي السَّجْدُ ۝

یہ حدیث بھی اثباتِ دعا سے بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتی کیونکہ حدیث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ تم کسی وقت تاویلِ قرآن پر قتال کرو گے۔ اہل سنت کا مسلک بھی یہی ہے کہ جنابِ امیرِ مومنینؑ اللہ عنہ اپنی لڑائیوں میں حق بجانب

تھے اور آپ کے مخالفین خطا کار! اس حدیث میں وہ کوفی وجہ ہے جس سے آپ کی امامت بلا فصل ثابت ہو سکے۔ بلکہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ تاویل قرآن پر قتال اور امامت بلا فصل میں ایک کو دوسرے کے ساتھ کسی وجہ سے بھی کوئی تلازم نہیں، لہذا اس حدیث کو اہل سنت کے مقابلہ میں لانا انتہائی نا سمجھی کی بات ہے، ہاں اس کو اہل سنت کے مذہب کی دلیل ٹھہرائیں تو یہ درست ہو گا۔ کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیر مومنین اللہ عنہ کسی وقت امام ہوں گے، اور تاویل قرآن پر قتال فرمائیں گے اور ان کے قتال کا وقت معلوم ہی ہے کہ کب تھا۔

اور پھر یہ حدیث اہل سنت کے اس دعوے کی دلیل بھی ہو سکتی ہے کہ حق۔ جناب امیر مومنین اللہ عنہ کی طرف تھا اور آپ کے مخالف خطا پر تھے، کہ قرآن کے معانی سمجھنے میں ان سے خطا ہوئی اور ایک اجتہادی غلطی کے شکار ہوئے۔

یہ شیعوں کی بد قسمتی سے کہ بے وقوفی کے سبب اس قسم کی احادیث کو اس مقام پر لاتے اور اپنی ندامت و شرمندگی کا سامان اپنے ہاتھوں کرتے ہیں، کیونکہ یہ احادیث تو ان کی تائید کے بجائے علی الاعلان ان کی تردید کرتی ہیں ظاہر ہے کہ تاویل قرآن بالا جماع کفر نہیں اگر قرآن کے ظاہری معنی سے غلط فہمی کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ تاویل کر لے اور اصلی معنوں تک رسائی نہ ہونے کے سبب انکار کر بیٹھے تو اس کے کفر میں بھی کلام ہے نہ کہ جو معنی غنی یعنی تاویل سے منکر ہو۔ حالانکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ سے لڑنے والے کافر ہیں، جیسا کہ طوسی کی تجزیہ القائد میں صاف موجود ہے،

(۱۲) بارہوی حدیث وہ ہے جو حضرت زبیر بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،
عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ
الْثَّقَلَيْنِ مَا إِن تَمَسَّكْتُم بِهِمَا لَنْ تَفْشُوا بَعْدِي أَهْلًا
أَخْلُفُ مِنَ الْآخِرِينَ يَا بَنِي اللَّهِ وَعِشْرَتِي۔
نبی رحمت علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں دو مرکز
ثقل چھوڑ رہا ہوں جب تک تم ان دونوں کو چھلے
رہو گے تو میرے بعد بھی گمراہ نہ ہو گے ان میں سے ایک

دوسری سے بڑھ کر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری عترت
یہ حدیث بھی احادیث مابقی کی طرح اصل مدعا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی آخر وہ ایسی کونسی مجبوری اور ضرورت
ہے کہ مالک ریاست کبریٰ ہی سے شک و استدلال ہو اور اگر اسے مان لیں تو اس کے ساتھ ساتھ ایک اور
بھی تو حدیث میں ہے کہ۔

عَلَيْكُمْ لِسْتِي وَمَسَلَّةُ الْخُلَعَاءِ الرَّاشِدِينَ لِلْهَدْيَيْنِ
مَنْ بَعْدِي تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَصُوا عَلَيْهَا بِاللَّهِ جِدَّ۔
تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی
سنت میرے بعد لازم ہے اسے مقام لو اور مضبوطی
کے ساتھ دانتوں سے پکڑ لو۔

اور پھر ملو تہارا کہا ہی سہی لیکن لغت عرب میں فترت اقارب کے معنی میں آتا ہے۔ اگر اس کی دلالت امامت
پر ہوگی تو حضور علیہ وسلم کے تمام اقارب ائمہ واجب الطاعت ہونے، لازم ہوں گے، خصوصاً عبداللہ بن
عباس، محمد بن الحنفیہ، زبیر بن علی، حسن مثنیٰ، اسحاق بن جعفر صادق رحمہم اللہ اور ان جیسے، دیگر اہل بیت!۔

اور صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ خُذُوا شَطْرَ دِينِكُمْ هَذَا الْحُسْبُورُ آدِہِنا اَدِہِنا دین اس حیر سے ہو۔
یعنی حضرت عائشہ صدیق رضی اللہ عنہا سے

وَاحْتَدُوا بِمَقْدِي عَمَّارٍ وَتَسْلُوْا اِبْنِ اُمِّ عَبْدِ عَمَّارٍ سے روش برداشت سیکھو، اور عبد اللہ بن مسعودؓ کی وصیت کو مضبوطی سے تھام لو

وَمَا جَنِّتُ لَكُمْ مَا مَنَعَنِي لَكُمْ اِبْنُ اُمِّ عَبْدِ عَمَّارٍ وَعَلَمْتُكُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مَعَاذُ بَنِ جُبَلٍ۔
عبد اللہ بن مسعودؓ تم سے جس بات پر خوش ہوں میں بھی اس پر خوش ہوں۔ اور تم میں مسافر بن جبلؓ کے حلال و حرام

کا زیادہ علم رکھنے والے ہیں،

اسی طرح کی اور بھی بے شمار احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ خصوصاً آپ کا یہ فرمان اَتَيْنَا اَبْنِ اُمِّ عَبْدِ عَمَّارٍ مَعَنَا مِثْلُ اَهْلِ بَيْتِي فَبَيْنَا مِثْلُ سَفِينَةٍ كَوْجَمٍ مِّنْ مَّاءٍ كَبْهَاءٍ نَّبِيٍّ وَمِنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا حَرِيْقٌ۔ میں نے آپ کے ساتھ میرے بعد دین میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو، اور یہ حدیث تو شہرت و تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے تو اب یہ لازم آیا اور ضروری ہوا کہ سب ہی اشخاص امام ہوں۔

اس کے علاوہ اگر یہ حدیث تحت دلیل امامت ہو تو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے، اور جسے شیعہ متواتر مانتے ہیں کہ اَتَيْنَا اَبْنِ اُمِّ عَبْدِ عَمَّارٍ مَعَنَا مِثْلُ اَهْلِ بَيْتِي فَبَيْنَا مِثْلُ سَفِينَةٍ كَوْجَمٍ مِّنْ مَّاءٍ كَبْهَاءٍ نَّبِيٍّ وَمِنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا حَرِيْقٌ۔ میں میرے اہل بیت کی مثال لوح کی کشتی کی سی ہے کہ جو اس میں سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا ڈوب گیا، صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فلاح و ہدایت ان سے محبت و دوستی سے وابستہ ہے اور ان کی اتباع پر موقوف، اور ان کی محبت و دوستی سے روگردانی بے فائدگی کا باعث!۔

اور بخشنہ تعالیٰ سارے فرق اسلام میں سے اہلسنت کی کبریٰ سعادت نصیب ہے اور دیگر مذاہب کے مقابلہ میں صرف انہی کے مذہب و مسلک کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے تمام اہل سنت کی محبت کی رسی کو پورے طور پر تمام رکھا ہے، اس طرح نہیں کہ اَفْتَدُوْا مِثْلَ بَيْتِي وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضِ كِتَابِي کی ایک بات مانتے ہیں، اور کچھ کا انکار کرتے ہیں،

بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ایمان کے بموجب کہ لَا تَفْتَرُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِيْ (ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے ساتھ فرق نہیں کرتے، بعض سے محبت یا ان پر ایمان اور بعض سے عداوت یا کفر اختیار نہیں کرتے، اور ان شیعہوں کا یہ حال ہے کہ ان میں کا کوئی فرقہ تمام اہل بیت کو دوست نہیں رکھتا، بعض ایک طائفہ سے دوستی رکھتے ہیں تو باقیوں سے بغض عداوت۔ اور بعض دوسرے طائفہ سے ایسی حال ان کے اتباع و پیروی کا ہے، بخلاف اہل سنت کے کہ کسی ایک پر انحصار کنز سب سے روایات لیتے ہیں، اور ان سے تسک و استدلال کرتے ہیں چنانچہ ان کی کتب تفسیر و فقہ و حدیث اس پر گواہ ہیں، اگر کتب اہل سنت کا اعتبار نہ کریں تو پھر مرویات شیعہ کا کیا جواب ہے جن کو اس کتاب میں نقل کیا ہے اور جو عقائد الہیہ سے لے کر فروع فقہیہ تک اہل سنت کے مذہب کے موافق ہیں،

اس موقع پر بعض خوش طبع شیعہ، دلفریب تقریر جھاڑتے ہیں، ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کو یہاں نقل کر کے

ان کی فریب بازی کو دامن کر دیں، وہ کہتا ہے کہ اس حدیث میں اہل سنت کی سفینۂ نوح سے تشبیہ اشارہ کرتی ہے کہ تمام اہل میت کی محبت اور سبکی اتباع نجات و فلاح کے لئے ضروری نہیں، اس لئے کہ اگر ایک شخص نے کشتی کے ایک کونے میں اپنی جگہ پکڑ لی تو بلاشبہ اس کو ڈوبنے سے نجات مل گئی ساری کشتی میں پکڑ لگاتے پھرنا کبھی اس کونہ میں کبھی اس کونہ میں، نہ اس کا کوئی عادی ہوتا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے، لہذا جب شیعوں نے کسی اہل بیت سے تعلق رکھا اور ان کی اتباع کو اپنا مقصد ٹھہرایا تو بلاشبہ اسے راہ نجات مل گئی۔ اور اہل سنت کا یہ الزام کہ انہوں نے بعض کی امامت ترک کی۔ صیح نہ رہا۔

بجاء اللہ اہل سنت اس کا کافی جواب دے سکتے ہیں، اور دو طرح سے۔ اول بطریق نقضی والزام کہ اگر یہی بات ہے تو امامیہ کو چاہیے کہ زیدیوں، کیسیائیوں، ناؤسیوں اور انصاریوں میں سے کسی کو نہ گمراہ کہیں نہ ان کی تکفیر و تفسیق کریں بلکہ ان کو ناجی اور باہر اد خیال کریں، کیونکہ ان میں سے ایک ہر فرقہ نے اس وسیع کشتی کا ایک گوشہ پکڑا ہوا ہے اور اس کو اپنا ٹھکانا بنالیا ہے، اور بقول تمہارا ہے ایک گوشہ ہی ڈوبنے سے بچانے کے لئے کافی ہے، بلکہ اس صورت میں تو بارہ اماموں کی تعین بھی خطرہ میں پڑ جائے گی کیونکہ کشتی کا تو ایک کونہ ہی نجات کے لئے کافی ہے، بارہ گوشوں کی کیا ضرورت ہے۔

اور امام دہی ہے جس کی اتباع نجات آخرت کی موجب ہو، اور پھر مولیٰ تو اٹنا مشر بہ ہی نہیں پورا سلسلہ امامیہ ہی زبردست اور درہم برہم ہو جائے گا، یہی بات زیدیہ کہیں تو یہی بات ان کے خلاف بھی جا بیگی گویا اس صورت میں شیعوں کے فرقوں میں سے کوئی فرقہ اپنے لئے، کوئی خاص مذہب مخصوص نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان کو چاہیے کہ اپنے سب ہی مذاہب کو مبنی برحق اور صواب و درست سمجھیں۔ حالانکہ ان کے مذاہب میں باہم جو تناقض اور تضاد ہے اس کو معلوم کرنے کے لئے کسی علمی گہرائی میں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اجتہادات کے علاوہ تناقض کے دونوں اطراف کو حق جاننا اجتماع نقیضین کا قائل ہونا ہے جو محال ہے،

دوسرا جواب بطریق حل ہے وہ یہ کہ ایک کونہ میں جگہ پکڑ لینا اس وقت ڈوبنے سے بچا سکتا ہے کہ دوسرا کونہ اس کی تحریک کاری سے محفوظ رہے اور وہ وہاں سوراخ نہ کرنے لگے اگر ایک کونہ میں مقیم رہ کر دوسرے کونہ میں سوراخ کرے گا تو ہرگز ڈوبنے سے نہ بچ سکے گا اور شیعی فرقوں میں ایک بھی فرقہ ایسا نہیں جو ایک کونہ میں بیٹھا ہو اور دوسرے کونہ میں سوراخ نہ کر رہا ہو،

ہاں اہل سنت اگرچہ دوسرے گوشوں میں بھی چلت پھرت رکھتے ہیں مگر ان کی کشتی اس کے باوجود محفوظ و سالم ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے کسی گوشہ میں سوراخ نہیں کیا کہ دوسرے موج دریا کشتی میں داخل ہو جائے اور کشتی کو ڈوب دے،

اور یہ مقام شکریہ ہے کہ اہل سنت کی اس روش کے سبب خواص و خوارج کے شکاکات و اعتراضات کا دفعیہ بھی آسان و سہل ہوا کہ انہوں نے عقلی دلیل سے ان دونوں احادیث کا انکار کیا ہے اور ان میں کمزوریاں نکالی ہیں، اور کہا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا مطلب محتضات مقلیدہ کی تکلیف کو رد رکھتا ہے جو بالبدلت محال و

ناممکن ہے۔ اوردہ اس طرح کہ اگر تمام اہل بیت سے تمسک کیا جائے تو ان کے آپس کے عقائد و فروغ میں تناقض کی متنازع اختلاف کے سبب امت کو تقییدین کے جمع کرنا تکلیف دینا ہے جو بالکل ہی محال ہے اور اگر تمام کی جگہ بعض سے تمسک کریں تو تقییدین سے ہر گاہ یا با تقییدین کے اگر پہلی صورت ہو تو بغیر مرجع کے ترجیح لازم آتی ہے، یعنی جب سب اہل بیت فریقیت میں برابر ہیں تو ایک کو دوسرے پر ترجیح کیسے، اور پھر ان میں بھی ہر ایک کو تقییدین کی روایات میں سنت اختلاف پیش آیا۔ لہذا پھر وہی اجتماع التقییدین یا ترجیح بلا مرجع کا الزام لگتا ہے، دوسری صورت میں مختلف عقائد اور مختلف شریعتوں کا ایک دین میں خلاف شارع سما جائے لازم آجائے جس کی صاف تردید اس کلام الہی سے ہوتی ہے، لَنْ يَجْعَلَنَا مِنْكُمْ شُرَكَاءَ وَمِنْهَا جَاہِ اَرَمِی سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک دین اور ایک راستہ بنایا اور ضرورت و ینیہ کی وجہ سے اس کا محال ہونا لازم آتا ہے، ان اشقیاء کے ان انکسالات و اعتراضات سے پوری ملت شیعہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تا آنکہ اہل سنت کی روش اختیار نہ کریں،

اور شیعوں کے عقلی دلائل کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ حد و شمار ہے بھی باہر ہیں ”الفین“ اور دوسری کتابوں نے ان کا اساطہ کیا ہے۔

یہاں اہل سنت کے لئے مفید قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے جس سے وہ ان کی ہر دلیل کا توڑ اور ہر مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں پہلے قویہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اس مدعا پر جو عقلی دلیل ہوگی وہ تین سال سے خالی نہیں رہا، اس کے سبب مقدمات عقلی ہوں گے جیسے اس کتاب میں بیان کردہ دلائل میں پانچویں دلیل (۲) یا بعض عقلی ہو گئے بعض عقلی (جیسے دلیل اول یا دوم) سب نقلی ہوں گے، جیسے دلیل دوم (یہ اصطلاح کو مشہور اصطلاح کے خلاف ہے، کہ دلیل عقلی وہ ہے جو من مقدمات عقلیہ سے مرکب ہو۔ اور دلیل نقلی وہ جس کا ایک مقدمہ نقلی ہے،

بہر حال ہر مسئلہ عقلی دلائل، یقینی طور پر یا غرض ہوں گے شرائط امامت سے، یا موانع امامت اور طریق تقییدین سے تو گویا اس صورت میں تمام دلائل کی بنیاد امامت کی بحث قرار پائے گی اور امامت کی بحث، نبوت کے تابع ہے جسکی وہ امامت، تابع ہے، اور وہ خود یعنی بحث نبوت فرع ہے (اہیات کی جس کی وہ بھی نائب ہے کیونکہ نبوت خدا کی رسالت کا نام ہے۔

پس جب شیعوں کے اصول اور ان کے مسلمات کا تیز جہاں میں کتاب اللہ عزت رسول اور عقل کے خلاف ہونے کے سبب قلع قمع کر دیا گیا تو گویا ان کے دلائل تینوں مرحلوں میں سدود کر دیئے گئے اور ان کے شبہات کا نسب نامہ تین پشتوں تک مجروح کر دیا گیا،

اس کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ مثلاً یہ مقدمہ جو ان کے دلائل میں بہت آیا ہے کہ امام کا منصوص علیہ ہونا دینی اس کی امامت پر نص کا ورود ہوا ہو، واجب ہے، اس کی اصل اور بنیاد ان کا یہ عقیدہ ہے، نَصَبُ اِمَامٍ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰہِ۔ امام کا مقرر کرنا اللہ پر واجب ہے،

اور اس بنیاد اصل کی بنیاد یہ عقیدہ ہے، نَصَبُ النَّبِيِّ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰہِ ونبی کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ اور اس اصل کی اصل کی اصل یہ عقیدہ ہے، اَشْكَالُفٌ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰہِ و بندوں کو مسکن کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔

اور اس اصل کی اصل کی اصل کی اصل یہ عقیدہ ہے، اَللّٰهُفْ وَاجِبٌ عَلٰی اللّٰهِ لطف و مہربانی اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔

جب ان مذکورہ بالا چار مباحث کو عقل نے کتاب اللہ اور حضرت رسول اچھے دو معتبر و مادل گواہوں کی شہادت و گواہی سے باطل و غلط ثابت کر دیا تو اس مقدمہ کے باطل و غلط ہونے میں کون سا شبہ باقی رہ جاتا ہے یا رہ سکتا ہے۔ لہذا اس قاعدہ کی رد سے ان کے تمام دلائل کی حالت باعتبار مقدمات و مواد کے عقلمند کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے، اور پھر ان کے اشکال و مکرطی کی تلوار کا کھلونا جو بچوں کا دل بھلا دیا ہو، یا شیر کی کھال ثابت ہوتی ہے جس کو بوڑھے بھی روز نتے پھرتے ہیں۔ اسی لئے درحقیقت ان کے دلائل کے بیان سے اس کتاب میں بغفلہ تعالیٰ کوئی گھبراہٹ یا دغ نہ نہیں ہے البتہ ان کے وہ چند دلائل جن کو یہ عروۃ الوثقیٰ و مضبوط کھوٹا یا ”عمدۃ القوی“ و چیدہ قوت، خیال کرتے ہیں، ہم بطور نمونہ یہاں قلمبند کرتے ہیں، تاکہ ان کے باقی ماندہ دلائل کی حقیقت بھی کھل جائے جن سے وہ بھی کما حقہ واقف نہیں ہیں، ایسی دلیلیں کل چھ ہیں، پہلی دلیل :- یہ کہ امام کے لئے واجب ہے کہ معصوم ہو، اور جناب امیر رینى اللہ عنہ کے علاوہ کوئی معصوم نہیں لہذا وہی امام ہوں گے کوئی اور نہیں اور یہی مدعا ہے،

اس دلیل میں صفری و کبری دونوں نا قابل تسلیم ہیں۔ صفری اس لئے کہ حضرت امیر رینى اللہ عنہ نے صراحت فرمایا اِنَّمَا الشُّرَہٰی لِلنَّہَا جِرَیْنِ وَ اَلْاَنصَا د (مشورہ کا حق مہاجرین و انصار ہی کو ہے، اور ظاہر ہے کہ مہاجرین و انصار کی جماعت میں جس نے ان کو غیبتہ چنا کوئی معصوم نہ تھا اور یہ بھی ہے کہ جب آپ نے خوارج کا یہ کلام سنا کہ لا امرۃ (خلافت کوئی چیز نہیں) تو آپ نے فرمایا لَا جَنَیْلَیْکَ مِیْنِ اَمِیْنٍ بَیْرَ اَفَاجِیْرٍ (لوگوں کے لئے کوئی امیر ضروری ہونا چاہئے خواہ وہ نیک ہو یا بد) نہجۃ البلاغہ میں بھی یہ روایت موجود ہے،

لیکن اس کو اگر تسلیم بھی کر لیں تو نبی کے سوا کسی دوسرے اور شخص کا معصوم ہونا معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ علم و معلومات کے تین ہی تو اسباب ہیں۔ حواس سلیمہ عقل، اور خبر صادق ہے ظاہر ہے کہ غمت چرنکہ اس ملکہ کا نام ہے جو گئی ہوں اور برائیوں کے صدور کو درد سے تو یہ جس میں نہیں آ سکتی، رہی عقل تو وہ بھی افعال و آثار کی مدد کے بغیر اس ملکہ کا پتہ نہیں چلا سکتی، اور افعال و آثار کی رہنمائی یہاں نصیب نہیں، اس لئے کہ اول تو شخص معین و محسوس کے تمام افعال و آثار کا معلوم کرنا دائرہ امکان سے باہر ہے خصوصاً مدلل کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی نیتوں و ارادوں مثلاً مقادیر فاسدہ حسد و بغض و جذبہ خود پسندی ریا اور دوسرے نازیبا اخلاق وغیرہ۔

اور پھر اگر اس کے تمام اچھے افعال و آثار موجودہ کا پتہ کسی طرح لگ بھی جائے تو اس کے ماضی و مستقبل کی کون ضمانت دے گا۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ صبح وہ کچھ ہے تو شام کو کچھ، نفس اس کے ساتھ لگا ہوا ہے شیطان سادھن دم کے ساتھ ہے، برے ہمدموں میں گھرا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ صبح وہ مومن ہے تو شام کو ایمان کو خیر باد کہہ چکا ہو، بر صبیحا، اور بلیغ با محور کے قصے اس جگہ عبرت کے لئے بہت کافی ہیں، دوسری طرف دعائے ماثورہ یَا مُقَلِّبُ الْقُلُوبِ ثَبِّثْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ وَ طَاعَتِکَ (اے دلوں کو لوٹ پلٹ کرنے والے میرے دل کو اپنے دین اور اپنی طاعت پر جمادے اس بیماری کے کھٹکے سے بچانے کے لئے بڑی اکیسر ہے،

اور بعض محال یہ سب کچھ معلوم بھی ہو جائے تو حقیقت عصمت کا پتہ کیسے چلے گا، یعنی یہ کہ گناہ اس سے سرزد ہونا متنع و محال ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کر لیں گے کہ معلوم کر لیں کہ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوا جس کو محفوظیت کا مرتبہ کہتے ہیں، جو عصمت کے لئے کافی نہیں تا وقتیکہ اس کا گناہوں کا امتناع معلوم نہ ہو۔ اب رہی خبر صادق تو وہ دو قسم کی ہوتی ہے متواتر اور خیر خدا اور رسول۔ ظاہر ہے متواتر کو یہاں کوئی دخل نہیں اسلئے کہ جس کی شرط کے ساتھ انتہاء علم ضروری کو مفید نہیں اور خیر عورت میں جزیرہ عیث میں غیر مفید ورنہ پھر فلاسفہ کی عالم کے قیام ہونے کی خبر علم ضروری کو مفید ہوگی جو بالا جماع باطل ہے۔ اور خدا اور رسول کی خبر یہاں اصول شیعہ کے مطابق علم کی موجب نہیں اول تو یہ کہ اخبار میں بد آواز ہے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایک شخص کی عصمت کی خبر دیں اور دوسرے وقت میں اسی شخص کے عشق کی اور اس کی ایک خبر ہم تک پہنچے اور دوسری نہ پہنچے اسی طرح ارادہ میں بھی یہ صورت یا جماع شیعہ جائز ہے کہ ایک وقت میں ایک شخص کی عصمت سے ارادہ متعلق ہو اور دوسرے وقت میں اس کے نفق سے۔

لہذا ایسی حالت میں الطینان و اعتماد اٹھ گیا اور اس پر سے اعتماد جانا رہا کہ یہ شخص آخر وقت تک عصمت پر قائم رہے گا بھی!

دوسرے یہ کہ خدا اور رسول کی خبر (اطلاع) مکلفین کو یا تو معصوم کے ذریعہ پہنچے گی یا بواسطہ تواتر کے اپنی صورت میں دور لازم آئے گا۔ کیونکہ اس کی عصمت بھی تو اسی خبر سے ہم ثابت کرتے ہیں اگر اس خبر کو بھی عصمت سے ثابت کریں تو یہ ایک چیز کا خود اپنے پر موقوف ہونا ہوگا۔

دوسری صورت میں یہ قسم ہے کہ خود شیعوں کے نزدیک ہر تواتر علم یقینی کو مفید نہیں مثلاً، موزوں پر مس کا تواتر، وضو میں پاؤں دھونے کا تواتر اور الی المرافق اور امدہ ہی امدہ الفاظ قرآن کا تواتر اور قعدہ نماز میں التہیات کے صیغہ کا تواتر اور اسی طرح کے اور بہت سے تواتر کہ شیعہ ان سب تواتروں سے انکار کرتے ہیں پس کسی خاص تواتر کی تعیین درکار ہوگی مگر وہ بھی غیر مفید ہے کیونکہ تواتر سے علم یقینی ناقلین کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے اور جب ایک دو یا تین بھڑٹ کھل گیا تو سارے اقسام سے اعتماد جانا ہوگا۔

اب رہا دلیل کا مقدمہ کبریٰ۔ دینی سوائے جناب امیر کے کوئی معصوم نہیں تھا، تو وہ اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ آجنا بننے نے اپنے دوستوں سے خود یہ فرمایا۔

لَا تَكْفُرُوا عَنْ مَقَالَتِي بِحَقِّ وَشَوْسٍ وَلَا بِعَدْلٍ خَائِي
كُنْتُ بِفَوْقِ أَنْ أُخْطِئَ وَلَا أَمَنْ مِنْ ذَا ذَلِكَ
فِي فُلْبِي۔
تم حق بات کہنے اور منصفانہ مشورہ دینے سے باز نہ رہو اس لئے میں خطا و لغزش سے بالاتر نہیں ہوں نہ اپنے فعل میں ایسی باتوں سے مامون ہوں۔

بحوالہ نبع البلاغہ۔

ظاہر ہے کہ ایک معصوم ایسے الفاظ استعالیٰ نہیں کر سکتا خصوصاً اسی کلام کے یہ آخری الفاظ۔
إِنَّ اللَّهَ يُلْقِي إِلَيْنَا مِنْ نَفْسِهِ مَا هُوَ آتَمُّكَ بِهَمَّتِي
مجھ سے بہتر مالک ہے۔۔

یہ الفاظ ان کی عدم عصمت پر واضح دلیل ہے۔ کیونکہ معصوم کو تو اللہ تعالیٰ اس کے نفس کا مالک بنا دیتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے **كَانَ أَمْلَكُكُمْ لِذُنُوبِهِ** ان کو اپنے نفس پر تم سے زیادہ قابو تھا، علاوہ ان جناب امیر سے بطور دمایوں بھی منقول ہے **اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا أَقْرَبْتُ بِهِ إِلَيْكَ ثُمَّ خَالَفَهُ قَلْبِي** اے اللہ تو میرے اس عمل کو بخش دے جن کے ذریعہ میں نے تیرا قرب و محو نہ بنا چاہا مگر میرے دل نے اس کی مخالفت کی۔

یہ سارا کلام بیخ البلاغہ میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے،
دوسری دلیل ۱۱۔ یہ کہ امام کو چاہیے کہ اس نے کبھی کفر نہ کیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **لَا يَنَالُ عَهْدُ ابْنِ بَيْتٍ** میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا اور کافر ظالم سے کیونکہ فرمایا ہے **وَأَن كَا فُؤُودٌ هُمُ الظَّالِمُونَ** اور کافر ہی ظالم ہیں، ایسا ارشاد فرمایا **إِنَّ الشِّرْكَ لَكُفْرٌ عَظِيمٌ** بے شک شرک بڑا ظلم ہے، اور سوائے حضرت امیر کے سب نے بت پرستی کی ہے لہذا آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام نہ ہوگا اور آپ امامت کے لئے متعین ہوئے، اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ امامت کی یہ شرط نہ کسی شیعہ نے اپنی کتب کلامیہ میں لکھی ہے نہ کسی سنی نے نہ قرآن کی کسی آیت میں اس کا ذکر ہے، نہ کسی حدیث میں اس کا حوالہ ہے، یہ صرف شیعہ علماء نے حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی امامت و خلافت سے انکار کرنے کے سلسلہ میں تراشی ہے اس کا وجود ان کے سینہ پر کینہ کے علاوہ کبیں نہیں ملتا،

ظاہر ہے کہ شرعی اور دینی امور میں سے کسی دینی امر میں کفر سابق کا کسی بیخ اعتبار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایمان لانے کے بعد سو سال کا بوڑھا کافر اور پستی مسلمان جس کی ستر پستیں اسلام پر گزری ہوں دونوں برابر ہیں تو پھر اس میں یہ شرط کیوں ملحوظ رکھی جاتی اور آیت **لَا يَنَالُ** الخ سے اس جگہ استدلال مضحکہ خیز ہے اور مغالطہ دینے کی کوشش ناقصہ کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ شرعی ریاست ظالم کو نصیب نہیں ہوتی اس لئے کہ عدل و انصاف امامت کبریٰ، قضا، احتساب اور عمارت تمام شرعی درجات میں شرط ہے تاکہ ان منصوبوں پر فرائض مرتب ہوں اور برامات و ریاست میں ظالم کا فقرہ چند در چند فسادات کا باعث ہوتا ہے لہذا کفر و ظلم اور امامت میں منافات ثابت ہوئی اور دو منافعی و مخالف باتیں ایک ذات میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں علیحدہ زمانوں اور وقتوں میں جمع ہو سکتی ہیں، چنانچہ اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ بوقت امامت امام کے لئے یہ چاہیے کہ وہ مسلمان ہو اور عادل ہو نہ یہ کہ اسنے امامت سے پہلے کفر و ظلم نہ کیا ہو، اسی لئے اس شخص کو جو پہلے کفر میں مبتلا رہا ہو یا ظلم پیشہ ہو، ایمان لانے کے بعد اسے کافر و ظالم کہنا نہ لغت و عرف میں اور نہ شرع میں ہرگز جائز نہیں۔

اور اصولی میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جس میں مبداء فی الحال قائم ہو اس پر شتق کا اطلاق حقیقت ہے اور دوسرے میں مجاز اور وہ مجاز بھی مطلق نہیں کہ ہر جگہ ہو جو موقع مشہور و معروف ہوں وہیں ان کو بون چاہیے جیسا کہ اپنے مقام پر یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ مجاز ہر جگہ استعمال نہیں ہوتا ورنہ پھر انسان کے علاوہ ہر طریق کو کھجور کا تنہ کہہ سکیں گے، اور ہر بوڑھے کو بچہ! یہ بڑا سخت مغالطہ ہے۔ اسی طرح سونے والے کو

جاگنے والا غنی کو فقیر، پیٹ بھرے کو بھوکا، مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کہہ سکیں گے۔

علامہ حنفیہ میں سے ابو الحسن زاید نے معالی العرش الی معالی العرش میں ایک طویل حدیث میں کہا ہے،
 اِنَّ اَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ لَبَّيْكَ صَلَّيْ اللّٰهُ عَلَيْكَ
 وَاسْلَمَ بِمُحَمَّدٍ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ دَعَيْتُكَ
 يَا رَسُولَ اللّٰهِ اِنِّي لَمَنْ اَسْجُدُ لِقَضَائِكَ
 جَبْرِئِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَقَالَ مَدَقَّ اَبُو بَكْرٍ۔
 حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کی موجودگی
 میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ
 کی عمر کی قسم میں نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا اس وقت
 جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا کہ ابو بکر نے سچ کہا۔

اہل سیر و تواریخ نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے کبھی بت کو سجدہ
 نہیں کیا۔ لہذا الحمد للہ کہ اس شرط کی رو سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صحت پر بھی اجماع ہوا۔
 تیسری دلیل یہ ہے کہ امام کی امامت نفس سے ثابت ہونی چاہیے اور نص سوائے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کسی کے حق
 میں نہیں۔ لہذا آپ کے علاوہ کوئی امام نہ ہوگا۔

یہاں بھی صغریٰ و کبریٰ دونوں ناقابل تسلیم ہیں۔ صغریٰ تو اس لئے کہ امیر المومنین کا کلام بابت مشعوذہ ابھی
 گزرا ہے، اس کا آخری جزیہ سے نَدَانِ اِخْتَارٍ دَرَا جَلَدًا وَسَهْوًا اِمَامًا مَا كَانَ لِلّٰهِ حَقٌّ دَمْتَرَهُ كَاحِقِ مَہَاجِرِينَ
 و انصار کو ہے وہ اگر کسی شخص کو چن کر اس کو امام کہیں تو یہ رضائے الہی اور خوشنودی رب کا ذریعہ ہوگا۔

اور کبریٰ اس سبب سے ناقابل تسلیم ہے کہ اگر کوئی نص وارد ہوئی تو وہ قرآن میں ہوئی یا حدیث میں اور ہر
 دو کا سال پر اس معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایسی نص نہیں ہے اور پھر یہ بھی بات قابل لحاظ ہے کہ نص اگر وارد بھی ہوئی
 تو لا محالہ متواتر ہونی چاہیے یعنی کیونکہ اصول اور بنیادی عقائد میں خبر واحد کا کوئی اعتبار نہیں اور کوئی جانتا نہ جانتا اہل
 بیت کرام اس سے ضرور واقف ہوتے سالانہ وہ اس کا انکار فرماتے ہیں،

اور اگر نص وارد ہوئی تو بھی اماموں کے حق میں ہوئی جب کمال یہ ہے کہ ہر امام کی وفات کے بعد ان کی اولاد
 دعوائے امامت میں باہم مختلف ہوئی،

اگر نص ہوتی تو یہ اختلاف اور سر پھٹول کیوں ہوتی، اور کیوں ایک دوسرے کو ناحق اور نااہل بتاتے۔
 اگر نص ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ابلاغ کی دو صورتیں ہوتیں یا تو اس کو لوگوں کو بعد تواتر
 اس کی تبلیغ فرماتے، یا نہیں پہلی صورت میں وہ حاملین نص رجن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ علم ہو گیا، موقع
 آنے تک یا تو اسے چھپائے رکھتے یا ظاہر کر دیتے دوسری شق لا محالہ بالا جماع باطل ہے کہ وہ اگر بھی تو ظاہری
 نہیں ہوئی اور پہلی شق ہو تو پھر وہ تواتر سے اعتقاد اٹھاتی ہے۔ اور منزوات میں کذب کا دخل لازم آتا ہے
 اور نبی کریم کی تبلیغ کی دوسری صورت میں کہ آپ اس کو مد تواتر تک نہ پہنچائیں مکلفین سے حجت اٹھ جاتی ہے
 اور نص کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے، بلکہ نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ترک تبلیغ کا الزام آتا ہے،

چوتھی دلیل یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ ہمیشہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ستم رسیدہ رسیدہ اور ان سے شاکر رہے
 اور خود کو ہمیشہ مظلوم و مقہور ہی ظاہر فرمایا اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آپ سے امامت چھین لی گئی تھی تو امامت
 آپ کا حق ہوئی نہ کسی اور کا کیونکہ آپ کی صداقت کو سب بالا جماع مانتے ہیں،

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایات بھی اس لئے ناقابل تسلیم ہیں کہ اہل سنت کو تلاش و جستجو کے باوجود ان روایات کا کوئی اثر پتہ کھون سرانہ نہیں مل سکا بلکہ اس کے برخلاف ایسی متواتر حدیثوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے جو ان میں باہم موافقت وغیر خواہی، دعا و ثنا، اور ایک دوسرے کی طرف مدد و تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ثابت کرتی ہیں، اس سلسلہ میں امامیہ کی روایات دو طرح کی ہیں۔ ان میں اکثر اہل سنت کی روایات کے موافق ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عین حیات ان کے موافق، و خیر اندیش و ہمدرد رہے اور کبھی اپنے نیک مشوروں سے دریغ نہ کیا۔ چنانچہ خلیفہ ثانی جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ کا قصہ جو الہ نبج البلائہ صفحات ۱۵۳۱ میں بیان ہو چکا ہے۔

اسی طرح ان حضرات ثلاثہ کی وفات کے بعد بھی آپ ان کے شاخو اں رہے اور ان کے اعمال کو سراہتے رہے ان کی بھلائی، مافیت اور نجات پر شہادت دیتے رہے۔ جیسا کہ بلاد بانی بکروالی عبارت کا پورا نظمہ جو بحوالہ نجویۃ البلائہ گزشتہ اوراق میں ذکر ہوا اس پر ماث اور واضح دلالت کرتا ہے،

اور شیعوں کی بہت سی روایات، اہل سنت کی روایات کے خلاف بھی ہیں، لہذا اہل سنت نے متفق علیہ روایات کو لے لیا اور مختلف فیہ کو جن کو فقہ حضرات اپنے راویوں کے کچے چٹھے سے واقف ہونے کے باوجود روایت کرتے ہیں نظر انداز کر دیا، کیونکہ شیوہ عقلا و دانشمندان یہی ہے کہ وہ متفق علیہ کو لیتے اور مختلف فیہ سے کنارہ کش رہتے ہیں، اس سلسلہ کی شیعہ روایات نبج البلائہ، کشف الغمہ اور معیضہ کاملہ سے اوراق ۱۵۳۱ میں کافی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں، رہیں اہل سنت کی روایات تردہ بھی اس سلسلہ میں حد شمار سے باہر ہیں،

اب ہم کتاب الموائفۃ ابن سمان سے جو اسی مقصد کے تحت تصنیف ہوئی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں ایک روایت بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جو معاملہ امامت زیر بحث کی پوری وضاحت کرتی ہے اگر کوئی ماہر لسان عرب حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی اس عبارت کو اس عبارت سے جو نبج البلائہ کی روایت میں ہے ملائے اور موازنہ کرے تو اس میں سرموزق نہ پائے گا۔ یہ ہمارا ذمہ ہے،

اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام میں کوئی بناوٹ نہیں کر سکتا اس کو جانچنے اور دیکھنے کے لئے البتہ عربی میں مہارت اور مستلک کے بارے میں سلیقہ شناسی ضرور درکار ہے یہ نہیں کہ عربی لغات سے اجنبی معنی بلاغت کلام سے متاثر ہو کر فریفتہ ہو جائے، اور اسے پرکھ اور تمیز کا مادہ نصیب نہ ہو،

ترجمہ: حافظ ابو سعید بن سمان اور دوسرے محدثین نے بھی محمد بن عقیل بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور آپ کو چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ تو پورا مدینہ آہ بکاس سے لرز اٹھا اور وہی کیفیت لوگوں پر طاری تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت پیش آئی تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ باجسم گریاں بر زبان انا للہ تشریف لائے اور کہنے لگے آج

مَا وَدَى الْحَافِظُ ابْنُ سَعْدِ بْنِ السَّمَانِ وَغَيْرُهُ مِنَ الْمُحَدِّثِينَ اَيْضًا عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَقِيلِ بْنِ ابِي طَالِبٍ اَنَّهٗ لَمَّا قُبِضَ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ وَسُجِّيَ عَلَيْهِ رَحْلَتُ الْمَدِينَةِ بِالنَّكَارِ كَيَوْمِ قُبِضَ فِيهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ فَجَاءَ عَلِیُّ بْنُ ابِیْ بَکْرٍ مُّسْتَوْجِعًا وَهُوَ یَقُولُ الْیَوْمَ اِنْقَطَعَتْ خِلَافَتُهُ الْنَبُوَّةُ فَوَقَفَ عَلٰی بَابِ الْبَيْتِ الَّذِیْ فِیْہِ ابُو بَکْرٍ مُّسَجًّیً فَقَالَ دَحِمُوا

اللَّهُ يَا أَبَا بَكْرٍ كُنْتَ أَيْقَانُ رَسُولِ اللَّهِ وَآيَةُ سَهْ
وَمُسْتَوْجِلُهُ وَثِقَتُهُ وَمَوْضِعُ سِتْرِهِ وَمَشَاوَرَتُهُ
كُنْتَ أَوَّلَ تَوَلَّيْنَا سَلَامًا مَا رَأَيْتُكُمْ رَأَيْتُكُمْ
أَشَدَّ مَدَنِيَّةً وَأَخْوَفَ لَهْمَ اللَّهِ وَأَعْظَمَ هَيْئَةً فِي دِينِ
اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَأَخْوَفَ لَهْمَ رَسُولِهِ وَأَشْفَقَ لَهْمَ عَلَيْهِ وَ
أَحَدَ يَهْدِي إِلَى السَّلَامِ وَأَيْسَرَ لَهْمَ عَلَى الْمُتَحَابِّهِ وَأَحَبَّ
مُحَبَّةً وَأَكْثَرَ لَهْمَ سَنَاقِبِهِمْ سَوَابِقِهِمْ وَأَرْفَعَهُ
دَرَجَةً وَأَشْهَبَ لَهْمَ بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
هَدًى وَهَسَاةً وَخَمَلَةً وَفَضْلًا وَخُلُقًا وَأَشْرَفَ لَهْمَ عِنْدَهُ
مَنْزِلَةً وَأَكْرَمَ لَهْمَ عَلَيْهِ وَأَوْفَى لَهْمَ عِنْدَهُ جَزَاهُ اللَّهُ
عَنْ رَسُولِهِ وَهَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَعَنِ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى أَكُنْتُ عِنْدَهُ بِمَنْزِلَةِ السَّمْعِ وَ
الْبَصَرِ مَدَّةً فَتَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ
كَذَّبَهُ النَّاسُ نَسَاكَ اللَّهُ فِي تَنْزِيلِهِ وَمَوَاقِفِهِ
نَقَالَ عَزَمِينَ قَائِلٍ وَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدَقِ وَصَدَّقَ
بِهِ وَالَّذِي هُوَ الْمُتَّقُونَ فَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدَقِ
مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَدَّقَ بِهِ أَبُو بَكْرٍ وَ
أَسَيَّنَهُ حِينَ بَخِلُوا وَفُتَّ مَعَهُ عِنْدَ الْمَكَاوِرِ حِينَ
عَنْهُ قَعْدٌ وَأَوْفَى لَهْمَ فِي الشَّدَةِ أَحْسَنَ الصُّحْبَةِ ثَانِي
اثنَيْنِ وَمَاصِيَّةً فِي الْفَكَارِ وَالْمَنْزِلَ عَلَيْهِ السَّكِينَةُ
وَرَبِيقَةً فِي الْهَجْرَةِ وَخَلِيفَةً فِي رَيْنِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَفِي
أُمَّتِهِ أَحْسَنَتْ الْخِلَافَةَ حِينَ ارْتَدَّ النَّاسُ وَفُتَّ
بِأَمْرِ مَا لَمْ يَقُمْ بِهِ خَلِيفَةُ عَنِّي فَهَضَمْتُ حِينَ وَهَرَا
أَصْحَابُكَ وَبَرَزْتَ حِينَ اسْتَكَاوُوا وَقُرَيْتَ حِينَ مَضَعُوا
وَلَزِمْتُ مِنْهَا جَمْرَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي
أَصْحَابِهِ إِذْ لَنْتُ خَلِيفَةً حَقًّا وَكُنْتُ سَاهِرًا وَلَمْ يَقْدَعْ
بِرَغْمِ الْمُنَافِقِينَ وَكُنْتُ الْكَارِزِينَ وَكَرِهَ الْحَاسِدِينَ
وَصَحَّرَ الْفَاسِقِينَ وَتَرَفَّعَ الْبَاقِينَ فَمَنْتَ يَا أَمْرُ حِينَ
فَنَشَرُوا أَوْ لَطَقْتُ حِينَ تَعَبَرُوا وَمَضَيْتُ لِقَاؤُكَ وَتَقَرُّوا

نبوی خلافت کا فائز ہو گیا، پھر اس گھر کے مدوا نہ پر جس میں
حضرت ابو بکر مکتوف تھے کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے اے
ابو بکر اللہ تم پر رحم فرمائے تم رسول اللہ کے مسکن الفت و انس
راحت و اعتماد تھے اور آپ کے اسرار کی قرار گاہ آپ کی است
میں تم اسلام سے مشرف ہونے والے پہلے فرد تھے ایمان میں
سب سے زیادہ پر غور تقویٰ میں سب سے زیادہ مضبوط
سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے سب سے زیادہ
اللہ کے دین کی مدد پر کمر بستہ، ان کے رسول کا سب سے
زیادہ لحاظ کرنے والے، ان پر ان سب سے زیادہ شفیع
سب سے زیادہ اسلام کے غمخوار، ان کے اصحاب کے لئے
سب سے زیادہ قابلِ بھروسہ، باعتبار محبت سب سے
زیادہ مجرب تر، فسیلتوں میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے
باعتبار سبقت سب سے افضل، باعتبار درجہ سب سے
بالا تر، سب سے زیادہ رسول اللہ سے مشابہ باعتبار طرز و
روش، رحمت و بزرگی میں، عادت و خصلت میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ میں اشرف
ان سے زیادہ با عزت آپ کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ
میں اشرف ان سے زیادہ با عزت آپ کے نزدیک سب سے
زیادہ قابلِ بھروسہ آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ ان کو اسلام
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی طرف سے جزائے
خیر عطا فرمائے،
تم ان کے لئے کان اور آنکھ کی طرح تھے، جب لوگوں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو تم نے تصدیق
کی اسی لئے قرآن میں تمہارا نام صدیق رکھایا صاحب
عزت نے، یہ قول، جو سچ بات لایا۔ اور جس نے اس کی
تصدیق کی وہ سب تقویٰ والے ہیں،
تو سچ بات لانے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور
جنہوں نے ان کی تصدیق کی وہ ابو بکر ہیں۔
تم نے رسول اللہ کے ساتھ اس وقت ہمدردی کی

جب لوگوں نے ان سے جان چرائی تم نے ان کی مصیبتوں میں اس وقت پشت پناہی کی جب لوگ ان کی مدد سے بیٹھ رہے تھے تم سختی کے زمانہ میں آپ کے اچھے ساتھی بنے رہے تم دویں کے دوسرے اور غار میں ان کے ساتھی تھے جس پر سیکنت اتری تم ہجرت میں ان کے رفیق تھے اللہ عز و جل کے دین اور آپ کی امت میں تم ان کے خلیفہ تھے جب لوگ مرتد ہو گئے تو تم نے مخالفت کے امور بہترین انداز میں نبھائے اور امور ریاست کو ایسا نبھالا کہ کسی نبی کے خلیفہ کے ہاں اس کی مثال نہیں، جب تمہارے ساتھی سست پڑے تو تم مغبوطی کے ساتھ قائم رہے جب وہ ٹھک گئے تو تم سامنے آئے جب انہوں نے کمزوری دکھائی تو تم نے قوت کا مظاہرہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں تم رسول کے راستہ پر رہے اس لئے کہ تم خلیفہ برحق تھے نہ تم نے کسی سے جھگڑا کیا نہ کوئی تمہارے مقابل آیا نہ فتنے ناخوش کا فردیل، حاسد رنجیدہ، فاسق خوار باغی گمراہ رہے جب لوگوں نے بزدلی دکھائی تم نے کام نبھالا جب لوگ لنگ ہو گئے تو تم ہی بولے جب اور لوگ کھڑے رہ گئے تو تم چل نکلے اس لئے سب نے تمہاری پیروی کی تو ہدایت پائی، تم اپنی آوازیں میں سب سے زیادہ اور پیش روی میں سب سے بلند، ان سے زیادہ کم گو، ان سے زیادہ راست گوارا سے زیادہ سکوت پسند، ان سے زیادہ گفتگو میں اثر انداز رائے دہندگی میں سب سے بڑھ کر کاموں کی انجام دہی میں سب سے زیادہ بہادر کاموں کو ان سے زیادہ پہچاننے والے ان سے زیادہ کام میں شرافت پسند، اللہ کی قسم تم پیشوائے دین تھے اول جب لوگ اس سے جھگڑے اور آخر میں جب لوگ بزدل ہوئے تم سو منوں کے لئے شفیق باپ کی طرح تھے جب وہ بال بیل کی طرح تمہارے سایہ عاطلت میں پڑے تو تم نے ان کے کمزوروں کا وہ بوجھ اٹھایا جس کو وہ نہ اٹھا سکے جس کی وہ حفاظت نہ کر سکے اس کی تم نے حفاظت کی

فَاتَّبَعُواكَ فَمِنْهُمْ زَاكِيَةٌ وَكُنْتَ أَخْفَظَهُمْ مَوْتًا وَأَعْلَاهُمْ قَوْلًا وَأَقْلَاهُمْ كَلَامًا وَأَمْرُهُمْ مَّتَطَقًا وَأَخْلَوْهُمْ صَمْتًا وَأَبْلَغَهُمْ قَوْلًا وَآكْبَرَهُمْ رَأْيًا وَأَشَجَّهُمْ دَأْعًا وَفَهَّمَهُمْ لُذْمًا وَأَشْرَفَهُمْ عَمَلًا كُنْتَ وَاللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمُرُونَ أَوَّلَ الْخَالِقِينَ تَتَعَرَّى النَّاسُ عَنْهُ وَآخِرُ أَجَلِينَ يَشْكُرُونَ كُنْتَ لِمُؤْمِنِينَ أَمِيرًا حَيْثُ أَذْصَارُ وَأَعْلَى عَمَلًا كُنْتَ تَحْتَلَّتْ أَتْقَالُ مَا ضَعُفُوا عَنْهُ وَرَمَعَتْ مَا أَهْمَلُوا وَأَحْفَظْتَ مَا ضَاعُوا وَأَعْلَوْتَ ذُلَّهُمْ وَأَوْصَبْتَ إِذْ جَزَعُوا وَأَوْدَرْتَهُمْ كِتَافًا رَمَا طَلَبُوا وَرَجَعُوا أَنَّهُ شَدِيدُمْ بِرَائِكَ فَتَفَرُّوا وَنَاوَأُوا إِلَيْكَ مَا لَمْ يَحْتَسِبُوا وَجَلَّيْتَ عَنْهُمْ فَا بَصَرًا كُنْتَ عَلَى الْكَافِرِينَ عَدُوًّا صَبِيحًا وَ لِيُؤْمِنِينَ رَحِمَةً وَأَنْسَاءً وَخَصِيصًا فَكُفِّرْتَ وَاللَّهِ بَعْبًا هَا وَنُزِرْتَ بَعْبًا هَا وَذَهَبْتَ بِمَقَاتِلِهِمْ وَأَذْمَكْتَ سَوَابِقَهَا كَمْ تَضَلَّ حُجَّتُكَ وَلَمْ تَضَعْفْ بِصِدْقِكَ وَ كَمْ تَجَبَّنَ نَفْسُكَ وَلَمْ يَزِغْ قَلْبُكَ كَأَنْ تَحْسِلَ لَا تُحْرَكُ الْعَوَاصِفُ وَلَا يَزِيلُهُ الْقَوَاصِفُ كُنْتَ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آمِنُ النَّاسِ عَلَيْكَ فِي مَعْبُوتِكَ وَذَاتِ يَدِكَ وَكَمَا قَالَ ضَعِيفًا فِي بَدَنِكَ قَرِيحًا فِي أَمْرِهِ مَعْرُوضًا فِي نَفْسِهِ خَلِيفَةً عِنْدَ اللَّهِ جَلِيلًا فِي أَعْيُنِ الْمُؤْمِنِينَ كَيْلُوا فِي أَنْفُسِهِمْ لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ فَيْكَ مَعْمُورًا لَهَا أَيْلُ نَيْكَ مَعْمُورًا وَلَا لِأَحَدٍ فَيْكَ مَطْمَعُ الضَّعِيفُ الدَّلِيلُ عِنْدَكَ كَوَيْ عَزِيزٌ حَتَّى تَأْخُذَ بِحَقِّهِ وَالْقَرِيءُ الْعَزِيزُ عِنْدَكَ ضَعِيفٌ كَيْلٌ حَتَّى تَأْخُذَ مِنْهُ الْحَقُّ الْقَرِيبُ وَالْبَعِيدُ عِنْدَكَ سَوَاءٌ أَتَرَبَّ النَّاسُ إِلَيْكَ أَمْ طَرَعَهُمُ اللَّهُ وَتَقَهُمْ لَهُ نَبَأُكَ الْحَقُّ وَالصِّدْقُ وَالرَّفْقُ وَقَوْلُكَ حَلَمٌ وَجَزْمُ وَامْرُكَ حَلِيمٌ وَ حَزْمُ وَرَأْيُكَ عِلْمٌ وَعَزْمُ فَابْلَغْتَ وَاللَّهُ لَهُمُ السَّبِيلُ وَهَلَّتْ الْعَصِيرُ وَالْخُفَاةُ الْغَيْرُ أَنْ دَاغَنْدَلُ يَدِكَ الدِّينُ وَخَيْرُ الدِّينَانِ وَشَبَّتْ الْإِسْلَامُ وَالْمُسْلِمُونَ

فَلَمْ يَرَوْا اللَّهَ لَوْ كُنْتُمْ أَكْفَرُونَ نَسَبْتُ وَاللَّهِ
سَبْتُ الْبَعِيدَ وَأَنْتَ مِنْ بَعْدِكَ لَا تُنْبِئُكَ يَوْمَ
وَقَدْتُ بِالْخَيْرِ قَوْمٌ اعْطَيْنَا فَحَلَلْتُ عَنْ الْبَكَارِ وَحَلَلْتُ
رَزِيَّتِكَ وَهَذِهِ مُصِيبَتُكَ الْوَكَا مَرَا نَا لِلَّهِ وَانَا
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

جس کو انہوں نے ضائع کیا اس کی تم نے نگہبانی کی جب
وہ مصیبت سے بے قرار ہوئے تو تمہاری بیقراری ان
سے بھی زیادہ رہی، جب وہ دل چھوڑ بیٹھے تو تم سبر پر ڈٹے
رہے۔ وہ جو ڈھونڈتے رہے اور نہ پایا تم نے اسے پایا
تم نے اپنی رائے سے ان کی رہنمائی کی تو وہ کامیابی سے ہم

کنار ہوئے اور تمہارے طفیل ان کو وہ کچھ ملا جس کا ان کو وہم گمان بھی نہ تھا۔ تم نے ان پر ہر چیز ایسی واضح کی کہ ان کو بینائی مل گئی
تم کافروں پر اک مذاب تھے تو مومنوں کے لئے سراپا رحمت و انس اور فرامی؛ اللہ کی قسم تم ان مراتب کی بلندی پر اڑے رہے
پھر اس کے قرب سے کامیاب ہوئے تم نے برگزیدہ درجہ حاصل کئے اور ان سے آگے کے مراتب پائے۔ نہ تمہاری رحمت
کمزور رہی نہ تمہاری سوچ بوجھ میں ضعف آیا۔ نہ تمہارا نفس بد دل ہوا، نہ تمہارا دل بیگنا ہو یا تم ایک پہاڑ تھے جس کو نہ طوفان
ہلا سکتا تھا، نہ ہوا کے جھونکے اس کو اپنی جگہ سے ڈگمگا سکتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق تم زیادہ
احسان کرنے والے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی رفاقت اور دولت نثار کرنے میں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے
مطابق تم ضعیف بدن مگر اللہ کا حکم بجالانے میں قوی تر۔ نفس میں تواضع پسند، اللہ کے نزدیک بلند، مومنوں کی نظر میں
بزرگ، ان کے دلوں میں باوقفت کسی کو تم پر قابو پاسکے کمزور ذلیل تمہارے نزدیک قوی و عزیز تھے جب تک ان کا حق نہ
کرنے کی ہمت نہ کسی کو طمع کا ایسا موقع کہ تم پر قابو پاسکے کمزور ذلیل تمہارے نزدیک قوی و عزیز تھے جب تک ان کا حق نہ
ولا دیتے اور قوی و عزیز تمہارے نزدیک کمزور ذلیل تھے نہاد تھکے تم اس سے کسی کا حق نہ لے لیتے دور و نزدیک تمہارے
لئے برابر تھے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کا زیادہ مطیع تھا وہی سب سے زیادہ تمہارے قریب تھا تمہارا کام
حق پرستی راست گوئی اور نرمی تھا۔ اور تمہارا قول حکمت آمیز و دلنشین اور مضبوط، اور تمہارا حکم بردباری اور دانائی پر
مبنی تھا، پس اللہ کی قسم تم نے ان کو راہ راست پر لگایا ان کے مشکل راستوں کو آسان بنایا۔ قنفذ کی آگ بجھائی تمہاری وجہ
سے دین ٹھیک ہو گیا اور ایمان طاقتور اسلام اور مسلمان نے اپنے دم جمائے احکام الہی ظاہر ہوئے گو کافراں پر
کوڑھے، اللہ کی قسم تم بہت آگے بڑھ گئے اور اپنے بعد والوں کو قہقار مارا تم نے حکم کھلا بھلائی حاصل کی اور تم اس سے
بالا ترو کہ تم پر کوئی روئے، گو تمہاری جدائی کی مصیبت بہت سنگین ہے اور اس نے لوگوں کو جھنجھوڑا لایا ہے، اِنَّا لِلّٰہِ
وَ اِنَّا اِلَيْہِ رَاجِعُونَ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فصیح و بلیغ خطاب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ستائش میں ہے گویا آپ کی طرف
سے بدیہ تحسین و عقیدت کا اظہار، انتہائی بلند معیار سے اظہار ہے،

اگر آپ کے ان تمام خطبات و کلمات کو جو آپ نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں ارشاد فرمائے اور جو
اہل سنت کی کتب میں بطریق وثوق و عدالت، بلکہ بطریق تو اترو شہرت منقول ہیں یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار
ہو سکتی ہے اور ایک مستقل دفتر رضی کی بیج البلاغہ کے برابر مرتب ہو سکتا ہے،

ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں یہ سوال اٹھے کہ شکایت و ظلم سے متعلق جو روایات شیعہ کتب میں مروی ہیں
اگر ان سب کی سب کو ان کے پیشواؤں کی من گھڑت اور بناوٹی کہا جائے تو یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ اتنی بڑی جماعت

ساری کی ساری جناب امیر پر افتراء باندھنے پر تلی جائے۔ لہذا اس میں کہیں نہ کہیں، کوئی غلطی لگی ہے، آخروہ کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات اور اوراق ماسبق میں گزر چکی ہے کہ ان کے ناسمجہ راویوں نے تجسیم و بداء وغیرہ میں ائمہ پر جھوٹ عقوقا ہے۔ اور ائمہ نے ان کی تکذیب کی ہے۔ حالانکہ قتادہ البیہ کا ترجمہ کہاں اور قتادہ صہبائیہ کی روایات کی تکذیب بھی دوسرے شیعوں کے ذریعہ ان تک پیچنی لیکن مسلمان عن صحابہ کے سلسلہ میں تو کوئی تکذیب ان تک نہیں پہنچی اگر پہنچی بھی ہو تو ان کے خیال میں اس کی تکذیب صریحت سے نہ آئی ہو جیسا کہ بیج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ کے حوالہ سے سب کچھ تفصیلاً بیان ہو چکا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب چونکہ صحابہ سے بعض رکھنے، اور ان کے متعلق عقائد بد رکھنے میں متفق الحیال ہیں، اس لئے وہ تکذیب کی روایت کر کے خود اپنی تردید کیونکونے لگے، اس کو ظاہر کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا رہی کیوں مارنے لگے۔ اس لئے یہ اپنے پھیلوں کے جھوٹ کو پالتے پوتے رہے بلکہ بلی کے گوئی طرح چھپاتے رہے اور یوں یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اس فرقہ کے متفق علیہ جھوٹ کی شکل اختیار کر گیا، اور یہ جھوٹ اتنے زور منور اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے بولا گیا کہ وہ ان کے لئے سانپ کے منہ کی چھو نہ رنگیا، نہ نکلے گا تو اندھا اگلے گا تو کورھی۔ یہ جھوٹ ان کی زندگی و موت کا کاسئلہ بن گیا اور اپنے ہاتھ سے کون اپنی قبر کھودنے لگا، اور عقائد اکیہ سے متعلق جھوٹ ایسا نہیں اس لئے اس کے متعلق دونوں کی طرح روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، اس لئے دونوں طرح کی روایت ملتی ہیں،

اس کے باوجود بھی ان سب کی غلطی کا ایک نشانہ بھی ہے وہ یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے وہ خطابات جو رمی نے بیج البلاغہ میں جمع کئے ہیں ان میں اور دوسرے خطوں میں جو جناب امیر کی صحیح مراد کو ظاہر کرتے ہیں اور شیعوں کے خیال و گمان کی تردید کرتے ہیں، جن کو حذف اور ساقط کیا مثلاً یہی خطبہ مذکورہ بالا جو حضرت ابو جہر رضی اللہ عنہ کی تائش میں گزرا اس میں جناب امیر قریش کی شکایت فرماتے ہیں، اور ان کے حق میں بیجا فرماتے ہیں مگر یہ فرقہ اپنی بدگمانی اور دل بغض کے سبب سمجھتا ہے کہ ان قریش سے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم مراد ہیں اور ان کے مددگار حاشا و کلا الیہ ہاں کل نہیں ہے بلکہ آپ کا اشارہ ان نو جوانان قریش کی طرف ہے جن کا شمار صحابہ کرام میں نہ تھا بلکہ خلیفہ اول و دوم کے عہد خلافت میں یہ سن بلوغ و عمر غیر تک بھی نہ پہنچے تھے اور عہد امیر المومنین میں عقل و رشد ناقص حاصل کی اور بڑے بڑے کاموں میں دخل و مداخلت کرنے لگے اور انہوں نے جناب امیر اور آپ کے رفیقوں و دوستوں مثلاً حضرت طلحہ حضرت زبیر اور ام المومنین رضی اللہ عنہم میں شکر و خیال اور ناراضگی پیدا کی اور ایک بڑے زبردست فساد برپا کرنے کا سبب بنے اور پھر خود جناب کی مدد و معاونت سے بھی دستکش ہو گئے اور آپ کے اوامر و نواہی ماننے سے بھی منکر ہو کر بیٹھ رہے اور سستی کا مظاہرہ کیا۔ اور یہ ان کی ہی روش سے ہوا کہ مخالف کے شکر سارے شہروں پر تائبین ہو گئے اور جناب امیر کا اقتدار صرف کوفہ عراق اور خراسان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے کشکان جنگ جمل پر گزریا تو ان میں عبدالرحمن بن عتاب ابن اسید حوام المومنین رضی اللہ عنہما کے طرفداروں میں سے تھے کو کشتہ دیکھا تو آپ نے مدد و ہمتوں کا اظہار فرمایا اور رو کر یوں فرمایا۔ **هَذَا يَفْسُوفُ قَرِيشٍ ثَمَّةٌ قَالَ جَلَّ غَتُ الْفَيْ وَ شَقِيحٌ نَقِيٌّ**، یہ قریش کا سردار ہے میں نے اپنی ناک کا ٹل لی اور اپنے آپ کو تسلی دی۔

شیعوں کا حالہ یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام کو اپنے معتقدات اور اپنے گمراہ پیشواؤں کے جہڑ مغزبات

پر وصال لیتے ہیں، بلکہ آیات و احادیث کو بھی اسی اسلوب اور نقطہ نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں تو اس بیماری کا کیا علاج ہے
ورنہ یہ تو قیامت تک بھی ممکن نہیں کہ صحابہ کرام جن کے حق میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں،

أَلَمْ يَكُنْ لَهُ كَلِمَةً أَتَقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا،
اور ان کو تقویٰ کی ملت پر جھانے دکھا اور وہ اس کے برابر
مستحق بھی ہیں، اور اہل بھی،

(۲) آيَةُ آدٍ عَلَى الْكَفَّارِ سَاءَ بَيْنَهُمْ -
وہ کافروں پر سخت اور مومنوں پر مہربان !

(۳) حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الدِّينَ وَبَيَّنَّ فِي قُلُوبِكُمْ
اللَّهُ تَعَالَىٰ نَعَىٰ تَعْلُو أَيْمَانِ كِي حُبَّتْ دِي اور اس کو تمہارے
دلوں میں مریض کر دیا اور کفر و فسق و عصیان سے تم کو
نفرت دے دی

ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت یا آپ کے خاندان کی ایذا رسانی سرزد ہو سکے اگر کسی کا یہ عقیدہ ہوگا
تو وہ قرآن و حدیث متواترہ کی تکذیب کا مرتکب ہوگا،

پانچویں دلیل امیر سیاحین اللہ عنہ نے امامت کا دعویٰ بھی کیا اور بطور تائید معجزہ بھی دکھا یا مثلاً خیر کا دروازہ اکھاڑنا
چٹان کو اٹھا لینا۔ یا جنوں سے جنگ و مقاتلہ کرنا اور سورج کو لوٹالانا اس لئے وہ اپنے دعوے میں پچے ہوں گے
اور امام ہوں گے،

ان لوگوں کا یہ کلام اہل سنت کے اس استدلال سے ملتا جلتا ہے جو وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات
میں پیش کرتے ہیں، مگر یہ مشابہت صرف اسلوب بیان میں ہے مقدمات کی صحت میں نہیں ہے
ادل تراوی میں کلام ہے کہ امامت کا اثبات معجزہ سے ہوتا ہے کیونکہ معجزہ تو نبوت کے ثابت کرنے کے لئے
ہوتا ہے، امامت، قضا، احتساب، افتاء، اجتہاد، کسی کی سلطنت، لشکر کی امارت اور وزارت یا دیگر شری مہدوں کے
لئے نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت چونکہ براہ راست مذاکرات سے ہوتی ہے، اس لئے اس کا اثبات معجزہ کی شکل
میں خدا کی طرف سے تصدیق کئے بغیر ممکن نہیں۔ بخلاف امامت کے کہ وہ نبی کے فرمان اور آپ کے سوچنے سے ثابت
ہوتی ہے،

پھر یہ بات بھی ہے کہ معجزہ سے نبوت کا ثبوت بھی بعض عادت الہی کی بناء پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت صرف
انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں ہے، ان کے علاوہ کسی سے متعلق بھی یہ عادت نہیں رہی اس لئے اس کی دلالت بھی
انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص رہے گی،

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص مدعی بن کر کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا دعویٰ دائر کرے اور ثبوت میں کوئی معجزہ پیش
کرے تو شرعاً اس کا یہ ثبوت بالکل معتبر نہیں کیونکہ شریعت میں ثبوت دعویٰ کا ایک طریقہ گواہ دنا ہے معجزہ کا اظہار
نہیں، یہی حال تمام دعاوی اور معاملات کا ہے۔ جب امامت بھی پیغمبر علیہ السلام کے متعین کرنے یا از باب حل و عقد
کے انتخاب سے وجود میں آئی ہو تو اس پر معجزہ کس طرح دلیل بن سکے گا،

دوسرے یہ بات بھی غلط ہے کہ تینوں خلفاء کے زمانہ میں آپ نے امامت کا دعویٰ کیا جسکو خود امامیہ کی روایات
بھی افراد قرار دے کر تردید کرتی ہے۔ اور لقیہ کا واجب سمجھنا بھی اس کو باطل قرار دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی اس پرسکوت کی وصیت اسی دعوے کے سراسر منافی ہے، اور یہ سب امور امامیہ کے نزدیک آسمان سے نازل ہوئے والی وحی کی طرح ثابت ہیں،

تیسرے جناب امیر مومنین علیہ السلام سے خوارق عادات اور کرامات کا صدور و ظہور بالکل قابل تسلیم ہے لیکن یہ امر تو غفلت انگیز ہے کہ رضوان اللہ علیہم نیز دیگر معابد و اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے بھی بطریق تواتر و شہرت ثابت ہے، اگر باب خیر کا قصہ قویہ و اقہر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کا ہے، اس وقت امامت کے دعویٰ کا امکان اور گنجائش ہی کہاں! اب رہی خیانت سے لڑائی تو کتب اہل سنت سے تو اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا یہ معنی شیعوں کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق کے لئے روانہ ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام نے راستہ میں خبر دی کہ فلاں کنوئیں میں جن اکٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے لشکر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر کو بھیجا اور آپ نے ان کو قتل کیا۔

اگر اس روایت کو صحت بھی مان لیں تو بھی معجزہ قویہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہوگا البتہ کرامت جناب امیر کی ہوگی مگر جس وقت امامت کا وجود ہی نہ تھا تو اس کے لئے یہ شہادت کیسی کیونکہ معجزہ کے لئے دعویٰ کی شرط بالاجماع ہے، علی بن عیسیٰ اردوبیلی نے کشف الغمہ میں لکھا ہے کہ یہ مقاتلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تھا، تو اس سے معاملہ ہی صاف ہو گیا کہ یہ آپ کا معجزہ تھا۔

اور چٹان کے اٹھا لینے والی بات کا بھی اہل سنت کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں صرف شیعہ امامیہ اولیاء میں یہ کی کتابوں میں اس کی روایت ملتی ہے، اخطب خوارزم جو دیر ہی ہے اپنی کتاب میں یوں بیان کرتا ہے کہ "جناب امیر جب جنگ صفین کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں ساتھیوں کو سخت پیاس لگی مگر پانی آس پاس دستیاب نہ تھا جناب امیر نے اس وادی میں واقع ایک گرجا کے قریب اشارہ فرمایا یہاں کھدائی کرو دوران کھدائی سامنے ایک چٹان اُگئی جس کو اکھڑنے اور ہلانے سے سب عاجز آ گئے، تو اس کی اطلاع آپ کو دی گئی چنانچہ آپ خود اس گڑھ میں اترے اور اس چٹان کو وہاں سے اٹھا کر دور پھینک دیا اس کے نیچے میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ نکل آیا ساری فوج نے وہ پانی پیا اور خوب سیراب ہوئے۔ جب گرجا کے راہب نے یہ کرشمہ دیکھا تو ایمان لے آیا۔ اور کہنے لگا کہ ہم نے اپنی پرانی کتابوں میں لکھا دیکھا ہے کہ ایک شخص ان ان اوصاف کا اس گرجا کے قریب پڑاؤ کرے گا اور اس چٹان کو اٹھا لے گا وہ دین حق پر ہوگا۔

اس کلام کا ماحصل بس اتنا ہی تو نکلا کہ اگر یہ کرامت ثابت بھی ہو تو آپ کی اور کرامتوں کی طرح یہ بھی ایک کرامت ہوگی امامت کے دعوے کا یہاں کوئی ذکر ہی نہیں، نہ اہل شام کے مقابلہ میں یہ قسمہ پیش آیا اگر ایسے مؤلف پر یہ واقعہ پیش آتا بھی تو وہ اہل سنت کے لئے راحت قلب ہوتا شیعوں کے دعوے سے اس کو کیا تعلق ہوتا کیونکہ اس وقت تو بالا جماع جناب امیرؑ کی امامت، امامت حق تھی۔ اور وہ مقابل مخالف اور ناصق!

اور رہا سورج کا لڑنا تو اکثر محدثین رحمہم اللہ جو اہل سنت ہیں مثلاً طحاوی وغیرہ نے اس قسم کی روایت کو صحیح تسلیم کیا ہے اور یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلاشبہ ایک معجزہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی نماز عصر فوت ہونے کے اندیشہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے یہ واقعہ پیش آیا۔ تو آپ نے نماز عصر ادا فرمائی۔ اس وقت

امامت کا دعویٰ کہاں تھا، اور کون ان کا مخالف اور منکر تھا،

چھٹی دلیل ۱۔ یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی موافق یا مخالف نے کوئی ایسی روایت بیان نہیں کی جس میں آپ پر طعن، و قدح ذاتی طور پر وارد ہوتا ہو، بخلاف خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ان کے بارے میں موافق و مخالف ہر دو نے ایسی بہت سی روایات بیان کی ہیں جو ان کی ذات میں قدح و برائ کا سبب ہیں اور ان کے استحقاق امامت کو سلب کرتی ہیں، لہذا جناب امیر جو امور مخالفت امامت سے بری اور مناف ہیں امامت کے لئے مخصوص ہوئے،

اس دلیل میں عجیب انداز کی گڑبڑ اور مخالطہ آمیزی کی گئی ہے، اس لئے کہ اہل سنت اور معتزلہ جو ان تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم کی امامت کے قائل اور موافق ہیں، ان سے ہرگز کوئی ایسی روایت مروی نہیں، جو ان حضرات کی خرد گیری کا ہر کرتی ہو، بارے شیعہ تو وہ چونکہ ان حضرات ثلاثہ سے بغض و عناد شدید رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے مزدراچی روایات میں ان کو ثلاثہ امامت و طعن بنایا ہے۔ حالانکہ ان میں بھی کوئی طعن کی بات نہیں، اسے آگے چل کر باب مطالعہ میں ہم انشاء اللہ ان کا پول کھلیں گے،

اگر ان امور کو جو انہوں نے اپنی روایات میں طعن کا سبب بنایا ہے، موجب طعن مانیں تو لازم آتا ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں بھی طعن و قدح پیدا کریں۔ بلکہ اگر کوئی شیعہ کتب کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرے تو ان کو انبیاء کی شان میں طعن آمیز باتوں سے بھرپور اور بھری ہوئی پائے گا، اس بحث کا اچھا خاصہ حصہ تو اوراق سابق میں بیان بھی ہو چکا ہے،

اور ان کا یہ کہنا کہ جناب امیر کے بارے میں کسی موافق یا مخالف نے قدح و عیب اور ابیت بیان نہیں کی درمخالطہ ہے کیونکہ اہل سنت اگر مخالف ہیں تو یہ ان کا سفید بھوٹ ہے کہ چونکہ وہ تو آپ کی صحت امامت کے معتقد ہیں وہ تو مخالف ہیں ہی نہیں، وہ ایسی رعایات بیان ہی کیوں کرنے لگے اور اگر مخالف سے مراد خواص اور خوارج ہیں تو انہوں نے تو اس سلسلہ میں اتنے لیے چورسے افراد اور طومار باندھے ہیں کہ درق کے درق سیاہ کر ڈالے اور ایسی خرافات و لغویات بک کر اپنے منہ کا لے کئے ہیں کہ ہم اس کتاب میں سوادب کے خیال سے ان کا ذکر بھی نہیں کر سکتے لیکن معاملہ ایسی قوم سے بحث کا ہے جو لغویات و خرافات اور معنی طعن ہیں ان سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ تو نقل کفر کفر نہاد کے مصداق ان کی کتابوں سے بقدر قلیل بطور نمونہ یہاں درج کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ عبدالمجید صاحب مغربی کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق طعن آمیز باتیں مطالعہ، دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن کی روایات میں خواص تنہا ہیں، اہل سنت اور شیعہ جہاں ان روایات کا انکار کرتے ہیں، ایسی روایات کا قابل اعتبار میں اور دوسری کہ ان کی وجہ سے کوئی الزام عائد کیا جاسکے اس لئے کہ وہ محض افراد اور بھوٹ و بہتان پر مبنی ہیں۔ مثلاً قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں آپ کی شرکت، یا قذف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں آپ کا حصہ لینا اور یہ آیت نازل ہونا۔

وَالَّذِينَ تَزُولُ رِجْلُهُمْ فِي مَنَافِقِ كَذِبٍ ۚ
ان منافقوں میں سے جو اس بہتان عظیم کا ذمہ دار
بنائے اس کے لئے مذاب عظیم ہے،

دوسری قسم وہ جو اہل سنت اور شیعوں کی کتابوں میں سے جو اس بہتان عظیم کے ساتھ منقول و مروی ہیں،

اس قسم کے مطامع واقعی قابل توجہ اور جواب طلب ہیں، چنانچہ اہل سنت اور شیعہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ ان کے جوابات دیئے ہیں۔ شیعہوں میں رمی نے "نثریہ الانبیاء والائمة"، نامی کتاب میں۔ اور اہل سنت میں سے ابن حزم نے اپنی کتاب "قتاب الفیصل" میں۔ اس قسم کے بہت سے مطامع کا جواب دے کر ان کا رد کیا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ قتل عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے اموال واسلحہ پر خلیفہ امیر بن خود قابض و منفرد ہو گئے ہر چند ان کے وارثوں نے مانگا مگر ان کو نہ دیا۔ حالانکہ مسلمان کا مال کسی طرح حلال نہیں۔ چنانچہ ولید بن عقبہ نفاس بارے میں چند اشعار کہے ہیں:

- | | |
|--|---|
| (۱) اَلَا مَا لِلْبَنِيِّ لَا تَغْوُهُمْ كَوَالِدُهُ | اِذَا هُمَا تَجْمُلَانِ حَجْمًا تَبْرَأُ |
| (۲) بَنِي هَاشِمٍ مَدُّوا سِلَاحَ ابْنِ اُخْتِهِ | لَا تَبْهَبُوهُ لَوْ تَحِلُّ مَنَاجِدُهُ |
| (۳) بَنِي هَاشِمٍ لَا تَجْعَلُوا شَافَا تَكُ | سَوَادُ عَلَيْنَا قَاتِلُوهُ وَ سَالِبُهُ |
| (۴) وَاَنَا وَاِيَاكُمْ وَمَا كَانَ مِنْكُمْ | كَمُذْرِعِ الْقَصَادِ يَرَابِ الْقَدَمِ شَابِهُ |
| (۵) بَنِي هَاشِمٍ كَيْفَ اَلْتَمَأْتُمْ سِلَاحَنَا | وَعِنْدَ قَبِي سَلْبُهُ وَ حَرَامُهُ |
| (۶) لَعَمْرُكَ لَا اُتَى بَنِي اَزْدٍ وَقْتُكَ | وَهَلْ يَلْبِسُ الْمَاءُ مَا قَاشَ شَارِبُهُ |
| (۷) هُمْ تَتْلُوهُ كَمَا يَكُونُ مَكَانُهُ | كَمَا نَعَدْتُ كَوْمًا بِكَلْسِي مَوَادِيكُ |

(۱) خبردار! یہ میری رات کو کیا ہو اگر اس کے ستارے ڈوبتے ہی نہیں جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کے مقابل دوسرا ستارہ ظاہر ہو جاتا ہے،

- (۲) اے بنی ہاشم اپنے بھانجے کے ہتھیار واپس کر دو، اور ان کو موٹومت ان کا روٹنا جائز نہیں،
- (۳) اے بنی ہاشم ہم سے جلد بازی نہ کرو ہمارے نزدیک ان کے قتل کرنے والے اور ان کو لوٹنے والے برابر ہیں،
- (۴) ہم تم اور جو کچھ تمہاری طرف سے ہوا ہے پتھر کا وہ شگاف ہے جسے کوئی بھرنے والا بھر نہیں سکتا،
- (۵) اے بنی ہاشم ہم میں اور تم میں صلح کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ ملی کے پاس ان کا تیر و تامل ہے،
- (۶) تیری جان کی قسم میں نہ عثمان کو بھولوں گا اور نہ ان کے قتل کو اور کیا پانی کے پینے والا تازہ ندی اس کو بھول سکتا ہے۔

(۷) انہوں نے اس کو اس لئے قتل کیا کہ اس کی جگہ لے لیں۔ جیسا کہ کسریٰ کے ساتھ ایک دن اس کے امیروں نے کیا تھا۔

ایک دوسرا طعن یہ کہ آپ نے اہمات الاولاد (دوہ باندیاں جن کے اولاد ہو جائے) کے بارے میں اپنے مختلف خطاب ظاہر فرمائے اور کسی ایک پر نہیں جمے! پہلے ان کی ذرعت کے قاتل تھے، پھر عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں جب ان کی ذرعت کے حرام ہونے پر اجماع ہوا تو آپ اس اجماع سے متفق ہو گئے۔ پھر اپنی خلافت کے زمانہ میں ان کی ذرعت صحیح ہونے پر فتویٰ صادر فرمایا اسی لئے قاضی شریح نے آپ سے دو بروگفتگو کی اور کہا اِنَّكَ فَاِجْمَاعًا اَحَبُّ اِلَيْنَا مِنْ نَأْيِدَةٍ وَ خُلِّفَتْ دَاخِلُكَ دَاخِلُ رَاِئِے جَمَاعَتِ كَمَا تَقُولُ هُوَ مَعَكُمْ هُوَ مَعَكُمْ هُوَ مَعَكُمْ

تمہارا رائے سے زیادہ پسند ہے، حالانکہ آپ نے خود یہ فرمایا تھا کہ اَلَا اِنَّ يَدَ اللّٰهِ عَلٰى الْجَمَاعَةِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ خَالَفَهَا خبردار جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جس کی مخالفت کرے اس پر اللہ کا غصہ ہے، اور قرآن میں یہ ارشاد موجود ہے،

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُوْمِنِيْنَ (آخر آیت تک) لہذا آپ نے صاف طور پر اجماع کی مخالفت فرمائی ان مطالعہ میں سے ایک اور یہ ہے کہ آپ نے دادا کے حصہ وراثت میں مختلف فیصلے صادر فرمائے اور کسی پر بھی برقرار نہ رہے حالانکہ خود ہی یہ بھی ارشاد فرمایا مَنْ اَمَّا اِذَا كَانَ يَتَفَقَّهُ حِسْرًا يَتِيمٌ فَهَيْئَلُ فِي الْحَيَاةِ (جو جہنم میں جانے کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ مسئلہ جہنم کلام کرے) ان ہی میں سے ایک وہ ہے جس کی بخاری نے بایں الفاظ روایت کی ہے اِنَّ عَلِيًّا اَتٰى بِذُنَادٍ ثَقَلَتْ عَلَيْهِ رِيَالًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ کے پاس کچھ زینق لائے گئے تو آپ نے ان کو آگ میں جلا دیا۔

یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بہت برسی لگی اور جناب امیر کو بھی مذمت ہوئی، آگ سے جلا دینے کا یہ قصہ شیعہ کتب میں بھی موجود ہے شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الایثار والائتہ میں روایت کی ہے اِنَّ عَلِيًّا حَرَّقَ نَجْدًا اَتٰى فُلَانًا فِيْ دُبُرٍ (جناب علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جس نے اعلان کیا تھا، جلا دیا۔

حالانکہ حدیث لَا تُعَذِّبُوْا لَنَا رِءَاْکَ سے مذاہب نہ دو کی صحت پر اجماع ہے ایک طعن یہ ہے کہ آپ نے شراب پینے کی سزا میں بطور حد ایک شخص کے انٹی کوڑے لگوائے اور جب وہ مر گیا تو اس کی دیت (خون بہا) بھی ادا فرمادی اور فرمایا اِنَّمَا وَدَّ يَتَدَلَّ اِنَّ هَذَا اَشْيًى فَعَلْنَا كَمَا يَرَانَا رَمْنٌ بِيْهِ غَوْنُ بہا اس لئے دیا کہ یہ نسل ہم نے اپنی ذاتی رائے سے کیا تھا حالانکہ خود عہد عمر رضی اللہ عنہ میں شراب کی حد کے سلسلہ میں آپ نے ہی ان کو مشورہ دیا تھا کہ اس حد میں اسی کوڑے ہونے چاہئیں اور دلیل یہ بھی کہ اِذَا سَكَّرَ هٰذِيْ وَ اِذَا اَهْدٰى اِفْتَوٰى رَجَبٌ مَّسِيْ جَآئَ لِيْ تَوَادُلٌ فَرَلِيْ بَكِيْ گاہ اور جب بکواس کرے گا تو افتراء باز رہے گا اگر بایا آپ کو اپنے اجتہاد میں شک و تردد ہو گیا۔

ایک طعن یہ ہے کہ ولید بن عقبہ کے آپ نے چالیس کوڑے لگائے اور یوں آپ نے مدشرع میں لحاظ مردت اور رواداری سے کام لیا۔ کیونکہ ولید بن عقبہ کا حضرت عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ سے رشتہ قرابت تھا۔ ایک طعن یہ ہے کہ ایک شخص پر اس کے اقرار کی وجہ سے حد تناسل لازم ہوتی تھی آپ نے وہ حد معاف فرما دی۔ حالانکہ یہ خلاف شرع ہے نَسَمُ نَفْسٍ يٰلَا تُقْبَلُ رَجَانٌ كَابِدٌ لَّهٗ جَانٌ (کاسہ ہے،

ایک طعن یہ ہے کہ مولانا صاحب پر رحم کر لیا حالانکہ وہ کنیز (باندی) تھی جس پر رحم نہیں ہوتا۔ ایک طعن یہ بھی ہے کہ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مسکاتیب (قسم غلام) کے معاملہ میں آپ کو الزام دیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر غلام کے ذمہ زمر مسکاتیب میں سے ایک درہم بھی باقی ہے تو وہ پورا غلام باقی ہے، مگر جناب امیرؓ کا خیال تھا کہ وہ جتنی ادائیگی کر دینگا اس کے قدر آزاد ہو جائے گا۔ اور باقی کے برابر غلام رہے گا جیسا کہ صحاح میں منقول ہے،

اور ایک طعن یہ ہے کہ پہلے تو آپ درہنچوں کے فیصلہ پر راضی ہو گئے پھر فرمانے لگے لَقَدْ عَثَرْتُ عَثْرَةً لَا كِبَرُ لَهَا وَكَسَوْتُ أَلْبُسَ كِبَرٍ مَا جِلْدُ النَّمْرِ دَمِيں نے ایسی ٹھوکر کھائی ہے، جس کی کوئی تلافی نہیں اب اس کے بعد بہت ہوشیاری سے کام لوں گا، حالانکہ پنجابیت کا حکم ٹھکرانا جائز نہیں۔
ایک طعن یہ بھی کہ بمطابق روایت شعبی إِنَّ قَلِيلًا قُطِعَ يَدَ السَّارِقِ مِنَ الْمُؤْمِلِ الدَّصَابِعِ حضرت علی نے چور کا ہاتھ انگلی کی جڑوں سے کاٹا، گویا آپ مد سارق سے نواقف تھے، اور جو شخص اتنا مت حدودی سے نواقف ہو وہ امانت کے لائق نہیں۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنے بچوں میں بعض کی بعض کے خلاف گواہی کو قبول فرمایا حالانکہ بات صاف صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَأَشْتَتُهُمْ ذُرِّيَّةً مِنْ تَارِكِينَ (اور گواہ بناؤ، دو گواہ مردوں میں سے)

ایک طعن یہ ہے کہ آنکھ کی دیت میں، نصف دیت کا لینا، فتناس لینے والے کا نے جس کی ایک آنکھ چھوڑ دی گئی ہو، کو مقرر فرمایا، حالانکہ حکم أَلْعَيْنِ بِالْعَيْنِ (آنکھ کے بدلے آنکھ کا ہے)۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپؐ نے بچہ پر سرقہ کی حد جاری فرادی جیسا کہ کتب شیعہ میں موجود ہے حالانکہ آپؐ نے خود روایت فرمائی ہے کہ مَنْ نَمَسَ نَفْسَهُ مِنْ ثَلَاثَةِ عَشْرَةِ نَفْسَاتٍ حَتَّى يَبْلُغَ عَشْرِينَ سَلَّمَ (یعنی وہ مکلف نہیں ہیں، بچہ سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے)

ان میں سے ایک یہ ہے جس کی روایت محمد بن بابویہ بھی نے الفقیہ میں کی ہے۔
أَنَّهُ جَاءَهُ تَجَمُّلٌ إِلَى أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ وَآخَرُ بِالْعُرْقَةِ إِتْرَارًا يُقَطِّعُ بِهِ الْيَدَ فَكَلَّمَ كَقَطْعِ يَدٍ۔
امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے چوری کا اقرار کیا جس سے قطع ید کی حد لگنی چاہیے تھی مگر آپؐ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ حالانکہ حدود

قائم نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے،

ایک طعن یہ بھی ہے کہ جب ناشی شاعر عین رمنان میں شراب نوشی کے جرم میں پکڑا ہوا آیا تو آپؐ نے حد شرعی سے ہمیں کوڑے سے زیادہ اس کے لگائے۔ جب کہ حد شرعی پر زیادہ جائز نہیں،

ایک طعن یہ ہے کہ شریف مرتضیٰ نے تفسیرہ الانبیاء والائمہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ أُمِّي بَنِي إِسْرَءِيلَ مَغْشُورًا أَلْبَسَايَا فَقَالَ إِنَّمَا نَعُوذُ بِكَ بِحَبْلِ جَبَّتِي عَطَاؤُ غَنِيٍّ وَبِكَ هَلِيلُهُ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب فاحشہ عورتوں کی کمائی کا مال پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا اے اٹھائے جاؤ نا اٹھ مالداروں اور اس کے اہل کی عطایا وصول ہوں، حالانکہ فاحشہ عورتوں کی اجرت حرام ہے،

ایک طعن یہ ہے کہ آپؐ نے دراہم میں سود کا حکم دیا جو حکم رسول کی صریح مخالفت ہے، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے لَا تَبْنِيُوا الدِّنَارَ هَاهُنَا هَاهُنَا درہم کو درہم کے بدلے نہ بچو

ایک طعن یہ ہے کہ آپؐ کی بعض باتوں سے دعوائے اہمیت ظاہر ہوتا ہے مثلاً خطبۃ البیان جو رجال شیعہ میں سے اصبع بن بنانہ سے منقول ہے أَنَا أَخَذْتُ النِّعْمَةَ عَلَى الدُّرِّ وَالْأَزَلِ أَنَا الْمُنَادِي

لَقَدْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ - ازل میں رحوں سے میں نے ہی مہر لیا اور میں نے ہی انہیں پکار کر کہا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ اسی طرح آپ کا قول - اَنَا مُنْشِيُ الدُّوَاخِ دُورِاحِ کا پیدا کرنے والا میں ہی ہوں، یا خطبۃ الافتخار میں آپ کا وہ قول جس کی روایت رجب بن محمد بن رجب برسی علی نے اپنی کتاب مشارق انوار الیقین فی الکشف عن امیر المؤمنین میں ہا میں الفاظ کی ہے، اَنَا صَاحِبُ السُّوْرِ - اَنَا مُخْرِجُ مَنْ فِي الْقُبُورِ دَرِّمِ صاحب سورہ ہوں اور میں ہی اہل قبر کو قبروں سے نکالنے والا ہوں،

یا آپ کا یہ قول -

اَنَا حَيٌّ لَا يَمُوتُ - اَنَا جَاوِزُتِ يَوْمَسَى الْجَحْرِ
وَأَعْرَفْتُ فِرْعَوْنَ وَجُذُوعَهُ اَنَا اَرْسَيْتُ الْجِبَالَ
النَّجَارَاتِ وَفَجَّرْتُ الْعُمُودَ النَّجَارِيَّاتِ اَنَا
ذَلِكَ النَّوْرُ الَّذِي اِقْبَسَ مُوسَى مِنْهُ الْهَدْيَ
کو ہدایت کی روشنی ملی۔

ایک طعن یہ ہے کہ بین عراق اور عمان میں تو اپنے اعزہ و اقارب کو حاکم مقرر فرمایا مگر کو فہ و بصرہ پر ظلم و زبردستی (رضی اللہ عنہا) کی حاکمیت کو راہ فرمائی حالانکہ امارت کی سپرنگی میں یہ زیادہ حقہ اور زیادہ بہتر تھے، ایک طعن یہ بھی ہے کہ قاتلان عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) پر قصاص جاری کرنے میں تاخیر اور بے دلی دکھائی حالانکہ اسباب قتل حضرت عثمان پر ثابت نہ ہو سکے۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ حضرت ابوسلی اشعری (رضی اللہ عنہ) کی امانت کی۔ ان کا مال لوٹا، اور ان کے گھر کو نذر آتش کیا اور جناب ابو سعید انصاری (رضی اللہ عنہ) کی بھی توہین کی، ایک طعن یہ ہے کہ واقعہ انکس کو تسلیم کرنے والوں میں سے آپ بھی تھے چنانچہ بخاری کی یہ روایت و کَانَ عَلِيٍّ مُسْلِمًا فِي مَدَنَةِ اَرْدَ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تسلیم کرنے والوں میں سے تھے،

حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَكُوْنَا اِذْ سَبَحْنَاهُ يَوْمَ تَوَلَّوْا الْمُؤْمِنُوْنَ - تو گویا ایمانی تقاضے کے خلاف کیا۔

ان میں سے ایک طعن یہ بھی ہے کہ اول تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل سے پوری بریت ظاہر کی جب اس پر قاتلان عثمان بکبیدہ خاطر اور آزر وہ دل ہرے تو فرمایا - قَتَلَهُ اللّٰهُ وَاَنَا مَعَهُ رَاۤى كُوْنَهُ تَعَالٰی نے قتل کیا اور میں اس کے ساتھ ہوں۔

امامت کو باطل قرار دینے کے لئے ان بد مختوں کے شبہات و اعتراضات اتنے طویل الذیل ہیں کہ اس منقر کتاب میں ان کا اور ان کے جوابات کا بیان خواہ مخواہ طوالت کا باعث ہو گا دے وہ اس کتاب کے مومنین سے بھی خارج ہیں، مجد لہ اہل سنت کی بڑی کتابوں میں ان خرافات کی بڑی تفصیل سے خاطر خواہ تردید کی جاتی رہی ہے،

اصول اہل سنت کے مطابق ان مطامع کا جواب اجمالی طور پر بالکل ظاہر ہے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اسلمہ جات اور اموال جو آپ اپنے تصرف میں لائے تو وہ اس لئے کہ وہ اموال طبرہ ایسے ہوں گے جن کا تعلق بیت المال سے ہوگا جناب شہید رضی اللہ عنہ کی ذاتی ملکیت نہ ہونگے اور ایسا ہونا لازمہ امت میں سے ہے کہ جو خلیفہ ہوتا ہے وہی ایسے اموال پر قابض و متصرف ہوتا ہے۔ ہمارے دور میں بھی اس کی مثال شاہی تخت، چتر، ہاتھی گھوڑے وغیرہ ہیں کہ وہ آنے والے بادشاہ کے قبضہ و تصرف میں آتے ہیں وراثتاً شاہ میں تقسیم نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس قسم کے اموال خلیفہ اول کے بعد خلیفہ ثانی کے تصرف میں آئے خلیفہ اول کے وارثوں کو نہیں ملے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ورثہ اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے اس لئے انہوں نے مطالبہ پیش کر دیا۔

(۲) اہل سنت کے اعتقاد کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ مجتہد بھی تھے، اور مجتہد کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ایک مذہب ترک کر کے دوسرے مذہب اختیار کر لے اور ایسا بھی ہوا ہے دیہاں مذہب سے مراد مجتہد نہ رائے ہے مذہب بمعنی دین نہیں، چنانچہ شیخین رضی اللہ عنہما سے بھی ایسے واقعات کا مدور ہوا ہے۔

(۳) عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں اہل اہلاد پر جو اجماع تھا وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے نقطہ خیال سے قطعی نہ ہوگا، بلکہ غلطی ہوگا اسی لئے آپ نے اس کی مخالفت کی اور اجماع غلطی، اور اجماع سکوت کی مخالفت ہو سکتی ہے پھر اصولیوں کے نزدیک اجماع کے محنت کے لئے یہ شرط ہے کہ اہل اجماع اپنے قول پر قائم و برقرار رہیں اور چونکہ جناب امیر بھی اہل اجماع میں سے تھے، جب آپ کا اجتہاد بدلا تو اس وقت وہ اجماع آپ کے لئے حجت نہیں رہا۔

(۴) حد کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق اور جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہما باہم مختلف النہال تھے چنانچہ عہد فاروق میں اس مسئلہ پر کافی بحث و مناظرہ ہوتا رہا۔ اگر مجتہدین کسی نقطہ نظر سے اختلاف کریں اور ایک مجتہد مختلف افہات میں حکم کی مختلف جواب کو ترجیح دے تو کوئی مضائقہ نہیں،

آپ کے کلام من اسنادان یتقعد کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ حد مختلف فیہا ہے ترجیح کے لئے ہر جانب وجہ قائم ہیں اور اس میں کوئی نص و ادونہیں لہذا ان حالات میں اگر کوئی اس میں حکم قطعی ہے تو وہ بے باک ہوگا اور بے احتیاط بھی قاطع علماء اور ماہرین فضلہ کی شان یہی ہے کہ مختلف فیہ اجتہادی مسائل میں کسی ایک طرف جزم و یقین نہیں رکھتے،

(۵) زہد و زینق اور مرتکب انعام کو ملانے کا جو واقعہ تھا وہ بھی اجتہادی تھا۔ جب آپ کو خبر صحنہ سدوم ہوئی تو آپ نے اظہار ندامت فرمایا اور اجتہاد میں تمام اخبار پر تفصیلی نظر رکھنا شرط نہیں، اسی لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ابتداء میراث جب کا علم نہ تھا جب جناب عبید بن جراح اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے اس کی خبر دی تو آپ نے اس کو تسلیم فرمایا سالانہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باجماع فرما دیا و خوارج مجتہد تھے۔

(۶) اسی طرح شرابی پر حد لگانے کے بعد دینا بھی بطور احتیاط تھا۔ اجتہاد میں کسی شک کی بنا پر نہیں تھا اور احتیاط کے پہلو پر عمل کرنا انتہائی تقویٰ اور پرہیزگاری کی علامت ہے جو جناب امیر رضی اللہ عنہ جیسے مسبقوں کے شایان نشان ہے،

(۷) اور ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے اس لئے لگانے کہ اس سے متعلق شہادت میں شبہ پیدا ہو گیا تھا، ایک شخص نے شراب پینے پر شہادت دی تھی اور دوسرے نے شراب کی تے پر، گو جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حد میں اس شبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جب کہ ان کے دور میں ایسا واقعہ ہوا اور فرمایا وَمَا تَقْيَا هَا اِرَادَ وَتَدْبِرُهَا اس نے اسی لئے

تو شراب کی تہ کی کہ اس نے شراب پی، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ نے امتیاط کے طرہ پر دو حدوں میں سے جو حد کم تھی اس پر اکتفا کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ قرابت عثمان کا حد کے اجراء میں لحاظ فرماتے جب کہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آپ نے نہایت تاکید کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ مدد پوری پوری نافذ کی جائیں، چنانچہ سیرت و تاریخ کی وہ کتابیں جن کی صحت پر اہل سنت و فواصہ دونوں متفق ہیں اس پر واضح اور صاف دلالت کر رہی ہیں،

(۸) اور قسماں آپ نے معاف نہیں کیا تھا بلکہ مقتول کے درشا کی جانب سے معافی ہوئی تھی، البتہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ اس میں ضرور شامل تھا معتبر کتابوں میں یہ قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو عداوت کی بنا پر ایک دیرانے میں قتل کیا اور بھاگ گیا مقتول کے درشا قاتل کی تلاش میں نکلے تو اس دیرانے سے متصل ایک اور دیرانہ تھا۔ وہاں انہوں نے ایک شخص کو پشاب کرتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں خون آلود پھیری بھی تھی کپڑے بھی خون آلود تھے لوگوں نے اسے شبہ میں پکڑ کر جناب امیر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے سارے حالات اپنے خلاف پا کر اقرارِ حرم کر لیا اور کہا کہ جو شرمی سزا ہو مجھے دیر ہی جائے کیونکہ آگے قتل بھی میرے پاس ہے، گواہ بھی پیچھے ہیں، میں پایا بھی مقتول کے قریب ہوں اب میرے لئے کہنے کو کیا رہ گیا ہے اسی اثنا میں جب اصل قاتل کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ناکردہ گناہ نے اس کا حرم اپنے سرے لیا ہے، تو وہ بھاگا ہوا جناب امیر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور کہا کہ اصل قاتل میں ہوں اور یہ شخص بے گناہ ہے لہذا اسے رہا کیجئے اور قسماں مجھ سے لیجئے، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے پہلے آدمی سے پوچھا کہ تو تائیر سے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا جو تو قتل کا اقرار ہی ہو گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے اپنے گھر میں بکری ذبح کی تھی، پھیری پر اسی کا خون تھا کپڑوں پر بھی اسی کا خون لگا تھا، ذبح کے بعد کھال اتارنا ہی چاہتا تھا کہ پشاب نے زور کیا تو میں فراغت کے لئے دیرانہ میں جا گھسا وہاں ایک لاش کو دیکھ کر ڈر گیا اور اس کے برابر اسے دیرانے میں جا کر پشاب کر رہا تھا کہ مقتول کے وارثوں نے آچڑھا اور آپ کے پاس لے آئے سارے حالات میرے خلاف تھے، کچھ کہتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا لہذا میں نے اقرار کر لیا، اس پر جناب امیر نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اصل افزاری قاتل کو شاباش دی کہ گونہ نے ایک آدمی قتل کیا ہے مگر دوسرے کی جان بھی بچائی تو اگر اقرار نہ کرتا تو ایک بے گناہ قسماں میں مارا جاتا تو اس قابل ہے کہ تیرا خون بہا معاف کیا جائے مقتول کے وارثوں نے جب آپ کی یہ بات سنی تو قسماں سے لادعویٰ ہو گئے اور قاتل کو معاف کر دیا۔ لہذا اس صورت میں طعن کی کہاں گنجائش ہے۔

(۹) رجم مولاہ عاظم، اگر اس کی آزادی کے بعد ہوا تو جائز ہوا، اور ممکن ہے آپ کو اس کے کنیز ہونے کی اطلاع نہ ہو۔

(۱۰) آپ کے ساتھ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا منظرہ کرنا اور ایک مسئلہ میں آپ کو الزام دینا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی عقارت کا باعث نہیں۔ حق کی پیروی تو ادلیا کی شان ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ایک عورت کی بات کے نائل ہو گئے اور بر ملا یہ الفاظ فرمائے، **كُلُّ النَّاسِ اَفْقَعُ مِنْ عَصْرِ كَيْفَ الْمُخَدَّاتِ فِي الْحِمَالِ**۔ (عمر سے تو سبھی لوگ زیادہ سمجھدار ہیں حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی)۔

(۱۱) پنپائیت کی خلاف ورزی تو اس وقت لازم آتی ہے جب کہ دونوں بیچوں نے غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ دے دیا ہو۔ جناب معاذ یہ رضی اللہ عنہ کے بیچ نے مد مقابل کے بیچ کو گڑ بڑا دیا اور اس کو سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تو یہ

پنچاست کہاں ہوئی جو اس کی خلاف ورزی کا الزام دیا جائے۔

(۱۲) چور کا ہاتھ انگلیوں کی جڑوں تک کاٹنا یہ جلا وطنی غلطی تھی، آپ کا حکم نہیں تھا جو آپ کی لاعلمی لازم آئے،

(۱۳) اور بچوں میں باہم ایک دوسرے کی گواہی قبول کرنا جب کہ وہ امور ہی ایسے ہوں جو بچوں میں چلتے رہتے ہیں اب بھی امام ماکہ رحمہ اللہ علیہ کے یہاں مقبول ہے، اور آیت فاستشهدوا میں بچے داخل نہیں کیونکہ بچوں کے باہم کھیل کود میں بالعموم کی موجودگی نہیں ہوا کرتی اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ کافروں میں بعض کی گواہی بعض کے لئے مان لی جاتی ہے، لہذا جب یہ مجتہدین کا مسلک ہوا تو طعن کا سوال نہ رہا۔

(۱۴) اور ایک چشم کی آنکھ کی ادھی دہت لینا یہ فقیہ کی باریک بینی اور مکتہ رسی ہے کیونکہ کانے کی صرف ایک ہی آنکھ ہے جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی ہے۔ لہذا اگر نقصاں لینے والے نے اس کی اس آنکھ کو چھوڑا جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی تھی تو گویا اس نے اپنے حق سے تجاوز کیا اور ایک زائد آنکھ چھوڑ دی۔ تو اس پر رویت لازم ہو گئی البتہ قرآنی نص العین بالعين کے پیش نظر اس سے قصاص لینا لازم ہوگا۔ لہذا اس جگہ حقیقت اور شبہ حقیقت دونوں پر عمل ہوا اگرچہ یہ کسی مجتہد کا عمل نہیں ہے لیکن قواعد شرعیہ اس کے نظام پر پیش کئے جاسکتے ہیں، مثلاً زکوٰۃ میں بنت خمس ایک سال کی اونٹنی اک جگہ بنت لبون (دو سال کی اونٹنی) لینا اور بقدر زائد کی قیمت دیدینا جائز ہے، حاصل کلام یہ کہ اجتہادی مسائل میں کسی پر طعن منقول اور کاربے ثواب ہے!

(۱۵) اور نابالغ بچہ پر اگر پوری حد سرقہ لگانا ثابت بھی ہو تو وہ سیاست خلاف پر مبنی ہوگا حکم شرعی کی بنا پر نہیں بچوں پر گو قلم شرع اٹھ گیا ہے، مگر خلفا کی سیاست اور تاویلی نثر ان پر لاگو ہو سکتی ہے حدیث صحیح موجود ہے کہ اَضْرَبْتُمْ عَلَيْهِمُ اَوَّلَهُمْ اَبْنَاءَ عَشْرٍ سِنِينَ۔ (وہ دس برس کے بچوں کو نماز پڑھنے پر انہیں مار لگاؤ)

(۱۶) اور محمد بن بابویہ کی روایت کہ چوری کا اقرار کر لینے والے پر حد نہ لگائی، یا د مضاف میں شراب خوری والے پر مقررہ حد سے بیس کوڑے زائد لگائے، ناقابل قبول ہے لہذا اس کے جواب کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کی بھی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ یہ زیادتی بر بنائے سیاست تھی!۔

(۱۷) رہا فاحشہ عورتوں کی اجرت کا معادہ تو اہل سنت کی کتابوں میں تو اس کا وجود ہے نہیں اس لئے اس کا جواب بھی ہو سکتا ہے کہ روایت جھوٹی ہے جب کہ اہل سنت کے ہاں تو اس کے خلاف ایک مجمع روایت استیعاب میں موجود ہے،

ابو سلمہ موسیٰ بن اسماعیل نے ابی حواریہ سے، اس نے میسر سے اس نے ثابت بن حمزہ سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ غار وثقنی، مدائن سے اپنے چچا کے پاس سے کچھ مال لا کر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس لایا۔ جب مال کی پردگی سے نارغ ہو گیا تو ایک عقلی نکالی جس میں پندرہ درہم تھے اور کہنے لگا کہ یہ فاحشہ عورت کی کمائی میں سے ہے جو جناب علیؑ نے فرمایا نیزاں اس جائے میرا

مَا وَدَّ ابْنُ اَبِي سَلَمَةَ مَوْسَى ابْنُ اَسْمَاعِيلَ عَنْ ابِي حُوَارَةَ عَنْ ثَابِتِ بْنِ حُمَزَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ مَا لَا مَرَجَ لَهَا مِنْ عَيْنِ عَتَمَةٍ اِلَى عَلِيٍّ ابْنِ اَبِي طَالِبٍ فَلَمَّا نَزَعَ اَخْرَجَ كَيْسًا فِيهِ خَمْسَةُ عَشْرَ دِرْهَمًا فَقَالَ هَذَا مِنْ اُجْرِهَا اَلْمَسَاكِينِ فَقَالَ عَلِيٌّ وَنَيْلُكَ مَا بِي وَلَا اُجْرُهَا اَلْمَسَاكِينِ ثُمَّ قَامَ اَلْمَسَاكِينُ وَ عَلَيْهِ مَقْلَعَةٌ لَهُ خَمْرٌ اَوْ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ

قَبْلِ مَالِهِ فَاتَّخَذَهُ اللَّهُ مَوْلًى شَقِيًّا ۚ قُلَيْدُ الذَّنِّ لَوْ جِدَ ۚ
مِلْدَانٌ مِنْ حَبِّ اللَّاتِ وَالْعُزَّىٰ۔
اس کہانی سے کیا واسطہ افتخار یہ سن کر اٹھ کھڑا اس وقت
وہ سرخ کپڑا پیٹے ہوا تھا۔ اس نے جب حضرت علیؓ کو عرض
سلا کیا تو آپ نے فرمایا دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے، اس پر ائمہ کی پھٹکار ہو، اس وقت اگر اس کا دل صبر کر دیکھا جائے تو وہ
ہات و دھڑکی کی محبت سے لبریز نظر آئے گا،

لہذا معلوم ہوا کہ شیعوں نے جو روایت بیان کی ہے وہ مختار تفتنی کے افتراء اور بہتان پر مبنی ہے جس کو مختار
نے ایسا مالی ہنسٹ کرنے اور شرسنگی مٹانے کی خاطر گھڑنت کر کے عام لشکریوں اور اپنے پیروکاروں تک پہنچائی اور
بالآخر رفتہ رفتہ شہرت پا گئی،

۱۸۷) در اہم کے سود کے متعلق صورت یہ ہے کہ وہ در اہم جن میں کھوٹ اتنی زیادہ ہو کہ ان کا چلن بند ہو جائے اور سکے
کی حیثیت ختم ہو جائے، ایسے در اہم رسکوں کی کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت شافیہ کے نزدیک جائز ہے حرام
نہیں ہو سکتا ہے کہ جن در اہم میں جناب امیر نے زیادہ کو جائز رکھا ہو، وہ اس قسم میں ہوں، اور حضور اکرم ﷺ
علیہ وسلم کے ارشاد میں در اہم سے مراد وہ ہے جو ناسن پانڈی کا ہو یا اگر کھوٹ ہو بھی تو اتنی نہ ہو کہ اس کے چلن میں
عارض ہو، اور اس کی قیمت کی حیثیت باقی ہو،

۱۸۸) اور خطبۃ البیان اور خطبۃ الافتخار کا اہل سنت کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں، بلکہ ان کے ہاں یہ موضوعات میں
شامل ہیں ان کے راوی امامیہ ہیں اور جھوٹے ہیں لہذا ایسی افتراء اور بہتان کی بات کو آڑ بنا کر طعن کرنا پرے درجہ
کی سفاقت اور بے وقوفی ہے اور بالفرض ان کو صیح مان بھی لیں تو یہ غلبہ حال و سرستی کی کیفیت ہو گی چنانچہ بعض
اوقات اولیاء اللہ پر یہ حالت طاری ہو جاتی ہیں اور ان کے زیر اثر ان کی زبان سے ایسے کلمات کا صدور ہو جاتا ہے
اور شرع میں حالی کی ایسی سستی اور ایسے غلبہ پر معذور رکھا گیا ہے، تو یہ کے سلسلہ میں صیح حدیث میں اس کی مثال موجود
ہے، کہ کوئی بندہ بول کہہ بیٹھا۔ اَنْتَ عَبْدِي وَ اَنَا كَمُكَكَ۔ اَخْطَا مِنْ شَيْءٍ وَ الْقَدْ رَجَعْتُ مِرَابِدَهُ فِي تِيْرَا
رب خوشی کی شدت میں وہ ایسی غلطی کر بیٹھا۔

پھر یہ کلام زبان حال کی حکایت ہے جیسے کہتے ہیں، قَالَتْ اَلَا زَيْدٌ يَلْمُكَ لِمَ تَتَّقِيْهِ قَالَتْ لَا تَسْأَلْنِيْ
وَأَسْأَلُ مِنْ قَيْدِ زَيْدٍ زَيْدٌ نَسِيَ سَيْحَ سَبْحَةٍ كَرِهَ لَهَا زَيْدٌ سَبْحَةٍ سَبْحَةٍ سَبْحَةٍ سَبْحَةٍ سَبْحَةٍ سَبْحَةٍ سَبْحَةٍ سَبْحَةٍ
شوٹنگ رہا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے هَلْ تَدْرِيْ مَاذَا قَالَ هَاجِلُكُمْ (کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے
کیا کہا؟) یعنی زبان اشارہ سے در نہ زبان عبادت کا است کو بہتہ ہونا غیر ممکن ہے، کہ وہ اس کو جان سکیں،
۲۰۰) اور امارت، اور مہدوں کے لئے ایسے اقارب اور عزیز زیادہ بہتر ہیں جو واجبی اطاعت سے سزا و نفاق نہیں
کرتے بہ نسبت ان انبیوں اور عزیزوں سے جن کا شمار ہی نافرمانی اور حکم عدولی بن گیا ہو، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ
عنه نے بھی یہ طرز اختیار فرمایا۔

۲۱) اور تائیں عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے میں در، اور پس و پیش اس لئے عقی کہ قاتل کی تعیین نہ ہو سکی تھی
اور قاتل کی تفتیش اور سراغ رسانی خلیفہ کے ذمہ نہیں بلکہ وارثوں کے ذمہ ہے،

(۲۲) اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی اہانت مالک اشتر اور اس کے غلاموں نے کی اور کوفہ میں کی ان کا گھر بغیر امیر رضی اللہ عنہ کے حکم کے جلا ڈالا اور آپ کو اس کی اطلاع تک نہ ہوئی، تاریخ طبری میں یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا ہے اور جناب ابوسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی اہانت کا سبب ان کی بائیزوں کی طرفاری اور جانبداری تھی۔

(۲۳) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کی شان میں واقعہ کی تسلیم آیت ہدایہ نازل ہونے سے پہلے پہلے تھا اور اس میں بظاہر خرابی اس لئے نہیں کہ محض خبر سچ اور محبوث دونوں پہلو رکھتی ہے،

(۲۴) اور آپ کا یہ کہنا تَنَكُّهُ اللّٰهُ دَنَا مَعَهُ۔ بطور قرریہ کے تھا، کہ ضرورت کے وقت آپ اس کو کام میں لائے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے حضرت سارہ علیہا السلام کے حق میں هَذَا اخي لکلا۔ اور ضرورت یہ تھی کہ مبادا قاتلان عثمان لا لشکریں بلوہ اور قتلہ و فساد برپا کریں۔ بلکہ خطرہ یہ بھی تھا، کہ خود جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہی قتل کے درپے نہ ہو جائیں،

خلاصہ کلام یہ کہ شیطان نے فواصب اور شیعہ ہر دو کی راہ ماری اور ان کو خدا کے دوستوں کی عیب جوئی کی راہ پر ڈال دیا جو اس کی عین آرزو اور مقصد وجود ہے اور یوں اس نے ان کو اپنا آلہ کار بنالیا و خدا سے رسوا کرنا چاہتا ہے اس کا میدان طبع نیک لوگوں پر طعنہ زنی کی طرف کر دیتا ہے (۱)

امامت کی بحث کا خاتمہ

شیعوں کے تمام فرقوں میں قدر مشترک وہ نکتہ خیال جس پر سب متفق ہیں۔ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ و امام ہو فصل تھے اور تینوں خلفاء سران اللہ علیہم کی خلافت غلط اور بے بنیاد تھی اس قدر مشترک پر اہل سنت کے ساتھ ان کا جو نزاع اور بحث تھی وہ گذشتہ اوراق میں بڑی تفصیل اور واضح انداز میں گزر چکی اور اسی کے ساتھ شیعہ فرقوں، ان کی شاخوں بلکہ ڈالوں نے اس سلسلہ میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ سے جو مخالفت کی ہے وہ بھی وضاحت سے سامنے آچکی۔

لیکن اس قدر مشترک کے باوجود بھی ان کے فرقوں میں باہم بڑے سنگین اختلافات ہیں، حتیٰ کہ بعض نے بعض دوسروں کو کافر و گمراہ تک کہنے میں کوئی باک نہ کیا۔ ایک دوسرے کو طعن کرنا تو معمولی سی بات ہے،

اس کتاب میں اختلافات کا ذکر موزوں تو نہ تھا کیونکہ اس کا موزوں شیعہ و سنی کی آپس میں گفتگو و بحث ہے نیز ان کے مابقی اختلاف سے اہل سنت کا کچھ نقصان بھی نہیں لیکن اس نقطہ نظر سے کہ کسی چیز میں زیادہ اختلاف ہونا اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے، مسائل مژوہ امامت، معنی امامت اور تعیین ائمہ میں ان کے اقوال نقل کرنا موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اس مذہب کے جھوٹ ہونے کی علامت مختلف پہلوؤں سے واضح ہو جائیں اور ان کا یہ طعن کہ اہل سنت فقہ میں بہت اختلاف کرتے ہیں، انہیں پر لوٹ جائے کیونکہ ان کا اختلاف تو اصول میں ہے جس سے مذہب کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے اور اہل سنت کا اختلاف مژومات میں ہے جو رحمت ہے گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان بھی اصول میں متفق رہے ہیں، گو فروعات میں اختلاف رہا چنانچہ شرع لکھد مے الدین مآوضی پہ نوحا (الی آخر آیت) اس پر گواہ ہے

لہذا وہ دین جو اپنے اندر اصول اختلاف رکھتا ہو، ایک کرشمہ ہی ہے جس کی نظر انبیاء سابق کے ادیان تک میں

نہیں ملتی یہ جائیکہ اسلام میں اس کی گنجائش ہو۔

شروط امامت میں اختلاف۔ اہل عالی شیعوں کے نزدیک امامت محض ادا امر نواہی کے احکام کے اجراء و نفاذ کا نام ہے، شیوئوں البیہ میں سے ایک شان۔ ان خلاۃ کے علاوہ باقی فرقے کہتے ہیں کہ امامت دین و دنیا کے امور میں پیغمبر کی نیابت ہے سارے زیدی امام میں عصمت کی شرط کے قائل نہیں، اور اسے بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ اس کے لئے کوئی نص وارد ہو،

اور زیدی امام کے لئے افضلیت کو لازم سمجھتے ہیں، بلکہ امامت کی شرطوں میں سے بہترین شرط تلوار تمام کر نکل آنے کو مانتے ہیں اور اپنے سب دعوؤں کی دلیل پیش کرتے ہیں،

اسمعیلیہ۔ سب کے سب علاوہ فرقہ ززاریہ کے عصمت کو امامت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں ززاریہ اس معاملہ میں خاموش ہیں، نہ انکار کرتے نہ ہاں کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ امام کو فردع کے لئے مکلف ہی نہیں کیا گیا وہ جو بھی حرام کاری کرے اسکے لئے سب کی سب جائز ہیں،

شیخ الطائف ابو جعفر طوسی۔ نے اپنے شیخ ابو عبد اللہ محمد بن نعمان بغدادی جو شیخ مفید کے لقب سے مشہور ہیں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابو الحسن ہارونی، ابتدا میں شیعہ مذہب رکھتے اور امامت کے قائل تھے لیکن امامیہ کے شدید جھگڑوں کی وجہ سے انہیں راہ ہدایت کا بھی پتہ نہ چل سکا اور انہوں نے ان کی روایات کو آپس میں مختلف تناقض اور متضاد دیکھ کر شیعیت ہی پر تین حرف بھیجے اور توبہ کر کے شافعی مذہب اختیار کر لیا اور وہ لوگ جو آپ کے شاگرد یا صحبت یافتہ تھے۔ اور عمر مہبران سے استفادہ کرتے رہے تھے، انہوں نے بھی اپنے شیخ کی پیروی میں اس مذہب سے اظہار بیزاری کیا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شخص بھی گہرائی میں اتار کر اس مذہب پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے اقوال و اجاز کے پریشان کن اختلاف سے آگاہ ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس مذہب میں راہ نجات ہی غائب ہے اور تعارض کی راہ تنگ اور راہ اخلاص معدوم و مفقود ہے تو مجبور ہو کر اس مذہب کو خیر باد کہتا اور دوسرا کوئی مذہب اختیار کر لیتا ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں سے متعارض روایات بیان کرتے ہیں اور سرِ امام سے دوسرے کے خلاف بھی روایات لاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جو قرآن و حدیث کے بھی مخالف ہوتی ہیں،

اور اس تعارض و تناقض میں نسخ کا کوئی احتمال ہے ہی نہیں، کیونکہ ایک نبی کے لام کو دوسرا نبی ہی منسوخ کر سکتا ہے، امام کو یہ حق ہی کہاں ہے وہ خدا اور رسول کے احکام کو منسوخ کر سکے ورنہ امام امام ہی نہ رہے گا کیونکہ وہ تو نبی کا نائب ہے نہ اس کا مخالف ہے نہ مستقل نبی اور بغیر منعی نسخ کو مان لیں تو بعد میں آنے والا امام امام اول کے احکام کا نسخ ہو گا اس صورت میں مدار عمل بعد اسے امام کی روایات پر ہو گا حالانکہ اس فرقہ نے امام اول کی روایت پر اجماع کیا ہے،

پھر اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ احکام مودیدہ میں جن میں ایک دوسرے سے تاکید و منسوخ جائز نہیں ورنہ

معصوم کی تکذیب لازم آئے گی۔ حالانکہ ان کی روایات کا اختلاف احکامِ سریدہ میں بھی چلتا ہے لہذا نسخ کا احتمال سرے سے زائل ہو گیا۔

اور درجی یہ بات کہ رداۃ کے وثوق کے اعتبار سے ایک خبر کی دوسری خبر پر ترجیح کا معاملہ تو اس کا فراسطہ ہی بند ہے۔ کیونکہ انہوں نے چند کتابوں کو کتبِ مساوی سمجھ رکھا ہے اگر کوئی ان میں سے ایک روایت لاتا ہے تو دوسرے کے نزدیک اس کی حیثیت خاک کے برابر ہے،

لہذا اگر ان کے عوام کے نقطہ نظر سے سمجھی کو قابلِ وثوق سمجھ لیں تو ایک کو دوسری پر ترجیح کس طرح دے سکیں گے اور اگر بعض راویوں کے اقوال کو بعض دوسروں کے مقابلہ میں قبول کر کے دوسروں پر طعن و تشنیع اور جرح و ثرواع کر دیں تو سارے کے سارے موضوع ہو کر رہ جائیں گے اور اس صورت میں ترجیح کی کوئی شکل بھی متصور نہیں تو پھر ساری روایات ساقط اور ناقابلِ عمل ہو کر احکامِ معطل اور بیکار ہوئے جاتے ہیں،

اس قسم کی روایات ان کے ایک فرقہ اثنا عشریہ کی ہیں کہ ان کا ہر عالم ایک ایسی روایت بیان کرتا ہے جو دوسرے کی روایت سے ٹکراتی ہے مثلاً ایک جماعت بطریقِ صحیح یہ روایت بیان کرتی ہے کہ اَلْمَذْنُوعُ لَا يُقْبَلُ اَلْمُضَوَّرُ۔ مذنی وضو نہیں توڑتی اور دوسری جماعت صحیح سند سے یوں بیان کرتی ہے کہ اَلْمَذْنُوعُ لَا يُقْبَلُ اَلْمُضَوَّرُ۔ مذنی وضو توڑ دیتی ہے، ایک جماعت کہتی ہے کہ نمازیں سجدہ سہو واجب نہیں تو دوسری روایت کرتی ہے کہ سجدہ سہو واجب ہے اور ائمہ نے سجدہ سہو کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ شہرِ خراسانی سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو بعض کہتے ہیں کہ وضو نہیں ٹوٹتا، ایک جماعت کہتی ہے کہ جماعت نماز پڑھیں یا دیگر اعضا بدن سے کھینا نماز میں خراب پیدا نہیں کرتا تو دوسری جماعت یہ روایت کرتی ہے کہ عضوِ مخصوص اور اس کے تعلقات سے کھینا بھی نماز میں جائز ہے، اور یہ حالت دو چار اخبارِ راجی میں نہیں تمام اخبارِ روایات میں ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب مَن ذَا يَفْضَلُ اَلْفَقِيْدَةُ اس پر گواہ ہے،

اور اگر شیعوں کے تمام فرقوں کی روایات و اخبار پر نظر ڈالیں تو ان کے تمام اصول و فروع میں بے ربطی اور گورڈ کا ایسا طوفان اٹھنا دکھائی دیتا ہے جس کی کوئی مدد و انتہا نہیں ان کے بعض علماء نے ان سب روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے درحقیقت عجیب جادوگری دکھائی ہے ان میں سب کا پیشوا اور راہِ شیخ لطفِ محمد بن الحسن الطوسی ہے جو تہذیب و استبصار کا مصنف ہے، اس کی کوشش کی یہ معراج ہے کہ وہ ان کو تقیہ پر محمول کر گیا ہے کہ وہ مخالفین میں سے کسی کا مذہب نہیں ہے یا اگر ہے تو ضعیف کم ایک دو آدمیوں سے زائد کسی نے اسے اختیار نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ ائمہ نظام اس قدر بزدل اور خوفزدہ قرآن تھے کہ صرف اس وہم و شبہ کی وجہ سے کہ شاید کوئی یہ مذہب رکھتا ہو اور اس دلت موجود بھی ہو اپنی عبادت کو باطل و خراب کر دیں ان ائمہ اور اویاد کے متعلق ایسی بدعتیگی کے تصور سے بھی خدا کی پناہ!

اور پھر بعض جگہ خبرِ روایت کے ایک جملہ کو تقیہ پر محمول کیا ہے اور دوسرے جملہ کو کہ وہ بھی اہل سنت کے مذہب کے خلاف ہے جو ان کا توں چھوڑ دیا ہے اگر یہ تقیہ ہے تو پھر یہ کیسا تقیہ ہے کہ ایک جملہ میں تقیہ ہے اور دوسرا جملہ صاف صاف اور کھلم کھلا کیا یہ اپنے ائمہ کو عقل سے کر رہا ہی سمجھتے ہیں اس کی مثال حضرت علی کی یہ روایت ہے،

آنَ الْبَنِي عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَبَقِيَّةِ أَهْلِ بَيْتِهِ بِمُؤْمِنِينَ
وَبِحَبْلِ طَيْبٍ أَصَابِعُ آيَةِ حَبْلَيْنِ عِنْدَ غَسْبِقَا -
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو منہ دو مرتبہ دھونے کا
مکھ دیا اور پاؤں دو مرتبہ دھونے کا وقت ان میں انگلیوں سے مثال
کرنے کا۔

حالاں کہ منہ کا دو مرتبہ دھونا نہ شیعوں کا مذہب ہے نہ سنیوں کا۔ کیونکہ (بطور سنت) دونوں کا تین مرتبہ دھونے پر
اجماع ہے اور پاؤں کا دھونا سنی مذہب کے موافق ہے، شیعوں کے نزدیک تو مسح کرنا ان کا مذہب ہے لہذا اس حدیث
میں تقیہ و اظہار دونوں کا جمع کرنا لازم آیا۔

بعض جگہ ایسی رکبک اور پونج تاویلات کرتے ہیں کہ امام کے کلام فیض و بلیغ کو بازار یوں کے مہل اور لغو کلام کی حد
تک پہنچا دیتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک وہ تاویل ہے جو یہ جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ کے کلام میں کرتے ہیں، جب کہ آپ دعا فرما رہے ہیں
إِلٰهِي عَقَيْتُ وَطَلَمْتُ وَتَوَلَّيْتُ. میرے اللہ میں نے نافرمانی کی ظلم کیا اور سستی کی، یہاں یہی دعا ان کی کتابوں میں
دوسرے ائمہ سے بھی مروی ہے، اب یہ روایات خواہ سچ ہوں یا جھوٹ، ہر صورت عصمت کے خلاف ہیں، پھر یہ تقیہ کا موقع
بھی نہیں۔ کیونکہ یہ مسالہ تو اس ذات کے ساتھ مناجات کا ہے، جو سر ظاہر و پوشیدہ بات کو جاننے والی ہے،
اب اس دعا میں ان کی تاویل دیکھئے یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ۔

إِلٰهِي اِنَّ شَيْعَتِنَا عَصَوْا وَطَلَمُوا وَتَوَلَّوْا اَكْبَرُ
رَمَيْنَا بِهٖ شَيْخَتَهُ وَرَمَيْنَا بِهَا اَوْتَةً فَاَلَسْنَا
حَالِفِيْهِ وَحَالِفِيْهِمْ حَالِنَا -
اے میرے اللہ! ہمارے شیعوں نے نافرمانی کی اور ظلم کیا اور
سستی کی لیکن ہم ان کے شیعہ ہونے پر راضی ہیں اور وہ
ہمارے امام ہونے میں راضی ہیں، پس ہمارا حال ان کا حال ہے

اور ان کا حال ہمارا حال ہے،

اس یگانگت و اتحاد کے کیا کہنے۔ اگر شیعوں اور ائمہ میں اس قسم کی یگانگت و اتحاد ثابت ہے تو شیعوں کی نافرمانی
ظلم اور سستی تو ائمہ میں اثر کر گئی مگر ائمہ کا عدل، طاعت، عبادت و تقویٰ شیعوں پر مطلق اثر نہ کر سکی گویا شیعوں کے احکام
تو ائمہ پر غالب آگئے مگر ائمہ کے احکام شیعوں پر بے اثر رہے، کوئی حد ہے اس بد عقیدگی کی عرب و عجم کے عداوت میں
اس قسم کی لغو تاویل کی کوئی نظیر دھونڈے سے بھی نہ ملے گی،

پھر باعتبار فی نحو اس میں جو رکاکت ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں کہ واحد متکلم کی تاویل کو صحیح پر عمل کیا اور متکلم کو غائب
پر! اور متکلم کا غیر کے فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی لازم آیا بغیر کسی وجہ تعلق بسببیت وغیرہ کے! اور ایسے لغو فاسد
کلام کو ایسے لوگوں کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے جو بلاغت کی انتہا پر پہنچے ہوئے تھے،

اور پھر اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ اپنی ذات مقدس کو اس نسبت سے آلودہ کیا ظلم و عصیان کی نسبت براہ دست
ان شیعوں ہی کی طرف کیوں نہ کی۔ اور جو ان کی عصمت کے منکر تھے ان کے لئے اپنے ہاتھوں یہ دستاویز کیوں ہسیا
کی اور خواہ خواہ زائد ضرورت کلمات کہہ کر بہت بڑی جماعت کی گمراہی کا سبب کیوں بنے۔

اور پھر اسلام کے سرداروں اور ابتدائی محدثوں میں فروعی مسائل میں کافی سخت اختلافات رونما ہوئے خود اہل سنت
میں بھی فروعی مسائل میں باہم یکدگر خاصے اختلافات تھے مگر فروعی مسائل کے اس اختلاف کو کسی نقصان کا سبب نہیں

سمجھا۔ نہ اس کے باعث آپس میں طعن و مقاب اور سب و شتم سے کام لیا نہ زبانی گفتگوؤں اور بحث و مناظرہ کا البتہ رواج رہا ہر شخص اپنا مذہب ظاہر کرتا اور اس پر دلائل قائم کرتا۔ ہمد صواب سے لے کر عباسی دور تک آپس کی یہ مناظرہ بازی اور باہم چوٹیں پلٹتی رہیں، ہر مسئلے پر ہکا بھکا اور دھڑلے سے اجتہاد کرتے مسائل استنباط کرتے اپنے اقوال کی ترجیح کے دلائل ثابت کرتے اور فریق ثانی کے قول کو ضعیف و کمزور بتاتے۔ ایسے ماحول میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ائمہ کرام کو تقیہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام کو ظاہر کرنے سے کیوں پہلو تہی کی، حالانکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم و سوم کے عہد میں اصحاب اولاد و اراج متبع اور دوسرے مسائل پر کافی زور دار بحث کی اور جابنہیں میں خاصی سختی و درشتی کی نسبت بھی آئی، مگر اس کے باوجود کسی نے بھی بدل و نزاع نہیں کیا خصوصاً خلیفہ دوم کہ ان کو تشیع بھی اس معاملہ میں بہت نرم مزاج اور قبول حق میں مزاخل مانتے ہیں، ان کے سامنے قرآن و سنت سے جو بھی دلیل پیش کی جاتی ہو کسی پس و پیش کے قبول فرماتے خواص کی بات تو رہی الگ عام مسلمانوں میں ایک عورت نے ایک مسئلہ میں جب معقول بات کہی تو آپ نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ یہ الفاظ فرمائے کہ ان اس افتخار من عسحق الخلد است ہمد آدمی عترت زیادہ دین کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے حتیٰ کہ پردہ نشین مستورات بھی ایسے حالات میں جناب امیر رضی اللہ عنہ تقیہ کیوں فرماتے اور وہ بھی فردی مسائل میں اور منزل من اللہ کے اظہار سے جو آپ پر واجب تھا کیوں باز رہتے،

اسی طرح بعد میں آنے والے ائمہ مثلاً جناب سجاد، باقر، صادق، کاظم اور رضا رحمہم اللہ علیہم اجمعین جو علماء اہل سنت مثلاً زہری امام ابو حنیفہ، امام مالک رحمہم اللہ کے معتقد اور پیشوا رہ چکے ہیں، اور ان ہی بزرگوں سے ان حضرات کو تلمذ و شاگردی کا اعزاز بھی حاصل رہا اور اس وقت کے سر فیائے کرام مثلاً معروف کرخی رحمہ اللہ وغیرہ نے آئیناب ہی کے نیفی سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور شامی و طریقت نے ان ہی کے سلسلہ کو سلسلۃ الذہب کہا ہے اور پھر محدثین اہل سنت نے انہیں بزرگوں سے ہر فرق خصوصاً تغبیہ، سلوک اور حدیث میں دفتر کے دفتر روایت کئے ہیں تو کیا ایسے حالات میں ان محترم ائمہ کرام کے لئے یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ یہ اپنے معتقدین شاگردوں اور عقیدہ مندوں سے ڈر گئے ہوں اور ان سے تقیہ کیا ہو، اگر ایسے لوگوں سے تقیہ کیا جاسکتا ہے تو پھر وہابی شیعہ سے تو بد رجہ اولیٰ تقیہ کرنے کا احتمال ہونا چاہیے دیکھئے تو زیباں میں ہم کہاں سے کہاں لٹک گئے، بات یہ چل رہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد امامیہ اور شیعوں کے دوسرے فرقوں میں اصل امانت کے سلسلہ میں اتنا شدید اختلاف ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ اور یہی اختلاف آگے چل کر روایات کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہو کر اخیر آدم برسر مطلب۔

واضح رہے کہ اسمعیلیہ کے تین فرقوں کی طرح امامیہ بھی ائمہ کی تعداد کو خاص تعداد کے ساتھ محدود کرتے ہیں، مگر اس حد تعداد میں بھی باہم مختلف ہیں، یعنی یہ تعداد پانچ کہتے ہیں اور بعض سات بتاتے ہیں، بعض دوسرے آٹھ اور بعض بارہ کے قائل ہیں، تو بعض نیزہ کے علاوہ ائمہ میں اور بہت مانتے ہیں ان میں پہلا نام حضور علیہ السلام کا پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا پھر ان کی اولاد میں جو نیک بخت ہوں جناب جعفر بن محمد رحمہم اللہ تک گویا یہ سب چھوٹے خدا ہیں اور دوسرے خداؤں کو منقسم کرنے والے پھر ان کی اولاد میں جو نیک بخت ہو وہ ان کا جانشین و نائب ہے، علاوہ ہی کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ اس امت میں امام صرف دو ہیں۔ حضور علیہ السلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

پھر حضرت علیؓ کی اولاد میں جو نیابت کے لائق ہو وہ آپ کا نائب اور جانشین ہے،
 حلو یہ ہے کہ ہمیں کہہ دے کہ امام وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ حلول کرے۔ ان کا اختلاف باب اول میں مذکور ہوا۔
 کیسا نیہ کی شاخ متنازعہ اس کے قائل ہیں کہ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ امام ہیں پھر حضرت حسینؓ رضی اللہ
 عنہ، پھر ان کے بعد محمد بن الحنفیہ۔

ان میں سے ہر فرقہ اپنے تسلیم کردہ امام سے احکام شرعیہ میں احادیث و روایات نقل کرتا ہے، اور ان
 سب کے متواتر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔
 کیسا نیہ کا پہلا فرقہ کہتا ہے کہ جناب محمد بن الحنفیہ نے اپنے والد کی وفات کے بعد امامت کا دعویٰ کیا اور
 ان کے والد ان کی امامت کا حکم دے گئے تھے۔
 اسی کیسا نیہ کا دوسرا فرقہ متنازعہ کہتا ہے کہ حضرت حسینؓ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد محمد بن علیؓ نے
 امامت کا دعویٰ کیا۔ اور ان سے متعلق بہت سی خرق عادات بیان کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے دعویٰ کی تائید
 میں پیش کیں۔

اور سارے امامیہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ رضی اللہ عنہ کے بعد بے شک محمد بن علیؓ نے امامت کا دعویٰ کیا
 لیکن آخر میں اپنے دعویٰ سے رجوع فرما کر اپنے بھتیجے جناب زین العابدینؓ کی امامت کے قائل ہو گئے،
 راوندی نے جناب سجادؓ کے معجزات کے بارے میں حسین بن ابی العلاء اور ابی المضر حمید بن الثنیٰ ہر دوسے
 روایت کی ہے، یہ روایت انہوں نے ابی بصیر سے اور اس نے ابی عبد اللہؓ سے بیان کی کہ وہ فرماتے ہیں،
 ترجمہ: محمد بن حنفیہ علی بن حسین کے پاس آئے اور کہا کہ
 اے علی کیا تم میری امامت کا اقرار نہیں کرتے۔ وہ بولے
 چچا جان میں اگر صبیح جانتا تو آپ کی مخالفت کیوں کرتا
 بلکہ دمررت یہ ہے کہ آپ پر اور تمام مخلوق پر میری
 اطاعت فرض ہے چچا جان آپ کو بہتہ نہیں کہ میں
 دمی بھی ہوں اور دمی کا بیٹا بھی عرض کچھ دیر کی
 بجٹا بجٹا کے بعد علی بن حسین نے کہا کہ تم کس
 ثالث کو پسند کر دو گے وہ ہمارے درمیان ثالثی کرے
 محمد نے کہا جسے آپ پسند کریں علی نے کہا کہ کیا تم
 اس پر راضی ہو کہ حجر اسود ہمارا ثالث ہو محمد نے
 جواب دیا۔ سہماں اللہ میں آپ کو لوگوں کی طرف
 بلاتا ہوں اور آپ مجھے پتھر کی ثالثی پر بلاتے ہیں،
 جو بول نہیں سکتا علی نے کہا بے شک وہ بولے گا،

كَلَامُ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنْفِيَّةِ إِلَى عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ
 فَقَالَ يَا عَلِيُّ اَلَسْتَ تَقْرَأُ آيَةَ اِمَامَةٍ عَلَيْكَ
 فَقَالَ يَا عَلِيُّ لَوْ عَلِمْتُ ذَالِكَ مَا خَالَفْتُكَ
 وَرَايَ طَاعَتِي عَلَيْكَ وَعَلَى الْخَلْقِ مَعْرُوفٌ يَا عَلِيُّ
 اَمَا عَلِمْتَ اَنِّي وَصِيٌّ وَابْنٌ وَصِيٌّ وَتَشَاجِرًا
 سَاعَةً فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ بَيْنَ كَرْهِي حَتَّى يَكُونَ
 بَيْنَنَا حَكَمًا فَقَالَ مُحَمَّدٌ بَيْنَ شَلْتِ فَقَالَ اَنْدُمِي
 اَنْ يَكُونَ بَيْنَنَا الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ فَقَالَ سُبْحَانَ
 اللّٰهِ اَوْ هُوَ اِلَى النَّاسِ وَكَذَلِكَ عَزَى إِلَى جَعَلِ
 يَتَكَلَّمُ فَقَالَ عَلِيُّ بَلَى يَتَكَلَّمُ اِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ
 الْقِيَامَةِ وَلَهُ عَيْنَانِ وَلِسَانٌ وَشَفَتَانِ يُشْهَدُ
 عَلَى مَنْ اَتَاكَ بِالْمُؤَافَاةِ فَذُكِرَ اَنَّهُ اَوَّاهٌ
 فَذُكِرَ اَنَّهُ مَزْجَلٌ اَنْ يَتَكَلَّمُ اللّٰهُ اَيُّنَا

حُجَّةُ اللَّهِ عَلَى خَلْقِهِ فَأَنْطَلَقَا وَصَلَّيَا
 مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ وَكَرَرُوا مِنْ الْجَنَّةِ
 الْأَسْوَدِ وَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَنَفِيَّةِ
 لَيْسَ لَكُمْ يَحْيَا إِلَى مَا دَعَوْتَنِي إِلَيْهِ
 إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ فَقَالَ لِمُحَمَّدٍ
 يَا عَمْرُو تَقَدَّرَ إِلَيْهِ فَأَنْتَ أَنتَ مَيِّتِي
 فَقَالَ مُحَمَّدٌ لِلْحَجَّاجِ أَسْأَلُكَ بِحُجْرَةِ اللَّهِ
 وَحُجْرَةِ رَسُولِهِ وَحُجْرَةِ كُلِّ مُؤْمِنٍ
 إِنْ كُنْتُ تَعْلَمُ أَلِي حُجَّةٌ عَلَى عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ
 فَأَنْطِقْ بِالْحَقِّ وَثَبَّتْ لَنَا فَلَمْ يُجِبْهُ ثُمَّ
 مُحَمَّدٌ قَالَ لِعَلِّي تَقَدَّرَ مَا نَأْسَلُهُ فَقَدَّرَ عَلَيْهِ
 فَقَالَ لَهُ بِمَا وَخَفِي ثُمَّ قَالَ أَسْأَلُكَ بِحُجْرَةِ
 اللَّهِ وَحُجْرَةِ رَسُولِهِ وَحُجْرَةِ
 أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيِّ وَحُجْرَةِ الْحَسَنِ
 وَالْحُسَيْنِ وَنَاحِيَةِ بَيْتِ مُحَمَّدٍ إِنْ كُنْتُ
 تَعْلَمُ أَلِي حُجَّةٌ اللَّهُ عَلَى عَلِيٍّ فَأَنْطِقْ بِذَلِكَ
 وَثَبَّتْ لَهُ حَتَّى يَرْجِعَ عَنْ رَأْيِهِ فَقَالَ الْحَجَّاجِيُّ
 عَدِيٌّ مَيْمُونِي يَا مُحَمَّدُ بِنُ عَلَى إِسْمَعِيلَ وَأَبِي
 لِعَلِّي بْنِ الْحُسَيْنِ لِأَنَّهُ حُجَّةُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَ
 عَلَى جَمِيعِ خَلْقِهِ فَقَالَ بِنُ الْحَنَفِيَّةِ وَبِنُ
 ذَالِكَ سَمِعْتُ وَأَطَعْتُ وَسَكَتُ -

قیامت کے دن اسکی دو آنکھیں ہوں گی ایک زبان اور دو ہونٹ
 وہ اس کے متعلق گواہی دے گا جو اچھے خاتمہ کے ساتھ اسکے
 پاس آئے گا لہذا میں اور تم اسکے پاس چلتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ سے
 دعا کریں گے کہ وہ گویا ہو کر بتائے کہ ہم میں کون اللہ کی مخلوق پر اللہ کی
 محبت سے چنانچہ دونوں گئے دو نزل نے مقام ابراہیم پر دو گاروا
 کیا اور پھر حجر اسود کے قریب گئے محمد بن حنفیہ کہہ چکے تھے کہ تم مجھے
 جھکے پاس سے جا رہے ہو وہ نہ بولا تو تم غلام قرار پا گے پھر علی
 نے کہا چاہا جان پہلے آپ اسکی طرف بڑھئے کہ آپ باقتدار عمر محمد سے
 بڑے میں چنانچہ محمد نے حجر اسود سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ
 میں اللہ و رسول اور سر مومن کی حرمت کو واسطہ ٹھہرا کر تجھ سے
 پوچھتا ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں علی بن حسین پر محبت ہوں تو حق
 بات کہہ اور یہی ثابت کر دکھا کہ کون اللہ کی محبت سے ہے پھر عمر نے علی
 سے کہا کہ اب تم آگے بڑھو اور اس سے پوچھو چنانچہ علی نے آگے بڑھ
 کر پہلے تو کچھ آہستہ سے کہا پھر کہا کہ میں اللہ رسول اللہ امیر المؤمنین
 علی بن حسین اور فاطمہ بنت محمد کی حرمت کا واسطہ دیکر تجھ سے
 پوچھتا ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں اپنے چچا پر اللہ کی محبت ہوں تو
 ان کو بتا اور ثابت کر دکھاتا کہ وہ اپنی رائے سے رجوع کر لیں اس
 وقت حجر اسود زبان عربی صاف طور پر گویا ہوا کہ اے محمد بن علی سزاوار
 علی بن حسین کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تم پر اور اللہ کی سب مخلوق
 پر اللہ کی محبت میں تب محمد بن حنفیہ بول اٹھے میں نے سن لیا اور
 اور میں نے اطاعت کی اور میں نے یہ بات تسلیم کر لی

کیا سنیہ اس دعوے کی توثیق کرتے ہیں مگر شہادت کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہادت اس کے الٹ تھی کہ
 کہ حجر اسود نے محمد بن حنفیہ کے حق میں ان کی دعا پر گواہی دی تھی، اور علی بن حسین نے محمد کی امامت ان کی بھی توثیق کی ہے کہ
 علی بن حسین کا طرز عمل اسپر سچا گواہ ہے، کہ اس کے بعد وہ امامت کا نام تک اپنی زبان پر نہ لائے اور مکمل خاموشی اختیار
 کر لی، اور اس سکوت کے امامیہ بھی قائل ہیں،

محمد بن حنفیہ نے فتا رثقی، اور کوفہ کے شیعروں سے جو اس وقت مراد انہوں سے بنو آرماتھے خط
 و کتابت کا رابطہ قائم کیا چنانچہ انہوں نے بھی آپ سے تعلقات استوار کر لئے، علی سے رابطہ و میل ملاپ
 نہیں رکھا حالانکہ دونوں ایک جگہ ہی شہر مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے،

اور پھر کوفہ میں شیعوں کے نذرانے بھی محمد کو ہی پہنچائے جاتے تھے کہ علی بن حسینؑ کو، اور نہ ہی شیعیان کوفہ علی کو اپنے پاس بلا سکتے تھے! قاضی نور اللہ مویشی نے مجالس المؤمنین میں لکھا ہے کہ جب محمد بن الحنفیہ نے وفات پائی تو ان کے شیعوں نے ان کے صاحبزادے ابو ہاشم کی امامت کو تسلیم کیا۔ جو بڑے مرتبہ والے تھے۔ اور شیعہ پہلے ہی سے ان کے معتقد تھے اور مطیع و فرمانبردار تھے۔ خود محمد بن الحنفیہ نے ان کی امامت کے لئے وصیت کی تھی۔

اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ محمد بن الحنفیہ اپنے دعوے سے آخر تک نہیں پھرے تھے، اسی لئے امامت اپنے خاندان کے سپرد کی۔

قاضی نور اللہ نے محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ خط بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے مختار اور کوفہ کے شیعوں کو لکھا تھا، جسکی عبارت کچھ یوں تھی۔

”اے مختار! مکہ سے کوفہ جا۔ اور ہمارے شیعوں سے کہہ کہ امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے خون کا بدلہ لینے کے لئے نکل کھڑے ہوں اور کوفیوں سے (بھاری) بیعت لے۔“

کہتے ہیں کہ جب مختار نے یہ خط کوفیوں کو دکھایا تو کوفہ کے اکثر لوگ سلیمان سے برگشتہ ہو کر منہ موڑ گئے۔ سلیمان نے اپنے شیعوں سے کہا ٹھیک ہے تم بے شک محمد بن الحنفیہ کی حمایت میں خروج کرو کوئی مضائقہ نہیں مگر ہمارے امام تو علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں۔ لہذا کوفیوں کا سلیمان سے برگشتہ ہونا یہ ثابت کر لیتے کہ محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔

اور قاضی نور اللہ، ابو الوید غرار ذمی سے بھی جو زیدی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا یہ روایت بیان کرتا ہے کہ مختار ثقفی نے امرائے شام کے سر فوج کی خوشخبری اور تیس ہزار دیانہ کے ساتھ محمد بن الحنفیہؑ کے پاس بھیجے تھے کہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس۔ اور انہوں نے اس فوج کی نعمت کی شکر گزاری میں دو گانا دا فرمایا اور شاہیوں کے سروں کو سرعام ٹٹکانے کا حکم دیا۔ مگر جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے منع کیا اور فرمایا ان کو دفن کرادو!

اس واقعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ مختار محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا معتقد تھا۔ اس لئے اس کو انس وقت کوئی خوف و خطر نہ تھا، کہ وہ دل سے تو جناب سجادؑ کی امامت کا معتقد ہوتا اور کسی ضرورت کے تحت بطور تلقیہ جناب محمد بن علیؑ کو امام کہتا۔ اب ذرا قاضی نور اللہ کا ایک دوسرا بیان دیکھئے، اور غور فرمائیے کہ اس سے مدعا کیا برآمد ہوتا ہے، وہ مختار کا حال نکھتے ہوئے علامہ حل کے حوالہ سے کہتا ہے کہ شیعوں کو مختار کی حسن عقیدت میں تو کوئی کلام نہیں، البتہ اس کے بعض ناشائستہ اعمال ان کو قابل اعتراض لگتے تو انہوں نے اس کو اعتراضات و مزمت اور سب و شتم کا ہدف بنایا۔ اس کی خبر جب جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو آپ نے مختار پر اعتراضات کرنے سے شیعوں کو منع کر دیا اور کہا کہ اس نے ہمارے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور ہیں رو پیہ پیسہ بھی بھیجا۔

یہاں عقلمندوں کو غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں! کہ اس کا واضح اور صاف مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی امام وقت کا منکر ہو تو یہ مناسب نہیں کہ اس کی دیگر خدمات اور خاندان سے دل محبت کو نظر انداز کر کے اس کو برا بھلا کہا جائے۔

اب وہیں اس کی ذاتی با اعمال جو اس سے مراد دہوتی رہی ہیں، تو ان کی پردہ پوشی ہی طریق احسن ہے۔ اس نتیجہ کے پیش نظر کہنے والی بات یہ ہے کہ اہل سنت کا بھی تو یہی مذہب ہے وہ بھی حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے متعلق یہی کہنا چاہتے ہیں کہ گو وہ امام وقت کی امامت کے منکر تھے مگر بائیں ہمہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے تھے۔ اللہ وہ رسول کے دشمنوں کے

قلع وقوع کی خاطر مصروف جہاد رہتے تھے۔ اللہ کے نام کا بول بالا کرنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ رسول اللہ کے اہل بیت کی روپیہ پیسے سے اعانت کرتے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو داد ہمیش میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ تو ان پر زبان درازی کا کیا جواز رہا۔

بات پھر دو دو ٹکڑی گئی۔ اور بات سے بات نکل آئی۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ کیسا یہ ان شواہد و دلائل کی بنا پر یہ ملنے کے لئے تیار نہیں کہ جناب محمد بن علی الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ دعوائے امامت سے پھر گئے تھے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کیا انہوں نے جناب محمد بن علیؑ کی کرامات کا اتنا طوارر وایت کیا ہے کہ جو حدود و تعصبات سے بھی ماورای۔ اور قیاس و عقل سے بھی باہر ہیں، اور پھر ان سب کو متواتر بھی خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ جناب محمد بن علیؑ کے بعد آپ ہی کی ہدایت و حکم سے آپ کے بیٹے ابوہاشم امام ہوئے۔ البتہ ان کے بعد باہم اختلاف ہو گیا کہ کون امام ہے، یہ سب تفصیلات باب اول میں بیان ہو چکیں۔

زید یہ فرقہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد زید بن علی بن حسین (رضی اللہ عنہم) امام ہوئے۔ وہ علی بن حسین رحمہما اللہ کی امامت کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک تو "مائے سومیر" کے مصداق جو توارے کر میدان میں آجائے وہی امام ہے، یہی ان کے ہاں شرط امامت ہے۔ سکوت اور تقیہ جو ان کے خلاف ہے اس لئے وہ کسی گوشہ نشین، اور تقیہ پر عامل کو امام تسلیم نہیں کرتے۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جناب زید اپنے باپ، دادا، اور جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہم سے اپنی امامت کے متعلق نصوص اور بشوات بھی نقل کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض روایات کو وہ متواتر بھی ملتے ہیں۔

جناب زید بن علی رحمہ اللہ علیہ امامیہ کے تمام معتقدات سے انکار اور ان کی تردید کیا کرتے تھے اور اس انکار کی روایات امامیہ اور خود زید بھی نقل کرتے ہیں۔ ہشام کے قصہ میں بحوالہ کلینی اس کی نقل اوراق ماسبق میں بیان ہو چکی ہے۔ باقیہ فرقہ کا یہ اعتقاد ہے کہ امام باقری ہمدی موجود ہیں۔ وہ حلی لایموت ہیں اور نظروں سے اوجھل ہیں۔

نادر سید فرقہ سی اعتقاد جناب جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کی نسبت رکھتے ہیں، اور آپ سے یہ متواتر روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

لَوْ رَأَيْتُمْ رَأْسِي تَدَّحْدَهُ عَلَيْكُمْ مِنْ هَذَا
الْجَبَلِ فَلَا تَصَدَّقُوهُ فَإِنَّ صَاحِبَكُمْ صَاحِبُ
(التَّائِيْنِ)۔
اگر تم میرے سر کو اس پہاڑ سے اٹھکا ہوا اپنے پاس آنا
دیکھو تو بھی اس کی موت کا یقین نہ کرو کیونکہ تمہارا صاحب
(سرور۔ امام) بہت طویل عمر والا ہے۔

الشمعیہ، جناب اسمعیل بن جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کے متعلق جناب جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کی یہ ہدایت متواتر روایت کرتے ہیں کہ اِنِّي هَذَا الْأَمْرُ فِي الْأَكْبَرِ مَا لَمْ يَكُنْ يَدْعَاهُ (یہ امر امامت بڑے بیٹے کو پہنچتا ہے جب تک اس میں کوئی خرابی رونما نہ ہو) اور جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ کے دعوائے امامت کو جھٹلاتے ہیں، اور انہیں برائی سے یاد کرتے ہیں کہ انہوں نے نص متواتر کے خلاف کیا جس طرح حضرت ابوہریرہ (صدیق رضی اللہ عنہ) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیا۔

قوامہ جناب اسمعیل کے بعد ان کے بیٹے محمدؑ کو امام مانتے ہیں مگر ائمہ جناب صادق کے بعد عبد اللہ بن جعفر کو امام بلا فصل مانتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ اسمعیل کے حقیقی بھائی تھے۔ اور یہ بھائی جب جناب صادق کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ تو چونکہ نص اسمعیل کے حق میں تھی، لامحالہ باپ کی وفات کے بعد بطریق میراث اس نص کا مصداق حقیقی بھائی ہوا نہ کہ سوتیلی بھائی۔ اور اسمعیل و عبد اللہ کی والدہ فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسین بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم) تھیں لہذا دونوں بھائی دونوں جناب سے حسینی سید تھے

موسوی کہتے ہیں کہ جناب صادق رحمہ اللہ علیہ کی نص و ہدایت کے مطابق آپ کے بعد جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ امام ہیں۔
مطویرہ آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ حی لا موت ہیں اور قائم منتظر بھی وہی ہیں، اور ثبوت میں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ
سے یہ نص متواتر نقل کرتے ہیں۔

مَسَابِعُهُمْ قَائِمٌ مَعَهُمْ صَاحِبُ التَّوَارِقِ۔ (ان کا ساتوں ان میں قائم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم نام ہے)
اشاعرہ نے جناب حسن عسکری رحمہ اللہ علیہ کی امامت پر اتفاق کیا ہے ان کے بعد جعفریہ (فرقہ) نے جناب جعفر بن علی
کو امام مانا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکری لا ولد تھے۔ دلیل یہ ہے کہ آپ کی میراث جعفر بن علی نے لی۔ یہ بالا جماع ثابت ہے اگر ان
کے کوئی بیٹا ہوتا تو جعفر کو کیسے پہنچتی!

مگر بعض کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکریؑ کے بیٹا تھا جو باپ کی زندگی میں کسن فوت ہو گیا کلینی نے زمارہ بن اعین سے بحوالہ
ابی عبد اللہ روایت کی ہے۔

إِنَّهُ قَالَ لَا بُدَّ لِلْعَلَامِ مِنْ عَيْبَةٍ
كُنْتُ وَرِسَةٍ، قَالَ يَخَافُ كُنْتُ وَمَا يَخَافُ
فَأَذْهَبِي بِسِدِّيقٍ إِلَى بَطْنِهِ۔
آپ نے کہا اڑ کے کے لئے غائب رہنا ہی ضروری ہے
میں نے کہا کیوں؟ آپ نے کہا خوف کھاتا ہے۔ میں نے کہا کس بات
سے ڈرتا ہے؟ آپ نے جواب میں اپنے ہاتھ سے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔
اشاعرہ نے اس اشارہ کا مطلب سمجھا کہ لوگوں کو ان کی ولادت میں شک پڑ جائے گا، بعض کہیں گے کہ حمل سا قطع ہو گیا۔ بعض
کہیں گے سرے سے حمل تھا ہی نہیں۔

لیکن عقلمند سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ”ما یخاف“ کے جواب میں اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرنا ان کے سمجھے ہوئے معنی کو صاف
طور پر غلط بتا رہا ہے اس لئے کہ پیٹ کے
بچہ کو خوف نہیں ہوا کرتا۔ اور اگر بوجہی تو اس سے لوگوں کا اختلاف دور نہیں ہوتا۔
حاصل کلام یہ ہے کہ یہ بیان کرنے کا مقصد ”کہ ان کے فرقے آپس میں مختلف ہیں، اور ہر ایک اپنی من مانی بات پر تواتر کا مدعی ہے“
یہ ہے کہ ان کے جھوٹ اور افتراء پر دلیل و حجت قائم کی جائے! اگر ایک ہی فرقہ کی خبر متواتر ہوتی تو یہ اختلاف ہرگز رونما نہ ہوتا۔ خصوصاً
جناب محمد بن حنفیہ نہ جناب زین العابدین سے جھگڑتے، نہ حجر اسود کی ناشی تک نوبت پہنچتی۔ نہ جناب زید بن علی کو جناب باقر سے
نہ جناب جعفر بن علی کو جناب محمد بن مہدی سے کوئی پر خاش ہوتی۔ کیونکہ اہل بیت ہی اپنے اندھونی معاملات کو زیادہ جانتے ہیں۔ یہیں سے
عقلمند کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ ان تمام فرقوں کے جھوٹ کو سمجھتے اور یہ جان لے کر یہ سب کچھ اس فرقہ کی افتراء پر دازی ہے کہ ہر وقت کی
مصلحت کے مطابق ایک امام اپنے خیالات کے مطابق مقرر کر لیا کرتے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے کہ اپنے بٹلے ہوئے
امام کی آغا میں اپنے پرکاروں سے غم، نذر و نیاز اور فتوح و مصلحت کیا کریں اور عیش و آرام اور بعد والے اپنی اندھی تقلید کی وجہ سے
گمراہی کے جہنم میں جا کرے۔ سچ ہے۔

إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِآبَاءِهِمْ ضَالِّينَ فَهَمُّ
عَلَى آثَارِهِمْ كُفْرُهُمْ عَوْنٌ۔
انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا پس وہ ان ہی
کے قدموں پر دوڑے چلے جاتے ہیں۔

www.ashari.org

اسٹخوان باب

متعلقہ، آخرت

امور معاد میں کتاب و عزت سے شیعی مخالفت

① عقیدہ ۱) مرنے کے بعد اجسام و ارواح کے لئے ایک اور عالم۔ عالم آخرت درپیش ہوگا، جہاں سب حساب و کتاب جزا و سزا، ثواب و عقاب کے لئے جمع کئے جائیں گے۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ مگر شیعوں کے بہت سے فرقے مثلاً زرارہ، کاملیہ، منصوریہ، حمیریہ، باطنیہ، قرامطیہ، جناحیہ، خطابیہ، معمریہ، میمونہ، مقننیہ، خلفیہ اور جنابیہ کہتے ہیں کہ حشر اجساد بالکل نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی ارواح کے لئے موجودہ عالم کے سوا کوئی اور ٹھکانہ ہے بلکہ ان کا اسی عالم دنیا میں تسخیر الٹ پھیر اور لوٹ پلٹ ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہیں

ان کے اس عقیدہ کی تردید و مخالفت، کتاب اللہ، انبیاء کرام کی نصوص اور ائمہ کے کلام سے اتنی ظاہر و باہر ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ کتاب اللہ کے جذبات و اشارات ملاحظہ ہوں۔

پس وہ اچانک قبروں سے (اٹھ کر) اپنے رب کی طرف برعین گئے۔

① فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ۔

جب یہ سوال اٹھائیں کہ ہم کو کون لوٹائے گا تو آپ کہہ دیجئے، وہی جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا۔

② فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ۔

ہم پراعترا من کرتا ہے اور اپنی اوقات بھول گیا، کہتے ہیں بوسیدہ ہڈیوں میں کون جان ڈالے گا۔ آپ کہہ دیجئے وہی ان کو زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔

③ وَهَضَبْنَا مَثَلًا وَنُصِي خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ۔

پھر اپنے رب کی طرف اٹھنے کے جاؤ گے ! اور اسی کی طرف لوٹو گے۔

④ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُحْشَرُونَ۔

اسے میرے رب مجھے دوبارہ (دنیا میں) لوٹا دے گا کہ جو رادھوئے کام (چھوڑ آیا ہوں) ان کو تیری پسند کے مطابق انجام دے سکوں۔ مگر نہیں۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اب تو قیامت تک اس عالم کے درمیان پر وہ حامل ہو چکا۔

⑤ وَاللَّيْلُ تَرْجِعُونَ۔

⑥ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ مَالًا فِيمَا تَنْهَيْتُ فَلَا آتِيهَا كَلِمَةً هَوْفًا لَّيْلَهَا۔ وَنِمْ وَرَافِعُ بَرْدَحَ إِلَىٰ يَوْمٍ يُبْعَثُونَ۔

اس غلط اور ناسد عقیدہ میں ان فرقوں کا استدلال و تمسک ان چیزوں سے ہے جو انہوں نے فلسفیوں سے سیکھی ہیں۔ حالانکہ شریعت کے نزدیک وہ قطعاً غلط اور سراسر بنیاد ہیں، مثلاً آسمان کی کرویت (کرہ کی شکل) اور خلا کا محال ہونا۔ مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر

اس موجودہ عالم کی طرح کا کوئی دوسرا عالم بھی ہوگا تو لحاظ دہ بھی کر دی شکل کا ہوگا۔ اور ایک جیسے دو گتے، باہم چپاں نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو، اور فاصلہ ہونے کی صورت میں خلا لازم ہے۔ (جو فلاسفہ کے نزدیک محال ہے) اس استدلال میں ان کو کئی جگہ غلطی ملے گی اور دھوکہ ہوا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ کیا ضروری ہے کہ عالم پورے کا پورا کرہ ہو۔ اسلئے کہ وہ ہندسی دلائل جو کرانیت پر قائم کئے گئے ہیں افلاک متحرکہ کی کرانیت کے ساتھ مخصوص ہیں، ہو سکتا ہے یہ افلاک متحرکہ پورے عالم کا ایک حصہ ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ خلا کے محال ہونے کا دعویٰ ناقابل تسلیم ہے کیونکہ اس پر جتنی بھی دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ سب پر کوئی نہ کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اگر ہم دو کرانوں کو اوپر نیچے یا برابر رکھیں تو البتہ فاصلہ ضرور ہوگا لیکن اگر ایک کرہ دوسرے کرہ کی موٹائی میں دھنسا ہوا، اگرچہ ہوا یا سایا ہوا ہو۔ جس کی موٹائی ایک دوسرے کے برابر ہو اور اس کا قطر ان کے قطر کے برابر۔ یا اس کی موٹائی اور قطر ان کی موٹائی اور قطر سے زائد ہوں۔ جیسا کہ فلاسفہ کے نزدیک تدویرین افلاک خوارج کی موٹائی میں گڑھی ہوتی ہیں تو فاصلہ ہرگز لازم نہیں آتا۔ اس لئے کہ فاصلہ کی جگہ تو گھیرنے والے کرہ کی موٹائی سے بھری ہوتی ہے۔

خود فلاسفہ کہتے ہیں کہ مرتبہ کی تدویر کا قطر مثل، سو مج کے قطر سے بڑا ہے۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ عالم کے یہ سب گزرات جو ہم کو معلوم ہیں اپنی جگہ خود ایک ہی کرہ ہوں۔ جو کسی دوسرے کرہ کی موٹائی میں سمائے ہوئے ہیں اور یہی حال دوسرے عالم کا بھی ہو۔ چوتھی بات یہ کہ کیا ضروری ہے کہ معاد کا عالم، اسی عالم جیسا دوسرا ہی ہو، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی عالم میں تغیر و تبدل ہو جائے کلی عناصرانیت میں بدل جائیں اور افلاک سب کے سب باغ و بہشت کی شکل میں۔ اسی عالم میں فلکی اور عنصری مادے دوسرا رنگ اور دوسری صورت میں ظاہر ہو جائیں کہ مرکبات، کانیں، نباتات، حیوانات امدان افلاک میں پیدا ہوں۔ گویا ہر آسمان باغ و بہشت بنے۔ اور زمین دوزخ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

جس دن یہ زمین دوسری زمین و آسمانوں میں بدل دی جائیگی۔ اور اللہ واحد و غالب کے حکم سے مروئے نکل آئیں گے۔

يَوْمَ يُبَدِّلُ الْمَآذِنَ
وَالسَّمَوَاتِ وَبَنَاتِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ

اور حشر نافر سے پہلے جنت و دوزخ کا وجود، انبساط و امتداد کے منافی نہیں بلکہ کیفیات اس وقت بھی اسی ہی ہوں گی جیسی

اب ہیں۔

عقیدہ (۲) — قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر بندوں کو اسٹانا واجب نہیں کہ اس کے ترک پر کوئی عقلی قباحات لازم آئے، ہاں اس نے چونکہ اس کا وعدہ کیا ہے اس لئے وعدہ کے مطابق ان کا اسٹانا اور جمع کرنا ایک ہونے والا، اور وقوع میں آنے والا واقعہ ہے تاکہ وعدہ خلافی لازم نہ آئے یہی اہل سنت کا عقیدہ و مذہب ہے! مگر امامیہ کہتے ہیں کہ بندوں کا اسٹانا از روئے عقل اللہ تعالیٰ پر واجب اور ضروری ہے۔ حالانکہ بہت سی آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ بعث و معاد وعدہ الہی سے وابستہ ہیں اور پھر ایسی آیات کے آخر میں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْلُقُ اِلَّا بِمَعَادٍ (کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) یا اسی طرح کی اور عبارات کا انانہ کے عقیدہ کی کھل تکذیب کرتی ہیں۔

اور الہیات کی بحث میں یہ گزرجچکا ہے کہ خدا تعالیٰ پر کسی چیز کا واجب ہونا بے معنی سی بات ہے! امامیہ اس مسئلہ میں بھی چند ناقص

عقلی گدے، اڑاتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اوامر و نواہی کا مکلف کیا ہے تو اگر طاعت پر ثواب نہ دے اور نافرمانی پر عقاب میں نہ جکڑے، تو ظلم لازم آتا ہے اور ظلم ہر ایک ہی کے لئے قبیح اور بُرا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو قبیح تر ہوگا۔ اور ثواب و عقاب بعث کے بغیر تصور نہیں تو لا محالہ اللہ تعالیٰ پر بعث واجب ہوا۔

ان کا یہ استدلال بھی پچھندو جوہ ظاہر البطلان ہے۔

اول۔ یہ کہ خالق و مالک کے متعلق ظلم کی نسبت کا تصور ہی غلط ہے اس لئے کہ وہ اپنی ملک میں جس طرح کا چاہے تصرف کرے۔ اسے حق ہے اور اسے ظلم نہیں کہہ سکتے!

دوسرے۔ جن سے ظلم کا تصور ہو سکتا ہے مثلاً مالکان مجازی ان کے حق میں بھی فساد برطاری پر انعام نہ دینا ظلم نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ایک آقا اپنے غلام کو معاشی ضروریات سے بے پرواہ کرتا ہے۔ اور اس سے کام بھی اس کی طاقت کے مطابق ہی لیتا ہے اب وہ غلام جو کام انجام دیتا ہے وہ اس کا فرض منصبی ہے اب اگر ادا کرے وہ انعام ملے تو دنیا کا کون عقل نہ کہیگا کہ مالک پر انعام دینا واجب ہے۔ وہ انعام نہ دے تو کوئی اسے ملامت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح معصیت اور گناہ پر بالکل ہی باز پرس نہ کرنا تو ظلم ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ تو عفو و احسان یا اپنا حق معاف کر دینا کہلاتا ہے۔ اس کو ظلم خیال کرنے والا تو بوقوف ترین بلکہ عقل سے پیدل ہی ہوگا۔

پھر الہیات کے بیان میں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ سے بطریق تواتر یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ ”اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ کو سب سے سخت کا فرد الا ہمیشگی کا عذاب بھی دیدے تو وہ عدل ہے ظلم نہیں۔“

حاصل کلام یہ کہ شیعہ حضرات اس مسئلہ میں بھی حسبِ عادت و دستور افراط و تفریط میں پھنس گئے، کہ امامیہ افراط کے راستہ پر چڑھ گئے کہ اللہ تعالیٰ پر بعث و معاد واجب کہنے لگے اور دوسرے فرستے جن کا ذکر باب اول میں ہوا۔

تفریط کی راہ میں بھٹک گئے کہ سرے سے معاد کا ہی انکار کر دیا۔ اور استدلال دونوں ہی کا عقلی ناقصات پر مشتمل ہے۔ امامیہ کا حال تو آپ ابھی پڑھ چکے اب ان دوسروں کی بھی سنتے۔

یہ کہتے ہیں کہ بعث و معاد اگر واقع ہو تو مومن صالح کے بعض یا کل بدنی اجزاء کو عذاب دینا یا کٹر کافروں کے بعض یا کل اجزاء بدنی کو نعمت سے نوازنا لازم آئے گا حالانکہ یہ عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔ اور اس لزوم کی صورت یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کسی آدمی کو بطور غذا کھایا۔ حتیٰ کہ اس غذا سے لطف بنا، اور اس لطف سے بچہ پیدا ہوا۔ اب اس بچہ کا جزائے بدنی کو یا عذاب دیا جائے گا۔ یا انعام سے نوازا جائے گا عذاب کی شکل میں اجزاء غذا سے متاثر ہوں گے اور نعمت کی صورت میں نعمت سے، گو پہلی صورت میں عذاب کے مستحق نہ ہوں اور دوسری صورت میں نعمت کے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کھانے والے کے بدن کو اس مدت تک تحلیل ہونے سے محفوظ رکھے جب تک اجزاء غذا بالکل فساد ہو کر نہ نکل جائیں یا کھانے والے کو اتنی مدت تک نامرور کرے کہ اس سے لطف پیدا ہی نہ ہو، اور اگر پیدا ہو تو احتمال یا کسی اور طرح نکل جائے اور اس بچہ سے متعلق ہی نہ ہو۔

پھر ایسے شخص کا وجود کہ اس نے مدت دراز تک انسان کا گوشت کھایا ہو اور اس سے لڑکا بھی پیدا ہو گیا کس دلیل سے معلوم، خالی غولی امکانی ہوا بیوں سے کام تو نہیں چلتا کیونکہ یہ دلیل معارضہ کی شکل میں ہے (دوسرے کی دلیل کو کاٹنا معارضہ کہلاتا ہے) اور معارضہ کو دلیل چاہیئے احتمال اس کو کافی نہیں۔ اور وقوع ممنوع ہے۔ یہ طریق دلیل بازاری (جدل) ہے۔ تحقیق کلام یہ ہے کہ بدن انسانی کے بعض

اجزاء غذا نہیں بن سکتے ، جیسے روح ہوائی کر عرف عام میں اسی کے نکل جانے کا نام موت ہے یہ جزو بدن ہونے کے باوجود غذا نہیں بن سکتی اس میں کسی طرح کا لطف نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ یہ کسی دوسرے بدن کا جزو بن سکتی ہے اور پھر بہت سے غذائی اجزاء کھانے سے پہلے ہی بطریق تحلیل جدا ہو کر چلے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ سارے اجزاء ایک دوسرے سے ممتاز ہیں ۔ بوقت حشر ان سب کو جمع کر کے روح ہوائی کا نکشش ان سے جوڑ کر ان کو انسانی بدن کی شکل میں تبدیل فرما دے گا ۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ دکھ ، سکھ کا اصل تعلق روح سے ہے اس لئے عذاب سے وہی دکھ پاتی ہے اور نعمت سے لطف اندوز ہوتی ہے ، بدن کا واسطہ البتہ ضرور ہوتا ہے اور بدن بغیر روح کے ایک پتھر ہے ، اسی لئے اس کا دکھ پانا یا لطف اندوز ہونا مستحسن نہیں ۔ اور دکھ دینے والے لذت پہنچانے میں ہمارا بدن کافی ہے ۔ لہذا اگر اس کا پہلا بدن باقی ہے اور اس کو ثواب و عقاب کا مورد بنانے میں کوئی قیامت نہیں تو اسی بدن پر اکتفا کیا جائے گا ورنہ دوسرا بدن پیدا کیا جائے گا ، اب وہ خواہ پہلا ہی بدن ہو یا وہ ہو جو کھانے والے کے کھانے سے پہلے غلغلہ پذیر ہو چکا تھا ۔ پھر اس پر ثواب و عقاب ہوگا ۔

یہ شکل تاسخ کی نہیں ہے کیونکہ تاسخ کا تو یہ مطلب ہے کہ دنیاوی ابدان میں روحیں بطلب کمال منتقل ہوتی رہتی ہیں اور یہاں بحث اس بدن کا ہے جو آخرت میں جزا و سزا کے لئے پیش ہوگا ۔ اسی بعینہ بدن کی حفاظت جزا کے لئے ضروری نہیں کیونکہ ابدان میں زیادتی دیکھی کے ساتھ گھٹنا برعکس ، احادیث متواترہ سے ثابت ہے بلکہ قرآن کی نصوص سے بھی ثابت ہے جیسا کہ ارشاد ہے ۔

كُلَّمَا نَفِخَتْ جُلُودُهُمْ بَدَلْنَا لَهُمْ
جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ

مشارکت میں اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک شخص سے لباس پوشی کی حالت میں کوئی جرم مرتد ہوا اور وہ اسی حالت میں گرفتار ہو گیا تو وہ اسی حال میں سزا پائے گا لیکن اگر گرفتاری کے وقت وہ بے لباس و عریاں تھا ۔ تو بقدر ستر عورت اس کے بدن پر لباس ڈال کر سزا دیں گے ۔ گویا روح سے بدن کی نسبت ایسی ہے جیسے کسی شخص کی لباس کی نسبت ہے

وہ دم گر شود لباس بدل
شخص صاحب لباس را چہ خل

(لباس اگر بار بار بھی بدلا جائے تو اس سے صاحب لباس کی شخصیت میں کیا فرق پڑے گا)

اسی لئے عرف میں بچپن سے لیکر بڑھاپے تک باوجود اجزائے بدن کے بدل جانے اور باوجود امراض ، یا شخصی محنت و مشقت کے سبب غلغلہ پذیر ہونے کے وہ شخص باقی رہتا ہے اور کسی کے دل میں یہ وہم تک نہیں آتا کہ بوڑھا وہ نہیں ہے جو ستر سال پہلے بچہ تھا ۔ پھر باوصف ان تبدیلیوں کے ، انعام و عقاب کے احکام اس پر بلا کسی انکار کے بدستور جاری ہوتے ہیں ۔

بعض امامیہ اپنے مذکورہ دعویٰ پر ان آیات سے دلیل لاتے ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ آخرت میں جزا اعمال سے وابستہ ہے مثلاً ۔

جَزَاءُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

وَمَنْ يَخْزَىٰ كُلَّ نَفْسٍ يَنْفَسٍ يَكُنْ لَهُ جُزَاءٌ مِّمَّا كَسَبَتْ ۔

لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۔

ماضی ہوگا ۔

یہ آیات ثبوت میں پیش کر کے بعض امیہ کہتے ہیں کہ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جزاء کا سبب عمل ہے ۔ تو گویا مطیع و فرمانبردار کو ثواب اور

نافرمان کو گناہ کے بدلے عذاب دینا واجب ہوا۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ گویا ہر جرم کے وقوع پذیر ہونے اور اعمال پر ثواب و عقاب مرتب ہونے پر تو دلالت کرتی ہیں، مگر خدا تعالیٰ پر اس وجہ کو کسی طرح بھی نہیں بتاتیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو ذوق باقاعدہ نوکر رکھتا ہے اور نہ اس کی خدمت و تقصیر پر باقاعدہ کوئی قول و قرار کرتا ہے ایسی صورت میں اگر وہ خدمت پر انعام یا تقصیر پر سزا دے تو یہ تو کہا جائے گا کہ اسے انعام یا سزا اس کی خدمت یا تقصیر کے بدلے میں ملے مگر یہ دونوں باتیں نوکر رکھنے والے پر کسی قاعدہ سے بھی واجب نہیں کہی جائیں گی۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر گناہوں پر سزا دینا واجب ہوتا۔ تو گناہ کبیرہ کے سلسلے میں یہ وجہ ہو سکتا تھا۔ مگر نص قرآنی میں وقوع کے اعتبار سے اس کے واجب نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے چہ جائیکہ اس کے عقل و وجہ کی بات کی جائے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَا يَغْفِرُ مَنْ يُشْرِكُ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ
اللہ کے ساتھ جو شرک کرے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں کریگا ہاں اس کے علاوہ جس کی چاہے گا مغفرت فرمائے گا۔

عقیدہ (۳) کہ عذاب قبر حقیقی ہے۔ اہل سنت کا یہی مسلک ہے، مگر شیعوں کے اکثر فرقے حتیٰ کہ زیدیہ بھی عذاب قبر سے انکاری ہیں حالانکہ بہت سی آیات قبر کے عذاب اور اس کی راحوں پر دلالت کرتی ہیں جیسے فرمایا گیا۔

مِمَّا خَطَبْتَهُمْ أُغْرِقُوا فَأَذْخَلُوا أَشَارًا - اپنے گناہوں کی بدولت غرق کئے گئے اور پھر دوزخ میں ڈال گئے

اور حرف "فَا" ایک چیز کے بلا وقفہ بعد میں آنے کو بتاتا ہے اور صیغہ جو کو ماضی کا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ دُوبتے ہی بلا وقفہ دُوفنا صلا کے وہ زمانہ ماضی میں دوزخ میں ڈالے گئے۔ اَلَّذِينَ يُعَذِّبُونَ عَلَيْهِمْ عَذَابًا أَوْ عَشِيَّتًا۔ صبح و شام ان کا سامنا دس باقہ آگ سے پڑتا ہے۔

اس آیت میں عذاب قیامت کا عطف اس پیش ہونے والے عذاب پر مدعا کی صداقت پر صاف دال ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیز آئمہ سے اخبار و احادیث بطریق تواتر اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

اسی طرح قبر کی نعمتوں اور راحوں کا ذکر بھی بہت سی آیات میں آیا ہے مثلاً

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ
جو اللہ کے راستے میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے انہیں رزق ملتا رہتا ہے۔

يَلْبِثُ قَوْمٌ يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَّبِّيَ كُلَّ مَعْصِيَئِي
کاشش مری تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ جسے غفلت میری مغفرت فرمادی۔ اور مجھے عزت و ارج میں سے بنا دیا۔

یہ واقعہ یقیناً قیامت سے پہلے کا ہے کیونکہ قیامت کے دن تو ہر ایک ہی کو اس کا حال اور اس کی مغفرت اور اعزاز و اکرام معلوم ہو جائیگا قبر کی جزائز کے منکر بطور دلیل معنی و عقل یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

لَا يَدْخُلُ فِيهَا الْكُفُورُ إِلَّا الْمَوْتَةُ الْأُولَى - انہیں موت کا مزہ قبر میں پہلی موت ہی کے وقت چکھنا ہو گا۔

کہ اگر قبر میں زندگی ہوتی تو لازماً اس زندگی کی موت بھی ہوتی کیونکہ قیامت کے دن زندہ کئے جانے کا ثبوت تو بالا جماع ہے تو اس صورت میں

دو موتوں کا مزہ چکھنا ظاہر ہوتا ہے حالانکہ قرآنی آیت میں ایک ہی موت کے مزہ کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قبر کی زندگی و موت حقیقی طور پر متحقق نہیں، بلکہ روح و جسم کے ایک تعلق کا نام ہے کہ روح جب اس بدن پر اپنی شعائیں ڈالتی ہے تو بدن سے ربط قائم ہو جاتا ہے اور قبر سے مناسب ماحول میں بدن کو تازگی ملنے لگتی ہے۔ ایسی زندگی نہیں جیسی دنیا میں تھی کہ وہاں بدن غذا کھاتا اور بڑھتا تھا۔ بلکہ وہ تعلق مثال کے طور پر ایسا ہوتا ہے جیسا محب و محبوب کا یا آقا و غلام کا۔ یا گھر والے اور گھر کا۔

اود اتنا تعلق، رنج پہنچانے یا راحت دینے میں کافی ہو لے گا اور یہ صورت بھی اس وقت ہوتی ہے جب قبر میں بدن صحیح و سالم موجود ہو اور اسے دفن کیا گیا ہو۔ ورنہ عذاب و عیش سب روح کا ہونگا یعنی نفس مجرد کا کہ اس کا حقیقی بدن روح ہوتی ہے جس کا تعلق دوسرے کسی بدن سے جو عالم مثال کا ہو، یا اجزلے جمادیہ سے اسی اہمیت و شکل میں ترتیب دیا گیا ہو کہ دیکھنے والے کو اس بدن مثالی، یا جمادی میں اور دنیاوی بدن میں کوئی فرق و تمیز نہ معلوم ہو! اور یہ تناسب کی شکل نہیں ہے کیونکہ تناسب تو اسے کہتے ہیں کہ روح ایک بدن سے نکلی کر دوسرے بدن کی تدبیر میں مصروف ہو اور غذا حاصل کرنا اور بدن کا بڑھنا بھی جاری رہے۔ اور یہ زیر بحث تعلق ایک احساسی تعلق ہے کہ جس کے سبب وہ دکھ یا راحت محسوس کر سکے!

چنانچہ پھر یہی اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ شیخ الطائف ابو جعفر موسیٰ اپنی کتاب تہذیب الاحکام میں اپنی سند سے علی بن مرہار سے وہ تاسم بن محمد سے اور وہ حسین بن احمد سے اور وہ یونس بن علیان سے روایت کرتا ہے۔

(ترجمہ) وہ کہتا ہے کہ میں ابی عبد اللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، انہوں نے مجھ سے پوچھا ارادہ مومنین کے متعلق لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں اور وہ عرش کے نیچے قذیلوں میں! ابو عبد اللہ نے کہا سبحان اللہ! اللہ کے نزدیک مومن پرندوں کے پوٹوں میں رکھے جانے سے زیادہ باعزت ہے جن سے وہ غیر مانوس ہے۔ ورنہ حقیقت جب اللہ تعالیٰ مومن کی روح قبض کرتا ہے تو اسے اسی قالب میں واپس آتا رہے جو دنیا میں اس کو حاصل تھا۔ پس وہ کھلتے ہیں اور پیتے ہیں جب کوئی آنے والا ان کے پاس آتا ہے تو وہ ان کی دنیاوی صورت کی وجہ سے ان کو پہچان لیتا ہے۔ اسی طرح اس نے ابی عمر سے اس نے جمادیہ سے اس نے ابی نصیر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ابو عبد اللہ سے مومنوں کی ارواح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ جنت میں اپنے دنیاوی شخص کی حالت میں ہیں کہ تو اگر اس کو دیکھے تو کہہ اٹھے یہ فلاں شخص ہے۔

قَالَ كُنْتُ عَنْهُ ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ جَالِسًا فَقَالَ مَا يَقُولُ النَّاسُ فِي أَرْوَاحِ الْمُؤْمِنِينَ قُلْتُ يَقُولُونَ فِي حَوَاصِلِ ظُهُرِ خَضِرٍ فِي قَنَادِيلِ سَمَحَاتِ الْعَرْشِ فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ الْمُؤْمِنُ أَكْرَمَ عَلَى اللَّهِ مِنْ أَنْ يُجْعَلَ رُوحُهُ فِي حَوْصِلَةٍ مَلَأَ بِرِغِيرٍ مَا تُؤْمِنُ الْمُؤْمِنُ إِذَا أَقْبَضَهُ اللَّهُ تَعَالَى صَيَّرَ رُوحَهُ فِي قَالِبٍ كَقَالِبِهِ فِي الدُّنْيَا فَمَا كُلُّونَ وَيَشْرَبُونَ فَإِذَا أَقْدِمَ عَلَيْهِمُ الْقَادِمُ عَرَفَهُمْ بِتِلْكَ الصُّورَةِ الَّتِي كَانَتْ فِي الدُّنْيَا وَعَنْهُ عَنْ ابْنِ عَمِيرٍ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ أَبِي يَصِيدٍ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عَنْ أَرْوَاحِ الْمُؤْمِنِينَ فَقَالَ فِي الْجَنَّةِ عَلَى صُورَةِ أَبَدَانِهِمْ لَوْ رَأَيْتَهُ لَقُلْتَ فَلَانٌ لِمَنْ تَهْتَدِي۔

پھر مال بدن سے روح کا تعلق اس طرح کا ہو یا اس طرح کا عرف میں اسی تعلق کو حیات سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسروں (مسلم) کی درمیانی مدت میں جب یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو اسے موت کے نام سے یاد کیا ہے۔ وَبَنَّا أَمْثَلًا أَمْثَلَيْنِ وَأَحْيَيْنَا أَمْثَلَيْنِ (اے ہمارے رب تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا۔ دو مرتبہ زندہ کیا) یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پہلی موت سے موت کا ایک فرد مراد ہو، اور ممکن یہ بھی ہے کہ مراد جنس موت ہو! جو زندگی بہشت سے پہلے ہے خواہ ایک بار ہو خواہ دوبارہ۔ اس صورت میں ان کا استدلال اصل سے باطل ہوا۔

اور صدر الشریعہ کی شواہد الربوبیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّمَا أَنْتَ الْأَرْوَاحُ مَا دَامَتْ أَرْوَاحًا لَا يَخْلُو عَنْ
تَدْبِيرِ أَجْسَامٍ وَالْأَجْسَامُ قَبْضَانِ قَسْرٌ تَنْصَرِفُ فِيهِ
النَّفُوسُ تَنْصَرِفُ أَوْ يَأْتِيَانِ مِنْ غَيْرِ وَاسِطَةٍ
وَقَسْرٌ تَنْصَرِفُ فِيهِ تَنْصَرِفَانِ نَوِيًّا بِالْعَرَضِ
بِوَاسِطَةِ جِسْمٍ آخَرَ قَبْلَهُ وَالْقَسْرُ الْأَوَّلُ لَيْسَ
مَحْضًا بِهَذِهِ الْحَوَاسِ الظَّاهِرَةِ لِأَنَّهُ غَائِبٌ
عَنْهَا فَإِنَّهَا إِنَّمَا يَحْسُ بِالْأَجْسَامِ الَّتِي مِنْ جِسْمِ
مَا يُحِيلُهَا مِنْ هَذِهِ الْأَجْزَامِ كَالْقَشْوَرِ وَيُؤَيِّرُ
فِيهِمَا سَوَاءً كَانَتْ بَسِيطَةً كَالْمَاءِ وَالْهَوَاءِ أَوْ
مُرَكَّبَةً كَالْمَوَالِيدِ وَسَوَاءً كَانَتْ لَطِيفَةً كَالْأَرْوَاحِ
الْبَخَارِيَةِ أَوْ كَشْفَةً كَهَذِهِ الْأَبْدَانِ الْمُتَحَيِّتَةِ الْحَيَوَانِيَّةِ
وَالْأَجْسَادِ اللَّبَنَاتِيَّةِ فَإِنَّ جَمِيعَهَا مَا يَسْتَحْمِلُهَا
النَّفُوسُ وَيَنْصَرِفُ فِيهَا بِوَاسِطَةٍ وَأَمَّا الْقَسْرُ
الْأَوَّلُ الْمَنْصَرِفُ فِيهَا النَّفُوسُ فَهِيَ مِنَ الْأَجْسَامِ
النُّورِيَّةِ الْآخِرَةِ وَتَبْعِيَّةٌ ذَاتِيَّةٌ غَيْرُ قَابِلَةٍ
لِلْمَوْتِ وَهِيَ أَجَلٌ دُنْبَةٌ مِنْ هَذِهِ الْأَجْسَامِ
الْمَشْقُوقَةِ الَّتِي تُوجَدُ مَعَهَا مِنَ الرُّوحِ الَّتِي يُعْنَى
بِالنَّفْسِ الْخَيْرِ فَإِنَّهُ مِنَ الدُّنْيَا وَإِنْ كَانَ شَرِيفًا
لَطِيفًا بِالْإِصْطِفَاءِ إِلَى الْغَيْرِ وَلِهَذَا يُسَمَّيُ
كَيْفَ جَلَّ سَرِيعًا وَلَا يَمُكِّنُ حَشْرَهُ إِلَى الْآخِرَةِ
وَالَّذِي كَلَّمَكَ فِيهِ مِنْ أَجْسَامِ الْآخِرَةِ وَجْهِ
تَحْشُرٍ مِنَ النَّفُوسِ وَيَكْتُمُهَا مَعَهَا
وَيَبْقَى بِمَقَاسِهَا - اِنْتَهَى -

(ترجمہ) یہ سمجھ لو کہ روحیں جب تک رو میں ہیں اجسام کی دیکھ بھال میں
لگی رہتی ہیں اور جسم دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں نفوس
ذاتی، اولیٰ اور بغیر کسی واسطہ کے تصرف کرتے ہیں۔ دوسرے
وہ جن میں وہ ثانوی، بالعرض اور دوسرے جسم کے واسطہ سے
تصرف کرتے ہیں جو اس سے پہلے ہے۔ قسم اول ان حواس ظاہرہ
سے محسوس نہیں ہوتے کیونکہ وہ اس ان حواس کی دسترس سے
باہر ہیں۔ یہ حواس تو انہیں اجسام کو محسوس کر سکتے ہیں جو ان
اجرام کی قسم سے ہوں۔ جیسے کھال۔ اور یہ اجسام ان اشیاء
میں اثر و تصرف کرتے ہیں جو ہوا و پانی کی طرح بسیط ہوں
خواہ مرکب۔ جیسے نوالہ شدائد۔ اور خواہ ارجح بخاریہ کی طرح
لطیف ہوں خواہ کثیف جیسے گوشت پوست کے حیوانی بدن اور
نباتاتی اجسام کیونکہ ان سب میں نفوس بالواسطہ تصرف کرتے
ہیں۔ بلا واسطہ ان کو استعمال نہیں کرتے۔ اور اجسام کی
قسم اول جن میں نفوس تصرف کرتے ہیں تو وہ اجسام نوری آخری
ہیں جن کو حیات ذاتی نصیب ہے جو موت کو قبول نہیں کرتی۔ یہ
بدن تدبیر ہیں۔ ان شفاف اجسام سے جو ہمیں پائے جاتے ہیں
اور اس روح سے جو حیوانی روح کہتے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں
ہے اگرچہ وہ دوسرے کے لحاظ سے شریف تر و لطیف تر ہے
اسی لئے وہ جلد تغیر حاصل کر لیتی ہے اور نابود ہو جاتی ہے
اور اس کا حشر بھی آخرت میں ممکن نہیں۔ اور ہمارا کلام جس
میں ہے وہ آخرت کے اجسام ہیں اور ان کا نفوس کے ساتھ
حشر تو ہم سے اور ان کے ساتھ متحد رہتے ہیں اور ان کے باقی
رہنے تک باقی رہتے ہیں۔ (بات ختم ہوئی)

اس سلسلہ میں ان کی عقل دلیل یہ ہے کہ سوال و جواب، بات چیت، لذت و اہم، اور ارادہ کہ یہ سب حیات پر موقوف ہیں اور حیات اس ڈھانچے
کی شکست و ریخت اور بدنی مزاج کے عقل و باطل ہونے کے بعد ممکن نہیں۔ لہذا ان امور کا میت کو لاحق ہونا امکان سے خارج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے بدن مردہ ہے روح نہیں، اور ٹوٹ پھوٹ اور مزاج کا بطلان اور اس کے تغیرات بدن پر واقع
ہوتے ہیں روح پر نہیں۔ ہاں جسمانی لذت اور دکھ پانے کے لئے اور حواس کے اعمال کے لئے یا تو اس کے اپنے بدن سے تعلق کر دیا جاتا ہے، یا اس
مثال بدن سے جو تدبیر و تصرف اور غذا و نمو حاصل کرنے سے بالاتر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جب روح بدن سے جدا ہوئی تو قوائے نباتی بھی اس کے ساتھ جدا ہوئے تو اے نفسانی اور جسمانی جدا نہیں نہیں ہوئے اگر تو اے نفسانی و حیوانی کا وجود بطور فیضان یا بطور بقا تو اے نباتی و مزاج کے ساتھ مشروط ہو تو یہ لازم آئے گا کہ فرشتے، شعور و ادراک حسی حرکت غضب و دفع منافق سے محروم ہوں۔ لہذا ارواح قبروں میں فرشتوں کی طرح ہیں کہ وہ شکل و بدن کے توسط سے کام کرتے ہیں اور حیوانی و نفسانی افعال کا ان سے صدور ہوتا ہے بغیر اس کے کہ ان میں نفس نباتی کا فروما ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرشتوں کو بلحاظ اعمال، نعمت و عذاب سے کوئی واسطہ نہیں، اور روحوں کو ان کے اعمال کی بنا پر یا نعمت سے نوازا جائے گا یا عذاب سے دکھ دیا جائے گا۔

اور اس سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مردہ جو زمین پر پڑا ہو لہجے یا سولی دیا ہو کوئی انسان جو کسی درخت پر لٹکا ہوا مدت تک اسے یونہی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ اس کے اعضا و اجزا، مشکتہ و ریحۃ ہو کہ ختم ہو جائیں، اب نہ اس میں زندگی ہے نہ قیام و قعود ہے۔ نہ حرکت نہ گفتگو، نہ سوال و جواب اور نہ ہی ان امور کے آثار ہی پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ہم نے اس کے سینہ پر رائی کے دانے بھی ڈالے، مگر وہ اسی طرح پڑے ہے اسی طرح کا فردہ کے بدن کو دیکھا بھالا، مگر اس میں چلنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

اس شبہ کا جواب گذشتہ تقریر سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس میت کی روح کو اس انداز کے موافق کہ وہ ادراک کر سکے اور دکھ سکھ سے متاثر ہو سکے یا تو انہی عنصری ابدان سے جوڑ دیتا ہے یا دوسرے ابدان مثالیہ مختصر عہد سے۔ اور یہ کام انجام دیتا ہے۔

اب رہا ان حرکات کا محسوس نہ ہونا تو یہ ان کے سرے سے نہ ہونے اور واقعہ نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ حرکات تو حرکات ہم فرشتوں اور جنوں کی ذاتوں اور اشخاص کو بھی حواس سے ادراک نہیں کر سکتے حالانکہ حسنی و شیعہ ہر دو مذاہب میں ان کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک سونے والا سوتے میں کسی عورت سے پوچھو کہ طور پر لذت اندوز ہوتا ہے کہ خارج میں اس کا ثبوت بصورت احتلام ظاہر بھی ہوتا ہے لیکن کوئی پاس بیٹھنے والا اس کے بدن پر ان لذتوں کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں کرتا۔

نیز حکم اور فلاسفہ ساروں کی حرکات کے قائل ہیں اور ان کی رد حایات کی مدد کو بھی ملتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ نباتات بن قرہ کے حوالے سے یہ بات بابدوم میں نقل کی جا چکی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ ادھر تو رانی کے دالوں کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھے اور ادھر میت کی روح کو بدن سے پیدا کردہ تعلق کے ذریعہ نعمت سے لطف اندوز یا عذاب سے دکھ رکھے، زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بعید از وقوع بات ہے۔ مگر اس سے بات نہیں بنتی کیونکہ جب ایک چیز عقلاً ممکن ہو اور خبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر بھی دیں تو وہ بات واجباً قبول ہو خواہ وہ علوت و تجسس کے موافق ہو یا نہ ہو۔ جیسے سرد مہماک کے حالات گرم مہماک کے باشندوں کے لئے اچنبھا اور انہونی لگتی ہے اور وہ اسے بعید از وقوع سمجھتے ہیں۔

حالانکہ ان کا وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ ایک محسوس حلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مردوں کی تین کھوپڑیاں لئے ہوئے آیا اور کہنے لگا کہ تمہارے رسول نے فرمایا ہے کہ جو دنیا سے بے ایمان جائے گا اس کو آگ سے جلاتے ہیں، آپ نے فرمایا ہے شک ایسا ہی فرمایا ہے تو وہ کہنے لگا۔ یہ کھوپڑیاں میرے ماں، باپ اور بھائی کی ہیں، ان پر ذرا ہاتھ رکھ دیکھو کیا ان میں حرارت و گرمی ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوہے کا ایک ٹکڑا اور پتھر محسوس کے سامنے رکھ کر کہا ذرا ان پر ہاتھ تو پھر دو کوئی حرارت محسوس ہوتی ہے محسوس نے ہاتھ پھیر کر کہا نہیں! پھر آپ نے لوہے کو پتھر پر مارا تو چنگاری نکل، تو اس سے پوچھا یہ آگ کہاں سے نکل پڑی؟ وہ کہنے لگا کہ لوہے پتھر کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ رگڑنے سے ظاہر ہو گئی آپ نے فرمایا پھر تو کیسے انکار کرتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ان کھوپڑیوں میں بھی آگ چھپی ہوئی ہو اور تیرے ہاتھ کو محسوس نہ ہوتی ہو۔ محسوس بات کی تہ کو پہنچ گیا اور تو بکر کے مسلمان ہو گیا۔

دونوں میں فرق اس قدر ہے کہ لوہے و پتھر میں چھپی ہوئی آگ تو ان کے رگڑنے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر کافر کے بدن کی آگ کچھ ایسی چھپی

ہوتی ہے کہ بالکل ہی معلوم و محسوس نہیں ہوتی۔ اور ایسا یوں ہے کہ جن و انس پر غفلت کا پردہ پڑا رہے! اور ایمان بالغیب کی اہمیت کم نہ ہو۔

اور پھر اس مریض کے باسے میں کوئی کیا کہے گا جس کے دل یا دیگر اعضا میں گرم گرم بخارات یا بھڑکنے والا مادہ حرارت پیدا کرتا رہتا ہے جیسا درد والے یا دوسرے مریضوں کو یہ کیفیت لاحق ہوتی ہے حالانکہ اوپر والے پر بدن پر گرمی کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ اور جب قبر جزا و سزا کی پہلی منزل ہے تو اس کے امر اور نہی کو اس عالم دنیا میں آشکارا اور بے نقاب کرنا ایمان بالغیب کے منافی ہے اور اس دارالکلیف دنیا کے مخالف و ضد جس کی بنیاد سراسر عقل کے امتحان پر ہے نہ ظاہر اور جس پر اس کے باوجود مکلفین کو چونکا نے اور تنبیہ کرنی کی غرض سے کبھی کبھی لوگوں پر بقرے کے حالات بھی منکشف ہو جاتے ہیں اور خواب میں کبھی جاگتے میں بھی بعض مردوں کے اچھے یا بُرے حالات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لہذا عقلاء کے اکثر و بیشتر فرقوں کے نزدیک بعد از موت عذاب و ثواب کی حقیقت قطعی اور یقینی ہے یہی وجہ ہے کہ کیا کافر کیا مسلمان ہر فرقہ اپنے مردوں کی امداد و اعانت کے لئے اپنے اپنے طور پر ایصالِ ثواب کے مختلف طریقے اختیار کرتے اور بڑے صدق قول سے ان میں مشغول و مصروف رہتے ہیں اگر اس عالم آخرت کے خوف و امید کی کوئی اصلیت و حقیقت نہ ہوتی تو یہ سب کچھ کس لئے ہوتا۔

عقیدہ ۴۷ — قرآن و حدیث میں جو کچھ آسمان سے کو قیامت کے دن سوال و جواب ہوگا۔ اعمال تو لے جائیں گے اچھے بُرے اعلیٰ تانے لوگوں کے ہاتھوں میں تمھارے جائیں گے صراط قائم ہوگی۔ عوض موجود ہوگا۔ شفاعت ہوگی وغیرہ وغیرہ یہ سب ظاہر معنی پر محمول ہیں۔ ان کے معنوں میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح جنت و دوزخ کا وجود برحق ہے اور جنت و دوزخ کے اندرون کی جو کچھ تفصیل آتی ہے مثلاً حور و قصور و غلمان، نہریں، درخت، فواکہ و ثمار، یا سانپ، بچھو، آگ، وادی اور کہانیاں۔ کھانوں کا پکنا اودان کی جگہ دوسری کھانوں کا پیدا ہو جانا وغیرہ وغیرہ سب صریح درست اور برحق ہیں۔ اہل سنت کا یہی مذہب و مسلک و اعتقاد ہے مگر افسوس کے اکثر فرقے مثلاً زیدیہ و اسماعیلیہ وغیرہ ان چیزوں سے انکار کرتے اور ان میں تاویلات کے پیوند لگاتے ہیں۔

ان کی تردید و تکذیب جس انداز میں قرآنی آیات و احادیث رسول جیسے دو گواہ عادل کر رہے ہیں وہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہے۔

عقیدہ ۴۸ — کہ تناسخ خلط اور باطل ہے۔ مگر شیعوں کے اکثر فرقے مثلاً قرامطہ، کاملیہ، منصوریہ اور مفسدینہ وغیرہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح میں تناسخ ہوتا ہے وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں آتی جاتی رہتی ہیں اور روحوں کی اسی آر، جاگ کا نام معاد (آخرت) ہے۔

کامل الاعتقاد و الطاعات افراد کی روحیں ایسے اشخاص کے اجسام میں منتقل ہوتی ہے جو صاحبِ نعمت و ثروت ہوں، صاحبِ عافیت و صحت ہوں مثلاً سلاطین امراء حکام وغیرہ اور اس روح کی جنت یہی ہے اور گھسیا اور گناہ آلود افراد کی روحیں ان اشخاص کے بدنوں میں گھسی ہیں جو بھوکے، ننگے، بے نوا، گدا گروں، یا مریض اور صدموں کا مارا ہوا ہو۔ یا کبھی ان حیوانوں کی جو ن چلی جاتی ہیں جو باعتبار اوصاف ان کے ہم رنگ ہوں مثلاً حریص کے لئے، چیونٹی، بہادرتگر کے لئے شیر، چیتا وغیرہ یا بزدل کے لئے خرگوش، عیار و مکار کے لئے لوطی، مسخرے کے لئے بندہ چور کے لئے بچہ اور خود پسند کے لئے مود (طاؤس) کے ابدان باعتبار اوصاف، جلے قیام بنتے ہیں۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ دراصل ہندوؤں سے مانگاتا ننگا ہے اور کچھ ان کی قرآنی تحریف کا کارنامہ ہے کہ بعض آیات میں نفی اور معنوی تحریف کر کے اپنے عقیدہ کی پیوند کاری کرتے ہیں۔ مثلاً۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ
يُطَيَّرُ بِمَنَاجِدٍ إِلَّا أَمْرًا أَمَّا لَكُمْ

حالانکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ جانور، چرند، پرند، بنی آدم ہی کی طرح جدا گانہ انواع پر مشتمل ہیں کہ ان میں ہر ایک کو اس کی خلقت کے مناسب خاص خاص احکام و اوصاف عطا کئے گئے ہیں اگر یہ آیت تناسخ کی طرف اشارہ کرتی ہو تو یہ لازم تھا کہ جانوروں کی پہلی پیدائش نہ ہوتی۔

اور وہ سب کے سب افراد حیوانی ہوں، جو حقیقت میں تو آدمی تھا مگر تناسخ کی وجہ سے جانور بن گیا ہے حالانکہ جو تناسخ مانتے بھی ہیں ان کا بھی یہ مذہب نہیں۔ یا یہ آیت کَلَّمَآلْغَفُصَّاتِ جُلُودَھُمْ بِذَکَآرِھُمْ جُلُودَھُمْ لَیْسَ لَھُمْ کَلَمٌ - کہ یہ ان دوزخیوں کے حق میں ہے جو عذاب میں بکڑے ہوئے ہیں ان ارواح کے بارے میں نہیں ہے جو دنیا میں شکل ہوتی رہتی ہیں۔ یا یہ آیت لَمَّا ارَادُوْا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْہَا اُعِیْذُکُمْ وَ اٰیَہُہَا - کہ اس میں ضمیر صاف طبع پر آخرت کی آگ پر پھرتی ہے (کہ جب وہ نارِ جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو واپس ہی دھکیل دئے جائیں گے۔ اسی طرح کا معاملہ ان احادیث کا ہے جو قیامت کے دن صورتوں کی تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں یا اس بات پر کہ حشر کے دن لوگوں کو مختلف صورتوں پر اٹھایا جائے گا۔ ان احادیث کا تناسخ سے دور پرے کا واسطہ بھی نہیں، کیونکہ تناسخ تو یہ ہے کہ عالم دنیا میں ایک روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہو۔ عالم آخرت کی منتقل سے تناسخ بحث ہی نہیں کرتا۔ اور ان احادیث کی دلالت عالم آخرت پر ہے۔ عالم دنیا پر نہیں۔

اور پھر تناسخ کی تشریف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دوسرا بدن اپنے تمام اجزاء میں پہلے بدن کا معاثر ہو۔ یہ نہیں کہ بدن تو پہلا ہی ہو شکل و صورت بھی وہی ہو مگر جزائے بدن میں انبساط، یا پھیلاؤ وغیرہ ہو جائے۔ تناسخ والے بھی اس کو نہیں ملتے اور اس کے ساتھ قابلِ لحاظ ایک بات یہ بھی ہے کہ قطعی دلائل سے یہ بات بتا دی گئی ہے کہ اعمال کا بدلہ تناسخ کی شکل میں ناممکن و محال ہے کیونکہ بدلہ پانے کے وقت کسی عمل کی تکلیف محال ہے اور تکلیف سابق کے بغیر بدلہ کا تصور محال ہے اور تناسخ کے وقت یہ دونوں محالات لازم آتے ہیں اور اس کا ثبوت ہے کہ یہ محالات لازم آتے ہیں اور یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے اچھے یا بُرے عمل کئے، اور مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے انسانی بدن میں منتقل ہوئی یہ حالت ایسی ہوگی کہ وہ مکلف بھی ہے اور جزا یافتہ بھی۔ کیونکہ ہر فرد انسانی بغیر مکلف کے اور مہر میں نہیں لٹکایا جاتا۔ اس کی حیات کا ایک ایک سیکڑا عالم تکلیف میں ہوتا ہے اور اگر اس روح کی منتقل کسی ایسے بدن میں ہوئی جو غیر مکلف ہے جیسے بچہ، یا جنون یا کوئی حیوان۔ اب اس بدن کی موت کے بعد روح لا محالہ یا تو کسی مکلف انسانی بدن میں منتقل ہوگی یا غیر مکلف اور حیوانی بدن میں، اور اس کو اس بدنی زندگی میں راحت بھی پیش آئے گی۔ اور تکلیف بھی تو یوں وہ جزا یافتہ ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے کی زندگی میں اس کو مکلف ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ دیکھ سکھ محض اتفاقی ہو کسی عمل کے سلسلے میں نہ ہو تو پھر جزا، جزا ہی نہ ہو کیونکہ جزا تو عبرت و تنبیہ کے لئے ہوتی ہے جب گناہگاروں کی طرح بے گناہ بھی اس کے شریک ہوتے تو پھر یہ جزا عبرت کیسے ہوئی اور محلِ عمل غلط ملط ہو گیا۔ اور جو باتیں مطیع و فرمانبردار کو پیش آتی تھیں وہ غیر مطیع و نافرمان کو بھی پیش آئیں تو مطیع اعزاز و اکرام سے محروم ہو گیا۔

اور ایک اہم قابلِ غور یہ بھی کہ اگر مومنین، صالحین بدلہ انبیاء و ائمہ کی ارواح عیش پرست، فاسق و فاجر سلاطین و امراء کے بدن میں منتقل ہوں تو یہ لازم آتا ہے کہ موت ثانی کے بعد بزرگوں کی روحیں عذاب پائیں گی۔ اور ان کی نیک نجاتی، بد بختی سے بدل جائے گی اور عزت و تکریم کے بجائے ذلت و اہانت سے دوچار ہوں گے۔ اور اگر اس کا الٹ ہو کہ امراء و حکام۔ و سلاطین انبیاء و صلحاء کے اجسام میں نمودار ہو، تو یہ ضروری ہے کہ انبیاء و صلحاء زمانہ ماضی کے انبیاء و صلحاء سے کتر نہ ہوں، اوصاف میں زائد ہوں گے یا کم از کم برابر و ہمتیہ۔ اور وہ سب کے سب بشکل انبیاء و صلحاء عیش پرست اور آسودہ حال ہوں گے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔ نیز روح کی بدن سے وابستگی کے بعد بدن کتنا بھی نعمت و آسودگی سے مالا مال ہو۔ وہ رنج و الم سے بچا نہیں رہ سکتا۔ مثلاً بھوک، درد، بیماری یا اسی جیسی تکلیف اس کو کیسے معاف کر دیں گی۔ تو اس صورت میں فرمانبرداروں، انبیاء و ائمہ کو دکھ دینا لازم آیا جو صاف ظلم ہے اور اسی طرح روح کے بدن سے منسلک ہو جانیکے بعد اسے کتنے ہی رنج و الم پیش آئیں۔ راحت و خوشی سے بھی وہ محروم نہ ہوگی جو وہ کسی قدر اور کسی وقت ہو سوائی صورت میں سرکشوں اور جابروں کا نعمت سے لطف اندوز ہونا لازم آیا۔

ایک اور بات یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اگر ابدان غیر متناہی ہیں تو نوع انسانی کا قدیم ہونا لازم آتا ہے۔ بلکہ ہر زمانہ میں انسانی ابدان کا

لگے زمانہ سے کہونا محال ہوگا اور اگر وہ کسی حد پر ختم ہوا تو آخر کی طرف ختم ہونے سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مکلف بدلہ پانے سے بچ جائے۔ اہل مشرق کی طرف ختم ہونے سے لازم آئے کہ بغیر تکلیف کا جزا پائے! اور اگر یہ کہیں کہ نوع انسانی کے خاتمہ پر جزا و سزا کا معاملہ آخرت پر اسٹار رکھیں اور وہ وہیں جزا پائیں گے۔ تو ہم کہیں گے کہ اگلے اعمال کی جزا آخری بدن کے اعمال پر ختم ہوئی اور ہر گئی ثواب آخری بدن کے اعمال کی جزا آخرت میں ابدی ہوگی اور ہمیشہ ہمیش باقی رہے گی۔ لہذا اگر پہلی جزا عدل پر مبنی تھی تو دوسری جزا اسرار ظلم ہوئی۔ اور اگر دوسری جزا بمقتضائے انصاف تھی تو پہلی جزا ناقص و ادھوری ثابت ہوئی۔

اور اگر یہ کہیں کہ نوع کے ابتدائی درجہ میں عیش و الم محض اتفاقی تھا جزا کے طور پر نہیں تھا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ پھر بعد میں انہوں نے طبقات پر ظلم ہوا کہ وہ اتفاقی عیش و راحت سے محروم رہے۔ اسی طرح اگلے طبقوں کے حق میں بھی ظلم ہوا کہ قصود کے بغیر رنج و الم جھگٹا۔
غلامہ کلام یہ کہ تناسخ کو جزا کا ذریعہ کہتا عقلی و عرقی ہر دو کے قواعد کے صاف و صریح طور پر مخالفت و غلط ہے اور یہاں اس قسم کے تناسخ کا بطلان مقصود ہے۔

عقیدہ (۶) قیامت سے پہلے مردوں کی دنیا میں واپسی نہیں ہوگی۔ مگر امامیہ تو سب کے سب اور افاضیوں کے کچھ فرقے واپسی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ "پیغمبر، وحی، اسطین، اور ان کے دشمن یعنی خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم، اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید مردان اور دوسرے ائمہ اور ان کے قاتلین، حضرت مہدی کے ظہور کے بعد زندہ ہوں گے اور حادثہ دجال سے پیشتر ان تمام قصود واروں کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے قصاص لیا جائے گا پھر وہ مراجعت گئے اور قیامت میں پھر زندہ اٹھائے جائیں گے۔

ان کا یہ عقیدہ کتاب اللہ کے صریح خلاف ہے کہ بہت سی آیات واپسی کی تردید کرتی ہیں ان میں سے ایک آیت ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ الْأَشْجَارُ فَتَبْلُغُ أَرْضَ بَابِلَ فَتُكْفَرُ عَنْهَا قُلُوبُ النَّاسِ فَيَكُونُ النَّاسُ كَفَرًا
اور جب وہ دن آئے گا کہ درختیں پھٹ جائیں گی اور زمین بابل کی زمین کی طرح ہو جائے گی اور لوگوں کی زبانیں کفر کی طرف مائل ہوں گی اور وہ لوگ کفر سے کفر تک پہنچ جائیں گے۔

اس آیت کے آخری جزو میں درجہ اول سے شروع ہونے والی بات کا ثبات کرتے ہیں مگر اس آیت کی موجودگی میں تو ان کو اتنا کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ چلنیک اعمال کے لئے واپسی محال ہے، مگر اگر اسے محدود و تعزیرات کے لئے واپسی محال نہیں بلکہ آیت کا آخری حصہ ہی تو مطلقاً واپسی کو رد کرتے۔

شریف مرتضیٰ نے نامہ صریح (کتاب) میں کہا ہے کہ عہد مہدی میں، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ایک درخت پر سولی دی جائیگی۔ پھر اس درخت کے متعلق بعض تو یہ کہتے ہیں کہ وہ سولی سے پہلے سرسبز ہوگا مگر سولی کے بعد خشک ہو جائے گا تو بہت سے لوگ بہک کر یہ کہنے لگیں گے کہ یہ بیچارے بے گناہ تھے کہ ان کو خواہ مخواہ سولی دی گئی۔ تب ہی تو یہ سرسبز درخت سوک گیا اور بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ پہلے یہ درخت ٹھنڈا سوکا ہوگا سولی کے بعد ہلکا ہوا ہو جائے گا اور اس سبب سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہو جائے گی اب اس ذہنیت پر ماتم کیجئے یا تعجب کراس جھوٹ میں بھی تو باہم مختلف ہیں،

اور جابر جعفی جو اس فرقہ کے قدامت میں سے ہے کہ کہتا ہے کہ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اس دنیا میں واپس آئیں گے اور قرآن مجید میں قرب قیامت جس ذابہ الارض (زمین چو پایہ) کے نکلنے کا ذکر ہے اس سے مراد آپ ہی ہیں۔ سبحان اللہ کیا حسن عقیدت ہے! ہونے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو!

اور زید یہ سب کے سب دنیا میں پھر واپسی کا سختی سے انکار کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اس عقیدہ کو ائمہ کرام کے حوالہ سے بڑے اچھے طریقے پر رد کیا ہے لہذا اہل سنت کو ان خرافات کی تردید کہ اب کیا ضرورت! کُلُّي اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْعِصَالِ۔
(مومنوں کی طرف سے لٹنے کے لئے اللہ ہی بہت ہے) هُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔

(وہ ذات وہ ہے جسے تم کو پیدا کیا پھر تم کو مارے گا یہ مقرر ہو کر زندہ کرے گا پھر تم اس کے پاس لوٹ کر جاؤ گے)

اصول امامیہ کے موافق اس عقیدہ کو باطل ثابت کرنے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کو حد قصاص کی صورت میں دنیا کے ختم ہونے سے پہلے عذاب دیا جائے اور آخرت میں پھر دوبارہ ان کی پڑائی جائے تو یہ سراسر ظلم اور کھلی زیادتی ہے۔ اس لئے لامحالہ آخرت میں عذاب سے وہ بری ہوں گے۔ اور اس صورت میں وہ آخرت کے بڑے اور دائمی عذاب سے چھٹکارا پالیں گے۔ اور وہاں کی ابدی راحت سے بہرہ ور ہوں گے اور یہ بات سخت خیانت اور بڑے جرم کے سراسر منافی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **وَلْعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَى**۔ (بے شک آخرت کا عذاب بڑا سخت اور باقی رہنے والا ہے) اور اگر دنیا کے عذاب سے مقصد دکھ دینا اور ایذا رسانی ہے تو یہ سب کچھ تو عالم قبر میں ہو چکی رہا، اس کے لئے ان کو زندہ کرنا سخت و سبکاوہ ہے اور عبت فعل کا مصدر بڑا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس سے پاک ہونا چاہیئے اور اگر دنیا کے عذاب سے غرض لوگوں کو ان کی خیانت سے باز کرنا ہے تو اس کی ضرورت تو ان لوگوں کو جی جان کے عہد میں موجود اودان کی خلافت کے حق ہونے کا عقیدہ رکھنے والے تھے۔ اودان کے معین و مددگار بنے ہوئے تھے۔ بلکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جناب امیر اور حضرت سبطین رضی اللہ عنہم کو اپنے اپنے عہد میں انتقام کی قدرت دی جاتی تاکہ بعد میں آنے والی امت گمراہی میں نہ پڑتی۔ اور ان کے کاموں اور کرداروں سے بروقت آگاہ ہو کر ان سے بیزار نہ ہوتی، انتقام میں اتنی دیر لگانا کہ امت کا اکثر حصہ گزر چکا اور گزرنے والوں کو ان کی "بدکرداریوں" کی برائی کا پتہ تک نہ ہو سکا حکمت کے خلاف اور صلاح کے منافی ہے تو گویا اصلح کا ترک لازم آیا اور کاش یہ آخرت میں ہوتا کہ اگلے پچھلے سائے جمع ہوتے اور سب کے سب اس جزا اور قصاص پر مطلع ہوتے تو وجہ جواز بھی ہوتی۔ امت کے بیشتر حصہ عمر میں یہ تعزیری واقعہ پیش نہیں آیا اور آخرت کے مجمع عظیم کے سامنے وہ پاک صاف اٹھائے جائیں گے۔ اب جب دنیا کا دم واپس ہے اس وقت کے چند حاضرین ان کی خیانت و گناہ پر مطلع بھی ہوئے تو اس سے حاصل کیا ہوا۔ وہ اس کو بھی دیگر انقلابات کی طرح کا ایک انقلاب جائیں گے اور کوئی ہجرت نہ پھر میں گے اور پھر ان کو اس وقت زندہ کریں گے تو یہ تیز و فرق کو نہ کر سکے گا کہ یہ ابو بکر ہیں۔ یہ عمر ہیں اور یہ معاویہ ہیں (رضی اللہ عنہم) سب کو یہی خیال ہو گا کہ چند لوگوں کے یہ نام رکھ لئے ہیں۔ جیسے اب بھی ایام عاشورہ میں کسی کا نام یزید، کسی کا نام شمر کہ کر ان کی پٹائی کرتے ہیں اور یوں اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں (کتنے شریعتیہ یزید و شمر کہ شیعوں کو خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں پٹوانے کا شوشہ چھوڑ گئے کیونکہ ان کا تو نام ہی استعمال ہوا ہے لہذا تو درحقیقت ان کے اپنی ہی کی ٹوٹی ہیں۔ ان کو مار نہیں لگتی۔ ن)

اور اگر مہدی یا دیگر ائمہ کا یہ کہہ دینا کافی ہو کہ یہ عمر ہیں یا ابو بکر ہیں (رضی اللہ عنہما) تو پھر ان کا یہ کہنا کیوں کافی نہ ہوا کہ ان کی خلافت ناحق و باطل تھی یا وہ علم و غصب کے مرتکب ہوئے ان کو زندہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پھر اس صورت میں پیغمبر و وصی اور ائمہ کو عام لوگوں کے مقابل میں ایک زائد موت کا مزہ کیوں چکھایا جا رہا ہے موت کے برابر تو کوئی دکھ اور الم نہیں اللہ تعالیٰ کو یہ کب گوارا ہو گا کہ ایک فعل عبت کی خاطر اپنے دوستوں کو الم شدید سے دوبارہ دوچار کرے۔

اور یہ صورت بھی تو پیش آ سکتی ہے کہ جب ان کو زندہ کریں تو وہ قرآن سے یہ جان جائیں کہ ہمیں تعزیر اور قصاص کے لئے زندہ کیا گیا اور سابقہ زندگی میں ہم ناحق اور ائمہ برحق تھے۔ تو اس تنبیہ کے بعد ہوسکتا ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کر لیں (کیونکہ ظاہر ہے اس وقت تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا ہو گا) تو پھر ان پر عذاب کا کیا جواز باقی رہے گا (اِنَّ ابَّ مِنَ الذَّنْبِ كُنْ لَازِمًا لِّهٖ) اور پھر انہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ اس صورت میں جناب امیر اور سبطین رضی اللہ عنہم کی کتنی سبکی اور اہانت لازم آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ اتنے ناقص تھے کہ ان کے لئے ان کے دشمنوں سے انتقام بھی نہ لیا۔ اور نہ انہیں کو ان پر عادی کیا کہ یہ خود ہی اپنا انتقام لے لیتے اور جب سینکڑوں صدیاں گزر جانے پر مہدی پیدا ہوئے تو ان کی فریاد قبول ہوئی اور انتقام لیا۔

غرضیکہ اس عقیدہ کے مخالف تھے ہیں کہ آدمی لکھتا لکھتا تھک جائے مگر ان کا حدود شمار ختم نہ ہوا! اس رجعت کا سب سے پہلا قائل عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ یہ توشہ اسی کا چھوڑا ہوا ہے البتہ وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رجعت کا قائل تھا۔ دوسری صدی کے شروع میں، جابر جعفی نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی اس رجعت میں شریک کر دیا، مگر اس نے اس رجعت کا کوئی وقت و زمانہ متعین نہیں کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ سفیان بن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ہم جابر جعفی کے گھر گئے تو ہم نے اس سے ایسی باتیں سنیں کہ ہمیں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم پر پھٹ نہ پڑے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر سے زیادہ جھوٹا، اور عطاء سے زیادہ سچا کوئی نہیں دیکھا۔ اور جب تیسری صدی کا آغاز ہوا تو اس زمانہ کے رافضیوں نے اپنے بغض کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے تمام ائمہ اور ان کے دشمنوں کی رجعت کا عقیدہ گھڑ لیا۔

عقیدہ (۷)

اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں میں سے جس کو چاہے گا عذاب نہ کرے گا کسی فرقہ کا پاس یا لحاظ نہ رکھے گا۔ جیسا کہ فرمایا۔ **يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَن يَشَاءُ** (جس کو چاہے عذاب دیتا ہے جس پر چاہے رحم فرماتا ہے)۔ مگر امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی بھی امامی شیعہ کو نہ گناہ صغیرہ پر عذاب ہوگا نہ گناہ کبیرہ پر اور نہ آخرت میں عذاب ہوگا نہ عالم قبر میں۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے ہاں مسلم اور اجماعی ہے۔ اسی لئے یہ ترک حاجات اور تکاب معاصی میں انتہائی بے باک ہوتے ہیں۔ اور اس عقیدہ کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ خلاصی اور نجات کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کافی ہے لیکن یہ اماندان آتا نہیں سمجھتے کہ صرف محبت تو (بلا عمل) خدا اور رسول کی بھی کافی نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ اس فرقہ کا کوئی شخص شیر میں کسی حمام پر گیا۔ حمام والے نے پوچھا آغا تہا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کلب علی (علی کا کتا) وہ بولا کہ ایسی کیا بات ہوگئی کہ غلام علی کی جگہ کلب علی نام رکھ لیا۔ وہ بولا کہ اس نیت سے کہ ممکن ہے علی کا کتا سمجھ کر بہشت میں جانے سے کوئی نہ روکے! وہ بولا کہ یہ ٹھیک تو ہے مگر جب خدا کا کتا بہشت میں نہیں پڑھ سکتا تو علی کے کتے کی کیا حیثیت کہ اسے جنت میں گھسنے دیا جائے۔ اگرچہ یہ عقیدہ خود ان کے اصول کے بھی خلاف ہے اور ان کی روایات کے بھی، لیکن چونکہ ہر تاجر و تاجر کرنا، ترک طاعات اور تکالیف شرعیہ سے کنارہ کشی مد نظر ہے اس لئے تیسری ڈھائی سہلے سے سینہ لگا رکھا ہے۔ یہ گویا اس معاملہ میں ان کا نفس امامہ ان کے علم و عقل پر غالب آ گیا ہے یہ عقیدہ ان کے اصول کے تو یوں خلاف ہے کہ اگر کسی امام نے کبیرہ کا ارتکاب کیا ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو سزا نہ دے تو اللہ تعالیٰ پر ترک واجب کا الزم آتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے! بلکہ اس طرح عذاب دینے کو نہ عدل کہتے ہیں جیسا کہ اپنے موقع پر پہلے بیان ہوا۔ اور روایات کے یوں مخالف ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ، جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ سے بذریعہ روایات صحیحہ ایسی دعائیں منسوب ہو کر وہ بارگاہ الہی میں رو کر ملا جلتے تھے، تفصیلات پر عرض خواہ ہوئے اور اس کے عذاب سے پناہ چاہتے تھے، اور ان میں حرمت رسول، حرمت کعبہ و قرآن کے واسطے دیتے تھے۔ جب یہ بزرگمان محترم خود اس قدر عالی مرتبہ رکھنے کے باوجود، پادشہ علی سے لڑتے، ڈرتے اور کانپتے تھے تو خالی محبت (وہ بھی دشمنی نما) کے معیوں کی یہ مجال و تاب کہاں کہ وہ اس پر غراتے پھریں، اور اس پر تکیہ کر کے دھڑلے سے ارتکاب معاصی کے ٹھانیں۔

کہ ہیں تو چند دنوں سے زیادہ آگ چھوٹے گی بھی نہیں اور یہ دھوکہ ان کو ان باتوں کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے دین میں جھوٹ کے طور پر شامل کر لی تھیں۔ تو اس وقت ان کا کیا حال ہوگا۔ جب ہم ان کو ایک یقینی دن (قیامت) میں اکٹھا کر کے ہر ایک کے سوال کا۔ بلا کم و کاست پورا پورا بدلہ دیں گے۔ اور ان پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔

لَيْسَ بِمُتَّكَاتٍ اَنْتَ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُودَةً وَ تَعْرِضُ مُخِرًا
فِي دِيْنِهِمْ مَا كُنَّا يَعْظُمُ عَنْهُ لَمَّا كُنَّا اَجْمَعًا
هَمَزٌ يَوْمَ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَ وَفِيَتْ كُلُّ نَفْسٍ
مَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

اس سلسلہ میں ان کے پاس وہ چند پچھپ روایات ہیں جو ان کے رواساء نے احمقوں کو بھانسنے کے لئے تراش لی ہیں۔ ان میں ایک روایت وہ ہے جو ابویہ قمی نے بیان کی ہے، واضح ہے کہ قمی بذمائی کی حد تک جھوٹ بولنے اور روایات گھڑنے میں شہرت یافتہ ہے۔ یہ ایسے کھولے سکوت سے تھیلیاں بھری رکھتا ہے اور موقعہ بقواعد سے سہارا کرتا رہتا ہے۔

علی الشرائع میں مفصل بن عمر سے یوں روایت کرتا ہے۔

قَالَ قُلْتُ لِرَبِّي عَبْدُ اللَّهِ لِعَصَا عَلِيٍّ قَسَمَ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ قَالَ لَا تَكُ حَبِطَ إِيمَانٍ وَبَقِصَةُ كُفْرٍ وَرَأَيْتُكَ خَلَقْتَ الْجَنَّةَ لَا حِلَّ لِلْإِيمَانِ وَالنَّارَ لِأَهْلِ الْكُفْرِ فَهُوَ قَسَمُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ لَا يَدْخُلُ النَّارَ إِلَّا مُبْغِضٌ

میں نے ابی عبداللہ سے پوچھا کہ یہ علی رضی اللہ عنہ (جنت دوزخ بانٹنے والے کیسے بن گئے؟ تو کہا کہ دراصل ان کی محبت ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے اور جنت اہل ایمان کے لئے اور دوزخ اہل کفر کے لئے پیدا کی گئی اور چونکہ جنت میں وہی داخل ہوگا جو ان سے محبت کرتا ہوگا اور دوزخ میں وہی جائے گا جو ان سے بغض رکھتا ہوگا۔ اور اس طرح وہ جنت دوزخ بانٹنے والے ہوئے۔

اس روایت کے جھوٹ ہونے کی دلیل کافی ہے کہ حضرات ائمہ قرآن و شریعت کے خلاف ہرگز کچھ نہ فرماتے۔ کیونکہ اگر ایسا کرتے تو نہ صرف اپنی ہی تردید کرتے بلکہ اپنے باپ دادا کی تکذیب بھی کرتے۔ اور اس روایت میں چند وجوہ شریعت کے مقرر کردہ قواعد کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔

اَوَّلُ: اگر کسی کی محبت ایمان اور اس سے بغض کفر بھی ہو تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جنت دوزخ کا بانٹنے والا بھی ہو۔ دیکھو تمام

انبیاء اور رسولوں، ائمہ اور حضرات سبطین کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہے مگر وہ جنت دوزخ کے بانٹنے والے نہیں ہیں۔

دوم: اگر حسب علی ہی کامل ایمان ہو تو توحید، نبوت، آخرت، اور شیعوں کے دوسرے اہم اور ضروری عقائد سب باطل رہے گا۔ جو جائیں گے۔ اور دوسرے ائمہ کے متعلق بدگوائی و بدزبانی اور ایذا رسانی کا جواز پیدا ہو جائے گا اور اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا تو معلوم ہوا حسب علی ایمان کامل نہیں۔ لامحالہ وہ جزو ایمان ہوگی۔ اور

تیسرے اس جملہ کا لَا يَدْخُلُ النَّارَ إِلَّا مُبْغِضٌ یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ جزو ایمان جنت کے داخلہ کے لئے کافی نہیں۔

چوتھے: کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا کیونکہ علی رضی اللہ عنہ سے ان کو کوئی بغض نہیں تھا۔ اور یہ بات بالا جماع غلط اور باطل ہے۔

پانچویں: یہ کہ اگر یہ سب کچھ صحیح بھی مان لیں تو اس کا اصل مقصد مدعا سے کوئی علاقہ تعلق نہیں اس لئے کہ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مُبْغِضٌ کا مقصد و منشا صرف اتنا ہی ہے کہ مہین کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائے گا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر جب جنت میں جائے گا، ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے اسے معمولی سمجھ والا بھی جانتا ہے۔

پانچویں: یہ کہ اگر ان سب سے قطع نظر کر لیں تو اس صورت میں رافضیوں کے تمام فرقے مثلاً خلاۃ، کیسانہ، ناوسیہ، افطیہ

قوام اور باطنیہ بھی جنت کے مستحق ہوں گے حالانکہ یہ امامیہ کے مذہب کے بھی خلاف ہے۔

جب اس روایت کا نشانہ بھی صحیح نہ بیٹھا اور مقصد بکاری ہوتے نہ دیکھی تو زبیل کذب سے یہ باویہ ایک اور روایت نکال لایا

عَنْ أَبِي عُبَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَ فِي جَبْرِئِيلَ وَهُوَ مُسَبِّحٌ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّ اللَّهَ الْأَعْلَى لَيُرِيكَ السَّلَامَ وَقَالَ مُحَمَّدٌ بَنِي وَرَحْمَتِي وَعَلَيَّ وَجِبَّتِي لَا أَعَدُّ بِمَنْ وَالِاهُ وَإِنْ عَصَانِي وَلَا أَرْحَمُ مِنْ عَاكِاهُ وَإِنْ أَهْلَعَنِي

ترجمہ:۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جبرئیل علیہ السلام میرے پاس خوش خوش آئے، اور کہا اے محمد اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام کہہ دیا ہے، اور کہا ہے کہ محمد میرے نبی اور میری رحمت ہیں اور علی میری محبت! جس نے ان سے دوستی کی، میں اس کو عذاب نہیں دوں گا اگرچہ وہ میری نافرمانی کرے اور جس نے ان سے دشمنی رکھی میں اس پر رحم نہیں کروں گا اگرچہ وہ میری اطاعت کرے۔

اس روایت کے جوڑا بیونکی دلیل ہے کہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں درحقیقت نبوت ثابت کی جا رہی ہے کیونکہ طاعت کا سوخت منکر انبیاء کا خاصہ ہے۔ نبی کے انکار کرنے والے کی طاعات جبط ہوتی ہیں۔ نیز اس روایت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی لازم آتی ہے کہ وہ تو اللہ کی محبت میں مگر حضور نہیں۔ کہ آپ کا فرمان تو نافرمانوں میں کا ایک ہے اور مطیع، اطاعت گزاروں کے منجملہ ایک۔ مگر حضرت علیؑ

کو دوست رکھنے والا حب علی کے اثر سے نافرمانی سے بے خوف ہے اور آپ سے بغض رکھنے والا بغض کے باعث طاعت کے اجر سے محروم نیز ان روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز، روزہ، طاعت و بندگی سب منسوخ اور بے کار بعض ہیں اور گناہ خواہ صغیر ہوں یا کبیرہ انکی حرمت خاک بن کر ہوا میں اڑ گئی۔ اسلئے کہ جزائے نیک و بد کا بے اثر توجہ بعض علیؑ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن جو مخلوق کو گمراہی سے بچانے کے لئے اترا تھا اس میں ہدایت کی صفت ہی نہیں اسلئے کہ جو کام و نجات کی بات ہے

یعنی حب علی و بغض علی وہ تو قرآن میں مذکور ہی نہیں۔ اور اگر مذکور ہوا بھی تو اس پیرایہ میں ہرگز نہیں جو ہر مکلف کے ذمہ نشین ہو سکے۔ اور معر بھانے کی ہر ایک میں استعداد و طاقت نہیں۔ گویا قرآن مجید اسی چوکی دعوت دیتا ہے جو آخرت کے لئے کسی کام کی نہیں۔ سوائے مشقت و رنج و کلفت و ملال اس سے کچھ حاصل نہیں۔ آخرت میں جو بات کام آتی قرآن اسی سے خالی ہے (نعمو بالذہ)

اور پھر ایسی باتیں نفس و شیطان کو مغرور و سرکش اور نافرمان بناتی ہیں اور ان جذبات کو قوی کرتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انبیاء و اوصیاء جو نفس و شیطان کا راستہ روکنے کے لئے بھیجے گئے ہیں وہ اپنے منہ سے ایسی باتیں نکالیں۔ اب ان روایات کے تجزیہ کے آشکار ہونے کے بعد اسی سلسلہ میں ان کی معتبر کتابوں کی ایک اور روایت سنئے تاکہ ان کا باہمی تعارض و تناقص سمجھنے میں مدد ملے۔

یہ روایت ان کے سردار اور پیشوا حسن بن کیش نے بحوالہ ابی ذر رضی اللہ عنہ (بیان کی ہے

نَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَجُلًا - وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب کی طرف دیکھ کر

فَقَالَ هَذَا خَيْرٌ الْأَوَّلِينَ وَخَيْرُ الْآخِرِينَ مِنْ أَهْلِ السَّمَوَاتِ وَأَهْلِ الْأَرْضِ هَذَا أَسِيدُ الْقِدَّةِ يَقِينٌ

وَسَيِّدُ الْوَحْيَيْنِ وَرَأْسُ الْمُتَّقِينَ قَاتِلُ الْفَرَسِ

الْمُجْتَلَيْنِ إِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَانَ عَلَى نَاقَةٍ مِنْ نَوَاقِ الْجَنَّةِ قَدْ أَهَّاتْ عَرْشُهُ الْقِيَامَةِ مِنْ ضَوْحِهَا

عَلَى رَأْسِهِ نَاحٍ مَرْمُوعٍ مِنَ الزَّيْتِ جَدِيدٍ وَأَلْيَا قُوَّتِ قَتَقُولُ الْمَلِكَةَ هَذَا أَمَلُكَ مَقَرَّبٌ وَيَقُولُ الْيَتِيمُونَ هَذَا

بَنِي مُوسَى قَدْ نَادَى الْمُنَادِي مِنْ تَحْتِ بَطْنَانِ الْعَرْشِ

هَذَا الْقِدَّةُ بَنِي الْأَكْبَرِ هَذَا وَجْهُ جَدِيدٌ عَلَى بَنِي طَالِبٍ يَقِفُ

عَلَى مَقَرِّ جَنَّةٍ رَفِيعَةٍ مِنْهَا مَنُ يُجِيبُ وَيَدْخُلُ فِيهَا مَنْ يُبْغِضُ وَيَأْتِي أَبْوَابُ الْجَنَّةِ

اس روایت سے واضح پر معلوم ہو گیا کہ سبحان علی! جس نے اپنے گناہوں کو پا داس میں جہنم رسید ہوں گے اور عذاب بھگتنے کے بعد آپ ان کو اس

سے نکالیں گے۔ تو یہ سبحان علی وہاں کیوں اور کیسے چلے گئے۔ ان پر تو آتش دوزخ حرام تھی؟

۱۴ ابن بابویہ کی بحوالہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ایک اور روایت سنئے۔

قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ

عَهْدَ أَمَلُكَ فِي النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا كُلُّ خَرِيفٍ

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بندہ جہنم

میں ستر خریف تک ہر خریف ستر سال کا ہوگا۔ داخل ہے گا فرمایا پھر وہ

لَهُ فَيَدْخُلُ فِيهَا مَنُ يُبْغِضُ حَسَابٌ -

مَسْبُوعُونَ سَنَّهُ قَالَ تَعْلَمُ أَنَّهُ سَأَلَ اللَّهَ تَعَالَى
يَحْيَىٰ مُحَمَّدٌ وَآلِهِ أَنْ يُرَحِّمَهُ فَأَخْرَجَهُ مِنَ النَّارِ
وَعَفِيفٌ لَهُ -
محمد اور ان کی آل کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے کہنے لگا کہ وہ اس پر رحم
فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ جہنم سے اسے نکال دے گا اور اس کی مغفرت
فرما دے گا۔

اب اگر یہ شخص محب علی تھا تو اتنی مدت تک یہ دوزخ میں کیا کرتا رہا۔ اور دشمن علی تھا تو اس کی معافی اور دخول جنت! یہ کیوں؟
ان روایات کا آپ شیعوں کی طرف سے حسب دستور قدیم یہی جواب سمجھ لیں کہ دروغ گو را حافض نباشد! حقیقت اور بالکل ظاہرات
یہی ہے کہ جوش شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدہ کا مخالف ہوگا اس کو ان کی زبانی کلامی بلکہ دلی محبت بھی ہرگز ہرگز کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیگی
جب کہ وہ آپ کے طریقہ اور راستہ چھوڑ کر گمراہوں، شیطانوں، جھوٹوں اور روایات کا کاروبار کرنے والوں کے پیچھے چل پڑا ہو۔ اور صراط المستقیم
گم کر بیٹھا ہو!

اس صورت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ خاتون جنت، جناب بطین اور دیگر ائمہ کی ولایت کا انکار یا ملکہ جناب امیرؑ کی محبت کا دم بھرنے
والا بھی جنتی ہوا دروغ کا عذاب اسے چھو بھی نہ سکے! حالانکہ اسی معلم نے کہ جبکہ یہ مفید کے لقب سے یاد کرتے ہیں اپنی کتاب المعراج میں یوں
روایت کی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ يَا مُحَمَّدُ كُونْ عَبْدًا عَبْدًا فِي
حَقِّ تَصْيِيرِ كَلِّكَ النَّبَالِي أَنَا فِي جَلِيدٍ لَوْ لَا ذِي
مُحَمَّدٍ وَعَلِيٍّ وَفَاطِمَةَ وَالحُسَيْنِ وَالحَسَنِ
مَا أَسْلَمْنَا فِي الْجَنَّةِ -
اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے محمد میرے کسی بندہ میری اتنی زیادہ
عبادت بھی کہ ہو کہ وہ پرانی مشک کی طرح ہو گیا ہو پھر اگر وہ میرے
پاس اسی حالت میں آئے کہ محمد علی، فاطمہ، حسن و حسین کی ولایت کا منکر
ہو تو میں اسے جنت میں گھسنے بھی نہیں دوں گا۔

تو معلوم ہوا کہ کیسا نہ، بطین رضی اللہ عنہا کی ولایت کے انکار کے باوجود، اور خلاۃ جناب امیرؑ کے عقیدہ کے مخالف ہونیکے باوصف
ناجی اور بہشتی ہوں گے (اس وقت امامیوں پر کیا گذرے گی)

اگر امامیہ یہ کہیں کہ اس روایت میں پانچوں کا انکار ولایت مراد ہے اور ان میں جناب امیرؑ بھی ہیں، تو شاید اس شخص کی عبادت انہیں
کے سبب نامقبول ہوتی ہو کہ وہ جناب امیرؑ کی ولایت ہے انکار کرتا تھا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں ولایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار
کرنا بھی جو بالاجماع کفر ہے۔ اعمال کے سوخت ہو جانے کے لئے کافی ہوگا۔ اور انکار ولایت علیؑ کا اس میں کوئی دخل نہ ہوگا۔
لاحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس روایت میں ہر ایک کا علمی و علمی و انکار ولایت مقصود ہے۔ اور یہ ہمارے مدعا کے لئے کافی ہے۔
اب تک ہمارے سخن اثنا عشریوں کے علاوہ دیگر فرقوں کی طرف رلا ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اثنا عشریوں کے متعلق بھی کچھ
بیان کریں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ اثنا عشریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے علاوہ شیعوں کے تمام فرقے دائمی طور پر جہنمی ہیں، ناجی صرف
وہی ہیں۔ یہ ان کا مشہور خیال ہے۔ ابن مطہر حلی شرح تجرید میں لکھتا ہے کہ ان فرقوں کے بارے میں ہمارے علما کا اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کیونکہ وہ جنت کا استحقاق نہیں رکھتے۔

بعض دوسرے کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں لایا جائے گا۔

ابن نوجت اور بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ دوزخ سے تو نکلیں گے مگر حال کافر نہیں ہیں لیکن جنت میں بھی نہ جاسکیں گے اس لئے کہ ایمان

صحیح نہیں رکھتے جو استحقاق ثواب جنت کا سبب ہے، بلکہ اعراف میں پڑے رہیں گے۔

صاحب التَّقْوِیْم نے جو امامیہ کے بڑے علماء میں سے ہیں کہا ہے کہ صرف شیعوں میں بہتر فرقہ ہیں جن میں نجات پانے والے مرنے والا شیعی ہیں۔ باقی شیعی فرقے کچھ مدت و وزخ کا عذاب بھگتیں گے پھر جنت میں چلے جائیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ ہمیشہ کا عذاب یا کچھ مدت کا۔ نجباء جناب امیر کے لئے یقیناً ثابت کرتے ہیں۔ ہاں صاحب تقویم یہ بھی کہتا ہے کہ باقی کے تمام اسلامی فرقے وہ ہمیشہ وزخ میں رہیں گے۔ لہذا معلوم ہو گیا کہ ان کے نزدیک اہلسنت باوجود محبت جناب امیر کے ہمیشہ اور دائم اور زخمی ہیں۔ اس سے ان کا قاعدہ و اصول جناب امیر کا اثباتی اور منفی پہلو سے ٹوٹ گیا۔

اب ان کے اس مذہب کو ذہن میں محفوظ رکھ کر توجہ سے ان کی روایات سنیں۔

روای ابن بابویہ عن ابی عباس عن النبی ﷺ علیہ
ابن بابویہ نے بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
وَمَسَامَرُهُ قَالَ وَالَّذِي بَعَثَنِي لَأَيُّدُبَنَّ النَّارَ وَمَوْجِدُ
سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قسم سے مجھے مبعوث کرنے والے کی
کہ سو حد کبھی وزخ کا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

اور طبری نے کتاب احتجاج میں حسن بن علی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے۔

أَلَمْ يَقُلْ مَنْ أَخَذَ مَعَهُ أَهْلَ الْقِبْلَةِ الَّذِي كُنْتُ فِيهِ
انہوں نے کہا کہ جس نے وہ راہ اختیار کی جس میں اہل قبلہ کا کوئی اختلاف
أَخْلَاكَ وَرَدَّكَ عَلَيْهِ مَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ سَلَّمَ وَفِي
نہیں اور اختلافی بات کو اللہ کے حوالہ کیا وہ محفوظ رہا اور وزخ سے نجات
مِنَ النَّارِ وَخَلَّاهُ الْجَنَّةَ۔
پالی اور جنت میں جا پہنچا۔

اور کلینی نے بحوالہ زرارة بسند صحیح یوں روایت کی۔

قَالَ قُلْتُ لَأَيُّ عَمِدٍ اللَّهُ أَصْلَكَ اللَّهُ أَرَأَيْتَ مَنْ صَلَّى وَ
صَامَ وَحَجَّ وَكُنَّ نَبَّ الْحَارَمِ وَحَسَنَ وَرَعَهُ وَمَنْ لَا يُعْرِضُ
وَلَا يَنْصِبُ قَالَ إِنَّ اللَّهَ يَدْخُلُهُ الْجَنَّةَ بِدَحْنِهِ۔

اس نے کہا کہ میں نے ابی عبد اللہ سے کہا اللہ آپ کو نیک بخت کرے اس
شخص کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جس نے روزہ رکھا نماز پڑھی
حج کیا حرام سے بچا پر ہیر گاری کا اچھا نمونہ پیش کیا، امہ کا نہ اقرار کرتا
ہے نہ دشمنی کرتا ہے آپ نے کہا اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت جنت میں داخل
کرے گا۔

یہ تینوں روایات اہلسنت کے ناجی ہونے پر صاف دلالت کرتی ہیں۔ اگر ائمہ کی معرفت نہ رکھتے ہوں۔ چہ جائیکہ ان کو مستحق امامت
جانتے، ان کو اپنا پیشوا مانتے اور ان سے محبت ظاہر کرتے ہوں۔

اور ان کے مطالعہ سے ہر سمجھ دار پر ظاہر ہو گیا ہے کہ یہ روایات جمہور شیعہ اور صاحب تقویم کے قول کی سختی کے ساتھ تردید کرتی ہیں۔
اور ابن نو بخت نجوی، مجوسی کا قول بالکل ہی باطل اور بے بنیاد ہے۔ یہ تو اب تک قواعد اسلام سے نااہل اور نا آشنا ہے۔ اسے یہ چہ ہی نہیں کہ
اعراف تو ایک عارضی قیام گاہ ہے، ہمیشہ رہنے کی جگہ وہ ہے ہی نہیں اصحاب اعراف تو آخر میں بہشت میں بھیجے جائیں گے مسلمانوں کے
نزدیک یہی بات صحیح ہے۔

نواں باب — احکام فقہیہ

جن میں شیعوں نے تقلید سے اختلاف کیا ہے

اس باب میں ان فقہی احکام سے بحث کی جائیگی، جن میں شیعوں نے کتاب اللہ اور عزت سے مخالفت کی ہے۔ اس سلسلہ میں فرمان خداوندی: **اِنَّهُمْ شُرَکَاؤُکُمْ فَاَوْشِرْکُوْا** یعنی **اِنَّهُمْ مِثْلُکُمْ بِمَا کُنتُمْ فَاَنْتُمْ مِثْلُهُمْ** کے لئے یہاں کوئی شریک مل گیا ہے جو ان کے لئے دین کی ایسی راہ نکالتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی، کا ہمنون ان پر بالکل چسپاں ہوتا ہے۔

شیعی فرقوں میں سے کیسا نیہ اور غلاۃ کے فقہی مسائل و احکام پابوں، فصلوں میں مرتب اور تصنیف شدہ نہیں ملتے۔ اس لئے کہ اب ان کے اہل علم بھی نہیں ملتے اور انکی تصانیف بھی دستاب نہیں لیکن یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ مختار فقہی نے کافی کچھ احکامات نکالے اور ان کو شریعت قرار دیا تھا وہ کہتا تھا کہ جبرئیل میرے پاس آئے اور وحی لاتے ہیں، اسی کی روشنی میں اندازہ لگایا جائے کہ اس کی فقہی احکام کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

زیدوں کے جتہدین نے شریعت کے بہت سے احکام نکلنے طور پر ترتیب دے لئے ہیں۔ بین کے اکثر شہروں میں ان کے علما بھی ملتے ہیں اور کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ کتاب الاحکام اعلیٰ مشہور و معروف کتاب ہے۔

عیدوں کے ظہور سے پہلے اسمعیلیہ اکثر مسائل میں امامیہ سے مستفق تھے ان کے خروج کے بعد بہت سے دوسرے مسائل بھی نکل گئے۔ چنانچہ ان کے کچھ مسائل اوراق سابق میں بیان بھی ہوئے ہیں۔

قرامطہ اور باطنیہ نے تو شرائع و احکام کو سرے سے ختم ہی کرنا مقصد قرار دیا ہے اسی لئے ظاہر پر عمل نہ کرنا ہی اپنا شعار بنایا ہے۔ لہذا فقہ اور شریعت کے درحقیقت اصلی دشمن ہی ہیں۔ اسوقت ہمارے دیار و امصار میں اشاعرہ فرقہ کے علاوہ کوئی اور فرقہ ایسا نہیں جس کے احکام و مسائل مدون انداز میں تصانیف کی صورت میں ملتے ہوں۔

یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ ان کی کتب فقہ کا یہ نظریہ مطالعہ کیا جائے اور ان کا اسلوب شرعی اسلوب کے جسدہ مخالفت یا بٹا ہوا ہو اس کو واضح اور ظاہر کیا جائے۔ تاکہ اہل دانش و پیش آنکی و روح کوئی افراط و تفریط اور گھٹن سے آگاہ ہو کہ اس کا پورا پورا کھوج لگا سکیں۔ مسائل فقہیہ میں گواہل سنت کے باوجود بھی اختلاف ہے لیکن ہر ایک کا اعتقاد و استدلال قرآن و حدیث و آثار پر ہی ہے۔ لیکن چونکہ ہر ایک کا طریق معانی فہمی جدا ہے اور علل شرائع بھی جدا اس لئے اختلاف ناگزیر ہو گیا۔ بخلاف ان حضرات کے کہ ان کی خاص شریعت قرآن و حدیث کے اسلوب سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔ ان کے متعلق آدمی یہی سوچتا ہے کہ یہودی شریعت ہے یا نصاریٰ کی۔ یہ ہندوؤں کا دیدار شاستر ہے یا صائیکو داساتیر۔ یہ بحث چونکہ نہایت طویل النزل ہے۔ اس لئے مجبوراً بطور نمونہ مختصر سا بیان کرتے ہیں کہ عقلمند کو اشاعرہ ہی کافی ہوتا ہے۔

ان کے احکام میں پہلا حکم صحابہ اور خلفائے ثلاثہ۔ نیز ان چند مہات المومنین کو جو بالاجماع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ترین کا فخر پہناتا ہے۔ اس حکم کا کتاب اللہ کے خلاف ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

دوسرا حکم حضرت عمار و قرضی اللہ پر لعنت۔ اللہ کے ذکر سے بھی افضل ہوتا ہے۔ حالانکہ کسی بھی دین و شریعت میں ابلیس تک پر جو گمراہی کا اصل الاصول ہے لعنت کرنے کو طاعت و عبادت شمار نہیں کیا گیا۔ چہ جائیکہ اسکو حج سے بڑی اور افضل الطاعت مانا جائے۔ قرآن مجید میں صاف آتا ہے **وَلَنْ کُفِّرَ اللّٰہُ الْکُفْرَ** (اللہ کا ذکر سب سے بڑی عبادت ہے)

سے جو سب سے تیز اور سب سے ظاہر حرکت ہے دائرہ آفاق سے گزرتے کر الایاں آفاق پر نور افشانی کرتا ہے۔ قوت بصر کو جلا بخشتا ہے۔ روح میں تازگی و بشارت پیدا کرتا ہے۔ اور بہت سے انسانی منافع مثلاً زراعت تجارت صنعت و حرفت میں بہتری کا باعث ہوتا ہے۔ گویا موت کے بعد اٹھاتا نمودار ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ مَبَاسًا وَجَعَلَ لَكُمُ النَّهَارَ شُغْلًا رات کو تمہارے لئے لباس، نیند کو آرام و سکون اور دن کو بھیلانے والا بنایا۔ یا فرمایا۔ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ہم نے تمہاری نیند کو آرام رات کو لباس اور دن کو معاش بنایا۔

تو اگر اس میں عید بنانے کی کوئی بات ہے ہی تو اس وقت کو بناؤ۔ کیونکہ یہ منافع ہر روز، اسی وقت فیض عام کی طرح نوع بشر کو حاصل ہوتے ہیں اگر محکمہ اس معاملہ میں غور کرے تو اسے پتہ چلے گا کہ دن رات کے ایک چکر میں سال میں آنے والے چار دوسروں کی کیفیات پائی جاتی ہیں، صبح سے لے کر دوپہر تک فصل ربیع کی کیفیت ہے کہ سبزہ تروتازہ اور پھول کھلے ہوتے ہیں حیوانی مزاج نشاط و فرحت میں ہوتے ہیں جب آفتاب نصف النہار پر پہنچا تو گویا اپنی حرکت خاص سے راس سرطان پر آیا۔ موسم گرما کی کیفیت کا آغاز ہوا۔ پھر سردی رونما ہوئی۔ پیاسہ، بیوست و خشکی جسموں میں غالب آئے گی۔ اور جب غروب کی طرف جھکا تو گویا میزان میں آیا کہ فصل خریف کی کیفیات شروع ہوئیں اور جب آدمی رات ہوئی اور گھٹاؤ سے بڑھ کر کی طرف رواں ہو تو گویا اب راس جدی پر آیا اور موسم سرما کی کیفیات کا آغاز ہوا۔ شب بزم برف کی طرح برسنے شروع ہوئی۔

ساتویں۔ جابر فظالم بادشاہوں کیلئے سجدہ جاری قرار دینا آخون باقر مجلسی اور ان کے دوسرے علمائے اہل اہل کے لئے جائز رکھا ہے۔ حالانکہ قواعد شرعیہ کے یہ بات صریحاً خلاف ہے جیسا کہ فرمایا۔ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاجْعِدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنَّ كُنتُمْ رِایَا تَعْبُدُونَ۔ چاند سورج کو سجدہ مت کرو، سجدہ اسی ذات اللہ کو کرو جس نے ان کو پیدا کیا۔ اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہو۔ یا ارشاد فرمایا۔ اَلَا یَسْجُدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْحَیَاةَ مِنَ الْمَوْتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَیَسْمَعُ نَدْوٰی السَّمٰوٰتِ اَوْرَیْہِمْ میں پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے۔ اور جو ان کو بھی جانتا ہے جو تم چھپا کر یا علانیہ کرتے ہو۔

غرض بہت سی آیات ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ سجدہ خاص طور پر شریعت مصطفوی میں اسی ذات برحق اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے جو طاقت والا ہے اور سر پوشیدہ و ظاہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اور یہاں حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کرنے سے استدلال بغیر غلط اور بے اصل بات ہے۔ اس لئے کہ انسانوں کے احکام کو فرشتوں کے معاملہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ دلائل خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا حکم صریح تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ تعمیل حکم الہی تھی۔ اور کسی دین و فریب اور شریعت کا اس وقت نہ کوئی وجود تھا اور نہ یہ مکلفین کا سجدہ اصطلاحی تھا۔ (ن) اسی طرح یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کا بھجڑ بھی نظیر نہیں بن سکتا کہ وہ اول تو اصطلاحی سجدہ نہ تھا۔ دوسرے سابقہ شریعتوں سے تمسک اس وقت درست ہو سکتا ہے کہ ہماری شریعت میں اسے منسوخ نہ کیا گیا ہو۔ اور یہ سجدہ ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ منسوخ قرار نہ دیا گیا ہوتا تو پھر اس کے زیادہ حقدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم، جناب امیر اور جناب سبطین و دیگر ائمہ ہو سکتے تھے۔ یہ جابر فظالم شاہ عباس و طہا سب کیوں حقدار ہوئے۔ اب احکام کے ذکر کے بعد ہم مسائل فقہیہ کو لیتے ہیں۔

(۱) ان کے نزدیک وہ پانی پاک ہے جس سے استنجاء کیا گیا ہو۔ اور ابھی محل استنجاء بھی پاک نہ ہوا ہو، اور اجزائے نجاست پانی میں تحلیل ہو گئے ہوں تا آنکہ پانی کا وزن بھی بڑھ گیا ہو۔

یہ مسئلہ قواعد شرع کے صریحاً خلاف ہے۔ کیونکہ شرعی حکم و محرم علیکم اللہ عافکم۔ (یعنی تم پر گندی اور پلید چیزیں حرام کرتا ہے) اور یہ مسئلہ ائمہ کی روایات کے بھی مخالف ہے جیسا کہ قرب الاسناد نامی کتاب کے مرتب نے علی بن جعفر سے انہوں نے اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے روایت کی

کی ہے۔ اور جیسا کہ ابو جعفر طوسی نے عبد اللہ بن سنان اور ابی بصیر دونوں سے اور ان دونوں نے ابی عبد اللہ سے روایت کی۔ اور جس طرح کتاب المسائل میں علی بن جعفر سے روایت کہ: **اِنَّهُ قَالَ سَأَلْتُ اُمِّیْ مُوسٰی بْنَ جَعْفَرٍ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ رَیْلَ بْنَ مَایْمُوْنٍ وَکَرَعَ فِیْهِ اُذْقِیَّةٌ یُّوَلِّیْ مَلْ یَصْنَعُ شَرَابَهُ وَالتَّوَعُّفُ مَوْثِقُهُ قَالَ لَا یَنْجُوْنَ اِلَّا بِمَعْمَالِهِ**۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا جس میں ایک ہزار رطل پانی ہو مگر اس میں ایک اوقیہ بیشابہ پر لگیا ہو کہ کیا ایسا پانی پینا جائز اور اس سے وضو صحیح ہو جائیگا آپ نے فرمایا نہیں۔ وہ مجھ سے اس کا استعمال جائز نہیں۔

اور اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ اثنا عشری مذہب اسی کے موافق بھی ہے کہ جب پانی ایک گز سے کم ہو تو وہ نجاست پر بھانے سے ناپاک ہو جاتا ہے، مگر اسکے باوجود معلوم نہیں استنجا کے پانی میں معتد کے اس بار و بر و ہوجانے کے بعد وہ کون سے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسکی نجاست بڑھنے کے بعد بھی پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ نیز غفریپ آنے والے دوسرے مسائل سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک انسانی بولنے ایسا ہی پاک ہے جیسا ہندو گولہ کے گانے گائے کا گوشت پاک ہے!

اگر کوئی اشاعرہ اس مسئلہ سے انکار کرے تو ابن مطہر علی کی کتاب منتہی بھی دنیا سے نابود نہیں ہوئی۔ ان کے کتب خانوں میں یقیناً موجود ہوگی اسے کھول کر دیکھ لیں جس میں اس نے استنجہ کے پانی کی پاکی بیان کر کے دوبارہ اس کے استعمال کے جواز پر پورے فرقہ کا بیان کیا ہے، دوسرے مسئلہ شراب کی طہارت کا ہے جس کے متعلق ابن بابویہ جعفری اور ابن عقیل کی تفصیلات موجود ہیں کہ پاک ہے!

یہ مسئلہ بھی صریح قرآنی آیت کے خلاف ہے، **اِنَّهَا اَلْمُدَّ وَالْمِیْسِرُ وَالْاَنصَابُ وَالَّذِیْ لَا یُحِیْطُ بِمَعْنٰی عَمَلِ الشَّیْطٰنِ**۔ شراب، ہوا، بت، اور پانے کے نجس اور کافر شیطان ہیں۔

نعت میں جس صحت نجاست کو کہتے ہیں۔ (ان اشیاء و اعمال میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی نجاستوں کا ذکر ہے، اسی لئے مختصر کے بارے میں فرمایا **فَاِنَّهُ رَجَسٌ**)۔ بلاشبہ وہ مجسمہ نجاست ہے،

اور پھر یہ ائمہ کی روایات کے بھی خلاف ہے جو خود شیعوں کی کتابوں میں موجود مذکور ہیں۔ صاحب قریب الاستاد اور صاحب کتاب المسائل دونوں نے یہ روایات بیان کی ہیں۔ اور ابو جعفر طوسی نے ابو عبد اللہ سے یوں روایت بیان کی ہے: **اِنَّهُ قَالَ لَا تَقْلَبُ فِی الشَّوْبِ قَدْ اَصَابَهُ الطِّیْمُوْنُ حَتّٰی یُکْرِمَ بِشَرَابٍ لِّکَیْ یُشَوِّیَ**۔ نماز مت پڑھو

تیسرا مسئلہ مذی کا ہے کہ یہ اسے پاک کہتے ہیں جو صحیح اور متفق علیہ حدیث کے خلاف ہے۔ روانذی نے موسیٰ بن جعفر سے انہوں نے اپنے باپ دادا سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا جس کو یہ بات پیش آئے وہ حشفہ کو دھو لے۔

اور ابو جعفر طوسی اگرچہ مذی کی نجاست پر صریح روایت بیان کرتا ہے مگر نہ اس پر فتویٰ دیتا ہے نہ اس پر عمل رکھتا ہے۔ چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے ہاں مذی کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ حالانکہ خود ہی ائمہ سے اس کے خلاف روایات بیان کرتے ہیں۔ طوسی نے یعقوب بن یقظین سے اس نے ابی الحسن سے روایت کی کہ **اَلْمَذِیُّ مِنْهُ اَلْوَضُوْءُ**۔ (مذی نکلنے سے وضو کرنا چاہیے)۔

اور روانذی نے جناب علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ: **قَالَ قُلْتُ لَا یُزَالُ سَلِّ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ الْمَذِیُّ فَمَا لَیْتَوَضَا وَضُوْءُہٗ لِّلصَّلٰوۃِ**۔ آپ نے کہا میں نے ابو ذر سے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کے متعلق پوچھنا، انہوں نے پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی وجہ سے وضو کرو ایسا وضو جو نماز کے لئے کرتے ہو۔

پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ یہودی کو بھی پاک کہتے ہیں جو گاڑھے پیشاب کو کہتے ہیں۔ اور پیشاب تینوں شریعتوں کے اجماع کے مطابق ناپاک ہے۔ بلکہ دوسرے باطل دینوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

چھٹا مسئلہ یہ کہ وہی کے نکلنے سے بھی ان کے ہاں وضو نہیں ٹوٹتا حالانکہ یہ ائمہ کی روایات کے خلاف ہے۔ روندی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث مرفوعہ نقل کی ہے کہ اَلْوَدِيُّ يَنْتِجُ الْوَضُوْءَ (وہی کے نکلنے سے وضو کیا جائے) اس کے علاوہ بھی لوگوں نے ابی عبد اللہ سے اسی قسم کی روایات بیان کی ہیں۔

ساتواں۔ یہ کہتے ہیں کہ پیشاب کرنے کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ جھٹک دو، اس کے بعد جو کچھ اس سے نکلے وہ پاک ہے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا یہ مسئلہ بھی صریحاً خلاف شرع ہے۔ کیونکہ ہر دراستوں سے نکلنے والی ہر چیز ناپاک بھی ہے اور وضو کو توڑنے والی ہے۔ اور اس سے پہلے عضو کے چھانسنے کو بعد کی طہارت اور وضو نہ ٹوٹنے میں کیا دخل ہے۔ اور کیا واسطہ یہ تو وہی بات ہوئی جو صابیوں کے دسات میں پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لے تو درمیان نماز وضو توڑنے والی کوئی بات پیش آجائے تو اس سے نماز میں کوئی مغلل واقع نہیں ہوتا۔ اسکی مثال تو اس شخص سے ملتی جلتی ہے جس نے کسی کی ملاقات کی خاطر فرش فروش کا اہتمام کیا، لباس آرائش کا بھی خیال کیا، مگر جب وہ ملاقاتی آیا، تو فرش فروش بھی اٹھا دیا اور خود بھی ننگا ہو کر اس سے ملا۔ اور یہ توجیہ کرنے لگا کہ یہ سب اہتمام تو اس کے اعزاز میں تھا۔ اب دوران ملاقات میں ننگا ہو گیا تو کیا ہوا،

اور پھر یہ بات ائمہ کی روایات کے بھی خلاف ہے۔ کہ ابن عباسی نے ابی جعفر سے روایت کی ہے۔ اَنَّهُ كَتَبَ اَلَيْهِ هَلْ يَجِبُ الْوَضُوْءُ اِذَا اخَذَ مِنْ اَلْكُفْرِ شَيْئًا بَعْدَ اَلْوُضُوْءِ اَوْ قُلَّ نَعْمٌ۔ کہ ان سے تحریر کیا یہ پوچھا گیا کہ پاکی کے بعد اگر عضو مخصوص سے کوئی چیز نکلے تو کیا وضو واجب ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں!

(۸) خانگی مرغ مرغی کی بیٹ کو بھی یہ پاک کہتے ہیں حالانکہ ائمہ کی نصوص سے اسکی نجاست و ناپاکی ثابت ہے۔ اور ان کی معتبر کتب میں یہ لکھا ہوا بھی ہے۔ مثلاً محمود بن حسن طوسی کی روایت بحوالہ فاریس یوں ہے۔ اَنَّهُ كَتَبَ رَجُلٌ اِلَى صَاحِبِ الْعَسْكَرِ يَسْأَلُهُ عَنْ ذَرْقٍ لِلدَّجَاجِ يَجُوزُ اَلْوُضُوْءُ عَلَيْهِ فَاَلَيْسَ لَدَى جَنَابِ حَسَنِ عَسْكَرٍ سَے اِيك شخص نے لکھ کر فتویٰ پوچھا کہ مرغ کی بیٹ کا کیا حکم ہے اس کے ملوث کپڑے سے نماز جائز ہے۔ آپ نے جواب لکھا۔ نہیں۔ اور دیے بھی یہ بات خود ان کے قاعدہ کے بھی خلاف ہے۔ کہ حلال جانور کی بیٹ ناپاک ہے، ابن مطہر نے مفتی میں اس پر نص نقل کی ہے۔ ان سب کے باوجود مرغوں اور مرغیوں میں کیا خوبی پیدا ہو گئی کہ ان کی بیٹ پاک ہو گئی!

(۹) وضو میں ان کے نزدیک تمام چہرہ کا دھونا فرض نہیں۔ حالانکہ نص قرآنی فَاغْسِلُوْا وُجُوْهُكُمْ۔ صراحتاً پورے چہرہ کو دھونے پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے حد فرض اس فاصلہ سے ستر کی ہے جو انگوٹھے اور بیچ کی انگلی میں ہے جبکہ ان کو پیشانی کے اوپر والے حصہ سے لے کر نیچے تک کہیں ہیں اس اندازہ کی نہ شریعت میں کوئی اصل و بنیاد ہے نہ ائمہ سے اس قسم کی کوئی روایت مستول ہے۔ جناب امیر المؤمنین نے ایک مرتبہ جبکہ آپ مسجد کوفہ کے برآمدہ میں بیٹھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی نقل کر کے لوگوں کو دکھا رہے تھے، پورا چہرہ دھویا۔ اور حاضرین نے اسے دیکھا اور اس کی روایت کی۔ اس کے غلط اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کو کشادہ کر کے اور پھیلا کر اوپر سے نیچے کی جانب کہیں ہیں گے تو ٹھوڑی کے متصل اگر وہ دونوں جانب سے گلے کا حصہ بھی گھیر لیگی تو گویا گلے کے اتنے حصہ کا دھونا بھی فرض ہوگا۔ حالانکہ گلے کو چہرہ میں کوئی شامل نہیں کرتا۔ اور اگر ہر دو انگلیوں کو پیشانی کے مقابلہ میں پھیلا لیں اور آہستہ آہستہ تنگ کرتے جائیں تو تنگ کرنے کی حد کیا ہے یہ معلوم نہیں ہوئی۔ اور شرعی اندازے تو مکلفین کو بتانے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ چھپانے کے لئے!

(۱۰) کہتے ہیں کہ غسل جنابت کے ساتھ وضو حرام ہے۔ اسی کا یہ مسئلہ بھی حدیث کے صریح خلاف ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس غسل سے پہلے وضو فرماتے اور پھر تمام بدن پر پانی ڈالتے یہ سنت تو اتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اور ان کی یہ باب ائمہ کی روایت کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ کھنئی نے محمد بن یحییٰ کے حوالہ سے ابی عبد اللہ سے روایت کی، اور حنفی بن سعد نے حضرت عیسیٰ سے اور اس نے ابی جعفر سے! دونوں نے کہا کہ پہلے وضو کرے پھر غسل کرے۔ جب آپ سے غسل جنابت کی کیفیت معلوم کی گئی!

(۱۱) یہ غسل نوروز کو بھی سنت کہتے ہیں۔ ابن قدامت نے بھی یہی کہا ہے۔ یہ بھی دین میں ان کا گھڑا ہوا اور بناوٹی مسئلہ ہے، جس کو ان کی کتابوں میں کسی نے بھی جناب پیغمبر علیہ السلام یا جناب امیر رضی اللہ عنہ یا دوسرے ائمہ سے روایت نہیں کیا۔ کہ انہوں نے نوروز کے دن غسل کیا ہوا، نہ عرب اس نوروز کو جانتے تھے، جانتے بھی کیسے یہ تو کافر مجوسیوں کی عید کا دن تھا۔ (جب ان کے صحیح جانشین پیدا ہو گئے تو انہوں نے ڈھٹائی سے اپنے ہاں اس کو رواج دے لیا۔ مسلمانوں کو مجوسیوں کی عید سے کیا سرور کا رسم

(۱۲) تیمم میں یہ دو مضر بنوں کے بجائے ایک ضرب بتاتے ہیں۔ حالانکہ ائمہ کی روایات اس کے خلاف بول رہی ہیں۔ علانے محمد بن اسلم سے روایت کی کہ اس نے اپنے دادا سے تیمم کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ ایک مرتبہ چہرہ کے لئے اور ایک مرتبہ دونوں ہاتھوں کے لئے ضرب لگائے لیث مرادی نے ابی عبد اللہ اور اسحاق بن حزم نے جناب رضا سے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔ اس روایت میں پیشانی پر مسح کا اضافہ بھی کر دیا ہے حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

(۱۳) ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے۔ موزہ، ٹوپی، الار بند، پائنتاب، کمر بند (ٹیکام) اور عمامہ اور جو کچھ نمازی کے بدن پر ہو، جسکی چوڑائی پر نماز جائز نہ ہو، اگر اس پر نجاست لگ جلتے چاہے وہ خفیہ ہو یا غلیظہ، جیسے انسانی براز، تو نماز جائز ہے، نماز میں کوئی خلل نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی حکم قرآنی کے بالکل خلاف ہے۔ وہاں تو حکم ہے وَشَايَكَ فُطْرًا رَپِنَ كُرْءِىَ پاك كُرءِىَ اور ظہا ہر بے کہ تمام چیزیں عورت و شرع میں لباس و کپڑوں کے زمرہ میں شمار ہوتی ہیں۔

(۱۴) ایک مسئلہ یہ ہے کہ نمازی کے بدن کے کپڑے مثلاً ازار، کمرہ، پاجامہ خون و پیپ میں بھر جائیں، تو بھی نماز جائز ہے۔ حالانکہ غلطی و پیپ اپنا ہوا یا دوسرے کا۔ بلاشبہ نجاست اور ناپاک ہے۔

(۱۵) ایک مسئلہ یہ کہ نفل نماز میں نمازی خواہ کھڑا ہو، یا بیٹھا، اور ایسے ہی سجدہ تلاوت کہ ان میں قبلہ کی سمت کے خلاف رخ کر لیا جائے تو وہ دین میں ان کی طرف سے یہ ایسا اضافہ ہے جسکی اجازت شریعت نے نہیں دی، سواری اور سفر کا استثنا تو شریعت میں ہے مگر اور کسی حالت میں قبلہ سے رخ ہٹانے کی اجازت نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی روایات میں ان دو حالتوں کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ وَفِي حَيْثُ خَرَجْتَ تَوَلَّوْا بَهْجَتَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اور تم جہاں بھی ہو اپنا منہ اسی طرف رکھو۔ اب اس عموم میں سے پیغمبر علیہ السلام جس صورت کو مستثنیٰ اور علیہ فرما دیں وہی قابل تسلیم ہوگی۔ آپ کے علاوہ کسی کی یہ تاب اور مجال نہیں کہ اپنی عقل سے کوئی استثنا کر سکے۔ اس مسئلہ میں ان کے شیخ مقداد نے کچھ انصاف سے کام لیا ہے اور اپنی تصنیف کنز العرفان فی احکام القرآن میں اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

(۱۶) ایک مسئلہ یہ کہ اگر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں خشک انسانی غلاظت بھی ہوگی ہے اگر وہ غلاظت نمازی کے کپڑوں یا بدن پر نہ چسپے تو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ حالانکہ نماز کی جگہ پاک ہونا شریعت کے تسلیم کردہ اور مقرر کردہ مسائل میں سے ہے!

(۱۷) مسئلہ اگر کوئی دونوں ہاتھ کہنیوں تک اور دونوں پاؤں گھٹنوں تک ایسے نالہ اور چوبچہ میں داخل کر دے جس میں بول و برا نہ ہو، تو غلاظت صاف کر کے بغیر ہاتھ پاؤں دھوئے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح ایسے ہی غلاظت سے پرہیز میں غوطہ لگا کر، اور

غلاطت کو بدن سے اتار کر بغیر بدن دھوئے بھی نماز پڑھنا جائز ہے: ظاہر ہے ایسی صورت میں پانی سے دھوئے بغیر بدن پاک نہیں ہو سکتا جرم (ذلل) نجاست بدن سے اتار دینے سے پاکی حاصل نہیں ہوتی تاہم پاکی کا اثر نازل ہوتا ہے۔ اس کام کے لئے ہی اللہ تعالیٰ پانی بتایا ہے۔ **وَيُنَزِّلُ عَلَيْكَ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَ بِهِ** اور آسمان سے پانی اتارتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تم کو پاک کرے اور فرمایا **وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا**۔ (اور نازل کیا آسمان سے پاک کرنے والا پانی)

(۱۸) مسئلہ اگر کوئی نمازی نماز سے فارغ ہو کر یہ دیکھے کہ اس کے کپڑوں پر خشک پاخانہ، یا کتے بلی کی غلاطت، یا خون و مٹی لگی ہوئی ہے تو اس کی نماز درست ہو گئی۔ طوسی نے کتاب تہذیب میں یہ ہے، اور دوسروں نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے شرع میں کپڑوں کا پاک ہونا فرض و شرائط نماز میں سے ہے،

(۱۹) ماورزا دیرہ نہ صرف عضو مخصوص اور اس کے تعلقات پر گیلی مٹی لگا کر، بلا ضرورت و مجبوری۔ نماز پڑھ لے تو ان کے ہاں جائز ہے، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ شرع میں عام حالات، خصوصاً نماز، و عبادت اور مناجات میں ستر عورت کی کتنی تاکید ہے۔ اسی وجہ سے ان کے متاخرین میں سے ایک جماعت نے اس کی قیاحت اور برائی محسوس کر کے جہور کا قول تسلیم نہیں کیا۔ اور ائمہ و اہل بیت کے آثار سے دلیل لاکر اسکو غلط اور باطل ثابت کیا ہے۔

(۲۰) مسئلہ اگر کوئی شخص، داڑھی، مونچھ، بدن اور اپنے کپڑوں کو مرغ کی بیٹ سے تھیلے یا اس کی داڑھی، مونچھ یا خسرہ پر اس کے پیشاب کے چھینٹے پڑ جائیں، یا عضو مخصوص کو پیشاب کرنے کے بعد تین مرتبہ جھٹک لے۔ یا مذکورہ جگہوں پر ندی مل لے۔ تو ایسی صورت میں دھوئے دھلائے بغیر نماز درست اور جائز ہوگی۔

(۲۱) نماز کی حالت میں چل کر ایسے خیر کو جسے کتا بلی کھانا چاہتے ہوں اٹھا کر دسترس سے باہر جگہ پر رکھ دینا جائز ہے، اگرچہ چلنے کی مسافت شرعی دس گز کے برابر ہو، اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ حالانکہ فعل کثیر خصوصاً ایسا کام جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو باجماع روایات شرعیہ نماز کو باطل کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ **قَوْلُ اللَّهِ قَاتِلِينَ فَإِنْ خِفْتُمْ دَرَجَاةً أَوْ وَكَلْنَا قَادًا أَمْنًا قَادًا كُفُّوا لَكُمْ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ**۔ اللہ کی حاضری میں سکون سے کھڑے ہو اگر کوئی خوف کی حالت ہو تو پیدل یا سواری پر جیسا موقع ہو نماز پڑھ لو۔ اور جب امن کی حالت ہو تو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے اس کے مطابق نماز پڑھو۔

(۲۲) یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی بعض سورتوں کے پڑھنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورہ السجدہ۔ اور تین سورتیں اور۔ حالانکہ قرآن مجید میں آیت **فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ** (قرآن کا جو حصہ آسان یاد ہو پڑھو) عموم پر ناطق ہے۔ اور خود یہ فرقہ بھی اپنے ائمہ سے ایسی روایت بیان کرتا ہے کہ نماز ہر سورت سے جائز ہے۔ اور مزے کی بات یہ کہ یہ اس نماز کو بھی جائز بتاتے ہیں جس میں نمازی کوئی قرأت پڑھے اور دل میں یہ سمجھتا جائے کہ یہ قرآن منزل کا حصہ نہیں ہے بلکہ عثمان (رضی اللہ عنہ)، اور ان کے دوستوں کے تحریف کردہ قرآن کا حصہ ہے۔ ان میں سے بعض عین حالت نماز میں کھانا پینا یا نہ بتاتے ہیں چنانچہ ان کے ایک معتبر فقیہ ابو القاسم نجم الدین نے شرائع الاحکام میں بصرحت اس کو بیان کیا ہے۔ حالانکہ متفق علیہ احادیث میں نماز کی حالت میں کھانے پینے کی ممانعت بیان کی گئی ہے۔ اور اس پر تو اس فرقہ کا اجماع ہے کہ اگر کسی رات کی صبح کو روزہ رکھنے کا ارادہ ہو تو اس رات کو عین و ترک نماز میں تشنگی محسوس ہو تو پانی پینا جائز ہے۔

(۲۳) اگر کوئی کسی حدیث سے بغلیہ ہو جائے اور اس حالت میں انتشار ہو، اور وہ عضو کو مقابل کے عضو کے مقابلہ میں رکھے اور اس کی وجہ سے مذی اس کی پینڈی تک نہ آئے تو ایسی حالت میں بھی نماز جائز ہے۔ طوسی، ابو جعفر اور ان کے دوسرے جتہدین کا یہی فتویٰ ہے! یہ ایسی حرکت ہے جو مقاصد شرع کی کھلم کھلا تردید کرتی ہے اور مناجات باری کی حالت کے صاف منافی ہے۔

(۲۵) اگر کوئی نمازی عین حالت نماز میں عضو مخصوص اور تعلقات کے ساتھ مشغول رہے حتیٰ کہ تندی و انتشار کی نوبت بھی آجائے اور اس کی وجہ سے مذی بھی بہ نکلے تو نماز میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

(۲۶) ان میں سے بعض نے ائمہ کی قبور کی طرف ثواب و تقرب کی نیت سے رخ کر کے نماز پڑھنا جائز کہا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ**۔ (اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو مسجد بنالیا)۔

(۲۷) انہوں نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو بغیر غرار اور بغیر سفر کے جمع کرنے کو جائز قرار دیا ہے جو صراحتاً قرآنی فرمان کے خلاف ہے۔ **حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ**۔ (اپنی نمازوں کی حفاظت کرو و خاص کر درمیانی نماز) **(إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَبْنُوتًا)**۔ (مومنوں پر نماز اوقات کی تعیین کے ساتھ فرض کی گئی ہے)۔

۲۸ امام غائبؑ کے خروج کے انتظار میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء چاروں نمازوں کو ملا کر پڑھنا ان کے نزدیک مستحب ہے۔
 (۲۹) عام یا تجارتی سفر میں پوری نماز پڑھنے کا حکم لگاتے ہیں مگر روزہ چھوڑنے سے منع کرتے ہیں حالانکہ شریعت میں نماز روزہ کا ایک ہی حکم ہے۔ (یعنی رعایت دونوں عبادتوں میں ہے) ابن ادریس، ابی یوسف اور طوسی وغیرہ نے اس فرق کی تصریح کی ہے، حالانکہ ان کی کتابوں میں ائمہ کی ایسی روایات موجود ہیں جن سے فرق نہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ معاویہ بن وہب نے ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ **أَنَّهُ قَالَ فَإِذَا قَصَدْتَ أَفْطَرْتُ وَإِذَا أَفْطَرْتُ قَصَدْتُ**۔ (میں جس حالت میں نماز قصر کرتا ہوں تو روزہ نہیں رکھتا اور جب روزہ نہیں رکھتا تو نماز میں قصر کرتا ہوں)۔

۳۰ یہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو قیام کم اور سفر زاد درپیش ہو جیسے سواری کو کرایہ پر بھلانے والا کشتیوں کے ملاح وغیرہ یا وہ تجارتی جو پیشوں اور منڈیوں کی تلاش میں ہر وقت پا برکاب رہتے ہوں ان سب کے لئے جائز ہے کہ دن کی نماز میں قصر کریں اور رات کی پوری پڑھیں، اگرچہ دوران سفر پانچ ہی دن کے قیام کی نوبت آئے چنانچہ ابن زہر، ابن سراج اور ابو جعفر طوسی نے نہایت اوجہ و بسط میں اس کے متعلق نص بیان کیا ہے۔ حالانکہ اس صورت کے خلاف ائمہ کی روایات ان کے علم میں آچکی ہیں کہ انہوں نے دن رات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ محمد بن بابویہ نے اپنی صحیح میں ایک امام کی یہ روایت بیان کی ہے۔ **قَالَ الْمَكَارِمِيُّ وَالْمَلَّاحُ إِذَا جَدَّ إِلَيْهِمَا سَفَرٌ فَلْيَقْصِدْ**۔ (کرایہ پر کام کرنے والا اور ملاح اگر ان کو سفر کی عجلت ہو تو وہ قصر کریں) عبد الملک نے بھی جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔

(۳۱) نماز جن سفر میں قصر کی جاتی ہے ان میں سفر مکہ، مدینہ، کوفہ اور کربلا کو شامل نہیں کرتے ان کے جہور کا یہی ترتیب ہے۔ (۳۲) چار مقامات کے سفر میں قصر نہ کریں، اور مختار مرقفی اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ مشاہد ائمہ کے لئے سفر کا یہی حکم ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ آیت قرآنی **فَإِذَا أَهْمْتُمُ الْمَسَاجِدَ فَسَارِعُوا إِلَيْهَا** کے خلاف ہے کہ اس میں سفر مطلق ہے اور جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ بھی تمام اسفار میں قصر کرتے تھے اور ابو محمد بن بابویہ کی جو روایت بیان ہوئی وہ بھی اطلاق پر دلالت کرتی ہے۔

۳۳ ان کے ہاں امام کی عدم موجودگی میں نماز جمعہ چھوڑ دینے کا حکم ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ**۔ (مسلمانوں جب نماز جمعہ کے لئے پکارتے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو)۔ اس آیت میں امام کی موجودگی کی کوئی قید نہیں۔

۳۴ رسم اگر کسی کا بیٹا، باپ یا بھائی مرجائے تو اس کے لئے جزیع و فزیع کرنے اور کپڑے پھاڑنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اور عورت کے لئے

تو برصیت پر ایسا کرنا جائز ہے، حالانکہ تمام شرائع میں مصیبت کے وقت صبر کی تلقین کی گئی اور رونا پیٹنا، اور دوا دینا، حرام کہا گیا ہے اور صحیح احادیث میں تو یوں آیا ہے لَيْسَ مِنَّا مَنْ حَلَقَ وَ سَلَقَ وَ خَذَقَ رَوْحِهِمْ مِنْ سَعْيِهِمْ جَوْدَ كَسِيٍّ كِى مَوْتٍ بِسَرْمَنْدَانِيٍّ، یا نوحہ کرے اور کپڑے پھاڑے اور ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَرَقَ الْحَبِيرَ وَ كَلَّمَ الْخُذَّذَ (وہ ہم میں سے نہیں جو گریبان پھاڑے یا گال پیٹے)

(۳۴) پانی میں غوطہ لگانے سے ان کے ہاں روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ روزہ توڑنے والی چیزیں کھانا پینا اور خسی فعل، بالاجماع ہیں۔ اسی لئے ان میں سے بہت سوں نے جب صبح آنا اس مسئلہ کے خلاف پائے تو روزہ نہ ٹوٹنے کے قائل ہو گئے۔

(۳۵) ایک عجیب و غریب مسئلہ ان کے ہاں یہ بھی ہے جنکو ان کی اکثریت مانتی ہے کہ لڑکے کے ساتھ خلافت وضع فطری عمل کیا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ حالانکہ ائمہ سے اس کے خلاف مروی ہے۔ اور اس بات پر تمام امت کا اجماع ہے کہ جو فعل و حرکت انزال کا موجب ہو وہ مفسد روزہ بھی ہے۔ چاہے کسی راستہ سے ہو!

(۳۶) ان میں سے بعض کے نزدیک جانور کی کھال کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس کا کھانا بھی جائز ہے بعض کہتے ہیں پتہ کھانے (مثلاً پان) سے روزہ میں خلل نہیں پڑتا۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جو چیزیں عاداتاً نہیں کھائی جاتیں ان کے کھانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اور اس کے باوجود محفوظ پر بقضا اور کفارہ دونوں بائیں واجب قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ غوطہ کے وقت اس کی ناک اور گلے میں ایک بوند پانی بھی نہ گیا ہو۔ اس افراط و تفریط کے کیا کہنے! یہ صورت تو شریعت کے مقاصد اور احکام کے اسباب و علل سے دور جا پڑنے کی ہے۔

(۳۷) ان کے نزدیک عاشورہ کے دن کا روزہ عصر تک رکھنا مستحب ہے۔ حالانکہ کسی شریعت میں بھی روزہ کے معاملہ میں دن کے ٹکڑے نہیں کئے گئے، کہ بعض وقت میں روزہ ہو اور بعض میں نہ ہو۔ یہ تو مسلمانوں کا روزہ نہ ہوا ہندوؤں کا برکت ہو گیا، کہ وہ دن میں بعض چیزیں کھانا جائز سمجھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے دن کا روزہ رکھیں۔

(۳۸) از دی الحجہ کو روزہ رکھنا ان کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، حالانکہ کسی پیغمبر یا امام نے خصوصیت کے ساتھ نہ اس دن کا روزہ رکھا نہ اس دن کے روزہ کا کوئی ثواب بیان کیا۔

(۳۹) ان کے نزدیک اعتکاف صرف ان مساجد میں جائز ہے جن میں نبی، یا وحی نے جمعہ قائم کیا ہو ان کے علاوہ دیگر مساجد میں جائز نہیں۔ یہ مسئلہ بھی قرآن مجید کے صریح خلاف ہے کہ قرآن مجید میں وَ اَنْتُمْ دَعَا كُفْرًا فِي الْمَسَاجِدِ۔ (اور تم مسجدوں میں اعتکاف کرتے ہو) آیا ہے ہاں میں ہر مسجد شامل ہے پھر اعتکاف کرنے والے کے لئے خوشبو سونگھنا، عطر لگانا بھی ان کے ہاں سخت ناجائز ہے! حالانکہ مساجد میں جانے کے لئے خوشبو لگانا بالاجماع سنت ہے! اور معتکف تو خوشبو لگانے کا زیادہ حقدار اور مستحق ہے کہ وہ مسجد میں قیام کرتا ہے جو فرشتوں کی ہنش کی جگہ سے۔ اور فرشتوں کو خوشبو سے انس اور بدبو سے وحشت و نفرت ہے۔ اور یہ بات جملہ شرائع سے ثابت ہے۔

(۴۰) زکوٰۃ کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ سونا چاندی اگر سکوں کی شکل میں نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور اگر سکوں کی شکل میں بھی ہو مگر وہ لٹج نہ رہے ہوں، دوسرے ان کی جگہ رواج پائے ہوں تو ان سکوں پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے ہاں حیلہ کی شکل بھی جائز ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چاندی سونے کا بہت سا سکہ ہو اور آخر سال تک وہ اسکی ملکیت میں بھی ہے، اگر سال ختم ہونے سے ایک دو دن پہلے بھی وہ ان سکوں کا زیور، کھلونے، برتن یا کوئی سامان آرائش بنوالے تو ان سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

ان مسائل میں اگر غور و تدبر سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ مقاصد شرع سے یہ کتنے دور جا پڑے اور نص صریح کی مخالفت پر کتنے جبری اور دلیر ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يَكْنُزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَفْقَهُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمُ عَذَابَ أَلِيمٍ
جو لوگ سونے چاندی کو جو جو جو کر رکھتے ہیں اور انکی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک اور سخت عذاب کی بشارت دیجئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا ائمہ کے کلام میں جہاں کہیں زکوٰۃ کی فرضیت کا ذکر آتا ہے وہاں سونے چاندی ہی کا نام آتا ہے۔ درہم دراز کا نام نہیں آتا۔ (اس لئے جس چیز میں بھی چاندی سونا پایا جائے گا اس پر وہ فرضیت لاگو ہوگی۔)

(۴۱) اموال تجارت پر بھی ان کے ہاں زکوٰۃ واجب نہیں، جب تک، لین دین، رد و بدل اور الٹ پھیر میں ان کی نقدی (بصورت سکم) نہ بجائے، اور ایسے مال میں بھی زکوٰۃ کو واجب نہیں کہتے جس کا کوئی عورت یا مرد مالک ہوا اور پھر اس نے اسے اپنا سرمایہ قرار دے لیا۔ اور نہ اس مال میں زکوٰۃ ہے جو کمائی کی خاطر خریدا مگر پھر اسے سرمایہ بنانے کی نیت کر لی۔ یا اس کے برعکس، حالانکہ شارع علیہ السلام کا حکم اذنی زکوٰۃ اَمْوَالِكُمْ۔ (اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو صاف ہے، اور ان مذکورہ چیزوں کے مال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔)

(۴۲) اگر کوئی نادار فقیر مستحق زکوٰۃ۔ زکوٰۃ کے پیسہ پر، قابض، مالک اور متصرف ہونے کے بعد اس پر سوا جائے تو ان کے نزدیک وہ زکوٰۃ واپس لے لینے کا حکم ہے۔ (چاہے وہ دینا چاہتا ہو) حالانکہ کسی کا مال رخصت ہونے کے بعد اس پر بھی شریعت میں جائز نہیں۔ زکوٰۃ لینے وقت اس کا مستحق ہونا شرط ہے۔ تمام عمر کے لئے یہ شرط نہیں!

(۴۳) ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اتنی رقم ہے کہ سفر حج اور آمد و رفت کے تمام اخراجات نیز اہل خانہ کے تاواپسی اخراجات بخوبی پورے ہو سکتے ہیں مگر اس کو یہ گمان ہے کہ واپس گھر آکر مزید ایک ماہ سے زائد یہ رقم پوری نہیں پڑے گی تو اس پر حج فرض نہیں۔ ابو القاسم نے شراعی میں اور دوسروں نے اس پر نفی کی ہے۔ حالانکہ شارع نے حج کو استطاعت کی شرط سے مستعد کر کے فرض فرمایا ہے اور اس کا کتب تفسیریہ کی کہ اس کا پیسہ، سفر خرچ، سواری خرچ، اور آمد و رفت کی مدت میں اس کے اہل خانہ کے خرچ کو کافی ہو سکے۔ اگر واپسی پر پیسہ ختم ہو جائے تو اس سے استطاعت میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر ہے واپس آکر ہر شخص اپنی سابقہ یا نئی معاش میں لگ جاتا ہے یہ کار نہیں بیٹھتا۔ صرف استطاعت کا رخ بدلے گا پہلے خرچ کر نیکی استطاعت میں لگا ہوا تھا۔ اب کمانے کی استطاعت میں مشغول ہو سکا۔ (۴۴) ان کے بعض کہتے ہیں کہ حج میں ستر عورت فرض نہیں ہے۔ ایام جاہلیت کی طرح برہنہ ہو کر طواف کرنے کو بھی جائز کہتے ہیں مگر یہ شرط لگاتے ہیں کہ اپنی شرمگاہ کو مٹی یا کسی چیز سے اتنا تعمیر ملے کہ کھال نظر نہ آئے گوا سکی شکل دکھتی رہے اس میں کوئی حرج نہیں (کیا نانگے ہندو جو گویوں سے سرقہ تو نہیں؟) اس طرح تو انہوں نے رسم جاہلیت کو زندہ کیا ہے، ملت حنیفہ سے اس کا کیا ربط و تعلق۔ حالانکہ قرآن مجید میں خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ (مسجد میں جاتے وقت اپنا لباس لے لو) کا صاف حکم ہے۔ اور روایات بھی اس مسئلہ کے خلاف موجود ہیں۔ اور خدا خدا کے طواف کے وقت تو ادب کا انتہا سے زیادہ لحاظ رکھنا چاہیے وہاں ننگا ہو کر خانہ خدا کی بے حرمتی اور اپنی رسوائی نہ کرے اور اہل جاہلیت کی مشابہت اختیار کر کے شیطان کی سواری نہ بنے!

اسی کے ساتھ طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ اگر احرام کی حالت میں زنا سرزد ہو جائے تو اشاعہ شریعہ کے نزدیک حج میں کوئی نقصان اور خلل نہیں ہوتا اور ننگوں میں بھی نہ ہوگا تو پھر کیا ہوگا۔ جب کوئی بے حیائی پر کمر باندھ لے تو جو چاہے کرے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان واضح اور اور صاف ہے کہ فَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْوَالِدِ فِي الْحَيَاةِ۔ (حج میں نہ جملع ہے دہکاری اور نہ رنگا فساد اور نہ اسے بڑھ کر رفت اور کیا ہوگا۔)

(۴۵) احرام کی حالت میں اگر فنکار عمدہ کیا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، اور اگر دوبارہ پھر ایسا ہی کیا تو کفارہ نہیں۔ یہ ان کا مسئلہ ہے حالانکہ دوسری مرتبہ میں تو پہلے کی نسبت قصور زیادہ ہے کہ اس میں اصرار اور ڈھٹائی کا تاثر ملتا ہے۔

اب ہم ان کے ہاں جہاد صرف پانچ اوقات کے ساتھ مخصوص ہے۔ (۱) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں۔ (۲) جناب امیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں۔ (۳) حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح سے پیشتر کے وقت۔ (۴) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہمرکابی میں۔ (۵) امام مہدی کی سرکردگی میں۔ (حضرت علی اور جناب سبطین رضی اللہ عنہما ہر ایک میں انہوں نے جیسا جہاد کیا اس کا کیچڑا آبِ اوراقِ گذشتہ میں ملاحظہ فرمایا کیلئے اب امام مہدی کے ساتھ یہ کیسا جہاد کرتے ہیں دیکھا چاہیئے)

ان مذکورہ پنج اوقات یا زمانوں کے علاوہ ان کے نزدیک جہاد عبادت تو کیا جائز بھی نہیں۔ حالانکہ جہاد سے متعلق یہ نص۔ **الْجِهَادُ مَا مَضَى**
إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (جہاد قیامت تک جاری ہے) بتواتر ثابت ہے؛ اس کے علاوہ قرآن مجید کی وہ آیات جو جہاد کی ترغیب و تائید کے لیے
وارد ہوئی ہیں ان میں کسی وقت اور زمانہ کی قید نہیں۔ بعض آیات تو ایسی ہیں جو مراحۂ اسباب پر دلالت کرتی ہیں کہ جہاد ان اوقات
خمسہ کے علاوہ بھی عبادت اور اجر عظیم کا باعث ہے۔ مثلاً **عَلَيْكُمْ** اول رضی اللہ عنہ کے رفقہ کے حق میں یہ آیت **يَا جَاهِدْ وَنُفِي سَيِّئُكَ**
لِلّٰهِ۔ (کہ وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں) اور **عَلَيْكُمْ ثَانِي** رضی اللہ عنہ کے لشکر کی شان میں یہ آیت **يَسْتَدْعُونَ إِلَى قَوْمٍ غَضَّ**

اب یہ دیکھئے کہ جب ان کے نزدیک پنج اوقات کے علاوہ جہاد فاسد ہے تو فاسد جہاد کے مال غنیمت کی تقسیم بھی شرعی لحاظ سے درست نہ ہوگی۔ تو ایسی صورت میں جو لونڈیاں کسی کے قبضہ میں ہوں گی وہ نہ انکی ملک ہوں گی اور نہ ان سے نفع اٹھانا جائز ہوگا۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے انہوں نے ایک انوکھا فتویٰ گھڑا ہے۔ صاحب رقعہ مزورہ نے اس فتویٰ کی نسبت امام صاحب الزمان کی طرف کی ہے کہ یہ لونڈیاں سب امام کی ملک ہیں۔ اور ائمہ اپنی لونڈیوں کو اپنے شیعوں کے لئے حلال سمجھتے تھے۔ گویا اس جیلہ سے گرفتار شدہ باندیاں شیعوں کے لئے حلال ہوتیں! کہتے رکیک اور دھمکیات ہیں یہ جیلہ کہ جیلہ گردوں پر زمین و آسمان سے پھونکا پڑتا ہے، اور بے حیائی اور بے باکی تو دیکھئے کہ جن فقہی کتابوں میں دین و ایمان کی باتیں موزوں ہوتی ہیں ان میں ایسی شرمناک باتیں اپنا دین و دنیا بٹا کر آہوں نے دسج کی ہیں۔

اس سلسلہ میں جب اہل سنت ان کو کہتے ہیں کہ اگر ان اوقات کے علاوہ جہاد جائز ہی نہ تھا تو خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے جہاد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ماتحتوں اصیر، مہونیوالی، خولہ بنت جحش، یامہ، پرچک، لطن سے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ میں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کثرت کیسے درست تھا۔ کہ نہ تو قبول تمہارے وہ جہاد کا وقت درست تھا، اور نہ ہی خلیفہ وقت کی تقسیم درست تھی۔ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ بروایت صحیح ثابت ہے کہ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے ان کو آزاد کر کے پھر عقد کیا تھا۔ لیکن یہ اتنا نہیں جانتے کہ مالک ہوئے بغیر آزاد کرنے کی تک ہی کیا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لہذا پہلے آپ اس کے مالک ہوئے پھر آزاد کیا، اور آزاد کرنا خود ایک تصرف ہے۔ لہذا مدعا ثابت ہوا۔

(کے ۴) ان کے نزدیک عقد نکاح یا معاملات خرید و فروخت صرف عربی زبان میں جائز ہیں کسی اور زبان میں جائز نہیں۔ حالانکہ کسی بھی شریعت دنیاوی معاملات میں لغات کا ہرگز اعتبار نہیں کیا اور نہ جناب امیر مہدی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں خراسان اور فارس کے لوگوں کو اس کی تکلیف دی کہ وہ اپنے معاملات عربی زبان میں طے کیا کریں، بلکہ نکاح اور خرید و فروخت کے معاملات جو وہ اپنی زبانوں میں طے کر رہے تھے ان کو بدستور جاری اور نافذ و جائز رکھا۔ اور یہ بات عقل میں بھی نہیں آتی کہ ان معاملات نکاح و خرید و فروخت۔ طلاق کی صحت میں عربی زبان کا کسی قسم کا دخل ہو۔ کیونکہ ان معاملات میں اصل مقصد تولد و منشا ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ عادتاً ہر قوم اپنی ہی زبان میں کرتی ہے،

(۴۸) ان کے ماں باپ کی موجودگی میں چھوٹے بچے کے مال کا مختار دادا، ہوتا اور وہی ولایت کا حق رکھتا ہے حالانکہ شرع اور عرف واولو

میں یہ طے شدہ بات ہے کہ ہر معاملہ میں ولی اقرب کے ہوتے ہوئے ولی البعک کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔
 (۴۹) ایک مسئلہ یہ ہے کہ تجارت میں مومن سے منافع لینا مکروہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ**۔ واللہ نے بیع حلال کیا، اور اللہ ان تکلیفوں کی آواز سے **عَنْ تَوَاضِعٍ مِمَّنْكُمْ**۔ مگر یہ کہ وہ تجارت تمہاری باہمی رضامندی سے ہو، اس میں مومن وغیر مومن دونوں برابر ہیں کیونکہ تجارت کی بنیاد اور خرید و فروخت کا مقصد منافع ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ہر عہد اور ہر شہر میں ساری امت کا عمل بھی سراسر اس کے خلاف ہے۔ اگر کوئی شخص دارالاسلام میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنا چاہے تو یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ تجارت کر سکے اور اس طرح ایران، حراسان، عراق، عرب اور یمن جیسے ملک تو تجارت کے فائدہ سے محروم ہوں گے۔ حالانکہ انبیاء و ائمہ نے مومنین کے درمیان تجارتی معاملات قائم کئے، اور نفع لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(۵۰) کہتے ہیں کہ یہی شدہ چیز، مرہن کا قبضہ ہونے بغیر ہی رہیں جائز ہے حالانکہ شرع میں قبضہ کو مرہن کی ضروریات اور لوازمات میں سے شمار کیا گیا ہے **فَرِهَانَ الْمُؤْتَقِفِ**۔ ارشاد ربانی ہے قبضہ کے بغیر وہ فائدہ مرتب نہیں ہوتا جو مرہن سے مقصود ہے، اس لئے کہ مرہن رکھنے والے کو مرہن شدہ رقبہ میں حمل نہیں، وہ ملک تو اس کی ہے، اس کی اجازت کے بغیر مرہن کوئی فائدہ و نفع نہیں اٹھا سکتا جو کچھ ہے یہی قبضہ تو ہے کہ جس کے ذریعہ بوقت ضرورت قرض وصول کر سکتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو مرہن کا فائدہ کیا ہے اس کے علاوہ یہ مسئلہ ائمہ کی روایات صحیحہ کے بھی خلاف ہے چنانچہ محمد بن یحییٰ نے جناب باقر و صادق رحمۃ اللہ ہر دو سے یوں روایت بیان کی ہے۔
إِنَّمَا قَالَ: لَا رَهْنُ إِلَّا مُقْبُوضًا۔ (ان دونوں نے فرمایا مرہن قبضہ کی صورت ہی میں صحیح ہے)

(۵۱) اگر کسی شخص نے کسی کی لوٹری مرہن رکھی تو ان کے نزدیک اس سے سبستری جائز ہے، حالانکہ یہ کھلا زنا ہے۔
 (۵۲) ان کے ہاں اگر کوئی اپنی حرم یعنی مملوکہ لوٹری کو جس کے بطن سے بچہ پیدا ہو چکا ہو اور جسے فقہاء کے عرف میں ام ولد کہتے ہیں کسی کے پاس مرہن رکھے تو یہ جائز ہے۔ بلکہ یہ تک جائز ہے کہ مرہن رکھنے والے کو اجازت دیدے کہ وہ اس کے آگے پیچھے جس راہ سے چاہے جنسی فعل کر سکتا ہے۔ اب اس پر کیا تبصرہ کیا جائے، اس مسئلہ میں جو قباحات ہیں یا یہ قواعد شرع کے جس قدر مخالف ہے وہ سب پر روشن ہے (حقیقت یہ ہے کہ اسے یہی فرقہ اپنے ماتھے کا جھومر بنا سکتا ہے۔

۵۳ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اپنا قرض کسی دوسرے پر اتار دے (کہ یہ ادا کرے گا، تو دوسرا اسے مانے یا دمانے پر حال میں ادائیگی قرض اس پر واجب ہے! ابو جعفر طوسی اور اس کے استاد ابن النعمان نے اس پر نفی کی ہے۔ اس حکم کا انوکھا پن یہی ہے کہ کسی شریعت میں یہ دھانڈا اور زبردستی نہیں ہے کہ ایک کا قرض دوسرے کے قبول کئے بغیر اس کے سرکھوپ دیا جائے، اگر کہیں اس مسئلہ پر عمل درآمد شروع ہو جائے تو ایسی ہڑ بونگ اور شور و شرب پر باہو کی کہ باید و شاید بر فقیر اپنے قرضداروں کو مارکیٹوں اور ساہوکاروں کے حوالہ کر جائے، اور صاحب ثروت تاجروں، ساہوکاروں کا مال کھٹے فقیروں کے قرضوں میں لٹ جائے تو کتنا عجیب تماشا ہوگا۔

(۵۴) ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے کسی کا مال چھین چھپٹ کر، یاد ہو کہ قریب سے غصب کر کے کسی کے پاس امانت رکھ دیا۔ اور پھر امانت رکھوانے والا مرگیا، تو امین امانت رکھنے والا بر واجب ہے کہ وہ اس امانت سے انکاری ہو جائے۔ حالانکہ امانت سے انکار کی اللہ تعالیٰ نے بڑی سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ غصب کا گناہ تو غاصب کے سر ہے اس امانتدار کو امانت کا انکار کس طرح جائز ہوگا جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر وہ آخرت کی جوابدہی اور پکڑ سے کس طرح بچے گا۔ اور دنیا میں اس کے لئے یہ جائز ہی کہاں ہوگا۔

(۵۵) یہ بھی ان کا مسئلہ ہے کہ اس غصب شدہ مال کا مالک ایک سال کی تلاش و جستجو کے باوجود مد مل سکے تو یہ مال فقیروں کو خیرات کر دیا جائے، حالانکہ غیر کے مال میں بغیر مالک کی اجازت خیرات کرنا شرع میں جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹاؤ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اَوِّدُوا مَانَةً إِلَىٰ مَنْ يَكْتُمُكَ وَلَا تَخْنُ وَخَانَكَ۔ (جس نے تجھے امین بنایا اس کی امانت اسے لوٹا۔ اور جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر، امین مطمئن رہی، یہی اس حدیث کی صراحتاً تبصیح بیان کی ہے۔

(۵۶) مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے کسی کا مال غصب کیا اور اپنے مال میں ملا دیا کہ دونوں کی پہچان یا علیحدگی ممکن نہ رہی، مثلاً دودھ، دہی، گھی، گیہوں، شکر اور پانی وغیرہ تو حاکم کو چاہیے کہ غاصب کا مال ملا مال اس شخص کے حوالہ کر دے جس کا مال غصب ہوا تھا سبحان اللہ! اس عدل و انصاف کے کیا کہنے! یہ تو غاصب پر حکم کھلا ظلم ہے کیونکہ جس کو غاصب کا مال دیا جا رہا ہے، اسی کا غاصب کے مال میں کیا حق پہنچتا ہے! کیونکہ اس سالے مال میں غاصب کا بھی تو مال شامل ہے۔ اور پھر ظلم کا علاج یا تدارک ظلم سے نہیں کیا جاسکتا۔

(۵۷) ایک مسئلہ ان کا یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی لونڈی کسی کے پاس رہیں رکھی اور اسکو اجازت دی کہ جب چاہے اس سے لطف اندوز ہو تو یہ جائز ہے۔ امانت رکویہ حق ہو جاتا ہے کہ خوب آزادی سے گھر سے اڑائے۔ اسی طرح اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اس لونڈی کے تمام منافع میرے لئے بحال کئے تو دوسرے شخص کے لئے اس لونڈی سے لطف اندوزی حلال طیب ہو جاتی ہے، اور ان کے ہاں شرعاً کو اس کے نام کی شرعیات تمام منافع کی اگر میں عاریتاً دینا چاہتا ہوں اور ام ولد کو بہتری کے لئے عاریتاً دینا بھی روا ہے۔ یہ تمام مسائل قرآن مجید کے احکامات کے بالکل مخالف ہیں اس لئے کہ قرآن مجید میں تو یہ فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُمِلُّوْهُنَّ حَافِظُوْنَ اِلَآءِ عَلَىٰ اَرْوَاحِهِنَّ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَمْلُوْكَاتٍ لِّكُمْ لَا تَبْغُوْا
وَرَاْعَ ذٰلِكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ۔
اور وہ لوگ جو اپنی شرعاً ہوں کی (عمرات سے) حفاظت کرتے ہیں
ہاں مگر اپنی بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں پر استعمال کرتے ہیں تو ان
پر ملامت نہیں ہے اور جو کوئی ان کے علاوہ کوئی اور صورت چاہے تو یہی
حد سے گزرنے والے ہیں۔

(۵۸) یہ کہتے ہیں ہوشیار اور سمجھدار پرچہ اپنے وارثوں سے بھٹک کر کسی کے پاس پہنچ جائے تو اسے اپنی نگرانی میں لینا اور اپنے گھر میں اس کی نگہداشت اپنے گھر میں کرنا جائز نہیں۔ (شاید اس لئے کہ ہوشیار پرچہ ان کے نزدیک بھٹک نہیں سکتا ہوگا، حالانکہ ہوشیار پرچہ بھی گم ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس کی نگرانی و حفاظت نہ کرنا اس کی ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی کم عمری کے سبب نہ نقصان رساں چیز کا دفاع کر سکتا ہے، اور نہ اپنی بقا کا منافع حاصل کر سکتا ہے، لہذا اسکو اپنی حفاظت و نگہداشت میں لینا جانوروں کی نگہداشت سے زیادہ اہم ضروری ہے۔

(۵۹) ان کے نزدیک اجارہ عربی زبان میں اس کا معاملہ کئے بغیر معتبر نہیں۔ (اجرت پر کوئی چیز لینا مثلاً سواری کے لئے کوئی گاڑی یا جانور وغیرہ، یا مثلاً رہنمائی کے لئے کوئی گائیڈ وغیرہ)

(۶۰) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ہے کہ اگر کوئی شخص کافروں سے جہاد کرنے کے لئے لشکر میں بھرتی ہو جائے یا دلو کوؤں کے قلع قمع میں پولیس و سیکوریٹی میں نوکر ہو جائے تو امام اہل ہدی کی عدم موجودگی کے سبب وہ تنخواہ کا مستحق نہیں کیونکہ امام کی غیر موجودگی کے سبب جہاد فاسد ہے صحیح نہیں ہے۔ لہذا تنخواہ کا معاوضہ بھی صحیح نہیں ہوگا۔

(۶۱) ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شیعہ نے اپنی ام ولد لونڈی کو کسی شخص کے پاس گھریلو کاموں وغیرہ کے لئے نوکر رکھا یا۔ اور اسکی شرعاً کو کسی دوسرے شخص کے لئے حلال کر دیا۔ تو اس کی گھریلو خدمات ایک شخص کے لئے ہو گئی اور جنسی خدمات دوسرے شخص کے لئے۔

(۶۲) ان کے نزدیک ہبہ عربی زبان کے بغیر درست نہیں۔ اب کوئی لاکھ بار کہے کہ میں نے تجھے یہ چیز بخشی، یا دیدی وہ ہبہ معتبر نہیں ہوگا۔

(۱۴) ان کے نزدیک اپنی زرخیز (مملوک) لونڈی کو جنسی تلامذ کے لئے کسی کو بخشنا درست ہے اور شرمگاہ عاریتاً دینا بھی جائز ہے! (۱۵) ان کے اکثر کے ہاں صدقہ واپس لے لینا جائز ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں لَا تَبْتَغُوا أَجْرًا قَاتِلًا (اپنے صدقے باطل مت کرو) کا حکم ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَلْعَائِدُ فِي صَدَقَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُوذُ فِي قَيْئِهِ دَیْنًا دِیَا ہوا صدقہ واپس لینے والا ایسا ہے جیسے کتا اپنی قے کو چاٹ لے)

(۱۶) ان کے ہاں بلی کو وقف کرنا جائز ہے۔ اب خدا جانے بلی میں وہ کونسا نفع نظر آیا یا فائدہ دیکھا کہ اس کا وقف جائز قرار دیا۔ (۱۷) ان کے ہاں کا ایک مستفق مسئلہ یہ بھی ہے کہ لونڈی کی شرمگاہ کا وقف جائز ہے، اگر وہ لونڈی کرائے پر ملے، یا کسی کے ساتھ متمتع میں جائے تو جس کے لئے وہ وقف کیگئی ہے اسکو وہ کمائی کھانا جائز ہے۔ شیر مادر کی طرح ہضم کر سکتا ہے یہ قبضہ کمری شریعت کے نام پر اس لعنتی مذہب کے سوا کسی مذہب میں کا ہے کو بیلیگی)

(۱۸) ایک مسئلہ یہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ خواہش اور ضرورت ہونیکے یا وجود نکاح نہ کرنا مستحب ہے۔ یہ مسئلہ انبیاء و اوصیاء کی سنت کے خلاف ہے۔ ان حضرات نے خود بھی نکاح کیے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا۔ انہوں نے چونکہ خواہشات کو پورا کرنے کا شیطانی طریقہ شرمگاہوں کو کرایہ پر چلا کر یا بھر کر کے یا عاریت دے کر اختراع کر لیا ہے۔ اس لئے یہ کیوں نکاح جھنجھٹ پالیں گے یا اس کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں گے۔

(۱۹) ان کا کہنا ہے جن ایام میں چاند برج عقرب میں ہو، یا تحت الشعاع، ان ایام میں نکاح مکروہ ہے۔ حالانکہ یہ امور مقاصد شرع کے خلاف ہیں جس کا مقصد رنجوم پرستی کی منع کئی ہے! یہ بات ملت خفیہ کے تو خلاف ہے البتہ صاحبین کے موافق ہے۔ (۲۰) ان کے ہاں نوبیس کی شرمگاہ لٹکی نہ پہنچ جائے خواہ وہ کتنی ہی نگڑی اور جسم دجان والی ہو اس سے صحبت حرام ہے۔ شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ اسے حرام کہہ کر مذہب کا رنگ دینا۔ انہیں کا کام ہے۔

(۲۱) یہ کہتے ہیں کہ حلال نکاح میں شرط کے طور پر زمانہ ستین میں جماع کی تعداد مقرر کرنا جائز ہے۔ مثلاً یہ کہ دن رات اتنی مرتبہ یا ایک ماہ میں اتنی مرتبہ فعل کروں کروں گا۔ اور پھر مرد پر شرط کے موافق مطالبہ و مواخذہ کا حق ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں اَللّٰهُ لَا اَشَادُ بِہٖ۔ وَلَا تَوَاعِدُ وَ اَمَّا اَنْ تَقُولُوْا فَاِنَّہٗ لَا مَعْرُوفَیْ قَادِرٌ عَلَیْہِ سَیِّئًا مَّا تُفْعَلُ (انہوں نے منکوم، مملوک، مانگی ہوئی، وقت کی ہوئی، اور امانت رکھی ہوئی، یا متمتع لونڈی کے ساتھ خلاف وضع فطری فعل کو جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن میں حیض کی حالت میں صحبت کی ممانعت ہے، اور علت ممانعت نجاست و گندگی بتائی ہے جب حیض کے راستہ کی حرمت کا باعث گندگی ہے تو پاخانہ کی گندگی و نجاست کے باعث اس کے راستہ کی حرمت کیوں نہ ہوگی۔ کہ اس کی ناپاکی تو اس راستہ کے آنتوں کے بروقت متصل رہنے اور ان میں اور ان میں نجاست کے بھرے بہنے سے زیادہ قابل حرمت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ جو شخص عورت سے غیر فطری راستہ کے ذریعہ یہ فعل کرے اس پر لعنت لعلون منی اتی امراۃ فی ذمیرہا۔ اور یہ بھی فرمایا اَتَقُوْا مَحَاشِیَ النِّسَاءِ (عورت کے غیر فطری راستہ میں مل، سے بچو) یہ وہ حدیث ہے جس پر سب کا اتفاق ہے مقدار نے بھی اس کی تصریح و تائید کی ہے۔ نیز اس حدیث میں وہ حرمت کی طرف بھی اشارہ ہے ہمشہ کے لغوی معنی بیت الخلا کہیں، تو اس لفظ کا اشارہ یہ ہے کہ یہ جگہ بھی بیت الخلا کی طرح گندی، نجس، ناپاک اور قابل احتراز ہے! اسی طرح آپ کا یہ قول بھی ہے۔ اِنَّ اَشْوَشَیْ مَحْشُوْرَہٗ وَاَسْوَسَیْ مَحْشُوْرَہٗ (اشوشت کی چیزیں ہیں، فن تشریح سے ناواقف بعض لوگوں کے زں میں یہ بات کہہ سکتی ہے کہ پیشاب بھی تو ناپاک و نجس ہے۔ اس کے راستہ کو حلال کیوں کیا گیا۔ تو سطور ذیل سے انکی تنقید ہو سکتی ہے۔ فن تشریح میں یہ بات طے شدہ ہے کہ عورت

کی جائے مخصوص بناوٹ کے لحاظ سے تین سوارخوں پر مشتمل ہے۔ اوپر کا سوارخ وہ ہے جس کا سلسلہ متناہت تک پہنچتا ہے اور اسی سوارخ سے پیشاب خارج ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرا یا ایک سوارخ اور ہے جو آنتوں سے ملا ہوا ہے جس سے کبھی کبھی ہوا خارج ہوتی ہے اور ان دونوں سے نیچے تیسرا کشادہ سوارخ ہے جنسی فعل اسی میں ہوتا ہے۔ یہ رحم سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ بچہ، اور حیض و نفاس کا خون اسی سے نکلتا ہے۔ اور یہ راستہ اسی وقت نجس و ناپاک ہوتا ہے جب حیض کا خون جاری رہتا ہے۔ اور اسی زمانہ میں جنسی فعل بھی حرام ہے، اس کے علاوہ یہ راستہ ایسا نجس نہیں رہتا کہ جنسی فعل جس وجہ سے نہ انجام دیا جاسکے۔ بخلاف پاخانہ کے مقام کے کہ اس کا راستہ ایسی آنتوں سے ملا ہوا ہے جو ہر وقت گندگی و بول و براز سے بھری رہتی ہیں، اس لئے یہ راستہ جنسی فعل کے لئے دائماً ممنوع ہے،

(۱۶۱) یہ متعہ دفریہ کو بھی جائز کہتے ہیں، ہمارے ملک اور زمانہ کے اشاعتیہ کی گو اس کے جواز کا انکار کرتے ہیں مگر ان کے حقیقین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں اس کے جواز کا ثبوت موجود ہے۔ اس متعہ کی صورت یہ ہوتی ہے، کہ ایک پوری جماعت کسی ایک عورت سے متعہ کر لیتی ہے اور ان میں سے ایک شخص اپنی باری مقرر کر لیتا ہے۔ اور اپنی باری میں اس سے جنسی فعل کرتا ہے۔ حالانکہ کسی بھی مذہب میں ایک رحم میں دو نطفوں کا جمع کرنا درست قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ آدمی کو حیوانات سے جدا اور عزیز کرنے والی چیز دراصل نسب کی حفاظت ہی ہے۔ اسی لئے نسب کی حفاظت کو بھی، ان پنج ضروری اور اہم تحقیقات میں شامل کیا گیا ہے جن کی حفاظت کا حکم ہر ملت و مذہب نے دیا ہے جو یہ ہیں، (۱) حفاظت نفس (جان)، (۲) حفاظت دین، (۳) حفاظت عقل، (۴) حفاظت نسب، (۵) حفاظت مال، یہی وجہ ہے کہ ہر شریعت میں، قصاص، جہاد، حدود قائم کرنے، نشہ اور اشیاء کو حرام ٹھہرانے، زنا کاری کا انسداد کرنے، متعہ، چوری اور عصب، ان کے متعلق بڑے سخت اور تاکیدی احکام ہیں۔ ان سب کا تعلق تحفظات خمسہ بالا سے ہے۔ وہ بالکل کھلا اور صاف ہے۔ اور متعہ کی صورت میں تحفظ نسب کی اہمیت اور ضرورت کا صاف انکار ہوتا ہے۔ پھر حیا، عفت، غیرت، عورت، اور ناموس، جو تمام ملتوں اور مذہبوں میں پسندیدہ اوصاف مانے جاتے ہیں۔ سب کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اور رُمی اور ناپسندیدہ باتوں کو شیعہ کا موعود مل جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ہوشمند متعہ کی گہرائی میں جھانکے تو اسے وہ تمام مفاسد اور برائیاں نظر آجائیں گی جو اس عقیدہ فاسد کی تہ میں پوشیدہ ہیں اور جو سب کی سب شرع کے خلاف اور حکم الہی کی ضد ہیں۔ مثلاً

الف۔ یہ فعل اولاد کو منافع بلکہ ہلاک کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص، محلہ، محلہ، یا بستی، یعنی اور ملک، ملک متعہ کرتا پھرے گا۔ تو ظاہر ہے اول تو اسے پتہ نہ چلے گا کہ اس کے نطفہ کے گل بوٹے، کہاں کہاں کھلے، پتہ چل بھی جائے تو سب کو اپنے زیر تربیت رکھ کر ان کی حفاظت کیسے کریگا اور ان کو یہ کیسے یقین ہوگا کہ وہ اس کی اولاد ہے، لامحالہ ایسے بچے آوارہ گردوں کی طرح پلے پڑیں گے۔ اور اس کے لئے ان کی غور و پرداخت کے لئے ان تک پہنچنا ناممکن ہوگا۔ ایسے حالات میں، ان کے فیضان اور ہلاکت میں کیا شبہ رہا۔ اور اگر وہ بچہ لوکی ہوئی تو اور بھی رسوائی کا باعث ہوگا۔ ان کے لئے بہتقوم اور ہم نسل اور ہم کوشش و سرملنا تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

ب۔ متعہ کی صورت میں باپ یا بیٹے کی متوعہ سے ہمبستری کا واقعہ خارج از امکان نہیں۔ بلکہ خطرہ تو اس بات کا بھی ہے کہ بیٹی، پوتی، نواسی، بہن، بھانجی، اس راستہ میں نہ ٹکرا جائیں۔ جو سب کی سب محرمات میں سے ہیں اور ایسا ہونا ناممکنات میں سے نہیں خصوصاً ایک طویل مدت گزرنے کے بعد، اس لئے کہ ایک آدھ ماہ تک تو حمل قرار پا جائے گا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور پھر اگر متعہ دوران سفر ہو، اور سفر بھی طویل ہو، ہر منزل پر ایک متعہ ہو، اور بہتہ میں نطفہ قرار پائے اور ان سے لوکی پیدا ہوں۔ اور دس، پندرہ، بیس سال، بعد یہی شخص یا اس کا بیٹا یا بھائی انہیں منزلوں میں سفر پر نکلیں، تو ہو سکتا۔ یہیں محرمات میں سے کسی سے مذہب ٹھہر جائے، اور وہ متعہ یا نکاح کرے!

رج۔ جس نے بہت سے متعہ کئے ہوں گے اس کی میراث کی تقسیم ناقابل عمل ہوگی، کیونکہ یہی پتہ نہ ہوگا کہ کون کون وارث ہیں اور وہ کہاں کہاں ہیں اور جب تک یہ معلوم نہ ہوگا وارث کا معاملہ نفاذ سے رکا رہے گا۔

د۔ اسی طرح متعہ سے پیدا ہونے والی اولاد کی میراث بھی تقسیم نہیں ہو سکے گی کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ اس کے باپ، یا بھائی، کون کون کہاں کہاں ہیں۔ اور جب تک تمام ورثا کی تعداد کا پتہ نہ لگے میراث کیسے تقسیم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ان ورثا کی جنس کا حال ہے کہ کون عورت ہے۔ کون مرد، اور کون میراث کے سلسلہ میں ایک دوسرے کا حاجب ہے یا ایک دوسرے کو کون محرم کرتا ہے۔ یہ ساری تفصیلات جب تک معلوم نہ ہوگی وارثوں کے حصے مقرر نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ متعہ کے حلال ہونے کی صورت میں نظام شریعت خصوصاً نکاح اور میراث کے معاملات ساگر میں بہم ہو جائیں اس کی پوری تفصیل جاننے کے خواہشمند حضرات فوائد القلوب مطالعہ فرمائیں جو اہل سنت کے ایک محقق عالم کی تصنیف ہے! اور نوٹریوں یا اہبات الاولاد کے حلال کر دینے میں متعہ سے بھی زیادہ خرابیاں لازم آتی ہیں اور یوں ان کے حلال کرنے سے پوری نوع انسانی میں عظیم فساد برپا ہو جاتا ہے، اور اسی فساد کی پیش بندی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکم میں جماع حلال کے صرف دو طریقے مقرر فرمائے، ایک علی الاعلان، بموجودگی گواہان نکاح صحیح دوسرے ملک میں کی شکل! یعنی شرعی طریقہ سے ملوکہ نوٹری کہ ان دونوں طریقوں اور عقدوں سے عورت کا کسی مرد سے خصوصی تعلق ورشتہ قائم ہو جاتا ہے، اور اس کی نگرانی اور حفاظت میں ہوتی ہے، اولاد اور وارثوں کا مناسب دیکھ بھال، حفاظت و نگہداشت عمل میں آتی ہے چنانچہ اسی مضمون کو تاکید کے ساتھ دوسو نوٹوں میں ذکر فرمایا ہے۔

یعنی سورہ مومنون اور سورہ معارج میں، ارشاد ہے۔ لَا تَحِلُّ اَزْوَاجَهُمْ اَوْ مَا صَلَّكْتُ اَيْمَانُهُمْ۔ اور دونوں جگہ ان آیات کے آخر میں یہ ٹکڑا بھی جوڑا ہے۔ فَمَنْ ابْتَغَىٰ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُونَ۔ اور ظاہر بات ہے کہ مَتَّوَعٌ عَوْرَتٌ نہ تو یہی ہے ورنہ

اس کے لئے لازم زوجیت، میراث، طلاق، عدت، نان و نفقہ سب واجب ہوتے، اور نہ ہی ایسی عورت ملک میں داخل ہے ورنہ خرید و فروخت، ہبہ، اور عتاقی ازاؤ کرنے کے احکام اس پر لاگو ہوتے اور اس کا اقرار تو خود شیعہ کرتے ہیں کہ متعہ کی صورت میں ماہین عورت و مرد زوجیت کے تعلقات و احکامات متحقق نہیں۔ ابن بابویہ کی کتاب اعتقادات میں واضح طور پر یہ لکھا موجود ہے کہ بہانے

نزدیک عورت کے حلال ہونے کے صرف چار اسباب ہیں۔ نکاح، ملک میں، متعہ، تحلیل، اور اللہ تعالیٰ نے بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ کئی بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو، یا اپنی خواہشات ان نوٹریوں سے پوری کرو جو بہانے

ملک ہیں، قاعدہ ہے کہ بیان صریح کے مقام پر سکوت ہو تو وہ حصر کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں یہ مقام چاہتا تھا کہ ان تمام صورتوں کا ذکر ہو جاتا۔ جس میں عدل و انصاف واجب نہیں۔ مگر سکوت بتاتا ہے کہ حلال صورتیں بس دو ہی ہیں، اور عدل کا تعلق صرف نکاحی بیویوں سے ہے۔ اگر حصر مقصود نہ ہوتا تو متعہ اور تحلیل کا بیان سب سے پہلے ہوتا۔ کیونکہ نکاح اور ملک میں تو کچھ نہ کچھ حقوق قائم و واجب

ہوتے ہیں جن کے ترک سے ظلم متصور ہے، بخلاف متعہ کے کہ اس میں تو اجرت مقررہ کے کچھ اور واجب ہی نہیں ہوتا۔ رہا تحلیل تو وہ علوہ بے درودہ ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ حلال کرنے والے کا احساس نہ ہوا پڑتا ہے، اس کے سوا واجب کچھ ہوتا ہی نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا

وَلَيْسَ تَعْفِیَ الدِّیْنُ لَا یَحِلُّ ذٰلَکَ اَحٰقُّ یَغْنِیْہُمُ اللّٰہُ اور جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے انہیں چاہیئے کہ وہ پاکدامن رہیں تا

انکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں صاحب استطاعت کر دے!

اگر متعہ اور تحلیل جائز ہوتے تو اللہ تعالیٰ عفت و پاکدامنی کا حکم کیوں دیتا۔ یہ حکم تو اسی لئے دیا کہ وہ حلال راستوں کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، اور صرف وہی راستے تھے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ وَلَا اَنْ يَكُنْ مِنَ الْمُحْضَنَاتِ
الْمُحْضَنَاتِ قَدِمْنَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ - اَلِی قَوْلِهِ -
ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تُضَرُّوا وَخُیَّرَ
لَكُمْ۔

اور جس میں یہ استطاعت نہ ہو کہ وہ پاکدامن مؤمن عورت سے شادی
کے لئے توپانی مملوکہ کو بیٹھنے سے نکاح کرے اور یہ ایسے شخص کے لئے ہے کہ
جنہا میں مبتلا ہونے کا ڈر رکھتا ہو۔ اور اگر مہر کو سکوت تو یہ تمہارے
لئے بہتر ہے۔

اگر استدلال و تحلیل جائز ہوئے تو لوٹنے والوں کے نکاح میں ڈر خوف اور مہر کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو کہتے ہیں کہ آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ
مِنْهُنَّ فَاُولَٰئِهِنَّ اَجُورٌ مِّمَّنْ لَیْسَ لَكُمْ فِیْہِنَّ۔ پس تم نے ان سے جو فائدہ اٹھایا ہے تو اب ان کو ان کا مہر بطور فرض کے ادا کرو۔

متعہ کے بارے میں نازل ہوئی، غلط ہے اسکی روایت بحوالہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یاد دوسرے صحابہ سے کہ ناکمل کھلا جھوٹا اور فاسد
ہے۔ گوکہ بعض غیر معتبر تفسیر اہل سنت میں یہ روایت نقل کی گئی ہے مگر چونکہ یہ بات نظم قرآن کے خلاف ہے۔ اور جو تفسیر بھی نظم قرآنی
کے خلاف ہو وہ اگرچہ صحابی سے مروی ہو سننے اور قبول کرنے کے لائق نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اول محرمات کا بیان حُدُودِ مَا کَانَ
اَمْتًا لَّكُمْ رَتَبًا رِی مَیْنِ تَمْ حَرَامِ کِی گئیں، سے اَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تک کیا۔ پھر فرمایا اَحْلِلْ لَكُمْ مَا کَانَ اَعْرَ ذِ لَکُمْ رَانَ مَحْرَمَاتِ
سوا تمہارے لئے حلال کی گئیں، مگر ان شرائط کے ساتھ کہ اَنْ تَبْتَغُوا بِاَمْوَالِکُمْ دَہْرَ وَاَنْ تَفْقَہَ فِیْ اَیْمَانِکُمْ دَہْرَ وَاَنْ تَفْقَہَ فِیْ اَیْمَانِکُمْ دَہْرَ وَاَنْ تَفْقَہَ فِیْ اَیْمَانِکُمْ دَہْرَ
سے تحلیل فروج دیا مانگے میں دینا دونوں صورتیں غلط اور باطل ہو گئیں اس لئے کہ یہ تو مفت کا سودا ہے۔ نہ ہلری لگے نہ پھلری!

پھر آگے فرمایا غُفْیَئِیْ غُفْیَئِیْ غُفْیَئِیْ۔ ان کو اپنے لئے مخصوص کر لو، دوسرے سے ربط ضبط پیدا نہ کریں اسکی نگہداشت رکھو یہ نہیں
کہ شہوت رانی کا تقاضا پورا کرنا اور کر واپائی کا لانا مقصود ہو! تو اس شرط سے متعہ بھی باطل ہو گیا کیونکہ متعہ میں احتیاط و اختصاص قطعاً
منظور نہیں ہوتا کیونکہ متعہ والی عورت تو کسی ایک کی ہو کر رہتی ہی نہیں۔ آج اس کی بغل میں توکل کسی دوسرے کی! پھر نکاح کے حلال
ہونے پر بنا رکھتے ہوئے فرماتے ہیں فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ اَجُورٌ مِّمَّنْ لَیْسَ لَكُمْ فِیْہِنَّ۔ آج اس کی بغل میں توکل کسی دوسرے کی! پھر نکاح کے حلال
اب تم پر پورا مہر لازم آگیا۔ اگر صحبت نہ ہوتی تو نصف مہر لازم ہوتا۔

اب اس نظم قرآنی کے خلاف اس آیت کو پہلی عبارت سے کاٹ دینا اور ابتدائے کلام پر محمول کرنا یا اعتبار رعیت قطعاً و مری غلط و باطل
ہے۔ حرف فاء قطع اور ابتدائے کلام سے مانع ہوتی ہے۔ وہ تو پہلے کلام آگے کلام سے ربط قائم کرنے کے لئے لائی جاتی ہے، یہ ایک روایت
کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت میں مِنْهُنَّ کے بعد اِلَیْ اَجُورٌ مِّمَّنْ کا اضافہ کر کے پڑھتے تھے، تو اس میں پہلی بات
تو یہ کہ اس روایت کی صحت میں ہی کلام ہے کسی معتبر کتاب میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر روایت ثابت بھی ہو تو یہ قرأت منسوخہ
ہوگی اور احکام کے ثبوت میں قرأت منسوخہ کام نہیں دیتی کیونکہ منسوخ ہونے کے بعد وہ قرآن ربی نہ حدیث! خاص کر اس صورت
میں جبکہ اس کے صریح مخالف دوسری آیات موجود ہوں۔ اور اگر سب باتوں کو نظر انداز کر کے مان لیں تو بھی یہ روایت متعہ پر ولادت
نہیں کرتی اس لئے کہ الی اَجُورٌ مِّمَّنْ، استمتاع سے متعلق ہے عقد سے نہیں! اور متعہ میں مدت کا تعین نفس عقد سے ہوتا ہے،

استمتاع کے ساتھ نہیں۔ تو گویا پھر معنے یوں ہونگے کہ پس اگر اپنی منکوحہ عورتوں سے ایک مدت معین تک لطف اندوز ہو لیں
تو تمام مہر ادا کریں، اس قید کے بڑھانے کا اسوقت یہ مطلب ہو گا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ جب نکاح کی تمام مدت گزر جائے
گی جب مہر واجب ہو گا۔ جب کہ رواج اور عرف میں یہ مشہور ہے کہ ایک تنہا مہر معجل دہر وقت ادائیگی کے قابل رکھتے ہیں اور وہ
تنہا کی موصول تا بقائے نکاح، یہ تاخیر عورت کی تصرف و اختیار سے حاصل ہوتی ہے ورنہ شریعت کے لحاظ سے تو ایک مرتبہ کی صحبت
کے بعد عورت کو مہر کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، اگر الی اَجُورٌ مِّمَّنْ کی قید کو عقد سے متعلق مانینگے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ شیعوں کے

نزدیک جتنی مدت العتر تک درست نہ ہو، حالانکہ یہ شیعوں کے اجماع سے درست ہے! اور آیت وَمَنْ لَّمْ يَسْتِطِعْ مِنْكُمْ شَاكٍ یا بھی نکاح ہی ہے۔ یعنی اگر اتنی مالی استطاعت نہ رکھے یوں کہ آزاد عورتوں کا ہر اور نان و نفقہ برداشت کر سکیں تو اپنی ہم مذہب لونڈی سے نکاح کر لیں، اب مسلسل و مربوط کلام کو پیچ سے کاٹ کر درمیانی عبارت کو متعہ پر محمول کرنا تو کلام اللہ کی کھلی تحریر ہے، اور اگر آیت کے سیاق پر غور کیا جائے تو اس سے متعہ کی حرمت صاف معلوم ہو جائیگی۔ اس لئے کہ آیت میں لونڈی کے نکاح میں اکتفا کی ہے اگر اگلے کلام میں متعہ کو حلال کرنا ہوتا تو پھر وہ لَمْ يَسْتِطِعْ مِنْكُمْ شَاكٍ کیوں فرمایا جاتا کیونکہ آزاد عورتوں کے نکاح پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں، متعہ کی وجہ سے جنسی خواہش پورا کر لینے میں روکاؤں ہی کیا تھی، بلکہ وہ تو ہر نئی چیز نئی لذت دیتی ہے، اس کے مصداق یہ صورت تو بہتر اور خوب تر تھی۔ پھر لونڈیوں سے نکاح کو اس قید و پابندی کے ساتھ حلال کرنے کی کیا ضرورت تھی!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پانچ مذکورہ بالا آیات قرآنی متعہ کی حرمت پر صاف اور واضح دلالت کرتی ہیں، اور ایک آیت جسے شیعہ اپنے خیال و گمان کے مطابق متعہ کے حلال ہونے کی دلیل بناتے ہیں سطور بالا میں اسکی حالت بھی واضح ہو گئی۔ کہ درحقیقت معاملہ اٹھا ہے۔ پھر ایک بات ذہنی رہنی چاہیے کہ اس معاملہ میں شیعوں کا رخ استدلال ہے جبکہ مخالف کا انکار! اور منکر کے لئے احتمال و شک ہی کافی ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ اس کا خیال ظاہر اور سمجھ میں آنے والا بھی ہو۔

رہا استدلال تو اگر اسے احتمال و شک کی ہوا بھی لگ جائے تو اسے نامعتبر اور باطل کر دیتی ہے چہ جائیکہ وہ قوی اور غالب سمجھا جائے۔ (۷۲) رضاع کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ بچہ پندرہ مرتبہ پے درپے بلافاصلہ دودھ پئے تو حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ پے درپے نہ ہو تو حرمت ثابت نہیں۔ حالانکہ شریعت میں اجزاء دس مرتبہ کا جو حکم تھا وہ بھی اجماع امت سے منسوخ ہو گیا، پانچ کی مزید تعداد اور پے درپے کی قید دوسرے سے بھی ہی نہیں، یہ اسی فرقہ کا گھڑا ہوا اضافہ ہے اور فسوخ شدہ حکم کو باقی رکھنا اپنی طرف سے شریعت بنانا ہے۔ اور حکم الہی کی مخالفت ہے، حالانکہ یہ خود ہی اپنے ائمہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ”مدت رضاع میں مطلقاً دودھ پینا حرمت کا سبب ہے خواہ دس مرتبہ ہو خواہ اس سے کم“ جبکہ یہ اعتقاد کا مقام ہے، اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ احتیاطاً زیادہ مالی صورت پر عمل کرنا چاہیئے۔ حرمت نکاح کا معاملہ ہے برأت ذمہ یقینی طور پر ثابت ہونی چاہیئے چنانچہ ان کے شیخ مقلد نے کنز العرفان میں کفارہ کی بحث کے تحت اس بات کی تصریح کی ہے کہ اس صورت میں زیادہ احتیاط والی جانب پر عمل کرنا واجب ہے۔

(۷۳) ایک مسئلہ ان کے ہاں یہ ہے کہ طلاق عری زہان کے علاوہ کسی اور زبان میں دینے سے واقع نہیں ہوتا یہ ایسا ظاہر البطلان مسئلہ ہے کہ محتاج بحث ہی نہیں! لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ”أَنْتَ مُطْلَقَةٌ“ (تجھ کو طلاق دی گئی ہے، یا أَنْتَ طَالِقٌ“ (تجھے طلاق ہے، تو بھی ان کے نزدیک طلاق نہیں ہوتی جب تک حلف فک (میں تجھ کو طلاق دی) کہے۔ حالانکہ شریعت نے ان دونوں صیغوں کو بھی طلاق شمار کیا ہے، اس میں شاید شبہ نکالیں کہ یہ دونوں صیغے وضع اصلی کے لحاظ سے اخبار (خبر دینے) کے لئے ہیں، تو طاعتک۔ بھی ایسا ہی ہے۔ بلکہ ان معاملات میں انشائی صیغے کسی ترکیب میں وضع ہی نہیں ہوتے۔ ہر حکم ہی اخباری الفاظ کام میں آنے میں مثلاً أَنْتَ حُرٌّ، یا أَنْتَ عَقِيقٌ (تو آزاد ہے) اور پھر یہ خود بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے سے پوچھے ”هل طلقك فلانہ“ کیا تو نے فلان کو طلاق دی، اور وہ جواب میں نعم (ہاں) کہے تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے حالانکہ یہاں تو صاف طور پر اخبار ہی مراد ہے۔ انشاء نہیں۔ وردہ استغناء کے جواب میں یہ کیسے استعمال ہوتا کیونکہ انشاء سے استغناء کا جواب نہیں ہوتا۔

(۷۴) یہ کہتے ہیں کہ گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی جس طرح نکاح نہیں ہوتا۔ حالانکہ شریعت نے بوقت طلاق گواہوں کی موجودگی کو لازم اور ضروری قرار نہیں دیا۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لیکر ائمہ کے زمانہ تک پوری امت کا اسی پر عمل

رہا کہ بروقت طلاق کبھی گواہوں کی تلاش نہ کی گئی، اور ان کی موجودگی کو مزوری نہیں سمجھا گیا، البتہ طلاق رجعی اور مطلق طلاق کے وقت دو گواہوں کی موجودگی کو مستحب سمجھا گیا اور وہ بھی رفع نزاع کی خاطر کہ اس کا موقع نہ آ سکے! اس لئے کہ نہیں کہ نکاح کی طرح دو گواہوں کے بغیر طلاق اور رجعت صحیح نہ ہو۔ اور نکاح و طلاق جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ نکاح میں اعلان اس لئے مزوری ہے کہ زنا سے امتیاز پیدا ہو اور کسی کو شک کی گنجائش نہ رہے۔ اور اعلان کی کم سے کم حد دو گواہ مقرر کی گئی۔ بخلاف طلاق کے کہ اس میں نہ کسی چیز سے تمیز دینے کی ضرورت ہے نہ اس میں کسی قسم کی تہمت کا خدشہ! اس لئے اعلان کی بھی ضرورت نہیں۔ ترک صحبت و جماع ہی کو تو طلاق کہتے ہیں اس میں تہمت کی کون سی بات ہے۔ پس طلاق کا معاملہ بھی خرید و فروخت، اجارہ، اور دوسرے معاملات کا سا ہے، اگر نہ احتیاط کہ کوئی فرق معاملہ سے ٹکر نہ جائے گواہ کر لیں تو کوئی حرج بھی نہیں کہ کل گواہوں کے مقدمہ وغیرہ کی نوبت آجائے تو گواہ گواہی دے سکیں۔ اور عدالت میں عقد و معاملہ کا اثبات ہو سکے۔ ورنہ بطور شرط مزوری نہیں!

(۷۵) اگر شوہر موجود ہو تو ان کے ہاں کذبات سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ شوہر کی حاضری و عدم حاضری کی قیاساً خلاف شرع ہے کیونکہ شرع میں شوہر کی حاضری و عدم حاضری کا تعلق طلاق نہ ہونے میں سرگزر نہیں کیا گیا۔ یہ فرق پیدا کر کے اپنی طرف سے انہوں نے نئی شرعی بنائی ہے،

(۷۶) مقطوع الذکر، موجودہ شخصیتیں، شخص نے اگر کسی عورت سے شادی کر لی اور خلوت صحیح کے بعد اسکو طلاق دے دی تو ان کے ہاں ایسی مطلقہ کی عدت نہیں ہے۔ حالانکہ یہ خود اس شخص سے ثبوت نسب کے قائل ہیں کہ اگر اس عورت کے کوئی بچہ ہو جائے تو ان کے نزدیک وہ مقطوع الذکر کا بیوہ کا جبکہ نطفہ قرار پانے کا احتمال ثابت ہو گیا۔ تو اس صورت میں عدت کیوں واجب نہیں ہوگی؟ کیونکہ عدت تو ہے ہی نطفہ قرار پانے کی معلومات کے لئے۔ نہ کہ نسب مخلوط نہ ہو۔ اور طبی قواعد سے ایسے شخص سے نطفہ قرار پانے کا امکان ثابت اور صحیح ہے، اسوجہ سے کہ محل منی تو شخصیتیں ہیں اور وہ صحیح و سالم ہیں۔ اس لئے باہمی رگڑ سے اخراج منی کا احتمال ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ رگڑ کے وقت منی مرد کے سوراخ سے نکل کر عورت کے رحم کے منہ میں پہنچ جائے اور وہ اسے جذب کرے اور اسی سے بچہ پیدا ہو جائے! بخلاف اس صورت کے کہ اگر شخصیتیں کٹے ہوئے ہوں تو تولید منی کا امکان ہی نہیں، گو عضو مخصوص صحیح و سالم ہو۔

(۷۷) اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اذیت دینے اور ضرر پہنچانے کی عرصت سے جنسی فعل ترک کر دے تو ظہار ان کے نزدیک واقع نہیں ہوتا۔ حالانکہ شارع کا مقصد تو ظہار کا کفارہ واجب کرنے سے ہے یہی کہ ایذا و ضرر رسانی کا دروازہ بند کیا جائے۔ لہذا ضرر پہنچانے کے وقت بھی کچھ واجب نہ ہو تو شارع کے مقصود کے خلاف لازم آتا ہے۔ اور پھر ایسا سمجھنا، نص کتاب اللہ، احادیث رسول اللہ اور آثار ائمہ سے بھی ٹکرتا ہے۔ کیونکہ ان میں ایسی کوئی قید نہیں۔ اور یہ ساری روایات ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں۔

(۷۸) یہ کہتے ہیں کہ ظہار کرنے والا اگر کفارہ کی ادائیگی سے قاصر ہو اور اظہارہ روزے رکھے تو اس کے لئے کافی یہ ہے اس مسئلہ کا کوئی تعلق نہ اللہ کی کتاب سے ہے اور نہ ہی شرع میں اس کی کوئی اصل و بنیاد ہے بلکہ نص قرآنی تو اس کے خلاف ہے۔ اس لئے ظاہر ہے یہ تو خود دین گھڑتا ہے!

(۷۹) یہ لعان (زنا کی تہمت لگانا) میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ بیوی مغفول بہا ہو، حالانکہ زنا کی تہمت میں جو عار و شرمندگی داخل بہا کو ہوتی ہے، غیر مغفول بہا، کو اتنی نہیں ہوتی۔ اور لعان ہوتا ہی اس تہمت کی شرمندگی دور کرنے کے لئے، علاوہ ازیں یہ بات قرآنی نص کے بھی خلاف ہے قرآن مجید میں ہے۔ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ قَوْلَهُمْ يَكُنْ لَكُمْ شَهِدًا أَوْ لَا فَذُنُ اللَّهِ أَوْ لَا فَذُنُ اللَّهِ

(جولوگ) اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور سوائے اپنے آپ کے اور کوئی گواہ نہیں، تو اس میں تو مدعوں پہا کی کوئی قید نہیں۔ اس فرقہ کے ایسے ہی المٹے پٹے اور دھامی بتاھی مسائل و احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جب اور جہاں مقاصد شریعت کو سمجھنے اور اس کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر ہے، تو ان خود اپنی عقل ناقص و تار سارے غلط سلط مسائل تراش لیتے۔

(۸۰) کہتے ہیں کہ لفظ عتق سے بھی عتق واقع نہیں ہوتا۔ (عتق بمعنی غلام کا آزاد کرنا، اس حکم کو منسوخ کرنے کے علاوہ کیا کہا جائے۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ فک س قبلہ سے بھی غلام آزاد نہیں ہوتا، حالانکہ قرآن مجید میں چند جگہ فک رقبہ سے عتق کو تعبیر کیا گیا ہے گویا اس کی حقیقت شرعی بھی یہی قرار پائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے فک رقبۃً أو اطعاماً فی یومیر غلام آزاد کرنا، یا دن میں کھانا کھانا، (۸۱) کہتے ہیں لوٹڈی غلام اگر اثنا عشری نہ ہوں تو ان کا عتق صحیح نہیں! کتاب و سنت میں تو اس کی کوئی اصل نہیں۔ اور آخر کی روایات ماسبق کی رو سے بھی یہ غلط ہے کیونکہ ان کی رو سے اہل سنت کا ایمان بھی صحیح ہے اور نجات کی بشارت دینے والا بھی، اب کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو ان کا تعصب اور بغض ہی ہو سکتا ہے۔

(۸۲) ایک مسئلہ یہ ہے کہ غلام اگر جدام کی بیماری میں مبتلا ہو جائے، یا اندھا، یا پا بج ہو جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، مالک کے ائمہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ حالانکہ یہ قاعدہ شرعیہ کے خلاف ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ناقص یا عیب دار مالک کی اجازت و ارادہ کے بغیر اس کی ملک سے نکل جائے۔ پھر یہ مقاصد شریعہ کے بھی خلاف ہے کیونکہ اعتاق غلام کے نفع کی خاطر ہوتا ہے، اور صورت بالا میں تو اس کی آزادی اس کی بر بادی اور ہلاکت کے مترادف ہوگی، اس لئے کہ ان جسمانی عوارض کی وجہ سے تو وہ کسب معاش اور تلاش روزگار کے قابل نہیں رہا۔ اور کھانا کھانا جو مالک کے ذمہ تھا، اب اس کے ذمہ آ پڑا۔ اب ایسی حالت میں وہ پچا او کہاں جائے اور کیا کریگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا نفع یہ ہے کہ وہ خدمت سے چھوٹ گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی معذرت اور لا چاری کی حالت میں مالک کو خدمت لینے کا حق ہی کہاں پہنچتا ہے۔ روٹی کھڑا تو اس کی ملک کا معاونہ ہے۔ یہ خدمت کا بدلہ نہیں ہے۔ بہت سے لوٹڈی غلام دائمی امراض یا کسی اور عارضہ کی بنا پر خدمت سے تھک بھی تو جاتے ہیں یا یہ حکم نوکر و مزدور پر تو لاگو ہو سکتا ہے کہ جب تک وہ خدمت انجام نہ دے اسکو مزدوری اور تنخواہ نہیں دیتے جب کام سے رہ جاتا ہے موقوف کر دیتے ہیں تو یہ حکم غلام پر چسپاں نہیں ہوتا۔

۸۳ کہتے ہیں کہ لوٹڈی کے پیٹ سے آقا کا نطفہ گر جائے تو وہ ام ولد ہو جاتی ہے، یہ عجیب مسئلہ ہے کیونکہ اس صورت میں تو ہر لوٹڈی جس کے ساتھ ہمبستری کی گئی ہو ام ولد بن جائے گی۔ کیونکہ جو عورتیں حمل اور بچہ کی تولید نہ چاہیں وہ محبت کے بعد نطفہ گرا دیتی ہیں اور یہ بات تجربہ کی ہے کہ رحم میں تو بغیر تولید ہی نطفہ ٹپکتا ہے باقی گرجاتا ہے۔ یہ اتنا نہیں جانتے کہ نطفہ کا ٹپکنا اگر دلیل بن سکتا ہے تو اس بات کی کہ نطفہ نے رحم میں قرار نہیں پکڑا۔ اور جب نطفہ ہی رحم میں نہیں ٹھہرا تو وہ لوٹڈی ام ولد کیسے ہو گئی۔ اس کا ام ولد ہونا تو رحم میں نطفہ کے قرار پکڑنے پر ہے۔ ورنہ صرف قرار پکڑنے پر بلکہ اس کی پوری خلقت پر اگر کسی کے پاس کسی چیز کا کوئی جز ہے تو نہیں کہے سکتے کہ اس کے پاس پوری چیز ہے۔

(۸۴) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ اگر کسی نے کسی کے پاس اپنی لوٹڈی گروی رکھ دی اور اس نے اس کے ساتھ جنسی فعل کیا اور اس کے ہاں لوط کا پیدا ہو گیا تو وہ لوٹڈی منہن کی ام ولد ہو گئی۔ حالانکہ مرتبین کا فعل تو صاف نہ تھا کہ اسے نہ حق مالکیت حاصل تھا، نہ حق تحلیل۔ اور تحلیل کا حق یہ تو بھی یہ حق اسے ام ولد نہیں بناتا۔ جسے یہ فرقہ بھی تسلیم کرتا ہے،

(۸۵) یہ کہتے ہیں کہ ایسے نفل پر جو نہ واجب ہو اور نہ اس سے کوئی فعل قبیح ترک کرنا منظور ہو بیٹے کی قسم باپ کی اجازت کے بغیر اور

ہوئی کی شوہر کی اجازت کے بغیر منعقد نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ بھی قرآنی احکام کے صریح خلاف ہے، کہ ان آیات میں اس قید کا کلمہ ذکر نہیں۔ مثلاً: **وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ** لیکن وہ تمہاری پکی قسموں پر مواخذہ کر لگا تاں تورات میں یہ ذکر ہے کہ مسیوی کی نذر خاوند کی اجازت کے بغیر اور چھوٹے بچے کی نذر بغیر باپ کی اجازت کے منعقد نہیں ہوتی،

اس حکم کے متعلق یہ بھی پتہ نہیں کہ تحریم شدہ ہے یا غیر تحریم شدہ! اگر اصلی بھی ہو تو بالغ و نابالغ کے مابین، نذر و نیاز میں بہت بڑا فرق ہے۔ لیکن جب قرآن مجید پچھلی آسمانی کتابوں کا نسخہ ہے تو قرآن کے خلاف تورات سے دلیل لانا یہودیت کے سوا اور کیا ہے! اس فرق کے نزدیک تو عورت کی نفل نذر بھی شوہر کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے جو اطلاق قرآن کے مخالف ہے۔ قرآن مجید میں **وَلْيُؤْتُوا ذُرِّيَّتَهُمْ** راہی نذریں پوری کرو، اور **يُؤْتُوا نَفْسًا تَحْتَ رِثَتِهِمْ** راہی نذریں پوری کرتے ہیں، فرمایا ہے۔ اور اس میں کوئی کہیں قید و شرط نہیں۔

(۸۷) ایک مسئلہ یہ ہے کہ پاپادہ حج کی نذر مانی تو یہ نذر ساقط ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ان کی یہ بات بھی نص قرآنی کے خلاف ہے۔ (۸۸) غلہ کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ دل کے ارادے سے لازم ہو جاتی ہے، چاہے نذر کے الفاظ ظاہر و پوشیدہ زبان سے ادا نہ کیے جائیں اس کا نام انہوں نے نذر ضمیر رکھا ہے، حالانکہ شریعت میں وہ امور جو احوال سے رکھتے ہوں ولی ارادہ سے لازم نہیں ہوتے، مثلاً مین، نکاح، طلاق، عقیق، رجعت، بیح، اجارہ، سبہ، اور صدقہ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں متفق علیہ صحیح حدیث بھی موجود ہے۔ **إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ عَنْ مَسْئَةِ صَدَقَةٍ بِهٖ سُدَّتْ فُؤَادَهَا مَا كَسَتْ بِهٖ أَوْ تَكَلَّمَ بِهٖ** شکر اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان دوسو سو سے درگزر فرمائی جو ان کے سینوں میں کھینچتے رہتے ہیں تا آنکہ وہ ان پر عمل نہ کر لیں یا زبان پر نہ لے آئیں۔

(۸۸) یہ مسئلہ بھی ان کے مان ہے کہ حدود میں قاضی کا حکم نافذ نہیں ہوتا، اس کے نفاذ کے لئے امام معصوم، ہونا چاہیے، لہذا امام کی غیر موجودگی میں، یا امام کا تسلط نہ ہونے کی صورت میں۔ جیسا کہ اکثر اوقات یا پورا زمانہ ایسا ہی گذرا کسی امام کا تعلق قائم نہ ہو سکا۔ حدود کا ناقابل نفاذ رہ جانا لازم کیا۔ اور اگر امام معصوم ہو بھی تو وہ سرمن رائے کر بلائے معلیٰ اور نفع اشرف میں ہوگا۔ فیض آباد۔ اور بنگالہ میں کون حدود قائم کرے گا۔ اور اگر کوئی ان کا نائب ہو جو ان کی تقرری اور اجازت سے حدود جاری کر سکے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی بلا و اسطہ اجازت میں آخر کون سی بات ہے یا کون سی کمی رہ گئی ہے کہ حدود کا نفاذ نہ ہو سکے۔ ارشاد ہے: **فَلْيَجْلِدُوا ثَمَانِينَ جَلْدَةً**۔ ان کو اسی کوڑے مارو، یا **الزَّانِي لَا يَمْلِكُ لَمْ يَلِدْ وَلَا يُولَدْ وَلَا كَانَ مِنْهَا** **مَالًا جَلْدَةً**۔ زانی مرد و عورت میں سے ہر ایک کو ستر کوڑے لگاؤ، یا **فَرَمَا أَلَسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَتُؤْتَى بِهٖ** (جو مرد و عورت ہر ایک کے ہاتھ کاٹ ڈالو) اور شریعت کے دیگر تمام عبادات، معاملات، اور کفارات میں جب امام کی موجودگی ضروری نہیں تو حدود کی نفاذ میں ان کی حضوری کیوں لازمی قرار دی جاتی ہے کیونکہ یہ حدود بھی مکان شہر و ملک کے حق میں عبادات ہی ہیں۔ اور چندہ شخص کے حق میں کفارات۔ انہیں امام کی موجودگی سے وابستہ کیوں کیا جائے! اور عبادت و کفارہ سے کیوں محروم رکھا جائے۔

(۸۹) یہ قاضی کے لئے پڑھا لکھا ہونے کی شرط بھی لگاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و سنت میں انکی یہ زائد کردہ شرط پر کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ اس کے خلاف پر دلیل ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ فیصلہ صادر فرمانے اور اسے نافذ کرنے کا منصب بھی رکھتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں کوئی خامی، کوئی کمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھی اس دلیل سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينَيْكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (آپ نے اس کو کتاب قرآن مجید سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھی تھی نہ آپ کے دائیں ہاتھ نے کچھ لکھا تھا۔ پھر مسمیٰ نامے، قاضی کے مہری خطوط، وغیرہ لکھنا پڑھنا دارالافتاء کے منشیوں کا کام ہے اگر قاضی خود یہ کام نہ کر سکے تو اس کی قضا میں کوئی نسا فرق آتا ہے۔ علاوہ ان میں ان کے محدثین نے خود اپنے انہ سے ایسی روایات بیان کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علم کتابت قضا میں ضروری نہیں ہے،

(۹۰) ان کی کتاب الدعویٰ میں بڑے انوکھے اور عجیب مسائل ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عورت جسکی لڑکی مرچکی ہو عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ میں نے اپنی لڑکی کے پاس فلان فلان، خادم وغیرہ بطور امانت سپرد کئے تھے تو ان کے نزدیک یہ دعویٰ بلا گواہ و ثبوت قابل قبول ہے۔ اسے بالویہ نے تو اس پر نص کی ہے۔ حالانکہ یہ بات قواعد شرع کے صاف خلاف ہے۔ اس لئے کہ بلا گواہ کوئی دعویٰ قابل سماعت نہیں۔ فَلَئِنْ لَاجَاءَ مُوْعِدُهُ بِآدْبَعِهِ شَهِدَ آدْبَعُهُ لَكُمْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ أَوْسَارِكِهِمْ عِندَ اللَّهِ مُصَدِّقَاتُ الْكَذِبِ وَيَعْلَمُونَهُ بِأَنَّهُمْ جَاؤُوا بِغَاوٍ لَكُمْ لَيْسَ بِهَذَا يَكُونُ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَهِيدٌ (آپ نے اس کو کتابت قضا میں بڑے انوکھے اور عجیب مسائل ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عورت جسکی لڑکی مرچکی ہو عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ میں نے اپنی لڑکی کے پاس فلان فلان، خادم وغیرہ بطور امانت سپرد کئے تھے تو ان کے نزدیک یہ دعویٰ بلا گواہ و ثبوت قابل قبول ہے۔ اسے بالویہ نے تو اس پر نص کی ہے۔ حالانکہ یہ بات قواعد شرع کے صاف خلاف ہے۔ اس لئے کہ بلا گواہ کوئی دعویٰ قابل سماعت نہیں۔ فَلَئِنْ لَاجَاءَ مُوْعِدُهُ بِآدْبَعِهِ شَهِدَ آدْبَعُهُ لَكُمْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ أَوْسَارِكِهِمْ عِندَ اللَّهِ مُصَدِّقَاتُ الْكَذِبِ وَيَعْلَمُونَهُ بِأَنَّهُمْ جَاؤُوا بِغَاوٍ لَكُمْ لَيْسَ بِهَذَا يَكُونُ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَهِيدٌ)

شریعت کا مقصد گواہوں سے اقوال و حقوق کا تحفظ ہے۔ اور اس صورت میں یہ مقصد بابت سے جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کسی دشمن نے کسی پر زنا کی تہمت لگائی، اور گواہ پیش نہ کر سکا تو کہتے ہیں کہ اسے قسم لے کر چھوڑ دینا چاہیے، اس پر حد فتویٰ کی حد نہ لگانی چاہیے۔ ان کے شرح مقتول نے اپنی کتاب مبسوط میں نص بیان کی ہے۔ حالانکہ شرع نے حدود میں قسم کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔ اور دعویٰ حد زنا پر گواہ پیش نہ کر سکنے صورت میں حد فتویٰ لگانا واجب قرار دیا ہے۔ قرآن میں اس پر حکم موجود ہے اور اس صورت میں تو دشمنی، تہمت اور دروغ گوئی پر وزنی دلیل ہے۔ تو اس سے چشم پوشی کیسے کی جاسکتی ہے اور اس سے حسن ظن کس طرح قائم ہو سکتا ہے، (۹۱) کتاب الشهادات میں بھی اسی طرح کے عجائب، غرائب، جمع کئے ہوئے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ دس سالہ نابالغ لڑکے کی شہادت قصاص سے متعلق معتبر ہے۔ حالانکہ نابالغ کسی مقدمہ میں بھی شہادت کا اہل نہیں۔ چہ جائیکہ قصاص کا معاملہ جس میں ایک جان کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے کسی بچہ کی شہادت کیسے قبول ہو سکتی ہے قرآن مجید کہتا ہے۔ وَاسْتَشْهِدُوا ثَلَاثَةً مِنْ رِجَالِكُمْ (۹۲) اگر اس کی آیات پر تہمید ایمان ہو!

(۹۲) کتاب البیہد والنزاع میں قرآنی حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اہل کتاب کے شکار کو حرام کہتے ہیں۔ اور اہل سنت کے ذریعہ کبھی مراد لیتے ہیں۔ اور ذبح کے وقت اگر قبلہ رو نہ ہوں تو اس ذبیحہ کو بھی حرام کہتے ہیں۔ ان امور پر ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں خصوصاً کا عموم ان کی اس زائد شرط کی تردید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ فَكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَابْتَاعُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا حُبِرَ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۹۳) کہتے ہیں کہ اگر غیر رواجی آلات سے کوئی شکار کرے تو وہ شکار اسکی ملکیت میں نہیں آتا، حالانکہ اس میں رواجی اور غیر رواجی ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے۔

(۹۴) کتاب الاطعمہ بھی عجائب کا مجموعہ ہے۔ مردار جانور کے دودھ اور بچہ دانی کو حلال کہتے ہیں۔ اس گیہوں کی روٹی کو حلال جانتے ہیں جس کا آٹا جس پانی سے گوندھا گیا ہو۔ اور وہ جس پانی اس آٹے میں اتنا مل گیا ہو کہ کھانا پتلا ہو گیا ہو اور آٹے کے تمام اجزاء میں پانی کے سبب اجزاء سرایت کر گئے ہوں۔ چنانچہ حلی نے کتاب تذکرہ میں اسی طرح لکھا ہے! اسی طرح وہ کھانا جس میں مرغی کی بیٹ کر

گھل مل گئی ہو، یا وہ شوربہ، فالودہ شربت، جس کو عورت یا مرد کے استنجے کے پانی سے تیار کیا گیا ہو، یا ان میں سرخی کی کچھ سیٹھ لگ گئی ہو، یہ سب چیزیں ان کے نزدیک پاک و طیب اور کھانے کے قابل ہیں، اسی طرح اس کڑ میں یہ ایک بڑا پیمانہ ہے جس میں بارہ وسق وزن آجاتا ہے، جس میں بے شمار آدمیوں نے استنجا کیا ہو، حیض و نفاس کا خون بھی نہیں پڑا ہوا ہو، مٹی و دی، سرخی کی سیٹھ بھی اس میں پڑی ہو اور سب گھل مل کر یک جان ہو چکے ہوں کتے کا پید شاپ بھی اس میں پڑ گیا ہو، اگر ایسے پانی سے جو س، فالودہ، تیار کریں اور اس سے روتہ افطار کریں تو یہ حلال و طیب ہے۔ اور اگر اسکو مرن افطار کے وقت پیئیں یا اس کا شربت بنائیں تو بھی جائز و حلال ہے۔ اگر تین پاؤں کے قریب آتش ریتلا حمیرہ وغیرہ پکائیں اور پاؤں بھر دم مسفوح (پہنے والا خون) ڈال دیں، یا اس میں گھوٹے گدھے کا پید شاپ پڑ جائے تو بھی حلال ہے، حالانکہ قرآنی احکام میں یہ سب چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے وَمُحَرَّمَاتُہُمْ عَلَیْہِمْ لَئِنْ کُنَّ اَوْ حَرَامٌ کَرْتَا ہے ان پر گندی و نجس چیزیں۔

(۹۵) ایک شخص بھوکا ہے۔ دوسرے آدمی کے پاس کھانا ہے، مگر وہ معمول کی قیمت سے زیادہ قیمت طلب کرتا ہے، اور بھوکے پاس بوجہ امیر و مال دار ہونیکے اتنی دولت ہے کہ وہ یہ مہنگا کھانا باسانی خرید سکتا ہے، پھر بھی اگر وہ زبردستی اس سے چھین کر وہ کھانا کھائے تو اس کے لئے سزا ہے۔ اور حلال بھی!

(۹۶) مسائل فرائض (میراث) میں ان کے مال یہ مسئلہ ہے پوتے کی موجودگی میں یا دوسری اولاد ہونے کی صورت میں دادا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ان اخبار و روایات کے خلاف ہے جو انکی اپنی کتابوں میں موجود ہیں چنانچہ سعد بن خولف نے اپنی صحیح میں جناب ابی الحسن کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے۔ سَأَلْتُہُ عَنْ بَنَاتِ الْاَبِیْنِ وَالْجَدِّ قَالَ لِلْجَدِّ الثَّلَاثُ وَالْاَبِیْنِ الْبَنَاتُ الْاَبِیْنِ۔ میں نے آپ سے دادا اور پوتوں کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے کہا ایک تہائی حصہ دادا کا ہے اور باقی پوتوں کو ملے گا۔

(۹۷) یہ مقتول کی دیت میں سے ماں کی طرف سے جو بھائی بہن ہوں کو حصہ نہیں دیتے، اور بیوی کو زمین یا زمین کی قیمت میں سے جو حصہ نہیں دیتے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے ترکہ اور اسکی دیت سے وراثت کا حصہ دیتے ہیں، خواہ اس نے غلطی اور شبہ میں پڑ کر اسے قتل کیا ہو حالانکہ اَلْقَاتِلُ ذِکْرِ قَاتِلٍ کُوْرْشَہِ قَاتِلٍ کُوْرْشَہِ نہیں ملتا، حکم عام ہے۔ اسی طرح آیات قرآن سے بیوی اور بھائی بہنوں کو ورثہ ملنے کا بھی حکم عام ہے زمین، اور دیت کی تخصیص اس میں کہاں سے ثابت؟ میت کے ترکہ میں قرآن، تلوار، انگوٹھی اور اسکی پوشاک، بغیر کسی حق اور معاوضہ کے بڑے بیٹے کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ بھی قرآنی حکم کے خلاف ہے۔ اور اس بیٹے کی میراث سے باپ کو محروم کرتے ہیں جس نے ایک میراث یا قصور سے بادشاہ قاضی یا کوتوال کے روبرو غلطی دیدی ہو، یا درحقیقت یہ شرع کا حکم نہیں بلکہ قانون تورہ چنگیز خانی ہے۔ اور بعض چچاؤں، چچا دادوں اور دادیوں کو مطلقاً میراث سے محروم رکھتے ہیں،

(۹۸) درو صایا کے مسائل میں منظروف کو نفوں کے تابع کرتے ہیں مثلاً ایک شخص نے وصیت کی میرا نال صندوق فلاں شخص کو دیا جائے تو اگر اس صندوق میں کچھ مال و اسباب نقد و زیورات وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ تو ان کے نزدیک وہ سب اشیاء وصیت میں داخل ہوں گی۔

(۹۹) لونڈی کی شہرگاہ کی تحلیل سال دو سال کے لئے جائز بتاتے ہیں۔

(۱۰۰) مجنون اور پاگل پر حدود کا اجرا ان کے واجب ہے جبکہ اس نے عاقل عورت سے زنا کیا ہو، حالانکہ اس کے خلاف متفق علیہ صحیح حدیث موجود ہے۔ وَرَفَعَ اَلْقَلَمَ عَلٰی ثَلَاثَہٗ عَنِ الْمَجْنُونِ حَتّٰی یَقِیْقَ۔ تین افراد سے قلم اٹھایا گیا (وہ غیر مکلف ہیں) مجنون و پاگل سے جب تک

وہ اچھا نہ ہو جائے،

(۱۰۱) اس عورت پر بھی رجم واجب کہتے ہیں جو اپنے شوہر سے بہبستری کے بعد کسی باکرہ عورت سے رگڑ کرے جس سے وہ حاملہ ہو جائے۔ اور اس باکرہ (کنواری) عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ حالانکہ رگڑ کو کسی نے بھی زنا میں شمار نہیں کیا اور نہ شرعاً وہ زنا سمجھا گیا ہے۔

(۱۰۲) اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے کو ابن زینہ کہہ کر پکارے۔ گو اس کی ماں بافرہ ہو، تو اس پر حد قذف کو واجب کہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکم میں حد قذف محصنات کے معاملہ کے ساتھ مخصوص ہے، اور کافر عورت محصنہ نہیں ہوتی، اس کے مسلمان بیٹے کی حرمت تعزیر کا سبب تو ہوگی مگر حد جانی کرنے کا سبب نہیں بنے گا۔

(۱۰۳) اگر کوئی نابالیا مسلمان کسی کو بے قصور قتل کر دے تو ان کے نزدیک اس نابالیا سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ حالانکہ قصاص کی آیت بلایا و نابینا سبب کر شامل ہے۔

(۱۰۴) ایک آدمی جو کاہ ہے۔ دوسرے مسلمان کے پاس کھانا ہے۔ مگر وہ اس جو کے کو نہیں دیتا۔ تو ان کے نزدیک اس جو کے کو قتل ہے کہ کھانا رکھنے والے مسلمان کو قتل کر کے اس سے کھانے لے اور کھا جائے! اس فعل کی وجہ سے نہ اس پر قصاص واجب ہے نہ دیت! حالانکہ دنیا کی کسی شریعت میں بھی کھانا نہ دینا قتل کے جواز کی وجہ نہیں ہے!

(۱۰۵) اگر کوئی کسی مسلمان کو قتل کر دے تو ان کے نزدیک اس ذی کا تمام مال و اسباب مسلمان مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے! اسی ذی کی ذات، تو مقتول کے وارثوں کو یہ اختیار ہے کہ چاہے اسے غلام بنائیں چاہے قتل کریں۔ ان کا یہ مسئلہ بھی شرع کے خلاف ہے۔ کیونکہ شریعت میں صرف قصاص کا حکم ہے۔ نہ اس کا مال لینا جائز ہے نہ اسکو غلام بنانا۔ اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی ذی کی چھوٹی اولاد کو مقتول کے ورثہ اپنا لونڈی غلام بنائیں گے حالانکہ یہ قرآنی آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰی۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا، کے سراسر خلاف ہے۔ حاصل تحریر یہ کہ دینی احکام و مسائل میں بہت سے مسئلے ان کے دماغی اختراع اور من گھڑت ہیں۔ نمونہ کے طور پر صفحہ گزشتہ میں جو تحریر کیا گیا وہ اس مدعا کے ثبوت کے لئے کافی ہے! صاحب فہم و شعور اور اہل عقل و دانش پر ان کے دین و ایمان، اور اصول و فروع کی حقیقت پوری منکشف ہو جائے گی۔ اور یہ بھی بخوبی فرس نشین ہو جائے گا کہ ان اصول کو جو سراسر دروغ اور فروع بے فروع کی نسبت آئینہ کرام کی طرف کرنا۔ اور ان ظلیل القدر ملوایان شرع و دین کا مذہب بتانا، چوٹی کے جھوٹ اور اعلیٰ درجہ کے بہتان و اعتراض کے سوا کچھ نہیں۔ اور لطیف یہ کہ ان کا یہ خود ساختہ مذہب اور روایات کے بھی مخالف ہے جو خود ان کے نزدیک ان کے راویوں کے حوالہ سے انہیں کی کتابوں میں منقول و مروی ہیں!

باب خلفائے ثلاثہ و کبار صحابہ پر مطاعن

کامیان — اور — جوابات

تلاش بسیار، اور جستجوئے مجدد کا حاصل یہ معلوم ہوا کہ اس عالم دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کے حق میں ہدیز بانوں اور یہ گوئیوں اور عجیب چہنوں نے زبان طعن و قدح دراز نہ کی ہو!

دوسروں نے ذات الہی جل شانہ تک میں کلام کیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کے انکار میں معتزلہ نے حضرت آدم السلام سے لے کر

حق تعالیٰ مرتبت نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم تک کو موضوع کلام بنایا۔ اور چھوٹے سے لے کر بڑے گناہ تک ان سے منسوب کئے! اور مزہ کی بات یہ کہ ثبوت میں قرآن و احادیث کے حوالے دے کر یہودی فرقہ عصمت ملائکہ کے معاملہ میں اسی غلط روش پر چلا! نواصب و فواج نے جناب امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی شان میں یہی طریقہ رکھا، اور آخر میں ابن سبا یہودی اور اس کے پیروؤں نے جو مختلف فرقوں اور ناموں سے موسوم ہوتے رہے، خلفائے ثلاثہ، کبار صحابہ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی اعلیٰ و ارفع شان میں مطاعن کا دروازہ کھولا ہے۔ اور اپنی ناقص و ناکارہ عقل اور گمان فاسد میں حوالوں کے لئے اہل سنت کی کتابوں کو شٹ لائے! لیکن دانشوروں اور عقلمندوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ سب کچھ ایسا ہے جیسے چاندنی پر کتے بھونک رہے ہوں جس سے ان عالی قدر و منزلت اور عالم و عالیہاں کے نزدیک مقدس و بزرگ اور محترم شخصیات کی عزت و قدر اور احترام میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آتی کسی شاعر نے کہا ہے،

اَوَّا اَتَشَقُّ نَفِیْقَتِی مِنْ نَاقِصٍ : فَهَی السَّهَادَةُ لِي بِأَنِّی کَامِلٌ (جب کسی کینے سے تو میری برائی سننے تو سمجھ لے کہ وہ میرے لئے اس بات کی گواہی ہے کہ میں کامل ہوں) ان خلفائے کرام صحابہ عظام اور اہل بیت المؤمنین رضوان اللہ علیہم کی عظمت، بزرگی اور برائی کی سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ باوجود انتہائی عناد اور بڑے درجہ کا کینہ رکھنے کے باوجود یہ دریدہ دہن اب تک صرف یہی چند شبہات سامنے لاسکے، جو غور و فکر کے ابتدائی مرحلہ میں ہی غبار بن کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا حالانکہ ان بزرگوں کی عیب جوئی کے مواقع کی تلاش میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اور مقدور سے بڑھ کر سعی و کوشش کر ڈالی۔ اور پھر ایسا شخص جو گوشت نشین نہیں تھا ریاست عامہ کا بار اس کے کندھوں پر تھا، مخلوق خدا کے ساتھ طرح طرح اور نوع بنوع معاملات سے اس کا ربط و ضبط تھا۔ اور وہ لاکھوں کی تعداد رکھنے والی ایک امت کا والی و مگران تھا اس کا سابقہ دوستوں کے ساتھ دشمنوں سے بھی تھا۔ وہ امن و جنگ دونوں حالتوں سے گذرا اس نے اپنی زندگی میں صرف دس بارہ کام ایسے کئے ہوں جن پر دشمنوں اور بذر بانوں نے انگشت نمائی کی ہو، اور گرفت پائی ہو۔ چمکہ دوران بحث وہ قابل گرفت باتیں بھی مل طعن نہ بن سکی ہوں۔ تو کہا دنیا کے لئے اسکی عظمت کے اعتراف کے لئے اتنا کافی نہیں ہے۔ دنیا تو اس کے گن گاتی اور اسے سراہتی ہے جو ایک گھر بستی کا مالک ہو اور زندگی بھر وہ روزانہ دوچار غلطیوں کے علاوہ اپنے سارے کام اور انتظام ٹھیک ٹھیک چلاتا ہو، تو کیا تم کی بات نہیں کہ اسکو قابل ستائش سمجھنے کے بجائے نشاۃ طعن بنایا جائے جو اتنی بڑی ملت کی سیاست کاری اور انتظام امور میں مشغولیت کے باوجود دس یا چ غلطیوں اور وہ بھی موسوم سے زیادہ نہ کر سکا جن پر دشمنوں نے انگلی دھری۔

مطاعن ابو بکر صدیقؓ (اختصار) کہتے ہیں کہ ایک روز آپ خطبہ دینے ممبر پر چڑھے تو جناب حسنین رضی اللہ عنہما نے کہا اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہمارے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کے ممبر سے اتر جاؤ، ان کے قول سے معلوم ہوا کہ آپ اس کے اہل نہ تھے!۔

جناب حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش رمضان سنہ ۱ اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شعبان سنہ ۳ کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال سنہ ۱۱ کے ابتدا میں ہوا۔ اسی لئے عہد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ حضرات بالاجماع کسب تھے یہی چھ سات سال کے! اب یہاں دوصورتیں ہیں، یا تو شیعیہ ان حضرات کے اقوال و افعال کو اس کم عمری کے باوجود معتبر تسلیم کریں گے، اور ان پر اپنے احکام کی بنا رکھیں گے، یا صغیر سنی کے سبب ان کو اہمیت نہ دیں گے، اور نہ ان سے احکام نکالیں گے۔ پہلی صورت میں ترک تقیہ لازم آتا ہے جو ان کے نزدیک واجب ہے (کہ حضرت حسینؓ خاموش کیوں نہ رہے جھگڑا کیوں نہ پڑے)۔ اور پھر

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت بھی لازم آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہار شنبہ سے لیکر دو شنبہ تک جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو بوقت نماز میں اپنا خلیفہ بنایا اور اس اثنا میں آپ جمعہ و خطبہ کے فرائض بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں انجام دیتے رہے!

اسی طرح جناب امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی مخالفت بھی لازم آئے گی کہ آپ بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی جگہ نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کی جمعہ و خطبہ کی نیابت کو بھی تسلیم کیا! اور دوسری صورت میں نہ کوئی نقص لازم آتا ہے، اور نہ کوئی قباحت کی بات ہی ہے۔ بچوں کا یہ قاعدہ ہے، کہ وہ اپنوں کی جگہ، کسی دوسرے کو دیکھتے ہیں، تو ناسمجی میں ایسی ہی بات کہتے اور کرتے ہیں۔ تو ان کے قول و فعل سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

اور ہر چیز ایسا کر ام اور اگر کمالات نفسانیہ اور مراتب ایمانیہ میں عام مخلوق سے ممتاز ہوتے ہیں۔ مگر احکام بشری خواص صغریٰ اور خصائص طفولیت ان میں بھی کار فرما رہتے ہیں۔ اسی لئے مقتدا بننے کے لئے کمال عقلی کی حد تک پہنچنا ضروری قرار دیا گیا ہے، چالیس سال سے قبل شافعی و نازدہ مثالوں کو چھوڑ کر منصب رسالت کسی کو عطا نہیں ہوا۔ عربی میں ایک مثل ہے۔
النَّبِيُّ مَبْنِيٌّ وَكَوْكَانِيًّا۔ (بچہ بچہ ہی ہے اگرچہ وہ نبی ہو)

اعتراف دوسرا اعتراف ان کا یہ ہے کہ مالک بن نویرہ کی خوبصورت بیوی سے نکاح کے لالچ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے امیر الامراء تھے مالک بن نویرہ کو جو مسلمان تھے نہ صرف قتل کیا بلکہ قتل ہی کی راہ کو اس عورت سے نکاح کر کے فعل زوجیت بھی کیا۔ اور اس کی عدت پوری ہونے کا بھی انتظار نہ کیا، کیونکہ عدت میں نکاح جائز نہیں اور یوں گویا زنا کے مرتکب ہوئے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ ان پر حد لگائی نہ قتل کا قصاص لیا جبکہ دونوں سزاؤں کا نفاذ ان پر واجب تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس پر ناراض بھی ہوئے اور فرمایا اگر میں امیر ہوتا تو تم سے قصاص لیتا جواب :- دراصل جو واقعہ پیش آیا اسکی تعبیر ان لوگوں نے صحیح بیان نہیں کی! اور جب تک صحیح حالات معلوم نہ ہوں اس وقت تک اعتراف کی بے وقعتی ظاہر ہے۔ سہرت و تاریخ کی معتبر کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مدنی نبوت طلیعہ بن خویلد اسی کی ہم سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب فارغ ہو کر نواح بطاح (ایک مقام کا نام) کی طرف متوجہ ہوئے تو اطراف و جوانب کی طرف فوجی دستے روانہ کئے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور طریقے کے مطابق ان کو ہدایت کی کہ جس قوم، قبیلہ، گروہ پر چڑھائی کرو، وہاں سے اگر تمہیں اذان سنائی دے تو وہاں قتل و غارتگری سے باز رہو۔ اور اگر اذان کی آواز نہ سنائی دے تو اسے دالطوب قرار دے کر پوری فوجی کاروائی کرو! اتفاقاً اس دستہ میں جناب ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مالک بن نویرہ کو پکڑ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس لائے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بطاح کی سرداری ملی ہوئی تھی۔ اور اس کے گرد نواح کے صدقات کی وصولی بھی اسی کے سپرد تھی جناب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اذان سننے کی گواہی دی، مگر اسی دستہ کی ایک جماعت نے کہا کہ ہم نے اذان کی آواز نہیں سنی۔ مگر اس سے پیشتر گرد نواح کے معتبرین کے ذریعہ یہ بات حتمی اور ثبوتی طور پر معلوم ہو چکی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ کے اہل خانہ نے خوب جشن منایا، پورے گھر میں ہندی بھائی ڈھول بجائے، اور خوب فرحت و شادمانی کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کی اس مصیبت پر خوش ہوتے پھر مزید ایک بات یہ ہوئی کہ مالک بن نویرہ سے سوال و جواب کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے جس کے لغو و مرتدین اپنی گفتگو میں عادی تھے، اور استعمال کرتے تھے یعنی قَاتِلْكُمْ اَوْ صَاحِبَكُمْ دُغْمَاً اَدْمِیَ یا تمہارے ساتھی نے ایسا

کہا، علاوہ ازیں بہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ نے وصال شریعت بھی اپنی قوم کو یہ کہہ کر واپس کر دئے تھے کہ اچھا ہوا "اس شخص کی موت سے تم نے مصیبت سے چھڑکارا یا لیا۔ ان حالات اور اپنے سننے اس کی گفتگو کے انداز سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا یقین ہو گیا اور آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا! اُدھر جب مدینہ میں اس واقعہ کی اطلاع پہنچی۔ پھر جناب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بھی آپ سے ناراض ہو کر دارالخلافہ پہنچے۔ اور قصور وار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہی ملے یا تو ابتداً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہی خیال تھا کہ خون ناحق ہوا اور قصاص واجب ہے۔ مگر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو طلب فرما کر تفشیش حال کی، ان سے پورا واقعہ پوچھا اور حالات واقعات کا سارا راز آپ پر منکشف ہوا تو آپ نے ان کو بے قصور قرار دیکر ان سے کچھ تعرض نہیں کیا اور ان اس سبب سے مدد پر بحال رہا۔ اب اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اور فقہی مسئلہ میں غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر زنا و قتل کی حد کیسے واجب ہو سکتی ہے! اب یہی بات کہ حرلی عورت کو بھی ایک حیض بقدر عدت گذارنی ضروری ہے۔ اور اتنا انکار بھی نہیں ہوا۔ تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر واقعہ سچ بھی ہے تو یہ اعتراض حضرت خالد پر ہوتا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ پھر حضرت خالدؓ نہ معصوم تھے، نہ امام عام! لیکن بات یہ نہیں۔ دراصل یہ قصہ ہی سن گولت ہے۔ اسی لئے کسی مستند و معتبر کتاب میں اس کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ بعض غیر معتبر کتابوں میں یہ روایت ملتی بھی ہے تو ان کا جواب بھی ساتھ ساتھ اسی روایت میں موجود ہے، کہ مالک بن نویرہ نے اس عورت کو ایک عرصہ سے طلاق دے رکھی تھی اور رسم جاہلیت کی بابت مدی میں اسے بوں ہی گھر میں ڈال رکھا تھا۔ اسی رسم جاہلیت کے توڑنے پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ **وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُفْلِحْنَ فَلَا تَحْضِلْنَ لَهُنَّ**۔ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پورا ہو جائے تو انہیں روکے نہ رکھو! لہذا اس عورت کی عدت تو کب کی پوری ہو چکی تھی۔ اور نکاح حلال ہو چکا تھا۔ تو اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فوری نکاح کر لیا تو اعتراض کی کیا بات ہے! فقہاء اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔

اسباب میں چونکہ اعتراضات اہل سنت پر کئے جا رہے ہیں، اور انہیں کے مذہب اور روایات سے اعتراضات کو ثابت کرنا بھی مقصود ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اہل سنت ہی کی روایات اور مسائل کا لحاظ رکھا جائے۔ ورنہ تو مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ کوئی شیعہ اپنی روایات، اپنے مسائل پیش کر کے اہل سنت پر اعتراض کا کیا حق رکھتا ہے جبکہ وہ ان کو صحیح و حق تسلیم ہی نہ کرتا ہو، استیعاب کا ایک حوالہ ملاحظہ کیجئے،

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو یعنی خالدؓ کو امیر لشکر بنایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ یمامہ اور دوسرے مقامات فتح کرائے اور ان کے ہاتھوں بہت سے مرتدین قتل کرائے ان میں سے مسیلہ کذاب اور مالک بن نویرہ بھی تھے۔

وَأَمَّا أَيْ خَالِدٍ الْبُكْرِي الْقَيْدِيُّ عَلَى الْيَوْمِ فَفَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْيَمَامَةَ وَبَنِيهَا وَقَتْلَ كُلِّ يَدِيَّةٍ أَكْثَرَ أَهْلِ الْبَدَةِ مَشَقَّةً مِّنْ سِلَاحِهِمْ وَذَابَ وَالِدُ بَنِي نَوِيرَةَ

دوسرا جواب یہ چلو مان لیا کہ مالک بن نویرہ مرتد نہ تھا۔ مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا شبہ تو پیدا ہو گیا تھا۔ اور **الْقِصَاصُ تَنْكِيسُ شَيْءٍ بِشَيْءٍ** (اور شبہ کی صورت میں قصاص ختم ہوتا ہے)

تیسرا جواب یہ: جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہؐ تھے۔ سنیوں یا شیعہوں کے خلیفہ تو نہیں تھے کہ ان کی فرمائش اور نواہش کے مطابق کام انجام دیتے، وہ جس ذات اقدس کے خلیفہ تھے ان کا آسواہ ان کے سامنے تھا، انہیں اسی کی پیروی کرنی

اور انہیں کی سنت پر عمل کرنا تھا۔ اور اسی زمانہ محترم و مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انہیں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں اسی قسم کے مشتبہ افراد کو قتل کیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تعرض نہ فرمایا۔ چنانچہ اہل سیرت و تاریخ کا اس قصہ کی صحت پر اجماع ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جناب خالد رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ تو آپ نے ایک نوکر پر بڑھائی کی۔ وہ لوگ اسلام تو لے آئے تھے لیکن قواعد و تعلیمات اسلام سے ابھی روشناس نہیں ہوئے تھے جب ان پر حملہ ہوا تو اپنے اسلام کے اظہار کے لئے، یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے صَبَاحًا سَبَاکًا (میں صابا ہیں صابی بمعنی بے دین) ان کا مطلب تو یہ تھا کہ اپنے صابق دین سے پھر گئے اور اسلام لے آئے

جناب خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ اسی لشکر میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ایک دستہ کے سردار تھے، انہوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ ان کو قتل نہ کرو قید میں رکھو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو آپ بہت ملول اور بخیدہ ہوئے۔ بہت افسوس ظاہر فرمایا کہ یہ الفاظ فرمائے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَبْرَاۤءُ اِلَیْکَ مِمَّا اَتَّعِیْتُ خَالِدًا دَاۤءِیَ الشَّیْطٰنِ تِیْرِیْ جَنَابِیْ خَالِدٌ نَّہَیَّ کَیْ اَسَّیْ سَمِیْ اِیْہُوں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر حد جاری کی، نہ کوئی قصاص و دیت دلائی۔ اس لئے اس نظیر کی موجودگی میں اسی قسم کے شبہ یا اس سے زیادہ شبہ کی صورت میں جنارہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب خالد بن ولید سے کوئی تعرض نہیں کیا تو کونسا تصور کیا خصوصاً اس صورت میں کہ آپ نے بہت المال سے اس کی دیت دلا دی ہو، آپ پر طعن و اعتراض دی ہو سکتا ہے جس کا دل بغض و کینہ کی آلائش سے آلودہ ہو

چوتھا جواب :- کیوں جناب مالک بن نویرہ کا قصاص نہ لینا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لئے باعث طعن ہے۔ تو ذی النورین الشہید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص نہ لینے پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اس لئے کہ ان کا قتل تو بلا وجہ بلا سبب تھا۔ نہ واقعہ میں کوئی سبب تھا نہ وہ گمان میں کوئی بات!

پانچواں جواب :- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا اس وقت واجب ہوتا جب مالک بن نویرہ کے ورثہ اس کا مطالبہ کرتے اور اس قسم کے مطالبہ کا بالکل کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ اس کے بھائی شہم بن نویرہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے بھائی کے مرتد ہونے کا اعتراف کیا۔ حالانکہ یہ بھائی وہ تھا جو اپنے بھائی مالک سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا، عمر بھر اسکی جدائی میں تڑپتا پھر کتا رہا۔ ہمیشہ اس کے فراق میں چاک گریبان آہ و فغاں کرتا رہا چنانچہ اس کے مرتد ہونے پر بھائی نے ضرب الشل مانے گئے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں،

(۱) وَمَا لَکَ لَمَّا کُنَّا فِیْ حُدُودِ حَبَہٖ اَنْ اَلْهَرَقَیْ قِیْلَ کُنْ یَصْطَدُّ مَا (۲) فَلَمَّا تَقَرَّرْنَا کَاۤفًیْ دُمَا یَا اَبُو لَیْلَہٗ اَجْمَاعُ لَیْلَہٗ لَمْ یَبْتَ مَعَا

(۱) عمر کے ایک خط سے جیسے کہ ہم دونوں بھائی حذیبہ کے دو صاحبوں کی مانند تھے، کہ لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ ہرگز بھی باہم جدا نہ ہوں گے، (۲) لیکن جب ہم جدا ہو گئے تو مری اور مالک کی اتنے عرصہ کی یکجائی کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہم نے ایک رات بھی ساتھ نہ گزارا ہی ہوا

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی سابقہ رائے پر جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کی تھی متاسف اور نادم ہوتے آپ نے اس کا برملا اعتراف کیا کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ کیا وہ حق اور بالکل درست تھا۔ اور یعنی برائیاں، اور اسکی سب سے بڑی اور واضح دلیل یہ ہے کہ آپ نے اپنے عہد میں جناب خالد رضی اللہ عنہ سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، نہ ان پر پرہیز کی، نہ قصاص لیا۔ حالانکہ حدود کے معاملہ میں آپ بہت سخت اور متشدد تھے، اور کسی رو رعایت سے

اعتراف۔ تیسرا طعن اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے سلسلہ میں آپ نے تاخیری صورت اختیار کی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لشکر کو رخصت فرمایا تھا۔ لوگوں کا نام بنام تقریر فرمایا اور آخر وقت تک اس پر بہت زور دیتے اور تاکید فرماتے تھے۔ بلکہ اس کی تیاری کے سلسلہ میں یوں ارشاد فرماتے: **جَهِّزُوا جَيْشَ أَسَامَةَ نَعْنِ اللَّهُ وَمَعْنٍ تَخَلَّفَ**۔ (اسامہ کے لشکر کو سامان مہیا کرو جو اس سے پیچھے ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے)

جواب ۱۔ سب سے پہلے تو یہ بات متعین ہونا ضروری ہے کہ ان لوگوں کا یہ اعتراض حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کس حیثیت اور پہلو سے ہے، کیا اس وجہ سے کہ آپ نے اس کے لئے تیاری نہیں کی؟ یا یہ صورت تھی کہ آپ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ اگر مد نظر پہلی صورت ہے تو یہ سفید جھوٹ ہے۔ وہاں تو صورت یہ تھی کہ آپ نے دیگر صحابہ کی آراء کے علی الرغم قبضش اسامہؓ کی ہر پہلو سے تیاری کی، اس سلسلہ کی تفصیل اہل صحیح صورت حال یوں تھی کہ ۲۶ صفر بروز دوشنبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کا انتقال لینے اور رومیوں سے جہاد کی عرض سے لشکر ترمیم دیا جائے۔ سہ شنبہ کے دن آپ نے جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کا امیر مقرر فرمایا (۲۸ صفر) ہار شنبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض آخری لاحق ہوا۔ پر دوسرے روز علالت کے باوجود دست مبارک سے نشان (علم) تیار فرمایا، اور ارشاد فرمایا: **إِنِّي بِسْمِ اللَّهِ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَاتِلْ مَن كَفَرَ بِاللَّهِ**۔ اللہ کے نام سے اللہ کے راستہ میں غزوہ کرو۔ اور اللہ کے منکروں سے جنگ کرو۔ پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس علم کو لئے باہر نکلے اور جناب بریدہ الحبیب رضی اللہ عنہ کو دیا کہ انہیں لشکر کا علمبردار مقرر کیا گیا تھا۔ اور مدینہ سے چل کر مقام جُحُوف میں آٹھ گھنٹے کے سارے لشکر کی اجتماع گاہ یہی پہلی منزل تھی، مگر جو آئے لشکر میں ملتا جائے۔ ادھر کیا صحابہ ماجرین **والنصار** حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، عثمان غنی، سعد بن وقاص، ابوعبیدہ بن جراح، سعید بن زید، فسادہ بن نعمان، اور سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہم اجمعین، اس لشکر کے شایان شان تیاریوں میں مصروف تھے، خیمے اور دیگر سامان روانہ کر چکے تھے۔ اور خود بھی روانگی کے لئے بارکاب تھے کہ چہار شنبہ کے غروب اور پنجشنبہ کی ابتدائی ساعتوں میں آپ کے مرض نے شدت اختیار کر لی، اور مدینہ میں بے چینی، جان شاردوں میں بل چل چ گئی شب پنجشنبہ عشاء کی نماز کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانشین مقرر فرمایا اور اس خدمت کچلئے آپ کو نامزد فرما دیا۔ (اور جانشینی کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا، تا آنکہ ۱۰ ذی الحج الاول کی تاریخ اور دوشنبہ کا دن آیا کہ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں کچھ تخفیف معلوم ہوئی تھی۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کفار محبت و رحمت میں نے کر معذور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ اور فی امان اللہ کہا۔ مگر یک شنبہ کو مرض میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ اُدھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ دوشنبہ کی صبح روانگی کا ارادہ کر چکے تھے اور بھانہ سونے ہی کو تھی کہ ان کی والدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کا قاصد یہ پیغام لایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عالم نزع طاری ہے، حضرت اسامہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم، گرتے پڑتے واپس مدینہ النبی آئے۔ بریدہ الحبیب نے وہ علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارک کے دروازہ پر گاڑ دیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم منزل آخر میں ہیں جاگزیں ہو چکے۔ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مسند خلافت کے لئے منتخب کر لئے گئے تو آپ نے حکم دیا کہ علم اسامہؓ کے گھر کے دروازہ پر نصب کیا جائے۔ بریدہ کو حکم ہوا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو کر لشکر کو اُس سر تو ترتیب دیں۔ اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو کوچ کا حکم ملا۔ چنانچہ وہ مدینہ النبی سے روانہ ہوئے اور پہلا بیڑا جُحُوف میں کیا۔

اسی دوران بعض قبائل عرب کے مرتد ہونے اور ان کے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تشویشناک خبر ملی۔ تو سارے صحابہ جناب صدیق

اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے، وقت بڑا نازک ہے، حالات دگرگوں نظر آتے ہیں، ایسے وقت اشاعت جاری لشکر دور درواز کی مسافت پر بھیجنا خلاف مصلحت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ عرب مدینہ خالی دیکھ کر شورش برپا کر دیں۔ اور فتنہ اٹھ کھڑا ہو، اور اہل بیت کسی آفت و مصیبت میں گھر جائیں۔ مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ قبول نہیں فرمایا۔ اور یہ فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اسامہؓ کے لشکر کی روانگی کے سبب میں مدینہ میں درندوں کا نغمہ بن جاؤں گا تب بھی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کے مقابلہ میں یہ صورت منظور ہوگی! البتہ اسامہ رضی اللہ عنہ سے بصورت دفعہ امتنا کہا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مدینہ ٹھہرنے کی اجازت دے دو کہ مدینہ النبی کی حفاظت و انتظام میں مجھے ان کے مشورہ کی ضرورت ہوگی چنانچہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی اجازت سے مدینہ النبی واپس آگئے۔ اور باقی لشکر جو ان کا توں یکم بیعہ اثنی کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، روانہ ہوا، اور جہاں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس رخ چل پڑا تھا اس مقام کا نام آج ہے بمقا۔

یہ ہے اصل قصہ اور واقعہ جو روئے الصفا، روضۃ الاحباب، حبیب السیر اور شیعوں و سنیوں کی دیگر معتبر کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر مقصود اعتراض دوسری صورت ہے، کہ آپؐ رفاقت اسامہؓ سے بچ کر گئے اور ان کا ساتھ نہ دیا۔ تو واقعہ اور صورت بلا کوہ نظر رکھا جائے تو اس اعتراض کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اور نہ اس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے تاہم اس کے چند جوابات ملاحظہ ہوں۔ (۱) رئیس وقت کو یہ اختیار ہے کہ اگر ایک آدمی کا تقرر اس نے کسی جگہ کیا ہے تو ضرورت کے وقت وہ کسی دوسرے منصب پر بھی اس کا تبادلہ و تقرر کر سکتا ہے۔ اور اس وقت اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ پہلی خدمت سے اس کو سببی الذمہ کر دیا۔ یہاں بھی صورت یہی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول یہ حکم فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ عیش اسامہؓ میں شریک ہو کہ جہاد کے لئے بجائیں۔ وہ اس کی تیاری میں مصروف تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہوئی کہ وہ میرے نائب نماز کی خدمت انجام دیں، تو وہ خدمت سپرد فرمادی اس مطلب ہوا کہ لشکر کی خدمات سے آپ کو چھٹی مل گئی، اس صورت حال پر اعتراض وہی کر سکتا ہے جو یا تو عقل سے پیدا ہونا یا اپنا بغض و کینہ نکالنے کے لئے اعتراض برائے اعتراض کا قائل ہو! شرعی نقطہ نظر سے بھی یہ ثابت ہے کہ جہاد سے پہلے کی ابتدائی صورت فرضی کفایہ ہے۔ اور لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری بھی اسی نوعیت کی تھی، اس لئے آپؐ کا لشکر اسامہؓ کے ساتھ نہ جانا کوئی قابل اعتراض نہیں اور نہ آپؐ پر کوئی الزام آتا ہے۔ دوسری طرف صورت حال یکسہ بدل گئی تھی۔ آپؐ ولی الامر، خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے پوری ملت کی خلافت پر ہر آدمی کی ذمہ داری آپ پر تھی۔ کفار و مرتدین کا جو فتنہ سر اٹھا رہا تھا اس کو فرو کرنا فرض عین تھا اس کو آپؐ کیسے نظر انداز فرما سکتے تھے۔ لہذا یہ کہنا درست ہو گا کہ آپؐ نے فرض عین کی ادائیگی کی خاطر فرض کفایہ کو ترک فرمایا یہی حکم شرعی بھی ہے۔ اور پھر اب تو پوزیشن بھی بدل گئی تھی: اب تو لشکر کی تیاری، ساز و سامان کی فراہمی لوگوں کو اس کی ترغیب دلائی۔ اور سبہ قسم مدد و ضروریات کا خیال رکھنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہونے کی حیثیت سے آپؐ ہی کو سرانجام دینے تھے، اور ان سب کاموں کا سہرا اب تو آپؐ ہی کے سر تھا۔ اور ان کا اجر و ثواب آپؐ ہی کے نام لکھا جاتا تھا۔

(۲) دشمن کی سرکوبی کے لئے کسی امیر کی سرکردگی میں چند اشخاص کی نامزدگی سیاست تمدنی، مدنی کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے جو حاکم وقت کی صوابدید سے متعلق ہوتا ہے۔ وہ حکم منزل من اللہ نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس انتظام اور سیاست مدنی کا بوجھ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آیا۔ اب یہ امور آپ کی صوابدید سے وابستہ ہوئے کہ جس کو چاہیں جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ متعین کر دیں اور جس کو مناسب سمجھیں اپنے ساتھ رکھیں بخود

شرکت کرنا چاہیں شریک ہو جائیں۔ نہ چاہیں تو نہ جائیں۔ ان کے اتنے رد و بدل سے فرمان اور حکم رسول کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ مخالفت تو تب ہوتی کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی جگہ کسی اور کو امیر لشکر مقرر کرتے۔ یا یہ ہم اور لشکر کی روانگی کے ارادہ کو ترک کرتے یا دشمنوں سے صلح کر لیتے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ملک مملکت اور دینی مصالح اور جزئی امور میں وقتی طور پر رد و بدل رئیس وقت، خلیفہ بادشاہ کی صوابدید سے متعلق و وابستہ ہونے پر ایمان میں وہ اپنی عقل و رائے کو پورا دخل دینے کا پورا پورا مجاز ہے، اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نہ شرعی حیثیت سے تھے اور نہ ان سے متعلق کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔ رب العزت والا حمد، تو اہل سنت کی کتابوں میں یہ موجود نہیں ہے۔ بالفرض اس کو صحیح مان لیں تو اس کے بہ معنی ہوں گے کہ اس ہم میں اسامہ کو تنہا چھوڑ دینا اور جناب زید بن حارثہ کے انتظام کے لئے رومیوں کے خلاف اس جہاد سے پہلو تہی کرنا اور شریک نہ ہونا حرام ہے اور جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خدمت امامت سے گراں بار ہوئے تو بلاشبہ ان تمام امور سے آپ مستثنیٰ قرار پائے جس طرح اس لشکر کی روانگی کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شرکت کے علاوہ دیگر تمام امور کا انتظام فرمایا، ان کی انجام دہی کے لئے بتا کید امر فرمایا۔ اسی طرح عدم موجودگی کے سبب آپ کے نائب نے سوائے اپنی شرکت کے، یا حضرت اسامہ کی اجازت سے فائق اعظم رضی اللہ عنہ کے ٹک جانے کے تمام امور عین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معینا اور ان کے انتظامات کے مطابق یہ ہم روانہ فرمائی، اور ہر طرح کے ساز و سامان جہاد کا ان کے لئے انتظام فرمایا۔ (ن) چنانچہ شہرستانی نے اپنی کتاب، الملل والنحل میں لکھا ہے کہ یہ لعنتی جملہ سن گھڑت اور افراتفرہ محض ہے، کسی فارسی میں نوشت و خواندگی صلاحیت رکھنے والے شخص نے محدثین اہل سنت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو اور وہ اپنی کتاب سیر میں یہ جملہ نقل کرے تو اس سے اہل سنت کو الزام دینا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک ہر حدیث معتبر ہے جو حدیثین کی معتبر کتب میں مدون ہو، اور جس کی صحت کا حکم بھی اس کے ساتھ مذکور ہو بے سند حدیث ان کے لئے نہ قابل توجہ ہے، اور نہ لائق اعتماد۔

(۴۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دصال کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے منصب میں انقلاب آگیا پہلے ان کا شمار عام مومنین میں تھا، (مخصوصیت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدیق اور بارگاہ تھے۔ وزیر و مشیر تھے۔ (ن) لیکن اب امیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب و جانشین ہیں۔ جب کسی شخص کے منصب میں انقلاب آجائے اور وہ ایک منصب سے دوسرے منصب فائز ہو جائے تو حکم شرع کے بموجب موجودہ منصب کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ پہلی حیثیت و منصب والے نہیں۔ مثلاً جب پیٹ کا پچہ پیلا ہو جائے، پھر وہ جوان و بالغ ہو جائے، یا پاگل اچھا ہو جائے، مقیم مسافر ہو جائے، مسافر اقامت اختیار کر لے، غلام آزاد ہو جائے، رعیت حاکم بن جائے، عام آدمی قاضی و جج بن جائے، فقیر مالدار، مالدار فقیر ہو جائے، زندہ موت کی راہ لگ جائے، میراث و ولایت میں قریب تر رشتہ دار فوت ہو جائے۔ اور اسی قسم کے بے شمار ایسی نظیریں ہیں، کہ پہلی حالت گزرنے کے بعد اس پر دوسری حیثیت و حالت کے احکام نافذ ہوں گے۔ پچہ نابالغ ہے تب تک معصوم ہے۔ بالغ ہونے پر یہ مکلف ہوگا اب اس پر معصومیت کی حالت والے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ مکلف والے احکام جاری ہوں گے،

اب جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جانشین رسول ہوئے، تو اب اسامہ کی ماتحتی والا حکم باقی نہیں رہا۔ اب اس لشکر کے ساتھ ان کا وہی رویہ ہونا چاہیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات کے وقت تھا۔ اور اس معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لشکر کے ساتھ خود تشریف لے جا رہے تھے، کہ ایک امر کسی کا مرحلہ سامنے تھا۔ اور اب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی رگودی خواہش رہی ہو اس لشکر کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے اس لئے کہ موجودہ منصب کا یہ تقاضا تھا کہ وہ مرکز کی حفاظت بنفس نفیس فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری تیاری اور اہتمام کے

ساتھ ہر صورت اس لشکر کی روانگی چاہتے تھے، اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں چاہتے تھے۔

بناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ لکھی گئی۔ اور لشکر کو پوری تیاری اور بڑے اہتمام کے ساتھ ہر صورت بھیجا۔ اور اسامہ سی ایئر لشکر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتراضات و مشوروں کے باوجود جناب اسامہؓ کو امیر لشکر رکھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی رفقہ کے مشوروں، اور مصالح ملکی اور قوانین جنگ کے علی الرغم انکی امارت کو باقی رکھا۔ اور مشوروں کے جوابات میں یہ جواب مرحمت فرمایا کہ ابو بکرؓ کی کیا مجال کہ وہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ امیر کو ہٹا دے (معنا)۔ اس معاملہ میں کوئی ہوشیاد آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ والے معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کوئی قابل اعتراض طرز عمل اختیار کیا ہو (۴) بالخصوص یہ مان ہی لیا جائے۔ کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے یہ ثابت کا زبھی باعث استغناء نہیں۔ نہ ہمداد خلافت کی مشغولی یا مدینہ اور ناموس رسول کی حفاظت کا عذر کام آسکتا ہے آپ اس پر مامور تھے کہ رزمیوں کی لڑائی کے لئے جناب اسامہ کے ساتھ نکلیں تاکہ تحلف کا الزام نہ لگے! اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایسا نہیں کیا۔ وہ اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہیں گئے؟

اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ آپ کی عصمت میں فرق آگیا، لیکن امامت میں عصمت شرط ہے کہاں عدالت البتہ ضروری ہے۔ تو چھوٹے موٹے ایک آدھ گناہ کے ارتکاب سے عدالت بھی مجروح نہیں ہوتی۔ اور اسباب پرستی تو اعتقاد رکھتے ہی ہیں شیعہ بھی اس کے قائل ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ نہ فاسق تھے اور نہ ان سے کبھی کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوا۔ (۵) پانچواں جواب یہ ہے کہ حضرات شیعہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے بعض دوسرے بزرگوں پر اہل سنت کے کیسے علم سے ٹٹول مٹال کر دوچار روایات کے ذریعہ جو طعن و اعتراض کرتے وہ انہیں اول تو ثابت نہیں کر پاتے۔ اور بالخصوص ان کے دوچار طعن ثابت بھی ہوں۔ تو ان کو یہ چاہئے کہ پہلے تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ضائل و مناقب، اور جنت کے درجہ عالیہ کی بشارت کی روایات کو جو اہل سنت بحوالہ آیات قرآن، احادیث رسول، اخبار ائمہ و دیگر اہل بیت سے ثابت کرتے ہیں جن میں سے بعض خود شیعوں کے نزدیک ان کی کتابوں میں بطریق صحیح منقول بھی ہیں۔ ایک بلڈھے میں رکھیں، اور اس کے مقابلہ میں اپنے منوعہ، من گھڑت اور افتراء پر مبنی مطاعن کی گھنٹی رکن دیں۔ پھر بلڈھوں کا رنج دیکھ کر ہم سے جواب کا مطالبہ کریں۔

(۶) شیعوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم وجوب کے لئے متعین نہیں ہے، جیسا کہ مرتضیٰ نے کتاب درر اور غرر میں اس کی دلیل لکھی ہے۔ لہذا اگر خاص جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اسامہؓ کے ساتھ جائیں۔ اور وہ نہ جائیں تو انہیں کے قواعد کے مطابق کوئی خرابی لازم نہیں آتی ممکن ہے حکم مندوب مستحب ہو جس کا ترک موجب گناہ نہیں، اب ربا لعنت والا جملہ تو اس کا ایک جواب تو یہ جملہ ہماری کتابوں میں نہیں، اور پر کذر چکا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر موجود بھی ہو تو لفظ منوع عام ہے۔ شیعہ کتب اصول میں اسکی تصریح موجود ہے۔ لہذا اس دعوے میں ایک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نہیں جناب امیر المؤمنین اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی داخل ہوں گے۔ تو ان کے متعلق جو تمہارا جواب ہو گا وہی جواب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہمارا بھی ہو گا۔ پھر اگر وہ کہیں کہ یہ دعوہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو ہمیشہ اسامہؓ کے لئے نام نہام، نامزد کرتے گئے تھے تو ہم کہیں گے کہ پھر جو چیز ہمیشہ اسامہؓ کا خطاب ان متعین اور نامزد حضرات کی طرف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہمیشہ اسامہؓ ہی کو یہ کہا جائے کہ ہمیشہ اسامہؓ کے لئے سامان اکٹھا کرو، کیا بات ہوئی۔ لامحالہ ماننا پڑیگا کہ یہ خطاب عام تھا۔ اور سب مسلمان اس کے مخاطب تھے۔ اور لعنت کا جملہ اسی کے ساتھ چسپاں ہے۔ لہذا اس سے نامزد حضرت کی تخصیص

ثابت نہیں ہوتی!

(۱) جیسا کہ باب ثبوت میں گذر چکا ہے کہ حضرت آدم و حضرت یونس علیہما السلام نے اللہ تعالیٰ کے بلاؤں پر براہ راست حکم کی خلاف ورزی کی و نعوذ باللہ، تو اگر امام و خلیفہ سے رسول کے ایک حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تو وہ وجہ طعن کیوں ہے، کہ نائب بہر حال نائب ہے وہ اصل سے بہر حال کمتر ہوتا ہے!

اعتراض (۴)۔ چوتھا اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کبھی کوئی ایسا کام ذمہ نہیں کیا جو اقامت دین و شرع سے تعلق رکھتا ہو، اور جس شخص میں ایک بھی دینی امر کی ولایت کی قابلیت نہ ہو وہ ولایت عامہ کی قابلیت کیسے رکھ سکتا ہے۔

جواب:۔ اس اعتراض کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جاسکتا ہے۔

(۱) ان کا یہ دعویٰ سراسر محوط بہتان اور محض فریب ہے دونوں فرقوں کی سیر و تاریخ کی کتابوں سے بالاتفاق یہ ثابت ہے، اور صحیح بھی ہے کہ اھلک شکست کے بعد جب یہ خبر ملی کہ ابوسفیان شکست و پشیمانی پر بہیم نام ہے اور مدینۃ النبی پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مقابلہ کے لئے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو متعین کر کے آپ کو رخصت کیا۔ چوتھے سال ہجرت، غزوہ بنی النضیر میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دولت خاند تشریف لے گئے۔ چھ سال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی لحيان کے لئے تشریف لے گئے تو آپ کی آمد کی خبر سنکر یہ قبیلہ پہاڑ کی چمٹوں پر قلعہ بند ہو گیا۔ آپ نے دو ایک روز ویاں قیام فرما کر مختلف اطراف میں فوجی دستے روانہ فرمائے، ان میں سب سے اچھا دستہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زیرِ کمان تھا، جو کراع الغمیم کی سمت روانہ ہوا۔ غزوہ تبوک کو وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم، نے اعلان فرمایا کہ لشکرِ مدینۃ النبی سے نکل کر ثینۃ الوداع۔ مقام پر جمع ہو لگاؤ اور ان کے امیر جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں چنانچہ آپ ہی کی صوابدیر پر سارے کام انجام پائے۔ غزوہ خیبر کے موقع پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دردِ شقیقہ لاحق ہوا، تو قلعہ کا محاصرہ کا معاملہ درپیش تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر قلعہ پر حملہ کا حکم دیا۔ اور اس دن کتاب صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑی سخت لڑائی لڑی۔ ساتواں سال، آپ ہی کو بنی کلاب کی سرکوبی کے لئے روانہ فرمایا۔ اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو مع سالار آپ کی ہمرکابی میں رکھا پھر آپ نے بنو کلاب سے جنگ کی، ایک جماعت کو تہ تیغ کیا، ایک جماعت کو قیدی بنالیا۔ اور بنو فزارہ پر بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی امیر لشکر تھے چنانچہ حاکم نے سلمہ بن اکوع سے یہ روایت بیان کی کہ

أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَا بَكْرٍ فَقَدْ فَعَلْنَا مَا سَأَلْتَنِي فَنَزَلْنَا فَنَزَلْنَا مِنَ الْمَاءِ أَصْرًا أَبْزَلْنَا بَنُو بَكْرٍ فَكُنَّا فَعَلْنَا مَا سَأَلْتَنِي أَهْلَهُمْ أَصْرًا أَبْزَلْنَا بَنُو بَكْرٍ فَكُنَّا لِمَا سَأَلْتَنِي إِلَى أَخِيرِ الْحَدِيثِ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا چنانچہ ہم نے بنو فزارہ سے جنگ کی جب ہم پانی کے قریب پہنچے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں وہاں شبہ ری کا حکم دیا چنانچہ ہم نے وہاں رات گزاری۔ صبح کی نماز کے بعد جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہم نے حملہ کیا۔

معاذ اور عقیب السیر میں مسطور ہے کہ غزوہ تبوک کے بعد ایک اعرابی رہنمائی دے کر حضور صلی اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ عربوں کی ٹکڑی وادی الرول میں مقیم ہے جو شجرِ نخل مانے کا ارادہ رکھتی ہے، تو حضور صلی اللہ وسلم نے جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا ان کو اپنا نشان دیکر اس ٹکڑی کی سرکوبی کے لئے روانہ فرمایا۔

اسی طرح جب بنی عمرو بنی عوف کی خانہ جنگی ہوئی تو حضور صلی اللہ کو اس کی اطلاع ظہر کے بعد ملی آپ فوراً ہی اصلاح احوال اور صلح و صفائی کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے اور جاتے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرما گئے کہ نماز کے وقت میں نہ آسکوں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عصر کی نماز جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

نواں سال جب حج فرض ہوا تو اسی سال بعض وجوہ کی بنا پر حضور کا تشریف لے جانا ملتوی رہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب میرا رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ تاکہ وہاں جا کر خود بھی ادائیگی مناسک حج میں مشغول ہوں اور دیگر موجودہ افراد کو اس عظیم الشان عبادت کے قواعد سے آگاہ کریں اور ہمسہ وفات کے بیچ الاول کے ساتھ اول کی، شب پنجشنبہ سے دوشنبہ کی صبح تک کی نمازوں کے لئے نائب مقرر فرماتا۔ تو اتنا مشہور واقعہ ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

اب آپ غور کریں کہ وہ دینی امور جن کا تعلق رئیس امام، خلیفہ سے ہو سکتا ہے وہ جہاد، نماز اور حج یہ تین ہی تو ہیں۔ اور ان تینوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موجودگی میں خلیفہ اول جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا۔ اب وہ اور کون سا دینی امر رہ گیا ہے جس میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نیابت، ولایت، یا امامت کی لیاقت و قابلیت نہیں رکھتے تھے،

(۱) ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ جیسے یہ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اس کا سبب وہ نہیں جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مملکت میں ان کا منصب و درجہ وزیر و مشیر کا تھا۔ کہ اہم دینی امور کے فیصلہ کے وقت آپ ان کی موجودگی کو ضروری خیال فرماتے۔ اور ان کی موجودگی ہی میں اس قسم کے امور طے فرماتے اور رسم ریاست اور معمول سلطنت ہی یہی ہوتا ہے کہ بڑے پایہ کے امراء و وزراء کی حاضری و رہائش میں اہم اور ضروری خیال کی جاتی ہے ان کو عملداری اور فوجداری کے لئے نہیں بھیجتے۔ اور فوجی دستوں پر امیر نہیں کیا کرتے، اس لئے کہ اہم اور بلند مرتبہ امور ان کی بغیر موجودگی کے سبب ابتری کا شکار ہوتے ہیں اور یہ وجہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائی چنانچہ حاکم نے حدیث بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ میں چاہتا ہوں کہ در دراز کی جگہوں پر لوگوں کو دین کی تعلیم و ترویج کے لئے بھیجوں، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں کو بھیجا تھا۔ مگر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس تو ان کے پایہ کے افراد موجود ہیں مثلاً ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ **اِنَّهُ لَافْعَىٰ عَنْهُمْ اِنَّهُمْ اَمِنَ الَّذِيْنَ كَانَتْ سَمْعُ وَ الْبَصَرُ**۔ بات یہ ہے کہ میں ان دونوں سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتا کیونکہ دین کے لئے یہ دونوں آنکھ، کان کی طرح ہیں۔

علاوہ ازیں حضور صلی اللہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار وزیر مرحمت فرمائے دو اہل زمین سے یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، اور دو آسمان سے یعنی جبریل و میکائیل علیہما السلام،

(۲) اگر کسی کی تلاطمی، کی دلیل ہی یہ ہے کہ اس کو کسی اہم کام کے لئے بھیجا نہ گیا ہو، تو یہ حضرت جناب حسنین رضی اللہ عنہما کے متعلق کیا کہیں گے؟ کہ ان کو بھی جناب امیر علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کسی ذمہ داری کے کام سے باہر نہیں بھیجا۔ تو کیا ان کو بھی امامت کا نااہل سمجھتے ہیں؟ جبکہ ان کے علانی بھائی جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سے کاموں پر مامور فرمایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے والد محترم، آپ ہی کو لڑائیوں اور خطرناک کاموں کے لئے کیوں بھیجتے ہیں اور حسنین رضی اللہ عنہما کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرتے، آخر اس میں کیا راز ہے؟ اس کا جواب انصاف پسند امام زادے نے اپنی شان شایاں دیا اور فرمایا کہ ہمارے باپ کی اولاد میں جناب حسنین رضی اللہ عنہما ان کے لئے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے دو آنکھیں۔ اور دوسری اولاد ان کے لئے ہاتھ پاؤں ہیں، تو جب تک ہاتھ پاؤں سے کام نکل سکے آنکھوں کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت! اور انسانی فطرت بھی یہی ہے کہ آنکھ پر کوئی

آفت آئے تو بلا اختیار عامۃ اس کی ڈھال بن جاتا ہے۔

اعتراف (۱۵)۔ پانچواں اعتراف یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے امور کا متولی بنایا، اور پوری امت کا ان کو خلیفہ بنا دیا، حالانکہ حضور صلی اللہ کے عہد مبارک میں وہ صرف ایک سال کے لئے صدقات کی وصولی پر مامور ہوئے تھے۔ پھر اسی خدمت سے معزول ہوئے، اور پیغمبر علیہ السلام کے معزول کردہ کو پھر بحال کرنا اور خدمت سپرد کرنا پیغمبر علیہ السلام کی کلم کھلا مخالفت ہے!

جواب :- یہ اوندھی منطق کسی انتہائی بے وقوف ہی کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ معزول کیے گئے! یہ خود کہتے ہیں کہ ان کو وصولی صدقات کی خدمت ایک سال کے لئے سپرد کی گئی تھی۔ جب انہوں نے یہ خدمت ایک سال تک انجام دے کر وہ کام سرانجام دے دیا، اور اپنی ذمہ داری پوری کر دی تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ معزول کر دئے گئے۔ اگر معزول اسی طرح ہوتا ہے تو کیا یہ لوگ بعد موت انبیاء و ائمہ کو بھی معزول سمجھتے ہیں؟

(۳) اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معزول ہی مانا جائے تو ان کی معزولی حضرت ہارون علیہ السلام جیسی ہوگی۔ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ طور سے واپس تشریف لائے، تو یہ نہایت و خلافت سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن پھر جب مستقل نبی ہوئے تو اس سبکدوشی نے آپ کی قابلیت و لیاقت امامت و نیابت میں کوئی نقص پیدا نہیں کیا۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں ایسا کیوں نہ سمجھا جائے جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ كَمَا كَانَ عُمَرُ (میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے) معلوم ہوا کہ ان کی سبکدوشی ان کی لیاقت امامت و خلافت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوئی۔

(۳۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تو اس وقت لازم آتی کہ آپ اس کی ممانعت فرمادیتے اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کو برسر کار کرتے، اور معاملہ ایسا ہے ہی نہیں۔ اس لئے مخالفت لازم ہی نہیں آتی۔ یہاں تو صورت یہ ہے کہ ایک کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد نہیں فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ ان کے سپرد کیا۔ اگر مخالفت رسول کے یہ معنی ہوں کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو، وہ دوسرے نے کر دیا تو نعوذ باللہ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بردار ما ہونا بھی مخالفت ہوگی،

اعتراف (۱۶)۔ یہ اعتراف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا۔ اسی طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں دونوں حضرات کو دیا۔ اگر یہ حضرات سرداری و ریاست کی قابلیت رکھتے یا ان میں افضلیت اور اولیت ہوتی تو ان کو سردار بناتے اور دوسروں کو ان کا ماتحت کرتے۔

جواب :- اس معنی اور اعتراف کے رد میں کئی پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی اور جواب دیا جاسکتا ہے۔

اول۔ ان حضرات کو امیر نہ بنانا ان کی عدم لیاقت اور عدم افضلیت کو ثابت کرتا ہے۔ تو لامحالہ ان کو امیر بنانا، ان کی قابلیت اور افضلیت کو ثابت کریگا۔ مگر پہلے تو ایک سوال درپیش ہے کہ کیا شیعہ حضرات عمرو بن عاص اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کی لیاقت امامت اور افضلیت کا اعتقاد رکھتے ہیں؟ اور اسے ماننے کو تیار ہیں؟ اگر ان کا جواب اثبات میں موجود ہو تو اہل سنت کو اس کے جواب کی ضرورت برپا کی ورنہ نہیں۔

دوم :- معقول کو افضل پر امیر بنانا نہ افضل میں کسی کو تاہی اور بُرائی کو ثابت کرتا ہے اور نہ معقول میں افضلیت اور امامت کبریٰ کی لیاقت ہی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر کسی خاص کام میں کسی کو سربراہ بنادینا کسی خاص جزئی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

یعنی وہ فاس کام ہفتوں ہی کے ہفتوں ہمام پاسکندہ، انفس کا وہ شاہکار نہیں بڑا جیسا کہ حضرت عمر بن عاص کی سربراہی میں ہوا۔ لیونکہ وہ جوڑ ٹوٹ اور جلد تندر اور چکر کرے کہ کام لکھا ہے، مشاقی رنجے۔ اور مقصد بھی یہی تھا کہ جنگی چالوں اور جملہ دند پر سے دشمن کو مات دی جائے اور اس کا قلع قمع کر دیا جائے ایک دوسری بات یہ بھی کہ وہ دشمنوں کی عیاریوں، چالوں اور گھاتوں کو خوب سمجھتے اور ان کے پوشیدہ راستوں سے بخوبی واقف تھے۔ جبکہ افضل حضرت اتنے واقف نہ تھے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ چور پکڑنے یا راستہ کو خطرات سے پاک کرنے کے لئے، محققوں اور فوجداروں ہی کا انتخاب ہوتا ہے، امیر الامراء وغیرہ کے سپرد ایسی خدمات نہیں ہوتیں۔ یا کسی خاص کام کی سربراہی میں سربراہ کیلئے تسلی و تسفی مقصود ہوتی ہے جیسے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں کہ شامی اور رومی افواج کے ہاتھوں ان کے زائد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے، اس لئے ان کو اس ہم کار سربراہ بنایا گیا تاکہ اپنے ہاتھوں ان کا انتقام لیں، ایدیوں ان کے دل کو صبر اور قرار آئے،

سوم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر جن کو ملت اسلام کی سربراہی کی مسند اراستہ کرنی ہے، اور ہزاروں لاکھوں مانتوں سے سابقہ پیش آنا ہے، ان کو اس کی بھی تربیت ہو جائے کہ ماتحتی کے زمانہ میں کیا عالم ہوتا ہے، کیا جذبات ہوتے ہیں، کیا مراحل درپیش ہوتے ہیں، اور اپنے سربراہوں کے ساتھ کیا معاملات پیش آتے ہیں، زیر دستوں اور ماتحتوں کی کس طرح دیکھ بھال، غور و پرداخت ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں اسی وقت معلوم ہوتی ہیں، جب آدمی خود بھی اس عالم سے گذر ہو، اور خود بھی کسی کا ماتحت رہ چکا ہو، تو گویا یہ تابعداری اور ماتحتی ایک مرحلہ تربیت و تعلم ریاضت و سلیقہ و مارت حق تاکہ ایسے لوگوں کے جذبات و خیالات اور حالات سے واقفیت کی بنا پر آگے چل کر ان سے کام لینے، یا ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کمی و کوتاہی نہ رہے، چنانچہ ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تربیت پائی تھی اسی کا طفیل تھا کہ ہر دو حضرات رضی اللہ عنہما اپنے امراء اور اپنے لشکریوں کی ایسی خوش اسلوبی اور حسن انتظام کے ساتھ رکھتے تھے کہ جس سے بہتر انتظام اور اچھے ثمرات حاصل ہوتے تھے۔ پیادہ سے لے کر کمانڈر تک اپنے امیر کا وفادار اور ان کے حکم کی بجا آوری میں ہمہ دم مستور اور شریک رہتا۔ نہ امراء کے دماغ میں بغاوت و خود مختاری کے جذبات بھڑکتے نہ لشکریوں میں اپنے نرائض سے غفلت و کلامی سستی راہ پاتی یا بے رغبتی ظاہر ہوتی۔ نہ امیر اپنے لشکریوں پر ظلم و تعدی کرتے نہ لشکری حکم عدولی یا تصور تک کرتے یا بغاوت کی سوچتے۔ رعایا امن میں سے تھی، اور مطمئن زندگی گذارتی تھی۔ غنائم و فتوحات میں روز بروز اضافہ اور زیادتی تھی یہ حالات و واقعات واقفان فن سیرت پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اور اتنے ہی یقینی جیسے گذر ہوا کل! ایسے امور واقعہ میں شیعوں کی کوئی دھاندلی اور ایج بیج نہیں چلتے، ان کا زور تو وہی یا توں یا شیخ چلی کی گھاتوں میں ہی چلتا ہے، کہ اگر یوں ہوتا خوب ہوتا ووں ہوتا تو بہتر ہوتا! **اعتراف** (۱)۔ اعتراف ہے کہ انتخاب خلیفہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز کے خلاف کیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ جبکہ باوجود اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے یہ جانتے تھے کہ کیا بات مصلحت ہے اور کیا فساد ہے، اور پھر آپ کو اپنی امت سے جس قدر شفقت و مہربانی اور رافت تھی وہ بھی ظاہر ہے، مگر اس سب کے باوجود آپ نے اپنی امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

جواب:۔ اول۔ تو یہ بات سفید جھوٹ ہے اور ہمتان! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔ کیا شیعہ یہ نہیں کہتے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا۔ (یہ بعض ابوبکر دشمنی انتہا بھرا ہوئے کہ اپنے پاؤں آپ کا ہٹاری ماری۔ اور بالواسطہ یہ مان گئے کہ جناب امیر کو بھی حضور سے سند امامت حاصل نہیں کیونکہ کسی

میں جناب امیر یقینا شامل ہیں۔ (۵) لہذا اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر دیا تو ان شیعوں کو تو یہ کہتے ہوئے شرمانا چاہیے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ یہ جواب تو شیعہ متعقلات کی بنیاد پر ہے، اور اگر گفتگو کی بنا محققات اہل سنت پر ہو تو محققین اہل سنت نماز و حج میں جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے قائل ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رمز شناس آپ کے کاموں کے وقفہ سنج اور آپ کے اشاروں کے راز دان تھے، ان کے لئے یہ اشارات کافی تھے۔ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلہ کو تحریری شکل صرف اس لئے دی کہ آپ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ عرب و عجم کے نو مسلم تصریح و تنصیف کے اور بدو و فاقی مجددانے کے اس سے واقف نہ ہو سکیں گے۔

دوسرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صراحت کے ساتھ خلیفہ مقرر نہ کرنا اس بنا پر تھا کہ آپ وحی ثرانی، اور لہام سبحانی سے بالیقین بہرہ مند تھے کہ آپ کے بعد جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ ہوں گے۔ مگر زیدہ اصحاب اس پر اتفاق کریں گے اور کسی دوسرے کو اس میں دخل اندازی کی تاب و مجال نہ ہوگی۔ چنانچہ اہل سنت کی کتب صحیحہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً: **قَالَ عَلِيٌّ لَا تَقْبَلُ يَمَّةَ ابْنِ ابِي بَكْرٍ** آپ نے ابوبکرؓ کی تقدیم کے سوا کوئی صورت قبول نہ کی، یا حدیث **يَا بَنِي اللَّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** اور سلمان ابوبکرؓ کے علاوہ کسی کو قبول نہ کریں گے، یا حدیث **فَإِنَّهُ الْخَلِيفَةُ مِنْ بَعْدِي**۔ (میرے بعد وہی خلیفہ ہیں)۔ جب یہ یقین تھا تو پھر خلیفہ بنانے اور عہد نامہ لکھنے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ مرنے آخری چھپانے جناب ابوبکرؓ اور ان کا جہیز اسے کو بلایا بھی تھا کہ اس سلسلہ میں ایک تحریر لکھو ا دیں۔ مگر پھر فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اور مسلمان خود بخود سوائے ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ کے کسی اور کو خلیفہ نہیں بنائیں گے اب لکھنے کی حاجت کیلئے اس لئے آپ نے ارادہ ترک فرمادیا۔

بخلاف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کہ نہ آپ پر وحی اتری تھی اور نہ آپ کو اس کا قطعی علم تھا۔ اور نہ ہی قرآن سے اس کا پتہ چلا ہے تھے کہ لوگ بلا شک و شبہ میرے بعد جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا لیں گے۔ ہاں آپ اپنی سوچ بوجھ سے یہ ضرور یقین رکھتے تھے کہ دین و ملت کے لئے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت، اصلاح اور مفید ہوگی۔ اس لئے یہ بات ان کے لئے بمنزلہ فرض ضروری تھی کہ جس بات میں امت کی بہتری اور صلاح ہے اسکو رد و لغل لائیں۔ بجز اللہ آپ کی عقل سلیم نے صحیح کام کیا کہ شوکت دین، انتظام امور سلطنت اور کافروں کی خواری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جس قدر ہوئی تاریخ عالم اسکی مثال و نظیر پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہے،

تیسرے یہ کہ خلیفہ نہ بنانا ایک الگ بات ہے، اور اس سے منع کرنا الگ بات مخالفت اس وقت تو ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلیفہ بنانے سے منع فرمادیتے اور جناب صدیق رضی اللہ عنہ اس کے باوجود خلیفہ مقرر فرماتے، یہ صورت مخالفت کی نہیں ہے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا وہ کام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کر لیا۔ اس تسلیم نہ کرنے کی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے منتخب فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی ہو، **أَعْرَضَ عَنْ (۸) - اعتراف کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ** کہتے تھے **إِنَّ لِي شَيْطَانًا يَعْتَرِينِي فَإِنْ اسْتَقَمْتُ فَأَعِينُونِي وَإِنْ سَاءَتْ فَعَصُونِي**۔ میرے ساتھ ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ہاتھ بٹاؤ، اور اگر ٹیڑھے راستہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو اور جس کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہو اور اسے راہ بھٹا دے وہ امامت کے قابل نہیں۔

جواب :- اول یہ ہے کہ یہ روایت اہل سنت کی معتبر کتابوں کی رو سے صحیح نہیں! اس لئے ایسی روایت سے ان کو الزام نہیں دیا

جاسکتا۔ بلکہ جو صحیح روایت ثابت شدہ ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ اپنی وفات کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلا کر جو وصیت فرمائی وہ یہ تھی وَاللّٰهُ وَمَا لَمْ يَنْتُ فَمُحَمَّدٌ وَمَا شَبَّهْتُ فَمُحَمَّدٌ وَرَأَيْتُ لَعْلَى السَّيْلِ مَاءً مَّائِةٌ وَكَذَلِكَ جُهِدُ أَوْ رَأَيْتُ أَوْ حَيْدُكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ۔ دیکھو اس میں سو یا کہ خواب پریشان دیکھتا۔ نہ شبہ میں پڑا کہ تو حیات میں ابھتا۔ میں یقیناً سید سے راستہ پر ہوں، بہکا نہیں۔ میں نے کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور میں تم کو بھی اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور مسئلہ خلافت طے ہونے پر آپ نے پہلا خطبہ جو دیا وہ یہ تھا۔

”اے رسول کے ساتھیوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ تو ہوں لیکن دو باتوں کی مجھ سے ہرگز امید نہ رکھنا۔ ایک وحی کی، دوسرے شیطان سے عصمت کی،“ آپ کا یہ خطبہ مستدام احمد، اور اہل سنت کی دوسری کتب میں موجود ہے، اس خطبے کے آخر میں یہ بھی ہے کہ وہ میں معصوم نہیں ہوں۔ پس تم پر میری اطاعت انہیں امور میں فرض ہے جو خدا کی شریعت اور پیغمبر کی سنت کے موافق ہوں۔ ان کے خلاف اگر میں کچھ کہوں تو اسے نہ مانو بلکہ مجھے ٹوکو،“ اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہے جو سراسر انصاف پرستی ہے چونکہ لوگ ریاست پیغمبر کے عادی تھے، اور اپنی ہر مشکل وحی الہی کی طرف رجوع کر کے حل کرتے تھے، اور پیغمبر کی معصومیت کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر بات بے چون و چرا قبول کیا کرتے تھے، اس لئے اب بدلے ہوئے حالات میں خلفائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ضروری تھا کہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ یہ دونوں خصلتیں پیغمبر کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ انہیں میں پائی جاتی ہیں، ان کے علاوہ کسی میں نہیں۔ چاہے وہ ان کا نائب ہی ہو۔ ا وہ نائب چاہے خود رسول اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا ہو یا امت نے انہیں اپنا امیر اور نائب رسول منتخب کیا ہو!

دوسری بات یہ کہ کلمی میں جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ بطریق صحیح روایات صحیحہ موجود ہیں، ”کہ ہر مومن کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اسکو بیکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے،“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث میں یہ ارشاد بھی ملتا ہے۔ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَرَّكَلٌ بِهِ قَرْنَيْنِ مِنَ النَّجَسِ۔ (تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ ایک جن صاحب مقرر نہ کیا ہو) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کا بھی کوئی شیطان ساتھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں ہے تو پر اللہ تعالیٰ نے اس پر مجھے غلبہ دیدیا ہے اس لئے میں اس کے شر سے بچا رہتا ہوں، اب قابل غور بات یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور اس کی وجہ سے کار و منصب نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت میں کیوں فرق پڑے گا۔ کیونکہ خلیفہ و امام امتی ہونا ضروری ہے اور شیطانی خطرہ امتی کو بھی دانگیر رہتا ہے۔ لیکن تقویٰ کی برکت سے وہ شیطان کی چالوں کو بھانپ جاتا ہے اور اس کے دام میں آنے سے بچ جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ الْكَافِرِينَ الْغَوَّارَ إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ۔
پیش آتے ہیں تو وہ فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

ہاں اس شخص کی خلافت و امامت کو ضرور نقصان پہنچتا ہے جو شیطان سے مات کھا جائے اور اس کے پچھ لگ جائے! اپنی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے۔ اور جو وہ کہے کرے۔ اور پھر توبہ تلا کر کے تلافی بھی نہ کرے ارشاد ربانی ہے وَارْجُوا أَنفُسَكُمْ يَوْمَ تَذَكَّرُونَ۔ اور شیطان کے چیلے (قابو یافتہ) کو گمراہی میں گھسیٹے لئے جاتے ہیں۔ پھر وہ کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ اور ہر تہہ پہنق و فجور کا جو لیاقت امامت و خلافت میں بالاجماع یقیناً غفل انداز ہوتا ہے!

تیسرے۔ اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا فرمایا بھی ہو تو اس کے باوجود آپ کے منصب خلافت و امامت میں کوئی فرق نہ

اے تو اس میں نوب اور ایامات ہے، کیونکہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو ناب و خلیفہ برحق ہیں اپنے ساتھیوں سے برملا اسی قسم کا کلام فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے یہ اقوال ضرور شعور کی اصح الکتابہ و نج البلاغہ میں موجود ہیں، ابک توں آپ کا اسی کتاب کے اور ان مابین میں ملاحظہ کر چکے ہیں یعنی

لَا تَقُولُوا عَنِ مَقَالَةٍ مِثْلَ أَوْ مَشْرُورَةٍ بَعْدَ لِي ذَاتِي
كُنْتُ بِفَوْقِ أَنْ أُخْطِئَ وَلَا أَمِنْ ذَلِكَ مِنْ فُطْنِي

اور پھر اس سے کہ کو انکا کی مجال ہے کہ شیطان نے حضرت اوم علیہ السلام کو بہکا یا تھا۔ اور ان کے ذریعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ ان کے بہکاوے میں اُن کے سب سے ہی تو آپ جنت سے اس خاکدان تیرہ و تار میں بھیج دئے گئے تھے۔ حالانکہ وہ خلیفہ تھے اور خلیفہ رسول بھی نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے۔ ان کے پاس تو انی جبار علیہ الرحمۃ کی فدائی سند بھی تھی۔

اور کون حضرت داؤد علیہ السلام کے خلیفہ بنی الارض ہونے سے منکر ہوگا کہ وہ خلافت پر یا داؤد اِنَا جَعَلْتُ لَكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ کی دلیل قاہر رکھتے تھے۔ پھر وہ بھی شیطان کی رہ سے اور یا کی بیوی کے معاملہ میں لکھتے پریشان ہوئے۔ بالاخر تنبیہ الہی کا ثبوت بنے۔ اور توبہ استغفار کی نوبت آئی۔ اور کیا کہیں گے اور ادخوان شیعہ جنہوں نے جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا صحیفہ کاملہ دیکھا ہوگا آپ کی دعا گوش ہوش سے سنی ہوگی کہ آپ اپنے لیے کیا ارشاد فرما رہے ہیں،

قَدْ مَلَكَ الشَّيْطَانُ عَيْنَانِي فِي مَوْجِبِ الظَّنِّ وَضَعَفَ
الْيَقِينُ وَإِنِّي أَتَكُونُ مَوْجِبًا وَرَتَبَةً وَطَاعَةً فَفَسَّيْ
لَهُ

اور اب دونوں حضرات کی عبارات کو میزان عدل میں تول لیجئے، ایک پلڑے میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ یَعْقُرُ فِخْزِ اور ان دُغْتُ کو رکھئے اور دوسرے میں جناب سجاد رحمۃ اللہ کے مَلَكَ عَيْنَانِي وَطَاعَةً فَفَسَّيْ رکھئے! اور اسی کے ساتھ اس قضیہ حلیہ کو بھی پیش نظر رکھئے جو آپ کے کلام میں واقع ہے جو نسبت بالبرہن بین الطرفين سے وقوع طریق پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی آپ کے کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی یاگ شیطان نے قبضہ میں لے لی تھی، اور آپ کا نفس اس کی پیروی کرنے لگا تھا۔

دوسری طرف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قضیہ شریہ بھی قابل لحاظ ہے۔ (رَہْ دُغْتُ جو وقوع طریق کا ہرگز متقاضی نہیں۔ یعنی آپ بطور شرط فرما رہے ہیں کہ اگر میں کچھ رو ہواؤں۔ اور کچھ رو ہواؤں، اور کچھ رو ہو گیا، میں جو زمین و آسمان کا فوق ہے وہ معمولی فہم شعور رکھنے والے سے بھی پوشیدہ نہیں۔) اور یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ صرف شیطان کے کلمات میں لگنے سے کیا نقص و نقصان ہے جبکہ وہ مقصد میں ناکام رہے۔ (اگر آپ کی جیب محفوظ ہے تو کسی جیب تراش کے پیچھے لگنے سے آپ کا کیا نقصان ہے؟) بلکہ یہ توفضیلت و تعریف کی بات ہے۔ کہ آپ اتنے نیدار اور چوکے اور اس کے حربوں سے اتنے واقف تھے کہ وہ عمر بھر سرگشتا رہا مگر آپ کو انگلی تک نہ لگا سکا۔ آپ پر قابو پانا تو دور کی بات ہے۔ (ن) اور آخر میں سورہ یوسف میں ۱۲ بارہ کی پہلی آیت کا یہ حصہ اور دیکھ لیجئے وَمَا أُجِدُّ نَفْسِي۔ اِنَّ النَّفْسَ لَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (لَا مَكْرَ حَصْرَ دَلِي۔ میں اپنے نفس کو بری الذمہ نہیں کرتا وہ تو بے شک بُری باتوں ہی کا حکم دینے والا ہے بل یہ کہ میرا رب تم فرمائے۔ تقاضائے دین و دیانت تو یہی ہے کہ اس آیت کی موجودگی میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صرف اس کلمہ کے باعث آپ کو منصب خلافت سے نہیں گرانے، اور اس کو موجب طعن و اعتراض نہ بنانا چاہئے۔) مگر اسم کو ان سے وفا کی ہے امید۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

اعتراف ۱۹: ان اعتراض یہ ہے کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ **اَلَا اِنَّ بَيْعَةَ اَبِي بَكْرٍ كَانَتْ فِتْنَةً وَفِي اللّٰهِ وَالتَّوْحِيدِ شَرٌّ كَمَا فَمَنْ عَادَ اِلَى مِثْلِهَا قَاتِلُوْهُ**۔ بے شک ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک تھی، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس کے مضر سے بچالیا۔ اب اگر دوبارہ کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دو! صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب ان کا بھی یہی ہے۔ لہذا یہ روایت صریح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت، اچانک، بے مشورہ اور بے تاہل عمل میں آئی اور بغیر اس کے کہ ان کی بیعت کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی کوئی دلیل دی جاتی ان کو خلیفہ بنادیا گیا۔ گویا آپ کی خلافت کی کوئی بنیاد نہیں تھی اور یوں آپ خلیفہ برحق نہ ہوئے،

جواب: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک صاحب یہ کہتے تھے کہ عمرؓ اگر مر گئے تو میں فتنہ شخص سے بیعت کر کے اس کو خلیفہ بناؤں گا، جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی تو شروع میں ایک دو حضرات نے بیعت کی تھی اور خلیفہ ہو گئے تھے اور پھر سارے ہاجرین و انصار ان کے پیچھے ہوئے! صحیح بخاری میں بھی یہ بات مذکور ہے۔ تو دراصل جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا کلام اس شخص کے جواب میں تھا۔ اور اس سے آپ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ایک دو آدمیوں کی اچانک بیعت بغیر غور و فکر اور ارباب حل و عقد سے مشورہ کے درست اور صحیح نہیں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں جو ہوا وہ اگرچہ اچانک اور بلارے و مشورہ ہوا تھا۔ مگر نتیجہ وہ متمکن و برقرار ہے اور لوگوں نے اسے قبول کر لیا گویا حق بحق دار رسید کا معاملہ ہوا اور کوئی ناحق بات نہیں ہوئی،

ربا آپ کے معاملہ میں دلائل کا سوال وہ تو پہلے سے موجود تھیں، مثلاً نماز کی امامت سپرد کرنا، اور دوسرے حالی مقامی قرائن جو ان معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ برتتے تھے۔ اور جن سے تمام صحابہؓ پر آپ کی افضلیت ثابت ہوتی تھی، ان امور کی وجہ سے کسی دوسرے آدمی کو آپ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اگر کوئی دوسرا ایسا کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیے! کہ اس نے رسول طریقہ انتخاب کو جو واجب ضروری ہے نظر انداز کیا اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا سبب بنا۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کلام سے شیعوں نے دانستہ ایک جملہ نقل نہیں کیا کہ کہیں ان کے اعتراض کی کمزوری ظاہر نہ ہو جائے۔ آپؓ نے آخر میں **وَالْيَوْمَ مِثْلُ ابْنِ بَكْرٍ**۔ تم میں سے کون ابوبکرؓ کا ہمسر ہے، کہ ان سے افضلیت و نیکی و بھلائی میں بڑھا ہوا ہو، اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کے حق میں بھی مشورہ، غور و فکر کی حاجت نہیں! پس معلوم ہوا کہ آپ کے الفاظ **وَفِي اللّٰهِ شَرٌّ** کے یہی معنی ہیں کہ سقیفہ بنی ساعد میں گو آپ کی خلافت میں عجلت کی گئی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس عجلت کے مضر سے مسلمانوں کو بچالیا۔ اور یہ عجلت ہی رفع فساد کا سبب بن گئی۔ اور جو خطرہ درپیش تھا وہ وقوع میں نہ آسکا یہ معلوم ہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد نیابت کے سلسلہ میں انصار مدینہ رضوان اللہ علیہم چاہتے تھے کہ یہ منصب انصار کے پاس لے۔ اس وقت اگر فتنہ بحث و تمحیص، اور مشاورت کی راہ اختیار کی جاتی تو حالات بے قابو ہو جاتے،

یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بیدار مغزی، روشن ضمیری اور دانائی تھی کہ آپ نے فتنہ کے سد باب کے لئے وہ راہ اختیار کی کہ بعد میں موافق و مخالفت سب نے اسے محسوس کیا، اسی کو راہ صواب مانا اور رضا و رغبت سے اس بیعت کو قبول کیا اور برقرار رکھا۔ کسی نے اسے ناحق نہیں کہا اور نہ کسی کے خیال و دہم میں یہ بات آئی کہ اس منصب پر کوئی نااہل مقرر کر دیا گیا ہے۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس قول بالا سے یہ سرا تو ہرگز نہ تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت صحیح نہ تھی کسی ناگزیر صورت سے بچنے کے لئے اس کو قبول کیا گیا۔ یا ان کی خلافت درست نہیں تھی۔ کیونکہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت عمرؓ

اور جناب ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما دونوں ہی تھے۔ دوسروں نے پھر اس کے بعد بیعت کی۔ بیعت کے وقت ان دونوں حضرات نے کہا تھا اَنْتَ خَيْرُنَا وَ اَفْضَلُنَا دَآپ ہم میں سے بہترین اور افضل ترین ہیں، اور کسی بھی ہمارے یا انصاری نے اس جملہ کو نہیں جھٹلایا بلکہ تسلیم کیا۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت، نبکی و جلالی مسلم اور قطعی الثبوت تھی! اور انصار رضوان اللہ علیہم کا اختلاف بھی صرف اس بات پر تھا کہ خلیفہ انصار میں سے بھی ہونا چاہیے۔ اس پر نہ ان کو اعتراض تھا نہ خلاف کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلافت کے لائق نہیں، چنانچہ اہل سنت کی صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس مجلس کے بعد آپ سے بیعت کر لی تھی اور خود جناب علی مرتضیٰ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی نہ صرف بیعت فرمائی بلکہ ابتدا میں عدم بیعت کا عذر بھی بیان فرمایا اور شکایت بھی کی کہ ہم سے مشورہ کیوں نہ لیا گیا۔ اور جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صورت حال کا تجزیہ کر کے بتایا کہ انصار کی پرغاش اور حالات کو دگرگوں ہونے سے بچانے کی خاطر یہ جملت کی گئی تو ان دونوں حضرات نے اس کی تدبیر کی تھیں نہ ان کی اور اسے مان بھی لیا۔ اہل سنت کے تمام صحابہ میں یہ قصہ بطور تو اترا سی طرح مقبول و مشہور ہے اور اگر ان شیعوں کو جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلیل کے طور پر بہت پسند ہے تو نقصانائے شرافت و انصاف ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وہ تمام اقوال جو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات یا خلافت کے بارے میں آپ نے فرمائے ہیں وہ بھی قبول کریں۔ انہیں سامنے رکھ کر موازنہ کریں کہ اس قول کو باقی اقوال سے کیا نسبت ہے! ایسی عجیب بات یہ عجوبہ فرقہ ہی کہہ سکتا ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے معتقد نہ تھے اور اسے درست نہ سمجھتے تھے:

اعتراف اصرار (۱) دسواں اعتراض یہ ہے کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ: كُنْتُ بِبَيْتِكُمْ وَ عَلَيَّ ذِكْرُكَ عَلَىٰ كَيْفِ مَوْجُودِکِ میں میں تم میں کا اچھا نہیں ہوں اگر وہ اس قول میں کچھ تھے تو قابل امامت نہ ہوئے کہ افضل کے ہوتے مفضول لائق امامت نہیں۔ اور اگر ان کا قول یہ جھوٹ تھا تو ویسے قابل امامت نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فسق امام ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

جواب: — پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت اہل سنت کی کسی کتاب میں بھی موجود نہیں۔ نہ بطریق صحیح نہ بطریق ضعیف۔ اب پہلے تو وہ اہل سنت کی کسی کتاب سے یہ روایت کھوج کھاج کے لائیں اور پھر جواب مانگیں۔ شیعوں کی من گھڑت غلط روایات کا ہمارے لئے کراہل سنت پر الزام لگانا نہ صرف انتہائی نادانی ہے بلکہ ایک قسم کا سفلہ پن بھی ہے۔

دوسری بات یہ کہ چلو شیعوں کی دلداری میں ہم اسے مان لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جناب سجاد رحمۃ اللہ نے اپنے صحیفہ مکملہ میں جو شیعوں کے نزدیک معتد و صحیح و معتبر طریقوں سے مروی ہے یوں فرماتے ہیں۔ اَنَا الَّذِي اَفْتَنَ الدُّثُوْبَ عُمُرَةَ میں وہ شخص ہوں جس کی تمام عمر گناہوں میں گزری۔ اب اگر آپ کا قول سچا ہے تو امامت کے قابل نہ رہے کیونکہ مرتکب گناہ فاسق امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور اگر اس قول میں جھوٹ ہے تو بھی امامت کے لائق نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فسق میں امامت کی صلاحیت نہیں اب شیعہ حضرات اس کا جواب دیں اہل سنت کی طرف سے وہی جواب اپنے اعتراض کا سمجھ لیں۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے متعلق روایت بالا میں بعض شیعہ علمائے یہ الفاظ اضافہ کئے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اَقْبَلُوْنِي اَقْبَلُوْنِي بھی فرمایا جس کے معنی ہیں کہ اپنی بیعت مجھ سے واپس لے لو، گویا آپ خلافت سے استعفیٰ دے رہے ہیں اور جو امامت سے استعفیٰ دے وہ امامت کے قابل نہیں ہوگا۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس قول بالا کے ساتھ ساتھ شیعہوں کا یہ اعتقاد بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسالت و نبوت سے استعفیٰ دیا اور یہ نبوت حضرت ہارون علیہ السلام کو سنبھلا دی تھی۔ ایسی صورت میں اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خلافت سے

استغنی مان بھی لیا جائے تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے استغنی کی طرح ہوگا۔ بلکہ اس سے ہلکا ہی ہوگا کیونکہ نبوت و رسالت پر تو براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے فائز ہوئے تھے اس لئے اس سے استغنی زیادہ قبیح اور بُرا ہے، اس کے مقابلہ میں خلافت سے استغنی میں کیا برائی رہ جائے گی جبکہ خود شیعوں کے بقول یہ خلافت لوگوں نے مصلحت و وقت کے تحت آپ کو دیدی تھی۔ اور یہ حق بھی نہ تھی۔ خدا نے تو ان کو مامور نہیں فرمایا تھا۔ اور جو ریاست لوگوں کی سپرد کردہ ہو اسکو قبول کرنا اور ہمیشہ ہمیش اس پر فائز رہنا ضروری بھی تو نہیں۔ اور جن مسائل یعنی انصار مدینہ کی پرفہاش کا دفعہ مرتدین کا قلع قمع اور مدینہ النبی کو اعراب کی شورش سے بچانا کی وجہ سے یہ خدمت امامت سپرد ہوئی تھی جب خاطر خواہ ان میں کامیابی ہو چکی اس وقت استغنی میں قباحت کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ امامت و خلافت کی ذمہ داریوں کے بوجھ و مشقت کو بلحاظ دنیا و آخرت برداشت کر لینا کوئی ہنسی کھیل بھی نہیں۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مصالح امت کے پیش نظر یہ گرجا باری برداشت کر لی تھی۔ فتنوں کے فرو ہو جائے اور امن چین کے بعد اگر انہوں نے چاہا کہ اپنا بوجھ ہلکا کریں اور کسی دوسرے کے کاندھے پر یہ بوجھ ڈالیں اور خود آزادی کی زندگی بسر کریں۔ تو یہ موجب طعن کیوں ہو۔ شیعہ روایات کے مطابق تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے طمعی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کو خلافت و امامت کا کوئی لالچ نہیں تھا آپ تو اسے اپنے سر سے ہٹالنا چاہتے تھے مگر لوگ ہی اس پر راضی نہ تھے۔ عام و خاص سب ہی اس منصب کو اپنے سے متعلق رکھتے رہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ کیوں آتے ورنہ اقتدار و ریاست تو وہ چیز ہے کہ جھوٹوں بھی کسی گمراہی سے چھوڑنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہو۔ اس کے لئے تو لوگ قریبی تعلق اور رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں، برٹی سلطنت و ریاست کی بات رہی الگ ایک گاؤں کی جاگیر بھی ہو تو بھی کوئی اپنی مرضی سے اسے چھوڑ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ ایسی ریاست جو آپ کو حاصل تھی اور دنیا و آخرت کے اعزاز کی حامل تھی، اس کو چھوڑنے اور دوسروں کو دیدینے پر آمادہ ہونا تو آپ کی انتہائی بے طمعی اور زہر کا نتیجہ تھا۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود شیعوں کی معجز کتابوں اور صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد آپ خلافت کا منصب سنبھالنے پر تیار نہ تھے لوگوں کی انتہائی اصرار اور مجاہدین و انصار رضی اللہ عنہم کے بہت زور دینے پر آپ نے اسے قبول فرمایا۔ تو اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی لوگوں کی محبت، چاہچے اور اپنی خدمات پر لوگوں کے تاثرات و پسندیدگی معلوم کرنے کے لئے ایسا کیا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس سے آپ کے منصب خلافت میں کونسا نقص و قصور **احقر الخ** (اللہ گبار ہواں طعن یہ ہے کہ سورہ برأت، جب نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مکہ جاؤ، اور حج کے اجتماع میں لوگوں کو یہ سورت سناؤ۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ سورہ برأت سنانے کی ہمت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیجئے کہ یہ جا کر سنائیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے روانہ کیا اور فرمایا کہ ان سے برأت تم لے لو اور جا کر اہل مکہ کو سناؤ۔ پس جو شخص ایک حکم قرآنی کی آدائیگی کی قابلیت نہ رکھتا ہو اسکو تمام مخلوق کے حقوق کی آدائیگی پر یا پوری شریعت اور قرآن کی احکام رسانی پر کس طرح ایسی ٹھہرایا جاسکتا ہے اور اسکو امام مانا جاسکتا ہے۔

جواب :- اس روایت میں عجیب خلط ملط، یا گرد بڑ ہے اس کی بڑی اچھی مثال یہ شعر ہے
چند خوش گشت است سعدی در زینا، الا یاتھا الساقی اذ وکسا ونا وناھا۔ مطلب شعر یہ ہے کہ زینا نامی کتاب میں الیہام
والامضون شیخ سعدی نے بہت خوب کہا ہے مگر نہ زینا سعدی کی کتاب ہے اور نہ دوسرا مصرعہ اس میں ہے یہ حافظ شیرازی کا

مصرعہ ہے جو دیوان حافظ میں ایک غزل کا مصرعہ اولیٰ ہے۔ (۵) یا اس کی مثال اس فتویٰ کی طرح ہے جو مشہور ہے کہ غش غش خشخیش معاویہ رضی اللہ عنہ کی تین ٹوکوں کا کیا حکم ہے۔ اس اشارہ و کنایہ سے قطع نظر اس معاملہ کی تفصیل ملاحظہ ہو! کہ اہل سنت کی روایات اس بارہ میں مختلف ہیں۔ اکثر روایات اس مضمون کی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نیابت کے طور پر امیر مقرر فرما کر روانہ کیا تھا۔ اس وقت سورہ برأت نازل نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی روانگی کے بعد یہ سورہ نازل ہوئی، جس میں مشرکین کے نقص عہد کا ذکر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سورہ دے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھیجے روانہ فرمایا کہ ان تازہ احکامات کو بھی لوگوں تک پہنچیائیں، اب بھلا اس سے کہاں معلوم ہوا کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول کیا گیا۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ دو کاموں کے لئے دو حضرات کو نامزد فرمایا۔ ان روایات سے شیعوں کے تمسک کی گنجائش کہاں رہی کیونکہ تمسک کا دار و مدار تو جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے معزول ہونے پر ہے اور جب اس کام کے لئے ان کا تقرر ہوا ہی نہیں تو عزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور بیضاوی، مدارک، زاہدی، تفسیر نیشاپوری، جذب القلوب اور مشکوٰۃ کی شروح میں اسی روایت کو اختیار کیا ہے اور اہل حدیث کے نزدیک بھی یہی قابل ترجیح ہے۔ اور تفسیر معالم، تفسیر حسینی، معارج، روضۃ لاہجاء حبیب السیر، اور مدارج میں یوں مذکور ہے کہ

اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس سورت کی تبلیغ و تلاوت کا حکم فرمایا تھا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کے لئے نامزد فرمایا اس میں دو احتمال ہیں، اول یہ کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول فرما کر ان کے جگہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا! دوم۔ یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا شریک کار بنایا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں۔ چنانچہ روضۃ الاحیاء بخاری و مسلم اور دوسرے تمام محدثین کی روایات اسی دوسری صورت کی روایات کو قوی بتاتی ہیں۔ کیونکہ ان سب نے اتنی بات متفقہ طور پر روایت کی ہے کہ یوم النحر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ جا کر ابوسریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان و منادی کا حکم دیا تھا کہ لا تَحْجُ بَعْدَ الْعَامِ مَشْرُکًا وَلَا یَطُوفُ بِالْبَیْتِ عُدْیَانًا۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہیں آئے گا اور نہ کوئی ننگا ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کریگا۔ یہ روایت بتا رہی ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ معزول نہیں ہوئے تھے ورنہ دوسرے کے فرائض میں مداخلت نہ کرتے اور نہ اعلان کنندہ تقرر کرتے۔ لہذا اس شق میں عزل ثابت نہ ہوں گے سب شیعوں کو اس کا حوالہ دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ اب رہا احتمال اول کہ آپ کا فرمان لَا یُؤْمَرُ سِوَیَ عَلِیٍّ إِلَّا رَجُلٌ مِثْلُیْہِ لا یرِیٰہُ کی چیز کو دہی شخص ادا کریگا جو مجھ سے ہوگا، بظاہر اس احتمال کو تقویت دیتا ہے۔ نیز نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ سورہ برأت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر تم پر ہو۔

تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معزول کرنا بے لیاقتی یا عدم قابلیت پر مبنی صحیح نہیں تھا۔ اس لئے کہ بالاجماع یہ بات ثابت ہے کہ آپ امیر المومنین بدستور تھے اس منصب سے آپ معزول نہیں ہوئے تھے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ میں جب حج کی سرداری کی لیاقت تھی جس میں ہزاروں مسلمانوں کی اصلاح مد نظر ہوتی ہے اور جس میں بہت سے احکام و فرائض کی ادائیگی سے سابقہ پڑتا ہے، خطبات دئے جاتے ہیں بے شمار مسائل لکھائے جاتے ہیں، اور گونا گون، نوع بنوع معاملات پیش آئے پر ہر وقت فتویٰ صادر کرنے پڑتے ہیں جس کے لئے بہت ہی زیرکی اور سوچ بوجھ اور وافر علم درکار ہوتا ہے ایسے اوصاف کے حامل میں چند آیات قرآنیہ کو باوازنہ پر مدح کر سنانے کی قابلیت کیوں نہ ہوگی ایسی خدمت تو ہر قاری اور حافظ آسانی انجام دے سکتا ہے جناب صدیق اکبر کے اس وقت کے خطبات اور اقامت فرغیہ کا اسلوب جو آپ سے ظہور میں آیا صحیح فہمی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں متعدد اسناد طرق سے منقول ہے۔

اور اہل سیر کا اس پر اجماع ہے کہ اس سفر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا فرمائی۔ نمازیں آپ کی امامت میں پڑھیں، اور آؤ ایگی مناسک حج میں آپ کی پیروی کرتے رہے۔

سیرت و احادیث کی کتابوں میں صحت کے ساتھ یہ بات بھی ثابت ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ النبی سے بعجلت روانہ ہوئے اور منازل سفر تیز رفتاری سے قطع کرتے ہوئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جا ملے، تو آپ رسول اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کی آواز سن کر بے چینی ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود تشریف لے آئے ہوں گے لشکر کو ٹھہرایا اور انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پہنچے تو بعد ملاقات دریافت فرمایا اَنْتَ اَمِیرُ اَوْ مَافِیْکَ؟ آپ بطور اسیر آئے ہیں یا بیعتیت مامور قدم بخبر فرمایا ہے، آپ نے فرمایا بطور مامور آیا ہوں۔ پس آپ روانہ ہوئے، اور ترویہ سے ایک روز پہلے (مخفی الجہ) آپ نے خطبہ دیا۔ اور دین و شریعت کے مطابق مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم دی۔ لہذا معلوم ہوا کہ آیات کی قرأت کا کام ان سے کسی اور وجہ سے واپس لیا ہو گا۔ عدم لیاقت و قصور قابلیت اس کا سبب نہیں ہو سکتا، کیونکہ آسان کام سے معزول کرنا اور اہم و جلیل القدر امور کی انجام دہی کے لیے امارت کا باقی رکھنا ایسی بات ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ والا بھی ایسا نہیں کرنا چاہے جائیکہ ایسی ذات گرامی سے جو عقل الناس تھی یہ وقوع پذیر ہوتی۔ یا علم الہی بھی خلاف حکمت نازل ہوتا (معاذ اللہ)

اور وہ وقت تھی کہ عہد توڑنے یا معاہدہ کرنے، اور صلح و جنگ کی بنیاد رکھنے میں اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ ان چیزوں پر سردار قوم یا اسی کا ہم رتبہ، بیٹا، داماد وغیرہ کی عدم موجودگی میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اور اسے نامعتبر جانتے۔ ان کے علاوہ کوئی بلند مرتبہ شخصیت بھی ہوتی تو اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے، اور یہ طریقہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے کہ دو گروہوں میں باہم کوئی مناقشہ کھڑا ہو جائے، اور لڑائی جھگڑے اسے نمٹانا ہو تو حالی مولیٰ، دوست احباب، نوکر چاکر سب ہی شامل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر معاملہ صلح و صفائی اور عہد معاہدہ کا ہو تو وہ گروہ کے سردار کی ذاتی شرکت کے علاوہ نہ کوئی لمحے کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی اعتقاد و اعتماد ہوتا ہے۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ منیٰ کی وسیع و عریض وادی میں جہاں لاکھوں کا اجتماع ہے، اور ہر شخص کے کانوں تک سوتہ برأت کے احکام پہچانے ہیں کتنا سخت سخت اور جفاکشی کا کام تھا اور یہ کام اسے کبھی انجام پا سکتا تھا۔ جبکہ ان کے ذمہ اعمال حج کی دیکھ بھال، لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد سے لوگوں کو بچانے رکھنے، اور احرام کے ٹوٹ جانے اور دیگر جنایات حج کے وقوع پذیری کی روک تھام جیسا ہم اور بھی ہوں اور پھر وقت بھی محدود ہو اور اسی محدود وقت میں قرآنی احکامات لوگوں کے کانوں میں پڑ بھی جاتے ہوں تو لامحالہ دوسرے آدمی کا ہونا لازمی ولا بدی ہے۔ اور چونکہ یہ کام بھی اپنی جگہ مہتمم بالشان ہے تو وہ دوسرا آدمی عظیم المرتبہ ہی ہونا چاہیے، لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کا امیر مقرر فرمایا۔ تاکہ دونوں مہمات بحسن و خوبی انجام پا جائیں۔ اور لوگوں کی نظروں میں ہر کام مقصود بالذات کی حیثیت رکھے۔ اگر برأت خوانی کا کام بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے متادوں سے لینے پر اکتفا کیا جاتا تو لوگوں کو خاص کر مشرک اعراب کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ عہد و پیمان کا مسئلہ پیغمبر علیہ السلام کے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری نہ تھا کہ اس کے لیے آپ نے کوئی مستقل آدمی مقرر نہ فرمایا۔

یہاں باریک بین علماء اہل سنت نے ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے کہ یہ موقع رحمت الہی، اور قبر الہی دونوں صفات کے درود و تہنیر کا تھا۔ حج کہ درود و رحمت الہی کا منبع و مورد تھا تو کفار کا نقص عہد قبر الہی کا مرجع،

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُو بَکْرٍ۔ آپ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں

سے امت پر سب سے زیادہ مہربان ہونے کے سبب مظہر صفت رحمت الہی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے ہونے کے باعث مظہر صفت قہر الہی تھے۔ اس لئے حج کی امارت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالہ ہوئی، تو کفار کے نقص عہد کے انجام بد سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری جناب علی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی تاکہ مجمع پر کہ جس میں مسلمان بھی تھے کفار بھی دونوں صفتوں جمال و جلال الہی کا فیضان ہو، مسلمان انوار جمال سے شربور ہوں۔ تو کفار جلال الہی سے بہیمت ڈوہ، اور پھر مردے کی بات یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے بھی معاون و مددگار رہے جیسا کہ بخاری کی روایت بحوالہ ابوسہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابوسہریرہ کو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ کیا ہی تھا کہ خود بھی گاہ بگاہ عملاً اس خدمت دین میں حصہ لیتے رہے۔ چنانچہ ترمذی و حاکم میں بحوالہ ابن عباس ثابت ہے کہ

كَانَ عَلِيٌّ يَخْدُمُنِي فَإِذَا أَعْنَى قَامَ أَبُو بَكْرٍ فَنَادَنِي بِهَا. حضرت علی رضی اللہ عنہ سورہ برأت کا اعلان فرماتے جب آپ شک جاتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اعلان کرتے تھے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: فَإِذَا مَضَى قَامَ أَبُو بَكْرٍ فَنَادَنِي بِهَا. ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو جاتے۔ حاصل کلام یہ کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سورہ برأت سنائے کی ذمہ داری لے لینے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مسئلہ نقص عہد کو عرب کے قاعدہ کے مطابق ہی انجام دیا جائے تاکہ ان کے لئے یکھنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو ہمارے آئین و رسم کے بموجب نقص عہد سے آگاہی نہ ہوئی کہ ہم اپنی راہ اختیار کرنے اور اپنا خیال آپ کر کے چنانچہ معاملہ زیادہ، بیعتناوی، شرح تجرید، مواقف، صواعق بشرح مشکوٰۃ اور دوسری کتابوں میں یہی وجہ لکھی ہے۔

اسی لئے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کے ایک ماہر انصاری کو معاہدہ لکھنے کیلئے طلب فرمایا تو رسول بھی عمرو نے جو مشرکین مکہ کا نمائندہ مصالحت تھا۔ بولا اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کسی اور کے لئے معاہدہ کو قبول نہیں کرتے، یہ معاہدہ تمہارے چچا زاد علی رضی اللہ عنہ کو لکھنا چاہیے اس کا حوالہ مدارج و معارج اور سیرت کی دوسری کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے۔

اس اعتراض کا ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سورہ برأت کی تبلیغ سے معزول فرمایا۔ مگر ایسے صاحب عدالت کا معزول کرنا جس کی عدالت کی گواہی پسوں جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور قرآنی آیات نے دی ہو، کسی خاص مصلحت کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ یہ عزل ریاست و امامت کی عدم صلاحیت کی بنا پر ہو سکتا ہے نہ تھا خصوصاً جبکہ اسے نہ وہ خدمت انجام دینے کا موقع ملا ہو اور نہ اس سے کوئی قصور یا خیانت سرزد ہوئی ہو، اور اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک فیصلہ ہے، کہ آپ نے عمر و بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو بحرین کی ولایت سے معزول کر دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسیب خاص تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلل ساتھی اور حمایتی تھے ذاتی طور پر وہ بڑے عابد و زاہد، امین و عالم، فقیہ و متقی بھی تھے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بطور غدر ایک تحریک بھی دی جو ان شیعوں کی اصح الکتاب نج البلاغہ اور دوسری صحیح کتب میں موجود ہیں۔ کہ

أَمَّا عَدُوٌّ فَإِنِّي وَكَيْتُ النُّعْمَانَ بْنِ مَعْلَانَ الدَّؤْدِيَّ عَلَى الْبَحْرَيْنِ وَنَزَعْتُ يَدَهُ بِلَاؤِ مَلَائِكَةٍ وَلَا تَقْرَبُ عَلَيْكَ فَقَدْ أَحْسَنْتُ الْوِلَايَةَ وَكَدَيْتُ الْأَمَانَةَ فَأَقْبَلَ عَيْتُ ظَنِينَ وَالْمُلُوكُ وَمَتَّعَهُمْ لَأَمَّا نُوْمِرٌ.

بنادیا ہے اور تم سے یہ وعدہ لیا ہے لیکن (اس کا سبب) نہ تمہاری کوئی کوتاہی ہے اور نہ تم پر کوئی الزام ہے تم نے حکومت بڑی اچھی طرح اور امانت داری سے چلائی پس تم آجاؤ نہ تم پر کوئی بدگمانی ہے نہ ملامت نہ تم ملزم اور نہ مجرم ہو

اور یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ عمر بن سلمہ باعتبار دین و حسب و نسب نعمان بن عجلان دورقی سے افضل تھے، کاروبار حکومت بھی انہوں نے بڑے اچھے طریقے اور نہایت دیانت کے ساتھ انجام دیا تھا۔ نہ ان کی کوئی غلطی تھی نہ تصور، نہ عدم قابلیت، اظاہر ہے کہ ایسا عزل میں سے جب کوئی بات نہیں تھی اور جملہ عیوب و قصور نقص سے وہ بری تھے تو کوئی خاص مصلحت ہی موجب عزل ہوگی، اور اگر جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک قرآنی حکم اور انجیلی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے تو ایسی صورت میں ان کو امیرؓ بنانا کیا معنی رکھتا ہے جبکہ بلحاظ عہدہ و مرتبہ یہ اہم اور عظیم تر منصب ہے۔ اور پھر ایسا کام بغیر معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرزد ہو۔ ناقابل تسلیم ہے۔ اگر آپ کا عزل واقع بھی ہوا ہے تو اس کی وجہ کوئی مصلحت خاص ہی ہو سکتی، قابلیت و لیاقت کا قصور سرگز نہ نہیں۔

اعتراف (۲) بارہواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں سے ورثہ نہیں دیا۔ اس پر بی بی بتول الزہراء رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ اے ابو قحافہ کے بیٹے تم لو اپنے باپ سے ورثہ پاؤ، اور میں اپنے بابا جان کا ورثہ نہ پاؤں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اور آپ کو محروم کرنے کے لئے صرف ایک شخص کی (یعنی اپنی) روایت کو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ہم انبیاء و کسی سے میراث لیتے ہیں اور نہ کوئی ہم سے میراث پالتا ہے، حالانکہ یہ حدیث نص قرآنی **يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِي ذُلِّكُمْ وَلَكُمُ اللَّهُ فِي ذُلِّكُمْ وَلَكُمُ اللَّهُ فِي ذُلِّكُمْ** کسی سے میراث نہیں۔ واللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دو گنا ہے کے خلاف ہے اس لئے کہ حکم قرآنی عام ہے کہ نبی و غیر نبی دونوں کو شامل ہے۔ اسی طرح دوسری نص یعنی کہ **وَرِثَ الْمُسْلِمُونَ دَاوُدَ** (یعنی سلیمان داؤد کے وارث ہوئے) بھی اس کے خلاف ہے۔ یا ایک اور آیت **وَصَبَّ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَكِيلٌ** یٰوَسَّیٰ وَ یُؤْتِیْهِ مِنْ لَدُنْكَ مِثْرًا (یعنی عینیت سے مجھے ایک ولی دیتا) بختم مجھ پر میرا بھی وارث بنے اور ال یعقوب کا بھی، ان سب سے معلوم ہو کہ انبیاء خود بھی وارث ہوتے ہیں اور ان کے وارث بھی ان سے میراث پاتے ہیں۔

جواب۔ اس اعتراض کے دو رخ ہیں ایک ظاہر ایک پوشیدہ، ظاہر تو یہ کہ صرف اپنی روایت پر انحصار کہہ کے ان کو محروم کر دیا۔ اور پوشیدہ یہ کہ آپ نے بغض و عداوت کی وجہ سے خاتون جنت رضی اللہ عنہا کو ترکہ نہیں دیا یہ بات اعتراض میں کھلے الفاظ میں گو نہیں کہی گئی مگر اعتراض کی اصل بنیاد ان کے نزدیک یہی ہے تو جواب یہ ہے، یہ بات صحیح نہیں کہ آپ نے محض اپنی سنی ہوئی بات کو حجت بنا کر آپ کو میراث نہیں دی۔ یا آپ ان سے بغض و عداوت رکھتے تھے اس لئے ایسا کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ تقسیم ہوتا تو ازواج مطہرات کو بھی حصہ ملتا جس میں خود آپ کی حلت جگر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اپنے رفیق و دوست حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں،

تو آپ کو دیگر امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن، یا اپنی اور اپنے دوست کی بیٹیوں، یا ان کے باپ بھائیوں سے عداوت تھی کہ ان کو بھی محروم رکھا۔ اور پھر نصف ترکہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آتا تھا۔ اور وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ابتداء ہی سے آپ کے رفیق و منشی تھے۔ ان سے کیا عداوت تھی کہ ان کو بھی ترکہ نہ دیا۔ تو معلوم ہوا کہ بغض و عداوت کا الزام غلط، لغو اور ان کا من گھڑت ہے، اب روگئی یہ بات کہ صرف اپنی روایت کی بنیاد پر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو ورثہ نہیں دیا ہے۔ بالکل جھوٹ اور صریح دروغ گوئی ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت کی کتابوں میں اس روایت کے راویوں میں ان حضرات کے اسمائے گرامی موجود ہیں: جناب حزقیل بن الیمان، جناب زبیر بن العوام، جناب ابوبکرؓ، جناب عباس، جناب علی مرتضیٰ، جناب عثمان غنی، جناب عبدالرحمن بن عوف، اور جناب سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم

اجمعین۔ ان حضرات کی جلالت قدر اور عظیم المرتبی سے کون واقف نہیں، پھر ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنکا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے، انہیں عین حیات ہی جنتی ہونے کی بشارت مل چکی تھی! اور حدیض رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود ان کے ملا علی المرتضیٰ نے اپنی کتاب اظہار الحق میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ مَا حَدَّثْتُكُمْ بِهِ حَدَّثْتُكُمْ قَوْلَهُ۔ (حدیض تم سے جو حدیث بیان کرے اس کی تصدیق کرو۔ یعنی سچ سمجھو اور ایک راوی ان میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی ہیں جو شیعہ اور سنی دونوں کے بالاجماع عقیدہ کے مطابق صادق ہیں! اگر عائشہ صدیقہ، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کی روایات اس معاملہ میں ان کے نزدیک معتبر نہیں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو یہ کیا کہیں گے؟

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مالک بن اوس بن ہرثان النضری سے یوں روایت کی ہے

أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِمُحَمَّدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ فِيهِمْ عَلِيٌّ وَالْعَبَّاسُ وَعُمَانُ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ وَالدَّيْلَمِيُّ بْنُ الْعَوَّامِ وَسَعْدُ بْنُ وَقَّاسٍ أَنْشَدَكُمْ أَنَّهُ يَذُنُّهُ تَقْوَمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ أَنْ تَعْلَمُونَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَهُ قَالُوا اللَّهُمَّ نَعَمْ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى عَلِيٍّ وَالْعَبَّاسِ فَقَالَ أَنْشَدْ كَمَا بِاللَّهِ هَلْ تَعْلَمَانِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَلِكَ قَالَا اللَّهُمَّ نَعَمْ۔

جناب عمر فاروقؓ نے صحابہ کے ایک مجمع کو مخاطب کر کے جس میں حضرت علیؓ، عباسؓ، عثمانؓ، عقیلؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ، زبیر بن عوامؓ، اور سعد بن وقاصؓ موجود تھے، کہا کہ میں تم کو اس فقرہ قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان برقرار ہے، اگر کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم میراث نہیں چھوڑتے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ میراث ہے۔ سب نے فرمایا، بخدا اہل! پھر آپ نے خصوصیت سے حضرت علیؓ و عباسؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں آیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا دونوں حضرات جواباً فرمایا جڑ

بے شک ایسا فرمایا

پس معلوم ہوا کہ ان کی حدیث باعتبار قطعیت آیت قرآنی کے برابر ہے، کیونکہ مذکورہ الذکر اصحاب بالاکہ فرداً فرداً روایت موجب یقین ہے چہ جائیکہ اس پوری جماعت کی متفقہ حدیث خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں۔ اور ان کے نزدیک معصوم کی حدیث یقین کرنے میں قرآن کے برابر ہے۔ اور اس سے بھی قطع نظر خود شیعوں کی کتابوں میں ان کے تسلیم کردہ امام معصوم، اسی قسم کی روایت موجود ہے۔ چنانچہ محمد بن یعقوب راضی نے کافی میں ابی البختری کے حوالہ سے جناب صادق رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَذَلِكَ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يَرَوْا فِي شَيْءٍ كُمُيْرُثُوا وَإِرْثُهُمَا لَا دِينَكَسَا وَإِنَّمَا أَوْسَا ثَوَا أَحَادِيثُ مِنْ أَحَادِيثِهِمْ فَعَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِنْهَا فَقَدْ أَخَذَ بِخَطِّهِ وَافِيهِ۔

اور کلمہ انما کے متعلق شیعہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ قطعاً حصر کے لئے ہوتا ہے جیسا انما و لیکمہ کی بحث میں بیان ہو چکا۔ لہذا معلوم ہوا کہ علم و احادیث کے سوا میراث میں کوئی اور چیز قطعاً نہیں چھوڑی۔ تو انہیں کے امام معصوم کے حوالہ سے ہی مدعا ثابت ہو گیا اور جواب ہی کے سلسلہ کا ایک بات یہ بھی ہے کہ جن شخص نے براہ راست بلا واسطہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث سنی وہ اس کے لئے علم یقینی کی موجب ہے اور اس کے لئے اپنے سنے ہوئے پر عمل کرنا لازم و مفروضی ہے، خواہ وہ حدیث کسی اور سے بھی سنے یا نہ

سنے، چنانچہ سنی و شیعہ اصولی ہر دو کا اس پر اجماع ہے کہ حدیث کی تقسیم متواتر و غیر متواتر اس شخص کے لئے ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہو اور آپ کی احادیث دوسروں کے واسطے سے سنی ہوں۔ اور جس نے آپ کی زیارت کی آپ کی زبان مبارک سے احادیث سنی اس کے لئے یہ تقسیم متواتر و غیر متواتر نہیں ہے اس کے لئے تو وہ فرمان متواتر سے بھی بہت اونچا ہے۔ تو اس معاملہ میں جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ زبان نبوت سے براہ راست سنی چلے تو اب تفتیش و تحقیق کی انہیں ضرورت ہی کیا رہی!

اب رہا یہ سوال کہ یہ حدیث آیت کے خلاف ہے۔ تو یہ بھی غلط اور مضبوط ہے، اور معترض کی ناہنجی کی دلیل۔ کیونکہ کھڑی میں جی طلب امت ہے، پیغمبر نہیں۔ لہذا یہ حدیث تعین خطاب واضح کرنے والی ہوگی آیت کی تخصیص نہیں! اور اگر تخصیص بھی مانیں تو آیت کی تخصیص تو لازم آئیگی مگر مخالفت نہیں۔ پھر اس آیت سے پہلے ہی بہت سی چیزوں کی تخصیص ہو چکی مثلاً کافرا و اولاد وارث نہیں۔ رقیق وارث نہیں۔ اور قاتل وارث نہیں۔ اور یہ خود شیعہ بھی اپنے آئمہ سے ایسی روایت بیان کرتے ہیں جس سے بعض وارثوں کو باپ کے ترکہ کی بعض چیزوں سے محروم کر کے ان کو خود لے لیتے ہیں۔ مثلاً تلوار، مصحف، انگوٹھی، بدن کا لباس، کہ بڑا بیٹا ان کو بغیر تقسیم خود لے لیتا ہے۔ دوسرے وارثوں کا جو حصہ ان اشیاء میں بنتا ہے اس سے ان کو محروم کر دیتا ہے!

حالانکہ وہ اس روایت میں تنہا ہیں۔ اور اہل سنت کے نزدیک ان کی عصمت بھی ثابت نہیں۔ اور جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر سلسلہ کے آخری امام تک تمام اہل بیت کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور ان کا عمل اس کی صحت پر مہر ہے! دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ جب ان حضرات کے ہاتھ میں آیا تو کسی بھی وارث کو اس کا حصہ نہیں دیا۔ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد محروم رہی! ازواج مطہرات بھی اپنا حصہ نہ پاسکیں۔ پس اگر پیغمبری ترکہ میں تقسیم میراث جاری ہوتی تو یہ محترم و گرامی قدر حضرات جو شیعوں کے نزدیک معصوم بھی ہیں، ایسی کھلم کھلا حق تلفی کیسے روا رکھتے! کیونکہ علماء حدیث، اور اہل سیر و تاریخ کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متروکہ مثلاً خیمہ و فدک یا اور عہد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں حضرت عباسؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دست تصرف میں رہے۔ پھر جناب عباسؓ سے حضرت علیؓ کے قبضہ میں آئے۔ پھر جناب حسنؓ بن علیؓ کے پاس پھر جناب حسینؓ بن علیؓ کے پاس، پھر علیؓ بن حسینؓ اور حسنؓ بن حسنؓ کے پاس اور دونوں اس پر متصرف رہے! پھر زید بن علیؓ برادر حسن بن حسن کے پاس۔

پھر مروان کے امیر ہونے کے بعد اس کے قبضہ میں آئے، اور مروانیوں کے ہاتھوں منتقل ہونے ہوئے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے قبضہ میں پہنچے، آپ غایت درجہ منصف مزاج تھے آپ نے صاف کہہ دیا کہ جس ترکہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری و سخت جگر جناب سیدہ فاطمہؓ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا میں اس کا مالک کس طرح ہو سکتا ہوں میرا اس میں کوئی حق نہیں۔ پس آپ نے یہ ترکہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منتقل فرما دیا، پس ”ائمہ معصومین“ اور اہل بیت کو ام کے عمل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ترکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور آیت میراث نے حدیث مذکور سے تخصیص پائی۔ اب ہم آیت وَ ذَرِّ سُلَيْمَانَ کی بحث کی طرف آتے ہیں، کہ بقول شیعہ یہ آیت اسباب پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء خود بھی وارث ہوں۔ اور ان کی میراث تقسیم بھی ہو، مگر یہ مضمون اس حدیث قطعی کے خلاف ہے جو ”ائمہ معصومین“ سے ثابت ہے۔

اس مشکل گتھی کو حل کرنے کے لئے بھی ہم ”قول معصوم“ کی طرف رجوع ہوتے اور کتب شیعہ سے اس کا سراغ و جواب تلاش کرتے ہیں کلینی نے جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یا اس الفاظ نقل کی ہے۔ اِنَّ سُلَيْمَانَ وَ زَكَرِيَّا وَ اِدْرَاكَ وَ اِدْرَاكَ مُحَمَّدًا وَ اِدْرَاكَ سُلَيْمَانَ سُلَيْمَانَ (علیہ السلام، داؤد (علیہ السلام) کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمان کے وارث ہوئے۔

گویا معلوم ہوا کہ یہ وراثت کمالات انسانی اور علم و نبوت کی وراثت ہے مال و اسباب ممتزکہ کی وراثت نہیں ہے۔ قرینہ عقلمیہ بھی قبول معصوم کا تائید کرتے ہوئے اسی وراثت کا پتہ دیتا ہے۔ کیونکہ باتفاق مورخین حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس لڑکے تھے۔ معاہدہ میں تو سارے ہی آپ کے وارث ہوتے، حالانکہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت و امتیاز کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں حکم فرمایا، تو پتہ چلا کہ وراثت جس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو امتیاز حاصل تھا اور دوسرے بھائی اس سے محروم تھے وہ وراثت علم نبوت کی تھی۔ یہ دوسرے بھائیوں کو کہاں نصیب تھی!

پھر ایک بات یہ کہ سب ہی کو معلوم تھا کہ ہر لڑکا اپنے باپ کی میراث پاتا ہے اور اس کے مال کا مالک بنتا ہے تو اس کی خبر دینا تو غریبہ اور کلام الہی لغو پر مشتمل نہیں ہو سکتا وہ اس سے پاک ہے۔ اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسی عام بات بیان کرنا جو تمام عالم میں مشترک ہے ان کے لئے باعث اعزاز کب ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان کے فضائل و مناقب کے طور پر بیان فرمائے۔ اور اسی آیت کا اطلاق خود بتا رہا ہے کہ اس وراثت سے مراد وراثت علم ہے۔ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا مَنطِقَ الْغَايِبِ۔ لوگوں! ہم کو ہر بندوں کی بولی سکھائی گئی ہے! اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ علم کے لئے وراثت کا لفظ استعمال کرنا مجاز ہے اور مال کے لئے اصل و حقیقت تو بلا ضرورت ہم حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی کیوں سرا دیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضرورت سے کہ ”معصوم“ کا قول جو ٹھانڈا نہ پڑے، اس کے علاوہ ہم اسے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ وراثت مال کے حق میں حقیقت ہے، یہ تو فقہاء کے مان کر ث استعمال کی وجہ سے اس معنی کے لئے خصوص ہو گئی جیسے منقولات عرفیہ! ورنہ درحقیقت قرآن کا اطلاق علم و منصب پر ہی صحیح ہے اور مجاز بھی مان لیں تو یہ مجاز نا متعارف اور مشہور ہے خصوصاً قرآنی استعمال میں کہ وہ حقیقت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمَنْهُمْ مَن بَعْدَ مَن خَلْفَهُمْ قَدْ أُوْرَثُوا الْكِتَابَ۔

اب آئیے آیت یٰوَسْمٰی وَیٰوَسْمٰی مِنْ اٰلِ یٰعْقُوْبَ، کی طرف توجہ دے کر یہاں وراثت سے قطعاً طور پر وراثت منصب مراد ہے۔ کیونکہ لفظ آل سے مجازاً خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذات مراد ہو تو یہ لازم آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ممتزکہ مال و اسباب ان کے زمانہ سے لے کر حضرت ذکریا علیہ السلام کے زمانہ تک جو تقریباً دو ہزار سال کا عرصہ ہے بغیر تقسیم شدہ باقی و برقرار ہو، اور اب حضرت ذکریا علیہ السلام کی وفات پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا حصہ ان کو پہنچے۔ اور یہ بڑا مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ مال حضرت ذکریا علیہ السلام کی وفات سے پہلے تقسیم شدہ ہو تو وہ مال تو حضرت ذکریا علیہ السلام کا ہوا اور یوشی میں داخل ہوا، اب آل یعقوب کا مال کہاں گیا، جس کے یحییٰ علیہ السلام وارث ہوں گے! اور اگر آل یعقوب سے مراد اولاد یعقوب ہو تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ تمام بنی اسرائیل خواہ زندہ ہوں یا مر چکے ہوں، سب کے وارث حضرت ذکریا علیہ السلام ہوں۔ یہ مغالطہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ لہذا اس آیت کا حوالہ اس جگہ لانا اسی فرقہ کی جولانی طبع یا حماقت کی نشانی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ذکریا علیہ السلام نے اپنے سوال میں دو لفظ فرمائے ہیں۔ وَاٰلِ یٰوَسْمٰی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ایسا ولی طلب فرمایا جو صفت وراثت سے متصف ہو (یعنی اس میں وارث بننے کی قابلیت و صلاحیت بھی ہو) لہذا اگر یہاں خاص علمی وراثت مراد نہ ہوگی تو یہ صفت محض لغویہ کا ثابت ہوگی۔ اور اس کے ذکر کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ کیونکہ بیٹا تمام شریعتوں میں باپ کا وارث ہوتا ہی ہے۔ اور لفظ ولی سے وارث مال بلا تکلف سمجھی جاتی ہے۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ انبیاء مکرم علیہم السلام کے نفوس قدسیہ کی تمام تر توجہات

اور مساعی اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول اور منتطف ہوتی ہیں، اس عالم فانی سے ان کے دل کا رشتہ کٹا ہوا ہوتا ہے اسی لئے متاع دنیا کی طرف نام کو بھی راجع نہیں ہوتے۔ خاص طور پر حضرت زکریا علیہ السلام کہ دنیا و متاع دنیا سے ان کی بے تعلقی اور بے اعتنائی تو مشہور و معروف ہے! ان کے لئے عادتاً یہ محال تھا کہ وہ مال و متاع کی وراثت سے جسکی قدر ان کے نزدیک ذرہ خاک کے برابر بھی نہیں تھی، خائف ہوں۔ اور اس کے صدمہ، ملال و اندوہ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی جانب میں کریں۔ کہ اے اللہ مجھے ایسا بیٹا دے جو میرے مال کا وارث بنے ورنہ یہ مال بے وارث رہ گیا تو غیر مستحقوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ (ن) کیونکہ یہ عمل تو مال کی محبت اور اس سے انتہائی دلی شغف کا پتہ دیتا ہے! (جس کا حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق کوئی بھول کر بھی تصور نہیں کر سکتا) اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ ڈر اور خطرہ تھا کہ کہیں چچا زاد بھائی مال و دولت کو بے جا خرچ نہ کر ڈالیں یا واپسیت اور طفول میں ضائع نہ کر ڈالیں تو اس ڈر اور خطرہ کا یہ موقع و مقام ہی نہیں کیونکہ جب آدمی کی آنکھ بند ہوئی مال و داروں کا ہوا۔ اب وہ اس مال کے مالک ہیں جا خرچ کریں یا بچا۔ ساری ذمہ داری ان کے سر پہ۔ مرنے والے سے اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی نہ اسے کوئی سزا ملیگی، دوسرے اگر ان کے دل میں ڈر تھا تو جناب الہی میں اس کا عرض کرنا کیا ضروری تھا، اس کا مداوا اور دفعیہ تو خود ان کے ہاتھ میں تھا۔ کہ وفات سے پہلے بہت مال و دولت راہ خدا میں لٹا جائے۔ اور صدقہ و خیرات کر دیئے اور بدکار وارثوں کو محروم کر جائے۔ اور انبیاء علیہم کو موت سے آگاہی دی جاتی ہے اور اختیار بھی ملتا ہے تو گویا اچانک موت کا خطرہ بھی نہ تھا۔ لہذا معلوم ہوا یہاں وراثت سے حضرت زکریا علیہ السلام کی مراد مال کی وراثت تھی ہی نہیں یہاں تو وہ منصب کی میراث کے لئے وراثت ملنے کی التجا کہہ رہے ہیں۔ اور اس خطرہ کے پیش نظر کر رہے ہیں کہ کہیں میرے بعد نبی اسرائیل کے شریر و بدتماش لوگوں کو وراثت نہ ہونے کی وجہ سے، ایسا موقع اور غلبہ حاصل نہ ہو جائے کہ وہ احکام الہی کی تحریف کر ڈالیں ربانی شریعت میں ترمیم و تنسیخ کرنے لگیں اور میرے علم کی حفاظت نہ کر کے اس پر عمل پیرا نہ ہوں۔ اور یوں دنیا میں عظیم فتنہ و فساد کا دروازہ کھولیں۔ اس لئے بیٹے کی دعا کی، کہ وہ میرا وارث بن کر میرے علم نبوت کی پیروی و اشاعت کا سبب ہوگا احکام الہی اس کے ذریعہ فروغ پائیں گے، خاندان میں یہ سلسلہ ایک نسل کم از کم اور باقی رہے گا۔ اور یوں انعامات و احسانات الہیہ سے مزید بہرہ یاب ہونے کی سعادت حاصل رہے گی! اجر بھی بڑھے گا۔ اور خاندان میں نبوت کی مدت بھی کچھ طویل ہوگی۔ جو یقیناً ایک اعزاز ہے۔ (محرر نے اپنی سوچ اور جذبات پر نبی کی سوچ و بوجھ کو قیاس کر کے اعتراض کرتا اور اپنی عاقبت بنا کر ہے مال و دولت، جاہ و اقتدار کسی دنیا دار کا مطمح نظر تو ہو سکتے ہیں لیکن نبی کے نزدیک پرکارہ کے برابر بھی ان کی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ نہ وہ مال و دولت کے جھگڑوں میں الجھتا ہے۔ نہ ان کا طالب ہوتا ہے۔ نہ اسکو باقی رکھنے یا بڑھانے کی خاطر کسی کو جان نشین بناتا ہے۔ اور نہ اس دلیل و گھٹیا کام کے لئے اللہ سے کوئی وارث طلب کرتا ہے۔)

بعض سمجھ بوجھ سے عاری علماء، یہ بحث بھی اس موقع پر چھیڑ دیتے ہیں کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کو میراث نہ ملنی تھی تو انہماک المؤمنین رضی اللہ عنہم کو میراث ملنا کیوں دے دیئے۔ مگر وہ اتنا بھی نہیں جانتے محترمان کو یہ مکان میراث میں نہیں ملے یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں نام بنام بنو کر ان کو نصرت فرمائے تھے ان کی حیثیت تو سببہ بالعقبہ کی تھی۔ اور یہ آپ کی زندگی میں ان مکانات پر حق ملکیت کے طور پر قابض تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد کسی نے ان کو میراث کے حصہ کے طور پر نہیں دیا تھا، انہیں محترمان رضی اللہ عنہم کی طرح جناب سید قبول الزہراء کا بھی ایک مکان تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنوا کر دیا تھا۔ ان ہی کی طرح حضرت اسماء رضی اللہ عنہ کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھر بنوا کر دیا تھا۔ اور ان گھروں کے یہ سب حضرات نبی

عنوان کوئی روایت موجود نہیں۔ لہذا اس کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا اور ان سے جواب طلب کرنا نادانی اور دھاندلی ہے۔ اہل سنت کی کتابوں میں جو روایت ملتی ہے وہ اس کے برعکس، اور مخالف ہے، چنانچہ مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوداؤد و جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جناب عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو تمام بنو مروان کو جمع کیا اور فرمایا۔

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهُ فِدَاةٌ
فَكَانَ يُفَقِّحُ مِنْهَا وَيَعُوذُ مِنْهَا عَلَى صِغَرِ بَنِي هَاشِمٍ
وَيُزَوِّجُ مِنْهَا أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا
سَأَلَتْهُ أَنْ يَجْعَلَ لَهَا فَالِيًا فَكَانَتْ كَذَلِكَ فِي حَقِّهِ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى مَضَى سَبِيلُهُ فَلَمَّا
أَنَّ وَلِيَّ ابْنِ بَكْرٍ عَمِلَ فِيهَا عَمِلَ بِمَا عَمِلَ رَسُولُ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَيَاتِهِ حَتَّى مَضَى سَبِيلُهُ فَلَمَّا
أَنَّ وَلِيَّ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَمِلَ فِيهَا بِمَا عَمِلَ حَتَّى
مَضَى سَبِيلُهُ ثُمَّ أَفْلَحَهَا مَرْوَانُ ثُمَّ صَارَتْ لِعُمَرَ
بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَوَأَيْتَ أَمْدًا مَنَعَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَالِمْةٌ لَيْسَ لِي بِحَقِّهِ وَإِلَى أَشْهُدُكُمْ
أَنِّي رَدَدْتُهَا عَلَى مَا كَانَتْ يُعْنَى عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِلَى بَكْرٍ وَعُمَرَ

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا۔ آپ اسکی آمدنی خرچ فرماتے یا شمی بچوں کی غور و پرداخت اور بیواؤں کے عقد وغیرہ میں صرف فرماتے۔ آپ کی بیٹی جناب فاطمہ نے آپ سے سوال کیا کہ آپ فدک (کی آمدنی) میرے لیے مقرر فرمادیں۔ مگر آپ نے اس سے انکار فرما دیا۔ اور آپ کی حیات تک فدک کا معاملہ بدستور رہا۔ اور جب جناب ابوبکرؓ والی ہوئے تو انہوں نے بھی اس معاملہ کو کا طرح رکھا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہو گیا۔ پھر جناب عمرؓ خطاب والی ہوئے تو آپ نے وہی راہ عمل اختیار کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب ابوبکرؓ نے اختیار کی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مروان نے اسے جاگیر بنالیا، اور اب اسی صورت میں یہ میری تحویل میں آیا۔ تو میں نے سوچا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ثلث جگہ کو نہیں دیا میرے لئے اس میں حصہ نہیں نہ میں اس کا مستحق ہوں لہذا میں تم کو گواہ جانا ہوں کہ میں نے اسکی پہلی حیثیت بحال کر دی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم و جناب ابوبکرؓ و رضی اللہ عنہما کے عہد میں تھی۔

توجہ بہہ کی حقیقت ہی فی الواقع ثابت نہیں ہے تو دعویٰ کا پیش کرنا اور ایسے حضرات کی گواہی دلانا جو شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں اور ہمارے نزدیک بھی صادق و معتبر ممکن ہی نہ رہا۔ اور اس کی کوئی گنجائش باقی رہی !

اس کا ایک جواب دوسرے پہلو سے یہ ہے کہ شیعہ و سنی دونوں کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ بہہ کی پہلی چیز جس کی بہہ کی گئی ہو، وہ اس وقت تک اس کی ملکیت میں نہیں آتی جب تک اس کے قبضہ و تصرف میں نہ آجائے۔ اور یہ بات ہر گروہ کے اجماع سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فدک سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضہ و تصرف میں نہیں آیا تھا۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ و تصرف میں تھا اور آپ اس پر مالکانہ تصرف فرمایا کرتے تھے۔ پس جناب سیدہؓ نے دعویٰ کیا، تو جناب صدیقؓ نے اس کی تکذیب نہیں کی، بلکہ ایک مسئلہ فقہیہ بیان فرمایا کہ صرف بہہ سے ملک ثابت نہیں ہوتا تا وقتیکہ قبضہ ثابت نہ ہو۔ قبضہ ثابت ہونے کی صورت میں کسی گواہ و شاہد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور بالقرض جناب امیر المؤمنینؓ و ام المومنین رضی اللہ عنہما بطریق اخبار اس بہہ کا اظہار کیا ہوگا۔ تو اس کو شہادت کی تردید کرنا جہالت کی بدترین صورت ہے یہ ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی پر فیصلہ نہ کرنا ہے۔ ان کی شہادت رد کرنا نہیں ہے۔ ارد شہادت تو یہ ہے کہ گواہ پر تہمت لگائیں اور اسے جھوٹا قرار دیں۔ شاہد کی تصدیق کرنا اور چیز ہے اور شہادت کے موافق حکم لگانا اور چیز ہے، یہاں جناب صدیقؓ نے شہادت کی تصدیق تو کی لیکن چونکہ شہادت نامکمل تھی اس

لئے فیصلہ شہادت کی صورت حال پر دیا۔ اور جو اتنا گودن اور بیوقوف ہو کہ ان دونوں باتوں میں فرق نہ کر سکے اور حکم نہ کرنے کو گواہ یا مدعی کی گھڑبیا سمجھے، علما کے نزدیک وہ قابل خطاب ہی کب ہے! قرآنی نص و حکم کے مطابق جب شرعی مسئلہ ہی یہ ہے کہ گواہوں میں دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں نہ ہوں تو کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ تو ایسی صورت میں حکم شرع کی وجہ سے جناب صدیق رضی اللہ عنہ مجبور تھے! حکم و فیصلہ کیسے دے سکتے تھے!

اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کہ مَن اَعْضَبَهَا اَعْضَبَنِي، اس موقع پر لانا لغت عرب سے ناواقفیت اور نادانی کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ اَعْضَاب (غضبہ دلتا) یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اپنے قول یا فعل سے بالادارہ غصہ دلائے۔ اور یہ بات انھرمیں الشمس ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی ایذا رسانی کا قصد تو کیا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، وہ تو بار بار ان الفاظ معذرت سے تعلق خاطر کا اظہار فرماتے رہتے تھے۔ وَاللّٰهُ بِالْاَبْتَةِ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِنْ قَدَابَةً رَسُوْلُ اللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَصِلَ قَدَابَتِي، واللہ کی قسم ہے رسول اللہ کی لخت جگر ملہ جی کے لئے مجھے رسول اللہ کی قربت اپنی قربت سے زیادہ محبوب ہے) جب غصہ دلانے کا آپ نے فعل سرزد ہی نہیں ہوا تو آپ اس وعید کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں! ہاں ہو سکتا ہے کہ بقائمانائے بشریت سید زہرا رضی اللہ عنہا، کو غصہ آیا ہو، مگر وعید اَعْضَاب پر معنی ہے غضب پر نہیں، اس لئے کہ اگر زہرا رضی اللہ عنہ کو اس سے کیا خوف خطر! اگر وعید کے یہ الفاظ ہوتے مَن اَعْضَبَهَا اَعْضَبَنِي عَلَيَّ (آپ جس پر غصہ ہوئیں میں بھی اس پر غصہ ہوا) تو البتہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے خوف کا مقام تھا۔

اس کے علاوہ سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا خانگی معاملات میں کسی بار جناب علی رضی اللہ عنہ پر غصہ ہوئیں۔ ان میں سے ایک موقع وہ تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے الجہل کی بیٹی کو اپنے لئے نکاح کا پیغام دیا، تو سیدہ رضی اللہ عنہا افسردہ و گریان بابا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شاکہ ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معاملہ میں خطبہ دیا جس میں فرمایا اَلَا اِنَّ فَاطِمَةَ بَضْعَةٌ مِّنِّيْ يَوْمَئِذٍ مَا اَذَاهَا يَوْمَئِذٍ مَا اَذَابُنَا فَمَنْ اَعْضَبَهَا اَعْضَبَنِي سَوَا فَاطِمَةٍ مِیْرَہٗ بَدَنَ کَاکُلَا یَمِیْنِ جس نے اس کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے کو ایذا پہنچائی جس نے ان کو فکر و تردد میں ڈالنا مجھے فکر و تردد میں ڈالا جس نے ان کو غصہ دلایا ان نے مجھے غصہ دلایا۔ ایک دوسرا موقع وہ تھا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہ سے ناراض ہو کر گھر سے نکل کر مسجد میں جا کر بغیر کچے بچھائے ننگی ترین پر سو گئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ زہرا کے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا اِنَّ ابْنَ مَعْصُومٍ (میرے حجام کے بیٹے کہاں ہیں) جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے کہا غَا ضَبْنِيْ فَخَرَجْتُ وَكَمْ يَقْلُ عِنْدِيْ مَجھ سے رنجش کی اور نکل گئے، گھر میں قیلولہ بھی نہیں کیا۔ یہ دونوں صحیح الثبوت اور متفق علیہ روایات ہیں۔ اور یہ بات تو بہت مشہور و واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بقائمانائے بشریت اتنا غضبناک ہوئے کہ بڑے بھائی ہو رہے ہوں گے کہ باوجود جناب کارون علیہ السلام کے سرو ڈاڑھی کے بال بکڑ کر انکو جھنجھوڑ ڈالا حالانکہ یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ دلانے کا کوئی قصد واردہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ نبی کو غضبناک کرنا کفر ہے۔ اور یہ بات بلا شک درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غضبناک ہوئے لہذا اگر یہ معاملہ غضبناک کرنے کا ہوتا تو معاذ اللہ حضرت کارون علیہ السلام متصف برسات کہاں رہتے!

ایک اور جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا میراث نہ ملنے یا دعویٰ ہبہ تسلیم نہ کر جانے کے سبب ناراض ہوئیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بات چیت بند کر دی۔ لیکن اسی کے ساتھ شیعوں اور سنیوں کی صحیح روایات میں یہ بات بھی تو ثابت ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ بات ملنا ق گزری اور جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر تشریف

لے جا کر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا سفارشی بنا یا تاکہ سیدہ رضی اللہ عنہا آپ سے خوش دل ہوئیں۔

اہل سنت کی روایات تو مدارج النبوت، کتاب الوفا بہیقی، اور شرح مشکوٰۃ میں موجود ہیں بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شرح مشکوٰۃ میں یہ مذکور ہے کہ قعنبہ کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے (گر می کا مسمی) تھا دروازہ پر دھوپ میں کھڑے ہوئے اور معذرت پیش کی، اور سیدہ آپ سے راضی اور خوش ہو گئیں۔ ریاض النضرہ میں بھی یہ قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فصل الخطاب بہیقی میں بروایت شعبی یہ قصہ منقول ہے۔ اور ابن السمان نے کتاب الموافقہ میں اوزاعی رحمہ اللہ: روایت بیان کی ہے کہ گمری کے ایک دن جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت سیدہ بتول الزہراء رضی اللہ عنہا کے دروازہ پر تشریف لائے۔ اور فرمایا اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نور نظر، لخت جگر میں دروازہ سے اسوقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک آپ مجھ سے راضی نہ ہوں گی۔ اسوقت حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور آپ کو قسم دے کر کہا کہ نارا صلی ختم کر دیں چنانچہ آپ نے لہا رخوشنودی فرمایا اور راضی ہو گئیں۔

اب رہے شیعہ تو ان میں سے زیادہ بعینہ اہل سنت کی روایات کے مطابق روایت کرتے ہیں۔ اور امامیہ میں سے حجاج السالکین کے مصنف اور دیگر علمائے شیعہ یوں روایت کرتے ہیں۔

اِنَّ اَيُّكُمْ لَمَّا رَا اَنَّ فَاطِمَةَ اَتَقَبَّلَتْ عَنْهُ وَاَحْبَبَتْ
وَلَمْ يَتَكَلَّمْ بَعْدَ ذَلِكَ فِيْ اَمْرِ فِدَاكَ كَبُرَ ذَلِكَ عِنْدَكَ
فَاَرَادَ اِسْتِصْنََاءَهَا فَاتَّحَا فَحَالَ لَهَا صَدَقَتْ
يَا اَبْنَةَ رَسُولِ اللّٰهِ فَيَمَّا اَدْعَيْتَ وَفَلَيْتِي رَأَيْتِ رَسُوْلَكَ
اللّٰهُ صَلَّي اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَسْمُهَا فَيُعْطِي الْفَقْرَاءَ وَ
السَّائِكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ بَعْدَ اَنْ يُّؤْتِي مِنْهَا فَوَنَّاكُمْ
وَالصَّانِعِيْنَ بِهَا فَقَالَتْ اَفْعَلْ فِيْهَا مَا كَانَ اِلَى رَسُوْلِكَ
اللّٰهُ صَلَّي اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَعْمَلْ فِيْهَا فَقَالَ ذَلِكَ اللّٰهُ
عَلَيَّ اَنْ اَفْعَلَ فِيْهَا مَا كَانَ يَفْعَلُ اَبُوْكَ فَقَالَتْ وَاللّٰهِ
لَتَفْعَلَنَّ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَا فَعَلَنْ فَقَالَتْ اَللّٰهُمَّ اَشْهَدْ
فَدَعَيْتُ بِذَلِكَ وَاَخَذْتُ الْعَهْدَ عَلَيْهِ وَكَانَ اَبُوْكَ
يُعْطِيْهِمْ مِنْهَا فَوَنَّاكُمْ وَيَقْسِمُ الْبَاقِي فَيُعْطِي السَّائِكِيْنَ
وَالسَّائِكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ -

(یہ حجاج السالکین اور معتبر کتابوں کی عبارت ہے)

جب ابوبکرؓ نے دیکھا کہ فاطمہ الزہراءؓ نے مجھ سے کبیرہ خاطر ہو کر تغلقات توڑنے لگی ہیں اور فک کے معاملہ میں کوئی بات نہیں اٹھائی تو آپ پر یہ بہت شاق گذرا۔ آپ نے ان کو راضی کرنا چاہا، آپ ان کے پاس آئے اور کہا اے رسول اللہ کی صاحبزادی، آپ اپنے دعوے میں سچی تھیں۔ لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی میں سے تم کو اور اس میں کام کرنے والوں کو دینے کے بعد باقی فقروں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے اس پر جناب فاطمہ نے فرمایا کہ آپ بھی اسی طرح کریں جیسے میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ ابوبکرؓ نے کہا خدا کی قسم میں تمہارے لئے وہ کام کروں گا جو کچھ تمہارے والد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے تو اب بولیں بخدا تم ایسا ہی کرو گے۔ ابوبکرؓ نے پھر فرمایا بخدا میں ضرور کروں گا اس پر سیدہ فاطمہؓ نے فرمایا اللہ تو گواہ رہ! پس آپ ان سے راضی ہوئیں۔ اور اس پر عبدلیہ پیر ابوبکرؓ اس کی آمدنی سے آپ کو دیا کرتے اور باقی کو فقروں مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کرتے۔

ان کی اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعوے کی تصدیق فرمائی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں تاخیر حیات تصرف کرنا اور اس پر قبضہ نہ کرنا انہوں نے ملک کے خلاف سمجھا جیسا کہ پوری امت کے نزدیک طے شدہ بات ہے۔ اب جب انہیں لوگوں کے حوالہ کے مطابق جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعوے

کی تصدیق فرمادی تو پھر ام المین اور جناب امیر رضی اللہ عنہما کے گواہ بنانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ (جس کو اپنے طعن میں بیان کیا) بفضلہ تعالیٰ امامیہ ہی کی روایات سے حقیقی ظاہر ہو گیا، اور یہ لوگ جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر شہادت کے رد اور دعویٰ کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے تھے سلسلہ جھوٹ ثابت ہوئی۔ واللہ یحییٰ الحق ویبطل الباطل (اور اللہ تعالیٰ حق کو حق ثابت کرتا ہے اور باطل کو باطل) جب علمائے شیعہ نے یہ دیکھا کہ سبب والا شوشہ تو ناکام ہو گیا کہ قبضہ کے بغیر جب ملکیت نہیں ہوئی۔ تو اس شرعی مسئلہ پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کو کیوں غصہ آیا، اور اس میں جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کیا قصور، تو ہمارے زمانہ کے شیعہ علماء اس دعویٰ سے بھی منحرف ہو گئے اور ایک دوسرا دعویٰ گھڑ دیا۔ اور ایک اور اعتراض جبرط دیا جو یہ ہے۔

الحکمۃ ص ۴۰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نو سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے لئے فکد کی وصیت فرمائی تھی مگر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو فکد پر قبضہ نہیں دیا۔ اور یوں انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کی خلاف ورزی کی،

جواب۔ اس کا کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے۔ اول تو حضرت جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے وصیت کا دعویٰ، اس کے ثبوت میں اہل سنت یا شیعہ حضرات کی معتبر کتابوں سے بطور شہادت حوالہ سامنے لائیں پھر اس کے جواب کا مطالبہ کریں۔ دوسرے شیعوں اور سنیوں کا اس پر اجماع ہے کہ وصیت اور میراث دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ لہذا جس مال میں میراث جاری نہیں ہوگی اس میں وصیت کیے چلے گی۔ اس لئے کہ وصیت اور میراث دونوں میں موت کے بعد ملکیت منتقل ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام بعد وصال کسی چیز کے مالک نہیں رہتے وہ ملکیت خدا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور میراث المال اس کا نگران ہوتا ہے اور اس کا لازمی ہے کہ۔

الْأَنْبِیَاءُ لَا یُشْهَدُونَ مَلَا مَعَ اللَّهِ۔ (پیغمبر اللہ کے ہوتے کسی چیز کو اپنی ملک نہیں سمجھتے)۔ ان کے قبضہ و تصرف میں جو اشیاء ہوتی ہیں، اسے وہ عاریت سمجھتے ہیں اور اسے استعمال فرماتے ہیں، اسی لئے ان پر زکوٰۃ بھی فرض نہیں ہوتی نہ ان کے ترکہ سے قرضہ چکا یا جا سکتا ہے۔ اور مال عاریت میں نہ وصیت نافذ ہوتی ہے نہ میراث۔ اور جب ائمہ معصومین، کی روایت سے انبیاء اکرام علیہم السلام کے اموال میں میراث کا جاری نہ ہونا قطعی طور سے ثابت ہو گیا، تو وصیت کا جاری نہ ہونا بطریق اولیٰ ثابت ہوا کیونکہ توریت تو وصیت سے میراث قوی تر ہے! اور وصیت اس سے ضعیف تر۔ تیسرے! کسی مخصوص فرد کیلئے وصیت اس وقت درست ہوتی ہے، جب وصیت کرنے والے سے اس سے قبل کوئی بات خلاف وصیت صادر نہ ہوئی ہو۔ اور اس معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی یہ فرما چکے تھے مَا تَوَلَّوْا كُنَا هَ صَدَقَةً (ہم جو بھی چھوڑیں وہ صدقہ ہے) اس لئے جو آپ کا مال تھا وہ فی سبیل اللہ وقف ہوا۔ اب اس میں وصیت کی گنجائش کہاں رہی۔ چوتھے! ہم وصیت کی بات کو درست بھی مان لیں تو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر یہ معلوم نہ ہوگی اور شاہدوں کے ذریعہ اس کا ثبوت نہ ہوا! تو آپ تو اس میں معذور سمجھے جائیں گے، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے وقت کیا عذر ہو سکتا تھا، کہ آپ نے بھی اس وصیت پر عملدرآمد نہیں فرمایا اور بدستور اس کی آمدنی سابقہ مصارف پر ہی صرف فرماتے رہے! اگر آپ نے اپنا حصہ راہ خدا میں دے ڈالا تو جناب سیدہ رضی اللہ عنہا اور آپ کی بہنوں کو اپنی والدہ کی میراث سے کیوں محروم فرمایا

شیعوں نے اس کے چار جواب دیے ہیں مگر چاروں میں سقم اور خامیاں ہیں ہم یہاں سے ان کو بیان کرتے ہیں۔

(۱) اہل بیت غضب کی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیتے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ذاتی مکان فتح مکہ کے بعد غاصب سے واپس نہیں لیا، مگر ان کا یہ جواب غلط اور مخالفہ آمیز ہے اس لئے کہ عہد عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ علیہ میں خود انہوں نے جتنا باقرضہ اللہ کے قبضہ میں فکد دیا۔ اور وہ انہی کے زیر تصرف رہا تا آنکہ خلفائے عباسیہ کا دور آیا اور وہ اس پر قابض ہو گئے

ہوئے۔ پھر سلسلہ میں مامون عباسی نے اپنے عامل قثم بن جعفر کو لکھا کہ فدک اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضہ میں دیدے۔ اسی وقت امام علیؑ اس پر قابض و متصرف ہوئے، پھر متوکل عباسی نے اس پر قبضہ جمایا۔ تو پھر معتقد نے اپنے عہد میں واپس کر دیا جب تکفی نے دوبارہ قبضہ کر لیا تو معتقد نے دوبارہ اسکو لوٹا دیا۔ چنانچہ قاضی نوکاشہ نے بیاس المؤمنین میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے لہذا اگر ان شیعوں کا مذکورہ بالا جواب درست ہے تو اہل بیت کے ان قابل احترام بزرگوں نے اسے کیسے قبول کر لیا۔ اور ان کے پاس اس کا کیا جواب و جواب ہے کہ ان کے نزدیک فدک کی طرح خلافت بھی تو غصب کر لی گئی تھی، تو حضرت عثمان غنیؓ شہید رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علیؑ رضی اللہ عنہ نے اسے کیوں قبول فرمایا اور جناب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس مضموبہ شے کو چھین لینے کی ایسی کوشش و سعی کیوں فرمائی کہ جس کے نتیجے میں آپ کی شہادت تک کی نوبت پہنچی۔

دوسرا جواب ان کا یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے طریق عمل کی اقتدا فرمائی کہ فدک سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہ جواب بھی سراپا پر عمل ہے۔ کیونکہ دیگر ائمہ اہل بیت نے جناب امیر اور سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے طریق عمل کی اقتدا کیوں نہیں کی اور فدک کو اپنے زیر تصرف لاکر اس سے کیوں نفع اندوز ہوئے۔ پھر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جناب سیدہ کی یہ اقتداء فرض تھی یا نقل۔ اگر فرض تھی تو دوسرے ائمہ نے یہ فرض کیوں ترک کیا۔ اور اگر نقل تھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے نقل کی خاطر فرض کیوں چھوڑا۔ یعنی حقدار کو حق پہنانا۔ اور پھر اقتدا تو کسی شخص کے اختیار سے افعال میں کی جاتی ہے نہ کہ اضطرار کی فعل میں، اگر سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا، عظیم و عظم کے سبب فدک سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو وہ تو سراسر مجبور تھیں۔ اور مظلومیت و بے بسی میں کسی کی پیروی و اقتداء کے کیا معنی۔ اور اگر اقتدا بھی کرتے تو خود اس سے فائدہ نہ اٹھاتے، بچوں کو ان کی میراث اور حق سے تو خردم نہ فرماتے۔

(۳) تیسرا جواب، تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ نے جو اس سلسلہ میں گواہی دی تھی وہ اپنے مفاد کی خاطر نہیں دی تھی بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لئے دی تھی، یا یہ جواب بھی قباحتوں سے پر ہے: اول تو یہ کہ جو لوگ جناب امیرؑ کے متعلق اپنے دل میں بدگمانی رکھتے ہوں گے وہ وہی تو ہوں گے جنہوں نے بہرہ و وصیت میں آپ کی شہادت کو رد کیا ہوگا اور ایسے حضرات اب جناب امیرؑ کے عہد میں زندہ ہی کیا تھے! وہ کیسے جان سکتے تھے کہ آپؐ کا فائدہ نہ اٹھانا اس نقطہ خیال پر مبنی تھا۔ دوسرے یہ کہ جب جناب امیر رضی اللہ عنہ کی اولاد اس سے منتفع اور مستفید ہو گئی، تو نواصب و خوارج کو تو یہ بدگمانی کرنے کا تو موقع مل جائے گا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ سب کچھ اپنی اولاد کی خاطر اور ان کو نفع پہنچانے کے لئے کیا۔ خاص کر زمین، ملک اور باغ میں تو انسان اپنے ذاتی نفع سے زیادہ اولاد کا مفاد پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں تقاضائے دورانہی یہ تھا کہ اولاد کو کرام کو وصیت فرما جائے کہ تم اس سے ہرگز برگز فائدہ نہ اٹھانا کہ ہمیں میری شہادت و گواہی مجروح نہ ہو جائے! اسوقت اولاد کے سامنے بھی دو نظریں ہوتیں اور اسے قبول نہ کرنے کا داعیہ قوی ہوتا۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ تقیہ پر عمل کے طریق پر مبنی ہے، مگر اس جواب میں ستم اور خرابی یہ ہے کہ سارے ہی امامیوں کا یہ مذہب ہے کہ جب امام حالت جنگ و قتال میں ہو، یا خروج کے وقت میں ہو تو اس وقت قطعاً تقیہ حرام ہو جاتا ہے اسی لئے جناب حسین رضی اللہ عنہ نے کوئی تقیہ نہیں کیا یہاں تک کہ راہ خدا میں جان ہار دی! لہذا اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں تقیہ فرمایا یا تو وہ امامیوں کے نزدیک معاذ اللہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے! اور پھر اگر ان تمام باتوں سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو شیخ ابن مطہر علی نے اپنی کتاب منہج الکرامہ میں ایک ایسی بات لکھ دی ہے جو اس اشکال کی جڑ ہی اکھیڑ سکتی ہے،

اور پھر جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن و اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور وہ یہ ہے اِنَّهٗ لَمَّا وَعْظَتْ فَاِطَعَتْ اَبَا بَكْرٍ فِيْ فِدَاكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا۔ رجب حضرت فاطمہؑ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فدک کے سلسلہ میں نصیحت فرمائی تو آپؐ نے ایک تحریر لکھ کر جناب سیدہ کو بھیجی اور فدک انہیں کو لوٹا دیا۔ اب اس روایت کو صحیح مان لینے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذمہ جو بھی دعویٰ ہو بہمہ کا ہو یا میرٹ و وصیت کا۔ ساقط ہو جاتا ہے اور شبہوں کا یہ منہ نہیں رہتا کہ اب وہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر کوئی طعن یا اعتراض کریں۔

البتہ دو شبہ اب بھی شیعہ دوستی دونوں کے دلوں میں کھٹکتے ہیں، اول تو یہ کہ مان لیا جناب سیدہؑ کا دعویٰ جناب صدیقؑ کے نزدیک پابند ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ لیکن جناب سیدہؑ کی اگر مرضی اس کو لے لینے میں تھی تو جناب صدیقؑ نے اتنا توقف کیوں کیا، اول ہی مرحلہ پر کیوں نہ دیدیا کہ بات اتنی نہ برہم تھی اور ثبوت رنجش تک نہ پہنچتی۔ اور نہ صلح و صفائی کی ضرورت رہتی اس شبہ کو یوں دفع کیا جاسکتا ہے کہ اس مقدمہ میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے علجان میں پڑ گئے تھے، اگر جناب سیدہؑ کی دجلوئی مقدم رکھتے ہیں تو دیں میں دو بڑے رشتے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ اس کے بعد لوگ یہ یقین کر لیں گے کہ امور مؤمنین میں خلیفہ فرق مراتب کرنے اور رعایت سے کام لیتے ہیں۔ کہ لیاظ والوں کو بغیر ثبوت دعویٰ ہی ان کا حق دیدیتے ہیں جبکہ عام لوگوں سے ثبوت دعویٰ کی خاطر گواہ طلب فرماتے ہیں، اور یہ بدگمانی دین میں اتنے بڑے فساد کا سبب بنتی کہ قیامت تک اس کا تدارک نہ ہو پاتا۔ بعد میں آنے والے حکام و قاضی اپنے دستور العمل میں اسی کو نظیر بنا کر من مانے فیصلے کیا کرتے اور جگہ جگہ ناحق، نرمی و سستی رعایت و جانبداری اس دستور کے پیش نظر عمل میں لاتے، دوسرے یہ کہ اگر سیدہ الزہراء رضی اللہ عنہ کو فدک دیدیتے تو لا محالہ آپ کو اس کا مالک بنا دیتے اور وارث کی ملکیت درحقیقت مورث کے ملک ہے۔ کیونکہ یہ اسی کا تونا بن ہے۔ تو اس صورت میں زمین کا خاندان نبوت میں واپس لے آنا ہوگا۔ حالانکہ بفرمان رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم ماترکناہ صدقۃ یہ صدقہ رسول تھی۔ اور صدقہ کی واپسی کو آپ نے ایسا بڑا فرمایا ہے گویا کتے کا قے کر کے چاٹ لینا ہوگا۔ تو آپؐ سے ایسی سنگین چوک کیسے ہو سکتی تھی!

یہ دو دینی وجوہات آپ کے پیش نظر تھیں۔ اس کے علاوہ ایک دنیاوی وجہ بھی سامنے تھی کہ سیدہ الزہراء کا مطالبہ پورا کر دینے کی صورت میں ایسی قسم کے مطالبات حضرت عباس و اہل بیت المؤمنین رضی اللہ عنہم کی طرف سے بھی اگر پیش ہو جاتے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسی الجہن میں پڑ جاتے کہ کچھ بنائے نہ بنتا۔ ان ہی باتوں کے پیش نظر مجبوراً آپ نے حکم حدیث نبوی۔ اَلْمُؤْمِنُ اِذَا بَغَتْ اِبْنَتَاہُ اَوْ بَنَاتَاہُ اَوْ اَخْتَاہُ اَوْ اَخُوہُ فَاَوْفَقْہَا۔ جب مؤمن دو بلاؤں میں گھر جاتا ہے تو وہ ان دونوں میں سے جو بھلی ہو اسے اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صورت اختیار فرمائی کہ گو وقت طوری طور پر ناگوار ہوگا مگر اس کا تدارک ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہو گیا، مگر دوسری صورت کا کوئی تدارک ممکن نہ تھا۔ اور پھر دین میں جو فیاض پیدا ہوتا اسکی قیامت تک ذمہ داری آپ کی گردن پر رہتی۔ اس صورت میں یہ شرعی مسئلہ بھی طے ہو گیا کہ بغیر گواہوں کے دعویٰ قابل تسلیم نہیں، اور یہ بھی کہ پیغمبر کے مال میں میراث و وصیت نافذ و جاری نہیں ہو سکتی! اور اپنے اختیار شرعی سے بیت المال کی ملکیت بطور گزارہ بصورت فدک جناب سیدہ کو دے کر رنجش و ناراضگی کازالہ بھی فرمایا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ جب جناب ابوبکر صدیق و جناب سیدہ رضی اللہ عنہما میں یا بھی صلح و صفائی ہو چکی تھی اور دونوں جانب سے کدورت مٹ چکی تھی جیسا کہ شیعہ و سنی دونوں کی روایات سے ثابت ہوا۔ تو پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ جناب سیدہؑ نے اپنے جنازہ پر جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا آنا گوارا نہ کیا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے آپ کو راتوں رات خاموشی سے دفن کر دیا۔ اس شبہ کازالہ یہ ہے کہ جناب سیدہؑ کی یہ وصیت خصوصی نہیں تھی عمومی تھی، اور اس کا مبنی غایت جذبہ ستر پوشی و حیا تھا۔ جیسا کہ صحیح

روایت سے اسکی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ نے مرض وفات میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اس سے جیا آتی ہے کہ مرنے کے بعد میرا جنازہ (مردوں کی طرح) کھلا سب لوگوں کے سامنے لایا جائے چنانچہ اس وقت جنازوں کا ایک سامعہول تھا۔ مرد و عورت کے جنازے ایک ہی طرح اٹھائے جاتے تھے۔ آپ کی یہ بات سنکر اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کہا میں نے جہشہ میں دیکھا ہے کہ وہاں جنازہ کو کھجور کی شاخوں سے کجاوہ کی طرح بناتے ہیں جناب سیدہ نے فرمایا مجھے بنا کر دکھاؤ۔ جب اسماء نے بنا کر دکھایا تو آپ بہت مسرور ہوئیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے کسی نے آپ کو اتنا مسرور اور اس طرح مسکراتا نہیں دیکھا تھا۔

آپ نے اسماء کو وصیت کی کہ تم اور جناب علی رضی اللہ عنہ مجھ کو غسل دینا اور کسی کو میرے پاس نہیں آنے دینا۔ اسی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جنازہ پر کسی کو نہ بگایا۔ ایک قول یہ ہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نے چند اہل بیت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھ کر رات ہی دفن کر دیا، بعض روایات میں یہ ہے کہ دوسرے دن جناب شیخین اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تعزیت کے لئے گئے تو سب ہی نے شکایت کی کہ ہم کو آپ نے خبر کیوں نہ کی کہ ہم جنازہ کی شرکت کا ثواب حاصل کرتے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا کہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) وصیت کر چکی تھیں کہ جب میں دنیا سے جاؤں تو مجھے لات میں دفن کرنا تاکہ میرے جنازہ پر کسی نا محرم کی نظر نہ پڑے۔ لہذا میں نے ان کی وصیت پر عمل کیا، (اور کسی کو اطلاع نہیں کی) مشہور روایت یہی ہے۔

فضل الخطاب میں یوں روایت ہے کہ جناب ابوبکر، عثمان غنی، عبدالرحمن بن عوف اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم نماز عشاء کے وقت تشریف لائے اس سے قبل جناب سیدہ کا مغرب و عشاء کے مابین وفات پا چکی تھیں۔ یہ ۳ رمضان سنہ شنبہ کی رات تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پورے چھ ماہ گزرے تھے۔ آپ کی عمر مبارک ۶۸ سال تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپ رجب صدیق پیش امام ہوئے اور چار تکبیروں کے ساتھ آپ نے یہ نماز ادا فرمائی۔

(اختلاف روایات آپ نے ملاحظہ فرمایا، آخری روایت کو اگر فریق ثانی بھی قبول کرے تو طعن و اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اعتراض برائے اعتراض کی روش رکھنے والے حضرات سے ایسی توقع کہ قبول حق کا کھلے دل منہا رہ کر میں خیال خلام ہو گا۔ (۵)

اور اس امر پر کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی جنازہ پر عدم حاضری محض وصیت ہی کی بنا پر تھی، کسی کدورت و رنجش کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ایک دلیل عقلی بھی شاہد ہے، کہ کدورت و ناراضگی اس کا سبب ہوتا تو یہی بات مد نظر ہو سکتی تھی کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ آپ کا جنازہ نہ پڑھائیں، حالانکہ یہ صیح نہیں ہے کیونکہ باجماع مورخین ہر دو فرقہ شیعہ و سنی۔ جناب حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ جب باسر لایا گیا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جناب سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینہ کے عامل تھے اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر میرے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ سنت ہوتی کہ امام جنازہ امیر وقت ہو تو تم کو کبھی آگے نہ کرتا۔ اسی سے معلوم ہو گیا کہ جناب سیدہ نے آپ کو نماز کی خاطر وصیت کر کے آنے سے نہیں روکا تھا، جناب حسین رضی اللہ عنہ خلاف وصیت کیسے کرتے! اور جناب صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب سعید رضی اللہ عنہ میں جو فرق مراتب ہے وہ ظاہر ہی ہے، اور پھر ابھی چھ مہینہ ہی کی تو بات تھی کہ سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پدر بزرگوار صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تمام انصار و مہاجرین کا پیش امام بنایا تھا۔ اور اس معاملہ میں بڑا اہتمام و تاکید فرمائی تھی! تو اس بات کا احتمال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس واقعہ کو فراموش فرما دیا ہو، اور باوجود ان صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ امام المسلمین کو اپنے جنازہ کی نماز پڑھانے سے منع فرمایا ہو۔ (یہ سوچ چار پانچ صدی بعد کے کسی امامی کی تو ہو سکتی ہے، خیر القرون کے بیت نبوت کے افراد تو کیا ایک عام مسلمان کی بھی نہیں ہو سکتی، کہ وہ سوچے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنکو امام نماز بنایا ان سے نماز جنازہ نہ پڑھوائی جلتے (۶)

اختصار ۱۵) پندھرواں اور آخری طعن کا یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو شرعی مسائل بھی معلوم نہ تھے۔ اور جس کو شرعی مسائل معلوم نہ ہوں وہ سنی اور شیعہ دونوں کے نزدیک قابلِ امامت نہیں کیونکہ ان دونوں کے ہاں احکام شرعیہ کا جاننا شرطِ امامت ہے۔ اور دہوی کے لئے وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) کہ آپ نے چور کے بائیں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور اٹانہ سمجھ سکے کہ شرع میں حد کے طور پر دائیں ہاتھ کا کاٹنا متعین ہے۔

جواب ۱۔ اس دلیل کا یہ ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے بائیں ہاتھ کے کاٹنے کا موقعہ دو بار آیا۔ ایک بار جبکہ چور تیسرا بار چوری کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ نسائی نے حارث بن حاطب رضی اللہ عنہ سے، اور طبرانی و حاکم نے روایت کی ہے، اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک حکم شرعی بھی یہی ہے، اور مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوداؤد اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی گئی ہے۔

ایک چور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدمت میں پیش کیا گیا آپ نے کاٹنے کا حکم فرمایا پس کاٹا گیا۔ پھر دوبارہ لایا گیا آپ نے حکم دیا کہ تو چنانچہ کاٹا گیا۔ پھر تیسری مرتبہ لایا گیا اور آپ نے حکم دیا کہ تو پس کاٹا گیا۔ پھر چوتھی مرتبہ لایا گیا تو آپ نے پھر کاٹنے کا حکم فرمایا چنانچہ کاٹا گیا۔

ایک روایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کے بائیں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس نے کہا کہ تو اس کاٹنے کاٹ دو، پھر بھی چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو، پھر چوری کرے تو اس کا دوسرا ہاتھ کاٹ دو، پھر بھی چوری کرے تو دوسرا پاؤں کاٹ دو۔

اس بات پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ پہلی مرتبہ چور کا سیدھا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، پھر جب دوسری بار چوری کرے تو اس کا بائیں پاؤں کاٹا جاتا ہے، اور اس کا ایک ہاتھ و پاؤں کاٹنے کے بعد تیسری مرتبہ چوری کرے تو اس بارے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے مگر اکثریت کے نزدیک اس کا بائیں ہاتھ کاٹا جائے۔ اور جب چوتھی مرتبہ چوری کرے تو اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے۔ پھر اگر اس کے بعد بھی چوری کرے تو اسے دھڑکے بجائے، سزا دی جائیگی اور قید کیا جائے گا ابوبکرؓ سے اسی طرح مروی ہے قتادہ کا یہی قول اور امام مالکؓ و شافعیؒ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مذہب ہے۔

پس جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم، فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہے تو طعن و اعتراض کی گنجی نش کہاں رہی۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر فقہ حنفی کی آراء میں الزام دینا حماقت کے سوا کیا ہے! اور دوسری مرتبہ آپ نے بائیں ہاتھ اس وقت کاٹنے کا حکم دیا جب آپ کے سامنے ایسا چور پیش ہوا جس کا دایاں ہاتھ اور بائیں پاؤں چوری حد میں پہلے سے کٹا ہوا تھا اس واقعہ میں بھی اکثر علماء کا یہی مذہب ہے کہ اس وقت اس کا بائیں ہاتھ کاٹنا چاہیے! جناب امام مالک رحمہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مؤطا میں بروایت

جَبِيٍّ بَسَارِيٍّ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ
اقْطَعُوهُ نَقَطْعُهُ ثُمَّ جَبِيٍّ بِهِ الثَّانِيَةَ فَقَالَ اقْطَعُوهُ
نَقَطْعُهُ ثُمَّ جَبِيٍّ بِهِ الثَّالِثَةَ فَقَالَ اقْطَعُوهُ نَقَطْعُهُ ثُمَّ
جَبِيٍّ بِهِ الرَّابِعَةَ فَقَالَ اقْطَعُوهُ نَقَطْعُهُ

اور امام محمد بن حنفی نے شرح السنہ میں حضرت ابوسریہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کے بائیں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس نے کہا کہ تو اس کاٹنے کاٹ دو، پھر بھی چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو، پھر چوری کرے تو اس کا دوسرا ہاتھ کاٹ دو، پھر بھی چوری کرے تو دوسرا پاؤں کاٹ دو۔

إِثْنًا أَهْلَ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّ السَّارِقَ أَوَّلَ مَنْ يَقْتُلُ
بِهِ الْيَدَ الْيُمْنَى ثُمَّ إِذَا سَرَقَ ثَانِيًا يَقْطَعُ رِجْلَهُ
الْيُسْرَى. وَ اخْتَلَفُوا فِيمَا سَرَقَ ثَالِثًا بَعْدَ قَطْعِ يَدَيْهِ
وَرِجْلَيْهِ فَنَدَّ هَبَ الْكُتُوبُ إِلَى أَنَّهُ يُقْتَلُ وَيَدُ الْيُمْنَى
ثُمَّ إِذَا سَرَقَ رَابِعًا يَقْطَعُ رِجْلَهُ الْيُمْنَى ثُمَّ إِذَا سَرَقَ بَعْدَ
بَعْدِ يَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ. وَهُوَ الْمَذْهَبُ عَنْ أَبِي بَكْرٍ وَهُوَ
قَوْلُ قَتَادَةَ وَ إِلَيْهِ ذَهَبَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَ
إِسْحَاقُ بْنُ رَاهُويَةَ

عبدالرحمن بن قاسم یہ قصہ نقل کیا ہے، جنہوں نے اسے اپنے باپ سے سنا کہ یمن کا ایک شخص جس کا ایک ہاتھ، بایاں پاؤں کٹا ہوا تھا، جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بطور مہمان آیا اور اپنے گھر پر پھر ایسے کے عامل کی شکایت کی کہ اس نے بلا قصور مجھ پر ظلم کیا اور میرا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالا، وہ رات کا کسر حصہ نوافل و تہجد میں گزارتا۔ جسے دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ بھی کہہ اٹھے کہ ستری رات تو چوروں کی سی رات نہیں لگتی۔ انہیں دنوں اپنے کی زوجہ محترمہ اسماء بنت عمیسؓ کا ایک زیور گم ہو گیا، معلوم ہونے پر سب اہل خانہ اسکو تلاش کرنے لگے، چراغ جلا کر کونے کھدے دیکھے گئے کہ کہیں ادھر ادھر نہ گر پڑا ہو، اور وہ لہجہ، لفظ و مہمان بھی تلاش کرنے والوں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا۔ اور یہ بھی کہتا جاتا کہ خدا اس ظالم کو سزا دے جس نے چوری کر کے پھلے اور نیک لوگوں کے گھر کو غم و فکر سے بھر دیا۔ بالآخر شک مار کر اور مایوس ہو کر لوگوں نے تلاش ختم کر دی۔ چند روز بعد وہی زیور ایک سنار کے ہاں پکڑا گیا، تعجبش پر اس نے بتایا کہ ایک لنگڑا بچی شخص مجھے فروخت کر گیا ہے۔ آخر اس چور نے بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ تب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کا اپنے آپ بد دعا دینا مجھے اسکی چوری سے زیادہ ناگوار لگتا تھا۔ ان دو واقعات در روایات کے علاوہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہو۔ اور ان کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا کہ آپ نے کوئی غلط حکم نہیں دیا تھا۔ اس لئے آپ پر لعن و لعن کا کوئی جواز نہیں۔ یہ سراسر تعصب و عناد پر مبنی ہے!

(۴) دوسری دلیل طعن ۵ کے سلسلہ کی ہے کہ آپ نے لواطت کے مجرم کو زندہ آگ میں جلا دیا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سزا زندہ جاندار کو آگ میں جلانے سے منع فرمایا ہے۔

جواب :- اس کا جواب مختلف عنوانات سے دیا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ لوطی کو جلا دینے کا قصہ جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ روایت ضعیف ہے جس کو اہل سنت کو الزام دینے میں حجت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ صحیح روایت وہ ہے جو سید بن غفلہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے۔ **إِنَّهُ أَكْرَبَهُ فَصَدَّبَ عَنْقَهُ ثُمَّ أَكْرَبَهُ فَأُخْرِقَ**۔ آپ کے حکم سے اس کی گردن ماری گئی۔ پھر آپ نے حکم دیا تو اس کو جلا لیا گیا۔ اور مردہ کو عبرت کی خاطر جلا دینا درست ہے جس طرح مردہ کو عبرت کی خاطر سولی پر کچھ عرصہ کے لئے لٹکا رہنے دینا۔ کیونکہ مردہ کو تو اس عذاب کا کچھ احساس نہیں ہوتا، دیکھ کر درد کا مدار تو حیات پر ہے۔

اور مرتضیٰ کو شیعہ علماء میں چوٹی کا شمار ہوتا ہے اور علم الہدٰی کے لقب سے مشہور ہے، اس روایت کے صحیح ہونے اور پہلی روایت کے غلط ہونے کا معترف ہے۔ تو جو روایت نہ اہل سنت کے نزدیک صحیح ہے نہ شیعوں کے نزدیک، ایسی روایت کو طعن کا مدار رکھنا نہ دلیل اقامتی ہے (یعنی نہ دل کو تسکین دیتا ہے) نہ دلیل الزامی ہے،

دوم یہ کہ ہم نے مان لیا کہ ایک خاص شخص کو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جلا دیا۔ لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا، ایک واقعہ میں تو ایک پوری کی پوری جماعت کو آپ نے حوالہ آتش کرنے کا حکم فرمایا۔ دوسری مرتبہ زندیقوں کی ایک بڑی جماعت کو جلا دینے کا حکم دیا جن کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ عبد اللہ بن سبا کے ساتھیوں میں سے تھے چنانچہ اہل سنت کی اصح الکتاب بعد کتاب اللہ، یعنی بخاری میں جناب عکرمہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت ہے۔ **أَتَى عَلِيٌّ بَرْنَادِقَةً فَأَخَذَ قَعْمَهُ فَبَكَمَ ذَلِكَ ابْنُ سُبَّاسٍ فَقَالَ كَوْنْتُ أَنَا لَمْ أَحْزِ قَعْمُهُ لَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَعْدُو بَرْنَادِقًا أَبَاحَ اللَّهُ**۔ علی رضی اللہ عنہ کے پاس تین تلاتے گئے آپ نے ان کو نذر آتش کر دیا جب خیر (حضرت) ابن عباس رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا، میں اگر ہوتا تو ان کو نہ جلاتا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے عذاب کی طرح عذاب نہ دو! پھر ایک اور مرتبہ بھی ایسے دو آدمیوں کو زندہ جلا دیا جو باہم لواطت کے جرم میں پکڑے گئے تھے۔

چنانچہ مشکوٰۃ میں بحوالہ رزین، جناب ابن عباس و جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 مَلْعُونٌ مِّنْ عَمَلٍ قَوْمٍ لُّوطٍ۔ وہ لعنت زدہ ہے جس نے قوم لوط جیسا فعل کیا۔ اور ایک روایت میں جناب ابن عباس رضی اللہ
 عنہ نے فرمایا اِنَّ عَلِيًّا اَحَدُهَا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو جلا دیا۔

اور اس فرقہ کے بغض و عناد اور تعصب کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بعید بھی نہیں لگتا کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے متعلق اہل سنت
 کی ان روایات سے انکار ہی نہ کر بیٹھیں۔ حالانکہ خود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں ضعیف و مرود
 روایات کو بھی مدار طعن بنا ڈالا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ خود شیعوں ہی کی معتبر کتابوں سے اس معصوم کی روایات سننے
 لائی جائیں۔ شریف مرتضیٰ نے جو ان کا علم الہدیٰ ہے کتاب تزییہ الانبیاء و اولادہ میں ایک روایت بیان کی ہے۔ اِنَّ عَلِيًّا اَحَدُ رِجَالِ
 اَبِي عَلَافٍ مَّا فِي ذِكْرِهِ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو جلا دیا جس نے ایک لڑکے ساتھ اغلام کیا تھا۔ اس روایت کے پیش
 نظر اب شیعوں کا کیا منہ ہے کہ وہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر زبان طعن و راز کریں۔ کیونکہ اب تو ان کے فعل کی ایک معصوم کے
 عمل سے تصدیق ہو گئی!

سوم۔ روایات اہل سنت سے ثابت ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ اور کہنے سے
 لوطی کو جلا دیا تھا۔ چنانچہ بیہقی نے شعب الایمان میں اسکی تخریج کی۔ اور ابن ابی الدنیا سے صحیح اسناد سے محمد بن المنکدر سے اسکی روایت
 کی اور واقفی نے اپنی کتاب الردۃ کے آخری ردہ بنی سلیم میں اس کو نقل کیا ملاحظہ ہو۔

انَّ اَبَا بَكْرٍ لَّمَّا اِسْتَشَارَ الصَّحَابَةَ فِي عَذَابِ الْوَلَوِيِّ
 قَالَ عَلِيٌّ اُرَى تَحْرِقُ بِالنَّارِ فَاجْمَعُ رَأْيِي الصَّحَابَةِ
 عَلٰى ذٰلِكَ فَاَمَدَّ بِهٖ اَبُو بَكْرٍ فَاَحْدَقَ بِالنَّارِ۔
 جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو لوطی کی سزا کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ
 فرمایا تو حضرت علی نے فرمایا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ انکو آگ میں جلا
 دیا جائے۔ چنانچہ تمام صحابہ نے اس رائے پر متفق ہو گئے پس جناب
 صدیق رضی اللہ عنہ حکم صادر فرمایا اور وہ جلا دیا گیا۔

بعض شیعہ راویوں نے مغالطہ دینے کے لیے مجویہ کہا ہے کہ فجاۃ سلمیٰ کو جو راہزن تھا جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگ میں گھولوا
 دیا اور وہ جل گیا۔ سراسر غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ شجاع بن زبیر قن کو جو لوطی تھا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رائے سے جلا دینے کا حکم
 فرمایا تھا۔ اور اگر بالفرض بطور نظام مملکت راہزن کو جلا دینے کا حکم فرمایا تو یہ طعن کا سبب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کا فعل معصوم
 کے فعل کے مطابق تھا۔

معمولاً تیسری دلیل انہوں نے یہ دی کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جہدہ (دادی) اور کالہ کا مسئلہ معلوم تھا کیونکہ دوسروں سے معلوم کرتے۔
 جواب۔ یہ ہے کہ اعتراض و طعن اہل سنت پر بموجب الزام نہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک بالفعل تمام احکام کا جاننا امامت
 و خلافت کے لیے شرط نہیں ہے۔ البتہ اجتہاد اور ملکہ استنباط ضرور شرط ہے۔ اور مجتہد کا یہی کام ہے کہ اول وہ نصوص تلاش کرتا ہے
 احادیث کی چھان بین کرتا ہے، اگر نص موجود ہو تو اس کے مطابق فتویٰ صادر کرتا ہے۔ اگر نص موجود نہیں پاتا تو ملکہ استنباط سے کام
 لے کر مسائل مستنبط کرتا ہے، جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نصوص تدوینی شکل میں موجود نہیں تھیں اور احادیث کی
 روایات نے بھی شہرت نہیں پائی تھی اس لیے بوقت ضرورت مجبوراً صحابہ کی سنی ہوئی روایات کی جستجو فرماتے۔

قَالَ فِي مَشْرِحِ التَّحْقِيْدِ اَمَّا مُسْئَلَةُ الْحَدِّ وَالْكَلَّةِ
 فَلَيْسَتْ بِدَعَا مِنْ الْجَمْعَيْنِ اَوْ يَجْعَلُونَ عَنْ مَدَارِكِ
 شرح تحریر میں بیان کیا ہے کہ جہدہ اور کالہ کا مسئلہ مجتہدین کے
 لئے کوئی انوکھا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دلائل احکام پر بحث کرتے

الْحَاكِمُ وَيَسْأَلُونَ لَوْ لَمْ يَكُنْ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَهَذَا
 رَجَعَ عَلَى كَفَى بِتَبَعِ أَهْلِ الْأَوَّلِ وَالْإِسْلَامِ قَوْلِ عُمَرَ ذَلِكَ
 لَا يَدُلُّ عَلَى عَدَمِ عِلْمِهِ -

دلالت نہیں کرتا،

جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی تحقیق و تفتیش تو یہ صاف بات بتاتی ہے کہ احکام دین میں آپ کو کتنی احتیاط ملحوظ تھی۔ اور یہ کہ آپ قوا شرعیہ میں شرانگہ کا پورا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جہدہ کا مسئلہ ظاہر کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے علاوہ کوئی اور بھی روایت ہے۔ یہ آپ کی احتیاط تھی۔ ورنہ روایت میں تعدد ضرور نہیں ہے حقیقت میں تو یہ طریق قابل ستائش تھا مگر یہ ہو تعصب و عناد کا کہ ان کو تعریف و توصیف بھی قابل طعن نظر آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

چشم اندیش برکنہ باد و عجب نماید ہنرش در نظر (بداندیش کی آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے)
 اگر اس سلسلہ میں کوئی شیعہ یہ کہے کہ امام کے لئے صرف اجتہاد کو کافی سمجھنا تو اہل سنت کا مذہب ہے ہمارے نزدیک تو تمام مسائل شرعیہ کا بالفعل جاننا امام کے لئے شرط ہے، تو ہم انہیں یاد دلائل گے کہ جب تم نے مطاعن کی بنیاد اہل سنت کے مذہب پر رکھی ہے تو لا محالہ اس سلسلہ میں ان کی قرارداد بھی تسلیم کرنی چاہئے، ورنہ پھر اہل سنت کے نزدیک جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نفی جو اس باب کا موضوع ہے ثابت ہی نہ ہو سکے گی! اور اس کی ساری تنگ دو لا حاصل نہ ہو سکے گی۔ اور اگر ہندوستانی اور دھاندلی پر ہی اتر جائیں تو ہم انہیں کے اصول پر بھی ان کو جواب دے سکتے ہیں، لیجئے ملاحظہ کیجئے!

جواب دوم،۔ اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مسئلہ جہدہ و کلاہ معلوم نہیں تب بھی انکی خلافت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا کیونکہ شیعہ روایت کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے حالانکہ آپ بالاجماع امام بہ حق تھے۔ چنانچہ عبد اللہ بن بشر نے یہ روایت بیان کی ہے کہ إِنَّ عَلِيًّا سَخِلَ عَنْ مُسْئَلَةٍ فَقَالَ لَا عِلْمَ لِي بِهَا ثُمَّ قَالَ وَابْرُؤْهَا عَلِي كَيْدِي سَأَلْتُ عَمَّا لَا أَعْلَمُ۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ اور پھر فرمایا میں اپنے دل کو مطمئن پاتا ہوں کہ مجھ سے وہ بات پوچھی گئی جسے میں نہیں جانتا یعنی مجھے اس سے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی کہ جو مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا اس کا مجھے علم نہ تھا، سعد بن ابی وقاص نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے! اسی طرح جناب امام ناطق بحقؑ، جعفر صادقؑ رحمہ اللہ علیہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے! جیسا کہ امامیہ میں کے صاحب قرب الاسناد نے اسمعیل بن جابر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے۔

قُلْتُ لَأَبِي عَبْدِ اللَّهِ فِي طَعَامٍ أَهْلُ الْكِتَابِ فَقَالَ لَا تَأْكُلُهُ
 ثُمَّ سَأَلْتُ عَنْهَا ثُمَّ قَالَ لَا تَأْكُلُهُ وَثُمَّ سَكَتَ عَنْهَا
 ثُمَّ قَالَ لَا تَأْكُلُهُ وَلَا تَتَوَكَّمُ إِلَّا تَنَزَّاهَا إِنَّ فِيهَا لَيَبَغْيًا
 وَالْغَيْرُ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے طعام کے متعلق آپ کو حتیٰ جواب معلوم نہ تھا اسی لئے بہت غور و فحوص کے بعد بھی حکم شرعی معلوم نہ ہو سکا لہذا ناچار احتیاط پر عمل کرنے کو فرمایا!

مطالعن عمر سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر شیعوں نے کیا رہ طعن توڑے ہیں۔ ان میں سے ان کے خیال میں قصہ قرطاس والا طعن بڑا وزنی ہے۔ آپ بھی دیکھئے !

اعتراض (۱) بروایت بخاری و مسلم (رحمہما اللہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری مرض میں بروز جمعرات وصال سے چار روز پیشتر مکان میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ قلم دوات اور کاغذ میرے پاس لاؤ تاکہ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس سے تم میرے وصال کے بعد نہ بہکو! حاضرین اسکی تعمیل میں مختلف الرائے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حاضرین سے مخاطب ہو کر (بولے ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب قرآن موجود ہے اور وہ ہم کو کافی ہے، اسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت تھی۔ بعض حضرات نے جناب، فاروق رضی اللہ عنہ کی تابعداری کی، اور بعض نے یہ کہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرما رہے ہیں تو لے آؤ۔ اس پر یا ہم جو گفتگو ہوئی اس میں بلند آواز کی وجہ سے شور و شغب کی صورت پیدا ہوئی۔ اسی گفتگو کے دوران بعض نے یہ بھی کہا، کہ مرض کی شدت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمادیا، شاید کچھ اور فرمانا چاہتے ہوں گے، اس لئے بات کو واضح طور پر سمجھ لینے کی خاطر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس فرمان سے آپ کا کیا ارادہ ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تم میرے پاس سے اٹھ جاؤ، کیونکہ رسول اللہ کے روبرو شور و شغب (مناجحتی، مناسبت نہیں۔ عرض اسی بجا بحثی اور تنازع کے سبب اس تحریر کا معاملہ آیا گیا ہوگا۔ (راور بعد میں مرض کی کیفیت دیگرگوں ہونیکے سبب اس کا موقع نہ آیا) تو یہ ہے اہل سنت کی صحیح روایات کے مطابق قصہ قرطاس جس میں اپنی عداوت اور خواہش کے مطابق شیعوں نے رنگ آمیزی کر کے کیا ہے کیا بنا دیا۔ اس قصہ میں انہوں نے چند پہلو نکال کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر طعن و اعتراض کیے ہیں۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد کیا جو حکم آیت **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ** (وہ وہی فرماتے ہیں جسکی وحی کی جاتی ہے) سراسر وحی تھی اور وحی کو ٹھکرانا سراسر کفر ہے جیسا کہ فرمان الہی ہے **وَمَنْ لَّمْ يُحِمْمْ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ** (جو خدا کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں)۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بھی کہا کہ آپ کو زبان اور اختلاط کلام کا عارضہ ہو گیا ہے! حالانکہ انبیاء کرام ان امور سے معصوم ہیں جنون انبیاء کرام کے لئے بالاجماع جائز نہیں ورنہ ان حضرات علیہم السلام کے قول و فعل سے اعتقاد اٹھ جائے گا۔ حالانکہ ان کا قول و فعل تمام حالات میں قابل اعتماد اور لائق اتباع ہے۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو جھگڑا اور شور و شغب کیا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور بلند آوازی گنہ کبیرہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ
اے مومنو! نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ ان سے جلا کر بولو جس طرح ایک دوسرے سے یا م جلا کر بولتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتہ نہ چلے۔

(۴) امت کی حق تلفی کی، اگر تحریر لکھ لی جاتی تو بعد میں امت گمراہی سے بچ جاتی، مگر اب ہر وادی میں لوگ سرسیمہ اور پریشان ہیں۔ اصول و فروع میں بے شمار اختلافات کا شکار ہیں! لہذا اس سارے اختلاف کا سارا وبال عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کو اُٹھانا پڑا ہے۔ یہ ہے اس طعن کی تقریر، جس کا ان کے ہاں زور و شور تو بہت ہے، مگر اس سلبیہ کا وزن و تہمت کے ساتھ ان کی کسی کتاب میں

نہیں ملتا۔ (اور جس انداز اور بے سلیقہ ویہ نظم ملتا ہے، اس سے کوئی صحیح طور سے ان کے مقصد و نیت پر خاطر خواہ مطلع نہیں ہو سکتا بہر حال اب اس طعن کے سلسلہ کی ان باتوں کا جواب ملاحظہ فرمائیے !

جواب :- ان چاروں باتوں کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ یہ سارے کام اکیلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سرزد نہیں ہوئے موجودین حجۃ مبارک سب کے سب اس معاملہ میں دو گروہ ہو گئے تھے، جن میں حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ اب اگر یہ دونوں حضرات منع کرنے والوں میں تھے، تو گویا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق اور ان کے شریک تھے۔ ایسی صورت میں یہ حضرات بھی ان مطاعن کا نشانہ ہیں ! اور اگر یہ اجازت دینے والوں میں تھے، تو پھر بھی بعض مطاعن سے یہ بھی نہیں بچتے۔ ان کا الزام ان پر بھی آئے گا۔ مثلاً ایسے نازک وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار و ادبھی آواز سے بولنا۔ یا امت کی حق تلفی کا معاملہ ! کہ ساتھیوں کے منع کرنے سے ٹک گئے، نہ اس وقت لائے نہ بعد میں لائے، جبکہ موقع بھی تھا اور پوری فرصت بھی ملی تھی ! اس وقت دوات قلم لا کر لکھوا لیتے۔ اس وحی الہی کے رد میں ایک طرح سے یہ بھی شریک ہو گئے ! لہذا یہ طعن اکیلے عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر نہیں لگتا دوسرے شریک کا بھی شامل طعن ہیں ! جن میں سے بعض اتفاق شیعہ و سنی مطعون نہیں ہو سکتے۔ تو جب طعن، مطعون اور غیر مطعون سب کو شامل ہو تو وہ غیر معتبر ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ طعن ہی غیر معتبر ہو تو اس کے جواب کی ضرورت ہی کیا رہی۔ اور اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو طعن کی وجہ اول بھی سب میں مشترک ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب مبارک ابی بنی بقوطاس سارے ہی حاضرین سے تھا۔ خاص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہیں تھا۔ لہذا آپ کا یہ حکم وجوب و فرضیت کی حیثیت سے تھا تو سارے کے سارے عدم تعمیل میں گناہ گار ہوئے اور شریعت کے فرمان کے مخالف قرار پائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نافرمانی کا سبب حضرت عمر فاروق بنے اور دوسروں نے آپ کی بات مان کر حکم رسول کی بجا آوری سے منہ موڑا۔ مگر کہہ منی ثم کجھکم بھما ائذک اللہ کی وجہ میں بہر حال سب ہی داخل ہوئے۔ گویا نعوذ باللہ عمرؓ کی مثال تو شیطان کی سی ہوتی کہ کافروں کو کفر پر اکساتا ہے اور دوسرے حضرات (رضوان اللہ علیہم) کی مثال کافروں کی مانند ہوتی یہ بات بالکل صاف ہے کہ طعن اکیلے شیطان پر نہیں کیا جاتا ورنہ تو سارے کافر معذور سمجھے جائیں گے کہ وہ بے قصور ہیں۔ بلکہ ماجور ! حالانکہ یہ قرآن ہی کے خلاف نہیں، تمام شرائع سابقہ کے بھی خلاف ہے، اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم وجوب و فرضیت کے لئے نہیں بلکہ ارشاد و ہدایت کے طور پر تھا۔ تو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر موجودین رضی اللہ عنہم اس کے ترک کی بنا پر مورد طعن نہیں رہتے۔ اور نہ ہی کسی وجہ سے ان کو قابل ملامت کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ محض صلح و ارشاد پر مبنی احکام کی عدم تعمیل بالاجماع قابل گرفت نہیں ہوتی۔ جیسا آگے انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔ (اب طعن کی چاروں وجوہ کے جوابات علیحدہ ملاحظہ ہوں)

جواب وجہ (ا)۔ اس وجہ کا مدار اس مفروضہ پر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وحی کو رد کر دیا کیونکہ قول پیغمبر وحی ہونے میں، جن پر آیت قرآنی دلیل ہے ! مگر اس صورت کے دونوں مقدمے غلط ہیں۔ پہلی بات یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد نہیں کیا بلکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آرام و راحت پہنچانا چاہا۔ ان کو یہ گوارہ نہ تھا کہ اس شدت مرض میں آپ کو کسی قسم کی مشقت و رنج پہنچایا جائے۔ (جس کی آنکھوں پر تعصب، بغض و عناد کی پٹی چڑھی ہو وہ معاملہ کا یہ دلائل پہلو نہیں دیکھ سکتا۔) ہر محبت اپنے محبوب کو ہر عالم میں راحت و آرام ہی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر وہ محبوب اپنوں کے ساتھ فطری و لبستگاری انس و محبت کے سبب بحالت شدت مرض و تکلیف ان کے فائدے اور مصلحت کی خاطر خود پر مشقت برداشت کر کے

کچھ کرنا چاہئے تو ہر محب چاہتا ہے کہ اس وقت ان کا دھیان ہٹا کر یا حال مٹھول کر کے اس مشقت کے الم سے اس کو بچائے۔ اس وقت یہ کہنا کہ آپ کو اس مشقت کے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ہمیں جو کچھ بھی دیدیا ہے یا سہارا دے لئے جو کچھ کر دیا ہے، ہمیں بہت ہے، کافی ہے۔ تو اسے عدم تعمیل کوئی شقی القلب اور خود غرضی ہی کر سکتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ یہی رویہ اکثر و بیشتر رائج اور معمول یہ رہا ہے۔ پس یہاں بھی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ آپ اصحاب اور امت کے فائدہ کی خاطر چاہتے ہیں کہ شدید مرض کی تکلیف کے وقت بھی اپنے اوپر تعب و مشقت برداشت کر کے کوئی تحریر لکھوائیں یا بنفس نفیس خود لکھیں، تو آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید مشقت کے بار ڈالنے کو گوارا نہیں فرمایا۔ اور کمال ادب ملحوظ رکھتے ہوئے راہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے رفقا و احباب سے کہا کہ اس وقت آپ کو اس مشقت میں ڈالنے اور مزید تکلیف پہنچانے کی ضرورت ہے! مقصد یہ بھی تھا کہ حضور صلی اللہ کے گوش مبارک تک بھی یہ رائے اور مشورہ پہنچے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ جان جائیں کہ ایسی حالت میں مزید مشقت لاجہل ہوگی!

حسبنا کتاب اللہ۔ کہہ کر آپ نے تکمیل دین و اتمام نعمت رب العلمین والی آیت کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا تھا اہل عقل کے نزدیک تو آپ رضی اللہ عنہ کی یہ دقت نظری قابل تحسین و صد آفرین ہونی چاہیے تھی: نہ کہ موجب طعن! یہ آیت اس واقعہ سے تین ماہ پیشتر نازل ہو چکی تھی، اس میں فرمایا گیا ہے۔ اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے بطور دین اسلام کو پسند کیا۔

گویا دین میں نسخ و تبدیلی، نقص و زیادتی کا دروازہ بالکل بند کر دیا اور اس پر اتمام و تکمیل کی مہر لگا دی۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا اشارہ اسی آیت کی طرف تھا، اب ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسی نئی چیز تو لکھنا یا لکھوانا نہ چاہتے ہوں گے جو کتب و شریعت میں نہ آچکی ہو کیونکہ یہ بات تکمیل دین کے وعدہ الہی کے مناسب نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ جو احکام سابق میں قرار پائے ہیں ان پر مزید تاکید فرمائیں۔ اگرچہ احکام خدا اور رسول پر عامل رہنا چاہیں تو جو تاکیدات فرمان الہی میں موجود ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تاکیدات وقتاً فوقتاً فرماتے رہے وہ ہمارے لئے کافی ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ مزید مشقت نہ فرمائیں اس وقت مناسب اور بہتر یہی ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ سکون اور راحت میں رہیں۔ اور آپ کے یہ الفاظ۔ اِنْ كُنْتُمْ سَوَّلَ اللَّهُ صَليَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَا الْوُجُوعُ وَ عِشْنَا كِتَابَ اللّٰهِ حَسْبُنَا۔ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے جو ہمیں کافی ہے!

اسی ارادہ کی گواہی ہے! لہذا معلوم ہوا اس واقعہ میں حکم رد کر دینے کی نسبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا انتہائی کج فہمی، نادانی یا انتہائی عداوت و بغض و عناد پر مبنی ہے،

اور اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کے امور میں مصلحت کو مد نظر رکھنا یا مشورہ سے مدد کرنا صحابہ کرام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہمیشہ سے ایک معمول بہ طریق رہا ہے! اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو اس بارہ میں خاص خصوصیت اور جرات کے مالک تھے۔ کہ بہت سے معاملات میں مثلاً منافق پر نماز جنازہ پڑھنی، ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) کو پردہ نشین کرنے، غزوہ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے اور مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے اور اسی قسم کے دیگر امور میں آپ کے مشورہ کے مطابق وحی الہی نازل ہو چکی تھی، اور بیشتر مقدمات میں آپ کی صوابدید کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ بنظر استحسان دیکھتے۔ اگر اس قسم کے امر مصلحت کو پیش کرنے کے کام کو یہ شیعہ روجی، یا قول پیغمبر کا رد کہیں دے تو بات جناب فاروق رضی اللہ عنہ تک ہی نہیں رہے گی بلکہ بعض جگہ جتنا

علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی آپ کے شانہ بشانہ اس الزام میں شریک نظر آئیں۔ چند مقامات دیکھیے تو۔

الف۔ بخاری شریف میں بطریق متعدد مروی ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیر اور سیدہ زہرا رضی اللہ عنہما کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اور ان کو نیند سے بیدار کر کے ادائیگی تہجد کے لئے سخت تاکید فرمائی، قَوْمًا فَصِيًّا (دونوں ٹھو اور نماز تہجد پڑھو) جواب میں جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا وَاللّٰهِ لَا أَفْعَلُ (اَلَا مَا كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْنَا) کہ اللہ کی قسم ہم نماز نہیں پڑھیں گے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کی ہیں، قَالِمَا أَفْعَسْنَا بِكَ اللّٰهُ (اور ہمارے دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں) وہ توفیق دیتا تو ہم تہجد بھی پڑھتے، یہ جواب سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان سے واپس چلے آئے اس وقت آپ اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے اور یہ فرماتے جاتے تھے وَكَانَ اللّٰهُ أَكْثَرُ شَيْءٍ جَدًّا لَّهُ. انسان بہت ہی جھگڑا لوبہ، لہذا اس قصہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی جانب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرعی معاملہ میں جھگڑنا ثابت ہوا ہے مگر چونکہ قرینہ صدق و راستی اور نیک نیتی پر گواہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامت نہ فرمائی۔

ب۔ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ غزوہ حدیبیہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے مابین صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے لفظ رسول اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب کے بطور لکھ دیا۔ رؤسائے کفار نے اس لقب کے لکھنے پر اعتراض کیا، کہ اگر ہم ان کو رسول اللہ ماننے تو پھر ہمارا جھگڑا ہی کی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چند جناب علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ لقب کاٹ دو۔ مگر آپ اپنے جزو ایمان، لقب کو کیسے کاٹ دیتے، اس لئے نہیں کاٹا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو رد کر دیا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ آپ کے ہاتھ سے لیکر خود مٹایا۔

لیکن اہل سنت اس قسم کے رویہ کو نہ مخالف رسول جانتے ہیں نہ کہتے ہیں، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اس مخالفانہ طرز عمل پر ان پر طعن بھی نہیں کرتے! اس لئے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر وہ کیوں طعن کریں گے! اور اگر شیعہ اس قسم کے امور کو رسول کی تردید کہنے پر ہی اصرار کرتے رہے تو پھر وہ اپنے پاؤں پر گویا خود ہی کھڑکی ماریں گے۔ اور قیل وقال کی راہ اپنے اوپر تنگ کریں گے کیونکہ اس فرقہ کی اپنی کتابوں میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق اس قسم کی مخالفانہ اور مصلحت اور مشورے پیش کرنے کے واقعات موجود مرقوم ہیں۔ چنانچہ شریف مرتضیٰ نے جو ان کے ہاں علم الہدیٰ کے لقب سے مشہور ہے! اپنی کتاب الغرر والدرر میں جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے روایت درج کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم (علیہ السلام) کی والدہ جنابہ ماریہ قبطیہ اور ان کے چچا زاد بھائی قبطی کے متعلق جس کی آپ کے ہاں آمد و رفت، سختی لوگوں نے اتہام کے طور پر بہت باتیں بنائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا یہ تلوار لو اور جاؤ، اگر وہ ان کے پاس ہو تو قتل کر دو، میں وہاں گیا، وہ مجھے دیکھ کر اور میرا ارادہ بھانپ کر وہاں سے بھاگ کر کچھ کے درخت پر جا چڑھا۔ پھر وہاں سے گدی کے بل زمین پر اپنے آپ کو گر کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ تو میں نے دیکھا کہ اس کے تو مردانہ عضو ہے ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے تلوار میان میں ڈالی

قَدْ أَكْثَرُ النَّاسُ عَلَى مَارِيَةِ الْقِبْطِيَّةِ أَقْرَبُ إِلَيْهِمْ
بَنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ابْنِ عَمِّ لَهَا
قِبْطِي كَانَ يَزُودُ هَذَا وَيَخْتَلِفُ إِلَيْهَا فَقَالَ النَّبِيُّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ هَذَا السِّيفَ وَانْطَلِقْ
فَارْجُدْهُ عَنْكَ فَإِنَّهُ فَاثِلُهُ فَمَا أَفْجَلْتُ فَمَا
عَلِمَ أَنِّي أُرِيدُ مَا قَاتِي مَخْلَّةً فَزَقَى إِلَيْهَا ثَمَّ
كَفَى بِنَفْسِهِ عَلَى قَتْلِهِ وَشَقَّ بِرِجْلَيْهِ فَاذَابَهُ
أَجَبَتْ وَأَمْسَحَتْ لَيْسَ لَهُ مَا لِلرِّجَالِ لَا قَلِيلٌ وَ
لَا كَثِيرٌ قَالَتْ فَعَمِدَتْ السِّيفَ وَرَجَعَتْ إِلَى

اور رسول اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آکر ساری صورت واقعہ عرض کی، تب آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے فرمایا سب اللہ کے لئے ہے جو ہم اہل بیت سے ہر گندگی و برائی کو کاٹا لے ہے۔

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہ اہل بیت سے تھیں اور آیت تطہیر میں داخل۔ اور خدا کا شکر ہے کہ رحمت سب کو شامل ہوئی اور نعمت سب پر عام۔ اب یہ شیعوں بتاتیں کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر نطق وحی واجب الاتباع ہے تو یہاں جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کیوں نہیں فرمایا۔ ہمارے نزدیک تو آپ کا یہ فعل عین حق تھا اور آپ پر کوئی طعن یا اعتراض نہیں۔ البتہ شیعوں کے لئے لمحہ فکریہ ضرور ہے۔ (۱) محمد بن یاقوب نے اُمّی میں اور دیلمی نے ارشاد العلویہ میں یہ روایت بیان کی ہے !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کو سات درہم عیانت فرما کر فرمایا کہ یہ علی (رضی اللہ عنہ) کو دینا اور کہنا کہ اس رقم سے اپنے اہل و عیال کے لئے کھانا لے آنا کیونکہ وہ بھوک سے بہت پریشان۔ پس وہ رقم سیدہ زہرا نے جناب علی کو دی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان سے ہمارے لئے کھانا خرید لائیں آپ وہ رقم لے کر گھر سے نکلے کہ اہل خانہ کیلئے کھانا لے آئیں کہ ایک آدمی کو یہ کہتے سنا کہ سچے وعدہ پر کون قرض دیتا ہے آپ نے وہ درہم اسے دے ڈالے۔

اِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطَى فَاطِمَةَ سَبْعَةَ دَرَاهِمٍ وَقَالَ أَعْطِيهَا عَلِيًّا وَمُرِّيهِ أَنْ يُشْتَرِيَ لِأَهْلِ بَيْتِهِ طَعَامًا فَقَدْ غَلَبَهُمُ الْجُوعُ فَأَعْطَتْهَا عَلِيًّا وَقَالَتْ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَكَ أَنْ تَبْتَاعَ لَنَا طَعَامًا فَاخْذْهَا عَلِيًّا وَخُذْ مِنْ بَيْتِهِ لِبَيْتِنَا طَعَامًا لِأَهْلِ بَيْتِهِ فَمِيعَ نَجَلًا يَقُولُ مَنْ يَقْدِرُ مِنَ النَّبِيِّ الْوَفَى فَأَعْطَاهُ الدَّرَاهِمَ

اس قصہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں (۱) رسول اللہ کی مخالفت (۲) دوسرے کے مال میں بلا اجازت تصرف (۳) اہل و عیال کی حق تلفی اور بیت ہی قریب، عزیز، بزدل۔ یعنی بیوی بچوں کے ساتھ قطع رحمی نیز یہ بات بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو جگر کے ٹکڑوں کو بھوکا رکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ بھجانا۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کے لئے اللہ کی طاعت میں تھا اور نیت بخیر تھی اس لئے مقبول اور قابل تحسین و تعریف ہوا۔ اس پر کوئی عتاب یا ناراضگی کا اظہار نہیں ہوا۔

اور قرآن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم تھی کہ اصحاب حقوق یعنی بیوی بچے اس ایثار اور نیک کام پر رضامند اور خوش ہوں گے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے جائز قرار دیں گے۔

اب یہی بات دوسرے مقدمہ کی! کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وحی ہیں۔ یہ دلیل عقلی اور نقلی دونوں لحاظ سے درست نہیں۔ عقلی دلیل سے تو اس طور کہ ہر سچے دار بخوبی جانتا ہے کہ رسول کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں۔ اور جب اسکی اصناف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے اللہ کا پیغام پہنچانے والا۔ اب رسالت کے محض طرف یہ ہوئے کہ ان کے پاس اللہ کا پیغام آئے اور ان کے ذریعہ وہ پیغام ہم تک پہنچے۔ یہ معنی نہیں کہ ان کا ہر فرمان اللہ کا پیغام! آیت وَمَا يَنْطِقُ الْمَرْقُورُ کے ساتھ خاص ہے۔ عَلَمُهُ شَدِيدُ الْقُوَى۔ اس کی دلیل ہے۔ یہ آیت پیغمبر کے تمام اقوال کو شامل نہیں۔ اس کی مثال دنیاوی اموریں ہمارے سامنے روزمرہ رہتی ہے، کہ کسی حاکم، عامل، یا بادشاہ کے ایچی کی، ہر بات اور ہر قول بادشاہ کی طرف سے نہیں سمجھا جاتا، یہاں ایک باسزور ذہن نشین کر لی جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت کے علاوہ ایک اور حیثیت منشائے الہی سمجھنے والے کی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں فرمایا ہے کہ رسول تم کو جو کچھ دے پس اسے لے لو، اور جس بات سے روکے اس سے رک جاؤ، یہ آیت میرے خیال میں اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہونے کے ساتھ مقتدا و پیشوا، اور مصلح امت بھی ہیں۔ اور امت پر

حقیق اور اس کے خیر خواہ بھی! اس کے پیش نظریہ کہا جائے گا کہ آپ کا ہر حکم خواہ اس کے ساتھ وحی کا نوالہ ہو یا نہ ہو، قابل اتباع ہو گا۔
البتہ اس کی حیثیت متعین کرنے کے لئے کہ وہ حکم الہی ہے۔ یا آپ کی رائے بطور مشورہ، یا وہ واجب الاتباع ہے، یا حکم استعسانہ
مندوب، آپ سے استفسار کیا جانا معیوب یا موجب طعن نہیں ہو گا۔ اور ایسے حکم کی عدم تعمیل کو جو مندوب ہو، یا قرآن سے معلوم ہو
کہ یہ پہلو ملحوظ ہے یا مراد رسول سے گنجائش معلوم ہوتی ہو، اسے رد وحی نہیں کہیں گے۔ (نعمانی)

اور نقلی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وحی منزل من اللہ کے درجہ کے ہوتے تو آپ کے بعض اقوال پر قرآن
مجید میں گرفت اور سرزنش نہ ہوتی حالانکہ بعض مقامات پر تو سرزنش کا لہجہ خاصا سخت بھی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذْنَتْ لَهُمْ ۖ اللَّهُ تَعَالَىٰ أَبِ كُفْرِهِمْ قَوْلَهُمْ ۚ وَأَبِ كُفْرِهِمْ قَوْلَهُمْ ۚ وَلَا تَجْعَلُ الْوَعْدَ عَيْنًا وَلَا تَتُخَذُ الْحَقَّ كَذِبًا ۚ
آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنے، اللہ سے مغفرت طلب کیجئے، بے شک اللہ تعالیٰ مغفور بھی ہے رحیم بھی، اور جو لوگ اپنا کلمہ
نقصان کرتے ہیں آپ ان کی جوابدہی نہ کیجئے! ایک اور جگہ۔ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَهَضْتُمْ عَنْهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ
اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے فیصلہ نہ لگے، اگر آپ نے ان سے سوچا یہاں پاداش میں دردناک عذاب کی صورت پکڑ ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو قبلی کے قتل کا حکم، طعام کی خرید، فقہ رسول اللہ کے مٹانے اور تہجد کا حکم سارے منزل من اللہ ہوتے
اور جناب امیر رضی اللہ عنہ مدوحی کے مرتکب قرار پاتے اور اگر ایسا ہوتا تو پھر وقت اور ہمد فی الامر۔ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے
مشورہ کرنے کا حکم دینا بے معنی بات ہوئی، اور پھر بعض امور میں بعض صحابہ کی اطاعت کسی معنی پر معمول کی جائے گی جسکی طرف آیت
لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُمْ ۚ اگر وہ بہت سے کاموں میں تمہاری اطاعت کریں تو تم دشواری میں پڑ جاؤ
ارشاد کرتی ہے! اور پھر یہ بھی ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں
اہل و عیال کی حفاظت و نگہداشت پر مقرر فرمایا تو آپ نے معتزنا نہ لہجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

أَتُخَفَّفُ فِي النِّسَاءِ وَالصَّبِيَّانِ ۚ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جارہے ہیں! (یعنی کیا میری حیثیت آپ کی نظر میں
ایسی وہ گئی ہے کہ میلان جہاد میں شرکت کے بجائے عورتوں بچوں کے ساتھ رہوں، تو یہاں وحی الہی کے مقابلہ میں اعتراض کرنا ایک
جائز ہوتا، اور اصول امامیہ کو دیکھا جائے تو ان کے پاس تو تمام اقوال رسول مدوحی ہیں اور نہ ان کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ
وسلم کے تمام افعال واجب الاتباع ہیں۔

لہذا جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کے اس فاسد باطن اور غلط مقدمہ کو جو نہ تو واقعہ کے مطابق ہے، اور نہ خود ان کے مذہب
کے موافق اور نہ ہی مد مقابل کے مذہب کے موافق، اس طعن کی تکمیل و ترویج کی خاطر ذکر کرنا تعصب و عناد، بغض و حسد کا بدترین
مظاہرہ ہے،

اب ہم اس معاملہ کو اقوال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچی سطح پر رکھ کر تجزیہ کرتے اور کہتے ہیں کہ شیعہ و سنی ہر دو کے نزدیک
مصلحت پیش کرنا، مشقت سے بچنے کی صورت نکالنا۔ اور حکم الہی بلا واسطہ کو جو قطعی طور پر وحی منزل من اللہ ہے، کے خلاف امر
اور بار بار اس میں ترمیم کی درخواست رو دینی شمار نہیں ہوتا۔

پہنچتے شب معراج بسلسلہ نماز کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بمشورہ پیغمبر الواعظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مرتبہ
مراجعت فرمائی اور بارگاہ الہی میں عرض پرداز ہوئے، کہ اس حکم کو میری امت برداشت نہ کر سکیگی اس میں تحقیق فرما دیجئے،

یہ بات خود ابن ابویہ نے کتاب المعراج میں لکھی ہے۔ اگر یہ امر رد و محی ہوتا تو پیغمبران عظام علیہا الصلوٰۃ والسلام سے اس کا صدور کیسے ہوتا! لہذا ایسے امور کو رد و محی کہنا کسی مومن سے تو متوقع نہیں ایسا تو کوئی ملحد و زندیق ہی کہہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بلا واسطہ حکم الہی میں سوال و جواب اور نوٹ پلٹ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں خود قرآن مجید میں موجود ہے۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوسٰى اَنْ اَنْتَ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ قَوْمٌ
فِرْعَوْنُ اَلَا يَتَّقُوْنَ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ اَخَافُ اَنْ يَّكْذِبُوْنِ
وَيَقِيْنُقُ صَدْرِىْ وَاَنْ يَّخْلُقُوْا لِّىْ فَاَرْسِلْ لِّىْ
مَرْءًا مِّنْكَ وَكَلِّمْهُ عَلَىٰ ذُنُوْبِىْ فَاَخَاتُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ
قَالَ كَلَّا فَاَدْهَبْ بِاَيِّ اٰرَتْنَا اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ
جب موسیٰ علیہ السلام سے تمہارے رب نے واضح طور پر کہا کہ
فرعون کی ظالم قوم کے پاس جاؤ وہ بڑے اور بے خوف ہو گئی ہے۔
تو موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب مجھے خطرہ ہے وہ مجھے جہنم لادینگے۔
میرے سینہ کے اندر گھٹن بھی ہوتی ہے اور زبان بھی (بوجہ کفایت)
نہیں چلتی، آپ! ماروں گے، اس بھی وحی بھیجئے اور ان کا ایک گناہ
بھی مجھ پر ہے سو موت اہوں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے
فرمایا، ان کی بجاں نہیں! تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ ہم تمہارے
ساتھ ہی ہیں۔ اور سنتے ہیں۔

اور پھر یہ بات شیعوں کے ہاں اصولی طور پر طے شدہ ہے کہ رسول ہی نہیں بلکہ خدا کے بھی بلا واسطہ حکم کا تقاضا یقینی وجوب نہیں ہوتا اس
میں مندوب و مستحب کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ لہذا دونوں شقوں میں سے ایک شق کی وضاحت و تعیین کے لئے استفسار اور نوٹ پلٹ
ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرتضیٰ شریف کی الغر والدر میں اس کا ذکر موجود ہے: جب یہ بات ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس حکم کے
بارے میں استفسار اور اس کو لوٹانے میں کیا قصور اور کون سا گناہ تھا، ان کی نیت و ارادہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف و شفقت
میں تخفیف تھا، اور ثبوت میں آیت قرآنی بھی پیش کر رہے تھے جس سے بھی بظاہر اس حکم کے مندوب ہونے کا پتہ چل رہا تھا۔

جواب وجہ (۲)۔ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختلاف کلام (بہکی بہکی باتیں کرنا) کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
کی "اودیہ بات بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے، اور یقین کے وہ کونسے ذرائع ہیں جو یہ بتائیں کہ اھ جدا۔
استفسار کیا یہ بات عجیب ہے پھر اسکو پوچھ لو کہ الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلے۔ اکثر روایات میں "قالوا"
کا لفظ ہے جو کسی قائل کی تصریح نہیں کرتا۔ ممکن ہے یہ حامیان تحریر کے منہ سے نکلے ہو، اور استفسار انکار کی طویر اپنے
قول کی تائید میں بولا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ تو طے شدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی بہکی بات نہیں نکلتی،
لہذا تعمیل حکم کے لئے یہ پوچھ لیں کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ احتمال دوسرے پہلو کا بھی ہے کہ مخالفین تحریر نے یہ بات بطور
استفسار انکار ہی ہو، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہکی بات کیوں کہنے لگے مگر آپ کے اس فرمان کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا پھر پوچھ کر دیکھ لو
کہ واقعی کچھ لکھنا لکھنا ہی مراد ہے یا کچھ اور مقصد ہے! اور بظاہر حالات بھی اس کلمہ کا نہ سمجھا جانا ہی محتمل تھا۔ کیونکہ نبی رحمت صلی اللہ
علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ احکام الہی کو خدا کی طرف منسوب کر کے ذکر فرماتے اور یہاں آپ نے بہ نسبت ذکر کر کے یہ نہیں فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِىْ اَنْ اُكْتَبَ لَكُمْ كِتَابًا لَّا تَنْفَلُوْا اَبْعَدِىْ بِكَ اللّٰهُ تَعَالٰى نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ جاؤں کہ
میرے بعد تم ہیک نہ سکو! مانعین تحریر اس شبہ میں پڑ گئے کہ ممکن ہے آپ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق ہی فرمایا ہو مگر ہماری سمجھ میں
نہیں آیا لہذا تحقیق کر لینی چاہیئے! اور پھر بات قطعی طور پر سب کے علم میں تھی کہ آپ نے عمر بھر نہ کوئی تحریر لکھی، نہ اسکی آپ کو مشق
تھی۔ اور نہ ہی (بطور معجزہ ہی) یہ تحریر آپ سے کبھی ظہور میں آیا۔ آپ کے اُمتی ہونے کی تصدیق قرآن مجید نے بھی کی ہوئی تھی۔

پھر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کی نسبت اپنی طرف فرمایا کہ اکتب لکم کتابا (کہ میں تمہارے لئے تحریر کروں) یہ اچھنبے کی بات تھی کہ انہیں اس کے کیا معنی ہیں۔ اسکو پوچھنا چاہئے۔ کیونکہ کلام پیغمبر کو نہ بیان تو کہہ نہیں سکتے! علاوہ ازیں یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں لکھوایا کرتے تھے۔ بلکہ کسی اور تحریر کا پڑھنا پسند بھی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ تورات کا نسخہ کہیں سے لائے اور اسے پڑھنے لگے تو آپ نے منع فرمادیا اور اس وقت آپ نے قرآن کے علاوہ کچھ اور بدست خود دیکھنے کو فرمایا تو حاضرین کو بہت تعجب ہوا۔ اور اسے سہجھانے سے عاجز رہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ بطور استغناء انکاری یا تعجبی، کسی کی زبان پر یہ لفظ آگیا ہو۔ اگر ان کو نہ بیان کا یقین ہو یا آپ کے کلام پر ہنسیاں لاحق ہونا ان کے وہم و گمان میں بھی ہوتا تو یہ کبھی نہ کہتے کہ پھر پوچھو! بلکہ یہ کہتے اس کے پیچھے مٹ پڑو یہ تو نہ بیان ہے اس کا کیا اعتبار!

اب یہاں اس جملہ ۱۔ صحیح البخاری کی تفصیل ملاحظہ ہو، لغت عرب میں حجر کے معنی اختلاف کلام کے ہیں کہ بات سمجھی نہ جائے۔ اور یہ اختلاف دو قسم کا ہوتا ہے۔ گرفتگی آواز کی وجہ سے (گلا بیٹھ جانا، زبان پر خشکی کے غالب آجانے کے باعث، اٹھٹھٹھ تکم و گفتگو کے کردار پر جانے کے سبب، ایسا ہو جاتا ہے کہ الفاظ صحیح معنی سے خاطر خواہ طور پر نہ اُٹھ سکیں، الفاظ جیسے مرز۔ نہ زبانیں یا لٹوٹ لٹوٹ کر اُٹھیں یہ اختلاف کلام کی پہلی قسم ہے، یہ عارضہ پیغمبرانہ کہ ام علیہم السلام کو بھی لاحق ہو سکتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر اس عارضہ کے لاحق ہونے سے کسی وصفت پیغمبری میں کوئی نقص یا عیب ہرگز پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ مرض و بیماری کے اعراض و توابع ہیں۔ باتفاق اہل سیر، مرض الوصال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتگی آواز کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ احادیث کتب صحیحہ میں یہ بات ملتی ہے۔ اختلاف کی دوسری قسم یہ کہ غشی (بیہوشی) کے سبب اور تپ لائے محرقہ میں دماغ کی طرف بخارات کے صعود کے باعث اکثر اوقات البساتو ہے کہ بے ربط یا خلل مفقود کلام زبان پر جاری ہو جائے۔ یہ کیفیت کو امور بدیہہ کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ روح اور فوق مدد کہ پرائز نازل ہو جاتی ہے اس لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو یہ کیفیت لاحق ہونے اور نہ ہونے میں علما کی آرا میں اختلاف ہے، جو حضرات اسے جنون پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے انبیاء کے لئے متغیر قرار دیتے ہیں۔ اور جو حضرات اسے نیند پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے جاگتے سمجھتے ہیں، اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس اختلاف کا دوسرا سبب یعنی بے ہوشی انبیاء علیہم السلام کو بھی لاحق ہوتی ہے۔ فخر موسیٰ صعبا۔ (موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے) تو قرآن مجید میں بھی آیا ہے، اسی طرح صورت قیامت پھونکے جانے کے وقت سوائے موسیٰ علیہ السلام کے سب کا بیہوش ہو جانا صحیح بھی ہے اور ثابت بھی۔ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصُعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ۔ اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے، مگر جسے اللہ چاہے۔ (وہ بیہوش نہیں ہوگا) اور حدیث صحیح میں یوں آیا ہے کہ فَالْوَنُ أَفَلَا مَن يَفْقَهُ فَاذْأُمُوسَىٰ أَخَذَ بِعَاقِبَتِهِ مِن تَوَائِمِ الْعَوَاشِ فَلَا أَدْرَىٰ أَصَبَقَ فَأَخَاقَ قَبْلِي أَمْ جُوزِي بِصُعْقَةِ الطُّورِ سَبَّ سَبَّ بَشَرٍ مِّنْ أُنْثَىٰ وَالْأَيْسَ هُوَ كَا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نظر آئیں گے جو عویش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے کھڑے ہوں گے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ وہ بیہوش ہوئے اور بچھ سے پہلے بیہوش میں آگئے۔ یا ان کی طور کی بیہوشی آبجی بیہوشی کا بدل ہو گئی۔

مال یہ بات ضرور ہے کہ اپنی کرامت اور سزرگی کے ساتھ غشی و بیہوشی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اپنی مرضی کے خلاف قول و فعل کے صدور سے بچائے رکھتا ہے۔ انکی عصمت اس حال میں بھی قائم و باقی اور فعال رہتی ہے۔ ہر حال میں ان سے رضائے الہی کی بات صادر ہوتی ہے! اور یہ بالکل ظاہر ہے ایسی حالت کو جنون پر بالکل قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ جنون میں اول مدد

کے قول نے مدرک میں احتمال پیدا ہو کر جم جاتا ہے، اور یہ احتمال جاری رہتا ہے زائل نہیں ہوتا۔ اسی لئے جنون کی حالت رستی ہے بخلاف اس حالت کے کہ یہاں روح ہر احتمال سے بالکل محفوظ رہتی ہے البتہ اعضائے جسمانی مخالف اثر کے علیہ پانے کی وجہ سے اور اس کے دفعیہ کے لئے روح کا مصروف بکار ہونے کے سبب روح کے زیر فرمان نہیں رہتا اسی لئے یہ حالت نہ جنتی ہے اور نہ دیر پا ہوتی ہے۔ یہ بالکل غیبر کے مانند ہے جو انبیاء کو لاحق ہوتی ہے اور جاگنے میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ بال اتنا ہے کہ نیند میں ان حضرات کا تلبہ بہدار و آگاہ اور خبردار رہتا ہے، مگر بیہوشی میں بھی نیند کے وہ تمام انکار جو اعضائے جسمانی، آنکھ، کان سے متعلق ہیں مرتب ہوتے ہیں اور نماز کا قصنا ہو جانا یا وقت کے گزر جانے کی خبر نہ ہونا یہ حالت ان حضرات کرام کو بھی پیش آتے ہیں جیسا کہ کافی کلینی میں حدیث لیلة التعریس کے ضمن میں مذکور ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی نمازوں میں سہو و نسیان لاحق ہوتا ہے چنانچہ امامیہ کی کتب صحاح میں انبیاء و ائمہ سے سہو و نسیان کی روایات بیان کی گئی ہیں۔

اس واقعہ میں بھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وجوہ کثیر خلاف عادت شریفہ باتیں ظہور میں آئیں، جسکی تفصیل ابھی مذکور ہوئی، ایسی حالت میں حاضرین میں سے کسی کو یہ دم ہو گیا ہو کہ کہیں یہ کلام بھی اختلاط کلام کی قسم سے نہ ہو جو اس جیسی بیماری میں رونما ہو جاتا ہے تو اس میں بعد از عقل کیا بات ہے، اور نہ یہ محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آپ خد یدود سر اور دیکھتے بخار میں مبتلا بھی ہوں۔ اور دوسری روایت سے تو یہ معنی اور تعجب صاف سمجھا جاسکتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ **حَاشَانَا اَھْجَدَا اَسْتَفْھُوْهُ** (آپ کا کیا حال ہے کیا اختلاط کلام ہے، ذرا پوچھو تو) اس پر کہنے والا آداب کی رعایت کرتے ہوئے انہما ریقین نہیں کرتا بلکہ بطور شک کہہ رہا ہے، ممکن ہے، ایسا نہ ہو اور ہم ہی آپ کا مفہوم نہ سمجھ پارہے ہوں، دوبارہ دریافت کر کے بات کو واضح کرالیتا چاہئے! اور یہ گفتگو تو اس تقدیر پر ہے کہ اختلاط کی دوسری قسم بیہوشی برادرین، اور اگر قسم اول برادرین (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کے مشورہ کی وجہ سے اپنے پاس سے اٹھ جانے کے متعلق جو ارشاد فرمایا اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ آپ پر بیہوشی طاری نہیں تھی بلکہ مرض کی شدت والی صورت تھی۔ ن) تو اس جملہ کا مطلب یہ ہو گا کہ شدت مرض کی وجہ سے آپ کے فرمان کے الفاظ ممکن ہے ہم پورے طور پر نہ سمجھ سکے ہوں، آپ سے استصواب کر کے مراد متعین کرالیں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل پورے اور صحیح طور پر انجام دے سکیں اس صورت میں کوئی اشکال نہ رہا۔

جواب وجہ (۳)۔ یہ وجہ سراسر غلط فہمی اور حق سے چشم پوشی پر مبنی ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا بے شک ممنوع اور ناجائز ہے مگر اس قصہ میں تو کسی سے بھی یہ حرکت سرزد نہیں ہوئی، نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہ کسی اور سے! اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی گفتگو کی آواز بلند ہو ہی جاتی رہی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ آیت قرآن مجید سے تو اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز اونچی کرنے کی ممانعت ہے۔ اگر آپ کی مجلس میں باہمی گفتگو صر بلند رہی، آواز ممنوع ہوتی تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے **لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ بَيْنَکُمْ عِنْدَ النَّبِیِّ** (نبی ص کے پاس بیٹھ کر باہم بلند آواز سے نہ بولا کرو)

در اصل آیت کا مفہوم صحیح طور پر متعین کر لیا جائے تو یہ اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ میرے خیال میں آیت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ (ا) جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرما رہے ہوں تو آواز پر اپنی آواز بلند کرے آپ کی گفتگو میں خلل نہ ڈالو، کہ اس سے دوسرے لوگوں تک آپ کی آواز پہنچنے میں رکاوٹ ہوگی۔ اور پورے مجمع تک آپ کی آواز صحیح طور پر نہ پہنچنے کے سبب احکام کی صحیح تبلیغ میں

نقص واقع ہوگا۔ اسی لئے آپ کی آواز پر آواز کا بلند کرنا گہرے اور حرام قرار پایا۔

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو میں اس کا خیال رکھو کہ جس میاں روی سے آپ گفتگو فرماتے ہیں حاضرین کو بھی آپ سے گفتگو اسی لہجہ اور انداز میں کرنی چاہیئے۔ آپ نے کوفات مدغم لہجہ میں فرمائی تو آیت کہتی ہے تم جواب بھی مدغم لہجہ میں دو، یہ نہیں کہ ایسے لہجہ میں بولو جو حضور کے لہجہ سے بلند ہو گجھد بفضکم لبعض سے ایک طرف تو مفہوم بالا کی تائید ہوتی ہے تو دوسری طرف باہم بلند آوازی کا جواز بھی نکلتا ہے۔ توضیح بالا اگر مد نظر رہے تو طعن کے لئے اس وجہ کا کوئی جواز نہیں رہتا، اس لئے کہ واقعہ بالا میں نہ تو کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران بول کر آپ کی آواز دبا کر اپنی آواز بلند کی۔ اور نہ کوئی آپس کی طرح حضور سے بولا،

رہا شور و شغب تو مختصر سی جگہ جب کئی آدمی اکٹھے ہو کر معمول کی آوازیں بھی بحث مباحثہ کریں گے، تو وہ بھی شور و شغب ہی لگے گا۔ اور پھر اس وقت آپ بیماری اور دردِ دالم کی جس حالت سے دوچار تھے، اس میں تو دس بارہ آدمیوں کی سرگوشی بھی شور و شغب ہی کی طرح باعثِ تکلیف ہوتی ہے! یہی بات کہ اول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آواز بلند کی یا جھگڑا شروع کیا، تو یہ بات کیسے معلوم ہوئی، ان کو یہ بات پہلے دلیل سے ثابت کرنی چاہیئے، پھر زبان طعن دراز کریں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان لا ینبغی عندی تناسخ (میرے پاس بیٹھ کر جھگڑنا مناسب نہیں) بھی اسی مدعا کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ بلند آوازی ترک اولیٰ کے ضمن میں آتی ہے کیونکہ لا ینبغی کا لفظ حرام یا گناہ کبیرہ کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، کوئی یہ نہیں کہتا کہ زنا کرنا مناسب نہیں! شرع میں اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کیا ہوگی۔ اور قودھو اعنی (میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو) وہ مرض کی کیفیت کے پیش نظر تھا۔ بیمار آدمی عموماً گفتگو سے دل تنگ ہوتا ہے، گفتگو کی نوبت بھی اُسے تو وہ چاہتا ہے کہ اہم ضروری کام کی بات ہو کر جلد یہ سلسلہ ختم ہو، اگر ایسی حالت میں کوئی بات سرزد ہو تو کسی دوسرے کے حق میں وہ طعن ہرگز نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ خلافت عام ہو جس میں رائے کے موافق و مخالف سب شریک ہوں! (شیعوں کو تم یا عمرؓ اس میں کون سی خور دین سے نفراگے۔ اور تم باطنی کو وہ خور دین کیوں نہ دکھاسی۔ کہیں تعصب کی عینک تو آنکھوں پر چڑھی ہوئی نہ تھی) ن، بروایت صحیح مروی ہے کہ اس بیماری کے دوران آپ کو کدوؤں کا دوا کھلائی گئی تھی، اتفاق کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا یبقی احد فی البیت الا کدرا لا العباس (گھر میں سب کو کدو کھلایا جائے۔ مگر عباسؓ کو چھوڑ کر) فانہ لکد یشھدکم (کیونکہ وہ تم میں موجود نہیں تھے) (غالباً صورت حال یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند خاطر نہ ہونے کے باوجود ان خانہ نے بطور علاج کدو کھلا دیا تھا۔ ان میں ایسے افراد بھی ہوں گے جو اس کے کھلانے کے خلاف ہوں گے۔ بعد اتفاق حضور نے گھر میں اس وقت موجود سب ہی افراد کو کدو کھلویا، چاہے اس نے کھلانے کی رائے دی ہو، خواہ نہ کھلانے کی حضرت عباسؓ اس لئے مستثنیٰ تھے کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھے نہ شریک رائے تھے۔ ن، بیماری سے دل تنگی، ایسی بات نہیں ہو سکتی کہ کسی قسم کے نفس کا سبب بنے اس لئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس معاملہ میں انبیاء کرام کے مناسبت نہ ہونے کا عقیدہ رکھا جائے، امراض میں بدنی ضعف بھی تو ہو جاتا ہے اس سے ان کی شخصیت بدل، کیا نقص ہوتا ہے۔ البتہ جسم و روح اس سے محفوظ مصون رہتے ہیں کہ ان کے فرائض و وظائف شرعی و دینی میں بیماری کے سبب کوئی خال واقع ہو۔

جواب وچہ (۴) یہ وجہ بھی خیال باطل پر مبنی ہے، حق تلفی اس وقت تو ہو سکتی تھی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نئی آئی ہوئی ہوتی اور وہ امت کے حق میں نافع ہوتی اور پھر اسکو روک دیا جاتا۔ اور الیوم اکملت لکم دینکم کے نزول کے بعد یہ قطعی طور

پر معلوم تھا کہ اب کوئی دین و شرع کی نئی بات نہیں ہوگی، محض مشورہ اور مصلحت ملکی پر کوئی بات تھی اور یہ وقت بھی صیبت کا تھا۔ اور یہ کون عظیم مذہب اور کمرے گا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا جو زمانہ تھا جس میں تینیس سال تک آپ قرآن مجید اور بے شمار احادیث کی تبلیغ فرماتے رہے۔ اور پھر عام خلق اللہ اور خصوصاً اپنی امت پر جو شفقت و رافت اور ہمدردی آپ فرما رہے۔ اس وقت جو بات آپ نے نہ فرمائی وہ ایسے تنگ و نازک وقت میں آپ فرمانایا لکھوانا چاہتے ہوں۔ اور وہ بھی ایسی بات جو دفع اختلاف کے لئے بمنزلہ تریاق ہو اور اس کو محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے پر باز رہے ہوں۔ اس کے بعد بھی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ روز حیات رہے، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو موجود نہ تھے۔ اہل بیت ہی کی آمد و رفت رہی وہی زیادہ تر آپ کی خدمت میں قاصر رہے۔ اس وقت ان حضرات ہی کو وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم تحریر فرما کر غایت فرما دیتے یا ان کو لکھوا دیتے۔ کیا ان کا یہ عقیدہ تو نہیں ہے کہ اس وقت بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غائبانہ ناراضگی کے خیال سے آپ نے ایسا نہیں فرمایا؟

اس خیال کے باطل اور لغو ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس تحریر کے لکھنے یا لکھوانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی اور یقینی طور پر مامور ہوتے اور وقت و فرصت پانے کے باوجود کہ پنجشنبہ کا کچھ حصہ، جمعہ یا کیشنبہ، مزارع مبارک بعافیت رہا اس کے باوجود آپ نے اس طرف توجہ نہ فرمائی کیا اس سے آپ کے فرض تبلیغ میں تساہل کا الزام نہیں آتا۔ اور کون ایسا بد بخت ہے جو ایسی بات آپ کی طرف منسوب کرنے کا خیال تک اپنے دل میں لائے۔ اسے تو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے! یہ بات تو آپ کی عصمت کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغُوا مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَمْنُوا فَرَاغَ بَلِّغُوا مَّا بَلَغَتِ رِسَالَتُهُ وَاللَّهُ يُلْعَلُكُمْ مِنَ النَّاسِ

اے رسول آپ کے رب کی لڑت آپ پر جو نازل کیا گیا اس کی تبلیغ فرمائیے، اگر آپ نے ایسا نہ فرمایا تو آپ نے رسالت رب کا بلاغ نہ فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

پھر ایسے وقت کہ وقت وصال سامنے تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیال سے وعدہ الہی پر جو عصمت و محافظت کے لئے وارد ہوا اہم اطمینان کا اظہار نہیں۔ ہم اس کے تصور سے بھی خدا کی پناہ چاہتے ہیں! اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے طور پر کوئی تحریر لکھنا یا لکھوانا چاہتے تھے، تو اب یہ سوال ہے کہ آپ نے اپنے اس خیال سے رجوع فرمایا، یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تو اب جناب فاروق رضی اللہ عنہ پر طعن کا سرے سے سوال ہی نہ رہا۔ بلکہ دیگر موافقات عمری کے ساتھ ایک یہ صورت بھی شامل ہو گئی جو آپ کی عزت میں اضافہ کے ساتھ آپ کی منقبت قرار پائیگی۔ اور آپ پر طعن کرنے والوں کے لئے موجب ذلت و بد بختی ہوگی۔ دوسری صورت میں لازم آئے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نافع اور مفید شے ترک فرمادی، آپ تو امت پر شفیق، مہربان اور غایت درجہ ہمدرد تھے۔ ایسا کیسے فرما سکتے تھے۔ آپ کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ دَعَزَ نَزْرًا عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ

بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایک رسول آئے ان پر تمہاری تکلیف شاق گذرتی ہے اور تمہارے نفع کے لئے وہ بہت حریص ہیں مومنوں کے حق میں مہربان رحم دل ہیں!

دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تحریر لکھوانا چاہتے تھے وہ (۱) سابق تبلیغ پر اضافہ اور کوئی نئی بات تھی! (۲) اسکی ناسخ یا مخالف تھی یا دس، اسکی تائید کرنے والی تھی! پہلی اور دوسری صورت میں تو آیت الیوم اکملت لکم دینکم کی تکذیب لازم آتی ہے، اور تیسری صورت میں امت کی کوئی حق تلفی لازم نہیں آتی۔ خدا کی تاکید اس سے بالاتر تھی! تو جب یہ امت

اللہ تعالیٰ کی تاکید کو خاطر میں نہیں لاتی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید کی کیا قدر کرتی۔ اور اس خیال کے غلط و باطل ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اسی حدیث قرطاس میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما صحیحہ میں موجود ہے،

اِسْتَدْبَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجُوْعَهُ فَقَالَ اَيْتَرُوْنِي بِكَيْفٍ اَكْتُبُ لَكُمْ مَكْتُبًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ فَنُتَا سَمْعُوْا فَقَالُوْا مَا شَاْنُهُ اَجْمَلًا اَسْتَغْفِرُوْا مِنْكُمْ هَبُوْا يَدُوْنَ عَلَيْهِ فَقَالَ دَعُوْنِيْ فَاَلَا لِيْ اَنْزِلْنِيْ خَيْرًا مِّمَّا تَدْعُوْنِيْ اِلَيْهِ وَاَوْصَاهُمْ بِثَلَاثٍ قَالَ اَخْرِجُوْا الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ حَزْبِكُمْ الْعَرَبُ وَاَجْزِلُهَا الْوُقُودُ بَلَّغُوْا كُنْتُ اَجْزِلُكُمْ وَسَكَتَ عَنْ الثَّلَاثَةِ اَوْ قَالَ نَسِيتُهَا وَفِي رِوَايَةٍ فِي الْبَيْتِ اَجْلَالُكُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ قَدْ غَلَبَكُمْ الْوَجْعُ وَعِنْدَكُمْ الْقُدْرَانُ حَسْبُكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد (سر) شدید تھا آپ نے فرمایا: شام کی بڑی، میرے پاس لاؤ تاکہ اس پر کچھ لکھوں تاکہ میرے بعد تم نہ بہکو۔ پس وہ (حاضرین جن سے خطاب فرمایا تھا) باہم بحث پر پڑے، اور کہنے لگے: یہ آپ کی کیا کیفیت ہے؟ کیا (درد کی وجہ سے) اختلاط کلام تو نہیں، (فرمان کی وضاحت کے لئے) آپ سے پوچھو تو، پس وہ آپ سے سوال و جواب کرنے لگے جس پر آپ نے فرمایا: میرے حال کی فکر چھوڑو، تم جس حالت کو میری طرف منسوب کر رہے ہو میں اس سے بہتر حال میں ہوں کہ تم کو جو کہتا ہوں سنو، پھر آپ نے تین باتیں بطور وصیت فرمائیں: (۱) مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کرو (۲) ایچیوں کو میری طرح انعام دینا جاری رکھو۔ (۳) کہتے ہیں کہ تیسری بات پر آپ خاموش ہو گئے۔ یا یہ کہا کہ میں بھول گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ گھر میں اس وقت جو لوگ تھے ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ انہوں نے فرمایا آپ درد کی شدید تکلیف میں ہیں، دینی بحث سے آپ کو تنگ نہ کرو، تمہارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے۔

(گمراہی اور بہکنے سے بچانے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) وہ کافی ہے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بولنے سے پہلے ہی لوگ بحث میں الجھ گئے تھے اور اپنے سوال و جواب سے حضور کی تکلیف میں زیادتی کا موجب ہو رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قصہ مختصر کرنے کے لئے ان کو تنبیہ فرما کر جوابات فرمانا چاہتے تھے فرمادی۔ دوبارہ ان سے یہ نہیں فرمایا کہ دوات قلم کا غزل لاؤ۔ اگر وہ کوئی دینی یا فطعی بات سوتی اور آپ اس سے سکوت فرماتے تو یہ خلاف عصمت ہوتا، شیعہ خود اس کے اقرار ہی ہیں کہ اس قصہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزید پانچ روز قید جیسا رہے۔ اور رفیق اعلیٰ سے دو شبہ کو واصل ہوئے، تبلیغ وحی کے لئے اس مدت میں آپ کو کافی وقت اور فرصت ملی، نیز یہ بات بھی اس روایت سے معلوم ہوگئی، کہ آپ جو عمرؓ فرمانا چاہتے تھے وہ دینی امور میں سے کوئی بات نہ تھی بلکہ سیاست مدنیہ، اصلاح مملکت اور دنیوی تدابیر کی قسم کی چیز تھی۔ (یہ محسوس فرما کر کہ یہ حضرات کچے کا کچھ سمجھ کر نئی الجھنوں کی طرف چل پڑے ہیں آپ نے تحریر کے قصہ کو برطرف کر کے اننا مقصد) بطور وصیت زبانی ہی ارشاد فرمادیا۔ اور تیسری جس کا اس روایت میں ذکر رہ گیا۔ یا راوی اسے بھول گئے جیسا اسامہ کی تیاری کے متعلق تھی جس کی صراحت دوسری روایت میں موجود ہے۔

اس دعویٰ کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ موجود صحابہ کرام نے جب دوسری بار دوات و بڑی کے لئے پوچھا تو آپ نے فرمایا تم مجھے جس کام میں مشغول کرنا چاہتے ہو میں اس وقت اس سے بہتر اور بالاتر کام میں مشغول ہوں۔ یعنی مشاہدہ حق، اور قرب و مناجات الہی

میں! اگر وہ تحریر دینی امور سے متعلق ہوتی، یا کسی دج کی تبلیغ کا معاملہ ہوتا تو وہ تو آپ کی نظر میں سب سے بہتر اور خیر و بھلائی، نیز فرض منصبی تھا۔ اس کو نانوئی درجہ میں کیسے رکھ سکتے تھے! علما رامت کا اس سہا جاع ہے، کہ انبیاء کے حق میں تبلیغ دجی اور دینی احکام کی ترویج سے بڑھ کر کوئی عبادت بہتر نہیں۔ اس روایت سے یہ بھی عیاں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار اصحاب کرام کے سامنے اس عالم سے بے تعلقی اور فارستگی کا اظہار فرمایا تو حاضرین پر تا سفت وحسرت اور بابوسی غالب آنے لگی، ان کی تسلی خاطر کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عتاب آمیز خطاب کسی عفتہ و ناراضگی کی بنا پر نہیں بلکہ شدت تکلیف کے سبب ہے۔ تم دل تھوڑا نہ کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذریعہ دین احکام الہی کا جو ذخیرہ بشکل کتاب اللہ تمہارے پاس ہے، تمہاری تربیت ہدایت اور تمہارے دین و ایمان کی حفاظت و پاسبانی کے لیے کافی ہے! تو دراصل جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ کلام اس گفت و شنید کے بعد حاضرین کی تسلی و تشفی کے لیے رچے اور ان کے اس گمان کے ازالہ کے لیے ہے کہ کہیں ہماری گفتگو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ اور اس گمان کا قرینہ وہی ہے کہ آپ نے تحریر کے لیے دوبارہ تلم و تلا طلب نہیں فرمائی۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے، کتابت سے روکنے کی عرض سے یہ کلام نہیں فرمایا تھا۔

بطور تتمہ کلام یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں فرقوں کے اہل سیر کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قصہ کے وقت دہلیں موجود تھے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہ ان حضرات پر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شدت تکلیف میں مزید مشقت اور تکلیف سے بچانے کی خاطر کسی تحریر کے حق میں نہ تھے، نہ اس وقت نہ آئندہ ان کی زندگی میں نہ بعد وفات جب آپ مسند خلافت پر متمکن تھے کوئی اعتراض و تکرار نہیں فرمائی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی روایت کسی سنی یا شیعہ سے آپ کی جانب منسوب ہو کر بیان کی گئی۔ لہذا اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے، تو آپ بھی ان کے ہم نوا تھے! آپ نے بھی اسے درست و جائز قرار دیا۔ سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جو ہر روز کم سن تھے، کسی سے افسوس اور حسرت کا اظہار منقول نہیں۔ اگر اس معاملہ میں کسی ہتم بالشان معاملہ سے محرومی کی بات ہوتی تو اصحاب کبار و خصوصاً جناب امیر رضی اللہ عنہ خود اس کا ذکر فرماتے بطور اعتراض نہ سہی بطور تاسف ہی حرف شکایت زبان پر لاتے اگر یہاں کسی کے دل میں یہ شبہ سر اجماع ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کسی اہم دینی بات کے تحریر کرانے کا نہ تھا تو آپ نے لن تفتلوا بعدی کے الفاظ کیوں فرمائے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تحریر کے ذریعہ امت کو گمراہی میں پڑنے سے بچانا چاہتے تھے اور گمراہی کے معنی یہی ہیں کہ دین میں کوئی خلل رونما نہ ہو۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ لغت عرب میں ضلال عام ہے جس طرح دینی گمراہی کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں دنیوی معاملات میں بد تدبیری کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے، کلام الہی میں اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے اپنے والد عزیم حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت کیا انا ابانا لفی ضلال مبین اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو مضبوط جھٹھے ہیں ان کو نظر انداز کر کے ایک اکیلی جہان یوسف (علیہ السلام) کو اتنی اہمیت دیر ہے تو ان کا یہ رویہ معاملات دنیوی کے لحاظ سے درست نہیں۔ دوسری جگہ منہ درمنہ کہا اذک لفی ضلال القدیہ۔ (آپ اپنی پہلی) اور ان کے خیال میں دنیاوی لحاظ سے بد روشیوں غلطی تھی کہ دنیا میں بڑے اور طاقتور جھٹھے دار پیٹے ہیں باپ کا دست و بازو ہوتے ہیں، دشمنوں سے دس نکلتے ہیں اور آڑے وقت وہی باپ کا سہارا بنتے ہیں۔ ظاہر ہے برادران یوسف (علیہ السلام) کا فر تو تھے نہیں کہ اس لحاظ سے ایسے عالی مرتبت پیغمبر باپ کو دین سے گمراہ بتاتے یا ایسا اعتقاد رکھتے، ان کی مراد دنیاوی بد تدبیری ہی ہو سکتی ہے، کہ کام کاج کے لائق لوگوں کو جو ہر وقت خدمت کے لیے کمر بستہ ہیں پیار نہیں کرتے، دوست نہیں رکھتے، اور کم عمر محنت و خدمت سے قاصر بیٹے کو محبت سے زیادہ عشق

کی حد تک چاہتے ہیں۔ لہذا یہاں بھی قصداً سے تدبیر ملکی میں خطا کاری ہے نہ دینی گمراہی۔ چنانچہ بطور وصیت جو تین باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں وہ مدنی، ملکی معاملات سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ مشرکین عرب کو حیزیرہ سے نکالنا، ایچیوں اور سقران کو انعامان سے نوازنا اور حبشہ اسامہ کی تیاری، یہ سب باتیں مصالح ملکی و مدنی تھے۔ اور ایسی تدبیر تھیں جن کا براہ راست فائدہ ملک و مملکت کو پہنچتا ہے چنانچہ پہلا مشرکین عرب کی نال کہیں اور کہاں گڑبی تھی کہ وہاں سے نکل کر شاد و آباد رہتے! نہ کہیں ان کی ننھیال و ددھیال مٹی نہ سسرال کہ وہاں جا کر سر چھپا لیتے۔ یا وہاں کے لوگ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے، لامحالہ انہیں عرب ہی میں رہنا تھا لہذا فی دین اللہ افواجاً فوج در فوج مسلمان ہوئے۔ سفر اہل کی آؤ جھگٹ، انعام اکرام سراسر مملکت کے فائدہ کی تدبیر تھی کہ ان پر اچھا تاثر قائم ہوگا تو منہ سے تعریف ہی نکلے گی اپنی اپنی مملکتوں میں جا کر وہ مسلمانوں کے لطف و عنایت، خاطر تواضع اور جود و سخا ہی کی تعریف کریں گے، جس کے ذریعہ غیر کے دلوں میں نفرت و عداوت کے بجائے انس و محبت کی لہ کشادہ ہوگی، کم لزم ان کی ریشہ و دانیوں سے تو مملکت بچی رہیگی حبشہ اسامہ والی تدبیر تو استحکام ملکی کے لئے اتنی موثر تھی کہ عرب و غیر عرب سب پر دھاک بیٹھ گئی، اور بدخواہ و بداندیش جو منصوبے رکھتے تھے سب خاک میں مل گئے۔ اگر حبشہ اسامہ بروقت روانہ نہ ہوتا تو خلافت راشدہ کے استحکام کا فوکا سوال مکہ و مدینہ میں مسلمانوں کا کلنگا محال ہو جاتا۔ نعمانی

اور اس پر دلیل قطعی یہ ہے کہ جب تیس سال تک وحی کا نزول قرآن و حدیث کی تبلیغ ان کی ہدایت کے اور ان کی گمراہی دور کرنے کے لئے کافی نہ ہوئے، تو یہ چند سطور کی تحریر ان کی گمراہی اور بہکنے سے کیسے کافی ہو جاتی! پھر یہاں بکاغوش ہوشیار قسم کے لوگوں کے دل میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کے متعلق کوئی تحریر لکھوانا چاہتے ہوں اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مداخلت سے یہ اہم کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ تو ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے لئے خلافت ہی بکات منظور خاطر مبارک ہوتی تو اسکی دو ہی صورتیں ہوتیں یا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا معاملہ ہوتا، یا جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا!

پہلی صورت کے متعلق اسی مرض کے دوران ایک اور مرتبہ آپ کے قلب مبارک میں اس کا داعیہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے ارادہ بھی فرمایا مگر پھر خود ہی اسکو ترک فرما کر معاملہ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کے اجتماعی شعور کے حوالہ فرمایا۔ اس ارادہ کے التوا میں نہجنا فاروق رضی اللہ عنہ کا دخل ہوا نہ کسی اور کا۔ آپ کے علم میں یہ ایک ہونے والی بات تھی، اس لئے اس کے لکھنے کی ضرورت بھی نہ رہی۔ حدیث کی معروف و مشہور کتاب صحیح مسلم میں ہے کہ اسی بیماری کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا،

اَوْعِيْ لِيْ اَيُّكُمْ وَ اَخْلَفُ اَلْتَّبْ لَهْمَا كَيْتَا فَاَنْتِيْ
اَخَافُ اَيْتَمَّيْ مَتَمَّيْ وَيَقُوْلُ قَائِلُ وَلَا وَاَيُّكُمْ
اللّٰهُ مَدَّوْلُ مَوْنُوْنَ اِلَّا اَيُّكُمْ
تم اپنے والد اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ کہ ان کے لئے ایک تحریر لکھوادوں، مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی آرزو مند، اسکی آرزو کر رکھے اور کہے کہ میں (اسکا عقدار) سون کوئی دوسرا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابو بکر کے علاوہ جعل نہیں کریں گے۔

یہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہاں تھے کہ انہوں نے اس وصیت کی تحریر یہ روک دیا ہو دوسری صورت سوتی تو اس کے لئے کسی تحریر کی حاجت نہ تھی، کیونکہ اس واقعہ سے پہلے میدان غدیر خم میں ہزاروں افراد کے مجمع میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی ولایت پر خطہ رہے چکے تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو ہر سو من مرد و عورت کا مولیٰ قرار فرما چکے تھے

اور یہ قصہ مشہور عوام اور زبان زد خلق تھا۔ اگر اتنی پابندی، تاکید، شہرت اور تواضع باوجود بھی عمل نہ کریں تو چند حضرات کے سامنے لکھی ہوئی نجی تحریر ان پر کیا اثر ڈالتی۔

حاصل کلام یہ کہ کسی بھی صورت میں اس تحریر سے روک دینے سے امت کی حق تلفی نہیں ہوتی، نہ مہات دینی پردہ خفائیں رہتے ہیں۔ ان کا یہ خیال باطل بھی امام مہدی کی شخصیت کے لغو خیال کا چرہ ہے۔ کہ اسکی حقیقت بھی دسوسہ اور وہم کے سوا کچھ نہیں اور وہم کی بیماری کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں، حتیٰ کہ لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں۔

اسختر الص (۳) دوسرا طعن واضح تر اس یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا مکان جلا دیا۔ اور آپ کے پہلوئے مبارک میں تلوار کا کچوکا دیا کہ اس کے صدمہ سے آپ کا محل ساقط ہو گیا۔ یہ قصہ سرسبز بہتان اور بدترین افتراء اور جھوٹ ہے اسکی کوئی اصلیت نہیں۔ اس لئے امامیہ حضرات کی اکثریت اس قصہ کی قائل ہی نہیں۔ اسنا کہتے ہیں کہ گھر جلانے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ ارادہ عمل میں نہیں آسکا۔ حالانکہ قصہ و ارادہ دل کی کیفیت ہے جس پر خدا کے سوا کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔

اگر ان کی مراد یہ ہو کہ آپ نے زبانی طور پر ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ میں اسکو جلا دوں گا تو یہ ڈراوا اور دھمکی بھی ان لوگوں کے لئے تھی جو جناب سیدہ کے مکان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہو جو ہر خائن کا بلحا اور جائے پناہ تھا اور جسے انہوں نے حرم مکہ کا درجہ دے رکھا تھا، اور خلیفہ اول کی خلافت کے خلاف فساد انگیز مشورے کرتے اور منصوبے بناتے اور فتنہ و فساد پھیلانے کی تدبیریں سوچتے خود جناب سیدہ زہراء ان کی نشست اور فساد انگیز حرکات سے شاک اور نالاں تھیں۔ مگر حسن خلق کے سبب کھلم کھلا ان کو اپنے یہاں آنے سے منع نہ کر سکتی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان حالات کا علم ہوا اور حقیقت واقعہ سے آگاہی ہوئی تو آپ نے ان جمع ہونے والے فساد یوں سے کہا کہ اگر تم اپنی فساد انگیز حرکات سے باز نہ آئے تو گھر سمیت تم کو جلا دوں گا۔ جلا کی دھمکی کی تخصیص ایک لطیف و باریک استنباط پر مبنی ہے جو آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے فرمایا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو نماز کی جماعت میں شریک نہیں ہوتے اور امام کی اقتدار نہیں کرتے تھے اسی قسم کی دھمکی دی تھی کہ اگر یہ لوگ ترک جماعت کرتے رہے اور اس سے باز نہ آئے تو میں ان کو مع ان کے گھروں کے جلا دوں گا۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے مقرر فرمودہ پیش امام تھے، اور یہ سازشی لوگ امام حق کی اقتدار چھوڑنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور مسلمانوں کی جماعت سے رشتہ و رفاقت توڑنے پر کام کر رہے تھے اس لئے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تہدید کے مستحق قرار پائے۔ لہذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے ملتا ہے جو فتح مکہ کے وقت ظہور میں آیا تھا جب فتح مکہ کے دن آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ابن خطلہ جو کفار کا شاعر تھا جس نے بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچو میں اشعار کہے اور روسیہا ہوا، حرم کعبہ میں جا چھپا ہے اور اس کے پردوں میں پلٹا ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا وہ جہاں چھپا ہے وہیں اسکو قتل کرو اور کسی بات کا لحاظ نہ کرو۔ تو ایسے لعنتی اور پٹھکار مارے راندہ درگاہ الہی لوگوں کو خدانہ خدائیں بھی پناہ نہیں تو خانہ زہراء رضی اللہ عنہا میں ان کو امان کیسے مل سکتی ہے۔ اور جناب زہراء رضی اللہ عنہا کو ایسے فساد یوں کی سرپرستگریوں ہونے لگا۔ علاوہ اس خود ان سے بھی ایسی صحیح روایات منقول ہیں کہ جناب زہراء رضی اللہ عنہا خود بھی ان لوگوں کو اس طرح جمع ہونے سے منع فرماتی تھیں! اور اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فعل سے بدرجہا کم ہے، کہ شہادت ذوالنورین جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب آپ مسند آراء خلافت ہوئے تو وہ لوگ جو آپ کی خلافت کا شتمہ اللہ کے

منصوبے اپنے ذہنوں میں رکھتے تھے، مدینہ منورہ سے بھاگ کر حرم مکہ میں جا پہنچے۔ قاتلین عثمان سے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کے ہمنوا ہو گئے اور حرم حرم جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو گئے تو ایسے لوگوں کو آپ نے قتل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترمہ اور اپنی ماں، بلکہ ام المؤمنین کی حرمت و عزت کا کوئی پاس نہ کیا۔ اس سلسلہ میں حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ تکلیف پہنچی اور جو امانت و ذلت، اٹھائی و اظہار من الشمس ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو صواب و درست ہی کہیں گے۔ کیونکہ اس قسم کے اہم امور میں جو عام فتنہ و فساد کا سبب بن سکتے ہوں انفرادی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا اور فتنہ کے مبادی و مقدمات کو نظر انداز کر دینا ان کے دفعیہ کی کوشش نہ کرنا دین و دنیا کے معاملات میں بے تدبیری سمجھی جائے گی۔ تو جس طرح سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کی جائے قیام و سکونت لائق عزت تھی، اسی طرح ام المؤمنین جو حرم محترم رسول، آپ کی محبوبہ زوجہ، اور محبوبہ الہی بھی تھیں۔ آپ بھی واجب الاحترام اور لائق تعظیم تھیں بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے توڑنے کی عرض سے اور تہدید و ترہیب کی بنا پر محض قول ہی صادر ہوا تھا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے تو اس کو عمل کی بھی آخری حد تک پہنچا دیا۔ لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق زبان طعن دراز کرنا تعصب و عناد برہمنی ہے! حالانکہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا قول جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فعل سے باعتبار درجہ بہت ہی کم اور ہلکا تھا۔

اب اگر اہل سنت پر الزام دینے کی خاطر فرق پیدا کر کے یہ کہا جائے کہ چونکہ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق تھی لہذا انتظام مملکت کی حفاظت ضروری اور اولیت رکھتی ہے، اس کے مقابلہ میں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا اس اور حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ دیاں ساتھ ہو گا۔ اور خلافت جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ ناحق تھی اس لئے خلافت فاسدہ، اس کے انتظام کے تحت کے لئے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے احترام کا لحاظ نہ کرنا وبال اور قابل اعتراض بات ہوگی۔ تاہم فرق ہمارے نزدیک انتہائی حماقت و نادانی اور بے عقلی کی بات ہے، اس لئے کہ اہل سنت تو دونوں خلافتوں کو برابر سمجھتے اور برحق مانتے اور مانعین خصوصاً ایسے وقت کہ اعتراض حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر کیا جا رہا ہے کیونکہ ان کے نزدیک تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حقیقت خلافت متعین ہو چکی تھی اور اس وقت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا مخالف اور ہمسرہ بھی میدان میں دھوئے خلافت کے ساتھ موجود نہ تھا جس کی مخالفت کچھ بھی اہمیت رکھتی ہو تو منظم اور برحق خلافت کے خلاف سازشیں کرنا اور منصوبے بنانا خصوصاً جبکہ جوش اسلام کی نشوونما ہو رہی تھی اور دین دایمان کے پودے نے جڑ پکڑی تھی سرعے قتل کو واجب کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے سازشیوں کو اس وقت قتل بھی کر دیتے تو یہ جائز اور حق تھا۔ انہوں نے تو صرف ڈرا دھکا کر ہی جان بخشی کر دی! اور تعجب تو ان شیعہ فضلا پر ہو رہا ہے جنہوں نے اس واقعہ کو منک مہرچ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر اپنا خبیث و بغض سب پر عیاں کر دیا ہے کہ جن جوانوں کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ڈرا دھکا دیا تھا ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹی زاد بھائی جناب زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور اس کے بعد جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا نے بنی ہاشم کے نوجوانوں اور زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر پر مجلس برپا کرنے اور اکٹھے ہونے سے منع فرمایا!

سبحان اللہ! کیا انوکھی منطق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف جناب زبیر رضی اللہ عنہ فساد کے منصوبے بنائیں تو وہ معصوم بے خطا اور واجب التعظیم ہوں۔ اور جب ہی زبیر رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص طلب کرنے میں لہجہ تہذ و درشت رکھیں تو واجب القتل قرار پائیں! جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہ کے مکان میں جب لوگ فتنہ و فساد برپا کرنے کے منصوبے بنائیں۔ سازشیں کریں تو وہ مقبول و پسندیدہ ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ زوجہ

جو بلاشبہ ام المؤمنین تھیں۔ کی قیادت و سرکاری میں قصاص کا دعویٰ یا قاتلین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شکایت میں زبان کھولیں تو نا مقبول اور مردود القول قرار دے جائیں! ایسا پھر اور واپس بات فرمادے اصول شیعہ ہی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اہل سنت پر اپنے ہی اصولوں سے الزام توہینا چاہیں، تو سیدہ ہاسیدہ صا کہیں، اس پر پیچ کی کیا ضرورت ہے! جب رسول اللہ علیہ وسلم نے ترک جماعت پر جو سنت مؤکدہ تھی، اور اس کا فائدہ صرف مکلفین تک محدود تھا۔ اس کے ترک سے عامہ مسلمین کو کوئی منظرہ یا نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ اس سبب کے باوجود ان تارکین جماعت کے گھروں کو جلانے کی تہدید فرمائی، تو ایسے فتنہ و فساد پر جس سے پوری ملت اسلامیدہ کے متاثر اور خونچاک ہونے کا خطرہ ہو، اور دین کو ملیا میٹ کرنے کا سامان ہو، تو ایسی سازش کا کو جلانے کی دھمکی کیوں جائز نہ ہو!

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان میں اس وقت تک داخل نہ ہوں جب تک دروازہ پر کے منقش و بالتصویر پردہ نہ اتار لیا جائے۔ یا خانہ حرام کعبہ میں اس وقت تک تشریف نہ لے جائے جب تک وہاں موجود حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مجھے نہ لکھا دیں۔ تو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی مہترک اور مکرم مقام کو جہاں فتنہ انگیز تہذیب سوچی جا رہی ہوں، حاضرین سمیت جلادینے کی دھمکی دیں تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے، زیادہ سے زیادہ جوابات کہی جاسکتی ہے وہ ادب کی رعایت نہ کرنے کی ہو سکتی ہے تو یہ معلوم ہو گیا ایسے اہم اور ہمہ بالشان امور میں ادب کی رعایت اور لحاظ نہیں کیا جاسکتا، جناب امیر رضی اللہ عنہ کا اپنا رویہ اس کا ثبوت اور دلیل ہے۔ کیا یہ شیعہ لوگ دنیا کو یہ باور کرنا اور جناب امیرؑ پر تہذیب رکھنا چاہتے ہیں کہ آپ محبوب رسول ام المؤمنین جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ادب نہیں فرماتے تھے اور آپ کی نظر میں آپ کے لئے کوئی اعزاز کوئی احترام نہیں تھا! دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود آپ کا رویہ جناب یقہ رضی اللہ عنہا اور آپ کے ہمراہوں کے ساتھ جو درشت ہوا تو وہ ظلم و ملامت کی حفاظت کا تقاضا تھا۔ اس کو امانت دے قدری صدیقہؑ پر محمول شیعہ ذہن ہی کر سکتا ہے! لہذا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسا فعل سرزد ہو جو فعل معصوم سے ملتا ہو تو وہ کس منطقی سے محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے!

اعتراف (۳) بطور طعن یہ کہتے ہیں کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا انکار کیا، اور قسم کھائی کہ آپ کا وصال نہیں ہوا، یہاں تک کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی اِنَّكَ مَيِّتٌ وَاَنْتُمْ مُتَوَفَّوْنَ (تم بھی مر گئے اور وہ بھی مر گئے)۔

یہاں بھی بات سمجھ کے پھیر کی یا بغض و عناد کی ہے۔ یا پھر اعتراف برائے اعتراف کا معاملہ ہے! ورنہ کیا ایسے شخص پر ایسی حالت میں طعن کیا جاسکتا ہے جو محبت رسول میں سرتاپا سخری ہو، اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کی شدت کے مشاہدہ اور اچھا رحلت کی اندوہناک خبر اور آپ کے فراق کے صدمہ سے اپنے ہوش و حواس عقل و فہم سے اتنا میرگاہ ہو گیا ہو کہ اسے اپنی مدد پر بھی نہ رہی ہو حتیٰ کہ اسے اپنا اور اپنے باپ کا نام بھی یاد نہ آ رہا ہو نہ وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ اگر ایسی مدہوشی و بے خبری میں انتہائے محبت کے باعث محبوب کی موت سے انکار کر بیٹھا ہو تو یہ طعن کا موقع نہیں تعریف کا مقام ہے!

(ایسی اٹکھ پھوڑ دینے کے لائق ہے جو ہنر کو عیب دکھائے) اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی حالت میں آیت بالا ذہن میں حاضر نہ کر پائے ہوں تو یہ کون سے تعجب کی بات ہے بہت سے لوگوں کو غم و اندوہ اور جزع و فزع کے عالم میں آیات قرآنی یاد نہیں رہیں لیکن حکم بشریت یہ مستحق طعن اور لائق ملامت نہیں ہونے! خود انہیں شیعوں کی صحیح روایات سے جو سابقا بیان ہوئی ہیں

یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کے وقت یہ بھی بھول گئے کہ وہ قریب ہے اور مکانت سے پاک اور بری ہے! حالانکہ آپ اس وقت حیرت و مدہوشی کی کیفیت سے دوچار بھی نہ تھے! اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایسی حالت میں جو ان کے نزدیک قیامت سے کم نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے جواز سے بے خبری ہو گئی تو اس میں کونسا گناہ ہو گیا! نسیان و ذہول لوازم بشریت سے ہیں، یادداشت ایک صدمہ عظیم کے سبب سن اور غیر مؤثر ہو گئی تھی، ذہول و نسیان تو ہوش و حواس اور پوری بیداری ذہن کی حالت میں بھی محترم و مقدس حضرات سے وقوع پذیر ہوا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام بالا جماع نبی معصوم تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاکید کے باوجود پھلی کے دریا میں چلے جانے کے واقعہ کو بھول گئے! اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود جناب حضرت علیہ السلام سے پختہ وعدہ کر لینے کے پیش آمدہ واقعہ کی مذمت کے سبب اپنا قول یاد نہ رکھ سکے! اور ایک دفعہ نہیں تین مرتبہ ایسا ہوا۔ اور ابو البشر اور اصل انبیاء علیہم السلام، حضرت آدم کے نسیان صیر خود قرآن مجید میں شہادت موجود ہے، اور نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نسیان لاحق ہونے کا بیان و ثبوت تو خود ان کی کتاب کا کلمہ میں موجود ہے۔ اور ابو جعفر طوسی اور دیگر امامیہ نے اسکو صحیح درست بتایا ہے! اس کے علاوہ ابو جعفر طوسی نے عبد اللہ چلبی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ۔

ان الامام عبد اللہ کان یسہو فی صلاتہ ویقول فی سجدتی السہو بسم اللہ ویاللہ وصلی اللہ علی محمد وآلہ وسلم

امام عبد اللہ اپنی نماز میں بھول جاتے تھے اور سجدہ سہو میں بجائے تسبیح بسم اللہ و بواللہ و صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے تھے!

پس اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سانحہ قیامت خیز و ہوش ربا میں ایک آیت بھول گئے تو طعن کی کیا بات ہے۔

اعمر ابن (۴) اعراض یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض ایسے شرعی مسائل سے ناواقف تھے، جن کا جانتا خلافت و امامت کے اہم امور میں سے ہے! ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایچ نے ایک حاملہ عورت کو حالت حمل میں رجم کرنے کا حکم دیا۔ اس پر جناب علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو منع کیا اور فرمایا: (اِنْ كَانَ لَكَ عَلَيْهَا سَبِيلٌ فَاَيْسَ لَكَ عَلَى صَاحِبِ بَطْنِهَا سَبِيلٌ) اگر آپ کو اس عورت پر توبہ ہے تو جو اس کے پیٹ میں ہے اس پر توبہ کرنا نہیں! یہ سن کر آپ تادم ہوئے اور فرمایا کولہ علی لھلک عمرہ۔ (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا تھا) دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ آپ ایک پاگل عورت کو رجم کرنا چاہتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو روکا۔ اور یہ حدیث پڑھی۔

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ رُبَّمَا الْقَوْمُ عَنْ ذَلَالَةٍ عَنِ النَّبِيِّ حَتَّى يَسْتَفِظُوا عَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَبْلُغُوا وَ عَنِ الْجَاهِلِينَ حَتَّى يَفْقَهُوا

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تین شخصوں سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ سونے والے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے، بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے یا کمال تک نہ پہنچے، اور احمقوں سے جب تک وہ اچھا نہ ہو جائے، تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے صاحبزادہ ابوسمہ رضی اللہ عنہ پر جو دوران حد فوت ہو گئے تھے بحالتِ مردگی، بھی بقیہ کوڑے لگوائے حالانکہ مردہ کو حد لگانا خلاف عقل ہی ہے اور خلاف شرع بھی!،

چوتھا مسئلہ یہ کہ آپ کو شراب پینے کی حد کا بھی علم نہ تھا، وہ آپ نے لوگوں کے صلاح مشورہ سے مقرر کی! ان باتوں سے پتہ چلا کہ آپ کو تو شریعت کی ظاہری باتوں کا بھی علم نہ تھا تو خلافت کی کیا لیاقت رکھتے ہوں گے!

جواب :- ان اعتراضات کا یہ ہے کہ یہاں بھی یہ خیانت کی عادت بد سے باز نہیں آئے قصہ کا ایک ٹکڑا اٹھایا، اور باقی کو ہم کر گئے۔ بعض اس لئے کہ طعن کر کے خبت باطن ظاہر کرنے کا موقعہ ہاتھ سے نہ نکل جائے اور یہ رویہ متعصب معاندی کا ہو سکتا ہے جیسا کہ یہود کہتے تھے۔ **اِنَّ اللّٰهَ فَتّٰیوْهُ وَحُجْنُ اَعْنِیَآءُ** (اللہ تو فقیر ہے ہم مالدار ہیں)

حاملہ کے رحم کا قصہ دراصل یہ ہے کہ آپ کو اس کے حاملہ ہونے کا علم نہ تھا۔ اور ظاہر ہے حمل کا اظہار پورے دنوں، ولادت کے قریب ہی ہوتا ہے۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم تھا۔ تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کیفیت سے مطلع فرمایا تو آپ نے بطور تشکر یہ کلمات فرمائے۔ کہ اگر میں اس بات سے ناواقف رہتا اور عورت و بچہ اس حد کے اجراء سے ہلاک ہوجاتا تو بیٹ کے اس بچہ کی ہلاکت پر مجھے اتنا افسوس اور صدمہ ہوتا جو میری ہلاکت کے برابر ہوتا۔ اگر علی رضی اللہ عنہ، بروقت مجھے اطلاع نہ دیتے تو میں امداد و غم سے ہلاک ہوجاتا۔ اب یہ بات باتفاق شیعہ و سنی امام پر لازم نہیں کہ زانیہ کے خود اقرار یا گواہوں کی شہادت کے بعد زانیہ سے یہ پوچھے تو حاملہ ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ عورت کو خود چاہیے کہ وہ حاملہ ہو تو اس کو ظاہر کر دے، تو ایسا حکم جو حقیقت حال سے ناواقفیت کی بنا پر صادر ہو، اور اصل حقیقت کچھ اور ہو جس کا تقاضا اس کے خلاف ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ حقیقت حال سے لاعلمی تو کہہ سکتے ہیں جو نہ امامت و خلافت میں نقص کا باعث ہے نہ نبوت میں۔ اسے جیل و ندادانی سے تعمیر نہیں کیا جاسکتا!

دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے خبری ہی کی بنا پر اپنے بھائی کی داڑھی پکڑی، سر کے بال کھینچے۔ اور ان پر غصہ ہوئے۔ اور ان کی امانت کی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے بھائی کی عزت و تکریم کے حکم سے جاہل نہ تھے۔ اور خود دوسرے عالم و عالمان صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے تھے۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَاَنْتُمْ تَخْتَصِمُونَ اِلَیَّ وَاِنْ بَعُثْنَاکُمْ اِلَیْکُمْ مِنْ بَعِثٍ فَعِنِّ فَعِیْنٌ مُّثْلُہٗ بِحَقِّ اَخِیْہِ فَاِنَّمَا اُتْلَعُ مِنْہٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ۔
بے شک میں بشر ہوں۔ تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو تم میں سے بعض دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ چرب زبان ہوتا ہے اگر میں اس سے متاثر ہو کر اسکو اسکے بھائی کا حق دیدوں تو یہ بھٹنا کہ میں نے اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔

اور سنن ابی داؤد میں روایت ہے کہ جب ابی بن حمّال رضی اللہ عنہ نے آپ سے کان منک عطا فرمانے کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے اطلاعی کے سبب اسے مرحمت فرمادی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کان تو تیار ہے بغیر کسی عمل و کاریگی کے اس سے تو منک بنا بنایا، نکل رہا ہے تو آپ نے اسے یہ خیال فرما کر واپس لے لیا کہ یہ تو تمام مسلمانوں کا حق ہے اور سب کا مفاد اس سے وابستہ ہے کسی ایک شخص کی ذاتی ملکیت میں اتنا مناسب نہیں! اسی طرح جامع ترمذی میں بروایت صحیح واکل بن جرحندی سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک مسماۃ نماز میں شرکت کے لئے گھر سے نکلیں، مگر کسی نے اس کو پکڑ کر الجھڑنا کیا۔ اس کے شور مچانے پر زانی تو بھاگ گیا۔ مگر کسی دوسرے راہگیر کی طرف عورت نے اشارہ کر دیا کہ اسی نے زبردستی مجھے بے آبرو کیا ہے، لوگ ان کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار کا حکم جاری فرمایا۔ رحم شروع ہی ہونے والا تھا کہ اصل مجرم اقراری ہو گیا۔ اور کہنے لگا یا رسول اللہ! یہ شخص بے گناہ ہے زانیہ میں کیا تھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے قصور سے معذرت فرمائی اور اصل مجرم کو جرم کا حکم فرمایا۔ پھر ایک اور حدیث متفق علیہ جو دونوں فرقوں کی کتابوں میں مذکور ہے یوں مروی ہے،

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ عَلِيًّا بِإِقَامَةِ
الْحُدُودِ عَلَى أَمْرٍ أَقْبَى مِنْ بَنَفَاسٍ فَلَمْ يَقُمْ عَلَيْهَا
الْحُدُودَ خَشْيَةً أَنْ تُكُونَتْ فِدَاً كَذَلِكَ النَّبِيُّ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَحْسَنْتَ وَمَهَا حَقٌّ
يَنْقُطِعُ دُمُهَا.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا
اس عورت پر حد جاری کرنے کا جو نفاک کی حالت میں تھی۔ مگر آپ
نے اس ڈر سے کہ کہیں وہ مرنے جائے اس پر حد نہیں لگائی۔ اور اس
کا اظہار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ آپ نے فرمایا تم نے اچھا
کیا۔ اے خون کی مدت گزر جائے اور خون بند ہو جائے تک ملتوی نہ کرو

ان سب کے علاوہ نواسب نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر بھی اسی قسم کے طعن و اعتراض ثابت کئے ہیں مثلاً آپ نے شراب پر حد لگانے
پر دونوں حدود راجح اور درے بیک وقت جاری کیں۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھیں۔ اور آپ کا یہ فعل شریعت کے تو لوگوں خلافت
کہ انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مانع اور غامضہ کو رجم کیا۔ اور عقل کے بھی خلاف ہے، اس لئے کہ جب رجم کی سزا جو سخت ترین ہے اس
پر جاری ہونی واجب ہے تو اس سے ہلکے سزا دے کیوں لگائے جائیں۔ اہل سنت تو اس معاند فرقہ کو یہ جواب دیتے ہیں کہ اجتہاد اس
کے شادی شدہ ہونے کا علم نہیں تھا اس لئے کوڑے لگوائے، مگر جب معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے تو سنگسار کر لیا۔ (مگر شیعوں کے نزدیک
بالاطعن کی موجودگی میں ان کا کیا منہ ہے کہ وہ معاند کو کوئی مسکت جواب دے سکیں)۔ تو اسے دو حدوں کا جمع کرنا نہیں کہہ سکتے!

حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت حال سے لاعلمی اور چیز ہے اور شرعی مسئلہ کا نہ جاننا اور چیز، اور جو شخصی اتنا جاہل ہو کہ وہ ان دونوں
میں فرق کر سکی بھی تیز نہ رکھے وہ قابل خطاب ہی کب ہے! اور یہی صورت پاگل عورت کو رجم کرنے میں درپیش تھی کہ حضرت فاروق
رضی اللہ عنہ کو اس کے پاگل ہونے کا علم نہ تھا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ بحوالہ عطاء بن سائب رحمہ اللہ علیہ ابو
ظہیر جہشی رحمہ اللہ علیہ سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ لوگ ایک عورت کو بچم زنا پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں
لائے ثبوت جرم کے بعد آپ نے اسے رجم کی سزا دی، لوگ باگ اسے پکڑ کر سزا کے لئے جا رہے تھے کہ اتفاقاً حضرت علی رضی اللہ عنہ
میں مل گئے، آپ نے پوچھا کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ لوگوں نے بتایا کہ رجم کے لئے! آپ نے ان سے عورت کا ہاتھ چھڑایا اور خود اس
کا ہاتھ پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے اور فرمایا میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، یہ پاگل ہے اور فلاں قبیلہ سے
تعلق رکھتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنون پر احکام تکلیف جاری نہیں ہوتے۔ یہ حال معلوم ہونے پر جناب
فاروق رضی اللہ عنہ نے رجم کا حکم موقوف فرمادیا! معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسئلہ تو جانتے تھے، مگر اس کے پاگل پن سے قناعت
نہ تھے اس لئے اسکی حالت کا علم ہوتے ہی آپ نے اسکی سزا موقوف کر دی! بہت سے پاگل ایسے ہوتے ہیں کہ جب تنگ وہ پاگل پن
کی کوئی حرکت نہ کریں بظاہر ناراض اور سمجھ دار نظر آتے ہیں اس لئے کہ صورت تو پاگل و عاقل کی ایک سی ہی ہوتی ہے، جس اور عقل سے
کسی کا جنون معلوم نہیں ہوتا۔ یہ عورت پکڑ دھکڑ سے لے کر اثبات جرم کے مرحلے اور سزا کا حکم جاری ہونے تک کی سزا سے گزری اور
اس کی کسی بات اور کسی حرکت سے اس کا جنون ظاہر نہیں ہوا، تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیوں مطعون ہوتے، اور یہ مسئلہ اپنی
جگہ طے ہے کہ امور عقلیہ و حسیہ سے عدم واقفیت نبوت کے لئے بھی نقص نہیں تو خلافت امامت میں کیسے نقص ہوگا،

اور اوراق ماسبق میں شریف مرتضیٰ شیعہ کی کتاب الغرر والدرر سے یہ روایت نقل کی جا چکی ہے کہ قبلی کے متعلق آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں تھا کہ وہ سالم العضو ہے، یا مقطوع العضو! جو جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کے ماں آتا تھا۔ اور
ان کا بچا زاد بھائی تھا، اسی طرح اس عورت کے متعلق بھی یہ علم نہ تھا کہ وہ تازہ تر ہے اور ایام نفاس میں ہے۔
تو اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کسی عورت کے حاملہ یا پاگل ہونے کا علم نہ ہو سکا تو خلافت و امامت کی کوئی شرط

میں فرق آگیا۔ خلافت کی شرط احکام شرعی کا جانتا ہے حیات اور عقلیات جزئہ کا جانتا شرط نہیں؛ اور بالفعل احکام شرعیہ کا جانتا نہ نبوت میں شرط ہے نہ خلافت و امامت میں، بلکہ نبی کو احکام شرعیہ بذریعہ وحی معلوم ہوتے ہیں۔ اور امام کو اجتہاد ہے اور اجتہاد میں کبھی غلطی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ترمذی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت گذر چکی جس کا ما حاصل یہ تھا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مرتدوں کو جلوا دیا تھا، اسکی خبر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ہوئی تو آپ نے اس پر نیکہ فرمائی کہ ان کو قتل کرنا چاہیے تھا جلانا نہیں چاہیے تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتد کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے اور آگ کے عذاب سے منع فرمایا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کہنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا ابن عباس نے سچ فرمایا، معلوم ہوا کہ اس قسم کی اجتہادی غلطی بھی موجب طعن و اعتراض نہیں اس پر ملامت کی گنجائش ہے۔ چہ جائیکہ بے خبری، عدم علم وہ بھی ایسے موقعہ پر جہاں اس سے واقف و باخبر ہونا ضروری نہیں۔ کیسے ملامت و طعن کا محل بن سکتے ہیں!

یہاں ایک بڑی پیچیدہ اور مشکل صورت حال کا سامنا ہے؛ خاص کر شیعوں کے لئے کیونکہ نواصب کو یہاں ناخفہ آگیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تین مرفوع القلم لوگوں کے لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود روایت بیان فرماتے ہیں مگر دوسری طرف کتب شیعہ میں یہ روایت ہے کہ ان علیاً کان یا مکرماً یا مآتما حدیث الشریقۃ علی الصبی قبل ان یحکمہ۔ (جناب علی رضی اللہ عنہ) نابالغ لڑکے پر چوری کی حد جاری کرنے کا حکم فرماتے تھے! محمد بن بابویہ قتی نے اپنی کتاب ”من لا یحضرہ الفقیہ“ میں یہ روایت بیان کی ہے! آئیے یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے صریح خلاف ہے۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ نافذ ہو بھی جاتا تو ایک مخصوص یا نفل عورت ہی اس کی زد میں آتی، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فرمان سے تو ہر بچہ کا ہاتھ چوری کی سزا میں کاٹا جائے گا اور یوں ہزاروں بچے لہجے ہو جائیں گے۔ اب اس کا وبال شیعوں پر ہے۔ وہ کیا جواب دیتے ہیں وہ جانیں، اشاعہ ضرور ہے کہ یہاں وہ فقیہ کی آڑ بھی نہیں لے سکتے کیونکہ بچوں پر حد عمر عثمان رضی اللہ عنہما کا مذہب نہیں تھا۔ ہاں اگر پائل عورت کو سزا دیتے تو فقیہ کا عند چل سکتا تھا۔ مگر وہاں تو خود آئی ہی تھی ظاہر فرما کر ان کو رجم سے روک دیا! ہاں اہل سنت کے مذہب کے مطابق یہاں کوئی اشکال نہیں اس لئے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس شیعہ روایت کو تسلیم ہی نہیں کرتے، بلکہ اسے افتراء اور بہتان قرار دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک ابن بابویہ کا اس روایت کو بیان کرنا ہی اس کے کذب اور غلط ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اور اتنا نواصب بھی جانتے ہیں۔ (نہ جانتے ہوں تو جان لیں) کہ شیعہ روایات کے حوالہ سے وہ اہل سنت کو الزام نہیں دے سکتے!

دہامردہ پر حد لگانے کا معاملہ تو وہ تو سرتاپا جھوٹ اور افتراء کی پوٹ ہے۔ اہل سنت کے ہاں اس کے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی اس لئے اس کے جواب کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ صحیح روایات یہ ہیں کہ ابو سحیمہ رضی اللہ عنہ حد لگائے جانے کے بعد بھی زندہ رہے۔ البتہ دوران حد ان پر بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اسی کو کسی نے مرنا سمجھ لیا ہو۔

اور ان کا یہ اعتراض کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شراب نوشی کی حد کا علم نہیں تھا آپ نے دوسروں سے پوچھ پچا کر اس کی حد مقرر کی۔ یہ ایک عجیب قسم کا طعن ہے کیونکہ جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کا نہ جانا کوئی عیب یا نقص کی بات نہیں جبکہ شرع میں اس کی حد بندی بھی نہ کی گئی ہو۔ اس لئے کہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ وجہ ایک چیز موجود ہی نہیں تو اس کا علم کیسے ہو گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں شراب کی حد معین نہیں ہوئی تھی۔ یوں ہی بلا تعین، چابک، بٹی ہوئی چادرتوں یا لٹاؤ کی چھڑی سے چند ضربات لگاتے تھے۔ جناب صدیق اکبر کے عہد میں جب چند اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا تخمینہ لگایا تو گنتی چالیس تک پہنچی

اور جب خلافت عمر رضی اللہ عنہم ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہونے لگے تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشورہ کے لیے جمع کئے گئے اور ان سے مشورہ طلب کیا گیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض روایات کے مطابق جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہ آپ بھی جناب امیرؓ کے ہم رائے تھے۔ دونوں حضرات نے تجویز فرمایا کہ شراب نوشی کو حد و حد فزنی اسی کو طے رکھی جائے، اس لیے کہ شراب پی کر آدمی مست ہو جاتا ہے، اسی مستی میں وہ عقل سے بیگانہ ہو کر وہی تباہی بکتا ہے گالی بھی دیتا ہے اور ہمت بھی لگاتا ہے۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس لطیف استنباط کو پسند کیا اور اسی حد پر سب کا اجماع ہو گیا۔ لہذا معلوم ہوا کہ شراب نوشی کی حد کے بانی مہیانی تو خود جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ آپ کو حد خمر کا پتہ ہی نہ تھا انتہا درجہ کی بے عقلی کی دلیل ہے، خود امامیہ کے نزدیک بھی یہ قصہ اسی طرح ثابت ہے چنانچہ شیخ ابن مطہر علی نے مجمع الکرامہ میں اس کو نقل کیا ہے یہیں سے ان کے دوسرے اعتراض کا بھی جواب معلوم ہو گیا کہ یہ کہتے ہیں کہ شراب نوشی کی حد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عقل و رائے سے حد خمر میں اضافہ کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں تو صرف چالیس کوڑے تھے۔ تو اگر یہ اضافہ اور زیادتی ہی ہے تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد اور مشورہ اور تمام صحابہ کے اتفاق سے ہے۔ تو اکیلے عمر رضی اللہ عنہ ہی ہدف طعن کیوں؟ (انہوں نے تو ایک معصوم، کی رائے سے یہ حد مقرر فرمائی تھی۔ کیا یہ اس طرح بالواسطہ سہی جناب امیر رضی اللہ عنہ پر طعن کے مرتکب نہیں ہوئے۔) بعض کتب شیعہ میں اس طعن کو دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد خمر میں اسی سے زیادہ کوڑے لگوائے، اول تو یہ روایت صحیح نہیں۔ یا فرض صحیح بھی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی حد خمر میں سو کوڑے لگوائے۔ یعنی تہی پر ہمیں کا اضافہ فرما کر چنانچہ محمد بن بابویہ تہی نے کتاب "لا یخضرہ الفقیہ" میں ایک روایت بیان کی ہے کہ جب نجاشی غارتی شاعر کو عین رمضان المبارک کے ایام میں شراب نوشی کرنے پر پکڑ کر لایا گیا۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو سو کوڑے لگوائے پس کوڑے رمضان المبارک کی حرمت کے سبب اضافہ کے،

اہل سنت بہر طور ان دونوں واقعات کا صرف یہی جواب دیتے ہیں کہ امیر المؤمنین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ انتظاماً یا اقدراً واجب شرعی میں خیانت و بے حرمتی کے سبب اضافہ کر سکتا ہے! جس پر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا فعل واضح اور کھلی دلیل ہے! لہذا اب صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہ طعن کی گنجائش ہے اور نہ کوئی وجہ جواز!

اعتراف (۱۵) یہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد میں سو کوڑے مارنے کے لئے درخت کی ایسی ٹہنی جس میں سو شاخیں تھیں مارنے کا حکم دیا جو سراسر شریعت کے مخالف ہے۔ کیونکہ از روئے حکم قرآن مجید سو کوڑے مارنے کی ہدایت ہے، فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةً۔ دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو،

جواب یہ ہے کہ اس اعتراض کا مقصد عناد و تعصب اگر نہیں ہے تو جہالت تو یقینی ہے اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فعل کے موافق ہے چنانچہ مشکوٰۃ میں نیز شرح السنہ میں جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ وہ ایک ناقص الخلق بیمار شخص کو اس جرم میں کہ وہ حملہ کی ایک لونڈی سے زنا کر رہا تھا پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لئے درخت کی ایک لمبی چھڑ لاؤ جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے ایک بار مارو! ابن ماجہ نے بھی اسی جیسی ایک روایت بیان کی ہے۔ اور ایسے سرلین کے متعلق جسکی صحت کی امید نہ رہی ہو اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

الْمَرْفُوعُ إِذَا وَجِبَ عَلَيْهِ الْحَدُّ إِنْ كَانَ الْحَدُّ رَجْمًا
مرلین پر اگر حد واجب ہو اور وہ رجم کی شکل میں ہو تو فی الوقت

جاری کر دی جائے۔ اور اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو فوراً نافذ نہ کی جائے تا وقتیکہ وہ بیماری سے نجات نہ پالے اور تندرست نہ ہو جائے۔ اگر بیماری ایسی ہو کہ اس کے ازالہ اور صحت کی طرف سے ناامیدی ہو تو حد اسی وقت جاری کی جائے جیسے دق و سل کا مریض۔ یا اگر وہ انس الحلقہ اور ضعیف البدن ہو تو ہمارے نزدیک سو شانوں والی چھڑکی ایک ہی ضرب بطرح ماری جائے کہ ہر شاخ اس کے بدن سے چھوئے ضرور! (فتح القدیر میں ایسا ہی مذکور ہے)

يُقَامُ عَلَيْهِ لِهَآلِ وَاَن كَانَ جَلْدًا لَا يَقَامُ عَلَيْهِ حَتَّى يَبْرَأَ أَوْ يَمُوتَ إِلَّا زَكَاةً مَرِيضًا وَقَعَ الْيَأْسُ عَنْ بُرْئِهِ فَيَمْنِدُ يَقَامُ عَلَيْهِ كَذَآءِ الطَّهْرِ يَكُونُ الْمَرْمَى لَا يَرْجَى زَوَالَهُ كَالسَّلَاحِ كَأَن مَضَى جَاذِعِينَ الْخَلْقَةَ فَعِنْدَنَا يُعَذَّبُ بِشَآءٍ فِيهِ مَآثِرُهُ مُشْتَرَاخٌ فَيُعَذَّبُ رَنَعَةً وَلَا بَدَأَ مِنْ دَمُونٍ كُلِّ شَيْءٍ إِلَى بَدَنِهِ كَذَآءِ فِي قُلُوبِ الْقَدِيرِ

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی حد جسکو لگائی وہ ضعیف الحلقہ (پیدائشی کمزور) ہی تھا! قرآن مجید میں بھی ایسے حیلہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام جب اپنی قسم توڑنے نہ توڑنے کی فکر میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ ترکیب بتائی: خُذْ بِيَدِكَ صِغَةً مِّنْ مَّرْثُومٍ وَلَا تُخَنِّثْ. ایک ٹٹھا سنیوں کا نو اور اس کو مارو، اور اپنی قسم نہ توڑو۔

اعتراف (۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ بھی اعتراف ہے کہ آپ نے جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر چار گواہوں کی گواہی کے باوجود زنا کی حد لگانے سے درگزر کیا۔ اور ایک گواہ کو الباطلہ سکھا دیا کہ اس کے بعد حد جاری و ثابت نہ ہو سکی۔ یعنی جب چوتھا گواہ گواہی کے لئے آیا تو اس سے کہا اَرَىٰ وَجْهَ رَجُلٍ لَا يَقْنَعُ اللَّهُ بِهِ رَجُلًا مِّنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (میں ایک ایسے شخص کا چہرہ دیکھ رہا ہوں کہ اس کے درجہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں کے ایک شخص کو رسوا نہ کریگا)

جواب۔ اس طعن کا جواب یہ ہے کہ حد سے درگزر یا اسے طالت اس وقت کہہ سکتے ہیں جب ثبوت مکمل ہو گیا ہو، چونکہ چوتھے گواہ کی گواہی صحیح نہیں تھی اس لئے حد ثابت ہی نہیں ہوئی، تو اسے طالت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے رگواہ کو سکھانے پر وہاں کا الزام تو یہ کھلا اقرار اور محض بہتان ہے۔ ابن جریر طبری، امام محمد بن اسماعیل بخاری اپنی تاریخ میں اور حافظ عابد الدین بن اثیر، حافظ جمال الدین ابوالفرج بن جوزی اور شیخ شمس الدین مظہر سبط بن جوزی اور دوسرے ثقہ مورخین بیان کرتے ہیں کہ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بصرہ کے امیر تھے۔ بصرہ کے لوگ شرارت پر تلے ہوئے تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کو معزول کرائیں، انہوں نے ایک سازش کے تحت ان پر زنا کی تہمت لگائی۔ اور چند چھوٹے گواہ اکٹھے کیے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان سے گواہی دلائیں۔ اسی سازش کے تحت بصرہ میں اس الزام کی شہرت دی گئی یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک بھی یہ خبر پہنچی۔ آپ نے ان سب کو بلوایا چنانچہ جناب مغیرہؓ مع چار گواہوں کے مجلس عدالت صحابہ کے روبرو جس میں جناب امیر المؤمنین خود بھی تشریف فرما تھے پیش کیے گئے۔ اہل بصرہ نے بحیثیت مدعی دعویٰ دائر کیا کہ جناب مغیرہؓ نے ام حمیل نامی ایک عورت کے ساتھ زنا کیا۔ گواہ گواہی کے لئے آئے تو ایک نے کہا کہ میں نے ان کو اسکی دونوں رانوں کے بیچ میں دیکھا۔ اس پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا لَا وَاللَّهِ حَتَّىٰ يَشْهَدَ اللَّهُ، يَلْمُ فِيهَا دَوَاجِ الْمَوَدِّ فِي الْمَحَلَّةِ۔ (نہیں خدا کی قسم اس وقت تک اسکی گواہی معتبر نہیں) چونکہ یہ گواہی نہ دے کہ اس نے عضو مخصوص کو اس طرح اندر جاتے دیکھا جس طرح سرمہ دانی میں سلائی جاتی ہے)

اس پر گواہ نے کہا نعم اَشْهَدُ عَلَىٰ ذَلِكِ (ہاں میں اسی کیفیت کی گواہی دیتا ہوں) اس کے بعد دوسرے اور تیسرے گواہ نے بھی اسی طرح گواہی دی جب چوتھا گواہ جو زیاد بن ابیہ تھا گواہی کے لئے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم بھی اپنے ساتھیوں کی طرح گواہی دیتے ہو۔

تو اس نے کہا میں اتنا جانتا ہوں کہ

رَأَيْتُ مُجَلِّبًا وَنَفْسًا حَاشِيَةً وَإِشْهَارًا وَلَكِنَّهُ مُسْتَبِطُنًا وَرَجُلَيْنِ كَانَهُمَا أَوْذَا حِمَارٍ۔ میں نے ایک نشنگاہ، پھولا ہوا سانس، اور ایسا تادی دیکھی۔ اور ان کو اس کے پیٹ پر دیکھا، دونوں پاؤں ایسے لگتے تھے جیسے گدھے کے دوکان۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے ایسا دیکھا جس طرح سلائی سرمہ دانی میں جاتی ہے۔ اس نے کہا نہیں اس طرح نہیں دیکھا۔ اب اس صورت حال کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ شرعاً حد ثابت ہو گئی؟ اور یہ مقدمہ بند کرے گا تو تھا نہیں۔

صحابہ کی کھلی مجلس میں سب پیش تھے، سب کے سامنے سوال و جواب ہو رہے تھے۔ اس گواہ کو سکھانے پر بڑھانے کا مرحلہ کہاں پیش آیا اگر برسرِ مجلس جناب عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے تو کیا صحابہ کرام جن میں جناب علی رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے اس کو گوارا فرمالتے یہ حضرات تو اتنا منصف مزاج عادل اور جری تھے کہ برسرِ منبر امیر المؤمنینؓ کو ٹوکنے اور جواب طلبی سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ اور پھر

یہ معاملہ تو حدود اللہ کا تھا امور شرع اور حدود کے اثبات میں کوئی خامی، سستی اور رواداری برتی جاتی تو صادقوں اور عادلوں اور سچے مسلمانوں کی یہ جماعت کثیر، جو اسی مقصد اور فیصلہ کے لئے جمع ہوئی تھی کب اسے برداشت کر سکتی تھی۔ ان اصحاب کرام

رضی اللہ عنہم کی عادت تو امرِ ناحق و منکر کو چھپانے کی نہیں آشکارا کرنے کی تھی۔ وہ دین کے معاملہ میں نہ بے جا لاپرواہی کرتے تھے نہ بے جا رواداری برتتے تھے، یہ سب کے سب ایسی غلط روش پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے اور جس پر حد ثابت ہو چکی ہو اس کو

یوں ہی اچھوتا کیسے جانے دیتے! اگر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے شاہد کو سکھایا ہوتا تو یہ حضرات فوراً ہی آپ کی گرفت کوٹے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ وصف خود شیعہ روایات سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ قبول حق میں اتنے مستعد تھے کہ دینی امور

میں ایک عورت کی بات سے قائل ہو گئے! اور پھر ان کا یہ وصف تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دین و شرع کا کوئی اہم کام بغیر صحابہؓ کے مشورہ اور ان کی موجودگی کے انجام نہیں دیتے تھے۔ اور شروع طبعی میں جس کلمہ کی آدائیگی شیعوں نے آپ کی طرف منسوب کی ہے

وہ سراسر غلط ہے۔ اور آپ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ البتہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا تھا اور جس کی عورت و ابرو، اور جان پر پنی ہو اور جنیال خویش جھوٹ و سازش کا شکار ہو وہ ایسی باتیں کہتا ہی ہے۔ بات تو گواہ کی ہے کہ اگر وہ صرف

اللہ کی رضا کی خاطر گواہی دینے آیا تھا تو وہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی باتوں سے متاثر کیوں ہوا۔ اور اس کا لحاظ کیوں کیا۔ اور اگر گواہ مدعی علیہ کا لحاظ کر کے۔ اور مدعی علیہ کے نقصان کی گواہی دلوائے۔ یہ بات کسی بھی مذہب و شریعت میں نہیں۔

اور اگر یہ مقولہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا مان لیں، تو یہ آپ کی فراست و مومنانہ کا ایک نمونہ ہے کہ آپ جو صورت آزمندہ سامنے آنے والی ہے اس کو میان فرما رہے ہیں اور آپ کے ساتھ بارگاہیسا ہوا کہ آپ نے قرآن اور مومنانہ بصیرت سے پتہ چلا کر کسی بیہوش واقعہ کے متعلق فرما دیا کہ یہ ایسا ہے۔ اور وہ واقعہ تو ایسا ہی ہوا! محض شیعوں کے کہنے سے تو یہ نہیں مانا جاسکتا۔ ان کے پاس

اس کا کیا ثبوت ہے کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے گواہ سے یہ کہا کسکے سامنے کہا؟ کون گواہ ہے؟ اسکی دلیل کیا ہے؟ اور یہ شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس دلی ارادہ سے کیسے واقف ہو گئے کہ آپ کے دل میں یہ بات تھی کہ گواہ گواہی سے منحرف

ہو جائے؟ دل کا حال تو صرف خدا جانتا ہے! اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حد ٹالنے والی بات سرزد ہوتا مان لیا جائے تو آپ کا یہ فعل تو امام معصوم، کے عمل کے مطابق ہو گیا۔ ان پر اگر طعن روا ہے تو امام معصوم اس سے کہاں چپیں گے! ان کی مدافعت میں

اگر ان کے پاس کوئی جواب ہے تو اسکو یہاں بھی منطبق کر لیں، محمد بن ابی بکرؓ نے کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى امِيرِ الْمُؤْمِنِينَ وَقَالَ بِالسُّوءِ فَقَالَ امِيرُ الْمُؤْمِنِينَ قَطَعَ بِهِ الْيَدَ فَلَمْ يَقْطَعْ يَدَهُ۔ ایک شخص نے امیر المؤمنین

(علی) رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر اس انداز میں چوری کا اقرار کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹا جانا چاہیے تھا مگر آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ جب اس کے اقرار سے قطعید کا حرج ہو گئی تھی تو جناب امیر نے اس پر حد کیوں جاری نہیں کی، اور یہ حد کیوں نکالی گئی؟
اعتراف (۱) ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطیب بڑے بڑے مہربانہ ہونے کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اگر زیادہ ہر کوئی عورت وغوی کی بات ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حقدار تھے۔ حالانکہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں (رضی اللہ عنہن) کے مہربانچسپ سے زیادہ کے نہیں باندھے لہذا تمہیں چاہیے کہ سنت رسول پر سختی سے عمل کرو اور زیادہ مہربانہ نہ بنو۔ آئندہ اگر کسی نے زیادہ مہربانہ دیا تو میں مقدار سنت سے زیادہ رقم بحق بیت المال ضبط کروں گا۔ اس پر ایک خاتون اٹھی اور کہنے لگی عمر سنو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **وَإِذَا نَكَحْتُمُ امْرَأَتَكُمْ فَتَمَتُّوا وَلَا تُخَالِفُوا مِنْهُ شَيْئًا**۔ اگر عورتوں کو مال کا ڈھیر دے ڈالو تو اس ڈھیر سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

ایسی صورت میں تمہیں کیا حق ہے کہ مہر کی زائد از سنت رقم واپس لو۔ اگرچہ ان کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر جناب نے فرمایا **كُلُّنَا مِنَ أَفْقَهُ مَنْ عَمَّ حَتَّى الْمُحَدَّثَاتِ فِي الْحِجَالِ**۔ (دین کی سمجھ میں سب ہی عمر سے بڑھے ہوئے ہیں حتیٰ کچھ کھٹوں کی پردہ نشین عورتیں بھی) اس واقعہ میں شیعوں کے پیش نظر قابل اعتراض بات یہ ہے کہ آپ ایک عورت کے مقابل لاجواب ہو گئے۔ کوئی جواب نہ بن پڑا اور جو ایک عورت کو جواب دینے سے عاجز ہو وہ امامت کے قابل کب ہو سکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جس پر شیعہ بغلیں بجائیں، آپ کی خاموشی اس لئے نہیں تھی کہ آپ اس کا جواب باصواب دینے سے عاجز ہو گئے تھے بلکہ آپ کتاب اللہ کے ادب و احترام کی بنا پر خاموش ہو گئے تھے۔ کہ وہ اپنے کو کتاب اللہ کے مقابل رکھ کر اس کے جواب سے گریز کر رہے تھے۔ (نیز آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ محترمہ کا مبلغ علم کتنا ہے۔ قرآنی آیت کا مفہوم احادیث کی روشنی میں ان کو سمجھانے اور بتانے کا یہ موقع بھی نہ تھا کہ وہ کوئی محفل مناظرہ تو تھی نہیں جب آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حوالہ دے چکے تھے۔ اس کے باوجود محترمہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ آپ کا یہی مفہوم ہوتا جو وہ سمجھ رہی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادتی مہر کو ناپسند فرماتے، ایسے وقت آپ کا سکوت ہی صحیح اور مناسب تھا۔ ن)

کیونکہ کتاب اللہ کے مقابلہ میں چون و چرا، یا توجہات و تاویلات بلند مرتبہ اہل ایمان کے شایان شان نہیں۔ ان کے نزدیک اسلام راستہ ہی ہے کہ وہ قرآن کے ظاہری الفاظ کو تسلیم کر لیں۔ اور اسی لئے آپ نے سکوت اختیار فرمایا۔ (دراصل ان محترمہ کو اعتراض زائد از سنت مقدار کی واپسی پر تھا۔ اور اسی کے ثبوت میں یہ قرآنی آیت پڑھی) اگر ان کی عرض حوالہ یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بھاری بھاری مہربانہ ہونے سے راضی ہوتا ہے تو یہ بات تو جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم مبارک کے صریحاً غلط ہے کیونکہ احادیث صحیحہ میں کثرت و زیادتی مہر کی نفی منقول ہے! خطابی نے غریب الحدیث میں یوں روایت کی ہے کہ **عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبَايَسُوا الصَّدَاقَ فَإِنَّ الرَّجُلَ يُعْطَى الْمَرْأَةَ حَتَّى يَبْقَى فِي نَفْسِهِ خَسِيفَةٌ** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہر میں آسانی کرو۔ آدمی اگر (چہ بھاری مہر بھی) عورت کو دیتا ہے مگر دل میں پھانس سی جیسی رہ جاتی ہے!

ابن جبان نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ **قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ خَيْرِ النِّسَاءِ أَيْسَرَهُنَّ صَدَاقًا** کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عورتوں میں وہ عورت بہتر ہے جس کا مہر بہت ہلکا ہو۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا صَالِيَةً عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُعْضَى الْمَرْءُ كَاسَ
تَسْهِيلٍ أَمْرًا فِي مَدِّ أَقْصَا.

۱۔ احمد و بیہقی کی مرفوع روایت ہے کہ۔

أَغْلَقَهُ النَّسَاءُ بِوَكَّةَ أَيْسَدَ مَهْنًا قَا۔

رسب سے زیادہ بابرکت وہ عورت ہے جس کا ہر سب سے زیادہ ہلکا ہو

اس آیت سے زیادہ سے زیادہ ہر کی زیادتی کا جواز نکل سکتا ہے اگرچہ بیکراہت ہوگا۔ لیکن وہ نصی کہاں ہے جو یہ بتائیں کرے کہ آیت میں فقط قنطار سے مراد ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ قنطار زیور، روپیہ، پیسہ، اور ساز و سامان ہو جو مرد اپنی بیوی کو دیتے ہیں۔ مہرنہ ہو! اس لئے کہ اس قسم کے عطایا و ہدیایا جو ان عورتوں کو ہبہ کر دئے جاتے ہیں۔ ان کو واپس لینا زریبا نہیں۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ اسے طلاق دے کر بے آسرا اور تکالیف معاش وغیرہ کے حوالہ کر رہے ہو، ایسی حالت میں تو اس ہبہ کی واپسی اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوگی جو خلاف شرع بھی اور خلاف مروت بھی! اور امر جائز میں ممانعت مصلی ملی و ملکی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے خیر خواہانہ نصیحت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اپنے اموال بے جان نمود و نمائش، غلط فہم و مباحات، زمانہ سازی اور اسراف بے جا میں نہ متعلق کریں۔ کہ یہ دوسرے حقداروں کی حق تلفی کا سبب بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ باسم تنازعات، مقدمہ بازی، لڑائی جھگڑے اور کسی بڑے فتنہ کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

اور مصالح ملکی و ملی کی نگہداشت اور جائز اخراجات پر قدغن، یا انہیں محدود کرنا خلیفہ وقت کا کام ہے۔ ہر زمانہ میں اس کے نظائر ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ طلاق ایک امر جائز ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جناب زید رضی اللہ عنہ کو اس سے منع فرماتے تھے کہ وہ جناب زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق نہ دیں علی ہذا کا حاکم سنت نبوی ہے مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اہل کوفہ سے فرماتے تھے کہ یا اہل کوفہ لَا تَنْزِلُوا الْحَسَنَ لِأَنَّهُ مِلَّةٌ لِّلنَّسَاءِ رَاے اہل کوفہ حسن رضی اللہ عنہ کی شادی نہ کرو کیونکہ وہ عورتوں کو طلاق بہت دیتے ہیں، ہاں لکن اُن کا فعل جائز تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جس کلام پر اعتراض ہے اس سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر کی زیادتی کے جواز کے توقا کُل تھے مگر انجام بد پر نظر فرما کر روکتے تھے۔

اگر ان محترمہ کا آیت سے مقصد مال کی واپسی حرام ہوتا ہو۔ تو وہ حرمت خاوندوں اور شوہروں کے ثابت ہوگی۔ نہ کہ ان خلفا یا احکام کے لئے جو ڈانٹ ڈیٹ کر اس سے روکیں۔ اور اسکی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَإِنْ أَزْوَاجُكُمُ اسْتَبَدَّنَّ إِلَی زَوْجٍ وَآتَيْنَهُنَّ أَحَدُ قَنَاطَرًا۔ اور اگر تمہارا ارادہ ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری کو لانا ہو اور ان میں سے ایک کو ڈھیروں مال دیدیا ہو! (تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو) اور بحق بیت المال کی ڈانٹ بطور تنبیہ تھی۔ ویسے جمہور اہل سنت کے نزدیک ظہیر کو یہ حق ہے کہ اگر کسی فی الحال یا فی المال فتنہ کا اندیشہ ہو تو جائز بات پر بھی قدغن لگا سکتا اور سزا دے سکتا ہے۔ اور مال کی قرع بھی ایک قسم کی سزا ہے۔ اور اعتراض میں یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اقرار کیا، ایک معاذلہ اور بے سرو پاٹھ ہے۔ کسی بھی روایت میں اس اقرار کی تصریح نہیں۔ البتہ وہ جملہ کہنے ضرور فرمایا جو ایک طرف تو آپ کی تواضع، کسر نفسی اور حسن اخلاق کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ نے سوچا کہ ایک ناواقف علوم قرآن اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اپنی بات کی سند قرآن مجید سے لائی ہے اب اس کے استنباط کو دلائل صحیحہ سے غلط تاؤں تو دل شکستہ ہو جائیگی، اور پھر استنباط قرآن کی شاید جرأت نہ کرے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اس کی دل جوئی کی خاطر اپنے کو اس معاملہ میں معترف اور قائل کروں تاکہ اسکو بھی اور دوسروں کو بھی معافی قرآن

میں بخور خوش اور اس کے ذائقہ اخذ کرنے کی آئینگی پیدا ہو اور یک گونہ قرآن سے وابستگی رہے۔ تو دوسری طرف اسکے قول کی تردید بھرے مجمع میں اس کو شرمندگی سے بچانے کا مقصد بھی ظاہر کرتا ہے، اس قصہ کے علاوہ دوسرے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں یہ وصف خاص طور پر تھا کہ آپ چاہتے تھے کہ لوگ کتاب اللہ سے وابستگی حاصل کریں اور قرآن پر بخور و فکر اور مسائل کے اخذ و استنباط میں مشغول رہیں۔ ورنہ کون رئیس وقت اور حاکم زمانہ ایسا بے نفس ہوتا ہے کہ ایمان حکومت یا مجمع احباب و معتقدین میں ایک ناسمجھ عورت کی سمجھ بوجھ کی تعریف و توصیف کے ساتھ اپنے کو قائل اور ملزم کے روپ میں پیش کرے۔ اور اس کے سوال پر چپ ہو جائے! اگر بالفرض آپ سے کوئی جواب نہیں پڑتا تھا تو ان مترمہ کی گرفت کرنے اور ٹرانٹ ٹیپٹ کے لئے ایک جواز تو موجود ہی تھا اور آپ اسکو اس معاملہ میں سزا بھی دے سکتے تھے کیونکہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کا ذکر کر رہے تھے اور وہ اس کے مقابلہ میں قرآنی آیت لا کر نعوذ باللہ گویا یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے بے خبر تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا وہ مطلب نہ سمجھتے جو میں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن مقتدایان دین و شریعت کی شان کا تقاضا یہ ہی ہوتا ہے کہ ان کے نفوس پاک میں نفسانیت اور سخن پردری کی بوتل نہ آئے۔ انہیں تو صرف حق کی تلاش اور اس کا اتباع منظور ہوتا ہے اور وہ حق خود ان کے اپنے پاس ہو یا دوسرے سے حاصل ہو۔ اسی لئے تمام اکابرین و ارباب یقین اس منقبت عظیم میں باہم شریک و ہمسر ہیں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک قصہ منقول ہے چنانچہ ابن جریر اور ابن عبد البر نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ

قَالَ سَأَلَ الرَّجُلَ عَمِيًّا عَنْ مُسْئَلَةٍ فَقَالَ فِيهَا نَقَالَ
الرَّجُلُ كَيْسَ هَكَذَا وَالْكَنْ كَذَا وَكَذَا قَالَ عَلِيٌّ أَصَبْتَ
وَأَخْطَأْنَا وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلَيْهِ
راوی کہتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے
کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے اس کے جواب میں کچھ فرمایا تو اس نے
پلٹ کر کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسا ایسا ہے جناب علیؑ نے
فرمایا تو نے ٹھیک کہا ہم سے خطا ہو گئی۔ اور ہر جاننے والے سے ایسا
جاننے والا ہے!

آپؑ کے اس قابل تعریف طرز عمل کو نواصب نے اسی طرح موردِ طنن بنایا جس طرح بخور بظہر فطرت شیعوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں کہا! یہاں ایک بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اگر کسی ایک مسئلہ میں امام سے زیادہ کسی کو معلومات ہوں۔ یا اس مسئلہ کے نکات کا غیر امام کو علم ہو اور امام کی معلومات اور ذہن وہاں تک نہ پہنچا ہو تو یہ بات خلافت و امامت کی لیاقت کو ناقص نہیں بناتی، اور ان کی لیاقت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ حکم الہی انا جعلناک خلیفۃ فی الارض خلیفۃ وقت بھی تھے۔ مگر کسی دوسرے کا کھیت چر جانے والی بکریوں کا جو مقدمہ آپ کے سامنے آیا، اس کے حکم کے سمجھنے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذہن تیز نظر آ رہا اور وہ معاملہ کو سمجھ گئے۔ حالانکہ وہ اسوقت نہ نبی تھے نہ خلیفہ و امام! بلکہ نوعمر ہی تھے اس کے باوجود معاملہ فہمی میں حضرت داؤد علیہ السلام سے سبقت لے گئے! ابن بابویہ قمی کے من لایحضرہ الفقیہ، میں بروایت احمد بن عمر حلبی لکھا ہے کہ

قَالَ سَأَلْتُ أَبَا الْحُسَيْنِ عَنْ قَوْلِهِ تَعَالَى وَدَاوُدُ سُلَيْمَانُ
إِذْ يُحْكَمُ فِي الْحَرْثِ قَالَ حَكَمَ دَاوُدُ بِرِقَابِ الْغَنَمِ وَ
فَهَمَّ اللَّهُ سُلَيْمَانُ أَنْ يَكْتُمَ لِصَاحِبِ الْحَرْثِ فِي
الْبَنِّ وَالصُّوفِ
میں نے ابی الحسین رحمہ اللہ علیہ سے اللہ کے فرمان و داؤد و سلیمان
کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے بکریاں دلائے
کا فیصلہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے سلیمان کو معاملہ سمجھایا کہ کھیت
والے کا حق دودھ اور اون میں ہے،

لہذا اگر ایک مسئلہ اللہ تعالیٰ کسی نادان عورت کو سمجھا دیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ سمجھائیں۔ تو ان کی خلافت و امامت میں اس سے کیا نقصان لازم آتا ہے۔ وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت میں بھی تو اس واقعہ سے کوئی نقص واقع نہیں ہوا۔ اور ظاہر ہے خلافت و امامت تو نبوت کی نیابت ہے۔ اور دنیا میں وہ کون ایسا ہے جس کو اپنے بارے میں یہ تجربہ نہ ہوا ہو کہ بعض اوقات بدیہی اور سامنے کی بات تک بھی ذہن نہیں پہنچا۔ اور عقل و فہم میں اس سے کم تر لوگ فوراً بات کی تہ کو پہنچ گئے اور انہوں نے اس نتیجہ پر اسے تنبیہ کیا۔ مگر بغض و عناد نے جس کے دل پر قبضہ کر رکھا ہو اس کا کیا علاج۔

اعتراف (۸۷) یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خمس میں سے اہل بیت کا حصہ ان کو نہیں دیا اور یوں قرآن کے حکم کے خلاف کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، **وَاَعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنْ لِلّٰهِ خُمُسُهُ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالسَّابِقِیْنَ السَّابِقِیْنَ** معلوم رہے کہ مال غنیمت میں سے جو کچھ تم پاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول رسول کے قریبدار اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔

جواب :- اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ امامیہ مذہب کی رو سے یہ اعتراض صحیح نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ آیت، مصارف خمس کے بارے میں ہے استحقاق کے بیان کے لئے نہیں ہے۔ لہذا اگر امام وقت کی صوابدید کا تقاضا یہ ہو کہ ان بیان کردہ چار مصارف میں سے کسی ایک کے لئے وہ مخصوص کر دے تو اس کے لئے یہ جائز اور درست ہے! امامیہ کی ایک جماعت کثیر کا یہی مذہب ہے۔ چنانچہ ابوالقاسم مصنف شرائع الاحکام نے جس کو امامیہ محقق کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور دوسرے علما نے اس کی تشریح کی ہے اور اس کے ثبوت میں اپنے ائمہ سے روایات بیان کی ہیں۔ لہذا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک، دو سال اس خیال سے ان کو خمس نہ دیں کہ ان کو ضرور نہ رہی ہو۔ یا ان کے مقابلہ میں دوسرے فرقے زیادہ حاجت مند اور تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ اور آیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خمس ان چار طبقوں ہی کو دیا جائے ان سے باہر کسی کو نہ دیا جائے اور پھر ان میں سے خواہ ہر ایک کو دیا جائے خواہ ایک دو کو! اور اسکی دلیل یہ ہے کہ آیت زکوٰۃ انما الصدقات الخ میں بھی مصارف زکوٰۃ کا ہی بیان مقصود ہے اور یہ صحیح مذہب بھی یہی ہے اسی لئے اگر کوئی ان آٹھ طبقوں میں سے کسی ایک ہی طبقہ کو زکوٰۃ دے تو جائز ہے یہی حکم یہاں بھی ہے! اور خود جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ذوالقرنی کا حصہ خود نہیں لیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے مطابق بنی ہاشم کے فقراء اور مساکین کو دے دیا کرتے ان سے جو کچھ بچ رہتا وہ دوسرے مسلمان فقراء و مساکین میں بانٹ دیتے۔ اطمینان اور وارفتگی نے بحوالہ محمد اسحاق روایت بیان کی ہے کہ

اَنَّهُ قَالَ سَأَلْتُ اَبَا جَعْفَرٍ مُحَمَّدَ بْنَ عَلِيٍّ بْنِ الْحُسَيْنِ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيَّ بْنَ اَبِي طَالِبٍ لَمَّا وَلِيَ الْاَمْرَ النَّاسَ كَيْفَ صَنَعَ فِيْ سَهْمِ ذِي الْقُرْبٰى فَقَالَ سَلَكْتُ بِهِ وَاللّٰهِ مَسْلَكَ اَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَ ذُرَادَ الْهَآوِىْ فَقُلْتُ كَيْفَ اَنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ قَالَ وَ اللّٰهِ مَا كَانَ اَهْلُهُ يَصُدُّوْنَ ذَا الْاَعْنِ رَوٰهُ

میں نے جناب ابو جعفر محمد اللہ سے پوچھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے ذوالقرنی کے حصہ کے متعلق کیا طریقہ اختیار فرمایا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم وہ اسی مساک پر عمل پیرا ہے جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔

طحاوی نے یہ مکتوط مزید بیان کیا میں نے کہا اب، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے تو فرمایا خدا کی قسم آپ کے اہل آپ کا رائے کے خلاف نہیں چل رہے۔

اور تقسیم خمس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریق عمل یہ تھا کہ اول اہل بیت کے نادار و مساکین کو عنایت فرماتے پھر جو بچ رہتا اسے

بیت المال میں داخل کر کے بیت المال کے مصارف میں لگاتے رہتے۔ اسی لئے اہل بیت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خمس دینے کی روایات تعداد میں زیادہ بھی ہیں اور مشہور و متواتر بھی بہت ہیں! ابو داؤد نے محمد الرحمن بن ابی لیلی سے بحوالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اَنَّا بَايَعُوهُ وَعَمَرُوهُ نَسَمًا سَهْمًا ذُو الْقُرْبَىٰ لَهُمْ۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ دونوں نے ذوالقربی کا حصہ ان کو تقسیم کیا۔ نیز ابو داؤد نے حضرت جابر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی ہے۔ اَنَّا عَمَرْنَا كَانَ يُعْطَىٰ ذُو الْقُرْبَىٰ مِنْ خُمْسِهِ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذوی القربی کو خمس دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث صحیح ہے اور حافظ عبد العظیم منذری نے اسکی صحت کی تصریح کی ہے۔ روایات کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما خمس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتداروں کا حصہ نکالا کرتے تھے اور اسکو ان کے نادار اور مسکینوں میں تقسیم فرماتے تھے اس کے علاوہ بھی ان کی دیگر ضروریات اسی سے حل اور پوری فرمایا کرتے تھے اس کو میراث کے طور پر بغنی و فقیر محتاج و غیر محتاج کو نہیں دیتے تھے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز تقسیم بھی یہی تھا۔ اور احناف نیز امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا اب بھی یہی مذہب و مسلک ہے جیسا کہ احکام الشواہد کے حوالہ سے اوپر مذکور ہوا۔ بدایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

خمس تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک یتیموں کے لئے ایک مساکین کے لئے اور ایک مسافروں کے لئے جن میں فقراء و ذوالقربی داخل ہیں۔ اور مقدم! ان کے غنی اور مالداروں کو نہیں دیا جاتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس خمس کا ایک خمس نکالا جائے گا۔ اور اس میں غریب اور مالدار سب برابر ہوں گے اس میں سے عورت کو اکابر حصہ ملے گا مرد کو اس کا دو گنا۔ یہ تقسیم محدود ہوگی بنی ہاشم اور مطلب میں غیروں کو اس میں سے نہیں دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قول ذوی القربی میں فقیر و غنی کی کوئی تیز نہیں ہے۔

أَمَّا الْخُمْسُ فَيُقَسَّمُ عَلَى ثَلَاثَةِ أَشْهُمٍ سَهْمٌ لِلْبَنَاتِ وَ سَهْمٌ لِلْمَسَاكِينِ وَ سَهْمٌ لِبَنَاتِ السَّبِيلِ يَدْخُلُ فِيهِ ذُو الْقُرْبَىٰ فِيهِمْ وَيُقَدَّمُونَ وَلَا يَدْخُلُ فِيهِمْ أَغْنِيَا لَهُمْ۔ وَقَالَ الشَّافِعِيُّ لَهُمْ خُمْسُ الْخُمْسِ يَسْتَوُونَ فِيهِ غَنِيَّتُهُمْ وَفَقِيرَتُهُمْ وَتُقَسَّمُ بَيْنَهُمُ لِلدَّكْرِ مِثْلُ حَقِّ الْأُنثِيَيْنِ وَيَكُونُ بَيْنَ بَنِي هَاشِمٍ وَبَنِي الْمُطَلَبِ دُونَ غَيْرِهِمْ يَقُولُ تَعَالَىٰ وَ لِذِي الْقُرْبَىٰ مِنْ غَيْرِ فَضْلٌ بَيْنَ الْعَتَىٰ وَ الْفَقِيرِ۔

اب سوچنے (اور شرمانے) کی بات یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق تھا اور بعد میں وہ معصوم کے فعل کے مطابق بھی ثابت ہوا۔ اور امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا مذہب بھی یہی قرار پایا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کا کیا جواز اور کیا گنجائش رہ جاتی ہے،

یہی بات شافعی مسلک کے خلاف ہوئیگی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے مقلد تو تھے نہیں کہ اس بہانے ان کو بدعت طعن بنایا جائے! اور پھر احناف و امامیہ آپ کے طرز عمل کے موید ہیں تو شافعیہ کی مخالفت سے کیا ڈرنا۔ اب غور طلب یہ مسئلہ رہ گیا کہ جب دینے اور نہ دینے کی دونوں روایات صحیح ہیں تو ہر دو قسم روایات میں تطبیق کی صورت کیا ہو تو ان میں تطبیق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) چونکہ محتاجوں کو دیتے تھے، اغنیاء کو نہیں دیتے تھے جن کو ملا انہوں نے کہا دیتے ہیں جبکو ملا وہ کہتے ہیں نہیں دیتے تھے! (۲) نفی و اثبات دینے کی وجہ اور طریقہ سے متعلق ہے جس نے دینے کے متعلق کہا اس نے یہ مطلب لیا کہ مصروف کے مطابق دیا۔ اور

جس نے نہ دینے کے متعلق کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ وراثت کے طور پر نہیں دیا۔ اس صورت میں ہر دو قسم کی روایات اپنی اپنی جگہ صحیح درست ہیں! اور اس تطبیق کی دلیل یہ ہے کہ مفصل روایات میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خمس میں سے قربت داروں کا حصہ نکال کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے نام بنام خانہ بنانہ تقسیم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ یکمشت حضرت علی و حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سپرد فرماتے اور یہ ہدایت دیتے کہ اس میں سے فقرا کو دیں، یتیموں کا نکاح کرائیں، کنواریوں کی شادی کرائیں جن کے پاس خادم نہ ہوں ان کے لئے لونڈی غلام خرید دیں۔ بے گھروں کے گھر بنوا دیں شکستہ گھر والوں کے گھروں کی مرمت کرا دیں۔ بے سواری والوں کو سواری دلوادیں چنانچہ آپ کی خلافت کے آخر تک یہی معمول رہا۔ آپ کی حیات مبارک کا آخری سال تھا تو بدستور سابق دونوں حضرات کو بلوا کر فرمایا کہ خمس میں سے ذوی القربی کا حصہ لے لیں جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسال بنی ہاشم میں کوئی محتاج و حاجت مند باقی نہیں رہا۔ البتہ عام مسلمانوں میں فقرا کی تعداد بڑھ گئی ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس مال یہ حصہ بھی ان مسلمانوں کو دیا جائے۔ اس وجہ سے آپ کی خلافت کے آخری سال یہ حصہ ذوی القربی میں تقسیم نہیں ہوا۔ اگر چہ اس مجلس سے اٹھنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ٹوکا کہ تم نے ایک غلطی کی تم کو وہ مال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے لینے قبضہ میں لیکر فقرا و مسکینوں میں اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا چاہئے تھا۔ ہو سکتا ہے بعد کے خلفاء تمہارے اس فعل کو مستند بنالیں اور یہ کہہ کر تم کو اس کے دینے سے انکار کر دیں کہ تم تو خود ہی اس کو موقوف کر چکے اور لینے سے انکار کر چکے ہو!

اب ہر سہ مذاہب (حنفی، شافعی، امامی) کی روشنی میں مسئلہ خمس کی تفصیلی حیثیت ملاحظہ فرمائیے!

شیعوں کے نزدیک جو شخص امام ہو وہ آدھا خمس خود لے لے، اور آدھا یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو بقدر حاجت و ضرورت بانٹ دے ان کے نزدیک سات چیزوں میں خمس واجب ہوتا ہے۔

۱) وہ مال غنیمت جو حربی کا فروں سے ہاتھ لگے خواہ کتنا ہی ہو (۲) کوئی کان ہو مثلاً فیروزہ، تابانہ، سونا، چاندی، گل اڑنی، یا کسی بھی قسم کی ہو۔ البتہ اس کے ضروری اخراجات مثلاً کھدائی، صفائی وغیرہ کر کے باقی ماندہ کی قیمت میں مشغال شرعی سونے جتنی ہو (۳) دریا و سمندر سے غوطہ زنی سے جو کچھ حاصل ہو (۴) حلال و حرام مال جو آپس میں رل رل جائیں (۵) وہ زمین جو آدمی نے مسلمانوں سے خریدی ہو۔ (۶) جو دینہ زمین سے نکلے اور (۷) وہ نفع و فائدہ جو تجارت، زراعت، حرفت یا ان جیسے کسی پیشہ سے حاصل ہو جب یہ فائدہ اس شخص کے کل سالانہ اخراجات سے بڑھ جائے تو اس کا خمس دیا جائے!

حنفیہ کے نزدیک پورے خمس کے تین حصے کئے جائیں گے۔ ان تین میں سے دو حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کئے جائیں گے، البتہ یہ لحاظ رکھا جائے کہ پہلے ہاشمی، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو دیا جائے۔ ان سے بچ جائے تو پھر عام مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم ہو۔ اور احناف کے نزدیک خمس تین چیزوں میں واجب ہوتا ہے، (۱) مال غنیمت، (۲) کان منکبغ۔ (وہ کان جس سے نقش و نگار آرائش و زیبائش وغیرہ کی اشیاء نکلتی ہوں) جیسے سونا، چاندی، تابانہ، لڈانگ پارہ وغیرہ، (۳) زمین سے نکلنے والا دینہ خزانہ!

اور شوافع کے نزدیک خمس کے پانچ حصے کئے جائیں ایک حصہ بنام رسول خلیفہ و وقت کو دیا جائے۔ دوسرا بنی ہاشم و بنی مطلب کے امیر و غریبہ میں بطریق میراث کہ مرد کو دو حصے اور عورت کو ایک حصہ، برابر تقسیم کیا جائے (یعنی امیر و غریبہ میں کوئی فرق نہ کیا جائے) باقی ماندہ تین حصے عام مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کئے جائیں۔ ان کے نزدیک خمس دو چیزوں میں واجب ہوتا ہے۔ (۱) مال غنیمت۔ (۲) زمین سے برآمد ہونے والا خزانہ! اب اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقسیم کو ان ہر سہ مذاہب مابعد پر

جانچیں تو بظاہر حقیقہ اور اکثر امامیہ کے مذاہب سے بہت ملتی جلتی صورت نظر آئیگی۔ کہ یکشت حضرت عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سپرد کرتے۔ بنی ہاشم کے ہر شخص کو تقسیم نہیں کرتے تھے۔

اعتراف ۱۰ یہ ہے کہ دین میں آپ نے ایسی نئی باتیں نکالیں جن کا پہلے وجود نہ تھا۔ مثلاً باجماعت ترلوچ کہ جو خود ان کے اعتراف سے بدعت ہے! اور متفق حدیث یہ ہے کہ **مَنْ أَخَذَ فِيْ أَمْرِنَا هَذَا أَمَّا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ كَوَيْلٍ وَكَلِّدٌ مِّنْ عَدُوِّ صَلَاحٍ** جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے، اور ہر نئی نکالی ہوئی بات گمراہی ہے،

ان مسکینوں کا وہ حال ہے کہ انکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ اب انہیں پتہ نہیں کہ ہم غلط سلط کیا کہہ رہے ہیں کس کو کہہ رہے ہیں بات میں وزن بھی ہے یا نہیں یہی کیفیت اس طعن میں ہے اگر انکھیں کھول کر انہوں نے اپنی ہی کتابیں پڑھی ہوتیں تو معلوم ہو جاتا کہ اس طعن سے اہل سنت کو الزام نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ خود انہیں کی کتب حدیث سے بطریق شہرت و تواثر یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں تین رات ترلوچ باجماعت ادا فرمائیں، دیگر توافل کی طرح ان کو تنہا ادا نہیں فرمایا اور ترک جماعت پر بطور عذر یہ فرمایا: **إِنِّيْ خَشِيتُ أَنْ يَقْرَءَ مِنْ عَلَيْنَا**۔ ملاومت کی وجہ سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ تم پر فرض نہ کر دی جائے۔

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد فرضیت کا خدشہ نہ رہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کلمت ثابتہ کا اجراء و احیاء فرمایا! سنیوں اور شیعوں دونوں کے ہاں یہ اصولی قاعدہ مقرر و موجود ہے کہ جو حکم نصی شائع کے مطابق کسی عذر علت اور سبب سے مقید ہو۔ توجب وہ عذر علت باقی نہ رہے تو وہ حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکو بدعت کہا تو گویا بدعت کا اعتراف کر لیا۔ تو دراصل یہ بھی ان کی سمجھ کا پھیر اور عناد کا مظہر ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ فرمایا تھا **نَعَمْتُ الْبِدْعَةُ هَذِهِ**۔ کیا یہی اچھی نئی بات ہے! تو اس کا مطلب یہ تھا کہ باجماعت ادائیگی پر ہمیشگی نئی بات ہے۔ اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا مبارک پہلے سے معلوم تھا کہ عذر نہ ہوتا تو آپ کے نزدیک اس پر ملاومت پسندیدہ و مرغوب تھی اس لئے موانع اور عذر اٹھ جانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند فرمودہ طریقہ کا اجراء آپ کے ذریعہ ہو رہا ہے تو آپ کے لحاظ سے تو نئی بات ہے مگر منشا رب نبوت کے مطابق ہونی کی وجہ سے یہ نئی بات اچھی ہے اسے برا اور گمراہی کی بات کہنے کی کون مسلمان جرأت کر سکتا ہے! یہ حقد مراتب کی بات ہے۔ اسے معاند و حاسد اور بدگو کہ سبھی کہہ سکتا ہے یہی ایک بات نہیں اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو جناب رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہ تھیں مگر خلفاء و ائمہ کے وقت میں اجماع امت سے ان کو وجود ملا۔ ان کو بدعت نہیں کہیں گے اور اگر کسی کو بدعت کا لفظ بہت ہی خوب ہو تو اسے اجازت ہے کہ **حَسَنَ** کے لافحہ کے ساتھ اسے بدعت **حَسَنَ** کہہ لے،

مگر بدعت سیئہ کہنے کا اصول شرع کی روشنی میں اسے نہ حق ہے نہ اس کے پاس جواز! اس لئے کہ حدیث نئی بات اس چیز کے ساتھ مخصوص ہے جسکی نہ شریعت میں کوئی اصل و بنیاد ہو نہ خلاق و ائمہ اور اجماع امت سے اس کا ثبوت ملتا ہو! اور اگر اس بات کو یہ شیعہ نہ مانیں۔ تو ان کی عید غدیر، جشن و تعظیم نوروز، قتل عمر کے دن نماز و سرت شکرانہ۔ لونڈیوں کی شرمگاہوں کی حلت۔ بعض اولاد کو ترکہ سے محروم کرنے کا فعل وغیرہ کا کیا بنے گا۔ (یہ تو صورت و حقیقت دونوں لحاظ سے بدعات سیئات ہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تو کسی ذہن میں ان کا تصور تک بھی نہ تھا۔ ان کا گمان غاسد ہے کہ یہ تمام امور ائمہ نے نکالے اور اختراع کئے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اہل سنت کے نزدیک خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ائمہ کا درجہ اور حکم رکھتے ہیں۔ (اور ان کا یہ دعویٰ تمہارے دعوں کی طرح بے اصل و بے دلیل نہیں بلکہ اس پر ایک مشہور حدیث کی دلائل بھی موجود ہیں۔

مَنْ يَغْتَسِلُ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَدَىٰ اخْتِلَافًا كَثِيرًا أَفْعَلِيكُمْ
بِمُنْتَقَىٰ وَسُنَنِهِ الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدِينَ مِنْ بَعْدِي عَقَبُوا
عَلَيْهَا يَا التَّوَّاجِدِ - تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا اسے بہت اختلاف نظر میں
گے۔ اس وقت تم میری سنت اور میرے بعد کے خلفائے راشدین کی
سنت پر عمل لازم ہے، اس کو دانت گرد و کر بکھڑو۔

لہذا معلوم ہو گیا کہ خلفائے راشدین کی نکالی ہوئی بات بدعت کہہ کر رد کرنے کی چیز نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی
مانند مضبوطی سے تھامنے والی لائق عمل سنت ہے۔

اعتراف (۱) شیعہ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ اِنَّ عَمَّهُ قَضَىٰ فِي الْحَدِيثِ مَائَةَ قَضِيَّةٍ - عمرؓ نے دادا کی میراث کے بارے میں
سو فیصلے نافذ کئے! لطیفہ ملاحظہ ہو کہ یہی عبارت نواصب نے جناب اعلیٰ مرقفی رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھی ہے اب پتہ نہیں
اس جھوٹ گھڑنے میں پہل کس نے کی۔ اور سزا نامہ اپنے من پسند نام ٹانگ دئے۔ ممکن ہے جس استاد کے دونوں شاگرد ہیں اسی نے گھر
کو ہر ایک کے حوالہ کر دی ہو۔ البتہ اہل سنت کے ہاں یہ روایت قطعی موجود نہیں! اس لئے انہیں اسکی طرف نہ توجہ کی ضرورت ہے نہ
جواب کی فکر! اما یہ چونکہ روایات میں اختلاف اور رد و بدل کے عادی مشہور ہیں اس لئے اس کی جھلک یہاں بھی موجود ہے کسی
نے یہ روایت (ج) سے کی ہے تو کسی اور نے (ح) سے، اور بعض روایات میں "حد الخمر" کے الفاظ ہیں۔ (دہر حال یہ حق
کا معاملہ ہے اگر یہ "خدا کو مچھرا" کر دیں تو آپ کیا کریں گے۔ ن)

قاعدہ کے مطابق تو اس اعتراف کے جواب دینے کے ہم پابند نہیں۔ تاہم اپنے ان ہریانوں، کی خاطر فرضی طور پر اسے مان لیں تو
حد خمر، والی روایت پر تو ہمیں اعتراض کی کوئی بات نظر نہیں آتی اس لئے کہ اس وقت تک کتاب و سنت میں اسکی کوئی حد مقرر نہ تھی۔
اس لئے صحابہ کرام کے دلوں میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مختلف خیالات و تباہ ویز ہوتی تھیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کسی آخری نتیجہ
پر پہنچنے کے لئے ہر ایک کی رائے اور خیال جانچتے اور پرکھتے رہتے رہے! اور جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں حضرت
علی مرقفی و جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی رائے با صواب پر اجماع منعقد ہو گیا۔ تو اختلاف قضیہ کا سوال ہی نہ رہا۔

اور اگر یہ جیم سے جد ہے تو یہ ان کا کھلا جھوٹ ہے اس لئے کہ جد کی میراث کے بارے میں تو اختلاف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
کی خلافت کے عہد میں بھی تھا۔ اس بارے میں صحابہ کرام مختلف خیالات تھے۔ بالآخر معاملہ دو اقوال پر ٹھہرا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ
کا قول تھا کہ اسے باپ کی جگہ تصور کریں۔ اور دوسرا قول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا کہ اس کو بھی ایک بھائی سمجھ کر شریک
میراث کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں اقوال کی ترجیح میں متردد تھے۔ آپ کا رجحان قول صدیق رضی اللہ عنہ کی ترجیح کی جگہ
تھا۔ اس سلسلہ میں آپ ہارے حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت نیز دوسرے کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے گھروں
پر گئے دونوں جانب گفت و شنید ہوئی بحث و مباحثہ ہوا دلیلیں دی گئیں، اور یہ بات کسی طرح بھی عیب شمار نہیں کی جاسکتی۔

یہ تو مفاد ملت کے لئے مسئلہ کی تعین کا قابل تعریف عمل تھا۔ ایسی صورت میں سنیکڑوں دلیلیں دی جاتی ہیں، ہر دلیل کا مدعا اور قضیہ
جد ہوتا ہے، اس پر طعن کرنا انتہائی نادانی اور کورزدوقی کے سوا کچھ نہیں۔ اس بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں حضرت زید بن ثابت کا قول
آپ کے نزدیک قابل ترجیح قرار پایا۔ صورت مسئلہ کی تشریح و تعلیم کے لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کو اپنے گھر لے گئے،
وہاں آپ نے ایک نہر کھودی، اس میں سے شاخیں، شاخوں میں سے نالیاں نکالیں اور اس نہر میں اس انداز سے پانی چھوڑا کہ تمام
شاخوں اور نالیوں میں پہنچے گا۔ پھر ایک ذیلی نالی کا منہ بند کر دیا تو اس کا پانی پلٹ کر پیچ کی نالی میں آگیا اور اسی مسامی سطح والی
نیر اس سے نیچے والی نالیوں میں بہنے لگا مگر اوپر والی نالی میں نہیں چڑھا! اس تصویر و تمثیل سے یہ ثابت ہو گیا کہ دادا سے بیٹے کو اور

بیٹے سے بیٹوں کو جو کچھ پہنچا۔ وہ اس سلسلہ کے رک جانے سے دوبارہ سارے کا سارا تنہا دادا کو واپس نہیں پہنچے گا دادا کی قربت اپنی جگہ پر ایک الگ قربت ہے اور بھائیوں کی قربت الگ۔ ایک دوسرے کی قربت باہم کسی دوسرے قربت کو باطل نہیں کرتی۔ اس قلیل سے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کی تریج پر مطمئن ہو گئے!

اعتراف (۱) آپ نے عورتوں سے متعہ کرنے اور حج تمتع کرنے سے منع کیا حالانکہ یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جاری تھے، اس طرح آپ نے گویا خدا کے حکم کو منسوخ اور اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا۔ اور کتب اہل سنت میں آپ کا یہ اعتراف باس الفاظ موجود ہے۔ **مَنْعَتَانِ كَانَتَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا أَنْهَى عَنْهُمَا** دو طرح کے جو متعہ عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں رائج تھے میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں!

جواب۔ اہل سنت کے نزدیک حدیث کی صریح ترک تب مسلم میں بروایت سلمہ بن اکوع سیرہ بن معبد جہنی نیز دیگر صحاح میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یوں مروی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو حرام قرار دینا تھا۔ صرف تین یوم کے لئے اجازت دی تھی پھر یہ حرمت تاقیم قیامت قرار دیدی گئی تین دن کی اجازت بھی جنگ اوطاس کے موقع پر دی گئی تھی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعہ کے حرام ہونے والی روایت تواتر اور مشہور ہوئی کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد اور محمد بن الحنفیہ کی ساری اولاد اس روایت کو بیان کرتے چلے گئے اور موسیٰ، بخاری و مسلم اور دوسری متداول اور مستعمل کتابوں میں بہت سی سندوں کے ساتھ یہ روایات منقول ہیں۔

شیعوں نے ان روایات میں یہ شبہ ڈالا ہے کہ یہ حرمت غزوہ خیبر کے وقت تھی پھر جنگ اوطاس کے وقت دوبارہ حلال کر دیا گیا۔ مگر ان کی شرارت نہیں تو بے خبری پر مبنی و محمول ہے۔ ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو دراصل غزوہ خیبر کو خالگی گدھوں کے گوشت کی حرمت کی تاریخ ٹھہرایا گیا ہے حرمت متعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ بجا رہے ہیں اس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کی حرمت کی تاریخ خیبر ہی ہے، اسی قسم کو بعض محققین نے نقل کرتے ہوئے کہہ دیا ہے۔ **نَهَى عَنْ مُنْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ**۔

لیکن اگر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس روایت میں تحریم متعہ کو خیبر کی تاریخ سے متعین فرماتے تو آپ کا ابن عباس رضی اللہ عنہما پر رد الزام درست کیسے ہوتا۔ حالانکہ جب آپ نے ان کو الزام دیا تو یہی روایت پیش کی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو متعہ جائز سمجھنے پر ان الفاظ سے ڈانٹا جھڑکا! **إِنَّكَ دَجُلٌ نَاتِلَةٌ عَرْتَمَ** ایک پاگل آدمی ہو! لہذا جو شخص تحریم متعہ کی تاریخ غزوہ خیبر بتاتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے غلط استدلال کا مدعی ہے۔ اور یہی دعویٰ اسکی جہالت و حماقت پر گواہی کیلئے کافی ہے اہل سنت کی ایک جماعت نے جناب عبد اللہ اور حسن محمد بن الحنفیہ رحمہما اللہ کے دونوں صاحبزادوں سے روایت کی ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے بیان کی کہ آپ نے فرمایا۔ **أَمَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أُنَادِيَ بِتَحْرِيمِ الْمُنْعَةِ** مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کے حرام ہونے کی منادی کرنے کا حکم فرمایا! پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک یا دوبارہ متعہ حرام قرار پایا جس کو اس کی اطلاع ہو گئی وہ اس سے رک گیا۔ اور جسے خبر نہ ہو سکی وہ نہ رکا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد آیا اور یہ معلوم ہوا کہ بعض جگہ یہ فعل ضرورت کی حد سے نکل کر رواج اور فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ تو آپ نے اس کی حرمت بیان فرمائی اور احکامات ریاست کی طرح اسکو شہرت دی۔ اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا۔

یہاں تک کہ بالآخر اس کی حرمت ہر خاص و عام کے علم میں بھی آگئی اور ذہن نشین بھی ہو گئی، کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکی حرمت بیان فرما چکے ہیں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلام سے یہی تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ عمل ہوا۔

اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ وہ حلال سوئیکی شکل میں رائج بھی ہو یا اس کے حلال ہونے کا حکم باقی بھی ہو، پھر اگر احادیث و روایات سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو قرآنی آیات سے صراحتاً اسکی حرمت کا پتہ چلتا ہے۔ ان آیات میں شیعہ تاویلات سے اگر کام لیا جائے، جیسا کہ سابق اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ تو ان سے آیات کی تحریف لازم آتی ہے۔ متعدد ولی عورت کو یہ بیوی کیسے ثابت کر سکتے اور یہ درجہ اس کو کیسے دے سکتے ہیں، جبکہ بیوی کے احکام مثلاً عدت، طلاق، ایلا، ظہار، اس سے صحبت سے درجہ حصان کا حصول۔ امکان لعان اور وراثت، خود شیعوں کے نزدیک بھی اس پر لاگو اور منطبق نہیں ہوتے، اور یہ ایک عام فطری عہدہ ہے کہ جب خبر پائی جاتی ہے تو وہ اپنے تمام لوازم کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اور البصیر نے اپنی صحیح میں جناب ابی عبد اللہ صادق رحمہ اللہ علیہ سے یوں روایت کی ہے کہ **أَنَّ سُبُلَ الْمُتَعَلِّقِ أَحَىٰ مِنَ الْأَرْبَعِ قَالَ لَا وَلَا مِنَ السَّبْعِينَ**۔ آپ سے متعہ کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ چار میں داخل ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں نہ چار میں نہ ستر میں۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متعہ، بیوی شمار نہیں ہوتی ورنہ چار میں ضرور شامل ہوتی۔ اور قرآن مجید میں جہاں کہیں عورتوں سے نفع اٹھانے کو جائز و حلال قرار دیا ہے وہیں احسان اور سفاح کی قید لگائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ **وَأَحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِمَا مَلَكَتُمْ** **مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ**۔ **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْنَهُنَّ أَجُورَ** **هُنَّ مُحْصَنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ**۔ امدان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں بھی تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں اگر مل کے بدلہ تم ان کو حاصل کرنا چاہو تو بیوی بناؤ۔ مستی نکالنے کے لئے نہ اپناؤ، نہ رائج تمہارے لئے حلال کی گئیں، مسلمان پاکدامن عورتیں بھی، اور ان قوموں کی پارسا عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، جبکہ تم ان کو ان کا معاوضہ دہر دے دو اور مقصد بھی، بیوی بنانا ہو نہ کہ شہوت رانی،

اخذ ظاہر ہے متعہ میں احسان (بیوی پن) نہیں ہے۔ اور خود شیعہ بھی اس کو احسان کا سبب نہیں سمجھتے! نہ غیر شادی شدہ متعہ کرنے والے پر حد برہم لگاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ متعہ کرنے والا مسافح (صرف سستی نکالنے والا) ہے کہ اسکی عزم من ماعود دافق، زاجھت پانی نکالنا۔ اور اس پانی کے مقامات کو خالی کرنا ہے۔ نہ اس سے مقصد گھریساں ہوتا ہے۔ نہ حصول اولاد، اور عزت و ناموس کی حفاظت، و غیرہ: اہل سنت کے مقابلہ میں حجت و دلیل کے طور پر شیعوں کے پاس بے دے کہ صرف یہ آیت ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَلَا أَجُورَ عَلَيْكُمْ قَوْلُفِيْنَهُ۔ پھر صریحاً تم ان سے منتفع ہونے ہو تو ان کا جو ہر مقرر ہوا ہے وہ ادا کرو! اور اسکی بابت ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ متعہ کے حلال ہونے پر ہرگز دلالت نہیں کرتی، اور استمتاع سے مراد فعل نہ وجیت ہے جس پر لفظاً دلالت کرتی ہے اور ایک کلام کے دوسرے کلام کے بعد آنے یا اس کے کلام سابق پر موقوف ہونے کو بتاتی ہے۔ اور اس سے پہلے کی آیت میں نکاح اور ہر کا ذکر ہے! اور یہ لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کر کے یہ بات کہتے ہیں کہ یہ حضرات اس آیت کو **فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ** (الی اجل مسمى) پر مسمیٰ تھے جس سے صاف متعہ کا پتہ چلتا ہے۔ تو ان کا یہ قول ہفوات کے ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا منقول لفظ رالی اجل مسمى) بالاجماع قرآن موجود نہیں۔ اور قرآن کے متواتر ہونے پر ہر دو فرقے شیعہ و سنی متفق ہیں۔ نہ یہ حدیث پیغمبر ہے۔ تو اب حجت و دلیل میں یہ کیا پیش کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جوابات یہ کہہ سکتے ہیں یہ ہو سکتی ہے کہ یہ روایت شاذہ فلسفہ کہیں۔ اور منسوخ شدہ شاذ روایت کو جسکی صحیح سند مفقود ہو قرآن حکم یقینی کے مقابلہ پر لانا۔ اور قرآن حکم یقینی کو اس کی وجہ سے ترک کرنا اور نظر انداز کرنا کس عقلی توجیہ کی بنا پر قابل توجہ ہے۔

اور پھر شیعہ دینی دونوں میں یہ امولی قاعدہ مقرر طے شدہ ہے کہ حلت و حرمت کی دو دلیلیں جو قوت و یقین میں مساوی ہوں باہم متضاد و متعارض ہوں تو حرمت کے حکم کو مقدم رکھنا چاہئے! لیکن یہاں تو یہ دلیل متعارض نہیں بلکہ ایک صریح کذب اور جھوٹ ہے، اس لئے کہ اس قرأت کو نہ تو اب تک کسی نے سنا ہے نہ سب و عجم میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں قرآنی نسخوں میں سے کسی میں یہ عبارت دیکھی گئی۔ تو پھر اباحت کو کیسے مقدم رکھ سکتے ہیں! اور یہ لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت سے جو یہ کہتے ہیں کہ آپ متعہ کو جائز سمجھتے تھے۔ تو اے کاش! یہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کے تمام مسائل پر کاربند ہوتے تو کم از کم صراطِ مستقیم پر لو قائم ہوتے۔ لیکن یہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما اس مسئلہ پر فرماتے کیا تھے۔ قصہ خود جناب المحترم رضی اللہ عنہ کی تصریح کے مطابق یوں ہے کہ آپ فرماتے تھے متعہ ابتداءً عہد اسلام میں مطلقاً مباح تھا اور اب صرف مجبور کے لئے ایسا مباح ہے جس طرح کسی کیلئے خون، خنزیر اور مردار، جاری۔ بطریق خطابی حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت بیان کرتا ہے کہ: قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ لَقَدْ سَأَرْتُ بِقَتِيلِ بْنِ الدَّكْبَانِ وَ قَاتُوا فِيهَا شَعْرًا قَالَ وَمَا قَاتُوا قُلْتُ قَاتُوا۔

قُلْتُ لَشَيْخٍ لَنَا طَالَ مَجْلِسُهُ يَا شَيْخُ مَهْلُكَ لَكَ فِي قَتِيلِ بْنِ عَبَّاسٍ فِي مَعْنَى مَخْصِيَةِ الْخَطَرِ اِنْ سَأَلْتُكَ لَكُنْ مَشْهُوًّا وَ حَقِّي مُصَدِّقُ النَّاسِ۔ فَقَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ مَا بَعْدَ اَفْتِيَتِ اِنَّمَا هِيَ كَالْمَيْتَةِ وَ الدَّمِ وَ لَحْمِ الْخَنَازِيرِ۔ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا سو اوروں نے آپ کا فتویٰ مشہور کر رکھا تھا۔ اور اس پر اشعار بھی کہے ہیں، آپ نے پوچھا وہ شعر کیا ہیں میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب شیخ کی مجلس طویل ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو ابن عباس کے فتوے کے مطابق ایک نازک اندام لطیف و نرم بدن اور خود سپرد عورت میں کوئی رغبت ہے جو لوگوں کی واپسی تک آپ کا ٹھکانا ہو آپ نے فرمایا بہت خوب، میں نے تو یہ فتویٰ نہیں دیا وہ متعہ، مردار، خون، اور خنزیر کی طرح ہے،

جامع ترمذی میں امام ترمذی رحمہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں روایت کی ہے۔

قَالَ اِنَّمَا كَانَتْ الْمُتْعَةُ فِي اَوَّلِ الْاِسْلَامِ كَانَ الدَّجَلُ يَقْدُمُ الْبَلَدَ لَا يَكُنْ لَهُ بَهَا مَعْرِفَةُ قِيَمَتِ زَوْجِ الزَّوْجَةِ بِعَدْرِ مَا يَرَى اَنَّهُ يَقِيْمُهُ بِعَافٍ فَحَفَظَ لَهُ مَتَاعَهُ وَ تَصَلَّحَ لَهُ شَيْئُهُ حَقًّا اِذَا نَزَلَتْ اِلَيْهِ اِلَّا عَلَى اَرْوَاحِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا حَرَامٌ۔

آپ نے فرمایا ابتداءً عہد اسلام میں متعہ تھا (ہو یا نہ تھا) کوئی شخص شہر و قصبہ میں اپنے کام سے آتا تھا وہاں کسی سے اس کی جان پہچان نہ ہوتی تو وہ کسی عورت سے اپنی ریت قیام کا یقینی کر کے شادی کر لیتا تھا جو اس کے سامان کی حفاظت کرتی اور اس کی ہر چیز درست رکھتی تا آنکہ یہ آیت نازل ہوئی تب حضرت نے فرمایا۔ صحبت کی ان دو صورتوں کے علاوہ ہر طریقہ حرام ہے!

یہ تو صورتوں کے متعہ کا حال تھا، اب رہا متعہ الج، یعنی اشہرج میں ایک ہی سفر میں یا ایک ہی احرام میں حج و عمرہ کرنا، جو حج متعہ یا حج قرآن کی صورت میں اس سے آپ نے ہرگز منع نہیں فرمایا۔ یہ آپ پر افتراء یا بہتان ہے۔ البتہ آپ اسکو اولیٰ سمجھتے تھے کہ آدمی آئے عمرہ کرے اور گھر لوٹ جائے۔ اور پھر آئے اور حج کرے۔ دوسرے معنوں میں حج کی تینوں قسموں میں سے آپ حج افراد کو اولیٰ سمجھتے تھے! اب بھی امام شافعی سیفیان ثوری اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کے نزدیک حج افراد ہی افضل ہے۔ بعض اور فقہا کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور اس افضلیت کی دلیل آیت۔ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ حج و عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو، ہے اور انعام کے معنی تفسیر آیت میں یوں مذکور ہیں اِنَّمَا مَعَهَا اَنْ تُحْمَدَ بِهَا مِنْ دُونِ ذِي اَهْلِيكَ۔ (ان دونوں کے تمام کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اہل بیوی بچے) کی قیام گاہ سے دونوں کا احرام باندھے، (یعنی عمرہ کر کے گھر آئے پھر گھر سے احرام باندھ کر حج کو جائے!) پھر آگے ارشاد ہے۔

فَعَمَلٌ تَمْتَعُ بِهَا الْعُمْرَةُ إِلَى الْحُجَّةِ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (پس اگر کوئی عمرہ کا فائدہ حج کے ساتھ اٹھائے تو اسے چاہئے کہ مطابق گنجائش ہدی واجب ساتھ لے جائے) ہدی، یا قربانی تمتع پر فرض ہے جبکہ مفرد پر فرض نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمتع میں کوئی ایسی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے ہدی کو واجب قرار دیا۔ اور تمام شرعی فرائض پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حج میں ہدی۔ قصور کی بنا پر ہی واجب ہوتی ہے۔ ہدی کے ساتھ تمتع و قرآن بھی جائز ہے۔ اور حدیث مبارک سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج افراد کو تمتع و قرآن دونوں زیاد پسند فرمایا اس کی افضلیت کی واضح دلیل ہے، اس لئے کہ آپ نے حجة الوداع کے موقع پر حج افراد ہی ادا فرمایا۔ اور عرۃ القنطار اور عمرہ جعزانہ کے وقت صرف عمرہ ہی فرمایا۔ حالانکہ عمرہ جعزانہ کے موقع پر آپ نے فرصت بھی پائی مگر آپ نے حج نہیں فرمایا اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے، اور عقلاً بھی حج و عمرہ دونوں کی افرادی ادائیگی ہی افضل معلوم ہوتی ہے کہ ہر ایک کے لئے احرام اور ادائیگی کے لئے جدا جدا سفر تنکیوں کے دو چند ہونے کا سبب ہو گا۔ جیسے ہر نماز کے لئے تازہ وضو کا مستحب ہونا۔ یا ہر نماز کے لئے بجائے سکونت سے مسجد میں جانا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس متعۃ الحج کو منع فرمایا اور اسے جاری نہ رکھا وہ متعۃ الحج دوسرے معنوں میں ہے یعنی حج کو فسخ کر کے عمرہ ادا کرنا اور بلا عذر عمرہ کے لئے حج کے احرام سے نکلنا۔ اور اسی پر امت کا اجماع ہے کہ اس قسم کا متعۃ الحج بلا عذر حرام ہے یاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مصلحتاً فیجہ کر لیا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس عمل سے جاہلیت کی ایک ناروا اور غلط رسم کو توڑنا تھا۔ ایام جاہلیت میں وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کو بدترین گناہ سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے اِذَا عَفَى الْاَثَرُ وَبَرَأَ الدُّبُرُ وَالسَّخِ الْصَفْرُ حَلَلَتِ الْعُمْرَةُ لِمَنْ اَعْتَمَسَ۔ جب نشانات قدم مٹ جائیں سو اگر کسی پلٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا ہیمنہ گزر جائے تو عمرہ کرنے والوں کے لئے عمرہ حلال ہو جاتا ہے۔

چونکہ یہ عمل مصلحتاً تھا اس لئے اسی وقت وزمانہ کے لئے مخصوص تھا، دوسروں کے لئے یہ جائز نہیں کہ بلا غدر و فسخ کریں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نیز دیگر صحابہ کی روایت سے یہ تخصیص ثابت ہے چنانچہ مسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کانت المصلحة في الحج لاصحاب محمد خاصة (مصلحة الحج اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا) اور نسائی نے حارث بن بلال رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی ہے کہ قال قلت يا رسول الله فسخ الحج لنا خاصة ام لئلا نسا عامة فقال بل لنا خاصة (میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ فسخ حج ہمارے لئے خاص ہے یا عام امت کے لئے بھی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ہمارے لئے ہی مخصوص ہے، نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے،

مازری کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس متعہ سے حج کے زیارۃ میں روکا ہے اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ عمر کے لئے حج فسخ کرنے کی صورت ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت جابر، عمران بن حصین اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ متعہ جس میں اختلاف ہے وہ عمر کے لئے حج فسخ کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسا کرنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی گوشمالی بھی کر دیتے تھے صرف متعہ پر نہیں مارتے تھے، یعنی اشہر حج میں عمرہ کرنے پر!

قَالَ الْمَازِسِيُّ اخْتَلَفَ فِي الْمَسْجِدِ الَّتِي نَهَى عَنْهَا عُمَرُ فِي
الْحَجِّ فَقِيلَ فَسُئِلَ الْحَجَّاجُ إِلَى الْعُمْرَةِ وَقَالَ الْقَاضِي عِيَّاسُ
طَاهِرٌ حَدَّثَنِي جَابِرُ بْنُ عُمَرَ أَنَّ ابْنَ حُصَيْنٍ وَابْنَ مَوْسَى
أَنَّ الْمَسْجِدَ الَّتِي اخْتَلَفُوا فِيهَا إِنَّمَا هِيَ فَسُئِلَ الْحَجَّاجُ
إِلَى الْعُمْرَةِ قَالَ وَلِهَذَا كَانَ عُمَرُ يُضَرِّبُ النَّاسَ
عَلَيْهَا وَلَا يُضَرِّبُهُمْ عَلَى مُجَدِّدِ التَّمَتُّعِ أَيْ الْعُمْرَةِ فِي
أَشْهُرِ الْحَجِّ -

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان انا انھی عنھما اس کا مطلب یہ ہے میں جو تمہارا والی و حاکم ہوں منع کرتا ہوں کہ تمہارے دلوں پر خاطر خواہ اثر ہو، کیونکہ میں دینی معاملات میں جو سختی برتتا ہوں تم کو بخوبی اندازہ ہے، اس لئے اس معاملہ میں تساہل نہ برتنا۔ رہا معاملہ اصل نبی اور ممانعت کا سو قرآن مجید اور حدیث مبارک دونوں سے وہ پہلے ہی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

فَمَنْ ابْتَغَىٰ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ حُمُّ الْعَادُوْنَ (ان مذکورہ صورتوں کے علاوہ اگر کوئی اور صورت اختیار کرنا چاہے پس وہ حرمہ تجاوز کرنے والے ہیں) یا وَاتَّقُوا الْحُجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰہِ حج و عمرہ دونوں اللہ کے لئے پورے کرو! مگر بعض لوگ اپنی لاپرواہی سے اور بعض دوسرے اپنی سرکشی اور فسق کی بنا پر قرآن و حدیث کا حکم کم ہی خاطر میں لاتے ہیں۔ ان کو حدود میں رکھنے اور سنی و کبی ہوئی بات پر کان دھرنے کے لئے صاحب اقتدار کا جبر اور سختی درکار ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ مقولہ مشہور ہو گیا ہے کہ بادشاہ قرآن کی نسبت زیادہ بندوبست کرتا اور احکامات پر عمل کرتا ہے،

قاروق اعظم گمانی کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی اسی نکتہ پر مبنی ہے کہ ممانعت تو قرآن و حدیث کے کچھ، اب ان پر عمل میں کراؤں گا اس لئے میں ان دونوں باتوں کو ملحوظ نہ رکھتا ہوں۔

حضرت عثمان غنیؓ پر اعتراضات

اور ان مطاعن و اعتراضات کی کل تعداد دس ہے۔

اعتراض (۱) پہلا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں پر ایسے والی و حاکم مقرر فرمائے جن سے ظلم و زیادتی اور خیانت سرزد ہوئی اور ناشائستہ امور کے وہ مرتکب ہوئے مثلاً ولید بن عقبہ جس نے شربابی اور سستی ہی کی حالت میں صبح کی نماز کی امامت بھی کی۔ اور دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھائیں اور کہا کہ دو رکعت میں تمہارے پڑھنا ہوا اور جناب معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو چاروں صوبوں کا تختہ بنا دیا بالآخر وہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ جناب امیر (رضی اللہ عنہ) کے محمد میں نہ ہونے والی باتیں ہوئیں۔ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا والی بنایا۔ اور اس نے لوگوں پر اتنے مظالم کئے کہ لوگ تنگ آکر مدینہ منورہ پر چڑھ آئے اور بلوہ کیا! مروان کو اپنا وزیر اور نشی مقرر کیا، جس نے جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے دھوکہ کیا کہ خط میں قبولہ (انکی اطاعت کرو) کے بجائے اقتلوہ (ان کو قتل کر ڈالو) لکھ دیا۔ اور پھر اپنے حاملوں کی شکایات پر سکوت فرمایا اور ان کو معزول کرنے میں تامل سے کام کیا۔ اور نوبت یہ آگئی کہ لوگ ان کے ہاتھوں تنگ آ گئے اور آپ کے خلاف ان عاملوں کے طرز عمل کے ساتھ نفرت پھیل گئی۔ اور ان وقت ان کے معزول کرنے کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا بلکہ بالآخر قتل و غارت گری ہوئی جس کا کوئی نثارک نہ ہو سکا۔ اب جو شخص ایسا بد تدبیر ہو، جو امین و خائن اور عادل و ظالم میں تمیز نہ کر سکے نہ مردم شناس نہ وہ امامت کے قابل نہیں ہو سکتا۔“

جواب۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ امام کو یہ چاہیے کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھے اس کے وہی کام سپرد کرے۔ امام کے لئے علم غیب رکھنے کی شرط سوائے شیعوں ذہل سنت کے ماں ہے اور نہ ہی کوئی اور طبقہ و طائفہ اس کا قائل ہے! اور ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے حسن ظن رکھنا بھی اسلامی شعار ہے، اور جناب عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے یہی کیا، انہوں نے جس کو کام کا آدمی سمجھا اس کے سپرد ہی کام کیا جس کو اپنے حسن ظن سے امین و عادل و مطیع و اطاعت شعار دیکھا اسی کو امور سلطنت و ریاست سپرد کئے! معاویہ و مخالف فرقہ کی غوغا آرائی سے پہلے کرتا رہا کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے عمال و حکام خلیفہ سے محبت رکھنے کے علاوہ ان کے احکام کے تابعدار تھے۔ فوج کشی، اور دو دروازے دیار و امصار کے فتح کرنے میں معرکہ آرائی میں چاق و چوبند، اور بیدار مغزی میں نادرہ روزگار تھے۔ ان کے فتوحات اور ارق تاریخ پر ثبت ہیں! اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغرب میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ اندلس تک جا پہنچا تو مشرق میں کابل، بلخ اور روم میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ رومیوں سے خشکی پر بھی برد آ رہا ہوئے تو بحری لڑائیاں لڑ کر

بھی ان کو مفتوح کیا۔ خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عراق و نجد اور خراسان فتنہ و فساد کا گہوارہ رہ چکے تھے، ان کی اتنی مؤثر گوشمالی کی گئی کہ فتنہ و فساد کا نشان تک لوگوں کے دلوں سے مٹا ڈالا، اسلام کی اتنی شان و شوکت اور فتوحات کا یہ عظیم الشان سلسلہ تاریخ کے اوراق پر ثبت کرنے والا کیا اتنا ہی بودا تھا کہ وہ معمولی عمال حکومت سے عاجز آجاتا۔ اور ان کی گوشمالی نہ کر پاتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ وہ معاملہ چھوڑا ہو یا برطاحسن تدبیر سے حل فرماتے تھے، آپ کو امور جہانبانی سے بے خبری نہیں تھی، نہ وہ عوام کی نفسیات سے ناواقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ امراء و حکام کے بہت سے لوگ یوں ہی خواہ مخواہ بھی دشمن اور درپے آزار ہوتے ہیں، اور جھوٹی پسچی شکایتیں ان کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے لئے تو عدل و انصاف کا شور و غوغا بلند کئے رکھتے ہیں، مگر جن کے وہ خلاف ہوتے ہیں اسکو وہ فوراً پچھانسی چڑھوانا چاہتے ہیں، اس کے لئے عدل و انصاف کے معروف طریقے برتنے کے بھی روادار نہیں ہوتے، اہل سنت کے نزدیک نہ جناب خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ معصوم تھے۔ نہ ان کے عمال و حکام بے خطا۔ وہ بھی ان سازشیوں اور غوغائیوں کی طرح انسان تھے۔ اگر کوئی عامل و حاکم فاسق یا بددیانت نکلا۔ یا اس نے ظلم و ستم روا رکھا۔ تو اس میں جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا کیا تصور جبکہ ان سے متعلق شکایات آپ نے کبھی نظر انداز بھی نہ کیں، جب کسی شکایت کی تحقیق کے بعد ثابت ہو کہ شکایت درست ہے تو آپ نے متعلقہ فرد سے باز پرس بھی کی اور اسکو معزول بھی فرمایا مثلاً ولید! اور جو عمال حکومت اسلامی ریاست کے رکن تھے جنکی مدبرانہ مساعی سے اور جن کی جنگی مہارت سے، اور بیدار مغزی سے اسلام اور مسلمانوں کو شوکت مل رہی تھی، جو اسلام و ریاست کے وفادار تھے نہ ان کی طرف سے کوئی فتنہ اٹھا، نہ سازش ہوئی اور جنہوں نے روم کی کامیاب لڑائی لڑی اور نمایاں فتوحات حاصل کیں۔ جیسے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ تو ان کو آخر کیوں معزول کرتے؟ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد گوشہ نشینی ہی اختیار کر لی تھی۔ بعد کے جھگڑوں ٹنٹوں میں انہوں نے مطلق دخل نہ دیا۔ اسی سے ان کی اچھائی اور سلامتی فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ شکایات جہاں کی بھی ہوں ان میں ہاتھ عبداللہ بن سہیل بھودی اور اس کے سازشی ٹولے کا تھا۔ اوراق بائیں میں آپ تفصیل پر مدھل چکے ہیں۔ مصر میں وہ بیٹھا ہوا آگ لگاتا اور بھڑکاتا رہا تھا۔ وہ زیرک تھا، پیر پھا لکھا، تیز و زوردار، اور چرب زبان تھا۔ وہ یہودی سیاست کا ماہر اور منہجا ہوا تھا۔ سیادت و قیادت کی ہوس نے کم اسلام دشمنی نے زیادہ اسے آتش میں پراکڑ رکھا تھا جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کی خواہش اعزاز کو مسترد کر کے اسے دھتکار دیا تھا! ایسے عالم میں ایسا دشمن جو نہ کرتا تھوڑا تھا! بہر حال حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے اپنی صوابدید اور مومنانہ ذمہ داریوں کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اور عزت و عظمت اسلام، ملت مسلمہ کی نیکنامی کے لئے جو کچھ آپ کر گئے آپ کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ کاتب تقدیر نے جب مقدم میں شہادت تحریر کر دی تھی تو اس کے اسباب بھی تو نہیا ہونے تھے! لہذا تدبیر مساعد تقدیر نہ سوتی فتنہ و فساد کا دروازہ بند نہ ہو سکا! آپ انہیں حالات سے گزرے جن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنے زمانہ خلافت کے پہلے دن سے لے کر آخری لمحات تک گزرنے پڑے۔ حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہر چند بہترین تدابیر اور چیدہ مشورے خلافت و ریاست کے امور کے انتظام کے سلسلے میں عمل میں لاتے رہے، مگر تقدیر نے ساتھ دیا۔ اور خاطر خواہ طریقہ پر مسند خلافت پر تمکن حاصل نہ ہوا۔ یہی حال ہر دو اصحاب گرامی قد رضی اللہ عنہما کا اپنے عمال و حکام کے سلسلے میں رہا۔ وہ بھی باسم بیکر مٹے جلتے تھے۔ اتنا فرق البتہ تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے عمال، امراء و حکام آپ کے ساتھ تسلیم و انقیاد و محبت و وفا سے پیش آتے رہے، سرکشی اور بغاوت اور نافرمانی سے دور رہے۔ بخاتم اور خمس وغیرہ سلسل اور باقی عہد دار الخلافہ بھیجتے رہے جس کے سبب اہل اسلام دولت و ثروت کی زندگی کے دور میں داخل ہو گئے! اور عیش و عشرت

کا زندگی کے عادی ہونے لگے اور یہی حد سے گزری ہوئی پُر عشرت زندگی فتنہ و فساد کا سبب بن گئی۔

اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عامل اور حکام دین و ملت کے وفادار تو کیا ذاتی طور پر بھی آپؐ کے طبع و فرمانبرداری نہ تھے۔ ہر کام کو بگاڑتے چاروں طرف سے شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر لوٹتے، خیانتیں کر کے ظلم و ستم ڈھاکر دنیا و آخرت کی رو سیاسی حاصل کرتے اور بھاگ نکلتے۔ غیروں کا تو کیا ذکر خود آپؐ کے اقارب اور چچا زاد بھائیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اگر کسی کو اس بات میں شبہ ہو تو وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وہ خط پڑھ لے جسے بیچ البلاغ نے درج کیا ہے۔ واضح رہے بیچ البلاغ ان کے ہاں کی اصح ترین کتاب ہے اس خط میں آپؐ اپنے چچا زاد بھائی کو خطاب فرما رہے ہیں۔ آپؐ کا یہ خط آپؐ کے مشہور خطوط میں سے ہے اور اکثر کتب امامیہ میں ملتا ہے۔ خط کا ابتدائیہ قابل توجہ ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اس روسیاء سے جو حسن ظن تھا وہ بھی ملحوظ خاطر رہے۔

حمد و ثناء کے بعد واضح ہو کہ میں نے تم کو اپنی امانت کا شریک کار کیا، تم کو اپنا اور مہنا بچھونا ریا رفا، بنایا۔ تم میرے اہل خانہ میں میرے نزدیک غنچواری، رفاقت اور امانت داری میں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھے۔ لیکن جب تم نے اپنے ابن عم کا بدرفت و دیکھا اور دشمن کو آمادہ پیکار پرایا۔ اور لوگوں کی امانت داری خیانت کی شکل اختیار کر گئی اور یہ امت خونریزی میں ڈوب گئی تو تو منہ پھاڑ کر رہ گیا اور عین غم و اندوہ کے عالم میں اس کو دعا دیگیا۔ اور اس کی طرح تو بھی اس سے بچھڑ گیا۔ دوسروں کی طرح تو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اور توں بھی خیانت کرنے والوں کا خیانت میں ساتھی بن گیا۔ تو نے اپنے ابن عم کی نہ ہمدردی کی نہ اس کی امانت ادا کی۔ گویا تو اپنے جہاد میں مخلص نہیں تھا تجھے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و مدد نہ تھی۔ نہ اپنے رب کی طرف سے کسی کھلی دلیل پر قائم تھا۔ گویا تو ملکہ و فریب سے دنیا کمانا چاہتا اور دھوکہ سے امت کے خزانے اڑا لینے کی نیت رکھتا تھا۔ جب حالات کی ستم گری نے تجھے خیانت کا موقع دیا تو تو جھپٹ پڑا۔ اور بے عبر ہو کر ان کا جتنا مال سمیٹ سکتا تھا لے بھاگا۔ یہ وہ مال تھا جو امت کے بیواؤں اور یتیموں کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا۔ جس طرح بد حال بھیڑیا غنوں آلود، ہڈی ٹوٹی بکری کو لے بھاگتا ہے۔ اب تو وہ مال سمیٹ کر حجاز لے گیا ہے اور یوں اٹھا رہا ہے۔ گویا اس کے لینے میں تو نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تیرا باپ مرے (تیرا ناس ہو) گویا تیرا جوڑا ہو مال تھا یا تجھے اپنے مال باپ کا ورثہ ملا تھا۔ کیا کہنے! یا تو آخرت کے عذاب سے نڈر ہو گیا ہے؟

مَا بَعْدَ فَا فِيْ اَشْرَكَكَ فِىْ اَمَانَتِىْ وَ جَعَلْتُكَ شَعَارَتِىْ وَ بَطَانَتِىْ وَ لَمْ يَكُنْ فِىْ اَهْلِىْ رَجُلٌ اَوْ ثَقِىٌّ مِنْكَ فِىْ نَفْسِىْ لِوِاسَاتِىْ وَ مُوَازَنَتِىْ وَ اَدَاوِىْ اَمَانَتِىْ اِلَى فَلَمَّا رَا عَيْتَ الزَّمَانَ عَلَى الْاِيْنِ عِنْدَكَ قَدْ كَلَبَ وَ الْعَدُوَّ قَدْ حَذَبَ وَ اَمَانَتِىْ النَّاسِ تَدْخُوْبَةٌ وَ هَذِهِ الْاُمَّةُ قَدْ نَفَّكَتْ شَعْرَتِىْ وَ قَبِلَتْ رِوْبِىْ عِنْدَكَ فَكَهْرَ الْمِحْنِ نَفَارَقْتُهُ مَعَ الْمُنَارِقِيْنَ وَ خَدَّ لَتَهُ مَعَ الْخَاوِلِيْنَ وَ خَنَّتُهُ مَعَ الْخَائِبِيْنَ فَلَمَّا ابْنُ عَمَلِكَ وَ اَسَيْتَ وَ لَا اَلَا مَانَةَ اَدِيْتِىْ وَ كَانَ لَمْ يَكُنْ اللّٰهُ تَرْيِدُ يَحْيَا دِلَ وَ كَانَ لَمْ يَكُنْ عَلَى بَيْتِهِ مَن رَّبَّكَ وَ كَانَتْ لَتُكِدُ هَذِهِ الْاُمَّةُ عَنْ دُنْيَا هُمْ وَ تَشْوِىْ عَزَّتْهُمْ عَنْ فَيْهْمَ فَلَمَّا اَمْلَكْتُكَ الشَّدَّةُ فِىْ خِيَانَةِ الْاُمَّةِ اسْرَعَتْ الْكُدَّةُ وَ مَا جَلَّتْ التَّوْبَةُ وَ اخْتَطَفَتْ مَا تَدْرُ عَلَيْهِ مِنْ اَمْوَالِهِمْ الْمُسُوْنَةِ لَا اَمْلِهِمْ وَ اَيْتَامِهِمْ اخْتَطَفَتْ الذُّبَابُ الْاَزْهَالَ وَ اَمِيَّةَ الْمُعْزَى الْكُسَيْرَةَ فَحَمَلَتْهُ اِلَى الْحِجَاازِ رَحْبَ الصَّدْرِ فَحَمَلَهُ غَيْرَ مُتَاَثِّرٍ مِنْ اَخْذِهِ كَانَتْ لَا بِاَلَا لَفِ اَخْرَجْتَ اِلَى مِلْكِىْ تَرَاثَكَ مِنْ اَيْدِىْ وَ اَمْرِكَ نَسْبَحَانَ اللّٰهُ اَوْ مَا تَوْعَدُ مِنَ بِالْمَعَادِ اَوْ مَا خِفَاتُ مِنْ نَقَاشِ الْحِسَابِ اَيْهَا الْعَدُوَّ وَ مَقَرِّىْ كَانَ عِنْدَ نَا مِنْ دَوَى الْاَلْبَابِ كَيْفَ تَسِيْعُ طَعَامًا

وَسَدَّ أَبَاؤُكُمْ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنَّكَ تَأْتِي كُلَّ حَرَامٍ وَأَنْتُمْ تَسْتَبِ
حَرَامًا وَتَتَّبَعُوا الْإِمَامَ وَتَنْكِرُوا النِّسَاءَ مِنْ أَمْوَالِ
النِّسَاءِ هِيَ وَالْمَسَاكِينُ وَالْمُجَاهِدِينَ الَّذِينَ
أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ هَذِهِ الْأَمْوَالُ وَأَخْضَرْتَهُمْ
هَذِهِ الْبِلَادَ فَاتَّقِ اللَّهَ وَارْذُلْ إِلَى هُوَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
أَمْوَالُهُمْ فَإِنَّكَ إِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا كُنْتَ اللَّهُ
مِنْكَ لَا عُدَّةَ إِلَّا إِلَى اللَّهِ فَبِذَلِكَ
يَسِفُ الَّذِينَ مَا ضَرَبْتُ بِهِ أَحَدًا إِلَّا دَخَلَ
النَّارَ.

اور حساب لکھنے والوں کا تجھے کوئی خوف نہیں رہا۔ تو تو ہمارے
نزدیک عقلمندوں کا انتخاب تھا۔ ترے خلق سے لقمہ کس طرح اترتا
ہے جبکہ تو جانتا ہے کہ حرام کھا رہا ہے اور حرام پی رہا ہے۔ یتیموں
مسکینوں اور مجاہدوں کو اللہ تعالیٰ نے جو مال دیا تھا اور جسکی غلظ
اس نے ان شہروں کو سرسبز و شاداب بنا رکھا ہے۔ اس مال سے
تو نو نڈیاں خرید رہا ہے۔ عورتوں سے نکاح کرتا ہے۔ اور
اڑا رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈر، حقداروں کا مال واپس کر! اگر تو نے
ایسا نہ کیا اور میں تجھ پر قابو پا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیرے معاملہ
میں بری الذمہ ہو جاؤں گا، اور تجھے اسی تلوار سے قتل کروں گا کہ اس
سے میں نے جس کو مارا وہ جہنم رسید ہوا۔

اس خط کے پورے مضمون اور اس میں پوشیدہ کرب پر غور کیجئے اور اس عامل کی خیانت و خباثت کا اندازہ لگائے، اور پھر جناب شہید
رضی اللہ عنہ کے پورے دور خلافت پر نظر ڈال جائے کیا وہاں بھی کسی عامل سے ایسی خیانت و خباثت کا ثبوت ملتا ہے! کیا وہاں بھی کوئی
مال کھا کر اس طرح بھگتا ملتا ہے۔ (اور گالیاں کھا رہا ہے)

جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایک اور عامل منذر بن جاد و رضا، وہ بھی سخت خائن اور چور نکلا۔ جب اس کی خیانت ظاہر ہوئی تو جناب
امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی دھمکی آمیز خط لکھا۔ آپ کا یہ خط بھی مشہور خطوط میں شمار ہوتا ہے، جو کچھ البلاغہ کے علاوہ
امامیہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے! ملاحظہ ہو۔

أَمَّا بَعْدُ فَصَلَاةُ أَيْدِيكَ عَذْبِي مِنْكَ وَطَنْتُ أَنْتَ
تَبْتَعُ هَذِيكَ وَتَشْكُرُ سَبِيلَهُ فَإِذَا أَنْتَ فِيمَا جِئْتَ إِلَى
عَتَاكَ لَا تَدْعُ لِهَوَاكَ أَلْقِيَا قَدْ لَا يَبْقَى لِأَخِيكَ
عِيَادًا أَتَعْمُرُ دُنْيَاكَ بِخَدَابِ أَخِيكَ وَلَفْصِ عَشِيرَتِكَ
بِقَطِيعَةٍ وَبَيْنِكَ إِلَى أَخِي الْكُتُبِ الْمَكْرَمَةِ.

حمد و ثناء کے بعد، میں تیرے باپ کی نیک بختی کے سبب تیرے بارے
میں دھوکہ کھا گیا اور میں یہ سمجھ بیٹھا کہ تو اپنے باپ کے نقش قدم
پر ہو گا اور اسی کے راستہ پر چلتا ہو گا۔ مگر ان خبروں سے جو تیرے متعلق
مجھے تک پہنچی (چنانکہ ہی یہ معلوم ہوا کہ تو اپنی خواہشوں کا اسیر ہے۔
اپنی آخرت کے لئے تیرے پاس کوئی ذخیرہ نہیں۔ کیا تو اپنی آخرت
برباد کر کے دنیا آباد کرنا چاہتا ہے؟ اور اپنے دین کا رشتہ کاٹ کر اسے
عزیز و اقارب سے رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔) الی اخرا المکتوب،

حاصل کلام یہ کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مابین اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہر دو حضرات
نے اپنی بہترین صوابدید کے مطابق جو کچھ حق سمجھا اور جو کام اپنے ذمہ لازم جانا اس کو عمل میں لائے۔ اس میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں فرمائی۔
اپنے خیال اور حسن ظن کے مطابق عمال و حکام مقرر فرمائے! نہ وہ کسی کے دل کا حال جانتے تھے، اور نہ یہ جانتے تھے کہ آج جو اچھا ہے کل بُرا
ہو جائے گا۔ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ظاہری اور دکھاوے کے اخلاق سے پیغمبر بھی متاثر ہوتے رہے! وہ تو چونکہ ان
پروچی کا نرول ہوتا رہتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی ان کا اندر وں اپنے انبیاء پر ظاہر فرما دیتے۔ اور ان کی کوئی سازش، کوئی برا
ارادہ اور منصوبہ کامیاب نہ ہو پاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلِيْمُحَمَّدٌ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاَنَّهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اٰہلِ اِيْمَانٍ كُوْخَا ص كَرَسے ! یا یہ قرآنی اعلان اللہ لِيْمُحَمَّدٌ الْمُوْحَمَّدِيْنَ عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰی يَمَيِّزَ الْحَقِيْقَتَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو ایسی درلی ملی، حالت میں جو تم کو درپیش ہے، چھوڑے نہیں رکھے گا۔ جب تک نصیب کو طیب سے چھانٹ کر الگ نہ کر دے۔

امام کے لئے ضروری نہیں کہ وہ غیب دان ہو، اور اس کا حسن ظن پھر غلط نہ لگے اور اس کو پہلے معلوم ہو جائے کہ اس سے کیا کچھ سرزد ہو والا ہے!

البتہ اس سلسلہ میں شیعوں کے بڑی دشواری اور مشکل ہے کیونکہ ان کے عقیدہ میں امام غیب دان ہوتا ہے اس بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ خیانت ظاہر ہونے سے پہلے اور کام سپرد کرنے سے پیشتر ہی جان جایا کرتے تھے، کہ فلاں خاص ہے وہ خیانت سے باز نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق آپ کے لئے گزشتہ و آئندہ کا علم حاصل ہونا ضروری ہے۔ اور یہ کسی ایک دو کا خیال نہیں ان کے ہاں کا اجماعی مسئلہ ہے۔ محمد بن یعقوب کلینی اور دوسرے علما نے مختلف روایتوں اور متحدہ طرق سے ثابت کر رکھا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک دیدہ و دانستہ خائنوں اور فساد یوں کو مسلمانوں کا والی مقرر فرماتے تھے۔ اور بالآخر وہ خائن لوگ مال و دولت سمیٹ کر بھاگ جاتے اور یوں مسلمانوں کے حقوق تلف کرنے کا باعث ہوتے تھے۔ اور پھر سولائے نصیحت ناموں، معتاب ناموں اور وعظ و نصیحت کے کوئی چارہ کار یا تذکرہ کی صورت نہ رہتی تھی!

اُدھر یحیٰی عثمان غنی رضی اللہ عنہ محض اپنے حسن ظن پر دیکھ کر علم غیب تو ان کو تھا نہیں، عامل مقرر کر دیتے اور ان کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتتے۔ اور پشیمان و پریشان ہوتے!

اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک اور عامل کی داستان سنئے، جس نے آپ کے محترم و مقدس خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور کتنی کس افیتوں سے انہیں دوچار کیا، یہ مروود زمانہ جس کی اصل بھی قابل اعتراض رہی، زیادہ سنئیہ و عرف زیادہ سن سفیان، تھا! جو ملک فارس و شیراز کا آپکی طرف سے صوبہ دار تھا۔ وہ اثنائے جیسا تھا کہ اپنی بے بسی پر فخر کرتا اور علی الاعلان اپنی والدہ پر جو ایک لونڈی تھی زنا کی گواہی دیتا تھا۔ وہ قصہ یوں ہے کہ جناب ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے اسلام لانے سے پیشتر حارث ثقفی مشہو طیب کی لونڈی سُمیئہ نامی سے ناجائز تعلق قائم کیا جس کے نتیجہ میں اس نے ایک بچہ جنبا چونکہ وہ حارث کی لونڈی تھی اور حارث ہی کے ایک غلام کی منکوحہ تھی اس لئے بچپن میں یہ لڑکا عبدالحارث کے لقب سے مشہور ہوا۔ جب وہ بڑا ہوا تو شرافت و بلاغت، خوش تقریری اور حسن بیانی کا بہت چرچا ہوا، اس کی سوچ بوجہ زریں و دانائی، دور دور شہرت پا گئی! ایک روز قریش کے ایک سخیہ بزرگ عمر بن عامر نے کہا کہ اگر یہ لڑکا قریش میں بہوتا تو عرب کو اپنی لاٹھی سے ہانکتا، ابوسفیان نے یہ سن کر کہا۔

وَاللّٰهُ اِنِّیْ لَا اَعْرِفُ مِنْہٗ وَضْعَہٗ فِیْ بَطْنِ اُمّیّہ۔ بخدا میں اس کو خوب جانتا ہوں جس کا یہ نطق ہے۔ اس مجلس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے آپ نے پوچھا ابوسفیان وہ کون تھا، ابوسفیان نے کہا ”وہ میں ہوں“، آپ نے فرمایا بس رہنے دے ابو

سفیان! اس پر ابوسفیان نے یہ اشعار پڑھے

یَا اِنِّیْ یَا عَلٰی مِنْ اَلْعَادٰی
وَلَمْ تَكُنْ اَلْعَاۗلَہٗ عَنْ زَیَادٍ
وَدَّرَکِیْ فِیْہِمۡ تَعَدَّ اَلْعَوَادُ
اَمَّا وَاللّٰہِ لَوْلَا خَوْفُ شَخْصٍ
لَا طَهَرَ سِدْرَہٗ مُحَمَّدٌ بَنُ حَدِیْ
وَقَدْ طَالَتْ فِیْہَا مِلَّتِیْ نَفِیْقًا

ترجمہ: بخدا اگر مجھے اس شخص کا ذرہ نہ ہوتا جو مجھے دشمنوں میں شمار کرتا ہے، تو اے علی، صغیر حرب (یعنی میں) اس لڑکے کے بھید کو ظاہر

کر دیتا تو پھر یہ خوش گفائی زیادہ کی شمار نہ ہوتی بہت عرصہ میں نے قوم ثقیف سے اسے چھپائے رکھا اور اپنے جگر گوشہ کو ان کے پاس چھوڑے رکھا،

یہ قصہ زیادہ بھی سنی رکھا تھا۔ اور بڑی بڑھائی اور بے حیائی سے کہتا تھا کہ میں اصل میں ابوسفیان کا لطفہ اور قوم قریش کا فرد ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو قاریں کا حاکم بنایا، تو نظم مملکت قائم کرنے ان شہروں کی حالت درست کرنے اور قلعہ و قضا و پر قابو پانے میں اس کی کارکردگی بڑی شاندار رہی، اور اس کی تدبیر و تجاویز کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

یہ حالت دیکھ کر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے خفیہ رابطہ قائم کیا، تاکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ان سے آپٹے۔ اور اسے لایح دیا کہ اگر وہ اس کے لئے تیار ہو تو اسے شریک نسب بھی کر لیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا خوش تدبیر اور لائق فائق اور کام کا آدمی اگر حریف سے کٹ کر اپنے سے آپٹے تو یہ بڑی سیاسی کامیابی تھی، آپ نے اس کو لکھا کہ اگر تو میرے پاس آگیا تو میں تجھے اپنا بھائی کہوں گا، اولاد ابوسفیان میں تجھے شامل قرار دوں گا۔ کیونکہ تو آخر تو ابوسفیان ہی کا لطفہ ہے۔ اور تیری ذاتی شرافت و سوجھ بوجھ ترے دعویٰ کی صداقت کے منہ بولتے گواہ ہیں۔ جب اس سخت و سختی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ نے زیادہ کو اس مضمون کا خط لکھا۔

مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ معاویہ نے تجھے خط لکھا ہے، وہ تجھے بیوقوف بنانے کی تیری تیزی کو مانڈ کر ناچا رہتا ہے تم اس سے ڈرتے ہو۔ وہ اس شیطان کی مانند ہے جو آدمی کو آگے سے پیچھے سے داپیں بانیں سے ہر طرف سے گھیرنے کی فکر میں رہتا ہے تاکہ جب اسے غافل یا بے فکر پائے تو قابو پا کر تباہ کر دے۔ تم اس سے ہوشیار رہو! اور عمر کے زمانہ میں ابوسفیان کے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی جو سو سو نفسانی یا شیطانی خیال ہی تھا کہ اس سے نہ کسی کا نسب ثابت ہو سکتا ہے نہ کسی میراث کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اس کو سند و ثبوت میں پیش کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے زبردستی مانگ کر لایا گیا ہو، اور جو ادھر میں لٹکا ہوا، اور ادھر ادھر مل رہا ہو۔

قَدْ عَرَفْتُ أَنَّ مُعَاوِيَةَ كَتَبَ إِلَيْكَ يَسْتَرْكَ لُبَّكَ وَ يَسْتَقِلُّ عَدِيدَكَ فَاحْذَرُهُ إِنَّهُ هُوَ الشَّيْطَانُ يَا أَلِيَّ الْمَوَدَّةِ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَعَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ لِيَفْقَهُمْ غَفَلَتُكَ وَيَسْتَلْبِ عِزَّتَكَ فَاحْذَرُهُ وَقَدْ كَانَ مِنْ أَلِيَّ سُفْيَانَ فِي زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَلَمَّا قُبِيَ حَدِيثُ النَّفْسِ وَذُنُوبُهُ قُبِيَ نَذَاتُ الشَّيْطَانِ لَهُ يَثْبُتُ بِهَا نَسَبٌ وَلَا يَسْتَحِقُّ بِهَا مِيرَاثٌ وَالشُّعْرَى بِهَا كَأَنَّ الْفِيلَ الْمُدْنِغَ وَالْمَنُوطَ الْمُدْنِغَ بِدَبٍ

جب زیادہ نے یہ خط پڑھا تو کہنے لگا۔ دلرب الکعبہ شہد ابی الحسن بانی ابن ابوسفیان (رب کعبہ کی قسم علی نے تو گواہی دی ہے کہ میں ابوسفیان کا بیٹا ہوں،)

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک آپ نے کافق رہا۔ ساتھ نہ چھوڑا۔ اور جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت و سیادت کا معاملہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا، اور ادھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی حد سے زیادہ کوشش کی، اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے اسی قول کو دلیل بنا کر جو جناب عمرو بن عامر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے روبرو کہا تھا اس کو اپنا بھائی قرار دیا اور سنا کہ میں زیادہ بن ابوسفیان اس کا لقب تجویز کر کے تمام قلمرو میں اعلان کر دیا کہ ائمہ سے اسے زیادہ بن ابوسفیان کہا جایا کرے! اور یہ سعی و کوشش اس لئے کی کہ وہ مدبر، شجاع اور بہت زیرک سردار تھا۔ جمعیت بھی اس کے ساتھ بہت تھی۔ اپنے ساتھ ملنے سے ان کی ریاست میں استحکام اور مضبوطی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک امکانی خطرہ کا سدباب بھی تھا۔ ممکن ہے وہ بغاوت کے لئے خطرات کا باعث بن جائے۔ بہر حال جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی سیاسی تدبیر میں کامیاب ہوئے اور وہ آپ کا رفیق و

معاون بن گیا۔

اس بد فطرت نے جناب معاویہ کے ساتھ ہوجانے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی تک تو حضورِ نبوت ظاہری لحاظ رہا۔ مگر آپ کی وفات کے بعد جب عراق کا گورنر بنایا گیا تو کوفہ پر قبضہ کے بعد سب سے پہلے جناب سعید بن شریح رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے چلے گئے۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے مخلص رفقاء میں سے تھے۔ اور آپ کے بلند قد خاندان کے دلی دوستوں میں سے گئے جاتے تھے۔ اس کا ان کے درپے آزار ہوا گیا خاندان و اولاد علی رضی اللہ عنہ سے عدوت و دشمنی کی ابتداء تھی!

جناب سعید کو جب اس کے ارادوں کی بھنگ ملی تو وہ کوفہ سے نکل کر مدینہ منورہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے۔ ان کا کوئی بھی گھر تھا۔ اہل عیال تھے مال و اسباب تھا ان سب پر زیادہ نے قبضہ کر لیا۔ مال و اسباب لوٹ کر گھر چلا دینے کا حکم دیدیا۔ جب یہ اطلاع جناب حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو یہ خیال فرما کر کہ آخر اتنے عرصہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا رفیق، و دوست رہا ہے، لحاظ و سروت کچھ تو برتنے گا۔ آپ نے بطور سفارش اس کو خط لکھ دیا۔

مِنْ حُسَيْنِ ابْنِ عَلِيٍّ زِيَارَةً أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ عَمِدْتُ إِلَى
رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ لَهُ مَالٌ لَهُ وَعَلَيْهِ مَا عَلَيْهِمْ فَقَدْ مَنَعَ
وَارَةً وَأَخَذْتُ مَالَهُ وَعِيَالَهُ فَإِنَّا نَأْكُ كِتَابِي هَذَا
فَأَبْنِ دَاكُ وَدَقْمَالَهُ وَعِيَالَهُ فَإِنِّي قَدْ أَخَذْتُ
فَنَشْفَعُ فِيهِ

حسین ابن علی کی طرف سے زیادہ کو اب بعد تم نے ایک ایسے مسلمان شخص پر بلا ڈال دیا ہے جس کے حقوق بھی وہی ہیں جو سب مسلمانوں کے ہیں اور اس کی ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو اور مسلمانوں کی ہیں۔ تو نے اُن کا گھر ڈھک دیا۔ مال و اسباب اہل عیال پر قبضہ کر لیا۔ یہ تو نے کیا کیا! اب جب مرا یہ خط تجھ کو ملے تو تجھے چاہئے کہ اس کا گھر تعمیر کروادے، مال و عیال واپس کر دے کیونکہ میں نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اس کے متعلق مری یہ سفارش مان لے۔

آپ کے اس خط کے جواب میں بد بخت ناشر نے جو کچھ لکھا وہ ذیل میں ملاحظہ کیجئے

مِنْ زِيَارَتِي إِلَى سُفْيَانَ ابْنِ الْحُسَيْنِ بْنِ فَاطِمَةَ أَمَّا
بَعْدُ فَقَدْ أَتَانِي كِتَابُكَ تَبَدُّعِي بِهِ بِاسْمِكَ قَبْلَ
اسْمِي وَأَنْتَ لَمْ تَلِكْ لِحَاجَةٍ وَأَنَا سُلْطَانٌ وَأَنْتَ
سَوْفَةٌ وَكِتَابُكَ إِلَيَّ فِي فَاسِقٍ لَا يُؤَدِّيهِ إِلَّا فَاسِقٌ
مِثْلُهُ وَشَرُّكَ مِنْ ذَلِكَ إِنْ أَتَاكَ وَقَدْ أَدَيْتَهُ
إِقَامَةً مَّتَنَّفَكْ عَلَى سَوْءِ الدَّاعِي وَرَضِي بِدُكِّكَ وَ
أَيْمُ اللَّهِ لَا يَسْبِقُنِي إِلَيْهِ سَابِقٌ وَتَوْكَانَ بَيْنَ
جَلْدِكَ وَلَحْمِكَ فَإِنْ أَحَبَّ لِحَمَّةٍ إِلَى أَنْ أَكُلَهُ لَحْمُ
أَنْتَ فِيهِ فَأَسْلَمَهُ مُجَدِّدِيهِ إِلَيَّ مِنْهُ هُوَ أَوْلَى بِهِ
مِنْكَ فَإِنْ عَفَوْتَ عَنْهُ لَمْ أَكُنْ شَفَعْتُكَ فِيهِ
وَأِنْ قَتَلْتَهُ لَمْ أَقْتُلْهُ إِلَّا بِحُجَّتِهِ إِنِّي أَف

زیادہ بن ابی سفیان کی طرف سے حسین بن فاطمہ کی طرف! تمہارا خط مجھے ملا جس میں تم نے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا حالانکہ تم مجھ سے درخواست کر رہے ہو، اور رعایا ہو جبکہ میں حاکم ہوں! تم نے یہ خط ایسے فاسق کے بارے میں لکھا ہے جس کو وہی پناہ دے گا جو اسی جیسا یا اس سے بھی بڑا فاسق ہوگا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہوئی کہ وہ تمہارا پاس آیا اور تم نے اسے پناہ دیدی اسی وجہ سے وہ اپنی غلط رائے پر اڑا ہوا ہے۔ اور اس پر راضی ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ تمہارے گوشت پوتے میں بھی سما جائے تب بھی میری گرفت اس تک سب سے پہلے پہنچے گی، پس مجھے وہ گوشت بہت مرغوب ہو گا جس کے اندر تم سمائے ہوئے ہو لہذا اس غلطی کی پاداش میں تم اس کو اس کے حوالہ کر دو جو تم سے بہتر ہے اگر میں نے باغرض، اس کو معاف کر بھی دیا تو یہ اس وجہ سے نہیں ہو گا کہ تم نے اس کی سفارش کی تھی، اور اگر میں نے اس کو قتل کیا

تو اسکی مروت یہ وجہ ہوگا کہ وہ تم سے رشتہ محبت رکھتا ہے،
سبر کشی اور گستاخی سے لبریز جب یہ خط حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملا۔ تو آپ نے وہی خط ملفوف کر کے اپنی تحریک کے ساتھ کہ اصل واقعہ یہ تھا
میں زیادہ کو ایسا لکھا تھا جس کا اس نے یہ جواب دیا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر سخت غصہ ہوئے اور فوراً اپنے ماتھے سے خط لکھ کر زیادہ کو بھیجا۔

معاویہ کی طرف سے زیادہ کے نام حسین بن علی رضی اللہ عنہما ہائے
تمہارا وہ خط جو تم نے ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا، مجھے بھیجا ہے
جس میں انہوں نے ابن شریح کی سفارش کی تھی جس کو پڑھ کر میں نے انکار
لگایا کہ تو دو سببوں دلائلوں کے درمیان پھنسا ہوا ہے ایک نسبت
ابوسفیان کی ہے تو دوسری طرف سمیہ کی۔ ابوسفیان کی نسبت سے
تجھے برباد ہر محل، اور ارادہ کا پختہ ہونا چاہیے، اور سمیہ کی نسبت
کا تقاضا ہے کہ تیری رائے ایسی گھٹیا ہوئی چاہئے جیسے ان لوگوں کی
ہوتی ہے اور اس کا ثبوت تیرا وہ خط ہے جو تو نے حسین کو لکھا جس
میں تو نے ان کی والدہ کو گالی دی اور ان کو فاسق ٹھہرایا۔ میں
اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں، کہ تو حسین سے زیادہ فسق کا
اہل ہے۔ اور تیرا باپ جب تو ایک غلام کی طرف منسوب کیا جائے
ان کے باپ سے فسق کا زیادہ اہل ہے حسین نے خود کو اونچا سمجھ کر
اگر اپنا نام پہلے لکھ دیا تو کیا ہوا تجھے تو اس نے نہیں گھٹایا۔ اور
ان کی سفارش رد کر کے اس نیکی کو جو قبول سفارش کی صورت
میں حاصل ہوتی تو نے اپنے سے بہتر کی طرف لوٹا دیا جب سراسر
خط تجھے ملے تو سعید بن شریح کا جو مال و متاع تیرے پاس ہے
اس کے حوالہ کر دو۔ مال و حیاں لوٹا دو اور گھر بنو کر دو اور اس سے
کسی قسم کی باز پرس نہ کرو۔ میں نے حسین کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے
دوست کو ان احکامات کی خبر کر دیں، پھر اگر وہ چاہے تو ان کے پاس
رہے اور چاہے تو اپنے شہر میں آجائے، بہر حال تیرے ماتھا و زبان
کو ان پر کوئی اختیار نہیں اور تو نے جو حسین کو خط میں ان کے والد
کی طرف منسوب کرنے کی بجائے والدہ کی طرف منسوب کیا ہے تو تمہارا
یہ حرکت افسوس ناک ہے جیسا کہ تو وہ ہیں جو نہ کسی بدی سے دلیل
لکھ جاسکتے ہیں نہ عزت و مرتبہ سے گرائے جاسکتے ہیں کیا تو نے ان کے
والد کو حقیر جاتا ہے وہ علی ابن ابی طالب ہیں! اور ان کی والدہ کی

مِنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ إِلَى زَيْدٍ أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ
حُسَيْنَ ابْنَ عَلِيٍّ بَعَثَ إِلَى كِتَابِكَ إِلَيْهِ جَوَابَ كِتَابِهِ
إِلَيْكَ لِابْنِ شَرِيحٍ فَلَمَتِ أُنْكَرَ بَيْنَ رَأْيَيْنِ رَأْيِي
مِنْ أَبِي سُفْيَانَ وَرَأْيِي مِنْ سَمِيَّةٍ أَمَّا رَأْيُكَ مِنْ أَبِي
سُفْيَانَ فَحَلَمٌ وَعَزَمٌ وَأَمَّا الَّذِي مِنْ سَمِيَّةٍ فَلَمَّا
يَكُونُ رَأْيِي مِثْلَهَا وَمِنْ ذَلِكَ كِتَابُكَ إِلَى الْحُسَيْنِ
بِشْتِمِ آبَاءِهِ وَتَعْيِزِ مَنْ لَهُ بَا لُفْسُقٍ وَتَعْدِي أَنْتَ أَقْبَى
بَا لُفْسُقٍ مِنَ الْحُسَيْنِ وَلَا بُدَّ لَكَ إِذَا كُنْتَ تُنْسِبُ إِلَى
عَبْدٍ أَوْ لِي بَا لُفْسُقٍ مِنْ أَبِيهِ وَإِنْ كَانَ الْحُسَيْنُ بَدَأَ
بِاسْمِهِ إِتْبَاعًا عَائِنَكَ فَإِنَّ ذَلِكَ لَمْ يَصْنَعْهُ وَأَمَّا
تَشْفِيعُهُ نِيْمًا شَفَعَ فِيهِ فَقَدْ دَفَعْتَهُ عَنْ نَفْسِكَ إِلَى
مَنْ هُوَ أَوْقَى بِهِ مِنْكَ فَإِذَا تَأَلَّفَ كِتَابِي هَذَا
فَخَلِّ مَا فِي يَدِكَ لِسَعِيدِ بْنِ شَرِيحٍ وَابْنِ لُمْدَانٍ
وَلَا تَعْرِضْ لَهُ وَارْزُقْ إِلَيْهِ مَالَهُ وَبِعَالَهُ فَقَدْ كَتَبْتُ
إِلَى الْحُسَيْنِ أَنْ يُخْبِرَ صَاحِبَهُ بِذَلِكَ فَإِنْ شَاءَ
أَقَامَ عِنْدَكَ وَإِنْ شَاءَ رَجَعَ إِلَى بَكْدَه فَلَيْسَ عَلَيْهِ
سُلْطَانٌ بَيْدٍ وَلِسَانٍ وَأَمَّا كِتَابُكَ إِلَى الْحُسَيْنِ
بِاسْمِهِ وَلَا تَنْسِبُهُ إِلَى أَبِيهِ بَلْ إِلَى أُمِّهِ فَإِنَّ الْحُسَيْنَ
وَيْلَكَ مَنْ لَا يُدْرِي بِهِ الدُّجُورَانُ أَفَاسْتَغْفِرُ آبَاءَهُ
وَهُوَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ أَمَّا الَّذِي أَمَرَهُ وَكَلَّمَهُ وَهُوَ ظُلْمَةٌ
بُنْتُ رَسُولِ اللَّهِ أَخَذْتُ لَهُ إِنْ كُنْتَ تَعْقِلُ وَالسَّلَامُ

حرف نسبت کی: وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، ہیں۔ یہ نسبت تو اور بھی زیادہ قابل
فخر ہے! اگر تجھ میں کچھ سمجھ ہوتی،

عرصن ابن زیاد اور اسکی اولاد میں سے خاصکر عبد اللہ کی شرارت و گستاخی، جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ساتھ جس قابل
نفرت حد تک پہنچی ہوئی ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے!

اس تفصیل کے بعد شیعہ حضرات کے لئے مشکل صورت حال یہ ہے کہ ابن زیاد جب ولد الزنا تھا اور ولد الزنا امامیہ کے نزدیک دوسرے
کی طرح نجس العین ہوتا ہے تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو فارس کے لوگوں پر نیز مسلمانوں کے لشکر پر حاکم و امیر کیسے بنا
دیا۔ اور اس وقت چونکہ نمازیں پڑھنا، جمعہ و عیدین کی امامت بھی امیر کے دماغ میں تھی تو گویا یہی نطفہ بنا تحقیق، مسلمانوں
کو نمازیں بھی پڑھاتا رہا۔ اور بقول امامیہ نمازیں تباہ کرتا رہا۔ کیونکہ امامیہ کے مان یہ تحقیق و تصریح شدہ مسئلہ ہے کہ ولد الزنا کی
امامت سے نماز نافذ ہو جاتی ہے۔ تو ایسی صورت میں شیعوں کا کیا منہ اور ان کو کیا حق ہے کہ وہ جناب عثمان غنی شہید رضی اللہ
عنہ پر یہ طعن توڑیں اور اعتراض کریں کہ آپ کے اعمال ظالم یا خیانت پیشہ تھے! وایں گناہے است کہ در شہر شمایز کنند!

اعتراف (۳) | دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حکم بن ابی العاص کو جو مروان کا باپ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قصور کی بنا پر
مدینہ بدر کر دیا تھا۔ آپ نے اس کو پھر مدینہ واپس بلا لیا۔

جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو مدینہ سے اس بنا پر نکال دیا تھا کہ منافقین سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے،
اور کفار سے بعض معاملات میں تعاون بھی کرتا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں باہمی فتنہ انگیزی کی نوبت بھی آجاتی تھی،
تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعد اربعہ شیخین رضی اللہ عنہما، کفر و منافقت کا جازیں عموماً اور مدینہ منورہ میں خصوصاً
و نشان ہی مل گیا۔ اور کافر و منافق سے دوستی اور تعاون اور اس کے سبب فتنہ انگیزی کا خدشہ ہی نہ رہا تو بقاعدہ طے شدہ کہ
جب کوئی حکم کسی علت، سبب اور وجہ سے مفید ہو تو علت کے ختم ہو جانے کے بعد وہ حکم بھی باقی نہیں رہتا، مدینہ بدری کا حکم
بھی اس سے اٹھ گیا۔

اور جناب شیخین رضی اللہ عنہما نے مصلحت اس کے مدینہ میں داخلہ کو پسند نہیں فرمایا کہ احتمال تو ابھی باقی تھا کہ یہ دونوں حضرات بنی
تمیم سے تھے اور حکم بنو امیہ میں سے تھا ایسا نہ ہو کہ عداوت و درجاہدیت کے سبب رگ جاہلیت جوش مار جائے اور مسلمانوں
میں کسی نوع کی چم، چہ، میں، میں بر شروع ہو جائے۔

اور جناب غنی رضی اللہ عنہ کا تو وہ چونکہ بھتیجا تھا۔ اس قسم کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ لہذا بطور صلہ رحمی آپ نے اسے مدینہ بلا لیا۔ اور
یہ اعتراض لوگوں نے خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بھی کیا تھا کہ آپ نے حکم کو مدینہ میں کیسے بلا لیا۔ جس کا انہوں نے
کافی و شافی جواب اسی وقت دیدیا تھا کہ میں نے وصال سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی واپسی کی اجازت لے لی تھی!

جب ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے تو میں ان کے پاس گیا۔ آپ نے دوسرا گواہ طلب فرمایا۔ اسی طرح میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس
بھی گیا کہ شاید وہ مجھ تنہا کی گواہی قبول کر لیں۔ مگر انہوں نے بھی دوسرا گواہ مانگا۔ اب میں خود خلیفہ ہوں، اپنے علم یقینی کے سبب
ان کو بلا سکتا ہوں لہذا میں نے بلا لیا اس لئے اعتراض کی کوئی بات ہے نہ حکم رسول کی مخالفت کا سوال۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی شہادت اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہے بروایت صحیح یہ منقول ہے کہ میں

مرضی آخری میں ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاش میرے پاس ایک مرد صالح آتا کہ میں اس سے ہم کلام ہوتا۔ اندراج مطہرات اور دوسرے خدام خانہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ، کو بلو الیں۔ فرمایا نہیں، پھر حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ناموں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر ہاں فرمائی چنانچہ جب آئے تو تنہائی میں ان سے کچھ سرگوشی فرمائی۔ ہو سکتا ہے لطف و مہربانی کی اس خاص سماعت میں آپ نے اس کی بھی خطا بخشی کر لی ہو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرد صالح کی سفارش کو شرف قبول عطا فرما دیا ہو۔ کہ دوسرے اسی وجہ سے اس سے باخبر نہ ہو سکے!

پھر یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ حکم نے آخر عمر نفاق و فساد کی حادث سے توبہ کر لی تھی۔ اسی لئے اس کے بعد اس سے کوئی ایسی حرکت صادر نہیں ہوئی! اور پھر عمر کے لحاظ سے بھی وہ کس بل نہیں رہا تھا پیر فرزت ہو گیا تھا کسی ضرر و فتنہ کا اندیشہ بھی نہ رہا تھا۔

اعتراف (۳) تبصرہ اعتراض یہ ہے کہ اہل بیت اور اپنے عزیز و اقارب کو بہت زیادہ مال و دولت بخشا۔ اور بے انتہا اصراف کیا حتیٰ کہ بیت المال کو کنگال کر دیا۔ حکم بن ابی العاص جب مدینہ میں آیا تو اسے ایک لاکھ درہم دیئے

اس کے بیٹے حارث بن حکم کو مدینہ کے بازاروں کا محصول، عسور، خزائنہ اور منڈیاں عطا کیں۔ مروان کو افریقیہ کا خمس وکے والا۔ عبد اللہ بن خالد بن اسید بن ابی العاص بن امیہ جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آیا تو اُسے: بطور انعام تین لاکھ درہم دیئے۔ اپنی لڑکی کو مروارید کے دودانے ایسے دیئے جنکی قیمت جو ہریوں اور تاجروں کے انداز سے بھی زیادہ تھی۔ دوسری لڑکی کو یاقوت و بیش قیمت جو اہرے جوڑی ہوئے سونے کی انگلیھی دی۔ اور بیت المال کا اکثر روپیہ اپنی عمارتوں کی تعمیر باغات، اراضی اور کھیتوں کی درستگی میں صرف کیا۔

عبید اللہ بن ارقم اور معقیب دوسی نے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے عہد سے دار و غمر بیت المال کی خدمت پر مامور تھے یہ حالت دیکھ کر اپنی خدمت سے استعفیٰ دیدیا اور اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کر لی، تو مجبور ہو کر یہ خدمت جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ ایک روز تقسیم اموال بیت المال کے بعد ایک لاکھ روپیہ کی بقایا رقم جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بخش دی۔ ظاہر ہے جب اپنے مال کو مسرفانہ طور پر خرچ کرنا اور فضول اٹھانا شریعت کے لحاظ سے قابل ملامت ہے۔ تو مسلمانوں کے اموال کو اس طرح فضول خرچیوں میں اٹھانا کیوں نہ قابل ملامت اور لائق مذمت ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی داد و دہش اور بخشش و عطا کو بیت المال سے بتانا اور پھر اس کی بنا پر آپ پر اعتراض کرنا سراسر اقتدار بہتان اور مریخ جھوٹ ہے۔ آپ کا لقب غنی، خلافت کا مریخوں تو نہیں تھا آپ کی ثروت اور دولت مندی تو حصول خلافت سے پہلے سے چلی آرہی تھی۔ رشک اسلام کی مدد و تحوط کے وقت اہل مدینہ کے لئے آپ کا ایثار و داد کو نہ جھٹلا سکتا ہے، اس کے علاوہ ہر ضرورت کے وقت آپ کی بیش از بیش داد و دہش کے واقعات سے معمور اسلامی تاریخ سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت مبارکہ کے آخری دور میں جب فتوحات کثرت سے ہوئیں بے اندازہ غنم حاصل ہوئے ہر سمت سے دولت کے انبار اور انبار سمٹ سمٹ کر مدینہ منورہ آنے لگے اور ان سے حصہ پایا کر نبی محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار و پیچہ رفیقوں رضوان اللہ عنہم اجمعین کے حالات بدل گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض وہ رفقا راوی صحابی جو کبھی نان شبینہ کی صبر و رضا کے ساتھ حالت گذار چکے تھے انشی ہزار کے حصوں کے مالک قرار پائے۔ دار و خود مالی جناب علی رضی اللہ عنہ جو وہ دور بھی گذار چکے تھے کہ اہل و عیال کو فاقہ کی حالت میں دیکھ کر خود دوسروں کا عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ درہم عنایت فرمائے تھے کہ ان سے

بچوں کے لئے کھانا لے آئیں۔ (ن)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس دور میں وسعت و فراخی حاصل ہوئی، بہتوں نے عمارتیں کھڑی کر لیں۔ باغات اور ارضیات خرید لئے اور جائیدادیں بنالیں، اسوقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تاجر تو تھے ہی، اسوقت انکی تجارت کو اور بھی فروغ حاصل ہوا اور دولت و ثروت میں بھی خوب اضافہ ہوا۔ پھر آپ نہ تنگدل صاحب دولت تھے، اور نہ ہی آپ کا ہاتھ رکا ہوا تھا۔ اپنے اور پرلئے سب آپ کی داد و دہش سے فیضیاب ہوتے تھے آپ کے لطف و عنایت اپنے قبیلوں پر ہی نہ تھی، آپ غلاموں تیلیوں میواؤں پر ہمیشہ اپنا مال و دولت لٹاتے رہے۔ اور صدقہ و خیرات کا کوئی راستہ کوئی موقع آپ کے ہاتھ سے نہ نکل پاتا۔ آپ کا یہ معمول زبان زد خلافت ہے کہ آپ معمول ہر جمعہ ایک غلام خرید فرما کر آزاد کیا کرتے تھے۔ اور انصار و مہاجرین رضوان اللہ علیہم کی روزانہ دعوت بھی آپ کے معمول میں شامل تھی جس میں ہر تکلف کھانا کھاتے تھے! اس سلسلہ میں جناب حسن بصری رحمہ اللہ علیہ کا ارشاد ملاحظہ کیجئے!

میں گواہ ہوں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جمع کے وقت یہ اعلان بذریعہ مناد کیا جاتا، کہ حضرات آئیے اور اپنے عطایا لے جائے، آئیے اپنی خوراک لے جائیے اور لوگ آتے تھے اور خوب لے جاتے تھے، اور میرے کانوں نے یہ اعلان بھی سنا کہ آؤ اپنے لئے لباس لے جاؤ۔ اور لوگ اپنی پوشاکیں حاصل کرتے اور اسی کے ساتھ کھلی و شہد کے ناشتہ سے بھی لطف اندوز ہوتے جس رحمہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خوراک وافر بھی ہوتی اور بہت عمدہ بھی۔ ابو عمر نے یہ روایت استیعاب میں کی ہے،

شَهِدْتُ مَعَادِي عُثْمَانَ يَأْتِيهَا النَّاسُ أَعْدَاءُ عَلَى عَطِيَا تَكُمُ فَيَعْدُونَ فَيَأْخُذُونَ نَهَاوْا فِرْقًا يَأْتِيهَا النَّاسُ أَعْدَاءُ وَاعْلَى أَرْسِ قَوْمٍ فَيَعْدُونَ فَيَأْخُذُونَ نَهَاوْا فِرْقَةً حَتَّى وَاللَّهِ لَقَدْ سَمِعْتُ أَدْنَاهِي يَقُولُ عَلَى كَسْوَتِكُمْ فَيَأْخُذُونَ الْحُلَّ وَاعْدُوا عَلَى السَّعْنِ وَالْعَسَلِ وَقَالَ الْحَسَنُ وَادْنَاهِي وَادْنَاهِي كَثِيرًا وَكَانَ أَبُو عُمَرَ فِي الْأَسْبَابِ .

آپ کی داد و دہش اور وجود و سخا کا جو اندازہ لگانا چاہے تاریخ کا مطالعہ کر کے لگا سکتا ہے! اللہ کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کو کسی نے اسراف نہیں بتایا خود حدیث کی رو سے بھلائی میں خرچ کرنا اسراف نہیں بلا اسراف فی الخیر۔ اور اعزہ و اقارب پر خرچ کرنا تو دو گنے اجر کا موجب ہوتا ہے، حدیث صحیح میں ہے کہ مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے، اور خویش و اقارب پر صرفہ دو بھلائیوں رکھتا ہے، ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی۔ قرآن نے بھی اقارب کو دوسرے مصارف پر مقدم رکھا ہے۔ وَآلِی الْعَالِ عَلَى حُبِّهِ ذَوِی الْقُرْبَى وَ الْيَتَامَى وَ الْمَسْكِينِ وَ ابْنِ السَّبِيلِ (اور اس کی محبت پر مال دو، اقرباء کو تیمائی، مسکین اور مسافروں) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ نے سالم بن جعد سے روایت بیان کی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو جن میں جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے اپنے پاس بلایا اور ان کو قسم دلا کہ ہر پوچھا کہ سچ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بخشش و عطایا میں قریش کو دوسرے لوگوں پر مقدم خیال فرماتے تھے؟ اور اسی طرح بنی ہاشم کو قریش پر! اس پر تمام صحابہ نے سکوت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر جنت کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دیدی جائیں تو میں وہ بنی ہاشم کو دیدوں تاکہ ان میں سے کوئی باہر نہ رہ جائے۔ بلکہ وہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہو جائیں! لیکن ان تمام مصارف کو بیت المال سے سمجھنا بڑا تعصب اور عناد ہے! خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے اس سلسلہ میں جب سوال کیا تو آپ نے فرمایا: خلافت سے پہلے میرے پاس جتنی دولت تھی تمکو خوب معلوم ہے اور میری داد و دہش اور بخشش و عطایا کی جو کیفیت ہے وہ بھی تم سب جانتے ہو۔ یہ جانتے پوچھتے یہے جاشہبات اور عدل و تقویٰ کے خلاف گمان میرے پاس سے میں کیوں کرتے ہوں

اب رہیں وہ باتیں جن کا ذکر اس قصبہ کے شروع میں آیا ہے یہ نقل دروغ ہے، اور ان سے قصبہ میں گڑبڑ پھیل گئی ہے بات کچھ اور ہے لوگ اس کو دوسرا دیدیا گیا ہے، بیت المال کا نام اپنے جھوٹ میں زور پیدا کرنے کے لئے دیدیا ہے حالانکہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں اور اصل قصہ بھی اتنا ہے کہ جناب غنی شہید رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کا نکاح حادث بن حکم کی بیٹی سے کیا۔ اور ان کو اپنی ذاتی دولت میں سے دھوکہ رونمائی کہہ لویا اسوقت کا کوئی رواج، ایک لاکھ روپیہ لکھ بھجویا۔ اور اپنی بیٹی ام رومان کو مروان بن حکم کے نکاح میں دیا تو اسکو بھی ایک لاکھ روپیہ دیا۔ اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی مال و دولت سے دیا۔ بیت المال کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اور نیک ہی صلہ بھی اور خویشی بن پر مبنی تھی! جو حکم شرع کے ساتھ ساتھ مقبول و پسندیدہ عوام و خواص فعل تھا۔

اور مروان کو افریقہ کے محس کی بخشش کی داستان بھی جھوٹی اور سرا سرافتر ہے! اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی سرگردگی میں پیادوں و سواروں کا ایک لاکھ کا لشکر دیا مغرب کی فتح کے لئے روانہ کیا جب وہ مغرب کے پایہ تخت شہر افریقہ کے قریب پہنچا۔ تو میدان کارزار روہیں جا۔ مسلمانوں نے انتہائی جہد و جدوجہد اور کوشش سے وہاں فتح کامل کی اور بے حد و حساب مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جناب عبداللہ (مذکور) رضی اللہ عنہ نے تقدیر قوم کا بخش نکلا جو راجی سکے کے مطابق پانچ لاکھ دینار بنتا تھا۔ اور یہ رقم دارالخلافہ کو روانہ کر دی،

نقد و کے علاوہ اسباب و مولیشی کی صورت میں جو مال غنیمت تھا۔ وہ مدینہ سے دور دراز کی مسافت بار بار داری ناکافی ہونے اور اس پر اخراجات کے بار کی وجہ سے دارالخلافہ پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی اسوقت کے حالات اور سواری وغیرہ کی کیفیت کے ساتھ لیل و مسافت کا جو کئی ماہ میں قطع ہوتی تھی تصور کیجئے اور یہ سوچئے کہ امیر لشکر نے ان مشکلات اور دشواریوں کے مد نظر اس اسباب و مولیشی کو فروخت کرنے کا کتنا مناسب فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ اسباب غنیمت جو بیت المال کے محس میں کا تھا امیر لشکر نے مروان کو ایک لاکھ دسہیں فروخت کر دیا۔ مروان نے ایک لاکھ میں سے زیادہ رقم نقد ادا کر دی، جو نقدی میں شامل کر کے مدینہ منورہ روانہ کر دی گئی اور بقایا کے متعلق جناب عبداللہ سے یہ وعدہ وعید ہوئے کہ وہ مدینہ پہنچ کر ادا کر دوں گا اور خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ادھر اہل مدینہ کو بڑی گھبراہٹ اور سخت پریشانی تھی کہ کسی کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار اس جہاد میں شریک تھا جو کالے کوسوں پر لڑنے دشمن کی سرزمین پر سرپا تھا، سب کو اندازہ تھا کہ بڑی سخت لڑائی ہوگی، مسافت بھی بڑی دور و دراز کی ہے، راستے اور سرور کیں جدید ہیں۔ نہ کوئی خبر نہ کسی کی اطلاع بھلا خبر ملی بھی تو اتنی کہ دشمن بہت زیادہ بھی ہے اور قوی و طاقتور بھی، بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے اور بہت آدمی شہید ہوئے ہیں۔ ایسی ادھوی و نامکمل اور حوصلہ شکن خبر سے ہر ایک فکر مند پرالندہ حواس اور پریشان تھا۔ ایسے پریشان عالم میں مروان کی آمد سے جو اموال غنیمت سے لدا پھندا تھا، جو فتح کی خوشخبری کے ساتھ لشکریوں کے خطوط پیغامات اور تفصیلی خبریں لایا تھا اہل مدینہ کے لئے مژدہ جانفزا تھا۔ گھر گھر فتح کی خبر امن و سکون بکری پہنچی، اور سب کے لئے خوشی و مسرت اور فرحت و شادمانی کا سامان مہیا ہوا۔ تاریخ کا اگر کوئی مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دن اہل مدینہ نے مروان کو کس نیک اور بچہ رس دعاؤں سے یاد کیا، اور تعریف و تحسین کا کونسا پہلو تھا جس سے تاریخ کیا بے انتہادلی دعاؤں کا تحفہ اے دیا گیا۔ اور بہت تعریف و توصیف ہوئی اور اس وقت تک اس سے قابل شکایت کوئی بات سرزد بھی نہ ہوئی تھی کہ ان تمام باتوں پر اس کی وجہ سے پانی پھر جاتا۔ لہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بشارت کے صلہ میں اور امانتداری اور دیانت سے اس اہم خدمت انجام دینے میں کہ اتنی دور و دراز کی مسافت اور پُر خطر راستوں اور طرح طرح کی مشقت برداشت کر کے مسلمانوں کی امانت بخیر و خوبی پہنچائی۔ اور اہل مدینہ کو فرحت و شادمانی

نصیب ہوئی۔ اس سبب میں کی بقایا رقم کی ادائیگی اس کو معاف کر دی۔ امام و خلیفہ وقت کو یہ اور اختیار ہے کہ بشارت دہندوں، ملک و ملت کے لئے جاسوسی کی خدمت انجام دینے والوں اور مسلمانوں کے لئے خوشخبریوں لانے والے کو بیت المال سے انعامات دے اور پھر یہ کام بھی آپ نے تنہائی یا پوشیدہ طور پر نہیں صحابہ کی موجودگی اور اہل مدینہ کی رعنا مندری سے کیا۔ تو اب اعتراض و طعن کی اس میں کون سی بات ہے۔

یہاں اسراف کے معاملہ میں ایک علمی لطیف نکتہ قابل غور ہے، کہ انعام و عطایا، داد و پیش کئے جانے والی رقم و اموال کا اس مال سے جس سے یہ دیا جا رہا ہے تناسب دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔ مثلاً اگر ایک لاکھ روپیہ میں سے ایک لاکھ روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ عطا کر دیا جائے تو وہ اسراف نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ ایک لاکھ سے ایک ہزار کی ایسی ہی نسبت ہے جیسے دس کی ایک ہزار ہے۔ اور تمام عقلی و حسی امور میں تناسب کی رعایت عقل کے مقتضی کے بھی مطابق ہے، اور شرع کے بھی۔ مثلاً کسی دو ایلین و دو جز گرم ہوں، اور سو جز ٹھنڈے تو اس دو کو سخت گرم، (مرا جاؤ) ہرگز نہیں کہیں گے یہی معاملہ شرع کا ہے، کہ اگر کسی جگہ و مقام کا خرچ ایک لاکھ روپیہ ہو۔ اور مال سے چار سو ہزار وصول کیا جائے تو اس معاملہ کو عدلی ہی کہا جائے گا ظلم و زیادتی اس کا نام لکھنا حکم شرع کے خلاف ہوگا۔

اسی قیاس پر مقدار زکوٰۃ اور دیگر شرعی اندازوں اور غنیمتوں کی تقسیم میں تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اکثر ایسا سوا ہے کہ بڑی رقم میں سے چند ٹکے نکال لینے یا پچہ رہنے کو معمولی اور حقیر شے قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی اس کا امتحان کیا جاسکتا ہے اس طرح کہ اگر ایک آدمی کا ایک سو روپیہ اور ایک روپیہ والا نوٹ گر جائے اور تلاش کے وقت سودا دل جائے ایک والا نہ ملے تو وہ کہے گا جانے ولیک سو کا تو مل گیا۔ روپیہ والا نہیں ملتا تو نہ ملے۔ یہاں اگر اس کی نظر میں تناسب کی اہمیت نہ ہوتی تو بیچنے کی طرح حساب کی مدد سے تلاش کرنے کے لئے روپیہ کا تیل پھونکنے کی مثال یہ بھی قائم کر دیتا کہ روپیہ کے نوٹ کے لئے ہلکان ہو جاتا جیسا اگر سو کا نہ ملتا تو ہوتا (ن)

لہذا اب اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی کی داد و پیش کو دیکھا جائے تو زمانہ خلافت کی وہ داد و پیش جس پر طعن و اعتراض کیا جاتا ہے اتنی حقیر معلوم ہوگی جیسے سوئی کے ناکہ پر پانی کی تری۔ اس لئے اگر بیت المال سے بفرس محال اس خیر چہ کہ تسلیم کر لیا جائے تب بھی اسے اسراف نہیں کہا جاسکتا۔ کہ وڑوں روپیہ پوری فراغت سے راہ خدا میں بطریق خاطر لٹانے والے نے بیت المال سے چند لاکھ کی بخشش کر دی تو قاعدہ مذکورہ بالا کی رو سے یہ اسراف اور قابل اعتراض بات نہیں، بلکہ اگر ان مصارف کو ان کے مجموعی مصارف کے تناسب سے بہت کم دیکھیں تو اصرار کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اوپر معلوم ہو چکا کہ عقلی، حسی اور شرعی امور میں تناسب کو نظر انداز کر کے اقرار و تفریط کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر کوئی لگائے تو وہ مردود و ناقبول ہوگا۔ اسی لئے اس معاملہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اسراف کا الزام مردود اور ناقابل تسلیم ہے۔

اور عبداللہ بن خالد بن اسد بن مثنیٰ لاکھ درہم دینے کا جو ٹوک کہتے ہیں (تو شیعوں کا حال تو تقریباً ہر معاملہ میں "کا نا اور لے بھاگی" کا سا ہے۔ ان کے لئے اتنا کافی ہے کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عہد ورتین لاکھ کی رقم بس نتیجہ نکالنے میں ان کو کیا دیر کہ لوجی! فلاں کو عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال کے تین لاکھ درہم دے ڈالے صحیح معاملہ کی کہوج سے انہیں چڑھے۔ اقتراء اور جھوٹ ان کے لئے شیر مار دہے۔ اسی لئے یہ جو کہتے ہیں عموماً جھوٹ نکالتا ہے۔ اور یہاں بھی) وہ جھوٹ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ قرعہ تھا جو باقاعدہ تحریر کے بعد ان کو دیا گیا تھا۔ اہل مصر کے محاصرہ کے وقت یہی بات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمائی بھی تھی! اور عبداللہ کے وہ روپیہ بیت المال کو واپس کر دیا تھا۔

اسی طرح حارث بن حکم کے بازوؤں کا عشر چنگی وغیرہ کے سلسلہ میں جو کہل ہے، وہ سب غلط ہے اس سلسلہ میں کوئی عطا و بخشش

نہیں کی گئی بات صرف اتنی تھی کہ حادث کو ملازم رکھا گیا اور مختسبوں کی طرح اس کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ بازار کا گشت لگائے بھاؤ تاؤ کی دیکھ بھال رکھے، لوٹ بھٹوٹ، ظلم و زیادتی نہ ہونے دے۔ تول جو کچھ کے ترازو بٹنوں کی جانچ رکھے! ملازمت کو دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ اہل شہر کی طرف سے یہ شکایت ہوئی کہ اس نے بازار کی ساری کچھوڑ کی گٹھلیاں، خود خریدیں دوسرے گا بیوں کو خریدنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور یہیں دوسروں کے اونٹ بے چارہ رہ گئے، کیونکہ یہ ان کی خوراک تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور نوکر کے اسی وقتے برخواست کر کے اہل شہر کی شکایت کا برجل ازالہ کر کے ان کی تسلی خاطر کی!

اس میں عیب و طعن کی کیا بات ہے۔ یہ تو ان کا قابلِ تحسین اور لائقِ تعریف کارنامہ اور یعنی برانصاف عمل ہے کہ قریبی رشتہ داری کے باوجود محض شکایت سننے ہی اس کے خلاف کارروائی کر لائی۔

اسی طرح ابنِ ارقم اور معقیب دوسری کے استغفی کا معاملہ ہے کہ اس میں بھی دھوکہ دھڑکی سے کام لیا، حقیقت کے بجائے اپنی طرف سے من گھڑت انسانہ تراش لیا۔ مجمع بات یہ تھی کہ انہوں نے کبر سنی، اور ضعف کے سبب اس محنت و مشقت طلب خدمت کی کما حقہ ادائیگی سے معذور ہو جانے کی بنیاد پر استغفی دیا تھا۔ اور ان کے استغفی کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مجلس میں خطبہ کے دوران اعلان کیا اور فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ أَرْقَمَ كَذَبَ
عَلَى خِزْآنَتَيْكُمْ مِنْهُ مِمَّنْ أُنِجِي بَكْرًا وَحَمَرًا إِلَى
الْيَوْمِ وَإِنَّهُ قَدْ كَبُرَ وَضَعْفٌ وَقَدْ وَكُنَا
عَمَلِهِ زَيْدٌ بِنِ ثَابِتٍ -

لوگو عجب اللہ بن ارقم جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ سے آج تک تمہارے بیت المال کے خزانچی رہے ہیں اب وہ بوڑھے اور کمزور ہو گئے اس لئے ہم نے ان کا کام زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور بلکہ راعمر انہوں نے جو یہ بات کی ہے کہ آپ کی عمارات، باغات اور کھیت سب بیت المال کے پیسے سے بنے! تو یہ بھی ان کا افتراء اور جھوٹ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ کہنے کا جو نہر اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فطرت میں ودیعت فرمایا تھا۔ اور جو ذہب آپ کو سکھایا تھا، اس کی نظیر بعد میں بھی نہیں دیکھی گئی کہ حق حلال طریقہ پر انتہائی عزت و وقار کے ساتھ بلا تعب و مشقت کسی نے اس تھمال دولت کیا ہو! آپ اپنی حلال کمائی کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اس قدر فراق دہستی اور انبساط قلبی سے خیر کرتے تھے کہ مفسرین حدیث نعم المال الصالح للرجل الصالح۔ رپاک آدمی کی ملکہ میں پاک مال کی اچھائی کا کیا کہنا، کا صحیح مصداق بن گئے تھے۔

عہدِ خلافت سے پہلے کمائی کے بہت سے طریقے آپ اختیار فرماتے سب اور خلافت کے بعد یہ تدبیر اور تجویز ذہن میں آئی کہ آپ اپنی قلمرو میں، حوائی ہونا باجاز، جہاں بھی بنجر و ناکارہ زمین ملتی، خرید لیتے، اور پھر غلاموں اور ملازموں کو کھیتی باڑی کے سامان و اوزار دے کر اس افتادہ زمین کو قابلِ کاشت بناتے پھر لگا دیتے کہ زمین کو آباد کرو اور اس کی آمدنی سے اپنی گذر بسر کرو۔ جب زمین درست ہو جاتی تو باغ لگاتے، اس میں میوہ دار درخت لگاتے، کنویں اور نہریں بنواتے۔ عزم ہر طرح سے اس زمین کی آبادی اور سرسبزی میں کوٹھان رہتے اور یہی وجہ کہ عرب کی زمین جو قحط زدہ، بنجر اور بے آب و گیاہ تھی آپ کے عہدِ خلافت میں اتنی آباد سرسبز و شاداب ہو گئی تھی کہ بڑے بڑے ہڈے فضا علاقوں کی نظیر کہلانے کے مستحق تھی۔ جگہ جگہ چشے جاری ہیں، آبشار لعل ہیں میووں سے درخت لدے ہوئے ہیں، کھیتیاں سرسبز و شاداب ہر طرف لہلہا رہی ہیں۔ گویا زمین نے سونا اگل دیا ہے۔ پھر مولیٰ، غلام، ملازمین کے دیاں آباد ہو

جانے اور بس جانے سے، محروم، وادیوں اور جنگلات میں رہتی، چوری، چکاری کا خدشہ جاتا رہا، دزدوں کا ڈرا اور خوف جاتا رہا کہ وہ آبادیوں کی وجہ سے وہ سے نکل بھاگے! مسافروں کے لئے راستے بے خطر اور پر امن ہو گئے۔ تجارتی قافلے بے کھٹکے آنے جانے لگے۔ راستہ میں ان کو قیام گاہ اور جانوروں کے لئے چارہ کی سہولت میسر آنے لگی مختلف ملکوں اور شہروں سے تجارت کو فروغ ہوا۔ انھیں سامان اور عمدہ اور نئے نئے اشیاء کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں آسانی ہو گئی،

اور یہ دوا اور امن و خوشحالی، آبادی و زراعت آپس ہی عہد سعادت ہمد میں نصیب ہوئے جو عرب میں عجائبات اور خرق عادات میں شمار ہوتے تھے! حدیث شریف میں ایک پیشین گوئی بایں الفاظ کی گئی ہے۔

لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَقُودَ أَرْضَ الْعَرَبِ
مَدَجًا وَأَنْهَارًا۔
جب تک عرب کی زمین مغز اور زہروں والی نہ بن جائے قیامت نہیں آئے گی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم طائی سے فرمایا۔

إِنَّ طَائِفًا مِّنَ الْحَيَاةِ لَتَذَرِيَنَّ الطَّعِينَةَ تَسَافِرُ
مِنْ حَيَاةِ النَّعْمَانِ إِلَى الْكَلْبَةِ لَا تَخَافُ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ۔
اگر تمہاری عمر بڑی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک اونٹ سوار عورت مقام حیرۃ النعمان سے کعبہ تک رہنہام سفر کرے گی اور اس کے دل میں خدا کے ڈر سے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

اور یہی نہیں بلکہ حدیث شریف میں عہد عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مراحت کے ساتھ بطور اظہار مسرت یہ فرمایا گیا کہ عثمان کے زمانہ میں مال و دولت کی کثرت ہوگی خزانہ بہت ہوگا لوگوں میں دولت کی بدولت تکلفات کا رواج ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اس خوش تدبیری کا یہ اثر ہوا کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے، منجملہ ان کے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں کہ آپ نے سواد مبلع، فدک، زہرہ اور دوسرے گاؤں میں اسی ترکیب کو استعمال فرمایا۔ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے غابہ اور اس کے گرد و نواح میں، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ذی خشب اور بصرہ میں اسی تدبیر کو اختیار کیا۔ اسی طرح دیگر اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جہاں جہاں موقع ملا ایسا ہی کیا۔ چنانچہ مدینہ منورہ کے گرد و نواح خوب سرسبز و شاداب اور آباد ہو گئے۔ اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عرصہ خلافت کچھ اور دیر نہ ہو جاتا تو پورے حجاز کی سرزمین، اللہ زار اور بلخ و بہار ہوتی۔

اور جس طرح امام کی اجازت سے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اُفتادہ و بنجر غیر ملوکہ زمین کو اپنے خرچ و محنت سے کارآمد و آباد کر سکتا ہے۔ تو امام و خلیفہ کو اس حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے۔ اور اس زمین کی کمائی خلیفہ کے لئے کیوں نہ حلال ہوگی۔ اور کیوں اس کا تصرف ناجائز ہوگا۔ صریح روایات اور تاریخی حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُفتادہ و بنجر زمین میں کاشت کرتے، غیر آباد کو آباد کرتے، باغات لگواتے، کنویں کھدواتے اور نہریں جاری کرتے، اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی روپیہ پیسے سے کرتے اور اس کا صلہ وصول کرتے۔ اور آمدنی میں روز بروز اضافہ ہوتا۔ اور آپ کے زمانہ میں اہل مدینہ میں کون ایسا تھا جو کھیتی باڑی نہ کرتا یا باغات نہ لگواتا ہوا

اور بیت المال کے بقیہ کو جناب زبیر بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دے دینے کا واقعہ بھی صحیح نما جھوٹ ہے۔ صحیح روایت یہ ہے کہ آپ نے ایک بیت المال سے مستحقین میں رقم تقسیم فرلے کا حکم دیا۔ مستحقین میں سے کوئی باقی نہ رہا اور رقم میں ایک ہزار درہم باقی بچ رہے۔ تو آپ نے وہ رقم جناب زبیر بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور فرمایا کہ اپنی صوابدید کے مطابق مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کر دیں چنانچہ انہوں نے یہ رقم مسجد نبوی کی مرمت و سترگی میں صرف فرمادی۔ محب طبری نے اہل سنت کے گذشتہ واقعات کے ضمن میں اسے بیان کیا ہے!

عزمن بدگمانی کے مرضی علاج میں یہ بدگمان و متعصب لوگ اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ جہاں کہیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ذکر دیکھتے اور اس کے ساتھ آپ کی بیدھڑک اور فرائض و بخشش و عطا کا حال دیکھتے ہیں، تعمیر مساجد و مقامات مقدسہ یا مسلمانوں پر دولت لانے کا، اقربا کی امداد کا واقعہ پڑھتے ہیں تو انکے بند کر کے الزام لگا بیٹھتے ہیں کہ آپ نے یہ سب کچھ بیت المال کی رقم سے کیا، اوریوں مسلمانوں کی رقم ضائع کر کے ان کی حق تلفی کی ہے۔

اس خود ساختہ بدگمانی، اور تعصب و نادانی کا تو کوئی علاج نہیں۔ ان کی مثال تو لشکرِ دہلی کے ان فوجیوں کی سی ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی کے دور میں وہ دہلی میں گھسے اور لوگوں کے مال و اسباب کو اپنے تصرف میں لائے تو جب دہ شہر میں گھومتے، اور سنہری مسجد اور منقش دہلی شان عمارتیں سرائیں، ملاس و فخر دیکھتے تو بہت افسوس کرتے حتیٰ کہ بعض تو روتے بھی۔ اور سبب پوچھنے پر کہتے کہ ہمیں اس کا صدمہ ہے کہ ہمارے بادشاہ کے اموال کو کس بے دردی سے ضائع کیا گیا ہے۔ اگر یہ سارا دولتِ سنبھال کر رکھی جاتی تو آج ہمارے بادشاہ کے کام آتی۔

اعتراض (۴) چوتھا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دورِ خلافت میں کئی صحابہ کو اپنے عہدہ سے معزول کیا۔ مثلاً جناب ابو موسیٰ اشعرى رضی اللہ عنہ کو بصرہ کی امارت سے معزول کر کے آپ کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریم کو متعین کیا۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر سے ہٹایا اور ان کی جگہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ حالانکہ یہ وہ ہیں جو مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے اور جن کا خون حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال کر دیا تھا۔ اور فتح مکہ کے دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور پُر زور سفارش کر کے ان کی عطا معائنہ کرائی، پھر یہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے! جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی ولایت سے معزول کیا۔ نیز جناب مغیرہ بن شعبہ کو بھی کوفہ سے ہٹایا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کوفہ کی فتنہ، لے لی، اور خزانوں کا داروغگی سے علیحدہ کیا۔

جواب۔ اس طعن کا مل ہونا ہر سمجھ دار پر واضح ہے کہ اگر انکے خلفاء کو کسی ماتحت کے عزل و نصب کا اختیار نہ ہو تو پھر اس کی کیا عزت اور وقار رہے گا۔ یہ ان کے اختیاری امور ہیں۔ یہ ہے جس کو چاہیں مقرر کریں جس کو چاہیں معزول کریں نہ ان پر یہ لازم ہے نہ اس کے پابندی میں کہ سابقہ حال ہی کو برقرار رکھیں، بلکہ اس بات کا مفروضہ خیال رکھیں کہ بلا قصور بلا وجہ معزول نہ کریں اور وجہ و سبب ذاتی نہ کر دیں، یہی نہیں مملکت کے مفاد اور انتظامی و سیاسی معاملات بھی ہو سکتے ہیں۔

اور ان حضرات کی معزولی بھی بلا سبب نہیں تھی ان کے اسباب تھے، جنکی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے جسکو دیکھنے ہی سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حسن تدبیر کا پتہ چلتا ہے۔ فی الحقیقت ان حضرات کی علیگی اور دوسرے حضرات کا ان کی جگہ تقرر انتظام و استحکام مملکت کے ساتھ دوسرے شہروں کے فتح کا سبب بھی بنا۔ اور خلافت کی شان کچھ ہے کچھ ہوگئی۔ لشکر و افواج میں اس قدر اضافہ ہوا، ولایت و مملکت کا دائرہ استقرار کشادہ ہوا اور قہر و اسلامی کا خلفہ اس قدر وسیع تر ہوا کہ قیصر و کسریٰ کی نسلوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسلامی مملکت کا طول اگر انداز سے کا بل تک تھا تو عربین قسطنطنیہ سے عدن تک پھیلا ہوا تھا۔ ثانیین عثمان دس بارہ سال صبر و چین سے اور بیٹھے رہتے تو ان کو ایران و خراسان، طرح ہند و سندھ، ترک و چین میں بھی محمد علی علیؑ کے نعرے لگاتے کو مل جاتے! ان بد بختوں کو یہ سوچنے کی بھی توفیق نہ ہوئی، کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھوں سے کام چھین کر گوبنوا امیہ کو مسلط کیا مگر نام تو محمد و آل محمدؑ کا بالا ہو رہا ہے۔ عبداللہ بن عامر کریم کے طفیل ہی یہ مشہد، شیراز، نیشاپور و ہرات میں یا علیؑ کا نعرہ لگانے کے قابل ہوئے اس لیے کہ خراسان اسی نے فتح کیا تھا۔ اور بنوا امیہ کی ترک و چین، ہند و سندھ تک نارسائی ہی نے اس

علاقہ کے لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے آواز سے محروم رکھا۔ اور وہاں کوئی بھی نہ جان سکا کہ علی رضی اللہ عنہ کون ہے۔
ذیل میں ہم مجبوراً عزل و نصب کے اسباب کا اجمالی ذکر کرتے ہیں اور حوالہ میں شیعوں ہی کے معتبر مؤرخین ابن قتیبہ اور ابن اعثم کو پیش کرتے ہیں، تاکہ انہیں کچھ تولدج آئے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی علیہ کی اگر عمل میں نہ آتی تو سخت خاندان اور فتنہ کا اثر پیشہ تھا جو اگر چھوٹ پڑتا تو ناقابل تدارک ہوتا۔ کوفہ اور بصرہ دونوں تباہ ہو جاتے۔ کیونکہ دونوں شہر کے لشکریوں میں سخت اختلاف و نفاق رونما ہو چکا تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بصرہ کے گورنر تھے۔ اس کی حدود فارس سے ملتی تھی، جس کے زمیندار، خاصے طاقتور تھے ان سے مقابلہ کے لئے آپ نے خلافت سے استدعا بھی، چنانچہ پیشگاہ خلافت کی طرف سے کوفہ کے لشکر کو ان کی مدد و اعانت کے لئے مقرر کیا۔ وہ کوئی لشکر ابھی بصرہ نہیں پہنچا تھا کہ راستہ میں راسم مز سے لڑنے کی نوبت آگئی۔ یہ فائیک و ابو اوز کے درمیان ایک بڑا شہر تھا یہ لشکر اُدھر رو گیا۔ لڑائی ہوئی، اسلامی لشکر کو نمایاں فتح حاصل ہوئی، شہر بھی قبضہ میں آیا قلعہ بھی سرنگوں ہوا بے شمار مال و دولت، گورنری خلاصہ، ہاتھ آئے۔ اس سے پہلے بصرہ کے لشکر بھی ان سے ہمدرد نہ رہتے تھے۔ اس بنا پر جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ مال غنیمت تنہا کوئی لشکر میں تقسیم نہ ہو بلکہ بصری لشکر کو بھی اس سے حصہ ملے۔ اس لئے انہوں نے کوئی لشکر کو کہا کہ جن لوگوں سے تم لڑے، جن کے مکانات تم نے تباہ و برباد کئے ان کو تو طیل امان دے چکا تھا۔ اور چھ ماہ کی مہلت ان کو دے چکا تھا۔ اور تم کو تو میں نے مرنے ڈرانے دھمکانے اور سب ڈالنے کیلئے ملا یا تھا تم تو ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے اور جلد بازی سے کام لے لیا۔ مگر کوئی لشکر نے بصری لشکر کو غنیمت میں شریک کرنے سے انکار کیا اور کہا یہ امان دینے کا قصہ افترا اور جھوٹ ہے۔ یا ہم رد و کد نے شدت اختیار کر لی، اور دونوں لشکروں میں جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی، جب اس قصہ کی خبر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے شریک لشکر بزرگ و محترم صحابہ مثلاً حذیفہ بن یمان، ہذا بن عازب، عمران بن حصین، انس بن مالک اور سعید بن عمرو انصاری (رضی اللہ عنہم) اس معاملہ کی تحقیق و تفتیش کریں، اددیہ دیکھیں کہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی قسم کا کیا معاملہ ہے۔ میں انہیں حضرات کی تحقیق و تفتیش کے لحاظ سے اپنا فیصلہ دے دوں گا۔ جناب موسیٰ رضی اللہ عنہ نے ان سب حضرات کے سامنے قسم کھائی۔ تو خلافت کا حکم صادر ہوا۔ کہ مال اور قیدی، سب واپس کر دئے جائیں۔ اور مدت معینہ امان تنگ ان کو بالکل نہ چھیڑا جائے!

یہ فیصلہ کوئی لشکر کو ناگوار ہوا، اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئے۔ کوئی لشکر بھی ایک جماعت خلیفہ کے ہاں پہنچی اور اعتراض کیا کہ اگر واقعی امان دی گئی ہوتی تو بصرہ کے لشکریوں کو تو اس کی اطلاع ہوتی اور ان میں یہ بات مشہور و معروف ہوتی حالانکہ لشکر میں کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے جھوٹی قسم کھائی ہے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور قسم کے بارے میں ان سے استفسار کیا، اس وقت بھی انہوں نے قسم کھا کر یہی کہا کہ میں نے سچی قسم کھائی ہے، اس پر آپ نے فرمایا اگر معاملہ یوں تھا تو پھر ان لشکریوں کو ان پر کیوں چڑھایا، کہ انہوں نے وہاں جا کر یہ سب کچھ کیا۔ قسم آپ کی اگر جھوٹی نہیں ہے تب بھی ملک داری کی مصلحت کے خلاف یہ آپ کی بہت بڑی غلطی ہے۔ سردست میرے پاس کوئی مناسب آدمی نہیں کہ آپ کی جگہ مقرر کر دوں فی الحال آپ بصرہ جائیں، صوبہ داری اور لشکر کی سرداری سنبھالیں جب مجھے کوئی کام آوے گا تو آپ کو معزول کر دوں گا و آپ کی قسم کا معاملہ سوجھ بوجھ کے سپرد کرتا ہوں،

اسی دوران آپ شہید کر دئے گئے اور امور خلافت کے ولی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہوئے اُدھر بصری لشکریوں نے بھی شکایتوں کی بھرمار کر دی۔ اور ویرانی میں کججوسی کی شکایات و برباد خلافت میں پہنچائیں کوئی لشکر پہلے ہی ان سے کبیروہ خاطر تھا۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غور کیا کہ اگر ان کو تبدیل نہ کیا گیا تو دونوں لشکر یا فروختہ ہوں گے اور فرائض منصبی بدلی سے انجام دینگے اور نتیجہ دونوں صوبوں کا حال ابتر ہو جائے گا لہذا مجبوراً ان کو وہاں سے ہٹا کر ان کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جو برگزیدہ قریشی جوان تھے۔ اور حبیبہ وچھے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے تو آپ نے اپنا لعاب مبارک ان کے منہ میں ڈالا! جوانی سہی میں جذبہ شہادت و نجات کے آثار، سرور و ریاست کے علامات ان کے اقوال و اعمال و حرکات سے ہویں تھے۔ ان کا تقرر ان اطراف کے انتظام و انصرام اور دونوں لشکروں کی دلچسپی کے لئے واقعی بہت ضرورہ اور کارآمد ثابت ہوا۔

احمد بن ابی سیارہ نے تاریخ مروی روایت کی ہے کہ جب عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے خراسان فتح کیا تو اعلان کیا کہ میں انہما پر لشکر میں یہاں اس جگہ سے احرام باندھ کر نکلوں گا۔ چنانچہ وہ پیشاپور سے احرام باندھ کر نکلے! سعید بن مسعود نے بھی اپنی سنن میں ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔

اور جناب عروبن عامر رضی اللہ عنہ کا عزل اہل مصر کی بے شمار شکایات پر عمل میں آیا تھا۔ محمد فائق میں بھی بعض امور کی وجہ سے معزول ہوئے مگر توبہ کر لینے پر بحال کر دیئے گئے تھے۔ لیکن شیعوں کو تو ان دو حضرات کی معزولی کی بنا پر حضرت عثمانؓ پر اعتراض کرنا کچھ ترسب نہیں دیتا۔ اس لئے کہ یہ تو ان دونوں کو واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ انہیں تو حضرت شہید رضی اللہ عنہ کا لشکر گزار ہونا چاہئے کہ اے لوگوں! انہوں نے معزول کیا۔ جب وہ اسلام کی قابلیت ہی نہیں رکھتے تو اسلامی ریاست کا حق ان کو کیسے اور کیوں پہنچے اسی لئے بعض اہل سنت اس کو بطور لطیفہ یوں بیان کرتے ہیں کہ شیعوں کو توبہ کہنا چاہئے تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کرنے پر اکتفا کیوں فرمایا ان کو قتل کیوں نہیں کیا۔ لہذا حکیم کے موقع پر امت کے حق میں بداندیشی اور امام وقت کی شان میں بدسگالی کر رہی نہ پاتے۔

بعض خوش بعب حضرات نے اس طعن کا جواب اس انداز سے دیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ یہ تو سمجھتے تھے کہ اگر میں ان دونوں کو ختم کر دوں تو پھر میری امامت پر خاص وعام کے نزدیک ثابت اور مسلم ہو جائیگی۔ اور چونکہ غیب کا علم امام کی خصوصیت ہے۔ اس لئے شیعوں کو بھی انکار کا موقع نہ ہوگا مگر چونکہ آپ کے مزاج پر حیا و مروت غالب تھی، اس لئے یہ سمجھ کر کہ اس میں شیعوں کی کلم کھلا تکذیب ہوگی اور وہ بے چارے نادام و شرمندہ ہوں گے، اس لئے ان کو صرف معزول کرنے پر اکتفا کیا، اس پر اگر شیعہ یہ اعتراض کریں کہ اگر جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ معزول کیے جانے کے لائق ہوتے تو حضرت علیؓ کو م اللہ وجہ ان کو اپنی طرف سے ثالث رکھ کر، کیوں مقرر کرتے، تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے مجبوراً ان کو حکم بنایا، راضی خوشی اور اختیاراً نہیں بنایا۔ اور چلو یہ مان لیں کہ خوشی ہی سے بنایا تب بھی تو چوک ہوئی۔

فائدہ جلیلہ

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما پر مطاعن اور اعتراضات سوائے شیعوں کے اور کوئی نہیں کرتا۔ یہ مطاعن اہل سنت کی کتابوں میں شیعوں کی کتب سے ہی منقول ہوتے ہیں جو اکثر شیعہ اصول پر منطبق ہوتے ہیں۔ مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر مطاعن باعتبار اکثر شیعہ اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ پر اعتراض کرنے والے شیعہ بھی ہیں اور خوارج بھی۔ لہذا اعتراضات کی دو قسمیں ہو گئیں ایک وہ جو اصول شیعہ کے بموجب ہیں دوسرے خوارج کے اصول کے موافق۔ اس لئے اہل سنت کی کتابوں میں دونوں اقسام خلط ملط کر کے بیان ہو جاتی ہیں اور شیعہ تیر دانستہ کہ اعتراضات کی تعداد بہت معلوم ہو دونوں قسم کے اعتراضات تمیز و تفریق کے بغیر بیان کر جاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعض اعتراضات جو شیعوں یا سننوں کی کتب میں منقول و موجود ہیں وہ نہ مول شیعہ کے مطابق ہیں نہ ان کے مذہب کے موافق چنانچہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پر اعتراض اسی نوع کا ہے اور حضرت عروبن عامر رضی اللہ عنہ کی موقوفی پر اعتراض نہ اصول شیعہ پر منطبق ہوتا ہے نہ اصول خوارج پر۔ اسلئے کہ یہ دونوں گروہ تکمیل

کہتے ہیں اگرچہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کیا اسوقت ان سے کوئی قوی فعل موجب کسر سر نہ ہوا تھا بلکہ چونکہ انھیں شیعوں اور خوارج کے نزدیک وہ کافر اور مرتد ہو گئے تھے۔ اس لئے ایسے صورت میں تو ان کی موقوفی اور عزل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت سمجھی جانی چاہئے، نہ کہ قابلِ اعتراض!

اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کی یہ بھی کرامت ہے کہ شیعہ آپ سے جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی درخواست کرتے تھے۔ آپ نے ان کو دکھایا کہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو موقوف کر کے عبداللہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کو ان کی جگہ مقرر فرمایا۔ اگرچہ وہ ابتدائے اسلام میں مرتد ہو گئے تھے لیکن دوبارہ اسلام لانے کے بعد ان سے کوئی برا فعل سرزد نہیں ہوا بلکہ ان کی حسن و تدبیر اور نیک نیتی کے سبب عرب کا پورا علاقہ فتح ہوا اور بے شمار خزانے دربار خلافت کو حاصل ہوئے حتیٰ کہ مغربی جزائر پر بھی حملہ آور ہوئے، اور غنائم حاصل کئے، سوریہ میں نے لکھا ہے کہ ان کے غنائم سے پچیس لاکھ دینار رکھے سونے کے جمع ہوئے اور دیگر سامان، زیورات اور سولشیوں وغیرہ کا تو کوئی حدود شمار تھا۔ اس کا پانچواں حصہ بیت المال کے لئے بھیجا جو مسلمانوں پر تقسیم ہوا اور باقی چار حصے اپنے لشکر میں شرعی طریقے پر تقسیم کئے۔ ان کے لشکر میں بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی تھے اور صحابہ کی اولادیں بھی وہ سب کے سب ان کی عادات و اطوار اور طرز عمل سے خوش تھے، ان کے کسی طرز عمل پر ان کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان حضرات میں عقبہ بن عامر جہنی، عبدالرحمن بن ابوبکر صدیق عبداللہ بن عمرو بن عاص وغیرہ رضی اللہ عنہم تھے۔ پھر جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت پیش آیا تو خود کناہہ کش اور غیر جانبدار رہے۔ کہتے تھے کہ ہم نے خدا سے عہد کیا ہے کہ کافروں سے جہاد و قتال کے بعد مسلمانوں سے قتال نہیں کریں گے۔ آخر عمر تک عزت کریں اور گوشہ نشین رہے۔

اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا یہ سراسر خلاف واقعہ بات ہے۔ ان کو تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کی شکایت پر موقوف کیا تھا۔ اور ان کی موقوفی پر آپ نے یہ تاریخی کلمات فرمائے تھے۔

مَنْ يَعْنُ رُؤْيَا أَهْلِ الْكُوفَةِ إِنْ اسْتَعْمَلْتُ
عَلَيْهِمْ قُوًى اسْتَفْعَوْا وَإِنْ اسْتَعْمَلْتُ قُوًى
فَجَزَوْهُ۔
مجھے اہل کوفہ کے معاملہ میں کون معذور کرہہ سکتا ہے اگر میں نے ان پر ہمتی عامل مقرر کیا تو اسے انہوں نے کمزور قرار دیا۔ اور اگر کوئی قوی عامل ان پر مقرر کیا تو اس میں کیرے لگانے لگے!

پھر ان کی جگہ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب ان کو بھی رشوت ستانی سے مہتمم کیا جو سراسر جھوٹ اور افترا پر دانی تھی۔ مگر آپ نے رعایا کے پاس خاطر کے سبب ان کو بھی موقوف کر دیا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے مدینہ کیوں بلایا اس کا حال بھی انشاء اللہ آگے بیان کیا جائے گا۔

اور ان سب باتوں سے قطع نظر خلیفہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جس کو چاہے عامل مقرر کرے اور جسکو چاہے موقوف کر دے۔ کسی کو اعتراض کا کیا حق! اور طعن کی کیا مجال!

رہی یہ بات کہ صحابی کو موقوف کر کے غیر صحابی کو مقرر کرنا، تو یہ واقعات تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بھی وقوع میں آئے۔ مثلاً حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ریب تھے جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ کی طرف سے بحرین کے عامل تھے۔ ان کو بلا وجہ و سبب اور بے قصور و مل سے علیحدہ کیا۔ اور اس کا اعتراض آپ نے اس مراسلہ میں خود فرمایا جو ان کی معزولی کے سلسلہ میں ان کو لکھا گیا۔ اور جس کی نقل بحوالہ نوح البلاغہ باب مطالعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ گذر چکی۔ اور ان کے جگہ نعمان بن عجلان دوقی کو مقرر فرمایا، جو بے صحابی تھا۔ نہ علم و تقویٰ عدل و ثبات میں جناب عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کا عزیز و پیارے اسی طرح جناب قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علمبردار تھے۔ اور خود صحابی و صحابی زوہ تھے جناب

امیر رضی اللہ عنہ نے مصر کی گورنری سے معزول کر کے مالک اشتر کو ان کی جگہ مقرر فرمایا۔ جو صحابی تو کیا صحابی زادہ بھی تھا بلکہ فتنہ و فساد کی پورٹ تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اسی نے شہید کیا۔ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو لڑا دھما کر بغاوت کا سبب بنا، اور اس کو اس علم یقینی کے باوجود مصر کا عامل بنایا کہ وہ مصر پہنچے گا۔ تو جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کو برداشت نہ کرینگے اور وہ مصر پر چڑھائی کر دیں گے اور معاملات دگرگوں ہو جائیں گے۔

اعتراض (۵) پانچواں اعتراض آپ پر یہ ہے کہ جناب عبداللہ بن مسعود اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا عہد فاروقی سے جو سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اس کو بند کر دیا۔ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے ریزہ بد کر دیا۔ جناب عبادہ بن ہامت رضی اللہ عنہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امر بالمعروف کے سبب ناراض ہوئے، جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو منافق کہا۔ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو اتنا مارا کہ آنت اترنے کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ کعب بن عبد اللہ ہزری رضی اللہ عنہ کو کلمہ حق کہنے کی بنا پر امانت و تحقیر کی۔

یہ لوگ جلیل القدر صحابہ تھے جن کی امانت اہل سنت کے نزدیک انسان کی دیانت و جود ہونے کا سبب ہوتی ہے، تو جب اہل سنت کے نزدیک ان کی دیانت ہی برقرار نہ رہی تو ان کی امامت کیسے درست ہوگی۔

(روایت شیعہ کے مطابق) ان واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، شام میں تھے، جب قاصدوں کے ذریعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے افعال ناشائستہ ان کو معلوم ہوئے، تو ان معائب کی سربلالتشہیر اور ان پر کھلم کھلا تنقید اور شکستہ چینی کرنے لگے، تو جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ تم کو لوگوں کے سامنے ذلیل کرتے اور تمہاری اطاعت سے ان کو نکالتے ہیں۔ ان کا دفعیہ جلد از جلد کیا جانا چاہئے تین آپ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ اَشْخَصُّهُ عَلٰی صَوْلَکَیْہِ وَعِزِّ وَ سَالِیْقٍ عَلَیْقَہِ۔ (ان کو میرے پاس تیرا سوار اور تیرا نالائقہ دلے کے سمرا بھیجو)

چنانچہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اسی صورت سے مدینہ روانہ کیا، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو آپ ان پر غصہ ہوئے اور کہا کہ تم کیوں لوگوں کو کچھ پر جی کرتے اور ان کو میری اطاعت سے نکالتے ہو تو ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ آپ نے فرمایا کہ جب حکم بن ابی العاص کی اولاد تیس آدمیوں تک پہنچی تو خدا کے مال کو اپنا ٹھہرائیں گے اور اللہ کے بندوں کو نوٹندی غلام سمجھیں گے اور خدا کے دین میں حیلہ اور جھوٹ کو دخل دیں گے جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوگا اور بندگان خدا کو ان سے نجات بخئے گا۔ مجلس میں جو صحابہ موجود تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے؟ سب نے انکار کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوا کر ان سے دریافت کیا آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی سے یہ حدیث نہیں سنی۔ البتہ یہ دو کلمہ حدیث سنی ہے کہ مَا أَطْلَعْتُ الْخَضِرَاءُ وَلَا أَقْلَسْتُ الْغُبَارَ وَأَصْدَقَ لَهْجَةٍ مِنَ الْإِلَیْ دَرَجَةٍ۔ کسی پر نیل گوں آسمان سایہ فگن ہوا اور نہ گرد آلود زمین نے کسی کو اٹھایا جو ابوذر سے بات میں سچا ہوا

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غصہ ہوئے اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم شہر سے نکل جاؤ چنانچہ وہ ریزہ چلا گئے اور آخر دم تک وہیں رہے!

حضرت عبادہ بن ہامت رضی اللہ عنہ بھی شام میں تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اونٹنوں کی ایک قطار کو جن پر نشہ اور شراب لاری ہوئی تھی جاتے دیکھا تو پوچھا کیل ہے۔ بتایا گیا کہ یہ شراب ہے جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بغرض فروخت بھیجی ہے۔ آپ چری لے

کرٹھے اور شراب کی مشکین اور پکھالیں پھاڑ ڈالیں اور ساری شراب بہ گئی۔

پیر اہل شام کو حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی بری خصلتوں سے ڈرایا جناب امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے یہ قصہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ آپ عبادہ (رضی اللہ عنہ) کو اپنے پاس بلا لیں یہاں رہنے سے لشکر و ملک میں وہ فساد کا سبب بن جائیں گے۔ چنانچہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے ان کو مدینہ بلوایا اور سخت ناراض ہوئے کہ مجھ پر اور معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر کیوں نکلتے جینی کرتے ہو۔ کیا ابوالامر کی اطاعت کرنا بھی نہیں جانتے۔ جناب عبادہ (رضی اللہ عنہ) نے جواب دیا لَا طَاعَةَ لِمُخْلِقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ خدا کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

اولاد حضرت محمد بن سعود (رضی اللہ عنہ) کو جب عہدہ قضا اور خزانہ داری سے برطرف کیا اور ولید بن عقبہ کو حاکم بنایا۔ تو جناب محمد بن سعود (رضی اللہ عنہ) نے ولید کے ظلم و ستم سے آشفتنہ خاطر ہو کر لوگوں کے سامنے اس کے معائب بیان کرنا شروع کر دیئے۔ لوگوں کو کوئی کہ مسجد میں جمع کر کے (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی برائیاں ان کے سامنے رکھیں، اور کہا کہ لوگو اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرو گے تو خدا کا غضب تم پر نازل ہوگا اور تم پر مجھے لوگ مسلط کر دیئے جائیں گے۔ نیکوں کی دعائیں مقبول نہیں ہوں گی۔ اور جب ان کو جناب ابوذر (رضی اللہ عنہ) کی شہر بدری کی اطلاع ملی، تو مجمع عام میں تقریر کی اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر طعن کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی ثَمَّ اَنَّهُ هُوَ اَعْوَجُّكَ اَنفُسُكُمْ وَتَخَذُحُّونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ دِيَارِ هُم۔ (پھر تم وہ لوگ ہو جو اپنی ہی کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی فریق کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔ ولید نے یہ واقعات حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو لکھ بھیجے، تو آپ نے ان کو کوفہ سے بلایا۔ جب وہ مسجد نبوی میں پہنچے تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ ان کو مارے۔ غلام نے ان کو پیٹ کر مسجد سے نکال دیا۔ ان کے قرآن کو جلا ڈالا اور ان کے گھر میں ان کو قید کر دیا۔ اور سالانہ وظیفہ چار سال کے لئے بند کر دیا اسی حال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے وصیت کی کہ میری نسا ز جنازہ جناب زبیر (رضی اللہ عنہ) پڑھائیں۔ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے پڑھائیں۔ بیماری کی خبر سن کر حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) مزاج پرسی کو گئے تو ان سے کہا کہ اے ابن سعود (رضی اللہ عنہ) میرے لئے خدا سے گناہوں کی معافی چاہو، ابن سعود (رضی اللہ عنہ) نے کہا اے اللہ تو غفور رحیم لیکن عثمان سے درگزر نہ کرنا تو قہیکہ تو اس میرا بھائی ہے۔ جب سب صحابہ (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) سے آزدہ خاطر ہوئے اور حضرت عبدالرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہ) پر بھائی چارہ کے تعلق پر ناراضگی کا اظہار کیا تو جناب عبدالرحمن (رضی اللہ عنہ) شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایسے نکلیں گے۔ اب معاملہ تمہارے اختیار میں ہے۔ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو کہا کہ عبدالرحمن (رضی اللہ عنہ) منافق ہے۔ اسے پرواہ نہیں کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ عبدالرحمن (رضی اللہ عنہ) نے سخت قسم کھائی کہ جب تک زندہ ہوں عثمان (رضی اللہ عنہ) سے بات نہیں کروں گا۔ چنانچہ اسی جہاں کے عالم میں انتقال کیا۔

لہذا اگر عبدالرحمن (رضی اللہ عنہ) منافق تھے تو ان کی بیعت صحیح نہ رہی اور اگر منافق نہ تھے تو خود حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) ان پر نفاق کی تہمت لگانے کے سبب فاسق ہوئے۔ اور فاسق امامت کے قابل نہیں۔

اور عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) کے پیٹنے کا قصہ یہ ہے کہ تقریباً پچاس صحابہ (رضی اللہ عنہ) نے جمع ہو کر ایک خط لکھا اور اس میں حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے معائب لکھے اور جناب عمار (رضی اللہ عنہ) سے کہا تم یہ خط حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو پہنچاؤ۔ ممکن ہے وہ ان باتوں سے آگاہ ہو کر اپنی بد اطواریوں سے باز آجائیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھا رہا تھا کہ اگر تم ان بدعات سے باز نہ آئے تو ہر ایک کو معزول کر دیں گے اور کسی دوسرے کو تمہاری جگہ مقرر کر دیں گے۔ صاحب آپ نے خط پڑھا تو اس کو زمین پر پھینک دیا۔ اس پر عمار (رضی اللہ عنہ) نے کہا اس خط کو حقیر نہ جانتے اسے اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لکھا ہے کہ آپ کو پہنچا ہے خدا کی قسم میں آپ کے پاس نصیحت و نیر خواہی کچھ جذبہ سے آیا ہوں۔ اور

آپ کے بارے میں خوفزدہ ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اے ابن مسیبہ تو صورت بولت ہے۔ اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ان کو ماریں۔ چنانچہ انہوں نے اتنا مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر آپ خود اٹھے اور ان کے پیٹ اور عضو مخفوس پہلا تیس ماریں کہ آپ کو فتنہ کی بیماری لاحق ہو گئی۔ بیہوشی ہی کے عالم میں ان کی چار نمازیں بھی قضا ہو گئیں، جو بیہوش میں اگر انہوں نے ادا کیں۔ فتنہ کے عارضہ کے سبب جس نے سب سے پہلے پاجامہ یا شلواری پہنی وہ عمار رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

بنو فزرم اس واقعہ سے بہت ہریم ہوئے، اور کہا کہ اگر عمار رضی اللہ عنہ اس فتنہ کی بیماری سے مر گئے تو ہم ان کے بدلہ میں بنو امیہ کے ایک بڑے آدمی کو مار ڈالیں گے۔ اس واقعہ کے بعد عمار رضی اللہ عنہ گھریں گھر نشین ہو گئے تا آنکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے! کعب بن عبدہ ہنزی رضی اللہ عنہ کا قصہ یوں ہے کہ اہل کوفہ کی ایک جماعت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا اور اس میں آپ کے ایک ایک عیب اور برائی لکھی اور لکھا کہ اگر برائیوں سے باز آ جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ ہم آپ کی اطاعت سے نکل جائیں گے، اطلاق شرط تھی سو وہ ہم نے پوری کر دی۔ یہ خط آپ تک پہنچانے کیلئے قافلہ کے کسی آدمی کو دیدیا۔ کعب بن عبدہ نے بھی الگ سے آپ کو ایک خط لکھا جس میں بڑے درشت اور سخت انداز میں آپ کو مخاطب کیا تھا وہ خط بھی اسی قاصد کو دیدیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر بہت غصہ ہوئے۔ اور جناب سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ کعب بن عبدہ کو کوفہ سے نکال دو تاکہ وہ کوہستان چلا جائے۔ چنانچہ وہ ان کے گھر گئے، ان کو یہ سہنہ کیا اور بیس کوڑے لگائے اور پھر شہر بدر کر کے کوہستان کی طرف بھیج دیا۔

سعید بن العاص نے اشتر نخعی کی بھی توہین و تذلیل کی، اس کا قصہ یوں ہے وجاہہ سعید جب کوفہ کے صوبہ دار ہوئے اور مسجد میں گئے تو سب لوگ آپ کے پاس آئے۔ اور کوفہ اور مصافات کی خوبیاں بیان کرنے لگے، عبد الرحمن بن حسین جو کوہ وال شہر تھا۔ بولا کہ کاش کوفہ کے مصافات ہمارے امیر کی جاگیر میں آجائیں۔ اس پر اشتر نخعی بولا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو ہم نے تلوار سے فتح کیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے ہمیں اس کا مالک بنالیا ہے۔ عبد الرحمن نے اسے ڈانسا، اور کہا کہ امیر اگر چاہیں تو یہ سارا علاقہ ضبط کر سکتے ہیں۔ اشتر نے درشتی اور سختی برتی تو اور لوگ بھی اس کی حمایت اور اپنی زمینوں کے پاس میں اٹھ کھڑے ہوئے اور عبد الرحمن کو اتنا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔

سعید نے یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ اشتر، اور اس کے مددگاروں کو کوفہ سے نکال کر شام بھیج دو، چنانچہ وہ شام چلے گئے، اور قتل عثمان رضی اللہ عنہ تک وہیں رہے! پھر سعید بھی کوفہ کا انتظام نہ سنبھال سکے، لوگ بلوہ کر کے ان پر چڑھ آئے۔ اور وہ مدینہ چلے گئے۔ اس وقت کوفہ کے سرداروں نے اشتر کو لکھا کہ تمہارے بھائیوں نے ایک عہد کر لیا اور قسم کھائی ہے۔ سعید کو کوفہ سے نکال دیا ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھو اور ہم سے آلو تاکہ سب مل جل کر یہ ہم سر کریں چنانچہ وہ فوراً کوفہ پہنچا اور ثابت بن قیس کو تو ال شہر کو مابین کر نکال دیا۔ کوفہ کی تمام فوجیں اشتر کے ساتھ مل گئیں اور قسم کھائی کہ اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کسی عامل کو کوفہ میں نہ آئے دیں گے۔ آخر آپ نے مجبور ہو کر انہیں لوگوں کی خواہش کے مطابق حضرت ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کا صوبہ دار مقرر کر کے بھیجا۔

جواب ۱۔ اس طعن و اعتراض کا اجابی اور الزامی جواب تو یہ ہے کہ جن حضرات کے حوالہ سے شیعوں نے اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے اکثر تو خود ان کے نزدیک و امیب الغل تھے۔ وہ عزت و احترام کے قاب میں نہ تھے، کیونکہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سرگرم کو چھپایا ”ظالموں“ کی مدد سے اہل بیت کے حق کو نکالت کیا۔ اور شہادت حق سے خاموش رہے! اور شیعہ منطق کی رو سے ایسے حضرات سے جو بتناؤ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کرا تھا وہ اگر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے کر دیا تو ان پر طعن و اعتراض کیوں؟ ان کی تعریف کرنی چاہئے! اور ایک دو حضرات جو شیعوں کے پاس اس سلوک سے مستثنیٰ بھی ہیں تو ان کا ایک دوسرا جرم ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے بھی انکو عقوبت ملنی چاہی

چاہئے تھی۔ التنبہ دینی و دین آجائی کے پیش نظر جب خود جناب امیر رضی اللہ عنہ خاموش تھے۔ تو انہوں نے یہ جواب کیوں ترک کیا۔ جناب امیر کی تقلید کیوں نہ کی ان کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باتوں کو خاموشی سے گوارا کرنا چاہئے تھا اور خاموشی رہنا چاہئے تھا۔ پھر ان دونوں کا بڑ بے وفائی، بھی ثابت ہو گیا، کہ ذاتی معاملات کی وجہ سے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی کی، ان کے مقابلہ پر اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کے ہاتھوں امانت وغیرہ برداشت کی، مگر عبدالجبار صدیق رضی اللہ عنہ میں جبکہ نص امامت کے اظہار کا اصل موقع اور وقت تھا، خاموش رہے، جس کی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کا دینی حق بھی تلف ہوا۔ اور دین پیہر میں بھی خلل پڑا۔ ایسے بے وفائوں کو اچھا ہوا سزا ملی۔ اس کی وجہ سے جناب عثمان پر طعن کیوں؟ انہوں نے تو عین شیعہ فلسفہ کے مطابق ان پر گرفت فرمائی، کہ لقیہ کیوں چھوڑا۔ علی الاعلان بات کہنے کے مرتکب کیوں ہوئے۔

جواب (۲) خلافت و امامت کا معاملہ اٹا اہم اور مہتمم با شان ہے کہ اس کی حفاظت و بقا کے لئے، اور اس میں ہمہی اور انتشار پیدا کرنے والوں، یا اس کی حریم پر اثر اندازی کے وقت کسی قسم کا لحاظ و مروت کرنا مستحکم و غفلت برتنا مناسب اور زیر بانہیں، خود جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حرم رسول ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا لالہ و پاس نہیں فرمایا،

جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری، قدیم الاسلام، رشتہ دار تھے دونوں کو قتل کیا۔ اور عین خلافت کی حفاظت کی خاطر، ورنہ یہ بات تو جناب امیر رضی اللہ عنہ بخوبی اور بوثوق جانتے تھے کہ یہ حضرت اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما آپ کی جان کے خواباں نہیں تھے۔ وہ تو مروت قاتلان عثمان کا مطالبہ کرتے تھے۔ مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خیال مبارک میں، لشکر سے اس قدر فوج کا کٹا کر علیہ ہوجانا خلافت و مملکت میں خلل پیدا کرتا اور خلیفہ کا حکم ناقابل عمل ٹھہرتا تھا، اس لئے ان سے لڑائی لڑی۔ اور رشتہ داری، سسرال، زوجیت اور صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سارے ہی علاقے نظر انداز فرما دیئے!

اور جب کوفہ والوں کو جناب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت سے باز رکھا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے خاطر خواہ ان کی سرزنش کی۔ اور مالک اشتر کے ذریعہ ان کا گھر جلوا یا گیا مال و اسباب لوٹا گیا اور آپ نے اسے روک رکھا، یہ باتیں ہر دو قوت کی تاریخ میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ تو گو یا معلوم ہوا کہ امیر خلافت کے استحکام و حفاظت کے سلسلہ میں چھوٹی موٹی مصلحتیں تلف ہوتی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ وجود خلافت اور استحکام خلافت سب سے مقدم اور نہایت اہم مصلحت ہے۔ تو اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی حفاظت و صیانت کے لئے بعض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرایا ہو یا امانت کی ہو، تو وہ موجب طعن کیوں؟ جبکہ یہ ڈرانا یا امانت قتل سے بہر حال کم ہی ہے۔

اور جنگ جمل کے بعد ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جس قدر توہین و تذلیل ہوئی تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے، بیجا بات تو وہ تھے جو شیعہ فلسفہ و مذاق کے مطابق تھے۔ لیکن اہلسنت نے صحیح روایات کی روشنی میں اس اعتراض و طعن کا جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر اصحاب کی موجودگی میں بھی اور علیؓ کی میں بھی بار بار تاکید فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تم کو کسی وقت خلافت کی غفلت سے نوازے گا۔ منافق اس شرف کو تم سے چھیننا چاہیں تو مزاحمت اور جھگڑنے کے بجائے صبر کرنا۔ چنانچہ اہل سنت کی صحاح میں یہ روایت موجود ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کی مجلس میں ایک روز فقہ کا ذکر فرما رہے تھے کہ عنقریب واقع ہوگا۔ اس ذکر سے رفقاء کو سراسیمہ دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس وقت یہ راہ راست پیہروں گے۔ صحابہ کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے! پھر ایک مرتبہ اسی فقہ کے ذکر کے دوران فرمایا کہ اس روز بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے کھڑا ہونے والا چلنے والے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔

مرض وصال میں ایک روز فرمایا لیت عنندی رجاء اکلہ۔ (کاش اسوقت میرے پاس وہ شخص ہوتا جس سے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اہل بیت کو ام نے، حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا نام لے کر دریافت کیا کہ ان کو بلائیں تو آپ نے انکار فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بھی انکار فرمایا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیا گیا تو آپ نے فرمایا ہاں! بہب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت دیر تک سرگوشی میں کچھ گفتگو فرماتے رہے، مرض کی وجہ سے آپ لیٹے ہوئے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سر کو سید مبارک پر رکھے ہوئے وصیت فرما رہے تھے۔ اور ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اسوقت بے اختیار آب و از بلند اللہ المستعان، اللہ المستعان کے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ یہ روایت ازواج مطہرات اور اسوقت موجود دیگر خدام خانہ رضوان اللہ علیہم نے بیان فرمائی۔ ایک مرتبہ جناب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دو، اور کہو کہ تم پرعام بلوہ ہوگا۔ خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس قطعی نصوص و احکام اور تاکید و صایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود تھیں۔ اور آپ ان وصایا پر ثابت قدم رہے! جب آپ نے دیکھا کہ منافقین کے ساتھ کچھ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی لا علمی اور تاوافتی یا کسی غلط فہمی کے سبب منافقین کے ہم آہنگ و ہم آواز ہو رہے ہیں، تو آپ نے یہ چاہا کہ یہ سچے مسلمان منافقوں کا ساتھ نہ دیں اس سلسلہ میں اپنی صوابدید کے مطابق ان حضرات کو مناسب تنبیہ بھی فرمائی، مقصد ان کی خیر خواہی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ان حضرات کی آڑ لے کر یہ منافق و باغی زور نہ پکڑ دیں۔

اہل سنت کے نزدیک عصمت خاصہ انبیاء ہے۔ یہ حضرات بھی صحابہ کو معصوم نہیں جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ عہد عثمان سے قطع نظر عہد صدیق و فاروق رضی اللہ عنہم حتیٰ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر جرح و جارحی ہوئیں۔ بلکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسطح بدری اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما کو حد قذف میں پکڑا۔ کعب بن مالک، مرارہ ابن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جن میں سے دو حضرات شریک بدر بھی تھے عذوہ تبوک میں شریک نہ ہونے کے سبب بارگاہ نبوت سے نکال دئے گئے۔ اور سارے مسلمانوں کے مقاطعہ کا نشانہ بنے، ماعوا سلمیٰ رضی اللہ عنہ کو جرم کیا گیا، کئی حضرات پر شراب نوشی کی حد جاری ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی سزائیں ہوئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی حسب موقع و حال بعض حضرات کو تنبیہ فرمائی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ منافق اور باغی لوگوں کا ساتھ دیکر اپنا حشر ان کے ساتھ نہ کر لیں، اور جو دنیا و آخرت میں ان کے لئے عذاب و رسیا ہی مقدر ہو چکی ہے، اس سے بچ جائیں، اور بحمد اللہ ایسا ہی ہو گا کہ قتل عثمان نہیں کسی صحابی نے حصہ نہیں لیا منافقوں اور ابوا باشوں کے ہسی دست و دامن خون عثمان سے تر ہوئے۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امر مقدرا کا علم ہو چکا تھا اس لئے نہ ان بدخقول کے حملہ کا بچاؤ کیا نہ کسی کو حمایت میں بلایا۔ بلکہ صبر و رضا کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔

جن حضرات کو آپ نے تنبیہ فرمائی یا گوشمالی کی وہ چونکہ عواقب و نتائج سے آپ کی طرح آگاہ نہ تھے اس لئے بعد میں ان سے معذرت بھی چاہی، اگر غور کیا جائے اور انصاف سے کام لیا جائے۔ تو اہل سنت کا یہ موقف درست نظر آتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حال ہو بہو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے پورے طور پر ملتا ہے۔ کہ ان کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی۔

يَا عَلِيُّ لَا تُجَارِحِ الْأَمَّةَ عَلَيْكَ بَعْدِي وَإِنَّكَ تَعَارِلُ الْعَارِثِينَ وَالْأَقَابَةَ عَلَيْهِمْ وَالْأَرْقَانِ۔
اے علی میرے بعد تمہاری خلافت پر ساری امت متفق نہ ہوگی تمہیں عہد شکنوں، بے انصافوں اور بددینوں سے، لڑائیاں لڑنی پڑیں گی۔

چنانچہ جب آپ مسند خلافت پر متمکن ہوئے، تو حتی المقدور فتنہ کے فرو کرنے اور منافقوں سے قتل و قتال اور جنگ و جدال کے ذریعہ اپنے سے دو کمرے کی کوشش فرمائی نہ اس میں کوئی تاہل فرمایا اور نہ کسی کے منصب و مقام کا کوئی لحاظ کیا نہ کسی مروت اور رعایت سے کام لیا،

اسی لئے آپ کی ان کارروائیوں کی ذمہ داری ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آئیں، اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور ابوسبیحہ رضی اللہ عنہم بادوسرے صحابہ کرام بھی آئے! مگر مقدر نے یاوری نہیں کی۔ اس لئے امور خلافت حسب منشا انجام نہ پاسکے۔ اور اجمالی گزارشات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آپ سلسلہ سلسلہ تفصیلی جوابات، ملائکہ فرمائیں۔

طعن و اعتراض میں قصص واقعات جس انداز میں ذکر ہوئے، وہ حسب دستور، دجل و فریب کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ساری باتیں شیعوں کی من گھڑت اور بتلائی ہیں، معتبر تاریخوں کا دامن ان کے ذکر سے خالی ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کی جو اصل صورت حال ہے اس کے مطالعہ ہی سے اعتراضات کی قلعی کھل جاتی اور جواب خود بخود سامنے آ جاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قصہ بحوالہ ابن مسرین، اور دیگر ثقہ تابعین کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مزاجاً بہت تشدد تھے۔ زبان بھی بے قابو تھی۔ خود سرد رو کو نبین صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے خدام سے الجھ پڑتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے گتم گتم ہو گئے، ابوہریرہؓ تک پہنچ گئے، اسخوڑ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زبان درازی پر ڈانٹا اور فرمایا اَعْيَتْكَ اَهْلِيَّتُہِہُ اِنَّكَ اَمْرٌ مَوْفِقٌ جَاهِلِيَّةٌ۔ (کیا تم سے ماں کے حوالہ سے حار دلاتے ہو، تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کا اثر ہے،

عہد عثمانی میں لشکر شام میں جب انہیں قیام کا اتفاق ہوا تو فتوحات میں غنائم کی کثرت کے سبب بے شمار دولت ہاتھ آنے کے باعث ہمارے انصار لکھ بٹی ہو گئے، تو جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے سب پر اعتراضات شروع کر دیے، پہلا نشانہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بنے، اور حوالہ کے لئے آیت وَالَّذِينَ يَكْنُزُونَ اَمْوَالَهُمْ اَنْ يَكُنْ لَّہُمْ سَعَادَةٌ اَوْ يَكُنْ لِلْغَنِيِّ سَعَادَةٌ۔ (جناب معاویہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر چند سمجھا یا کہ یہاں خیر خرچ کرنے سے مراد بقدر زکوٰۃ ہے۔ سارا مال خرچ کرنا مراد نہیں ہے۔ اور اسکی دلیل میراث و فرائض کی آیت ہے۔ کیونکہ اگر سالہ کے سارے مال کا خرچ کرنا فرض و واجب ہو گا تو متروکہ مال کی تقسیم کے کوئی معنی درہیں گے۔ مگر بات ان کی سمجھ میں نہ آئی وہ اپنے خیال پر اٹھ رہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ سختی اور درشتی سے پیش آئے گئے!

شامی لشکر نے جہور اہمیت کی روش سے ہٹ کر ان کی روش پر انگشت نمائی شروع کر دی اب وہ جھڑ جاتے لوگ گروہ درگروہ ان کے گرد اکٹھا ہو جاتے اور ان کو چڑھانے اور مضہ دلانے کے لئے جان بوجھ کر زور نڈر سے یہ آیت پڑھتے۔ انہوں نے گویا یہ چڑ بنالی۔ جب بات مذاق اور ہنسی مٹھنے اور طعن و طنز تک پہنچ گئی تو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے سارا ماجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا۔ آپ نے حکم بھیجا کہ ان کو اپنے روانہ کر دیں۔ چنانچہ ان کی شایان شان عزت و احترام کے ساتھ ان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ یہ شیعوں کی اپنی پانچ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ تیرہ سواری پر بھیجے گئے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ان کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی اہل مدینہ شام میں پیش آنے والے واقعات و قصے سن چکے تھے یہاں کے خوش طبع اور پچھن مزاج لوگ بھی ان کے پیچھے لگ گئے۔ وہ بھی دل لگی اور مزاج کے لئے ان سے آیت کے معنی پوچھنے لگے۔ اسی دوران حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے فوت ہو گئے۔ آپ نے بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑی، آوائیگی حقوق و صایا وغیرہ کے تقسیم ہوا تو آٹھواں حصہ چار عورتوں کو پہنچا۔ ان میں سے ایک بیوی کو مرض و فنان میں چونکہ طلاق دیدی تھی اس لئے اس کو پورے حصہ کے بجائے ایک مقررہ رقم دینے پر صلح کر لی تھی اور وہ اسی ہزار درہم سے زیادہ تھی! (اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحیح و زنا کے حصہ میں کتنا مال خطیر آ یا ہو گا)

دل لگی بازوؤں کو شوشہ اٹھ آ گیا۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو پہنچانے کے لئے جناب عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی مال داری کا قصہ سنا۔ اہل معاہدہ میں ان کا ایک مزاج بنا ہوا تھا۔ لہذا حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے درختی ہونے کا فتویٰ لگا دیا۔ اور جوش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت صریحہ کو بھی بھلا بیٹھے۔ یہ معاملہ ایک نص صریح کے چونکہ خلافت تھا جناب کعب اجبار رضی اللہ عنہ جو اہل کتاب کے علما

میں سے تھے اور عہدِ فارسی میں مشہور باسلام ہو گئے تھے۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ جناب یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ ملتِ حنیفیہ آسان ترین، کشادہ ترین مذہب ہے۔ اور سارے مال کا خرچ کرنا تو یہودی مذہب میں بھی واجب نہیں جو بہت تنگ اور سخت مذہب ہے۔ تو مذہب اسلام میں سارا مال خرچ کرنا کس طرح واجب ہو سکتا ہے، بات ذرا سوچ سمجھ کر کی کیجئے۔ آپ حسبِ عادت غصہ میں آگئے اور فرمانے لگے اسے یہودی سمجھئے ان مسائل سے کیا واسطہ! اور لاٹھی اٹھا کر انہیں مارنے دوڑے۔ وہ وہاں سے بھاگے اور سید سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نشانی میں آگئے۔ اور آپ کی پیٹھ پیچھے چھپ گئے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ غصہ میں بھرے وہاں پہنچے اور اُڑ دیکھا نہ تاؤ اور لاٹھی کا وار کعب احبار پر کر دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس کی زد میں آئے اور آپ کے پاؤں پر لاٹھی سے چوٹ لگی۔ ان کی بدحواسی اور بیخودی دیکھ کر ہی حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے خدام کو حکم دیا کہ انہیں پکڑو کہیں غصہ میں ایسی جگہ چوڑے مار بیٹھیں کہ موت کا سبب بن جائے چنانچہ خدام نے انہیں پکڑا اور گھر چھوڑ آئے۔ جب جوش ختم اور غصہ دور ہوا۔ تو آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے، میں اپنے اس خیال پر اتنا پختہ ہوں اور یہی میرا مذہب ہے۔ کہ کل مال خرچ کرنے کو واجب سمجھتا ہوں۔ مگر پہلے شامی اور اب اہل مدینہ نے مجھے نشانہ تضحیک بنالیا ہے۔ وہ مجھے چھوڑنے اور چڑھنے کے لئے میرے ارد گرد اکٹھا ہو جاتے ہیں، ہنسی مذاق اڑاتے ہیں! اور مجھے پاگ کر دیتے ہیں، کہ ایسے واقعات کی نوبت آجاتی ہے آپ مجھے مشورہ دیجئے میں کیا کروں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہاں اب بات تو ایسے ہی ہو گئی ہے۔ کہ لوگ باگ آپ سے مرنا لینے کے لئے ایسی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ آپ اگر ان جمعوں سے کنارہ کشی گوارہ کر سکیں تو بہتر صورت یہی ہے۔ اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ مضامین مدینہ میں سے کسی مقام پر سکونت اختیار کر لیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ سے تین منزل کی دوری پر واقع مقام رندہ میں آپ تشریف لے گئے۔ اور وہیں رہیں۔ یہاں سے بھڑے وقفہ مسجد نبوی کی زیارت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لئے آتے جلتے رہے!

ان حالات سے متعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوئی شکایت آپ سے منقول نہیں۔ جو بات ملتی ہے وہ یہی کہ آپ جناب شہید رضی اللہ عنہ کے انتہائی مطیع اور فرمانبردار رہے۔ اور اسکی دلیل وہ قصہ ہے جو تمام مورخین نے بیان کیا ہے کہ جب آپ رندہ گئے اسوقت وہاں کا عامل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام تھا۔ جو مسجد میں جماعت پنجگانہ کی امامت بھی کرتا تھا۔ آپ کے پہنچنے پر جب نماز کا وقت آیا۔ تو اس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ مجھ سے افضل اور بہتر ہیں اس لئے امامت آپ ہی فرمائیں۔ مگر آپ نے فرمایا تم عثمان (یعنی اللہ عنہ) کے نائب ہو اور عثمان رضی اللہ عنہ مجھ سے افضل ہیں، اور نائب بھی اصل ہی کے حکم میں ہے اس لئے موزی اور لازم ہے کہ امام تم ہی بنو، چنانچہ اس غلام نے امامت کی اور آپ نے اس کی اقتدار میں نماز ادا فرمائی۔ تو یہ ہے اصل قصہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا۔ مگر اس فرقہ کا یہ وہی بغض و عناد کا ہے۔ اس لئے قصوں میں حسبِ مطلب کھانڈ چھانڈ اس کی عادت ہے۔ اور ایک قصہ سے دوسرے واقعہ کی پیوند کاری اس کا طریقہ۔ اور نتیجہ خیالی تصویر اور وہی بت تراش کر اسی کو معبود بنا لیتے ہیں۔

اور جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی محض افتراء اور بہتان ہے، نہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی شکایت لکھی اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ منورہ بلایا۔ کسی نابینا سے اس کا پتہ نہیں چلا۔ برخلاف اس کے معتبر تواریخ میں یوں مذکور ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب قبر پر لشکر کشی کی تو جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بھی شریک لشکر تھے۔ اس لئے کہ اس جہاد کے فضائل اور اس میں شریک بجا ہدین کی مغفرت کی شہادت، خود فخرِ سجداتِ علی اللہ علیہ وسلم نیز اپنی بیوی ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا سے سُن چکے تھے۔ جزیہ کی نفع کے بعد جو مال غنیمت حاصل ہوا، اس میں سے خمسِ علیہ کر کے دار الخلافہ روانہ کر دیا اور باقی مال مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے خود جناب معاویہ رضی اللہ عنہ بیٹھے۔ دوسری طرف چند صحابہ کرام جن میں جناب عبادہ، شداد بن اوس، فہری،

ابودرداء، وائلہ بن اسحق، ابوامامہ باہلی اور عبد اللہ بن بسر زانی۔ رضی اللہ عنہم تھے۔ الگ گوشہ میں بیٹھے یہ دیکھ رہے تھے کہ تقسیم موافق سنت ہوتی ہے یا خلاف سنت۔ اسی دوران دو فوجی، دو گدھے لئے جناب عبادہؓ کے سامنے سے گزرے تو آپ نے پوچھا تم یہ گدھے کہاں لئے جا رہے ہو؟ اور یہ کس کام کے لئے ہیں، لشکریوں نے بتایا کہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عنایت فرمائے ہیں تاکہ ان پر سواری کر کے سفر حج پر جائیں۔ اس پر جناب عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ نہ تمہارے لئے حلال ہیں اور نہ معاویہؓ کی یہ بخشش جائز ہے۔ یہ سن کر لشکری واپس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، گدھے واپس کر کے کہنے لگے کہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ان کا لینا جائز نہیں۔ اس لئے ہم ان کو کیسے لے اور ان پر حج کر سکتے ہیں! امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر مسئلہ کی صورت حال معلوم کی تو آپ نے کہا۔

عز و جنین کے موقع پر جب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غنائم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کا ایک بال ہاتھ میں لیکر فرمایا کہ اس مال غنیمت میں میرے لئے جس سے ایک بال بھی نہیں ہے۔ اور جو جس بھی تم مسلمانوں کے ہی مرف میں آتا ہے۔

تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ڈرو اور مال غنیمت اس طرح بانٹو کہ کسی کو اس کے حق سے زیادہ نہ دو!

سمعت رسولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی غنائم حنین والناس یملکونہ فی البغایم فآخذ و بکر و یمن بعبیر و قال مانی مما افاء اللہ علیکم من ہذا الغنائم مثل ہذا الا الخمیس والخمیس موزوۃ علیکم من انق اللہ یا معاویہ و اقسیم الغنائم علی وجہہا ولا تعط احد اقلها اکثر من حقہ۔

اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا یہ مال غنیمت سنبھا لو اور اپنی صوابدید پر اسے تقسیم کر دو! اور مجھے اس بارگراں سے ہلکا کرو، میں تمہارا ممنون احسان ہوں گا۔ چنانچہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ داروغہ تقسیم نے اور جناب ابوامامہ اور ابودرداء رضی اللہ عنہما دونوں آپ کے معاون و شریک کار بنے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یہ نظم باقی و جاری رہا۔ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کی وفات شام میں ہوئی۔ بیت المقدس میں مدفون ہوئے۔ مدوہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جدا ہوئے اور مدینہ منورہ تشریف لائے! لہذا یہ قصہ ہی عجوبہ ہے۔

یہی حال حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ناخوشی کے قصہ کا ہے کہ یہ بھی افسردہ اور جھوٹے ہے۔ مکتب صحیحہ اس کے بیان سے خالی ہیں۔ صحیح واقعہ اس قدر ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی قرأت قرآن میں اختلاف کے سبب یہ نوبت آئے لگی ہے کہ لوگ اختلاف قرأت کو بہانہ بنا کر غیر منزل الفاظ بھی پڑھنے لگے ہیں۔ تو آپ نے حضرت حذیفہ بن یمان اور دیگر جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے مشورہ سے یہ انتظام فرمایا کہ تمام عرب و عجم ایک ہی مصحف پر متفق ہو جائیں اور باہم مختلف نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس جو مصاحف تھیں ان میں قرأت شاذہ کے علاوہ بعض اور عجیبہ قنوت اور بعض تفسیری عبارات بھی درج تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن مجید کے وقت بیان معانی کے طور پر فرمائی تھیں۔ ان مصاحف میں ان کی برقراری آمادہ چل کر فساد عظیم کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ نفس قرآن میں اختلاف ہوتا۔ جو رفتہ رفتہ بیش از بیش خرابیوں اور برائیوں کا سبب بنتا ہے ان حضرات نے اپنے مصاحف میں ان کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ مگر مصحف لینے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے جبر سے کام لیا اور مار پیٹ کی بھی نوبت آئی۔ مگر اس کی اجازت، یا حکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرگز نہیں دیا تھا۔ اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنا مصحف بخوشی بلا جبر دیدیا تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ نہ کوئی بات ہوئی، نہ باہم کدورت کی نوبت آئی! اس کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر ممکن و مناسب طریقہ سے آپ کو راضی کرنا چاہا۔ اور عذر و معذرت بھی پیش کی۔ ایسی صورت میں قرین انصاف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں آتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بغض نفیس ان کے مکان پر گئے۔ ان سے معافی چاہی۔ ان کا وظیفہ ساجے لے گئے تھے وہ دینا چاہا۔ تو جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب مجھے ضرورت تھی اس وقت تو مجھوایا نہیں اب سفر آخرت پر جاسا ہوں تو آپ دے رہے ہیں میں نہیں لوں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا بچیوں کے کام آئے گا رکھ لیجئے۔ تو فرمایا میں نے لڑکیوں سے کہہ دیا ہے کہ ہر رات سورۃ واقعہ کا ورد کر لیا کرے کیونکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ جو کوئی ہر رات سورۃ واقعہ پڑھے گا فاقہ میں مبتلا نہ ہوگا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے اٹھ کر ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں گئے اور ان سے درخواست کی کہ ابھی مسعود رضی اللہ عنہ کو مجھ سے راضی کر دیجئے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہا نے متعدد مرتبہ کہلا کر بھیجا۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہنے لگے اے عبداللہ تم بھی اپنے بھائیوں سے یوسف علیہ السلام کی طرح کیوں نہیں کہہ دیتے لَا تَقْرُبْ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَکُمْ وَهُوَ الْذَّحُّرُ حَمِیْمٌ۔ (آج تم پر کوئی لاملت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے وہ ارحم الراحمین ہے) یہ سن کر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ چپ رہے کوئی جواب نہیں دیا۔

لہذا اس معاملہ میں ان کو راضی کرنے اور اپنے قصور کی معافی چاہنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس سعی و کوشش کے بعد وہ بری الذمہ ہو گئے! اب ان پر الزام بدلے عناد تو ہو سکتا ہے از روئے دیانت و انصاف نہیں۔ اور پھر جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ شکر رنجی، دشمنی کی سی نہیں، بھائیوں اور عزیزوں کی طرح کی تھی جو بعض اوقات معمولی بات پر بھی ہو جاتی ہے۔ اس شکر رنجی کی بنا پر نہ وہ آپ کی خلافت سے منکر ہوئے۔ نہ یہ عقیدہ رکھا کہ وہ اس کی لیاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ سلمہ بن شعیق جو آپ کے خاص دوستوں میں سے تھے کہتے ہیں۔

فَخَلَّتْ عَلَیْ اَبْنِ مَسْعُوْدٍ فِی مَرَضِهِ الَّذِیْ فُوِّیْ فِیْهِ وَعَشَدَّ قُوْمٌ یَّدُکُمْ لَنْ عَثْمَانَ فَقَالَ لَهُمْ مَهْلًا قَاتِلُوْهُمْ اِنْ تَقْتُلُوْهُمْ لَا تُصِیْبُوْنَ مِنْهُ۔

میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس مرض وفات میں ایک دن گیا تو آپ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے کہا، بس چپ کر جاؤ۔ اگر کبھی تم نے ان کو قتل کر دیا تو ان جیسا کبھی نہ پاؤ گے!

عزمن سیاست و انتظام ملک میں اس قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے واقعات پیش آتے ہیں اگر ان کو مطالعہ میں شرا کر لیں تو شیعوں کا تو قافیہ تنگ ہو جائے گا۔ مثلاً وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا کہیں گے کہ انہوں نے اپنے حقیقی بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بالکل چھوڑ دیا۔ ان کا وظیفہ اتنا تنگ کر دیا کہ مجبور ہو کر جنگ معین کے بعد وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ اور جناب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو عقیل القدر معاویہ آپ کے خاص ساتھی تھے۔ ان کو معزول کیا۔ ان کا وظیفہ بند کیا اور ان سے تعلقات توڑ لئے حتیٰ کہ وہ آپ سے الگ ہو کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرفدار ہو گئے! جناب عقیل اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہما ہر رات و عزت میں حضرت ابو ذر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کم تو نہیں۔ اگر ان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مستحق تعزیر ہیں تو یہ نادان یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جناب امیر داما رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے طعن کی زد میں آجاتے ہیں۔ کسی مسلمان کی تو یہ جرأت نہیں کہ عظیم المرتبت اصحاب کرام کو توڑے اپنی جگہ کسی عام صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کا خیال بھی دل میں لائے!

یہی حال حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے قصہ کا ہے کہ اس کی بھی کوئی اصل و بنیاد نہیں۔ اگر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ آپ کی تولیت اور بھائی چارگی پر نادم تھے تو آخر ان کو صاف اور دو لوگ انداز میں کہنے سے کیا بات مانع تھی!

بات صرف اتنی صحیح ہے کہ ان دونوں حضرات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم اخوت کا رشتہ و تعلق جوڑا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر جناب عبدالرحمن رضی اللہ عنہ، آپ سے خوش طبعی اور دل لگی بہت کرتے تھے۔ اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ بہت باہیا اور باروت تھے۔ حیا دار آدمی عموماً خوش طبعی سے پریشان اور دل تنگ ہوتی جاتا ہے، ایک روز ان کی خوش طبعی اور دل لگی سے اس قدر پریشان ہوئے کہ بہ الفاظ آپ نے فرمائے۔ اِنِّیْ اَخَانُیْ یَا اَبْنُ عَوْفٍ اَنْ تَسْبُکَ مِنْ رَکْعَیْ۔ (اے ابن عوف مجھے ڈر ہے کہ تو اپنی دل لگی سے مجھے مار ڈالے)۔

اور دوستوں اور ہم صحبتوں میں اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے ہیں (مگر ان کی وجہ سے دل میں گڑبہ نہیں پڑتی) دل صاف رہتے ہیں! جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی لوگوں کے ساتھ خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں۔ چنانچہ دارقطنی نے زیاد بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ ”ہم مسجد اعظم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں بیٹھے ہوئے تھے ان دنوں کوفہ کے مکانات سفاپوش تھے کہ اتنے میں مؤذن نے آکر کہا کہ یا امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا، آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گیا۔ پھر غلطی سے رعبو آیا اور اسی طرح کہا، اس پر آپ نے (ازراہ دل لگی) فرمایا۔ یہ کتا ہم کو سنت سکھا تا ہے“

دارقطنی نے اسی زیاد نکور سے ایک اور روایت بیان کی ہے کہ ایک شخص جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور منوکے بارے میں آپ سے پوچھا، کہ دائیں ہاتھ سے شروع کرنا چاہئے یا بائیں سے، آپ نے فرمایا دائیں سے شروع کرو یا بائیں سے! پھر آپ نے منہ سے گوز کی آواز نکالی رگڑا دھونو ٹوٹے کا اٹھا دفرمایا، پھر پانی منگایا اور وضو بائیں ہاتھ سے شروع فرمایا،

اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قصہ جس انداز میں بیان کیا ہے وہ بھی صحیح، اہل سنت کی روایات کے مطابق یہ قصہ یوں ہے کہ ایک دن حضرت سعد بن ابی وقاص اور جناب عمار رضی اللہ عنہما مسجد میں آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھجوائی کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہیں۔ آپ بھی مسجد میں آجائے، آپ کی طرف سے صادر شدہ بعض امور جو عوام کی شکایت کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق آپ سے گفتگو اور شور کرنا ہے۔ آپ نے اپنے غلام کے ہاتھ کھلوایا، اس وقت تو مجھے بہت سے کام درپیش ہیں، اس وقت تو آپ لوگ جائیں اور غلام روز ملتا کا وعدہ ہے۔ جو باتیں ہوں میں سنوں گا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ تو یہ سن کر چلا گئے۔ مگر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے پھر کھلوایا کہ آپ کو آج ہی ابھی اگر بات کرنی چاہئے۔ آپ نے پھر عذر کیا۔ مگر عمار رضی اللہ عنہ نے پھر تقاضا کیا مگر آپ نے عذر فرمایا۔ مگر عمار پھر ہے۔

اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام نے ان سے ہاتھ پائی کی، مسجد سے گھسیٹ کر باہر نکال دیا اور کہنے لگے کہ شریعت میں اجازت کی حد تین مرتبہ ہے آپ حد شرعی سے بڑھ گئے لہذا آپ کو سزا دینا ضروری ہوا، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے مسجد میں آئے، لوگوں کو اکٹھا کیا۔ عمار رضی اللہ عنہ کو بھی بلوایا اور قسم کھا کر کہا کہ غلام کی حرکت نازیبا میرے ایمان و اجازت سے نہیں ہوئی۔ اس غلام کو ڈانٹا ڈپٹا۔ اور فرمایا۔ هٰذَا یَدِیْ لِعَمَارٍ فَلْيَقْطَعْ مِیْثَاقَیْ اِنْ شَاءَ۔ (یہ میرا ہاتھ عمار کے سامنے ہے، وہ اگر چاہے تو مجھ سے اپنا قصاص لے سکتے ہیں)۔ اس پر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ چوما۔ اور آپ سے راضی و خوش ہو گئے!

اور اس کی واضح و قوی دلیل یہ ہے کہ محاصرہ کے ایام میں جناب عمار رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں شامل تھے جو بلوائیوں کو سمجھا بوجھا کر اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حقوق کو یاد دلا کر محاصرے سے رکھ رہے تھے۔ اور جس دن آج کا پانی بند کیا گیا۔ تو عمار رضی اللہ عنہ باہر تھے اور بلند آواز سے فرمایا سبحان اللہ قَدْ اَشْتَرٰی بِبِرِّ رَوْحَةٍ وَ تَمَعُوْا نَہْ مَا اَکْثَرُ۔ (سبحان اللہ جس نے ہیر و منہ نہ بدلا اس کا پانی بند کرتے ہی پھر دوڑتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ آج باواؤں نے عثمان (رضی اللہ عنہ) کا پانی بند کر دیا ہے۔

میں نے سمجھا یا مگر وہ مانے نہیں کوئی ترکیب کرنی چاہئے کہ ان تک پانی پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلوائیوں سے کہتا سننا بلے کا رہے وہ تو مایوس گئے نہیں کوئی نغینہ تدریس کرنی چاہئے! آخر سعی و کوشش کر کے اوٹھ کی ایک پکھال پانی بھر کر پہنچائی گئی۔

لہذا جناب عمار رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کو تو اس مثل کا مصداق بنتا ہے کہ ”رجی ورجی علیہ راضی ہو گئے مگر نفع راضی نہیں ہوا“!

اور کعب بن عبدہ ہجری رضی اللہ عنہ کا قصہ پورا بیان نہیں کیا۔ اوصاف حصہ چھوڑ دیا پورا قصہ یوں ہے کہ جب جناب کعب رضی اللہ عنہ کے سینے کی اطلاع آپ کو ہوئی تو آپ نے جناب سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ کر نہ لکھا اور کہا کہ کعب کو عزت و احترام کے ساتھ میرے پاس بھیجو! جب وہ آپ کے پاس پہنچا، تو آپ نے کعب سے فرمایا تم مجھ بہت سخت خط لکھا۔ یہ نہ شورہ فاطمہ ہے اور نہ بنائوں کو نصیحت کرنے کا اصول۔ نصیحت تو بڑے نرم اور دل نشیں طریق پر کرنی چاہیے! نہ کہ ڈانٹ ڈپٹ ہو، خصوصاً خلفاء امراء کے معاملہ میں تو رفق و نرمی ہی لازم ہے۔ فرعون باوجودیکہ مسلمہ قبی و بد بخت تھا مگر اس کے معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم پیغمبر کو نرم روی کی تعلیم دی۔ فقولا لہ قولاً لیناً۔ تم دونوں اس سے نرمی و رفق سے بات کرنا، میں نے تمہارے مانے سینے کا حکم نہیں دیا تھا، میرے حکم و اجازت کے بغیر تمہیں پٹیا لیا ہے۔ اس کے باوجود میں بدن سے قیصر اتارتا ہوں، بہ چاہک موجود ہے تم ایسا بدلہ مجھ سے لے سکتے ہو! اس پر کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کے اس معصقانہ جذبات و فیالات کو دیکھتے ہوئے میں اپنے معاملہ سے دلگزر کرتا ہوں، سخت الفاظ استعمال کرنے میں واقعی میں نے قصور کا ارتکاب کیا۔ اس کے بعد جناب کعب رضی اللہ عنہ آپ کے مصائب خاص کی حیثیت سے آپ کے پاس رہے!

اب رہا اشتر بنی کا قصہ تو وہ اسی طرح صحیح جس طرح ان لوگوں نے بیان کیا ہے مگر وہ نہ صحابی تھا، نہ صحابی زادہ۔ وہ تو کوفہ کا ایک فتنہ پرور اوباش تھا۔ اس نے حاکم وقت کا لحاظ نہیں کیا، خلیفہ کے عامل کی امانت کی، اور دوسروں کو بھی درغلیا۔ اگر ایسے شورہ پشتوں سے حاکم و حکومت چشم پوشی کریں تو ایک فساد پر پا ہو سکتا ہے۔ اشتر بنی تو وہی ہے جس نے فتنہ کی بنیاد ڈالی، اور بالآخر اس کی بھڑکائی ہوئی شولش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جام شہادت پلا یا مگر یہ اس کے بعد بھی فتنہ انگیزی سے باز نہ آیا۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو اسی نے قتل کی دھمکیاں دے کر مدینہ چھوڑنے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے دامن عافیت میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اور بالآخر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تک نوبت آئی۔ اشتر بنی کی یہ ساری فتنہ سامانیاں اور یہ حرکتیں جناب علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بد نظمی کا موجب بنیں، یہ ہمیشہ جناب امیر پر حکم چلاتا تھا۔ اس نے کبھی آپ کی ایسی اطاعت نہیں کی جیسی کسی خلیفہ و امام وقت کی کی جاتی چاہئے تھی! یہ باتیں نہ کوئی سر بستہ راز ہیں نہ من گھڑت، تاریخ کے اوراق میں محفوظ اور زبان و قلم لائق ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو اس کے اور اس کے دوستوں کی فرمائش پر حضرت ابوموسیٰ اشعری کو والی کوفہ اور جناب خذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما کو داروغہ خراج بھی مقرر فرمایا مگر فتنہ پرور سرشت نے پچلا نہ بیٹھے دیا۔ سازشوں میں لگا رہا۔ اہل مصر سے ساز باز کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بعض روایات میں تو یہ ہے کہ خود بھی قتل میں شریک تھا۔ قتل عثمان کا واقعہ قیامت تک کے فتنہ کا سبب بنا، اور اس فتنہ کے دواوائے کو کھولنے والوں میں ایک نام اشتر بنی کا بھی ہے! ایسا شخص تو قتل کر دیا جاتا تو منسا ب تھا کہ امت سے فساد کی جبر نہ کھٹ جاتی، آخر اچ اور ڈانٹ د پٹ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سرور و رحم دلی تھی کہ اسی تک نوبت پہنچ کر رہ گئی!

اعتراض (۲) | چھٹا طعن ادا عراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جناب عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے قصاص نہیں لیا۔ حالانکہ انہوں نے ہرمزان بادشاہ ابو ازجو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہو گیا تھا قتل کر دیا تھا۔ اور اس پر تہمت یہ لگائی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھا۔ اور پھر یہ تہمت بھی پایہ ثبوت کو نہ پہنچی اور آپ نے ابولولہ کی ایک عمر لڑائی کو مار ڈالا۔ اور حذیفہ نصرانی کو بھی اسی تہمت میں قتل کیا کہ وہ بھی قتل عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں شریک تھا۔

سب صحابہ جو کہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص لیجئے! جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی یہی مشورہ دیا۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے دیت تو دیدی مگر قصاص نہیں لیا۔ حالانکہ قصاص کا حکم کتاب اللہ سے ثابت ہے اور جو شخص کتاب اللہ کے حکم کا اجرا نہ کرے وہ امامت کے قابل نہیں،

جواب۔ جمہور علماء کے مذہب کے مطابق ابو لؤلؤ کی لڑکی کا قصاص نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ وہ مجوسہ تھی۔ اور اسی وجہ سے خفینہ نصرانی کا قصاص بھی واجب نہیں ہوتا کیونکہ نصرانی تھا اور مسلمان و نصرانی کا فرق میں قصاص نہیں ہوتا اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد موجود ہے لا یقتل مسلم بکافر۔ (مسلمان کا فرقے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا)۔

اب رہی بات ہرمزان کی کہ وہ بظاہر مسلمان تھا پھر بھی اس کا قصاص نہ لینے کی اہل سنت نے وجوہ بیان فرمائی ہیں۔

اول۔ ہرمزان اسوار کا بادشاہ تھا۔ اہل فارس کے مانتھوں سے چونکہ ان کا ملک نکل چکا تھا جس کی وجہ سے ائمہ اسلام اور عام مسلمانوں پر یہ خار کھائے ہوئے تھا جنگ سے کامیابی کی امید کھو کر مکاری اور غریب سے کام لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے امان حاصل کی۔ اس کے قریب کا قلعہ تو بڑا مشہور ہے، کہ جب وہ گرفتار ہو کر آیا تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ جب اسے خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو بڑی بے چینی کا اظہار کر کے پانی پلانے کی درخواست کی، جب پانی کا پیالہ اسے دیا گیا تو کہنے لگا کہ پانی پینے اور سیراب ہونے تک کی مجھے مہلت دی جائے تو پانی پیوں ورنہ میں ادھر منہ پیالے سے لگاؤں اور ادھر میری گردن مالا دی جائے تو کیا فائدہ جاتا امیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اطمینان رکھ جب تک تو پانی نہ پی لے تجھے امان ہے۔ کوئی تجھے نہ مارے گا۔ اس سکار نے تمام حضرت کے سامنے دو تین مرتبہ اس کا اقرار کر لیا۔ اور پھر پانی زمین پر گر دیا اور کہنے لگا، اب مجھے قتل کرو گے تو نقصان امان لازم آئے گا۔ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اس کی ملامت پر تعجب کے ساتھ فرمانے لگے کہ چالاک معلوم ہوتے ہو، بہتر ہے تم اسلام میں آ جاؤ۔ اس نے کلمہ پڑھا۔ اور یوں مدینہ میں رہنے کی صورت نکال لی۔ عراق کا کچھ علاقہ بھی بطور جاگیر اسے مل گیا، یہاں رہ کر اسکو موقع ملا کہ وہ خلافت کا ب رضی اللہ عنہ کے معمولات پر نظر رکھ سکے جب اس نے دیکھا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے پاس نہ ختم و خرم ہے، نہ چوکی، پہرہ، تو اسے بہت افسوس ہوا کہ ایسے بے احتیاط رئیسوں سے بچا چھڑانا کون مشکل بات تھی، شاہان فارس ان حالات سے غافل ہی رہے اور ان کو قتل نہ کر سکے، چنانچہ اس نے ساز باز کی اور ابو لؤلؤ کو خفیہ طور پر بلا کر اسے حکم دیا اور شہادت امیر المؤمنین کا سامنے پیش آیا۔ جفینہ اور دوسرے کافروں کو بھی اس نے گانٹھ لیا تھا۔ وہ سب اکٹھے ہو کر اس کام کے لئے تنہائی میں تدبیریں کرتے اور منصوبے سوچتے رہتے تھے،

چنانچہ حضرت عبداللہ اور جناب عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم نے گواہ پیش کر کے ابو لؤلؤ، اور جفینہ، اس کے پاس آتے جاتے اور قتل امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے متعلق مشورے کرتے ہیں۔ ہرمزان نے ہی آلہ قتل دو دھاری، خنجر تیار کرایا تھا۔ اور کہتا تھا کہ وہ کون جو اندر دھوکا جواسی قوم اور اپنے دین کی حمایت میں اس شخص سے بدلے گا، جس نے نہ ہماری عزت ہی مٹائی میں نہ ملائی دین و دولت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ چنانچہ اسکی انگلیخت پر ابو لؤلؤ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دینے والا ہرمزان ہی تھا۔ تب صحابہ کرام کے مجمع میں یہ طے پایا کہ اگر قتل لایا جائے اور جو صورت اس کی سیان کی گئی ہے اگر وہ اس کے مطابق نکلے تو شہادت پختہ اور ان عینوں کی شرکت قتل تسلیم کی جائے گی وہ نہیں۔ جب وہ خنجر پیش ہوا تو وہ ہو ہو رہی تھا جس کے متعلق گواہوں نے گواہی دی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسلک کے مطابق داود ہی امام شافعی، امام مالک اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے، قتل کا حکم دینے والا خود واجب القتل ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے قصاص نہیں لیا۔ یہ حکم تو عام لوگوں کے بارے میں ہے۔ لیکن خلفاء اور امان ریاست کے متعلق یہ حکم ہے کہ ان کو قتل کرنے کا حکم دینے والا اگر بدلہ اور قصاص میں نہ بھی مارا جائے تب بھی انہیں ریاست اور تدبیر مملکت! اس کا قتل اور

بس ضروری ہے۔

دوم۔ اگر اس کا قصاص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لیا جاتا تو ایک بڑا ہنگامہ اور شور و غل پیدا ہو جاتی۔ کیونکہ بنو تمیم، بنو عدی بنو امیہ اور بنو جحجہ سارے کے سارے قصاص میں قتل کئے جانے کے خلاف تھے، بلکہ بنو سہم تو خاص طور پر پرہیز اور آمادہ فساد تھے وہ تو کہتے تھے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عبداللہ سے قصاص لیں گے تو ہم خانہ جنگی شروع کر دیں گے۔ چنانچہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ رکیس بنو سہم نے تو عمر سے مجمع میں با آواز بلند کہہ دیا تھا کہ بھائیو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کل امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ قتل ہوئے اور آج ان کا بیٹا مارا جائے اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہ ہو گا۔

اور یہ بات صحیح ہے کہ فتنہ فرو کرنے کی خاطر قصاص موقوف کر دیا جائے اور در ثار مقتول کو در گزر یا دیت پر راضی کر لیا جائے تو درست ہے۔
 اور پھر اس بارے میں کیا کہا جائے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فتنہ کے خوف سے موقوف فرمایا تھا۔ وہاں تو یہ بھی ہوا کہ در ثار عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ دیت دلائی گئی اور نہ ہی ان کو راضی کیا گیا۔ یہاں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کے در ثار کو اتنا مال و دولت دے کر راضی اور خوش کر دیا تھا کہ پھر وہ قصاص کا نام بھی زبان پر نہ لائے: اگر فتنہ کے خوف سے قصاص کی موقوفی کو وجہ اعتراض بنالیا جائے گا تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نواصب کے طعن کا جواب نہ بن پڑیگا: اس لیے صحیح جواب ہر دو اطراف پر یہی مناسب اور موزوں ہے کہ فتنہ کے خوف سے قصاص موقوف کیا گیا۔ بلکہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کسی غلطی کی گنجائش بھی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرمزان کے در ثار کو راضی کر لیا تھا۔

سوم۔ تیسری وجہ جیسا کہ بعض حنفیہ نے لکھا اور محمد بن جریر طبری اور دوسرے ائمہ مؤرخین نے اس کی تصریح کی ہے کہ جریر بن ان کے سارے ورثاء مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے، کچھ فارس میں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو طلب بھی فرمایا مگر غالباً وہ طرد کی وجہ سے نہیں آئے اور قصاص کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ سارے ورثاء حاضر ہوں اور مطالبہ کریں۔ ایسی صورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا درست و جائز نہ تھا۔ لامحالہ ایسی صورت میں بجز دیت اور کوئی صورت نہ تھی وہ بھی بیت المال سے دی جاسکتی تھی قاتل کے مال سے نہیں، کیونکہ کتب حنفیہ میں اس کی بھی تصریح ہے۔ کہ امام عادل کے قتل میں جس نے کسی نوع کی مدد کی ہو گو وہ اس میں بالذات شریک نہ ہو ابودودہ واجب القتل ہے۔

اور یہ بات کہ اس کے سارے دشوار مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے صرف اہل سنت کی ہی کتابوں سے نہیں معلوم ہوتی، بشرطی رفقہ اور دوسرے امامیہ کے ہاں بھی اس کا مذکور ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس موقع پر بعض شیعوں نے کچھ اور اعتراض بھی کئے تھے جن کا ذکر نصیر الدین طوسی نے اپنی کتاب تجرید میں کیا ہے۔ مگر شیعی مورخین نے ان کو اپنی تاریخوں سے حذف کر دیا ہے۔ اسی لئے ہم نے بھی ان کو مستقل طور پر ذکر نہیں کیا۔ اسی اعتراض کے ضمن میں اجمالی طور پر کچھ بیان کئے دیتے ہیں۔ ان اعتراضوں میں سے ایک اعتراض تو یہ ہے کہ جناب ولید بن عقبہ نے شرب لی۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پر شرب کی حد جاری نہیں کی! لیکن یہ روایت ہی غلط ہے۔ یہی بات صاحب استیعاب نے کہی ہے اور طبری کہتے ہیں۔

اِنَّ تَعَصَّبَ عَلَيْهِ تَوْمَرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكُوفَةِ بَغْيًا وَحَسَدًا وَّ
وَشَهِدُوا عَلَيْهِ زُورًا اِنَّ تَقِيَاءَ الْخَمْرِ

اہل کوفہ نے ان سے تعصب برتا اور بغض و حسد کی بنا پر یہ جھوٹی گواہی
دی کہ انہوں نے شراب کی تے کی۔

مہربان اور اقصیٰ بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا۔

يَا أَيُّهَا الضُّبُرُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْخُذُ بِكَ وَيُؤَيِّدُ الْفُؤَادَ بِإِثْنِي
مِائَةِ عَاشِرٍ تَمَّ صَبْرُكَ وَاللَّهُ تَعَالَى تَمَّ لَكَ كَابِلُ عَنَائِتِ فَرَاغَ كَابِ - اودوہ لوگ
تیرے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے۔

اس کے آگے اصل صورت حال بیان کی ہے۔

وَهَذَا الْخَبَرُ مِنْ أَهْلِ الْأَخْبَارِ لَا يَصِحُّ عَنْ أَهْلِ الْحَدِيثِ وَلَا عَنْ أَهْلِ الْعِلْمِ لَهُ أَصْلٌ. وَالصَّحِيحُ عَنْهُمْ مَا رَوَاهُ عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ الْمُخَنَّا وَوَسْعِدُ بْنُ أَبِي عَدُوْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ كَثَّاجٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُثَنَّى عَنْ سَاسَانَ أَنَّهُ رَكِبَ إِلَى عُمَانَ فَأَخْبَرَهُ بِقِصَّةِ الْوَلِيدِ وَقَدْ مَرَّ عَلَى عُمَانَ رَجُلَانِ فَشَهِدَ عَلَيْهِ بِشُرْبِ الْخَمْرِ وَأَنَّهُ صَلَّى الْغَدَاةَ الْكُوفَةَ الرَّبْعَاءُ قَالَ ابْنُ يَدٍ لَكُمْ قَالَ أَحَدُ هَؤُلَاءِ إِنَّهُ يَشُدُّ بَعَاثًا لَ الْأَخْرِمِ إِنَّهُ يَتَّقِيهَا فَقَالَ عُمَانُ كَمْ يَتَّقِيهَا حَتَّى شَرِبَهَا فَقَالَ يَعْزِي أَمَةً عَلَيْهِ الْحَدُّ فَقَالَ عَلَى لَابْنِ أَخِيهِ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ جَعْفَرٍ أَمَةً عَلَيْهِ الْحَدُّ فَأَخَذَ السَّوْطَ فَجَلَدَهُ وَعُمَانُ يُعَدُّهُ حَتَّى بَلَغَ أَرْبَعِينَ فَقَالَ عَلَى أَمْسَلُ جَلَدَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعِينَ وَجَلَدَ الْوَلِيدُ أَرْبَعِينَ وَجَلَدَ عُمَرُ ثَمَانِينَ وَكُلُّ ذَلِكَ سَنَنٌ

ایک اور روایت دیکھیے۔

وَرَوَى ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ عُمَرَ وَبْنِ دِينَارٍ عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ الْبَاقِرُ قَالَ جَلَدَ عَلَى الْوَلِيدِ بْنُ عَقْبَةَ فِي الْخَمْرِ أَرْبَعِينَ جَلَدَهُ بِسَوْطٍ لَهُ طَرَفَانِ ابْنُ أَبِي عَوْفٍ رَأَيْتُ أَنَّهُ كَانَ عِزْرًا مِثْلَ مِثْلِي بِرِصَادَتِهِ

اہل حدیث کے نزدیک، اہل خبر کے یہ روایت صحیح نہیں۔ اور اہل علم کے نزدیک، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ان کے نزدیک وہ روایت صحیح ہے جس کو عبد العزیز بن بن مخنف اور وسعد بن ابی عدوہ نے عبد اللہ الدانق سے روایت کیا ہے، اور اس نے حصین بن منذر ابی ساسان سے کہ وہ سوار ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ولید کے قصہ کی خبر دی۔ پھر وہ آدمی بطور گواہ آئے اور انہوں نے اس کے شراب پینے کی گواہی دی۔ اور یہ بھی کہا کہ اس نے فجر کی چار گھنٹے پر چائیں۔ اور کہا یہ دو کی زیادتی میری طرف سے تمہارے لئے ہے! ایک گواہ تو کہا اپنے اسے شراب پیتے دیکھا اور دوسرے نے کہا میں نے اسے شراب پتے کرتے دیکھا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس نے شراب پی تب ہی تو شراب کی تھے کی۔ اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس پر حد جاری کر دیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ان کے کوڑے لگاؤ۔ انہوں نے کوڑے مارنے شروع کئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انکی گنتی شروع کر دی۔ جب چالیس کوڑے لگا چکے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اب تک جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چالیس چالیس کوڑے لگوائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی۔ مگر یہ سب سنت ہیں،

ابن عیینہ نے بحوالہ عمرو بن دینار جناب ابی جعفر محمد بن علی باقر سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد میں ولید بن عقیقہ کو چالیس کوڑے لگوائے۔ کوڑا دو شاخہ تھا۔

اور دوسرا عتر امین یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنگ احد میں ثابت قدم نہ رہے بلکہ جھاگ اٹھے اور سبعت عنوان اور بدر میں آپ شریک ہوئے! اب جہاں تک احد سے بھاگنے کا معاملہ ہے تو تیس صحابہ کرام کے سوا سارے ہی تتر بتر ہو گئے۔ تیرے۔ تو اعتراض صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ اور پھر اس معاملہ کو جب اللہ تعالیٰ نے معاف فرما کر رفت گذشت کر دیا۔ اور قرآن میں اس معافی کی آیت نازل فرمادی۔ تو اب تو کسی پر بھی اعتراض کی گنجائش نہ رہی۔

توجہ آیت۔ وجماعتوں کے ملنے والے دن جو لوگ تم سے منہ پھیر گئے تو درحقیقت ان کی بعض لغزشوں کے سبب شیطان نے ان کے

قدم ڈنگا دئے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ بغرض معاف فرمادی کیونکہ اللہ غفور رحیم ہے۔ اور بالفرض اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہ بھی بھاگتے تو شیعہ پھر بھی ان کو کہاں بخشتے دیکھ لو اسدن ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سرفہرست رہے مگر شیعوں کے طعن سے ان کے سینے بھی فگار نہیں ثابت قدم رہنے والوں میں تیرہ مہاجر اور باقی انصار تھے، مگر ان میں سے اکثر حضرات شیعہ نازک، انگلی کا شکار ہیں!

مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، جناب طلحہ، بن ابی عبد الرحمن بن عوف اور جناب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اجمعین۔ سارے کے سارے شیعہ دشمنی کا شکار ہیں۔ یہی حال انصار رضوان اللہ علیہم کلہ۔

اہل سنت کے نزدیک ایسے موقع پر بھاگنا زیادہ سے زیادہ گناہ کبیرہ کے تحت آتا ہے جس سے لیاقت و قابلیت امامت متاثر نہیں ہوتی۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی مل جانے کے بعد وہ گناہ بھی مہلک گیا! تعصب سے خالی الذہن شخص کتب تاریخ و سیر کا مطالعہ کرے تو وہ ان بھاگنے والے حضرات کو معذور سمجھے گا۔ کیونکہ سردار لشکر کی قتل کی افواہ کے بعد لشکر کا اپنی جگہ ٹٹے ہی رہنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر یہ حضرات بھاگے ہی کہاں، لشکر گاہ میں ہی ستر بتر تھے۔ کہ صورت حال کا صحیح علم ہوتے ہی سارے سمٹ آئے!

اب رہا بد میں عدم شرکت کا واقعہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کی دیکھ بھال اور تیمارداری کے لئے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ مدینہ میں آئے رہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے بچوں اور اہل خانہ کی نگہداشت کیلئے حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک میں شریک نہ ہو سکے تھے! اور اس صورت حال کی وجہ سے تو عدم حاضری حاضری سے بہتر شمار ہوتی ہے! یہ نادان خوب کو تائب سمجھ رہے ہیں! یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عثمان کو وہی اجر ملے گا جو بد میں شریک دوسرے حضرات کو! اور غنیمت میں بھی ایک آدمی کے برابر ان کا حصہ ہے!

رہی بیعت رضوان! کہ وہ تو ہوئی ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وجہ سے وہ تو بذات خود اس بیعت کی غایت اور سبب تھے! جب سوال درپیش ہوا کہ کافروں سے جا کر کون سوال و جواب کرے تو کسی نے اس کی حامی نہ بھری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدمت پیغامبری اور سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا آپ تشریف لے گئے، تو یہ افواہ انگلی کی کہ دشمنوں نے ان کو قتل کر دیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ آور ہو رہا ہے! تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بیعت سرت لی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کے لئے لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ مگر منہ نہ موڑیں گے۔ مگر بعد میں جب معلوم ہوا خبر جو جی ٹھٹی اور آپ زندہ ہیں تو لشکر میں تسلی و اطمینان پیدا ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ جو بیعت ان کی موت کی خبر کی بنا پر ہو رہی ہے وہ اس میں کس طرح شریک ہو سکتے تھے۔ وہ موجود ہوتے تو بیعت رضوان ہی کہاں ہوتی۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سید عالم بنائے بائیں ہاتھ پر مار کر فرما رہے ہیں کہ یہ ہاتھ عثمان کا ہے۔ یا بعض روایات کے مطابق، یہ ہاتھ عثمان کے لئے ہے، یعنی اس کے ذریعہ عثمان بھی شریک بیعت شمار ہوں گے تو جس جگہ ایسا ذی شتم اور مولائے کائنات نامٹ موجود ہو تو وہ ان کی عدم حاضری کا کیا نقصان اور ضرر ہے۔

غرض ان اعتراضات کے پودے پن کا احساس کر کے ہی اکثر علمائے امامیہ نے ان کو اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ہے!

اعتراض (۷)۔ سا تو ان اعتراض یہ ہے کہ بنابر عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا۔ اس لئے کہ ۱۰/۱۲ ذی الحجہ ۱۱ مئی میں آپ نے پورے انصار و اقرائیٰ کو قصر نہیں کیا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر

میں عموماً اور اس جگہ خاص طور پر قصر فرماتے تھے! اسی بنا پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپ کے طرز عمل پر اعتراض بھی کیا!

جواب۔ تعصب ملاحظہ ہو کہ بات میں زور پیدا کرنے کیلئے صحابہ کرام کے اعتراض کا تو ذکر کیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جواب

کو گول کر گئے، جن حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے یہ اعتراض کیا تھا وہ حقیقت حال سے واقف نہیں تھے۔ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اب میں نے مکہ میں بھی ایک شادی کر کے یہاں بھی اپنا گھر بنالیا ہے! اب میں یہاں اگر مسافر نہیں رہتا اس لئے قعر بھی نہیں کرتا۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ پر اعتراض نہیں کیا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا یہ جواب امام احمد، طحاوی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابن عبد البر نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

اَنَّ هَٰؤُلَاءِ مَلِكِي يَا النَّاسُ مَعِيَ اَرْبَعًا اَشْكُرُ النَّاسَ عَلَيْهِمْ
فَعَالٍ اَيْهَا النَّاسُ اِنِّي تَاَهَّلْتُ مِنْكُمْ مِنْذُ قَدْ هُمْتُ
وَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ
مَنْ تَاَهَّلَ يَلِدْ فَلْيُطْلَلْ مَلُوءًا اَلْبِقَعِمْ فِيْهَا اَخَذَ جَبَهَ
اَحْمَدَ عَنْ
عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ اِبْنِ كَثَّابٍ
عَنْ اَبِيهِ وَغَيْرِهِمَا عَنْ هَبَيْبٍ (۱)

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو منیٰ میں نماز پڑھائی تو چار رکعت پڑھائی، جس پر لوگوں نے آپ پر اعتراض کیا تو جواباً آپ نے فرمایا کہ لوگو جب سے میں آیا ہوں تب سے مکہ مکرمہ میں خانہ داروں کی ہے۔ رشاہی کر کے یہاں گھر لے لیا ہے، اور یہ بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے۔ کہ جو کوئی کسی شہر میں خانہ دار ہو جائے تو وہ اس شہر میں مقیم کی طرح نماز پڑھے۔

اس کے بعد تو کسی اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ ایسی صورت میں تمام مذاہب کے علماء کے نزدیک قعر درست نہیں۔

اعتراض - (۸) یہ ہے کہ آپ نے حوالہ مدینہ منورہ کی چراگاہ بقیع نامی کو قرق کر کے لوگوں کو اس چراگاہ سے روک دیا۔ چہا ہستہ آہستہ اسے قاربہ دو گن کر کے رمنہ میں داخل کر دیا۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لہ رشاہ ہے کہ

اَلْمَدِيْنَةُ شَرْكَاءُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ النَّاسِ وَالنَّاسُ وَالنَّاسُ
میز دہن کے بازار کو قرق کیا، تاکہ ان کا گماشتہ جب تک کھجور کی گٹھلیوں کی خرید و فروخت سے فارغ نہ ہو جائے کوئی اور گٹھلیاں نہ خریدے۔ اور دیہاتی کشتیوں کو قرق کیا تاکہ ان کے مال تجارت کے علاوہ کوئی اور مال نہ بیچیں

جواب - چراگاہ کا قصہ صحیح ہے، اور اس کی وجہ آپ نے خود صحابہ کرام کے رو برو بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْحَيَا اَللَّهِ وَرَبِّ سُوْلِيْہ۔ (چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہے) اور میں نے اس کو صدقہ اور بیت المال کے اذنوں اور جہاد کے گھوڑوں کے لئے چراگاہ بنایا ہے اور چراگاہ کو رمنہ ٹھہرایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے گھوڑوں اور صدقہ کے اذنوں کے لئے خود چراگاہ بنائی ہے۔ اس پر صحابہ کرام نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بہت مختصر سی چراگاہ بنائی تھی مگر آپ نے تو اس سے کئی گنا بڑی بنائی۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت کے بیت المال اور اس وقت کے بیت المال میں موازنہ نہ کرو اور اسی تناسب سے چراگاہ میں زیادتی سمجھ لو آپ کے اس جواب کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تسلیم کر لیا اور خاموش ہو رہے!

بازار قرق کرنے والی بات سراسر غلط ہے! اتنی بات ضرور ہوئی کہ حادث بن حکم جو بازار کا داروغہ تھا اس نے اپنی طرف سے کچھ ایسی پابندی عائد کی تھی، اور یہ بات دو تین روز ہی چلی۔ جب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا۔ داروغہ کو موقوف فرما دیا۔

رہا کشتیوں کا معاملہ! تو وہ ان کی ذاتی ملکیت کی کشتیاں تھیں، پہلے جب اور لوگوں کی اپنی کشتیاں نہیں تھیں تو وہ اپنا مال و اسباب مع گماشتوں کے آپ کی ہی کشتیوں میں لایا کرتے تھے۔ جب اور لوگوں نے بھی کشتیاں بنالیں تو آپ نے اپنی کشتیوں بہار برداری کی ممانعت فرمادی کہ دوسروں کا مال بار نہ کریں یہ نہیں کیا (جیسا کہ اعتراض سے تاثر ملتا ہے) کہ سب ہی کی کشتیوں کو قرق و پابند کر دیا ہو پہلے اجازت دینا ان کا احسان تھا۔ اب اگر آپ یہ احسان نہیں کر رہے تھے تو اس میں ملامت و طعن کی کیا بات ہے!

اعتراض - (۹) نواس اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو بہت سی جاگیریں، اور ارضی قطععات عنایت فرمائے۔ جو

بیت المال کی ارضیات میں سے تھے۔ اس طرح آپ نے گویا مسلمانوں کا حق تلف کیا۔

جواب۔ آپ نے اپنے رفیقوں، یا مصاحبوں کو ارضی قطععات دئے وہ تمام اس مقصد کے لئے تھے کہ افتادہ اور غیر آباد زمین کو وہ آباد کریں۔ کاشت شدہ زمین آپ نے کسی کو مرحمت نہیں فرمائی۔ اس کی ساری تفصیلات کتب تاریخ میں محفوظ ہیں۔ افتادہ اور غیر زمین اگر آباد ہو جائے تو اس میں تو ملک اور قوم کی بھلائی ہے۔ ملک آباد ہوتا ہے۔ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور خلق خدا کے رزق میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ بھلا اس میں اچھائی کا کون سا پہلو ہے کہ ہزاروں ایکڑ زمین کا کارہ پڑی رہے۔ نہ ملک کے کام آئے نہ مخلوق خدا کے۔ بلکہ پوروں، خدا کو لوں کی پناہ گاہ کے کام آئے! ملک آباد ہو، زمین کا چبہ چبہ پر کاشت ہوتے لگے۔ تو ایک طرف خلق خدا کو آسودگی میسر آتی ہے دوسری طرف ریزنوں اور فساد یوں کے ٹھکانے بھی ختم ہو جاتے ہیں، یہ تو قابل تعریف کارنامہ تھا۔ جو بعض وعظنا دیکھنے والوں نے طعن میں بدل ڈالا۔

اس کے علاوہ اہل سیر نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپ کے زمانہ میں یمن کے بہت سے شریف خانہ بدوش آپ کے پاس آئے، اور کہنے لگے ہم نے جہاد کی خاطر اپنا گھرا اور زمینیں چھوڑ دی ہیں، آپ ہمیں جہاد کے علاقوں کے قرب و جوار میں زمینیں عنایت فرمائیں تاکہ دشمنان اسلام کے ساتھ جہاد میں دوسرا دراز کی مسافت سے بھی جہاد کریں، اور باری باری اس میں حصہ لے سکیں، اس وقت فارس کا علاقہ اس علاقہ کے رہنما بہت سرکش تھے ان لوگوں کو آپ نے وہیں آباد کیا اور انہیں حدود میں ان کو ان کی منزلت کے زمین کے بدلے قطععات ارضی بھی عنایت فرمائے۔ اور بعض صحابہ کی زمین بطور تبار بھی ان کو دی۔ مثلاً جناب طلحہ رضی اللہ عنہ سے ان کی حضرت موت والی زمین ان کو دلوادی، اور ان کی حضرت طلحہ کو! اور جناب اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے کبہ کی زمین لے کر، انکو دوسری جگہ اس کے بدلہ دیدی! اور یہ سب کچھ یا بھی رضامندی سے ہوا! اس میں طعن و اعتراض کہاں سے نکل آیا۔

اعتراض۔ (۱۰) شیعہ کہتے ہیں سارے ہی صحابہ ان کے قتل پر خوش تھے، ان کی جہاد اور شہادت کرتے تھے، تین دن ان کا لاشہ یوں ہی ڈالے رکھا اور دفن کی کوشش نہ کی!

جواب۔ دوع گویم بر روی تو، قسم کا اعتراض شیعوں کے سوا اور کوئی کر بھی نہیں سکتا صریح جھوٹ اور بہتان انہیں کا حصہ ہے! اگر سارے ہی صحابہ ان سے ناخوش تھے تو ان کے قصاص کیلئے لڑنے والے یہ طلحہ و زبیر عاتقہ، معاویہ، اور عمرو بن عاص وغیرہم، رضی اللہ عنہم اجماعاً کون تھے! اور یہ کس عثمان (رضی اللہ عنہ) کے لئے لڑا ہے کیا انہوں نے کسی اور خیالی و دہی عثمان کے لئے یہ ساری تنگ و دو کی تھی۔ سنیوں اور شیعوں دونوں کی تاریخیں موجود ہیں۔ بلوہ مٹانے کی سارے صحابہ نے کوشش کی جب بلوایوں نے ان کی کوئی بات نہ سنی تو انہیں حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کی اجازت مانگی۔ آپ نے لڑائی کی اجازت نہ دی، بڑی شدت سے ان کو روکا۔ آپ کے منع کرنے پر وہ حضرات خاموش تو ہو گئے مگر آپ کی پانی، اور دیگر تکالیف کے ازالہ میں آخر دم تک کوشاں رہے، اور تدبیر و حیلہ سے کام لیتے رہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انصار کی جمعیت کے ساتھ آپ کے پاس آئے نوجوانان انصار نے ان سے کہا ان شہادت کنا انصار اللہ مرتدین۔ (آپ اجازت دیں تو ہم دوبارہ بھی انصار اللہ کا کردار ادا کریں)

اگر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تمام مہاجرین کو لے کر آپ کے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ آپ پر چڑھ دوڑنے والے یہ لوگ ہماری تلواروں کے زخم خوردہ ہیں، اس سے ڈر کر مسلمان ہوئے ہیں۔ اب بھی ڈر سے رائے ان کے ہوش خطا ہیں۔ یہ ساری ٹافوس ہو، اور لہن تریناں صرف اس لئے ہیں کہ وہ لفظ ہر کلمہ گو ہیں۔ اور آپ کلمہ کی عزت و حرمت کا پاس و لحاظ کرتے ہیں۔ آپ حکم دیں ابھی ذرا دیر میں ان کو وہ بات یاد دلا دیں جو ان کے حافظہ سے محو ہو گئی ہے! اور ان کو ان کی حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صبر، حلم و مروت

ملاحظہ ہو کہ آپ نے فرمایا ایسا کہ میری جان کی خاطر اسلام میں رخصت پیدل نہ کرو

اس کے باوجود حضرات حسنین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، ابوہریرہ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ، اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں موجود رہے اور جب بھی بلوائی بل بوتے تو یہ حضرات مدافعت کرتے، اور ان کو دھکیل دیتے۔

ان کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذاتی غلاموں کی اچھی خاصی نفری موجود، اگر آپ ذرا بھی اشارہ فرما دیتے، تو بلوائیوں کو اپنی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ یہ حضرات جیتے بھی نہیں تھے ہتھیاروں سے مسلح اور پوری طرح تیار ہو کر آپ کے پاس آئے، وہ بلوائیوں سے دود مارنے لگے کو سخت بے چین اور بے قرار تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم وہی تو ہیں جنکی تلوار کی تاب خراسان سے لے کر افریقہ تک کوئی نہ لاسکا۔ صرف آپ اجازت دیدیں پھر دیکھتے ہم ان کا کیا حشر کرتے، اور تماشا بناتے ہیں۔ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے۔ یہ سمجھ گئے کہ کلمہ کی حرمت کے سبب کوئی ہمیں نہیں چھوڑتا۔ اسی لئے دیدہ دلیر ہو گئے ہیں، اور سمجھانے بچانے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ نہ آپ کی بات سنتے ہیں نہ صحابہ کرام کے کہنے پر کان دھرتے ہیں۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہی فرماتے رہے کہ میری رضامندی چاہتے اور میرے احسان و سلوک کا حق ادا کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار رکھ دو۔ اور اپنے اپنے گھر جاؤ، اور سنو، جو اپنے ہتھیار رکھ دے۔ وہ میری غلامی سے آزاد ہے۔

خدا کی قسم مجھے یہ بات زیادہ محبوب ہے کہ میں خونریزی کر لے بغیر قتل کر دیا جاؤں بجائے اس کے خونریزی کر لوں اور پھر قتل ہو جاؤں۔

مطلب یہ تھا کہ میرا قتل مقدم ہو چکا ہے۔ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اس سے آگاہ فرما چکے ہیں اگر تم لوگ بھی تب بھی میری شہادت نہیں ملے گی۔ تو اس خونریزی کا کیا حاصل جس سے مقصد و مدعا بھی حاصل نہ ہو۔

یہ بات فریقین کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں، اولاد ابو جعفر اور اپنے مصاحب خاص قبر کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر متعین فرما دیا تھا۔ نیز حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے رید کوں کو حفاظت کے لئے متعین کیا ہوا تھا کہ بوقت ضرورت بلوائیوں کا مقابلہ کریں، چنانچہ جب بھی بلوائی بل بوتے تھے تو یہ حضرات پتھروں اور ڈنڈوں سے مار مار کر انہیں بھاگ دیتے تھے اسی مدافعتی لڑائی میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چوٹ کھائی، محمد بن طلحہ، اور قبر کے سر چھوئے، مگر دروازہ سے بلوائیوں کو داخل نہ ہونے دیا برابر کے کسی انصافی کے گھر میں نقب لگا کر اندر گھسے اور آپ کو شہید کر ڈالا۔

شیعوں کی صحیح ترین کتاب اس واقعہ کی گواہ ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں واللہ قد دفعت اللہ کی قسم میں نے خود ان کا دفاع کیا ہے، آپ جب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لاتے، بلوائیوں کو کوڑے مار کر دور بٹاتے، انہیں برا بھلا کہتے۔

کسی مؤمن کا یہ کام نہیں کہ اس تمام بات چیت اور معاملہ کو نفاق کہے اور ظاہر و باطن کے اختلاف پر محمول کرے۔ خود جو متناقض ہو وہی ایسی بات منہ سے نکال سکتا ہے۔ اور ایسے پاک دل بزرگ کے راسخ کو اپنے ناپاک خیال سے آلودہ کر سکتا ہے۔

اور اگر اس وقت نفاق رقیہ کی گنجائش تم کہتے ہو تو کو فرمیں (جبکہ آپ غلیفہ واما تھے) جو خطبہ رحمت فرمایا اس میں کیوں قسم کھائی کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو دفع کیا ہے اور آپ کی شہادت کے بعد میانگ و صل یہ کیوں فرمایا۔

میری اور عثمان کی مثال ان تین میلوں کی سی ہے جو ایک جنگل میں تھے ایک کالا، دوسرا سفید اور تیسرا سرخ تھا۔ اس جنگل میں ایک شیر بھی تھا مگر تینوں کے اتفاق و اتحاد کے سبب ان کا شکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسنے (جال علی اور کالے اور سرخ میل سے کہا کہ اس جنگل میں ہمارے موجود ہیں

إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ عُثْمَانَ كَمَثَلِ الْوَارِثَةِ ثَلَاثَةٌ كُنْتُ فِي أَجْزَاءِ أَبْيَضٍ وَأَسْوَدٍ وَأَحْمَرَ وَهَعْمَتُ فِيهَا أَسَدٌ وَكَانَ لَا يَقْدِرُ فِيهِمْ عَلَى شَيْءٍ لِاجْتِمَاعِهِمْ عَلَيْهِ فَقَالَ لِلثَّوَدِ الْأَسْوَدُ وَالْأَحْمَرُ لَا يَكُونُ لِي عَلَيْهِمْ فَنِي اجْتَمَعْنَا هَذِهِ

إِلَّا الشُّوْرَ وَالْأَبْيَضَ فَإِنَّ كَوْنَهُ مَشْهُوْرٌ وَكَوْنِي عَلَى
كُونِكُمْ فَلَوْ تَرَكْتُمَا فِي أَكْلَتِهِ وَصَفَتْ لَكُمْ الْأَجْمَةَ
فَقَالَ دُونَكَ فَكَلَهُ فَأَكَلَهُ فَلَمَّا مَضَتْ أَيَّامُ قَالِ
لِلْأَحْمَرِ كَوْنِي عَلَى كَوْنِكَ فَإِنَّ كَوْنِي أَكْلُ الْأَسْوَدِ
فَقَالَ دُونَكَ فَكَلَهُ فَأَكَلَهُ ثُمَّ قَالَ لِلْأَحْمَرِ أَلَمْ
أَكْلِكَ فَقَالَ دَعْنِي أُنَادِي ثَلَاثًا فَقَالَ أَفْعَلُ
فَنَادَى ثَلَاثًا أَلَا إِنِّي أَكَلْتُ يَوْمًا كُلَّ الْأَبْيَضِ
ثُمَّ رَفَعَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ صَوْتَهُ فَقَالَ أَلَا إِنِّي
هَبْنْتُ يَوْمَ قَتَلِ عُمَانَ

کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تمہارا اور میرا رنگ تو ایک سا ہے۔ البتہ
یہ سفید بیل جس کا اجلا رنگ ہر ایک کو نظر آتا ہے، یہ ہم سب کو مراد ملے
گا، اگر تم کچھ نہ کہو تو میں اس کو کھا جاؤں۔ پھر تم دونوں کے لئے جنگل میں
کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ دونوں نے کہا ٹھیک ہے اسے کھا جاؤ چند دن
گزرے تھے کہ سرخ بیل کے پاس آیا اور کہنے لگا ہم تم تو ہم رنگ ہیں
یہ کالا ہم میں نہیں ملتا۔ اسے بھی کھا جاؤں؟ سرخ بیل نے کہا کھا جاؤ شیر
اسے بھی چٹ کر گیا۔ اب سرخ سے کہا اب تمہاری باری ہے۔ اس نے کہا مجھے
اتنی ہمت دیکھ میں تیری دفعہ آواز لگاؤں۔ شیر نے کہا ٹھیک ہے، لگا
تو آواز دیں! بیل نے کہا سنو! میں تو اسی دن کھالیا گیا تھا جب سفید
بیل کھالیا گیا تھا۔

پھر امیر المؤمنین رضی

اللہ عنہ نے آواز بلند فرمایا۔ سنو میں اسی دن سبک رہے قدم ہو گیا
تھا جس دن عثمان قتل کئے گئے؟

اور یہ قصہ شہرت و توازن میں اس حد تک پہنچا ہے کہ فریقین کی کتابوں میں محفوظ و مذکور ہے۔ اس کا اب کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جناب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہر دفعہ صبح بلوائیوں کے پاس جاتے اور کہتے ان کو قتل نہ کر دینا کہ ان کے قتل کے نتیجے میں فتنے اور فساد برپا
ہوں گے۔ اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو منافقین کے متعلق پورا علم رکھتے تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس علم کی گواہی بھی دی
ہے۔ وہ ہمیشہ ڈیڈا کر کے تھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل نہ کرنا کہ یہ امر فتنہ و فساد کا سبب بن جائیگا۔

اور آپ کا دفن نہ ہونا۔ تو اس کا سبب بلوائیوں کا ہلکا، اور فساد تھا۔ اور اقلتر ہی جوان و باشوں نے صحابہ کرام کو ڈرا دھمکا کر پھیلا دی تھی اس کا باعث
بنی، رات کو جب بلوائی نیند میں مدہوش تھے تو حضرات زیر بن عوام، حکیم بن حزام، مسورہ بن مخزوم، جبرین مطعم، ابو حمزہ بن حذیفہ بدری، یسار
بن مکرم اور آپ کے لڑکے عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ نے شہیدوں کی طرح خون آنسو دیکر دل میں نماز جنازہ ادا کر کے آپ کو دفن کیا جناب جبرین مطعم
رضی اللہ عنہ نے نماز کی امامت کی! تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت بھی شریک تھی، بنو میں حسن بھری، امام مالک کے دارا مالک رحمہم اللہ بھی تھے!
آدمیوں کے علاوہ آپ کے جنازہ میں فرشتے بھی شریک تھے، چنانچہ حافظ دمشق نے مرفوعاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک روایت کئے ہیں۔
یَوْمَ يَمُوتُ عُمَانُ يَحْيَىٰ عَلَيْهِ مَلَائِكَةُ السَّمَاءِ جَسَدُ عُمَانَ ذَاتُ بَابَيْنِ كَمَا تَابَتِ السَّمَاءُ كَمَا تَابَتِ السَّمَاءُ كَمَا تَابَتِ السَّمَاءُ

اس روایت کی تائید ابن ضحاک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو بطریق سہم بن خنیس مروی ہے۔ یہ شہادت کے واقعہ میں موجود تھا۔ وہ کہتا ہے۔

جب شام ہوئی تو میں نے لوگوں سے کہا اگر تم نے اپنے سردار کو صبح تک اسی
حال میں رہنے دیا تو یہ بلوائی ان کے ناک کاٹ کر مٹا کر دیں گے ہمیں
آدمی رات کے وقت ان کی لاش اٹھائے موقوفہ ملا تو میں ان کو لے کر قبیعہ کی
طرف چلے تو اچانک ایک جماعت نے ہمیں پچھے سے آگھیرا جس سے ہم ڈر گئے
اور ہم ڈر کر وجہ سے بھاگنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک کسی نے پکار کر کہا۔
ڈرو مت جو صلہ رکھو ہم بھی جنازہ میں شرکت کیلئے آئے ہیں۔ ابن خنیس

فَلَمَّا أَمْسَيْنَا قُلْتُ لَإِنْ تَرَكْتُمْ صَاحِبَكُمْ حَتَّى يَضْلُوكُمْ بِهِ
فَأَنْطَلَقْنَا بِهِ إِلَى بَقِيعِ الْغَرْفِ فَلَمْ نَمْلِكْ لَهُ مِنْ جَوْنِ اللَّيْلِ
ثُمَّ حَمَلْنَاهُ فَنَقَشْنَاهُ سَوَادٌ مِنْ خَلْفِنَا فَهَبْنَا هُمُ حَتَّى كُنَّا
نَتَفَرَّقُ فَإِذَا مَيِّتَانِ دَايِلَهُ دَعَا عَلَيْنَا أَنْ تَبْتَدُوهُ فَإِنَّا جِئْنَاهُ
لِنَشْهَدَ وَكَانَ ابْنُ خُنَيْسٍ يَقُولُ هُمُ الْمَلَائِكَةُ

کہتے تھے کہ وہ فرشتے تھے۔

اور یہ جو کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم آپ کے سچے اور برائی کیا کرتے تھے تو ان کی من گھڑت، اور افتراء محض ہے۔ اس سلسلہ میں اہل بیت کی ایک روایت ملاحظہ ہو۔

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَنَاسِكِ عَلَى بَرٍّ وَزَيْنٍ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ مِّنْ نُّورٍ رَّعَمَ بِهَا وَبَدَلَهُ قَضِيْبٌ مِّنَ الْفَرْزِ دَرَسْتُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي إِلَى رُؤْيَاكَ بِالْأَشْوَاقِ وَأَسْأَلُكَ مُبَادِرًا أَفَالْتَقَتَ إِلَيَّ وَتَبَسَّمْتَ وَقَالَ إِنَّ عُمَانَ بْنَ عَفَّانَ أَضْحَى عِنْدَنَا فِي الْجَنَّةِ مَلِكًا عَرُوسًا وَقَدْ دُعِينَا إِلَى وَلِيمَتِهِ فَأَنَا مُبَادِرًا لَدُنْكَ۔

جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ہیں نورانی عمامہ زیب سر پہ، اور جنت کے کسی درخت کی چھتری دست مبارک میں ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو آپ کے دیدار کا مشتاق ہوں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کہیں تشریف لے جائیں گی مجلت ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف توجہ فرمائی اور مسکراتے ہوئے فرمایا، کہ عثمان بن عفان ابھی صبح سہارے پاس جنت میں آئے ہیں اور اس طرح آئے ہیں جیسے شاہی دولہا، اور میں ان کی دعوت ولیمہ میں بلایا گیا ہے اسی لئے میں ذرا جلدی میں ہوں۔

یہ روایت حسین بن عبد اللہ البزار الفقیہ نے بیان کی ہے۔

اور ابو شجاع دلمی جو مشہور محدثین میں شمار ہوتے ہیں اور جن کو شیعہ بھی معتبر مانتے ہیں اپنی کتاب منتهی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی خواہی اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا خواب بھی صحیح روایت کے ساتھ مشہور ہے۔ جیسے دلمی مذکور نے بھی منتهی میں روایت کیا ہے۔

عَنْ حَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ مَا كُنْتُ لَأَقَاتِلَ بَعْدَ رُؤْيَا رَبِّكَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاصْغَايْدَ عَلَى الْعُرْشِ وَرَأَيْتُ أَبَا بَكْرٍ وَاصْغَايْدَ عَلَى مَنكَبِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَأَيْتُ عُمَرَ وَاصْغَايْدَ عَلَى مَنكَبِ أَبِي بَكْرٍ وَرَأَيْتُ عُثْمَانَ وَاصْغَايْدَ عَلَى مَنكَبِ عُمَرَ وَرَأَيْتُ مَا دُونَهُ رَأَيْتُ مَا هَذَا أَفَالْتَقَا دُرَّ عُثْمَانَ يَطْلُبُ اللَّهُ بَدْلَهُ۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جو خواب میں دیکھا چکا ہوں اس کے بعد اب میں نہیں لڑوں گا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں آپ کے برابر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شانوں پر ہیں اور جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر رکھے ہوئے ہیں وہاں میں نے خون دیکھا اور اس کے بارے میں پوچھا کہ یکید ہے۔ تو جواب ملا یہ خون عثمان ہے جو اللہ تعالیٰ سے اپنا قصاص طلب کر رہا ہے۔

اور ابن سمان نے قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے۔

قَالَ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَوْمَ الْجَمَلِ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَبْذُرُ إِلَيْكَ مِنْ دَمِ عُثْمَانَ وَلَقَدْ طَاشَ عَلِيٌّ يَوْمَ قَتْلِ عُثْمَانَ وَأَنْكَرْتُ نَفْسِي وَجَاءَ وَفِي اللَّيْلَةِ فَقُلْتُ أَلَا سَمِعْتُمْ مِنَ اللَّهِ أَبَايُ

یوم جمل کے موقع پر میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے اے اللہ میں تیرے سامنے خون عثمان سے برأت ظاہر کرتا ہوں جس دن اُن کا قتل ہوا (صدیرہ سے) عقل گم ہو گئی اور مجھے حد درجہ صدمہ و ناگواری

تَوَمَّا قَتَلُوا اِمْرًا مَجْلًا قَالَ قَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَسْتَفْهِى رَجُلًا تَسْتَفْهِى مِنْهُ اَللَّهِ تَكْفُرًا بِرَأْسِي سَفْهُي مِنَ اللَّهِ اَنْ اُبَايَعُ وَعُثْمَانَ فَيَقْتُلَنِي فِي الْاَرْضِ كَمَا يَذْفُو بَعْدُ فَاَنْصَرُ فَوَ اَقْلَمًا ذَرْنِ رَجْعَ النَّاسِ يَسْمُكُونَ الْبَيْعَةَ فَقُلْتُ اللَّهُمَّ اِنِّي مُشْفِقٌ مِمَّا اُتِدُّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَاءَتْ عَزِيمَةُ بَايَعْتُ نَفَاكُوا يَا اَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ فَكَانَ مَا صَدَقَ قُلُوبِي.

ہوئی۔ پھر وہ لوگ بیعت کے لئے میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ میں ان لوگوں سے نہ شرماؤں جنہوں نے عثمان کو قتل کیا، جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس سے فرشتے شرما رہے ہیں کیا میں اُس سے نہ شرماؤں۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ وہ تو بے گور و کفن کشتہ پڑے ہوں اور میں بیعت لے لوں۔ تو سب لوگ واپس چلے گئے، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدقون ہو چکے تو وہ لوگ پھر واپس آئے۔ اور بیعت پر اصرار کرنے لگے تو میں نے کہا، اے اللہ میں جو اقدام (بیعت) کر رہا ہوں اس سے میں ڈر رہا ہوں۔ پھر مجھے (موجودہ حالات کے پیش نظر) اس کی اہمیت کا خیال آیا تو میں نے بیعت کر لی۔ بعد بیعت جب انہوں نے مجھے امیر المؤمنین کہہ کر پکارا۔ تو ان کے ایسا کہنے سے میرا دل پارہ پارہ ہو گیا،

اور اسی راوی نے جناب محمد بن الحنفیہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ

اِنَّ عَلِيًّا قَالَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ لَعَنَ اللَّهُ وَتَلَّكَ عُثْمَانُ فِي السَّهْلِ وَالْمَجْلِ.

جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یومِ جمعہ کے موقع پر فرمایا قاتلین عثمان پر اللہ لعنت کرے۔ خواہ وہ زمین پر ہوں خواہ پہاڑ پر!

اور اس روایت کا بھی یہی راوی ہے کہ

اَنَّ عَلِيًّا بَلَغَهُ اَنَّ عَائِشَةَ تَلَعَنَ تَلَّكَ عُثْمَانَ فَدَفَعَ يَدَيْهِ حَتَّى بَلَغَ بِهِمَا وَجْهَهُ فَقَالَ اَنَا لَعْنُ تَلَّكَ عُثْمَانَ لَعْنَهُمُ اللَّهُ فِي السَّهْلِ وَالْمَجْلِ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا

جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان پر لعنت فرماتی ہیں تو آپ نے اپنے ہاتھ چہرہ تک اٹھا کر دو تین مرتبہ فرمایا میں بھی قاتلین عثمان پر لعنت بھیجتا ہوں، اللہ ان پر لعنت فرمائے وہ زمین میں ہوں یا پہاڑ پر،

اور اسی راوی نے جناب محمد بن حسین بن حسین رضی اللہ عنہم سے یہ روایت بھی ذکر کی ہے کہ

وَقَدْ دُرِّدْتُ عِنْدَ كُفْلٍ قَتَلَ عُثْمَانَ فَبَكَى حَتَّى بَلَ الْخَيْتَةِ.

جب قتل عثمان کی خبر آپ کو پہنچائی گئی تو آپ زار و قطار روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى حُذَيْفَةَ فَقَالَ لِي مَا نَعْلُ الدَّجَلُ يَعْنِي عُثْمَانَ فَقُلْتُ اَنَا اَهُمُّ قَاتِلِيهِ فَمَهْ قَالَ اِنْ قَتَلُوْهُ كَانَ فِي الْجَنَّةِ وَكَانُوا فِي النَّارِ.

حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو مجھ سے پوچھا کہ حضرت عثمان کے معاملہ کا کیا ہوا میں نے کہا میرا خیال ہے وہ (دجلوئی) ان کو قتل کر ڈالیں گے۔ تو آپ نے فرمایا اگر ان کو قتل کر دیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور قاتلین جہنم میں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم کے اقوال و آثار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں، اور جناب حذیفہ رضی اللہ عنہ تو خود شہیدوں کے نزدیک اس روایت کی بنا پر جو ان کی کتابوں میں موجود ہے، صاوق الحدیث، (سچ بولنے والے) ہیں! اور اگر ہم وہ ساری روایات، اقوال و آثار بیان کرنے لگے جو قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مذمت میں نیران کے جنتی ہونے اور ان قاتلوں کے جہنمی ہونے کے بارے میں صحابہ کرام اور

تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول و ثابت ہیں تو اس کی گہرا و فتر کار ہو گا۔
ان چند مشہور روایات سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کہنا کہ آپ کا لاشہ تین دن بے گور و کفن پڑا یا صریحاً جھوٹ اور افتراء ہے جس کی تکذیب و تردید تمام
تاریخی کتابوں میں موجود ہے! اس لئے کہ اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ آپ کی شہادت ۸ ارڈی الحجہ بروز جمعہ بعد عصر واقع ہوئی۔ اور سبقتہ کی
رات کو آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

پھر جس ذات گرامی قدر کی نسبت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شہادت موجود ہو کہ وہ بلا حساب، کتاب جنت میں جائیں گے اور شہادت بھی ایسی
جو تو اتر کی حد تک ثابت ہے تو اب وہ کون سی شہادت ہے جس کی ضرورت باقی رہتی ہے!

مناسب ہے کہ اس عنوان کو ہمیں ختم کر کے دوسرے عنوانات کو لیں۔ اہل انصاف اور صاحب بصیرت اہل ایمان کے لئے یہ بیان کردہ حصہ ہی کافی
و شافی ہے! اور ہدایت دینے والا تو اللہ ہی ہے!

مطاعن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔

اعتراض۔ (۱) یہ پاک بی بی مدینہ سے مکہ گئیں اور پھر وہاں سے بصرہ، اہل انکہ ازدواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) کو خدا تعالیٰ نے گھروں سے باہر
نکلنے سے منع اور گھروں میں ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ لہذا ان کے لئے یہ کب مناسب تھا کہ رسول کی عزت کی حفاظت کرنے
کے بجائے سولہ ہزار کے ”اوباش“ لشکر کے ساتھ نکل پڑیں۔

جواب۔ اگر آیت مجاب سے گھر میں ٹھہرے رہنا اور باہر مطلقاً نہ نکلنا مراد ہوتا تو نزول آیت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان محترمت
طبیات کو نہج و عمرہ کے لئے جانے کی اجازت دیتے نہ عزوات میں ساتھ لے جاتے! نہ ہی والدین سے ملاقات، مریضوں کی عیادت، اور مردوں کی
تعزیت کے لئے باہر جانے کی اجازت مرحمت فرماتے۔ اس لئے آیت کا جو مطلب معترضین نے نکالا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ اس ممانعت اور حکم سے صرف
جواب اور پردہ کی تاکید مقصود و مراد ہے۔ کہ دیگر چادر پوش عورتوں کی طرح کوچہ و بازار میں ادھر ادھر نہ پھرتی پھریں! اور سفر کرنے میں مجاب
اور پردہ کے خلاف کوئی بات نہیں۔ آج اس (گئے گزرے) زمانے میں بھی پردہ نشین خواتین، ستر و حجاب کی پابندیوں کے ساتھ سفر کے لئے نکلتی
ہیں۔ خاص طور پر وہ سفر جو دینی ملی یا دنیاوی مصالح پر مبنی ہو، جیسے حج و عمرہ، جہاد وغیرہ۔

تو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ سفر بھی اس نوعیت کا تھا کہ مسلمانوں میں باہم رخنہ نہ پڑ گیا ہے اسکی اصلاح ہو، اور امام
عادل کے قتل کے قصاص کے مطالبہ میں سب مسلمان متفق و شریک ہوں۔ آپ کا یہ سفر حج و عمرہ کے سفر کی مانند تھا۔ آج بھی اگر یہ کہا جائے کہ
فلاں عورت گھر میں بیٹھنے والی ہے باہر نہیں نکلتی۔ تو اس سے کیا مطلب لیا جاتا ہے۔ خود ہی غور کر لیں، انصاف کو کام میں لائیں بہت دھری نہ کریں۔

(اگر اس سیدہ سادہ علی جواب سے انکی تسلی نہ ہوتی ہو تو مجبوراً ہم) ایک جواب اور دیتے ہیں۔ کہ خلافت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جب
اہل بیت کے حقوق سلب ہوئے تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (بقول شیعہ راوی) بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خاتون جنت بی بی
فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو سوار کر کے مدینہ کے محلوں، اور انصار کے گھروں میں خانہ بجانہ رات کو گشت کراتے اور امداد و معاونت طلب فرماتے
تھے۔ یہ روایت شیعہ حضرات کے نزدیک مشہور اور متواتر ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ اب یہاں غور کا مقام ہے کہ ننگ و ناموس کے تحفظ کے
معاملہ میں بیٹی، بیوی سے زیادہ نہ ہو تو کم بھی نہیں ہوتی۔ اب دیکھئے ناموس رسول کے گھر سے سفر کے لئے نکلے اور اپنے خیمہ یا مستقر میں قیام کرنے،
اور دوسروں کے گھروں میں نہ جانے، اور در بدر پھرنے میں آخر کوئی تفاوت و فرق ہے یا نہیں۔ اور پھر دو تین گاؤں ضبط ہونے کا ضرر تو ذاتی
اور انفرادی ہو سکتا تھا اور قتل خلیفہ نے تو پوری امت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس میں دنیا ہی نہیں دین کا بھی ایسا ضرر تھا جس کی پیسٹ میں

پوری ملت مسلمہ آگئی تھی !

تو ذاتی نقصان کے تدارک کے لئے سفر کرنے، اور پوری ملت کے نقصان کی تلافی کرانے کے لئے سفر کرنے میں جو فرق وہ صاف ظاہر ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے، اس لئے جب وہ سفر قابلِ مصلحت نہیں تو یہ سفر کس منطق سے قابلِ اعتراض قرار پاسکتا ہے !

ایک اور جواب یہ ہے کہ تمام ازدواجِ مطہرات مثلاً ام المؤمنین حضرت ام سلمہ اور ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو شیعوں کے نزدیک بھی محترم و مقبول و معتبر ہیں حج وغیرہ کے لئے گھروں سے باہر تشریف لے جاتی تھیں۔ بلکہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا تو اس سفر میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مکہ مکرمہ تک شریک سفر تھیں، اور آپ کی خواہش تو یہ تھی کہ ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہی آگے بھی جائیں۔ مگر عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے جو آپ کے بیٹے تھے اپنی کسی مصلحت سے ان کو روک دیا۔

یہ عجیب دھاندلی ہے کہ اللہ تعالیٰ تو حجاب وستر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ازدواجِ مطہرات کو سفر کی اجازت مرحمت فرمائی اور یہ خدائی خواہ اس پہن و تشبیع کرے ! ملاحظہ فرمائیے خدائی اجازت !

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَلِكَ أَذْنَىٰ أَنْ يَعْنَدْنَ فَنَّا يُؤْذِينَ وَكَانَ اللَّهُ وَهَّابًا حَكِيمًا

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنے اوپر چادر ڈال رکھیں یہ ان کے لئے ایک پہچان ہے تاکہ وہ ایذا نہ پہنچائی جائیں۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔

اور حدیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اَوْنِ لَّكَ اَنْ تَخْرُجِي لِحَاجَتِكَ۔ (اپنی ضروریات کے لئے تمکو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت دیدی گئی)۔ ہاں سفر کے لئے محرم کا ہونا شرط ہے، تو آپ (رضی اللہ عنہا) کے اس سفر میں سبکے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے۔ پھر آپ کی بہن ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق کے شوہر جناب طلحہ بن عید اللہ رضی اللہ عنہم بھی ساتھ تھے اور دوسری بہن جناب اسماء بنت ابی بکر کے شوہر حضرت زبیر بن عوام۔ رضی اللہ عنہم بھی ہمراہ تھے۔ اور ان دونوں کی اولاد میں بھی شریک سفر تھیں۔

ابن قیمین جن کی کتاب پر شیعوں کو کتاب اللہ سے زیادہ اعتماد ہے اپنی تاریخ میں رقمطراز ہے۔

لَمَّا بَلَغَهَا بَيْعَةً عَلَىٰ أَمْرٍ أَنْ تَعْلَلَ لَهَا هُوَ وَجْهٌ مِنْ حَدِيدٍ فِيهَا مَوْضِعُ الدُّخُولِ وَالْخُرُوجِ فَوَجَّهَتْ وَابْنًا طَلْعَةً وَالزَّيْبُورَ مَعَهَا

جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اطلاع ملی تو آپ نے ایک آہنی (صودج) بنوایا جس میں اترنے چڑھنے کا راستہ بھی رکھا۔ پھر جناب طلحہ کے دونوں بیٹوں اور جناب زبیر رضی اللہ عنہم کی معیت میں سفر کے لئے روانہ ہو گئیں۔

پھر ازدواجِ مطہرات تو امہات المؤمنین ہیں ! اس حیثیت سے باعتبار احترام و عزت پوری امت انکی اولاد ہے۔ اسی لئے تمام علمائے امت کا مذہب یہی ہے کہ امت کے کسی بھی فرد کی معیت میں ان کو سفر کرنا جائز ہے !

یہی وجہ تھی کہ حلیف ثانی امیر المؤمنین عرفا و دق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ازدواجِ مطہرات رضی اللہ عنہم کو سفر حج کے لئے بھیجا تو جناب عثمان غنی اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کو ان کے ہمراہ روانہ کیا اور فرمایا تم ان کے سعادت مند بیٹے ہو۔ اس لئے تم میں سے ایک ان کی سواری کے آگے ہے۔ اور دوسرا پیچھے ! اور ان سب سے قطع نظر خود قرآنی آیت کے الفاظ وَلَا تَجْرِيْنَ تَبَوُّعَ الْمُجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى۔ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مطلق نکلنے سے منع نہیں فرمایا، بلکہ جاہلیتِ اولى کے طریق پر بناؤ سنگار کی نمائش کرتے ہوئے نکلے کہ منع فرمایا۔ تو اب اس نہی سے استدلال نہیں رہا۔ اب یہی یہ بات و قرون فی بیوتکن کی، تو یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ شیعوں کے نزدیک امروہوب کے لئے رمتعین نہیں

تو پھر اس کے خلاف کرنے سے خرابی کیسے لازم آسکتی ہے!

اعتراض - (۲) کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خون عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لئے سفر اختیار فرمایا حالانکہ ان کا کوئی تعلق نہ تھا، نہ وہ وارث تھیں اور نہ کوئی رشتہ قرابت تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ

سے دشمنی و عناد تھا۔ اسی لئے ان کے خلاف فتنہ برپا کیا۔ جبکہ اس سے پہلے خود لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر برا لگیتے تھے فرمایا کرتی تھیں، اور فرماتی تھیں اُتُّلُوا اَعْتِلًا۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔

اِنَّ عَائِشَةَ اَنَا هَا خَبَرُ بَيْعَةِ عَلِيٍّ وَكَانَتْ خَارِجَةً مِّنَ الْمَدِينَةِ فَعَبِلَ لَهَا قَتِيلٌ عُثْمَانُ وَبَايَعَ النَّاسُ عَلِيًّا فَقَالَتْ مَا اَبَايَ اَنْ تَقَعَ السَّمَاءُ عَلَيَّ اَلْاَرْضُ قَتَلَ وَاللّٰهُ مَظْلُومًا وَاَنَا طَالِبَةٌ بِدَمِهِ فَقَالَ عُبَيْدٌ اَدُلُّكَ مَن يَحْمَسُ عَلَيْهِ وَاَطِيعِ النَّاسَ فِي قَتْلِهِ لَآنْتَ وَلَعَدُو قُلْتُ اُتُّلُوا اَعْتِلًا فَقَدْ نَجَرْتُ فَقَالَتْ عَائِشَةُ قَدْ وُ اللّٰهُ قُلْتُ وَقَالَ النَّاسُ فَقَالَ عُبَيْدٌ فَنَدَى الْبُكَاءُ وَمِنْكَ الْعَيْزُ وَمِنْكَ الدِّيَارُ وَمِنْكَ الْمَطَرُ وَاَنْتِ اَمْرُو بِقَتْلِ الْاِمَامِ وَقُلْتُ لَنَا اَنْتَ قَدْ فَجَرٌ۔

جب آپ مدینہ منورہ سے باہر تھیں تب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے ان کو اطلاع ملی۔ آپ کو بتایا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دئے گئے اور لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی۔ آپ نے اس وقت فرمایا۔ آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو بھی مجھ کوئی پرواہ نہیں۔ اللہ کی قسم وہ مظلوم قتل کئے گئے۔ اور میں ان کے خون کا مطالبہ کرتی ہوں۔ عبید نے ان سے کہیں سب سے پہلے جس نے لوگوں کو بھڑکایا اور ان کے قتل پر ابھارا وہ آپ ہی تھیں، اس وقت آپ نے کہا تھا کہ نعل کو مار ڈالو کہ وہ فاجر ہو گیا ہے۔ اس پر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بے شک میں نے ایسا کہا اور لوگوں نے بھی کہا اس پر عبید نے کہا کہ اس کی ابتدا بھی آپ نے کی اور اس میں تبدیلی بھی آپ ہی کی طرف سے ہو رہی ہے۔ آپ ہی کی طرف سے ہوا بھی ہے، اور آپ ہی کی طرف سے باتش بھی۔ امام کے قتل کا آپ ہی نے ہمیں حکم دیا کہ وہ فاجر ہو گئے ہیں۔

جواب :- اس اعتراض کے جواب میں اہل توہید بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ خلیفہ عادل کے خون کا بدلہ لینا ہر مسلمان کا حق ہے۔ ورنہ کے ساتھ حق مخصوص نہیں۔ کیونکہ خلیفہ عادل۔ اسوال کی حفاظت اور فتنہ و فساد کے انتظام و قیام میں تمام مسلمانوں کا نایب ہوتا ہے۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو ام المؤمنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں، اس مطالبہ کے کرنے کی عام مسلمانوں سے زیادہ حقدار تھیں۔ احکام الہی کے نفاذ کے لئے وہ کیوں تنگ و درود فرمائیں۔ خصوصاً قصاص جیسے اہم دینی معاملہ میں جبکہ وہ قصاص بھی ایک مظلوم کا ہو جیسے خلافت و امارت کا مالک ہوتے ہوئے بلا کسی شرعی وجہ کے قتل کر دیا ہو۔ اور حضرت عائشہ و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے باہم دلی بغض و عناد کا تو کسی مسلمان کا دل میں تصور تک نہیں آسکتا۔ ہر مسلمان ایسے خیال و تصور سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے یہ محترم و مقدس ہستیاں تو ایک دوسرے کے فضائل و مناقب ہیں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ دہلی نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حب علی عبادۃ۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کی محبت عبادت کا درجہ رکھتی ہے)۔ آپ کا سفر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ و جدال کا نہیں تھا، قتل سے باہم جو گتھی پڑ گئی اور دونوں میں جو گرہ لگ گئی تھی اس کی اصلاح اور باہم صلح و صفائی اور خون عثمان کا قصاص مقصد سفر تھا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیا جائے اور ان کو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نکال دیا جائے۔ اور قاتلین عثمان کی دھمکیوں اور ڈنڈا وے میں اگر جناب طلحہ و زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم مدینہ چھوڑ کر دھڑ دھڑ منتشر ہو گئے تھے، مطمئن ہو کر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے رفیق

ومعاون نہیں اور باہم اتفاق و مودت سے خلافت کا نظام حسن و خوبی کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے۔ ادھر جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر خالفین بھی حد سے زیادہ آگے نہ بڑھیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں کہ قائلین عثمان نے بعد قتل، حضرات طلحہ و زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو قتل کی دھمکیاں دیں۔ اور علی الاعلان منافقانہ گفتگو کرتے رہے۔

دہی بات حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر لوگوں کے کسانے کی تو یہ ابن قتیبہ، ابن اعثم کوئی اور سماطی، کا پیشہ وارانہ جھوٹ اور افتراء ہے۔ یہ تو مشہور کذابوں میں گنے جاتے ہیں۔ چنانچہ جنگ جمل اور دوسری لڑائیوں کی جو رپورٹنگ انہوں نے کی ہے۔ وہ مشیہ و سنی دونوں کے نزدیک افتراء اور بہتان پر مبنی ہے اور جھوٹے اور مفتری واقعات میں کثرت سے آگے بڑھ کر واقعات تخلیق کرنے میں بدنام ہیں، یہ حد و جہنا النفاق اور بغض و عناد کا گھناؤنا اظہار ہے کہ زوجہ محبوبہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اللہ اور رسول کی شہادت کو بالائے طاق رکھ کر چند اخوان الشیاعین جھوٹے اور بے ایمان کوفوں کا دم چھلنا بنائیں اور انہیں کی تال پر تاپچنے لگیں، اور ان کی اتباع و پیروی میں اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَئِكَ عَلَى مَقْعَدِ اللَّهِ
مِمَّا يَظُنُّونَ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَرِزْقٌ كَرِيمٌ
لئے مغفرت اور اچھا رزق ہے!

اہل سنت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بابت ابن قتیبہ کی بات کو کس طرح وقعت دے سکتے ہیں جبکہ ترمذی، ابن ماجہ اور ابوحاتم رازی نے بطریق متعدد یہ روایت کی ہے کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں۔

قَالَ سَأَلَ اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعُثْمَانَ
يَا عُثْمَانُ لَعَلَّ اللَّهَ يَفْصِلُكَ قَوْمًا فَإِنْ أَوْدَوْكَ
عَلَى خَلْعِهِ فَلَا تَحْلَعَهُ لَهُمْ ثَلَاثًا.
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا اے عثمان، شاید اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی پوشاک پہنائے۔ اگر لوگ وہ پوشاک اتارنا چاہیں تو تم ان کی خاطر وہ پوشاک نہ اتارنا۔

اعترض۔ (۳) تبصر اعتراض یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی بلکہ اس پر جہمی بھی رہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نعیم بن حمار نے کتاب الفتن میں اور محمد بن مسکویہ نے تجاہد

الام میں، اور ابن قتیبہ نے کتاب السیاست میں ایک روایت یوں بیان کی ہے کہ جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک لشکر راستہ میں ایک ایسے مقام سے گزر رہا تھا۔ تو وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا، جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا اس پانی کا کیا نام ہے، انہوں نے بتایا کہ اسے حوآب کہتے ہیں۔ سنکر آپ فرماتے لگیں مجھے یہاں سے واپس لے چلو۔ جناب محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا اس نے پوچھا آخر کیوں؟ آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ازواج سے یہ فرماتے سنا ہے!

كَأَنِّي أَخَذْتُ لَكُنْ تَبْنَحُهَا كَلَابُ الْحَوَابِ فَإِنَاكَ
أَنْ تَكُونِي يَا حَمِيرًا عَوْ.
گویا میں تم میں سے ایک پر حوآب کے کتوں کو بھونکتا دیکھتا ہوں۔
تو لے حمیر! تم وہ نہ ہونا۔

پس یہ ممانعت یا دھونے کے باوجود آپ وہاں سے واپس نہ ہوئیں۔

جواب۔ جو روایات ان لوگوں نے بیان کی ہیں یہ بات تو ان سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ اور اہل سنت کی روایات میں پھر اصرار آپ کے یہ الفاظ ملتے ہیں رُدُّونِي۔ رُدُّونِي۔ مجھے واپس لے چلو۔ واپس لے چلو، اسی کے ساتھ ان کی روایات میں بطور تتمہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے واپسی میں پس و پیش کیا۔ مگر اہل لشکر نے اس سلسلہ میں آپ سے موافقت نہ کی اور

باہم اختلاف رہے پیدا ہوا۔ اسی دوران مروان بن حکم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے لشکری قریب کے دیہات و آبادی سے اسی لیے افراد کو بطور گواہ لائے یہ کہتے تھے کہ یہ پانی خواب نہیں کہلاتا۔ بلکہ وہ کوئی پانی ہے۔ اس گواہی کے بعد آپ رضی اللہ عنہا کے آگے روانہ ہوئیں۔ یہ جواب تو روایت کے مقابلہ میں روایت سے تھا۔ اب از روئے روایت ایک اور جواب ملاحظہ فرمائیے، کہ

حدیث میں پانی پر سے گزرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مصیبت سے جو ان میں سے کسی ایک کو پیش آسکتی ہے اس سے خبردار فرما رہے ہیں، اس حدیث سے بھی سمجھنا اور مخالفت رسول پر اصرار اور ضد کی نسبت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کرنا۔ کس طرح ممکن ہے خاص کر اس صورت میں جبکہ ”اینا ان تگوئی یا حَمْدُکَ اَوْ“ کے الفاظ اہل سنت کی معتبر و مستند کتابوں میں موجود ہی نہیں ہیں؛ اور اگر بالفرض موجود بھی ہوں تو ان کا مطلب وہی ہو گا جیسے کوئی سربراہ خاندان افراد خاندان کو اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے آئندہ پیش آنے والے خطرات و دشواریات سے آگاہ کرے۔ اور ان سے ڈرائے۔ جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی قسم کی پیش بینی اور احتیاط کے لئے تھا۔ یہ شرعی بھی تھی جس کی مخالفت مصیبت کہلاتی ہے۔ مگر احتیاط شرعی ہی کی عدم موجودگی میں آپ رضی اللہ عنہا کے عمل کو مصیبت قرار دے کر طعن کرنا سوا کسب و لغت و عناد کے کچھ نہیں!

یہ واقعہ اوراق گذشتہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ایک شب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے اور نماز تہجد کی تاکید فرمائی مگر آپ نے جواباً قسم کھا کر کہا کہ ہم سوئے فرض کے ہرگز کوئی نماز نہ پڑھیں گے۔ وَاللّٰہ لَانفَعِلِی الْاَمَّا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے تو اپنے زانو پستے یہ فرماتے جا رہے تھے۔ (انسان کتنا جھگڑا لہو ہے) اب درادوں جگہوں کی مخالفت کا موازنہ کر لیں (تو کیا فیصلہ ہے شیعہ حضرات کا جناب امیر علی رضی اللہ عنہ رضی اللہ عنہ کے متعلق)۔ حقیقت میں بنظر انصاف دیکھا جائے تو ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اصرار میں معذور بھی نہیں۔ مگر مکرر سے روانگی کے وقت ان کو کہاں معلوم تھا کہ راستہ میں چشمہ خواب بھی پڑے گا۔ اور اس پر سے گذرنا ناگزیر بھی ہو گا۔ اور پھر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ وہی مقام ہے، تو واپسی کا ارادہ بھی کیا۔ مگر نہ کرنے اس کی موافقت نہ کی۔ اس لئے اس پر عمل نہ ہو سکا۔ اور پھر حدیث میں بھی اس کی تصریح نہیں ہے کہ اگر ایسا واقعہ پیش آجائے تو کیا کرنا چاہئے! آپ کا مقصد سفر چرنکہ باہم صلح و صفائی بین المسلمین تھا جو اپنی جگہ اہم تو ہے ہی مگر شرعاً اس کا حکم بھی ہے۔ اسی کے پیش نظر آپ نے سفر جاری رکھا۔

یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لشکر بصرہ پہنچا۔ تو اس نے بیت المال لوٹ لیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل عثمان بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کو جو صوبائی تھے۔ امانت کے ساتھ نکال دیا۔

استعراض - (۴)

جواب ۱۔ یہ ہے کہ یہ واقعہ نہ آپ کے اشارہ سے ہوا، اور نہ آپ کی مرضی سے ہوا۔ اور جب آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے نہ صرف یہ کہ جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ سے عذر و معذرت کی بلکہ حد سے زیادہ ان کی دلجوئی فرمائی۔ اور ان کا دل خوش کرنے کے لئے مقدور ہر کوشش فرمائی۔ تاریخ میں اسی جیسا ایک اور واقعہ بھی محفوظ ہے۔ کہ جناب امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک لشکری مالک اشتر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں عہد عثمانی کے ایک گویہر جناب ابو موسیٰ اشعری صحابی رضی اللہ عنہ کا کوفہ میں گھر جلا گیا۔ مال و اسباب لوٹ گیا۔ تو کیا ان کے نزدیک یہ بھی طعن کی بات ہے؟ اگر نہیں تو لشکر یا ان عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں بیت المال لئے سے جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کیوں۔ اگر وہ تو دونوں جگہ ہو، ورنہ کہیں بھی نہیں۔ جیسا کہ سنیوں کا مسلک ہے؛ اور پھر ان دونوں واقعات میں قابل لیٹا و غور ایک نہاں اور بنیادی فرق بھی ہے۔ یہاں بیت المال پر دست درازی ہوئی۔ جس میں ان دست درازوں کا بھی حق و حصہ تھا۔ جناب عثمان انصاری عامل بصرہ کی ذاتی املاک و اموال پر دست درازی نہیں کی گئی مگر وہاں ذاتی املاک کوئی گنیں۔ جلائی گئیں اور تباہ کر دی گئیں!

اور پھر یہاں جو کچھ ہوا آخری چارہ کار کے طور پر ہوا۔ ان کے زندہ رہنے اور بقا کے لئے کوئی صورت چھوڑی نہیں گئی۔ واقعہ یوں ہے کہ جناب

طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے اول جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کی خاطر ہمارے ساتھ مسلمانوں کی ایک جمعیت آئی ہے۔ ہم جو زارہ لے کر چلے تھے وہ ختم ہو گیا اگر آپ بیت المال کے اموال ہمارے پاس لے آئیں تو ان میں تقسیم کر دئے جائیں۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف اس سے انکار کیا بلکہ آمادہ پیکار ہوئے، اور حکم جاری کیا کہ کوئی لشکر سیل نہ ہوئے پائے، کھانا پینا، دانہ، چارہ سب بند کر دیا۔ جب لشکر کی جان کے لئے پر گئے، تو معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا۔ لشکر میں جو اکھڑ مزاج لوگ تھے۔ اور اسوقت کے حالات کے مطابق ایسے لوگوں کو پورے طور پر قابو میں رکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ چنانچہ وہ ہلہ کو کے شہر میں گھس گئے اور بیت المال کو جس میں ان کا حق بھی تھا لوٹ لیا۔ تو ایسی صورت میں اعتراض اور بیہی کی کہاں گنجائش!

اور اس سب کچھ کے باوجود اہل سنت میں کوئی بھی جب حضرت عائشہ، طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم تک کو معصوم نہیں کہتا، تو لشکریوں کی عصمت کا کون قائل ہوگا کہ ان سے اس قسم کے اعمال کے صدور سے عقیدہ میں فرق آئے!

اور جب جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما قتل کئے گئے، ام المؤمنین زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی توہین جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی۔ تو ان کے عقیدہ میں فرق کیوں نہیں پڑا۔ جب کہ باعتبار مراتب جناب عثمان انصاری کو جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ پھر اس قسم کے واقعات کے صدور سے ان کے عقیدہ میں کیوں خلل پیدا ہوگا۔

جسٹ ہم زیادہ افسوسناک روای ہے کہ میں نے احسن حدیث کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل جبل پر قابو پایا تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہلوا یا کہ آپ مدینہ منورہ واپس چلی جائیں آپ نے انکار فرمایا۔ تو دوبارہ قاصد بھیجا کہ واللہ یا تو آپ واپس چلی جائیں گی، یا پھر میں بکرہ و اہل کی بغیر دار عورتوں کو بھیجوں گا کہ وہ آپ کو ان کے ذریعہ قابو کر لیں گی۔ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ صورت حال دیکھی تو آپ مدینہ روانہ ہوئیں۔ (ابو بکر بن شیبہ نے اپنی مصنف میں اسے روایت کیا۔)

لَمَّا هَرَعَ عَلَى أَهْلِ الْجَبَلِ أَرْسَلَ إِلَى عَائِشَةَ رَضِيَ
إِلَى الْمَدِينَةِ قَالَتْ فَابْتُ قَالَ فَأَعَادَ إِلَيْهَا الْمُرُورُ
قَالَ اللَّهُ لَتَرْجِعْنَ أَوْ لَا بُعْثَنَّ إِلَيْكَ نِسْوَةً مِنْ بَكْرٍ
بَنِي وَائِلٍ مَعْصَنَ شَفَاؤُحْدٍ أَرِيَاخُذُ نَكَدَ بَهَا
فَلَمَّا رَأَتْ ذَلِكَ خَدَجَتْ يَرَاهُ أَبُو بَكْرٍ بَنِي إِلَى
شَيْبَةَ فِي الْمُسْتَفِ.

اعتراض۔ (۵)

یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا کر دیا جس پر آپت قرآنی نازل ہوئی جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے بطور سرکشی ایک بات کہی تو ان بیوی نے وہ بات بیان کر دی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر عتاب کر دیا کہ بعض کو یہ بات بتادی اور بعض سے چھپائی، اور جب نبی نے اپنی بیوی کو بتایا کہ تم نے ایسا کیا، تو وہ کہنے لگیں آپ کو یہ کس نے بتایا۔ آپ نے فرمایا مجھے علم وغیرہ (خدا نے بتایا۔)

وَإِذَا سَأَلَ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَرْوَاحِهِ
حَدِيثًا فَلَمَّا بَنَاتُ بِهِ وَأَلْهَدَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ
وَأَعْدَمَ عَنْ الْبَعْضِ فَلَمَّا بَنَاتُ هَا بَ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ
هَذَا قَالَ نَبَاتُ فِي الْعَلِيمَةِ الْخَبِيرِ

جواب۔ مفسرین اس پر متفق ہیں کہ راز حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے افشا کر دیا کیونکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دروازہ کی درز سے اپنے لباس پر دکھا تھا۔ اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے کہ میں نے ماریہ کو اپنے لئے حرام کر لیا ہے۔ تو تم میرا یہ راز چھپائے رکھنا کسی سے ذکر نہ کرو دینا۔

مگر آپ اس خوشی میں جو ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے حرام کر لینے کی خبر سے انہیں ہوئی تھی کتمان راز کی تاکید کو بھول گئیں، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ راز فاش کر دیا اور اسی وجہ سے جناب ماریہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ واقعہ کہہ ڈالا۔ وہ تحریم کے معاملہ کے بجائے راز کی بات، اس واقعہ کو

سمجھتی رہیں جو در سے انہوں نے دیکھا تھا اس لئے تحکم کی بات کہہ ڈالی۔

ان حالات کے پیش نظر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف افترا راز کی تسبیح کرنا محض تہمت و افترا ہے اور پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اہل سنت کا جو عقیدہ ہے، اس میں ان کا یہ عمل بھی کوئی ظلم نہیں ڈالتا۔ اس لئے کہ اگر وہ عیوب کیلئے بھی ہو، استیجاب مقصود نہ ہو، تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ خلاف وجوب معصیت اور گناہ ہے۔ اور آیت کا جملہ "ان تنوبوا الی اللہ صاف بتانا ہے کہ اس معصیت سے توبہ مقبول ہے۔ اور بالاجماع یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے توبہ کی اور وہ مقبول ہوئی۔ اور آپ آخر دم تک ازواج مطہرات میں داخل رہیں، اور خوشخبری پائی۔

طبری کی جمع البیان جو شیعوں کی معتبر تفسیر سمجھی جاتی ہے اس میں طبری کہتا ہے۔

قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسَمَ الْإِيَّامَ بَيْنَ نِسَائِهِ فَلَمَّا كَانَ يَوْمَ حَفْصَةَ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ فِيَّ إِلَى أَبِي حَاجَةً فَأَذِنَ لِي أَنْ أَتُوهُ فَأَذِنَ لَهَا فَلَمَّا خَرَجَتْ أَرْسَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى جَارِيَتِهِ مَارِيَةَ الْقُبَيْطِيَّةِ أَنْ تَأْتِيَهُمْ وَقَدْ كَانَ أَهْدَاهَا الْفُتُوسُ فَأَدْخَلَهَا بَيْتَ حَفْصَةَ فَوَقَعَ عَلَيْهَا فَأَنَّتْ حَفْصَةُ فَوَجَدَتْ الْبَابَ مُعْلَقًا فَجَلَسَتْ عِنْدَ الْبَابِ فَخَدَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَجْهَهُ يَقْطُرُ عَرَقًا فَقَالَتْ حَفْصَةُ أَنَا أَذِنْتُ لِي مِنْ أَجْلِ هَذَا. أَدْخَلْتَ أَمَتِي بِلَيْتِي ثُمَّ وَقَعْتَ عَلَيْهَا فِي يَوْمِي وَعَلَى فِرَاشِي أَمَا أُبَيَّتُ لِي حُرْمَةً وَحَقًّا فَقَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَيْسَ هِيَ جَارِيَتِي قَدْ أَهْلَ اللَّهُ ذَلِكَ لِي أَسْأَلُكَ فَهِيَ حَرَامٌ عَلَيَّ أَلَتَنُفُسُ بَيْنَ لَوْ رِضَاكَ وَلَا تُخْبِرُنِي بَيْنَ لَوْ إِسْرَافٍ مِنْهُنَّ وَهُوَ عِنْدَكَ أَمَانَةٌ فَلَمَّا خَدَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَعَدَتْ حَفْصَةُ الْجَدِ الرَّائِي بَيْنَهَا وَبَيْنَ عَائِشَةَ فَقَالَتْ أَلَا أُبَشِّرُكَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ خَدَعَكَ عَلَيْهِ أَمَتُهُ مَارِيَةَ وَقَدْ أَرَاهَا اللَّهُ مِنْهَا وَخَيْرٌ مِنْ عَائِشَةَ بَعْدَ مَا نَأَتْ وَكَانَتْ مُتَصَافِيَتَيْنِ مُتَظَاهِرَتَيْنِ عَلَى سَائِرِ أَوْلَاجِهِ فَمَزَلَتْ بِمَا يَهْوَى النَّفْسُ لِمَ خَدَعَهُ مَا أَهْلَ اللَّهُ وَلَكِنَّهَا غَاوَزَتْ نِسَاءَهُ نِسَاءَهُ وَعَشْرِينَ يَوْمًا وَقَعَتْ فِي مُشْرِيبَةٍ أَمَّا أَبُو إِهْلِيَّةَ مَارِيَةَ

کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انعام کے مابین باری کے دن مقرر فرما رکھے تھے۔ (ایک مرتبہ) حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اپنے والد سے کچھ کام آپ اجازت فرمائیں تو میں ان سے مل آؤں، آپ نے ان کو اجازت دیدی جب وہ چلی گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ام ابیہم جناب ماریہ قبیلہ رضی اللہ عنہا کو بلوایا۔ یہ شاہ مصر متوقس کی طرف سے آپ کو بدیہ کے طور پر ملی تھیں۔ ان کو آپ جناب حفصہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں لے گئے۔ اور صحبت فرمائی اسی دوران حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آگئیں، گھر کا دروازہ بند پا کر باہر دروازہ ہی پر بیٹھ گئیں۔ جب کچھ دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو آپ کے چہرہ مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ تب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ آپ نے مجھے اس لئے اجازت دی تھی کہ میرے گھر، میرے بستر اور میری باری کے دن اس لونڈی سے صحبت فرمائیں۔ آپ نے میری عزت اور حق کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ لونڈی اللہ تعالیٰ نے میرے لئے حلال نہیں کی ہے۔ اچھا شکوہ نہ کرو میں تمہاری دلجوئی کی خاطر اس کو اپنے لئے حرام کر لیتا ہوں، مگر اس بات کا ذکر باقی ازواج سے نہ کرنا۔ یہ میرا ارادہ تھا اسے پاس امانت ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا دوڑ کر اس دیوار کے پاس گئیں جو ان کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی مشترک تھی اور کہنے لگیں خوشخبری سنو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لونڈی ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ اور یوں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے سکون و راحت ہمیں فرمادی۔ اور پورا واقعہ جو دیکھا تھا

حَتَّى تَزُكَّ آيَةُ الْغَيْبِ وَقَبْلَ أَنْ يَنْبَغِيَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَلَا يُومًا لِعَائِشَةَ مَعَ جَارِيَةِ الْيُطْبُيَّةِ فَوَقَعَتْ حَفْصَةُ عَلَى ذَلِكَ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَعْلَمِي عَائِشَةَ بِذَلِكَ وَحَدَّثَ مَارِيَةَ عَلَى نَفْسِهَا فَأَعْلَمَتْ حَفْصَةُ عَائِشَةَ الْخُبْرَ وَاسْتَلْتَمَّهَا نَاحِلَةً اللَّهُ نَبِيَّهَ عَلَى ذَلِكَ وَهُوَ قَوْلُهُ وَإِذْ أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا يَعْنِي حَفْصَةَ وَلَكِنْ حَدَّثَ مَارِيَةَ الْيُطْبُيَّةَ أَخْبَرَ حَفْصَةَ أَنَّهُ يَنْتَلِفُ مِنْ بَعْدِ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرُ فَعَدَّهَا بَعْضُ مَا أَفْشَتْ مِنَ الْخُبْرِ وَاعْتَدَّ عَنْ بَعْضِ أَنْبَاءِ بَكْرٍ وَعُمَرُ يَذْكَانُ بَعْدِي.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا دیا تھا۔ باقی ازواج مطہرات کی نسبت ان دونوں بی بیوں میں دوستی اور اتفاق کے باہم روابط زیادہ استوار تھے۔ اس پر آیت تحریم یا ایہا النبی لم یؤمر بما حلّ اللہ لہ نازل ہوئی۔ تو آپ نے اتیس روز تک اپنی ازواج سے کنارہ کشی اختیار فرما کر ابراہیم کے بالا خانہ پر قیام فرمایا تا آنکہ آیت تحریر نازل ہوئی۔ بعض راویوں نے یہ کہا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باری کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے خلوت فرمائی تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا وٹن موجود تھیں۔ اور ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اور آپ نے ماریہ کو اپنے اوپر حرام ٹھہرایا۔ مگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس کی اطلاع اس تاکید کے ساتھ کہ کسی سے ذکر نہ کرنا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو کر دی جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اس آیت میں مراد بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام ٹھہرائے تو خبر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کو دی اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دی تھی کہ میرے بعد جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما حلیفہ ہوں گے۔ انہوں نے خبر کا ایک حصہ افشا کر دیا اور دوسرا نہیں بتایا۔

اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ افشا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوا۔ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے: اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ افشا خوشی و فرحت کی زیادتی کے سبب ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ اور پھر عیاشی کی وہ روایت جو اس نے جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے کی ہے اور وہ شیعوں کے نزدیک بہترین محدثین شمار ہوتا ہے وہ صاف رضامندی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس سے شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہوتا ہے، اور اس راز کے افشا پر کوئی عتاب بھی نہیں! یہاں ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو گیا، کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی الہی کے ذریعہ حضرت شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہو گیا تھا، تو اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا حکم، امر الہی کے مخالف ہوتا ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام تو تقدیر الہی کے خلاف دعا تک نہیں کرتے چہ جائیکہ خلافت کی تقرری و موقوفی کے احکام صادر فرمائیں! معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا۔ یہ سب یازوں کی گھونٹ اور افرا ہے!۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجِئُ لَنَا فِي قَوْمٍ لُوطٍ. إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ. يَا إِبْرَاهِيمُ أَعُوْذُ مِنْ هَذَا وَإِنَّهُ حَدَّثَ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَاتَّهَمُوا اتِّبَهُمْ عَنْ آتٍ غَيْرُ مَذْمُودٍ.

جب ابراہیم علیہ السلام کا خوف دور ہوا اور بشارت (پسر) ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے معاملہ میں اصرار کرنے لگے کہ انہیں عذاب نہ دیا جائے۔ وہ نرم دل بردبار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں مگر اس لئے یہ اصرار کر رہے تھے ہم نے ان سے کہا، ابراہیم اس (اصرار) سے گریز کرو، تمہارے رب کا اس معاملہ میں حکم جاری ہو چکا۔ اب تو ان پر عذاب آئے گا جو لوٹا یا نہیں جاسکتا۔

اعتراض (۶)۔ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

مَا غَدِرْتُ عَلَى أَحَدٍ مِّنْ نِّسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رُبَّ عَلَى خَدِّجَةَ وَمَا كُنَّا بِنَهْائِهَا قَطُّ وَلَكِنَّ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْتَرُ ذِكْرَهَا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے سوائے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے کسی کے حال پر مجھ کو غیرت نہیں آئی حالانکہ میں نے ان کو بالکل نہیں دیکھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کثرت سے فرمایا کرتے تھے۔

جواب۔ غیرت اور رشک تو عورتوں کا طبعی تقاضا ہے! اور طبعی تقاضے پر کوئی گرفت نہیں۔ ہاں غیرت و رشک کی بنا پر کوئی قول و فعل خلاف شرع سرزد ہو تو البتہ گرفت کا موقع ہوتا ہے۔

حدیث صحیح میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کسی بیوی کے گھر میں تھے کہ ایک دوسری زوجہ محترمہ نے آپ کے لئے عداوہ کھانا تیار کر کے بھجوا دیا مگر ان محترمہ نے غیرت کے مارے سے خادمہ سے طشت لے کر زمین پر پٹخ دیا کہ طشت تو ٹوٹا ہی کھانا بھی بکھر گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کی حرمت کے لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے بنفس نفیس خود اٹھے اور کھانا چھیننے لگے، ساتھ ہی یہ بھی فرماتے جاتے، غالت امکم۔ مگر اس کے علاوہ نہ ان محترمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ فرمایا نہ ناراض ہوئے۔ جب اس معاملہ میں نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی محرمات کے ساتھ یہ سلوک و معاملہ ہے ایسے غیرے کو حق کہاں پہنچتا ہے کہ ان امہات محترمات رضی اللہ عنہن کو اعتراض کا نشانہ بنائے۔ اور اپنی عاقبت خراب کرے! کتب امامیہ میں تو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ درج ہے کہ انہوں نے ائمہ کے معاملہ میں حسد و رشک کا اظہار فرمایا، تو ان کے مقابلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت کیا وزن رکھتی ہے، اور کیسے اس پر یہ لوگ اعتراض کر سکتے ہیں۔

اعتراض (۷)۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا، آخر عمر میں فرمایا کرتی تھیں قَاتَلْتُ عَلِيًّا وَكَوَيْدْتُ اِلَيْهِ كُنْتُ نَسِيًا مُّثْسِيًا۔ میں علی رضی اللہ عنہ سے لڑ پڑی، اور میری خواہش ہے کہ میں بھولی بسر بات ہوں!

جواب۔ ان الفاظ سے کوئی روایت بطریق صحیح منقول نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یوم حبل کی یاد جب بھی آتی، آپ بے اختیار اتار تار تھیکہ چادر مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ یہ رونا اس بنا پر ہوتا کہ کاش میں نکلنے میں جلدی نہ کرتی، پہلے حالات کی تحقیق کیوں نہ کر لی، غور و فکر کیوں نہ کیا، کہ اتنا زبردست المیہ پیش آگیا۔ اگر یہ اپنی لکھی ہوئی بات منوانے پر اتنے مصر تو اہل سنت کی معتبر و صحیح اور مستند کتابوں کی بات بھی تو سنیں اور اسے قبول کریں جن میں ایسے ہی الفاظ جناب علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ جب ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے لشکر کو جرکت ہو گئی اور دونوں طرف کے کافی لوگ ہلاک و شہید ہو گئے تو آپ جب مقتولین کی لاشوں کے ملا حظہ کے لئے گئے تو اپنے زانو پیرٹ پیرٹ کر یہ فرما رہے تھے، يَلَيْتَنِي مِمَّتُ قَبِيْلٍ هَذِهِ اَوْ كُنْتُ نَسِيًا مُّثْسِيًا۔ (۷) کاش میں اس سے پہلے مگر بھولی بسر بات کیوں نہ ہو گیا، اگر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایسا فرمایا بھی ہو تو وہ اس قبل سے ہو گا۔ اور جہاں مقصد انصاف پسندی، اور رجوع بحق ہو وہاں طرفین سے اسی قسم کے احساسات ندامت کا اظہار ہوتا ہے جو باہم مرتبہ شناسی پر مبنی ہوتا ہے!

کیا یہ تعجب اور کھ کی بات نہیں کہ ایسے قابل قدر جذبات و احاسانات کو بھی یہ لوگ مطاعن میں شمار کرتے ہیں۔

اعتراض (۸)۔ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حجر مبارک کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن تھا اپنے والد اور ان کے دوست حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا مقبرہ بنا دیا۔

جواب۔ کتب اہل سنت میں جو احادیث صحیحہ مروی و منقول ہیں اللہ سے ثابت ہے کہ گاہ بصراحت گاہ یا اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوش خبری دی ہے کہ یہ دونوں محترم حضرات آپ کے حواریں مدفون ہوں گے! چنانچہ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تدفین ویاں پا گئی تو جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

اِنِّیْ كُنْتُ لَا اُخْبِرُ اَنْ یَجْعَلَ لَیَّ اللّٰهُ مَعَ صَاحِبِیْكَ اَوْ
كُنْتُ كَثِیْمًا اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
كُنْتُ اَنَا وَاَبُو بَكْرٍ وَاُمِّیْ وَوَقَعْتُ اَنَا وَاَبُو بَكْرٍ وَاُمِّیْ
وَالطَّلَقْتُ اَنَا وَاَبُو بَكْرٍ وَاُمِّیْ
میرا پختہ گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ تمکو دے عمر تمہارے دونوں دوستوں
کے ساتھ ملا دے گا۔ اس لئے کہ میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے اس قسم کا کلام سنا کہ میں، ابو بکر اور عمر دو ایک تھے، میں، ابو بکر و
عمر کھڑے تھے، میں، ابو بکر اور عمر چلے !

لہذا آپ کے وہاں دفن ہونے کے جواز کا اس سے صاف اور کھلا حکم اور کیا ہوگا جو کمال و زمانہ مذی اور خوشنودی کا پتہ دیتا ہے۔ اگر انحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کی صریحی اجازت دے کر رہتی تو پھر جناب حسن رضی اللہ عنہ نے اس حجرہ میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیوں فرمایا تھا۔ جبکہ آپ بخوبی جانتے تھے
کہ اب اس قسم کی اجازت اور حکم شرعی کا حصول ناممکن اور محال ہے !

دوسرا جواب یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے تمام حجرے ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک بنا دیا
تھا اور ہر ایک کے لئے ایک ایک مکان نامزد فرمادیا تھا۔ حکم فقہی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جب ایک شخص اپنی کسی اولاد کے نام کوئی مکان بنائے یا خریدے
اور پھر اس کو اسی کے قبضہ میں چھوڑے رکھے تو وہ اسی کی ملک ہو جاتا ہے۔ دوسری اولاد یا وارثوں کا اس میں کوئی دخل نہیں رہتا۔ اور یہی حکم
ازواج اور دیگر اقارب کے ہے۔

ازواج مطہرات کی ملکیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اپنے مکانات میں مالکانہ تصرف فرماتی رہتی تھیں، مثلاً توڑ پھوڑ، مرمت، ان کو تنگ یا
کشادہ کرنا۔ دروازہ نکالنا وغیرہ۔ اور یہی حال سیدہ فاطمہ الزہراء اور جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے حجروں کا بھی ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے
گھروں کے مالک تھے۔

اور قرآن مجید کی آیت وَقَوْنِ فِیْ بُیُوتِكُنَّ مِیْنِ اِیْمَانٍ قَرِیْبٍ تَصْرِیْحِ کے ہے۔ پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مجموعی اصحاب کرام جن میں
جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کرنا اور کسی کا بھی انکار نہ کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حجرو
جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں تھا اور یہ سب ہی کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلفا کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے
اور معمولی تغیرات پر گرفت فرماتے تھے ! اگر اس معاملہ میں بھی وہ دیکھتے کہ کوئی امر خلاف شرع ہے تو وہ کبھی خاموش نہ رہتے ! لہذا اس سے صاف
پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک اپنے اپنے حجروں پر ازواج مطہرات کی ملکیت مسلم الثبوت تھی ! کسی نے بھی
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت طلبی پر اعتراض نہیں کیا۔ اور یہ بات تو شیعی کتب سے ثابت ہے کہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی اسی
حجرہ مبارک میں اپنے چادر اہر صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے چاہی تھی ! یہ الگ بات ہے کہ ان کی
وفات کے بعد مردان کی ملاقات کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ اس سلسلہ میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ مع اہل و عیال اور دوست احباب مسلح ہو
کر آمادہ پیکار بھی ہوئے مگر مروان نے فوری طور پر مسجد نبوی اور روضہ اطہر کے ارد گرد فوج متعین کر دی ! اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس معاملہ میں جناب حسین
رضی اللہ عنہ اور آپ کے ہمراہیوں کو گزند نہ پہنچ جائے، کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیچ میں پڑ کر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سمجھا بجا کہا کہ نذر
مصلحت وقت دکھا کر آپ کے غصہ کو کم کیا۔ اور معاملہ بغیر خون خرابے کے منہ بند کیا۔

لہذا اگر حجرہ شریف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ملک نہ تھا تو جناب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اجازت کیوں طلب فرمائی، ایسی صورت میں مروان
سے اجازت لینے چاہئے تھی کہ وہ حاکم وقت ہونے کی حیثیت سے بیت المال، اور اوقاف وغیرہ پر منقوض تھا۔ اور اس کے حکم کی وجہ سے جناب صدیقہ
رضی اللہ عنہا کی اجازت بھی مفید نہ ہوتی۔ اگر کسی کو اس روایت سے انکار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے ہاں کی کتاب فضول مہمہ فی معرفۃ النعمہ، یا دوسری
کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اس موقع پر اپنے دلی بعض وعناد سے مجبور ہو کر بہت سے شیعہ بطریق تہمت و افتراء جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ اتہام

لگاتے ہیں، کہ آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اجازت دینے کے بعد چیتا لیں، اور ایک فجر پر سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر آئیں، دفن سے روکا میراث کا دعویٰ کیا۔ اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ اونکا بونا شعر پڑھا۔

تَحْتَلَمْتُ تَقَعْتُ وَإِنْ عِشْتُ تَقَعْتُ
لَكَ الْقِسْمُ مِنَ الثَّمَنِ وَبِالْكَفْلِ تَقَعْتُ

رتم شتر سوار ہوئیں فجر سوار ہوئیں اور زندہ رہیں تو بٹا نفی سوار بھی ہوگی تمہارا حصہ تو آٹھویں حصہ کا نوں حصہ ہے مگر تم تو سارا مال ہضم کر گئیں۔ حالانکہ انہیں شاید یہ پتہ نہیں کہ حدیث میں معاشرہ انبیاء لا نورث ولا نورث را نبیاء کی ہماری جماعت نہ کسی وارث ہوتے نہ ہمارا کوئی وارث ہو تبلیہ، اہلِ راوی خود حضرت صدیق رضی اللہ عنہما ہی تو ہیں۔ اور پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم کو میراث طلب کرنے سے روکا۔ تو آپ میراث کا دعویٰ کیسے کر سکتی تھیں۔ اور آپ کو سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر آنے کی کیا ضرورت تھی تدفین آپ ہی کے حجرہ میں ہوئی تھی۔ اپنے حجرہ کا دروازہ بند فرما لیتیں

اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل متروکات کے آٹھویں حصہ کا نوں جس میں حجرہ، سکونت و کاشت کی زمین، ہتھیار، اونٹ، خیر اور گھوڑے بھی شامل تھے۔ بالیقین جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے علاوہ تھے تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہما پر ان کے ہضم کر جانے کا الزام کیسے درست ہو سکتا ہے۔ کل میراث آپ کے قبضہ میں تھی نہ آپ نے کھائی! عرض جھوٹوں پر خدا کی لعنت کے قانون کے مطابق ان مغتربوں کے ہاتھ، لعنت، ندامت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اور قانون الہی ایسے جھوٹوں کو خود ان کی اپنی زبان سے رسوا کرتا ہے۔

اعتراض - (۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مسکن عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ فرما کر دورانِ خطبہ یہ الفاظ فرمائے۔
إِنَّ الْفِتْنَةَ هَهُنَا ثَلَاثَ مِائِينَ
اگرچہ یہ سنو، فتنہ یہیں ہے۔ تین مرتبہ فرمایا، جہاں سے شیطان کا سینگ نکلتا ہے!

اور اس سے مراد عائشہ (صدیق رضی اللہ عنہما) کا فتنہ ہے جبکہ آپ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے روئے کیلئے مدینہ سے بصرہ گئیں۔ اور ہزاروں سلاطین کے قتل کا سبب بنیں!

جواب :- کلام صحیح ہے مگر مراد باطل ہے۔ اور یہ دانستہ کلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح تحریر ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ بہت سی جگہوں اور مقامات پر فرمائے ہیں اور اشارہ مسکن عائشہ کی طرف نہیں مشرق کی طرف فرمایا ہے۔ ہر جگہ مسکن صدیق رضی اللہ عنہما کہاں! مسجد نبوی میں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرماتے تھے یہ اتفاق ہے کہ وہاں سے رخ کرنے سے حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا سامنے پڑتا ہے۔ کیونکہ آپ کا مسکن مشرق جانب تھا۔ پھر انہوں کی عبارت کو تو دیکھو کیوں کہ قرنِ شیطان کے طلوع کی جگہ مسکن عائشہ نہیں سمت مشرق ہے بلکہ اور ولایت جو ان الفاظ سے سمت مشرق کی مراد ظاہر کرتی ہے خود انہیں کی کتابوں میں موجود ہے! مگر انتہائی بغض و حسد اور شرارت کی بنا پر ادھر سے آنکھیں سوندی ہیں اور غلط مراد یعنی کو پھیلانے میں انہوں نے شیاطین کا کردار ادا کرتے جا رہے ہیں۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم کی روایت اس قصہ کے سلسلہ میں بیجا شبہ و دو رنگی میں کافی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔
مَا أَشْأَلُ الْكَفْرَ هَهُنَا وَمَا أَشْأَلُ الْفُحْوَ الْمَشْرِقَ حَيْثُ يُطْلَعُ
قرنِ شیطان فی کافریۃ و مضمر۔
طلوع ہوتا ہے ربیعہ مضر میں۔

اس امتِ مروجہ میں جو فتنہ بھی اٹھا اسی سمت سے اٹھا۔ سب سے پہلا فتنہ مالک بن اشرک کا خروج تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی حضرت عثمان

شہید رضی اللہ عنہ کے خلاف کوفہ سے نکلے اور کوفہ مدینہ منورہ سے جانب مشرق ہے !

دوسرا فقہ حنفی بن زیاد کا تھا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنا اس کے بعد مدنی نبوت مختار ثقی کا فتنہ نمودار ہوا، پھر اکثر بغاوت اور باطل عقائد ان ہی اطراف سے رونما ہوتے رہے، اسی لئے رافضیوں کا منبع بھی کوفہ ہے اور حضرت علی کے لئے پیدائش بصرہ واصل بن عطا بصری ہے۔ قرآن کوفہ کے علاقہ کی پیداوار ہیں، خواہ مخواہ ان سے نکلے تو دجال اصحاب ان سے !

اس شخص کے کفر میں کیا شک ہو سکتا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سفر بصرہ کو آ کر بنا کر آپ کے مسکن و محل کو مقام فتنہ کہنایا خیال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ تو منبع ایمان، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا مسکن تھا، جن کے اسم مبارک ہی سے فتنہ کفر بجائے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اس جہرہ مبارک سے حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہوئیں تھیں۔ فتنہ اندازی تو ان کے خیال میں بھی نہیں تھی، اگر بصرہ کا سفر معاندین کے نزدیک ناگوار سفر ہو بھی تو اس کے لئے تو آپ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئیں، تو اب مکہ مکرمہ (العیاذ باللہ) محل فتنہ ہونا چاہیے جہرہ مبارک کیوں ؟

اعترض - (۱۰) یہ لوگ بدعت کہتے ہیں کہ

إِنَّ عَائِشَةَ شَرَفَتْ جَابِرِيَّةً وَقَالَتْ
لَعَلَّنَا نَعْبُدُ بِهَا بَعْضَ فُتَيَاكِ فَرَسَاشِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی کا بناؤ سنگھار کیا اور مقصد یہ بتایا کہ شاید اس طرح ہم کسی قریشی جوان کو شکار کر سکیں۔

کہ وہ اس کی طرف مائل ہو کر اس سے نکاح کرنے پر آمادہ ہو جائے اور میرے حلقہ تابعدارائی میں آجائے۔

جواب :- اول تو چند وجوہ یہ روایت مجروح ہے، اور اس سے ثبوت پیش کرنا درست نہیں مثلاً یہ روایت وکیع بن جراح سے مروی ہے جو انہوں نے عمار بن عمران سے انہوں نے غنم رقبیلہ کی ایک عورت سے اور اس نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کی ہے اس میں

عمار بن عمر جہول الحال ہے، کوئی نہیں جانتا وہ کیسا آدمی تھا۔ اور غنم کی عورت اسم و سسی دونوں جہت سے جہول الحال ہے نہ کوئی اس کا نام جانتا ہے نہ اس کا حال چال۔ اس لئے ان دونوں کی بات معتبر اور قابل حجت نہیں۔ پھر اس روایت میں عنعنہ ہے۔ اور جو اصل و منقطع دونوں کا احتمال رکھتا ہے کوئی جہت اس سے متعین نہیں ہوتی، ایسی بے سرو پا روایات سے تمسک کہہ کے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ذات مطہرہ طعن کرنا کسی مومن کی تو شان نہیں ہو سکتی، اگر وجہ علالت ہے دیگر ہو تب بھی یہ خلاف انصاف ہے کہ اپنی علالت کے اظہار کے لئے دوسرے کے ایمان میں خلل اندازی کرے اور ان کے لئے ایسے حربے استعمال کرے۔ اور پھر یہ طعن کی بات ہے ہی نہیں۔ اپنی متبنی، لڑکی یا مردہ لونڈی وغیرہ کے لئے مناسب برہم خوردہ کو کسی عاریات ہے۔ اور اس غرض و مقصد سے لڑکی کا بناؤ سنگھار کرنا کہ اس سے نکاح کی رغبت ہو مسنون مستحب ہے ! اور ہمیشہ سے رائج اور جاری ہے۔ (کیا طعن کرنے والے اپنی لڑکیوں کو دولہا کے اعزہ کے سامنے بھوتنی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یا کچھ بناؤ سنگھاں کرتے ہیں ! اور کیا وہ بہترین داماد کے حصول کے لئے، زیبائش کو واقعی قابل اعتراض طریقہ مانتے ہیں،) صحاح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ منقول ہیں جو آپ نے اپنے متبنی جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی نسبت فرمائے جو سیاح فام اور کیمہ المنظر تھے !

لَوْ كَانَ أَسْمَةُ جَابِرِيَّةً لَكَسَوْتُهَا حُلِيَّتُهَا حَتَّى انْفَعَا . اگر اسامہ لڑکی ہوتی تو میں ان کا بناؤ سنگھا کر دیتا۔ ان کو زیور پہناتا۔ تاکہ ان کی طرف لوگ راغب ہوں۔

اور آج بھی شرفاء وغیرہ شرفاء سب میں یہ طریقہ جاری ہے کہ منگنی کے وقت لڑکیوں کا بناؤ سنگھا کرتے، اچھا لباس اور بقدیم سر زیورات وغیرہ سے زیبائش بڑھاتے ہیں۔ بلکہ ایسے موقع پر زیور مانگ مانگ کر آرائش اور ناموری کرتے ہیں تاکہ عام دنوں میں نظر آنے والی لڑکی میں

ایسا نکہار نظر آئے جو باعثِ تزعیم ہو، اور دولہا دایا لٹا کر سو کر اسے پسند نہ کریں۔ تو ایسی بات جو دنیا کے تمام طبقات، حتیٰ کہ طعن کرنے والوں کے اپنے بار بھی، رائج اور معمول بہ ہو اور شرعاً بھی سنت و مستحب ہو وہ قابلِ اعتراض و موجبِ طعن کس منطبق سے ہو گئی!

بلا تخصیص عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اعتراضات

ایسے اعتراضات دس ہیں۔

اعتراض - (۱) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے دو مرتبہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ اولیٰ جنگِ اُحد میں کہ سب بھاگ گئے دوم جنگِ حنین میں کہ وہاں بھی ان کے قدم اکھڑ گئے۔ یہ دونوں جہادِ کفار کے مقابلہ میں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی میں کفار کی لڑائی سے بھاگنا۔ گناہ کبیرہ ہے!

جواب۔ جنگِ اُحد کے وقت تک فرار سے ممانعت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اور پھر یہ بغزشِ معاف بھی کر دی گئی۔ ولقد عفا اللہ عنہم! (خدا نے جسے معاف کر دیا مگر آپ اسے معاف کرنے پر تیار نہیں۔ ایسی حالت میں تو آپ اپنے ایمان کی خیر منائیے۔ ن) اور پھر جنگِ اُحد میں منافقین تو لڑائی سے پہلے ہی بھاگ گئے تھے! مسلمان ویدہ ہوئے، اقاعدہ لڑائی لڑی۔ مگر جب شکست ہوئی اور یہ مشہور ہوا کہ (خاکِ بدرین) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ تو ایسی حالت میں کہ سردارِ لشکر نہ رہے اور جمعیتِ تباہی کی نذر ہوئی ہو تو ایسی حالت میں فرار کی ممانعت نہیں۔

اور جنگِ حنین کی پسپائی کو فرار کہنا تو کھلی دھاندلی ہے۔ یہ تو ایک جنگی چال تھی جو پہلی غلط چال اور بے تدبیری، کی اصلاح اور لشکر کو نقصان سے بچانے کے لئے کی گئی۔ ہوا یہ کہ میدانِ جنگ کا بغور جائزہ لینے کا موقع نہ ملنے کے سبب یہ بات اور دشمن کی چال سامنے نہ آ سکی کہ دشمن نے تنگ راستہ کے اطراف کی چھاڑیوں میں اپنے تیرانداز متعین کر کے چھپا دیے ہیں۔ مسلمان بے فکر آگے بڑھے تو اس اچانک حملہ اور افتادے سے سراسیمہ ہو گئے، اور انتشار میں مبتلا ہو گئے، اس وقت بھی پسپا ہونے والے بھی مہاجر و انصار کے کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم تھے بلکہ وہ مسلمان صحابہ تھے جو فتح مکہ یا بعد میں مسلمان ہوئے۔ مگر ان کی پسپائی کو بھی فرار کہہ سکتے اس لئے صورت حال سمجھ میں آنے کے بعد یہ فوراً پلٹے اور پھر مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے۔ اور پھر جس فدا و گرامی و محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبی حلیت، ہر کام بھر کر یہ معترضین ان کے جاں نثاروں کو مطعون کرنے اور انہیں گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دینے کے لئے مضطرب و بے چین ہیں۔ جب انہوں نے ہی اپنے اصحاب و ساتھیوں کو کچھ نہ کہا تو یہ جو نہ تین میں نہ تیرہ میں! کیوں تاؤ خانی میں اپنا ایمان ضائع کر رہے ہیں نہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ أَزَلَّ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّهُم تَرَوْنَهَا۔ (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔ اور ایسے لشکر اتارے جنکو وہ دیکھ نہ پاتے تھے)۔

(تم جن کو بزمِ خود کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر اپنے بغض و کینہ کا نشانہ بنا رہے ہو، اللہ کے ہاں ان کے مرتبہ کا کچھ جلوہ نظر آیا کہ نہیں۔ ان کے لئے سکینت خداوندی کا نزول ہو رہا ہے لشکرِ خداوندی ان کی مدد کے لئے اتر رہا ہے۔ اور پھر وہ منظر و منصور لوٹ رہے ہیں! مگر اس سب کے باوجود تمہیں وہ اب تک کبیرہ کے مرتکب ہی نظر آ رہے ہیں۔ ن) ابوالقاسم بن سعید شیبی نے اپنی کتاب شرائع میں بطور نص یہ بیان کیا ہے کہ جب جنگ میں ہلاکت کا یقین ہو جائے تو جنگ سے بھاگنا جائز ہے۔ (تو اب یہ کس منہ سے مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں)

اور یہ شیعہ تو اپنی کتابوں میں درج صحیح روایتوں کے سبب انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب ملانے ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام وغیرہ جنکا معصوم ہونا قطعی ہے۔ اس پر جماع بھی ہے۔ تو اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے جو معصوم بھی نہیں ہیں کسی کبیرہ کا ارتکاب ہو بھی گیا تو ان کے نزدیک طعن کا کیا جواز خصوصاً جب وہ گناہ، توبہ واستغفار اور رحمت الہی سے محو بھی کر دیا گیا ہو۔

پھر یہ گناہ ان کی طاعات اور جہاد کی مشقتوں کے اجر کو ملیا میٹ نہیں کر سکتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں وارد قرآن و احادیث متواترہ کی بغارات سے چشم پوشی کرنا اور اکاد کا بشری اغزشوں کی ٹوہ میں لگا رہنا کسی صاحب ایمان کی شان تو ہرگز نہیں۔ معاندین کے جھک سائے سے اللہ و رسول کے نزدیک تو ان کے مرتبہ میں سنی عہد کی نہیں آسکتی۔ البتہ عاقبت انہیں کی خراب ہوگی۔ (ن)

ویسے بھی ان شبہات سے اہل سنت کے اعتقاد میں تو کوئی خلل پیدا نہیں اس لئے معاندین کی یہ ساری ٹنگ و دو لا حاصل ہے کیونکہ وہ صحابہ کی عصمت کے قائل نہیں۔ اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا ہو تو کیا غم۔ جبکہ غفور الرحیم خدا کی ذات ہے۔ ہاں معاندین کے ہاتھ میں بخشش کا کام ہوتا۔ تو سوچتے ہاں

اہل سنت کی راہ اعتدال کی راہ ہے اس لئے وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً حقوق صحبت، خدمت رسول، ان کی جانبازیاں و جان نثاریاں، راہ خدا میں گھریاں، جان و مال، آل و اولاد کا بیٹھنا، دین و شریعت کو رائج کرنا، اور وہ آیات جو ان کی شان میں نازل ہوئیں اور وہ احادیث جو ان کی رفعت شان اور بلندی درجہ پر حروف آخر میں وہ سب ان کے پیش نظر رہتی ہیں لیکن شیعہ! کہ ان کو عیبوں اور گناہوں کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں

اعتراض - (۲) کچھ بلکہ اکثر صحابہ کرام نے جب موصول اور اونٹوں کی آواز سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا خطبہ دیتے چھوڑ کر کھیل تماشے اور خرید و فروخت کے لئے دوڑ پڑے۔ اور اس دنیا کی متاع قلیل پر نماز جیسی اہم اور دنیاوی رکن اسلامی کو اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں قربان کر دیا۔ ان کا یہ عمل صاف طوہر پرے دیانتی پر دال ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں فرمایا گیا۔ **وَإِذْ أَمَرْنَا آلَ آدَمَ أَنْ تَقُولُوا لَكُمْ أَنْ سَلِّطُوا عَلَيْهِمُ الْبُيُوتَ وَالْأَنْهَارَ وَالْأَنْهَارَ وَالْأَنْهَارَ وَالْأَنْهَارَ**۔ جب کاروبار یا کھیل کود کی کوئی بات دیکھ پائے ہیں تو اس کی طرف چھپٹ پڑتے ہیں اور آپ کو اکیلا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

جواب - یہ قصہ ہجرت کے ابتدائی ایام کا ہے، جبکہ ہنوز احکام و آداب شریعت سے سب حضرات کو پوری واقفیت حاصل نہ تھی۔ قوط کے ایام تھے، جس کی وجہ سے سب کو پریشانی لاحق تھی! تجارتی قافلہ کا شند سے انتظار رکھا۔ خدا شہد یہ بھی تھا کہ قافلہ کا سارا اندج یکشت کسی نے لے لیا، یا قافلہ گزر گیا تو نرخ گراں تر ہو جائے گا۔ ان ہی حالات کی بنا پر اضطراری طور پر ادھر چھپٹ پڑے۔ مگر کیا صحابہ مثلاً ابوبکر صدیق و عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما بدستور مسجد میں بیٹھے رہے۔ پور تربیت و تادیب سے قبل کا کوئی فعل، افعال جاہلیت کی مانند قابل عتاب اور لائق اعتراض نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کا انداز گو عتاب اور تادیب کا ہے۔ مگر اس کے باوجود انجام کار سے ڈرایا یا کسی عذاب کا مورد۔ نہیں بتایا گیا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حضرات پر نہ عتاب فرمایا نہ غصہ ہوئے نہ ڈانٹ ڈپٹ فرمائی۔ تو اب اور کس کی یہ مجال یا حق ہے کہ وہ ان نفوس مقدسہ پر طعن یا اعتراض کرے۔

اور پھر لغزش کا صحابہ، یا امتیوں سے سرزد ہونا نہ بعید از عقل ہے نہ تعجب کی بات کہ ان میں عصمت کا جوہر ہوتا ہی نہیں۔ معصوم انبیاء و رسل علیہم السلام تک سے بعض ایسے امور صادر ہوئے جو عتاب الہی کا باعث تھے! ایسے امور کا تقاضا لئے بشریت کے سبب ظہور ناگزیر ہے۔ پے پے تنبیہات کے سبب ہی تو تہذیب و تادیب حاصل ہوتی ہے۔

اعتراض - (۳) اہل سنت کی صحاح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت موجود ہے۔

سُبْحًا أَوْ بِمِجَالٍ مِّنْ أُمَّتِيْ نَفُوْهُمْ خُذْ مِنْهُمْ ذَاتَ الشَّكْلِ
فَأَقُولُ أَصْبَحْنَا بِأَيِّ أَصْبَحْنَا نِقَالَ إِنَّكَ لَا تَدْرِي
مَا أَحَدٌ ثَوَّابَعْدَكَ فَأَقُولُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ
الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا أَمَا دُمْتُ فِيهِمْ
فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الذَّقِيْبُ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ نِقَالَ إِنَّهُمْ لَن يَزَالُوا
مُؤْتَدِّينَ عَلَى أَغْفَابِهِمْ مُّتَدُّ فَا رَقَّتْهُمْ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری امت کے کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف نہ لجا یا جائیگا تو میں کہوں گا یہ تو میرے امتی ہیں، یہ تو میرے امتی ہیں (انہیں جہنم میں کیوں سے جا رہے ہو) اس پر مجھے بتایا جائیگا کہ آپ واقف نہیں، آپ کے بعد انہوں نے کیسے کیسے عمل کئے، جنگی پاداش میں ان کو لے جایا جا رہا ہے، تب میں وہ الفاظ دہراؤں گا جو اللہ کے ایک صالح بندہ (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہے تھے۔ کہ جب تک میں ان میں موجود رہا ان کا نگران رہا اور تو نے مجھے ان کے درمیان اٹھالیا۔ تو آپ ان کے نگران رہے۔ ادا آپ تو سریشے کے نگران اور جاننے والے ہیں۔ تو کہا جائیگا کہ جب آپ ان سے جدا ہوئے تو یہ تب سے مرتد ہی رہے۔

جواب۔ حدیث مذکورہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مرتد سے مراد وہ لوگ ہیں جنکی موت ارتداد ہی پر ہوئی۔ اور جو مرتد نہ ہوں ان میں سے کسی کو بھی اہل سنت نہ صحابی کہتے اور مانتے ہیں، نہ ان کے فضائل و خوبی کا کوئی معتقد ہے۔ قبیلہ بنی حنیفہ اور بنی تمیم کے اکثر لوگ بصورت و فرد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آئے مگر وہ ارتداد کی ویاہر کا شرکار ہو کر خائب و خاسر ہو گئے! اہل سنت کی گفتگو کا موضوع تو وہ صحابی کرام رضوان اللہ علیہم ہیں جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ راہی سفر آخرت ہو گئے۔ اور اختلاف رائے کے باعث آپس میں لڑے جھگڑے بھی قتل و قتال تک کی نوبت بھی باہم ہوئی۔ اس سب کے باوجود دونوں متحارب جماعتوں نے باہم ایک دوسرے کو نہ کافر کہا، نہ بدعتی، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ایمان کی گواہی دینے اور مؤمن کہتے اور مانتے رہے! ایسے باایمان اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی زنجبیل میں کوئی روایت ہو تو پیش کریں۔

یہ تھے تو ان مرتدوں کا بے خوف رفیقین کے نزدیک مرتد تھے! بحث تو مرتدوں کے ساتھ جنگ و جدال کرنے والے مسلمانوں سے ہے! وہ تو بلکہ شہیدین کا عالم بلند کرنے والے تھے۔ انہوں نے تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ قیصر و کسری کی غفلت و قوت کو پاش پاش کیا لاکھوں لوگوں کو مسلمان کیا۔ قرآن مجید کی تعلیم دی۔ صلوات قائم کی شریعت سکھائی۔

خدا کے دشمنوں سے جہاد میں، کافر کو مسلمان بنانے، دین و شریعت اور قرآن کی تعلیم دینے میں جو اجر و ثواب ہے اسے ہر مسلمان جانتا ہے! اسی کے ساتھ ایسے حضرات کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بشارتیں بھی دیں اور اچھے وعدے بھی فرمائے۔ ذیل میں آیات ملاحظہ فرمائیے۔
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ
لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفْنَا الدِّیْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِیْ اَرَادُوْا
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْا رَبِّیْ
لَا یُشْرِكُوْنَ لِیُشِیْءَا

تم میں سے اہل ایمان اور اچھے عمل کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے۔
کہ انکو خلافت الہی کا اسی طرح حقدار بنادیا جائیگا جس طرح ان سے پہلوں کو بنایا تھا۔
اور ان کو ان کے اس دین میں جو ان کے لئے پسند کیا گیا ہے تمکین عطا فرمائے گا۔ ان کے
بعد ان کے خون کو اس میں بدل دے گا تاکہ یہ میری عبادت کریں اور اس میں
کسی کو بھی میرا شریک نہ ٹھہرائیں۔

چند جگہ ان کے متعلق ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَاَرْضُ عَنْهُمْ! (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں)
وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خٰلِدِیْنَ
فِیْهَا اَبَدًا۔
ان کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جنکے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان میں
یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

وَقَبِّلِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّهُ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا
كَبِيرًا۔

مؤمنوں کو یہ بشارت دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے بڑے
اعزاز و اکرام ہیں:

فَالَّذِي هَاجَرُوا وَآخَرُوا جُؤَارًا
وَأُودَعَا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا أَلَا تَعْلَمُونَ
عَنْهُمْ سُبُوحًا رَبُّهُمُ وَلَا تُخْلِفُهُمْ جَنَّتُ ثَجْرِي
مِنْ قَبْلِهَا أَلَا نَصْرُ۔

پس جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گروں سے نکلے گئے اور جنگ و محاربت میں میری
راہ میں تکلیف دی گئی اور جنہوں نے جہاد کیا مرے بھائی مارا بھی، میں ان
کی غز شہوں کو معاف کروں گا اور ان کو ایسے باغوں میں رکھوں گا جہی
کے نیچے تھریں بہہ رہی ہوں گی۔

یہاں ایک بات جان لیجئے چاہئے کہ انبیاء السلام پر سب و شتم اور طعن اس لئے کفر و حرام ہے، کہ ان میں سب و شتم کی وجہ یعنی گناہ و کفر
سرسے موجود ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ حضرات کرام تو اپنی ذات میں تعظیم و توقیر اور مدح و تعریف کے بے شمار اسباب اپنے اندر
رکھتے ہیں۔ اب مسلمانوں کی وہ جماعت جو اپنے اندر اعزاز و اکرام، تعظیم و توقیر کے اسباب کی حامل ہو اور نص قرآنی سے ان کے گناہوں اور
غز شہوں کی بخشش و معافی بھی ثابت ہو چکی ہو تو ایسی جماعت بالیقین اعزاز کرام میں انبیاء کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے ایسی جماعت کی
بدگویی کرنا اس کو بدعت ملامت بنانا اس کی اہانت و تحقیر کرنا بھی حرام ہے لافرق صرف اتنا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں تو اسباب
توقیر سرے سے تھے ہی نہیں۔ ان میں تھے مگر وہ مٹا دیے گئے اور مآل کار یہ کہہ سکتے ہیں کہ گویا کہ یہ اسباب ان میں تھے ہی نہیں، اس لئے کہ
توبہ کر لینے والے کی طرف گناہ و غز شہ کی نسبت حرام ہے:

سوائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عام امتیوں کا یہ حال نہیں ہے کہ ان کے گناہوں کی معافی کا ہر کو علم و وحی اور قرآن سے قطعی معلوم
ہو گیا ہو، یا ان کی طاعتوں کا قبول ہونا اور ان کے اعمال سے بالتحقیق اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا بطریق یقین ثابت ہو گیا ہو۔ گویا صحابہ کرام رضی اللہ
عنہم کا طبقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور عام امتیوں کے درمیان بطور بنیاد ہے۔ اسی لئے جمہور علماء امت کا مذہب یہ ہے کہ صحابہ کے علاوہ کوئی
شخص کتنا بھی متق و پرہیزگار ہو صحابہ کرام کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ یہ بڑا قیمتی اور نفیس نکتہ ہے اسے ذہن نشین رکھنا چاہئے۔ پھر ایک جگہ یہ ارشاد
فرمایا گیا۔ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَ
جَنَّتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقْتَدِرٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا۔
ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی رحمت اپنی خوشنودی اور ان باغات
کا جہان کے لئے ہیں جن میں برقرار رہنے والی نعمتیں ہیں جس میں وہ ہمیشہ
ہمیش رہیں گے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا۔ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَ
رَفَعَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَذَّاهُ الْيُكْرَهُ وَالْفُسُوقُ
وَالْعُصْيَانُ۔
لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت عطا فرمائی اسے تمہارے دلوں کا
روفق و رزینت بنایا۔ اور کفر و فسق اور گناہ سے تمہارے اندر نفرت اور
کراہت پیدا فرمائی

اس آیت سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ پاکیزگی کی اس جماعت میں سے کسی سے اگر کسی فسق و عصیان کا ارتکاب ہوا بھی ہے تو وہ خطا، سہو، یا
مغالطہ اور غلط فہمی کے سبب ہوا۔ وہ فسق و نافرمانی کو برا جانتے اور سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب محال و ناممکن ہے۔ اور عقلاء کے نزدیک
یہ بات اپنی جگہ ثابت دہے شدہ ہے کہ اختیاری اعمال و افعال کرینکے لئے یہ بات ابتدائی ضروری و لازمی شرط ہے کہ وہ اس کو کرنے
سے پہلے اچھا بھی سمجھتا ہو اور اس کی طرف شوق و میلان بھی رکھتا ہو۔ اور یہ اوپر کی آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے دلوں کی گہرائی
میں کفر، فسق اور عصیان سے کراہت اور نفرت موجود تھی۔ اس لئے، دانستہ اور شوق و خوشی سے کسی برائی کے ارتکاب کا ان کے متعلق
خیال ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

وہی سچے کے مؤمن ہیں۔ اپنے رب کے نزدیک ان کے لئے مراتب عزت بھی ہیں۔ معافی بھی ہے۔ اور عمدہ رزق بھی!

أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ۔

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان کے ظاہری افعال و اعمال، نماز روزہ، حج و جہاد نہ دکھاوے کے تھے نہ ان میں نفاق و غیرہ ماکھوٹ ملا ہوا تھا یہ تو بڑے سچے اور کھرے مؤمن تھے۔ کہ اپنے رب کے پاس با عزت مراتب بھی رکھتے تھے۔ اور عمدہ میزبانی بھی حاصل تھی۔ اور یہ مراتب و میزبانی کی عزت اسی لئے پائی تھی کہ ان کے رب نے ان کی بخشش و مغفرت فرمادی تھی۔ اور ان کا ایمان حقیقی اور یقینی تھا!

ان رسول اور ان کے ایمان والے ساتھیوں نے اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کئے اور جہلا میاں انہیں کے لئے ہیں۔ اور کامیاب و کامران بھی ہیں! تم میں سے فتح سے قبل جان و مال سے جہاد کرنے والوں کی کوئی برابری نہیں کر سکتا وہ بڑے بلند مرتبہ لوگ ہیں۔ ان کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے مال و جان سے جہاد کیا۔ اور اللہ کا وعدہ ہر ایک سے بھلائی اور بہتری کا ہے! اور اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے! فقر و مہاجرین جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ان کے اموال چھینے گئے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے طلبگار اور اللہ و رسول کی مدد کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

یہ بھی ارشاد فرمایا لکن الرسل والذین آمنوا معہ جاهدوا بأموالہم و أنفُسہم و أولئک لعمہ المفلحون۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔ لَا یَسْتَوِی مِنْکُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتِلَ۔ أُولَئِکَ أَطْغَمَتْ دَرَجَاتُہِ الذِّینَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدِ وَقَاتِلُوا وَکَلَّ اللَّهُ الْهَاسِیَ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یَعْقُذُ إِلَى الْمُہَاجِرِینَ الذِّینَ أَخَذُوا مِنْ دِیَارِہِمْ وَأَمْوَالِہِمْ یَتَّبِعُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِزْقًا نَّآ۔ وَیَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَہُ أُولَئِکَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔

آخر آیت تک کا مضمون سامنے رکھتے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان نفی کے بعد سے نفاق کے احتمال تک کو واضح اور کھلے الفاظ میں باطل کر دی ہے! نیز ارشاد ربانی۔ یَوْمَ لَنُجِزِیَ اللَّهُمَّ النَّبِیَّ وَالذِّینَ آمَنُوا مَغْنً۔ نُّوْرًا هُمْ یَسْعَی بَیْنَ أَیْدِیہُمْ وَبِأَیْمَانِہِمْ۔ یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی عذاب نہ ہو گا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی وفات کے بعد بھی ان کا نور زائل نہ ہو گا۔ ورنہ زائل شدہ اور مٹا ہوا نور قیامت کے دن ان کے کیسے کام آسکتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان۔ وَلَا تَحْزَنْ أُولَئِکَ یَدْعُونَ رَبَّہُمْ بِالْعَدَاۃِ وَالتَّعَسُّیِ یُرِیدُونَ وَجْہَہُ۔

جی ان محرم و مکرم حضرات رضی اللہ عنہم کے متعلق نفاق کے احتمال کو بھی باطل کرنا ہے۔

وَإِذَا جَاءَ أُولَئِکَ الذِّینَ یُؤْمِنُونَ بِآیَاتِنَا نُقِلْ سَلَامًا مِّنْ مَّکِنِّکُمْ۔ کُتِبَ لَکُمْ عَلَی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃُ اِنَّہُ مِنْ عَمَلٍ مِنْکُمْ سُوْءٍ بِحِصَالِہُ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِ ہَا وَاصْلَحَ فَإِنَّہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے!

ان کے گناہوں کے بخشنے جانے کی اس سے واضح اور صاف دلالت کیا ہو گی۔ جب رب غفور نے ان کو دامن رحمت میں لے کر معاف فرمادیا تو

کو ناروا اور فضول مشقت سے بچانا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اعتراض کا ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت کے حاضرین مجلس میں اکثریت حضرات اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی تھی بھابھ کرام رضوان اللہ علیہم تو کم تعداد میں تھے۔ اب اعتراض کا سارا زور اقلیت پر ڈال دینا جبکہ اکثریت کی شرکت اور مصری سے وہ فعل انجام پذیر ہوا ہو، انتہائی واضح و بدیہی اور سہو دگی ہی کہلا سکتی ہے۔

پھر اس واقعہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ یوم حیات رہے۔ اہل بیت ہمیشہ خدمت میں رہے، سامانِ نوشت و خوراک موجود اور دسترس ہی رہا۔ کاتب بھی متعین رہے۔ اگر وہ کوئی بہت ہی اہم دینی معاملہ تھا تو ساری سہولتوں کی موجودگی کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس خواہش کا یا اس کی تکمیل کا اظہار کیا اور اعداء کیوں نہ فرمایا اس وقت تو کوئی حیلہ باز اور جھگڑنے والا آپ کے آس پاس نہ تھا۔ کیا کوئی مسلمان نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ترک واجب کی سوزنی کے بعد بھی اپنا ایمان سلامت رکھ سکتا ہے!

اللہ تعالیٰ کی جناب سے جنکو خیر امت اور امت وسط کے معزز القاب عنایت ہوئے ہوں، جن کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہو، اور جو شہدائے اعلیٰ الناس کا تمغہ رکھتے ہوں ان کی نسبت بدترین امت کا اعتقاد خیال و گمان رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی کے خلاف نہیں نفوس قرآنیہ کی کھلم کھلا مخالفت بھی ہے!

اعتراض - ۵ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی بجا آوری میں سہل انکاری سے کام لیتے تھے مستعدی اور لپک جھپک نہیں دیکھاتے۔ بلکہ کاہلی اور سستی دکھاتے۔ آپ کے مقاصد سے روگردانی کرتے۔

جان چراتے اونہ جا مال سٹول سے کام لیتے۔ اسکی دلیل میں وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ یوم احزاب کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

أَلَا رَجُلٌ يَأْتِيَنِي بِغَيْرِ الْقَوْمِ جَعَلَهُ اللَّهُ مَعِيَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَلَمْ يَجِبْ أَحَدٌ وَكَانَتْ تَصِبُ رِيحٌ شَدِيدًا وَقَوْلُنَا يَا أَحَدُ يَدُّهُ قَدْ نَلَمَ أَحَدٌ بَدَأَ دَعَا فِي بِأَسْمِهِ إِلَّا أَنْ أَوْرَهُ قَالَ فَأَوْرَهُ فَقَاتِنِي بِغَيْرِ الْقَوْمِ فَلَمَّا وَلِيْتُ مِنْ عِنْدِهِ جَعَلْتُ كَأَنَّمَا أَمْشِي فِي مَقَامٍ حَتَّى دَأَبْنُهُمْ وَرَجَعْتُ وَأَنَا أَمْشِي فِي مَشْرِ الْحَكَامِ فَلَمَّا أَتَيْتُهُ وَخَبَرْتُهُ قَدَرْتُ.

کیا کوئی شخص ایسا ہے جو مخالف لشکر کی بجائے خبر لائے۔ اس کے اجر میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے میرے ساتھ رکھیں گے، مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ اس وقت سخت طوفانی جھکڑ چل رہی تھی اور بہت ٹھنڈی تھی! پھر آپ نے ارشاد فرمایا حذیفہ تم اٹھو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میرا نام لیکر فرمایا تو مجھے اٹھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور مخالف لشکر کی خبر لائے جب میں وہاں سے چلا ہوں تو ایسا معلوم ہوا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں جتنی کہ میں لشکر کو دیکھ کر واپس ہوا تب بھی کیفیت ایسی ہی تھی جب واپس آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے چکا تو مجھے ٹھنڈ لگنے لگی؟

ان لوگوں کا یہ اعتراض اس لئے قابل جواب نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حکم کی شکل میں نہیں تھا بلکہ ایسی بات کی صورت میں تھا جو عمومی طور پر سامنے رکھی جاتی ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اسے ذیل ارشادات کی طرح ہے

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا۔
ہم نے اپنی امانت زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے رکھی، ذکر سے برداشت کریں، مگر وہ اس سے ڈر گئے اور اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔

پس اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں خود خدائی سے آؤ یا بادل خواہستہ۔

دونوں نے کہا ہم خوشدلی ہی سے کہتے ہیں!

فَقَالَتَا إِنِّي كُنَّا طَائِفَتَيْنِ

اور قرآن عالیہ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ امر شرعی تبلیغ نہ تھا۔ اور امر ہونے کے باوجود یہ کہاں سے لازم آیا کہ وہ وجوب کے لئے تھا بلکہ اس کا جملہ حاکم جعلہ اللہ معی یوم القیمۃ۔ اس کے مندوب و مستحب ہونے پر واضح دلیل ہے۔ کیونکہ واجبات میں ثواب کا وعدہ نہیں فرماتے۔ اگر فرماتے بھی ہیں دخول جنت یا دوزخ سے نجات پر اکتفا فرماتے ہیں۔ اس خاص ثواب کا وعدہ اس کے مندوب ہونے کی واضح دلیل ہے!

بطور اصول یہ بات طے شدہ ہے کہ امر وجوب کے لئے بھی ہو تو وہ وجوب کفایہ ہوگا۔ موسم چونکہ بہت شدید سرد تھا اس لئے ہر ایک نے چاہا کہ یہ کام کوئی دوسرا کرے۔ اگر یہ حکم فرداً فرداً ہر ایک پر واجب ہوتا تو اس کی بجائے اس میں سارے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور جلد از جلد یہ آوری کا مظاہرہ کرتے۔

اگر یہ کوئی بھی بات نہ مابین تو پھر یہ بتائیں کہ کیا یہ طعن جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ بھی تو اس وقت اس جماعت میں شامل اور موجود تھا! آپ نے اس حکم کی تعمیل کیوں نہ فرمائی اور حکم یہی لانے میں عجلت کیوں نہ فرمائی! اتنے کچے کے بعد بھی اگر جناب امیر دہلیک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں یا وہ کوئی کریم اور خیالات بد کو دل میں جگہ دے، تو ان کمنہ توڑنے کے لئے، کتاب اللہ احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتب سیر سے ہزاروں دلیلیں ان کے منہ پر ماری جاسکتی ہیں یُطِيعُونَ اللہَ رُؤُوسًا لِّسُؤَالِهِ بِمَا تَعْمَدُ صِدَاقَتِ وَثَقَاتِهِ ان حضرات کے لئے قرآن مجید میں موجود ہے جو ہاجرین و انصار اور مجاہدین رضی اللہ عنہم اطاعت و انقیاد کی وجہ سے مرحمت فرمایا گیا۔ بخاری و مسلم اور کتب سیر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جان فحاری، پروانہ دار فدائیکو اور آپ پسند و جان قربان کرنے کی کیفیت ساری کی ساری محفوظ و موجود ہیں۔ ان حضرات کے متعلق یہ الفاظ تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں کہ

كَانُوا يَنْتَدِرُونَ إِلَى أَمْرِهِ وَكَانُوا يَقْتُلُونَ عَلَى وَصْوِهِ وَإِذَا نَهَوْهُ وَقَعُوا فِي كَيْفٍ مَّا حَبَلَ مِنْهُمْ فَذَلِكَ مِنْهَا عَلَى وَجْهِهِ۔

وہ آپ کے حکم پر لانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستور کے پانی پر لڑ پڑنے کے ترہیب ہو جاتے۔ اگر آپ کی کلمی کا پانی کسی کی ہتھیلی پر آ پڑتا تو وہ فوراً اسے اپنے منہ پر لے لیتا۔

کسی ذات کے ساتھ یہ شیعہ تکی و وارفتگی کسی نے پہلے کہاں دیکھی ہوگی، اور جس نے اب دیکھ لی وہ حیران رہ گیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جناب رسول بن مسعود تقی رضی اللہ عنہ جو اس وقت مشرکین مکہ میں سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن۔ وہ مکہ والوں کی طرف سے سوال و جواب کے لئے آئے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و شیعہ تکی کی یہ کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جب مکہ واپس گیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی مدح سرائی اور تعریفوں کے پل باندھ دئے۔ اور کہا کہ میں نے قیصر و کسری اور شانان ہم اور دوسرا مملکت سب کو دیکھا سب کے درباروں میں کیا ہوں، مگر کسی کو بھی گوااسکی سات پشتیں لٹکری میں گذر گئی ہوں اتنا مطیع و متقاد نہیں دیکھا۔

ان شیعوں پر تو کلمہ گوئی ایک تہمت ہی ہے۔ ورنہ کوئی کلمہ گو کلمہ پڑھ لینے سے بعد ان نفوس مقدسہ کے متعلق ایسی پاؤہ گوئی

اور ہر نہ سرائی نہیں کر سکتا! اگر امثال امر میں اس قسم کی سستی موجب طعن ہوتی ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے بھی ایک دقت رکھ ڈالیں! اور سرفہرست ابوالشہر سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم مبارک لکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ایک درخت کے کھانے سے منع فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا یہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا دہوتم دونوں کو جنت سے نکلوا دے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے شیطان و وسوسہ کے زیر اثر اس درخت کو کھالیا! ایک بات البتہ ہے۔ یہ معتزلی شیعہ آخر انہیں اسلام کے اخلاق تو ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکر ہی تھے، اور جو عدول حکمی اور شیعہ چشمی میں بدنامی کی حد تک مشہور ہیں ان کی نافرمانی کی گواہی تو خود جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے برسر منبری، جس کی کیفیت انہیں کی اصح الکتاب نبی البلاغہ میں مسطور و مرقوم ہے۔ اور جس کا حوالہ اس کتاب

میں بھی گور چکا ہے۔ یہ اپنے ان اسلاف پر عائد شدہ مطاعن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جیسے پاکباز محب و منقاد حضرات کے کھاتے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

اعتراض - (۶) کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں سے فرمایا

اَنَا اَعِدُّ كُمْ لِمُحْجَزٍ كُمْ عَنِ النَّاسِ
یَسْتَمِعُ عَنِ النَّاسِ فَلَمَّا عَنِ النَّاسِ فَعَلَبُوا نَحْنُ وَتَقَعَحْمُونَ فِيهَا۔
میں تمہاری کمر بکڑ کر آگ سے کھینچتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آگ سے
اور دھڑاؤ، آگ سے اور گرجے سے چھوٹ کر آگ میں گر پڑتے ہو!

یہ اعتراض پہلے اعتراض سے بھی زیادہ پُر پورچ ہے! اس روایت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک نبی اور ایک امت کی مثال ہے۔ وہ کوئی بھی نبی ہو سکتا ہے۔ اور کوئی سی بھی امت! اس میں اپنے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کی تخصیص جو بھی کیے سکتی ہے جبکہ ہر شخص کی شہوات نفسی و غصبی اسے دوزخ کی طرف کھینچتی ہیں۔ اور پیغمبر کی نصیحت اور فرمان اس کو اس سے روکتا ہے لہذا ہر نبی کی مثال اپنی امت کے ساتھ اس شخص کی سی ہے جو محض شفقت و ہمدردی و غیر خواہی کے جذبہ سے ہر شخص کی کمر بکڑ کر اپنی طرف کھینچتا اور غلبہ غضب و شہوات کے سبب اس سے ہچما پھڑا کر جاتی آگ میں گھسا جاتا ہے، اور اگر لوگوں میں چونکہ شہوات و غضب کا غلبہ شدید ہوتا ہے اس لئے پیغمبر کی شفقت و جذبہ ہمدردی نہیں ہوتی اور آگ میں گر پڑتے ہیں۔ اور پھر یہ تو تمثیل میں ذکر کردہ آگ ہے، آتش دوزخ آخرت نہیں ہے۔ اور اس آگ سے مراد گناہ اور خواہشات، شہوات ہیں جو عموماً آتش دوزخ میں جانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہاں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا دوزخ میں گرنا ہرگز مراد نہیں ہے۔ ورنہ تو یہ حدیث قرآنی آیت کے صریحاً مخالف ہوگی۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ وَكَذَلِكَ عَلَّمْنَا عَلَى شِقَاقِ حَقِّهِ قَوْمٍ النَّاسِ فَأَنفَذْنَا كَذْرًا مِنْهَا۔ (تم دوزخ کے گروے کے کنارہ پر پہنچے کہ اس نے تمہیں بلایا)

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں ان کے لئے جنت تیار کرنے اور عظیم کامیابی اور بہترین اجر کا وعدہ ہے۔ اور پھر اگر انہیں نطفہ کے عموماً سے دلیل لانے پر اصرار ہی ہے تو یہ یہ سب کو شامل ہوئی، اور ان سب میں جناب علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی بھی شامل ہوگی۔ (پتا بخدا) اور اگر مخصوص خطاب سے دلیل لینے ہیں تو پھر بعض کے فعل سے سب پر اعتراض کرنا لازم آتا ہے جو بالکل غیر معقول ہے!

اعتراض - (۷) صحیح مسلم میں جناب عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ

اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا فُتِحَتْ عَلَيْكُمْ وَخَدَّائُنِ فَارْسُوا فِيهِمْ
أَحْسَى قَوْمٍ أَنْتُمْ قَالُوا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ
كَمَا آمَرَنَا اللَّهُ تَعَالَى فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّا بَلْ تَلْتَمِزُونَنِي فَتَحْضَرُونَ
ثُمَّ تَتَدَابَرُونَ ثُمَّ تَكْبَهُ غَضْوَنَ۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب روم و فاطمہ کے خاندانوں
پر تمہاری کسوٹی ہوگی اس وقت (باعث اطلاق) تم کیسی قوم ہو گے۔
عبد الرحمن بن عوف نے فرمایا اللہ کے حکم کے مطابق رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں بلکہ تم باہم حریف ہو گے ایک دوسرے
سے حسد کر دو گے۔ ایک دوسرے سے آنکھیں پڑاؤ گے اور ایک دوسرے
سے بغض رکھو گے!

جواب۔ اس معنی و اعتراض کا یہ ہے کہ یہاں انہوں نے بددیانتی کا حسب عادت مظاہرہ کیا ہے، وہ الفاظ نقل کر رہے ہیں جن پر اعتراض کرنا مقصود تھا اور حدیث کا متمم جو ان کے مذہب و مقصد کی تردید کرتا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو اعتراض سے بچاتا اور اصل مراد کو ظاہر کرتا ہے اسے گول کر گئے! بالکل اسی ملحدی طرح جو لا تفرجوا للصلوة، کو تو اپنی مطلب برائی کے لئے پڑھتا ہے مگر انتم ساری کو ہضم کرتا ہے۔ چوری تو ہر جگہ اور ہر معاملہ میں قابل نفیس حرکت ہے مگر خاص کر ایسے مقامات پر حدیث کی چوری دھونڈنا زیبا بلکہ چور کی منافقت

سمجھی جائے گی۔ حدیث کا آخری حصہ ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

ثُمَّ تَقْلَبُونَ إِلَى مَسَاكِنِ الْمُهَاجِرِينَ فَتَحْمِلُونَ بُعْثَكُمْ
عَلَى رِقَابِ بَعْضٍ۔
پھر تم مہاجرین کی طرف جاؤ گے اور وہاں ان کے بعض کو دوسرے کی گردن پر سوار کر دو گے!

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ بغض و حسد کرنے والا کوئی اور فرقہ ہے! اور یہ فرقہ مہاجرین صحابہ کا تو بالکل نہیں۔ خواہ وہ انصار ہوں یا دیگر مگر انصار کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی کہ مہاجرین کو باہم ورغلا کر لڑا دیا ہو۔ اب لے دے کہ ایسے لوگوں کا وجود تابعین ہی میں پایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جو موضوع بحث میں دوہی گروہوں میں منقسم ہیں۔ یعنی مہاجر و انصار۔ ان کا مہاجر ہونا تو از روئے حدیث غلط فہم ہے۔ اور انصار ہونے کی حالات و واقعات تردید کر رہے ہیں۔ اور حدیث کے الفاظ غیر مبہم طور پر اعمال بد کے وقوع کا زمانہ فارس و روم کے خزانے فتح کرنے کے بعد متعین کرتے ہیں کہ اس وقت تم میں سے بہت سے لوگ خزانوں و فتوحات کی کثرت کی بنا پر بغاوت و فساد کی راہ اختیار کریں گے۔ اور مہاجرین کو کہ خلافت و ریاست ان کا ورثہ ہے چرب زبانی، دروغ گوئی اور لٹائی بھائی کر کے باہم لڑا دو گے۔ حبیبؑ تاریخ کے اوراق میں اس جماعت اور اس کے سرغنوں کا کھوج لگاتے ہیں تو دواں، جناب عبد الرحمن بن ابی بکر، مالک اشتر، مروان بن حکم، اور ان جیسے لوگوں کے نام نمایاں درج ملتے ہیں۔

لہذا اس اعتراض و طعن کا رد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہرگز نہیں۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک میں معاذ اللہ کذب لازم آئے گا۔

ایک اور جواب اس قسم کے اعتراض کا۔ نبوت کی بحث میں گزر رہے، کہ شیعہ روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ اور ٹوٹاؤ کے باوجود ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام، تمام عمر ائمہ اہل بیت کی طرف سے حسد و بغض میں گرفتار رہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک) تو ان معصوم کی پیروی میں غیر معصوم صحابہ بھی قتل ہو گئے تو اعتراض کیوں! اگر شیعوں کے ہاں پیغمبر معصوم کے عمل کی کوئی توجیہ یا جواب ہو سکتا ہے تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بابت اہل سنت کی طرف سے بھی وہی توجیہ یا جواب تصحیح کر لیا جائے!

اعتراض۔ (۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ أَدَّى إِلَى عَلِيٍّ فَقَدْ أَدَّى إِلَى عِلِّيَّتَيْنِ فَقَدْ أَدَّى إِلَى عِلِّيَّتَيْنِ فَقَدْ أَدَّى إِلَى عِلِّيَّتَيْنِ۔ جس نے علی رضی اللہ عنہ کو ستایا اس نے کیا مجھے ستایا، اور حضرت بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی نسبت فرمایا۔ مَنْ أَعْتَبَهَا أَعْتَبَنِي۔ جس نے انہیں

غصہ دلایا اس نے گویا مجھے غصہ دلایا۔ حالانکہ سب صحابہ نے علیؑ کی عداوت اور بی بی زہرا رضی اللہ عنہا کی ایذا رسانی پر اتفاق کیا ہے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ان کو رسوا کیا جبکہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے ان کے گھر کو جلا نا چاہا۔ اسکی تفصیل شیعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی فَتَحٌ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ کہ وہ اگر بیعت کریں مگر وہ نہیں آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو طیش آیا۔ اور خود ان کے گھر گئے اور ساتھ ہی اپنے ساتھ لکڑی کے گٹھے اور آگ بھی لے گئے۔ گھر پہنچے تو دروازہ بند دیکھا تو زور سے آواز دی کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ دروازہ کھولو۔ مگر جناب علی رضی اللہ عنہ خاموش رہا اور دروازہ نہ کھولا۔ تو آپ نے دروازہ کو آگ لگا دی اور بلا تامل اندر گھس گئے۔ جب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا ہنے یہ دیکھا تو بے اختیار آنسو سے نکل آئیں اور عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آکر اپنے باپا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ تب عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار مع میان کے ان کی کوکھ میں چھبائی۔ اور علی رضی اللہ عنہ سے کہا ہاں اٹھو اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر پر بیعت کر لو۔ ورنہ میں تمکو قتل کر دوں گا۔ سارے صحابہ اس وقت موجود تھے مگر کسی نے دم نہ مارا۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر و داماد رضی اللہ عنہما کو کھلا ہوا

کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس وصیت کو جو آپ نے اہل بیت کے حق میں فرمائی تھی پس پشت ڈال دیا،

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ یہ سارا قصہ اور بیان شیعوں اور کوفہ کے کذابوں کا من گھڑت افتراء اور دعوئے بے فروغ ہے! تو جو یہ گھڑیں، بہتان باندھیں اور اس کا جواب اہل سنت سے مانگیں، تو یہ بے چارے کیسے عہدہ برآہو سکیں گے جب اہل سنت سے ہی جواب لینا ہے تو پہلے اہل سنت کی کتابوں سے اسکی حقیقت معلوم کرو اور پھر جواب مانگو اس لئے کہ اہل سنت کے ہاں روایات میں مدغم کوئی کاپن نہیں۔ ان کے ہاں تو جوابات صحیح ہے وہ بلا کم و کاست حوالہ قرطاس و قلم ہوتی ہے۔ یہ ہر مسلمان کو جان لینا چاہئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے کوئی بھی جناب امیر ابو سعید و زہرہ رضی اللہ عنہما کے درپے آزار نہ ہوا نہ ان کے ساتھ پرغاش رکھی بلکہ ہمیشہ ان کی شان کے شایاں عزت و توقیر کرتے ہر طرح کی مدد و نصرت کے لئے کمر بستہ رہتے۔ اور سرانگھوں پر بٹھاتے رہے۔ جب بھی ان کی طرف سے کسی اعانت کی طلب ہوئی یا کسی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ ان کی مدد و اعانت کی گئی! چنانچہ عبدالرحمن ابتری کہتا ہے۔

ہم (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جنگ صفین میں آٹھ سو فوجی جنہوں نے بیعت رضوان کی تھی ان میں سے تریسٹھ افراد مقتول ہوئے جن میں عمار بن یاسر اور خزیمہ بن ثابت و الشہادتین رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ اور مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جن کا اس نے اور دوسروں نے بھی ذکر کیا ہے۔

شَهِدْنَا صَفِّينَ مَعَ عَلِيٍّ فِي ثَمَانٍ مِائَةِ مِثْقَلٍ بَالِغٍ
تَحْتَ الشَّجَرَةِ بَيْنَهُ الْبُرْصَانُ وَقُتِلَ مِنْهُمْ ثَلَاثَةٌ
وَسِتُّونَ رَجُلًا مِنْهُمْ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ وَخُزَيْمَةُ
بْنُ ثَابِتٍ وَوُشَّاحُ الشَّهَادَتَيْنِ وَجَمْعٌ كَثِيرٌ مِنْ
الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَقَدْ ذَكَرَهُمْ وَغَيْرُهُمْ

یہ بات جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خطبہ مندرجہ بالا میں موجود ہے، علامہ ازیں آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو خطوط تحریر فرمائے وہ سب موجود ہیں جن میں آپ نے مہاجرین و انصار کے ساتھ ہونے کو اپنی خلافت کے حق ہونے کی دلیل قرار دیا ہے! ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے دانا اور فہیم سے ایسا عمل ظہور میں آئے۔ اور یہ قنفذ کون ہے جس کے نہ نام کا پتہ نہ ذات کا۔ یہ کس حیثیت سے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا تھا۔

آپ کا ساتھ دینے والے اور جنگ صفین میں آپ کے دوش بدوش بھی مہاجر و انصار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظروں سے اوجھل ہوئے تھے، جناب زہرہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں جناب شعیب رضی اللہ عنہما کی قوت و شوکت انہیں دو گروہوں سے تھی۔ بخلاف جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے پاس تو ایک لاکھ شامی پہلوان پشت پناہی کے لئے موجود تھے، وہ اگر انصار و مہاجرین کو نظر انداز کرتے تھے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن اس دور میں جبکہ سارے مکہ سارے مہاجر و انصار زندہ ہوں۔ کوئی قوت نہ ہوا ہوا و دہی قتل ہوا ہو، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جبراً ہونے بھی دوچار لڑکے ہوئے ہوں۔ تو یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ان مہاجر و انصار نے خاندان رسول پر ظلم، ہونے دیکھا اور خاموش رہے! ظلم و غصب کے معاملہ میں خاموشی! یہ ان نفوس ذکیہ پر الزام و اتہام ہے، ان کی اجتماعی خاموشی کا صرف ایک ہی مطلب تھا جو یہ تھا ہے عین مشار بہت کے مطابق ہونا ہے اور کسی پہلو بھی نہ کسی پہلو پر، ظلم اور کسی کی حق تلفی کی جارہی ہے۔ کسی کو سستایا جارہا ہے نہ اسے ذلیل کیا جارہا ہے! افہام و فہیم کی فضا ہے، آزار کا اختلاف اگرچہ بھی تولد فہم و فراست سے حل کیا جا رہا ہے۔ لاشعری نوکا، اور وہ ایسے معاملہ میں جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہوں، اہل حل و عقد انہیں تسلیم کر کے عمل پیرا ہو چکے ہوں۔ یہ صرف دشمنان اسلام کا پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں۔ پھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں دیکھ لیں، کہ وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور نہیں ہوئے بلکہ آپ ہی نے ان کی سرکشی کی وجہ سے ان پر حملہ کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود مہاجر و انصار رضوان اللہ علیہم معتد بہ تعدد آپ کے زیر علم اور شان نہاد تھے! مگر سارے ہی مہاجر و انصار ان

کے خلاف اور ان کو دشمنوں کے حوالہ کرنے والے تھے تو یہ تعداد کہاں سے آگئی، بغرض یہ سب کچھ کسی بھی عقل رکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا یاں جسکی عقل شیطان یا اخوان الشیطان نے مار رکھی ہو وہ البتہ صحرائے مصلحت و مگر ایسی نہیں، بھٹکنے والا ہی ایسی باتیں گھڑتا یا بار کو تار بھا اب پہلے آپ یہ ملاحظہ فرمائے کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق کیا خیالات اور کیا برتاؤ تھا۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہمیشہ آپ کے اوصاف و فضائل میں رطب اللسان رہتے دوسرے صحابہ کرام کو آپ کی عزت و توقیر کرنے کیلئے تاکبالت فرماتے رہتے۔ چنانچہ دارقطنیؒ نے شعبیؒ سے روایت کی ہے کہ

ایک مرتبہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے تو آپ کو دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جے ایسے آدمی کے دیکھنے کی خواہش و خوشی ہو جو لوگوں میں باعتبار مرتبہ نہ ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باعبارت قرابت سب سے قریب ہو، اور آپ کی پیروی و متابعت میں سب سے افضل و برتر ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ان آنے والے صاحب کو دیکھے!

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی آپ کی توقیر و تعظیم کرتے، آپ سے صلاح و مشورہ طلب کرنے میں مبالغہ فرماتے تھے۔ دارقطنی نے سعید بن مسیبؒ کی روایت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں۔

أَيُّهَا النَّاسُ اعْلَمُوا أَنَّ لَنَا نَبِيًّا لَا يَنْفَعُ شَرُّهُ إِلَّا بِوَلَايَةِ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، رُوِيَ عَنْهُ سَمِعَهُ لَوْ كُشِرَتْ عَلَى كَيْفِ الْمَكِيلِ عَلَى كَيْفِ الدُّوِّ هِيَ سَهْوٌ سَكَنِي (ہو سکتی ہے)۔ اور جب مؤودہ کے متعلق سوال اٹھا تو صحابہ کرام باہم مختلف الرائے تھے، اسی میں یہ سوال پیش آیا کہ ہمیں دو مہینہ کا ساقط کردہ محل بھی مؤودہ کہلائے گا یا نہیں۔ تو محتاط صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے رائے تھی کہ وہ بھی مؤودہ میں شامل ہے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا واللہ جب تک اس پر سات مرتبہ نہ گذر لیں وہ مؤودہ نہیں ہوتی۔ یہ حضرت جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، صَدَقْتَ الْحَالَ اللَّهُ بَقَاءُكَ أَبَا الْقَاسِمِ (ابو القاسم اللہ آپ کی زندگی و راز فرمائے آپ نے صحیح فرمایا)۔

حمزیری نے درۃ الخواص فی اغلاط الخواص میں لکھا ہے کہ یہ دعائیہ جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے پہل ادا فرمایا۔ عظیم باپ کے صحیح خلعون الرشید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما برگزیدہ اصحاب کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جہاد و قتال میں عدم شرکت پر ہمیشہ ملل و متاسف رہے۔ طبرانی نے اوسط المعاجم میں روایت بیان کی ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو مکہ میں یہ معلوم ہوا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جانب عراق روانہ ہو گئے ہیں۔ تو یہ مکہ سے دو گڑ پڑے اور تین دن رات کے فاصلہ کی مسافت پر آپ کو جالیا آپ سے کہا۔

آپ کا ارادہ کہاں جانے کا ہے؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ عراق جارہوں۔ اور آپ کے ساتھ مکاتیب و عہد ناموں کے بڑے دفتر اور طومار تھا۔ جس کے متعلق فرمایا کہ یہ وہاں کے لوگوں کے خطوط ہیں اور یہ بیعت نامے ہیں! حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہنے لگے ان خطوط اور بیعت ناموں پر نہ جئے۔ میں چوکتا ہوں بغور سنئے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل امین آئے اور دنیا و آخرت میں سے ایک کے اختیار کرنے کا حق دیا کہ ان میں سے جو چاہیں پسند فرمالیں

أَبْنُ تُرَيْدٍ فَقَالَ الْحُسَيْنُ إِلَى الْعِدَاءِ فَإِذَا مَعَهُ مَقْتَبٌ وَلَهُوَ أَمِيرٌ فَقَالَ هَذِهِ كُتُبُهُمْ وَيَعْتَهُمْ فَقَالَ لَا تَنْتَقِزُ إِلَى كُتُبِهِمْ وَلَا تَأْتِيَهُمْ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ إِلَى مُحَمَّدٍ شَلِّ حَدِيثًا إِنَّ جِبْرِيلَ شَلَّ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَيَّرَهُ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَاخْتَارَ الْآخِرَةَ وَإِنَّكَ بِطَعْنَةٍ مِّنْ مَّرْسُومِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَلِيهَا أَحَدٌ مِنْكُمْ فَابْنِي أَنْ يَرْجِعَ وَأَعْتَقَهُ ابْنُ عُمَرَ

فَبِكُلِّ وَاجْهٍ مِّنَ الْبَكَاةِ اسْتَفْتَدُوا مَن تَشَاءُونَ ۚ وَابْعَثُوا مَن تَشَاءُونَ ۚ وَابْعَثُوا مَن تَشَاءُونَ ۚ وَابْعَثُوا مَن تَشَاءُونَ ۚ

فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کو اختیار فرمایا۔ اور آپ بھی ان کے جسد مبارک کا ایک جزد ہیں آپ میں سے کوئی بھی متولی خلافت نہ ہوگا۔ پھر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپسی سے انکار فرمایا تو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے معاف کیا اور باؤا بلند درو کو کہے جارہے تھے کہ اے مقتول میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں ..

برائے نام بھی عمدہ و صحیح سند کے ساتھ اسی قسم کی روایت بیان کی ہے!

اب ہم ان لوہائیوں کے معاملہ کو لیتے ہیں جو حضرت طلحہ، جناب زبیر اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہم جمعین اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے باپیں واقعہ ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ بات تو بلا غور و تردید بلاتامل کسی جا سکتی ہے کہ ان لوہائیوں کی بنا جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بغض و عناد ہو کر نہ تھا۔ نہ آپ کو ایذا پہنچانا مسلح نظر تھا بلکہ ان کے کچھ دوسرے ہی سیاسی قسم کے اسباب و عوامل تھے جنکو قابل اعتما و مومنین نے شرح و بسط اور اور خاصی تفصیل سے مرقوم و مرتب کیا ہے۔ اور وہ سارے کے سارے اسباب و عوامل وقوع میں بھی آئے۔

اجمالاً ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے، کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کوفہ و مصر کے ابا شوں اور شورش پسند بد معاشوں نے شہید کر دیا۔ تو اسوقت فضا و حالات کو دیکھتے ہوئے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اسے الجھٹایا دار و گیر کرنا مصلحتاً مناسب تھا یا نہیں فرمایا۔ اور خاموشی اختیار فرمائی۔ مگر ان بد بختوں نے اپنے اس فعل قبیح و شنیع کو لائق ستائش سمجھا اور اس پر فخر کرنا اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کو برائی سے یاد کرنے کی مذموم حرکت بھی شروع کر دی۔ اور علی الاعلان کہنے لگے کہ ہم نے جو کیا یہی حق ہے۔ دوسری طرف چند برگزیدہ صحابہ کی ایک جماعت جس میں جناب طلحہ، زبیر، عمران بن بشیر، اور کعب بن عجرہ، وغیرہ رضی اللہ عنہم قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت دلگیر اور متاسف و ملول تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بدترین سانحہ ہے جو امت میں رونما ہوا۔ ہمیں ابتداء میں صحیح طور پر معلوم ہو گیا ہوتا کہ ایسا ہوگا تو اب اول قدم پر ہی اس کا سدباب کر دیتے! افسوس وہ مظلوم ماں گئے۔ وہ یقیناً حق پر تھے، ان کے قاتلین ہی غلط روا اور باطل پر تھے! قاتلوں اور شورش پسندوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بعض حضرات ہمارے خلاف یہ رائے رکھتے ہیں تو انہوں نے طے کیا کہ ان کو بھی جام شہادت پلا کر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کی راہ پر روانہ کر دیں۔ بعض مخلص اور بہمدد لوگوں کے ذریعہ اس پخت و پز کی اطلاع ان حضرات کو ملی اور یہ حضرات مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ وہاں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بسلسلہ حج پہلے سے قیام فرما تھیں! ان حضرات نے سارے حالات و کوائف سے آپ کو آگاہ کر کے یہ بھی کہا کہ اب ہم آپ کی پناہ میں ہیں کہ پریشانی میں ماں کی گود بچہ کے لئے باعث سکون ہوتی ہے۔ آپ مسلمانوں کی ماں ہیں۔ مسلمانوں پر جو افتاد آپڑی ہے اور عربوں کی جو آفت ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی ہے اس کو اب مرنے آپ ہی ٹال سکتی ہے! کیونکہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے تو مصلحت و وقت کے پیش نظر ان بد بختوں کے سامنے خاموشی اختیار فرمائی ہے! اور شورش پسندوں نے اس خاموشی کو کمزوری سمجھ لی ہے۔ اور اب وہ ظلم و تعدی پر زیادہ جبری اور بے باک ہوتے جا رہے ہیں جیت تک حضرت عثمان شہید کا قصاص ان سے نہ لیا جائے گا۔ اور ان کی بدکرداری کا قرار واقعی سزا دی جا سکیگی معاملات صحیح نہ ہوں گے۔ ان کا ظلم و تعدی بردھستی رہیگی۔ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوگا تو میں مانی کریں گے۔ دیار و امصار میں انتشار و اتراق پھیل جائے گا اور سارے مسلمان اسن والہمینان سے محروم ہو جائیں گے!

اسوقت جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ جب تک امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ ان کے گھیرے میں ہیں اور وہ لوگ مدینہ میں ہیں تم مدینہ نہ جاؤ، جہاں اہمینان و سکون نظر آئے وہاں قیام کرو، اس دوران تدبیروں سے چیلے حوالوں سے یہ کوشش جاری رکھو کہ

جناب امیر رضی اللہ عنہ ان کے نرغہ سے نکل آئیں۔ جب ان سے ان بدبختوں کا اثر ختم ہونے کا تو اسوقت تمہاری رفاقت ان کے لئے مفید بھی ہوگی اور موثر بھی، اسوقت جب وہ تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہاری رفاقت قبول کریں گے تب اس پر غور کرنا اور سوچنا کہ خلیفہ مظلوم کا قصاص کس طرح لیا اور قاتلوں کو سزائیں تنبیہ اور گونہائی کس طرح ہو کہ دوسروں کو اس سے عبرت حاصل ہو، مگر یہ کام بہت بڑا ہے۔ اسے بچوں کا کھیل نہ سمجھنا۔ تمام موجود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس لئے کو پسند کیا۔ اور چونکہ اسوقت مسلمانوں کی فوجیں عراق و بصرہ میں تھیں اس لئے انہیں اطراف کو قیام کے لئے مناسب خیال کیا۔ اور ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر زور ملا کہ جب تک فتنہ فرو نہ ہو اور امن و امان نہ قائم ہو، اسد خلافت صحیح طور پر انجام نہ پانے لگیں۔ اور ہماری ملاقات امیر المؤمنین سے نہ ہو جائے، آپ ہمارے ساتھ ہی قیام فرمائے۔ آپ ہمارے لئے بہت بڑا سہارا ہیں۔ آپ امت کی ماں ہیں آپ کا اعزاز و اکرام بھی تمام اہل بیت سے بڑھا ہوا ہے۔ آپ کے بیٹے ہوئے ہم پر ہاتھ اٹھانے کی کسی بدبخت کو جرأت نہ ہوگی۔ لہذا بہت سی مصالح ملکی و ملی کا خاطر اور اس توقع پر کہ جو خلیفہ مسلمانوں میں پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کو پائے اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں آپ کی مساعی ممکن ہے بار آور ہو جائیں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ فرمایا۔ ان میں سے آپ کے اقارب بھی تھے۔ ایک سگے بھائی، دوسرے بہنوئی۔ اور بھی دیگر اصحاب! چنانچہ آپ بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں۔

مگر قاتلین اور شورش پسندوں کی یہ حرکت کسی فوری جذبہ یا ابال کا نتیجہ نہ تھیں نہ ہی اس کا شائبہ تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد و عادل نہ تھے۔ بلکہ یہ اسلام کے فلاح و کفر کی اولین سازش تھی جس کی پشت پر پورکی شیطنت اور المیہیت کی طاقت مرکوز تھی!

مدتوں منصوبہ بندی کی گئی، رجال کا تیار کر کے گئے، اور اس کی خشت اول عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ برسوں سے خفیہ و اعلانیہ تحریک چلائی جا رہی تھی۔ اطراف و اکناف سے شورش پسندوں اور فسادوں کو و غلایا اور ابھارا گیا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ برسوں کی محنت اور تباہی پر وہ کسی بے تدبیری سے پانی پھیر دیتے۔ لہذا قتل عثمان کے بعد سیت حاکمہ پر انہوں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اول پروگرام۔ بیعت حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ جب اطمینان سے پورا کر لیا، تب بھی ان کے گرد سے اپنا گھیرا نہیں ہٹایا۔ بلکہ گرفت اور گھیراؤ اور سخت مضبوط کر دیا۔ اور حالات کو اس لیے پرے آئے کہ سازشی گروہ معتبر مانا جانے لگا۔ وہ جو کچھ کہتے وہی صحیح تسلیم ہوتا۔ وہ جو سازش بھی چاہتے کامیاب ہو جاتی تھی چنانچہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے پیش نظر اصلاح بین المسلمین کا پروگرام تھا وہ اگر کامیاب ہو جاتا تو نہ صرف قاتلان عثمان کی فروع و کرا کو پنپا دے جاتے بلکہ منافقت بھی اپنی موت آپ مر جاتی، مگر مشیت ایزدی میں کچھ اور ہی طے تھا اس لئے ام المؤمنین کے سفر خیر کو بھی دشمن نے اذہ مطلب برآری بنالیا۔ اور جناب امیر تنگ یہ قصہ بہت سی رنگ آمیزیوں کے ساتھ دوسرے انداز میں پیش کیا۔ اور آپ پر زور دیا کہ آپ کو لا محالہ ان کا تعاقب کرنا چاہئے۔ حضرات حسنین، عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے ہر چند اس سے رکا۔ اور نفی لغت کی، مگر آپ پر اثر فساد یوں کا ہی غالب رہا ان حضرت کی بات آپ نے نہیں مانی۔ بالآخر آپ تعاقب میں روانہ ہو گئے!

جب بصرہ پہنچے، تو آپ نے ققاع کو ام المؤمنین اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجا کہ معلوم کریں ان حضرات کا مدعا و مقصد کیسے ہے۔ چنانچہ ققاع آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا ام المؤمنین آپ کے سفر کی کیا عرض ہے آپ نے فرمایا مسلمانوں میں باہم مصالحت۔ پھر طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو بلوایا وہ آئے تو ققاع نے پوچھا کہ یہ بتائے کہ سلع و اصلاح کس طرح ترکیب سے ہوگی، انہوں نے قاتلین عثمان کی حوالگی کیسے کہا تو ققاع کہنے لگا یہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے، فتنہ فرو نہ ہو کہ مسلمان سب متفق ہو کہ مطالبہ کریں تب

ہی ایسا ہو سکتا ہے، لہذا تقاضائے وقت یہ ہے کہ کئی الحال اس معاملہ میں نرمی اختیار کر لو، ان دونوں حضرات نے تسلیم کر لیا کہ تمہاری رائے صاحب ہے فقہاء جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹے اور واقعات کی اطلاع دی۔ حالات دوبارہ ہوتے دیکھ کر سب ہی کو خوشی تھی، اور یقین ہوتا تھا کہ صلح کی روکاؤ اب دور ہو گئی ہے۔ عنقریب صلح ہو جائیگی۔ لشکریاں تین دن مقیم رہا، تیسرے دن کی شام کو باہمی نامہ و پیام کے ذریعہ پہلے پا گیا کہ اگلے دن جناب طہ و زبیر رضی اللہ عنہما تنہائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کریں گے اور اس مجلس میں قاتلین عثمان میں سے کوئی نہ ہوگا۔ یہ خبر ایسی تھی کہ منافقوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، ان کو نظر آنے لگا کہ ساری محنت مٹی میں مل کر اکارت ہی نہیں جائیگی جان کے لئے بھی پر جائیں گے اور ایک ایک کو چن چن کر قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ حیران و پریشان اپنے سر پہ اور اسٹاذ عبد اللہ بن سبا کے پاس گئے، حالات بتا کر چارہ کار پوچھا۔ اس نے کہا بس صورت ایک ہی ہے۔ رات کو لشکر ام المؤمنین پر شب خون مارو، اور چرخ صحیح کر کہو مسلمانوں نے دھوکہ دے کر ہم پر حملہ کر دیا، یہی بات امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے بھی دل نشین کرو۔ بالآخر انہوں نے یہی کیا۔ لشکر ام المؤمنین پر ٹوٹ پڑے اور الزام لگایا کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے غدیر کیا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ عن خبر سن کر تعجب میں نہ گئے۔ مگر اب وقت گزر گیا تھا، جنگ کی آگ پورے زور سے بھڑک چکی تھی۔ سر قلم ہو رہے تھے، منافقوں کی چال بازی مومنوں کی فراست پر بازی لے گئی تھی۔ ناچار امیر رضی اللہ عنہ بھی شریک جنگ ہو گئے، اور پھر ہوا جو ہونا تھا!

قرطبی کے علاوہ دیگر اہل سنت کے مورخین کی اکثریت نے اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے، اور جناب حسن، جناب عبد اللہ بن جعفر اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی اسی قسم کی روایات منقول ہیں۔ اب شیعوں کے اسلاف، قاتلان عثمان، جو ان کے پیشوا بھی ہیں۔ ادھر ادھر کی زہلیات بیان کرنے لگیں، تو ہم انہیں گونڈ شتر کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

اول اول اہل شام کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ قاتلان عثمان سے قصاص لیا جائے اور انہیں پوری سزا ملنی چاہئے۔ مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس وقت بھی یعنی جنگ جمل کے بعد کہ اب میدان صاف تھا مخالف اور جھگڑنے والے ختم ہو گئے تھے، آپ کی طرف سے غدیر واجبی کیا گیا۔ تو وہ بدگمان ہو گئے اور خلافت سے منکر ہو کر آپ کی برائیاں کر کے کہنے لگے کہ دراصل آپ خلافت کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اور پھر وہ مد مقابل بن کر اٹھ کھڑے ہوئے، جناب امیر رضی اللہ عنہ ایک فرمان بجا لے کر ابلاغ پہلے بیان ہو چکا ہے جس میں آپ نے فرمایا۔ ”ہم ایسے ہو گئے کہ اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑتے ہیں اس لئے کہ اس میں کجروی، گمراہی، شبہ اور تاویل نے جگہ لے لی ہے۔“

اوطا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ابلاغ میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

آپ کے بعض رفقاء نے کہ کاش ان لوگوں کو سزا دیتے جنہوں نے
حضرت عثمان پر بلوہ کیا، فرمایا بھائیو! میں اس چیز سے ناواقف
نہیں جو تم کہہ رہے ہو، لیکن ایسا ہو کس طرح سکتا ہے، اس لئے
کہ صاحب قوت و شوکت ان کے پاس ہے۔ وہ ہم پر حاکم ہیں، ہم
ان پر نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ مل کر تمہارے غلاموں
نے چڑھائی کی اور تمہارے صحابیوں نے اکٹھے ہو کر ان کا ساتھ
دیا۔ اور یہ تم ہی میں سے ہیں جو دل کھول کر تمہاری ہی برائیاں
کرتے پھرتے ہیں،

قَالَ لَهُ بَعْضُ اصْحَابِهِ لَوْ عَاقَبْتَ قَوْمًا اجْتَلَوْا
عَلَى عُثْمَانَ فَقَالَ يَا اِخْوَتَايَ اِلَيْهِ لَسْتُ اَجْهَلُ
مِمَّا تَعْلَمُونَ وَلَكِنْ كَيْفَ لِيْهِمْ وَالتَّجَلُّوْنَ عَلَى
شُرَكَائِهِمْ يَمْلِكُوْنَ نَا وَلَا تَمْلِكُهُمْ وَهَآهُمْ
هَؤُلَاءِ قَدْ ثَارَتْ مَعَهُمْ عِبْدُكُمْ وَ
التَّفَتَّ اِلَيْهِمْ اَعْدَاكُمْ وَهُمْ خِلَاءُكُمْ
يَسْمُوْنَكُمْ مَا شَاءُوْا۔

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ کرام، حضرت علی رضوان اللہ علیہم، سے جس بات کا تقاضا کر رہے تھے آپ اس سے تغافل محض اس لئے فرما رہے تھے کہ آپ مجبور محض ہو کر رہ گئے تھے، اور ضرورت اسی کی متقاضی تھی۔ اور جناب امیر اس میں معذور تھے۔

ہجج البلاغہ کے متدجات تو شیعہ حضرات کے مرغوبات اور پسندیدہ ہیں، ان میں تو اہل سنت کو کوئی عمل دخل نہیں۔ اگر ہم اپنی روایات ذکر کریں تو پوری حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ اور بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے!

حالانکہ شیعہ ایسی روایات ذکر نہیں کرتے۔ بڑے خفیہ طریقہ پر راز رکھتے ہیں کہ مذہب کا سارا تار و پود ہی نہ بکھر جائے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھلی دلیل ہے کہ خواہی نہ خواہی کہیں نہ کہیں دو چار عبارات ان سے انہیں کی معتبر کتابوں میں ایسی دسج کرادی ہیں۔ جو اہل سنت کے بہت ہی کام آتی ہیں! اور ان کے خود ساختہ مذہب کی خود ہی پول کھول دیتی ہیں۔

قفقہ کا قفسہ، سید زہرار رضی اللہ عنہا کے گھر کا دروازہ جلانا۔ یا ان کی کوکھ میں تلوار کا ٹھوکا۔ یہ سب ان کے کوفہ کے اخوان الشیطان مغفروں اور کذابوں کی من گھڑت ہے۔ جو محسن اتفاق سے ان شیعوں کے پیشوا اور مقتدا بھی ہیں!

اہل سنت کی کتاب میں بطریق صحیح تو کیا بطریق ضعیف بھی اس کا ذکر نہیں۔ شیعہ راویوں کا تفصیلی احوال پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان بد بختوں نے تو اپنے ائمہ کو نہیں بخشا۔ طرح طرح کی تہمتیں ان پر جھڑپیں۔ نوع بنوع افزائمت ان سے منسوب کئے۔ اور یہ کچھ تو انہوں نے دو کچھ محبت و اخلاص کے علی الرغم کیا، اب آپ خود سوچ لیں جن سے ان کو عداوت ہے جو ان کا دین و ایمان بھی ہے ان کے متعلق تو یہ جھوٹ کے مینار کھڑے کرنے سے بھی نہ بچ سکیں گے۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا بھی ہے! بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کتابوں میں کذب و افتراء اور بہتان کے سوا کچھ نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو اہل سنت ان جھوٹوں کی ان جھوٹی روایات پر کیوں کان دھرنی گے جو قرآن مجید، اور عترت کے یکسر مخالف ہیں۔ کیونکہ اہل سنت کے دین و ایمان کا رشتہ تو قرآن مجید اور اقوال عترت سے وابستہ ہیں۔ اور یہ دو عادل گواہ ان کے بہتان اور افتراء کی جڑ کاٹنے کے لئے کافی وافی ہیں۔

ان اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق قرآن کی شہادت درکار ہو تو وہ بھرا پڑا ہے جگہ جگہ ہم ان کے حوالے بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ آیت اذلة علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین۔ کس کے بارے میں ہے۔ اشد اعدا علی الکفار محبا بئینہم کون لوگوں کی شان میں آیا ہے۔ الذین ان ممکنا ہم الادیہ۔ کس جماعت کے حق میں نازل ہوئی۔ کیا آیت میں مذکورہ امید کا پسندیدہ مشغلہ امر بالمعروف

ونہی عن المنکر ہی تھا کہ خانہ زہرار رضی اللہ عنہا کو جلا میں اور ان کی کوکھ میں تلوار جھپائیں! اسی کے ساتھ اس آیت پر بھی نظر رہے۔ و لکن اللہ حبیب الیکم الایمان الادیہ۔ یہ کس کو خطاب کر رہی ہے فعل بد فسوق ہے یا تمہیں؟ مگر یہ آیت کو اس پاکیزہ جماعت سے فعل بد کی پسندیدگی کی تردید کر رہی ہے۔ وہ فعل بد کو پسند نہیں کرتے اس کے ارتکاب کا ان سے کیا سوال،

اور اگر اس گروہ انقیار و اصفیاء کے متعلق حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت ہی سننا چاہتے ہو تو ہجج البلاغہ ہی اٹھا کر دیکھ لو کہ انہوں نے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گرامی قدر رضوان اللہ علیہم کے متعلق کیا ارشاد فرمایا ہے۔ ان اصحاب کرام کا اپنے دوستوں کے سامنے تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

لَعَدَّ الرَّائِبُ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَمَا أَرَى أَحَدًا مِنْكُمْ يَشَبَّهُهُمْ لَقَدْ كَانُوا
يُصَلُّونَ شَعْنًا عَذْرَابًا تَوَاسَّجَدُ أَوْتِيًا مَالًا
لَا يَدْرِي حَوْنُ بَيْنَ جَبَاهِهِمْ وَأَقْدَمِهِمْ يَعْقُونَ
مجھے تم میں سے کوئی بھی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند دکھائی نہیں دیتا۔ وہ دن محنت و مشقت کے کاموں میں گذرتے تورات نماز کے سجود و قیام میں، نہ وہ اپنی پیشانیوں کو آرام دیتے نہ قدموں کو۔ گویا آخرت کے ڈرنے انہیں آتش زیر پا کر بکھا

ہو۔ ان کی پشانیوں پر طویل سجدہ کے نشان پڑ گئے تھے۔
اللہ کے ذکر پر آنکھوں سے اسقدر آنسو ابل پڑے کہ چہرہ تر ہو جاتا۔
اور وہ اللہ کے عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں طوفان
میں لرزیدہ درختوں کی مانند ہلپتے رہتے،

عَلَى مِثْلِ الْحَمَرِ مِنْ دُرٍّ مَعَادٍ هُمْ كَأَنَّ بَيْنَ أَعْيُنِهِمْ
دُكْبًا مِنْ طُولِ سُجُودِهِمْ إِذَا ذَكَرَ اللَّهُ هَمَلَتْ
أَعْيُنُهُمْ حَتَّى يُكَلِّمَ جِبَاهَهُمْ وَمَا ذُكِّمُوا لِمَعْنَى الشَّجَدِ
فِي السُّجُودِ الْعَامِ حَتَّى تَمُوتَ الْعُقَابُ وَهَجَاءُ لِكُلِّ ثَوَابٍ

اور یہ بھی فرمایا۔

وَقَالَ ابْنُ الْقَدِّ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ
سَلَّمَ نَقُتِلُ ابْنَاءَنَا وَأَبَاءَنَا وَإِخْوَانَنَا وَأَخَوَاتَنَا
وَأَعْمَامَنَا وَمَا نُرِيدُ بِذَلِكَ إِلَّا إِيْمَانًا وَتَضَلُّعًا
وَمُضِيًّا عَلَى الْبَقِيَّةِ وَصَبْرًا عَلَى مُضِيِّ الْأَلَمِ وَجِدًّا
عَلَى جِهَادِ الْعَدُوِّ وَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ مِتًّا وَالْأَخْدُ
مِنْ عَدُوِّهِ يَتَمَازِلَانِ تَصَاوُلَ فَخْلَيْنِ يَخَالِ سَانَ
أَنْفُسُهُمَا الْيُحْمَا يُسْقِي صَاحِبَهُ كَأْسَ الْمَنُونِ فَمَوَدَّةً
لَنَا وَمَوَدَّةً لِعَدُوِّهِ وَنَامِنَا فَلَمَّا رَأَى اللَّهُ صِدْقَنَا
أَنْزَلَ بَعْدَ ذَلِكَ الْكَلِمَةَ وَأَنْزَلَ عَلَيْنَا الصَّدَقَةَ
حَتَّى اسْتَقْبَلَهُ الْإِسْلَامُ مُلْقِيًا جِدَارَهُ مُتَبَوِّئًا أَوْ
لِطَانَهُ وَلَعْمَدِي نَوَكْنَا فِي مَا آتَيْنَاكُمْ مَا قَامَ
لِلدِّينِ عُمُودٌ وَلَا أَحْضَدٌ لِلْإِسْلَامِ عُمُودٌ

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں قتال کرتے اور مقتول
ہو جاتے، باپ، بھائی، ناموں، چچا ہوتے، اور ایسا ایمان کے تقاضے
اطاعت کے جذبہ، راہِ راست پر چلنے کی خاطر، صدمہ کی تکلیف پر
صبر کرتے ہوئے دشمن کے خلاف جہاد میں کوشش کرتے ہوئے کہتے،
ایک ہم میں سے دوسرا دشمنوں میں سے دونوں با ہم ایک دوسرے پر
شیر کی طرح حملہ آور ہوتے اور ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش
کرتے کہ دونوں میں سے کون اپنے مد مقابل کو موت کا جام پلاتا ہے۔
کبھی ہم بازی لے جاتے، کبھی ہمارا دشمن جیت جاتا، جب اللہ تعالیٰ
نے ہماری صداقت پر کھلی، تو دشمن پر ذلت تھوپی اور ہمیں فتح
عطا فرمائی، حتیٰ کہ اسلام کا سکرم چم گیا۔ اور اسے استغفار نصیب ہوا۔
اس کے پڑوسی مطمئن، اس کے دیار و امصار جائے امن و قرار
تھے۔ اور میری جان کی قسم کہ ہم بھی اگر وہی کرتے جو تم کر رہے
ہو، تو نہ دین کو قیام و قرار نصیب ہوتا، نہ ہی شجر اسلام سرسبز
و بار آور ہوتا۔

اور پھر ان جملہ شہادتوں سے قطع نظر کی صورت میں بھی ایک آیت قرآنی ہمیں ایسی موجود ملتی ہے جو اس قصہ کو جھٹلانے کے لئے
کافی ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا
أَبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ
أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَ لَهُمْ
بِرُوحٍ مِّنْهُ

جو قوم اللہ و رسول اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہے آپ اس کو
ایسا نہ پائیں گے کہ وہ اللہ و رسول سے ضد و کد رکھنے والے سے دوستی
رکھیں، خواہ وہ ان کے باپ ہوں ان کے بیٹے ہوں، یا ان کے بھائی
یا ان کے کنبہ والے۔ وہ لوگ وہی ہیں جنکے قلوب پر ایمان کندہ
کر دیا گیا ہے، اور اپنی روح سے ان کو تقویت پہنچائی۔

اس آیت سے بالکل صاف اور صریح طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ایسے شخص کی طرف راجع ہونا یا دوستی
کا ناگزیر ہونا جو اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ہو یا اسکی حمایت کرنا یا اس کی دوستی کو حکم الہی کے نفاذ میں رکاوٹ
بنانا محال و ناممکن ہے۔ لہذا ایسے بلند اوصاف رکھنے والے حضرات سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایسے واقعہ پر سکوت اختیار کریں چہ جائیکہ

ان میں سے کوئی ایسے ناگزیر عمل کا ارتکاب کرے، حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دین کا علم بلند رکھنے میں انہوں نے اپنی جانیں اور اموال نثار کر دیں ہوں اور ساری زندگی سنت رسول کے زندہ کرنے میں گزار دی ہو۔ سبھا نافی ہذا ایھتنا عظیم جب اہل سنت کے سامنے خلا و رسول، جناب امیر و مسنن، رضی اللہ عنہم کی وقیع شہادت موجود ہو تو ان سے یہ توقع کیوں رکھی جاتی ہے کہ وہ ان اخوان الشیطان کی بکواس اور ابن مہر حلّی اور ابن شہر آشوب مازندرانی کی افترار پردازی و تراذ خالی پر کان دھریں گے۔ ان کی نظر میں تو یہ صدائیں کوئے کی کائیں کا ہیں، اور صوت حمار سے زیادہ وزن نہیں رکھتیں!

اعترض - (۹) بخاری و مسلم میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئیگی جب تک میری امت وہ کچھ نہ کرے جو پہلے کی امتیں کر چکی ہیں۔ ایک ایک بالشت اور ایک ایک مائتھ کی مقدار ہر مرنے والے کو ملے گی۔
 قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُ تَقَوْمُ السَّاعَةِ حَتَّى تَأْخُذَ أُمَّتِي مَأْخُذَ الْفُقَرَاءِ قَبْلَهَا شَبْرًا بِشَبْرٍ وَذَرَا عَابِدِي رِاعًا قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ كَفَّارًا فَرَأْسَ الْزُّوْمِ قَالَ وَمَنْ النَّاسِ إِلَّا أُولَئِكَ -

اس اعتراض و طعن میں ان ناہنجاروں نے دنیا کو اپنی عقلوں پر ماتم کرنے کی دعوت دینے کا مصححہ خیز اقدام کیا ہے، کہ ساری امت کو اول تو صیابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں محصور قرار دیا اور پھر اس حدیث کو صیابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خلاف استعمال کیا۔ حالانکہ اس حدیث میں لفظ امت مذکور ہے۔ صیابہ کا لفظ نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت زیادہ تر کفار فارس و روم کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ کیا عقائد میں، کیا اعمال میں، کیا اخلاق میں، کیا رسم و رواج میں، مثلاً رومی تشلیث کے قائل ہیں، کہتے ہیں اللہ تین میں سے ایک ہے۔ غالی رافضی بھی پانچ خدا مانتے ہیں۔ باب اول میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ پھر رومی کہتے ہیں کہ حشر روحانی ہو گا نہ کہ جسمانی اسمعیلیوں اور دوسرے رافضیوں کا بھی یہی مذہب ہے۔ رومی پیشاب پاخانہ کی نجاست سے نہیں بچتے، نہ کوئی اہتمام ان کے ہاں اس کے لئے پایا جاتا ہے۔ امامیہ کے ہاں بھی انسانی بول و براز نجس نہیں جانتے۔ اس میں اگر یہ لہجہ بھی جائز تب بھی ایسی حالت میں نماز جائز قرار دیتے ہیں۔ اس کا بیان باب فقہ میں گذر چکا ہے۔

رومی خدا و رسول پر افترار کرتے اور جھوٹے الزامات لگاتے ہیں، امامیہ بھی افترار و کذب میں اپنے ان استادوں کو پیچھے چھوڑ کر خود استاد کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں!

فارس والے خالق خیر و شر کو علیحدہ علیحدہ ثابت کرتے ہیں، تو امامیہ بلکہ سارے رافضی خدا کو خالق خیر اور بنو و شیطاں کو خالق شر جانتے ہیں۔ فارسی تقدیر کا انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آدمی کا ارادہ تو وقوع میں آجاتا ہے مگر اللہ کا ارادہ واقع نہیں ہوتا۔ امامیہ بشمول جملہ رافضی بھی یہی مذہب اپنائے ہوئے ہیں۔ فارسی نور و تاریکی بہت تعظیم کرتے، اسے بمثل عید شہداء کرتے ہیں۔ قمر کو عقرب میں، اور چھوڑے کی رسم اور محاق (چاند کا سورج کے مقابلہ میں آجانے) کو منحوس مانتے ہیں۔ بالکل (شبر البشیر) اسی طرح امامیہ بھی نور و تاریکی تعظیم کرتے اور ان امور کو منحوس سمجھتے ہیں، متعہ اور شرمگاہوں کا حلال ہونا جسپر ہندوستان کے راجہ عمل پیرا رہتے ہیں۔ امامیہ کے نزدیک بھی جائز ہے۔

محرمات سے نکاح اور اغلام، مجوسی فارسیوں کا دین ہے۔ رافضیوں میں باطنی فرقہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ماتم نوہ گری، چاک گریابی اور سیاہ لباس کرنا مصیبت و آفت کے وقت فارسی جوہیوں میں رائج ہے۔ امامیہ بھی اپنے طریقہ میں ان کے قدم بقدم ہیں۔

یہ تو مٹتے نمونہ از خرواہ ہے۔ بنظر تحقیق و تفتیش دیکھا جائے تو یہ قوم شیعہ کفر و شرک کی بہت سی گندگیوں میں، انہیں کے ہم عنان اور شیر البشیر، ذلعا بذرا عا کی زندہ مثال نظر آئیگی۔

اب عام ناظرین کے ساتھ دل چاہے تو شیعہ قوم بھی غور کر لے کہ اس حدیث مبارک کو عملاً صحیح ثابت کرنے میں اور اس کا مصداق بننے میں آگے آگے کون ہے!

اعتراف۔ (۱۰) یہ ہے کہ بخاری شریف میں بحوالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَوْلَا اِنَّ قَوْمِي حَدِيثُ عَائِشَةَ هُمْ بِلَفْظِ وَ اَخَاتُ
اَنْ تُنْكِرَ قُلُوبُهُمْ لَا مَدْرُ اَنْ يُعَدَّ مَرَّ الْبَيْتِ وَ
اَدْخَلْتُ فِيهِ مَا اُخْرِجُ مِنْهُ وَالذَّقْتُهٖ بِالْاَرْضِ
وَجَعَلْتُ مَا بَيْنَ شِدْقَيْهَا وَغُذِيًّا وَبَلَعْتُ بِهِ
اَسَاسُ اِبْرَاهِيْمَ۔

اگر تمہاری قوم کا عہد کفر بھی قریب نہ گذرا ہوتا اور مجھ یہ ڈرنہ ہوتا
کہ وہ اسے گوارا دیندہ کوئی نہ کہیں تو میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا حکم دیتا۔ اور اس
میں سے نکالا ہوا حصہ اس میں شامل کرتا، اس کی کرسی زمیں سے
ملا دیتا۔ اس میں شرعاً عزاد و دروازے قائم کرتا، اور اس کو ابراہیم کی
بنیاد پر از سر نو تعمیر کرتا۔

تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، کی قوم قریش ہی تو تھی۔ تو معلوم ہوا ان کے دل اور باطن صاف نہ تھے۔ اور ان کے باطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خائف تھے اور ان کے دُور سے بعض شرعی امور میں آپ تقیہ فرماتے تھے۔

جواب۔ اس اعتراف کا یہ ہے کہ قومک سے سارے ہی قریش مراد ہوں تو اس میں اوروں کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی داخل ہوں گے بلکہ پورا ناشی قبیلہ بھی کیونکہ وہ بھی قریش میں سے ہیں۔ اور اگر چند افراد مراد ہوں تو اس سے بات نہیں بنتی کیونکہ موقعہ اھلوت اور فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمان ہونے والے افراد سے خوف کا اظہار ہے جو نہ ابھی آداب شریعت سے مؤدب ہوئے تھے اور نہ ہی قوت ایمانی ابھی مستحکم ہوئی تھی، اپنے خاص اصحاب اور فقار قدیم سے آپ کو کوئی خوف نہ تھا۔

اب یہی تقیہ کی بات تو وہ تبلیغی امور احکام شرعی اور واجبات میں ثابت کرنا چاہیے، دنیوی مصالح اور عارات کی شکستہ و ریخت میں بات بنتی نہیں۔ اگرچہ وہ عمارت کعبہ شریف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ عمل بالاتفاق ناممور باللہ ہے اور نہ واجب۔ اور پھر حدیث میں اھلوت خوف ہے اور خوف سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز واقع بھی ہو جائے۔ لہذا اس حدیث کے ساتھ تمام اصحاب پر طعن کرنا اور خصوصاً ان پر جو یہاں زیر بحث مسئلہ میں سخت بددیانتی کے ساتھ تعصب و عناد کا گھناؤنا مظاہرہ بھی ہے۔

گیارہواں باب

مخصوصیات مذہب شیعہ

اہل سنت رحمہم اللہ نے نبی کد و کاوش اور تلاش و جستجو اور تفتیش و تحقیق سے اس فرقے کے پانچ ایسے خواص معلوم کئے جو کسی دوسرے اسلامی فرقے میں نہیں ملتے، ملتے ہیں تو شان و نادر اور وہ بھی شیعوں کے میل ملاپ کا اثر ہوتا ہے وہ خواص خمسہ یہ ہیں۔

(۱) اوہام (۲) عادات (۳) غلو (۴) تعصبات اور (۵) ہفوات، اول تو آپ ان خواص خمسہ کے معنی ذہن نشین کر لیں اسکے بعد بطور نمونہ ہر ایک سے کچھ ذکر کیا جائے گا انشاء اللہ۔

الف :- عادات :- وہ ہیں جو ان کے عوام و خواص میں بلا ان کے علماء کی تصریح و تذکرہ شہرت رکھتی ہیں۔ ان عادات کا ذکر نہ انکی کتابوں میں ہے نہ ان کے علماء نے تصریح کر کے کوئی مذہبی ثبوت پیش کیا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ کے خوارق کا انکار، با تم، توحہ، شیعون، تصویر سازی، تربت نوازی، بموقعہ ایم عاشورہ، ان باتوں کے متعلق عبادت کا گمان رکھنا اور یہ عقیدہ تسلیم کرنا کہ اس سے تمام سال کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور بابا شہباز الدین کے عید کے دن آنے کا پستلہ بشکل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بنانا اسکے پیٹ میں شہید ڈالنا اور اسکو قتل کر ڈالنا اور اس شہید کو ملی جانا۔ دوشنبہ کے دن کو منہوس سمبھنا، چاند کے عدد سے الرجب ہونا، بارہ کے عدد کو مبارک جاننا اور اسی طرح کی عادتیں۔

اس فرقہ کی یہ عادات اسلیئے قابلِ محرف نہیں کہ ہر فرقہ نے اپنے لیے کچھ عادات کچھ رسوم، کچھ بدعات گھڑ رکھی ہیں۔ لیکن چونکہ اس فرقہ کے علماء و خواص ان امور سے انکار رکھتے اور انہیں خلاف کتاب اللہ جانتے ہیں تو ان سے اکثر ساقط ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی اس کتاب میں انکی ان عادات کو نظر انداز کیا ہے، اسے موضوع بحث نہیں بنایا، البتہ انکی بعض عادات جو علمی انداز میں پیش کی جاتی ہیں اگرچہ بحالہ کتب اور بلحاظ قرداء علماء ان کا ثبوت نہیں، ہم نے باب فقہ میں انکا ذکر کیا ہے، مثلاً جمعہ اور جماعات کا ترک، وضو میں پاؤں کا مسح کرنا، مونروں پر مسح ترک کرنے کو سنت بتانا، تراویح کو ترک کرنا، دسریں و طلی کرنا، اور متعہ کو افضل عبادات جانتا،

ب :- ہفوت :- یہ ہے کہ اپنے مذہب کی حفاظت کی خاطر یا مخالف مذہب کو شکست دینے کی غرض سے جس عقل صریح، اور تواضع کے خلاف کسی امر کا ارتکاب کیا جائے۔

ج :- غلو :- یہ ہے کہ جو بات اپنے نزدیک ثابت نہ ہو وہ اپنے محبوب افراد کے ساتھ انتہائی محبت و عقیدت کے پیش نظر وہ بات انکے لیے ثابت کرتے ہیں، یا جو چیز خود کے نزدیک ثابت ہے انکے بارے میں اس سے انکار کر دیتے ہیں۔

د :- تعصب :- یہ ہے کہ جن افراد سے انکو انتہائی بغض ہے انکے بارے میں منفی شئی کو ثابت اور ثابت کو منفی بتاتے اور ثابت کرتے ہیں، گویا غلو اور تعصب دونوں ایک ہی تھیلی کے دو چٹے بٹے ہیں۔ کیونکہ ہر دور میں اپنے مسلک کی نفی اور اپنے منکرات کی تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب یہ عمل اپنی محبوب شخصیات کے لیے ہو

تو وہ غلو ہوتا ہے اور مبغوض شخصیت کیلئے ہو تو اسے تعصب کہتے ہیں اور یہ دونوں عادتیں نص قرآنی کے مطابق حرام ہیں۔

(۱) يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا
حَلٰلُ اللّٰهِ اِلَّا الْحَقُّ - اے اہل کتاب اپنے دین میں غلومت کرو اور اللہ تعالیٰ کی نسبت حق بات ہی منہ سے نکالو۔

(۲) يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ
اے اہل کتاب گواہی دیدینے کے بعد تم اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو۔

اسی باعث اس کتاب میں غلو و تعصب کو ایک ہی فصل کے تحت بیان کیا ہے اور شہرت کی بنا پر غلو کو بھی تعصب کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اور اوہام چونکہ گراہی کی جڑ اور بنیاد ہوتے ہیں، اس لیے انکو مستقل فصل میں سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ باب تین فصلوں پر مرتب کیا گیا ہے۔

(۱) فصل اوہام (۲) فصل تعصبات (۳) فصل نفقات۔

پہلی فصل

شیعی اوہام

واضح رہے کہ عقل کے تفکر میں زیادہ تر غلطی غلبہ و ہم سے ہوتی ہے اسی لیے ہر اس فرقہ کا جس پر اوہام غالب ہوں عقل اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً تپے اور عورتیں اسی لیے بچوں کے نزدیک لکڑی کا ہر گھوڑا دوڑنے والا ہوتا ہے اور قالین کا شیر پھاڑنے والا ہوتا ہے۔ اور عورتوں کے نزدیک ہر بیماری کا سبب اوپری پرانی یا سیاہ آسید یا شیخ سرد کا دخل ہوتا ہے۔ لکن نزدیک شادی وغنی کی مقررہ رسمیں چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شرعی حکم چھوڑنا۔ اور وہ اسے باعتبار عقل محال سمجھتی ہیں اور اچھے برے شکون لینا، فال نکالنا انکے نزدیک وحی منزل من اللہ کا حکم رکھتی ہے۔ لہذا جب شیعہ مذہب لائل میں وہم کا غلبہ ہوا تو انکی عقل پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اسی لیے سلف نے فیصلہ دیا کہ شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں۔

اب ان کے اوہام کی تفصیل سننے سے پہلے یہ اور جان لیجئے کہ وہم کا عقل پر غلبہ مطالب حق و صحیحہ کی دریافت میں چند انواع و طرق سے ہوتا ہے۔

نوع اول :- یہ کہ عقل حکم جزئی (خصوصی) کو کلی (عام) جاتی ہے مثلاً یہ کہ ہر مخالف دشمن ہے اب یہاں غلطی کا منشا یہ ہے کہ بجائے اسکے کہ اسکے عکس کو کلی مانیں جو حقیقت میں ہے بھی۔ یہ وہم میں پڑ کر اس کو کلی تسلیم کر لیتے ہیں۔ اہل بیت اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں شیعوں کو یہی غلطی لاحق ہوئی بلکہ اہلسنت اور اہل بیت کے حق میں بھی کہ صحابہ اور اہل سنت کے بیشتر فقہی مسائل کو امامت سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اہل بیت سے مخالف پایا تو یہ حکم لگا بیٹھے کہ انکو اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے حالانکہ باعتبار عقل مخالفت کو عداوت کہنا ہرگز صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر ایک ہی مقصد کے طالب حصول مقصد کیلئے جدا راستوں پر گامزن ہوں تو انہیں باہم دشمن نہیں کہتے چنانچہ فقہیہ امام اعظم اہلسنت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ

علیہ کے شاگرد قاضی ابویوسف و امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ جانے بہت سے مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف کیلئے۔ اب کون عقلمند انکو اپنے استاد کا دشمن کہے یا مانے گا۔

اسی قاعدہ سے بہت سی شاخیں پھولتی ہیں۔ مثلاً اگر باہم دو شخص کسی معاملہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں یا ایک دوسرے کے کسی مشورہ و اجتہاد میں کوئی غلطی پکڑتا ہے تو وہ اسکا دشمن ہے۔ اسی لیے جناب امیر کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی بعض باتوں کو ناپسند کرنا۔ یا ان کے بعض اجتہادی مسائل میں انکو خطا کا ٹھہرانا شیعوں کے نزدیک دشمنی کی کھلی اور صاف دلیل ہے۔ اسی طرح جناب صدیقہ رضی اللہ عنہما کا قصاص عثمان میں تاخیر کو نظر انکار دیکھنے کو یہ لوگ دشمنی پر فہمول کرتے ہیں۔ تو جب اصل ہی غلط ہے اس سے جو شاخیں نکلیں گی وہ سب ہی غلط ہوں گی۔ حالانکہ کتب شیعہ میں اسی اصل کے خلاف ثابت ہے۔ ابو مخنف جناب حسین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کو ناپسند فرماتے تھے اور جب کو جناب حسن رضی اللہ عنہ کی غلطی اور خطا قرار دیتے تھے۔

لہذا اگر انکی تسکیم کردہ اصل کے مطابق کسی بات کا ناپسند کرنا یا اسکو خطا ٹھہرانا عداوت پر مبنی ہو تو لازم آتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جناب حسن رضی اللہ عنہ کے دشمن ہوں ایسا اعتقاد کفر و صریح کی طرف لے جاسکتا ہے۔ دوسری نوع :- حصہ کے صیغہ کو اگر ہم اپنی طرف سے بڑھاتے ہیں کہ نتیجہ غلط نکلتے اور شیعوں کے اکثر دلائل اسی نوع کے ہیں جس کا نمونہ باب امامت میں گذر چکا۔ مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ، عالم تھے، شجاع تھے اور متقی تھے اور جو ان اوصاف کا حامل ہوا امام وہی ہے دوسرا نہیں۔ حالانکہ صغریٰ میں حصہ بالکل نہیں۔ اور یہ غلطی اس لیے ہے کہ ہر دو مقدمات میں حد واسطہ پوری پوری مکر نہیں آئی۔ حالانکہ نتیجہ نکالنے کیلئے حد واسطہ کا مکرر آنا شرط ہے، لیکن وہم جو معانی کی قیودات کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر و عاجز ہوتا ہے وہ اس سے غافل رہ کر سمجھ بیٹھتا ہے کہ شاید اس میں حد واسطہ مکرر آگئی ہے چنانچہ یہ دلیل بھی اسی نوع اور قبیل کی ہے کہ جناب امیر واجب الاطاعت ہیں اور جو واجب الاطاعت ہو وہی امام ہے وغیرہ وغیرہ۔

تیسری نوع :- یہ کہ مطلوب کچھ اور ہوتا ہے اور نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے لیکن چونکہ ان دونوں میں قرب اور نزدیکی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہم سمجھ بیٹھتا ہے کہ مطلوب حاصل ہو گیا اسی وجہ سے شیعوں کے اکثر دلائل نامکمل و ناتمام ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے مباحث امامت میں اسکی بحث گذر چکی ہے۔ مثلاً یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ مدینۃ العلم کے دروازہ ہیں اور جو مدینۃ العلم کا دروازہ ہوا امام ہے۔ وہم نے سمجھا کہ امام چونکہ رئیس امت ہے اور دروازہ بھی گھر کی ریاست کسی نہ کسی وجہ سے رکھتا ہے پس جناب امیر رضی اللہ عنہ جب دروازہ ہوئے تو امام بھی ہوئے حالانکہ مدینۃ العلم کا دروازہ ہونا کچھ اور ہے اور امام ہونا کچھ اور۔ ان میں آپس میں نہ اتحاد ہے نہ لزوم۔

چوتھی نوع :- یہ مصداق بر مطلوب کی شکل میں ہوتا ہے کہ وہم لفظ یا مفہوم کے تغیر کی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ دلیل کا مقدمہ کچھ اور ہے اور مطلوب کچھ اور میں نے ایک کو دوسرے سے ثابت کر دیا حالانکہ عقل و دلوں کو ایک جاتی یا ایک ذات سمجھتی ہے لہذا اسکو ثابت کرنا اثبات الشئ لنفسہ کا مصداق ہے۔ مثلاً شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اولیٰ بالتصرف ہیں اور جو اولیٰ بالتصرف ہو وہ امام ہے حالانکہ

اما کے اصل معنی ہی "اولی بتصرف عام" کے ہیں لہذا اگر واسطہ ایک ہی چیز ہوئے۔ اور صغریٰ اور مطلوب بلحاظ معنی ایک قضیہ اگرچہ لفظ میں تغائر ہو۔

اور مصداقیت کی ایک قسم یہ ہے کہ دلیل کے مقدمات مطلوب سے زیادہ واضح نہ ہوں بلکہ مقابل نزدیک پوشیدہ اور قابل منع ہو مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ معصوم ہیں اور امام معصوم ہوتا ہے اہلسنت کے نزدیک جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت تو ہر حال کسی نہ کسی وقت ثابت ہے لیکن معصومیت وہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ مانتے ہیں۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کسی وقت بھی معصوم نہیں جانتے محفوظ سمجھتے ہیں۔ آپ کی امامت کو ثابت کرنے والی دلیلیں بڑی واضح اور مضبوط ہیں۔ مگر آپ کی عصمت ثابت کرنے والے دلائل خدشہ اور قباحت سے خالی نہیں۔

پانچویں نوع :- لفظی اشتراک کی غلطی ہے۔ یعنی دو چیزوں پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں اور اس چیز کا حکم دوسری چیز کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً بنی ترویل شریعت اور وحی میں امام ہے۔ اور بنی کا خلیفہ بھی حکم و احکام صلح و جنگ میں امام ہے۔ لہذا جب بنی معصوم ہوگا تو خلیفہ بھی معصوم ہوگا۔ حالانکہ امام کا اطلاق بنی پر کسی اور محض کے لحاظ سے ہے اور خلیفہ پر دوسرے معنی سے۔

نہوی توجیہات میں اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے مثلاً کہتے ہیں وہمداکعون ویؤتون الزکوۃ سے حل واقع ہوا ہے تو چاہتے کہ ایثار الزکوۃ سے مقارن ہو حالانکہ وہ یقیمون الصلوۃ سے حل ہے تاکہ صلوۃ یہود سے احتراز ہو جائے۔ غلط جواز بھی اسی قبیل سے ہے یعنی بطور مجاز ایک چیز پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں پھر حقیقی معنی کے لازم کو اس چیز کیلئے ثابت کرتے مثلاً بعض روافض کہتے ہیں کہ اللہ نور ہے اور ہر نور محسوس ہے تو اللہ بھی محسوس ہے چنانچہ ہشام بن حکم اور ان کے دوسرے پیشواؤں کا یہی مذہب ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات پر نور کا اطلاق ہر بنائے مجاز ہے اور محسوسیت حقیقی معنی کا لازم ہے مجازی معنی کا نہیں۔ یا مثلاً کہتے ہیں کہ غیثی رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے نفس نبی فرمایا اور نفس نبی معصوم ہوتا ہے، واجب الاطاعت ہوتا ہے، اور اولی بتصرف، اور تمام مخلوق و انبیاء سے افضل۔ تو یہ تمام امور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت کرتے ہیں حالانکہ آپ کو نفس نبی مجازاً فرمایا گیا اور مجاز پر حقیقت کا حکم مرتب نہیں ہوتا ورنہ بہادر کو شیر کہنا اس سے انسانیت سلب کرنا ہوگا۔

چھٹی نوع :- ایہام العکس کی ہے یعنی ایک سچا مقدمہ عقل کے ہاتھ لگتا ہے اور وہم اسکے عکس کو بھی کلیہ صادقہ سمجھ بیٹھتا ہے اور اس سے دلیلوں میں کام نکالتا ہے مثلاً یہ کہ ہر انسان معصوم قابل امامت ہے یہ ایک سچا مقدمہ ہے مگر وہم نے اسکا عکس تراش لیا کہ ہر قابل امامت معصوم ہے۔ حالانکہ منطقوں کے نزدیک یہ بات طے اور ثابت ہے کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ نہیں آتا۔

ساتویں نوع :- اغفال اللزوم کی۔ ہے یعنی حکم ملزوم لازم اعم کو دیتے ہیں اور یوں غلطی میں پڑ جاتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ بنی کیلئے عصمت اس لیے ضروری ہے کہ وہ امت کی ریاست کا مالک ہوتا ہے تو جو بھی ریاست ہو گا وہ معصوم ہوگا حالانکہ بنی کی عصمت معجزہ کی تصدیق کے سبب سے ریاست کے باعث نہیں۔ اور یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سورہ برآۃ کی تبلیغ سے معزول کرنا اسی سبب سے تھا کہ آپ نیابت پیغمبر کے قابل نہ تھے تو پھر

آپ کسی نیابت کے قابل نہ رہے انکا ایسا کہنا بھی اسی قبیل سے ہے اس لیے کہ آپ کا یہ عزل عادت کے مطابق تھا جو ان کے ہاں نقص عہد کے وقت جاری تھی اور اسی زمرہ میں ہے انکا یہ کہنا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ اہل بیت میں سے نہیں تھے کہ انکو حق خلافت پہنچتا۔ اسلیے وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرنے کے معاملہ میں خطا کرتے تھے۔ گویا کہتے ہیں کہ اہل بیت کے مقابلہ میں ہر صحابی کو دعوائے خلافت کا حق نہیں اور بھی اسی طرح کے اقوال ہیں۔ جو اغفال اللزوم کے زمرہ میں آتے ہیں۔

آٹھویں نوع :- یہ دو متنافی اشیا کا دو وقت میں بھی ہونا محال قرار دیتے ہیں۔ اور انکی یہ غلطی زمانے سے غفلت پر مبنی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ خلفا ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کسی نہ کسی زمانہ میں کافر تھے اور کافر قابل امامت نہیں حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ دو متنافی چیزوں کا ایک وقت میں جمع ہونا تو محال ہے مگر ایک ذات میں دو وقتوں میں جمع محال نہیں مثلاً سونا، جاکنا، گرمی، سردی وغیرہ وغیرہ۔

نہویں نوع :- قوۃ کو فعل کی جگہ استعمال کر لینا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی امام تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "انت منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ" جو نسبت ہارون کی موسیٰ سے تھی وہی نسبت تم کو مجھ سے ہے (اسلیے اگر آپ بلا فصل امام نہ ہوں تو آپ کا عزل لازم آتا ہے۔ اور امام کا معزول ہونا جائز نہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور امام بالقوہ تھے امام بالفعل نہ تھے۔ اور امام بالقوہ کو جب ان سے قابل ترجیح افراد کی موجودگی کے سبب مقرر ہی نہیں کیا گیا تو عزل کا کیا سول۔ دسویں نوع :- جز کو کل کی جگہ لے لینا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اولاد پیغمبر جزو پیغمبر ہیں اور پیغمبر معصوم ہیں۔ لہذا اولاد بھی معصوم ہے حالانکہ معصوم پیغمبر کی مکمل شخصیت ہے اسکا کوئی جز نہیں اور اسی میں غلط مجاز کی شکل بھی موجود ہے اس لیے کہ اولاد جز حقیقی نہیں ہوتی۔

گیارہویں نوع :- یہ کہ عرض کو ذات کی جگہ لے لینا اور تابع کو متبع کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ امام نائب پیغمبر ہوتا ہے تبلیغ کے معاملہ میں۔ تو وہ احکام کا اسی طرح مبلغ ہو گا جس طرح بنی اور پیغمبر۔ اور پیغمبر معصوم ہے تو چاہئے کہ امام بھی معصوم ہو۔ حالانکہ یہ نہیں دیکھتے کہ پیغمبر مبلغ بالذات ہے اور امام مبلغ بالتبع ہے اور عصمت مبلغ بالذات کا خاصہ ہے اور اسی قبیل سے وہ بات ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس امت کا امام نائب پیغمبر ہے جو تمام پیغمبروں سے بہتر ہیں لہذا امام کو بھی تمام پیغمبروں سے بہتر ہونا چاہئے حالانکہ نائب شخص کو تمام صفات میں اس شخص کا حکم نہیں ملتا۔

(جب وہ نائب پیغمبر ہونے کے باوجود پیغمبر کے مرتبہ پر نہیں تو تمام پیغمبروں سے افضل ہونا تو بعد کی بات ہے۔)

باسا ہویں نوع :- یہ ہے کہ ایک لازم مشترک میں شریک دو چیزوں کے اتحاد کا حکم لگانا مثلاً مشیر مکرہ (منع کرنے والا ہے) کیونکہ جس معاملہ میں مشورہ ہو یا جس میں مجبور کیا گیا۔ دونوں کی رضامندی کو دخل ہے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب قصہ قرطاس میں مشیر ہوئے تو مکرہ بھی ہوئے اور جو بنی کو کسی چیز پر مجبور کرے وہ مکرہ گناہ ہے حالانکہ مشورہ دینے اور مجبور کرنے میں عقل کے نزدیک فرق ظاہر ہے اگرچہ وہ اسکا یقین نہ کرے اسی لیے بچے عورتیں اور نادان مشیر کو بھی مکرہ کی طرح ملامت کرتے ہیں۔

تیسرے ہویں نوع :- یہ کہ عدم ملکہ کو ایجاب و سلب کی جگہ جانتا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جب خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم معصوم نہ تھے تو فاسق ہونے حالانکہ عصمت نہ ہونے سے فسق لازم نہیں آتا کیونکہ ان کے درمیان محفوظ کا ایک واسطہ ہے۔

چودھویں نوع :- یہ کہ مجموعی کل کو افرادی کل کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ ہر صحابی معصوم نہ تھا تو گویا کل صحابہ بھی معصوم نہ ہوئے اس لیے انکا اجماع خطا کا احتمال رکھے گا۔ حالانکہ مجموعی کل اور افرادی کل کے احکام میں بہت فرق ہے مثلاً ہر انسان اس گھر میں سما سکتا ہے اور یہ روٹی اس کا پیٹ بھر سکتی ہے مگر سب انسان نہ اس گھر میں سما سکتے ہیں اور نہ یہ روٹی سب کا پیٹ بھر سکتی ہے

پندرہویں نوع :- یہ کہ نئی نئی مثالوں کو ایک خاص چیز جانتا اور اس قسم کا وہم کہ ضرور عقل والوں پر غلبہ کرتا ہے یہاں تک کہ دریا کے پانی، چراغ کے شعلے اور فوارہ کے پانی کو اکثر اشخاص ایک پانی اور ایک شعلہ خیال کرتے ہیں اور اکثر شیعہ اپنی عادات میں اس خیال میں منہجک ہیں۔ مثلاً عاشورہ کا دن جو ہر سال آتا ہے اسکو فقہا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن خیال کرتے ہیں اور نوحہ و ماتم، نالہ و شہیون، مگریرہ و زاری، سینہ کوبی و بقراری بالکل ان عورتوں کی طرح شروع کر دیتے ہیں جو ہر سال اپنے مردوں پر کرتی ہیں حالانکہ عقل جانتی اور مانتی ہے کہ زمانہ سیال اور غیر قار ہے اسکے اجزاء کو ہرگز قرار نہیں اور جو معدوم ہو گیا اسکا لوث نا قابل ہے جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اس دن ہوئی تھی جسکو بارہ سو (اور اب چودہ سو) سال کا عرصہ ہوتا ہے اس دن کو آج کے اس دن سے کیا اتحاد اور کونسی مناسبت ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو اسپر اس لیے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں ہر سال و شادمانی کے اسباب ہر سال تازہ اور نئے ہوتے ہیں یعنی رمضان کے روزوں کی اداسگی اور خانہ کعبہ کے حج کعبے کی اداسگی جو نئی نعمت کا شکریہ ہیں جو سال بسال نیا سرور اور نئی فرحت پیدا کرتے ہیں اسی لیے شرعی عیدیں اس وہم فاسد پر مقرر نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ اکثر عقلا نے بھی نوروز و مہرجان اور اس قسم کے دنوں کو عید منایا ہے کہ یہ ہر سال آسمانی تغیرات کے سبب نئی نئی فرحت لاتے ہیں اور نئے نئے احکام کا سبب بنتے ہیں۔

بابا شجاع الدین کی عید، عید غدیر سب اسی خیال فاسد پر مبنی ہیں۔ یہ ہیں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آیت **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** کا دن یا نزول وحی کا پہلا دن، اور شب معراج کو شرعاً عید کیوں قرار نہیں دیا۔ عید الفطر عید النحر کو قرار دیا۔ اسی طرح کسی نبی کے یوم تولد یا یوم وفات کے دن کو عید قرار نہیں دیا۔ اور صوم یوم عاشورہ کو کیوں منسوخ فرمایا جسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سال اول میں یہود کی موافقت میں ادا فرمایا ان سب میں یہی راز کار فرما ہے کہ وہم کو اس میں مداخلت کا موقع نہ ملے۔

سولہویں نوع :- ایک چیز کی صورت (تصویر) کو وہی چیز قرار دینا اور اس قسم کے اوہام نے اکثر بہت پرستوں کی رہنمائی کی اور انکو گمراہی میں مبتلا کیا۔ کس اور نادان بچے بھی اس وہم میں پڑ کر بہت خوش ہوتے ہیں کہ مٹی کے کھلنے ہتھیار گھوڑے بنا کر انہیں اصلی گھوڑے اور ہتھیار سمجھتے ہیں۔ کس بچیاں رنگ برنگ کپڑے پہنا کر انکی شادیاں کرتی اور بہت خوش ہوتی ہیں۔

اس قسم کے وہم کا شیعوں پر تو بہت ہی غلبہ ہے حضرات حسین، جناب امیر، جناب سیدہ رضی اللہ عنہم

کی مصنوعی قبور بناتے ہیں اور حقیقی قبروں کی طرح انہیں مان کر ان کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں سجدے کرتے ہیں، فاتحہ و سلام پہنچاتے ہیں، مورچہ لگس راں اٹھائے مجاوروں کی طرح ان کے پاس کھڑے رہتے ہیں اور خوب داد کفر دیتے ہیں عقل کے نزدیک بچوں کی حرکت اور ان پر میران نابالغ کی حرکات میں کوئی تفاوت اور فرق نہیں۔
 سترہویں نوٹ :- کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے نام سے موسوم کر کے تعظیم یا اہانت، سب و شتم مار پیٹ کا سلوک کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم یہ سلوک اصل شخص سے کر رہے ہیں ان کا یہ وہم پہلے وہم سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

آپ نے بچوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھا یا سنا ہو گا کہ وہ اپنے میں سے کسی کو بادشاہ، کسی کو وزیر، کسی کو چور، کسی کو کوتوال بنا کر باہم اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں شیعہ بھی غم میں یہ ناکہ رچاتے ہیں کسی کا نام یزید، کسی کا شمر، اور بعض خواتین کو خواتین الہیت کا نام دے کر ان سے وہی سلوک کرتے ہیں، جو ان کے نزدیک ہونا چاہئے تھا۔ ان کے اس وہم کو اللہ کی کتاب کی ایک آیت باطل کرنے کیلئے کافی ہے۔

إِنَّ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءُ سَبَّحْنَاهَا أَنْتُمْ ذُنُوبَكُمْ أَلَمْ تَكُونُوا
 مَا آتَزَلَّ اللَّهُ يَهْمَانِ سُلْطَانِ
 اداؤں نے رکھ لیے ہیں بغیر اللہ کی منظوری کے
 ان کی اسی وہم کی پیداوار ان کی یہ حرکت ہے کہ جب کسی کا نام عبد اللہ یا عبد الرحمن دیکھتے ہیں تو اسکی تحقیر و اہانت کرتے ہیں حالانکہ حدیث صحیح میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ناموں میں سے سب سے زیادہ محبوب عبد اللہ و عبد الرحمن ہیں۔

بالکل معمولی اور سامنے کی بات ہے کہ کسی چیز کا نام اس چیز کے خواص و اثرات نہیں رکھتا۔ مثلاً آگ کا نام گرم نہیں۔ پانی کا نام ٹھنڈا نہیں۔ شکر کا نام مٹھاس نہیں اور ایلوے کے نام میں کڑواہٹ نہیں پائی جاتی۔
 اٹھارویں نوٹ :- یہ کہ ظرف کو تناقض کی شرع نہیں جانتے اس وہم نے بھی عوام میں بہت گمراہی پھیلانی ہے اور انہیں راہ راست سے بھٹکایا ہے۔

دو نفیضوں کے دو مختلف ظروف میں جمع ہو جانے کو یہ محال ہی جانتے ہیں۔ چنانچہ مسئلہ اجتہاد میں شیعہ اسی وہم میں گرفتار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر امام خدا کی جانب سے مقرر نہ ہوا اور ایسے احکام جن پر نص شرعی نہ ہو اگر وہ مجتہدین کی رائے سے واجب ہوں تو اجتماع نفیض لازم آئے گا کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اگر ایک چیز کو حلال قرار دیا ہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسکو حرام قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ صاف بات ہے کہ جب جتنے کاظمی مختلف ہوں تو اجتماع نفیضین کہاں ہوا دونوں کا ظن ایک ہونا اور احکام مختلف تو کہاں جاسکتا تھا۔
 ہر شخص جانتا ہے کہ محمود کے گمان میں حلد کھڑا کیجئے مگر احمد کے گمان میں کھڑا ہوا نہیں ہے تو اسمیں نفیض کہاں اور یہ باہم تناقض کیسے ہوئے۔

یہاں بھی غیر منصوصات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم متعین نہیں بلکہ ہر شخص کے لیے وہی حکم متعین ہے جو اسکے یا پیشواؤں کے اجتہاد کے مطابق ہو اور اختلاف امتی رحمۃ کے یہی معنی ہیں۔
 انیسویں نوٹ :- یہ کہ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ تشبیہ دینے میں مشبہ اور مشبہ بہ میں پوری پوری

مسادات کا سلب جانتا۔

یہ وہم کس بجوں کو لاحق ہوتا ہے تمیز دار اور شعور رکھنے والے لڑکوں کو نہیں شیعوں کو یہ وہم بہت ہوتا رہتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو زبدہ تقویٰ، علم اور علم میں جب اولوالعزم انبیاء علیہم السلام سے تشبیہ دی ہے تو امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو ان انبیاء اولوالعزم کے برابر ہونا چاہئے اور جو اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے برابر ہو گا وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے افضل ہو گا اب ایسی لمبدر بات کا کوئی کیا جواب دے۔

بیسویں نمونہ :- یہ کہ عادیات کو اولیات کے بجائے لاتے ہیں۔ یہ وہم اکثر گمراہ فرقوں کو لگا ہے اور بڑے بڑے اہل علم اس بھنور میں غوطے کھاتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ریاست اسکی اولاد اور اسکے خاندان میں چلتی ہے اور دلیل یہ کہ قیصر و کسری کے ہاں یہی ہوتا تھا۔ اور زینداروں یا راجپوتوں میں اسی کے مطابق عمل ہوتا ہے داماد کے ہوتے ہوئے خسر کو ریاست کا حق نہیں پہنچتا۔

اسی وہم کے مقابلہ میں اسی جنس کا ایک دوسرا وہم بھی ہے یعنی کہ انسان کے مرنے کے بعد ریاست کے اختیارات اسکی بیوی کے سپرد ہیں اور اگر اسکی کئی بیویاں ہوں تو جو بیوی اسکی خاص ہو اور جو کنوار پنے کی حالت میں اسکی بیوی بنی ہو امامت کا معاملہ اسکے ہاتھ میں ہے۔ نہ اس مسئلہ میں لڑکی کو کوئی دخل ہے نہ داماد کو۔

بہر حال عقل کے نزدیک دونوں وہم فاسد اور غلط ہیں شرع میں عہدہ اور ریاست ورثہ میں شمار نہیں۔ قابلیت، صلاحیت لیاقت یا صاحب ریاست کے اشارہ پر ترجیح کا دار و مدار ہے۔

اکیسویں نمونہ :- غائب کو نظر آنے والی چیز پر قیاس کرنا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ اور پیغمبر علیہ السلام کو مخلوق اور امت پر قیاس کرنا اس سخت بیماری نے بھی بہت سوں کے عقائد خراب کئے ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے الہیات و معاد کے اکثر مسائل اسی اصل پر موقوف ہیں خصوصاً وجوب اصلح و لطف اور وجوب عدل اور مطیع کو ثواب دینا اور عاصی کو عذاب وغیرہ اس وہم سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے گزشتہ ابواب میں ان کا بیان گذر چکا ہے۔

بائیسویں نمونہ :- ترک اضافات یعنی یہ کہ ایک چیز کو چند چیزوں سے دو تین نسبتیں حاصل ہوں ایک نسبت کوئی حکم چاہتی ہو دوسری کچھ اور اب ان میں سے ایک کا لحاظ کریں اور باقی کو نظر انداز کر دیں امامیہ کے یہ وہم اکثر مسائل میں لاحق ہوا ہے مثلاً کہتے ہیں کہ امامت چونکہ نبی کی نیابت ہے اسلیئے وہ نبی کی اجازت پر موقوف ہوگی لہذا امام کی امامت پر نفس ہونا واجب ہوا۔ حالانکہ امامت ریاست امت ہے اور انہیں کے اختیار پر موقوف ہے۔ تو اس لحاظ سے امام کا منصوب علیہ ہونا ضروری نہیں یا مثلاً کہتے ہیں کہ امیر سے محبت کرنا واجب ہے جبکہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اسے پرغاش رکھی لہذا وہ واجب البغض ہوتیں حالانکہ اسکا یہ پہلو بھی تو ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام واجب المحبت ہیں اور ام المؤمنین آپ کی محبوب زوجہ لہذا وہ واجب المحبت ہوتیں۔

اس قسم کا وہم ان کے تمام معتقدات میں گھسا ہوا ہے۔ اور حفظت شیا و غایت عنک اشیاء (ایک چیز زیادہ گئی اور باقی ساری چیزیں تیری نظر سے غائب ہو گئیں) کی پرانی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ وہم کے سوا نکتہ سب کچھ بھول گیا۔

دوسری فصل

شیعی تعصبات

واضح رہے کہ تعصب اسے کہتے ہیں کہ ایک چیز اپنے نزدیک دلیل قطعی سے ثابت ہے مگر مخالف کے مقابلہ میں اسکا انکار کر دیا جائے اور جو چیز اپنے نزدیک قابل انکار ہے اسی چیز سے فریق مخالف پر الزام رکھنا گویا مخالف بھی نفی و اثبات میں خود کے موافق ہو ورنہ اگر وہ موافق نہ ہوگا تو وہ دلیل الزامی ہوگی۔ تعصب نہ ہوگا اور چونکہ درحقیقت غلو بھی یہی ہے کہ منفی کاثبات کیا جائے اور مثبت کی نفی کی جائے۔ محض شدت محبت کے سبب تو اسے بھی تعصب میں شمار کیا گیا ہے۔ اس فصل میں اسکا بھی ذکر ہوگا مگر عنوان کلام ہر دور میں تعصب ہی رہے گا۔

تعصب (۱) ۱۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ سے آفتاب سے زیادہ روشن دلائل جو اہل بیت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر اہل سنت کے ہاں مروی ہیں انکے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو ان سے صاف انکار کر دیتے ہیں اور وہ ایسی تباہی روایات جو ان کے مخدوم و مطعون اور غیر معتبر راویوں سے طریق قوم کے موافق امامیہ سے منقول ہیں انکو قبول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام جس کی روایت کرے وہ موجب علم و عمل ہے اگرچہ اسکی اسناد میں جھول، ضعیف، جھوٹے اور وضع راوی ہی کیوں نہ ہوں اور اہل سنت کی مرویات چاہے قدر راویوں سے ہوں واجب الرد اور انکار کے قابل ہیں۔ حالانکہ باب اخبار میں انکے تمام علماء یہی کہتے ہیں کہ موثق روایت ضعیف سے مقدم ہے، بہتر اور معتبر ہے، اور ثقات اہل سنت کی روایات بلاشبہ ان کے نزدیک موثق ہیں۔

تعصب کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان خفی الدالات آیات کو نص صریح جاتے ہیں جو قواعد و اصول عربیت کے موافق انکے مدعا پر ہرگز دلالت نہیں کریں اور نصوص صریحہ کو متشابہات سمجھتے ہیں جو اہل سنت کے مذہب پر صحیح دلالت کرتی ہیں۔

حالانکہ اس سلسلہ میں انکے علماء کا اس طور بار بار امتحان بھی ہوا کہ بعض کافر و ذمی لوگوں کو جو نہ کسی مذہب سے سروکار رکھتے تھے، اور اہل مذاہب سے انکا کوئی تعلق نہیں تھا، لغت عربی کی تعلیم یا ترجمہ تحت اللفظ سیکھنے پر جب انکو وہ آیات سن کر پوچھا گیا کہ تم ان سے کیا سمجھتے تو انہوں نے بلا توقف اہل سنت کے مدعا پر گواہی دی شیعہ مدعا اس آیت سے نہ انکے سمجھ میں آیا اور نہ اس پر انہیں یقین آیا۔

تعصب (۲) ۲۔ حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب علی رضی اللہ عنہ کو برابر جانتے ہیں حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام مخلوقات پر افضلیت خود انکے نزدیک بھی بتواتر منقول ہے

تعصب (۳) ۳۔ علیؑ کی محبت جسکے دل میں ہوگی خواہ وہ کافر و مشرک ہو، یہودی و نصرانی ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور جو دل میں صحابہ کی دوستی رکھے خواہ عابد و متقی ہو اور اہل بیت سے بھی محبت رکھتا ہو پھر بھی وہ دوزخی ہے۔

چنانچہ رضی الدین لغوی شیعہ نے اپنے چند شعروں میں زینبنا بن اسحاق نصرانی کے بہشتی ہونے کا حکم لگایا ہے حالانکہ اس نے جناب ابو بکرؓ و عمرؓ کو برا نہیں کہا ہے۔

ابیات

عَلَيْهِ وَتَمِيمٌ لَا أَحَادُ ذَكَرَهُمْ بِسُورَةٍ وَكُنِيَ مُجِدِّ لَهَا شَيْخٌ
وَمَا يَغْتَرِبُنِي فِي عَلِيٍّ وَأَهْلِهِ إِذَا ذُكِرُوا فِي اللَّهِ لَوْ مَتَّ لَا يَحْمِلُ
يَقُولُونَ مَا بَالُ النَّصَارَى يُحِبُّهُمْ وَأَهْلُ النَّهْلِ مِنْ أَهْرَبٍ وَأَعْلَمِ
فَقُلْتُ لَهُمْ إِنِّي لَأَحْسِبُ حُبَّهُمْ سَرَى فِي قُلُوبِ الْعُلَنَ حَتَّى الْهَائِمِ

ترجمہ: ۱۔ میں عدی و تميم (ابو بکر و عمر کے قبیلے) کا ذکر برائی سے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کرتا۔ لیکن میں بنی ہاشم سے محبت رکھتا ہوں۔ اور جب دین خدا میں علیؓ اور اس کے گھرانے کا ذکر کیا جائے تو مجھے ملامت گھر کی ملامت نہیں چھوٹی۔ کہتے ہیں کہ اس کا کیا سبب ہے عرب و عجم اور نصاریٰ کے عقلمندان سے محبت کرتے ہیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ اتنی محبت انسانوں کے دلوں میں کیا بہانہ کے دلوں تک میں اثر کر گئی ہے۔ اور ابن فضلون یہودی کو تو ان کے علماء ان دو تین بیعتوں کی وجہ سے بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

نَهَى هَبْنِي مِنَ الْبَيْتَةِ سُورِي | وَأَهْلُ عَنِّي بَعَثَ إِلَى الرَّسُولِ
وَأَسْقِنِي شَرِبْتُ بَيْتَهُ عَلَى | سَيِّدِ الْأَوْلِيَاءِ بَعْلُ بُشُولِ

ترجمہ: ۲۔ میرے پروردگار میرا جنت کا سوال پوچھا۔ اور اہل رسول کے طفیل میرے گناہ بخش دے۔ اور علیؓ کے ہاتھ سے مجھے پانی پلا جو ولیوں کے سردار اور شوہر بتول ہیں۔

حالانکہ حضرت علیؓ اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی محبت انکی مدح گوئی، منقبت خوانی بالاجمل موجب اجر و ثواب اور ایک طرح کی عبادت ہے مگر تمام قابلِ اجر و ثواب اعمال میں قبولیت کیلئے ایمان شرط اول ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ | اور جو اچھے کام کرتا ہے بشرطیکہ وہ مؤمن بھی ہو تو اسکی سَخِيهِ وَإِنَّا لَنَاصِرُونَ۔

جب محبوبِ خدا پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی آپ کے لئے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر کافروں پر اثر انداز نہ ہوئی۔ تو جناب امیر و اہل بیت رضوان اللہ عنہم جو بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروار و تابع دار ہیں۔ تو انکی محبت کافر کے حق میں کیسے کارگر ہو سکتی ہے۔ اور پھر کافروں کی دوزخ سے رہائی اور بہشت میں انکا دخول خود ان شیعوں کے نزدیک باطل و محال ہے خواہ وہ کتنے بھی اعمالِ خیر کیوں نہ کر لیں۔ اور اہل ایمان خواہ کس قدر بھی گناہ نہ رکھتے ہوں انکے نزدیک بہشت میں ضرور داخل ہونگے صحابہ سے محبت زیادہ سے زیادہ معصیت اور گناہ کبیرہ ہی ہوگی تو اہل سنت انکی دوستی کی وجہ سے بہشت سے کیوں محروم رہیں گے۔ حالانکہ وہ اہل بیت کرام سے بھی بلاشبہ محبت رکھتے ہیں۔ اور جب اہل بیت کی محبت کافر کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا سکتی ہے تو اہل سنت جو صرف صحابہ سے دوستی رکھنے کے مرتکب ہیں دوزخ سے خلاصی پا کر جنت

میں کیوں داخل نہ ہوں۔

تعصب (۴) :- یہ ہے کہ کہتے ہیں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے ہوئے کوئی معصیت فرم نہیں پہنچاتی حالانکہ یہ بات لصوص قرآنی کے خلاف ہے مثلاً مَنْ یَعْمَلْ سُوًّا ثُمَّ یُجْزِ بِہَا (جو بڑا کام کریگا اسکا بدلہ پائے گا) مَنْ یَعْمَلْ مُثْقَلًا دَمْرًا شَتَلْ یُکَلِّ (جو ذرہ برابر برائی کریگا وہ اس کے آگے اسی کے علاوہ ازیں اس کے خلاف خود انہم کرام رحمہم اللہ سے صحیح روایات مروی ہیں جو کتاب میں بیان ہو چکی ہیں۔

تعصب (۵) :- صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم سے انتہائی بغض و عداوت کی وجہ سے پوری امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان بد بختوں نے "ملعونہ" رکھ دیا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کُنْتُمْ خِزَیْۃً اُمَّتِہِ کو بھی پس پشت پھینک دیا ہے اور اپنے امام جناب حسن مکرمی رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو جو ابن بابویہ نے بسند صحیح اپنی تفسیر میں روایت کی ہے فراموش کر دیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

أَمَّا عَلَیْکُمْ یَا مُؤَسَّی اَنْ فَضَّلَ اُمَّتِہِ مُحَمَّدٍ عَلٰی اے مومن! کیا تم جانتے نہیں کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سَائِرِ الْاُمَمِ کَفَضْلِی عَلٰی خَلْقِ۔

فضیلت میری تمام مخلوق پر۔

اسی طرح آیت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّتًا وَّسَطًا لِّتُکُوْنُوْا شٰہِدًا عَلٰی النَّاسِ بھی انہوں نے نظر انداز کر دی ہے۔

تعصب (۶) :- موجودہ قرآن مجید سے برت ظاہر کرتے ہیں حالانکہ یہ بلاشبہ ان کے انہم حضرات رحمہم اللہ کے نزدیک منقول بالتواتر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دورانِ نماز و خارج نماز بہ نیت عبادت اسکی ہی تلاوت فرماتے تھے اور جناب حسن مکرمی اور دیگر انہم رحمہم اللہ نے اسی قرآن کی تفسیر لکھی اور اسی کی آیات و الفاظ سے اپنے کلام میں دلائل و استشادات پیش کئے۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن منزل نہیں بلکہ یہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا تحریف کردہ ہے کیونکہ انہوں نے ہی اسے جمع کیا اور انہوں نے ہی اسے رواج دیا۔ کوئی حصہ اس بغض و عناد کی نہ

تعصب (۷) :- حضرت عرفان حق رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنے کو ذکر الہی اور تلاوت قرآن سے بڑھ کر جانتے ہیں حالانکہ کسی بھی ملت و شریعت میں بروں کی برائی کا ثواب نہیں مافی گئی چہ جائیکہ وہ ذکر الہی سے زیادہ ثواب کا درجہ رکھے جو باجماع علم و عقل افضل ترین شغل اور احسن ترین عمل ہے (یہ بات بغض و عناد سے الٹی کھوپری میں جڑ پکڑ سکتی ہے اور وہی الیہ الغو و بے ہودہ عقیدہ رکھ سکتے ہیں)

تعصب (۸) :- بڑے بڑے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ازواجِ مطہرات (رضی اللہ عنہن) پر لعنت بھیجنے کو بڑی عبادت شمار کرتے اور بخوشی نمازوں کی طرح اسکو ہمیشہ ادا کرنا فرض خیال کرتے ہیں۔ البوہیل فرعون و عمرو کو جو بلاشبہ خدا اور اسکے رسولوں کے دشمن ہیں کبھی کبھی نہیں کہتے نہ انکی کتابوں میں اسکے متعلق کچھ لکھا ہے انکی کتابوں میں تو یہ لکھا ہے کہ جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر ہر صبح لعنت بھیجنا ستر تکیوں کے برابر ہے مگر البوہیل فرعون و عمرو پر لعنت رتی بھر بھی حسنہ نہیں۔

تعصب (۹) :- بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام کلثوم اور بی بی رقیہ رضی اللہ عنہما کا عقد چوکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا اس لیے ان ہر دو محترمت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے خارج کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں نہیں تھیں۔ بلکہ بعض تو انکو حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں بھی نہیں مانتے کہ کہیں ماں کی طرف سے بی بی زہرا رضی اللہ عنہا سے اشتراک نہ ہو حالانکہ یہ آیت **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ** (اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو کہ تمہارا خلاف ہے) ایک بیٹی کیلئے بات صیغہ جمع کی کیا تک تھی

منہج البلاغہ میں ذکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تغیر سیرت پر ناراض ہوتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے، کہ دامادی کے سبب آپ اس رتبہ تک پہنچے کہ شیخین رضی اللہ عنہما بھی نہ پہنچے تھے، (یہ کن کی دامادی کی طرف اشارہ)

اور دیکھئے ابو جعفر طوسی اپنی کتاب تہذیب میں جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ وہ اپنی دعا میں یہ فرمایا کرتے تھے :-

اللہم صل علی رقیۃ بنت نبیک | اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی رقیہ پر رحمت فرما
اللہم صل علی ام کلثوم بنت نبیک | اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی ام کلثوم پر رحمت فرما۔

کلمین کی روایت بھی ملاحظہ کیجئے۔

نَزَّوَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَدِيجَةً | جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی تو آپ کی عمر پچیس سال تھی تو آپ **وَهُوَ ابْنُ بَضْعٍ وَعِشْرِينَ سَنَةً قَوْلًا لَهَا مِنْهَا قَبْلُ مَبْعُوثَةٍ** کی بعثت سے قبل، قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم **عَلَيْهَا السَّلَامُ الْقَاسِمُ وَرَقِيَّةُ وَزَيْنَبُ وَأُمُّ كُلْثُومٍ** (رضی اللہ عنہم) پیدا ہوئیں، اور بعثت کے بعد طیب، **وَوَلِدُهَا بَعْدَ الْمُبْعَثِ الطَّيِّبُ وَالظَّاهِرُ وَفَاطِمَةُ** اور طاہر، اور فاطمہ رضی اللہ عنہم تولد ہوئے۔

اور دوسری روایت میں اس نے بیان کیا ہے کہ بعثت کے بعد صرف فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی پیدا ہوئیں اور طیب و طاہر رضی اللہ عنہما بعثت سے پہلے پیدا ہوئے، ملا طاہر قزوینی نے شرح میں قصہ کی تفصیل لکھی ہے۔

تعصب (۱۰) :- یہ کہتے ہیں کہ جناب ابو بکر صدیق، عمر فاروق، اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم منافقوں میں سے تھے حالانکہ یہ بات انکے نزدیک ثابت ہے کہ آیت **مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَاتِ مِنَ الطَّيِّبَاتِ** کے ذریعہ مؤمن و منافق باہم میز ہو چکے تھے۔ آخر حیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام مقرر فرمایا حالانکہ منافق کو بالاجماع امام نماز بنانا جائز نہیں اور پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہمیشہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدار میں نماز ادا فرماتے رہے انکے علاوہ جناب ابوذر، سلمان فارسی، مقداد اور جناب عمار رضی اللہ عنہم بھی ان تینوں حضرات کے پیچھے نماز پڑھتے رہے اور کبھی انکی اقتدار سے علیحدہ نہیں ہوئے۔

تعصب (۱۱) :- کہ تمیمی اور عدوی جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دو بت تھے جنکو وہ چھپائے رکھتے

اور انہیں کی عبادت کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بات انہی لوگوں کے نزدیک ثابت ہے کہ جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنی بنایا تھا اور اپنی صاحبزادی کا نکاح کرنا چاہتے تھے۔ اگر اگلی کچھ اس صحیح مان لی جائے تو یہ کہ جناب اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا جو مومنہ تھیں جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ سے انکا نکاح کیسے صحیح ہوا اور جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی ولادت کیسی ہوئی۔ اور غلط ولادت والے کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنی کیسے بنایا اور اپنی بیٹی انکے نکاح میں دینے لاکیں ارادہ کیا ایک معصوم کاتب پرستوں سے اس قسم کے معاملات کرنا کس شرع و منطق کی رو سے صحیح قرار پائے گا۔

تقصیب (۱۲): یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی وہ آیات جو حضرات مہاجرین و انصار خصوصاً حضرت ابو بکر و عمر عثمان و طلحہ و زبیر اور جناب صدیقہ رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئیں سب متشابہات ہیں جنکے معنی کا پتہ نہیں۔ ابن شہر آشوب السردی ماثر ندرانی نے جو اہل عالموں میں سے ہے یہ بات لکھی ہے اور دوسرے بھی اسکے دیکھا دیکھی ہی بیان کر رہے لگے ہیں۔

تعصب (۱۳) :- اہل سنت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے میں حد سے بھی بڑھ جاتے ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے عناد رکھتے ہیں افراط سے کام لیتے ہیں اسی وجہ سے ان حضرات کو نواصب کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اس افتراء و بہتان کا سمبر ابن شہر آشوب نے اپنے سر بیانہا ہے۔ حالانکہ یہی لوگ خود اپنی کتابوں میں اہل سنت کی کتابوں خصوصاً بیہقی ابوالشیخ اور دہلی سے نقل کرتے ہیں۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدٌ حَتَّى
 أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهِ وَيَكُونَ عَدُوًّا أَحَبَّ إِلَيْهِ
 رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفْسُهُ
 اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک میں کسی
 کو اپنی جان سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں وہ مومن نہیں ہوتا
 اور میری عترت بھی اس کو اپنی جان سے زیادہ پیارا نہ
 ہوگا۔

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ اللَّهِ لِمَا يَغْذُّكُمْ مِنْ تَعِيمِهِ وَأَحَبُّوهُ لِعَبِّ اللَّهِ وَأَحَبُّوهُ أَهْلَ بَيْتِي يُحِبُّنِي إِلَى حَيْرِ الدَّ

ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے محبت کرو کہ وہ تم پر العاف فرماتا ہے اور اللہ سے دوستی کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔

ان روایات کے علاوہ شیعہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت جناب امیر اور آپ کی ذریت رضی اللہ عنہم سے محبت فرائض ایمان کے شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عربی اشعار میں فرمایا ہے

فَلَا تَعْدِلْ بِأَهْلِ الْبَيْتِ خَلْقًا | فَأَهْلُ الْبَيْتِ هُمُ أَهْلُ السَّعَادَةِ
فَبَعْضُهُمْ مِنَ الْإِنْسَانِ خَسِرٌ | حَقِيقٌ وَوَحْبُهُمْ عِبَادَةٌ

(اہل بیت کو عام مخلوق کی طرح کا نہ سمجھو وہ تنگ بخت لوگوں کی جماعت ہے۔ ان سے عداوت و بغض انسان کے لیے حقیقی خسارہ ہے۔ اور ان سے محبت عبادت کا سادہ درجہ رکھتی ہے۔)

ان اشعار کو شیخ مبہاء الدین آملی نے اپنے کثکول میں ذکر کر کے شیخ موصوف سے یہ بھی نقل کیا کہ آپ

فرماتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تو ایمان لے آیا مگر آپ کے اہل بیت پر ایمان نہیں لایا تو وہ مومن نہیں۔ اور ان شیعوں کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حب اہل بیت کا حال بھی معلوم ہے اور اس سلسلے میں جناب اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے امام صاحب کی پر خاشش بھی پوشیدہ بات نہیں ہو تا یہ تھا کہ جناب اعمش حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو جو ابو جہل کی بیٹی کیلئے پیغام نکاح دینا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر اظہار ناراضگی فرمانے کو بیان کیا کرتے تھے۔ مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے کہتے تھے کہ گو واقعہ صحیح ہے، مگر تم جس انداز پر بیان اور بے ادبانہ میں اسکو بیان کرتے ہو یہ درست نہیں۔ اور جب کوئی دینی مسئلہ اس پر موقوف بھی نہیں تو کیوں بیان کرتے ہو۔ چنانچہ شریک بن عبداللہ بن شبرہ، ابن ابی لیلی رحمہم اللہ جو امام صاحب کی جے رائے سے متفق تھے۔ سب مل کر اعمش کے گھر گئے اور ان سے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ہدایت کی، جناب اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جہاں تک حب علی رضی اللہ عنہ کا سوال ہے تو میں اس میں تم سے بھی دو قدم آگے ہوں مگر حدیث کو جس طرح سنا ہے اسی طرح روایت کیا ہے۔ میرا یہی منصبی فریضہ ہے پھر ان حضرات کے سامنے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے مناقب میں مہبت سی روایات بیان کیں کہ سب خوش ہو گئے اور خوش خوش واپس آگئے۔ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو جناب محمد باقر، جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہما سے علم و طریقت کے استفادہ کی جو شاگردانہ نسبت حاصل ہے یا جناب زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے جو رابطہ و تعلق ہے وہ نہ محتاج بیان ہے نہ محتاج ثبوت۔ جناب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی جناب ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی زیارت کی جناب امیر نے اسکے حق میں برکت اولاد کی دعا فرمائی چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کی دعا کی قبولیت کی عسومت ہیں جناب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت اس خاندان سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اس سلسلہ میں ان کے اشعار شیعہ کتب میں مذکور و مسطور ہیں۔ ہم انکی توجہ انکی اپنی کتابوں میں مندرج اشعار کی طرف دلاتے ہیں کہ انہیں دیکھیں اور اپنے الزام کی مضحکہ خیزی پر ہوسکے تو ندامت سے سر جھکا لیں۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں سے تھے۔ پوری زندگی ان کے ہم مجلس رہے آپ سے علم حاصل کیا اور آپ کے شاگرد در شیعہ شمار ہوئے ہیں۔ اور جب جناب علی رضا رحمۃ اللہ علیہ نیشاپور پہنچے تو ایک فجر پر سوار تھے، شفیق بنی رحمۃ اللہ علیہ جو اہل سنت کے بڑے صوفیاء میں سے ہیں آپ کے آگے آگے جلو داری کرتے چلتے تھے اور صوفیہ کی ایک دوسری جماعت اپنی چادر وں سے آپ پر سایہ کئے ہوئے ہوتی۔

حافظ البوزرعر رازی، اور محمد بن اسلم طوسی رحمہما اللہ اپنے تمام طلباء اور حدیث کے کاتبان کے ساتھ اپنے مدرسوں اور اپنے مقامات سے باہر آپ کی زیارت کیلئے نکل آئے۔ اور شہر میں ایک ہل چل مچ گئی۔ لوگ باگ آپ کی زیارت کو امنڈ آئے۔ محدثین اہل سنت نے عرض کیا کہ اس موقع پر آپ اگر ایک دو حدیثیں اپنی آباؤی سند یعنی سلسلۃ الذہب سے جمع کے سامنے بیان فرما دیں تو ہم سب احسان مند ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے اب و جد کے حوالہ سے یہ روایت بیان فرمائی۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ حِصْنِي فَمَنْ قَالَهُ دَخَلَ حِصْنِي
وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِي آمِنَ مِنَ الْعَذَابِ -
کلمہ لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جس نے یہ کلمہ پڑھا وہ میرے
قلعہ میں داخل ہو گیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہو گیا
وہ عذاب سے مامون ہو گیا۔

اس وقت اہل سنت علماء محمدین اور طلباء وجودات بردار تھے ان کی تعداد لگ بھگ بیس ہزار تھی۔ امام احمد بن
حنبل رحمۃ اللہ علیہ جب اس روایت کو ذکر کرتے تو فرماتے اگر یہ پائل پر پڑھی جائے تو اسے ہوش آجائے اور بیمار
پر پڑھی جائے وہ صحت یاب ہو جائے۔

ابن اثیر نے کامل میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امام بیہقی سے صاحب الفصول نے بھی تاریخ الائمہ میں ایسا
ہی ذکر کیا ہے حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت مشہور ہے۔

كَانَ عِنْدَكَ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ فَأَتَاكَ عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ فَقَالَ
لَكَ الرَّجُلُ الْقُرَشِيُّ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ مَنْ هَذَا قَالَ
سَعِيدٌ هَذَا الَّذِي لَا يَكْفِيكَ مِنْ لِمَا أَنْ يَجْعَلَكَ هُوَ
عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ بْنُ عَلِيٍّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ
عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ -
مگر ایک اس ایک قریشی ملے ہوئے تھے کہ جناب علی
بن حسین رضی اللہ عنہما تشریف لائے قریشی نے پوچھا
ابو عبد اللہ کیون صاحب ہیں سعید نے کہا یہ وہ ہیں جن سے
ناواقف رہنا کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں یہ علی بن
حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم ہیں۔

پھر تصوف کے اکثر سلسلے انہی حضرات تک منتهی ہوتے ہیں۔ تو گویا یہ اہل سنت کے سب فرقوں کے پیرو مرشد
ہیں اور اہل سنت کے نزدیک پیرو مرشد کی جو عزت و احترام اور عظمت ہے وہ سب پرواضح اور روشن
ہے۔ یہ حضرات تو اپنے مرشد سے بغض و عناد رکھنے یا انکی امانت کرنے کو سلسلہ طریقت سے نکل جانیکے
متراوف سمجھے ہیں۔

اب لائق غور اور قابل توجہ بات ہے کہ اہل سنت کا دار و مدار شریعت اور طریقت پر ہی تو ہے اور انہی
دو باتوں کو وہ سزا ساری اور بزرگی کا ذریعہ جانتے ہیں شریعت کے ستون اور بڑے ہی چار ائمہ عظام رحمۃ اللہ
علیہم ہیں۔ اور طریقت کے بڑے صوفیاء کے خاندان کے افراد ہیں اور ہر دو فرقوں۔ اہل شریعت و اہل طریقت
کا رجوع اہل بیت ہی کی طرف ہے اور یہ انہی بزرگوں کے خوان فیض کے ریزہ ہیں۔ لہذا اہل بیت سے
بغض رکھنے کی نسبت اہلسنت کی طرف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک مسوس چیز کا انکار کرنا یا اجتماع ضدین کا دعویٰ
کرنا کوئی بھی عقلمند اسکو گوارا نہیں کرتا۔

اور اہلسنت کو تو اصحاب کہنا، نور کو اندھیرا، یا آفتاب کو تاریک کہنے کے متراوف بے تاسخ کی اس گواہی کو کوئی
نہیں جھٹلا سکتا کہ اہل سنت ہمیشہ از اصحاب سے برسر مقابلہ رہے ہیں وہ انکی ہفتوات اور کجواس کی ہمیشہ تردید
کر کے منہ توڑ جواب دیتے رہے ہیں۔ انکے شاعروں نے ان کے مقابلہ میں زبان سے سیف سنان کا کام
لیا ہے۔ کثیر غزہ مشہور شاعر کے دو شعر دیکھئے۔

لَعَنَ اللَّهُ مَنْ يَسُبُّ حُسَيْنًا
وَرَفَى اللَّهُ مَنْ يَسُبُّ عَلِيًّا
اَفَاخَاهُ مِنْ سَوْفَةٍ وَاَمَامٍ
بَصْدَامٍ وَاَوْفَقٍ وَجَدَامٍ

(حسین کو گالی دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو یا انکے بھائی کو جو انکے ماتحت و امام ہیں گالی دینے والے پر بھی۔ اور علی رضی اللہ عنہم) کو گالی دینے والے کو اللہ تعالیٰ، صدمے، لغزش، اور جہازم کی مار مارے (حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ شیعہ اہل بیت سے اہل سنت کی محبت کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اسکا تصور کر سکتے ہیں) کیونکہ انکی سپر لش بغض و عناد اور نفاق کے خمیر سے ہوئی، محبت کی زانکو ہوا لگی نہ وہ اس سے واقف و آگاہ ہیں اور یہ ان کے خمیر کا ہی قصور ہے کہ وہ اپنے مقتداؤں اور رہنماؤں کو بھی دانتیا نادانت اپنے بغض و عناد کا نشانہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں) اگر انہیں اہلسنت کی محبت کا اندازہ کرنا ہو تو پھرنا صبی مذہب اختیار کر کے سامنے آئیں۔ اور اور دیکھیں کہ اہلسنت ان سے کیا سلوک کرتے ہیں

تعصب (۱۴)۔ یہ کہتے ہیں کہ اہلسنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کو فسق نہیں کہتے اور انکے قاتل ابن لمیم سے امام بخاری نے روایت کی اور اسکی تعدیل و توثیق بھی کی ہے۔

ان کا یہ جھوٹ انتہا درجہ کا افتراء اور بہتان ہے۔ اور انکی بے شرمی اور بے حیائی کا منہ بولتا ثبوت ہے اسلیے کہ کتاب صحیح بخاری کوئی نادر الوجود کتاب تو ہے نہیں بشعبروں کو چھوٹے چھوٹے قصبات میں اسکے نسخے نہیں گے اسکے راوی گئے چنے، اور موثق و مضبوط۔

اہلسنت قتل مومن کو شرک باللہ کے بعد سب سے بڑا گناہ کہتے ہیں، انکی کتب عقائد میں بھی یہی لکھا ہے اس نفس مقص کے قتل کو تو وہ حدیث نبوی کے بموجب کفر جانتے ہیں۔ اہلسنت کی تمام کتابوں میں حدیث اشقی الضمیرین کا مورد بھی ملعون بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات تو کوئی سنی محدث اس سے روایت بیان کرے گا خارج از بحث ہے اور پھر بخاری جیسا امام۔

طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 أَشَقُّ النَّاسِ ثَلَاثًا: عَاقِبَةُ قَاتِلِ نُمُودٍ وَابْنُ آدَمَ | سارے انسانوں میں بد بخت ترین تین افراد ہیں نمود کی
 الْكَذِبِيُّ قَتَلَ أَخَاهُ - فَقَاتِلُ عَمَلِي بْنِ أَبِي طَالِبٍ | اونٹنی کی کو پیس کاٹنے والا۔ آدم کا وہ بیٹا جس نے
 اپنے بھائی کو قتل کیا۔ اور علی ابن ابی طالب کا قاتل۔

ابن شہر آشوب نے بھی اس افتراء کو اپنی مشالب میں امام بخاری پر بہتان باندھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں نے اہلسنت پر افتراء پر دازی اور بہتان تراشی میں بے حیائی کی تمام حدود پار کر لی ہیں (سچ ہے کہ جب حیا جاتی رہے تو جو چاہے کرو)

تعصب (۱۵) :۔ انکو اہلسنت سے جو بغض و عناد ہے اور جس کی بنیاد ان کی نسبت سنت پیغمبر ہے۔ تو یہ شیعہ اس بغض و عناد میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ ان کے علماء سنت پیغمبر پر لعنت کر کے اپنا ایمان کفر کے مول پر دے چکے ہیں وہ کہتے ہیں ہکو کفر قبول ہے مگر سنت پیغمبر کو اچھا کہنا منظور نہیں یہ تو وہی مثال ہوئی غصہ تو سوکن پر کیا مگر قتل شوہر کو کر دیا اور یہ بات کوئی مفروضہ نہیں صاحب ابن عباد جو سالطین دیالہ کا وزیر تھا اس فرقہ کے داعیوں میں اسکی نظیر نابید ہے وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

حُبُّ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ | هُوَ الَّذِي يُهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ

إِنْ كَانَ تَفْضِيلِي لَهُ بَدْعُهُ | فَلَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى الشُّكَّةِ -

راوی بن ابی طالب کی محبت ہی جنت میں لے جاتی ہے میرا ان کو افضل ٹھہرانا اگر بدعت ہے تو پھر سنت پر اللہ کی لعنت ہو۔ (نعوذ باللہ من ذلک المفوات)

تعصب (۱۶) :- اہل سنت کی بعض روایات پر زبان طعن دراز کرتے اور انہیں سخت ستم کہتے ہیں مثلاً سہویہ غیر والی روایت، یا لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز قضا ہو جانے والی روایت، چنانچہ ابن مطہر علی نے انہی دو روایات کے نقل کرنے پر بہت واہمی تباہی بکلی ہے، مگر ان اندھوں کو یہ نظر نہیں آیا کہ خود انکی کتابوں میں ان روایات کو نہ صرف نقل ہی کیا گیا بلکہ انکی تصحیح بھی بیان کی گئی ہے۔

ان میں سے حدیث ذوالیہدین تویہ ہے۔

آن رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّلُمِ
أَوِ الْعَصَةِ رَكَعَتَيْنِ فَقَالَ ذُو الْيَدَيْنِ أَقْصَيْتَ الصَّلَاةَ
أَمْ كَسَيْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَنْ خَلْفَهُ أَصَدُّ ذُو الْيَدَيْنِ قَالُوا
لَعَنَ صَلَّيْتَ رَكَعَتَيْنِ كَبَيْتَ عَلَى صَلَاتِهِمْ وَأَتَمَّ أَلْفًا
وَسَجَدَ لِلشَّهْرِ سَجْدَتَيْنِ شَعْنًا شَقْدًا وَسَلَّمْ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز ادا فرمائی اور دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ تو جناب ذوالیہدین رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ! نماز میں قصر ہو گیا۔ یا آپ سے سہو ہوا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر مقتدیوں سے دریافت فرمایا کیا ذوالیہدین صحیح کہہ رہے ہیں سب نے عرض کی بے شک! تب آپ نے اسی تمنا پر بنیاد رکھتے ہوئے دو رکعت اور پڑھیں اور سہو کے دو سہو کیے اور تشهد پڑھ کر سلام پھیرا۔

اور حدیث لیلۃ التعریس وہ یہ ہے کہ۔

عَرَسَ فِي مُنْصَرِفِهِ مِنْ حَيْثُ كُنَّا قَبْلَ طُلُوعِ الصُّبْرِ
فَرَأَى فَعَلَبْتُ عَيْنًا فَلَمْ يَسْتَقِظْ حَتَّى حَلَبَ
حَرَّ الشَّمْسِ ثُمَّ اسْتَقِظَ وَوَضَّأَ وَصَلَّى قَضَاءً
الْقُبْرِ وَقَالَ هَذَا وَادِي الشَّيْطَانِ -
خبر سے والسی پر ایک جگہ طلوع فجر سے کچھ دیر پہلے شب باشی کے لیے آپ نے قیام فرمایا نیند کا غلبہ تھا کہ آپ سو گئے اور جب دھوپ کی گرمی محسوس ہوئی تو آپ کی آنکھ کھل گئی تب آپ نے وضو فرما کر صبح کی نماز قضا پڑھی اور فرمایا یہ شیطان کی وادی ہے۔

ان روایات کی نسبت ابن مطہر علی کہتا ہے کہ پہلی روایت عبادات میں پیغمبر کے نسیان کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری شیطان کے تسلط کو۔ اور ہر دو نبوت میں سقم پیدا کرتی ہیں۔ لہذا یہ اہل سنت کا افتراء ہے۔ مگر خود اس مفری کے دبدبے پٹم ہو گئے اور اسے یہ نظر نہیں آیا کہ پہلی حدیث ابو جعفر طوسی نے تہذیب میں حسین بن سعید سے بطریق صحیح روایت کی ہے اور اس نے ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور کلینی نے بھی بحوالہ ابی عبد اللہ سماعہ سے روایت کی ہے۔ اور دوسری اسناد سے بھی بحوالہ ابی عبد اللہ سعید اعرج سے روایت کی ہے اور اسکے آخر میں کہا ہے کہ۔

إِنَّ رَبَّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ هُوَ الَّذِي أَلْهَى النَّسَاءَ رَحْمَةً
امت پر مہربانی کی نظر سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے سہو

وَقَالَتِ الْنَصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاری نے کہا عیسی مسیح اللہ کے بیٹے ہیں) اور جہاں کہیں کافروں کا قول نقل فرمایا وہاں اسکے عقب میں اسکی تکذیب بھی ساتھ ہی لگا دی ہے۔ قرآن کے تفصیلی مطالعے سے اسکا پتہ چلتا ہے مگر اس جگہ اس قول کی تکذیب بالکل مذکور نہیں اگر اس آیت کے حوالہ سے بھی ان کے تعصب کی آگ نہ بجھ تو جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس قول کے بارے میں یہ کیا کہیں گے جو منہج البلاغہ نے آپ کے ایک خطبہ کے ذیل میں نقل کئے ہیں اَلْعُنْدَ اللَّهِ الْفَاشِي حَمْدًا وَالْغَالِبُ جُنْدًا اَللَّعَالِي جُنْدًا (ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جسکی حمد عام جسکے شکر غالب ہیں۔ جسکی شوکت بالا تر ہے)۔

تعصب (۱۸) :- ان کا کہنا ہے کہ اہلسنت یہود و نصاری سے بدتر ہیں۔ یہ بات ابن العلم نے بیان کی ہے اس اچھوتی بات کی واقعی داد نہیں دی جاسکتی کہ خدا، رسول، فرشتوں، قرآن، دیگر کتب الہیہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے رسول و خاندان رسول کے ساتھ انکی جانی و مالی محبت و وابستگی۔ یہ ساری باتیں تو انکے نزدیک رائے کاں۔ البتہ یہود و نصاری کا کفر پیغمبر کے ساتھ انکی عداوت اور انکا انکار فرشتوں خصوصاً حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ انکی عداوت یہ سب اس فرقہ کو پسند اور گوارا ہے۔ سچ ہے۔ گندگی کا کیرا گندگی ہی میں خوش ہے۔

اور پھر اس قول سے تو انہوں نے اپنے پیشواؤں اور مقتداؤں کی پیروی کا حق آدا کر دیا انہوں نے بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کافروں اور بت پرستوں کو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر کہا تھا ارشاد شیعوں کو بھی حق و فاداری کا پاس کرتے ہوئے ان کی اگلی ہوئی گندگی کو نکلنا ہی چاہئے تھا (قرآن کریم نے ان باطل پرستوں کے لیے ایک آئینہ مہیا کیا ہے۔ انہیں وہ دیکھ لینا چاہئے تاکہ انہیں اپنی اصلی شکل میں کوئی شبہ نہ رہے) اَلْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي اَوْفَا الصِّيَابَةَ اَلْكَتَبُ يُبَيِّنُ اَلْمُحِبَّةِ وَالطَّاعُونَ وَيَعُوذُونَ بِالَّذِينَ كَفَرُوا هَؤُلَاءِ اَهْلُكَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا سَبِيْلًا۔ تم نے نہیں دیکھا ان کو جو صاحب کتاب تھے کہ وہی اب بتوں اور شیطان پر ایمان لے آئے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ یہ کافر مومنوں کے مقابل میں زیادہ راہ راست پر ہیں۔

در شیعہ کو بھی کتاب (قرآن) سے حصہ ملا تھا۔ مگر جب یہ کتاب سے فریٹ ہو کر جیت و طاعت (ابن سبا وغیرہ) پر ایمان لے آئے تو انہیں اپنے پیشرو اور مقتداؤں کی اتباع میں لازماً انہیں کے قول کو دہرانا اور یہود و نصاری کو مسلمانوں سے اچھا بتانا ہی چاہئے تھا۔

تعصب (۱۹) :- یہ کہتے ہیں، غالی، کیسانی، اسماعیلی، اور رافضیوں کے دوسرے فرقے جو ائمہ کی امامت کے منکر ہو کر امامت ہی کے کذب کہلائے اور ائمہ کی شان میں انہوں نے دریدہ دہنی بھی کی ہے یہ سب کے سب محبت علیؑ کے باعث جنت میں جائیں گے۔ اور اہلسنت ہمیشہ ہمیش دوزخ میں رہیں گے اور ان کی تمام ائمہ کی دوستی بھی کام نہ آئیگی۔ اور شریعت و طریقت میں ان کو اپنا امام تسلیم کرنا فائدہ دے گا اگرچہ انہوں نے ان حضرات میں سے کسی کی تحقیق بھی نہیں کی بلکہ سب کی تعظیم ہی کرتے رہے۔ مگر جانیں گے دوزخ ہی میں۔ اب یہ بات اللہ ہی جانے کہ اہل سنت کی حب علی کیوں بے اثر ہے اور کیسائیوں اور اسماعیلیوں

کی ائمہ کی تکذیب کیوں بے اثر نہیں۔

تعصب (۲۰) : یہ ہے کہ ایسی احادیث جو شیعوں کے نزدیک ان کے اپنے طریقے کے مطابق صحیح الثبوت ہیں۔ اگر سورتفاق سے ان روایات کا مضمون اہل سنت کے مذہب سے موافقت کر جائے تو وہ روایات ان کے نزدیک ناقابل عمل ناقابل قبول بلکہ نظر انداز کر دئے جانیکے قابل ہیں اس لیے اس صورت میں اہلسنت کی موافقت کا کفر لازم آتا ہے۔ مثلاً مذی و منی کے نجس ہونے کی روایات یا ان کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جانے روایت اور سجدہ سہو کی روایات کہ ابو جعفر طوسی وغیرہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اور بڑے تالاب میں غسل کی روایات جنکا ذکر ابن المعلم نے کیا ہے۔ اور ڈھیلے کے بعد پانی سے استنہار خود ان کے اقرار سے سنت پیغمبر ہے جسکی تصریح صاحب الجامع نے کی ہے۔

ان کے شیخ الطائف نے ایک قاعدہ اور اصول مقرر کیا ہے کہ کلیہ کی بعض روایات یا اس کے شیخ محمد بن نعمان کی روایات یا شیخ الشیخ محمد بن بابویر قمی کی روایات یا خود شیخ الطائف نے جن روایات کی تصحیح کی ہے جب ایسی روایات پر عام لوگ عمل کرنے لگیں تو ان کو متروک العمل سمجھ لینا چاہئے۔

معلوم نہیں یہ اپنے برے ہمنام اہل سنت سے کہاں کہاں بھاگیں گے۔ اور ان سے بچنے کیلئے کہاں کہاں ہاتھ پاؤں ماریں گے۔ اجزائے کلمہ (بنیاد عقیدہ) اور الفاظ قرآن کے اشتراک سے کیسے بیجا چھڑائیں گے۔ اور علی جسن، حسنین، فاطمۃ الزہراء (رضی اللہ عنہم) کے لئے نام رکھ کر کرب اہل سنت کی موافقت سے جان چھڑائیں گے۔

ایک دوسرا اصول اور قاعدہ باتفاق انکے ہاں یہ بھی مقرر ہے کہ جب کسی مسئلہ میں دو روایات ہوں تو ان میں سے جو روایت اہل سنت کے موافق ہو، اسکے اثر پر عمل کرنا چاہئے کیونکہ رشد و ہدایت اسی میں ہے۔
تعصب (۲۱) : ان کی بہت سی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اہلسنت یہود و نصاریٰ سے بہت گتے ہیں۔ ان کے بدن سے کوئی چیز چھو جائے تو اسے دھونا چاہئے النالوں کو نجس اور گندہ کہنے والوں کا اپنا یہ حال ہے کہ انسانی پاخانہ بھی ان کے ہاں نجس نہیں اس سے بدن لتھڑا ہوا ہو تب بھی اگلی ناز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے یہ اہل سنت کے ہاتھ نہ لگائیں مگر ان کے پاخانہ سے مستفیض نہ ہوتے رہیں کہ وہ تو ان کے نزدیک نجس نہیں! پاک ہے۔

تعصب (۲۲) : ہر کام مثلاً کھانا پینا، پہننا، سوار ہونا، اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ بھانے بسم اللہ کے الٹو اور عمر رضی اللہ عنہما پر لعنت سے شروع کرنا چاہئے۔ وہ اسے مبارک اور بابرکت خیال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے نام کا غائب نہ کر لکھ کر مع لعن کے۔ اسے بطور قلیتہ جلائیں اور بخار کے مریض کو اسکی دھونی دیں تو وہ بخار سے شفا پا جائے گا۔

ایک بات یہ کہتے ہیں کہ جب کسی کھانے پر شتر مرتبہ ان کو دواسمائے (مبارک) پر لعن کر کے دم کر دیں تو اس کھانے میں بہت برکت ہو جاتی ہے۔ ربات دراصل یہ ہے کہ جو خود لعنتی ہو اسکی لعنت تو بے اثر ہوتی ہے۔ یہ ان محترم و مقدس بزرگوں کے اسماء مبارکہ کی تاثیر ہے کہ مریض شفا یاب ہوتے اور کھانوں میں برکت ہوتی ہے

اور یہ اتنا بڑا افضل و اعزاز ہے کہ لعنتی لوگ۔ خود غیر محسوس طور پر اس کے اقرار پر مجبور ہوئے۔ انہیں یقین کرنا چاہیے کہ جب وہ ان اسماء مبارکہ کے ساتھ لعنت چسپاں کرتے ہیں تو لعنت تو لعنتی کو دیکھ کر اس سے چمٹ جاتی ہے اور اسماء مبارکہ پاک و صاف رہ جاتے ہیں۔ اور اپنا صحیح اثر دکھاتے ہیں۔ (ن)

کافی کلینی میں یہ مرقوم ہے کہ خدا کے نزدیک عورتوں میں بدترین نام "حمیرا" ہے۔ اور یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لقب ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی لقب سے مخاطب فرماتے تھے، مگر یہ لوگ ابولہب کی بیوی کو برا نہیں جانتے جسکی برائی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی (شاید اس لیے کہ آجکل ابولہب کے مشن کے وارشد ہی ہوں)۔

ان کے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکوں کے نام ابوبکر و عمر و عثمان (رضی اللہ عنہم) رکھے تھے۔ اور یہ بھی بالیقین معلوم ہے کہ باپ پر بیٹوں کا یہ حق ہے کہ وہ ان کے نیک و اچھے نام رکھے پس جب ابوبکر و عمر و عثمان میں کوئی برائی نہیں تو صدیقہ کا لقب کب برا ہو سکتا ہے۔ اگر معاملہ جناب امیر سے عداوت کا ہے تو جناب صدیقہ ان تینوں حضرات سے بڑھ کر تو مخالف نہیں تھیں۔ اور پھر لقب کا رتبہ اختصاص میں نام سے کمتر ہے کیونکہ تعیین و تشخیص کے لیے وضع اصلی میں علم کا ہی اعتبار ہے لقب تو دراصل صفات سے ہوتا ہے اور غلبہ استعمال سے اختصاص پیدا کر لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز بالذات مخصوص ہو وہ مخصوص بالعرض سے زیادہ قوت والی ہوتی ہے (جہاں بطور لطیفہ دو باتیں ذہن نشیں ہو جائیں تو کیا مضائقہ اول تو یہ شیعہ چونکہ اپنے لڑکوں کا نام عموماً۔ ابوبکر و عمر و عثمان (رضی اللہ عنہم) نہیں رکھتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ نام رکھے تو شیعہ ان کے پیرو نہیں رہے۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی یہ نام اچھے شمار ہوتے ہیں۔ تب ہی اس نے برے لوگوں سے یہ توفیق ہی سلب کر لی کہ وہ ان اچھے اور بابرکت ناموں کا کبھی فیض ہی حاصل نہ کر سکیں۔ اور انہیں کبھی یہ توفیق نہ ہو تو اپنے لڑکوں کے ایسے بابرکت نام رکھ سکیں۔ (ن)

تعصب (۲۳)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر طعن کی طرح جناب حفصہ رضی اللہ عنہا پر طعن کو بھی عبادات بلکہ فرائض پہنچوتہ میں شمار کرتے ہیں بعد ادائیگی بیچگانہ دیگر ورد و وظائف کے مقابلہ میں اسکے ورد کو بہترین وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کوئی ایسا امر صادر نہیں ہوا جو انکی بدگوئی کا سبب اور اسکا یہ خود بھی اقرار کرتے ہیں کہ وہ کوئی گناہ نہیں رکھتیں سچا اسکے کہ وہ حضرت فاطمہ اعظم رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔ حالانکہ ولائیت و امانۃ و ذمہ اخری۔ اسکے صریح خلاف ہے اگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہی سبب موجب طعن ہے تو تعجب ہے جناب محمد بن ابی بکر کو اسی طرح کی نسبت رکھتے ہوئے ان لوگوں نے کیوں معاف کیے رکھا۔ اور ان پر لعن و طعن کیوں نہیں کرتے اگر یہ کہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت و صحبت ان کے حق میں مانع لعن ہے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت اور تعلق زوجیت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کیوں مانع طعن نہیں ہوا۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ تو جناب رثما ب صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق قرب و صحبت کے سبب ہی معزز و محترم تھے۔ اس لیے آل سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق زیادہ قابل لحاظ ہونا چاہیے تھا۔

تعصب (۶۴) :- اس فرقہ کے ایک نابکار شیخ مقداد نامی نے الزام لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ سے فعل شنیع کیا تھا۔

حالانکہ شریف مرتضیٰ نے "تذیب الانبیاء والائمة" نامی کتاب میں اور دوسرے علماء امامیہ نے قطعی طور سے حکم لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفاء رضوان اللہ علیہم ظاہری شریعت کی پاسداری اور زبدین و تقویٰ کے امور کو شائع کرنے اور رواج دینے کا بہت اہتمام کرتے اور خاص خیال رکھتے تھے تاکہ اسمیں کوتاہی کے سبب منصب امامت کی لیاقت مجروح نہ ہو اور لوگوں کی نظروں سے نہ گر جائیں خصوصاً عمر رضی اللہ عنہ کو اس معاملہ میں بڑی کد و کاوش رہتی اور بہت احتیاط و پرہیز مد نظر رہتا۔

تعصب (۶۵) :- یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بلکہ تمام امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے طلاق کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تھا کہ جب چاہیں طلاق دیدیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ازواج مطہرات کے طلاق کا اختیار نہ بنایا تھا۔ آپ اس معاملہ کو دوسرے کے سپرد کیسے فرما سکتے تھے ارشاد باری ہے -

لَا يَحِلُّ لَكَ النَّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ -

اُپ کیلئے ان عورتوں کے بعد نہ تو کوئی اور حلال ہے۔ اور نہ انکا تبادلہ دوسری زوجات سے کو آپ کو ان کا حق

بھلا کیوں نہ لگتا ہو۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بائ و فدا کیا کہ نہ مزید کوئی کھل فرمائیں گے اور نہ ہی موجودہ ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے ان کے بدلے دوسری بیوی لائیں گے۔

ازواج مطہرات کو یہ فضیلت و عزت اس لیے نصیب ہوئی کہ انہوں نے اپنے حق اختیار کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کو خیر باد کہہ کر آخرت کو قبول کر لیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و رفاقت کو دنیاوی عیش و عشرت سے جدا کر کے اور کامرانی کے مقابلہ میں پسند کیا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی یہ چاہا کہ ان کو دنیا و آخرت میں پیغمبر کی رفاقت میں ان کی ثابت قدمی مذکور و مسطور ہے۔ اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ ان کا اختیار میں تمام ازواج مطہرات حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سبقت نصیب تھی۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دیتے یا کسی کو اسکا اختیار دیتے۔

اور اگر آپ ایسا اختیار کسی کو سپرد فرماتے بھی تو شیعوں کو اس سے کیا فائدہ۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات تو وہ طلاق علی میں آئی نہیں۔ اور وصال کے بعد وہ توکیل و تفویض کا عدم ہو گئی۔ اس لیے کہ سارے فرقوں کے اجماع کے مطابق موکل کی وفات کے بعد وکالت باطل ہو جاتی ہے اور جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا جناب امیر رضی اللہ عنہ سے برسر پر خاشش تھیں اس وقت آپ طلاق کے مالک نہ تھے۔ اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وفات کے بعد طلاق دینے کے معنی ہی نہیں۔

اس فرقہ کی بنیاد اور شرط وجود ہی کذب و افتراء توہمات و تعصبات پر ہے اس لیے نہ ان کے تعصبات

کی کوئی حد ہے اور نہ وہ کبھی رک سکتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں مناسب احوال ان میں تبدیلی و اضافہ ہوتا ہی رہے گا۔ ہم کہاں تک ان کا تعاقب کر کے کھوج لگائیں گے۔ اس لیے جو کچھ ذکر کیا جا چکا اسی پر اکتفا کرتے ہیں ہم نے تینوں فصلوں میں بطور نمونہ ہی پیش کیا ہے۔ پورے تعصبات کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے۔

تیسری فصل

شیعی ہفوات

ہفوة (۱)؛ یہ کہتے ہیں کہ انبیاء و ائمہ کا کام دین و مذہب کا چھپانا ہے۔ انہوں نے پوری زندگی تقیہ میں بسر کی ہے۔ کسی کو بھی مذہب و دین واضح طور پر نہیں بتایا۔

یہ ہفوة چھوڑتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ ایسا ہے تو پھر انبیاء کی بعثت اور ائمہ کے تقرر سے حاصل کیا ہوا یعنی کچھ بھی نہیں۔ دنیا ان کی آمد سے پہلے بھی اندھیرے میں تھی آمد کے بعد بھی اندھیرے میں رہی۔

در اصل اس باطل خیال کی بنیاد اس تخیل پر ہے کہ ہر صاحبِ عزم، یا ہر طالع آزمایہ جو ایک سلطنت کا علم بلند اور دوسری کا سرنگوں کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ارادوں کو راز رکھتا، اور اپنی تدبیروں کا کسی کو پتہ نہیں لگنے دیتا اور کج فطرت لوگ ایسے ہی لوگوں پر انبیاء و ائمہ کو قیاس کر کے مذکورہ غلط و باطل تصور و عقیدہ گھڑنے سے مرتکب ہوئے خدا سا بھی غور کر لیں تو پتہ چل جائے گا کہ بنی کو مبعوث اور امام کو مقرر کر کے ان کو اخفاءِ راز کا مکلف بنانا ایسا ہی ہے کہ کسی کو قاضی شہر مقرر کر کے یا بٹ کر دیا جائے کہ کسی سے بات کرے، کسی کی فریاد سنے، نہ کوئی فیصلہ دے تو ایسے تقرر کو ایک نادان اور کچھ بھی کھیل سمجھ کا اور مذاق اڑانے کا اور بظاہر یہ فعل بے قوفی سمجھا جائے گا اور ایسا کرنا بعثت بنی اور تقوٰیام کے سراسر خلاف ہے۔ اگر انبیاء اور ائمہ حکم خدا کے بجائے اپنی مرضی سے یہ تقیہ کرتے ہیں تو وہ عاصی اور گنہگار اور تارک، واجب قرار پائیں گے اور پھر عصمت کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ جھوٹ بولنا، نفاق اختیار کرنا، انبیاء و ائمہ کی شان کے خلاف ہے اور ان بزرگ و محترم و مقدس ہستیوں کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ان بری خصلتوں کو اپنا شعار بنائے رکھیں۔ اور لوگوں کو ہدایت و رہنمائی کے بجائے دھوکہ دیں اور گمراہ کریں اگر منکرین و مخالفین اور معاندین کی طرف سے ان کو کوئی اندیشہ یا خطرہ بھی ہوتا ہے تو بھی کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہتے انہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ
أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا۔
اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں اسی سے ڈرتے
ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اہل نکرانہ کو اللہ
بہ، کافی ہے۔

اگر ان صفواتیوں کے کہنے کے مطابق انبیاء تقیہ کیے ہوئے ہوتے تو کفار کی طرف سے اذیت کیوں برداشت

کرتے، مار پیٹ، گالم گلچ، بے عزتی، بے حرمتی، جلا وطنی ان کے ہاتھوں کیوں جھکتے۔ جبکہ عام مسلمانوں کے لیے فرمایا گیا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں بغیر اپنے سے پہلوں کی طرح تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت کئے بغیر جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ وہ تکالیف اتنی سخت تھیں کہ نبی اور ان کے ساتھی یہ کہنے لگے تھے کہ اللہ کی نصرت و مدد آخر کرب آئے گی۔ تو انبیاء و ائمہ کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہئے۔

اور اس سہفہ کی تان اسپر توڑی ہے کہ آیت اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ میں ”اَتْقٰىكُمْ“ سے مراد وہ ہے جو تقیہ میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ ان کے مفسرین نے ان الفاظ کی یہی تفسیر کی ہے (گویا انہوں نے دوسروں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے ہاں کے اتقا کو منافق اعظم کہے جلنے کا برا نہیں مانیں گے۔ کیونکہ شیعوں سے قطع نظر پوری دنیا کے نزدیک تقیہ و نفاق ہم معنی ہیں۔ ن) اور اس تفسیر کے موجب لازم آتا ہے کہ حضرت یحییٰ و حضرت زکریا علیہما السلام اور جناب حسین رضی اللہ عنہ جنہوں نے بالاجماع تقیہ نہیں کیا خدا کے نزدیک کرامت و بزرگی نہ رکھتے ہوں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جتنے بھی منافق تھے وہ بزرگی و کرامت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں۔ سُبْحَانَكَ هَذَا بُنْتَانٌ عَظِيمٌ (ناظرین یہ یاد کر لیں کہ خدا کے ہاں جناب حسین رضی اللہ عنہ جو کرامت و بزرگی بھی رکھتے ہوں مگر شیعوں کے نزدیک تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے کوئی عزت و حرمت نہ رہ گئی تھی۔ اور کوفہ کے شیعوں نے اس کا عملی ثبوت دیا۔ خطوط کی ترسیل سے لیکر کارگاہ شہادت کی تاریخ کا مطالعہ کر جائے کہ ہر جگہ شیعہ آپ کو گھیر گھار کر کشاں کشاں، اودھیلے ہوئے مقتل تک لے جاتے نظر آئیں گے جہاں پہنچا کر وہ خود منہ پھیر کر دشمنوں سے سازش کے دام کھرے کر دینے لگے۔ آج یہ جتنے چاہیں مرنے جوڑ لیں۔ روز قیامت بہت قریب ہے انشاء اللہ خون حسین کے ایک ایک قطرہ کان کو حساب دینا ہی ہوگا۔ کیونکہ قاتلان حسین میں سب سے بدست یہی ہیں۔ ن)

اور تقیہ کے وجوب اور اس کی خوبیوں کے سلسلہ میں جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ سب جھوٹ من گھڑت اور افتراء۔ جناب صادق اس قسم کی بیوقوفانہ کوجائز ہی نہیں سمجھیں گے چہ جائے کہ وہ اسے واجب قرار دیں۔ اور اپنے جد امجد جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی مخالفت فرمائیں گے۔ نہج البلاغہ ان کی اصح الکتاب ہے اور متواتر بھی۔ اس میں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی نص صریح بایں الفاظ موجود ہے۔ عَلَامَةُ الْاِيْمَانِ اِيْثَارُكَ الصَّدَقَ حَيْثُ يَضُرُّكَ عَلَى الْكُذْبِ۔ (جب جھوٹ کے مقابلہ پر سچ بولنا نقصان کا سبب ہو، اس وقت سچ بولنا ایمان کی علامت ہے) یہ نص بتاتی ہے کہ تقیہ کرنے والا ایمان ہی نہیں رکھتا۔

اَوَّلِيْكَ يَوْمَئِذٍ اَخْرَجَهُمْ مِّنْ اِيْمَانِهِمْ بِمَا صَبَّوْا اِلَيْهِ | وہ اپنے صبر کی وجہ سے دوسرا اجر دے جائیں گے۔ کی تفسیر بھی یہ تقیہ ہی سے کرتے ہیں کہتے ہیں حسنہ تقیہ ہے اور اس کا اظہار سینہ بے حالانکہ اس سے پہلے کی آیت صاف طور پر اظہار پر دلالت کرتی ہے فَاِذَا اِيْثَلٰى اَحْكِيْهُمْ قَالُوْا اَمَّا۔ آخر تک۔ پھر تقیہ میں صبر کی ضرورت بھی تو نہیں۔ یہ تو بلا مشقت حسب دلخواہ مال اڑانا اور عیش کرنا ہے۔ کیونکہ تقیہ میں تو ہمہ دم بہر حال سر امر موافقت و اتحاد اور تسلیم و رضا ہے، نہ مخالفت نہ عناد پھر بھی صبر کی گھائی کہاں

اور کیسے پیش آسکتی ہے۔

کذب افزا انکی گھٹی کا جزئہ نہ ہوتا تو شاید ان کو توفیق مل جاتی کہ اپنے ہی فرقہ کی کتابوں میں مندرج تفسیر کو باطل کر کے والی منہ بولتی روایات ہی کا مطالعہ کر لیتے جو کسی اور سے نہیں اہل بیت کرام رحمہم اللہ سے مروی ہیں ان میں ایک وہ روایت ہے جو جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور رضی نے نہج البلاغہ میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم میں ان کے مقابلہ میں تنہا آؤں اور وہ اتنی کثیر تعداد میں ہوں کہ زمین ان سے پٹی پڑی ہو تو بھی ان کی پروہ نہ کروں نہ ان سے دہشت کھاؤں۔ میں ان کی گمراہی سے بھی باخبر ہوں اور اپنی ہدایت سے بھی۔ مجھے اپنی طرف سے نیز اپنے رب کی طرف سے ہدایت کا یقین ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے اچھے اجر اور ملاقات کا امیدوار ہوں اور منتظر بھی۔

پس جو شخص تنہا ہوتے ہوئے دشمن کے اتنے بڑے لشکر سے جس نے زمین کا چپہ چپہ بھر رکھا ہونہ ڈرے نہ ان سے دہشت زدہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا منتظر اور امیدوار عنایات و کرامات ہو۔ ایسے شخص کی زندگی و موت کے معاملات میں تفسیر کی گنجائش اور اس کا امکان کہاں پایا جاسکتا ہے۔ پھر تفسیر بغیر خوف کے نہیں ہوتا۔ اور خوف دو طرح کا ہوتا ہے۔ اول جان کا خوف اور ائمہ کرام کو یہ خوف بالکل نہیں ہوتا۔ اسکی دو وجوہ ہیں پہلی تو یہ کہ ان کی موت ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔ کلینی نے کافی میں یہ مسئلہ ثابت کیا ہے اور سارے ہی امامیہ کا اس پر اجماع ہے دوسری وجہ یہ کہ ائمہ کو ماکان و مایکون کا علم ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی موت۔ اس کی کیفیت و وقت سے باخبر ہوتے ہیں اور اس کا تفصیلی علم رکھتے ہیں۔ لہذا وقت سے پہلے جان کا خوف ان کو کیوں ہونے لگا۔ دوسرے خوف، بدنی یا روحانی ایذا کی مشقت کا ہوتا ہے۔ اور ان تکالیف کو برداشت کرنا اور گوارا کرنا ہمیشہ نیکو کاروں کا وظیرہ اور طرہ امتیاز رہا ہے انہوں نے اوامر الہی کے امتثال میں تکلیفوں کو گوارا کیا ہے۔ جابر اور قاسم بادشاہان وقت اور فرارین زمانہ سے مقابلہ کیا ہے اگر اسی معاملہ میں بزدلی دکھائیں، اور عبادت و مجاہدہ میں مشقت کا تحمل گوارا نہ کریں تو وہ نیکوں ہی کے شمار میں نہیں آسکتے چہ جائیکہ وہ نیکوں کے امام شمار ہوں لہذا ان کیلئے کسی طرح بھی تفسیر ثابت و جائز نہ ہوا۔

پھر اگر بقول شیعہ تفسیر جائز یا واجب ہوتا۔ تو شیعوں کے گمان کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں چھ ماہ کا توقف کیوں کرتے اتنے عرصہ بیعت سے رکے رہنا تو صراحتاً ملال و ناخوشی کا اظہار ہے (جو تفسیر کی نفی ہے) سب کے ساتھ بیعت ہی کر لیتے۔

تیسری روایت جو تفسیر کو باطل ٹھہراتی ہے۔ عباسی نے زرارہ بن اعین سے اس نے ابی بکر بن حزم سے روایت کی ہے۔

قَالَ لَوْضَاءُ رَجُلٍ وَمَسَّحَ عَلَى خُفَيْدٍ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ وَصَلَّى فَجَاءَ عَلَى فَوْجَاءَ رَقَبَتَهُ فَقَالَ وَبَلَدُكَ لَصَلَّى عَلَى غَيْرِ وَضُوءٍ فَقَالَ أَمَرَنِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَأَخَذَ بِيَدِهِ فَأَنْهَى بِهِ إِلَيَّ شَقَّ قَالَ أَنْظُرْ مَا يَقُولُ هَذَا عَنْكَ وَرَفَعَ صَوْتَهُ عَلَى عُمَرَ فَقَالَ أَنَا أَمَرْتُ بِذَلِكَ۔

کہا کہ ایک شخص نے وضو کیا موزوں پر مسح کیا اور مسجد میں اگر نماز ادا کی اتنے میں جناب علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو اسکی گدی دبوچ کر فرمایا ارے تیرا اس سے بغیر وضو کے نماز پڑھتا ہے۔ اس نے کہا مجھے تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا آپ نے اسکا ہاتھ پکڑا اور ارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لا کر کہا دیکھئے یہ آپ کے بارے

میں کیا کہتا ہے۔ اور اندازہ تھا طلب گرجنے پر سے جیسا تھا
حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا ہاں میں نے اسے یہی کہا تھا

اب یہاں تفسیر کہاں رہا جب غلط کار کو کدی سے دہوج لیا اور خلیفہ وقت پر گرج برس لیے تو تفسیر رخصت ہو گیا۔
جو تھی روایت شیعوں کے مقتدا اور نہج البلاغہ کے شارح راوندی کی ہے۔ جسے اس نے اپنی کتاب جرح الخوارج
میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو خبر ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ
عنہ ان کے شیعوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں مدینہ کے
باغات کے راستہ میں آپ دونوں کا آمناسا منابہو گیا
اس وقت حضرت علی کے ہاتھ میں کمان تھی آپ نے
کہا اے عمر (رضی اللہ عنہ) مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم میرے
شیعوں کے متعلق کچھ کہتے رہتے ہو جواب میں حضرت
عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے علی (رضی اللہ عنہ) اپنے مٹی
کے سر پر رحم کھاؤ۔ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا

تم اس درجہ تک پہنچ چکے ہو۔ اور اپنی کمان زمین پر ڈال
دی جو فوراً اتر دھابت کر منہ کھولے ہوئے عمر کو کھٹکنے کیلئے
ان کی طرف لپکی۔ اس پر عمر پلائے خدا کے لیے اے اللہ
اب میں تمہارے کسی معاملہ میں دخل نہ دوں گا اور ان کے
آگے گر کر گرلائے گئے۔ پس علی نے اتر دھبہ پر ہاتھ ڈالا تو

وہ کمان بنگئی۔ اس کے بعد جناب عمر رضی اللہ عنہ اپنے
گھڑ لوٹ گئے سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رات ہوئی تو
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا عمر رضی اللہ

عنہ کے پاس جاؤ مشرق سے ان کے پاس مال آیا ہے
جسے وہ ہضم کرنا چاہتے ہیں لہذا ان سے کہو کہ علی رضی اللہ
عنہ کہتے ہیں جو مال مشرق سے آیا ہے نکالو اور حقاروں

میں اسے بانٹ دو اسے دبانے کا خیال نہ کرو ورنہ میں تمہیں
ذلیل کروں گا۔ سلمان کہتے ہیں میں ان کے پاس گیا اور
جا کر یہ پیغام پہنچایا۔ وہ کہنے لگے تم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دوست

کو اس مال کی خبر کیسے لگی۔ میں نے کہا ان سے ایسی بات
کہاں چھپ سکتی ہے تو کہنے لگے سلمان! میری بات مان لو

أَنْتَ عَلَيَّ أَبْلَغُ مَا عَنْ عُمَرَ أَتَمَّا ذَكَرْتُ شَيْئًا
فَأَسْتَقْبَلُهُ فِي بَعْضِ طُرُقَاتِ بَسَاتِينِ الْمَدِينَةِ
وَفِي يَدِي قَوْسٌ فَقَالَ يَا عُمَرُ يَلْغِي عَنْكَ
ذِكْرُكَ لِشَيْعَتِي فَقَالَ ارْجِعْ عَلَى صَلَاحِكَ فَقَالَ
عَلَيَّ أَنْتَ لَهْمَانَا شَرٌّ مِّنْ الْقَوْسِ عَلَى الْأَرْضِ
فَأَوَّاهُوا لَعْبَانِ كَالْجَبْرِ فَاغْرَأَاهُ وَقَدْ أَقْبَلَ عُمَرُ
عُمَرُ لِيَبْلُغَهُ فَقَالَ عُمَرُ اللَّهُ اللَّهُ لَالِ الْهَسَنِ لَأَعِدَّ
بَعْدَ مَا فِي شَيْءٍ وَجَعَلَ يَتَفَرَّغُ إِلَيْهِ فَضَوَّبَ بِيَدَيْهِ
إِلَى الشَّعْبَانِ فَعَادَتِ الْقَوْسُ كَمَا كَانَتْ فَمَضَى إِلَى
بَيْتِهِ فَقَالَ سَلَمَانٌ فَلَمَّا كَانَ فِي اللَّيْلِ كَعَلَى
عَلِيٍّ فَقَالَ سِيرُوا إِلَى عَمْرٍاءَ فَاتَّحَمِلَ إِلَيْهِ
مِنْ نَاحِيَةِ الْمَشْرِقِ مَالٌ وَقَدْ عَزَمْتُ أَنْ يَحْبِسَهُ
فَقُلْتُ لَمَّا يَقُولُ لَكَ عَلِيٌّ أَخْرِجْ مَا حَمَلَ إِلَيْكَ مِنَ
الْمَشْرِقِ فَفَرَّقَهُ عَلِيٌّ مِنْ هَوْلِهِمْ وَلَا تَحْبِسْهُ
فَانْضَحَكَ قَالَ سَلَمَانٌ فَمَضَيْتُ إِلَيْهِ وَادَّيْتُ
الرِّسَالَةَ فَقَالَ أَخْبِرْنِي عَنْ أَمْرِ صَاحِبِكِ مِنْ أَيْنَ
عَلَيْهِ فَقُلْتُ فَهَلْ يَخْفَى عَلَيْهِ مِثْلُ هَذَا
فَقَالَ يَا سَلَمَانَ أَقْبِلْ مِثْلِي مَا أَقُولُ لَكَ مَا
عَلَى الْأَسَاحِرِ وَإِنِّي لَمُسْتَقِينٌ بِكَ وَالصَّوَابُ أَنْ
تُقَارِقَهُ وَتَصِيرَ مِنْ جُمْلَتِنَا قُلْتُ لَيْسَ كَمَا
قُلْتُ وَلَكِنَّهُ وَرَثَ مِنْ أَسْرَارِ النَّبُوَّةِ مَا قَدْ هَانَتْ
مِنْهُ وَهَذَا أَكْثَرُ مِنْ هَذَا فَقَالَ ارْجِعْ إِلَيْهِ
فَقُلْ السَّلَامُ وَالطَّاعَةُ لِأَمْرِكَ فَرَجَعْتُ إِلَى عَلِيٍّ فَقَالَ
أَحَدِثْكَ عَمَّا جَرَى بَيْنَكُمْ فَقُلْتُ أَنَسَ

أَعْلَمُ مَتَى فَتَكَلَّمُ بِكُلِّ مَسْجَرٍ
بَيْنَنَا فَقَالَ إِنَّ رُغْبَ ثَعْبَانَ فِي
قَلْبِهِ إِلَّا أَنْ يَمُوتَ

علی تو ایک جادوگر ہیں میرا تمہارے بارے میں یقین ہے اور مناسب بھی یہی ہے کہ تم ان سے جدا ہو کر ہم میں آلو، میں نے کہا جیسا آپ خیال کرتے ہیں معاملہ ایسا نہیں ہے ان کے بارے میں آپ نے جو ملاحظہ کیا وہ وہ اسرار نبویہ میں جو انہیں ورثہ میں ملے ہیں۔ اور ان کے پاس تو اس سے بھی زائد ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اچھا ان کی طرف واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ میں نے آپ کا حکم سنا اور مانا۔ لہذا میں جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آیا تو آپ نے پوچھا کہ جو باتیں عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئیں سناؤں۔ میں نے کہا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں پھر آپ نے وہ تمام باتیں دھرا دیں جو ہمارے درمیان ہوئی تھیں اور آپ نے یہ بھی کہا کہ اگر دھوکا خوف مرتے دم تک ان کے دل میں رہے گا۔

اس روایت میں تفسیر کی گردن ماری گئی ہے۔ اور غیب دل کھول کر اس کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ لہذا اس سے معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کے عہد میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے جن امور پر سکوت عمل میں آیا مثلاً قصہ فدک، اور جناب ام کلثوم رحمہما اللہ کا نکاح وغیرہ وہ محض اس بنا پر تھا کہ آپ کے نزدیک وہ درست تھے۔ اور آپ انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ورنہ انکار و تنقید کی پوری طاقت رکھتے تھے۔ اگر انکار کی طاقت رکھتے ہوئے شرع کی منع کردہ باتوں پر سکوت فرماتے اور سستی برتتے تو فاسق نہ ہو جاتے۔ بلکہ دختر سیدۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں اگر اس تمام اقتدار کے باوجود سستی یا رواداری سے کام لیتے تو کونسی ایسی برائی تھی جو لازم نہ آتی۔ اور کچھ نہ سہی اسکی وجہ سے منصب امامت کی لیاقت سے انہیں میلوں دور جا پڑتے۔

چنانچہ ایک دو مرتبہ کوئی ممنوع و ناگوار چیز سامنے آئی، یا علم غیب سے معلوم کیا تو اتنے شدید غصہ سے کام لیا۔ ظالموں کے سخت ترین انسان عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے جب کو کسی کا لحاظ نہ تھا اس قدر خائف ہو گئے۔ لہذا معلوم ہوا کہ متعہ کی حرمت، سنت تراویح کا اجرا اور رواج پانا خمس و غنائم کی تقسیم، عمال کا تقرر، اور دوسرے مہات خلافت ان سب کو آپ پسند فرماتے تھے، ورنہ تو چشم ابرو کے ایک اشارے سے سارا کارخانہ خلافت ڈبکبر ہم کر سکتے تھے۔ کسی لاؤ و لشکر۔ اعوان و انصار کی بھی مطلق ضرورت و حاجت نہ تھی وہ ایک بے تیر کی ایک گھمان ہی کافی تھی۔

عہد فاروقی میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے سکوت۔ اور دین و خلافت کے ظاہری امور میں موافقت کی جو وجہ کتب امامیہ میں لکھی گئی ہیں کہ آپ بے بس، لاچار، ذلیل و بے قدرت تھے۔ مقابلہ کی طاقت نہیں

رکھتے تھے۔ ایسی وجہ ہیں کہ اول تو آپ کے یہ باتیں شایان شان نہیں۔ دوسرے امامیوں کی یہ وہابی تباہی بکواس کے سوا کچھ نہیں۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ عہدِ شیخین میں بڑے معزز اور بڑے لائق احترام رہے۔ دونوں حضرات کے مشیر و غیر خواہ رہے۔ اور ملتِ حنیفیہ پر قائم رہے۔ ان کے دوستوں، ساتھیوں اور خلفائے ان کو کبھی بے مقدرت، بے بس، لاچار اور بے وقوف نہیں سمجھا۔ ہمیشہ ان کے شایان شان برتاؤ کیا۔ یہ تو شیعی ہی ہیں جنہوں نے روز اول سے آپ کو اپنا، آلہ کار، سمجھا۔ اور ان کی حقیقی محبت و عزت نہیں کی۔ ان سے تقیہ جیسی ذلیل حرکت منسوب کر کے ان کا سارا وقار، دبدبہ اور عزتِ مذاک میں ملا دی۔

ان سے تقیہ منسوب و ثابت کر نیسے دراصل اہل بیت کیلئے ایسی باتیں لازم آتی ہیں جو انکی غیرتِ عزتِ اکبر و سب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ مثلاً اپنی بیٹی کا فر کے نکاح میں دینا یا اپنی تمام بہنوں بلیوں کو کفار کے حوالہ کرنا خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان حضرات کو وہ مقدرت و قوت حاصل تھی کہ اسکا دفاع کر سکتے۔ اور ایک معجزہ دکھا کر ایسے حضرات کو چشمِ زدن میں ذلیل کر سکتے تھے۔

المسنت اور کتبِ شیعہ میں باتفاق تو اتر سے یہ بات ثابت ہے کہ جناب امیر و اہل بیت رضی اللہ عنہم نے خلفاء ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے فروعِ فقہیہ کے بہت سے مسائل میں اختلاف کئے ان سے بحث و مناظرہ کیا۔ لیکن اس مخالفت یا مناظرہ کی بنا پر کسی ایک نے بھی صراحتاً تو کیا اشارہ و کنایہ میں بھی انکو ملعون نہیں کیا انذا ہی تو بہت دور کی بات تھی۔ اس سے بھی تقیہ باطل ہوا۔ کیونکہ بعض مسائل میں واقعہ کا اظہار ہونے کے باوجود کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ گویا ثابت ہو گیا کہ اظہار کی قوت موجود تھی اور نقصان کا خوف معدوم۔

اور اگر تفرقہ مانا جائے تو وہ یا خدا کے حکم سے ہو گا۔ یا بغیر حکم خدا ہو گا پہلی شق میں ثابت ہوتا ہے کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ حکیم نہیں کیونکہ ایک کام کا حکم دینا اور پھر اسکے خلاف کا امر صادر کرنا۔ تو حکمت و دانائی کی جگہ سفاهت و حماقت لگتا ہے اور اگر شق ثانی ہو۔ یعنی محض لوگوں کی ایذا رسانی کے دُورے تقیہ ہو تو ائمہ و اہل بیت جیسے داعیانِ حق پر بزدلی، ہستی اور بے صبری تھوپنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایسے شخص میں امامت کی لیاقت نہیں۔

سارا قرآن جماد کی مشقتوں پر تحمل اور مصائب پر صبر کی تلقین سے بھر اہول ہے۔ صابریں کی مدح سرائی بھی جا بجا ملتی ہے۔ اور ان امور سے بھاگنا یا جان چرانا سنا لیں اور صابریں کا طریقہ بھی نہیں رہا۔

ایک اور بات کہ اگر تقیہ واجب ہی ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ نہ فرماتے۔ اگر مجھے اس عہد کا پاس نہ ہوتا جو مجھ سے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تھا تب تم دیکھتے کہ مدعا رسوں کی تعداد کے لحاظ سے کمزور کون ہے۔ اسکا حوالہ کتبِ امامیہ کے حوالہ سے پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ عام امامیوں کا یہ خیال ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ پر اپنی خلافت سے قبل تقیہ واجب تھا۔ اور خلافت کے بعد حرام ہو گیا۔ لہذا آپ سے جو روایات خلافت و ولایت کے بعد منقول ہیں ان میں تقیہ برگز نہیں مانتا چاہئے ورنہ لازم آئے گا کہ ایک معصوم حرام کا مرتکب ہوا۔ لیکن ان میں صمد مرتضیٰ امامی اس بات کا قائل ہے کہ آپ خلافت اور ولایت کے بعد بھی تقیہ واجب تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اسکا یہ قول غلط و باطل ہے۔ اس لیے کہ اگر بعد خلافت بھی تقیہ واجب ہوتا تو آپ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول

نہ فرماتے۔ اس لیے کہ آپ ان سے نوزیر تھے، جس کا اظہار بھی ان الفاظ میں فرمایا تھا۔
 اِنِّیْ اَخَافُ کَیْکَ وَ اِنَّ کَیْکَ لَعَظِیْمٌ۔ میں انکی تدبیر سے خائف رہتا ہوں انکی چال بڑی گہری ہوتی ہے۔

جناب ابن عباس اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی مشورہ دیا وَلَیْسَ شَہْرًا وَاَخِیْرًا دَہْرًا (ایک ماہ کیلئے ان کو حاکم بناؤ، اور پھر ہمیشہ کیلئے معزول کر دو) مگر آپ نے اس کا جواب دیا۔ وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذًا الْمُضِلِّیْنَ عَصْدًا (میں فساد پیشہ سے مدد و قوت لینے والا نہیں ہوں) چنانچہ یہی معزولی فساد عظیم کا باعث بنی، زمین سے حقنے اہل یثربے اور نوبت قتل و قتال تک پہنچ کر رہی۔

سید مرتضیٰ کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت و خلافت تو ایک دکھاوا تھی یوں ہی برائے نام۔ حقیقت سے خالی۔ کیونکہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے پر خاش رکھتے تھے جو آپ کی وفات تک جاری رہی اور آپ کے متبعین اور فوج میں ایسے لوگ تھے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد تھے۔ اور در پردہ وہ آپ کے دشمن تھے۔ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے انصاف اور فضائل کے معتقد اور ان کے معاونین اور حامیوں کے مداح۔ ایسی صورت میں اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ خاطر خواہ انداز پر اپنے عقیدہ کا اظہار فرماتے یا اسپر عمل پیرا ہوتے تو گمان غالب تھا کہ یہ متبعین ساتھ چھوڑ جاتے، اور امر خلافت اور کھن ہو جاتا۔ اس وجہ سے ولایت کی حالت میں آپ پر تقیہ واجب تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شیعیت کے دعویٰ کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت کو بھی نمانشی اور بے معنی قرار دیتے ہیں۔

اہلسنت کے نزدیک یہ ولایت سراسر نامعنی تھی اور ولایت کی حقیقت اس پر منحصر تھی درحقیقت ولایت کے معنی ملک میں تصرف کرنے، احکام جاری کرنے، رعایا سے محصولات و خراج لینے اور مفیدوں کی تنبیہ و تادیب پر قدرت رکھنے کے ہیں۔ اور اس وقت کے اکثر اسلامی شہروں پر جناب امیر رضی اللہ عنہ ایسے تصرف و ولایت کی قدرت بدرجہ کمال رکھتے تھے۔ خصوصاً حجاز، یمن، عمان، بحرین، آذربائیجان، عراقین، فارس، و خراسان میں بغیر کسی جھگڑے، مقابلہ یا رد و کاوٹ کے احکام جاری و نافذ تھے۔ اور وہاں کے باشندے دل و جان سے آپ کے مطیع و فرمان بردار تھے۔ اگر مخالف تھا تو شام کا علاقہ تھا۔ اگر ملک کے کسی ایک حصہ میں گزر رہا ہو جائے تو یہ معنی ولایت کے منافی نہیں اس سے خلافت و امامت نمانشی و برائے نام نہیں کہلا سکتی ذرا صدراول۔ عبدالوہاب صدیق رضی اللہ عنہ پر تو نظر ڈالئے۔ کہ آپ خلیفہ مقرر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف سوائے جزیرۃ العرب کی علاقہ نہ تھا۔ اور اس میں بھی سب دشمن اور مفید بڑے زور آور تھے مثلاً مسیلہ کذاب، بنو حنیفہ، بنی تمیم کی مدعیہ نبوت سبلح، اور بنو تمیم وہ قبیلہ تھا کہ سارے عرب میں انکے لڑاکا مشہور تھے۔ اس کے مرد مردان کا رزار سمجھ جاتے تھے۔

دوسری طرف انہیں زکوٰۃ کی شورش تھی تو شام میں بنو غسان، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے برسر پر خاش تھا۔ اور پھر ارد گرد کے تمام عرب قبائل فتنہ اُتداد میں گرفتار۔ فرض کیفیت یہ تھی کہ سوائے اہل یمن مکہ و مدینہ کے آپ کا کوئی حامی و ناصر نہیں آتا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود آپ کی استقامت و ثبات کا یہ عالم تھا

کہ آپ نے کسی شرعی معاملہ میں معمولی سی مداخلت اور کمزوری یا رواداری کو باہر پانے نہیں دیا۔ اور ایسے عالم میں بھی اعلان فرمایا تو یہ فرمایا۔

لَوْ مَنَعُونِي حَقًّا لَأَكُونُ يُؤَدُّنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتِلْتُهُمْ۔ اگر جالوز کی سی بھی جو یہ زکوٰۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے مجھے نہ دینگے تو میں ان سے قتال کروں گا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ تو سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ملک کے ایک علاقہ کے بسنے والوں سے ڈر کر دین محمدی کو مٹنے اور دولت سرمدی کے زوال کو کیسے روار کھتے۔ یہ بات صرف شیعوں کی سمجھ میں آئے تو اُنے کسی مسلمان کے تو تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ وہ تو ایسے خیال پر سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ پڑھتے ہیں ایک طرف تم ان کو دوسری طرف ان پر الزام لگاؤ کہ گویا جناب امیر رضی اللہ عنہ نے دین محمدی میں خلل کو جائز رکھا اور گوارا کیا تمہاری عقلوں کو زنگ لگ گیا۔ یا انکھیں بصارت کھو بیٹھیں۔ کہ نہ یہ دیکھتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو نہ یہ سوچتے ہو کہ کس کے متعلق کہہ رہے ہو اور یہ بات جو انہوں نے کہی کہ آپ کے متبعین اور افواج میں دشمنوں کی اولاد کی اکثریت اور وہی ان کے پیرو تھے۔ تو اس میں اکثریت والی بات تو بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ اکثریت تو کوفیوں مصریوں اور قائلین عثمان کی تھی جنگی ساری تگ و دو و صابہ کرام کے مطاعن کی تلاش میں صرف ہو رہی تھی وہ تو ان حصرات کرام کی بزرگی اور اعزاز کے انہدام کے خواہاں تھے۔ یا عراق و عجم، خراسان و فارس اور ہماز کے ایسے لوگ تھے جو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد کے ذمہ خوردہ تھے۔ اور ان کی فوجوں سے دو بدوشکت کا زخم کھا کر دلوں میں کسی نہ چھپائے ہوئے تھے۔ یا پھر وہ اکھڑ، اور ان گھڑ عرب جو فتہ انکیزی جگمگائی، طعن و بدگوئی کو اپنی فطرت میں لے کر اس دنیا میں آئے۔ اور جنکا محبوب مشغلہ احکام و حکام میں رد و بدل اور اکھاڑ بچھاڑ اور پھر ایسے مزاج کے لوگوں کے سامنے مسائل بھی عین ان کی خواہش و کارندہ اور تمناؤں کے بر لسنے والے ہو جیسے متعہ کہ عیاش طبع اور شہوت پرست لوگوں کی کشش کا باعث، یا مسع رہلین کا مسئلہ کہ آدھے وضو سے چھٹی یا تراویح کی معافی۔ کہ بے ایمان روزہ دار کیلئے افطار کے بعد ایسا ہے جیسے موت کے بعد عذاب قبر پھر اکثر مجاہدین و عرلوں پر تراویح بہت شاق و دشوار تھی چنانچہ ایک مشہور شاعر طرطوسی نے اس سلسلہ میں جو کہا ہے اسکا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

”روزہ کا دن بدبختی کا دن ہے اور تراویح کی رات مصیبت کی رات ہے۔ بیمار بن جاؤ کہ پاک چیزیں تمہارے لیے حلال ہو جائیں گی۔ اور بعض وقت بیمار بننا ہی عین شفا ہے۔ اور اگر روزہ رکھنا ہی پڑ جائے تو اکثر بعد عشر کا روزہ رکھو۔“

تو ان مسائل نے جن لوگوں کے دلوں کو کھینچا وہ بھی آپ کے ساتھیوں اور فوجیوں میں شامل تھے۔ تو معلوم ہو گیا کہ اکثریت کن لوگوں کی تھی۔ اور صحابہ کی جو اولادیں آپ کے ساتھ تھیں وہ انصار تھے جو ہمیشہ سے حب علی اور شیعیان علی شمار ہوتے تھے جو شیخین رضی اللہ عنہما کا عدل اور ان کی فضیلت سے آگاہ تھے۔ اور اپنے والدین سے وضع و آئین پیغمبری سے بھی واقف ہو گئے تھے، تو گویا بقول شیعہ شیخین کی طرف سے سنت پیغمبری میں جو تحریف یا تغیر ہوا تھا اسے خوب جانتے تھے اور کُلِّ جِدِّ يَدْلِزِيذُ کے مصداق

نادر مسائل پر انے مسائل کے مقابلہ میں انکو پسند اور جمعیت خاطر کا سبب بھی ہوں گے۔ اس طرح یہ سارے مٹھی میں تھے۔ پھر خوف کس سے تھا، محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے دو ایک ہوں گے۔ تو وہ مصر میں جب مارے گئے تو ان کا خوف بھی زائل ہو گیا۔ اب رہے امیر معاویہ اور جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ان سے اگر خوف تھا تو وہ بغاوت اور محاذ آرائی کا تھا۔ اسکے لیے مخالفت میں انہوں نے کونسی کمی کی تھی کہ اگر آپ اظہار حق فرماتے اور اصل امور شرع مروج فرماتے تو وہ اپنی مخالفت میں کیا اضافہ کرتے۔

اس کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی سامنے رہے کہ ابتدائے بعثت سے لیکر حیات مبارکہ کے آخری لمحہ تک آپ کے اثر پیرو یا تو آپ کے جانی دشمنوں کی اولاد تھے یا ان کے بھائی برادر مثلاً عکرمہ بن ابی جہل، حارث بن ہشام، صفوان بن امیہ بن خلف، جعیر بن مطعم، اور خالد بن ولید (رضی اللہ عنہم اجمعین) جو امیر الامراء اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شمشیر بہن تھے یہ سب کے سب ان کافروں کے فرزند تھے جو آپ کے سخت ترین جانی دشمن تھے۔ اسکے باوجود آپ نے کبھی بھی امور شرعیہ میں کسی رو رعایت یا نرمی و سستی سے کام نہیں لیا۔

یہی حال سابقہ انبیاء و رسول علیہم السلام اور ان کے ورثاء کا رہا ہے۔ کہ ہمیشہ دشمنوں اور مخالفوں سے پالا پڑتا رہا۔ اگر ان کے اسلاف کی دشمنی و عداوت، تبلیغ احکام و امور شرع میں ملحوظ رکھی جایا کرتی تو شرع کیسے ظہور میں آتی اور دین حق دین باطل سے کس طرح ممتاز ہوتا۔

پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے پیروؤں نے آپ کی بات مان لینے، آپ کی تعظیم و توقیر کرنے اور آپ کی رفاقت میں جان لڑا دینے میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی چنانچہ جنگ جمل و صفین اور نہروان کے واقعات موجود ہیں، اور جو شخص کسی پر جان بچھاؤ کرنے کے آخری اقدام پر تلا ہوا ہو وہ ان کے شرعی فرمان سے کیوں منہ موڑ لے گا۔

اور اتنا تو مہر حال تمام متبعین اور پیروؤں کے بارے میں متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب آپ کا شمار خلفائے راشدین میں کرتے اور اپنے زمانہ و وقت میں ساری مخلوق سے بہتر سمجھتے تھے۔ اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ و مذہب ہے اور ان کے نزدیک یہ بھی طے شدہ ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حکم رکھتی ہے تو جن لوگوں کے ایسے خیالات اور عقائد ہوں ان سے دُور نا اور تفریق کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پانچویں روایت جو کلمہ کی ہے یہ ہے۔

کلمہ نے بحوالہ معاذ بن کثیر جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر ایک کتاب نازل فرمائی اور فرمایا کہ یہ تمہاری طرف سے تمہارا کیلیے وصیت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل (علیہ السلام) سے دریافت فرمایا وہ تمہارا کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ علی بن ابی طالب اور اہل اولاد (رضی اللہ عنہم) اور کتاب پر سونے کی مہر میں تمہیں پس رسول اللہ

رَوَى الْكَلْبِيُّ عَنْ مُعَاذِ بْنِ كَثِيرٍ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ أَمَرَ عَلِيَّ نَبِيَّهِ كِتَابًا فَقَالَ هَذِهِ وَصِيَّتِي إِلَى النَّجَبِ أَوْ قَالَ وَمِنَ النَّجَبِ يَا جَبْرِئِيلُ فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ وَوَلَدُهُ. وَكَانَ عَلَى الْكِتَابِ خَوَاتِيمٌ مِنْ ذَهَبٍ فَدَفَعَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى عَلِيٍّ وَأَمَرَ أَنْ يُفَكَّ خَاتَمًا مِنْهُ فَيُعْمَلَ بِهَا

صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کتاب علی (رضی اللہ عنہ) کو دی اور حکم فرمایا کہ ان مہروں میں سے ایک کو توڑیں اور اس میں جو کچھ درج ہے اس پر عمل کریں۔ پھر حسن (رضی اللہ عنہ) کو دی آپ نے مہر توڑی اور جو کچھ اس میں پایا عمل کیا۔ پھر حسین (رضی اللہ عنہ) کو دی اور انہوں نے مہر توڑی تو اس میں یہ لکھا پایا کہ ایک قوم کی ہر اہلی میں شہادت کے لیے فکلو کیونکہ تمہارے بغیر ان کی شہادت معتبر نہیں اور راہ خدا میں اپنی بان کی بازی لگاؤ تو انہوں نے ایسا ہی کیا پھر علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ کو دی انہوں نے بھی ایک مہر توڑی تو اس میں یہ لکھا پایا کہ سر تسلیم خم کرو خاموش رہو گھر میں بیٹھے رہو اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کے بیٹے محمد بن علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کی انہوں نے ایک مہر توڑی تو اس میں یہ پایا لوگوں سے حدیث بیان کرو، ان کو فتویٰ دو اور اہل بیت کے علم کو پھیلادو اور اپنے نیک بخت باپ دادا کی تصدیق کرو اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرو کیونکہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر جعفر صادق (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ کی آپ نے ایک مہر توڑی تو اس میں یہ لکھا ہوا پایا کہ لوگوں سے حدیث بیان کرو

فِيهِ ثُمَّ دَفَعْنَا إِلَى الْحَسَنِ فَقَالَ خَاتِمًا فَعَمِلَ بِمَا فِيهِ ثُمَّ دَفَعْنَا إِلَى الْحُسَيْنِ فَقَالَ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ أَنْ أَخْرُجَ بِقَوْمٍ إِلَى الشَّهَادَةِ فَلَا مَشَاهِدَةَ لَهُمْ إِلَّا مَعَكَ وَاشْتَرَوْا نَفْسَكَ لِلَّهِ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعْنَا إِلَى عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَقَالَ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ أَنْ يُطْرُقَ وَأَضْمَتْ وَالزُّمُ مَاتَرِكَ وَأَحْبَذْتُكَ حَتَّى يَأْتِيكَ الْيَقِينُ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعْنَا إِلَى ابْنِهِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَقَالَ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ حَدِيثَ النَّاسِ وَأَفْتِهِمْ وَالشَّيْءَ عُلُومَ أَهْلِ الْبَيْتِ وَصَدَّقَ أَبَانُكَ الصَّالِحِينَ وَلَا تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ فَإِنَّهُ لَا سَبِيلَ لِأَحَدٍ عَلَيْكَ ثُمَّ دَفَعْنَا إِلَى جَعْفَرِ الصَّادِقِ فَقَالَ خَاتِمًا فَوَجَدَ فِيهِ حَدِيثَ النَّاسِ وَأَفْتِهِمْ وَلَا تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ فَإِنَّهُ عُلُومَ أَهْلِ بَيْتِكَ وَصَدَّقَ أَبَانُكَ الصَّالِحِينَ فَإِنَّكَ فِي حِزْبٍ وَأَمَانٍ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعْنَا إِلَى ابْنِهِ مُوسَى وَهَكَذَا إِلَى قِيَامِ الْمُهِدِيِّ وَمَا مِنْ طَرِيقٍ آخَرَ عَنْ مُعَاذِ بْنِ كَثِيرٍ أَيْضًا عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ وَفِيهِ فِي الْخَاسِمِ الْخَامِسِ وَقِيلَ الْحَقُّ فِي الْأَمْنِ وَالْخَوْفِ وَلَا تَخْشَ إِلَّا اللَّهَ۔

ان کو فتویٰ دو اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرو اہل بیت کا علم پھیلادو اور اپنے نیک بخت باپ دادا کی تصدیق کرو تم یقیناً امن و حفاظت میں ہو تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کے بیٹے موسیٰ (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ کی اور اسی طرح ظہور مہدی تک ہوتا چلا جائیگا۔ اور ایک دوسرے سلسلہ سند سے بھی معاذ بن کثیر سے روایت کی ہے اور اس نے ابی عبد اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) سے اسمیں پانچویں مہر میں یوں ہے۔ امن و خوف میں حق بات کہہ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔

یہ روایت بڑے اچھے فوائد پر مشتمل ہے۔

الف :- ائمہ حضرات جو کچھ کرتے تھے خدا کے حکم کے مطابق کرتے انکو جن باتوں کا حکم دیا گیا انہوں نے وہ انجام دیں۔ لیکن زمین پر اقتدار حاصل کرنے اور امور مملکت میں دخل اندازی کا ان میں سے کسی بزرگ کو بھی حکم نہیں ملا ورنہ وہ اسکے لیے تنگ و دو کرتے اور ضرور کامیاب ہوتے۔

ب :- جناب امیر رضی اللہ عنہ عہد خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم میں خاموش رہنے کوئی گڑبڑ نہ کرنے اور

خلفائے ثلاثہ کی اطاعت و فرماں برداری سے پیش آنے پر مامور تھے۔ اور انہوں نے اس حکم الہی کی پوری پوری پابندی فرمائی فہو المراد یہی ہمارا مقصد ہے۔

ج : بعض ائمہ مثلاً جناب باقر و صادق رحمۃ اللہ علیہما کو کسی کے ساتھ تفتیہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ لہذا ان کے وہ تمام افعال و روایات جو اہل سنت کے نزدیک ان سے بطریق تواتر و شہرت مروی ہیں سب کے سب سچائی اور ظاہر پر مبنی ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما علماء اہل سنت نے آپ سے جو کچھ سیکھا وہ سب فرمودہ خدا تھا۔ مگر شیعوں نے جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے وہ ان اقوال میں جو اہلسنت کی موافقت میں ہیں اور انکی کتابوں میں مذکور ہیں رد و بدل کر کے ان کو تفتیہ پر محمول کرتے ہیں تو یہ تحریف و تفسیح تو ہے ہی مگر اسی کے ساتھ وصیت کے بھی صاف طور پر خلاف ہے۔

چھٹی روایت سلیم بن قیس ہلالی نے اپنی کتاب احتجاجات میں اشعث بن قیس سے ایک طویل روایت کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

امیر المؤمنین (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور لوگوں کا بھگاؤ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی طرف ہوا اور آپ سے بیعت لی گئی تو میں نے فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو اونٹ پر سوار کیا اور حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کا ہاتھ پکڑا اور اہل بدر، مہاجرین و انصار کے سابقین میں سے کسی کو نہ چھوڑا جس کو میں نے اپنے حق کیلئے قسم نہ دی ہو اور اپنی مدد کے لیے نہ بلایا ہو مگر ان حضرات میں سے چار کے سوا میری بات کرنا و القعداد۔

کسی نے بھی نہ مانی۔ یعنی زبیر، سلمان ابوذر اور مقداد (رضی اللہ عنہم)

یہ روایت بھی صاف غمازی کر رہی ہے کہ امام برحق پر تفتیہ واجب نہ تھا اگر واجب ہوتا تو خاتون جنت اور شباب اہل جنت کے سرداروں کو لیکر یوں در بدر نہ پھرتے۔ اس میں فائدہ کی کوئی بات نہ تھی بلکہ جو لوگ بیعت کر چکے تھے ان کے سامنے ایسی بات کے اظہار میں تو سر اسر مضرت تھی۔

ساتویں روایت۔ بھی سلیم بن قیس سے ایک دوسری کتاب میں جو شیعوں کے ہاں "ابان بن عباس" کے نام سے مشہور ہے اس نے سلیم سے اسکی یوں روایت کی ہے

إِنَّ أَبَا بَكْرٍ بَعَثَ إِلَى عَلِيٍّ عَلَى قُنْفُذٍ أَحْيَيْنَ كَيْفَهُ النَّاسُ وَلَمْ يُبَايِعْهُ عَلَى وَقَالَ لَهُ انْطَلِقْ إِلَى عَلِيٍّ فَقُلْ لَهُ أَجِبْ خَلِيفَةَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنْ انْطَلَقَ فَلْيُخْبِرْهُ فَقَالَ لَهُ مَا أَسْرَعُ مَا كَذَبْتُمْ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جب لوگوں نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لی اور علی (رضی اللہ عنہ) نے ان سے بیعت نہ کی تو ابوبکر نے قنفذ کو ان کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو تسلیم کر لو پس اس نے جا کر یہ بات پہنچا دی تب علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا تم لوگوں نے

وَأَمَّا كَذَبُورُ اللَّهِ مَا اسْتَخْلَفَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهِيَ -
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس قدر جلد جھوٹ منسوب
 کر دیا۔ اور ان سے پھر گئے خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے میرے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

یہ روایت بھی تفسیر کے بطلان کا علی الاعلان اظہار کر رہی ہے۔
 آنھوں نے روایت کتاب سلیم میں اسی ابان سے مروی ہے۔

إِسْمًا مَّا لَمْ يُجِبْ عَلَى غَضَبِ عُمَرَوَ أَضَرَمَ
 بِالنَّارِ بَاب دَارِ عَلِيٍّ فَاحْرَقَ الْبَابَ وَدَفَعَهُ
 فَأَسْتَقْبَلَتْهُ فَاطِمَةُ وَصَلَتْ يَا أَبَتَاهُ وَيَا رَسُولَ
 اللَّهِ فَرَفَعَ عُمَرُو السَّيْفَ وَهُوَ فِي غَمَدِهِ فَوَجَّحِي بِهِ
 جَنْبَهَا وَرَفَعَ السَّوْطَ فَضَرَبَ بِهِ رُءُوسَهَا فَصَلَّتْ
 يَا أَبَتَاهُ فَاخْذَعِلِي بَسَلًا يَبِ عُمَرُو وَهَرَّةٌ وَوَجَّحِي
 أَلْفَا وَرَقَسْتَهُ -
 جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ
 عنہ کی خلافت نہیں مانی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت
 خفا ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ کو آگ
 لگا دی اور جلا کر اسکو ڈھادیا فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا
 بابائی و بائی دیتی ہوئی آئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے
 میلان سمیت اپنی تلوار سے انکی کوکھ میں کچو کا دیا اور
 کوڑا ان کے پیروں پر مارا وہ پھر ہائے بابا چلائیں تو حضرت

علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گردن دبوچی اور اسے جھٹکا دیا تاکہ وگدی کو بھی رگڑا۔
 انہیں روایت اسی کتاب میں یہ بھی درج ہے۔

قَالَ عُمَرُو لِعَلِيٍّ يَا أَبَا بَكْرٍ - قَالَ إِنَّ لَكَ أَفْعَلَ
 ذَلِكَ قَالَ إِذَا وَاللَّهِ يُضْرِبُ عُنُقَكَ قَالَ كَذَبْتَ
 وَاللَّهِ يَا ابْنَ صَخَاكَةَ لَا تَقْدِرُ عَلَى ذَلِكَ أَنْتَ
 الْأَمْرُ وَأَضْعَفُ مِنْ ذَلِكَ -
 عمر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا ابوبکر رضی اللہ عنہ
 کی بیعت کر لو آپ نے کہا اگر نہ کروں تو پھر کیا ہو گا انہوں
 نے فرمایا تب بخدا تم قتل کر دے جاؤ گے علی نے کہا اے
 ابن صخاکہ بخدا تم نے جھوٹ کہا تم اس پر قادر نہیں ہو
 سکتے تم تو اس سے زیادہ لیم اور کمزور ہو۔

اس روایت نے تو تفسیر کا ناس ہی مار دیا۔ اور جبر بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا کہ جناب امیرؓ نے گالی بھی دی تکتذیب
 بھی کی اور اس پر قسم کھا کر اسے پختہ اور موکد بھی کیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اضعف الخلق کہا۔
 حالانکہ شیعوں کی اصح الکتاب منہج البلاغہ میں منقول و مروی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ
 ان کے لشکر اہل شام کی بدکولی کرتے اور گالیاں دیتے ہیں تو آپ نے انکو اس سے روکا اور فرمایا کہ مجھے تمہارا گلہ
 ہونا پسند نہیں۔ اب پتہ نہیں آپ نے اپنی زبان کو گالی سے آلودہ کرنا کیوں پسند فرمایا۔

دور اصل یہ زبان آپ کی ہے۔ نہ آپ کا اخلاق ہے۔ یہ تو کسی بد فطرت کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ اپنی زبان ان
 کے دہن مبارک میں ٹھونسے کی ناپاک جسارت کر رہا ہے۔ (ن)

دسویں روایت محمد بن سنان کی روایت ہے۔

أَنَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَالَ لِعُمَرَوِ بْنِ الْخَطَّابِ
 يَا مَعْزُومُ إِنِّي أَرَاكَ فِي الدُّنْيَا قَتِيلًا يَجِيءُ أَحَدٌ
 امیر المؤمنین نے عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہما) سے کہا اے
 معزور میں مجھکو دنیا میں مقتول دیکھ رہا ہوں کہ عبد بن معمر

مَنْ عَبْدُ بَنٍ أَمْرٌ مَعْتَبَرٌ تَحْكُمُ عَلَيْهِ جَوْرٌ أَفْتَكُلُكَ
يَدْخُلُ بِذَلِكَ الْجَنَانَ عَلَى رَغْمِهِمْ مِنْكَ -
اور وہ تمہیں قتل کر دے گا اور تمہارے نہ چاہنے کے باوجود جنت میں جا سکا۔

پڑھتا جا رہا تھا، اس گرج چمک میں کہیں تقیہ کا وجود نظر آتا ہے، کو سوں منزلوں اس کا تو پتہ نہیں۔
گیا رہیں روایت یہی محمد سن رومی ہے۔

امیر المومنین نے عمر (رضی اللہ عنہما) سے کہا کہ تمہارے لیے نیز جسکی جگہ تم نے سنبھالی ہے یقیناً بے آبروی اور سولی پر چڑھنا ہے۔ تم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس سے نکال دیے جاؤ گے اور سولی پر جاؤ گے ایک سوکھے درخت پر چوہے لے آسکا۔ اس سے تمہارے ہمدرد فتنہ میں پڑ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ آگ لائی جاسیگی جو ابراہیم کے لیے بھڑکائی گئی تھی اور جرجیس، دانیال اور ہرنبی صدیق آئیں گے پس تم دونوں اسمیں ڈالے جاؤ گے اور جلانے جاؤ گے اور رکھ ہو جاؤ گے پھر ہوا آئے گی اور تم کو سمندر میں ڈال کر نیست و نابود کر دیں گی۔

أَنْ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَالَ لِعُمَرَ إِنَّ لَكَ وَلِصَلِّحِكَ
الَّذِي قُمْتَ مَقَامًا هَذَا فَصَلِّبَا مَعَهُ جَانِ مِنْ جَلَدٍ
رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَضَلَّ بَانَ عَلَى نَوْحَةٍ
يَا لَيْسَتْ فَتَوَرَّقَ فَيَنْتَنُ بِذَلِكَ مَنْ قَالَ الْكَمَائِثُ
تَوَلَّى بِالنَّارِ الَّتِي أَضِيَتْ لِرَجْمِ هَيْمَةَ وَيَأْتِي
جَرْجِيْسُ وَدَانِيَالُ وَكُلُّ بَنِي صَدِيقٍ فَتَضَلِّبَانِ
فِيهَا فَتَحْتَمِلَانِ وَتَصْنِرَانِ رِمَادًا اشْتَعَلَتْ فِي رُءُوسِهِ
ثُمَّ تَنْسِفُكُمَا فِي الْيَمِّ نَسْفًا -

یہاں بھی دامن تقیہ تار تار ہے اور اصول تقیہ اشکار۔

رہنمہ جبر بالا روایت کے متعلق بلا ریب و شک ہر مسلمان جانتا ہے کہ جناب امیر یہ الفاظ و بیان تو کجا لکھو پتہ تک نہیں ہو گا کہ سبائیوں نے ان کی طرف کیا کیا جھوٹ منسوب کر کے پھیلا دیا ہے۔ البتہ اس روایت سے رافضیوں کی ان وارداتوں کی ضرورت تصدیق ہو گئی جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ جن میں ان بد بختوں نے کئی مرتبہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے اجساد مبارک کو پہلوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکال کر اسی سبائی بکواس کو علی جامہ پہنانے کی ناکام کوشش کی۔ اور اسی کوشش میں ایک مرتبہ ہم رافضی مسجد نبوی میں غرق زمین ہو کر کندہ جہنم بنے جس کا نشان ہنوز موجود ہے۔ (ن)

گو تقیہ کے بطلان کی روایات کتب شیعہ میں بے شمار موجود ہیں مگر یہاں صرف بارہ روایات پر اکتفا کیا گیا۔ کسی بھی عقلمند کو ان روایات کے مطالعہ کے بعد یہ شک نہیں رہے گا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جو اپنے دشمنوں میں جبری، ہیبت، سرکشی اور دبدبہ میں مشہور اور ضرب المثل تھے وہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سامنے ہر معاملہ میں بودے، پست ہمت اور حقیر و ذلیل تھے۔ تو پھر دوسرے حضرات جو آپ سے کمزور ضعیف و بزدل تھے ان کا معلوم نہیں بدحواسی میں کیا حال ہوتا ہو گا، ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہو گئے لہذا معلوم ہو گیا کہ جناب امیر کا امور مملکت میں دخل نہ دینا۔ اور ان کو ان ہی چند ضعیف و کمزور و حقیر لوگوں کے صوابدید پر دیدہ و دانستہ چھوڑے رکھنا بے بسی اور تقیہ پر مبنی نہیں تھا اگرچہ یہ بھی پتہ چل

کیا تھا کہ ایسا کرنا مخلوق کے دین و ایمان کے فساد کا سبب بنا اور شریعت کی تحریف اور کتاب اللہ کی تبدیلی جیسے نتائج اس پر مرتب ہوئے۔ اب اس کا جواب شیعہ ہی دیں کہ اس قدر طاقت و قوت اور دبدبہ رکھتے ہوئے جناب امیر نے فساد عقیدہ، تحریف شریعت اور تبدیلی کتاب اللہ کیسے اور کیوں گوارا فرمائی۔ جبکہ مذکورہ بالا روایات نے تقیہ کے اصول کو توجہ دلایا۔

ائمہ سے تقیہ کا وقوع سراسر جہن، بزدلی، بے عزتی اور نا حفاظتی ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ موت بھی ان کے ہاتھ میں ہو گذشتہ و آئندہ حالات کی ان کو خبر بھی ہو اور پھر تقیہ بھی اس حد تک کہ فاسق و فاجر، انکی لڑکیاں اور بہنیں چھین لیں وہ انتقام کی قدرت بھی رکھتے ہوں بلکہ اول قدم پر ہی دفاع اور رد و کدینے کی صلاحیت بھی حاصل ہو۔ کہ پھر کسی تعب و مشقت کی بھی ضرورت نہ رہے، صرف ایک کمان ڈال دینے اور زبان ہلا دینے سے کام تمام ہو جائے بہر حال ایسا ذلیل اور قابل نفرت خیال و تصور ان محترم حضرات کی شان میں کسی مسلمان کے دل و دماغ میں تو ہرگز نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ یہ صریح کفر ہے یہ ساری قباحتیں اور نحوستیں تو اس منحوس تقیہ کے اصول کی پیداوار ہیں اور اس کے واجب ہونے سے کب بلکہ صرف واقع ہو جانے سے وہ ساری اغراض فوت ہو جاتی ہیں جو نصب امام سے مقصود ہوتی ہیں نہ ہی امت ظاہر ہو پاتی ہے نہ ہی شریعت کی حفاظت اور نہ ہی حق باطل سے تمیز پاتا ہے۔ اور اگر کوئی ابتداء دعویٰ امامت و خلافت کرے اور جب دیکھ کر لوگ اسکی امامت کے منکر ہیں اور اس سے سختی و ددشتی سے پیش آتے ہیں تو وہ تقیہ اختیار کر کے بیٹھ جاتے اور ہر معاملہ میں ان کا شریک علی رہے تو عوام و خواص یہ سمجھیں گے کہ اس نے اپنے دعویٰ سے رجوع کر لیا ہے۔ اور یہ بھی یقین کر لیں گے کہ آدمی ٹھڈا دلا اور بڑبڑلاتا تھا کہ اتنے بڑے منصب کا دعویٰ تو کر بیٹھا مگر کچھ چلتی نہ دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔

درحقیقت یہ خیال حد درجہ نازیبا و ناشائستہ ہے اور کوئی بھی مسلمان اسکو پسند نہیں کر سکتا مگر اسکو کیا کیا جائے کہ شیعہ روایات جو ان کے ہاں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی بابت ملتی ہیں اسی حالت کو ثابت کرتی ہیں۔ بغرض محال ہم یہ مان بھی لیں کہ تقیہ میں کوئی خرابی نہیں، مگر لڑکیوں اور بہنوں کے چھین لیے جانے پر دب جانا اور دم بخود رہ جانا مسلمان کی دل شکنی اور نفرت قلبی کے لیے تو یہی کافی ہے۔ اور ان کی یہ اشک ثنوی بھی بے کار اور افتراء ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دختر جناب امیر رضی اللہ عنہ پر حاوی نہ ہو سکے کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو گیا۔ یہ ایک دیدہ دلیرانہ چوری ہے جو حضرت سارہ علیہا السلام کے قصہ سے اڑائی گئی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ایک ظالم نے ان عفت ماب کو غصب کر لیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سر بسجود مصروف التجار تھے۔ وہ بد بخت جب بھی بد نیستی کرتا بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ مگر یہاں تو قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے باقاعدہ نکاح میں آگئیں پھر ان کے بطن سے زید بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف پیدا ہوا بلکہ زندگی کی بیشش بہاریں بھی دیکھیں اور عین عالم شباب میں بنی عدی کی باہم خانہ جنگی میں صلح و صفائی کے لیے جاتے ہوئے رات کی اندھیری میں کسی نامعلوم فرد کے ہاتھوں مغالطہ میں شہید ہو گئے اور اتفاق یہ کہ آپ کی والدہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی اسی روز بیماری کے سبب فوت ہوئیں۔ دونوں

جنازے ساتھ لائے گئے جناب حسین و عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے نماز جنازہ پڑھی اور دفن کیا۔ اور کچھ نہ بھی ہو تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری لمحہ تک ان پاکباز محترمہ رضی اللہ عنہا کا آپ کے گھر میں رہنا بلاشبہ ثابت ہے۔ اول تو جگر پارہ رسول کا ایک "فاجر و کافر" کے ہاتھوں چھین جانا ہی مقصور نہیں اور اگر ہو بھی گیا تھا تو یہاں خلاصی زیادہ متوقع تھی۔ اور نکاح کے بارے میں عند پریش کرنے کی خاطر یہ بے حیا قوم جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت نقل کرتی ہے کہ اول فرج غصب منہ اس کو سکر تو مسلمانوں کے روگئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر لعنت ہے ان بد باطن بد بختوں پر کہ محض عداوت عمر میں اتنے اندھے ہو گئے کہ اس قسم کی کفریات پاکبازانہ اطہار پر یکے میں بھی انہیں ذرا شرم و عار نہیں۔ حالانکہ ان کے شرمناک جھوٹ کی تکذیب کے لیے خود کتب امامیہ میں صحیح روایات موجود ہیں۔ جو عداوت عمر کی بنا پر طاق لسیان بنا رکھی ہیں۔ ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یاد دہرے اندھے ہیں۔ تو دنیا تو اندھی نہیں ملاحظہ فرمائے۔

سُئِلَ الْإِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ الْبَاقِرُ عَنْ تَوْبِهَا فَقَالَ لَوْلَا أَنْبَاءُ أَهْلِهَا مَا كَانَتْ تَوْبُهَا إِيَّاهُ وَكَانَتْ أَشْرَفَ بَسَائِرِ الْعَالَمِ جَدَّهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَخَاهَا الْحُسَيْنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدُ أَشْبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَبُوهَا عَلِيُّ ذُو الشُّرَفِ وَالْمَنْقِبَةِ فِي الْإِسْلَامِ وَأُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَدَّهَا خَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ -

جناب محمد بن علی الباقر رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے نکاح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر حضرت عمر کو جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لائق نہ پاتے تو ان سے نکاح ہی کیوں کرتے وہ تمام مستورات عالم میں شریف ترین تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نانا۔ جو انان جنت کے سردار حضرات حسنین رضی اللہ عنہما۔ ان کے ماں جائے نکاحی شرف و منقبت کے مالک حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد اور سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا رسول اللہ کی جگر گوشہ ان کی والدہ ہیں ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ان کی نانی۔

ان کو یہ بات تو سامنے رکھنی چاہئے تھی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک شیعہ کی برائی کرنے پر اتنی شدت سے باز پرس کی اور کمان کا اثر دہا بنا کر ان کو ہراساں اور بے عزت کیا۔ تو کیا وہ اپنی بیٹی کے چھین جانے پر اور عزت و ناموس کا سوال درپیش ہونے پر ایسے ہی ٹھنڈے مزاج کا ثبوت دیتے اور ان کی لگ غیرت و حمیت میں کوئی جنبش نہ ہوتی اور وہ خاموشی سے بغیر تعارض کئے اسے گوارا کر لیتے۔ ایسی پاک مظهر مگر امیر الحق احترام ہستیوں کے متعلق وقوع زنا کا وہم بھی اپنے دل لانا گویا مجبوری سے ہو مسلمانوں کے کھلا کفر ہے۔ مگر کھلے کفر کے مرتکب یہ ناپاک اور بد فطرت گروہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کی پاکی و پاکبازی قرآن مجید میں نازل فرمائی ہے ان کے پاک دامن کو محض عداوت و بغض و عناد عمر رضی اللہ عنہ کے سبب اس فعل کے دلغ سے داغدار کرے اور جناب امیر اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو بے غیرتی اور بے ناموسی کے اہتمام سے متہم کرے۔ مگر یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ ساری کالک ان ملعونوں

ہی کے چہروں کا تاقیام قیامت بزر ہے گی۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے سبائی منصوبوں کی خاطر سارے ہی قابل احترام و شرف بزرگوں کو خورج کرنے کی ناپاک منصوبہ بندی کی جسارت کی ہے جسکی پاک دامنی کا خدائے گواہ ہے ان کے دامن پر تو یہ منافق و کافر کیا دھبہ کاری کریں گے۔ البتہ خود ہی قرۃ عاسنین بسکر رہیں گے۔ انہوں نے عداوت و بغض میں جس کفر و زندلیقیت کا مظاہرہ کیا اسکی نظیر کسی فرقہ میں پائی گئی نہ پائی جاسکی شیطان بزرگان قرآن آدم (النسان) کا کھلا دشمن ہے اور انتہا درجہ کی عداوت اور بغض رکھتا ہے مگر اس نے بھی خدا تعالیٰ پر کوئی تہمت یا جھوٹ نہیں جوڑا اور اسے مجھادی و بے بسی جیسے نقائص سے مشہم نہیں کیا۔

فائدہ عظیم

جب تفسیر کی بات بحث میں آئی گئی تو فرق اسلامیہ میں اسکے سلسلہ میں جو افراط و تفریط پائی جاتی ہے اسے بھی مختصر بیان کر دینا مناسب معلوم ہوا۔

اگر تفسیر میں شیعوں کے ہاں حدود و جرافراط ہے تو اسکے مقابلہ میں خوارج کے ہاں بے انتہا تفریط و ریشعیوں کا افراط ان کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ معمولی اور بہت ہی معمولی خوف یا لالچ کے باعث اظہار و اقرار کفر بھی جائز سمجھتے ہیں۔ بلکہ واجب گردانتے ہیں۔ اور خوارج کی تفریط یہ ہے کہ وہ دین کے مقابلہ میں جان و ناموس کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو اپنے انتہا پسند مزاج کے باعث اس باب میں عجیب عجیب زیادتیوں سے کام لیتے ہیں۔ اس میں سے ایک یہ کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی چور یا غاصب آکر اسکا بہت سامان و دولت لے جانا چاہے تب بھی اسکو نیت توڑنا حرام ہے۔ چنانچہ وہ حضرت بریدہ اسلمی صما لے رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کرتے ہیں کہ وہ نماز میں اپنے گھوڑے پر نظر رکھتے تھے کہ بدک کر بھاگ نہ جائے۔

اسلئے مناسب ہوا کہ مذہب اہل سنت جو درمیانی درجہ ہے کو تحریر میں لے آئیں اہلسنت کی اکثر کتب میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ پہلی بات تو یہ کہ تفسیر ایک مشروع فعل ہے چنانچہ آیات ذیل اسکی دلیل ہیں۔

لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ
الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي
شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ ثَمَنًا

ہو تو اور بات ہے۔ یا فرمایا۔
إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ

پیر جاسوا ہو۔

ان کے علاوہ بھی اور بہت سی آیات ہیں
تفسیر کی تعریف یہ ہے کہ جان، مال، اور آبرو کو دشمن کے شر اور اسکی دست و برد سے بچائیں۔
دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن سے دینی و ملی اختلاف کے سبب دشمنی ہو جیسے کافر و مشرک

مرتد وغیرہ، دوسرا وہ جس سے کسی دنیاوی اغراض و اسباب کے سبب دشمنی ہو۔ جیسے مال و جائیداد، اسباب وغیرہ، جب دشمنی دو طرح کی ہوتی تو لامحالہ تقیہ کی بھی دو قسمیں ہوں گی۔ پہلی قسم جس میں اذروئے شرع تقیہ کی صورت یہ ہوگی کہ جب مسلمان کسی ایسی جگہ گھر جائے جہاں کافروں کی وجہ سے دین و مذہب کو ظاہر نہ کر سکے تو اسپر ہجرت واجب ہو جاتی ہے وہ اس جگہ کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جائے جہاں اسے اپنے دین مذہب کے اظہار کی آزادی اور پوری قوت میسر ہو۔ اسکے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اپنی کمزوری کیلئے کوئی جواز تلاش کر کے اپنے مذہب و طریقہ اسلام کو چھپائے۔ اس پر قرآنی قطعی نصوص وارد ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا عِبَادِي اِنَّ اَرْضِيْكَ وَاَسَعَتْ لِيْ اَيَّامِيْ فَاعْبُدْنِيْ ۔ میرے بندو میری زمین بڑی وسیع ہے۔ پوجا صرف

میری ہی کرو۔ ۔ یا ارشاد ہوا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّيْنَاهُمُ لَكُنَّا ظَالِمِيْنَ اَلْقُسُفُہُ قَالُوْا فِیْكُمْ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْا لَسْتَ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاَسَعَتْ فَتُحَاجُّوْا فِیْهَا قَالُوْا لَیْسَ مَا دَلَّمْكُمْ جَهَنَّمَ وَاَسَاءَتْ مَصِيْرًا ۔ جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہوا ہوتا ہے فرشتے جب انکی روح قبض کرتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ تم کہاں پھنسے ہوئے تھے وہ کہیں گے کہ ہم زمین کے کمزور افراد تھے۔ فرشتے ان سے کہیں گے کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی۔ تم وہاں ہجرت کیوں نہ کر گئے۔ ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے ہاں ترک ہجرت میں کوئی واقعی عذر ہو تو وہ قابل لحاظ ہوگا۔ مثلاً عورتیں، بچے، اندھے، لنگڑے، لولے، اپاہج، زیر حراست یا قیدی، یا انہیں کی مانند۔

مخالفین اگر خود اسکو یا اسکے ماں باپ بیوی بچوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہوں اور گمان غالب ہو کہ وہ اپنا ارادہ قتل پورا کر کے رہیں گے۔ خواہ یہ قتل دانتہائی بند کرنے یا جلا وطن کرنے یا کسی اور صورت سے ہو ایسی صورت میں بقدر ضرورت ان سے زبانی موافقت کی اجازت ہے۔ مگر ایسی حالت سے بچ نکلنے کی کوشش اور حیلہ جوئی واجب ہے۔

اور اگر یہ خیال ہو کہ کچھ مالی یا بدنی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے جو قابل برداشت ہو، مثلاً قید و بند، یا غیر مملکت مارپیٹ، ایسی صورت میں مخالف کے ساتھ موافقت جائز نہیں۔ جواز کی صورت میں بھی موافقت رخصت ہے ورنہ اس وقت بھی عزیمت یہی ہے کہ دھڑلے سے اپنے مذہب کا اظہار کرے چاہے جان جاتی ہی رہے۔ (درحقیقت یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل ہی جدا ایک دوسری ہی کیفیت ہے۔ اسکو رخصت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گو صورتہ تقیہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے لحاظ سے آسمان و زمین کا فوق ہون) اب ذرا شیعوں کی سہل انگاری اور زیادتی دیکھئے کہ معمولی سے مال و زر کی خاطر بلکہ مجلس میں کسی اعزاز و اکرام کی امید میں بلکہ صرف زبانی طور پر خود کو قبلہ و صاحب کھلوئے اپنا دین و ایمان سچ کر مخالف کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور ہجرت کو ہرگز واجب نہیں جانتے اور ان تمام قرآنی آیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں ترک ہجرت پر حکم کھلا عتاب فرمایا گیا ہے اور یہ کوئی پہلی مثال نہیں بلکہ انکا معاملہ تمام قرآن

کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ ان کی معتبر کتب میں یہ مذکور و مسطور ہے۔

مَنْ صَلَّى خَلْفَ سُبْحِي فَكَأَنَّمَا صَلَّى خَلْفَ نَبِيِّ - جس نے سنی کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

مگر تھوڑے سے ناپ و آش کی خاطر دیکھ لیجئے اپنی نماز کس طرح خراب کرتے اور اس نماز کے مقابلہ میں دوسری نمازوں کے زیادہ ثواب کے امیدوار بنے رہتے ہیں۔

ایسی ہی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرقہ مذہبی اعتقادات میں کتنا بودا اور لا پرواہ اور حیلہ ساز واقع ہوا۔ غیرت اور شدت کی تو اسمیں بوباس تک نہیں اکسا سارا اور رخصنا، بچھونا، وہ تعصب اور اندھا پن ہے جو یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر بدگوئی کرنے اور طعن و تشنیع میں صرف کرتے ہیں دینی مشقت برداشت کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتے۔ دنیا کا حقیر ساز و سامان، یہاں کی راحت و لذت ان کے نزدیک دین و آخرت کے بڑے منافع اور دیر پا نعمتوں سے بھی زیادہ عزیز تر اور اہم تر ہیں۔ یہ واضح اور صحیح طور پر اس آیت کے مصداق ہیں۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ | اسی لوگ ہیں جنہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے فَلَآ يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ۔ دامن خرید رہے۔ وہاں نہ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائیگی نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

دنیا بھر کے عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ محبت و بغض، تصدیق و تکذیب، اور اخلاص و نفاق کے دعوے کے جھوٹ سچ جاننے اور پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ تجربہ براہ و بلا و مصائب کے وقت منافع کے تلف ہو جانے، لذتوں کے شرک کرنے اور رنج و مشقت کے برداشت کرنے کے باوجود اپنے دعویٰ پر مصر اور ثابت قدم رہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ یوں تو ہر شخص مصلحت و وقت کے موافق اپنے متعلق کوئی نہ کوئی دعویٰ رکھتا ہی ہے۔ اگر ان عام اور معمولی تکالیف سے بچنے کیلئے تقیہ لازم ہو جائے تو سچ جھوٹ میں تمیز کیسے ہو سکے گی۔ اگرچہ علم الہی میں دلوں کی پوشیدہ اور سینہ کی چھپی ہوئی باتیں روشن ہیں۔ اور اسکو امتحان کی حاجت بھی نہیں۔ لیکن دینی تکلیف کا مدار اور امر و نہی پر عمل کا پتہ تو امتحان نما معاملات پر ہے۔ چنانچہ اس معاملہ کو صفائی سے ظاہر فرمایا۔

لِيَبْلُوكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا - تاکہ تمہیں پرکھے کہ بلحاظ اعمال کون اچھا ہے۔

یا فرمایا۔

وَلِيَبْلُوكُمْ حَتَّىٰ تَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالضَّالِّينَ - ہم تم کو یقیناً آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے

مجاہدین اور ضالین کون ہیں۔ اور فرمایا

وَلِيَبْلُوكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ - البتہ ہم آزمائیں گے تمکو خوف و دہشت اور بھوک سے (سابقہ ذال کر) اور مالوں جانوں اور سپیداوار میں کمی ڈال کر۔

اب رہی دوسری قسم تو اس صورت میں ہجرت واجب ہونے اور نہ ہونے میں علماء کی آراء مختلف ہیں ایک گروہ اسے واجب کہتا ہے اور اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتا ہے وَلَا تَلْفُتُوا يٰۤاَيُّدِيْكُمْ اِلَى التَّحٰلُفِ (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) اور دوسری دلیل مال کے ضائع کرنے کی ممانعت سے لی ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ہجرت واجب نہیں۔ کہ وہاں سے ہجرت دنیاوی مصالح میں سے ایک مصلحت اور ملت کے اتحاد کے سبب ہجرت نہ کرنے سے اس کمزور و ضعیف شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ اسکا غالب دشمن بحیثیت مسلمان اس سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔

دونوں گروہوں کے مابین فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اپنی جان یا عزیز و اقارب کی ہلاکت کا یا شدید بے عزتی کا خطرہ ہے تو یہاں سے بھی ہجرت واجب ہے۔ لیکن یہ ہجرت عبادت اور لائق ثواب نہیں کہ اس پر اسے ثواب بھی ملے اسکا وجہ محض اس شخص کی دنیاوی مصلحت کی بنا پر ہے

تحقیق کی بات یہ ہے کہ ہر واجب عبادت نہیں ہوتا بہت سے واجبات ہیں کہ ان پر کوئی ثواب نہیں مثلاً سخت بھوک کے وقت کھانا، مرض میں یقینی اور ظنی نقصانات سے بچنا صحت کی حالت میں سمیات سے پرہیز کرنا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہجرت بھی اسی قسم کی ہے۔ یہ ہجرت الی اللہ اور سولہ نہیں ہے کہ ثواب آخرت کا سبب بنے۔ تقیہ سے متعلق اس مفید بحث کے بعد اب ہم اصل معاملہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد مبارک میں ہرگز تقیہ نہیں کیا۔ پسندیدہ دین کے اظہار پر آپ کو قدرت تھی۔ دین و دنیا کے کسی معاملہ میں آپ کسی سے خائف نہیں تھے۔ امر دین میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے ہجرت نہیں فرمائی اگر آپ خائف ہوتے تو آپ پر بموجب آیت قرآنی اِنَّ الَّذِیْنَ تَوْفَّعْتُهُمْ اَلَا سَیِّئُوْنَ اور دنیاوی امور میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مال و جان کے بارے میں آپ سے نہ کوئی لڑا جھگڑا نہ الجھا اور نہ سخت کلامی سے پیش آیا اس کے برعکس ہر گھم و مہ آپ کی نہایت تعظیم و توقیر کرتے۔ اور محبت سے پیش آتے تھے اور آپ کا برتاؤ بھی سب کے ساتھ علی قدر مراتب تھا۔ چنانچہ تاریخ اس پر گواہ ہے۔

رباشیعوں کا مذہب تو وہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے محققین تو آپ کی خود اپنی خلافت میں بھی تقیہ کو واجب بتاتے ہیں چہ جائیکہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں۔ یہاں قاضی نور اللہ شوستری نے بڑی بلوچ اور گوند شتر قسم کی بات کہی ہے وہ کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے لڑائی کا نہ ہونا (یعنی عہد خلفاء ثلاثہ میں) ایسا ہے جیسا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل ہجرت مقابلہ نہ کرنا یا اکثر انبیاء کا مقابلہ نہ کرنا۔

یہاں قاضی صاحب کو ہجرت کے لفظ سے دھوکا لگا ہے اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا حال اپنی کریہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل ہجرت حال کی طرح ہے تو پھر ان کا حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے وقت یا ہجرت کے بعد کے حال کے مطابق کیوں نہ ہو حالانکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ ہی نہیں فرمایا یہ بات

بالاجامع ثابت ہے اس سے انکار و فرار ممکن ہی نہیں۔

خدا اور رسول کے متعلق ہلکی بات یا سوچے سمجھے کوئی کلمہ منہ سے نہیں نکالنا چاہئے۔ اور پھر قبل ہجرت ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا یہ حال تھا کہ وہ البوجہل، اور امیہ بن خلف کے ساتھ مل کر لغو ذلالت و منات کو پوجتے تھے یا دوسرے رسوم جاہلیت اور ذبح لغیر اللہ میں ان کے شریک عمل تھے یا ان کی مدح و ثنا اپنا ورثہ بنایا ہو تھا۔ یا ان کے ساتھ ہم پیار و ہم نوالہ رہتے تھے۔ یا احکام میں ان کی پیروی کرتے یا یہ کہ ہمہ وقت و ہمیشہ باہم مقابلہ گفت و شنید اور مار پیٹ رہتی تھی۔

آپ تو ان کی عادات اور رسوم کی برائی اور بھور بلا کرتے۔ لوگوں کو برسر میدان علی الاعلان دین حق کی طرف بلاتے اور سختیاں برداشت کرتے۔ حتیٰ کہ بعد ہجرت کے انصار و مددگار پیدا ہوئے تو زبانی دعوت سے گذر کر نوبت تلوار و تلنگ تک پہنچی۔ تو گویا وہاں تو مراتب انہار میں ترقی تھی تقیہ اور پوشیدگی کا وہاں کیا سوال یہی حال انبیاء سابقین علیہم السلام کا تھا ہاں جب اور جن انبیاء کرام پر جہاد باسیف واجب نہ تھا بلکہ اسکا تعلق امراء و ملوک سے تھا اور جوانیاء کے زیر فرمان تھے اس لیے وہ خود جنگ و جدال اور جمع لشکر میں مشغول نہ ہوتے تھے۔ اور جب ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مامور بجهاد ہوئے (اور یہ جہاد تا قیام قیامت جاری قرار بھی دیا گیا) تو یہ ضروری قرار پایا کہ آپ کے خلفاء ہی نہیں آپ کی ساری امت بھی مامور بجهاد ہو۔ اب اگر کوئی شخص انبیاء سابقین کی سنت جہاد کو ترک کرے اور اس ترک کو لازم قرار دے لے تو بلاشبہ کافر ہو جائے۔ اور کبھی ایسا نہ ہوا نہ ہو گا کہ بغاوت اور کفر کے ظہور کے بعد ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب یا خلیفہ سے وجوب جہاد ساقط ہو جائے۔

لہذا جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حال کو انبیاء سابقین کے حال پر قیاس کرنا ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کیلئے نمازیں بیت المقدس کی طرف منہ کرنا فرض تھا نہ کہ کعبہ مکہ کی طرف۔ اور آیت استقبال قبلہ سے پیشتر آپ کا حال بھی وہی تھا جو انبیاء سابقین اور خود ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حال تمام احکام شریعہ میں تھا۔ ایسی جہونا نہ بڑا لگانے والے کو غفلت کی فہرست سے خارج کر دینا چاہئے آیت جہاد کے نزول سے پہلے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکے نزول کا انتظار تھا اور آپ ترک قتال فرماتے ہوئے تھے۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کس بات کا انتظار تھا۔ قرآن میں تو امت محمدیہ پر جہاد و قتال واجب ہو چکا تھا۔ پھر اول الامر جو پیغمبر علیہ السلام کے نائب ہیں اور جنکے تقرر سے غرض محض یہ ہے کہ جہاد کریں۔ دین کا اعلان کریں اور ظالم سے مظلوم کا حق دلائیں کس بات کا انتظار کرتے رہے اور کیوں "جہاد" نہیں کیا۔ یہ ہے مبلغ علم ان کے علماء کا اور حال ان کے محققین کی بے سرو پا بکواس کا عوام کا تو کہنا ہی کیا۔

اب تقیہ سے متعلق اہلسنت کے خیالات بھی گوش گزار کر لیجئے۔

اہل تاریخ کا اس پر اجماع ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا کہ آپ اگر یزید کی بیعت کر لو اور اسے امام برحق تسلیم کر لو تو ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ جہاں رہنا منظور ہو بخوشی رہو بار بار یہ پیشکش ہوئی مگر جب آپ نے یزید کو اپنے رویہ پر ڈٹا پایا اور اسے قابل امامت نہ سمجھا تو آپ نے حکم کھلا اس کی بیعت

سے انکار کر دیا اور ہرگز کوئی تقیہ نہ فرمایا اور پھر پیش آیا جو پیش آنا تھا۔

لہذا اگر تقیہ واجب ہوتا تو اسکے اس سے زیادہ سازگار حالات اور کس ہو سکتے تھے۔ کہ دشمنوں کا خوف بے انتہا تھا۔ شتر نغمہ بار ڈالے جانے کیلئے تیس ہزار لشکریوں میں محصور ہو چکے تھے قتل و بے عزتی اور بے ابروی یقینی ہو چکی تھی۔ ایسے عالم میں آپ کے ثبات نے یہ بتا دیا کہ وجوب تو بڑی بات ہے آپ رحمۃ اللہ علیہ تقیہ کے جواز کے بھی قائل نہ تھے۔

ایک دوسری بات۔ تاریخ نگواہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دو حالتیں تھیں اول یہ کہ عہد شیخین اور زمانہ ذی النورین رضی اللہ عنہم میں آپ نے بیعت خلافت کی کسی سے کوئی تعارض نہ فرمایا نماز، روزہ، حج، مشورہ، تدابیر امور مہم میں انکے ساتھ شریک و دخیل رہے۔ اور خلا، ملا برابر رہا۔ دوسری حالت یہ کہ جناب ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں سے بیعت، جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کئی بار مقابلہ کیا اگرچہ آپ کے ساتھ کم تھے چنانچہ قاضی فوز اللہ نے مجالس المؤمنین میں لکھا ہے کہ قریش میں سے صرف بائیس نفر آپ کے ساتھ تھے جبکہ ترہ قبیلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اس لیے آپ کو فتح نصیب نہ ہوئی اور آپ دفع شر نہ فرما سکے تو لا محالہ پہلی صورت میں بھی خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے آپ کی موافقت تقیہ و بے چارگی کی بنا پر نہ تھی ورنہ یہاں بھی تقیہ فرماتے۔

ایک اور بات یہ کہ شیعوں کی ایک معتبر کتاب بحر المناقب میں مناقب اخطب سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے محمد بن خالد سے روایت کی۔

جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ اگر میں تم کو جانی پہچانی راہ سے اجنبی راہ کی طرف پھیر دوں تو تم کیا کرو گے۔ راوی کے مطابق سب چپ رہے۔ آپ نے تین مرتبہ اسے دہرایا۔ تو جناب علی رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا اس وقت ہم تم سے توبہ کا مطالبہ کریں گے۔ اگر توبہ کر لو گے تو ہمارے لیے قابل قبول رہو گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں ایسا نہ کروں؟

خَطْبُكُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَوْ هُوَ فَكَفَرْتُ
هَمَّا تَعْرِفُونَ إِلَى مَا تَشْكُرُونَ مَا كُنْتُمْ صَائِعِينَ
قَالَ نَسْكُتُوا قَالَ قَالَ ذَلِكَ ثَلَاثًا فَقَامَ عَلِيٌّ
فَقَالَ إِذَا كُنَّا نَسْتَعْتَبُكَ فَإِنْ ثَبَّتَ قَبْلُنَا لَمْ
قَالَ وَإِنْ لَمْ قَالَ إِذَا تَضَرَّبَ الَّذِي فِيهِ عَيْنَاكَ
فَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَعَلَ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ
مَنْ إِذَا أَعُوْجَجْنَا أَقَامَنَا -

کہا اس وقت ہم تمہارا سر قلم کر دیں گے جس میں تمہاری آنکھیں ہیں جناب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس امت میں وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ٹیڑھے راستہ پر چل نکلیں تو وہ ہم کو سیدھا کر دیں۔

اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ جناب مرتضیٰ علی رضی اللہ عنہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کس قدر پختگی سے قائم تھے، اور ممنوعات شرعیہ میں سستی نہ کرنے اور ان سے انکار کرنے کی قدرت رکھنے میں آپ کا مرتبہ کس قدر بلند و رفیع تھا اور جب یہ حال ہوا وہ معاملہ کی نوعیت ایسی ہو تو تقیہ کی وہاں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

پھر قاضی فوز اللہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ آپ بھی ان میں سے ہیں جو اعراض میں ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بہت عزیز اور دوست رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ عباس میرے والد کی

جگہ ہیں۔ غرض آپ کے فضائل اتنی تفصیل سے بیان کئے کہ اس مختصر میں اسکی سمائی بھی مشکل ہے اسکے بعد یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپ نے جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رشتہ مانگا۔ آپ نے پہلی بار انکار کیا دوسری بار سکوت فرمایا۔ اسکے بعد خود جناب عباس رضی اللہ عنہ نے متولی نکاح بنکر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے باندھ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بوجہ تعلق اس سے نہ روک سکے اور اسی لیے سکوت فرمایا۔ ہر عقلمند بلا ادنیٰ تاویل کے یہ جان لے گا کہ اتنے فضائل رکھنے والی ہستی کے متعلق یہ کبھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کے ظالم کے ظلم میں آپ نے اعانت کی ہو۔

ہفویہ (۲) :- یہ کہ شیخین رضی اللہ عنہما اہل نفاق میں سے تھے حالانکہ ان کی قوت ایمان بطریق تو اتر ثابت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کو اپنے ساتھ شمار فرمایا ہے۔ کینی سے باب الامت میں درجات ایمان سے متعلق جو حدیث روایت کی گئی ہے اس میں تصریح ہے کہ مہاجرین اولین کے ایمان کو تمام امتیوں کے ایمان پر بدرجہا ترجیح ہے۔ پھر جناب کی جو لفظ منہج البلاغہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں مذکور ہے وہ بھی آپ کے کمال ایمان پر شاہد و دال ہے۔ اور جناب محمد باقر اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا آپ کو صدیق کے لقب سے لقب کرنا سی ہفویہ کی ریڑھ ہی مار دیتا ہے۔

ہفویہ (۳) :- یہ کہ شیخین اصحاب العقبہ میں سے تھے۔ یعنی وہ بارہ منافق جنہوں نے غزوہ تبوک سے واپسی پر انشاء راہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا پا کر قتل کرنا چاہا تھا۔ عمار بن یاسر اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما اس سازش سے آگاہ ہو گئے اور بروقت مداخلت کر کے ان کی سازش ناکام بنا دی۔

یہ ہفویہ تو اتر اور بدایت کے صاف خلاف ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں حضرات کی صاحبزادیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تھیں۔ ان کو اس قسم کے کام کے وہاں زیادہ مواقع حاصل تھے۔ پھر ان حضرات کا خانہ نبوت میں آنا جانا، آپ سے خلوت و جلوت میں ملاقات و یکجائی اتنی مشہور و معروف ہے کہ ضرب المثل ہو گئی ہے۔ اس قسم کے زائد الزوں اور جلوت و خلوت کے ساتھ یہوں کو فرصت و تنہائی کے وقت کی تلاش کی بھلا کیا ضرورت۔ رفیق غار، اور صاحب عریش (موجودہ جنگ میں) کو اس کام کی تکمیل کیلئے ان سے اچھے مواقع کب مل سکتے تھے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جس کی نظر کتب سیر پر ہو اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شیخین کی صحبت یا ان حضرات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت و موانست، شفقت و موانست و حمایت معلوم ہو وہ ان حضرات کی نسبت اس قسم کے احتمال کو ہرگز جائز نہیں رکھے گا۔ ان حضرات کے متعلق ایسا احتمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کوئی جناب امیر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسا احتمال رکھے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پھر ان شیعوں ہی کی تفاسیر سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت اصحاب العقبہ ہی کی شان میں نازل ہوئی۔

يُخَلِّفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلْفًا ۖ لَّكَفَرًا
وَكَفَرُوا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهُمْ فِي ابْصَارِ
لَعْنَةٍ اُولٰٓئِكَ ۖ

اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ کہا۔ اور اسلام لا کر پھر کافر ہوئے۔ اور جو جاہل تھا وہ نہیں پایا۔

اس آیت صحیبات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ اصحاب عقبہ کا حال دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو توبہ کریں اور عذاب نفاق سے نجات پالیں، یا گناہ پر اصرار کریں تو اس صورت میں دنیا و آخرت میں عذاب کے سزاوار ہو جائیں اور

ان کا کوئی معین و مددگار نہ ہو اور شیعہ اس پر متفق ہیں کہ جناب ابوکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے اس نفاق سے تو بے ہوش نہیں کی۔ تو ایت کی رو سے ان کو عذاب الیم پہنچنا چاہئے اور ان کو کوئی حامی و ناصر بھی میسر نہ ہونا چاہئے۔ مگر ان کی پوری زندگی آئینہ کی مانند سامنے ہے۔ انہیں کوئی عذاب نہیں پہنچا رہا حمایت و نصرت کا معاملہ تو ان حضرات کو جو حمایت و نصرت میسر رہی اس سے کوئی شیعوں کی طرح اندھا ہی انکار کر سکتا ہے اور تاریخ کو جھٹلا سکتا ہے۔ اب ایک طرف کتاب اللہ ہے دوسری طرف شیعہ۔

پہلی امت اس پر متفق ہے کہ کتاب اللہ میں جھوٹ کو مطلق دخل نہیں اسکے اندر تو جھوٹ کیا ہوتا کوئی باہر سے بھی اس میں جھوٹ داخل نہیں کر سکتا۔ دوسری امت مسلماً اس پر بھی متفق ہے کہ شیعوں کو جھوٹ بولنے، جھوٹ کھڑے، اور جھوٹ منسوب کرنے میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں نے جھوٹ بولا۔ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اصحاب عقبہ میں سے نہیں ہیں۔

ہفوا (۶) :- یہ کہ امام کے محض وجود کو لطف قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے امام مقرر فرما کر لطف کا حق ادا فرمایا۔ اب اس کو ظاہر کر کے تسلط اور غلبہ دینا یہ لطف کیلئے بالکل ضروری نہیں۔ یہ اتنی کچی بات ہے کہ اس پر ہوشمند تو کیا کتب کے بچے بھی یقین کرنے کو تیار نہ ہوں گے۔ ذرا کسی مدرسے لڑکوں کو کہتے کہ تمہارے لیے ایک ایسے استاد کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس کو نہ تم دیکھ سکتے ہو نہ اس کی آواز سن سکتے ہو اور نہ ہی وہ تم کو دیکھ سکتا ہے نہ ہی تمہاری آواز سن سکتا ہے پھر جو رد عمل ہو گا آپ کو پتہ ہی چل جائے گا۔

ہفوا (۵) :- حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اوصاف خدائی سے متصف کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ اعراض آئین و متنی سے پاک ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کو بشر نہیں کہنا چاہئے۔ یہ امور بدایت عقل کے صاف و صریح خلاف اور اس کو جھٹلانے والے ہیں۔ کسی شیعہ شاعر کا ایک شعر ہے :-

يَجْعَلُ عَنِ الْأَعْرَاضِ الْإِيْنِ وَاللَّيْنِ : وَيَكْبُرُ عَنْ تَشْبِيهِهِ بِالْخَلْقِ

(وہ اعراض، اور این و متنی سے برتر ہیں اور وہ اس سے بھی بالاتر ہیں کہ ان کو عاصر سے تشبیہ دی جائے) ایک دوسرا شاعر دوسرے خیال کو یوں نظم کرتا ہے :-

أَهْلُ النَّهْيِ عَجَزُوا عَنْ وَصْفِ جَيْدَتِهِ : وَالْعَاشِقُونَ يَمْنَعُونِ حَبَّةَ تَاهُؤُا
إِنْ أَدْعَا بَنَاتُكَ أَلَا الْعَقْلُ يَمْنَعُنِي : وَأَخَشَى اللَّهَ فِي قَوْلِي هُوَ اللَّهُ

(اہل عقل حیدر کی تعریف سے عاجز رہ گئے اور عاشق ان کی محبت میں حیران ہیں)

(اگر ان کو بشر کہوں تو مجھے عقل روکتی ہے۔ اگر ان کو اللہ کہوں تو اللہ سے ڈرتا ہوں)

یہ خیال و عقیدہ غالی شیعوں کے عقائد سے قریب اور کفر و زندقیت کے سوا کچھ نہیں۔

ہفوا (۶) :- یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو جناب علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کی پاسداری کے لیے بھیجا تھا وہ درپردہ تامل نبیاء کے ساتھ تھے اور ظاہر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور جو اس بات کا انکار کرے اکتے مذہب میں اسے کافر کہا جاتا ہے یہ بات ابن طاووس اور دوسروں نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہے۔

ابن المعلم نے جناب محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ **لَوْلَا عَلِيُّ لَمْ يَخْلُقِ الْإِنْسَاءُ** (علی اگر نہ ہوتے تو انبیاء پیدا نہ کئے جاتے) یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن علی (رضی اللہ عنہ) کا درجہ سارے انبیاء اور رسولوں سے بلند ہوگا۔ تمام انبیاء اور رسول محبت علی اور آپ کی شیعیت بطور دین مانے ہوئے تھے۔ اور اسکی آندو رکھتے تھے کہ ان کا حشر بحیثیت شیعوں علی ہو حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسکے آندو مند تھے یہ بات ابن طاووس نے ذکر کی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ علی (رضی اللہ عنہ) کا حق خدا تعالیٰ پر ثابت ہے۔ یہ تمام بہنوات اور بکواس ساری آسمانی شراائع اور نصوص قرآنی کی تکذیب کرنے والے اور کفر و زندیقیت کی اصل و بنیاد ہیں۔

ہفتوا (۷): یہ کہ قرآن مجید کی تحریف کرتے ہیں اور سیاق و سباق کے خلاف اسکو خلاف مراد معنی پر محمول کرتے ہیں حتی کہ جاہل نا عاقل اسکو نشان مذاق بناتا ہے۔ اس فرقہ کی تمام تفاسیر اسی قماش کی ہیں۔

بطور نمونہ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) **صَاحِبِ مَسْكَنَةٍ**۔ کے متعلق کہتے ہیں اس سے حب علی۔ مراد ہے

(۲) **الَّذِينَ اَلْفَضَلَتْ عَلَيْهِمْ**۔ سے مراد علی و اولاد علی (رضی اللہ عنہم) ہیں۔

یہ دونوں تفسیریں نہ صرف یہ کہ نظم قرآن سے کوئی ربط نہیں رکھتیں باہم بھی ایک دوسرے کی تکذیب کرتی ہیں۔

(۳) **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ**۔ سے مراد عشرہ مبشرہ (رضوان اللہ علیہم) کے لغو آدمی ہیں۔

(۴) جہاں کہیں لفظ **فَرَدَّكَ** کا آیا ہے وہاں علی مراد ہیں حتی کہ آیت **اَتَمَّكُمْ مِّلَّةً فَوَاسِرَ تَجِدُوْا اَتَمَّكُمْ لِسَانًا** **رَاجِعُونَ**۔ میں بھی گویا علی رضی اللہ عنہ کو روز جزا کا مالک بھی قرار دیتے ہیں یہ پہلے بھی باب مکائد میں بیان ہو چکا ہے۔ عنقریب پھر بیان ہوگا۔

(۵) **وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَى رَاسٍ ظَلِيمًا**۔ (یعنی کافر اپنے پروردگار پر دلیر ہے) کی تفسیر ای فی اخذ الخلافۃ (یعنی خلافت لینے میں) کرتے ہیں حالانکہ یہاں کافر سے مراد بت پرست ہیں اس سے پہلے کی عبارت اسکی دلیل ہے۔ **فَرَمَاوْا وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ** (اور اللہ کے سوا ایسی ہستیوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان)

(۶) یہ بھی کہتے ہیں کہ **لَنْ اَشْكُكَ لِيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ** سے مراد **شُكُّكَ فِي الْخِلَافَةِ** مع علی غیڑ کا ہے۔ (یعنی تم خلافت میں علی کے غیر کو شریک کرتے ہو اس لیے تمہارے اعمال ضبط و ضائع ہو جائیں گے) لیکن انکو اتنا معلوم نہیں کہ اس آیت کا کچھ اول بھی ہے **وَلَقَدْ اَوْحٰی اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ** (آپ کی طرف اور جو آپ سے قبل گذرے وحی بھیجی گئی۔ کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع و بے کار جائینگے) اس میں خلافت علی میں غیر کی شرکت کہاں گھس آئی کہ اس سے نہی ہو۔ اور اگر نہی تھی ہی تو پھر دوسروں کو خلیفہ کیوں کیا۔ اور اگر صرف ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تمام انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی پہنچا تھا تو اس منادی کی کیا ضرورت تھی۔ پھر آیت کا سیاق بیل اللہ فاعبد و کون من الشاکرین ہے اور سابق قُلْ اَغْيِرُ اللّٰهُ تَاْمُرُوْنَ اِيَّهَا الْجَاهِلُونَ اور یہ سیاق و سباق کی دونوں آیات صاف بتا رہی ہیں کہ شرک سے مراد غیر اللہ کی عبادت ہے اور یہ قاعدہ و اصول شیعوں کے ہاں بھی طے کردہ و تسلیم شدہ ہے کہ شارح کے کلام میں جب کوئی لفظ آئے تو شرعی معنی پر

محول ہوگا۔ لغوی معنی یہ نہیں ہوگا خصوصاً جبکہ لغوی معنی ضمیر کا بھی محتاج ہو جس کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔
(۷) یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت وَتَجْعَلُ لَّكُم مَّا سَلَطْنَا نَافِلًا يَصْلَوْنَ إِلَيْكُمَا يَأْتِيَنَّكُمْ أُنْثَىٰ وَنَرٍ اشْبَعَتْكُمْ الْغُلَبُونَ میں سلطان سے مراد جناب علی رضی اللہ عنہ کی صورت ہے یعنی جب فرعون حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کو کوئی اذیت پہنچانا چاہتا تو فوراً اسے علیؑ کی صورت دکھا دی جاتی وہ سہم کر رہ جاتا۔ حالانکہ قرآن مجید میں غلبہ کو آیات سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور آیات جمع کا صیغہ ہے کم از کم دو آیات تو مہربانی چاہئیں اور صورت علیؑ تو ایک ہی آیت ہوگی (اگر مہربانی بھی تو) پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آیات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں کہیں ان کا قصہ بیان فرمایا ہے وہی معجزات پر اکتفا فرمایا ہے۔ عصا، اور ید بیضا جیسا سورہ طہ میں مذکور ہے تو آسان نشانی کا ذکر اور اڑھڑی نشانی کو نشانیوں کے شمار میں نظر انداز کر دینا شانِ بلاغت کے خلاف ہے۔

اور پھر یہ کیا بات ہوئی کہ فرعون تو صرف آپ کی تصویر سے سہم اور ڈر جاتا تھا مگر جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر آپؐ کے جیتے جاگتے جسم حقیقی نے اتنا بھی اثر نہ کیا کہ اسکے دیکھنے سے ان کے مزاج میں کچھ نرمی ہی آجاتی۔
(۸) یہ کہتے ہیں کہ یَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ الْإِيسَىٰ میں رب سے مراد علیؑ نہیں۔

(۹) یہ قائل ہیں کہ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ میں انس و جن سے علیؑ کے شیعہ مراد ہیں کیونکہ ان سے کسی گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا علیؑ کی ولایت اٹکے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیگی اور جب گناہ رہے ہی نہیں تو سوال کس بات کا ہوگا ابن بابویہ، ابن طاووس اور دوسروں نے اسکو بیان کیا ہے۔ مگر یہ عالم وفاضل، ایک تو یہ بات نہیں سمجھ پائے کہ سیاق لفظی میں انس و جان نکرہ ہے اور وہ عام الفاظ میں سے ہیں ان سے شیعیان علیؑ کی تخصیص کے کوئی بسنا داور وجہ نہیں دوسرے یہ کہ کیا شیعہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی محرمات سے زنا کر اور اپنے نخت جگر یا شریک دودھ سے اغلام بازی کر کے۔ نیز ساری زندگی شراب نوشی خنزیر خوردی اور سود کاری جھوٹ و غیبت، میں گزارنے کے باوجود پرستش سے نہ صرف محفوظ رہیں گے بلکہ یہ اغمال بد ان کے لیے ناز و روزہ و دیگر عبادات و اعمال صالحہ کی طرح موجب اجر و ثواب بھی ہوں گے اگر وہ ایسا ہی خیال کرتے ہیں تو یہ تو باہمیوں اور زندہ بقیوں کا مذہب ہوا۔ بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔ کیونکہ وہ لوگ ان امور کو مباح خیال کر کے ان کے ارتکاب پر عذاب کا خوف نہیں رکھتے۔ اور یہ شیعہ تو عذاب کے خوف سے ہی مامون نہیں بلکہ ان خباثتوں اور نجاستوں اور بد اعمالیوں پر اجر و ثواب کی امید رکھتے اور ان بد کاریوں کو عبادت جانتے ہیں۔

(۱۰) یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں صبر کا حکم اور صابریں کی تعریف بیان ہوئی ہے۔ ان سب سے مراد، شیعہ اور انکا وہ صہر مراد ہے جو یہ جناب مہدی کے آنے تک مخالفین کے ہاتھوں تکلیفیں اور مصائب اٹھائیں گے ان مذکورہ تفامیر سے اگر کوئی شیعہ انکار کرے تو اسے یہ تمام تفسیریں شیعوں کی اصح الکتاب کہنی مسموٰں میں گے وہاں وہ دیکھ سکتا ہے اسکے علاوہ ان کو تفسیر علی بن ابراہیم۔ اور تفسیر ابن بابویہ جسکو یہ جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتا ہے نیز شریف مرقفی کی کتاب تمیزیہ الانبیاء والائمہ کے مطالعہ کی اگر توفیق مل جائے تو وہ بال یہ سارے حوالے ان کو موجود ملیں گے۔

ہفتویہ (۸) یہ کہ روز جزا کے ملک و حاکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب علیؑ نہیں گے اس خیال خام کی تردید

قرآن مجید میں جا بجا ملتی ہے مَا لِلَّهِ يَوْمَ الدِّينِ - لَمِنَ الْمَلَكِ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ - وغیرہ وغیرہ اسکی مثالیں ہیں۔ اگر یہ حضرات حاکم ہوں تو شفاعت بے معنی ہو جاسکی امت کو پھر خوف و خطر کیوں ہو گا اور یہ حضرات خود ان کو کیوں ڈرائیں گے ایک بات لائق توجہ یہ بھی ہے کہ ان شیعوں کے نزدیک حسب کتاب، وزن اعلیٰ، سوال وغیرہ جو روز قیامت کی ہولناکیاں ہیں شیعوں کو تو ان سے سابقہ پیش ہی نہیں آئے گا یہ سب تو غیر شیعوں کیلئے مخصوص ہیں۔ وہ تو براہ کھتے ہیں کہ علی کو دوست رکھنے والا خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی یا یہنہو مشرک و دوزخ میں نہیں جائیگا۔

علل الشرائع ابن بابویہ کی ایک کتاب ہے اس نے اسمیں یہی بات لکھی ہے۔ اس نے اس روایت کو بحوالہ مفضل بن عمر جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا ہے معانی الاخیار میں بھی یہ روایت موجود ہے اور شیعہ اعتقاداً اس مسئلہ کو متواتر سمجھتے ہیں اس صورت میں حسب علی کے مقابلہ میں نہ خدا و رسول پر ایمان کی کوئی حیثیت ہے نہ تمام عقائد اور تکلیفات کی ضرورت اور تمام حدود اور ساری تعزیرات ساقط اور القط ہو جاتے اور امور شریعت میں کوئی شرعی امر ضروری نہیں رہتا۔

یہ ہنود بے شمار فسادات کی بنیاد اور اصل ہے۔ ایسے ہفتوات پر اعتقاد رکھنے کے بعد تو اثنا عشریوں کو چاہئے کہ اپنے مذہب کو حمیہ یہ عمر یہ کہا کریں۔ کہ اعتقادات کی ہر ہنگی کا یہی تقاضہ ہے۔

ہفتویہ (۹) : کہتے ہیں کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جیلوں بہانوں سے کام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہا چنانچہ علی بن مظاہر واسطی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بھی بیان کر ڈالی ہے حالانکہ جناب فاروق اعظم کا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ خصوصی لگاؤ دلی محبت عزت و احترام اور توقیر سسرال ہو جانے پر فخر، عطایا کے رجسٹریں آپ کی حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی فضیلت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی روایات خود ان شیعوں کے ہاں تواتر ثابت ہیں اور نہج البلاغہ کے شارحوں نے جو اکثر شیعہ ہیں ان سب کو اپنے شروح میں لکھا ہے۔

اور شریف مرتضیٰ (شیعی) کی کتاب تہذیب الانبیاء والاعمام میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعریف ان الفاظ میں موجود ہے۔

إِنَّ عُمَرَ كَانَ مُطَهِّرًا لِلْإِسْلَامِ وَالْمُتَمَسِّكًا بِشِرَائِعِهِ | بے شک عمر اسلام کو ظاہر کرنے والے اور تمام احکام اسلام پر عمل کرنے والے تھے۔

ایسے اوصاف سے متعلق شخص کے متعلق کوئی فاجر العقل ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ اپنے دوست، مشیر، دست و بازو، محبوب اور خسر کو جو باپ کے درجہ کا ہوتا ہے قتل کرنے کی تدبیر کرے گا۔

ہفتویہ (۱۰) : کہتے ہیں کہ جو شخص فلاں فلاں پر ستر بار لعنت کرے تو اسکو ستر نیکیوں کا ثواب ملے گا ستر گناہ محو کر دئے جائیں گے۔ اور جنت کے ستر درجے اسے الاٹ کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ ابو جعفر طوسی نے بحوالہ جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ مختلف روایات کے ضمن میں اسکا ذکر کیا ہے۔ یہ ایسا سفید جھوٹ ہے کہ سارے مذاہب و شرائع اپنے اپنے انداز میں اسکی تردید رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ بروں کو بھی برا کہنا کسی شریعت میں ثواب کا موجب نہیں

یروں اور بدوں کا سردار شیطان ہے مگر اسکو برا کہتا بھی نیکی میں شمار نہیں ہوتا۔ آپ صبح سے شام تک اس پر لعنت کر رہے تھے تو بھی آپ کے نامہ اعمال میں ذرہ بھر نیکی نہیں لکھی جائیگی (اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کیلئے عموماً اور شیعوں کیلئے خصوصاً جناب اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر پیش کرتا ہوں شاید کسی کی آنکھ کھل جائے۔
نئی ترکیب شیطان نے نکالی ہے یہ افواہ کی - بند خدا کی حمد کیجئے ترک بس جھکوا برا کہئے - شیعوں کا ہنر ہوا بھی شیعی عوام کیلئے شیطان کا غواہی کہ نہیں - ان مخترم ہستیوں پر لعنت سے انکا تو کچھ بگڑتا نہیں البتہ شیعوں کی اپنی عاقبت یقیناً خراب ہوگی - ن)

بطریق صحیح جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے اپنے رفقاء کو جب اہل شام کو گالیاں بکتے سنا تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم گالیاں بکنے والے ہو (بحوالہ النج البلاغہ) نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت کو خدا کی حمد ثنا اور ذکر سے افضل کہتے ہیں چنانچہ احوال کے ذریعہ متعدد طرق سے جناب صادق کی روایات ملتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو اکبر فرمایا ہے وَلَئِنْ كُنْتُمْ اَللّٰهُ اَكْبَرُ مگر یہ احوال وہ ہے جس نے بار بار جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ پر جھوٹ باندھا ہے اور آپ نے اسے اقرار پر دانا اور جھوٹا کہا ہے لیکن اسکا کیا جائے کہ شیعوں مذہب کی بنیاد ہی جھوٹ و جل اور فریب پر رکھی گئی - اور وہ ہی آج تک اسکو سہارا دیئے ہوئے ہیں -

ہفوف (۱۱) یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کرنا کاتبین کو یہ حکم دیدیا ہے کہ قتل عمر کے یوم سے تین دن تک لوگوں کے نامہ اعمال نہ لکھے جائیں - نہ کسی کا گناہ درج کیا جائے یہ روایت علی بن مظاہر واسطی نے احمد بن اسحاق قمی سے اس نے جناب حسن عسکری سے انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس میں حکایت اب بیان ہو رہی ہے یہ روایت افتراء اور جھوٹ پر مبنی ہے یہ نہ صرف اصول شریعت کے خلاف ہے بلکہ متواتر روایات کو بھی جھٹلانے والی ہے۔ اس روایت کو ماننے والا ذرا غور کر کے بتائے کہ ایک شخص قتل عمر کے یوم یا بالغ ہوا اور تین دن تک قابل تصور اور ناقابل تصور سارے ہی کبیرہ گناہ کا دھڑلے سے ارتکاب کرتا رہا جس میں فحشاء کے ساتھ زنا، اغلام، شراب نوشی، قتل بت پرستی، چوری اور جناب علی رضی اللہ عنہ کا سب و شتم سب ہی کچھ شامل ہے - اور وہ تین دن کے معادی وقفہ میں انتقال کر گیا - اب وہ بغیر حساب جنت میں چلا جائے - تو کیا روایت بالا کے مطابق درست ہوگا - اگر کسی میں رفق بھر عقل اور صحیح دینداری ہوگی وہ اس روایت کے باطل ہونے پر کوئی شک نہیں کریگا -

ہفوف (۱۲) - کہتے ہیں کہ تیمی اور عدوی نام کے دو بت تھے اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما خدا کو چھوڑ کر ان کی پوجا کیا کرتے تھے - ابان بن عیاش اور دوسروں نے سلیم بن قیس لہلی سے یہ روایت کی ہے اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت لگائی گئی ہے - جناب فصل تعصبات میں اس بگڑائی بیان کی گئی ہے -

ہفوف (۱۳) کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطاب کے صلیبی فرزند تھے بلکہ ولد الزنا تھے حالانکہ اور ول کو چھوڑنے خود امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے نیز دیگر ائمہ نے سیکڑوں مرتبہ ان کو وہ ابن الخطاب کہہ کر فخر طلب کیا ہے - امہات المؤمنین میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں - دوسری طرف امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا آپ کی زوجہ محترمہ ہیں - گویا آپ بنی محترم کے خسر ہیں تو علی مکرم کے داماد اور حب علی کے بد بخت و دعویدار اس سے بالکل نہ ٹھہرائے کہ علیؑ

پھر الزام لگائیں کہ انہوں نے ولد الزنا کو داماد بنالیا۔

سارے امامیہ کا حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے نسب کے انکار پر اتفاق ہے ان کے علماء انساب کی کتابوں میں اسکو لکھا بھی ہے ان میں حمید الدین غفری صاحب بحر الانساب بھی ہے۔ اور حسن بن سلمان العذری اپنی ملتقات میں اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

ہفتہ (۱۴) کہتے ہیں کہ ہر سال موسم حج میں فرشتے جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی قبور سے زندہ کر کے منیٰ میں لاتے ہیں اور رمی جمار کی جگہ ان کو سولی پر چڑھاتے ہیں۔ ابوالخضر نے اپنے باپ دادا کے حوالے سے جناب محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بیان کی ہے۔

یہ ہفتہ بھی شیعی کذب و افتراء کا شاہکار ہے۔ اور ائمہ کو بدنام کرنے کی ناپاک سعی یا پھر پاکلوں کی بڑ ہے اس لیے کہ دارالہزار تو آخرت ہے دنیا تو نہیں۔ یہ ہفتہ خلاف نقل ہونیکے علاوہ عقل و حس کے بھی خلاف ہے یہ لاکھوں حاجی ہر سال حج کیلئے منیٰ میں تین چار دن قیام کرتے ہیں انکو کہیں نہ سولی چڑھی دکھائی دیتی ہے نہ کہیں کوئی لٹکا ہوا نظر آتا ہے آخر یہ شیعہ ذہنی سولی کس کو دیتے ہیں (میرے خیال میں ان پام میں یہ خود کو سولی پر لٹکا ہوا محسوس کرتے ہیں اور اس وقت یہ اپنا نام ابوبکر و عمر رکھ لیتے ہونگے۔ ن)

اگر یہ کہیں کہ جمل کو کھانا منظور نہیں تو ہم کہیں سے کہ آخر عذاب قبر میں کونسی کمی تھی کہ فرشتے ان کو قبروں سے نکالتے اور بازار منیٰ میں لاتے ہیں اگر حاجیوں کو عبرت دلانا اور خود اگلو اپنی تذلیل و رسوائی سے آگاہ کرنے کا مقصد تھا اور وہ کسی نے دیکھا نہیں تو ساری تک و دو لا حاصل، عبث اور لغو ثابت ہوئی اور اللہ تعالیٰ عبث سے پاک ہے یہ بات شیعہ عقائد میں بھی تسلیم شدہ ہے۔

ہفتہ (۱۵) کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفر ہجرت میں اسلحے ساتھ لیا تھا کہ کہیں قریش مکہ کو سمت سفر سے مطلع نہ کر دیں کہ آپ کس طرف تشریف لے گئے۔ اس ہفتہ پر یہ شیعہ خود بغلیں بھانا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے ورنہ یہ اتنا ظاہر البطلان ہے کہ تردید کی مطلق حاجت نہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو یہ کہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت تھی کہ موسم گرما کی دو پہر ان کے گھر تشریف لے جا کر ارادہ ہجرت سے مطلع فرماتے اور مشورہ طلب فرماتے کہ کب و کس طرح نکلنا چاہیے، زادراہ اور سواری ان سے کیوں لیتے، سفر کا کھانا اور ناشتہ ان کے گھر سے ان کی صاحبزادی سے تیار کرایا۔ پھر ابوبکرؓ کسی کچھیلے عامر بن فہیرہ کو راہ نما کی حیثیت دی سواری کے اونٹ اس کے حوالے کئے انہیں ابوبکر کے بڑے بیٹے عبداللہ (رضی اللہ عنہما) کو حالات کے تجسس اور خبر گیری کے لیے اور قریش کی تجویزوں و خبروں سے آگاہی کیلئے ہر کارہ مقرر کیا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فکر مندی اور غم کو اور آنحضرت صلی اللہ کا ان کو معیت کا گہرا راز فشاء کرتے ہوئے تسلی و دلالت دینے کو حکایت بیان فرمایا اذ یقول (صاحبہ لا تخزنن ان اللہ معنا اس ہفتہ سے شیعوں کی اس اندرونی کھولن اور بھڑکتی ہوئی آتش عداوت کا پتہ چلتا ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس عزت و فضیلت کے سبب ہے جو آپ کو اس سفر صحبت و رفاقت میں میسر آئی۔ جس کا ذکر رہتی دنیا تک قرآن مجید میں محفوظ ہو گیا وہ چاہتے ہیں ہفتہ سے اڑا اڑا کر جھوٹ اور افتراء بازی کر کر کے اس فضیلت میں کیڑے نکالیں مگر بے سرو پا محض خیالی

تکے سے تمام واقعہ اسکے پس منظر پیش منظر ماز و ماعلیہ کو یہ کیسے جھٹلا سکتے ہیں اسکے تو ہر ہر رخ اور ہر پہلو سے ان کے کمواس کی تردید اور انکی ذلت میں اضافہ پر اضافہ ہوگا۔ یُوْنِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یَّحِقَّ الْحَقُّ وَیُطِلَّ الْبَاطِلُ وَکُوْکِرَ الْکَمْبُجُ مُؤْنٌ اِیْسے ہی مترع کیلئے فرمایا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملا عبد اللہ شہیدی مصنف اظہار الحق نے اس قصہ اور آیت کا بڑی کاوش اور باریک بینی سے جائزہ لیکر مجبوراً یہ منصفانہ رائے ظاہر کر دی ہے کہ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ احتمال (جو شیعوں نے بیان کیا ہے) حقیقت سے بہت دور ہے (یعنی شیعوں کا یہ سہفہ غلط در غلط ہے) اسمیں تعجب کی کیا بات ہے کہ آپ خلیفہ اول کو اپنی رفاقت و ہمراہی کیلئے جن لیں جن کو سرسبز ہونے کی نسبت بھی حاصل تھی۔ اور لوگوں سے ایمان و اسلام میں سبقت لے جانے کی برتری بھی آپ کو نصیب تھی اور اکثر اوقات رسالتکاب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں موجود رہتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی صحبت سے دل بستگی محسوس ہوئی ہو (کلام ملا مجتہد تمام ہوا) قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المؤمنین میں اس بحث کی رکاکت کی تصریح کی ہے والحمد للہ۔ مفسر نیشاپوری نے کہا ہے۔

ثُمَّ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ اَنْ اُضْطَجَاعَ عَلٰی عَلِيٍّ فَرِاشَهُ طَاعَةٌ وَفَضِيلَةٌ اِلَّا اَنَّ فَضِيلَةَ اِيْنِيْكُمْ اَعْظَمُ لِاَنَّ الْاَنْبِيَاءَ اَعْلٰی مِنَ الْغَايِبِ وَلَا اَنْ عَلِيًّا مَا تَحْتَلُّ الْاَلْحَنَةَ اَلَّا لِكَيْلَهُ وَاحِدَةً وَابْنُكُمْ مَكَثَ فِي الْغَايَةِ اَيَّامًا وَاَمَّا اَخْبَارُ عَلِيٍّ لِلنُّوْمِ عَلٰی فَرِاشِهِ لَا اَنْ كَانَ صَغِيْرًا وَاَلَمْ يَنْظُرْ مِنْهُ دُخُوْرًا بِالْكَذٰلِیْلِ وَالْحُجَّةَ وَالْاَجْهَادَ بِالسَّيْفِ وَالسَّيْفَانِ بِخِلَافِ اِيْنِيْ بَكْرِيَاتٍ اَدْعَا جِيْنَتِيْ جَمَاعَةً اِلَى الدِّیْنِ وَقَدْ ذَبَّ عَنِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّفْسِ وَالْمَالِ وَكَانَ غَضَبُ الْكُفَّارِ اَشَدَّ مِنْ غَضَبِهِمْ عَلٰی عَلِيٍّ وَلِهَذَا لَمْ يَقْصُدُوْا عَلٰی عَلِيٍّ بِالْمُحْتَمَلِ لَمَّا اَنَّ الْمُضْطَجِعَ هُوَ اَتَقٰی۔

دیکھا کہ سونے والے وہ ہیں تو انہوں نے علیؑ کو مارنے یا تکلیف پہنچانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

ہفوفہ (۱۷)۔ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن فلاں عورت کے بدن کی کھال اصحاب کہف کے کتے کی کھال سے بدل جائے گی۔ دراصل باتوں اور روایتوں میں حسب مرضی کائنات چھانٹ اور کتر جنون اس فرقہ کی پرانی عادت اور شرارت ہے یہ الفاظ دراصل بے علم باعور کی نسبت آئے ہیں وہ ان کے نزدیک مزا کا سبز دار نہ قرار پایا تو روایت میں اصلاح کے طور پر تحریف و تصرف کر کے اس قسم کی روایت کی یہ ان کا پیرانا پیشہ اور عادت ہے کہ یہ ان کافروں کا بھی پاس کرتے اور ان کو برائی سے یاد نہیں کرتے جنکے کفر پر اللہ و رسول کے کلام میں صراحت وارد ہوتی ہے اور جنہوں نے اللہ و رسول سے انتہائی دشمنی اور عداوت برتی اور جنکی بد بختی اور بد انجامی پر قرآن مجید گویا ہے اور نہ انکی بد حالی

کو یہ کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں جو سزائیں وارد ہیں انکو انکے مرتبہ سے زیادہ جان کر خلفاء رسول اور ازواج رسول کے حق میں یہ روایت کرتے اور چسپاں کرنے کی ناپاک جسارت کرتے ہیں۔ اور یوں قرآن و حدیث کی توحیف اور ان میں تصرف کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں اور ان کا حال اس بے وقوف کا سا ہے جسے بعض قرآنی آیات کی اصلاح کی تھی کہ اسے جب پڑھا وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ یَا۔ وَخَرَّ مُوسَىٰ۔ تو یوں اصلاح کی وَعَصَىٰ مُوسَىٰ رَبَّهُ یَا۔ وَخَرَّ عِيسَىٰ۔ اور کہنے لگا کہ عصا موسیٰ علیہ السلام کا تھا نہ کہ آدم علیہ السلام اور خرد گدھا) تو عیسیٰ علیہ السلام کا تھا نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کا۔ اس ہفویہ کی تردید کیلئے قرآن کی یہی آیت کافی ہے کہ۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ | اے اہل بیت اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے نجاست اور گندگی
وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔ | دور فرما کر تم کو طاهر و مطہر کر دے۔

اور کتنے کی کھال کو وہ اصحاب کہف ہی کا ہو نجس ہے۔
یَا یہ آیت۔ الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ۔ یَا یہ آیت۔ لَا يَجْعَلُ لَكَ
النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ مِنْ أَزْوَاجٍ۔ جب ازواج کی تبدیلی دوسری ازواج سے بھی جائز نہ رہی تو ازواج
کی تبدیلی ناپاک و نجس کتنے سے کیسے جائز ہوگی۔

اس ہفویہ میں ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے آیت ذیل کے مضمون کو خود اپنے اوپر کس طرح چسپاں کر لیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ | جو لوگ اللہ و رسول کو اذیت دیتے ہیں (خواہ عل سے خواہ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا۔ | باتوں سے) انکے لیے دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور انکے لیے
بڑا دردناک عذاب تیار ہے۔

اور یہ اس لعنت ہی کا اثر ہے کہ وہ یہ وعید دیکھ، پڑھ اور سکر بھی اسی پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنی ترکات شنیعہ سے باز نہیں آتے اپنا ایمان برباد کرتے اور اللہ و رسول کو اذیت دینے والے اعمال و عقائد سے چمٹے ہوئے ہیں۔
هَفْوٰی (۱۶) :- کہتے ہیں کہ زمین کا وہ حصہ جو کسی معصوم کے بدن سے چھو جائے کعبہ مکرّم سے ہزار درجہ بہتر ہے
یہ بات ان کے شیخ مقبول نے دروس میں بیان کی اور دوسروں نے اس پر نص کی ہے۔

اس ہفویہ کا باطل و غلط ہونا بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کو مان لینے سے لازم آئے گا کہ یہود و نصاریٰ کے کہنے، رہبان کے معبد، دیر، جوس کے آتش خانے اور بتوں کے استحقاق جہاں کسی معصوم کا گذر ہوا ہو خصوصاً کافر و صغین کے درمیان کی منزلیں کعبہ مکرّم سے بہتر ہوں۔ بلکہ خلفائے عباسیہ کے وہ گھر جہاں ائمہ معصومین نظر بند رہے کعبہ سے ہزار درجہ افضل ہوں۔ اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا وہ گھر جہاں یزید پیدا ہوا اور جس میں ایک مرتبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عیادت کیلئے تشریف لے گئے کعبہ مکرّم سے ہزار درجہ بہتر ہو۔ تف ہے ان ہفویہ بازوؤں پر کہ وہ نہیں سوچتے کہ ان کے زبان و قلم سے کیا شکل رہا ہے۔

هَفْوٰی (۱۸) ایک طرف تو یہ خود اقراری ہیں کہ صاحب امر حقیقی بادشاہ امام معصوم مہدی منتظر ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ سزائیں مقرر کرے یا سزائیں نافذ کرے لوگوں کے جھگڑے ٹٹے چکائے جمعہ و جماعت

قائم کرے جہاد کا حکم دے۔ اور جوان کی اجازت کے بغیر ان امور میں دخل دے وہ فاسق ہے اور نافرمان۔ پھر دوسری طرف خود ہی کہتے ہیں کہ امام معصوم کی غیر موجودگی میں امور شرع اس مجتہد کی ذمہ داری ہیں جو اپنے اندر نیابت تک کی شرائط رکھتا ہو۔ یعنی جو اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہو اور اسکے زمانہ میں اس سے بڑا کوئی عالم نہ ہو تو وہ جہاد کے علاوہ ہر بات میں امام کا نائب ہے۔ یہ مسئلہ امامیہ کا متفقہ اور اجتماعی ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہ کہ اہل سنت پر جو یہ طعن کرتے تھے، وہ کہاں گیا۔ کہ یہ لوگ بغیر نص کے اپنے اجماع سے رسول کا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ اور یوں دین پیغمبر میں تصرف کرتے اور دخل دیتے ہیں، اب یہ کس نص اور دلیل سے اپنے امام کا نائب مقرر کرتے ہیں۔ دوسری بات قابل قیاس و خلش یہ کہ لنگے پاس وہ کونسا پیمانہ اور ذوالعہد ہیں جس سے یہ معلوم کریں گے کہ شرق و غرب پوری دنیا میں موجود علماء وقت میں کون سب سے بڑا عالم ہے علی طور پر یہ کام جتنا مشکل و محال ہے سب پر ظاہر ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ان کچھ وہ بعض علماء جنکے اجماع پر یہ اعتماد رکھتے ہیں اور جنکو انہوں نے اپنے ہاں امام کا درجہ دے رکھا ہے اور لنگے امر غیبی سے ایک انجمن کو تیار نہیں۔ مثلاً ابن بابویہ، ابن المعلم، سید مرتضیٰ، ابن مطہر علی، شیخ مقتول، وغیرہ وغیرہ ان کا اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ عالم ہونا کسی بھی جہت سے ثابت نہیں۔

اب دیکھنے اور غور کر کے کی بات یہ ہے کہ جب نیابت امام کی شرائط معلوم ہونا شہری اور اس کا معلوم ہونا محال و مشکل ہے تو لامحالہ دو صورتیں ہوں گی یا تو احکام شرعیہ بغیر عمل معطل پڑے رہیں گے یا امام معصوم کے فرمان کے خلاف عمل ہوگا یہ ایسا ضعف اور آفت ہے جس سے ان کا نکلنا محال ہے۔

ہفوک (۱۹):۔ یہ کہ وقت محدود کے علاوہ دیگر اوقات میں جہاد کو فاسد اور معصیت خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید اور احادیث رسول بطریق تو اترا جہاد کی ہمہ وقت فضیلت پر صاف طور پر گواہ ہیں۔ معمولی عقل والا بھی یہ کہے کہ وجوب جہاد کا سبب جب دشمنوں کا دغیہ اور اسلام کا بول بالا قرار پایا تو جب تک دشمن موجود اور اعلائے کلمۃ اللہ کی ضرورت ہے جہاد جاری رہے گا ان ہر دو اسباب کے ہوتے ہوئے جہاد نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پہلے پھوڑے سے مواد نہ نکالنا۔ اور اعضاء رئیس کے کمزور ہونے کے باوجود قوت کی دوا استعمال نہ کرنا۔

ہفوک (۲۰): یہ لوگ قرآن کو منزل نہیں مانتے بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تحریف کردہ خیال کرتے ہیں یہ اپنے عقیدہ پر ہی جیسے بہتے تو کسی بات پر تو ثبات و استقامت کی لنگے ہاں مثال مل جاتی اس عقیدہ کے باوجود یہ خود ہی اپنے ائمہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ اسی قرآن کو نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اور بہ نیت ثواب اسی قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اسکی آیات کو احکام شرعیہ کیلئے دلیل ٹھہراتے تھے۔ غضب بالائے غضب یہ کہ ان کے پاس بھی قرآن منزل موجود نہیں اور سادے امامیہ کا تحریف شدہ کلام اللہ کی تلاوت کرتے اور اپنے مردوں کو اسی کا ایصال ثواب کرتے ہیں۔ اگر وہ عقیدہ ہے تو یہ خلاف عقیدہ لغو حرکت کیوں۔

ہفوک (۲۱):۔ یہ کہتے ہیں کہ ذابۃ المؤمنین سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ الشاہین جہنم رسید کرے کہنے بے ادب ہیں۔ آیت وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلٰیكُمْ اَخْرَجْنَا لَكُمْ ذَابَّةً اَلْمُؤْمِنِیْنَ کی تفسیر کلینی نے یہی بیان کی ہے۔ اور افزاء و تہمت کے لیے جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا کذھا تلاش کیا ہے اور ان کے حوالہ

سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کہلوایا انا الدابة الارض التي تكلم الناس (میں ہی وہ زمینی چوپایہ ہوں جو لوگوں سے بات کرتا ہے) حالانکہ قرآن مجید میں صاف طور پر مذکور ہے۔ کہ دابة الارض کے خروج کا وقت قرب قیامت کا زمانہ ہے اور لوگوں پر ہلاکت و مصائب ٹوٹ پڑنے کا وقت ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا زمانہ اس سے سینکڑوں سال مقدم ہے اور آپ کی واپسی کا زمانہ بمطابق عقیدہ امام مہدی کا وقت ہے۔ اور ایسی توقیات میں عرصہ دوازہ کا بعد ہے۔

ہفوة (۷۲) :- اپنی لونڈیوں، کنیزوں اور بیویوں کی شرمگاہوں کو مہالوں، دوستوں کو بچ و دوستی و میزبانی بطور عادت سپرد کرنا بہترین عبادت خیال کرتے اور اونچے درجہ کی طاعت جانتے ہیں، اور اس پر اجر جزیل کی روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ رقعہ مزورہ کے راقم ابن بابویہ نے حضرت صاحب الزمان سے رقعہ نقل کیا ہے جس کے پڑھنے سے ہر شریف مسلمان کے روگ گئے کھڑے ہوتے اور سرندامت سے جھک جاتے ہیں، مگر اس طائفہ ملعونہ کی بے حیائی اور ڈھصائی ملاحظہ ہو، کہ اس قدر گندے اور شرافت و باکبازی سے عاری خیالات ایسے نفوس قدسیہ عالی مرتبت حضرات کی طرف منسوب کرتے اور ذرا انہیں شرماتے۔

ہفوة (۷۳) :- یہ عورتوں کے متعہ کو بہترین عبادت اور افضل طاعت خیال کرتے ہیں۔ تفسیر فتح اللہ میں آیت فَمَا اسْتَسْتَعْتِمُ بِهِنَّ مِنْهُنَّ فَأَتُوهُنَّ أَجْمُرَهُنَّ فَرِيضَةً کے ذیل میں بحوالہ ابن بابویہ جناب جعفر صادق رضی اللہ علیہ یہ روایت مذکور ہے۔ کہ کوئی خالص شاہجہاد اللہ کسی عورت سے متعہ کرے تو اس سے جو بات یا اس کے ساتھ جو حرکت بھی کرے اس پر اللہ تعالیٰ اسے ایک نیکی عطا فرمائے گا اور اگر اس سے بھرتی کرے تو حق عز اسماء اسکے تمام گناہ معاف فرمادے گا اور جب غسل کرے گا تو ہر بر بال کے عوض جسہر یا بی بیہ اسکی مغفرت کرے اور رحمت برسا گا۔ لہذا اس روایت کے بموجب انسان کے لیے عمر بھر میں ایک مرتبہ متعہ کرنا گناہوں کی معافی کیلئے کافی ہے۔

تفسیر مذکور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہ جو دنیا سے بغیر متعہ کے چلا گیا ہو تو قیامت میں بگڑی صورت اور کرمہہ النظر بنا ہوا اٹھے گا۔ اس شخص کی طرح جس کی ناک کاٹ دی گئی ہو۔ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ! کیا اس روایت کی رو سے انبیاء اکرام علیہم السلام اور ائمہ رحمہم اللہ جنہوں نے بالاجماع متعہ نہیں کیا۔ زدنہیں پڑتی اور کیا وہ اس ذلت میں گرفتار قرار نہیں پاتے۔

اسی تفسیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے فرمایا جو ایک بار متعہ کرے اسکا درجہ حسینؑ کے برابر ہو گا جو دو مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ حسنؑ کے درجہ کے برابر ہو گا اور جو تین مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ علیؑ جیسا ہو اور جو چار مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا ہو۔ یہ روایت سنکر ایک لطیفہ گو کہنے لگے کہ اس روایت میں ایک کمی رہ گئی۔ آخر میں یہ اضافہ ہونا چاہیے تھا کہ جو پانچ مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ اللہ تعالیٰ جیسا ہو گا تاکہ متعہ کی عظمت و شان پورے طریق پر ثابت ہو جاتی۔

اسی تفسیر میں جناب سلمان فارسی جناب مقداد جناب اسود کندی اور جناب عمار یا سر رضی اللہ عنہم سے روایت مذکور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ اٹھے اور ایک پراثر تقریر فرمائی اسکے بعد فرمایا لوگو میرے بھائی جو میرے رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پاس ایک تحفہ

لائے ہیں اور وہ مومن عورتوں سے متوجہ کرنا ہے۔ مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو یہ تحفہ نہیں بخشا گیا۔ میں تم سے کہتا ہوں یہ میری سنت ہے میرے زمانے ہی میں نہیں میرے بعد بھی جو اسے قبول کرے، اس پر عمل پیرا ہو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے۔ اور جس نے میرے اس حکم کی مخالفت کی اس نے گویا خدا سے مخالفت کی جان لو کہ اہل مجلس ہیں سے جو میری مخالفت کرے اور میرے ساتھ بغض رکھنے اور دیر سے اسکو باطل ثابت کرے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ دوزخی ہے اس پر خدا کی لعنت ہو جو میری مخالفت کرے کیونکہ اس سے جس نے انکار کیا تو گویا اس نے میری نبوت کا انکار کیا اور خدا کی مخالفت کی اور جو خدا کی مخالفت کرے وہ دوزخی ہوگا۔

جوانی پوری زندگی میں ایک بار متہ کرے معافی ہے۔ جب عورت اپنے مرد ممنوع کے پاس بیٹھتی تو فرشتہ ان پر اترتا ہے اور جب تک اپنی نشستگاہ سے اٹھیں انکی رکھوالی کرتا ہے۔ اگر باہم ہم کلام ہوں تو وہ کلام ان کے حق ذکر و تسبیح کا حکم رکھتا ہے اور جب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں تو جو بھی گناہ کئے ہوں وہ سب انگلیوں کے پوروں سے بھر جائیں اور جب باہم بوسہ بازی کریں تو اللہ تعالیٰ ہر بوسے کے عوض ایک حج و عمرہ کا ثواب لکھتا ہے۔ بمقدار اونچے اونچے پہاڑوں کے۔ اور جب اٹھ کر غسل میں مشغول ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میرے ان دو بندوں کو دکھیو کہ اٹھ کر غسل کرنے لگے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ میں ان کا پروردگار ہوں تم گواہ رہو کہ میں نے ان کے گناہ معاف کئے۔ ان کے بدن کے جس بال پر پانی کرتا ہے حق تعالیٰ ہر بال کے عوض ایک شیشی لکھتا اور ایک گناہ معاف کرتا ہے اور دس درجے بلند کرتا ہے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات میں جو صرف کوشش کرے اسکا کیا درجہ ہے۔ فرمایا وہی جو مرد متمتع اور عورت متمتع کا ہے۔ اس کے بعد فرمایا اے علی جب یہ دونوں غسل سے فارغ ہوتے ہیں تو جو قطرہ ان کے بدن سے گرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہو جاتا ہے اور قیامت تک اسکا ثواب غسل کرنے والے کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ اے علی! نبو اس سنت کو حقیر جانے اور اسے زندہ نہ کرے وہ میرے شیعہ میں سے نہیں ہے میں اس سے بیزار ہوں گا۔

اب ان روایات پر غور کر لیا جائے کہ تمام شرائع اور ادیان و ملل سے کس قدر مخالف ہیں۔ نکاح جو بالاتفاق انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اسکو کسی نے گناہ معاف ہونے اور درجات بڑھنے کا ثواب نہیں بتایا پس حرکت فاحشہ کی کیا حیثیت۔ کسی بھی دین و آئین میں شہوت رانی اور نفس کی خواہش پوری کرنے کو اس قدر ثواب تو کیا بلکہ اسکے عشرہ عشرہ کا سبب بھی نہیں ٹھہرایا۔ ایسی حرام کاری کو وہی دین و آئین اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے جس میں خدا کے دشمنوں کے ساتھ جہاد اور رمضان کی راتوں میں شب بیداری جسکی قرآن میں تعریف آچکی ہو۔ سب سے بڑی موصیبت اور گناہ کبیرہ ہو۔ مگر بصورت متہ حرام کاری میں شب بیداری وہ عبادت ہو کہ ایک بار کرنے سے درجہ امامت اور چار بار کرنے سے درجہ نبوت پر فائز کر دے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ قرآن مجید جو محض ثواب کے اسباب بتانے اور لوگوں کو جنت میں پہنچنے کا راستہ بتانے کیلئے نازل ہوا وہ تو اس سب سے بڑی عبادت کی بویاں اور محاسن سے یکسر خالی ہے۔ اس میں اس سہل اور آسان راستہ کی ہوا تک نہیں گئے مگر اور انبیاء و ائمہ کے درجات تک پہنچنے کا راستہ نامعلوم ہی رہا۔

اگر چند ضعیف و من گھڑت اور وابسی تباہی روایت ابن بابویہ کی تحصیل یا میر فتح اللہ کے پیارے میں ”ثوب ناپاک“ کی طرح چھپی پڑی ہوں اور کسی نے ان پر یقین نہ کیا تو پھر اسمیں لطف و احسان الہی کیا رہا۔ ایسے عمدہ و دلچسپ مضمون کو تو ایک بار نہیں بار بار قرآن مجید میں لانا چاہئے تھا۔ اور نماز روزہ حج زکوة و جہاد جیسی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا چاہئے تھا۔ تاکہ خاص و عام اس سے واقف ہوئے مکتب کا ہر بچہ اس کو پڑھتا اور تو اترو شہرت کی حد تک وہ پہنچتا۔

بہر حال ان کے نزدیک جب متعہ ایک بڑی عبادت ٹھہرا تو انہوں نے اسمیں وسعت بھی دی تاکہ کوئی آدمی کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اس کے ثواب سے محروم نہ رہے۔ وہ وسعت کیا ہے ملاحظہ فرمائے۔ علی بن احمد عیسیٰ فرقہ امامیہ کا چوٹی کا عالم کر ملے معلیٰ کی جامع مسجد کا امام اور خطیب بھی تھا اس کا شمار ان کے واجب الاماعت مجتہدین میں ہوتا تھا۔ اس نے اور ان کے دوسرے عالموں نے کہا ہے امامیہ کے نزدیک بالاتفاق ”متعہ دوریہ جائز ہے۔ اور وہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی رات ایک عورت چند مردوں سے گھڑی دود و گھڑی کے لیے متعہ کر سکتی ہے اور باری باری سب کو نسا سکتی ہے (مگر اس صورت میں غسل کرنے کے ثواب میں یہ عورت کو نسا سے متمتع کے ساتھ شریک قرار دی جاسکتی۔ ن)

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم امامیوں کے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ خاوند والی عورت سے بھی متعہ جائز ہے جبکہ ان کے خاوند سنی المذہب ہوں اسلئے کہ ہمارے نزدیک اہل سنت کا نکاح صحیح نہیں یوں ان کی عورتیں نکاح کے باوجود بغیر خاوند والی ہیں۔ اور ایسی عورتوں سے متعہ بالاجماع جائز ہے۔ بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہندو اور مجوسی عورت سے بھی متعہ جائز ہے بشرطیکہ وہ زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہہ دے چاہے اسکے دل میں ان الفاظ کے کوئی معنی و مفہوم نہ ہوں۔

خاتمہ باب خلاصہ حساب

واضح رہے کہ خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی مذہب پر برقرار و متحد و متفق تھی۔ بانیان قتل اور قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک بڑے دور رس سازشی منصوبہ کی داغ بیل ڈالی۔ اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کی مرضی کے خلاف ایک نئے شیعی مذہب کو وجود میں لے آیا گیا۔ جو ہر لحاظ سے مسلمانوں سے الگ ایک مستقل مذہب ہے اس لیے کلمہ سے لے کر قبر کے گڑھے میں دفن ہونے تک کوئی شرعی مسئلہ ایسا نہیں جو اہلسنت سے موافق ہو۔ اگر نادانگی میں اسکی موافقت کسی وقت ظاہر بھی ہو جائے تب بھی دالستہ اور جان بوجھ کر یہ ہمیشہ مذہب اہلسنت کے مخالف ہی رہے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہر دو جماعت میں سے ہر ایک کی حقانیت کو پرکھنے کیلئے کوئی معیار ہونا چاہئے تو وہ معیار کتاب اللہ اور اقوال عترت رسول ہیں اب ہمیں چاہئے کہ یہ دیکھیں کہ اس معیار کے مطابق کون سا مذہب کافروں کے مذہب کے مشابہ ہے اور کون سا مذہب کافروں کے مذہب کے منافی اور بالکل اسکا الٹ ہے

کیونکہ کافروں کے متعلق دونوں جماعتوں کا یہ اجماعی اور متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ لعنت مگر ابی میں گرفتار ہیں۔ اس پر کچھ کی ضرورت اس لیے بھی اٹھے کہ دونوں جماعتوں کے اختلاف کے وقت ایک دوسرے کی روایات کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ لہذا کتاب اللہ اور اقوال و عترت رسول جس مذہب کی حقیقت کی گواہی دیں گی ہمارے نزدیک وہی مذہب حق ہو گا۔ اور اس کے مقابل مذہب کو ہم باطل سمجھیں گے۔ اور جو آئین کفر و شرک اور ان کے مذہب سے متاجلتا اور مشابہ ہو گا اس کو ہم مذہب باطل سمجھیں گے اور اس کے مقابل کو مذہب حق۔

لہذا ہم اول قرآن مجید کو سامنے لاتے ہیں کہ اس میں بہت سی آیات ہیں جو مذہب اہل سنت کی حقیقت ثابت کرتی ہیں۔ مگر ہم تبرکاً ان کے بارہ ائمہ کے عدد کے موافق بارہ آیات قرآنہ بیان کرتے ہیں۔

آیت (۱) :- مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا مِنْهُمَا هُمْ فِي دُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ -

محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ (اصحاب) جو ہیں وہ کافروں پر سخت گیر مگر باہم بہت نرم دل ہیں۔ تم انہیں رکوع و سجد میں اللہ تعالیٰ کا فضل و رضا طلب کرتے ہوئے پاؤ گے۔ ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان ثبت ہیں۔

اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا دین دراصل دین حق ہے اس لیے کہ ممدوح کا موافق بھی ممدوح ہوتا ہے۔

آیت (۲) :- وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ -

اور ان کے بعد آنے والے کہتے ہیں اے پروردگار ہم کو اور ہمارے سابق الایمان بھائیوں کو بخشدے اور ایمان والوں کے خلاف ہمارے دلوں میں کینہ پیدا نہ کر اے ہمارے رب تو مہربان و رحم والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا مذہب حق ان لوگوں کا ہے جو کسی مومن کے خلاف دل میں کینہ نہیں رکھتے۔ اور اپنے سے پہلے ایمان لانے والوں کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور یہ صحابہ کرام اور امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہم ہیں کیونکہ اس آیت سے پہلے مہاجرین و انصار کا ذکر ہے۔

آیت (۳) :- وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ تُولِهِ مَا نَوَىٰ وَفُضِّلَ بِهِ جَهَنَّمَ وَشَاءَتْ مَصِيرًا -

جس کے لیے سیدھی راہ کھل گئی ہو اسکے بعد بھی وہ رکول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چل پڑتا ہے وہ اپنے لئے کو خود ہی بھگنے کا اور ہم سے دوزخ کے حوالہ کر دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

آیت سے یہ معلوم ہوا مومنوں کے خلاف راستہ اختیار کرنے والا مستحق دوزخ ہے۔ اس آیت کے نزول کے وقت مومنین صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہی تھے۔

آیت (۴) :- وَهَكَذَا اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

جو ایمان لاکر نیک کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انکو اسی طرح زمین میں اقتدار دے گا جس طرح ان

سے پہلوں کو اقتدار دیا۔ اور انکے لیے جو دین پسند کیا ہے ان کے لیے اسے ممکن عطا فرمائے گا۔ انکے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کرتے ہیں میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ اس حالت کے بعد اگر کوئی کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

كَمَا اَسْتَحَفَّ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا. وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں جس دین نے ممکن استحکام اور مضبوطی حاصل کی خدا کا پسندیدہ دین وہی تھا۔ اور وہ دین جس کا اس وقت وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا تو کچھ منافقوں، سازشیوں، اور شرک پسند قاتلوں کے دلوں میں انکی سازشوں اور نفاق کے ساتھ مخفی و پوشیدہ تھا۔ وہ اللہ کا پسندیدہ دین نہیں اور خدا کے پسندیدہ دین کے مخالف اور اسلامی اقتدار کی لغت کی ناشکری کرنے والے فاسق ہیں اور طاعت خداوندی سے خارج مثلاً رافضی، خوارج، اور نواصب،

آیت (۵) :- هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (وہ وہ خدا ہے کہ جو خود اور اسکے فرشتے تم پر رحمت کا نزول کرتے ہیں تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے) اس آیت کے اصل مصداق تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہیں مگر جس نے بھی ان کی پیروی کر لی وہ بھی مگر اسی کے اندھیروں سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آگیا۔ اس لیے کہ اگر کوئی رات کی اندھیروں میں مشعل لے کر چلے تو روشنی اسے ہی میسر نہیں ہوتی اسکے قدم بدم ہر سفر بھی اس روشنی سے مستفید ہوتے ہیں تاریکی سے وہ بھی خلاصی پا لیتے ہیں۔

آیت (۶) :- فَاتَّخَذَ اللَّهُ سَكِينَتَكَ عَلَىٰ رُسُوْلٍ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَرْمُومُ كَلِمَةُ التَّقْوَىٰ وَكَالُوْا اِحْقَ بَهَا وَاَهْلُهَا۔ (اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی طمانینت و سکینہ نازل فرمایا۔ اور پرہیزگاری کی بات پر انکو ثابت قدم رکھا کیونکہ وہ اسکے بہت زیادہ حقدار بھی تھے اور اسکے لائق بھی) معلوم ہوا صلح حدیبیہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے جو سکینت اور طمانینت نازل فرمائی گئی۔ اس میں آپ کے رفقاء اور جہاں نثار اصحاب رضی اللہ عنہم بھی شریک و سہم تھے اور اس وقت انکے دلوں پر کلمہ التقویٰ کندہ اور چسپاں کر دیا گیا تاکہ کسی وقت بھی وہ ان سے الگ نہ ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ان سے خلاف تقویٰ کوئی بات صادر نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو الزام کلمہ التقویٰ بے معنی بات ہو جاتی۔ لہذا اللہ تعالیٰ کا کندہ کلمہ بھی نشان چھوڑ گیا۔ جبکہ کلمات رب نہ کبھی تبدیل ہوتے ہیں نہ ان کا اثر زائل ہوتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا وہ جماعت ہی کلمہ تقویٰ کی زیادہ مستحق بھی تھی اور اسکی اہل بھی مستحق تو اس لیے کہ مسلمان ہی صرف وہ تھے باقی تو سارا جہان کفرستان تھا۔ اور اہل اس لیے کہ وہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت دادہ تھے اور یہ اسکی برکت و عظمت ہے کہ ان حضرات کو قیامت تک نجوم ہدایت قرار دیا گیا کہ جو بھی تقویٰ کا طالب ہو اب وہ انہی احق و اہل، اصحاب بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اقتدار کرے ان کی پیروی سے جو روکش ہوا اسے تقویٰ کی ہوا بھی نہ لگی۔

لیکن رسول اور ان کے مسلمان ساتھی کہ انہوں نے جہاد میں اپنے اموال کھپا دیے اپنی جانیں لڑا دیں۔ (اس لیے) بھلائی بھی انہیں کا حصہ ہیں اور کامیاب بھی وہی ہیں۔

ظاہر ہے کامیاب و باہرا کے جو قدم بہ قدم ہو گا وہ بھی کامیاب ہو گا۔ (رسول جس راستہ پر چل کر رضائے الہی کی جس جنت میں پہنچے آپ کے اصحاب کرام انہیں قدموں پر قدم رکھتے ہوئے منزلِ رات تک پہنچے گویا یہ منزلِ راد کی راہ متعین ہو گئی اب جو اس منزل کو حاصل کرنا چاہے اسے چاہئے کہ وہ انہیں قدموں پر چل کر جائے اس لیے کہ اس کے سوا منزل مقصود کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ (ن)

لیکن اللہ نے ایمان کی محبت تم کو عطا کی اور اسے تمہارے دلوں کی زینت بنایا (یعنی با وقعت، اور کفر، فسق اور نافرمانی کی نفرت تم میں پیدا کی۔ ان کی ہدایت و رشد اللہ تعالیٰ کے فضل و نعمت کے سبب سے ہے۔

جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے بھلا بنا کر دنیا بھر کیلئے نمونہ قرار دیا تو ظاہر ہے کہ ایسے بھلے کا تابع بھی بھلا ہو گا۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر تکین عطا کریں تو یہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی پابندی سے ادائیگی کریں اور بھلے کا مولا کا حکم دیں اور برے و ناکور کاموں سے منع کریں۔

آیت (۹) :- الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَّا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْعُرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔

یہ آیت مہاجرین رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی۔ قاعدہ کے مطابق مقدم کے ساتھ تالی و تابع کا وجود لازم ہے۔ تاکہ کلام اللہ کے متعلق کوئی مجھوٹا شبہ بھی نہ کر سکے۔ اب یہاں مقدم کا ذکر ہو گیا اور ان کے اوصاف بھی معلوم ہو گئے۔ لہذا ان کے تالی (تابع) بھی ایسے ہی ہونگے ان کے دین حق پر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہو گا۔

اس نے تم کو انتخاب کیا، تمہارے لیے دین میں کوئی سنگی نہ رکھی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔ اس نے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی تمہارا نام مسلمان رکھا۔ تاکہ رسول تو تمہارے گواہ ہوں اور تم لوگوں کے۔ پس قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو اللہ پر مکمل اعتماد رکھو وہی تمہارا آقا ہے اور کیسا بہتر آقا اور کتنا اچھا مددگار ہے۔

آیت (۱۰) :- هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلًا اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيْمَ۔ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُوْنَنَّ الرَّسُوْلُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شَهِدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ۔ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔

چنیدہ اور منتخب خدا کا تابع بھی یقینی طور پر نجات پالنے والا ہوتا ہے۔ آیت (۱۱) :- كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْعُرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (تم

بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ تاکہ تم سے بھلائیوں کے کرنے کے حکم اور برائیوں سے روکنے کی نہی کا کام لے۔

امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ تعالیٰ نے خیر امت رکھا ہے اس امت کو اس نام کے علاوہ بطور طعن کسی دوسرے نام یا کالی سے یاد کرنے والا نہ تو مسلمان ہو سکتا ہے نہ خیر امت کا کوئی فرد۔ دوسری بات یہ امت وصف خیریت سے متصف ہے اور اس خیریت کا باعث اسکا فریضہ منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس امت کا نام تقیہ، اخفاء، احکام الہی میں نرمی نہیں ہے۔ اور نہ ایسے لوگ جو ان اوصاف سے متصف ہوں خیر امت کا حصہ ہیں۔

آیت (۱۲) :- هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَهُوَ ذِي الزَّاتِ حَقِّ ۚ جِسْمِ نَزَلَ بِدَايَةِ دِينِ حَقِّ كَ سَا تَهْ اَ پْنِ رَسُوْل كُو مَبْعُوْثْ فَرِيَا تَا كِهْ تَرَامْ اَدِيَا نْ پَر اِسْ كِي فَوْقِيَتْ وَ بَرْتَرِي ظَا هِرْ فَرِيَا نِيْ ۚ

معلوم ہوا کہ دین حق کا یہ نمایاں وصف ہے کہ وہ کھلم کھلا اور ظاہر و باہر ہو، بلی کے گو کی طرح چھپا یا اور پوشیدہ رکھا جائے والا دین، ہرگز حق نہیں بلکہ سرے سے کوئی دین ہی نہیں وہ تو ہفوفے بازوں کا اختراع اور گھڑا ہوا ایک مجہوب ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں یہ بات جو یہ حضرات کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب کے ظہور کا وقت امام مہدی کا زمانہ ہے تو ان کا یہ قول پُر و پوچ ہے اس لیے کہ لیظہرہ کا لام امرسل رسول سے متعلق ہے لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متصل ہی اس دین کا ظہور ہو۔ اور وہ جاری رہے۔ اور ظاہری طور پر کوئی دین بجز اہلسنت کے جاری و زندہ نہیں۔ آیات قرآنیہ سے استدلال ثبوت کے بعد ہم اب اقوال معتزات رسول کی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے روایات اہل سنت سے بالکل مدد نہیں بلکہ شیعہ کتب کی اوراق گردانی اور انکی روایات کی چھان بین کی ہے۔ اور ہمیں ان ہی کتابوں میں خاطر خواہ کافی مواد ملا ہے۔ انکی کتابوں میں اہل بیت گرامی سے رومی بہت سی ایسی روایات ہیں جو بڑے واضح اور صاف انداز میں اہلسنت کے مذہب کی حقانیت اور مذہب شیعہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ ذیل کی پہلی روایت کتاب السواد والبیاض کے امامی مصنف نے اپنی مذکورہ کتاب میں درج کی ہے۔

امام ابی عبد اللہ جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول "وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ" اور ضوئہ تک کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے یوں راضی ہوا کہ انہوں نے اس سے پہلے توفیق و مدد سے کام لیا۔ اور وہ یوں اللہ سے راضی ہوئے کہ اس نے ان پر یہ احسان کیا کہ رسول کی متابعت اور ان کے لئے ہونے دین کی پیروی کا موقع نصیب ہوا۔

(۱) :- عَنْ الْإِمَامِ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ جَعْفَرِ الصَّادِقِ فَإِنَّهُ قَالَ فِي تَفْسِيرِهِ قَوْلَ تَعَالَى وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ حَسَنًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ قَالَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ بِمَا سَبَقَ لَهُمْ مِنَ التَّوْفِيقِ وَالْإِحْسَانَةِ وَرَضُوا عَنْهُ بِمَا مَنَّ عَلَيْهِمْ مِنْ مَّتَابَعَتِهِمْ رَسُولَهُ وَقَبُولَهُمْ مَا جَاءَ بِهِمْ۔

لہذا معلوم ہوا کہ مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم کے تابعین کو رضوان الہی کا مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ اور بموجب نص قرآنی "وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ" اللہ کی ذرا سی رضا تمام دنیاوی و اخروی لذائذ و نفعات سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

(۲)۔ انہی روایات میں سے ایک روایت صاحب الفصول کی ہے جو ایک امامی اثنا عشری مصنف ہے۔

عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ الْبَاقِرِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ قَالَ لِعِبَادَتِهِ خَاصًّا وَفِي أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ الْأَخْيَرِ وَفِي أَنْتُمْ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَتَّبِعُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَتَّبِعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ قَالُوا لَا قَالَ فَأَنْتُمْ مِنَ الَّذِينَ نَبَوْا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يَتَّبِعُونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ قَالُوا لَا قَالَ أَمَّا أَنْتُمْ فَقَدْ بَرَأْتُمْ أَنْ تَكُونُوا أَحَدَ هَذَيْنِ الْفَرِيقَيْنِ وَأَنَا أَشْهَدُ أَنْكُمْ لَسْتُمْ مِنَ الَّذِينَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى وَالَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ رُبَّمَا أَغْفِرْ لَنَا وَإِلَّا خَوَّانَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا خِلَافًا لِلَّذِينَ آمَنُوا مَرَّبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ۔

ابی جعفر محمد بن علی باقر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے اس گروہ سے جو حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضوان اللہ عنہم کے بارے میں باتیں بنا رہے تھے۔ فرمایا مجھے بتاؤ تو کیا تم مہاجر ہو جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جن کا مال اس لیے ضبط کیا گیا کہ وہ اللہ کے فضل و رضا کے طالب تھے اور اللہ و رسول کی جی جان سے مدد کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا نہیں ہم وہ مہاجر نہیں۔ تب آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم وہ لوگ ہو جنہوں نے دارِ ہجرت میں مقام کیا اور ایمان میں سبقت کی اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس گئے یہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے نہیں ہم ان میں سے بھی نہیں۔ تب آپ نے فرمایا گویا انکو اقرار ہے کہ ان دونوں فرقوں میں سے ہونے کا تمہارا کوئی دعویٰ نہیں۔ اور میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تم ان میں سے نہیں ہو چکے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا۔۔۔ آخر آیت تک۔۔۔

اس اثر سے صاف معلوم ہوا کہ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم کی شان میں بلکھنے والے یہ کہ نہ صرف گمراہ ہی ہیں بلکہ دائرۂ ملت سے بھی خارج ہیں۔

(۳)۔ انہی روایات میں سے جناب امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت ہے کہ آپ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے حق میں دعا فرمائی ان پر درود بھیجا اور ان الفاظ میں ان کی مدح و ثنا فرمائی۔

بِأَنَّهُمْ أَحْسَنُ الصُّلَحَةِ وَأَتْمَمُ فَائِذَةِ الْأَرْوَاحِ وَالْأَوْلَادِ فِي أَظْهَرِ كَلِمَةٍ وَأَتْمَمُوا كَلِمَاتِهِمْ عَلَى مُحَبَّتِهِ۔

وہ نیک صحبت لوگ تھے انہوں نے کلمۃ اللہ کی خاطر اپنی بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دیا اور اسی کی محبت پر فرائض سہے۔

اور بعد دعا یہ بھی فرمایا۔

لِلَّذِينَ اتَّبَعُوا الصَّحَابَةَ بِأِحْسَانِ الَّذِينَ يُقْبَلُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ۔

جنہوں نے صحابہ کی پیروی واقعی طور کی وہ اپنی دعاؤں میں (یوں یاد رکھتے ہیں) اور کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ایمان کے

ساتھ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

بجاء اللہ اس وصف سے متصف فرقہ اہلسنت ہی کا ہے۔ ناصبی غوارج اور افضیٰ تو کھلم کھلا اس وصف سے محروم ہیں۔

(۴) :- روایت ذیل کو شیخ محدثین نے جناب امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور جس تفسیر کو شیخ انہیں کی طرف منسوب کرتے ہیں اس تفسیر میں بھی یہ موجود ہے۔

إِنَّ اللَّهَ أَوْحَىٰ إِلَىٰ آدَمَ يَا آدَمُ إِنَّا مُحَمَّدًا لَوْ مَرَّ بِهَا جَمِيعُ الْخَلْقِ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ وَ الْمَلَائِكَةِ الْمُقَرَّبِينَ وَسَائِرِ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ مِنْ أَوَّلِ الدَّهْرِ إِلَىٰ آخِرِهِ وَمِنَ الثَّغْرِ إِلَىٰ الْعَرْشِ لَرَجَعَهُمْ بِهَذَا آدَمُ لَوْ أَحَبَّ رَجُلٌ مِنَ الْكَافَرِ أَوْ جَمِيعُهُمْ رَجُلًا مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابِهِ لَكَفَاهُ اللَّهُ عَنْ ذَلِكَ بِأَنْ يُخَدِّعَهُ بِالْقَوْلِ وَالْإِيمَانِ لَشَيْدُ خَلْدِهِ الْجَنَّةِ -

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بذریعہ وحی مطلع فرمایا کہ اگر محمدؐ کو ایک طرف رکھ کر اور باقی ساری مخلوق۔۔۔ انبیاء و رسل مقرب فرشتے نیک بندے از ابتدا تا انتہائے زمانہ۔ از زمین تا عرش۔ کو دوسری طرف رکھ کر تو لاجائے تب بھی محمدؐ کا پلڑا بھاری ہوگا۔ اور اے آدمؑ کافروں میں سے کوئی یا سب اولاد محمدؐ یا اصحاب محمدؐ میں سے کسی کو محبوب رکھے تو اللہ اس کے لیے کافی ہو جائے گا کہ اس کا خاتمہ ایمان پڑوے اور اس کو جنت میں داخل کرے

اس روایت میں کسی شیعی، خارجی، ناصبی، کیلئے تسک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ وہ بھی یہ کہہ کر کہ ہم بھی بعض آل یا اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو محبوب رکھتے ہیں اس لیے ہمارا بھی حشر ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ کسی سے محبت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی تو ہے کہ انہیں میں سے کسی کے ساتھ بغض و عداوت بھی نہ رکھنا ہو۔ کسی کے ساتھ عداوت رکھتے ہوئے کسی دوسرے کی محبت کا دعویٰ قابل قبول نہیں۔ یہ کوئی گہری بات نہیں بالکل ظاہر اور سامنے کی بات ہے کہ جب ایک شخص کی محبت فضیلت کا سبب ہوئی تو اس کے خلاف بغض یقیناً باعث ذلت و نقصان ہوگا۔ اور چلیے ان امور سے تھوڑی دیر قطع نظر کر لیتے ہیں، مگر پھر بھی یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ جو لوگ تمام آل اور تمام اصحاب کے ساتھ محبت رکھتے ہوں۔ وہ زیادہ حق رکھتے زیادہ بہتر ہوں گے، اور درجہ میں زیادہ بلند ہوں گے ان سے جو چند سے محبت کرتے ہوں، اور ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔

(۵) :- اسی تفسیر مذکور میں یہ روایت بھی مذکور ہے۔

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ أَوْحَىٰ إِلَىٰ آدَمَ أَنَّ اللَّهَ لَيُفِيضُ عَلَىٰ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْ مَحَبَّتِي مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابِي مُحَمَّدٍ مَا لَوْ قَسَمْتُ عَلَىٰ كُلِّ عَدُوٍّ مَخْلُوقِ اللَّهِ مِنْ طَوْلِ الدَّهْرِ إِلَىٰ آخِرِهِ وَكَأَنَّ الْكَافَرَ إِذَا هُمُ إِلَىٰ عَاقِبَةِ تَحْمُودَةٍ قَرَأَ إِيْمَانٍ بِاللَّهِ حَتَّىٰ يَسْتَحِقُّوا بِهَا الْجَنَّةَ وَأَنَّ رَجُلًا مِنْ بَيْتِ مُحَمَّدٍ وَ أَصْحَابِهِ أَوْ وَاحِدًا مِنْهُمْ لَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ عَذَابًا

اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آدم علیہ السلام کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ محمدؐ، آل محمدؐ اور اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہر محبت کرنے والے پر اس قدر مہربانیاں لٹاتا ہے کہ اگر وہ ابتداء زمانے سے لے کر آخر زمانہ تک کسی کافر مخلوق پر تقسیم کر دی جائے تو وہ ایمان باللہ اور ان کی آخرت ایسی سنوار دے کہ وہ جنت کے مستحق بن جائیں۔ اور جو شخص آل محمدؐ یا اصحاب محمدؐ سے یا ان میں سے کسی ایک سے بغض و عداوت رکھے

لَوْ قَسَمَ بِكَ ذَا مِثْلٍ خَلَقَ اللَّهُ لَا أَهْلَكَ لَهُمْ أَجْمَعِينَ | تو اللہ تعالیٰ اسکو ایسا عذاب دے گا کہ اسے ساری مخلوق پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کو ہلاک کر ڈالے۔

ان روایات میں قابل غور ایک بات یہ بھی ہے کہ محبت کے ذکر میں واحد (یعنی کسی ایک سے) نہیں فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ محبت تمام آل و اصحاب رضی اللہ عنہم کی مطلوب و مقصود ہے اور بغض کے ذکر میں سب کے علاوہ۔ واحد ابھی علیحدہ سے ذکر کیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان حضرات میں سے کسی ایک سے بغض و عداوت ہی ہلاکت کیلئے کافی ہے۔ اب یہ بات دن میں چمکتے سورج کی طرح ظاہر ہے کہ تمام آل و تمام اصحاب رضوان اللہ علیہم سے محبت کر لے اور ان تمام کے بغض سے بری ہونے میں اہلسنت ہی تنہا ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں۔ والحمد للہ علی ذلک۔

(۶) :- اس سلسلہ کی ایک وہ روایت ہے جو نہج البلاغہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔
أَنَّهُ قَالَ أَلَيْسَ مَوَالِي السَّوَادِ الْأَعْظَمَ فَإِنَّ يَدَ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ الشَّيْطَانُ۔
آپ نے فرمایا کثرت کے ساتھ والبتہ رہو کہ جماعت پر اللہ علیکم وعلیٰ آلکم وعلیٰ اجمعکم کی طرف سے ہے اور نہج البلاغہ میں ہے۔ اور نہج البلاغہ میں ہے۔

اور ابتداء سے لیکر آج تک سواد اعظم اہلسنت ہی ہیں۔ رافضی، خارجی اور نواصب کسی بھی زمانہ میں نہ سواد اعظم رہے ہیں اور نہ انشاء اللہ قیامت تک ہوں گے۔ ان کے سواد اعظم ہونی کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ عقائد اہلسنت دل سے قبول کر لیں۔

(۷) :- بحوالہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نہج البلاغہ نے یہ روایت نقل و محفوظ رکھی ہے۔
إِنَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَالَ لِلنَّاسِ جَمَاعَتَيْنِ اللَّهُ بِمَا عَمِلْتُمَا وَأَنَا بِمَا عَمِلْتُمَا۔
امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ لوگوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اس جماعت کی مخالفت اللہ کے غضب و غضب کو بھڑکاتی ہے۔

چودہ صدیاں بیت گئیں۔ آج تک سولے اہل سنت کے کوئی جماعت نہیں گذری، لطیفہ کہ شعیوں کے ہاں ان کا نام ہی جماعت پڑ گیا۔ اب گویا اس جماعت کا مخالف بقول جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ خدا کے غضب کا سزاوار ہوا۔ ان پر دو روایات بالا کو ان کے دوسرے محدثین مثلاً ابو جعفر محمد بن یعقوب رازی کلینی، محمد بن علی بن بابویہ قمی، شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی، اور دوسروں نے بھی روایت کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ نہج البلاغہ میں وارد ہے جو شعیوں کے نزدیک پوری کی پوری متواتر ہے۔ اور شیعہ اپنی کتابوں میں مختلف طرق سے لائے ہیں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم کی وہ روایت جو اہل سنت کے مذہب کی حقیقت و صحت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہلسنت کے پیشواؤں نے سب کچھ سیکھا ہی اہل بیت سے ہے۔ کیا فقہ و اصول عقائد اور کیا سلوک طریقت یا تفسیر و حدیث سب کچھ انہیں سے حاصل کیا۔ اہل بیت سے ان کی شاگردی کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ عالم آشکارا حقیقت ہے اور بہت مشہور و معروف ہے۔ اور اسی تعلق کی بنا پر اہل بیت ہمیشہ ان سے نرمی، خلق اور فراخ قلبی سے پیش آتے رہے۔ بلکہ بشارتیں بھی دیں ہیں۔

اور اس بات کا اعتراف و اقرار علمائے امامیہ سے بھی ثابت ہے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر ڈھیٹ پن سے حق سے آنکھ چرائے تو اسکا کوئی علاج نہیں۔ ابن مطہر حلی نے منہج الحق اور منہج الکرام میں اسکا اعتراف کیا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ امام مدینہ امام مالک رحمہما اللہ نے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا۔ امام شافعیؒ امام مالک رحمہما اللہ کے اور امام احمد بن حنبل امام شافعی رحمہما اللہ کے شاگرد ہیں۔ اور جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جناب باقر اور زید شہید رحمہما اللہ سے بھی تلمذ کیا ہے۔

امامیہ اپنے ان مجتہدوں کو واجب الاطاعت مانتے ہیں جو امام کی غیر موجودگی میں اجتہاد کی شرط اپنے اندر رکھتے ہوں لیکن وہ مجتہد جو ائمہ کی موجودگی میں شروط اجتہاد کا مالک ہی نہ ہو بلکہ ائمہ سے اجتہاد اور فتویٰ کی اجازت بھی حاصل کر چکا ہو۔ امامیہ کے نزدیک اسکے مذہب کا اتباع تو بطریق اولیٰ ہونا چاہیے (لیکن ایسا نہیں ہے) یہ بات خود شیخ حلی کو تسلیم ہے وہ اعتراف کرتا ہے کہ جناب باقر زید شہید اور جعفر صادق رحمہم اللہ نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو فتویٰ کی اجازت دی ہے۔ لہذا آپ کا جامع الشروط ہونا نقص امام سے ثابت ہوا۔ اب شیعوں میں سے جو بھی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو واجب الاطاعت نہ جانے وہ گویا معصوم کی شہادت کو جھٹلاتا ہے۔ اور یہ بات عامی شیعہ بھی جانتا ہے کہ معصوم کی شہادت جھٹلانا کفر ہے۔ خصوصاً امام کی غیر موجودگی میں۔ ان کا مذہب ابن بابویہ، ابن عقیل، اور ابن المعلم کے مقابلہ میں زیادہ قابل اتاع ہوگا۔

کہیں تو یہ انصاف کریں اور تعصب اور عناد سے دست بردار ہوں۔ اس بارہ میں اہلسنت کی روایات نہیں مانتے چلو نہ انیں خود امامیوں کی روایات تو انکے لیے قابل قبول ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ابوالحسن حسن بن علی نے اپنی اسناد سے ابی البیری سے روایت کی ہے کہ:

دَخَلَ أَبُو حَنِيفَةَ عَلَى أَبِي عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ
فَلَمَّا نَظَرَ إِلَيْهِ الصَّادِقُ قَالَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْكَ وَأَنْتَ
تُحْيِي سُنَّةَ جَدِّي بَعْدَ مَا انْدَرَسَتْ وَتَكُونُ مَقْرَعًا
لِكُلِّ مَلْهُوفٍ وَعِيَاثًا لِكُلِّ مَهْمُومٍ يَسْتَلْكَ الْمُتَعَبُّونَ
إِذَا وَقَفُوا وَهَدًى يَهْدِيهِمْ إِلَى وَاضِعِ الظُّلُمِ إِذَا تَحَيَّرُوا
فَلَكَ مِنَ اللَّهِ الْعَوْنُ وَالتَّوْفِيقُ يَسْتَلْكَ الرَّابِيُّونَ
بِكَ الظُّلُمِ۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے نانا کی سنت کو زندہ کر رہے ہو جبکہ وہ مٹ چکی ہے۔ تم ہر مضطر کی جگہ پناہ بنو گے اور ہر غمگین کی فریاد رسی کا مرکز ہو گے جب حیرت زدہ ٹھٹھک کر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے تو تم ہی سے راستہ پوچھیں گے۔ اور جب وہ حیرانی میں ہونگے تو تم ہی ان کو کھلے راستہ پر لگاؤ گے تو اللہ کی طرف سے تم کو مدد اور توفیق ملے گی۔ اللہ والے تم سے راستہ پوچھا کریں گے۔

سارے ہی امامیہ یہ روایت کرتے اسے تسلیم کرتے اور مانتے ہیں کہ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ وقت ابو منصور کے پاس آئے تو اسکے پاس عیسیٰ بن موسیٰ حاضر تھے وہ کہنے لگے اے امیر المؤمنین یہ آج پوری دنیا کے بڑے اور نامور عالم ہیں اس پر منصور نے پوچھا اے نعمان! تم نے کس سے کتاب علم کیا ہے؟ ابوحنیفہؒ بولے علیؑ کے ساتھیوں سے اور انہوں نے علیؑ سے۔ اور عبد اللہ بن عباس کے ساتھیوں سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عباس سے اس پر منصور بولا۔ اے جوان! تم نے بڑا درجہ استناد حاصل کیا ہے۔

اور یہ بھی ان امامیوں ہی کی کتب میں مسطور و مرقوم ہے کہ وہ ابو حنیفہؒ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم تھا جو آپ کو گھیرے ہوئے تھے اور ہر طرف سے آپ سے سوال پوچھے اور آپ کی طرف سے جواب دیئے جا رہے تھے۔ سوالات کے جواب اتنے برجستہ اور فوری ہوتے گویا وہ پہلے سے آپ کی جیب میں ہوں اور آپ نکال نکال کر دے رہے ہوں۔ اس وقت اچانک ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ جناب ابو حنیفہؒ نے جب آپ کو دیکھا فوراً تعظیماً کھڑے ہو کر کہا اے ابن رسول اللہ۔ اگر آپ کی آمد کی مجھے بھٹک بھی مل جاتی تو اللہ تعالیٰ مجھے اس حال میں نہ دیکھتا کہ میں بیٹھا ہوں اور آپ کھڑے ہوں۔ ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تم بیٹھے رہو۔ لوگوں کو جواب دیتے رہو میں نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح پایا ہے۔

حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے مسئلہ تفضیل کے ذیل میں بشرح تجرید ابن مطہر علی میں یہ دونوں روایتیں موجود ہیں۔ اگر اس موقع پر کسی شیعہ کے دل میں یہ شیطان و غوغا پیدا ہو کہ جب امام ابو حنیفہؒ یا ان جیسے مجتہدین اہلسنت حضرات ائمہ کے شاگرد تھے تو پھر بہت سے مسائل میں ان حضرات کے خلاف فتاویٰ کیوں دئے۔ تو اس کا جواب قاضی نور اللہ شوستری کی مجالس المؤمنین میں موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ جناب عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جناب امیر رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے اور آپ کے سامنے ہی درجہ اجتہاد تک پہنچ چکے تھے اور آپ کی موجودگی میں اجتہاد کیا کرتے تھے اور بعض مسائل میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اور آپ لے جائز سمجھتے۔

ہشام احوول، ابن سالم، میثمی، زرارة، اصول عقائد الہیہ میں مثلاً تجسم و صورت اور حدوث عالم باری تعالیٰ میں حضرات ائمہ کے صریح مخالف تھے۔ کلینی اور امامیہ کی دوسری صحیح کتابوں میں بذریعہ ثقات ایسی روایات موجود ہیں کہ حضرات ائمہ ان سب لوگوں سے ان عقائد میں مخالفت کے سبب نفرت فرماتے اور انہیں سرزنش بھی کرتے۔ اس سبب کے باوجود بھی ان بزرگوں سے انکی شاگویی اور تلمذ سے کسی کو انکار نہیں۔ اور جب یہ لوگ ان ائمہ سے روایات بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی بھی ستر تابی نہیں کرتا۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک رحمہما اللہ کا اختلاف تو محض فروع فقہیہ میں ہے اصول عقائد میں کوئی اختلاف نہیں۔ پھر بھی انکو نظر سے گرایا جا رہا ہے۔ اس کا سبب؟ تعصب و عناد کے سوا کچھ تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجتہد کو اپنی دلیل کی پیروی لازم ہے۔ ہاں مسائل منصوصہ کے خلاف دیدہ و دانستہ کرنا اس کیلئے حرام ہے۔ اور جب مسئلہ کے لئے کوئی نص موجود نہ ہو تو مجتہد اور امام معصوم میں یہ فرق ہے کہ مجتہد کے اجتہاد میں خطا کا احتمال رہتا ہے اور امام معصوم کا قول یقیناً صحیح ہوتا ہے۔ اور خطا کی صورت میں مجتہد پر کوئی عتاب نہیں بلکہ اسکو ایک گونہ اجر ملتا ہے۔ چنانچہ معالم الاصول شیعہ میں اسکی تصریح موجود ہے۔ تو مجتہد کی خطائے احتمالی بمنزلہ صواب یقینی کے ہوئی جسے کوئی خوف و ترس نہیں ہوتا۔ نہ اسکی ہی حق میں نہ مقلد کے حق میں۔ البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ اجتہاد اپنی جگہ اور صحیح صورت حال کے ساتھ ہو یعنی قرآن صریح۔ خبر متواتر مشہور اور اجماع امت کے مقابلہ میں اجتہاد نہ ہو۔ اس لیے کہ ان دلائل کی موجودگی میں اجتہاد درست نہیں۔

پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اہلسنت کے مجتہدین اور ان کے لشکر کے سارے تقویٰ، عدالت اور دیانت میں

اتنے مشہور و معروف ہیں کہ شیعہ بھی عقیدہ سنت کے طعن کے سوا اور میں فقہ کذب، یاد نیا داری جیسا کوئی عیب بھی لگانے کی جرأت نہیں کر سکے۔ جبکہ دوسرے فرقوں خصوصاً شیعوں کے روادے کا جو حال ہے وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ انکے راوی خود انہی کے ہاتھوں ایسے مجروح و مطعون ہیں کہ شاید کسی اور فرقے کے راوی ایسے ہوں۔

صفین کی جنگ کے بعد جناب امیر کے لشکر جو خلاصہ فرقہ ہیں اور اس گروہ کے قرن اول اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اقوال و افعال زیادہ تر انہی مطعون و مجروح روادے کی وساطت سے مروی ہیں ان کا حال آنجناب کے خطبوں منقولہ نہج البلاغہ میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو چکا کہ یہ کس قدر خائن فاسق امام کے احکامات کے نافرمان کاذب اور جھوٹے تھے۔ انکے سارے طور طریقے منافقوں کے سے تھے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی منافقت کی گواہی دی۔ اور کوفہ کی جماعت جنکی روایت پر عقیدہ کا دار و مدار ہے۔ جیسے ہشام بن زرارہ، میثمی وغیرہ ان سب کو خود ائمہ نے تجسیم کے معاملہ میں افتراء پر داز کہا اور ان کو بد عبادی اور لعنت بھیجی ہے۔ بعض کو اپنی صحبت میں آنے سے روک دیا جیسا کہ عبد اللہ بن مسکان۔ شیخ مقتول نے "ذکر علی" میں اسکا ذکر کیا ہے۔

اور ان روادے میں بعض تو ایسے ہیں کہ انکا اسلام بھی ثابت نہیں مثلاً زکریا بن ابراہیم نصرانی جس سے ابو جعفر طوسی اور دوسرے لوگوں نے روایات لی ہیں۔ اور عباسی دور میں جب ائمہ نظر بند رکھے جاتے تھے تو شیعوں کے اکثر راوی عباسیوں کے دُور سے گھر سے باہر تک نہ نکلتے تھے نہ ائمہ سے اپنے تعلق کا اظہار کر سکتے تھے۔ بخلاف اہلسنت کے کہ ان کے علماء اس وقت بھی ائمہ سے شرف ملاقات حاصل کرتے اور انکتاب فیض کرتے تھے۔ ساری تاریخوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ عباسی خلیفہ کی جیل میں نظر بند تھے تو امام محمد (محمد بن الحسن الشیبانی) اور قاضی ابوالیوسف رحمۃ اللہ علیہما ان کی زیارت کو جاتے اور علی مشکلات کو حل کرتے ایسے عالم میں کہ وہ متہم ہونیکے بنا پر اسیر حکومت تھے۔ ان حضرات کا ان سے ملاقات کرنا انکے انتہائی خلوص اور تعلق خاطر کا مظہر ہے اور یہ تاریخی بات امامیہ کی اپنی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ امامیہ میں سے صاحب الفضل نے مذکورہ بالا ہر دو حضرات سے جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے خرق عادات کے باب میں روایت بھی بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ جب ہارون الرشید نے انکو قید کیا تو ہم انکے پاس گئے اور انکے پاس بیٹھ گئے۔ آپ کے پاس کوئی مامور و متعین شدہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں ذیلوی سے فایغ ہو کر واپس جا رہا ہوں آپ اگر کسی چیز کی ضرورت یا خواہش رکھتے ہوں تو بتائیں میں کل لیت آؤں گا۔ آپ نے اسے جواب دیا نہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں مجھ پر تم سے فرمایا میں اس پر حیران ہوں کہ یہ شخص جو مجھ سے میری حاجت پوچھتا ہے کہ اگر کچھ ہو تو میں کل لیتا

اَنْهَمَا قَالَا لِمَا حَبَسَهُ هَاهُنَا الرَّشِيدُ دَخَلْنَا عَلَيْهِ وَجَلَسْنَا عِنْدَهُ فَجَاءَهُ بَعْضُ الْمُؤْكَلِينَ فَقَالَ اِنِّي قَدْ فَرَّغْتُ فَاَنْصَرِفْ فَاِنْ كَانَ لَكَ حَاجَةٌ فِي شَيْءٍ اَتَيْكَ هَاهَا لِيْنِ اَجِيْبُكَ غَدًا فَقَالَ مَالِي حَاجَةٌ ثُمَّ قَالَ لَنَا اِنِّي اَعْجَبُ مِنَ الرَّجُلِ سَأَلَنِي اَنْ اَكْلِفَهُ حَاجَةً يَأْتِي بِهَا مَعًا اِذَا جَاءَ وَهُوَ مَيِّتٌ فِي هَذِهِ اللَّيْلَةِ فَجَاءَهُ فَمَاتَ الرَّجُلُ فِي لَيْلَتِهِ بَلَدَكَ فَجَاءَهُ -

اؤں مگر یہ تو رات ہی کو مرنے والا ہے چنانچہ وہ شخص اسی شب اچانک فوت ہو گیا۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اہلسنت کا مذہب ہمیشہ ظاہر و مشہور رہا۔ اور شیعوں کا مذہب اسکے برعکس ہمیشہ مستور و مخفی رہا (کسی سازش کی طرح) اور دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر ہونا لازم ہے فرمان خداوندی ہے **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ** (وہ ہے جس نے ہدایت و دین حق کے ساتھ اپنا رسول بھیجا تاکہ تمام دینوں پر اسکو غالب و ظاہر کرے) اور یہ بھی فرمایا **وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ** (ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہونگے) اور اس پر اتفاق ہے کہ عباد سے مراد امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عرب، عجم، شام، روم، مصر، مغرب کے وارث ہمیشہ اہلسنت ہی رہے ہیں۔ جب مسلمانوں کی شامت اعمال سے عراق و خراسان پر تاتاری کا فروں اور چنگیزیوں کا تسلط ہوا۔ تو ان شہروں کے وارث شیعہ ہوئے گویا دولت محمدی کے اصل وارث اہلسنت ہیں۔ اور شیعوں کا یہ گروہ چنگیزیوں کے لگے ہوئے لقمے کھانے والا ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اہل تشیع اور اہلسنت کے اختلاف کا مدار اور مرکزی مسئلہ امامت کا معاملہ ہے۔ ان کے ہاں امامت کا مسئلہ ایسے پانچ اصولوں پر موقوف ہے جن میں سے کوئی ایک بھی قابلِ سماع و دلیل سے ثابت نہیں۔ وہ اصول خمسہ یہ ہیں:-

اصل اول :- یہ کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ۔ بلا فصل امام (خلیفہ) تھے۔

اصل دوم :- ائمہ کی تعداد میں نہ کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

اصل سوم :- امام آخر کی درازی عمر۔ ان کا پوشیدہ رہنا۔ یا مرنے کے بعد انکی والہی جیسا کہ انکے فرقوں میں اختلاف ہے۔ یہ تینوں باتیں کتاب اللہ اور اخبار متواترہ سے نہ آجنگ ثابت کی جاسکی ہیں اور نہ قیمت تک ثابت ہو سکی۔

اصل چہارم :- صحابہ کا مرتد و کافر ہونا۔ حق کو چھپانا باطل کو ظاہر کرنا۔ ناشائستہ امور پر ان سب کا اتفاق۔ حالانکہ قرآن مجید میں صحابہ کی شان میں اور انکے حال کی اچھائی اور انکے نتیجہ کی بہتری پر صاف اور کھلے طور پر شاہد و ناطق ہیں:-

اصل پنجم :- ائمہ کے متعلق تقیہ کا اعتقاد رکھنا کہ شیعوں کو وہ ایسی باتیں بتا دیتے تھے جو اوروں سے چھپاتے تھے۔ حالانکہ وہ دوسرے بھی انہی کے شاگرد دہوتے انہی سے علم و طریقت حاصل کئے ہوتے۔ تو بلا وجہ اور سبب حضرات ائمہ کے لیے جھوٹ بولنے کی ضرورت تھا۔

ان پانچوں امور کو جبکو شیعہ اسلام کے ارکان خمسہ کی مانند جانتے ہیں۔ ہم نے ظاہری عقل، کتب اللہ، سنت مشہورہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلکہ ساری اگلی پچھلی شریعتوں کے قواعد پر ان کو جانچ پرکھ کر دیکھ لیا اور ان کو سب کے خلاف پایا اور یوں ہم نے یقین کے ساتھ جان اور سمجھ لیا کہ یہ مذہب خاندان نبوت سے نہیں لیا گیا بلکہ ایک مصنوعی اور افتراء مذہب ہے۔ (جسکی پہلی بنیادی اینٹ عبداللہ بن سباؓ نے نصب کی اور پھر اسکے حواریوں نے موقعہ بموقعہ و وقتاً فوقتاً اسکی تعمیر و تکمیل میں اہم کردار ادا کیا اور یہ کوئی سر

بستر از منہیں کہ ابن سبا کا استاد معلم الملکوت ہے۔ (ن)

ان اصول کے ثبوت میں شیعوں نے جو دلائل دیئے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ ایسی احادیث ہیں جو ضعیف الحال راویوں سے مروی ہیں جنکا ان کے زمانہ میں علماء میں شمار ہی نہ تھا۔ اور جنکے راوی خود ان کے نزدیک جرح و قدح سے مجروح و مطعون اور جھوٹ و بددیانتی سے متہم ہے۔ یا وہ قرآنی آیات ہیں کہ ان کے ساتھ جب تک اسباب نزول اور خصوصی واقعات شامل نہ کئے جائیں ان کے ظاہر سے ان کا مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اور وہ اسباب نزول یا خصوصی واقعات اکثر موضوع، ضعیف اور اقرار شدہ اخبارات ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اصل مطلب حاصل کرنے کے لیے گھڑے ہوئے ناقابل تسلیم مقدمات ملانے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسکی تفصیل گند چکی ہے۔

ان امور میں جو بھی عقیدہ غور و خوض سے کام لے اور حقیقت حل سے واقف ہو وہ بلا تامل اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ مذہب از ابتدا تا انتہا، فریب، فترت، اور مصنوعی ہے۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح اسپر عیاں ہو جائیگی۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

ان کے مذہب کے مطالعہ کے دوران ایک یہ بات بھی ہم نے دیکھی اور غسوس کی کہ شیعہ مذہب اصول و فروع میں کافروں کے پانچ مذہبوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ یعنی، یہود، نصاریٰ، اصابین، مجوس اور ہنود۔ دنیا بھر کے کفار میں علماء، کتب، اور تصنیف و تالیف کے نقطہ نظر سے یہی پانچ مذہب ممتاز اور مشہور ہیں۔ اور ملت حنیفیہ کے سراسر خلاف ہیں۔

اور انتہائی غور و فکر سے کام لینے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شیعہ مذہب بحیثیت مجموعی بعینہ ان فرقوں کا مذہب ہے۔ ہر مذہب سے ایک نہ ایک چیز لے لی ہے۔ مثلاً۔ اپنی تعریف میں مبالغہ سے کام لینا۔ عذاب الہی سے امن میں رہنے کا دعویٰ، عذاب و عقاب سوال و جواب، وزن اعمال سے خود کو مستثنیٰ کرنا، اور ان امور کو دوسروں کے ساتھ مخصوص کرنا۔ یہ سب کچھ یہود سے لیا ہے کیونکہ وہی کہتے تھے۔ نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاجْتَبَاۤءُ (ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے دوست ہیں) لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا نَّعْبُدُكَ (ہمیں آگ چھوننے سے زیادہ نہ چھوئے گی) لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنُ كَانَ هُوَ اَوْ نَصَارَى (یہودی و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا) اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے بغض و عناد رکھنا اور خدا کے مقرب بندوں اور محبوب دوستوں سے تعصب۔ یہ بھی یہودیوں کی انکے لیے بخشش ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِیْلِ اِسْپِرْگُوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دینا۔ بدلا کا قول۔ یہ بھی یہود کی چوڑی ہوئی بڑیاں یا لگے ہوئے نقے ہیں جو ان مذہب کا حصہ ہیں۔

انکے کی محبت میں غلو، انکو آکر ماننا، ان میں روح الہی کے حلول کا عقیدہ، انکو معصوم جانتا، انکے لیے علم ثابت کرنا، موت ان کے ہاتھ میں ہونے کا عقیدہ رکھنا، جناب امیر کو قاسم جنت و دوزخ تسلیم کرنا، ان کو روز جزا کا مالک قرار دینا اور اپنے کو انکی محبت کے سبب بخشا ہوا، نجات پایا ہوا سمجھنا، یہ سارے عقائد نصاریٰ کی پٹریوں سے اڑائے ہوئے ہیں جو جناب مسیح علیہ السلام کی عہدیت کے منکر تھے۔ اور مذکورہ بالا مراتب انکے لیے ثابت کرتے تھے جس طرح شیعہ میں امام ہے نصاریٰ میں پوپ کا بھی وہی درجہ ہے۔ آدھے قرآن کو ظاہر پر محمول کرنا اور دوسرے آدھے کو جو صحابہ

و مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی تعریف میں ہے غلط سلط اور باطل تاویلات سے تحریف کرنا، یہ بھی یہود و نصاریٰ دونوں کی مشترک پلیٹ ہے جس میں یہ بھی مندر ہے ہیں۔ امامت کو جناب حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں مخصوص و محدود کرنا بھی یہود کے قول کے مشابہ ہے۔ وہ بھی نبوت کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں۔ اپنے کو خدا کا دوست کہنا اور شیعہ علی کی تعریف میں ایران توران کی ہانکنا بھی انہوں نے یہودیوں سے سیکھا ہے۔ یہودیوں کو تو اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا تھا کہ یہودیو! تم کو اگر یہ زعم ہے کہ تم ہی اللہ کے دوست ہو اور کوئی نہیں تو اپنا سچ ثابت کرنے کیلئے ذرا موت مانگ کر تو دکھاؤ۔ (ہم بھی ان پر وان یہود سے یہی کہتے ہیں کہ جب تم ہی اللہ کے دوست اور مستحق جنت ہو، مالک جنت بھی تمہارے اپنے ہیں تو پھر دنیا کے اس جہنم ناز میں کیوں دنیا بھر کی لعنت پھٹکار سمیٹ رہے ہو مگر جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔ مرنا بس میں نہیں، مرنے کی آرزو تو کر سکتے ہو وہی کر کے دکھاؤ۔ ن) کتاب اللہ میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے اس کچھ الفاظ کا اضافہ کرنا یہ بھی بعینہ یہودی حرکت ہے۔ یہود کہتے ہیں جب تک مسیح دجال نہ آئے جہاد جائز نہیں۔ اثنا عشری کہتے ہیں جب تک امام مہدی کا ظہور نہ ہو جہاد جائز نہیں۔ مغرب کی نماز کو ستارہ دیکھنے تک مؤخر کرنا بعینہ یہود کا مذہب ہے۔ تین طلاقیں کے یک وقت وقوع سے انکار کرنا بھی عین قول یہود کے مطابق ہے۔ یہودی کہتے ہیں مسلمانوں کی ایذا رسانی میں اتنا اتنا ثواب ہے اس مصرعہ پر شیعوں نے یہ کرہ لگائی کہ سنی کے قتل کی کوشش کو ستر سالہ عبادت کا درجہ دیا ہے۔ یہودی کہتے ہیں کَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْقَمِیْنِ سَبِیْلُ رَامِیْنِ کے حقوق غصب کرنے پر ہم سے کوئی جواب طلبی نہیں ہو سکتی ہے! امامیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سنیوں کی جان و مال و آبرو پر دست درازی میں کوئی مضائقہ نہیں۔

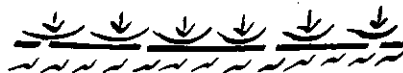
یہودی جناب عیسیٰ، مادر محترم مریم علیہما السلام اور ان کے حواریوں پر سب و شتم کرتے ہیں، شیعہ بھی اصحاب پیغمبر، خلفائے راشدین، امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہم کو سب و شتم کرتے ہیں۔ نصاریٰ پیشاب پاخانے کی نجاست کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ ناک کی ریزش یا تھوک کی طرح سمجھتے ہیں چنانچہ مذی، ودی، اور بعد پیشاب قضیب کو جھٹکنے اور خشک پاخانہ میں شیعوں کا بھی یہی مسلک ہے، ان کے نزدیک بھی یہ نجاست کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ نصاریٰ اپنی نازوں میں قبلہ کو معین کرنے کی پابندی نہیں لگاتے چاروں طرف سجدہ کرنا جائز بتاتے ہیں، امامیہ بھی نوافل میں بلا عذر استقبال قبلہ کی قید اڑا دیتے ہیں۔ اور ہر طرف سجدہ کرتے ہیں۔ نئی اختراعی عیدوں کے منانے میں بھی نصاریٰ کے ساتھ پوک پوری مشابہت رکھتے ہیں کہ انہوں نے بھی بہت سی عیدیں اپنی طرف سے گھڑ لی ہے۔ یوم عاشورہ میں ائمہ کی قبروں پر تصاویر لگانا، ان کو سجدہ کرنا یا ان کے روبرو دست بستہ کھڑے رہنا نصاریٰ کے عمل سے ملتا جلتا ہے کہ وہ بھی کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ، بی بی مریم (علیہما السلام) کی تصاویر بناتے ہیں، انکی تعظیم کرتے اور سجدہ کرتے ہیں،

اب ذرا صاحبین سے مشابہت دیکھئے کہ جب قمر عقب میں یا حاق میں ہوتا ہے اس سے احتراز کرتے ہیں۔ تاریخوں اور ایام کی سعادت و نحوست کے بارے میں بڑا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں، نوروز اور شرف آفتاب کی تعظیم کرتے ہیں، صاحبین تمام ستاروں کو فاعل ختمہ اور زمینی اشیا کا خالق خیال کرتے ہیں، رافضی بھی تمام حیوانات

کو خالق و فاعل مختار جانتے ہیں۔

مجوسی نیکی و بدی کا الگ الگ خدا مانتے ہیں یعنی بیزداں و ابرہمن رافضی بھی خالق خیر و خدا کو مانتے ہیں اور خالق شر شیطان و انسان کو ٹھہراتے ہیں۔ اس لیے علماء ملت نے انہیں اس ملت کے مجوسی ہونے کا خطاب دیا ہے۔ مجوسی عورت کے مباح کرنے میں فراخ دل، بلکہ انتہا درجہ بے غیرت و بے حیا معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ رافضی بھی متعہ اور شرمگاہوں کے حلال کرنے میں انکے قدم بقدم ہیں۔ بلکہ متعہ اور تحلیل فروج میں بیٹیوں اور بہنوں کو حلال جانتے ہیں جسکی وجہ بیان ہو چکی۔

رہی ہندو سے مشابہت تو ہندو جو کچھ اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی یہ لوگ ایام عاشورہ میں اپنے ائمہ کی قبور کی تصاویر کے ساتھ کرتے ہیں۔ انکو غسل دیتے ہیں، سوار کرتے تو بتیں بجاتے ہیں، انکے سامنے کھانا رکھتے ہیں، اور جھوٹا کوٹا بطور تبرک تقسیم کرتے ہیں، جناب قاسم صلی بی سکینہ کا بیابا، شادی، نکاح، رسم مہندی زندوں کی طرح عمل میں لاتے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو انکی توہم پرستی ہندوؤں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ وہ تو صرف اشخاص کی تصویروں کی پرستش کرتے ہیں اور یہ قبروں اور اشخاص کے جنازوں کی تصویروں کی پوجا و پرستش کرتے ہیں ہندو گائے کے پیشاب اور گوبر کو پاک سمجھتے ہیں، یہ رافضی بھی انسان اور گائے دونوں کے پیشاب پاخانہ کو پاک مانتے ہیں، اور اسی طرح انکے نزدیک دونوں کا خشک پاخانہ بھی پاک ہے، ستر عورت ہندو کے ہاں لنگوٹی میں چھپنے والے تین اعضاء ہیں اور شیعہ مذہب میں یہی ستر عورت ہے، ہندو عبادت کے وقت ننگا رہنا اچھا خیال کرتے ہیں۔ رافضی بھی نماز و طواف میں برہمن ہونے کو جائز کہتے ہیں بشرطیکہ آگے پیچھے کے اعضاء پر مٹی لتھیر لی جائے۔ ہندو اپنی پیشانی پر معبد کی خاک ملتے ہیں شیعہ بھی خاک ہی کو اپنی سمجھ گاہ بناتے اور قبلہ ٹھہراتے ہیں۔ ہندو کے ہاں پرستش و پوجا کے وقت کپڑے کی پاکی شرط نہیں، امامیہ بھی اس کپڑے کو جو بدن سے متصل نہ ہو پاک ہونے کی شرط نہیں لگاتے، مثلاً گپڑی، ازار بند، کمر بند، موزہ، سر پر چادر، پیشاب، مذی و دی ہندو کی طرح امامیہ کے نزدیک پاک ہیں، ہندو اپنی عبادت کیلئے کسی خاص سمت و جہت کو متعین نہیں کرتے، شیعہ بھی قوافل اور سجدہ تلاوت میں قبدر و ہونا فرض نہیں مانتے، ہندو اپنے روزے میں بعض اشیاء کا کھانا جائز رکھتے ہیں انکو روزہ توڑنے والی اشیاء شمار نہیں کرتے، شیعہ بھی غیر عادی اشیاء کھالینے کو فاقض صوم نہیں جانتے مثلاً موم وغیرہ۔ ہندو کے نزدیک خون مسفوح حرام نہیں، رافضی بھی کھانے میں خون مسفوح بہت شامل جانے کو بھی حلال کہتے ہیں، ہندو کے ہاں نکاح کی مشہوری اور گواہ ضروری نہیں، متعہ میں امامیہ بھی اسی روش کو طے ہیں۔ ہندو وادیوں کی شرمگاہیں جسکے لیے چاہیں حلال کر سکتے ہیں بعینہ یہی مسلک ان رافضیوں کا بھی ہے۔ غیر مکرک چاندی پیر نہ ہندو کے ہاں زکوٰۃ ہے نہ ہی مذہب امامیہ میں۔



بارہواں باب

تولاً - اور تبراً -

تولاً کے معنی محبت کے ہیں اور تبری کے معنی ہیں عداوت کے۔ اس نازک بحث میں پڑنے سے پہلے چند مقدمات بت ترتیب گوش اذکار کر لیے ضروری اور مفید ہیں۔ یہ مقدمات شیعوں کے معتبر علماء کے اقوال اور آیات قرآنی کی رو سے ثابت شدہ ہیں۔ پھر ان سے نتیجہ نکال کر وضاحت سے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ قابل محبت کون ہے اور لائق عداوت کون۔ اور یہ سب کچھ شیعوں کی مقرر کردہ اصول کی بنا پر ہو گا۔ اہل سنت کے اقوال کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

مقدمہ لا ۱۔ یہ کہ مخالفت اور عداوت میں فرق ہے۔ مخالفت کو عداوت لازم نہیں۔ بات اگرچہ صاف و ظاہر ہے، محتاج دلیل نہیں مگر ضد قور نے اور جائے فرار مسودہ کرنے کی خاطر دو وجوہ سے اسے ثابت بھی کرتے ہیں اول ۱۔ ملاحظہ فرمائیے واعظ، مصنف ابواب الجنان جو اثنا عشریہ میں ایک معتبر شخصیت شمار ہوتا ہے نے تصریح کی ہے کہ دو مومنوں کے درمیان امور دنیاوی میں مخالفت ممکن ہے۔ گو بتقاضائے ایمان دونوں باہم محبت رکھتے ہوں دوم ۲۔ اثنا عشریہ شیعوں کے اعتقاد کے موجب شیخ ابن بابویہ اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے درمیان فقہی مسائل یا مروی روایات کی تصحیح کے سلسلہ میں مثلاً میثاق وغیرہ میں باہم اختلاف متحقق اور ثابت ہے۔ اس کے باوجود وہ اتحاد مذہب کے سبب باہم رابطہ محبت بھی رکھتے ہیں۔ لہذا مخالفت عداوت عام ہو گئی۔ اس جہاں مخالفت ہو ضروری نہیں وہاں عداوت بھی ہو۔ البتہ جہاں عداوت ہوگی وہاں مخالفت بھی ضرور ہوگی۔ مقدمہ لا ۲۔ یہ کہ کبھی محبت و عداوت جمع بھی ہو جاتی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عداوت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک دینی مثلاً مسلمان کی عداوت کافر کے ساتھ کہ محض اصول عقائد کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ دوسرے دنیاوی مثلاً ایک مسلمان کی عداوت اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے کسی دنیاوی نفع و نقصان کے سبب یا ایک دوسرے کے طور و طریقوں اور طرز عمل سے نفرت رکھنے کے باعث۔ پس معلوم ہوا کہ مختلف الجنس یعنی دینی و دنیوی محبت و عداوت کا یکجا ہو جانا ناممکن الوقوع نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات واقع ہو جاتا ہے۔ اور متعلق الجنس مختلف النوع یا مختلف الصفت محبت و عداوت کا جمع ہونا بھی جائز الوقوع ہے۔ جیسے مومن فاسق بحیثیت ایمان تو محبوب ہے اور بلحاظ فسق مبغوض۔ (جیسے آیات المومنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض۔ اور ان الله لا یحب الظالمین۔ یا ان الله لا یحب الظالمین) اور اس دلیل سے کہ بری بات سے روکنا فرض ہے۔ اور بری بات سے روکنے کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے ولی بغض رکھے۔

اب یہاں ایک اور بحث ہے کہ بعض نیک اعمال کے صدور کے سبب مثلاً، خیرات، بھلائی، انصاف، دلوری، مروت، جو انمردی، پاس عہد اور صدق کلامی کے کسی کافر سے بھی دینی محبت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ سہمیری نظر تو مومن فاسق پر قیاس کرتے ہوئے محبت و عداوت کے جمع ہونے کا حکم لگاتی ہے مثلاً سخاوت کی

وجہ سے حاتم سے ثبت یا عدالت کے سبب نوشیرواں سے محبت۔ مگر نظر غور دیکھا جائے تو یہ محال نظر آتا ہے کہ دینی محبت و عداوت یکجا جمع ہوں۔ وجہ اور سبب یہ ہے خدا کے ہاں کسی عمل کے مقبول ہونے کی شرط اول اعتقاد کی درستی ہے، یہاں چونکہ اعتقاد ہی فاسد ہے اسلئے اسکا عمل بھی دینی لحاظ سے خدا کے ہاں فاسد و نا مقبول ہوا اور قابل اعتبار نہ رہا چہ جائیکہ قابل محبت ہو تا، پس نیک اطوار کا فر یا منصف مزاج کا فر سے محبت دنیاوی تو ہو سکتی ہے، دینی نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَصْحَابُ الْفِتْنَةِ يَحْسَبُهُ
الظَّالِمُونَ مَاءً حَاقًا إِذْ لَجَأُوا بِكَ إِلَى شَيْءٍ وَوَجَدَ
اللَّهُ عِزَّهُ قُوَّةً ۖ حَسَابًا ۖ وَاللَّهُ سَوِيعُ الْحِسَابِ
اسکا حساب برابر کیا درگاہ۔ اللہ تعالیٰ حساب جلدی لینے والا ہے۔

لہذا معلوم ہو گیا کہ ایک شخص میں ایک ہی حیثیت سے محبت و عداوت کا جمع ہونا محال ہے۔ البتہ دو حیثیات سے جائز الوقوع ہے، چنانچہ ملا محمد رفیع واعظ صاحب البواب الجنان نے سادات میں سے دو ائمہ کا قصہ نقل کیا ہے۔

اور یہ اجتماع جب عوام امت میں ممکن ہوا تو خواص امت میں بھی محال نہ رہا۔ کیونکہ مقتضائے بشریت تو ایک ہی ہے عوام و خواص کے درمیان جو فرق ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ خواص سے بشریت کے احکام جاتے رہیں، اور عوام میں موجود رہیں، بلکہ یہ فرق فضائل و مناقب کی قلت و کثرت کے سبب، یا ایمان کی قوت و ضعف کے باعث اور شریعت کے رواج دیے اور احکام الہی قبول کرنے میں آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے ہے چنانچہ درجات ایمان کی لمبی حدیث میں بروایت کلینی جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سب کچھ بیان ہو چکا۔ اور باتفاق رائے خواص امت کے تین طبقے ہیں، (۱) اہل بیت و اولاد پیغمبر، آپ کے اعزہ (۲) ازواج مطہرات (۳) مہاجرین و انصاریں سے چند مخصوص مخلصین درضوان اللہ علیہم اتنا ضرور ہے کہ ہر دو جانب مقابل باہم مناسبت رکھتے ہوں۔ مثلاً امت کے عام افراد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خواص کے ساتھ اس طرح پیش آئیں جیسے وہ آپس میں پیش آتے ہیں۔ اس پر کئی شرعی دلیلیں دی جا سکتی ہیں پہلی دلیل تو یہ مشہور حدیث شریفہ ہے۔

اللَّهُ فِي أَصْحَابِي لَأَتَّخِذُوهُمْ غُرَضًا مِّنْ بَعْدِي
دوسری وہ حدیث جو اہل بیت و انصار کے بارے میں ہے، اَقْبِلُوا هُنَّ مَحْسَبُهُمْ وَتَجَاوَزُوا عَنْ سَبِّهِمْ
(انکی بھلائی بیان کرنے والے کی بات مانو اور اگلی برائی کرنے والوں سے کنارہ کش ہو جاؤ) ایک دلیل۔ وَ
أَمَّا وَلَجُ أَهْلِهَا فَمَنْ (آپ کی ازواج انکی بایں ہیں) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنْ اَمَرْتُكُمْ مِّنَا
يُحِبُّنِي مِنْ بَعْدِي وَلَمْ يُصِبْ عَلَيْنَا إِلَّا الصَّابِرُونَ (میرے بعد تمہارے جو حالات و معاملات ہونگے
مجھے وہ فکر مند کرتے ہیں۔ اور تمہارے معاملہ پر صابر ہی صبر و استقامت پر قائم رہ سکتا ہے) مطلب یہ کہ
میرے بعد تمہاری اطاعت و فرماں برداری اور تمہارے شایان شان حقوق تعظیم ہر کوئی بجالائے برا مشکل
نظر آتا ہے ہاں وہی جو صبر و استقامت کامل رکھتا ہو۔

شرعی دلائل کے علاوہ اس سلسلہ میں عرف عام سے بھی بہت سی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان میں ایک یہ کہ اولاد کیلئے یہ زیبا نہیں کہ وہ والدین کے ساتھ اسی طرح پیش آئے جس طرح آپس میں یا اپنے ہم جنسوں سے پیش آتا ہے۔ مثلاً انکے عیوب کی گرفت یا ان پر لعن و طعن وغیرہ۔ اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہر سلطنت میں خواص سلطنت کی ایک جماعت ہوتی ہے مثلاً شاہزادے، بیگمات، وزراء، عمائد اور امراء، جنہوں نے ابتداء میں اس سلطنت کی نشوونما میں خاص کردار ادا کیا ہو اہوتا ہے۔ اور انتہا میں وہ اسکے بقا کا سبب بنتے ہیں انہی ان تھک جہد و جہد اور محنت کے سبب اس مملکت کا وجود ممکن ہو سکا۔ اب جو لوگ اس مملکت میں رہتے ہوئے فائدہ اٹھاتے ہیں انکے ذمہ ان حضرات کی سابقہ خدمات کا حق ادا کرنا اور انکے ربط قدیم کا اعتراف کرنا لازمی ہے ان قدیم ذمہ داران مملکت کے علاوہ ایک وہ جماعت ہوتی ہے جو قیام ملک کے بعد آئی اور اسکے وسائل سے مستفید ہو رہی ہے۔ تو یہ نئی جماعت جو برتاؤ اپنے ہم چشموں اور معصروں سے کرتے ہیں ولسا ہی برتاؤ باقیان مملکت سے کریں گے تو وہ باعث طعن ہو گئے اور لائق سرزنش ان خواص کا باہم معاملہ جیسا بھی ہو نئی جماعت اگر اپنے معاملات کو ان پر قیاس کر لگی تو وہ تو بین مملکت کا سبب نہیں ہے۔ ایک دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی روئل کسی شریف کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو اس شریف نے کسی دوسرے شریف کے ساتھ کیا ہو تو وہ عقلا کے نزدیک معذور نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اسکو تنبیہ کریں گے سزا دیں گے اور کہیں گے۔ ایذا قدر خود بشناس۔

مقلد (۳) :- یہ کہ مومنین کی آپس میں دشمنی جو کسی دنیاوی بات کے سبب ہو وہ ایمان میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ البتہ قبیح اور قابل مذمت ضرور ہے اور پھر اس میں حفظ مراتب کا خیال نہ رکھا گیا تو بہت ہی زیادہ برکھا اور لائق مذمت ہے۔ اور لحاظ اور حفظ مراتب کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہر تہہ ہوں چاہے خواص میں سے ہوں چاہے عوام میں سے اور عدم حفظ مراتب کی شکل یہ ہے کہ عامی کسی خاص سے الجھ جائے اور اس سے وہ سلوک کرے جو اپنے ہم جنس و ہم طبقہ سے کرتا ہے۔

صدر اول میں خواص تین قسم پر تھے، اصحاب آذواج اہل بیت۔ اسکے بعد کے زمانہ میں بھی تین ہی رہے۔ سادات علماء اور مشائخ طریقت (صوفیاء و اولیاء کرام)

گویا یہاں دو دعوے کئے گئے ہیں کہ باہم دشمنی ایمان میں خلل نہیں ڈالتی اور مذموم و قبیح ہے۔ ان دونوں دعوؤں کے لیے کافی کلینی کی ایک ہی روایت بطور ثبوت کافی ہے۔

علامہ قزوینی و اعظم جناب ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قصہ آزدگی کے ذیل میں صفوان جمال سے بحوالہ کافی جو روایت لا یا ہے اسکے آخر میں کہتا ہے کہ حضرت ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ گفتگو پر ایک ہی رات گزرنے پر جناب عبد اللہ بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کے گھر تشریف لے گئے اور صلح کر لی۔ بحوالہ کافی اسسٹن یہ بھی بیان کیا ہے،

دو شخص باہم یکدگر آزدگی دل میں رکھ کر جدا نہیں ہوتے مگر ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے زاری و لعنت کا سزاوار ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں ہی مستحق ہوتے ہیں، معتدراوی لے کہا میں آپ پر فدا۔

لَا يَفْتَرِقُ مَجْلَدَانِ عَلَى الْغَيْبِ إِلَّا اسْتَوْجِبَ أَحَدُهُمَا الْبَرَاةَ وَاللَّعْنَةَ وَرَبِّمَا اسْتَحَقَّ ذَلِكَ كَلَامَهُمَا قَالَ الرَّوْنِيُّ وَهُوَ مُعْتَدٍ جُعِلَتْ فِدَاكَ هَذَا الظَّالِمُ فَمَا بَالُ الْمُظْلُومِ قَالَ لِأَنَّهُ

لَا يَدْعُوا إِلَى الصُّلْحِ وَلَا يَتَغَامَضُ لَهَا۔ ظالم تو ٹھیک مستحق بے زاری و لعنت ہوا مگر مظلوم وہ کس وجہ سے؟ آپ نے فرمایا وہ اس لیے کہ اس نے چشم پوشی کی اور نہ بھائی کو صلح سی کی دعوت دی۔ اس سے یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ خواص امت میں اس قسم کی آرزوگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں مگر ان کے ایمان پر خلل انداز نہیں ہو سکی ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس قسم کی آرزوگیاں ایمان میں خلل انداز نہ ہونے کے باوجود ہیں فہج اور مذموم جنکا جلد دفعیہ ہو جانا چاہئے۔ اگر رد گئی خواص کا گواہ وہ قصہ ہے جو ہر تقاضائے بشریت باوجود درجہ و مرتبہ مساوی ہونے کے قویٰ پذیر ہوا۔ اور جسکے سلسلہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ ابو نواب سے مفتخر ہوئے یہ واقعہ آپ اور سیدۃ النسا ربی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہما کے ماہین پیش آیا، مگر محمد رفیع واعظ نے اس قصہ کو بیان کر کے تقاضائے بشریت پر محمول کیا ہے،

مقدمہ (۴) یہ کہ مطلق عداوت کا دار و مدار کفر ہے۔ ہر کافر کو دشمن چاہئے کیونکہ احکام قرآنی کی رو سے دینی عداوت کفر ہے اور جب علت و سبب ایک ہو تو حکم بھی ایک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ يَاللَّهُ تَعَالَى كَافُولٌ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَيَتَوَلَّاهُمْ فَاتَّخِذُوا اللَّهَ كَمَا يَتَّخِذُ الْكَاذِبِينَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ یا فرمایا کہ لا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ يَاللَّهُ تَعَالَى كَافُولٌ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَيَتَوَلَّاهُمْ فَاتَّخِذُوا اللَّهَ كَمَا يَتَّخِذُ الْكَاذِبِينَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ یا فرمایا کہ لا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ يَاللَّهُ تَعَالَى كَافُولٌ

معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کے کسی کافر سے، باپ بیٹا، عزیز و دوست ہونے کے دنیاوی تعلقات ہوں تو کفر کے ہوتے ہوئے سب تعلقات قابل ترک اور بے اعتبار ہوں گے، انکو نظر انداز کر کے مدار عداوت پر رکھنا چاہئے اور محبت دینی کا ایمان پر۔ لہذا تمام اہل ایمان سے ہمیشہ ایمان محبت رکھنا واجب ہے خواہ وہ فرماں بردار ہوں یا نافرمان کیونکہ وجوب محبت کا جو سبب ہے وہ دونوں میں موجود و مشترک ہے اور جب علت پائی جائے تو حکم کا وجود واجب ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد در بانی ہے وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ اور یہ طے شدہ بات ہے کہ ایک شی کا محب، اسکے محب و محبوب دونوں ہی کا محب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کا محبوب ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت پر مسلمان کے دل میں باقی دوسروں سے زیادہ ہونی چاہئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (اہل ایمان اللہ کی محبت سب سے زیادہ رکھتے ہیں) اور جب اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو مطلقا دوست رکھتا ہے تو یہ لازم ہوا کہ ہر مومن تمام مومنوں کو دوست رکھے ورنہ پھر وہ خدا کا دوست نہ رہے گا۔ اَللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (اللہ مسلمانوں کا دوست ہے، انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے) نیز فرمایا ذَالِكِ يَاقَوْمِ الَّذِي بَيَّنَّ اللَّهُ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَإِنَّ الْكَافِرِينَ لَأَمْوَالُهُمْ لَكُمْ (اور یہ اس لیے کہ اللہ ایمان لانے والوں کا حامی ہے، اور کافروں کا کوئی دوست نہیں) یا یہ ارشاد إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَكُمْ الْخَيْرَ وَذَٰلِكَ (وہ لوگ جو ایمان لائے اور پسندیدہ کام کئے ان پر عقیب اللہ کی دوستی ظاہر ہو جائیگی) قرآن سے یہ بات بھی یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مومنوں کی دوستی کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ سے زائل نہیں ہوتی۔ اِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنكُمْ أَنْ فُتِنَا بِاللَّهِ وَلِجَمَاعِهِمَا

(جب تمہارے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا، مگر اللہ تو ان دونوں کا دوست ہے) ان دونوں فرقوں سے مراد بالاتفاق بنو سلمہ اور بنو حارثہ ہیں۔ جنہوں نے یوم احد کے موقع پر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بھگائے میں آکر میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ظاہر ہے یہ حرکت گناہ کبیرہ شمار ہوتی ہے خصوصاً ایسے جہاد کے وقت کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس میں بنفس نفیس موجود ہوں اور بھاگ جلنے پر آپ کی ہلاکت کا پورا پورا اگمان اور خطرہ ہو، اور پھر جبکہ وقت ایسا نازک ہو کہ ملت اسلامیہ کی نشوونما پورے طور پر نہیں ہوسکتی اسلام کا پودا ابھی پورے طور پر جڑ بھی نہیں پکڑ سکا ایسے وقت ذرا سی غلطی اور قصور سے نہایت ہی ہولناک اور تباہ کن اثرات بھی ظاہر ہوسکتے تھے ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی دوستی سے دست برداری ظاہر نہیں فرمائی اور دونوں گروہوں کو تو منین ہی کے خطاب سے یاد کیا **وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ** (مومنوں کو بھروسہ اللہ ہی پر رکھنا چاہیے) اتنی محبت تو محض بتقاضائے ایمانی ضروری ہے، اور جب مسلمانوں میں اعمال صالحہ بھی پائے جاتے ہوں مثلاً جہاد، قتال مرتدین تو بظہارت، تقویٰ، اور اچھے اخلاق تو ایسی صورت میں تو وہ خاص اور یقینی طور پر اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونگے فرمایا اللہ تعالیٰ نے **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُورٌ** یا فرمایا **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِيمَانِ** **يُحِبُّ النَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ** یا فرمایا **وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ** یا **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ**۔

مقدمہ (۵) :- یہ کہ مومن و کافر کے ساتھ محبت و عداوت کے مختلف مراتب اور جہاد درجے ہیں مثلاً باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، ماں اور بہن کے ساتھ محبت اور تعلق خاطر میں جو تفاوت اور فرق پایا جاتا ہے اس سے ہر عقلمند واقف ہے اور محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح دنیاوی دشمنوں میں عداوت کے قوی و ضعیف ہونے یا آثار عداوت کی قلت و کثرت میں جو تفاوت اور فرق و اختلاف ہے وہ بھی کوئی یو شیدہ بات نہیں۔ بعینہ اسی طرح وہ محبت دینی جو ایمان کی وجہ سے ہوا اسمیں تفاوت اور اختلاف ہونا بلحاظ ایمانی قوت یا اسمیں زیادتی کے بموجب درجہ ایمان کے علو و بلندی کے اور بمقدار اختلاف و تفاوت مسلمانوں کے محب یا محبوب خدا ہونے میں۔ لہذا جس کا درجہ محبوبیت زیادہ ہو اس سے محبت بھی زیادہ رکھنی چاہئے۔

بالاتفاق محبت کا بلند درجہ وہی ہے جو سید المرسلین رسول رب العالمین حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ سے ہو۔ اس کے بعد ان سارے مسلمانوں سے جسکو آپ کی ذات مبارکہ سے انتہائی نزدیکی اور بڑا قرب حاصل ہے یہ جماعت تین طبقوں پر مشتمل ہے۔

(۱) اولاد و اقارب جو آپ کے جسم اطہر کا جز اور مکرہا سے ہیں، جسکے بارے میں ارشاد فرمایا۔ **(أَحِبُّوا اللَّهَ لِمَا يَخْذُكُمْ مِنْ نَحْمَةٍ - وَأَحِبُّوا لِلَّهِ - وَأَحِبُّوا أَهْلَ بَيْتِي لِحُبِّي)**۔ (اللہ کو محبوب رکھو کہ وہ تم کو نعمتوں سے پالتا ہے اور اللہ کی محبت کی خاطر مجھ سے محبت رکھو۔ اور میری محبت کے حصول کیلئے میرے اہل بیت سے محبت کرو) (۲) ازواج مطہرات جو آپ کے اجزائے بدن کے بمنزلہ ہیں (جو آپ کی ناموس عزت و آبرو میں اور آپ کی جلوت و خلوت کی محبوب ہستیاں ہیں) جنکی شان میں ارشاد باری ہے۔ **وَأَمَّا أَجْمَعُ فَهَآ أَهْلُكُمْ**۔ بنی نوع انسان اس پر متفق ہے کہ بیویاں انتہائی خلط ملطہ اور الفت و محبت کے سبب (اعزاز و اکرام اور تعلق

خاطر میں) شوہر (شخص) کا حکم رکھتی ہیں (وہ درحقیقت یک جان دو قلب کا درجہ رکھتی ہیں) اسی لیے شریعت میں عمریت (عمر ہونے) و میراث کے معاملہ میں سسرالی تعلق کو معتبر مانتا ہے اور احسان جتنا تے وقت نسب و صہر دونوں کو شانہ بشانہ رکھ کر ایک لڑی میں پرو دیا ہے،

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۱۔ وہ وہ ذات ہے جسے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسکو نسب اور سسرال میں تقسیم کیا۔

(۳) رفقاء سفر، اصحاب کرام، جو زندگی کے سفر میں آپ کے ہم قدم و ہم عنان و ہم آواز رہے، آپ کی نفرت و اعلت میں ہمیشہ بڑھ بڑھ کر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے صمیم معنوں میں آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہایا، جان و مال و عزت و اکبر و سب کچھ آپ کے لیے خطرہ میں ڈالا۔ گھر بار کو خیر باد کہا، سارے دنیاوی رشتہ و پیوند توڑ ڈالے اور آپ کی خوشنودی کی خاطر ماں، باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، بہن، اور سارے اقارب سے ناطہ توڑ لیا۔ ان کی یہی قربانیاں اور جذبات ایثار و محبت اللہ تعالیٰ کی نظریں معتبر اور قبیح ٹھہریں اور ان کے اس عمل کی قدر دانی فرمائی اور ان کے حق میں خاص عنایت کا یوں اظہار فرمایا۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاقْتُلُوا لَهُمْ بَنَاتِهِمْ فَضَلَّ اللَّهُ وَرِضْوَانًا وَيُصْرَفُونَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَوْلَىٰ بِكُلِّ صَادِقُوتٍ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ یہ بات سارا عالم جانتا ہے کہ اس قسم کی سچائی اور خلوص، نزدیکی اور قرب میں نسب سے بھی اعلیٰ ہے جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

الْقَوْمُ إِخْوَانُ صَدَقَ بَيْنَهُمْ سَبَبٌ وَمِنَ الْمَوَدَّةِ لَعَمْرُ لِيُعْدِلَ بَيْنَهُمْ سَبَبٌ

(یہ لوگ باہم برادران صداقت ہیں۔ ان کے درمیان دوستی کا وہ رشتہ ہے جس کی برابری نسب بھی نہیں کر سکتا) لہذا ان تینوں طبقوں میں عام مسلمانوں کی نسبت اور بلحاظ جملہ مسلمانوں کے محبت کے اسباب دو وجوہ سے قوی اور زیادہ بھرپور اور بکثرت ہیں۔

اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا انتہائی قرب و اتصال جسکی وجہ سے تمام بنی آدم سے محبوبیت میں ممتاز و منفرد ہیں دوم۔ دین شریعت کا ان کے ذریعہ رواج پانا اور دور و نزدیک اسکی اشاعت اور پھیلاؤ اور تقویٰ اور جہاد میں انکا بلند ترین درجہ۔ ہاں اس جماعت میں سے کوئی اگر گناہ کا مرتکب ہو۔ یا ایمان سے خالی ہو اور اس کے سلب اسکی سابقہ اعمال سوخت ہو گئے ہوں تو نص قرآنی کے مطابق انکے ساتھ عداوت و دشمنی واجب ہے۔ رسول محتسم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت کا اعزاز اس برائی کی وجہ سے ساقط ہو جائیگا۔ اور یہ گروہ بالا کے حکم سے مستثنیٰ نہ ہو جائے گا۔ مثلاً الولہب وغیرہ۔ اب ان اشخاص کے ایمان و عدم ایمان اور اعمال و طاعات کے سوخت ہونے کے متعلق چھان بین اور تحقیق و تفتیش کرنی چاہیے۔

خواجہ نصیر طوسی ایمان و کفر کی بحث اور ضبط اعمال کے ذیل میں تجرید العقائد میں کہتا ہے۔ الْإِيمَانُ التَّصَدُّيقُ بِالْقَلْبِ وَاللِّسَانِ (ایمان زبان و قلب کی تصدیق کا نام ہے) بِكُلِّ مَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِلْمُهُ مَنْ دِينِهِ ضَرْبَةٌ وَلَا يَكْفِي الْإِيمَانُ (ہر اس چیز کے ساتھ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ اور ضروریات

دین کا جانتا۔ اور پہلے کا جانا سوا کا فی نہیں) بسبب فرمان الہی (وَاسْتَيْقَنْتَهَا أَنْفُسُكُمْ) یقین سے جان لیں ان کے نفوس) وَلَا الثَّانِي (تصدیق کے بغیر اقرار بھی کا فی نہیں) بسبب قول خداوندی۔ قُلْ لَكُمْ تَوَصُّوْا (آپ کہتے کہ تم ایمان ہی نہیں لاتے)۔

خواجہ مذکور یہ بھی کہتا ہے۔ وَالْكَفَرُ هَذِهِ الْإِيمَانُ۔ (اور کفر ایمان نہ ہونے کا نام ہے) اس قول میں اسکا اشارہ اس طرف ہے کہ ایمان و کفر میں کوئی واسطہ نہیں جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ اِقَامَعَ الصِّدْقُ اِبْدُونَهُ (صدقہ کے ساتھ یا بغیر ضد) مخالف کے) وہ یہ بھی کہتا ہے۔ وَالْفُسُوقُ الْخُرُوجُ عَنْ طَاعَةِ اللَّهِ مَعَ الْإِيمَانِ (فسق اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانا ہے۔ سلامتی ایمان کے باوجود) یعنی وہ فسق جو ارتکاب معصیت کہلاتا ہے یہ ایمان سے منافات نہیں رکھتا۔ اور مومن فاسق ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے۔ وَالنِّفَاقُ أَظْهَارُ الْإِيمَانِ مَعَ اخْفَاءِ الْكُفْرِ۔ وَالْفَاسِقُ مُؤْمِنٌ مُطْلَقًا۔ (کفر چھپا کر ایمان کا اظہار نفاق ہے۔ اور فاسق مطلقاً مومن ہے) یعنی احکام دنیا و آخرت میں مثلاً تمیز و تکلیفیں، دعائے معفرت، صدقات، شہریم لعن و تبرائے بحیثیت ایمان اس کی محبت واجب ہونے میں، یاد دخول جنت میں گو بعد از عذاب ہی ہو۔ اسکے لیے پیغمبر کی شفاعت ہونے میں، اور اس امکان میں کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِذْخَرْتُ شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكِبَارِ وَلَوْحُودٍ وَجِدَةٍ وَ
الْكَافِرُ مُخَلَّدٌ فِي النَّارِ وَعَذَابٌ صَاحِبِ الْكِبَرِ
مُنْقَطِعٌ إِلَّا سَحَابًا قِيَامًا بِإِيمَانِهِ فَمَنْ يَغْلُ
مُثْقَالُ ذَرَّةٍ خَيْرٌ لَّيَوْمَ وَلَقَبُوهُ عِنْدَ الْعُقَلَاءِ وَ
السَّعِيَّاتِ مَنَاقِلَةً وَذَوَاتُ الْعُقَابِ مُحْتَضِرَاتُ الْكَافِرِ
وَالْعَفْوُ وَاقِعٌ لَا تَسْمَحُهُ تَعَالَى فَيَجَازُ وَفَوْقَهُ
ہیں۔ عذاب کی بیہشکی کا فوکے ساتھ مخصوص۔ گناہ کی معافی ضرور ہوگی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے، جو وقوع میں آئے گا۔

لہذا خواجہ نصیر کے پورے کلام سے پتہ چلا کہ فاسق پر لعنت بھیجتا اور اس سے بے زاری ظاہر کرنا، جائز نہیں بلکہ اسکی شان دوسرے مومنوں کی طرح ہے کہ اس کی مغفرت کی دعا بھی کی جاتی چاہئے اس کیلئے بھی ایہ مال ثواب ہونا اور صدق و خیرات کی جانی چاہئے تاکہ عذاب سے چھٹکارا پاوے اسکی نجات اور اس کے لیے پیغمبر کی شفاعت کی امید رکھنی چاہئے۔ اور جب تک اس میں ایمان موجود ہے اس سے محبت رکھنا واجب ہے اور اس سے عدوت دینی نقطہ نظر سے حرام ہے۔ کیونکہ تبر اور کالی اس وقت تو خیر ٹھیک ہو سکتی ہے کہ اس میں محبت کی کوئی وجہ موجود نہ ہو اور اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اسکی موت کفر ہو۔ اس لیے کہ کفر کے ہوتے پھر کسی عمل خیر کا کوئی اعتبار نہیں۔ فسق و گناہ کے سبب اس سے اظہار بیزاری جائز نہیں ہاں اسکے فعل فسق و عصیان سے بیزاری ضرور ظاہر کرنی اور اسے برا سمجھنا چاہئے۔

خواجہ نصیر نے تجربہ دید میں یہ بھی کہا ہے۔ وَالْإِحْبَابُ بَاطِلٌ لِإِسْتِلْزَامِهِ الظُّلْمَ لِقَوْلِهِ تَعَالَى

فَمَنْ يُفْعَلْ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (اعمال کی سوخت غلط بات ہے اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول "جو ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اس کا اجر پائے گا" کی روشنی میں ظلم کو لازم کرتا ہے) لہذا جب تک اس سے کفر سرزد نہ ہو اس کا کوئی عمل سوخت نہ ہو گا۔

مقدمہ (۶) بالاتفاق صحابہ کرام، ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم سے وہ چیز صادر نہیں ہوئی جو ان کے کفر کا سبب ہو کر ان کے اعمال حیطہ کرنے کا باعث بنتی۔ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ربط کو گھٹاتی یا کم کرتی یا اعتبار کھوتی سوائے اس کے فدک جیسے معاملات میں خلافت و غضب حقوق اہل بیت کے سلسلہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مخالفت رد نہا ہوئی اور نوبت محاربہ تک پہنچی۔ اب ذرا یہاں یہ غور کر لیا جائے کہ علماء شیعہ کے نزدیک یہ مخالفت، محاربہ، غضب کفر ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں خواجہ نصیر طوسی کا قول مشہور ہے کہ: مخالفوہ فسقہ و محاربوہ کفریہ (انکے مخالف فاسق ان سے لڑنے والے کافر ہیں) لہذا صحابہ میں سے جنہوں نے صرف مخالفت کی وہ تو تبرک کے لائق نہیں کیونکہ ان کے عمل کو کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ فسق کہہ سکتے ہو۔ اور فاسق مومن ہے۔ تو گویا شیخین اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم پر خود اصول شیعہ کے مطابق تبراجائز نہیں اور اتنی بات کا ان کے محقق علمائے بھی اعتراف کیا ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المؤمنین میں تحریر کیا ہے کہ شیعوں کے بارے میں اہل سنت کا یہ کہنا کہ وہ شیخین (رضی اللہ عنہما) کو کافر ٹھہرتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ کتب اصول شیعہ میں نہ اسکی کوئی بنیاد ہے نہ اصلیت ان کا مذہب صرف امیر مدبر ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مخالف فاسق ہیں اور ان سے لڑنے والے کافر جیسا کہ نصیر الدین طوسی نے تجرید میں لکھا ہے اور بمقتضائے حدیث حریث حربی و سلمہ سلمی (تیری لڑائی میری لڑائی اور تیری صلح میری صلح ہے) یہی ثابت ہوتا ہے اور ظاہر بھی ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تو نہیں بلکہ جنگ و قتال کئے اور تلوار و بھالے کی زحمت برداشت کئے بغیر اپنے لاؤ لشکر اور پیروؤں کی زیادتی کے سبب انکے حق کو سلب کیا اور رسول کی خلافت کے حق کو غضب کیا، (شوستری کا بیان خواہاں) ملا عبد اللہ مشہدی، مصنف کتاب اظہار الحق۔ اس اصل پر۔ بحث کرتے ہوئے اس کا جواب لکھتا ہے۔ بحث یہ کہ اگر کوئی کہے کہ خلافت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اگر نص صریح نہیں ہے تو امامیہ جھوٹے ہیں، اور اگر ہے تو جن صحابہ نے مسئلہ خلافت میں مخالفت کی ان کا مرتد ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس بحث کو بوجہ لکھ کر لکھتا ہے کہ جس نص کا انکا موجب کفر ہے وہ یہ ہے کہ نص شدہ کو باطل خیال کریں اور اس نص میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاذ اللہ تکذیب کریں۔ لیکن حق تو ان کا مانتے ہیں مگر اغراض دنیاوی، مصالح سیاسی، یا مال و جاہ کے سبب اسے نظر انداز کر دیں تو یہ فسق و عصیان ہو گا کفر نہیں ہو گا مثلاً زکوٰۃ باجماع امت واجب ہے اور قرآن و حدیث سے منصوص ہے لہذا جو اس کا انکار کرے گا مرتد ہو جائے گا۔ اور جو وجوب کا تو معتقد ہو مگر پیسے کی محبت یا بخل کے سبب ادائیگی سے موگردانی کرتا ہے تو وہ اپنے اوپر گناہ کا بوجھ لگاتا ہے۔ اور یوں گناہ کا یہ ہوتا ہے۔ جن حضرات نے خلیفہ اول کی خلافت پر اتفاق کیا وہ یہ نہیں کہتے تھے۔ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نص، مگر صیح نہیں کہا۔ بلکہ بعض اوقات بعض لوگ تو یہ کہتے کہ اس سلسلہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص مذکور نہیں اور بعض دوسرے کلام

پیغمبر علیہ السلام میں رکبیک تاویلات کرتے، (اس کی بات ختم ہوئی)

ان کے اس کلام سے چند مفید نتائج حاصل ہوئے۔ اول تو یہ کہ نص کے معنی سے انکار یا اس کے مدلول میں فاسد تاویل سے کفر لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ ایک قسم کا فسق اعتقادی ہے جسے اہل سنت کے ہاں خطائے اجتہادی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسرے فکد کا غصب، یا قرطاس نہ دینا، یا اسکے علاوہ امور جو بعض حضرات سے صادر ہوئے اور اسکا سبب حدیث غن معاشی الانبیاء لا نوث ولا نورث، یا آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ سے استدلال ہو تو یہ بھی کفر نہیں بلکہ فسق اعتقادی ہی کی ایک شکل ہے۔ جسے ہم خطائے اجتہادی کہتے ہیں۔ اسیلئے کہ جب امامت کے مسئلہ کی نص میں باطل تاویل کفر کا سبب نہ بن سکی تو مسئلہ میراث یا کچھ لکھ دینے میں جو مسئلہ امامت سے بالاتفاق ہزاروں درجہ کم ہیں آیت و حدیث سے تمسک کرنا کیوں کفر کا سبب ہو گا۔ اس کی تصریح خود انہوں نے بھی اپنے ہاں کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مسئلہ خلافت میں اختلاف جب تاویل کی بنا پر ہو تو وہ اعتقادی فسق ہے۔ اس سے ہی یہ لازم آیا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل کا اعتقاد اچھے ہاں حقیقت ایمان میں داخل نہیں بخلاف نماز روزہ و زکوٰۃ کی فرضیت کے اعتقاد کے۔ اس فرق کو جو کہ پورے فرقہ کا اجماعی ہے قیمتی ثبوت اور دستاویز کے طرح ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ یہ تو خود اپنے ہاتھ پاؤں کاٹنے والی بات ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ اسی لیے یہ سب خواجہ نصیر طوسی کا قول بطور گواہی بڑے زور کے ساتھ پیش کرتے ہیں گویا میدان مار لیا ہو۔ جب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرنے والوں کا ایمان خود انہیں کے محققین کے اقرار و اعتراف سے ثابت ہو گیا تو اب ان کے ظاہری اعمال و اخلاق کی بحث لانی چاہئے جو ان کے حسن سیرت پر دلالت کرتی ہے۔ آیت يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ کے ذیل میں ملا عبداللہ مشہدی فرماتے ہیں کہ صرف شہادتین کا اقرار اور اجمالی تصدیق ہر اس چیز کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ اسلام کا ایک مرتبہ ہے اور جناب رسالتناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پوری امت احابت یہ مرتبہ رکھتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نگرانی کے وعدہ کے سبب اس مرتبہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔ عقیدہ اسلامی کا اسی قدر حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لیے کافی تھا۔ مثلاً مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دینا۔ مرتدین و منکرین زکوٰۃ سے قتال، یا مدعیان نبوت سے جنگ۔ یا فارس و روم کے کافروں سے جہاد۔ اور جنہوں نے خلافت و ریاست کے حصول کا قصد کیا، انہوں نے ان امور میں انتہائی جدوجہد اور کدوکاوش اختیار کی کہ لوگوں کی نظر میں استحقاق امیر خلافت پر دھبہ نہ آجائے اور ان میں سے بہت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پاتے کے سبب اور قرب زمانہ کے باعث ان میں صحبت کی برکتیں موجود ہونے کی وجہ سے یہ حضرات صاحب زہد و ورع و تقویٰ بھی تھے جو مالیات و عورات ظاہریہ سے بھی محترز رہے۔ بلکہ بعض مباح اور جائز لذتوں کو بھی ترک کر دیا۔ ان سے جو کچھ غفلت و سستی عمل میں آئی وہ امر خلافت اور حقوق اہل بیت میں تھی۔ (انتہی کلام)

اس تحریر سے معلوم ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت شریف کی برکت سے اور اس برکت شریف کے ان کے جان و دل میں گھر کر لینے سے یہ نفوس مقدسہ اصل ایمان کے علاوہ ورع و زہد و تقویٰ سے بھی آراستہ تھے۔ نیز

یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق صحبت خلوص قلب کے ساتھ تھا۔ اتفاق و ظاہر داری کی توان حضرات کو ہوا بھی نہیں لگی تھی یہ نہ ہوتا تو صحبت مبارک سے اکتساب فیض اور حصول برکت کیسے کر سکتے تھے۔

اب یہاں عقلا کے لیے قابل غور بات یہ ہے کہ جب خود انہی کے (بلا جبر و اکراہ برضار و رغبت خود) اقرار و اعتراف سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایمان، ورع، تقویٰ، اور زہد ان میں بالیقین موجود تھا تو اسکے بعد یہ دعویٰ کرنا کہ امر خلافت اور اہل بیت کے حق میں ان سے گناہ صادر ہوا ایک یقینی الثبوت چیز کے خلاف دعویٰ کرنا ہے۔

معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کا یہ عمل کسی دلیل سے تمسک یا کسی نص کے فہم کے سبب ہی وقوع میں آیا ہو گا کیونکہ جب صحبت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اتنا اثر کر لیا کہ وہ اقرار زہد اور ورع کے ایسے روشن پیکر بن گئے کہ اپنے پرانے سب اٹکی ان خوبیوں کو سراہنے لگے۔ تو ایسی صورت کے بعد ان کے متعلق یہ تصور کر لینا کہ انہوں نے یہ حرکت دنیاوی لالچ یا ثب مال و جاہ کی خاطر دیدہ و دانستہ کی۔ ایسی متضادات بات ہے جو کوئی بھی عقلمند نہیں کہہ سکتا۔ اگر ایسا ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت پر تو عرف آئے گا مگر ان کے زہد و تقویٰ و ورع، اور محرمات سے بچنے کی صفت کہاں بچیں گی جس کا انہوں نے خود ہی اعتراف کیا اور انہوں نے اپنی تحریر میں جو یہ جملہ ٹانک دیا ہے کہ "وہ یہ کہ وہ کاوش اس لیے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظروں سے گر کر امر خلافت کی اہلیت نہ کھودیں۔" تو یہ انکی شکل اور بے سرو پا ہوائی ہے بلکہ پھرتے اور دھرتے دل کو تھا منہ کی کوشش ناکام ہے۔ یا پھر دل کی باتیں جاننے کا دعویٰ ہے ہمیں اتنے تکلفات میں پڑنے کی تکلیف ہی نہیں دی گئی۔ ظاہری حال کے مطابق تکلیف دی گئی ہے۔ کسی کو بظاہر اچھا دیکھیں، اچھا سمجھیں، اچھا کہیں۔ اور پھر یہاں تو اس ظاہر کے ساتھ ساتھ اسکا اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ انکے حالات کی حسن و خوبی صحبت شریف کی برکت سے تھی تو لا محالہ اس صحبت نے ان کے باطن پر بھی تو اثر کیا ہو گا۔

بہر حال یہ بات طے ہے کہ علماء شیعہ کے اعتراف سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جماعت کے خصالِ نقص و فضائل کر سکیں نہیں ہو گئے۔ اور ثابت ہو گیا کہ وہ با ایمان تھے زاہد و متقی، اور ورع و دلالتھے۔ محرمات سے اجتناب کرتے تھے۔ بلکہ بعض مباحات سے بھی بچتے تھے۔ اسلام کو رائج کرنے میں شکرین کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کے غار فارس و روم کے ساتھ جہاد کرنے میں انہوں نے کوشش کی۔

اب ہم اس بحث کا آغاز کریں گے کہ ان حضرات عالی وقار اور والاتبار کا درجہ اور مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنا بلند اور عالی تھا۔ اور انکے اعمال صالحہ کو دربار خداوندی میں کیسی پذیرائی ملی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے بڑھ کر کوئی مرتبہ عالی اور بلند نہیں ہو سکتا۔ جسکو اللہ تعالیٰ پسند فرمائے وہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو تمام اہل ایمان میں مقبول ہو گا۔ فرمایا۔ **وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَئِكَ الْمُقَدَّمُونَ إِلَىٰ آلِ الْبَيْتِ بِرِضَا اللَّهِ الْأُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ**۔ **وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ**۔ ملا عبد اللہ مشہدی صاحب کتاب اظہار الحق نے کہا ہے کہ اس آیت سے صحابہ کی فضیلت پر اہل سنت کا استدلال ہر صورت میں صحیح ہے۔ اسکے جواب میں امامیہ کی مشہور باتیں اپنی روش کے مطابق نہ جاندار ہیں نہ کوئی قوت رکھتی ہیں۔ البتہ مشہور باتوں کے خلاف جواب دے سکتے ہیں۔

فسیق مخالف کے طریق استدلال کی جو صورت ہے وہ تفسیر نیشاپوری میں یوں ہے۔

قَالَ أَهْلُ السَّنَةِ لَا شَكَّ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ سَبَقَ إِلَى
الْهِجْرَةِ فَهُوَ مِنَ السَّابِقِينَ وَقَدْ أَخْبَرَ اللَّهُ تَعَالَى
بِأَنَّكَ رَضِي عَنْهُ وَلَا شَكَّ أَنَّ الرَضَى مُعَلَّلٌ
بِالسَّابِقِ إِلَى الْهِجْرَةِ فَبَيِّنْ وَمُرِيدُ وَامِهُ فَدَلَّ ذَلِكَ
عَلَى صِحَّةِ إِمَامَتِهِ وَحَدِّمْ حَوَائِرَ الطَّغْيَانِ فِيهِ -

گی۔ معلوم ہوا ان کی امامت صحیح ہے اور ان پر طعن ہرگز جائز نہیں۔

اس کلام کے بعد علامہ مشہدی کہتا ہے کہ اس بات کا یہ جواب دینا کہ ہجرت و نصرت کی سبقت میں ایمان شرط ہے اور وہ شخص معاذ اللہ کبھی ایمان نہ تھا ہی نہیں حتیٰ کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ناخوشی ظاہر ہونے سے پہلے بھی انصاف سے بہت دور تھا۔ اور یہ کہنا بھی بلا مقصد ایک تکلف ہی ہے کہ سابقین ہجرت و نصرت سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلافت بلا فصل کی تصدیق کی ہو اور امر خلافت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی وصیت پر عمل کیا ہو کیونکہ آیت کے کسی لفظ سے اس قید کا پتہ نہیں چلتا۔ (نتیجہ ملاحضہ)

ملاحضہ کے اس کلام سے یہ بات صاف سمجھ جاسکتی ہے کہ جب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی امامت سے انکار بھی آیت کے عموم میں تخصیص نہ پیدا کر سکا تو دوسری کوتاہیاں مثلاً مذکورہ جو وقوع میں آئیں۔ کہاں تخصیص پیدا کر سکیں گی۔ کیونکہ آیت میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو اس قید کی طرف اشارہ کرے۔

پھر عبد اللہ مشہدی کہتا ہے بہتر ہے یوں جواب دیا جائے کہ یہ آیت صرف اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مہاجرین و انصار کے سابقین سے اور اس ہجرت و نصرت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی سبقت سے راضی ہوا۔ اور جب وہ انکے کسی فعل سے راضی ہوا تو لا محالہ اسکی جزا جنت میں ہمیشہ رہنے سے ہوگی۔ اور ظاہر ہے دخول جنت رضائے الہی پر موقوف ہے اور وہ موقوف اس رضائے الہی کے آخر تک باقی رہنے پر حسن خاتمہ کے ساتھ اور ایمان کی بقا کے ساتھ اور اس شرط کے ساتھ کہ اس سے ایسے اعمال صادر نہ ہوں جو اچھے اعمال کو سوخت کر دیں، انتہی کلام یہ تو انکے ہاں کے چوٹی کے دانشمندان کی لیاقت علمی اور حافظہ کا حال ہے کہ وہ اپنے ہی کلام کے ہر پہلو کا بھی لحاظ نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ اپنے اصول و عقائد ہی انہیں یاد رہتے ہیں۔

اول تو بروئے قواعد و اصول یہ آیت اس مضمون پر صحیح طور سے دلالت نہیں کرتی جسکی اس نے تقریر کی ہے کیونکہ آیت کا مقصد رضا مندی ظاہر کرنا ہے۔ مہاجرین و انصار کی ذاتوں سے اور جب انکی ذاتوں کو ہجرت و نصرت کے خاص وصف سے یاد کیا ہے تو یہ لازم آیا کہ یہ وصف تعلق رضا کا سبب ہو نہ یہ کہ رضا کا تعلق اسی سے ہو اور متعلق رضا ہونے اور تعلق رضا کا سبب ہونے میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

یہ کتب کے بچے بھی اس فرق کو جانتے ہیں کہ اگر کلام اللہ میں اسی طرح دھاندلی چلنے لگے تو کسی بھی مقصد میں استدلال کی صورت قائم نہیں ہو سکتی مثلاً آیت مولات صرف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ تمہاری ولایت اس وصف کے ساتھ متعلق ہے

یعنی نماز قائم کرنے اور بحالت رکوع زکوٰۃ دینے سے اور یہ وصف مشروط ہے اچھے خاتمہ اور فلاں فلاں باتوں سے اسی طرح کی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب اس عمل کی جزا بالیقین جنت کی دائمی رہائش ہوئی تو اس جزاے روکنے والی دوسری چیزیں ہو سکتی ہیں یا کفر و ارتداد، یا وہ بد اعمالیاں جو اچھے اعمال کو سوخت کر دیں۔ اول صورت میں مخالفہ فتنہ کا قاعدہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ ملا عبد اللہ مشہدی نے مذکورہ الصدر جواب و سوال کے ذیل میں اعتراف کیا ہے کہ کسی تاویل یا طل کی بنا پر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت سے یا نص سے انکار موجب کفر نہیں۔

اور قاضی نور اللہ شوشتری مجالس المؤمنین میں یہ لکھ چکا ہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما مرتد نہیں اور یہ سب کچھ بیان ہو چکا ہے۔ دوسری صورت میں خود اپنے عقائد کے خلاف کرنا ہے۔ نصیر الدین طوسی تجرید العقائد میں کہہ ہی چکا ہے کہ حبط اعمال ایک قسم کا ظلم ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ملاجی کو اپنا یہ عقیدہ ایسا فراموش ہوا اور سخن پروردی میں وہ اتنے غرق ہو گئے کہ خفا کے اعمال حبط کرنے والے گناہوں کی گنتی اور تعیین کرنے لگے۔ کہ چار اعمال کو حبط اعمال کا سبب بھی بیان کر ڈالا۔ اول یہ کہ وہ غزوہ احد میں جنگ سے بھاگے دوم خلافت مرتضیٰ کو غضب کیا۔ سوم فذک بھی دبا لیا چہارم جناب فاروقؓ نے قرطاس و قلم میں رکاوٹ ڈالی، حالانکہ اپنے کلام مذکورہ الصدر میں خود اعتراف کر چکا ہے کہ امامت مرتضیٰ سے انکار بھی آیت میں تخصیص پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اسکو رضا اور شونودی سے کوئی منافات نہیں جب وہ رضامندی کے منافی ہی نہیں تو اعمال کس طرح سوخت کرے گا۔ اگرچہ تمام شیعوں کے نزدیک بدلیل آیت کثر ان اشکیکت لیخبطن عملاک اعمال کا سوخت ہونا کفر و شرک کا خاصہ ہے۔ اور اصد کے دن بھاگنا اول تو از روئے قرآن معاف ہو چکا ہے دوسرے وہ اس آیت کے نازل ہونے سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ کس طرح اعمال کے حبط و سوخت کا سبب بنے گا۔ کہ اول تو عفو الہی کے باعث گویا نسیا نسیا ہوا۔ پھر اس آیت کے نزول کے بعد اگر وہ عمل حبط ہو چکا تھا تو حبط شدہ اعمال کے ساتھ رضائے الہی کا وابستہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

اس پر انتقال ہے کہ سورہ توبہ آخر ما نزل ہے۔ اور جنگ احد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی اور خلافت مرتضیٰ کو غضب کر لینا باعتراف فضلہ شیعہ کفر نہیں تو اس سے اب حبط اعمال کی صورت کب متصور ہو سکتی ہے۔ اور فذک کا تو غضب واقع ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فذک لی فی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے لیکر اپنے قبضہ میں نہیں لیا بلکہ میراث یا ہبہ ناتما کی روک تھام کی ہے۔ اسے غضب کوئی فائر العقل ہی کہہ سکتا ہے۔ اور پھر اسکے باوجود یہ روکنا بھی ایک حدیث مشہور کے سبب سے تھا اس لیے وہ گناہ بھی نہ تھا کفر تو دور کی بات ہے اور اعمال سوخت ہو جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ رہا قرطاس و قلم کا معاملہ تو شیخین رضی اللہ عنہما نے اس سے بالکل نہیں روکا ایتونی بقراطاس کے مخاطب صرف شیخین رضی اللہ عنہما تو نہ تھے۔ تمام سنی ہاشم اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم شریک ہیں جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے تو مشورہ دیا تھا اور مشورہ حبط اعمال کا سبب کس اصول قاعدے سے ہو گا۔

حاصل کلام یہ کہ یہاں ملاجی کسی بے دست و پائی دیکھنے کے لائق ہے بے چارہ چاروں طرف ٹانگ ٹوئیاں مار رہا ہے۔ مگر مقصد کا کوئی پتہ ہاتھ نہیں لگ پا رہا۔

اسی طرح دوسری آیات اَجْعَلْنٰهُ سِقَايَةَ الْحَاجِّ الْاِلٰہِ اور فَجَاهِدْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَوِیْنَ جُنْدَ اللّٰہِ الْاِلٰہِ اور اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِہِمْ وَاَنْفُسِہِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنَّ السُّورَۃَ۔ ان آیات مذکورہ بالا میں ملا محمد عبد اللہ مشہدی اور ان کے ساتھ دوسرے شیعہ علماء نے بہت ہاتھ پاؤں مارے بہت کوشش کی کہ ادھر ادھر سے کوئی مفید مطلب بات پلے پڑ جائے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ بالآخر ہارتھک کرا پنا سامنے لے کر رہ گئے۔ اور چار و پنجاران حضرات کے مراتب عالیہ کے قائل ہو گئے۔ یہ بے ان شیعہوں کے نزدیک ان مہاجرین و انصار کا حال جو ان کے خیال میں جناب امیر رضی اللہ عنہ و اہل بیت رضوان اللہ علیہم کے مخالف تھے جن میں خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم بھی شامل تھے۔

اب رہا معاملہ ان مہاجرین اولین کا جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محاربر کیا۔ مثلاً ام المؤمنین، جناب طلحہ و زبیر، رضی اللہ عنہم تو ان کے معاملہ میں شیعہ حضرات بڑے چہ کنہ اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ ان کے لگے لیڈر تو مخالف اور محارب میں کوئی فرق نہیں کرتے وہ تو سب کو کافر کہتے اور سب پر سب و شتم کرتے اور تبرّا بھیجتے ہیں، مگر ان کے پچھلے سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے امامت کو نبوت کا درجہ دیکر اسکے منکر کو کافر شمار کیا تو اصول مذہب میں بڑی گڑبڑ ہو جائیگی۔ ایک غلط اور گڑبڑ تو یہ ہے کہ حضرات ائمہ بلا کسی تکلف اور بغیر کسی مجبوری کے ان حضرات سے رشتہ مناکحت قائم کرتے اور اپنی لڑکیاں ان کو دیتے بھی ہیں اور ان سے لیتے بھی ہیں۔ چنانچہ جناب مسکینہ رحمۃ اللہ علیہا کا جناب مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ اور جناب قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی لڑکی سے جناب امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح کیا۔ اور اسی طرح کا عمل تمام حضرات ائمہ کے درمیان قائم، دائم جاری رہا۔ غرض ان حضرات کا معاملہ منکرین امامت کے ساتھ ہرگز ایسا نہ تھا جیسا کہ انکا معاملہ منکرین نبوت کے ساتھ۔ اور امام کی امامت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت کی طرح ہے۔

دوسری گڑبڑ یہ کہ خود ان کے اپنے عزیز و اقارب ائمہ کی امامت کے منکر ہوئے مثلاً محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت سے منکر تھے۔ اور ان سے اختلاف رکھتے اور جھگڑا کرتے تھے۔ اور حجاز و مدینہ فیصلہ طلب کرنے کے بعد بھی اور اسکی شہادت کے باوجود جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں تھے اپنی امامت کے دعوے دست بردار نہ ہوئے۔ اور دنیا سے کوچ کے وقت اپنی اولاد کے حق میں امامت کی وصیت کر کے رخصت ہوئے۔ اور نذر و نیاز اور خمس وغیرہ جو کچھ مختار تقی ان کو بھیجتا اس میں جناب زین العابدین کو بالکل شریک کرتے۔ یا مثلاً زید بن ابیہر رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ اپنی ہی امامت کے معنی تھے۔ اور امام محمد باقرؑ کی امامت کے منکر۔ انہوں نے اس بارے میں ہشام بن الحکم سے مناظرہ بھی کیا، مگر اس دعویٰ سے دست بردار نہ ہوئے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کی اولاد یحییٰ و متوکل جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے برسر پر خاش رہے۔ پھر اسی طرح جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد آپس میں لڑتی رہی۔ مثلاً عبد اللہ اقطع اور اسحق بن جعفر اپنی اپنی امامت کا دعویٰ کرتے رہے۔ اور اگر امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو لیں تو ان میں سے بھی ایسے افراد مثلاً نفس زکیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ تھے جو اپنی امامت کے معنی ہوئے۔ اور دوسرے ائمہ کی امامت کے منکر۔ اور معاملہ تو تو میں میں سے گذر کر جنگ و قتال تک پہنچتا تھا۔ اور لڑائی کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ بلکہ ان کے پیروؤں نے تو آپس

میں کشت و خون کیا ہے اور یہ ساری تفصیلات کتب تاریخ و الساب کے اوراق میں مذکور ہے۔
 لہذا اگر انکار امامت انکار نبوت کی طرح کفر ہو تو یہ سب کے سب حضرات کا فرمایا ہے۔ اور دوسری طرف وہ
 حضرات ائمہ جنہوں جناب زید شہید اور محمد بن الحنفیہ رحمہما اللہ یا ان جیسے حضرات کے بارے میں خوبی و فلاح کی
 شہادت دی ہے وہ جھوٹے قرار پاتے ہیں۔

اور اگر یہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد امام وقت کے انکار کے بعد بھی کافر نہیں ہوتی مگر دوسرے ہو جاتے
 ہیں تو موجبات کفر میں تفاوت و اختلاف اور تمیز لازم آتا ہے۔ حالانکہ موجبات کفر میں بالاتفاق کوئی تفاوت نہیں
 خواہ امام زادہ ہو یا علوی، ادھر زبان سے کلمہ کفر نکلا ادھر کافر ہوا۔ بالآخر مجبور و لاچار ہو کر یہ کہنا پڑا کہ منکر امامت کافر
 نہیں ہوتا۔ پھر مخالف و محارب میں فرق نکال بیٹھے کہ منکر مخالف ہے اور مخالف فاسق اور محارب کافر لیکن یہاں
 ایک اور خرابی لازم آگئی۔ کیونکہ انکار امامت کفر نہیں اور محارب انکار کو لازم ہے جبکہ امام اپنا تصرف چاہتا ہے تو گویا
 کفر غیر کفر کو لازم ہو گا حالانکہ یہ محال ہے جو حکم لازم کا ہے وہی ملزوم کا نتیجہ ہے۔ لہذا انکار بھی کفر ہو گا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ محارب خود انکار کا ایک مرتبہ ہے۔ کیونکہ جب امام تصرف کا ارادہ کرے تو انکار کی یہی شکل ہو گئی
 اکثر شیعہوں نے اس بات کا جواب اس طریقہ سے دیا ہے کہ اگرچہ قاعدہ کا تقاضہ یہی ہے کہ جب کسی چیز کا انکار کفر نہ
 ہو تو اس چیز کے مالک کے ساتھ محارب بھی کفر نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ محارب انکار ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس قاعدہ
 کو خلاف عقل ہم نے محاربان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں ترک کر دیا ہے اس لیے کہ ہم کو متفق علیہ حدیث حدیث
 حربی و سلمہ سلسلی پہنچی ہے۔

انکے اس جواب میں بوجہ و وجہ غلط موجود ہے۔ اول یہ کہ یہ کلام مجاز پر محمول ہے حرف تشبیہ کے حذف کے ساتھ۔
 یعنی حربی کا نہ حربی، اس لیے کہ معنی حقیقی تو بہر حال ممکن ہی نہیں ظاہر کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حربی
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حقیقہً تو حرب نہیں تھی بلکہ حکماً تھی۔ جب مجاز بخذف حرف تشبیہ ہوا
 تو اس حدیث سے اس کا مذموم و قبیح ہونا تو معلوم ہوا۔ مگر کفر نہیں ہوا کیونکہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کا تمام احکام
 میں یکساں ہونا لازم نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا الفاظ بہت سے صحابہ اور متعدد قبائل مثلاً اسلم، غفان
 جہنم، مزنیہ کے حق میں ارشاد فرمائے حالانکہ بالاتفاق ان سے محارب کفر نہیں۔

دوسرے یہ کہ کلام کے معنی یہ ہیں حربی بالتحصیص حربی۔ پس بہت سی جماعتوں کی لڑائی مثلاً قاتلین عثمان
 رضی اللہ عنہ کی جن میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہوں گے حرب رسول نہ تھی۔ اور اس قسم کا اظہار مشہور بھی ہے
 اور راجح بھی۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے دوست سے کہے کہ جویرا بدخواہ میرا بھی بدخواہ ہو گا۔ اور وہ دوست ایسی
 جماعت کے زمرہ میں ہے جن کا کوئی بدخواہ کسی امر عام مشترک کے سبب ہے تو وہ شخص عموم کلام میں داخل
 نہ ہو گا۔ نہ بروئے لغت نہ بطریق عرف اور صحابہ کرام اور اہل المؤمنین رضی اللہ عنہم خصوصاً جناب امیر رضی اللہ عنہ
 کے ساتھ لڑائی کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے بلکہ ان کا تو قاتلین عثمان سے پورا قصاص لینے کا مطالبہ تھا جناب امیر
 رضی اللہ عنہ بھی اسی لشکر میں شریک تھے تو لا محالہ ان سے بھی لڑائی تھنی۔

تیسرے حربی حربی۔ عَدَا وَتَدَا وَتَدَا وَتَدَا سے کنایہ ہے۔ ظاہر ہے یہ حضرات جناب امیر رضی اللہ عنہ سے

سے عداوت نہ رکھتے تھے۔ نہ انکی لڑائی عداوت کی بنا پر تھی محض رفع فساد کیلئے مقابلہ کی نوبت آئی اور بات جنگ و قتال تک جلد پہنچی۔

جو سمجھے یہ کہ تمام اختیاری امور میں قصد و ارادہ شرط ہے تاکہ وہ مدح و ذم کا مصداق بن سکے۔ مثلاً ایک شخص کہے جو اس برتن کو توڑے گا میں اس کے ساتھ ایسا ایسا کروں گا۔ اب ایک شخص نے چلنے میں ٹھوکر کھائی اور اس کا پاؤں برتن سے لگا اور برتن ٹوٹ گیا تو بالا جملہ اسے برتن توڑنے والا نہیں کہا جائے گا۔ اور وہ اس دھکیل کا مصداق نہیں ہوگا۔ چنانچہ معتبر تاریخوں کی رو سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے انکی لڑائی بالکل اسی نوع کی تھی۔

پانچویں یہ کہ ہم تسلیم بھی کر لیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی لڑائی بہر حال محاربہ رسول ہے۔ لیکن محاربہ رسول بھی تو مطلقاً کفر نہیں۔ البتہ نبوت اور رسالت کے انکار کے ساتھ کفر ہے۔ دنیا اور مال کی طمع کے ساتھ کفر نہیں اس پر وہ آیت دال ہے جو قطع الطريق کے حق میں وارد ہے اور ڈاکو بالا جملہ کافر نہیں فاسق ہیں۔ اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِي يَمْحَاكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقْتَلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا۔ سود خوروں کے بارے

میں بھی اسی قسم کی دھکی آئی ہے۔ حالانکہ وہ بالاتفاق کافر نہیں۔ فَأَذْنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ۔ بلکہ یہاں تو ان فاسقین کے لیے خدا و رسول ہر دو سے لڑائی لڑنا ثابت کیا ہے اور حدیث میں تو صرف حرب رسول کا ذکر ہے تو جب خدا و رسول ہر دو سے لڑائی موجب کفر نہ ہوئی تو تنہا رسول سے محاربہ کیوں کفر ہوگا۔ ہاں رسول کے ساتھ لڑائی دین کے انکار کے ساتھ اور اسلام کی توہین کی غرض سے ہو تو وہ بلاشبہ کفر ہے مطلق لڑائی کفر نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا کہو گے؟ حضرت ہارون علیہ السلام سے محاربہ میں آپ نے کوئی تامل نہ کیا اور اتنا سخت محاربہ کیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام زاری کرنے لگے اور فرمایا۔ يَا أَبْنِیْ اَقْرَبَا تَاْخُذْ بِخَبِيْثِيْ وَلَا بِرَاۤیْسِیْ۔ محاربہ اور لڑائی میں اسگ زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی بمطابق اَنْتَ مِثِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی۔ وہ رتبہ رکھتے تھے۔ ادھر زوہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قاتلین عثمان کا حامی اور معاملہ قصاص میں مال منول کرنے والا سمجھ کر ان سے رنجش و پر خاش رکھی۔ دوسری حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی کا حامی اور حد و تعزیر میں سستی کرنے والا جان کر اپنے بڑے بھائی اور پیغمبر کی اہانت کی۔ لہذا اگر محاربہ رسول کو کفر قرار دیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا۔ ان کا مقام کہاں ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام اور اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ جو معاملہ کیا اور جو صدمات پہنچائے کیا وہ محاربہ سے کم اذیت ناک تھے۔ پھر ان حضرات کو آپ کہاں اور کس مقام پر لے جا کر کھڑا کریں گے۔

ایسے مباحث اور مواقع پر کہ آدمی کو منصف مزاجی سے کام لینا چاہیے اور ہر شخص کے مرتبہ اور مقام کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ دوسری طرف کی شخصیت کوئی گری بڑی ہستی نہیں زوہر و غیور رسول ہیں جو قرآنی حکم کے مطابق ام المؤمنین ہیں۔ اور اس طرح جناب امیر خود کی بھی! ماں اپنے بیٹے کو اگرچہ قصور سے بری الذمہ ہو ڈانت ڈپٹ سکتی ہے۔ زمانہ کا اونچ نیچ سمجھا سکتی ہے۔ کسی بھی عمل کے متعلق باز پرس کر سکتی ہے۔ ہم تم بچوں

جو تین میں نہ تیرہ میں۔ یہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کی ماں پر لعن طعن کریں، سب و شتم کریں اور تیر بازی کریں (یہ تو پرانے شگون اپنی ناک کمانی ہوئی، یہ تو مل بیٹوں کا قصہ تھا یہاں حل نہ ہوا تو آگے بڑوں کی خدمت میں پہنچ کر ملے ہو جائے گا اور سب باہم شیر و شکر ہو جائیں گے، کب جنتی تو ان کی آئے گی جنہوں نے یہاں کمر لگے کہ فوجیوں کا کردار ادا کیا، اپنی حیثیت کو بھل کر بڑے بول بولے۔ جنگی عزت و حرمت جز ایمان تھی اسکے پاک دامن کو لعن طعن اور سب و شتم کے دھنیوں سے داغدار کیا اور خوب دل کھول کر بڑی ڈھکیاں اور عذرت سے ڈنکے کی چوٹ برس برس منبر دنیا کو گواہ بنا کر دیدہ و دلالت اپنی عاقبت خراب کی اپنی گور کو آتش جہنم سے بھرنے کا سامان کیا، اور پھر مست و بے خود ہو کر لغو لگا یا، "مشام از زندگی خویش کہ کارے کردم..." (چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف علیہما السلام کے برادران پر زبان طعن در انداز کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں جبکہ وہ برابر کے بھائی ہیں، اور یہاں تو ماں بیٹے کا تعلق ہے یہاں تو اور زیادہ محتاط ہونا چاہئے، اگر فرق مراتب کا خیال نہ کیا اور ان کو بھول گئے، تو یاد رکھو زندگی کہلاو گے۔

حاصل کلام یہ کہ حدیث حرید حرابی سے محاربان جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اثبات کیلئے تمسک کرنا قاعدہ کے لحاظ سے درست قرار نہیں پاسکتا اور بہت سے اصولوں کے خلاف رہتا ہے ان لڑائی لڑنے والوں کے نہ اعمال صالحہ کہیں جاتے ہیں اور نہ ان کا ایمان ضائع ہوتا ہے، اور یہی بغض و عداوت سب و شتم اور تیر بازی اور دکتے ہیں۔ اور محارب و مخالف کا فرق کسی طرح بھی سمجھنے میں آنے کے لائق نہیں۔ اس سلسلہ میں بھی علماء شیعہ کی آراء اور اقوال سنئے۔

قاضی نور اللہ شوستر نے مجالس المؤمنین میں بیان کیا ہے کہ شیعیت کا مفہوم (خلاصہ) یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلا فصل تھے، اس سلسلہ میں سب و شتم اور لعن جائز نہیں اور خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم) کے نام زبان پر لانے کی کھائش ہے۔ اگرچہ جاہل شیعہ وجوب طعن کا حکم لگائیں تو ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں، اور شیعوں پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف خبث و فحش کی نسبت کرتے ہیں تو حاشا ثم حاشا الیسا برگز نہیں، فحش کی نسبت تو کسی عامی آدمی کی طرف بھی حرام ہے چہ جائیکہ حرم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ نسبت کی جائے البتہ جب حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا و قرن فی بیوتکن کی مخالفت کرتے ہوئے بصرہ آئیں اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کا اقدام کیا اور بموجب حدیث حرید حرابی و سلم سلمیٰ جسکو فریقین مناقب امیر رضی اللہ عنہ میں ذکر کرتے ہیں کہ نہ جناب امیر کے ساتھ لڑائی مقبول ہے نہ حضرت پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ، اس لیے وہ قابل طعن نہیں۔ اسی کے متصل دوسرے ہی سانس میں یہ بات بھی کہی کہ کتب شیعہ میں ایک ضعیف روایت یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں توبہ کی۔ لیکن لڑائی کا قصہ متواتر ہے اور توبہ کی حکایت خبر آحاد۔ بہر حال اس بات کی پیران پر طعن جائز نہیں" (نتیجہ کلاماً)۔

اہل تاریخ اس سے بھی واقف ہیں، کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کسی لشکر کے حوالہ سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی توبہ بھی منقول ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

حدیث یاد دلانا جس سے آپ کی خلافت کی حقیقت ثابت ہوتی تھی، اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا معرکہ جنگ سے واپس ہو جانا بھی بطریق مشہرت و تواتر مروی ہے تو ان روایات کی رو سے بھی شیعہ کے نزدیک ان اشخاص پر بھی طعن جائز نہ ہو گا۔ اور یہی مدعا ہے۔

واضح رہے کہ شیعہ اسلاف میں سے مثلاً عبد اللہ مشہدی اور ان کے ساتھیوں نے اس عقیدے سے رجوع کر لیا ہے کہ حضرت امیر کا محارب کافر ہے۔ اور صرف اتنے ہی پر قناعت کی ہے کہ جناب لڑائی کفر تو نہیں ہے لیکن فسق اور گناہ کبیرہ تک پہنچا دیتی ہے کیونکہ انہوں نے نص کی تکذیب بہر حال نہیں کی۔ اس میں کوئی غلط تاویل کی یا نص محارب سے انکار کر کے اسے حلال سمجھا۔ تو یہ صورت فسق اعتقادی کی ہے کفر کی نہیں، اور خواجہ نصیر الدین طوسی بھی کوئی ایسا ویسا نہیں علماء شیعہ کے نزدیک اس کا قول بھی ”وحی ناطق“ کا درجہ رکھتا ہے خاص طور پر باب اعتقاد میں اس لیے ان کے متاخرین میں سے بعض نے ملا عبد اللہ اور خواجہ نصیر الدین کے اقوال میں تطبیق دی ہے کہ ”بمقتضا حدیث حدیث حرجی جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے لڑنے سے کفر لازم آتا ہے۔ اگرچہ التزام کفر نہ ہو۔ اور لزوم کفر شیعوں کے نزدیک بھی کفر نہیں۔ بلکہ التزام کفر، کفر ضرور ہے۔ لہذا خواجہ کا قول باعتبار لزوم ہے۔ جو ظاہر حدیث کے موافق ہے اور جناب ملا اور ان کے ساتھیوں کا قول بلحاظ التزام ہے جب ان میں التزام کفر نہ ہو تو ان پر مرتد کا لفظ راستہ نہ آیا، انتہی کلام۔

حق یہ ہے کہ یہ کلام تکلف کا شاہکار ہے۔ اصول شیعہ میں اس سے بڑھ کر تکلف کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک معمرہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ لیکن حدیث مشہور گو قایل تاویل ہے اور بالیقین اس کے حقیقی معنی مراد بھی نہیں پھر بھی یہ ان آیات قطعیہ سے بالکل نہیں ٹکراتی جو عام مہاجرین و انصار اور خصوصاً ازواج مطہرات اور ان دونوں بزرگوں (رضوان اللہ علیہم) کی شان میں وارد ہوئی ہیں۔ پھر شیعہ قواعد کی رو سے بھی ان حضرات کا کفر صحیح نہیں بیٹھتا۔ بات جو زیادہ سے زیادہ کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ امام وقت کے خلاف لڑائی بغاوت ہے اور بغاوت فسق ہے کفر نہیں۔ اور اگر اسکی بنا بھی کسی تاویل یا شبہ پر ہو تو یہ بغاوت فسق بھی نہیں بلکہ خطلے اجتہادی ہے۔ یہ تھا شیعہ کلمۂ نظر جناب امیر رضی اللہ عنہ اور انکی خلافت کے متعلق،

اس کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اہلسنت کا جو مذہب ہے وہ بھی زیر بحث لے آیا جائے۔ اور اسکو بھی ذرا تفصیل کے ساتھ ناظرین کے گوش گزار کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ فقہی اجتہادی مسائل مثلاً امامت، میراث پیغمبر، ہر قبل القبض کا تمام نہ ہونا، تقسیم خمس، راجح تمتع، وغیرہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہرگز کفر نہیں، کفر کیا معصیت و گناہ بھی نہیں کیونکہ آپ بھی منجملہ مجتہدین ایک مجتہد تھے اور مسائل اجتہادیہ میں مجتہدوں کا اختلاف جائز ہے اور ہر مجتہد اجبر کا مستحق ہے۔

ہاں بغض و عداوت اور عناد کے جذبہ سے جس نے آپ لڑائی لڑی وہ اہلسنت کے نزدیک بھی کافر ہیں اس پر سب کا اہل ہے اور خوارج اور اہل نہروان کے باسے میں اگلی یہی رائے اور مسلک ہے۔ اور حدیث حربہ اسی قسم کے حرب پر معمول ہے۔ لیکن یہاں بھی لزوم کفر ہے التزام کفر نہیں تو ان پر مرتد کا اطلاق نہیں ہو گا اور انکا غیر معقول شبہ لصوص قطعہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ کے خلاف ہے تو وہ انکے عذر کا سبب نہیں

ہن سکتا۔ گویا اہلسنت کے نزدیک احکام اخروی میں خوارج کا فرہیں۔ انکے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت نہیں کرنی چاہئے۔ نہ نماز جنازہ پڑھنی چاہئے وغیرہ وغیرہ۔

بغض و عداوت اور عناد کے جذبہ سے پاک محض کسی غلط شبہ غلط فہمی یا غیر مناسب تاویل کی وجہ سے آپ لڑنے والے جیسے صاحبانِ جمل اور اصحابِ صفین۔ تو یہ خطائے اجتہادی اور بطلانِ اعتقادی میں مشترک ہیں فرق یہ ہے کہ اصحابِ جمل کی یہ خطائے اجتہادی اور فسقِ اعتقادی کسی طور پر بھی طعن و تحقیر کو سندِ جواز عطا نہیں کرتا اس لیے کہ انکی مدحِ خواتی، منبقتِ اسلامی میں اور جنابِ رسالتِ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکی قرابتِ ثابت ہونے میں اور حضور سے انکے نسبی اور سسرالی رشتہ کی ثابت ہونے میں لصوص قطعہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ وارد ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ آپ کی عصمت اور علو مرتبہ پر جو قرآنی لصوص وارد ہیں وہ آپ پر طعن کرنے کے لیے آپ کی تحقیر سے بالغ ہو گئیں۔ جو آپ سے اپنے بھائی کے بارے میں سرزد ہوا۔ وہ بے تاملی اور عجلت کی بنا پر ہوا اور نہ یہ سب کچھ اللہ، فی اللہ تھا، شیطانی وسوسہ کا تو آپ کے لیے تصویر بھی نہیں کیا جاسکتا۔

رہا اصحابِ صفین (رضی اللہ عنہم) کا معاملہ تو جو اصحابِ جمل کے متعلق قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوئے ان حضرات کیلئے قطعی اور یقینی طور پر لصوص موجود نہیں اس لیے ان کے معاملہ میں توقف و سکت لازمی ہے۔ ان آیات و احادیث کے عموم پر نظر کرتے ہوئے جو فضائلِ صحابہ کے سلسلہ میں وارد ہیں بلکہ تمام ہی مومنین کے فضائل پر مشتمل ہیں اور جو انکی نجات اور شفاعت کی امید پر وہ دار سے رکھنے کا حکم ظاہر کرتی ہیں، اہل شام کی جماعت میں سے کسی کے متعلق جب تک قطعی اور یقینی طور پر یہ نہ جان لیں کہ وہ جنابِ امیرِ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض و عداوت رکھتا تھا حتیٰ کہ آپ کو کافر کہتا تھا اور سب و شتم اور لعن طعن کرتا تھا تو ہم ایسے شخص کو یقیناً کافر کہیں گے۔ اور جب یہ بات معتبر روایات سے پایہ ثبوت تک نہ پہنچے تو چھوٹا انکا اصل ایمان، بالیقین ثابت ہے اس لیے ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہونگے

خلاصہ کلام یہ کہ اہلسنت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ لہذا فرماتے والا آپ کے جنتی ہونے سے انکاری، بیادینی اوصاف، علم، عدالت، زہد، تقویٰ کے اعتبار سے آپ کو خلافت کیلئے نا اہل کہنے والا اور آپ کی لیاقت کا منکر۔ کافر ہیں، یہ بات خوارج نہروان کے متعلق قطعی ثبوت کی حد تک پہنچنے کے سبب انکو کافر کہتے ہیں اور جب تک ہمارے میں پایہ ثبوت تک نہیں پہنچی انکو کافر نہیں کہتے۔

اہلسنت کے مذہب کی یہ وضاحت و تحقیق انکے اصول طے شدہ کے بھی مطابق ہے کیونکہ انکا اتفاق ہے کہ ضرورت دین سے انکار کرنے والا کافر ہے۔ اور جنابِ امیرِ رضی اللہ عنہ کا ایمانی درجہ میں بلند ہونا، آپ کا جنتی ہونا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لائق ہونا نہ صرف احادیث سے بلکہ آیات قرآنیہ سے ثابت ہے، لہذا ان کا منکر کافر ہو گا۔ اور کم ظرفی، حب مال و جاہ، تاویلِ باطل، غلط فہمی یا کسی کے بھڑکانے اور بہکانے کی وجہ سے آپ لڑائی کفر نہیں فسقِ علمی یا اعتقادی ہے۔

آما میر جب اصل بنیادیں اہلسنت سے اتفاق کرتے ہیں تو انہیں حکم میں بھی اتفاق کرنا چاہئے
مقدمہ (۷) یہ کہ اگر کوئی مرد مومن مرتکب کبیرہ ہو جائے یا کسی غلط فہمی یا شبہ فاسد میں پڑ کر

کسی ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہو جائے تو اسے سب و شتم اور لعن طعن کرنا جائز نہیں اور اس سلسلے میں کسی دلیل دی جاسکتی ہیں مثلاً۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَأَعْلَمُكُمْ أَنَّمَا إِلَهُ الْإِلَهِ وَاللَّهُ فَاسْتَغْفِرْ لِدُنْيِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔ (سورہ النور) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اپنے اور مومن و مومنات کیلئے معافی چاہتے رہو! اس اصول قاعدہ پر سب کا اتفاق ہے کہ کسی چیز کا حکم دینا، اسکے خلاف کو روک دینا ہے، لہذا مومن فاسق جو محتاج استغفار ہیں انکو استغفار کا حکم دینا اس بات سے روکتا ہے کہ ان کے گناہ کے سبب ان کو زجر و توہین اور لعن طعن نہ کی جائے، نہ بددعا کی جائے، کیونکہ یہ سب باتیں استغفار کے ضد ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں۔ اسی لیے نماز کی آخری رکعت میں شہد و درود کے بعد دعائے مانورہ مشتمل بر استغفار مومنین و مومنات مننون ٹھہرا۔ اور لعن کرنا یا بددعا دینا ان کو رحمت الہی سے دور پھینکنا ہے اور شریعت کے حکم سے مقابلہ کرنا حرام قرار دیا جا چکا ہے،

(۲) الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ فِي كُلِّ نَفَسٍ وَاللَّهُ عَلِيمٌ خَفِيٌّ۔ (سورہ النور) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور ظاہر ہے مقرران دربار کے خلاف حضور شاہ کوئی لب کشائی کیلئے استغفار میں مشغول و مصروف ہیں۔ ایسے مسلمان و مومن کے خلاف بددعا یا سب و شتم جسکے لیے حاملان عرش استغفار میں مشغول ہوں ہرگز رضائے الہی نہیں ہو سکتی۔

(۳) اہل کبار کے حق میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت ثابت ہے اب تم ان کو کالی یا بددعا دے کر دربار خداوندی میں پیغمبر کے مد مقابل ہونے کی جہرت نہیں کر رہے؟

(۴) وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ اللَّهُمَّ ارْزُقْنَا كَمَا رَزَقْتَ آبَاءَنَا وَارْزُقْنَا كَمَا رَزَقْتَ آبَاءَنَا۔ (سورہ النور) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اس روایت کو زندہ و تازہ رکھنا چاہئے۔ تاکہ کل ہم جب اسکے محتاج ہوں تو ہمارے بعد والے ہمیں فراموش نہ کر دیں۔ اب جو اس کے خلاف کرے۔ یعنی بجائے دعائے مغفرت و عفوان پر لعن طعن کرے وہ گویا ملت و دین کا حق تلف کر رہا ہے۔

(۵) محبت و دوستی کا سبب ایمان ہے جو فاسق میں موجود ہوتا ہے، یہ فسق قابل نمائش تمغہ نہیں۔ یہ ایک مرض ہے جو علاج کا محتاج ہے اس سے تعلق اور ہمدردی کا تقاضا ہے کہ اسکا یہ مرض دور کیا جائے اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک زندگی میں ایک موت کے بعد۔ زندگی میں علاج یہ ہے کہ اسے اچھی باتوں کرنے اور بری باتوں سے روکنے کو کہا جائے، وعظ و نصیحت کی جائے، حد و تعزیر سے الائنش روحانی دور کی جائے۔ اور جب وہ مر جائے تو دوسرا طریقہ کام میں لایا جائے کہ اسکے لیے دعائے مغفرت کی جائے اچھا ثواب کیا جائے۔ صدق و

خیرات، کلمہ و کلام سے اسے فائدہ پہنچایا جائے، یہ تو ایک فطری سی اور انسانی زندگی کی پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ جب کسی کا بھائی بند، عزیز و رشتہ، مبتلائے مرض ہو تا ہے تو وہ اسے گولی مار کر یا قتل کر کے ازالہ مرض کرنے کی نہیں سوچتا وہ اسے لیکر طبیب کی طرف بھاگتا ہے جو اس کا علاج اس مرض کے اثر کو زائل کرنے کی صورت میں کرتا ہے، اسکے قتل اور اسکی روح مٹانے کی شکل میں نہیں کرتا، حدیث صحیح کا ایک مضمون ہے لعن المؤمن مقتدیہ (مومن کو لعنت کرنا گویا اسکو قتل کرنا ہے) اسیلئے کہ لعنت کے معنی رحمت سے دور کرنے کے ہیں اور

اسمیں جب تک ایمان موجود ہے اسکی رحمت سے دور کی نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں اس پر بعثت کرنے والا اللہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ آپ اس کا ایمان سلب کر لیں، اب وہ سوچ لے کر کہ اس سے کیا کہہ کر اپنے لیے کانٹے بھر رہا ہے، کیونکہ سلب ایمان تو بلا کلت ابدی ہے جو قتل سے ہزار درجہ سخت ہے۔

(۶) علت کا وجود چاہتا ہے کہ حکم موجود ہو اور علت کے زوال کا تقاضا ہے کہ علت نہ ہو تو حکم بھی نہ ہو۔ لہذا مومن فاسق کا ایمان دائم ہے روح کے دوام کے سبب۔ دوام روح کی صفت ہے۔ اور یہ ایمان دوستی و محبت کا سبب بنا ہوا ہے۔ تو وجوب محبت بھی دائم بدوام روح ہو گا فاسق ایک بدنی عمل ہے جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہو گا تو یہ فاسق بھی معدوم ہو جائے گا۔ اور اس کے اسباب، بغض و عناد، سب و شتم، لعن طعن، اباحت و تحقیر بھی بعد موت زائل ہو جائیں گے اور ایمان کے تقاضے (سبب دوام ایمان) باقی رہیں گے اور وہ مثلاً مغفرت و بخشش وغیرہ ہیں اسی لیے حدیث صحیح میں وارد ہے۔ لَا تَسْتَوُوا الْأَمْوَاتُ فَإِنَّهُمْ أَفْضَلُ إِلَى مَا قَدْ مَضُوا (مردوں کو گالی نہ دو کیونکہ وہ تو اپنی آگے بھیجی ہوئی اشیاء تک پہنچ چکے) موت اس لحاظ سے فاسق کے حق میں توبہ کا حکم رکھتی ہے کہ وہ عمل بد کا سلسلہ تو منقطع کر دیتی ہے مگر عمل سابق کو نہیں مٹا سکتی اور توبہ عمل سابق کو بھی مٹا مٹا کر دیتی ہے۔ اب موت کی وجہ سے جب عمل بد ختم ہو گیا، تو اب صرف ایمان رہ گیا۔ وجوب محبت جب کا تقاضا ہے۔

(۷) وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا (موعود توبہ) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے محض ایمان پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے (آگے سمجھ کر کوئی تعلق نہیں) لہذا مسلمان اور مومن پر لعن کرنا اور اس کے عذاب کی آزدی، یاد کرنا گویا خدا تعالیٰ سے یہ چاہنا ہے کہ وہ "ان کی" خاطر وعدہ خلافی کر جائے قطع نظر اس کے کہ خدا کے ہاں وعدہ خلافی کا خاند ہی نہیں۔ ان دشمنان دین و ایمان کی سادگی کی بھی تو داد دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے فرمایا کہ وَاللَّهِ لَا يَخْلُفُ الْوَعْدَ۔ پس یہاں طلب محال کے ساتھ نتیجہ میں سورہ ادنیٰ بھی !

مقدمہ (۸) :- امور دنیا کے سبب بزرگوں میں باہم بہت دفعہ آزدی پیدا ہوتی ہے مگر اسکے باوجود بزرگ اس آزدی کی باہم کے سبب کبھی اپنے مرتبہ سے نہیں گرے اور نہ تحقیر و اہانت کے منہ اڑا کر پائے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے برادران۔ کہ ان کے مابین توبہ نہیں ہو کیا کیا ہے۔ مگر ہمارے لیے صرف یہی حکم ہے کہ ان کی عزت و تکریم کریں اور انکی تعظیم ملحوظ خاطر رکھیں۔

ائمہ اہل اہل زادوں میں جو اختلاف پیدا ہوا حتیٰ کہ بعض نے بعض کی امامت تک سے انکار کر دیا تو ان حضرات کے معاملہ میں شیعہ حضرات کا طرز عمل بھی یہی ہے کہ سب کچھ ہوتے علی الرغم وہ سب کی عزت و تکریم کرتے ہیں اب اس عزت و تعظیم کی وجہ ان کے نزدیک چاہے جو کچھ ہو مگر اس سے تو مجال انکار نہیں کہ ان میں سے معصوم تو صرف ایک ہی ہو گا۔ اپنی اپنی تعلیم مذہب اور افتاد طبیعت کے مطابق انکو معصوم کے مقابلہ کو جو کہنا چاہئے عجیب بات یہ ہے کہ وہ نہیں کہتے، ان کے حق میں کفر تو بڑی بات ہے فسق تک کا اعتقاد بھی نہیں رکھتے۔ اب جس وجہ سے امام زادگان رحمۃ اللہ علیہم سے شیعوں کا یہ طرز عمل ہے۔ اسی وجہ سے اہل سنت بھی رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقین، اصحاب، ازواج مطہرات، اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی تعظیم و تکریم کام میں لاتے ہیں اور ہر فرقوں کو اپنے اپنے طرز

عمل میں معذور رکھتے ہیں۔

اور علامہ عبداللہ شہیدی جوان شیعوں میں نسبتاً ذرا گہری نظر رکھتا ہے اور حاضر دماغ رہتا ہے اس متوجہ پر متنبہ ہو کر مطلق منع کو ناکافی جان کر جسے چشم پوشی نہ کر سکا اور خود ایک سوال قائم کر کے اسکے جواب کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ مقام شبہ کا ہے اور عقلمند کو چاہئے کہ شبہ کی صورت واضح کر کے بیان کرے پھر اسکو دور کرنے کی کوشش کرے اگر کوئی کہے کہ دوسرے تہذیب شناس ہوں یا جماعت مقبولان الہی میں سے ہوں اور ان کے درمیان کسی شبہ، شک یا اختلاف رائے کی وجہ سے نزاع یا بدگوشی پیدا ہو جائے اس صورت میں ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان میں سے کسی پر بھی طعن کریں اور اس سے بدگوشی سے پیش آئیں (اب اسکے جواب میں کہتا ہے) یہ فرضی اگر ایسے تمام صلحائے امت کے درمیان پیش آئے جو سب کے سب جائز الخطا ہوں تو ممکن ہے۔ اور اگر زیر غور مقام ایسا ہو کہ ایک طرف معصوم ہوں اور دوسری طرف جائز الخطا تو یہ جائزہ نہیں اس صورت کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں محاصمہ کے ہر دو اطراف برابر نہیں ایک طرف معصوم ہیں تو دوسری طرف جائز الخطا۔ معصوم چونکہ خطا کا احتمال نہیں رکھتا اس لیے وہ مقابل سے ناحق آزرده نہ ہوگا۔ اور دوسری طرف چونکہ جائز الخطا ہے وہ اگر کسی بنا پر شبہ کر کے معصوم سے آزرده ہو کر عداوت رکھے گا تو وہ معذور نہ ہوگا کیونکہ معصوم کی محبت اور اس کی رعایت تعظیم پر نص آچکی ہے، تو اس کے شبہ کا کوئی اعتبار نہیں جس طرح شیطان کا شبہ حضرت آدم علیہ السلام اور انکی اولاد کی عداوت میں کہ اس کا یہ شبہ قابل عذر نہیں، (انتہی کلاماً)

اس جواب میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کر کے گمراہانے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ دانت مغالطہ میں ڈالنے کی کیدی کی گئی ہے، ورنہ وہ اتنے کودن نہیں کر یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ ہم نے اپنے کلام کی بنیاد ہی ایسی صورت پر رکھی ہے کہ اگر دو معصوموں میں باہم آزرده گی و ناراضگی پیدا ہو، جب وہ دونوں ہی معصوم ہیں تو پھر کہاں ایسے کہا آدم۔ اور ایسی مثالیں کہ فریقین معصوم ہوں اور ان میں باہم آزرده گی پیدا ہو۔ اور دونوں ایک دوسرے کی حق تلفی کریں ہم کتب امامیہ سے بہت سی پیش کر سکتے ہیں۔

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کا تہذیبیہ کہ حضرات ائمہ کا درجہ ان سے بلند کیوں ہو گیا، پھر ان سے مخالفت کرنا، ان سے حسد رکھنا، ان کی محبت کا عہد باوجود حکم الہی کے پورا نہ کرنا، اسکی پوری تفصیل بحث نبوت میں بیان ہو چکی ہے۔
(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے بڑے اور نبی بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی امانت و تحفہ کرنا، ڈاڑھی پکڑنا ان کے سر کے بال کھینچنا، یہ واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے کسی کو مجال انکار نہیں۔

(۳) شیعوں کی معتبر کتاب، بحر المناقب میں مناقب اخطب خوارزم سے ابو تراب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے نقل ہے کہ جناب رسالتہا صلی اللہ علیہ وسلم بی بی زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف لائے جناب علی رضی اللہ عنہ کو وہاں نہ دیکھا تو پوچھا میرا عم زاد کہاں ہے۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا مجھ میں ان میں کچھ ناچاقی ہو گئی اس لیے یہاں قیدوار کرنے کے بجائے وہ باہر چلے گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ مسجد میں پہلو کے بل لیٹے سو رہے ہیں، اور سر و چہرہ صحن مسجد کی خاک سے خاک آلودہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُضِیا بالاجاب، قہ یا اباتراب، (ابو تراب اٹھو۔ ابو تراب اٹھو) یہ واقعہ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے، انتہی کلاماً،

(۴) ابو خنیفہ لوطن بن یحییٰ از دی، امامیہ کا بہترین محدث ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتا

ہے کہ کان یبدری الکراہۃ لِمَا فَعَلُوا أَخُوَ الْحَسَنِ مِنْ صَلَاحِ مُعَاوِیَہٍ وَ یَقُولُ لَوْ جَزَأَ الْفَنی کَانَ أَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا فَعَلُوا اَخِی (آپ اپنے بھائی جناب حسن رضی اللہ عنہ کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینے پر بڑے خفا تھے اور فرماتے تھے کہ اگر میری ناک کٹ جاتی تو وہ مجھے زیادہ پسند تھی اس بات کے مقابلہ میں جو میرے بھائی نے کیا) لہذا ان صورتوں میں آزدگی و ناراضگی ہر دو جانب حق ہو تو اجتماع نقیضین لازم آتا ہے اور اگر ایک طرف حق اور دوسری طرف باطل ہو تو طرف باطل کی عصمت دہم برہم ہوتی ہے اور یہ خلاف مفروض ہے۔ پس معلوم ہوا کہ معصوم کے ساتھ آزدگی و قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جو عداوت، القصب، اعتاد اور بغض پر مبنی ہو جیسے خواہج نواصب کے اہل بیت اور مسلمانوں سے، دوسری وہ کہ باقضاۃ بشریت ہو یا کسی ایسی دلیل سے جس کا اس پر انکشاف ہو گیا ہو جیسے جناب سیدہ کی آزدگی جناب مرتضیٰ (رضی اللہ عنہا) سے یا حضرت موسیٰ کی کبیدگی حضرت ہارون علیہما السلام سے۔ یا جناب حسین کی جناب حسن (رضی اللہ عنہما) سے، اور ایسی آزدگی جو بتقاضاۃ بشریت ہو یا ظہور دلیل کے سبب ہونہ فسق ہے، نہ موجب طعن کہ عصمت میں خلل پڑے، جب ایسی آزدگی سے عصمت معصوم میں کوئی خلل نہیں پڑتا تو عدالت و تقویٰ میں بدرجہ اولیٰ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور ہم یہی بات ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں، فک و غیرہ کے سلسلہ میں صحابہ کرام کو جناب مرتضیٰ ولی بی نہ ہر ارضی اللہ عنہما سے جو آزدگیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ اسی نوعیت کے تھیں، اصحاب اظہار الحق اس جواب پر متنبہ ہو کر چپ نہ رہ سکا اور خود ہی ایک سوال قائم کر کے اس کے جواب کی فکر میں لگ گیا، لیکن جو سوال اس نے قائم کیا ہے اس کا وہ صحیح جواب دے ہی نہ پائے گا۔ اس نے سوال قائم کیا کہ ممکن ہے نیک لوگوں کی ایک جماعت ایک بات چاہیں یا کسی بات کو مسلمانوں کے مفاد میں دیکھیں مگر وہ بات اہل بیت کے لیے بے فائدہ اور فضول ہو اور وہ بتقاضاۃ بشریت اور اس سبب سے کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنا مفاد پہلے دیکھتا ہے نیک لوگوں کی مخالفت کریں اور ان سے ناراضگی رکھیں اور اس کا اظہار بھی کریں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اہل بیت کے کلام میں ناراضگی و ناخوشی ظاہر کرنے والی باتیں اسی وجہ سے ہوں اور اس طرف سے رنجش و عداوت مطلق نہ ہو۔

اس سوال کا بڑا طویل جواب بڑے گھماؤ پھراؤ سے دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کی رو سے جناب امیر معصوم ہیں، اور حقائق شرعیہ کو زیادہ جلنے والے تو آپ کے لیے یہ کہاں زیبا ہے کہ حق کے خلاف نیکیوں کی مخالفت کریں لہذا آپ کی کیفیت صحابہ کے ساتھ ایسی ہے جیسے نیکیوں کی باہم ہوتی ہے،

مگر یہ جواب بھی بچند وجوہ پر خلل ہے، اول، بی بی زہراء، جناب حسین رضی اللہ عنہما، اور حضرت آدم و حضرت موسیٰ علیہما السلام بھی معصوم ہی تھے، تو ان کے لیے کب مناسب تھا کہ حق کے خلاف معصوموں کی مخالفت کریں اور اگر ہر دو طرف حق مانا جائے گا تو اجتماع ضدین لازم آئے گا، یا یہ کہ ان میں سے ایک فریق معصوم نہ ہو،

دوسرے بعض اوقات مقابلہ ٹھیک ہے اور زیادہ ٹھیک ہے، کا ہوتا ہے اور کبھی ٹھیک ہے اور غلط ہے، کا جواز روئے دلیل مجتہد کے حق میں ٹھیک ہی کا درجہ رکھتا ہے اس طرح گویا کسی جانب سے بھی حق کے خلاف نہ ہوا،

مقلد ص ۹۰ (۹) :- ہر عقلمند جب اپنی سمجھ و وجہ کا جائزہ لے اور دوسروں کے حالات و واقعات پر بھی نظر رکھے تو یہ بات یقیناً اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ بسا اوقات خوفناک و ہولناک واقعات کے سبب یا الفت و عداوت کے باعث وہ مقرر و طے شدہ بلکہ بدیہی اصول بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ یا ان کے خلاف کسی گفتگو یا عمل کا مرتکب

ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات یہ غفلت و فراموشی طول بھی کھینچ جاتی ہے، اور بعض اوقات تنبہ ہو کر، صحیح معلوماً کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور یہ غفلت و فراموشی تقاضائے بشریت ہوتی ہے جس میں کسی کا کوئی استشار نہیں بنی، غیر بنی، معصوم، غیر معصوم، ولی، غیر ولی، متقی، غیر متقی، سب اسمیں شامل و شریک ہیں اور اس نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اس کیفیت میں زیادہ دیر نہیں رکھا جاتا فوراً تنبہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کیلئے ضروری نہیں ہے کہ جلد تنبہ ہو جائے قرآن و حدیث سے بے شمار دلیلیں اسکی ملتی ہیں،

اقول :- حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر درخت سے اِیْنِ اَنَا اللّٰهُ مَنْ کَرِیْعَیْنِ ہو گیا تھا کہ یہ تجلی الہی ہے جو مصروف تکلم ہے، اور عصا ڈال دینے کا حکم دے رہی ہے ایسی صورت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کسی بھی مخلوق کا خوف و خطرہ اپنے دل میں نہ لائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ قادر بھی ہے اور پورا پورا محافظ بھی مگر پھر بھی جب عصا سانپ کی صورت میں متحرک نظر آیا تو آپ ایسے ڈرے کہ بھاگ اٹھے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا اسی وقت دوران کلام لَا تَخَفْ اِیْنِ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ (دُرو نہیں میرے پاس رسول ڈر نہیں کرتے) سے تنبہ ہوا،

دوسرے :- فرعون کے جادو گروں سے مقابلہ کے وقت وعدہ الہی کے مطابق آپ کو سخت یقین تھا کہ ان کے مقابلہ میں غلبہ محمد ہی کو حاصل ہوگا، اسکے باوجود جب جادو گروں نے رسولوں اور لاٹھیوں کے سانپ بننا کر میدان میں پھینکنے اور اپنے مخصوص نعرے لگانے اور خود گناہ شروع کیا تو اچانک آپکے دل میں خوف آگھسا یہاں پھر آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کیلئے فوری طور پر تنبہ ہوا، لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (دُرو نہیں تم ہی فہمند ہو گے) تیسرا :- کوہ طور سے واپسی پر قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر اور حضرت ہارون علیہ السلام کی جانب سے عدم اطلاع پاکر آپ ایک دم مشتعل ہو گئے غصہ دماغ میں چڑھتا تو یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہارون تو پیغمبر ہیں، معصوم ہیں پیغمبر و معصوم، مشرک و بت پرستی پر کیسے راضی ہو سکتا ہے، عدم اطلاع کی کوئی وجہ ہی ہوگی، چوتھے :- آپ نے خضر علیہ السلام سے عہد کیا کہ آپکے معاملہ میں مطلقاً دخل نہ دوں گا نہ آپکے اعمال کے اسباب کیسے پوچھوں گا، لیکن جوں ہی آپ نے کوئی اچھنبے کی بات دیکھی تو عہد شکنی سے فراموش ہو گیا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کے فعل پر سخت نکتہ چینی کی اور بالآخر خضر علیہ السلام کی یاد دہانی پر تنبہ ہوئے،

پانچویں :- حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ قوم لوط کا فراور مستحق عذاب، نیز یہ اعتقاد بھی پختہ تھا کہ حکم الہی مالا نہیں جاسکتا، اسکے باوجود مجرموں کی پیروی میں استغاثہ لے کر بارگاہ الہی میں جا پہنچے۔

ارشاد خداوندی ہے،

فَلَمَّا ذَہَبَ عَنْ اٰیْمِہِ الرَّوْعُ وَجَآءُہُ
الْبَشَرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ط اِنَّ اٰیْمِہِ
لَحَلِیْمٌ اَوْ کَا مُنِیْبٌ ۔ یَا اٰیْمِہِ اٰیْمِہِ اٰیْمِہِ عَنْ
ہٰذَا اِنَّہٗ قَدْ جَآءَ اَمْرٌ مِّنْ یَّدِکَ وَلَا تَنْهٰ
اٰیْمِہِ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ۔

جسب ابراہیم کا ڈر نکلا۔ اور خوشخبری سن لی تو وہ قوم لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑنے لگے، ابراہیم بڑے بھلے خدا ترس اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ بہتے کہہ دیا ابراہیم اس خیال سے درگزر و تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا یہ عذاب اگر ہے گا اسے لوٹایا نہیں جاسکتا۔

چھٹے : حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں مقفل تھے، عشا بعد جب سب نمازی جا چکر تو ام المؤمنین بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا ملاقات کیلئے تشریف لائیں، بہت دیر تک بیٹھی رہیں جب واپسی کا ارادہ ہوا تو چونکہ رات خاصی گزر چکی تھی، اسلیے آنحضرت صلی اللہ علیہ ان کو گھر تک پہنچانے کیلئے مسجد سے باہر تشریف لائے، اثنائے براہ میں دو بڑے مخلص ایمان والے انصاری ملے جب انہوں نے حضور کو پہچان لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ ساتھ میں محترمہ بھی ہیں، تو راستہ سے ایک سمت سمت کر تیزی سے نکل جانا چاہا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو روکا اور فرمایا یہ عورت میری بیوی صفیہ ہیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! علاموں کی یہ گستاخانہ جرات کہاں کہ وہ آپ کے متعلق کوئی غلط خیال کرتے۔ آپ نے فرمایا شیطان آدمی کا دشمن ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ شیطان تمہارے دلوں میں گمان بد اور خیال فاسد نہ ڈال دے،

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتقاد رکھتے ہوئے بھی یہ ممکن تھا کہ اس حالت کو دیکھتے ہوئے جو عام لوگوں کیلئے سبب تہمت ہو سکتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ایسی تہمت کا وہم کسی کے دل میں پیدا ہو جائے، اور یہ بات ایمان و اعتقاد کے منافی نہیں،

ساتھویں : امام میر کی ساری کتب اخبار میں بحوالہ ابی حمزہ السامانی علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت بیان کی ہے قَالَ أَبُو حَمَزَةَ قَالَ لِي عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ كُنْتُ مُتَكَيِّفًا عَلَى الْحَارِيطِ وَأَنَا حِينَئِذٍ مُتَفَكِّرٌ أَنْ دَخَلَ عَلِيٌّ جُلًّا حَسَنُ الثِّيَابِ طَيِّبُ الزَّائِحَةِ فَنَظَرْتُ فِي وَجْهِهِ ثُمَّ قَالَ مَا سَبَّبَ حَرْبَكَ قُلْتُ أَخْشَوْفِي مِنْ فِتْنَةِ ابْنِ التَّائِبِ قَالَ فَضَحِكَ ثُمَّ قَالَ يَا عَلِيُّ هَلْ رَأَيْتَ أَحَدًا خَافَ اللَّهَ فَلَمْ يُنْجِهْ قُلْتُ لَا قَالَ يَا عَلِيُّ هَلْ رَأَيْتَ أَحَدًا سَأَلَ اللَّهَ فَلَمْ يُعْطِهِ قُلْتُ لَا ثُمَّ لَظَرْتُ قُلْتُ أَمْ قَدْ رَأَيْتُ أَحَدًا أَعْتَجِبْتُ مِنْ ذَلِكَ فَإِذَا بَعْدَ أَسْمَعُ صَوْتَهُ وَلَا أَرَى شَخْصَهُ يَقُولُ يَا عَلِيُّ هَذَا الْخِطْبُ.

امام میر سے جبرہ پر نظر ڈال کر بولا تمہارے غم و فکر کی کیا وجہ ہے میں نے کہا میں فتنہ ابن زبیر سے خوفزدہ ہوں یہ سن کر وہ شخص ہنسا اور پھر بولا اے علی کیا تم نے کوئی آدمی ایسا دیکھا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے نجات نہ دی ہو، میں نے کہا نہیں پھر وہ بولے کیا تم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے نہ دیا ہو، میں نے کہا نہیں۔ یہ کہہ کر

میں سامنے نظر اٹھاتا ہوں، تو وہاں کوئی نہیں تھا، میں اس پر متعجب ہی تھا کہ یہ مانگا کیا ہے کہ غیب سے میرے کانوں میں آواز آئی، میں آواز ہی سن سکتا تھا بولنے والے کو دیکھ نہیں سکتا تھا، اے علی یہ خطر تھے۔

اس قصہ میں جناب امام کو شدت خوف کے سبب ان دو باتوں سے غفلت ہو گئی جن سے ہر مومن آگاہ و باخبر ہوتا ہے اس لیے حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعہ آپ کو متنبہ فرما کر یہ غفلت دور کر دی گئی۔ لہذا اگر بعض صحابہ پر اہل بیت کی جانب سے یا اہل بیت پر بعض صحابہ (رضوان اللہ علیہم) کی طرف سے ایسے حالات طاری ہو جائیں اور وہ طول بھی کھینچ جائیں اور ایک دوسرے کے فضائل و مناقب سے بھی غفلت رہے تو اسمیں نہ تو تعجب کی کوئی بات ہے اور نہ ایسا ہونا دور از خیال بات ہے پھر یہ کیفیت محل طعن و تشنیع کیوں بنے،

مقدمہ (۱۰)۔ یہ کہ فضیلت خاص اگر نہ ہو تو فضیلت عام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس کے تقاضوں اور حقوق سے چشم پوشی کرنی چاہئے۔ اور یہ مقدمہ عقل و نقل دونوں سے ثابت ہے عقل سے تو اس طرح کہ یہ ظاہر ہے کہ خاص کے اٹھ جانے سے عام نہیں اٹھتا مثلاً انسان و حیوان کا انتقار اور جب عام نہیں اٹھا یعنی اس کی نفی نہیں ہوتی تو اس کا اثبات اور وجود ہے اور جب وہ خود موجود ہے تو اس کے لوازم بھی موجود ہیں، تاکہ لزوم کے معنی صادق آسکیں اسی لیے یہ مقولہ ہے کہ جب کوئی شئی پائی گئی تو اس کے لوازم بھی پائے گئے۔

اور نقل سے ثبوت اس طرح ہے کہ اہل کتاب جو اہل ملت میں داخل ہیں بہت سے احکامات میں انکو غیر اہل کتاب پر ترجیح دی گئی ہے مثلاً ان کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے میں۔ اسی نقطہ نظر سے کہ گو فضیلت خاص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ان میں موجود نہیں ہے، لیکن مطلق انبیاء پر ایمان کا ایمان ہے یہی صفت ان کو ایک ایسے شخص سے ممتاز کرتی ہے جو اس وصف سے عاری ہو یا مثلاً عرب کو بلحاظ کفو عجم پر ترجیح ہے کہ وہ اولاد اسمعیل ہیں، گو قریشی کفارت ان میں نہ ہو، اسی طرح قریش کو تمام عرب پر برتری دی گئی ہے گو وہ جس لینے اور زکوٰۃ کے حرام ہونے میں ہاشمیوں کی طرح نہ ہوں اسی طرح اور بھی مثالیں ہو سکتی ہیں، غرض شریعت میں جا بجا اسے مقدمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے طول کلام کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس کی جزئیات بالتفصیل بھی بیان کی جاسکتی تھیں، فی الحال یہی کافی وافی ہے، اس سے قطع نظر کہ اس مقدمہ کو عقل و نقل دونوں کی پشت پناہی حاصل ہے امامیہ فرقہ خود بھی اسے تسلیم کرتا ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک اولاد علی ہونا ایسی فضیلت ہے، جو تمام علویوں میں مشترک اور باعث محبت ہے یہ بات انکی کتب میں صراحت کے ساتھ مسطور و موجود ہے، حالانکہ بعض علوی، ائمہ کی امامت کے منکر ہوئے پھر بھی وہ فضیلت عامہ یعنی علوی ہونے سے نہیں نکلتے خواہ ان میں فضیلت خاص یعنی اعتقاد امامت تمام ائمہ ہو یا نہ ہو۔

اسی طرح محب علی ہونا، اور خود کو شیعہ علی کہنا ان کے نزدیک ایسی خوبی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ائمہ کی امامت کے منکرین پر بھی بدگونی، لعن طعن و طعن جائز نہیں۔ پہلی بات کا ثبوت تو یہ کہ جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ صاحبزادہ جناب امیر نے اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا انکار کیا اور ان کے ساتھ پر خاش رکھی حتیٰ کہ حجر اسود سے فیصلہ کرانے کی فہم آئی اور حجر اسود نے جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں گواہی دی مگر پھر بھی محمد بن الحنفیہ "آخر عمر تک اپنے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے، مختار لقی کو اپنا نائب مقرر کیا، کوفہ کے شیعوں کو اس کی اعانت و رفاقت کے لیے خطوط لکھے اور اسکو اہل شام سے لڑنے اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کیلئے مقرر کیا، مختار نے بھی بعد فتح امرائے شام کے سروں کو تختہ مار اور تیس ہزار دینار کے ساتھ محمد بن الحنفیہ "ہی کو بھیجا، جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نہیں اور رحلت کے وقت اپنے بیٹے ابوباشم کو امامت کی وصیت کی اب وہ اعتقاد جو شیعہ محمد بن الحنفیہ اور ان کے بیٹے ابوباشم کے بارے میں رکھتے ہیں یا جو تعظیم و توقیر وہ ان کی کرتے ہیں وہ ان کی کتابوں خصوصاً مجالس المؤمنین میں دیکھنی چاہئے۔

اور اسی طرح کا واقعہ جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ انہوں نے بجائے کسی امام کی بیعت کرنے کے خود اپنی امامت کا دعویٰ کیا، اور تنوار لبر کر اعلان کیا کہ اہل بیت میں امام وہی ہے جو مرد میدان ہو تنوار لبر کر خروج کرے

جو پوشیدہ اور چھپا رہے وہ امام نہیں چنانچہ قاضی نور اللہ اور دوسرے شیعوں نے ابو بکر حضرمی کے حوالہ سے مجالس وغیرہ میں یہ باتیں بیان کی ہیں، اور اس دعویٰ و امامت کا سلسلہ آپ کی اولاد میں جاری رہا بھی اور متوکل نے بھی غم و رنج کیا اور امامت کا دعویٰ ان بزرگوں سے متعلق شیعہ عقیدت و محبت کا احوال ان کی کتابوں میں مرقوم و محفوظ ہے یہ سب ان کو نیکی سے یاد کرتے اور واجب المحبت جانتے ہیں بلکہ جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے مناقب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ میں نص صریح نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ان کی شہادت کے بعد فرمایا: اللہ مجھے بھی ان کے خوقوں میں حصہ دار بنائے، قسم بخدا زید میرے چچا ہیں وہ اور ان کے ساتھی ایسے ہی شہید ہیں جیسے علی بن ابی طالب اور ان کے ساتھی شیخ ابن بابویہ نے امامی میں فضیل بن یسار سے اسکی روایت کی ہے، اور قاضی نور اللہ نے بھی مجالس المؤمنین میں فضیل بن یسار کے حالات کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے۔ اور یہ بات بھی اسی ذیل میں آتی ہے کہ جناب جعفر صادقؑ کے پانچوں لڑکے محمد، اسحاق، عبداللہ، موسیٰ، اسمعیل، امامت کے سلسلہ میں باہم مخالفت رکھتے تھے۔

عبداللہ افطح، اسمعیل کے سگے بھائی ہیں انکی ماں فاطمہ بنت حسین بن حسین بن علی رحمہم اللہ تھیں، اسمعیل جناب جعفر کی اولاد میں سب سے بڑے تھے، وہ آپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے، اسمعیل کی وراثت کے سبب جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امامت کا دعویٰ انہوں نے یعنی عبداللہ افطح نے کیا اور دلیل میں جناب امام جعفر کا یہ قول پیش کیا کہ (ان هذا الامر في الاكبر صافي لم يكن فيه عا حاة)، (امامت بڑے ہی میں ہے گی تاکہ اسمعیل خرابی نہ ہو) جناب جعفر کو غسل بھی انہوں نے دیا نماز جنازہ بھی پڑھائی قبر میں بھی انہی نے اتارا انکو بھی بھی انہوں نے لی (امام وصی نے امامتیں بھی انہیں کے سپرد کیں،

ادھر محمد نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ان کی سند یہ تھی کہ جناب محمد باقر نے جناب صادق (مہم اللہ) سے فرمایا تھا کہ تمہارے گھر میں میرے بعد ایک لڑکا پیدا ہو گا جس کا نام تم محمد رکھو گے۔ وہ امام ہو گا۔

اسمعیلیہ، اسماعیل کو امام مانتے ہیں تو اسمحاقیہ اسحق کو، اور موسویہ امام موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتے ہیں، امام علی رضا کے بعد امام محمد تقی بچے اور حالات سے بے خبر تھے اکثر شیعہ ان کی امامت کے منکر ہیں، امام تقی کے بعد موسیٰ بن محمد نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ایک جماعت ان کی پیروی ہوئی، جناب امام علی تقی کے بعد جعفر بن علی نے امامت کا دعویٰ کیا امام حسن عسکری کی امامت کے قائل تھے ان کا حمار یہ لقب رکھا، جب امام حسن عسکری نے وفات پائی تو جعفر نے اپنے دعویٰ میں قوت حاصل کر لی اور کہا کہ حسن بن علی نے کوئی جانشین نہیں چھوڑا امام کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ کوئی خلف و جانشین رکھتا ہو، لہذا امام حسن کے ماننے والے بہت سے لوگوں نے جعفر کی طرف رجوع کر لیا، ان میں سے ایک شخص حسن بن علی بن فضل تھے، یہ شخص شیعوں کے مجتہدین، محدثین و معتبرین میں سے تھے،

جعفر بن علی کے بعد ان کا لڑکا علی بن جعفر اور ان کی لڑکی فاطمہ جعفر نے شرکت میں امامت کا دعویٰ کیا اور جو امام حسن عسکری کی امامت کے معتقد تھے وہ بھی گیارہ فرقوں میں بٹ گئے،

مقصد کلام یہ کہ ان حضرات کی آپس کی مخالفتیں اور ایک دوسرے کی امامت کا اعلان کوئی راز نہ رہتا قسم کی چیز، نہیں تھی، بلکہ سبھی کی ہانڈی کی طرح علی الاعلان پھوڑی جا رہی تھی جلوتی اور خلوتی سارے ہی راز نہ تھے

دروں پردہ سے آگاہ ہو چکے تھے، خصوصاً امام حسن عسکری اور جعفر بن علی کے درمیان تو طعن بازی، فسق اور ارتکاب کہا کر تک کے الزامات کی نوبت پہنچ گئی تھی شیعہ اسے خوب جانتے ہیں،

خاتمہ کلام کے طور پر کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ ان ساری مخالفتوں عداوتوں اور تو تومیں میں کے باوجود ان بزرگوں کو اولاد علی جوئے کی نسبت حاصل ہے اس لیے ان کی ساری خامیاں، اپنی جگہ مگر یہ ان سب سے نزدیک مقبول اور واجب التعظیم والحبت ہیں، اور ان کی شکر رنجیاں اور عداوتیں، مخالفتیں وغیرہ سب لائق اغماض و چشم پوشی ہیں اب دوسری بات۔ محب علی یا شیعہ علی کی طرف آئے۔ سب کو معلوم ہے کہ مختار امامت زین العابدین کا منکر تھا، نہ صرف منکر بلکہ معاند بھی، کہ آپ کے ایک صلیبی بیٹے عبداللہ کو اس نے کوفہ میں قتل کر دیا اس کے علاوہ بھی بہت سی قبیح اور ناشائستہ حرکات اس سے سرزد ہوتی رہیں ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے قاضی نور اللہ نے مختار لفظی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس کی حسن عقیدت میں کسی شیعہ کو کوئی کلام نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ جب اس کے اعمال پر لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا تو وہ اس پر سب و شتم کرنے لگے، امام باقر کو جب مسلم ہوا تو آپ نے شیعوں کو اس سے روکا کہ اس پر لعن طعن نہ کی جائے وہ تو ہمارا بہت بڑا محسن ہے، اس نے میں مارنے والوں کو مارا، ہم کو اموال بھیجے اور دولت دی، (انتہی کلام)

تو گویا جسٹی اپنے اوپر شیعہ علی کا یہ بل چسپاں کر لیا، اب اسکے لیے دنیا بھر کی ساری خباثتیں حلال ہو گئیں۔ آپ سے نسبت پیدا کر لینے کے بعد اسکے ساتھ برائی سے پیش آنا حرام ہے، اور اشاعت عشریوں کے ہاں چونکہ بنی فضال اور دوسرے واقفینہ ناموسیہ کی روایات مقبول ہیں ان پر بھی لعن طعن جائز نہیں کیونکہ آخر وہ محب علی تھے اور خود کو شیعہ علی کہتے تھے، کیا ہوا جو بہت سے ائمہ کی امامت کو ٹھکراتے اور انکار کرتے تھے،

جب یہ مقدمہ پہلو سے ثابت ہو گیا اور کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی تو اب اہل سنت کہتے ہیں کہ علی کی جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرض کرنا چاہیئے، اور آپ کی محبت اور آپ پر ایمان کو علی کی محبت اور علی کی امامت کے اعتقاد کی جگہ جانا چاہیئے، اور اقارب و ازواج و اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین و انصار میں سے بجائے اولاد علی فرض کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کو جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت رکھنے کا دعویٰ کیا ان پر ایمان رکھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کیا، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور آپ کے خاندان کی خدمات بجا لائے اگرچہ ان سے انکار، قدر ناشناسی، اور اعمال قبیح کا صدور ہوا ان کو بجائے مختار و بنی فضال کے سمجھنا چاہیئے، اور ان میں آپس میں مولائے نہ کرنا چاہیئے،

اب جو یہ کہتا ہے کہ محبت علی اور شیعیت علی یہ تاثیر رکھتی ہے کہ وہ اس کا دعویٰ کرے بے شک ائمہ کی امامت کا انکار کرے ان کی شان میں بدگوئی کرے ان سے پر خاش رکھے مگر یہ تعلق اسے یہ تحفظ فراہم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے لعن طعن سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ یہ بتائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپ کی امت میں خود کو شمار کرنا اتنی تاثیر کیوں نہیں رکھتا کہ علی کی امامت کے انکار کے بعد وہ شیعوں کے لعن و طعن سے محفوظ رہ سکے،

ہم کہتے ہیں یہ امر دو حال سے خالی نہیں۔ کہ یا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے درجہ سے، (العیاذ باللہ) کھنیا ہے، یا علی کا درجہ (خدا نخواستہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ سے بڑھ گیا۔ اور یہ دونوں

صورت میں شیعوں کے نزدیک غلط و باطل ہیں بلکہ ان کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم و علیؑ باعتبار درجہ برابر و مساوی ہیں، جیسا کہ باب نبوت میں گزر چکا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کی بلندی جناب علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے منصب پر اس مساوات کے علاوہ ہے، اسی لیے تمام کتب شیعہ میں امامت کو نبیبت بنی کہا گیا ہے، جب یہ دس مقدمات ذہن نشیں ہو گئے تو اب ان سے نتیجہ نکال لیجئے اللہ تعالیٰ مقاصد و مبادی تک پہنچنے کی ہدایت اور توفیق مرحمت فرمائے،

منصف کا حرف آخر

اپنے موضوع کی عجیب تر کتاب ”تحفہ اثنا عشریہ“ بارہویں صدی ہجری کے بعد ذیہب تحریر سے مزین ہو کر نقش اختتام سے آراستہ ہوا خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس کی ابتدا میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اسی شرط کے تحت انجام تک پہنچا،

حضرت باری عزوجل اسماء کے فضل عمیم سے امید ہے کہ اس تحفہ کو اپنی بارگاہ میں مقبولیت کا درجہ عطا فرما کر تمام مومن مرد و عورت کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع عطا فرمائیں گے، اور اپنے انتہائی کرم و فضل جوہر و احسان کے طفیل راقم کتاب کو بھی اجر نیک اور ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔ جناب باری میں انتہائی الخلاح، عاجزی اور زاری سے ملتی ہوں کہ زبان و قلم کی لغزش سے اثنائے تقریر و تحریر میں اپنی یا اپنے دوستوں کی مرضی کے خلاف اس کتاب میں کوئی بات درج یا سرزد ہو گئی ہو تو بخش اپنی بے پناہ عنایت و مہربانی سے اسے معاف فرما کر درگزر فرمائیں اور دنیا و آخرت میں اس کے مواخذہ سے نہات بخشے، رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا مَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا مَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لِطَآئِفَةٍ لَّنَا بِهِمْ وَاعْفُ عَنَّا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدًا وَاٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ وَالْخَيْرُ غَوْلُنَا اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خلیل الرحمان منعمانی مظاہری

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ

۲۱ جولائی ۱۹۸۶ء چہار شنبہ،

کتاب تصوف و سلوک

قیمت	احیاء علوم الدین امام غزالیؒ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تصوف سلوک اور اسلامی فلسفے کی زندہ جاوید کتاب۔ ترجمہ: مولانا محمد احسن نانوتوی (چار جلد کامل) مجلد اعلیٰ	احیاء العلوم مذاق العارفین حجۃ الاسلام امام غزالیؒ
	اسرار تصوف ترکیب نفس اور اصلاح ظاہر و باطن میں بے نظیر کتاب کا نہایت مستند اردو ترجمہ۔ کتابت: طباعت اعلیٰ مضبوط وحسین جلد	کیمیائے سعادت اکسیر ہدایت حجۃ الاسلام امام غزالیؒ
	اس مجموعے میں تصوف، عقائد، کلام اور فلسفہ پر امام غزالیؒ کی ۱۶ وہ مستقل کتابیں شامل ہیں جو عربی سے نایاب تھیں۔	مجموعہ رسائل امام غزالیؒ اردو ۳ جلد
	تصوف کی مشہور کتاب	مکاشفۃ القلوب
	مولانا کی قلمی بیاض جس میں تصوف و سلوک کے مسائل کے علاوہ تعلیمات و اخلاق، تعویذات اور طبی نسخجات درج ہیں۔ مجلد	بیاض یعقوبی مولانا محمد یعقوب نانوتوی
	اصلاح ظاہر و باطن اور ترکیب نفس اور راہ طریقت کی مشکلات کا حل اور روحانی علاج کی قسرا باوین۔ تین جلد کامل	تربیت السالک حکیم الامت مولانا اشرف علی
	اسلامی شریعت کے حقائق و اسرار اور تمام علوم اسلامی پر محققانہ کتاب کا مستند اردو ترجمہ۔ مجلد اعلیٰ	حجۃ اللہ البالغہ دارود شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
	و حفظ و تقریر اور نصیحت میں بلند پایہ کتاب جس میں امادیت سے شرک و بدعت کا رد اور صوفیائے متقدمین کے حالات ہیں۔ مجلد	مجالس الابرار شیخ اسکندر رومی
	مولانا تھانویؒ کے ملفوظات جمع کردہ مفتی محمد شفیع	مجالس حکیم الامت
	حضرت حاجی اماد اللہؒ کی جلد دس تصانیف کا مجموعہ مجلد	کلیات امدادیہ
	اس موضوع پر بہترین کتاب۔ شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب	شرعیات و طریقت کا نلازم
	امام جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب کا ترجمہ۔ مولانا محمد عیسیٰؒ	نور الصدور فی شرح القبور
	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ (تصوف و اخلاق)	تعلیم الدین مدلل
	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظ کا عام فہم ترجمہ۔ ترجمہ مولانا عاشق الہی بریلوی	فیوض مینردانی
	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی عقائد اسلام و تصوف پر بے نظیر کتاب۔ ترجمہ عبداللہ کام جیلانی	غنیۃ الطالبین
	دارالاشاعت اردو بکزار کراچی	بہت تہ مفت ڈاک کے تحت بیچ کر طلب فرمائیں

کتاب عقائد و مناظرہ وغیرہ

اختلاف امت اور صراطِ مستقیم	اردو اسلامیات کی حیثیت اور اس میں امتدال کا طریقہ مولانا محمد رفیع مہدی
آیاتِ بیانات	تردیدِ شیعہ میں بے نظیر کتاب، حسن الکلم محمد مہدی خاں
ایرانی انقلاب	امام خمینی اور شیعیت مولانا محمد منظور نعمانی
العقائد علی المقند	عقائد علمائے اہل سنت مولانا فطیل احمد صاحب
براہین قاطعہ	جواب انوارِ سامعہ (جلد) مولانا فطیل احمد محدث
بریلوی علماء و مشائخ	کے لئے کلمہ نگرینہ مولانا محمد عاشق اہلی مہاجر مدنی
تقویتہ الایمان کاں	مشرب و بدعت کی رد میں مشہور کتاب شاہ اسماعیل شیعہ
تقویتہ الایمان	توحید و سنت کے امبار اور شرک و بدعت کا رد شاہ اسماعیل شیعہ
تاریخ میلاد	مرد پر پیدا و قیام کی مناسبت مولانا عبدالشکور دہلوی
تعفۃ الشافعیہ	(جدید ترجمہ) تردیدِ شیعہ میں لا جواب کتاب، شاہ عبدالعزیز دہلوی (جلد)
تاریخ مذہب شیعہ	یعنی نسبتِ ابنِ سبا اور شیعہ مذہب کی تاریخ مولانا عبدالشکور دہلوی
تصفیۃ العقائد	دینی مسائل و عقائد اسلام پر سرسید احمد خاں سے مرامت مولانا محمد قاسم نانوتوی
تغذیۃ الناس	تتم نبوت اور فضائل محمدیہ مولانا محمد قاسم نانوتوی
حجۃ الاسلام	حقانیت اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی
دھماکا	بریلوی کتاب زلزلہ کا جواب انجمنِ خدامِ التوحید برہنہ
شریعت یا اجالت	شرک، بدعت اور رسوم کا رد اور دعوتِ حق محمد پاشا صفائی
عقائد علمائے دیوبند	احمد رضا خان کتابِ سام الغریبین کے تین جواہر کا مجموعہ مولانا منظور نعمانی
عیسائیت کیا ہے؟	عیسائیت اور اسلام کے بانی کی تاریخ مولانا محمد تقی عثمانی
قادیانی چہرہ	نمود اپنے منہ میں مولانا محمد عاشق اہلی مہاجر مدنی
مسک علمائے دیوبند	دیوبندیوں کی اہل سنت میں مولانا قاری محمد رفیع
مودودی صاحب	کی تحریکات کے حقائق و حقائقین از علمائے دیوبند
مباحثہ شاہجپانپور	ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ مشہور مباحثہ مولانا محمد قاسم نانوتوی
میلہ خدا شناسی	مشہور میلہ خدا شناسی کا انکھن و بیان مولانا محمد قاسم نانوتوی
ہدایتہ الشیعہ	علمائے شیعہ کے دس سوالوں کا مفصل جواب مولانا رشید احمد مدنی

فہرستہ کتب مفتہ ذاکہ کے ٹکٹے بھیج کر طلب کیجئے

ملنے کا پتہ: دارالاشاعت اردو بازار کراچی ٹکون ۲۱۳۷۰۰

